فن کاروں کی تعداد صرف ۱۶ ہے اور افسانوں، ناولوں اور تنقیدی کتابوں کی تعداد صرف ۳۰ ہے۔ اہم شعراء (زندہ اور مرحوم) کی تعداد گیارہ ہے جنہیں فتح نصیب ہوئی ان کی ہیت کزائی دیکھی نہیں جاتی چونکہ اس صف میں مفکر کلاسکی شاعر بھی ہیں اساتذۂ کرام بھی ہیں، ترقی پسند اور جدیدیئے بھی ہیں۔ گویا استادوں اور شاگردوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں۔ دراصل اس چناؤ میں ان جلیل القدر مرحوم شعراء کو رائے دہندوں نے منکر نکیر سے زیادہ ستایا ہے اور قبرستان میں ان کی تذلیل کی ہے۔ نصف صدی پہلے ہی اقبال، حالی، شبلی، اکبرالہ آبادی، شاد عظیم آبادی، سیماب، جلیل، صفی، فانی، حسرت، جگر، یگانہ، جمیل مظہری کی قدر و قیمت متعین ہو چکی تھی۔ ان قد آور شعراپر ادب پیا کے معیار سازوں کی مزید آراء گویا شاعروں کی تحسین ناشناس کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان مرحوم مگر زندۂ جاوید اساتذائے کرام کی ادبی عظمت کو نئے ہزاریے کی ناقص میزان میں مزید تولنے یا جدید ادب پیا سے ان کے طول و عرض کا موازنہ ۱۹۶۰ء میں ابھرے ہوئے ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے کرنے کا عمل ایسا ہی ہے جیسے ایک پلڑے میں ہاتھی اور شیر کو رکھ کر دوسرے پلڑے میں باقی تمام جانوروں کو رکھ کر تولا جائے۔ اساتذۂ کرام کے ادبی خون کا حساب کلو کے وزن میں کرنا یا ان کے شاگردوں کے خون کو نست کر کے اسے ان کے استادوں کے ادبی خون سے گاڑھا یا وزن دار قرار دینا دلیلِ کم نظری ہے۔ آج جتنے بھی نامور شعراء ادباء محققین اور ناقدین ہیں سب کے سب مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں مذکورہ بالا عہد آفریں حضرات کی شعری اور نثری تخلیقات کو پڑھنے کے بعد ہی ارباب قلم بنے۔ موازنہ کسی شاعر کا کسی شاعر سے کرنا ہی کار طفلاں ہے۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ معتبر ادیبوں نے بحیثیت رائے دہندگان استادوں سے زیادہ نمبر شاگردوں کو مرحمت فرمائے۔ مولانا حسرت موہانی کو صرف ۹، فانی کو ۹، ناصر کاظمی کو ۹، یگانہ کو ۱۲، میراجی کو ۱۴، ن م راشد کو ۱۶، جوش کو ۱۶، فیض کو ۱۹، فراق کو ۱۹، اخترالایمان کو ۲۰، اقبال کو ۲۴، یہ گویا اساتذائے کرام میں علی الخصوص نغزگو غزل کے شعراء کو نیچا دکھانے کا چارٹ ہے۔ بیسویں صدی کے لمحہ موجود میں میر و غالب ماضی سے کہیں زیادہ زندہ ہیں۔ شاعری چاہے ہزاروں برس پرانی ہو، اگر وہ مترنم و موثر اور متحرک ہے اور وسیع تر انسانی و روحانی زندگی کی عکاسی کرے اور اپنی فکری توانائیوں کا سامان فراہم کرے ہمیں اپنا شریک بنالے تو آج پر کیا موقوف ہزاروں سال بعد بھی زندہ و شاداب اور محفوظ ہے۔ وہ ادب جو وقت گذر جانے کے بعد قدیم کے زمرے میں شمار ہو وہ اپنے عہد کا بھی اچھا ادب نہیں ہوتا۔ ترقی پسندوں اور جدیدوں میں کوئی ایسا عظیم شاعر نظر نہیں آتا جسے ہم ماضی بعید میں لے جاکر میر و غالب کے ہم دوش کھڑا کر سکیں یا ماضی قریب میں اقبال، سیماب، جمیل مظہری کے ہم پلہ قرار دیں۔ ایک نظر ادب پیا کی پیائش کے تحت ہارے ہوئے بارہ شعرائے کرام پر نظر ڈالتے وقت قاری کی آنکھوں سے خون کے قطرے رواں ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اسے حفظ مراتب کا پاس ہو۔

ذیل میں بارہ شکست خوردہ شعراء کی گرامی آراء کی تعداد یوں ہے۔ شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی کو صرف ۳ نمبر، حضرت شاد عظیم آبادی کو ۳ نمبر، بانی کو ۳ نمبر اور ظفر اقبال کو بھی ۳ نمبر ملے ہیں۔ مولانا حالی کی زبوں حالی اس تھرڈ کلاس صف میں دیکھی نہیں جاتی۔ ایک عظیم نقاد اور نظم نگار مولانا حالی کا موازنہ، بانی اور ظفر اقبال جیسے جدید غزل گو شعرا سے جو کیا گیا ہے اس سے زیادہ عبرت ناک منظر تاریخ ادب اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔ انشاء کی زندگی میں بھی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک دلخراش منظر یہ ہے کہ مفکر شاعر علامہ جمیل مظہری کو صرف ۲ نمبر، غزل کے منفرد کے لہجے کے شاعر مجروح کو ۲ نمبر، اسرار الحق مجاز کو بھی ۲ نمبر، جدید نظم کے شاعر محمد علوی کو بھی ۲ نمبر اور ادب پیا کے موجد حضرت زبیر رضوی کو بھی ۲ نمبر ملے ہیں۔ جدید نظم گو اور گیت نگار شعرا کے ساتھ کلاسکی شعرا کا تقابلی مطالعہ بھی مضحکہ خیز ہے حضرت اکبرالہ آبادی کو اللہ اکبر نے چار نمبر عطا کر دئے ہیں۔ اب اس شعری سلیکشن میں اساتذۂ کرام اور جدید غزل گو شعرا سے بھی زیادہ نمبر حاصل کرکے ہارنے والے دو ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری نے پانچ نمبر اور مخدوم محی الدین نے بھی پانچ نمبر حاصل کر لئے ہیں۔ اس درجہ بندی کے بعد نئی نسل اور مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ذہین طلباء کے نزدیک کلاسکی غزل کے شعرا میں مجروح، جمیل مظہری، حالی، اکبرالہ آبادی، سیماب وغیرہ کی قدر و منزلت کی کوئی خاص گیارنٹی نہیں رہی اس فہرست سازی سے ایک طرف ادب پیا، نقد و نظر کی نئی میزان کے مالک زبیر رضوی بے حد خوش ہیں کہ سو برس کے شعری ادب کا احاطہ کرتے ہوئے ان شاعروں کے نام بھی لئے گئے ہیں جن کی پہچان ۱۹۶۰ء کے بعد بنی ہے، اب مدیر شاعر جناب افتخار امام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ شاعر میں ادب پیا کے تعلق سے ادبی فیچر کا آغاز کریں۔ اور یہ سوال اٹھائیں کہ کیا اردو شاعری میں درجہ بندی ضروری ہے کہ نہیں۔ زبیر رضوی نے حد سے حد آندھرا میں صرف مغنی تبسم کو رائے دہندہ کی حیثیت سے لیا ہے۔ اور جنوب کی دوسری ریاستوں کے اہم اور نمایاں ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کر دیا ہے، فضیل جعفری نے بھی اسی سلسلے میں اپنی تنقید کو نیرجی کی بجائے بوجھ بنادیا ہے۔ اور باتوں باتوں میں چند نقادوں کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ جذبہ فکر و فن اور شعر و ادب کی ازلی وحدت کو قدیم و جدید کے ناقص خانوں میں بانٹ کر رکھ دینا دلیل کم نظری ہے۔ شاعری ہو یا نثر اچھی یا بری ہوتی ہے۔ یہ نہ قدیم ہے نہ جدید۔

میں اس بحث کو ذہن جدید کے بجائے شاعر کے ادبی فیچر میں اٹھا رہا ہوں کیوں کہ آپ نے بھی صدی شخصیت نمبر کا اعلان کیا ہے اور مسلسل کر رہے ہیں۔ آپ کا انتخاب اور طریقۂ کار کیا ہوگا، مجھے نہیں معلوم۔

● 5 - SK MEERUDDIN STREET, NOORULLAH PET, AMBUR- 635802 (T.N.)

نوٹ:

کاوش بدری صاحب کا طویل خط جو مدیر شاعر کے نام ہے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ماہنامہ کتاب نما (دہلی) کے تازہ شمارے (جون ۲۰۰۰ء) میں بھی شائع ہوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس خط کے تمام مباحث پر بحث "ذہن جدید" اور "کتاب نما" ہی میں ہو کیوں کہ شاعر کے صفحات پر "صدی شخصیت" کے بارے میں ایک نیا مکالمہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اچھا ہے کہ ہندو پاک کے دیگر ادبی رسائل میں ایک صدی کے ادب پر اور "صدی شخصیات" پر بحث ہو۔

[باقی صفحہ ۱۷ پر دیکھئے]



فکر امروز

۴۹ واں سال وصال

پ: جون ۱۸۸۰ء م: ۳۰ رجنوری ۱۹۵۱ء

ایک پیغام اہل عالم کے نام

ہوشیار اے اہل عالم اب نہیں ہنگامِ خواب
محفلِ ہستی یونہی کب تک اسیر انقلاب
بربری تہذیب سے ، ہنگامۂ تخریب سے
تم نے دنیا کے ہزاروں دور کر ڈالے خراب
دُور کرسکتی ہے اک انگڑائی اب بھی روح کی
شخصیت کی تشنگی ،جمہوریت کا اضطراب
پھر نظام کہنہ کو پیرایۂ تجدید دو
اپنی دنیا کو بناؤ بزم فطرت کا جواب
قومیت، فرقہ پرستی ،اور نسلی امتیاز
پیکرِ انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب
قلعہ پندار کو مسمار کر دو توڑ دو
چاک کر کے پھینک دو یہ مادیت کا حجاب
صرف تم انسان بن کر اپنی دنیا میں رہو
پر سکوں ، آزاد، یکسو، کامگار و کامیاب
بادۂ کبر و خودی ناپاک ہے ملعون ہے
پی رہے ہو تم جسے، انسانیت کا خون ہے

۴۹-اشعار پر مشتمل طویل نظم کا آخری بند۔

[فکر امروز جولائی ۱۹۴۷ء بار دوم]

سیماب اکبرآبادی

[redacted] 173278

[redacted] 24.5.02

[redacted]
جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

[redacted]
بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۱ واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد ــــــ ۷۱
شمارہ ــــــ ۱

12

فون: 3829904

جنوری ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

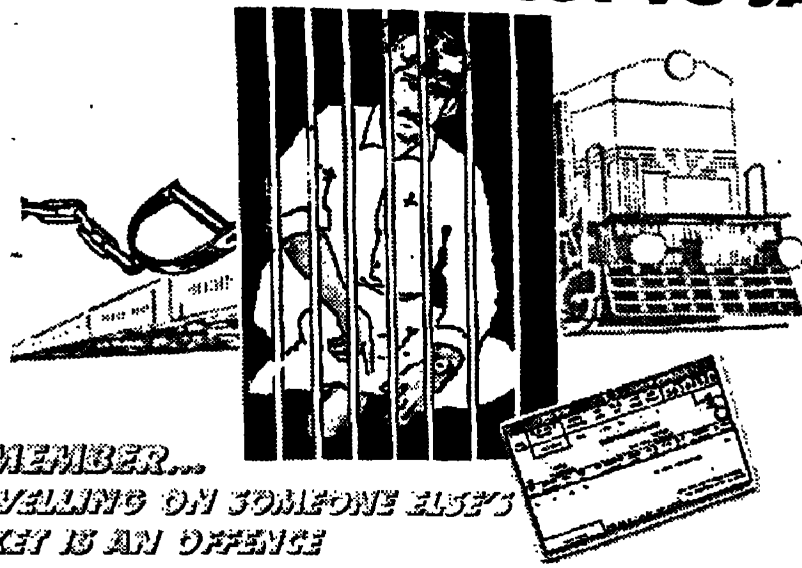
تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ✿ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ✿ خلیجی ممالک ۲ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

A TICKET FROM A TOUT IS A SHORT-CUT TO JAIL



REMEMBER...

TRAVELLING ON SOMEONE ELSE'S TICKET IS AN OFFENCE

PENALTY

- Forfeiture of invalid ticket and holder shall be deemed to be travelling without ticket.
- Charging of fare in addition to excess charge equivalent to fare or Rs. 50/-, whichever is more.
- Punishment with imprisonment up to 3 months or fine up to Rs. 500/-, or both.

ATTENTION

- As a result of ambush by special ticket checking squads **8000 persons were prosecuted between April-August 1999 and around 4000 persons were sent to jail.** The revenue collected as fare and fine in this period was Rs. 16.71 crores.
- The CRACK VIGILANCE and Anti Fraud Squads of Northern Railway regularly undertake drives to verify genuineness of passengers by physically visiting the addresses given on reservation requisition forms and to detect person travelling on transferred tickets.

Appeal

- Buy tickets only from railway booking counters or authorised rail travel service agents.
- Plan your journey in advance & do not buy tickets from touts in your own interest.

Never buy tickets from touts... avoid trouble and humiliation.

bdkhanna\621-E



NORTHERN RAILWAY

Requests your co-operation for better service

سرورق

حامد اقبال صدیقی

هم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

[قارئین و قلمکار]

مکتوبات

شمارہ ۔۱ [جنوری ۲۰۰۰ء] جلد۔ ۱۷

محفل اپنی......!

شاعر کا یہ شمارہ

شاعر کا یہ نیا شمارہ مکمل ہوتی ہوئی ۲۰/ ویں صدی کے آخری سال کا شمارۂ اولیں ہے۔ جنوری ۲۰۰۰ء کا یہ شمارہ ہے تو اپنے پرانے ہی FORMET میں لیکن مواد و معیار کے اعتبار سے اپنے سابقہ شماروں کے معیار کی خوب سیرت توسیع ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ قارئین شاعر کو زیادہ سے زیادہ متنوع اور دل پسند مواد وافر مقدار میں پڑھنے کو ملے یہی شاعر کا خاصہ ہے اور اس کا امتیازی وصف بھی۔ شاعر میں شامل کئے جانے والے تمام حرف ولفظ منتخب ہوتے ہیں جن پر علمی و ادبی مکالمہ ممکن ہے۔

شاعر کی ۷۰/ ویں سالگرہ

جنوری ۲۰۰۰ء کے اس شمارے کے ساتھ شاعر نے اپنی عمر کے ستر سال مکمل کر لئے ہیں اور اب ۷۱/ رواں سال شروع ہوا چاہتا ہے۔ ستر سال کی اپنی ایک ایسی طویل داستان ہے جس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ ہمیں فخر ہے اور بے طرح مسرت بھی کہ اردو زبان و ادب کے لئے ہمارے اسلاف کا یہ زبردست کارنامہ۔ سیماب خاندان کی نئی نسلوں کا کارنامہ ہے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ ۷۰/ رسالہ شاعر ایک چہرہ ،ایک شخصیت ایک اکاڈمی نہیں بلکہ ایک عالمی ادارے کا نام ہے۔ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یونیورسٹیوں کے اردو ریسرچ اسکالروں اور ثقہ محققین کا یہ موضوع ہے۔ ۲۰/ ویں صدی کے ادب کی ایک بڑی تاریخ رسالہ شاعر میں محفوظ ہے۔ شاعر کے لئے ہمارے بہت سارے خواب ہیں۔ ان میں سے ایک خواب یہ بھی ہے کہ ستر سالہ شاعر اپنی عمر کی ایک صدی کو مکمل کرے۔ جنوری ۲۰۳۰ء [اجراء ۱۹۳۰ء] ہماری منزل ہے۔ شاعر اپنی دوسری صدی کو بھی جئے یہ بھی دعا ہے۔ ڈھیروں کام ہیں، پروجکٹ ہیں۔ "شاعر زندگی" کو جینے کے لئے سخت جدوجہد کرنی ہے۔ کیوں کہ ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو والے اپنی اس تاریخ ساز روایت کے لئے کیا کرتے ہیں، اسے کس طرح اپنا فخر بناتے ہیں۔ ۷۰/ رسالہ شاعر کو کس طرح اپنا تعاون دیتے ہیں۔ چار سمتوں سے شاعر کے لئے کیا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا ہمیں انتظار ہے۔

آپ شاعر کی سترویں سالگرہ کس طرح منائیں گے؟

آئندہ خصوصی شمارہ

شاعر کی سترویں سالگرہ کی خوشی میں شاعر کا آئندہ مشترکہ شمارہ ایک اور خصوصی شمارہ ہے۔ اردو کی نئی بستیاں اور اردو ادب کا عالمی منظر نامہ، کے سلسلے کی ایک اہم ترین کڑی۔ ایک ایسا خصوصی شمارہ جو کسی ضخیم خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ شاعر کی سالگرہ کے تحت سال ۲۰۰۰ء میں کئی خصوصی شمارے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اپنی بے طرح مسرتوں کا اظہار ہم اسی طرح کر سکتے ہیں۔

اور آپ؟

مذکورہ خصوصی شمارے، دیگر خصوصی شمارے اور عام شماروں کے خیر مقدم کے لئے تیار ہیں؟۔ کیا آپ نے اپنا سالانہ زر رفاقت ارسال کر دیا ہے؟۔ کیا آپ نے اپنے بقایاجات کی ادائیگی کر دی ہے؟۔ کیا آپ شاعر کی توسیع اشاعت کے لئے کچھ کر رہے ہیں؟۔ کیا آپ اپنے صوبوں، شہروں اور علاقوں کے کتب فروشوں سے شاعر کو متعارف کرواتے ہوئے اس کی نکاسی کا اہتمام کر رہے ہیں؟۔ شاعر کے لئے اشتہارات کی ضرورت ہے۔ شاعر کو اپنے گرانقدر عطیات سے نوازیے، شاعر کے لئے ہمارے جو خواب ہیں ان کو تعبیر آشنا کیجئے۔ شاعر کو آپکی ضرورت ہے۔

کچھ خواب اور

شاعر کا آئندہ خصوصی شمارہ ہماری ان کوششوں کا ایک خوب سیرت ثمر ہوگا جس کا آغاز ہم نے ۱۹۸۰ء میں کیا تھا اور جسے ہم نے اردو کی نئی بستیاں نام دیا تھا۔ کئی خصوصی شماروں کا سلسلہ "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ [۱۹۹۹ء] تک پہنچا۔ آئندہ شمارہ اسی سلسلے کا ایک اور روپ ہے لیکن قدرے مختلف۔ ہم چاہتے ہیں کہ مجوزہ اردو کی نئی بستیاں نمبر کی اشاعت سے قبل اب دنیا کے مختلف براعظموں میں پھیلی ہوئی اردو کی نئی بستیوں کو ان کے انفرادی علاقوں کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ ان سب کی سمائی سے ایک مکمل دستاویز بن جائے مثلاً شمالی امریکہ، خلیجی ممالک، یورپ وغیرہ، بطور خاص پاکستان..............

اردو جہاں جہاں ہے شاعر وہاں وہاں ہے

صدی شخصیت

عالمی مواصلاتی میڈیا اور عالمی تجارتی منڈیوں نے Y2K کو عالمی موضوع بنا کر زبردست ہنگاموں کے ساتھ ۲۱/ ویں صدی کو مدعو کر لیا، اس کا استقبال کر لیا۔ اور ایک سال قبل ہی جب کہ بیسویں صدی کے اختتام کو ابھی ۳۶۵ دن باقی ہیں۔ نئے ہزارے اور نئی صدی کے شور میں یہ بھی ہوا کہ دنیا کے ہر شعبے میں گزشتہ ایک ہزار سال اور ایک صدی کے بہترین اور عظیم ناموں کا انتخاب ہونے لگا بڑے بڑے اداروں نے اپنے طور پر مختلف طرح سے انتخاب کئے اور اعلانات کئے۔ عالمی ادب و ثقافت کے تحت بھی یہ کام ہوئے ہیں۔

ہم نے جب، ہم عصر اردو ادب نمبر، کے کاموں کا آغاز [۱۹۹۰ء] کیا تھا تو ۲۱/ ویں صدی کو ذہن میں رکھا تھا اور مکمل ۲۰/ ویں صدی کے بارے میں بھی غور کیا تھا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) میں اس کا اعلان ہے۔ ۲۱/ ویں صدی میں شاعر کے ایک اور ضخیم خاص نمبر "اردو ادب کی ایک صدی" کے بارے میں غور کیا گیا تھا۔ اس کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ اردو کے تمام اہم قلم کاروں سے ذکر بھی ہوا ہے۔ اس کے تحت ایک صدی کے خاص خاص ادبی واقعات کے ساتھ مختلف اصناف کی اہم ترین عظیم شخصیتوں کی بابت بھی غور کیا جا رہا تھا۔ اب چونکہ الیکٹرانک میڈیا نے اس نوع کے کام کو کر ہی لیا ہے تو ہم بھی رسالہ شاعر کے تحت اردو ادب کی صدی شخصیت کا انتخاب کرنے والے ہیں۔ اردو ادب کے مختلف شعبوں سے ناموں کی ہماری ایک فہرست آئندہ شماروں میں آئے گی۔ اس میں سے ۲۰/ عظیم ناموں کا انتخاب کیا جائے گا۔ ایک وہ رائے جو ادارہ شاعر اپنے طور پر کرے گا اور دوسری وہ جمہوری رائے جو شاعر کے بے شمار قارئین سے حاصل ہوگی اور اس کے بعد ایک طے شدہ کمیٹی اتفاق رائے سے ۲۰ ناموں کو منتخب کرے گی۔ "اردو ادب کی ایک صدی" کے تحت ان ۲۰/ ناموں پر مشتمل شاعر کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے گا اور ہر طرح سے ان عظیم قلم کاروں کو موضوع کیا جائے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ "اردو ادب کی ایک صدی" کو تمام پہلوؤں سے اس طرح مکمل کر دیں کہ ادبی تاریخ نویسوں کو کم از کم ۲۰ ویں صدی کے اردو ادب کو لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ انہیں ایک ماڈل مل جائے۔

ہمیں آپ کے گرانقدر مشوروں کا انتظار رہے گا۔

تحقیق و تصحیح

استفسار:-

الف۔ (۱) براہِ کرم ذیل کے الفاظ کی صحت سے اطلاع دیجئے۔

جناب قمر جونا گڈھی کے مقطع میں ؎

نہ جانے کس سے دل لگا کر ہے قمر یہ تو خفا سرا
گذر رہی ہر گذر جہاں نہ پھر آئیگا جو گیا گیا

کیا سرا کے معنی میں "سرا" جائز ہے؟

(۲) کیا لفظ تخیل باتشدید بھی صحیح ہے؟

ہمشیرہ ایم آر۔ بی۔ اے گل کرانوی

ب۔ (۱) شاعر آگرہ بابتہ ماہ جولائی ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۲ پر جناب خادم شوی کی طرحی غزل شائع ہوئی ہے مجھے ان کے مقطع پر اعتراض ہے ؎

ذہن و روح کی تسکین تھیں کبھی وہ زلفیں بھی
دوش پہ بیرے خادم اب بارِ ہستی ہے

"تھیں" جمع کا صیغہ ہے اس کے ساتھ "بارِ ہستی ہے" درست ہے یا نہیں؟

محمد عبد الغنی فاروقی وکیل کلم نوری

ج (۱) رسالہ "جلوۂ فانوس" بنگلور کے ٹائٹل پر مندرجہ ذیل شعر لکھا ہوا ہے مجھے اس کی صحت میں شک ہے ؎

چشمِ حقیقت نگر دیکھ کہ ہے نور ریز
جلوۂ شمعِ ادب ہے پردۂ فانوس میں

ایم وارث صدیقی شاہدہ

د (۱) انتخاب شاعرہ گلزار ادب جالون میں جناب سلیمان اور جناب شوق کے دو شعر یوں شائع ہوئے ہیں ؎ ایک کہ جنوں وہ نگاہِ نیم باز

راز سب کونین کا بتلا گئی
نیم باز ان کی نگاہ بالیقیں
ہر گرہ سلجھی ہوئی الجھا گئی

دونوں شعروں میں نیم باز نگاہ نظم کیا گیا ہے جو میرے خیال میں غلط ہے چشم نیم باز ہونا چاہیے۔

طرفہ قریشی بھنڈاروی

جواب

الف (۱) "سرا" اور "سرا" دونوں کے معنی شعر مذکور کی جگہ میں میرے خیال میں "سرا" سے زیادہ فصیح "سرا" ہے۔
(۲) "تخیل" اور "تخیّل" دونوں صحیح ہیں مگر دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ تخیل کے معنی ہیں خیال میں لانا اور تخیّل کے معنی ہیں خیال پیدا کرنا۔ دھیان کرنا اور ذہنی عکس کی تصویر کشی۔

ب (۱) "تھیں" کو "بارِ ہستی" سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ خادم صاحب کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے خادم کبھی اُن کی زلفیں ذہن و روح کی تسکین کا باعث تھیں، لیکن اب زندگی کا بار دوش پر معلوم ہوتی ہے؟

(ج) اس شعر کے دونوں مصرعے دو مختلف بحروں میں ہیں بس یہی غلطی ہے۔ دوسرے مصرعے سے "ہے" نکال لیا جائے تو شعر صحیح ہو جائیگا۔

(د) "نگاہِ نیم باز" غلط ہے۔ نگاہ اس قوت کا نام ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں جانتے ہیں۔ لہٰذا اُس کا پورا یا آدھا کھلنا بعید از قیاس ہے، البتہ آنکھ، آدھی یا پوری کھل سکتی ہے، اس لئے چشمِ نیم باز لکھنا چاہیئے۔

اعجاز صدیقی

شاعر (آگرہ) کے پرانے شماروں میں مستقل کالموں کا ایک دلچسپ علمی وادبی اور تحقیقی سلسلہ تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان شاعر کا روپ رنگ بہت مختلف تھا کیونکہ علامہ سیماب اکبر آبادی ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کے زیر اثر تھا شاعر کے مذکورہ تمام کالم وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے گئے اور پھر بند کر دیئے گئے ایسے ہی کالموں میں سے ایک تحقیق و تصحیح بھی تھا جس میں علمی وادبی اور تحقیقی سوالوں کے جواب دیئے جاتے تھے۔ یہ جوابات علامہ نے دینا شروع کیے۔ اس کے بعد قبلہ اعجاز صدیقی نے اس کالم کی ذمہ داری لی اور پھر دیگر اساتذہ عصر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کے شمارے سے ایک صفحے کا عکس قارئین شاعر کی دلچسپی کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ آج اس طرح کے کالم کی ایک بار پھر ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ (الف الف)

منٹھی بھر رباعیاں

عبدالعزیز خالد

(۱)

اس کارگہِ دہر میں ہر ایک انساں
مامور مکلف ہے بقدر امکاں
اس سے ہے مطالبہ فقط اتنا ہی
ہونے دے حقائق کو نہ آنکھوں سے نہاں!

(۲)

ساحل سے کہے آب روانِ دریا
کیا تجھ کو بتاؤں میں روانی کا مزا
منزل سے زیادہ ہے سفر کی لذّت
گرمائے مسافر کا لہو بانگِ درا

(۳)

نااہل کی مدح کی نہ خالدؔ نے کبھی
استغنا سے طبیعت اس کی ہے بھری
رہتا ہے ہمیشہ خامہ فرسا لیکن
دامن ہے تہی، ہاتھ ہیں اس کے خالی!

(۴)

ملتی نہیں گرچہ، اس کی فرہنگ کہیں
اور اس کے قواعد بھی کہیں درج نہیں
آنکھوں کی لنگوا فرانکا لیکن
یکسر نہیں محتاجِ بیان و مبیں!

(۵)

کو شدّتِ احساس سے آشفتہ حواس
آماجگہِ وسوسہ ہائے خناس
رکھتا ہے مگر ہجومِ یاس وشک میں
قائم بالذّات مجھ کو آتم وشواس!

(۶)

اپنے کو سمجھتا ہوں میں عبدِ مامور
تاعمر مکلف ہے جو حسبِ مقدور
زادِ سفر افتادگی و عجز و نیاز
اسباب میں کچھ کم ہے تو بس علم وشعور!

(۷)

ہر میدانِ حیات میں بے جھجکے
بڑھ چڑھ کر کرے مقابلہ مردوں سے
پھر بھی ہے تاثر اس کے بارے میں یہی:
ہیں شروتِ زن فقط خدوخال اس کے!

(۸)

کرتا ہے رجالِ غیب سے باتیں کیا!
یا رہتا ہے فکرِ سخن میں الجھا:
خالدؔ بھی ہے منجملۂ اصحابُ اللیل
دیکھا اسے جب بھی جاگتے میں دیکھا!

(۹)

لکھی ہے مرے نصیب میں شب بیداری
پوچھو مری پلکوں سے درازی شب کی
باعثِ کوئی محفلِ شبانہ بھی نہیں
ناں شغلِ شبانگاہِ قلمکاری ہی

(۱۰)

کوتاہیِ ہمت تھی کہ ضعفِ پروبال؟
کرتا ہوں میں اپنے ہی سے رہ رہ کے سوال
شہبازِ بلند بال کی طرح اڑان
کیوں بھر نہ سکا بوصفِ پندارِ کمال؟

(۱۱)

سیکولریت —— سروا دھرما سمان
جس کی رُو سے ہر آدمی ہے انسان
اس شور وشر خودبینی وخود رائی میں
ہے صرف اسی نظام میں جاں کی امان!

(۱۲)

رہتے ہیں کتنے ہی طلبگارِ کمال
مجہول اُلاِسم و معدومُ الاحوال
کیا اس کے باور کرنے میں شک ہے؟
دیکھ مجھے میں اس کی ہوں اک زندہ مثال!

(۱۳)

ہیں حسنِ خود آگاہ کے اپنے ہی اصول
استحقاق اس کا —— حقِ ردّو قبول
دہکا ہوا انگارا —— جب برہم ہو
مائل بہ کرم ہو جب تو مہکا ہوا پھول!

(۱۴)

منطق کی چلے پیش نہ پیشِ جذبات
گوشِ متعصبِ نہ سنے عقل کی بات
ہے تنگ نظر، تنگ دلِ انسانوں سے
ہر سعیِ مکالمہ —— تضیعِ اوقات!

(۱۵)

موسم کے ستم جھیل سکے پیڑ وہی
شاخیں ہوں ہری بھری اسی خوش قد کی
ہو چھاؤں اسی کی گھنی گہری، جس کی
گہرائی تک جڑیں ہوں مٹی میں گڑی!

(۱۶)

ہاتھ آئے نہ منزل تو بھریں سرد آہیں
جو کھم میں پڑیں چھوڑ کے سیدھی راہیں
عبرت کا مقام ہے کہ زندہ زن ومرد
اصحاب قبور سے اعانت چاہیں!

(۱۷)

بولے تو لگے تار چھڑے بربط کے
چال ایسے جیسے موج صہبا لرزے
سانچے میں ڈھلے وہ متناسب اعضا
آنکھوں کی ہوسیری نہ طبیعت ہی بھرے!

(۱۸)

سودا نہیں ہرگز یہ زبردستی کا
جو بھی ہے خود سپردگی کا ہے مزا
تحفہ ہے محبت نہ کر تاوان وخراج
ہے شرطِ عطا، عطا کنندہ کی رضا!

●102-C DEFENCE HOUSING SOCIETY LAHORE CANTT-54792 (PAK)

غزل پر مکالمہ جاری ہے

ادبی فیچر

اگر موجودہ ادبی سماج کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان وادب سے وابستہ "ادب لوگ" زبانی جمع خرچ کے روایتی سلسلوں سے آگے عمل کی انھیں صورتوں میں پھنسے ہوئے ہیں جن میں سرکاری ضرورت اور مجبوری سماجی منصب داریوں کے حصول اور اس میں بنے رہنے کی جدوجہد یا پھر طلب کے فرسودہ اور میکانیکی طریقے شامل ہیں۔ نیا کچھ بھی نہیں ہورہا ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں داخل تو ہورہے ہیں لیکن وہی پرانے ،گھسے پٹے طور طریقوں کے ساتھ۔ نہ تو رسم الخط کے لئے کچھ ہے اور نہ ہی صنف غزل کے لئے کوئی خاص کام۔ حیرت ہوتی ہے کتب ورسائل کو پڑھتے ہوئے اور تعجب ہوتا ہے ادبی سمیناروں میں شریک ہوتے ہوئے کہ ہم لوگ پتہ نہیں کن دنیاؤں میں جی رہے ہیں؟ وقت کے تقاضے کیا ہیں اور ہم کیا کررہے ہیں۔ اردو رسم الخط کے تحفظ اور اس کی ترویج واشاعت کے لئے کسی کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے کہ جنگی پیمانے پر اس کا نفاذ کیا جاسکے، اس پر عمل کیا جاسکے۔ نہ ہی ہم نے اپنی زبان کو روز مرّہ کی ضرورتوں کے لئے ناگزیر کیا ہے۔ انگریزی ،ہندی اور علاقائی زبانوں میں گھری ہوئی اردو زبان اور اس کا رسم الخط اپنے چاہنے والوں سے جس اجتماعی عمل کی توقع کررہا ہے وہ انھیں نصیب نہیں ہورہا ہے۔ اردو والوں کے ہاں جس شعبے میں، جس خانے میں نگاہ کیجئے ،بظاہر سب مصروف مگر سب بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو کی درس وتدریس پر گفتگو ہو تو شکایتوں کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ کیا اساتذہ اور کیا طلباء اور ان کا نصاب ، سب کچھ بے روح ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اردو ادبا، شعرا اور اردو دانشوروں نے صنف غزل کو بھی محض ایک روایت یا دیگر اصناف شاعری کی طرح صرف ایک صنف ہی سمجھا ہے۔ غزل کے ان پہلوؤں پر توجہ ہی نہیں کی گئی جو قومی یکجہتی کو بنائے رکھنے میں معاون ہوئے۔ ہماری ثقافت کی ایک بہت بڑی اور نمایاں پہچان یہی صنف غزل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو غزل پر یہ نصف صدی بہت بھاری گزری ہے۔ آزاد نظم سے نثری نظم اور یک سطری نظم کے تجربے تک، ترقی پسندی ، جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت، ہر تجربہ گاہ میں غزل ہی پر عذاب ٹوٹے ہیں، نظم کو غزل پر ترجیح اور نظم نگار شعرا کو عظیم شعرا اور ان کی شاعری کو بڑی شاعری ثابت کرنے والی تنقید ،اس پر مستزآد مغربی تعین نقد اور اس کے تناظر کے تحت غزل کو بھی دیکھا گیا جب کہ غزل اپنی ظاہری وباطنی کیفیتوں میں بالکل مختلف اور منفرد صنف سخن ہے۔ غزل پر کوئی مثبت مکالمہ ہوا ہی نہیں، کوئی مثبت کام ہی نہیں ہوا۔ الٹے سیدھے مباحث نے غزل کی مقبولیت کو کم تو نہیں کیا لیکن غزل گو شعرا کو ڈسٹرب ضرور کیا ہے، اس کے اثرات غزل کے باطن پر بھی مرتب ہوئے اور غزل معنوی سطح پر کچھ کمزور ہوئی لیکن شاید یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے کیوں کہ غزل کا کوئی بہت معیاری انتخاب بھی کہاں شائع ہوا۔ ایسے اشعار کا انتخاب بھی نہیں ہوا جو اچھی سچی، اوربڑی شاعری کی معیار بندی کرتے۔ بڑے کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین ،ان پر نئے مباحث اور نئے شعری انتخاب شائع نہیں ہورہے ہیں، غزل پر گفتگو کے ہزار پہلو ہیں، مگر کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ان پہلوئوں کو روشن کرے۔ اردو رسم الخط کی طرح اگر اردو سے غزل بھی چلی جائے تو اردو والوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں ! ہندوستان کی دیگر زبانوں میں غزل ضرور زندہ رہے گی۔ غزل پر شاعر کے اداریوں اور ادبی فیچر میں غزل پر مکالمے کو پسند کیا جارہا ہے اور ایک بار پھر غزل موضوع بحث بن رہی ہے۔ چند سال بیشتر بھی شاعر کے صفحات پر "غزل" پر نیا تنقیدی مکالمہ "قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی اور اب پھر یہ کہا جارہا ہے کہ غزل مخالفین کو اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے اور غیر ضروری طور پر ان کو شہرت مل رہی ہے جب کہ ماضی کے غزل مخالفین کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ غزل مخالف سرگرمیوں سے غزل کا کچھ نہیں بگڑا ، ترقی پسند، جدیدیت پسند یا کوئی بھی 'پسند' ہو صنف غزل موجود ہے اور موجود رہے گی۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اس بہانے ہم غزل کو موضوع بحث بناتے ہیں کیوں کہ ہمارے خیال میں بدلتے

ہونے ادبی منظر ناموں میں غزل کو سب سے پہلے موضوع کرنا چاہئے کہ اوّل وآخر کونی دوسری صنف سخن ایسی نہیں ہے جو غزل کی طرح زندہ ،محترك اور عہد به عہد سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ نظم کی دیگر اصناف کتابوں، رسالوں کے لئے ہیں۔ انہی میں وہ زندہ رہتی ہیں یا مرجاتی ہیں۔ بتائیے! غزل کا یہ وصف کسی اورصنف میں ہے؟ ۔ کمزور ترین مخالفین غزل کا انجام ہمیں معلوم ہے۔ ہم توصرف ان بے حس نقادوں، پر وفیسروں اور دانشوروں کو متوجه کرنے کی سعیٔ پیہم کرتے ہیں جو غزل مخالفین سے زیادہ خطرناك ہیں۔ غزل کو اپنا فخر نہیں کررہے، کتابی رسالی غزل سے باہرغزل کو نہیں دیکھ رہے ہیں۔

غزل، اردو زبان کی روح ہے، غزل سیکولرزم کا ایندھن ہے۔ غزل زندگی کا لافانی نغمه ہے۔ غزل، دنیا کی جدید زبان ہے جسے ہر شخص به آسانی بول سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے۔ (الف ۔ الف)

اردو غزل، نصاب، اساتذہ اور طلباء

حور سد حیات

"شاعر" ستمبر ۹۹ء کا شمارہ ملا، پڑھا اور کئی مرتبہ پڑھا کہ یہاں اردو کے رسائل نہیں کے برابر آتے ہیں۔ آپ کے "جرعات" نے اپنی طرف متوجہ کیا اور ساتھ ہی میرے قلم کو متحرک بھی! آپ کے قلم سے نکلنے تمام لفظ بول رہے تھے، اور پڑھنے والے / سننے والے کے ذہن میں ایک تحریک جنم لے رہی تھی جو مچھلیوں کو ندیوں کے خلاف ورغلا رہی تھی۔

"اردو غزل ،نصاب ،اساتذہ اور طلباء"۔....

آپ لفظوں کو زبان کیوں عطا کرتے ہیں؟ لفظوں میں روح کیوں پھونکتے ہیں۔؟؟

۱۹۳۰ء / سیماب اکبر آبادی پھر اعجاز صدیقی سے لے کر آج اکیسویں صدی کے آس پاس، ناظر ،افتخار، حامد تک "شاعر" کا ایک لمبا سفر۔ سفر اور مسلسل سفر کہ سفر زندگی کی علامت ہے، اور منزل؟؟ ۱۹۳۰ء سے لے کر آج بیسویں صدی کے اواخر تک، شاعر کے تمام شماروں کو پڑھ جایئے۔ اگر ادبی سماج کے پاس وقت نہیں ہے تو وہ روبرو ہو صرف اداریوں سے۔ ایک ایک لفظ، کیا کہہ رہے ہیں کیا بول رہے تھے اور ہم نے کیا نوٹس لیا۔ کیا ادبی سماج، سیماب + اعجاز صدیقی = افتخار + کے ہر لفظ / جملے / اداریے / کو پڑھنے کے بعد ہمارا ادبی سماج، ANALYTICAL PROCESS سے گذرا؟

کتابوں سے ہمارا رشتہ ختم ہوتا جارہا ہے اور انسانوں سے، شاید انسانوں سے بھی؟

سچ تو یہ ہے کہ VISUAL MEDIA نے کتابوں سے قاری کو چھین لیا ہے۔ چھین لیا ہے ہمارا کلچر، ہماری تہذیب، ہماری پہچان، ہمارا سب کچھ... آج ہر ہفتہ کا ہر دن، ٹی،وی، کے پروگراموں سے جانا جاتا ہے۔ آدھی رات تک بچے جاگ رہے ہیں، زی ٹی وی، اسٹار ٹی وی، سونی، دوردرشن اور نہ جانے کون کون سے درشن ننگا پن پروس رہے ہیں۔ ان کے پاس عوام کو اپنی طرف کھینچنے کیلئے جیسے اور کچھ نہ ہو، کوئی مسائل باقی نہ رہ گئے ہوں۔ حل ہو گئے ہوں جیسے سارے مسائل۔ ترقی کی رفتار بڑھی ہے۔ مگر انسان کی رفتار / اردو سماج کی رفتار!!!

ہم سب اتنے آگے چلے آئے ہیں کہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں رہی اور اگر کوئی پیچھے کی طرف دیکھتا بھی ہے تو اسے سب کچھ دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ ہماری تہذیب، ہمارا کلچر سب کچھ نقطہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جسے ہم تھکاوٹ کے ان لمحوں میں دیکھ لیتے ہیں جب ہمیں لگتا ہے کہ زندگی کچھ دیر کے لئے ہم سے دور چلی گئی ہے۔ کیا کہیں ہم زندگی کو، فرصت نہیں اپنے کاروبار سے۔ ہم سب زندگی کی کڑوی سچائیوں کو پانی کی طرح پی رہے ہیں۔ جی رہے ہیں ایک اپاہج کی طرح۔ اب آیئے آپ کے جرعات کی طرف۔

".....غزل ہمارے نصابوں میں، ہمارے اساتذہ اور طلباء کے درمیان اب کن حالات سے گذررہی ہے؟ اور یہ کہ غزل کا جو ورثه ہے نئی نسل اس ورثے سے کس طور اور کس قدر استفادہ کررہی ہے.....اساتذہ خود غزل کے بارے میں کتنا شعور رکھتے ہیں ....." (الف الف)

آج اردو ادب کا طالب علم جو بہار کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم،اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کررہا ہے۔ میر، نظیر، غالب، اقبال، شاد، اکبر جمیل ... کے آگے کسی کو نہیں جانتا۔ ریلوے میں آنے کے بعد شہر شہر گھوما ہوں۔ سروے کیا ہے سبھی کے تحریری جواب میرے پاس موجود ہیں۔ آپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اردو کے ایک لکچرر سے جب میں نے قرۃالعین حیدر کے بارے میں سوال پوچھا تو انہوں نے کہا۔ "وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ بیگم اختر نے ان کی کئی غزلیں گائی ہیں۔" میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔ آج اردو ادب کا طالب علم ادبی رسائل میں خاتون مشرق، پاکیزہ آنچل... کا نام لیتا ہے۔ پٹنہ کے ایک کالج کی بی اے اردو آنرس کی طالبہ نے تو ادبی رسائل کا نام میر اور غالب بھی لکھ دیا ہے۔ میرے پاس تحریری ثبوت ہے "کوہسار (بھاگل پور)" میں میں نے ایک بار اس مسئلے کو اٹھایا تھا۔ مگر کیا ہوا؟

سعیدی۔ کیفی اعظمی، مظہر امام سے لے کر خورشید اکبر، عالم خورشید تک کی نسل شامل ہو؟□ کیا کسی بھی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو ایسا ہے جہاں کم سے کم ہر دور کے شعراء کے بارے میں بتایا/پڑھایا جاتا ہو۔□ کوئی یونیورسٹی ایسی ہے جہاں تنقید میں حالی سے لے کر کلیم الدین احمد تک اور کلیم سے شمس الرحمان فاروقی اور فاروقی کے بعد نظام صدیقی تک کو پڑھایا جاتا ہو۔□ کیا اردو کا ایسا نصاب تیار کیا گیا ہے جہاں پریم چند سے لے کر غیاث احمد گدی اور انور عظیم تک سلام بن رزاق اور شوکت حیات سے لے کر عبدالصمد، انور خان، مشرف عالم ذوقی، نورالحسنین تک کی نسل کو پڑھایا جاتا ہو۔ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں مگر ابھی تک غالب اقبال، پریم چند، حالی شبلی، سرسید وغیرہ سے آگے نہیں جاسکے ہیں۔□ کیا ہم آج اردو ادب کے طالب علم کو آج کا اردو ادب/ اکیسویں صدی کا ادب پڑھا رہے ہیں؟ اگر ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں تو یاد رکھئے اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ ہم آنے والی نسل کو کیا دے رہے ہیں۔ آنے والے کل میں یہی اردو کے لیکچرر بنیں گے اور پھر تیار ہوگی جاہلوں کی ایک اور فوج۔

بیسویں صدی ختم پر ہے۔ ۲۱ رویں صدی دستک دے رہی ہے۔ ہمارے ادبی سرمایے پر اردو کے طلباء کی کتنی نگاہ ہے؟ بھیڑ چلی جارہی ہے تیز دھوپ میں بارش میں۔ اور نتیجہ؟

آنے والے دنوں میں اردو کے ادبی رسائل/کہانیوں کا مجموعہ/غزلوں کا مجموعہ/تنقیدی/تحقیقی مضامین/ڈرامے پڑھنے والا کون؟؟ ۲۱ رویں صدی میں اردو ادب کدھر؟؟؟

ہم اردو کے نام لیوا کہے جاتے ہیں۔ لیکن اردو پڑھنے والوں کی ایک بڑی "منڈی" ادبی رسائل سے یا تو لاعلم ہے یا پھر ادبی رسائل کو خاموشی سے دفن کر دیتی ہے۔ ادبی رسائل نکلتے ہیں، بند ہوتے ہیں۔ یہ ادبی رسائل کیوں بند ہو جاتے ہیں۔؟؟ ادبی رسائل کو سرکاری اشتہار نہیں کے برابر ملتے ہیں۔ ادبی رسائل ہم خرید کر نہیں پڑھتے۔ مختلف صوبوں میں اردو اکادمیاں کیا کر رہی ہیں؟؟ کتاب، تحریک، الفاظ، جواز، نشانات اور نہ جانے کتنے ادبی رسائل نے دم توڑ دیا۔ شاعر۔ شب خون اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ افتخار اور فاروقی کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ یہ لوگ گھاٹے کی تجارت میں کیوں لگے ہوئے ہیں۔ شاید اپنی زبان کو / اپنی ادبی روایت کو زندہ رکھنے کی خاطر! مگر ان کے بعد؟ افتخار اور فاروقی کے بعد؟

آیئے ہم ان سب سوالوں کا جواب سوالیہ نشان کے نیچے لگے نقطے میں تلاش کریں۔

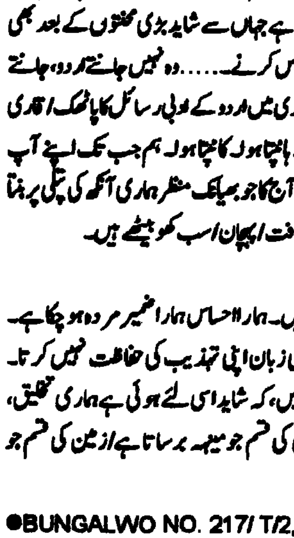
بھائی میرے! آپ کس کس سے کہیں گے اردو سماج سے/ہندی سماج سے (کہ راشٹر بھاشا کی حالت بھی ٹھیک نہیں، البتہ انگریزی خوب بڑھ رہی ہے)

صورت حال یہ ہے کہ ہر فرد ایک سے زائد چہروں کا مالک ہے اور قول و فعل میں بڑا تضاد ہے۔ جو نام آوری کا خواہاں تو ہے۔ عوام کے درمیان مقبولیت تو چاہتا ہے مگر اردو زبان کے لئے خون جگر تو دور کی بات، اپنے پسینہ کی ایک بوند بھی ٹپکانے کو تیار نہیں۔ شاید اس لئے کہ یہ وہ اوسر اور بنجر کھیتی ہے جہاں سے شاید بڑی محنتوں کے بعد بھی کچھ نہ مل پائے۔ یا زیادہ توقع نہیں ملنے کی۔ اکیسویں صدی کے بچے نہیں جاتے مدرسے، جاتے ہیں کلب ڈانس سیکھنے/ میوزک کلاس کرنے..... وہ نہیں جانتے اردو، جانتے ہیں انگریزی اور تھوڑا بہت ہندی بس۔ راشٹر بھاشا ہندی بولنے پر بھی سزا ملتی ہے انہیں انگریزی میڈیم اسکولوں میں۔ اکیسویں صدی میں اردو کے ادبی رسائل کا پاٹھک/قاری کون؟ خود تخلیق کاروں کا سماج؟ آج کے آدمی نے اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ وہ تو بھاگا جارہا ہے۔ ہانپتا ہوا کانپتا ہوا۔ ہم جب تک اپنے آپ کو نہیں پہچانیں گے۔ تب تک دنیا، سماج کو بدل ڈالنے کا خواب کبھی حقیقت نہیں بنے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کی پرواہ کسی کو نہیں۔ آج کا جو بھیانک منظر ہماری آنکھ کی پتلی پر بنتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آج کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں اور آنے والے کل کی سوچ رہے ہیں۔ جب کہ اپنی تہذیب/ثقافت/پہچان/سب کھو بیٹھے ہیں۔

ماضی/حال/مستقبل ــــ مستقبل تاریک!

کیونکہ ہم سب زندہ لاشیں ہیں۔ جن کے ہاتھ میں قلم تو ہے لیکن ان کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ ہمارا احساس ہمارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے دھرم پر نہیں چلتا لیکن دھرم کے نام پر لڑتا ہے، زبان کے نام پر نفرتیں ضرور تقسیم کرتا ہے۔ مگر اپنی زبان اپنی تہذیب کی حفاظت نہیں کرتا۔ سکھاتا ہے انگریزی / بھیجتا ہے کلب/سکھاتا ہے میوزک/ڈانس، کہ شاید یہی ہے ہماری پہچان، کہ شاید اسی لئے بھیجا گیا ہے ہمیں، کہ شاید اسی لئے ہوئی ہے ہماری تخلیق، کہ شاید..... لہر لہر، سمندر/لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں/پھیلتی ہیں/اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں/لوٹ جاتی ہیں/آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے/زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہے/مجھے اگر جاننا چاہتے ہو، تو ایک سمندر بن جاؤ/پھیل جاؤ میری لہروں کی طرح/میری لہروں کی طرح......

●BUNGALWO NO. 217/ T/2, BUNGALWO YARD BILASPUR-495004(M.P.)



ایک نثری خط۔ ستیہ پال آنند کے نام

احسان آوارہ

آپ کا منظوم خط۔ افتخار امام کے نام نظر نواز ہوا۔ آپ پھر وہی رونا لے کر بیٹھ گئے۔! "تم نے تو بس غزلیں کہیں۔ اور یہ نہ سوچا کہ، اس خود مست صنف شعر سے آگے، بہت کچھ ہے۔ "مرے صاحب آپ کو آج کے سائنسی دور میں اس خود مست صنف سے آگے جانے سے کس نے روکا ہے۔ آپ ضرور ستاروں سے آگے چلے جائیں۔ اور وہاں اس نام نہاد شاعری میں جس قدر تجربات، تخلیقی بھوت اتارنے کے لئے ممکن ہوں، کریں۔ اگر وہ تجربات ٹکاؤ ہوں گے تو یقیناً ٹکیں گے۔ ورنہ شکست وریخت کا شکار ہو کر معدوم ہو جائیں گے۔ لیکن براہ کرم غزل کو اس کے

[illegible]

تعجب ہوتا ہے کہ آپ ایسے اہل علم جن کے ذہن بھی کھلے ہوئے ہیں اور سوچ بھی وسیع تر ہے۔ غریب غزل کو۔ "مدتوں پہلے عرب میں یا عجم میں/اپنے وقتوں کے تعلق سے تراشے تھے/ سخن کے بت تراشوں.... آزروں نے..." قرار دے کر ایک فرسودہ صنف سمجھتے ہوئے اسے قابل گردن زدنی کیوں تصور کرتے ہیں؟ اسے آگے کے راستوں میں حائل کیوں سمجھتے ہیں؟ اس صنف نے تو کبھی آپ کے تجربات کی شکایت نہیں کی جب کہ آپ اور آپ کی طرح کی سوچ کے، اپنی ذات کی اکائی میں بند حضرات۔ نرگسیت کا شکار ہو کر کسی بھی خوبصورت چہرے کو کبھی برداشت کرنے کے روادار نہیں ہوتے، کیوں؟

دیکھیے حضور! انسان ایک ایسی اکائی ہے کہ جس کے ہزار رنگ ہیں۔ اور مور پنکھی سوچ ہے۔ اس کی زندگی کے حالات اور ماحول بھی الگ اور مختلف ہیں۔ ان کی بدلتی ہوئی صورتیں بھی مختلف شیڈس اور نوعیت کی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جب تخلیق کی جانب رجوع ہوتا ہے تو اس کی حسیات اور اس کے خارجی ماحول کے اثرات اس کی تخلیقات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ خود بھی تخلیق کی تہہ میں چھپا رہتا ہے۔ اس کی پسند اور ناپسند بھی وہاں موجود ہوتی ہے۔ پھر وہ چونکہ معاشرے کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق، اس کے خیالات کا ذریعۂ اظہار معاشرے میں موجود دوسرے لوگوں کے درمیان ایک مکالمے کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اور اپنے خیالات، مشترک ذریعۂ اظہار کے توسط سے لوگوں تک پہنچا رہا ہے تو جس صنف میں وہ یہ کام کر رہا ہے وہی صنف زندہ رہے گی کیونکہ وہ تخلیق کار اور سامع/ قاری کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔ اب یہ صنف چاہے غزل ہو یا غزل سے آگے آنے والی کوئی اور صنف اسے نئی، زندہ اور متحرک صنف قبول کرنا پڑے گا۔ اور اس زندہ حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جناب! غزل آپ سے پوچھتی ہے کہ انسان کی سرشت میں کیا ردم۔ لے۔ تال۔ نغمگی۔ غنائیت کا جز اس کی شخصیت کے توازن کی خاطر نہیں شامل ہے؟ کیا وہ ایک غیر جذباتی، بے حس ذی روح ہے؟ کیا وہ اپنے جذباتی اتار چڑھاؤ کے تحت خوشی وانبساط یا غم و رنج کا احساس نہیں کرتا؟ وہ ان احساسات سے کیا متاثر نہیں ہوتا؟ کیا وہ ایسی بے حس ذات کی اکائی میں بند ہو کر اپنی ہی طرح کے دوسرے انسانوں سے الگ رہ کر کسی ماورائی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے؟۔ یقیناً نہیں۔ کیونکہ وہ انسان ہے۔ اور انسانی سرشت جذبات سے عبارت ہے۔ محترم! ذرا تصور کریں کہ اوّل اوّل ابن آدم نے اپنی بے ربط آواز سے اگر کچھ تخلیق کیا تھا تو وہ بھی جذبات تھے۔ جس میں اس کی آواز کے ساتھ ہاتھوں کی حرکت اور چہرے کے تاثرات کا زیادہ اہم رول تھا۔ اس نے بے ربط زبان میں خوشی کے عالم میں جذبات کا اظہار بھی کیا۔ تب ہی تو دیکھیے مذاہب عالم کے سارے احکامات اسی قسم کی "شاعری" کی متوازی صنف میں اترے تھے۔ کیونکہ انسان کی سرشت سے مطابقت رکھتے تھے۔ اور اس کے دل و دماغ کو اثر انداز کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ جن کی انسانوں نے صدیوں تک قرأت کی، انہیں گایا۔ اور ان ہی کو ماڈل بنا کر اپنی زبان کی شاعری کو جنم دیا۔ جس میں اس نے اپنے عظیم کارناموں کی تشہیر کی اپنی تہذیبی اقدار کا اظہار کیا۔ اس عمل میں عرب و عجم کسی ایک علاقے کا حوالہ بے معنی اور کم نگاہی ہو گی۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں کلاسکی اصناف کی کوئی اہمیت نہیں۔ ویدوں کی زبان، ان کے رچاؤ پر آپ کی نگاہ نہیں گئی؟ ان مقدس کتب اور ان کی زبانوں سے پیدا "اپ بھرنشوں" کے تحت مختلف بولیوں کی "تانکہ پردھان" شاعری کا بھی آپ کو احساس نہیں۔ عوامی لوک گیتوں کا بھی آپ کو بودھ نہیں جو آج بھی اپنے اصلی روپ میں زندہ ہیں اور امر ہیں۔ ان سے آگے بھی لوگ ستاروں تک چلے گئے لیکن ان شہ پاروں کی کلاسیکیت پر حرف نہیں آیا۔ اور نہ آئے گا۔ اس لئے کہ وہ انسانی سرشت کی نزدیک تر کی تخلیقات تھیں۔ اس لئے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ غزل سے خائف ہیں، مگر دوہوں سے کیوں نہیں ڈرتے۔ غزل سے گھبرانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ کو نہیں معلوم کہ ترجمہ کرنے والے کو دو مختلف زبانوں کی دوہری سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے پڑتے ہیں۔ دو گھوڑوں کی لگامیں تھامنی پڑتی ہیں۔ تخلیقی ترجمہ کرنے کے لئے بڑی محنت اور ریاضت کے علاوہ دو زبانوں کی مکمل واقفیت کے ساتھ صبر و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو آج کے مادی دور میں بے حد دشوار عمل ہے۔ آپ غزل کو غزل کے روپ میں دوسری غیر ملکی زبانوں کے سامنے پیش کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ جب کہ وہ آپ کی جڑ ہے۔ آپ اس سے جڑے بغیر اگ نہیں سکتے تھے۔ آپ مستقبل کی شاعری کی سمجھ اور سوچ لے کر نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اسی کے ذریعہ سے آپ آگے کی شاعری کے متعلق سوچنے کے قابل ہوئے ہیں۔ آپ کو آگے جانے کا اوراک اسی غزل اور اس کی روایت نے اور اس کے ماحول نے عطا کیا ہے۔ غزل سے آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ غزل آپ کے معروضی اور بے بنیاد الزامات کے گھیرے سے بہت دور جا چکی ہے۔ آپ زماں و مکاں کو دیکھے پرکھے بغیر ماضی کو مستقبل کے ترازو میں تول رہے ہیں اور آپ کے باٹ بھی نئے اور نامانوس ہیں جن کی اس جنس کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

حضرت! آپ نے۔ "بزرگوں کے وہ گر از بر کئے ہوں (یا نہیں)۔ "" جو شعر کہنے میں معاون تھے" لیکن یہ یاد رکھیں کہ غزل ان گروں کی محتاج نہیں کیونکہ گر بذات خود بس توازن ہے، شعر کا متن نہیں، شعر تخلیق کار کی جدت ہے اور جدت گر کی طابع نہیں ہوتی۔ تال۔ سر۔ لے۔ ردم اور غنائیت ہی گروں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ شعر کا موا د نہیں؟ سوال یہ ہے کہ آپ کی ذہنی نشو و نما اور آپ کی ذات میں کتنی شعریت، تال۔ ردم۔ لے اور غنائیت پنہاں ہے؟ وہ جس قدر لطیف ہو گی، جس قدر طاقت ور ہو گی، جس قدر اس میں تخلیقی قوت ہو گی، اسی قدر توازن کے ساتھ آپ کے ذہن سے شہ پارہ نکل کر صفحہ قرطاس پر ابھرے گا۔ اور غزل کے فارم میں قاری/ سامع کے دل میں اتر جائے گا۔ سچ بتایئے کہ امریکہ یا کناڈا میں آپ نے کتنی غزلوں کی کیسٹس سنے ہیں؟ اور اپنے شعری ذوق کو تسکین دی ہے؟

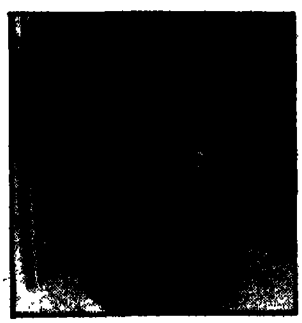
ہر زبان کے ادب کی ہر صنف نے وقت کے ساتھ تبدیلی کو قبول کیا ہے۔ یہی ارتقا کی صورت ہے۔ اور غزل نے ہر تبدیلی کا ساتھ دیا ہے۔ غزل قدیم سے آج تک بدلتی چلی آ رہی ہے۔ اب آپ کو "مرد محبوبوں سے استعاروں کی زبان میں بات کرنے کا ہنر سیکھنے [کی ضرورت]" نہیں [کیونکہ امریکہ میں ہم جنسی کی مکمل آزادی ہے] کیونکہ غزل اب "تانیک پردھان" نہیں بلکہ دو طرفہ مکالمہ ہے اور اس میں کہیں بھی جنسی گھٹن کا احساس نہیں۔ وہ اس سے بہت آگے نکل کر نئے نئے افق تلاش

کررہی ہے۔

محترم! کیا آپ چاہتے ہیں کہ غزل میں پوشیدہ اس کلاسیکی نغمگیت کے عنصر کو قتل کر دیا جائے۔ جو دنیا کی کسی صنف میں موجود نہیں یا کم کم ہے۔ تاکہ وہ آپ کے بے روح تجربات سے آگے نہ نکل سکے۔ تب آپ غزل کی مخالفت سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ آپ تجربات ضرور کریں۔ لیکن غزل کو ہدف نہ بنائیں۔ اس لئے کہ غزل نے کبھی آپ کے تجربات پر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ غزل ہی نے نظم کو کتب ورسائل سے باہر نکال کر کسی حد تک عوام میں نہ سہی، خواص کی زبانوں تک ضرور پہنچایا ہے۔ وہ خواص جو غزل کے شیدائی ہیں لیکن رس بھری نظمیں بھی پڑھنا، سننا اور سنانا چاہتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے گا اور اپنے ذہن کو بہت صاف شفاف کر کے سوچئے گا کہ غزل نہ ہوتی تو آپ کہاں ہوتے؟ آپ نے تو عظیم پابند نظمیہ شاعری کی روایت کو بھی کچھ نہیں سمجھا اور نظم کے زوال میں معاون ہوئے۔ غزل کے ساتھ اردو کی عظیم پابند نظمیہ شاعری میں اصناف کا تنوع اور اس کے تحت جو شاعری ہوئی ہے، وہ غیر معمولی ہے، جدید نظم سے موازنہ کر لیجئے۔ بہر حال! آپ نظم تخلیق کیجئے، اپنے ڈھب کی نظمیں کہتے رہیے، خوب کہیے، ادبی رسائل کا پیٹ بھرتے رہیے، صنف غزل آپ یا آپ کی قبیل کے شعراسے قطعی خوف زدہ نہیں۔ آپ کے ہم عصروں اور آپ کے پیش رو نظم نگاروں نے غزل کا کیا بگاڑ لیا۔ ن۔ م۔ راشد، میراجی، اخترالایمان، مجید امجد اور ایسے ہی کئی نام ہیں جو نظم کے اچھے شعرا میں سے ہیں۔ ان لوگوں سے غزل کو اور غزل کو ان لوگوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تو آپ غزل سے اتنے خائف کیوں ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ محض آپ کا ایک جاندار حربہ ہو شہرتوں کے حصول کا کیونکہ آپ غزل کی مخالفت نہ کرتے اور رسالہ شاعر میں آپ پر گوشہ شائع نہ ہوتا تو شاید آپ آج ہند و پاک کے چھوٹے بڑے ادبی رسائل میں اتنے نمایاں نہ ہوتے۔ گوشے کی اشاعت کے بعد شاعر میں شائع ہونے والے خطوط آپ کی یادداشت میں محفوظ ہوں گے۔ آج آپ اور آپ کی شاعری جو کچھ ہے، اس کے لئے بھی غزل ہی کو دعا دیجئے اور اس کا شکریہ ادا کیجئے۔ اور اگر آپ اب بھی بضد ہیں اور غزل کی مخالفت کو اپنا احساس کمتری سمجھے ہوئے ہیں اور غزل کو کٹہرے میں کھڑا ہی کرنا ہے تو آج کی غزل کے خلاف عوامی عدالت میں چارج شیٹ پیش کیجئے اور نتیجہ دیکھ لیجئے۔ نیاز کیش غزل کا حامی۔ ایک غیر شاعر۔

●CHHAONI, BANDHA- 210001(U.P)

غزل: شاعری، اکتساب اور......



کاوسی عباسی

نومبر ۹۹ کا "شاعر" ملا، کچھ پڑھ لیا ہے۔ جو پڑھا ہے لطف آگیا ہے۔ خاص طور پر، بشیر بدر کا مضمون "فیض صاحب کی غزل" نہایت وقیع و تازہ کار ہے۔ یہ بحث تو ہمیشہ ہی ہوتی رہے گی کہ کسی بھی عصر کی غزل میں ماضی کا کیا اور کتنا حصہ شامل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ کسی بھی زمانے میں، کون سے ڈکشن اور مضمون والی غزل باقی رہے گی اور کون سی، زمیں برد ہو جائے گی۔ لیکن، ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر بشیر بدر "غزل کی سادگی" کے لئے "پیغمبرانہ معصومیت کی بصیرت" مستعار لیتے ہیں تو کیا "پیغمبرانہ معصومیت کی بصیرت" بھی "ماضی کا ایک نام نہیں"۔ (ہمارے پیغمبر، خاتم النبیین، حضرت محمدؐ رسول اللہ، چودہ سو سال پہلے، آخری پیغمبر تھے)۔ تو کیا فیض صاحب دو تین سو سال پہلے شعر و ادب کے استعارے اور الفاظ اپنی غزل کے لئے مستعار نہیں لے سکتے؟۔ ایک مزید سوال: یہ کہ صرف فیض نہیں، بلکہ پاکستان، ہندوستان میں، آنے والے قریب و بعید زمانوں میں، اگر، سماج کو بدلنے کے لئے، ظالم و مظلوم طبقوں کے افراد کے درمیان، کوئی سماجی، سیاسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، جن میں شامل لوگوں کا وہی انبوہ ہوتا ہے جس کا ذکر بشیر بدر نے، اپنے مضمون میں کئی بار کیا ہے، تو جو شعرا ان تحریکوں میں مظلوم لوگوں کے ساتھ شامل ہوں گے، کیا وہ ظلم اور ظلم کے خلاف جدوجہد کے معاملات کے شعری اظہار کے لئے علامتیں، استعارے اور انداز بیان، اپنے ماضی کے ورثے سے، متعلق اور مشابہہ ہونے کی شرط پر، مستعار نہیں لے سکتے؟ کیا ان حالات کا حصہ بنے ہوئے شعراء کا ایسے اشعار ع جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری (ساحر) یا:

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں — چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم (فیض)
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے — فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم (فیض)
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا (مجاز)
ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب — ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے (ظہیر کاشمیری)

کہہ اٹھنا، "دیوانگی کی سازش" ہوگا، ان کا جائز بجواز شعری اظہار نہیں ہوگا۔ یعنی کیا ان شعراء کا وجدان، تخلیقی ذہن، ان حالات میں ایسے اشعار (کی تخلیق) کی طرف، فطرتاً، نہیں جائے گا؟ اور کیا، اس حالت میں بھی، ان شعرا کو محض بشیر بدر کی طرح اور ان کی نسیم محبت کی طرح لائٹ ویٹ (ہلکا پھلکا) ہو کر یا ایک ملازم صفت محبتی خواستگار ہو کر رہ جانا ہی پسند کرتے رہنا چاہئے۔ اور کیا ماضی سے صرف بشیر بدر "روح میں بسائے ہوئے نرم نرم جھونکے" "نسیم محبت کے، ہی اپنے سینے میں مستعار لے سکتے ہیں؟!۔ ہاں یہ الگ بحث ہے کہ فیض نے ماضی سے جو کچھ مستعار لیا، اس سے انہوں نے صرف میٹھی میٹھی دردمندی کا رنگ ہی کیوں وضع کیا۔ (فارسی اور اردو کے اتنے بڑے، عظیم اور مکمل شعری ورثے سے اکتساب کو، ایک گہری، ہزار رنگ باطنی، کاٹ دار اور کائناتی تحرک اور وژن پیدا کر دینے والی آواز تراشنے میں کیوں نہیں استعمال کیا۔[جس کی کوہ قامت مثالیں اردو کے کلاسیک ماضی میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اردو کلاسیک کا یہ وقیع، ٹھوس اور شاندار پہلو دریافت کرنے میں، سب سے زیادہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کریڈٹ اور احسان، شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے کام "شعر شور انگیز" کی چار جلدوں کو جاتا ہے۔ جس کے لئے اردو شاعری کے آنے

والے زمانے ان کے ممنون رہیں گے]۔ سو یہ بحث تو مختلف زاویوں سے ہمیشہ ہی ہوتی رہے گی۔ بشیر بدر نے بھی ایک بات، ایک زاویے سے کی ہے۔ لیکن بشیر بدر کے مضمون کا یہ سوالیہ پہلو نہایت اہم ہے کہ آیا ہمارے نئے زمانے سے فیض کی آواز کا تعلق موجود ہے یا معدوم ہو گیا ہے۔ جیسے میں نے اوپر لکھا ہے، ہمارے نئے زمانے میں میٹھی میٹھی دردمندی یا "نرم نرم جھونکے" صرف حالوی گلیوں، محلوں میں، متوسط درجے کے آف وائٹ سفید پوش ڈرائنگ روموں میں نشستہ، باندھی، کسی آنکھوں میں اور تقلیدی گھڑوں پر ہی اپنا مسکن بنا سکیں گے۔ ہمارے نئے زمانے کا mainstream تو ٹھوس اور متنوع اساس رکھنے والی، ایک گہری کاٹ دار اور کائناتی تحرک اور وژن پیدا کر دینے والی آواز ہی بن سکے گی۔ [میٹھی دردمندی اور روح کے نرم نرم جھونکے، جہاں جہاں ان کا وجود حقیقی ہے، وہ اس آواز کا لازمی حیاتیاتی حصہ ہیں لیکن vice versa قابل اطلاق نہیں ہے]۔

شعراء اور تخلیقی شعر کے بارے میں مذکورہ بالا بیان کی طرح شعر سننے، پڑھنے والوں میں بھی، آج، اگر لوگ نسیم محبت کے ان نرم نرم جھونکوں میں مست ہیں، جو انہیں بشیر بدر کی شاعری میں ہلکورے لیتے دیتے ہوئے، قرار واقعی طور پر، مہیا ہو جاتے ہیں تو کل یہی لوگ تحریکوں اور اتھل پتھل کے انقلابی، مواج زمانوں میں، اپنے اور اپنے ہیروز کے ہیروازم کے بیان داستان کے لئے، جدل اور یدہ کے لفظیات کی تلاش و کشش میں، ماضی کے دار و رسن، قید و سلاسل، قفس و صیاد کی طرف بھی جا سکتے ہیں اور چلے جائیں گے۔ کیا ایسے تحریکی و ادبی ادوار ہماری یاد نیا بھر کی اقوام کی تاریخ سے، ادبی لحاظ سے، کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ یا بالعکس، کیا ان تحریکی و ادبی ادوار کو، وقت کی پرکھی ہوئی اقوام اپنے سنہری ادوار نہیں کہتیں؟!۔ اور پھر جس طرح ہندوستان میں آج کل کے گلی بازاروں، قصبوں، شہروں میں ملی جلی شکلوں سے تشکیل پذیر ہونے والی اردو زبان کا ذکر بشیر بدر نے اپنے مضمون میں کیا ہے وہ بھی کیا، کچھ "ماضی کا ایک نام" نہیں؟۔ یاد کیجئے فلم 'غالب' میں، اس گلی کے فقیر کو جو غالب کی غزل گاتا پھر رہا ہوتا ہے۔ ایسے واقعات کا حوالہ، ادبی تحریروں میں بھی، ماضی میں غزلوں کی مقبولیت کے سلسلے میں دیا جاتا ہے۔ یعنی گلی کوچوں میں فقیر کی غزلیہ آواز اور دیگر ملی جلی آوازیں تک معاملہ تو بشیر بدر پسند فرماتے ہیں لیکن اگر انہی گلی کوچوں کے کچھ، قدرت کے عطایافتہ شاعر لوگ، کچھ زیادہ پڑھ لکھ کر، غزل کے شعروں کو، اپنے ادبی ورثے اور اظہار کو، کچھ اور زیادہ intellectualise کر دیں تو بشیر بدر رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔

"ترقی پسندوں" میں اگر کوئی زیادہ پڑھ لکھ نہیں جاتا تو وہ مجروح صاحب کی طرح پوری تکریم و تحفظ کے ساتھ ہم نشین بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی نے کچھ زیادہ پڑھ لکھ کر کچھ زیادہ علم و تعلیم (مغرب کی زبانوں میں) حاصل کر کے اپنے وژن کو متنوع اور کشش، اور گہرائی دے دی تو وہ ہمہ وقت کٹہرے میں لا کھڑا کیا جاتا ہے کہیں یہ بھی "شخصیت کی منصوبہ سازی" تو نہیں۔ اگر بشیر بدر صاحب ایم، اے، وغیرہ نہ ہو جاتے، صرف آٹھویں، دسویں، بارہویں پاس رہتے تو یونیورسٹی پروفیسر کا اعزاز جو انہیں اتنا عزیز ہے اور جس نے انہیں اتنا نکھارا ہے، انہیں کبھی نہ ملتا۔

اس مضمون کے سلسلے میں، بشیر بدر صاحب سے ایک درخواست اور بھی ہے کہ اردو غزل کو دوبارہ اعلیٰ فکر و جدان کے شایان شان بنانے کے لئے، اردو شاعری میں، ناصر کاظمی جیسے آسانی اظہار والے، میڈ ازی ٹائپ انداز غزل کا بھی کوئی توڑ بیان کریں۔ خیر اگر وہ کوئی توڑ، اس انداز غزل کا، بیان نہیں بھی کریں گے تو یہ کام ہم لوگ اور ہمارا زمانہ، خود ہی کر لیں گے اور شاید کر بھی رہے ہیں۔

بشیر بدر صاحب کو اچھے مضمون پر ایک بار اور داد و مبارکباد۔ ورنہ مشاعروں میں اسٹیج پر اپنی نثری باتوں میں تو وہ ہلکی پھلکی، چٹکی، چٹنے، خوش کرنے والی باتوں (دوسروں کو اور پھر خود کو) کے لئے ہی مشہور ہیں۔ اچھے مضمون کی مبارکباد پر یاد آیا۔ شاعر کے ایک پچھلے شمارے میں جناب ریاض صدیقی کا مابعد جدیدیت کے تاریخی عالمی طبقاتی کردار پر ایک نہایت اہم اور گراں قدر مضمون چھپا تھا۔ جس کے لئے وہ اور آپ بہت داد و مبارکباد کے مستحق ہیں۔

P.O.BOX NO 8060, RIYADH- 11482 (K.S.A.)

بقیہ صفحہ ۱۲: چھاجوں برستا پانی

تو پڑتا ہی ہے بیٹی.... شہزادی بھی جھومتی رہی.... اور حب کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ایک دن ایک شہزادہ اس کے جنگل میں آنکلا۔"

"مگر پھوپھی کیا شہزادی نے کپکپا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیئے۔ اور جن کے شہزادے آکر چلے گئے؟"

"امید بنائے رکھنے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے بیٹی؟ اسی کے سہارے زندگی تو بیت جاتی ہے!"

پھوپھی کی آواز میں بہت جبر کے ان گنت موسموں کی ویرانی شامل تھی۔ پھوپھی کو بیس برسوں بعد شاید ان کا اپنا آپ یاد آ گیا.... چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات....

وہ بھی تو بادشاہ کی ساتویں بیٹی تھیں مگر ان کے اندھیرے جنگل میں آج تک کوئی شہزادہ نہیں آیا۔

"پھوپھی۔ کیا آپ نے کبھی کوئی لو نہیں لگائی؟ کوئی انتظار نہیں کیا؟"

"بیٹی۔ تیری تو زندگی پڑی ہے۔" وہ اس وقت احتساب اسمر کی پھوپھی نہیں تھیں.... گھائل کی گت گھائل جانے!

"ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" اسے ساس کا جملہ یاد آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"جنگل کی اندھیری رات میں شہزادے ایک ہی مرتبہ کیوں آتے ہیں پھوپھی؟"

"بیٹی۔ ہم ہی دروازہ بند کر دیتے ہیں!"

شباہت نے ایک مرتبہ پھر تڑپ کر پھوپھی کو دیکھا اور بیک وقت دو کیفیتوں میں گھر گئی۔ پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتی سرسراتی ٹیس، درد.... صدیوں پر محیط نا قابل عبور دیوار پھاند لینے کی تمنا.... کوئی ہے؟ کہیں کوئی ہے؟ جو اس کا انگوٹھا چوس لے؟ غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم.... اس نے ہڑبڑا کر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیا۔

اور حب اچانک ایک عجیب سی خواہش نے سر اٹھایا.... "کاش وہ راکھی ہوتی!"

وہ پور پور کٹ کر اپنے اندر اندر گر رہی تھی.... اور ادھر پھوپھی اپنے کٹے پھٹے ٹکڑے ٹکڑے وجود کو چن رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں.... حاصل تو کچھ بھی نہیں.... وہی چھاجوں برستا پانی....؟

اور شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا.... وہی جنگل کی اندھیری رات!

شہزادی جنگل کی اندھیری ... جھومتی ... مرگی ...

دشمن کی زبان میں

شکیل جمالی

ان دنوں نظم کا پرچار زوروں پر ہے۔ غزل کو کئی زاویوں سے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ نظم کے حامیوں کو بہتر شاعری کے تمام امکانات صرف نظم میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے مطابق بدلتے سماجی ماحول اور نئی صورتحال میں غزل Out dated ہو گئی ہے۔ یہ سارا پرچار غزل دشمنی کی منصوبہ بند سازش کے تحت ہے۔ ہم نے کبھی نظم کے لئے بددعا نہیں کی۔ ہم نظم کے مخالف نہیں لیکن غزل کے گلے پر چھری پھیر کر نظم کی زندگی اور اس کی صحت کے لئے دعا نہیں کر سکتے۔ ہمیں نظم بھی چاہئے مگر غزل کے فوراً بعد۔ غزل کو رد کئے بغیر نظم کے نفاذ پر اصرار کرنے والوں کا ساتھ دیا جاسکتا ہے۔

غزل میں سب کی کہاں حسرتیں نکلتی ہیں
صلاحیت ہو تو گنجائشیں نکلتی ہیں (شکیل جمالی)

(۱)

نظم کے وکیلوں سے
ایک بات کہنی ہے
بس غزل ہی رہنی ہے

(۲)

اے غزل کے محاذوں پہ
ہارے ہوئے بد نصیبو!
سنو!!
جب تمہارے لرزتے ہوئے
سرد ہاتھوں میں
ہتھیار تک ڈالنے کیلئے
کچھ نہیں ہے
تو پھر
کیا غزل
اور کیا نظم
سب شغل بے کار ہے
کیوں یہ تکرار ہے
ہر طرف ہار ہے

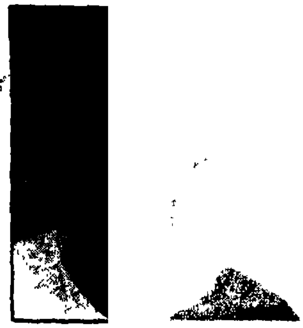
(۳)

زمانہ گزرا
غزل کو
عورت کی شکل دیکھے
زمانہ گزرا
کسی کی راہوں میں پھول پھینکے
زمانہ گزرا
شراب خانے کے پاس پھٹکے
غزل کے تقوے کو عمر گزری!
سسکتی انسانیت ہے شاہد
غزل مسائل کا آئینہ ہے
غزل ضرورت ہے زندگی کی
غزل بڑوں کا مشاہدہ ہے
تمہی بتاؤ!
غزل پہ پھر کیوں
پرائی عورت سے
بات کرنے کی تہمتیں ہیں
غزل کے تقوے کو عمر گزری!!

(۴)

غزل کے دامن کی تنگیوں کے
تمام شکوے
فضول ٹھہرے،
غزل میں گنجائشیں نہ ہونے کی
سب دلیلیں
سراب نکلیں،
غزل میں موجودہ زندگی کے
بیاں کی وقت بھی
جھوٹ نکلی
مرے عزیزو!
صلاحیت ہو تو زندگی کا
کوئی بھی موضوع
کوئی گوشہ
کسی طرح اُن کہا نہیں ہے
غزل سے کچھ بھی بچا نہیں ہے

●TEACHERS COLONY,
SARAI RAFI,
CHANDPUR-246725 (U.P.)



حسین الحق
SIR SYED COLONY,
NEW KAIM GANJ, GAYA- (BIHAR)

چھاجوں برستا پانی

افسانہ

شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا اور پھوپھی بچوں میں محو تھیں..... چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.....!

"پھوپھی۔ اب سو جائیے.... سب لوگ سو چکے"

"ارے بٹی میں بخت ماری تو کب کی سو چکی ہوتی' پر بچے سونے دیں تب نا!"

"پھوپھی" شباہت آہستہ سے بولی۔ "سب بچے سو چکے"

"ایں؟" پھوپھی نے چونک کر بچوں کو دیکھا اور خود ہی ہنس دیں۔ "مت تیرا برا ہو' میری بھی مت ماری گئی"

پھر پھوپھی نے لحاف سر تک کھینچ لیا.... شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور تک پتہ نہ تھا

اس نے گھڑی دیکھی دس بج چکے تھے، دسمبر کی آخری تاریخوں کی کٹ کٹاتی سردیاں اور اس پر بارش کا زور، شباہت نے کان لگائے۔ چاروں طرف برف آلود ہواؤں کی سائیں سائیں اور زور دار بارش، بجلی اور گرج کے ساتھ .... اس نے ہمت کر کے ذرا سی کھڑکی کھولی: باہر چاروں طرف دور دور تک چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.... اس نے پھوپھی کی طرف دیکھا' وہ نیند میں رو رہی تھیں.... شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا۔ شباہت نے بڑبڑا کر کھڑکی بند کر دی اور لحاف کے اندر گڑ مڑا کر دہری ہو گئی۔ خوف کی ایک تیز لہر اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگی تھی۔ پتہ نہیں نیند میں رونے والے کے اندر سے جو دوسرا آدمی نکل آتا ہے اس کی کیا جون ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر کے بے خیال ہونا چاہا تو پھوپھی کی آواز سنائی دی: چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اور پھر تمام رات وہ سو نہ سکی۔

ذرا سا نیند کا ایک جھونکا آتا اور پھر جیسے چونک کر وہ جاگ پڑتی۔ رات بھر بھیانک خواب اسے پریشان کرتے رہے.... ایک سجی سجائی دلہن۔ ایک لاش کے پاس.... پھر اس لاش اور سجی سنوری دلہن کے چاروں طرف آگ کے بلند شعلے.... وہ چونک کر جاگ پڑتی۔ درود پڑھ کر اپنے کو دم کرتی۔ اُٹھ کر بچوں کو دیکھتی پھر ہواؤں پر کان لگاتی ہوئی چھاجوں برستا پانی.... پھر کسی طرح سونے کی کوشش کرتی.... نیند کا ایک جھونکا .... آگ میں گھری دلہن کا چہرہ.... پانچ برس کی معصوم بچی' بے تحاشا مار کھاتے ہوئے اور روتے ہوئے.... لبنان میں اپنے ماں باپ بھائی بہن کی بمباری میں جلی لاشوں کے پاس بیٹھا اک معصوم .... چیچنیا اور انگشتیا کی سرحد پر یخ بناتی سردیوں میں ٹھٹھرتی بے سہارا عورت .... سجی سنوری دلہن لاش کے پاس.... خموش.... S.O.S.... S.O.S !

ساری رات وہ سوتی رہی اور جاگتی رہی.... وہی چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

شباہت کبھی اپنے بارے میں سوچتی کبھی اس کے بارے میں۔ درد ایک ایسا جھرنا بن چکا تھا جس کا پانی ہوا کے جھونکوں سے چاروں طرف جھوم جھوم کر گرتا ہے.... اسے پھر وہ یاد آئی.... راگنی، اس کی دوست .... اور خود شباہت.... دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا.... ایک ساتھ میٹرک سے بی اے تک.... اور اب؟

اس کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے.... کیسا تڑپ کر راگنی نے اسے دیکھا تھا۔ جیسے ڈوبنے والا آخری مرتبہ پانی کی سطح سے دنیا کو دیکھتا ہے؟

"انکل.... پلیز اس کو بچا لیجئے" شباہت روتے ہوئے راگنی کے باپ کے پیروں پر گر گئی تھی۔

"بٹی، پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے" راگنی کے باپ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں مگر آواز بالکل سپاٹ تھی

"مگر اس کا قصور کیا ہے؟"

"پرمپرا کی بھی قسمت ہوتی ہے۔ تم خوش قسمت ہو بٹی"۔

وہ انکل کے کندھے سے لگ کر سسک سسک کر رو پڑی، سوال پرمپرا کا تھا.... سب کچھ اس کے سامنے ہوا۔

راگنی کا شوہر راگنی کو بہت چاہتا تھا۔ انتم سمے میں باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "راگنی کو ستی کرایا گیا تو میری آتما بے چین رہے گی".... مگر سوال بیٹے کی آتما کے بھٹکنے کا نہیں تھا.... سوال پرمپرا کا تھا۔ شباہت نے ری ایکٹ کیا تو راگنی کے پتا جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا: بٹی تم مہمان ہو تم چپ رہو میں یہ برداشت نہیں کر پاؤں گا کہ یہاں کوئی بھی تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی کرے"۔

کبوتر حسرت۔۔ دکھتا رہ جاتا ۔ اور چلا ...

چھاجوں برستاپانی اور جنگل کی اندھیری رات!

ساری رات اسی عالم میں گزری، جانے وہ کب سوئی کب جاگی۔

یہ اس رات کی واردات تھی جس رات راگنی نے عام معمولی لڑکی سے ستی ماتا تک کا سفر کیا۔

جو کچھ ہوا وہ شباہت کے لئے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے نہیں کہ راگنی اس کی دوست تھی بلکہ اس لئے کہ کچھ دن پہلے، یہی دکھ اسے بھی دکھی کر چکا تھا۔ راگنی والا حادثہ اس کی "عدت" ختم ہونے کے ٹھیک دسویں دن ہوا اور وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

"کاش راگنی شباہت ہوتی!"

اس سمے اس کے اندر ایک بہت منہ زور خواہش نے سر اٹھایا تھا مگر وقت تو اس کے ہاتھوں سے پہلے ہی پھسل چکا تھا.... اور پھر اس کے شوہر کی وصیت.... اصل دھوکا تو اس کی وصیت سے ہوا' وہ مطمئن ہو گئی مگر اس کا کسے پتہ تھا کہ معاملہ شوہر بیوی کا نہیں سماج اور پرمپرا کا ہوتا ہے۔

ایسی ہی الٹ پٹی سوچوں میں دن پر دن بیتتے رہے، ہر رات بچوں کی ضد پر پھوپھی شروع کرتیں.... چھاجوں برستاپانی اور جنگل کی اندھیری رات اور ہر رات شباہت کی نیند اچٹ جاتی اور ہر دن الٹ پٹی سوچوں میں بیت جاتا۔

اور پھر کئی جاگتی راتوں اور سلگتی دوپہروں کے بعد ایک صبح عجیب سی بات ہو گئی۔ اس کا دیور انتخاب احمد بغیر پکارے اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ کسی کے کمرے میں کوئی صبح سویرے بغیر پکارے نہیں جایا کرتا۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا! ارے تم بغیر پکارے کیسے چلے آئے۔"

"آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں؟" انتخاب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"یعنی شخصی آزادی کے لئے ضد کا ہونا ضروری ہے؟" اس کے من میں ایک عجیب سے سوال نے سر اٹھایا

اس روز تمام دن وہ بے چین رہی اور انتخاب کا جملہ بار بار یاد آتا رہا: "آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں"

اور اس رات مہینوں بعد پہلی مرتبہ اس کا دھیان اپنی دیورانیوں کے کمروں کی طرف گیا.... ان کے کمروں سے سرگوشیاں ابھر رہی تھیں.... بیچ بیچ میں بھینچی بھینچی ہنسی.... دسمبر کی سرد رات میں اسے شدید گرمی کا احساس ہوا۔ ایسا لگا اس کے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں یا جیسے کسی نے دونوں کانوں کی لوئیں پکڑ کر زور سے مسل دی ہوں۔ اس نے ہڑبڑا کر لحاف بدن پر سے پرے پھینک دیا اور تبھی پھوپھی کی آواز کی بازگشت سنائی دی.... چھاجوں برستاپانی اور جنگل کی اندھیری رات! اس کا جی چاہا کہ وہ پھوپھی سے پوچھے.... مگر تبھی اسے یاد آیا کہ پھوپھی سو رہی ہیں۔

پھوپھی گہری نیند سوتی رہیں اور وہ جاگتی رہی اور رات رات بھر الٹ پٹے خواب اسے پریشان کرتے رہے.... زندگی کے وہ سہانے دن جو انتساب احمد کے ساتھ بیت گئے لپ جھپ کرتے آتے رہے اور جاتے رہے اور ایک عجیب سارومانی مجون مسلسل اس کے چاروں اور جھوم جھوم کر برستا رہا.... اٹھارہویں برس اس کی شادی ہوئی اور چوبیسویں برس وہ بیوہ ہو گئی.... ان چھ برسوں میں انتساب احمد نے اسے ٹوٹ ٹوٹ کر پیار کیا۔ دونوں کے پیار کی نشانی اس کے بچے سامنے پلنگ پر سوئے تھے اور وہ جاگ رہی تھی۔

شباہت کیوں جاگتی رہتی ہے؟ آخر اس کا مسئلہ کیا ہے؟ انتساب احمد کے والدین نے اسے اپنے مرحوم کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گھر میں جیسا دوسرے کھاتے ویسا ہی وہ کھاتی جیسا دوسرے پہنتے ویسا ہی پہنتی جن اسکولوں میں دوسرے بھائیوں کے بچے پڑھتے انہی میں اس کے بچے بھی پڑھتے۔ جس کمرے میں وہ انتساب کے ساتھ رہتی تھی اسی میں انتساب کے بعد بھی رہی۔ سسرال اور میکہ دونوں جگہ سے ایک خاص رقم اسے ہر ماہ مل جاتی اور کوئی پلٹ کر اس کا حساب نہ پوچھتا۔ پھر وہ پریشان کیوں ہے؟ پھر وہ پریشان کیوں ہے؟ رات رات بھر کیوں جاگتی رہتی ہے؟ اس کی دھلی دھلی ہر صبح کسی نہ کسی طرح میلی کیوں ہو جاتی ہے؟

شباہت کے پاس سوال تو ہے مگر جواب نہیں.... اسے نہیں معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہو ہی جاتا ہے!

اب اسی دن: پہلی جنوری کی صبح.... انتساب کے بعد کا وہ نواں دسواں مہینہ تھا.... سب نے اٹھتے ہی ہر سال کی طرح ایک دوسرے کو مبارک باد تو نہ دی مگر دس بجتے بجتے دیورانیاں اپنے اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ پکنک پر ضرور روانہ ہو گئیں نہ انہیں کسی نے روکا نہ شباہت سے کسی نے کہا۔ مگر بچے تو جا سکتے تھے۔

کیا صرف عورت ہی نہیں بچوں کے لئے بھی پورے گھر کی ضرورت ہے؟

اچانک اس کے اندر ایک بڑے ہی منہ زور اور سرکش جذبے نے سر اٹھایا۔ اس نے بچوں کو تیار کیا اور خود بھی تیار ہو کر جب کمرے سے باہر آئی تو ساس نے بڑی حیرت سے پوچھا: "کہاں جا رہی ہو بیٹی؟"

"آج پہلی جنوری ہے امی۔ بچوں کو ذرا گھما لاؤں۔"

"نہ بیٹی نہ"۔ ساس نے بڑی نرمی محبت اور آہستگی سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا.... "اچھا نہیں لگتا بیٹی"

"مگر عدت تو پوری ہو چکی۔"

"ہاں بیٹی۔ مگر سال ڈیڑھ سال تک، ہم لوگوں کے یہاں یہ سب اچھا نہیں سمجھا جاتا"

"پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے بیٹی۔" راگنی کے پتاجی کی آواز آئی۔

شباہت ایسے تڑپی جیسے کسی نے زنگ آلود تلوار الٹی طرف سے اس کے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی ہو.... پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتی اور سر مارتی ٹیسیں، درد.... اس نے بیتاب ہو کر صدیوں پر محیط ناقابل عبور دیوار پھاندنے کی تمنا کی.... کوئی ہے؟.... کہیں کوئی ہے؟؟

اس لمحے میں اسے راگنی بہت یاد آئی اور پھر اس کے پتاجی.... پر میرا کی بھی قسمت ہوتی ہے، تم خوش قسمت ہو بیٹی، ہم لوگ اس سلسلے میں بدقسمت ہیں.... اس نے جھپاکر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ جانے کیوں اسے شبہ ہو گیا کہ انکل اس کی تڑپ دیکھ رہے ہیں.... اس نے البم میں سے راگنی کی تصویر نکالی اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر البم بند کرتے ہوئے سوچا.... "اب دو ٹوک فیصلہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔"

اور پھر یک بارگی بہت سی کسمسیں اور شامیں اس پر حملہ آور ہو گئیں۔

احتساب احمد کے انتقال کے بعد سارے فیصلے تو دوسروں نے کر ڈالے.... مگر اس سے پوچھا بھی جاتا تو وہ کیا کر لیتی؟ بیوہ ہونے کے بعد لڑکی کی وراثت و کفالت ماں باپ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ کیا اسے بھی میکے لوٹ جانا چاہئے تھا۔ لیکن ماں باپ کتنے دن تک؟ ماں باپ کے بعد بھائی بھوجائی کا رویہ صحیح رہے۔ اس کی کیا ضمانت؟ تو گویا اس کو سسرال ہی میں رہنا چاہئے؟ مگر سسرال میں اس کا کیا ہے؟ اس کا نہ سہی بچوں کا تو آخر یہی گھر ہے؟ مگر بچے تو مجوب ہو چکے؟ لیکن اگر دادا کے گھر سے بھی دور ہو گئے تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟ مگر یہاں رہے تو ان کی حیثیت؟

سوال چاروں طرف بکھرے پڑے تھے مگر جواب کا کہیں پتہ نہ تھا

وہ اپنے آپ کو مسلسل اندر اندر کاٹتی رہی۔

اس درمیان خبر ملی کے شائستہ باجی کی شادی ہو گئی۔

شائستہ باجی شباہت سے چھ سال بڑی تھیں۔ یہ خبر سن کر اچانک ایک عجیب سے خیال نے سر اٹھایا۔ شائستہ باجی کی شادی تیس برس کی عمر میں ہوئی..... میں ابھی چوبیس برس کی ہوں.... اور پھر فوراً ہی اندر سے جیسے کانپ سی گئی.... عجیب قسم کا بدن پر گندگی لگ جانے کا احساس یا غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم.... اس لمحے میں اس کا اپنا آپ بھی اس کا غیر بن گیا.... چھی.... یہ میں نے کیسے سوچ لیا؟.... مگر سوچ پہ کس کا اختیار؟

بعد کے دنوں میں بھی شائستہ باجی اسے کئی بار یاد آئیں مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ شائستہ باجی کی خبر کے بعد بھی تو ابا اماں کو وہ یاد نہیں آئی.... احتساب احمد کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ موضوع گفتگو بنی.... دونوں سدھیوں اور سدھنوں نے گفتگو کی.... ابا اماں کو اپنی عزت پیاری اور ساس سسر کو اپنے بیٹے کی خریدی چیز سینت کر اور بچا کر رکھنے کی فکر!

وہ سسرال میں ہاتھوں ہاتھ رکھی گئی اور میکے والے اطمینان کی سانس لے کر جو روانہ ہوئے تو پھر نہ لوٹے۔

امان امور۔ ، باور کو بھیجو کہ ساون آیاری.... بابا تو آئے لیکن اسے لئے بنا چلے گئے.... اے کوس گئی اماں دوئے کوس گئی میں، پردہ اٹھائی کے دیکھا، نیروا بڑی دور.... نیروا بڑی دور.... اکبر کی جواں لاش پہ بیوہ کا وہ رونا.... چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اس رات اس نے خواب دیکھا:

کشتیاں سمندری طوفان کی زد میں۔ ایک کشتی کچھ ہی دیر بعد الٹ گئی اور سمندری تھپیڑوں کی نذر ہو کر غرقاب ہو گئی.... مگر دوسری کشتی بھنور میں گھری ڈوبتی رہی ابھرتی.... ابھرتی رہی ڈوبتی رہی۔ اس نے خواب ہی میں بے تاب ہو کر سوچا۔ اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے.... مگر کشتی کی عجیب قسمت۔ بھنور میں گھری چکر پہ چکر کھاتی رہی اور طوفان کا زور بڑھتا رہا.... کشتی اور بھنور.... بھنور اور کشتی

وہ چیخ کر جاگ پڑی.... اس کی چیخ سن کر پھوپھی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں.... کیا ہوا بٹی؟ کیا ہوا؟ وہ کیا جواب دیتی۔ وہ تو ابھی تک خواب کے سحر میں گرفتار تھی.... اور پھوپھی.... احتساب احمد کی پھوپھی.... جنہیں شباہت کی تنہائی کے خیال سے اس کے کمرے میں سلایا جاتا تھا۔ اپنا زمانہ یاد کر کے کپکپا گئیں۔ اور تب اسی آسیب زدہ حالت میں شباہت نے پھوپھی کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا.... وہ کہانی پوری سنائیے.... چھاجوں برستا پانی...."

"بٹی بہت رات ہو چکی۔ آج سو جاؤ کل سنا دوں گی"

"نہیں پھوپھی"۔ وہ پھٹی پھٹی آواز میں تقریباً چیخ پڑی.... "آج سنائیے... ابھی سنائیے"

"اچھا اچھا سناتی ہوں۔ دھیر دھرو دھیرج سے بیٹھو۔" پھوپھی نے گھبرا کر کہنا شروع کیا.... سو تا سنسار جاگتا پاک پروردگار، سات سمندر پار ایک بادشاہ تھا اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ ایک رات کھانا کھاتے ہوئے بادشاہ نے بیٹیوں سے پوچھا "تم سب کس کا دیا کھاتی ہو؟" چھ نے کہا: "آپ کا دیا"۔ مگر ساتویں نے کہا: "خدا کا دیا"

بادشاہ ساتویں بیٹی کے جواب پر خفا ہوا اور اس اندھیری رات ہی میں اسے جنگل میں پھنکوا دیا۔ جب بادشاہ کے کارندے اسے جنگل میں چھوڑ کر آ رہے تھے تو جھما جھم بارش شروع ہو چکی تھی.... ساتویں بیٹی نے اپنے چاروں طرف دیکھا.... چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات.... پھر مدتوں اس جنگل میں سورج نہیں نکلا۔ چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی...."

"مگر پھوپھی"۔ شباہت نے بے چین ہو کر بیچ میں ٹوکا دیا: کب تک یہ پانی چھاجوں برستا رہے گا اور کب تک وہ لڑکی جنگل کی اندھیری رات سے جھوجھتی رہے گی؟

"بٹی.... صبر صبر۔" پھوپھی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔ "بیچ میں مت بولو۔ جنگل کی اندھیری رات جس کی تقدیر بنتی ہے اسے جھوجھنا



باقر مھدی

میرا پہلا اور آخری خط
(غنی بھائی کے نام)

برسوں سے ہم تم تھے مگر دور رہے!
پہچان کی اک حد نہ نکلے ہر گز
خوش رنگ لباسوں میں نہاں رہتی تھیں
م بھی قریب آ کے چھپا رہتا تھا
بھی۔ شامیں گزرتی تھیں دبے قدموں سے!

نے ہم کو سرِ راہ کہاں پکڑا ہے؟
جھ یاد نہیں۔ صرف نشاں باقی ہے!
تم سے شناسا ہیں مگر۔ کچھ بھی نہیں!
ہوتی ہے الفاظ بھی ٹکراتے ہیں
معنی کا شرارہ نہیں اڑتا کوئی
ہی رہتا ہے انداز بدل جاتے ہیں
رہتی ہے مگر۔ ساز بدل جاتے ہیں
چلتے ہوئے ہم راز بدل جاتے ہیں

●E-1, RAVI DARSHAN, OFF CA
ROAD, BANDRA BOMBAY

علی احمد جلیلی

یہ رشتے کب چھپانے سے چھپے ہیں
ترے چہرے پہ ہم لکھے ہوئے ہیں

نہ روکو آنے دو ان حادثوں کو
یہ میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

مکیں خاموش ہیں جن بستیوں کے
وہاں جلتے ہوئے گھر بولتے ہیں

گل و شبنم کی تھی جن میں لطافت
بدن وہ آنچ اب دینے لگے ہیں

لہو تو آنکھ سے ٹپکا ہے میری
ترے دامن پہ کیوں چھینٹے پڑے ہیں

انہیں کہہ دو کہ زندہ ہوں ابھی میں
جو میری لاش کو دفنا چکے ہیں

علی یہ لوگ ہیں کن بستیوں کے
کہ قاتل کو دعائیں دے رہے ہیں

●22-1-733/1, SULTANPURA
HYDERABAD-500024 (A.P)

مظفر احمد ضیاء

منظر سے دور تجھ کو ترا خواب لے گیا
"آنکھیں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا"

دے کر نگاہ ناز سے ترغیب سر خوشی
ہاتھوں سے میرے جام مئے ناب لے گیا

ہوش و خرد تھے حجت باہم میں مبتلا
الزام اپنے سر دلِ بے تاب لے گیا

اک انقلاب وقت نے مفلس کیا ہمیں
تہذیب زندگی کے سب آداب لے گیا

بے برگ و بار شاخ سے اک زاغ نغمہ جو
ساحل پہ تھی جو ماہیِ بے آب لے گیا

بزم غزل میں کوئی فرشتۂ اجل کا تھا
ہمراہ میر و غالب و سیماب لے گیا

ہے کہکشاں بھی ماند مری چشم نم کے ساتھ
ساری ہی روشنی مرا مہتاب لے گیا

تھا خوف موت کا جو اسے ہر گھڑی ضیاء
آب بقا کے جام سے کچھ آب لے گیا

●1745-A, W-ROBIN LANE HIFF MAW
ESTATE, IL 60194 (U.S.A)



وارث علوی

SAYED WARA, ASTODIA
AHMADABAD- 380001

ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے

پچھلے پچاس سال میں جدید اور علامتی اور اسطوری اور حقیقت پسند لیبلوں کے تحت جو افسانے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان پر ہمارے ملک کی اس مخصوص صورت حال کا اثر بہت گہرا ہے جو بھرشٹاچار سے بھری ہوئی پُر تشدد خوں چکاں فرقہ پرست اور دن بہ دن نراج کی طرف بڑھتی ہوئی سیاست سے عبارت ہے۔ ناول تو بے دریغ طور پر صحافیانہ بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے دوسری زبانوں پر بھی اس صورت حال کا اثر پڑا ہے۔ لیکن اتنا شدید اور ہمہ گیر بھی نہیں جتنا کہ اردو میں نظر آتا ہے۔ دوسری زبانوں میں روزمرہ کی سیاست اور صحافت سے الگ دو جدید میں بدلتے ہوئے انسانی تعلقات نفسیاتی اور اخلاقی مسائل، انفرادی عزائم شخصی احساسات اور ذاتی آرزومندیوں اور محرومیوں کے موضوعات اس طرح عنقا نہیں ہوئے جیسے کہ اردو میں ہوئے ہیں۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلمان جس دور ابتلا سے گذرے ہیں اس میں زندگی کی سلامتی اور تحفظ ذات کا مسئلہ تمام مسائل پر حاوی ہو گیا ہے۔ دوسرے مسائل ہیں، اندرونی تضادات اور تصادمات بھی ہیں۔ درد کے ان گنت نازک مقامات بھی ہیں لیکن وہ سب کے سب ایک اندوہ ناک صورت حال میں تخلیقی طور پر غیر اہم بن گئے ہیں۔ یہ وبا کس قدر پھیلی ہوئی ہے اس کی عبرت ناک مثال سریندر پرکاش جیسا خلاق افسانہ نگار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ملک اور ارض پاک سے ہندوؤں کی ہجرت کا الم ناک واقعہ سریندر پرکاش کے لئے اتنا دہشت ناک ثابت ہوا ہے کہ اب وہ جو بھی افسانہ لکھتے ہیں ایک ہی تھیم کا VARIATION یا اعادہ ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں چند ایسے جدید افسانوں کا ذکر کیا ہے جن کی تھیم طاقتور اور ظالم کا کمزور پر غلبہ اور ظلم ہے۔ یہی تھیم ناولوں میں بھی نظر آئے گی مثلاً اقبال مجید کے "کسی دن" سید محمد اشرف کے "نمبردار کا نیلا" اور عبدالصمد کے ناول افسانوں ایسا لگتا ہے کہ افسانہ اور ناول چاہے علامتی، تجدیدی، یا حقیقت پسندانہ ہو، تھیم اور مواد کے اعتبار سے ایک ایسی تاریک سرنگ سے گذر رہا ہے جہاں دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ کمیونسٹ آئیڈیالزم کی شکست کے بعد تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ موضوع افسانہ میں یہ یک رنگی اور تنگ دامنی فکشن کے لئے بہت ہی بدشگون ہے۔ اتنا برا کہ یہ فکشن کی موت کی علامت ہے۔

مغرب میں تو ناول کی موت کا اعلان ہو چکا تھا۔ مجھ جیسے ناول کے رسیا اس اعلان پر یقین نہیں کرتے تھے۔ میں تو آج بھی نہیں کر رہا کیونکہ مغرب میں آج بھی کچھ نہ کچھ چیزیں ایسی سامنے آتی ہے جو ناول کی زندگی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یہ بات کہ شہرزاد کے پاس کہنے کے لئے کہانیاں نہیں رہیں کم از کم اردو کی حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے۔ سر دھڑ بغیر کی کہانیاں اس بات کا ثبوت ہے کہ رات ختم ہو چکی ہے اور شہرزاد کا سر قلم ہو چکا ہے۔

میں واویلا مچانے والے اور فریاد و فغاں کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی ہمیشہ عزیز رہی ہے اور ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں تو عزیز تر بن گئی ہے۔ سوائے خرافات نویسی کے میں نے عمر عزیز کا ایک لمحہ بھی فضولیات پڑھنے پر ضائع نہیں کیا۔ وقت کا مجھے بڑا احساس رہا ہے اور سیل رواں کے ہر لمحے میں پنہاں مسرت کا پورا رس کس میں نے نچوڑا ہے، مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے جب میں چاروں طرف رسالوں کے اداریوں میں، اخبارات کے کالموں میں، مضامین میں، خطوط میں، تقریروں میں اردو زبان کی کسمپرسی، اردو اکاڈمیوں کی بدعنوانیوں، اردو تعلیم کے کبھی حل نہ ہونے والے مسائل، اردو مدرسوں کی نااہلی اور کاہلی، اردو پروفیسروں کی نا قابلیت، ڈاکٹریٹ کے مقالات کا کھوکھلا پن، شاعروں اور ادیبوں کی گروہ بندی، انعامات اور اکرامات میں دوست نوازی اور اقربا پروری، بے کیف معاصرانہ چشمک، جاہلانہ تنقیدی دار و گیر اور اسی نوع کی ان ہزاروں گھٹی ڈکاروں کی بوباس دیکھتا ہوں جو ادب کی بوڑھی کنواریوں کے باؤ گولوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ تو میں سوچتا ہوں، میں کن لوگوں میں گھر گیا ہوں، کہاں آ گیا ہوں، کیا کر رہا ہوں، یہ ادب تو نہیں ہے جو حسن و مسرت کا سرچشمہ ہے، جو فلسفہ، دانش مندی، فکر و نظر، بصیرت و بصارت، احساس کی نزاکت اور جذبے کی ملائمت کا خزینہ ہے، مجھے تلاش ہے ان ناولوں کی جن کی دنیاؤں میں کھو کر آدمی خود کو پاتا تھا، ان افسانوں کی جو نیرنگیٔ جہاں کا آئینہ ہوتے ہیں، مجھے پتہ نہیں ان پچھلے پچاس سالوں میں اردو والے کون سے ناول اور افسانے اور ڈرامے پڑھتے رہے ہیں۔ اردو والوں سے یہاں مراد وہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جن کی آج کی عمر میں ہم پریم چند، بیدی، منٹو، عصمت، کرشن چندر، بلونت سنگھ، اپیندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، عزیز احمد، غلام عباس، علی عباس حسینی، اختر حسین رائپوری، ہاجرہ اور خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کو پڑھا کرتے تھے۔

ان میں سے ہر افسانہ نگار دوسرے سے مختلف اور اس کا ہر افسانہ دوسرے افسانے سے مختلف رنگ کا ہوتا تھا۔ یہ رنگا رنگی آج کہاں غائب ہو گئی کہ لگتا ہے سب کے چہرے ایک سے ہیں اور سب باہم مل کر ایک ہی افسانہ لکھ رہے ہیں، اندرونِ خانہ بھی وہی نوحہ گری اور فریاد و فغاں ہے جو بیرونِ خانہ ہے۔ میں نے اپنی دنیا تنگ اور راستے مسدود نہیں کئے۔ میں اس گوشۂ چمن سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں جس کی ڈوب سوکھی گھاس بن چکی ہے اور بے برگ و بار درختوں پر کرگسوں کے جھنڈ ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو نقاد بننے کی خاطر گلی سڑی بوٹیوں کو بھی نوچتے رہتے ہیں۔ میرے خلاف نئے لکھنے والوں کو شکایت یہ ہے کہ میں وہ تھانیدار ہوں جو بیدی اور منٹو کے ڈنڈے سے سب کو ہانکتا رہتا ہوں۔ میرے لئے بیدی اور منٹو وہ نہیں ہیں جو محمد حسن عسکری کے لئے فراق گورکھپوری تھے۔ اوپر جن افسانہ نگاروں کے میں نے نام گنوائے ہیں ان میں میری دلچسپی آج بھی ہے اور ان میں سے کچھ پر لکھ چکا ہوں اور وقت نے ساتھ دیا تو دوسروں پر لکھوں گا۔

جب ایک باغ نغمہ سراؤں سے خالی ہو جاتا ہے تو میں دوسرے کی طرف نکل جاتا ہوں لیکن وہ لوگ کیا کرتے ہوں گے جو دوسرے پرندوں کی بولیوں کو نہیں سمجھتے۔ کیا وہ دوسری زبانوں کی ناولوں سے دل بہلاتے ہیں۔ ایک مزید سانحہ اردو پر یہ گذرا ہے کہ اکاڈمیاں، نیشنل بک ٹرسٹ اور فروغ اردو کونسل کے باوجود ہمارے یہاں دوسری زبانوں کی ناولیں اب اتنی بھی ترجمہ نہیں ہو رہی ہیں جو چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائی میں مذکورہ اداروں کی عدم موجودگی کے باوصف ہوئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چھٹی دہائی کے بعد کی نسل ناول اور افسانے پڑھنے والی نسل نہیں ہے۔ دراصل اس نسل نے پڑھنے والے نہیں لکھنے والے ہی پیدا کئے ہیں۔ ہر آدمی ادیب یا شاعر بننا چاہتا ہے۔ خراب لکھتا ہے اور خراب پڑھنے والے پیدا کرتا ہے جو پھر خراب لکھنے والے بن کر خراب پڑھنے والے پیدا کرتے ہیں۔ آج ادب عبارت ہے اسی خانہ خرابی سے۔

ناول کے تو معنی ہی ہیں ہر تخلیق کا نیا ہونا، تازہ کار اور یکتا ہونا۔ کسی ایسے تجربہ کا بیاں ہونا جو دوسری ناولوں میں نہ ہو اور اگر ہو تو بہ انداز دگر ہو، اور یہ انداز ایسا ہو کہ اس کی انفرادیت کا برہان ہو، ایسی انفرادیت جو مادام بواری کو اینا کارے نینا سے بالکل الگ قسم کا ناول بناتی ہو۔ یہ کائنات یہ زندگی 'یہ انسان' کتنی بےپایاں تخلیقی وسعتوں اور امکانات کا حامل ہے۔ انسان کے احساسات اور جذبات کی دنیا میں کسی رنگارنگ، قدرت اور انفرادیت ہے۔ انسانی تعلقات کی دنیا میں کیسا بے پناہ تنوع ہے۔ ہر فرد کے مشاہدات اور تجربات کتنے مختلف اور متنوع ہوتے ہیں۔ فطرت انسانی کیسی حیران کن بھید بھری گتھیوں کا جھمیلا ہے۔ آپ ڈور کو سلجھاتے جایئے اور وہ الجھتی جائے گی۔ ان تمام باتوں کا شعور ہمیں ناول اور افسانے ہی عطا کرتے ہیں۔ ہمارے جدید افسانے کے پاس چاہے وہ علامتی ہو یا حقیقت پسند انسانی زندگی کی دلچسپیوں کے یہ مراکز نہیں ہیں۔ خراب افسانوں کا تو یہاں ذکر ہی نہیں، اچھے افسانے بھی موضوع کی یک رنگی کا ایسا شکار ہیں کہ لگتا ہے کہ افسانہ بھی غزل کی راہ چل پڑا ہے جس کے ایک سے مضامین اور معاملات ہیں۔ ترقی پسند افسانہ، خصوصاً کرشن چندر، احمد عباس اور ان کے مدرسے کے دوسرے صحافتی لکھنے والوں کے افسانوں پر بھی یہی الزام تھا کہ وہ بھی سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، طاقتور اور کمزور کے چکر سے باہر نہیں نکل سکا۔ جدیدیت جو اس صورت حال کے خلاف ردعمل تھی بالآخر اسی کا شکار ہو گئی۔

ترقی پسندی کے برعکس جدیدیت نے موضوع کی بجائے فارم پر زور دیا اور یہ رویہ غلط نہیں تھا۔ لیکن یہ محض التباس تھا۔ فکشن کی تنقید موضوع ہی کی حلقہ بگوش رہی۔ مثلاً انور سجاد کو بلراج مینرا اور باقر مہدی نے بغیر یہ دیکھے کہ ان کے افسانوں کا فارم ناقص اور خام کار تھا اور ان کے افسانے بے روح اور بے جان تھے (جس کے سبب چند ہی برسوں میں وہ بھلا دیے گئے) اس لئے انہیں بانس پر چڑھایا کہ وہ ان کے ہم عقیدہ تھے اور ان کے یہاں سامراجیت وغیرہ وغیرہ کی تصویر پر چھپکلی کی چال ترقی پسندی کے ٹوٹتے خمار کی فریم ورک میں ٹھیک سے سما رہی تھی۔ مجھے انور سجاد کی یساریت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں نے ان کے فارم کی فنکارانہ رائیگانی اور لاغری جو اس وقت کے تمثیلی افسانوں کے ہڈ پنجروں کا مقدر تھا، کی گرفت کی تھی۔ لیکن اس وقت میرے مارکسی دوستوں کا مجھ پر الزام یہی تھا جو آج بھی ہے کہ میں غالی مخالف یساریت ہوں۔ آج انور سجاد کی یساریت خود ان کے نام کے ساتھ ایک گالی کی طرح چپکی ہوئی ہے کیونکہ برصغیر کے دونوں بدنصیب ملکوں میں جوہری دھماکوں کے بعد انور سجاد کے یہاں اسلامی عقائد ہو دین محمدی اور نظام مصطفوی کا ایسا بروز ہوا ہے کہ آب حیات سے جملہ مستعار لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ باقر مہدی چپ اور سارا ادب دم بخود ہے۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ تماشے میں نے بہت دیکھے ہیں کہ وقت کی ایک ہی موج عقائد کو خس و خاشاک کی طرح ساحل پر لگا دیتی ہے۔ آج شمس الرحمٰن فاروقی شب خون کے صفحات میں زمین کی اس کروٹ کو جذب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو جوہری دھماکے سے انور سجاد میں پیدا ہوئی ہے انور سجاد کا ڈھول پیٹنے میں فاروقی بھی آگے آگے تھے۔ ان کی دلچسپی موضوع میں نہیں فارم میں ہے لیکن فکشن کے فارم کا ان کے پاس کوئی شعور نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک بھی ناول یا افسانہ نگار پر وہ کوئی معنی خیز تنقید نہیں لکھ سکے۔ انہیں اس وقت علامتی افسانوں کے گن گانے تھے سو گائے، یہ دیکھے بغیر کہ اس مکھڑے پر یہ سہرا سجتا نہیں ہے۔ انور سجاد اپنے کہے سے مکر گئے ہیں اور فاروقی کہہ مکرنیوں کے اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے کہ تجنیس لفظی اور معنوی کے۔ انور سجاد کہہ رہے ہیں کہ ان کا مضمون طنزیہ تھا اور فاروقی صاحب سوفٹ کی غلط مثال دے کر ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگر ان کے مضمون کے طنز کو ہم بھانپ نہیں سکے ہیں تو یہ ہماری کوتاہ فہمی اور انور سجاد کا المیہ ہے۔ یہ توجہ دلا دو راست

دزدی کہ بکف چراغ دارد والا معاملہ ہے۔ ایسے کرتب سیاست میں چل سکتے ہیں، ادب میں نہیں۔ میں کیونکہ ادب میں کوئی نہ کوئی انتظار حسین بہروپ کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ انتظار حسین کے یہ جملے ملاحظہ فرمایئے۔

> "اس عزیز نے طنز اتنا گھرا دابا ھے کہ اب کوئی حافظ محمود شیرانی ایسا جیّد محقق ھی اسے کھود کر برآمد کرے تو کرے۔ پھر اسے لیباریٹری میں جلکر تجزیہ کرایا جائے۔ کہ یہ واقعی طنز ھے اور اگر ھے تو کتنا۔ خیر اب جب کہ انور سجاد نے خود ھی اس راز سے پردہ اٹھادیا ھے کہ یہ سب طنز ھے تو اب مجھے یہ پریشانی لاحق ھے کہ اس نے محمدی ریاست کا جو تصور پیش کیا ھے اور محمدیت میں جو اپنے ایمان کا اعلان کیا ھے اسے اب کس طریقہ سے سمجھا جائے۔"

ادیب جب ادیب نہیں رہتا تو اپنے صحافتی بیانات سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے۔ چند فراموش شدہ افسانے لکھ کر جب آپ ختم ہو گئے تو آپ کا کوئی بھی بیان یا انٹرویو ہو، اس میں دلچسپی محض صحافتی ہے اور اسے اس مسرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں جو ایک خوبصورت ناول یا کہانی بخشتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ایسے مباحث سوائے ذہنی تردد کے کچھ پیدا نہیں کرتے۔ انور سجاد کا ذہنی سفر ایک کٹھ ملائیت سے دوسری کٹھ ملائیت کی طرف ہے۔ ہاتھ میں عقیدے کا لوٹا لے کر تیرتھ یاتراؤں پر نکلنے والے اور نظریات کی لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والوں کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں رہی۔ یہ سب ان لوگوں کے گورکھ دھندے ہیں جن کے پاس ادب میں پیش کرنے کے لئے کوئی عمل نہیں ہوتا۔

تخلیقِ ادب کوئی میکانیکی کام نہیں ہے۔ یہاں ہر لفظ نیا طور نیا ذوق تجلّی والا معاملہ ہے۔ آپ موضوع پر زور دیں یا ہیئت پر، تجربات کے نئے جزیروں کی طرف آپ کی کشتی تخیلی کا بادباں کھولے روانہ نہیں ہوتی تو تجسس، انکشاف، سیاحت اور دریافت کی ولولہ خیزی کی بجائے مٹی ڈھونے کا میکانیکی کام کرتی ہے اور ایک ہی نوع کے افسانوں کے ڈھیر لگاتی ہے۔ آج کا اردو افسانہ اور ناول اسی میکانیکی کھٹا کھٹ میں پھنس گیا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ ویسا ہی ہوگا جیسے سماجی اور سیاسی حالات ہوں گے۔ یہاں بجائے اس کے کہ فنکار حالات سے آنکھیں چار کرنا، ان کی ترجمانی کرنا اور پھر ان سے بلند ہو کر زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرف نظر کرنا، وہ حالات سے اس قدر مغلوب ہو گیا کہ تخلیقِ فن کے بنیادی انسانی سرچشموں سے دور ہو گیا۔ وہ اس نظر کو کھو بیٹھا جو زندگی کو اپنی کلیت میں دیکھتی ہے، پوری زندگی اور پورے انسان کا مطالعہ کرتی ہے، انسانی تماشے کے المیہ اور طربیہ سبھی روپ اس کے سامنے ہوتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی اور باطنی زندگی کی ایک پوری کائنات اسے دعوتِ نظر دیتی ہے۔ قصوروار حالات نہیں بلکہ خود افسانہ نگار ہے کہ وہ کسری آدمی ہے جس کا تخیل پاپیادہ، مشاہدات سطحی، دلچسپیاں محدود، فن ناقص اور حسِ ظرافت کالعدم ہے۔ میں اس حسِ مزاح کی بات کر رہا ہوں جو انسانی تماشہ کو خندہ جبینی اور دردمندی کے ساتھ دیکھنے کے آداب سکھاتی ہے، جس کے بغیر فنکاری، زندگی کے اچھے اور برے ہر تجربہ کو قبول کرنے کی وہ اہلیت پیدا نہیں ہوتی جو اسے ایک اخلاق پسند آدمی سے مختلف بناتی ہے۔ اخلاقی آدمی تو ہر آدمی میں ہوتا ہے، لیکن فنکار تخلیقِ فن کے وقت اخلاقیات کو معلق رکھتا ہے، اور اس مقصد کے لئے اسے اپنی اخلاقی شخصیت سے گریز کرنا پڑتا ہے، جس کا فکشن میں طریقہ کار ڈرامائی تکنک ہے جو غیر شخصی آرٹ کا نہایت ہی کارگر حربہ ہے حقیقت پسند روایت کو کھو کر ہم نے تخلیقِ فن کے ان تمام امکانات کو ختم کر دیا۔

اور حالات بھی ذمہ دار ہیں، جس ملک میں ناخواندگی کی شرح ساٹھ فی صد ہو، چالیس فی صدی آبادی غریبی کی ریکھا کے نیچے جیتی ہو، توہمات، ضعیف الاعتقادی، مذہبی خبط، اور ہجوم کی نفسیات کا غلبہ ہو، قدیم و جدید رجعت و ترقی، عقلیت اور عقیدت، مشرق و مغرب کا ٹکراؤ ہو، تشدد، بھرشٹاچار، اور تہذیبی اور سیاسی انتشار ہو، سماجی استحکام، سیاسی آدرش اور اخلاقی نصب العین عنقا ہوں، وہاں آدمی شخصیت کی سالمیت کھو دیتا ہے، ریزہ ریزہ جیتا ہے، اور اپنا کوئی قرینہ حیات اور نظام جذبات مرتب نہیں کر پاتا۔ نہ پرانی دنیا مرتی ہے نہ نئی دنیا جنم لیتی ہے۔ قید و بند میں زندگی رندھتی ہے تو آزادی میں قدم زمین سے اکھڑ جاتے ہیں۔ یہ صورتحال فکشن کے لئے سازگار نہیں جو کردار کے لئے شخصیت کا ارتباط اور اقدار کے لئے ہم آہنگ اور مستحکم سوشیل اسٹرکچر کا متقاضی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم پچھلے چالیس سال میں چالیس تو کیا چار ناول اور چار افسانہ نگار بھی ایسے پیدا نہیں کر پائے جو ہماری فکشن کی پیاس کو بجھا سکیں۔ العطش العطش کے عالم میں فن کا گدلا پانی بھی سکون بخشتا ہے، لیکن جب آنکھیں کھلتی ہیں تو گدلا پانی گدلا ہی نظر آتا ہے۔ مغرب میں آج کل ہزاروں ایسے ناول لکھے جا رہے ہیں جو گڈ رائٹنگ کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم عام ہونے کے بعد سلیس، رواں اور دلآویز نثر سبھی لکھ لیتے ہیں۔ کلی شی موضوعات مثلاً فرد کی تنہائی، ذات کی شناخت، اجنبیت، آزاد جنسی تعلقات ہر کسی کے بس میں نہیں، مابعد جدیدیت میں مرکز اپنے مرکز پر قائم نہیں۔ تو اچھی لکھی ہوئی سوانح عمری، خود نوشت، سفر نامہ، یادیں، جرنلزم، کسی کنبہ یا قبیلہ کی سماجیاتی تحقیق، کسی تاریخی شہر کے فنِ تعمیر کا بیان، سب کچھ ناول کی شق میں شمار ہو سکتا ہے، ایسی چیزوں کو آپ ناول یا تی سوانح، ناولیاتی سفر نامہ، یا ناولیاتی جرنلزم کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ناول نہیں ہیں، چنانچہ میلان کنڈیرا کا کہنا ہے کہ ہر آرٹ فارم کی طرح ناول کی اپنی ایک تاریخ ہے جو عظیم فن پاروں کے ذریعے تشکیل پاتی ہے، اور ہر اچھے ناول کو اس تاریخ کے اندر ہی جنم لینا پڑتا ہے کیونکہ اس تاریخ ہی میں ہم جان سکتے ہیں کہ کون سی چیز نئی

ہے کون سی ایجاد اور اجتہاد ہے، کون سی محض تکرار یا نقل ہے۔ مختصر یہ کہ تاریخ ہی میں کوئی تخلیق بطور ایک جمالیاتی اور فنکارانہ قدر کے جیتی ہے ایک ایسی قدر جس کی ہم شناخت اور پرکھ کر سکیں اور جس پر کوئی حکم لگا سکیں۔ کسی بھی فنی تخلیق کے لئے اس سے زیادہ بدنصیبی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی صنف کی تاریخ کے باہر رہ جائے کیونکہ اس کا انجام تاریخ کے باہر پھیلی ہوئی اس انار کی تیرگی میں گم شدگی ہے جہاں جمالیاتی اقدار کا کوئی تعین نہیں ہو پاتا۔

امریکی پبلشنگ انڈسٹری کا آج کل یہ عالم ہے کہ وہ سال بہ سال پانچ ہزار ناول شائع کرتی ہے جس میں سے بقول سلمان رشدی پانچ ناول بھی فکر انگیز مکالمے کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، لیکن سب بک جاتی ہیں۔ اور ان کے پڑھنے والے بھی نکل آتے ہیں جو پوسٹ ماڈرن اور صارفی معاشرے کی پیداوار ہیں اور تکثیریت اور لامرکزیت کے زمانے میں پاپ سنگیت اور ٹی وی سیریلوں کی طرح ناولوں کو بھوگنے اور فراموش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایسی ناولیں تاریخ کے باہر انار کی کے آسمان پر جلتے بجھتے ستاروں کی طرح گردش کرتی رہتی ہیں۔ ان پر کسی پائدار اور معنی خیز نقد و فکر کے نظام کی تعمیر ممکن نہیں۔ آج کا معاشرہ اس معاشرے سے بہت مختلف ہے جس کے لئے ناول ایک فلسفیانہ ذہنی سرگرمی تھا۔ ہمارے یہاں آزادی کے بعد اردو ناول کے جائزوں میں آپ کو کم از کم سو ناولوں کے نام مل جائیں گے اور چونکہ جائزہ نویس نقاد نہیں ہوتے لہٰذا ہر ناول کی تعریف کسی نیلام کرنے والے کی طرح کرتے نظر آئیں گے۔ ان میں پانچ دس ایسے ناول بھی نکل آئیں گے جن کی تعریف میں ہمارے مقتدر نقاد بھی رطب اللسان ہوں گے۔ ان جائزوں اور تبصروں کے باہر ان ناولوں نے اپنے قاری پیدا نہیں کئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا معاشرہ ناول پڑھنے والوں کا معاشرہ نہیں رہا۔ ناول کو ہم پانی کی طرح نہیں پیتے، پیپسی کولا کی طرح پیتے ہیں جو کارخانوں میں تیار ہوتا ہے، اشتہاروں کے زور پر بکتا ہے اور وہ تسکین نہیں دیتا جو انسان کی فطرت میں پڑی ہوئی کہانی اور کتھا کی ازلی پیاس کو پانی کے ذریعے بجھانے سے حاصل ہوتی ہے۔

میں ناول پڑھنے والا آدمی ہوں اور اسی لئے بہت معمولی آدمی ہوں۔ یہ تو اتفاق سے قلم چل گیا ورنہ پوری عمر ناول پڑھنے میں گذر جاتی اور جب جنازہ اٹھتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ ایک اور نامراد دنیا سے گیا، اور کوئی جان بھی نہ پاتا کہ ناول کے سبب کیسی سرسبز و شاداب، پر بہار و پر مسرت زندگی خاکسار نے گزاری۔ جدید افسانے کے خلاف میرا ردِّ عمل نظریاتی یا ادبی نہیں تھا، نہ ہی یہ مذاق سلیم کا معاملہ تھا۔ یہ ردِّ عمل تو حیاتیاتی تھا، ناول کا ہونا نہ ہونا تو میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔

اگر ہرے بھرے درخت کٹ جاتے ہیں، وادیاں خشک ہو جاتی ہیں، جھرنوں کا پانی زنگ آلود ہو جاتا ہے، تو اس کی فکر انہیں نہیں ہوتی جو نئی صنعتیں یا صنعت گری کو قائم کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس ماحولیاتی آلودگی سے وہ جانور بہت پریشان ہوتے ہیں جن کی زندگی کی چلچلاتی دوپہریں ناول کی گھنی جھاڑیوں میں گذری ہیں۔ ایسے جانور یا تو مر جاتے ہیں یا دوسری زبانوں کے خطوں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں جنگل ابھی سلامت ہیں۔

میرے کچھ خواب نہ سہی۔ کچھ خوف ضرور ہیں، مجھے خوف آتا ہے اس وقت سے جب مجھے ایسی دنیا میں جینا پڑے جہاں پڑھنے کے لئے ناول نہ ہوں۔ مجھے ہول آتا ہے اردو فکشن کے جدید منظر نامے کو دیکھ کر جس میں نظریات کی پلاسٹک کی تھلیاں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور ایک لنڈ منڈ درخت پر افسانہ اپنی بے بال و پری پر دریافت پر نوحہ کناں ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نمونوں کے طور پر جن ناولوں کے نام لئے جاتے ہیں وہ تو پیاسے کو حنظل پلاتا ہے اور ان خاردار بدرنگ جھاڑیوں پر نظر اسی لئے جاتی ہے کہ ان کا ہونا کسی چیز کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔□□

بقیہ صفحہ ۲۵ : ٹی وی

یہ وہی مسکراہٹ تھی جو ایک ماں کے چہرے پر ہوتی ہے جب اس کا بیٹا اپنی نویاہتا کو گھر لاتا ہے۔ بیٹے کو ہاتھ سے کھو دینے اور بہت کچھ حاصل کر لینے کی خوشی کا امتزاج۔

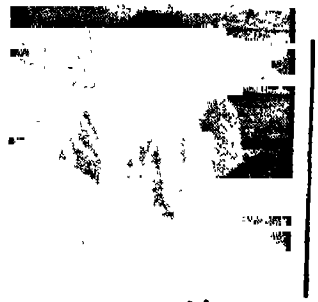
"آج تو تمہاری شادی کی خوشی میں ٹوسٹ کرنا چاہئے"

مونے شمپین کا گلاس اٹھایا اور میں نے بھی

"مجھے علم تھا کہ تمہیں ایک نہ ایک دن کوئی گشتی "مل جائے گی جو تمہیں مجھ سے جدا کر دے گی"

میری ہنسی چھوٹ گئی وہ بھی ہنسنے لگا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے

۔ مجھے پہلی بار اس کا ٹی وی ہونا اچھا لگا۔□□



مرتضیٰ خان

روشنی!!

ہندو دھرم اور ہندوتو!!
دونوں کا آپس میں سمبندھ نہیں

ہندو دھرم ہزاروں سال پہلے پھیلا
جو جیو اور جینے دو کا سبق ہے سکھلاتا

ہندوتو! بالکل سیاسی ہے!!
مذہب کے استعمال کی پالیسی ہے

آج دھرم کا تعلق بالکل ذاتی ہے
یہ دھرم کلچر کے پیڑ کی پاتی ہے!!

کلچر کے رنگوں میں دھرم ہیں پگھلے
جو سورج کی کرن سمان
گھل مل ہو گئے ایک سمان

سورج جب بھی ابھر تا ہے
میری کھڑکی سے اس کی پہلی کرن
جو ہندو ہے نہ مسلمان ہے
میرے چہرہ کو چومتی ہے
میرا چہرہ جوان ہے

کیا تم سورج کو قتل کرو گے
کیا تم کرنوں کو قید کرو گے
تم کتنا من میں اندھیارا پھیلاؤ گے
تم کتنا دماغوں کو کھولتے
لے جرم ہے کی اور کر جاتے ہو
ادھا لنا اتم پڑھا لے ہو
یہ سب الگ پھیلا وہ ہے
یہ سب اک دکھلاوہ ہے

دھرموں کے پیڑ کھلے ان کی جڑیں دھرتی میں گہری ہیں
تم کتنے شیشوں کو کاٹو گے جڑوں سے کونپل پھوٹیں گی
جتنا نفرت کی ماری دھرم کرم کو سمان سمجھو گے
تمہارے دماغوں کا نفرت سے تمہارا ناتا ہے
روشنی پھیلی نگر نگر آنگن آنگن اجیارا ہے
صدیوں کی پہچان روشنی صبح نو کا دھارا ہے

●8360 FENTON ST. SILVER SPRING,
MD 20910-4536 (U.S.A)



شاهد ماهلی

سانسوں میں رگ و پے میں سمایا ہے کوئی اور
یہ زیست کسی اور کی جیتا ہے کوئی اور
آنکھوں نے بسائی ہے کوئی اور ہی صورت
اس دل کے نہاں خانے میں ٹھہرا کوئی اور
کیا طرفہ تماشا ہے کہ اس دل کی صدا کو
سنتا ہے کوئی اور سمجھتا ہے کوئی اور
اک آگ ہے جو دل میں بجھی جاتی ہے ہر پل
خرمن سے جو اٹھتا ہے وہ شعلہ ہے کوئی اور
لاشے ہیں کنارے پہ پڑے تشنہ لبوں کے
جو پیاس بجھاتا ہے وہ دریا ہے کوئی اور
ہر صبح پہ سایہ سا ہے کچھ تلخیٔ شب کا
ہر شام کو اندیشۂ فردا ہے کوئی اور
اک بوئے رفاقت سی فضاؤں میں ہے شاہد
اس کوچۂ بے گانہ سے گذرا ہے کوئی اور

●K-20C, SHEIKH SARAI,
PHASE II, NEW DELEI-17



ظفر صہبائی

ہرے پیڑ اسنہری دھوپ کی قربت میں خوش رہنا
مگر ممکن نہیں ہے ایک سی حالت میں خوش رہنا

مگن رہتے ہیں یہ بوڑھے شجر اپنی کتھاؤں میں
انہیں آتا ہے اپنے قدیم کی خدمت میں خوش رہنا

میں اپنے زخم اکثر اس لیے بھی نوچ لیتا ہوں
کہیں شامل نہ ہو جائے مری عادت میں خوش رہنا

یہ آنسو چار روز کے ہیں یہ آنسو سوکھ جائیں گے
سکھا دیں گے تمہیں حالات ہر صورت میں خوش رہنا

ہم انسانوں کو جینے کا کوئی مقصد نہیں ملتا
کہاں ہوتا جو اس نے سب کی ہی قسمت میں خوش رہنا

پکارا عمر کو خوشیوں نے جب مصروف تھے بے حد
سمجھ سے سیکھ لیتے کاش ہم فرصت میں خوش رہنا

سکوں والے تو ناسمجھ تھے تم فطرت سے لڑنے میں
جو چاہو عافیت اپنی تو فطرت میں خوش رہنا

●HOUSE NO-10 STREET NO.
12 BERESIA ROAD, BHOPAL-36



افتخار نسیم

6033,NORTH SHERIDAN ROAD,
CHICAGO, IL. 60660 (U.S.A)

ٹی وی

میں نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو سڑک پر سوائے سفید رنگ کے اور کچھ نظر نہ آیا دوسری طرف دیکھا تو جھیل کا نیلگوں پانی بھی ندارد یا مظہر العجائب یہ کیا ہو رہا ہے کوئی راتوں رات جھیل بھی چرا کر لے جاسکتا ہے۔ میرے پیٹ میں ایک اور گانٹھ پڑ گئی۔ ساری دنیا خالی خالی نظر آنے لگی میں بستر سے چپک گیا مجھے ایسے لگا جیسے یہ بستر ایک ڈھلوان کی سمت سرک رہا ہے اور ابھی اس کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ میں نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے بستر پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو منظر کچھ اور تھا۔

"اب کیا حال ہے" ایک ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک نرس ہاتھ میں پانی کا گلاس لے کر کھڑی تھی۔ دونوں گورے خوبصورت مگر اجنبی چہرے۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"اس کو کلچرل شاک ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی کوئی شدید ڈیپریشن...... "ڈاکٹر کچھ اور لوگوں کا بتا رہا تھا۔

"یہ اکثر امیگرینٹس کو ہو جاتا ہے۔ ایک تو نئی جگہ دوسرا زبان کا مسئلہ اور تیسرا اپنی بیک گراؤنڈ کے لوگوں کا نہ ہونا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے اپنی ڈیپریشن دوائی کے ساتھ ساتھ اور لوگوں کے ساتھ ساتھ انٹرایکٹ بہت ضروری ہے" ڈاکٹر کے ہمراہ جو دوسرے نوجوان ڈاکٹر تھے وہ نوٹس بنا رہے تھے۔

"CAN YOU SPEAK ENGLISH" ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"YES" میں نے جواب دیا۔

"CAN YOU UNDERSTAND"

"YES"

"مسٹر علی آپ کس ملک سے ہیں"

"پاکستان"

"کوئی یہاں آپ کے جاننے والا ہے"

"نہیں"

"کوئی بات نہیں میں انٹرنیشنل ہاؤس میں کال کر کے پتہ کرتا ہوں، اچھا اب تم لوگ جاؤ" ڈاکٹر نے باقی لڑکوں سے کہا سب چلے گئے۔

"میرا نام ڈاکٹر گرے ہے۔ نہیں نہیں اٹھنے کی کوشش نہ کرو"۔

میرے والدین جب ایسٹرن یورپ سے امریکہ آئے تھے اس وقت میری ماں چودہ یا پندرہ سال کی تھی اور میرا باپ بیس سال کا۔ انہوں نے شادی یہیں کی تھی اس کے باوجود میری ماں شدید ڈیپریشن کا شکار ہو گئی۔ میری پیدائش کے بعد وہ مزید پوسٹ پارٹم ڈیپریشن کا شکار رہی۔ انہوں نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی۔ بعد میں وہ انسٹی ٹیوشنلائز ہو گئی۔ اصل میں ہم یہودی تھے یہاں یہودیوں کے ساتھ کالوں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ گورے ہمیں بعض جگہ تو جیسس کرائسٹ کا قاتل سمجھ کر اس سے بھی برا سلوک کرتے تھے" ڈاکٹر گرے نے سانس لے کر کہا۔

"میں نے بچپن سے فیصلہ کر لیا تھا میں ڈاکٹر بنوں گا۔ افسوس میں اپنی ماں کی کوئی خدمت نہ کر سکا وہ تو اب مجھے پہچانتی بھی نہیں اسے الزائمر ہو گیا ہے"

کچھ دوائی کا اثر اور کچھ ڈاکٹر گرے کی مشفقانہ باتیں، مجھے ایسے لگا جیسے میں پروں پر سوار ہوں، آہستہ آہستہ افق میں گم ہوتا جا رہا ہوں۔ دوسرے دن اٹھا تو ڈاکٹر گرے اپنے ساتھ ایک لمبے تڑنگے گورے آدم کو لے کر آیا۔

"HOW YOU FEELIN'"

"BETTER"

"یہ مسٹر کیزل باخ ہیں اور یہ مسٹر علی"

میں نے ہیلو کہا۔

"السلام علیکم آپ کا کیا حال ہے" اجنبی نے بڑی شگفتہ اردو میں کہا۔

میری آنکھیں پھیل گئیں!!

"آپ پاکستان میں کہاں سے ہیں؟"

"لاہور" میں نے سوچا اس گورے کو لائل پور کا کہاں علم ہو گا۔

"میں نوں احمد سعید قزلباش کہندے نے تے فیر تے تسی میرے گرائیں ہوئے"

"میرے خدایا" مجھے ایسے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

محمد احمد سعید قزلباش میری یونیورسٹی میں فزیکل انسٹرکٹر تھے۔

ڈاکٹر گرے نے کچھ دوائیاں اور ایکسرسائز لکھ کر دیں اور چلے گئے۔ میں اور مسٹر قزلباش اکیلے رہ گئے۔

"میرے نانا لاہور میں ڈیکن تھے میری والدہ محترمہ بھی وہیں پیدا ہوئیں

میرے والد پاکستانی تھے۔ میں نے میٹرک ماڈل اسکول لاہور میں کی تھی آپ کس اسکول میں پڑھتے تھے"۔

"ایچی سن کالج"

"مجھے یاد ہے جب تمہارے اسکول کے لڑکے پگڑیاں پہن کر گھوڑوں پر سوار ہو کر کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے آتے تھے تو ہم لوگ انہیں حسرت سے دیکھتے تھے"

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی میں اس بات پر فخر کروں یا غصہ، ہماری سوسائٹی کا یہ تفاوت ہی ہمیں ڈبوئے جا رہا ہے۔

"اب ایسا کرو جلدی سے اچھے ہو جاؤ اور اب جیم میں باقاعدگی سے آنا اور ہاں اسپتال سے نکلنے سے پہلے مجھے کال کر لینا میں تمہیں آ کر لے جاؤں گا۔"

دنیا اب بہتر نظر آنے لگی۔

مسٹر قزلباش مجھے ڈارمیٹری میں لے کر جانے سے پہلے اپنے گھر لے گئے۔ گاڑی کو پارک کر کے مسٹر قزلباش نے دروازہ کھولا تو اندر سے آواز آئی!

"ہائے ڈیڈ"

"ہائے سیلی۔ یہ مسٹر علی ہیں اور یہ میری بیٹی سلمہ" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

اسی شام کو سوئمنگ پول میں لیپ لگاتے ہوئے سلمہ نے مجھ سے پوچھا

"تو تم بھی لاہور سے ہو مو بھی وہیں پیدا ہوئے تھے"۔

"مو کون ہے"

"اوہ میرے ڈیڈی کو سب مو کہتے ہیں اور مجھے سیلی۔ سلمہ نہیں"

"اچھا"

سیلی مجھ سے چار پانچ سال بڑی تھی اور ایک بچے کی ماں اس کا خاوند اسی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ مو کی اپنی بیوی سے طلاق ہو چکی تھی۔

"کسی دن ہمارے گھر میں کافی پینے کے لئے آنا"۔

دنیا پہلے سے بھی بہتر نظر آنے لگی

اسکول شروع ہو چکا تھا۔ میں بھی اس ڈور میں شامل ہو گیا ایک پریڈ ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس کا ایک لامتناہی ہجوم ایک طرف سے دوسری طرف جاتا بہت دلچسپ لگتا تھا اب جیم میں ایکسر سائز کرتے پنجابی بولتے اردو شاعری سنتے میرا وقت محمد احمد سعید قزلباش کے ساتھ بہت اچھا گزرنے لگا۔

پلیز مجھے مو کہا کرو مسٹر قزلباش نہیں"

"لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا آپ میرے لئے محترم ہیں"

"تم بے تکلفی کے ساتھ بھی میری عزت کر سکتے ہو اور پھر امریکہ میں بہت عجیب لگتا ہے"

میرے خدایا ہماری اور اس تہذیب میں کتنا فرق ہے ہم اپنے والد کو ابا جی کہتے ہیں اور یہاں والد کے پہلے نام سے بچے انہیں پکارتے ہیں، سب تو نہیں لیکن اکثر یہی کرتے ہیں۔ "بزرگوں سے نیچی نظر کر کے ملتے ہیں" اور اگر یہاں نظر ملا کر بات نہ کرو تو لوگ سمجھتے ہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔

مو سے کھل کر مجھے علم ہوا کہ مو کی شخصیت ایک اخروٹ کی طرح ہے اوپر سے سخت لیکن اندر سے "گری" کی طرح نرم..... فوجیوں کی طرح چلتے چلتے کبھی کبھی اس کی چال "چپ" کھا جاتی تو مجھے عجیب لگتا۔ جب وہ باتیں کر کے کبھی کبھی فقرے کو لٹکا کر ختم کرتا تو مجھے الجھن سی ہونے لگتی۔

ایک دن مو نے مجھے کال کیا "سنو آج رات کو میرے ساتھ پارٹی میں چلو گے"

"مو میرا سمسٹر ختم ہونے والا ہے اور ابھی میں نے بہت پڑھنا ہے،"

"کل اتوار ہے کل پڑھ لینا"

"تو کتنے بجے آؤں" پارٹی کے نام پر میرا دل للچا گیا۔

"آٹھ بجے ملتے ہیں"

میں اندھیرے میں مختلف جھاڑیوں سے حشرات الارض کی آوازیں سنتا سنتا مو کے گھر پہنچ گیا گھنٹی بجائی ہلکا سا دروازہ کھلا۔

"اندر آ جاؤ"

"لائٹ تو آن کیجئے"

"کر لو"

میری آنکھیں پھیل گئیں

یہ میرے سامنے کون کھڑا ہے، چھ فٹ سے اوپر نکلتا ہوا قد، بلانڈ وگ جس میں پرانی ہالی وڈ کی ایکٹرسوں کی طرح کرل پڑے ہوئے۔ گہری ڈارک ریڈ لپ اسٹک، لمبا سا اسکارلٹ اوہارا جیسا ڈریس اور کمر پر ایک کمر بند اونچی ہیل والے سینڈل پہنے ہوئے وہ تقریباً آٹھ فٹ کا لگ رہا تھا۔ مجھے ایک دم لائل پور کا چھیچو ہیجڑا یاد آ گیا، مجھے شادی بیاہ میں ناچنے والے ہیجڑوں سے کتنی نفرت تھی میں انہیں مردوں کی مردانگی کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن مو کو میں کس زمرے میں ڈالوں

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں اسے کیا کہوں، کیا کہہ کر پکاروں

"چلو جلدی چلو"

مو نے ایک سیاہ رنگ کا لمبا سا کیپ پہن لیا اور سر کو ڈھک لیا میں گاڑی میں خاموش تھا۔

میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں کئی سوال ہوں گے۔ ہونے بھی چاہئے، اصل میں بچپن ہی سے ایسا تھا، میں اکثر اپنی امی کے کپڑے پہن کر گھوما کرتا تھا۔ وہ جب پارٹی میں جانے کے لئے میک اپ کرتیں تو میں انہیں غور سے دیکھا کرتا تھا۔ میرے ابا کو اس بات سے شدید چڑ تھی چنانچہ انہوں نے مجھے مختلف کھیلوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ میں کرکٹ زبردست کھیلتا تھا۔ میں دن بھر لڑکوں کے کپڑے پہنے رہتا لیکن رات کو آتے ہی اتار کر امی کے کپڑے پہن لیتا۔ امی کچھ نہیں کہتی تھیں کیونکہ میں اکلوتا بیٹا تھا۔ میں لڑکوں کے کپڑے پہنتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے کسی نے مجھے قید کر دیا ہے۔

میں مال روڈ سے لپ اسٹک روز اور ساری قسم کا میک اپ خرید لاتا۔ اسی طرح میں کالج میں پہنچ گیا، ایک دن میں نے عورتوں کے کپڑے پہنے ہوئے فل میک اپ کیا ہوا تھا اور آئینے میں اپنی خوبصورتی کو دیکھ کر فریفتہ ہو رہا تھا کہ ایک دم میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی میں نے پہلی بار اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے مشت زنی کی۔ اب میں نے اپنی پتلون کے نیچے سلک کا انڈر ویئر پہننا شروع کر دیا میں لنڈا بازار میں اکثر ہفتے میں تین چار بار جاتا اور وہاں سے میموں کے کپڑے اور انڈر ویئر خرید کر لانے لگا اسی طرح مجھے کچھ لڑکے مل گئے جنہیں اسی قسم کے کپڑے پہننے کا شوق تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان میں اکثر ہوموسیکچول تھے۔ اور مجھے لڑکوں کے ساتھ سونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اور نہ اب ہے، میں تو عورت کا دیوانہ ہوں"

گاڑی ایک پارکنگ لاٹ میں رکی میں جیسے خواب میں چلتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا دروازہ کھلا تو رنگ و بو کا طوفان آگیا۔ ہائے موہائے مو کی آوازیں آنے لگیں، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے مرد، عورتوں کا روپ دھارے ہوئے

ہائے ہیری ہائے الزبیتھ اور یہ علی ہے میرے گاؤں کا ہے

سب مرد/عورتیں ایک دوسرے کے میک اپ اور کپڑوں کی تعریف کر رہے تھے۔

"ہیری اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا ہے" مو نے مجھے بتایا۔

"تو آج شمپین پیو"

"میں نے تو کبھی شمپین نہیں پی"

کوئی بات نہیں THERE IS ALWAS THE FIRST TIME

اور پھر یہ عام شمپین نہیں ڈام پیری اون ہے ایک سو دس ڈالر کی بوتل"

شمپین کا ایک ایک گھونٹ میرے اندر پگھلے ہوئے سونے کی طرح اتر رہا تھا۔ اور میں حیران ہو کر اس محفل طرب کو دیکھ رہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا یہ سب شادی شدہ ہیں اور عورتوں کے شوقین ہیں اور اتنے زیادہ کہ "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپ ای رانجھا ہوئی"۔

"مو تمہیں پنجابی اردو شاعری کا اتنا زیادہ علم کیسے ہے" آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ "ہمارے زمانے میں سب کچھ پڑھایا جاتا تھا اور پھر لاہور تو ادب کا گڑھ ہے"۔

"مگر مو ان لوگوں کی بیویاں ان کو کچھ نہیں کہتیں اور پھر سوسائٹی" میں نے آخر وہی سوال پوچھ لیا جو مجھے پوچھنا چاہئے تھا"

"پاس سوسائٹی میں ہم کو بہت بری نظر سے دیکھا جاتا ہے، مذاق اڑایا جاتا ہے فقرے کسے جاتے ہیں بعض اوقات تو مار پیٹ کر دی جاتی ہے۔ میں اپنی سابقہ بیوی لنڈا سے لاہور میں ملا تھا وہ کسی پراجیکٹ کے سلسلے میں امریکہ سے آئی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کر لی اور میں امریکہ آگیا سیلی کی پیدائش کے بعد ایک دن لنڈا نے مجھے اس کے کپڑے پہنے ہوئے پکڑ لیا اور طلاق لے لی۔ میں جہاں کام کرتا تھا وہاں علم ہوا تو نکال دیا گیا۔ میں شکاگو آگیا اور مختلف ہیلتھ کلبوں میں فزیکل انسٹرکٹر بن کر کام کرتا رہا آخر مجھے یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی کیونکہ اسوقت کا پرنسپل جیک بھی ٹی وی تھا،

"ٹی وی کیا" میں نے پوچھا۔

"TRANSVESTITE جس کو مخفف کر کے ٹی وی کہا جاتا ہے۔ ایک ٹی وی پارٹی میں اس سے ملاقات ہوئی، تعلقات بڑھے تو اس نے ملازمت دے دی۔ سیلی جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کے لئے میرا عورتوں کے لباس پہننا کوئی مسئلہ نہیں تھا بحیثیت باپ بیٹی ہم اور قریب آگئے"۔

وہ ایک عجیب الف لیلوی رات تھی۔ وقت گزرتا گیا اب میں نے مو اور اس کی پارٹیوں میں متواتر جانا شروع کر دیا۔ میں اس کا مستقل ESCORT تھا کبھی کبھی مجھے ایک آدھ حقیقی عورت یا لڑکی مل جاتی جو ESCORT بن کر آئی ہوتی تھی۔ اسی طرح گزارا ہوتا رہا لیکن جب یونیورسٹی میں نبیلہ ملی تو ایسے لگا جیسے زندگی کی بھٹکی کشتی کو کنارا مل گیا ہے۔ دو سال بعد ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ نبیلہ نے کراچی میں اپنے گھر والوں کو کال کر کے منا لیا۔ میرے گھر والوں کے مان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن شادی تو میں نے ہی کرنا ہے۔

"چلو مو تو ہے وہ ہی ماں اور باپ بن جائے گا"

ویسی ہی شام تھی جب میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی شادی کے بارے میں مو کو بتاؤں گا اس دفعہ میں نے اس کو کال کیا۔

"شام کو آجانا"

میں نے گھنٹی بجائی دروازہ کھلا تھوڑا کھول کر اندر داخل ہوا، دروازہ بند کیا اور لائٹ آن کر دی۔ مو نے فل میک اپ کیا ہوا تھا ایک بہت ہی عالیشان گاؤن پہنا ہوا تھا۔

"آؤ شمپین پیو"

"مو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں"

"کہو"

"میں نبیلہ سے شادی کر رہا ہوں"

"نبیلہ کون.... وہی چوہیا سی لڑکی" میں نے پہلی بار مو کے اندر کی عورت کو بیدار ہوتے دیکھا۔

مو ایک دم چپ ہو گیا اتنی گہری خاموشی کہ آپ اسے چاقو سے کاٹ سکتے ہیں۔

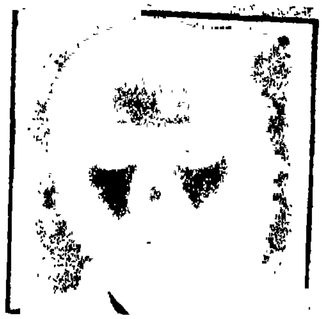
"مو کچھ تو کہو"

"کیا کہوں۔ سوائے BEST WISHES کے"

"مو میرا خیال تھا کہ تم خوش ہو گے"

"میں بہت خوش ہوں" مو نے ایک دم خوشگوار لہجے اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بقیہ صفحہ ۲۱ پر دیکھئے





غزل در غزل

نصر قریشی

زندگی کے کرب میں ڈھل کر سنورتی ہے غزل
پت جھڑوں میں فصلِ گل بن کر نکھرتی ہے غزل
وقت کی آواز بے آواز ہو جاتی ہے جب
دل کی گہرائی سے ہونٹوں پر ابھرتی ہے غزل
ظلمتوں میں ڈ[illegible]گھڑی سورج کا شہر
روشنی بن کر دیوں میں نور بھرتی ہے غزل
ہر قدم دار و رسن کی آزمائش ہو جہاں
بے خطر ان راستوں سے بھی گذرتی ہے غزل
خونِ انساں کا کہیں بھی یا کسی صورت بہے
پا برہنہ، سر برہنہ، بین کرتی ہے غزل
خود پرستوں، خود پسندوں، خود سروں کے شہر میں
آئینہ ہاتھوں میں لے کر طنز کرتی ہے غزل
عشق کی روداد ہو یا داستانِ زندگی
حرف و لفظ و صوت میں تاثیر بھرتی ہے غزل
نصر کاغذ پر بہائے روشنی کی کشتیاں
آگ کے دریا میں بھی ہنس کر اترتی ہے غزل

(۲)

عہدِ نو کے شاعروں کے پیش منظر ہے غزل
مٹھیوں میں بند ہے، پھر بھی سمندر ہے غزل
خاک ہو کر بھی اگا کرتی ہے اپنی خاک سے
خاک کی خوشبو میں ڈوبا خاکی پیکر ہے غزل
زندگی سے اپنا رشتہ توڑ کر جائے کہاں
سلسلہ در سلسلہ رشتوں کی مظہر ہے غزل
ناتواں کاندھے، صلیبِ زیست، مشکل راستے
صورتِ عیسیٰ نفس، مثلِ پیمبر ہے غزل
کتنی آوازوں کا میلہ، شور، ہنگامہ، صدا
خامشی کی سرحدوں پر حملہ آور ہے غزل
تاکتے ہیں کچھ نئے گل بوٹے اب اہلِ شعور
جسم سے لپٹی ہوئی رنگین چادر ہے غزل
دیکھئے کب ختم ہو الفاظ کا تنہا سفر
کاغذی صحراؤں کی وسعت کے اندر ہے غزل
نصر تم بھی تو غزل کی زلف کے قیدی ہوئے
نظم کے لشکر غالب ہو کے دلبر ہے غزل

●774-HATIA BAHADUR GANJ.
ALLAHABAD- 211003 (U.P)

ظفر اقبال ظفر

شکستِ ذات کے لمحے مرتب کر رہا ہوں میں
بکھرتے خواب کے ملبے مرتب کر رہا ہوں میں

تمہارا عکس بھی اس میں نظر آ جائے گا شاید
اب اپنے عہد کے چہرے مرتب کر رہا ہوں میں

اسے مفہوم کیا دیتے ہیں اب اہلِ ہنر دیکھو
ردیف و قافیے مصرعے مرتب کر رہا ہوں میں

فضائے بے اماں پھیلی ہوئی ہے ہر طرف پھر بھی
محبت، پیار کے رشتے مرتب کر رہا ہوں میں

قریں میرے سمندر ہے نہ دریا ہے ظفر کوئی
بس اپنے اشک کے قطرے مرتب کر رہا ہوں میں

●170- KHELDAR- FATEEPUR-212601



اسعد بدایونی

مضموں یہ کنائے نہ اشارے کیلئے ہے
وہ شخص کسی اور ستارے کیلئے ہے

کھلتا ہوا گل، آگ اگلتا ہوا موسم
عبرت کیلئے ہے کہ نظارے کیلئے ہے

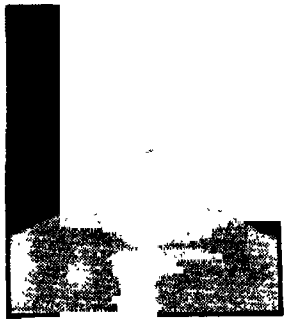
خاشاک ہوس عشق کے پھیلے ہوئے جنگل
ہر چیز مگر وقت کے دھارے کیلئے ہے

سوداگر اسباب جنوں گھر سے نکل کر
بازار میں آیا ہی خسارے کیلئے ہے

جب ہجر کی حدت سے جھلس جائیں دل و جاں
یہ درد کی دیوار سہارے کیلئے ہے

مواج سمندر میں ٹھہرتا نہیں کوئی
بے چین ہر اک شخص کنارے کیلئے ہے

DEPTT. OF URDU
M.U, ALIGARH (U.P)



ریاض صدیقی

261-C/ 11, C.C. AREA
TARIQ ROAD, P.E.C.H.S. KARACHI-75400 (PAK)

انہیں تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

مندرجہ ذیل مضمون کو شاعؔر کے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل)میں شامل "آگرہ اسکول" کے تناظر میں پڑھا جائے۔ اس مقالے کے بعض مندرجات پر ادارتی حواشی (اختلافی نہیں) ممکن تھے لیکن اسے کسی اور موقع پر ریاض صاحب ہی کے حوالے سے تحریر کیا جائے گا۔ مذکورہ مضمون میں جن حقائق کا ادراک کیا گیا ہے، نقادوں نے اس پر توجہ ہی نہیں کی کیوں کہ انھوں نے سیماب کا بالا استعیاب مطالعہ نہیں کیا۔ چند نظموں پر اکتفا کئے ہوئے نقادوں نے اردو شاعری کی من پسند تنقید ہی لکھی۔ انہی نظموں کو خوب خوب پڑھوایا۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ بہر حال ۲۱/ ویں صدی 'سیماب صدی' ہوگی اور پوری ادبی دنیا اپنے شعروادب میں اس صدی کو جئے گی (الف الف)

میں ہوں ایک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں　　　مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

استاد حضرت سیماب اکبرآبادی کا یہ ایک کھرا اور سچا شعر ہے جس میں تعلّیؔ نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ بہت کم ہی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے بارے میں اپنی ہی صلاحیتوں کا صحیح تعین کیا ہو۔ ان سے پہلے صرف غالب ہی کا نام اس حوالے سے لیا جا سکتا ہے۔ ع : میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ان شعروں کو موجودہ دور کے تناظر میں ازسر نو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اب دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اور مغرب کی سرمایہ داری اور اس کے ثقافتی بعد جدید عالمی کلچر نے دنیا کے تمام ملکوں سے ان کی زبانوں سے ثقافتوں، تاریخوں اور روایتوں کو چھین کر نشت کر دیا ہے۔ وہ پڑھی لکھی بعد جدید اور مغرب زدہ نسلیں جسے یہ کایا پلٹ بھا گئی ہے، کوٹھے پر بیٹھی ہوئی اس خوبصورت طوائف کے مترادف ہے جس کا بڑھاپا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے اور کبھی اس قسم کی وئی طوائف اپنا جسمانی حسن اور اپنی جنسی اپیل کھو دینے کے بعد سڑکوں پر بھیک مانگ کر گزارہ کرتی ہے۔ انسانوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ تہذیب کا بھی یہی ویہ ہے۔ بعد جدید دنیا کے اور تناظر میں جس کے مظاہر ہم سب بڑی بے بسی سے دیکھ رہے ہیں حضرت سیماب کے اس شعر کی معنویت کھلتی ہے۔

بربری تہذیب سے ہنگامۂ تخریب سے　　　تم نے دنیا کے ہزاروں دور کر ڈالے خراب

ضی میں جس بربری تہذیب کی کارتانیوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں ۱۹۹۱ء کے بعد وہ اپنی انتہائی حد پہ پہونچ کر ایک کلچر بن گئی جس کو آج کل کی اصطلاح میں بعد جدید ہا جا رہا ہے۔ مغربی ذرائع سے دستیاب ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۹۱ء کے بعد سے لے کر تاحال دنیا کے مختلف حصوں میں کم و بیش ایک کروڑ بے گناہ ہری موت کی نیند سلا دیئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ مارے جانے والوں کی یہ تعداد دوسری عالمگیر جنگ میں مارے جانے والوں کی کل تعداد سے تین نا زیادہ ہے قاتل اس قدر معزز، معتبر، مہذب اور ترقی یافتہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی زبان کھولنے کی بھی جسارت نہیں کر سکتا۔

بادہ کبر و خودی ناپاک ہے ملعون ہے　　　پی رہے ہو تم جسے انسانیت کا خون ہے

حضرت سیمابؔ کی شعری اور فکری تاریخ کے دو منطقے ہیں اول نو آبادیاتی (COLONIAL) اور دوم بعد نو آبادیاتی (POST- COLONIAL) بعد د آبادیاتی دور انہوں نے کراچی آجانے کے بعد شروع کیا اور غالباً یہی بڑی غلطی تھی جو ان سے سرزد ہوئی۔ تقسیم برصغیر کے بعد ہمارے یہاں ایک ایسی ہلچل برپا ہوئی جو آج تک جاری ہے۔ اس کے اثرات اردو زبان اور شعر و ادب کے ذوق و شوق پر بھی مرتب ہوئے اور اب کہ ہم ان نتائج کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو فسوس ہوتا ہے کہ اردو شعر و ادب کی موت نے اسے یہاں بلایا تھا۔ ان تبدیلیوں کے اثرات اس ادبی نسل پر مرتب ہوئے جو ۱۹۶۰ء کے بعد شعر و ادب کی قلم رو میں شامل ہوئی۔ آزادی کے بعد تو تاریخی و ثقافتی اور سماجی و جمالیاتی مشرقیت پر جوبن آنا چاہئے تھا مگر اس کے برعکس امریکی اور یورپی ملکوں کے ادبی و شعری نظریات اور فکری رجحانات کی درآمد میں حیرت انگیز حد تک بڑھوتی ہوئی۔ یہ بالکل انہونی صورت حال تھی کیونکہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اس دور میں جب برصغیر انگریز نو آبادیاتی سامراجیت کے چنگل میں تھا اس خطۂ زمین کی لسانی و تاریخی اور ثقافتی و جمالیاتی مشرقیت کی پہچان کی عزت و حرمت محفوظ رہی حتیٰ کہ ان مقامی لکھاریوں اور شاعروں نے جو انگریزی میں لکھتے تھے اور ان انگریز لکھاریوں نے جو ہندوستان میں آباد تھے یا اب بھی ہیں مشّار تھ پر اور حجاب والا

(RUTH PRAWER JHABVALA)اور مارک ٹلی(MARK TULLY) برصغیر کی روایت وثقافت اور زبانوں کے گہرے اثرات قبول کئے۔انگریزی میں ہندوستان کے مقامی اور انگریزی اہل نظر کی تخلیقات کی مربوط تاریخ جو۔ پین(PEN) تنظیم کے زیر اہتمام وہاں "انڈین رائیٹنگ ان انگلش" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ (مطبوعہ اسٹرلنگ پبلشرز دہلی ۱۹۸۹ء) یہاں دستیاب ہی نہیں ہے۔ تقسیم کے بعد روایت کا یہ دھارا پاکستان میں بار آور نہیں ہو سکا اور مغربیانے(WESTERNISATION) کے دھارے نے اسے نگل لیا۔اس غیر متوقع اور بے جواز کایا پلٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان اور شعر وادب سے لگاؤ رکھنے والی وہ نسل جس نے ۱۹۶۰ء کے بعد آنکھ کھولی کلاسیکی دور کے اساتذہ اور بیسویں صدی کے مستند بزرگ اساتذہ سے مانوس نہیں ہو پائی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تقسیم کے بعد اردو کے بعض بزرگ اور سینئر اہل الرائے کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ زبان اور شعر وادب کا ایک پاکستانی مزاج بنایا جائے جو ہندوستان کی اردو اور اس کے شعر وادب سے مختلف ہو۔یہ تجویز جذباتیت اور شدت پسندی کی طرف مڑ گئی اور اہل نظر نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تاریخ وثقافت اور ارتقاء کو بھی رد کر دیا۔دہلی لکھنؤ کے اہل زبان اور ان فنی ولسانی سانچوں کے خلاف بھی ردِّ عمل رونما ہوا۔اس بھیڑ چال میں سیماب کی استادی کو کون پوچھتا۔ حالانکہ وہ خود دہلی لکھنؤ کے اہلِ زبان اور ان کے فنی ولسانی سانچوں کے معاملے میں کوئی سخت گیر انداز نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے یہاں تو مولوی عبدالحق کے مقابلے میں بھی زیادہ لچک تھی۔اور اہم موضوع پر انہوں نے جن آرا کا اظہار کیا نہایت معقول ہیں۔"اس میں شک نہیں کہ آج اردو زبان کی عالم گیری ادارتی تعینات سے ماورا اور بالاتر ہے۔ایک دکنی شاعر بھی ایک لکھنوی شاعر کی طرح زبان ومحاورات پر حاوی ہے۔ایک پنجابی شاعر بھی ایک دہلوی شاعر کی طرح فصیح انداز بیان میں غزل کہہ لیتا ہے اور ایک کشمیری شاعر بھی ایک اکبر آبادی شاعر کی طرح معیاری فکر ونظم پر قادر ہے اس لئے اب ان اداروں (لکھنؤ، دہلی اور آگرہ وغیرہ) کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی لیکن میرے خیال میں ان اداروں کا قیام اب بھی ضروری ہے"۔ان کا آخر الذکر جملہ اپنی جگہ معنی خیز ہے کیونکہ روایت اور تاریخ سے جڑا رہنا ہی ایک قوم کی پہچان کا وسیلہ بنتا ہے۔پاکستان بن جانے کے بعد پنجاب کے اکثر مستند اردو دانوں نے ایسی اعلیٰ ادبی زبان لکھی جو کسی لکھنؤ اور دہلی کے اہل زبان سے کم نہیں ہے۔ سیماب کا یہ کہنا ہے کہ "محاورات کی تصحیح اور الفاظ کی سند کے لئے ہمیں کسی نہ کسی ادارۃ الخیال کا سہارا لینا پڑے گا میں اسے تقلید نہیں سمجھتا"۔یہ بھی کوئی متنازعہ بات نہیں ہے۔دنیا میں جتنی بھی ادبی زبانیں ہیں اپنی فنی ولسانی سند کا خیال رکھتی ہیں۔اردو تو قومی زبان ہے جب کہ انگریزی غیروں کی ہے مگر اب بھی ہمارے یہاں انگریزی لکھنے والے انگریزی محاوروں، لفظوں کے ہجوں اور قواعد کی صحت کے لئے بڑا اہتمام کرتے ہیں، انگریزی کی مستند ڈکشنریاں رکھتے ہیں، سرکاری دفتروں میں دیکھئے تو ہر افسر اور متعلقہ عملہ ہر وقت ڈکشنری ساتھ رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک غیر زبان کے لئے اتنی احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ مگر جب یہی بات اردو کے لئے کہی جاتی ہے تو اس کے خلاف رد عمل کا مظاہرہ ہوتا ہے۔کیا اہل نظر یہ چاہتے ہیں کہ ادبی اردو کا کوئی ملک گیر پیمانہ نہ بنایا جائے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اب بھی انگلستان کے اہل زبان غیر انگلستانیوں کی انگریزی زبان کو ایک علیحدہ قسم میں شمار کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افریقی انگریزی، امریکی انگریزی، اور ہندوستانی انگریزی جیسی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ سیماب نے محاورات کی تصحیح اور الفاظ کی سند کو ترجیح دینے کے باوجود یہ بھی لکھا ہے کہ تاہم اجتہاد کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔اس تحقیقی اور علمی دور میں آنکھیں بند کر کے لکیر کا فقیر رہنا "تجاہل عارفانہ ہے۔اگر تحقیق وتنقید کی قوتیں زبان ومحاورات کے تعین میں نئے نظریات پیدا کر دیں اور وہ قابل قبول بھی ہوں تو ممکن ہے کہ ہندوستان کے تینوں ادارہائے خیال بے کار ومعطل ہو جائیں۔"(دستور الاصلاح مطبوعہ ۱۹۴۰ء) انہوں نے خود بھی لسانی اور اسلوبی اجتہاد کا مظاہرہ کیا ہے اور شاعری میں تجربوں سے گریز نہیں کیا جیسے نو شعروں کی مختصر نظمیں جنہیں انہوں نے نورتن کا نام دیا ہے۔ان کے یہاں شاعری میں دیہاتی زبان کا بھی استعمال ہوا ہے (بن بنسی) اس کے علاوہ انہوں نے شری کرشن کی شخصیت پر بھی بارہ نظمیں کہی ہیں۔وہ ظاہری طور پر تو غزل کے مخالف نہیں تھے مگر نظمیہ شاعری کی ضرورت وافادیت پر ان کی آرا دلیل ہیں کہ وہ موجودہ دور میں غزل پر نظم کو ترجیح دیتے ہیں اور حالؔی کی روایت کو آگے لے جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

"ہم چاہتے ہیں کہ مشاعروں سے زیادہ مناظموں کو رواج دیا جائے۔اور ان کے لئے ایسے عنوانات موضوعات بطور طرح قائم کئے جائیں جن کی ملک کو ضرورت ہو۔اس طرح رفتہ رفتہ تغزل کی بے کار اور رکیک پابندی کم ہوتی جائے گی۔ تغزل کا معیار اگر بلند ہو تو وہ بھی نہایت ضروری چیز ہے مگر تغزل صرف غزل تک اور غزل صرف مشاعرے تک محدود ہے۔ مناظمہ کا میدان بہت وسیع ہے۔"(۱۹۳۰) یہ رائے اس دور کی ہے جب ترقی پسند تحریک نہیں پیدا ہوئی تھی اور آزاد نظم بہت کم ہی کوئی کہتا تھا۔ان کے تنقیدی نظریات کی یہ جہت بجائے خود ترقی پسندیت کی طرف پہلا قدم ہے مگر اسے تھیوری سے منسوب کرنا یقیناً صحیح نہیں ہے۔ "تھیوری" کی اصلاح امریکی جدیدیت پسندوں نے مخصوص معنوں میں استعمال کی ہے جس کا مقصد تنقید کو عمل اور نظریے سے بے دخل کرنا تھا۔ایسی تھیوری کس مصرف کی جو عمل میں نہ لائی جائے اور کسی نظریے کی ترجمان نہ ہو سیماب نے جو آرا قلمبند کی ہیں وہ سب ہی عمل سے مشروط ہیں اور تھیوری نہیں بلکہ طریقہ کار (METHODOLOGY) کے اطلاق کا تقاضا کرتی ہیں۔اس کا اطلاق انہوں نے اپنی شاعری اور ادبی نثر پر کیا ہے۔افتخار امام صدیقی عمومی معنوں میں تو ان کے نظریات کو تھیوری کہہ سکتے ہیں مگر جن اصطلاحی معنوں میں امریکی نیو کرٹکس نے اس کے معنوں اور حدود کا تعین کیا ہے وہ ساختیات بعد ساختیات اور بعد جدیدیت کی طرح بالکل مختلف قلمرو ہے۔

ایک ایسی قد آور شخصیت کو آزادی کے بعد اردو کے تیار کئے جانے والے نصابات میں جگہ نہ ملنا سانحہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ان نصابات میں وحشت کلکتوی کو بلکہ ملی مگر اول الزکر کو نہیں ملی۔ مشرقی پاکستان نکل جانے کے بعد وحشت کو نصاب سے خارج کر دیا گیا شاید اس لئے کہ وہ بنگال کے کونے کا حصہ تھے۔ ست چغتائی، کرشن چندر اور پریم چند کو نصاب سے اس لئے خارج کیا گیا کہ ان کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی شاہکار کہانی "پرمیشر سنگھ" کو اس نکال باہر کر دیا گیا کہ اس میں ایک سکھ کی انسان دوستی کا تاثر بہت گہرا تھا۔ ابوالفضل صدیقی کی کہانی بسیادیوج پر یہ اعتراض تھا کہ اس کی فضا اور علاقائی تناظر زیر دیش چھایا ہوا تھا۔ سیماب کا تعلق چونکہ تحریک پاکستان سے رہا تھا اس لئے وہ بھی تقسیم کے بعد کراچی آ گئے تھے اور اس حوالے سے ان کو نظرانداز کرنے کوئی جواز نہیں تھا مگر ہمارے نصاب ساز ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ان پر توجہ نہیں دی۔

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

ماہنامہ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اول کی اشاعت کے ذریعہ آج کی ادبی نسل سے سیماب کی ملاقات ہوتی ہے۔ تقسیم کے بعد وہ کراچی آ گئے تھے یہاں سے انہوں نے ایک ادبی رسالہ پرچم جاری کیا تھا اس کا نصب العین بین الاقوامی ادب و اخلاق اور تعلیم و تربیت تھا۔ غالباً اب وہ مشرق کی لسانی و تنقیدی ادبی و شعری روایت کو مغرب کے ساتھ مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ وہ کٹر روایت پرست اور ڈھیٹ قدامت پسند نہیں ہیں جیسا کہ انہوں خود لکھا ہے کہ روایت پرستی اور قدامت نوازی کے خلاف جہاد ضروری ہے گویا وہ کھلی ہوئی فضا کے قائل ہیں۔ (ماہانہ الوارث بمبئی جنوری فروری ۱۹۴۹ء) رلی رجحانات اور وہاں کی فکر سے کماحقہ واقف نہ ہونے کے باوجود ان کے اپنے ادبی نقطہ نظر میں مغرب کے موقف کی نشاندہی بھی ہوئی ہے مثلاً انہوں نے بنیادی اور اہم فقدان کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شخصیات پر ہماری زبان میں کافی مواد نہیں ہے۔ خدا جانے مستقبل کی تاریخیں کیوں کر مرتب ں گی (الوارث) شخصیات پر اردو زبان میں مواد کا فقدان آج بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کی ادبی تاریخیں انگریزی کی ادبی تاریخوں کی وسعت و جامعیت کا لہ نہیں کرتی ہیں۔

اردو زبان اور شعر و ادب کے حوالے سے وہ یقیناً ایک قد آور استاد اور صاحب الرائے نقاد ہیں چنانچہ ان کا شمار بھی غالب، حالی اور جوش کی فہرست میں ہونا ہئے تھا۔ نیاز بھی کوئی معمولی قد و قامت کے دانشور نہیں ہیں بلکہ ان ہی کی طرح ایک عہد پر چھائے ہوئے تھے مگر ایک موڑ ایسا ہے جہاں سیماب ان سے ے نکل گئے۔ نیاز مشرقی طرز کے تاثراتی نقاد ہیں چنانچہ اپنی پسند و ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں، مومن ان کو پسند تھے اس لئے انہوں نے تمام کلاسیکی شاعروں کے م کو ٹھکرا کر صرف دیوانِ مومن کا انتخاب کیا۔ سیماب کی تنقید میں حقیقت پسندی اور سماجی و سیاسی شعور کے پیمانوں کی بھی کار فرمائی ہے۔ اور حقیقت کے ے میں انہوں نے اپنے موقف کو بھی واضح کر دیا ہے کہ حقیقت کوئی تصوراتی چیز نہیں ہے بلکہ مطالعہ فطرت سے دستیاب ہوتی ہے۔ ان کی مشرقیت پر رب کے اثرات یقیناً نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری اور تنقید میں جدت بھی ہے اور اجتہاد کی شان بھی ہے۔ یہاں وہ غالب سے قریب دکھائی دیتے ہیں پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ مغرب کے اثرات سے بے خبر تھے بلکہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ غالب کی طرح انہوں نے بھی مغرب کے اثرات کو مشرقی یت اور ثقافت میں تحلیل کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کو جو اعزاز ملنا چاہئے تھا نہیں ملا۔ کراچی میں وہ جس جگہ محو خواب ہیں وہاں جائیں تو یہ مصرعے یاد آ جاتا ہے۔ "بر مزار ما غریباں نے چراغ نہ گلے"۔ شہر میں شاعروں اور دانشوروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان میں پرانے زمانے کے سینئر بھی ہیں مگر کوئی بھی ان کی قبر ہیں جاتا۔ کسی چاہنے والے یا ادبی ادارے نے آج تک نہ ہی کوئی سادہ سا مزار بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی چار دیواری اٹھانے کی۔ اب تو خیر اس کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ جو پڑھی لکھی نسل آئی ہے اسے اپنی تاریخ و زبان اور شعر و ادب سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور وہ ان موضوعات کو غیر منافع بخش اور ل سمجھتی ہے۔ اردو کے معتبر اور سینئر لکھاریوں نے بھی بعد وفات ان کو موضوع نہیں بنایا۔ اس میں کچھ کار فرمائی تعصب کی بھی ہو سکتی ہے۔ تاجور نجیب ی نے صحیح لکھا ہے کہ "آگرے کے بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دیئے جاتے" سابق دور کے الزامات سے قطع نظر ترقی پسندوں نہ صرف ماضی کے کلاسیکی ادب کا اپنے عہد کے تاریخی و سماجی تناظر میں از سر نو تجزیاتی مطالعہ کیا بلکہ ان معاصر بزرگوں کی دین کا بھی اعتراف کیا جن کے نظریات ادبی و شعری روایت کو آگے کی طرف لے جاتے ہوں۔ بعض اہل الرائے نے جیسا کہ شاعر کے زیر حوالہ نمبر سے بھی اندازہ ہوتا ہے سیماب اور پسندیب کے درمیان ایک فاصلے کی نشاندہی کی ہے۔ حامدی کاشمیری نے بھی یہ لکھ کر کہ وہ کوئی ایسی صدائے انقلاب بلند نہیں کرتے جو مستعار ہو یا روایتی بر کی رو سے یہ نظم "شکست جمود" ایک سیاسی انقلابی نظم ہے دراصل صرف چٹکی ہی لی ہے اپنی اس رائے کی نہ وضاحت کی ہے اور نہ اس کے حق میں دلائل کئے ہیں۔ ان کو یہ تو بتانا چاہئے تھا کہ آخر جنوبی ایشیا کی تاریخ نے انقلاب کا وہ کون سا نظریہ دیا ہے جو سیماب کے یہاں ظاہر ہوا ہے۔ نظریہ اگر یونیورسل ہو ی خطہ زمین کی جاگیر نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت کا ورثہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ پوری دنیا کے انسانوں کو موضوع بناتا ہے بیسویں صدی کا برصغیر مغرب کی نظر سے استفادہ کرنے پر مجبور تھا گاندھی جی کے دیہی اور پسماندہ سماج کی طرف اس کا واپس جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ حامدی صاحب نے شعر و ادب کی طت سے سیاسی و سماجی شعور کی نشاندہی کو روایتی تنقید سمجھا ہے اور شکست جمود جیسی شاہکار انقلابی سیاسی نظم کا مطالعہ صرف لفظ و بیان اور اسلوب کے تناظر

میں کرنے کی ترغیب دی ہے۔ وہ دراصل جدید سائنسی تنقید کو روایتی قرار دیتے ہیں اور روایتی تنقید کو جو صرف زبان وبیان اور تجربوں کی کسوٹی پر پرکھے نہ جانے والے خیالات سے عبارت ہو جدید سمجھتے ہیں۔ نظم کے بارے میں وہ قارئین اور اہل الرائے کو جو مشورے دیتے ہیں وہ تو خود صاحب نظم کے تنقیدی موقف کی تردید ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند وہ نہیں تھے مگر جن اعتراضات کو بنیاد بنا کر اینٹی ترقی پسندیت اور ترقی پسند دشمنی کی ایک فضا بنادی گئی ہے، سیماب کی شاعری اور ان کے ادبی نظریات اس کی تردید کرتے ہیں بلکہ ان کے بعض خیالات بھی ان اعتراضات کی زد میں آجاتے ہیں۔

اعتراضات اور کفروارتداد کے الزامات سے بھی وہ نہیں بچ سکے کیونکہ ان کی نظم "موحد اعظم" پر ملک میں خاصا ہنگامہ برپا ہوا تھا اور انہوں نے بھی یگانہ کی طرح ہار نہیں مانی بلکہ جم کر لڑی سید عنایت ملیگ نے ان کے ادبی موقف کا بہت صحیح پس منظر قلمبند کیا ہے۔ "سیماب کی شاعری کے تیسرے دور سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد معلوم کر لیا ہے اور اس کے بعد ایک انسان کی تعمیر میں معاون نظر آتا ہے۔ وہ انسان مکمل انسان ہے اس کا وطن بھی آزاد ہے اور روح بھی۔ ملک اور وطن کی ضروریات ابنائے وطن سے ہمدردی، سرمایہ داری کے مقابلے میں مزدور اور مزدوری، سیماب کا پیغام کسی خاص قوم اور فرقے تک محدود نہیں ہے۔ وہ روئے زمین پر ایک قوم دیکھنا چاہتا ہے تمام نوع انسانی کو انسانیت کے ایک رشتے میں منسلک دیکھنا چاہتا ہے۔ کائنات میں ایسے انسان کی نمو کا خواہش مند ہے جو جارحیت، قومیت، فرقہ پرستی، اور نسلی امتیاز سے بالاتر ہو۔ وہ جب ہندوستانیوں سے مخاطب ہوتا ہے تو اسے صرف مسلمان ہی نظر نہیں آتے وہ ہندوستان کو من حیث المجموع دیکھتا ہے" یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ شاعر کے اشعار اور اس کے ادبی نظریات اس کی سند ہیں اور اس میں کون سا وہ موضوع ہے جو ترقی پسندیت کی نفی کرتا ہو؟ ان کی شاعری اور نثری تحریروں میں سیاسی و سماجی اور انقلابی و نظریاتی شعور کا فقدان کہاں ہے؟ کوئی بھی شاعر جو اس قسم کے شعور کی نشاندہی کرتا ہو تو لازماً اس کے ذہن میں کسی نہ کسی ایسے نظام حیات کا خاکہ ضرور ہوگا جو اس کے نقطۂ نظر اور اس کی تمناؤں کی عملی تعبیر بھی پیش کرتا ہو ضروری نہیں کہ وہ شعری وسیلے سے اس کا کھل کر اظہار بھی کرے کیونکہ شاعری تقریر اور تدریس کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے۔ ان کی مشرقیت کو اگر نری مشرقیت ہی کہیں تو بھی اس میں ایسے انفعال اور توانا رجحانات کا پرتو جھلکتا ہے جو ایک واقعی پائدار اور جدید عالمی کلچر کے صحیح رخ کو نشان زد کرتا ہے۔ انہوں نے بہت پہلے ہی جن دنوں دوسری جنگ عظیم چھڑی تھی جارحانہ قوم پرستی، فرقہ پرستی اور نسلی امتیاز کے ہلاکت آفرین نتائج کا انداز کر لیا تھا مگر سویٹ یونین کی تباہی سے پہلے ان تخریبی اور انسانیت دشمن رجحانات کو جدید عہد کے تقاضے اور ترقی پسندیت کے مترادف سمجھا جاتا تھا حالانکہ حقیقی ترقی پسندیت جو ہمارے یہاں ۱۹۵۳ء میں ختم کی گئی تھی ان رجحانات کو بین الاقوامی بعد نو آبادیاتی سامراجیت ہی کی دین قرار دیتی تھی۔ آج یہی قوم پرستی، نسل پرستی، اور فرقہ پرستی دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک کھل کھیل رہی ہے۔ اب تو بعد آبادیاتی سامراجی قوتیں اسی ہتھیار سے اپنے سیاسی و اقتصادی اور کاروباری مفادات کو آزادی کے ساتھ پوری کر رہی ہے اور صاف نظر آرہا ہے کہ دنیا ایک نئی فاسسٹزم کی زد میں آگئی ہے۔ جیوف سائمنز (GEOFF SIMONS) کے مطابق صرف عراق میں اب تک پندرہ لاکھ بے گناہ مارے جاچکے ہیں جن میں آدھی تعداد پانچ سال سے کم عمر بچوں کی ہے۔ (کتاب مطبوعہ پلوٹو پریس لندن ۱۹۹۹ء) سیماب کی خواہشات اور تمناؤں کی صحت وسند کے لئے اس سے بڑھ کر گواہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان کی شاعری اور نثری تخلیقات کی تہوں سے معنی کھوج کر اگر اسے ایک جامع نقطہ نظر کی صورت میں دیکھیں تو وہ جدیدیت پسندوں، ساختیاتیوں، اور پس ساختیاتوں کے مقابلے میں اجتماع کے لئے کہیں زیادہ مفید اور کارگر محسوس ہوں گے کیونکہ ان کے مخاطب بھی تمام دنیا کے عوام اور مظلوم انسان ہی ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی سماج ہو اس کی ساخت میں ایک بڑا طبقہ خواتین کا بھی ہوتا ہے بلکہ زیادہ تر سماجوں میں معہ ہمارے سماج کی عورتوں کی مجموعی آبادی مرد آبادی کے برابر بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ ترقی پسندوں کے علاوہ ہماری ادبی تاریخ کے اساتذہ اور بزرگوں نے آدھی سے زیادہ آبادی والے اس طبقے کو یقیناً نظر انداز ہی کیا ہے سرسید اور اقبال تو عورتوں کی تعلیم کے مخالف ہی رہے اور ان کو گھر اور خاندان کے روایتی تصور سے باہر نہیں دیکھ سکے۔ سیماب عورتوں کی تعلیم و تربیت کے حامی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے لئے نہ صرف کتابیں لکھیں بلکہ ان کو اپنا شاگرد بھی بنایا۔

سیماب کی شاعری اور نثر نگاری کا تجزیاتی مطالعہ نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی تناظر میں کیا ہی نہیں گیا کیوں کہ اردو کی ادبی و فکری قلمرو اس عالمی رجحان سے ابھی تک لاعلم ہے۔ اس رخ سے جب ان کے اشعار اور افکار کو موضوع بناتے ہیں تو ان کے یہاں ایسے شعری اور نثری متون دکھائی دیتے ہیں جن کو تکنیکی تعریف کی رو سے نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی متون (TEXTS) قرار دیا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اساتذہ (میر، سودا، مصحفی، جرأت، انشا، مرزا رسوا اور واجد علی شاہ) اور بیسویں صدی کے اکثر شعراء اور تجزیہ نگاروں کے یہاں اس قسم کے شعری متون کثرت سے ملیں گے جن کی نہ تو اب تک درجہ بندی کی گئی ہے اور نہ ان کو یکجا کیا گیا ہے۔ سیماب کے چند زیر نظر شعر نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی زمانوں کے خلاف رد عمل کا کھلا ہوا اظہار ہیں۔

مسل کے پھینک دو پھولوں کے آئینے توڑ دو
ہٹا دو پردۂ رنگین ومسند گل پوش "بعد نو آبادیاتی"

ہوشیار اے اہل عالم اب نہیں ہنگام خواب
محفل ہستی یونہی کب تک اسیر انقلاب "نو آبادیاتی"

پھر نظام دہر کو پیرایۂ تجدید دو
اپنی دنیا کو بنا دو بزم فطرت کا جواب "نو آبادیاتی"

بربری تہذیب سے ہنگامۂ تخریب سے	تم نے دنیا کے ہزاروں دور کر ڈالے خراب	"نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی"
قومیت ،فرقہ پرستی اور نسلی امتیاز	پیکر انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب	"نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی"
صرف تم انسان بن کر اپنی دنیا میں رہو	پرسکوں آزاد یکسو کامگارو کامیاب	"نو آبادیاتی"
بادہ کبرو خودی ناپاک ہے ملعون ہے	پی رہے ہو تم جسے انسانیت کا خون ہے	"نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی"
نئے اصول مرتب کریں برائے چمن	بنائیں کچھ نئے آداب آشیاں کے لئے	"بعد نو آبادیاتی" جس کے پیچھے نظریہ کی کار فرمائی ہے
ظلم سے بڑھتا ہے سوز زندگی مظلوم میں	رفتہ رفتہ صید کو صیاد ہونا چاہئے	"نو آبادیاتی"
نہ اب وہ باطل کی ترجمانی نہ اب وہ اسلوب خوش بیانی	میری حقیقت پسندیوں نے بدل دیا رنگ شاعری کا	
نہ رہ جائے یہیں نقش غلامی بعدِ آزادی	میری تصویر کس نے کھینچ دی دیوار زنداں پر	"بعد نو آبادیاتی"
ہمیں سے نغمۂ آزادیٔ چمن چھڑا	پتہ قفس کا ہمارے ہی آشیاں سے چلا	"نو آبادیاتی"
اب ہے اک مدت سے خون وخاک میں لتھڑی ہوئی	آدمیت جس پہ نوع آدمی کو ناز تھا	"نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی"
ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ	شاخوں پر انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں	"بعد نو آبادیاتی"

اس حوالے میں ان کی نظموں "آزادی" اور "شکست جمود" بھی آتی ہیں۔ دو سو چوراسی کتابوں کے مصنف کے سمندر سے حاصل کئے جانے والے یہ چند قطرے ہی ہیں جس میں کل کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اس سمندر میں نہ جانے کتنے ہی ایسے اور قطرے ہوں گے جن کو چھانٹ کر اگر یکجا کر دیا جائے تو اول الذکر موضوع پر ایک پوری جامع کتاب تیار ہو جائے گی اور ان آرا کی۔ "انہوں نے کسی سیاسی نظام کی خواہش اور کسی بڑی طاقت کے زیر اثر ادب و زندگی دیکھنے او دکھانے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ سماجی سروکار سے ان کا مقصد کسی آئیڈیالوجی کی حمایت نہیں تھا" کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہاں جس بڑی طاقت کی طرف اشار کیا گیا ہے وہ امریکی اور یورپی طاقتیں ہرگز نہیں ہیں اور وہ بڑی طاقت جس کی نشاندہی ہو گی اپنے زمانے میں اسی قسم کے معاشی سماجی اور کار و نظریات کی ہمنوا تھ جو ہمیں سیماب کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کارشتہ اجتماعی حوالوں سے آپ فکر و نظر کے کس قبیلے سے جوڑیں گے؟ اس سوال کو تشنہ تو نہیں چھوڑا جا سکتا اور اس کوئی جواب ہی سیماب کے قد و قامت کے تعین میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

فروغ زندگی کیا روشنی ہو بزم امکاں کی | مثال شمع کشتہ بجھ گئی ہے روح انساں کی

---

۱ : نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی متون کا ان دونوں ہی سامراجی نظاموں کا مخالف ہونا شرط ہے۔ وہ متون جن میں ان کے حوالے سے یا تو غیر جانبدارانہ یا ان کی ہمنوائی کا رویہ ملتا ہے نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی متون میں شمار نہیں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید کے متون اس قبیلے میں شمار نہیں کئے جائیں گے۔

بقیہ صفحہ ٣٩ : برگد

دھل گئے۔ میں پھرتی سے باہر نکل آیا کہ اگر تھوڑی دیر اور ٹھہر جاتا تو یقیناً پوری آواز کے ساتھ رو دیتا۔ باہر آیا تو برگد کے تناور درخت کو دیکھتے ہی میں اپنا ضبط کھو بیٹھا، دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں تیر گئے۔ عشاء کے بعد میّت اُٹھی، تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر ہم لوگ جب گھر واپس آئے تو یہاں بھی قبرستان جیسی خاموشی اور ویرانی تھی۔ کیوڑے اور کافور کی مہک یہاں کی ہر چیز میں در بس گئی تھی۔ تیجے کے روز مختار فاتحہ کے بعد میرے پاس آیا اور نہایت اطمینان سے بولا کہ اب آپ یہاں نہ آیا کریں۔ محلے والے چہ می گوئیاں کرتے ہیں۔ آج سال بھر بعد عشرت کے آجانے سے سب کچھ پھر سے تازہ ہو گیا۔ کئی بار جی میں آیا کہ مجھے جانا چاہئے۔ پھوپھی نے کتنی تاکید کی تھی اور مجھ سے بار بار کہا تھا کہ ان کے بعد کشور کا خیال رکھنا مگر مختار کے ایک جملے نے سب کچھ کتنی آسانی سے ختم کر دیا تھا۔

شام کو عشرت نے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں فوراً تیار ہو گیا مختار والی بات میں نے اسے بھی نہیں بتائی۔ گاڑی میں سبھوں کو بٹھا کر پھوپھی کے گھر پہنچ گئے۔ عشرت اور بچے کب گاڑی سے اتر کر گھر میں چلے گئے مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ میں بھونچکا سا اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں برگد کا بھاری بھرکم پیڑ کبھی استادہ تھا۔ لمحہ بھر کو تو مجھے شبہہ ہوا کہ میں غلط جگہ پر تو نہیں آگیا لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ برگد اپنی جگہ سے غائب تھا۔ چبوترا شاید توڑ کر ہٹا دیا گیا تھا میں کچھ آگے بڑھا۔ کئی بار آنکھیں جھپکائیں کہ شاید اس طرح نظر آجائے پر وہاں اب بہت سارے جنگلی پودوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

□□

عبدالرحمن عبد

خاک ہوں رہ گزر میں رہتا ہوں
میں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں

شامِ ہستی ہے منتظر میری
میں تلاشِ سحر میں رہتا ہوں

ہر شگوفے میں ہے مری رنگت
ذوق ہوں ہر ہنر میں رہتا ہوں

خاص نسبت مری دلوں سے ہے
اکثر و بیشتر میں رہتا ہوں

اپنی قسمت پہ ناز ہے مجھ کو
میں محبت نگر میں رہتا ہوں

جب سے اک آشیاں بنایا ہے
آسماں کی نظر میں رہتا ہوں

●476-73RD STREET, BROCKLYN, NEWYORK-11209 (U.S.A)



شہاب اختر

کتبہ

یادوں کا دل رہ جاتا ہے
جیسے
کہانیاں رہ جاتی ہیں
ہمارے بعد بھی
یادیں
دل کی صورت
ہماری قبر پہ
کتبہ بن جاتی ہیں

میں ایشور ہو جانوں گا

موت آجانے سے
زندگی عجیب بچکانی حرکت لگتی ہے
ایشور آگ؟
آگ میں مٹی
مٹی میں پانی
میری موت کے بعد
میرا ایشور
مجھ میں سمائے گا
میں
ایشور ہو جاؤں گا۔

●CALCUTTA CLOTH STORE, KAPRA PATTI, P.O.JHARIA-828111(BIHAR)



شمیم انجم وارثی

کہہ مکرنیاں

یاد وہاں کی جب جب آئے
آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کاش کہ اک دن میں بھی جاتا
اے سکھی، لندن؟
نا سکھی، طیبہ

گلشن سے جب ہو کے گذرے
بے مایا پھولوں کو کترے
سکھے پھولوں کی ہر ڈالی
اے سکھی، ساجن؟
نا سکھی، مالی

نیند کے عالم میں جب آئے
آنکھ مری فوراً کھل جائے
لٹ جائے پھر دل کا سکون
اے سکھی، بالم؟
نا سکھی، فون

آنکھ لگے تو سامنے آئے
آنکھ کھلے تو وہ چھپ جائے
اس کو غیر کہوں یا اپنا
اے سکھی، ساجن
نا سکھی، سپنا

کیا اس کی دنیا میں عزت
جس کے پاس نہیں یہ دولت
اس کے دم سے ہے تعظیم
اے سکھی، شہرت!
نا سکھی، تعلیم

●M.D.ROAD,P.O.GAROLIA-743133
NORTH 24 - PARGANAS (W.B.)



پرویز ید اللہ مہدی

C/O. SHAGOOFA, 31-BACHLOR'S QTRS.
MOAZZAM. JAHI MARKET,HYDERABAD- 1 (A.P)

مرزا غالب اور ازار بند

کہتے ہیں کہ شاعر اپنے ڈھنگ سے شعر کہتا ہے۔ شعر کہنا چونکہ ایک تخلیقی عمل ہے اس لئے اسے بچہ جننے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، اس اعتبار سے ہر شاعر روز دو چار ڈیلیوریز (DELEVERIS) کی تکلیف سے ضرور گزرتا ہے البتہ بعض اوقات ڈیلیوری نارمل ہوتی ہے اور بعض اوقات سیزرین (SCISSERINE) کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے شعر کی ڈیلیوری ان کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی کہ یہ ایکسپریس ڈیلیوری، (EXPRESS. DELIVERY) کی تکلیف ہونے کی عادی ہوتی ہے۔ البتہ ہمارے ممدوح مرزا غالب کے شعر کہنے کا طریقہ بالکل مختلف تھا مختلف سے مراد یہ نہیں کہ وہ سر کے بل کھڑے ہو کر "یوگا" کرتے ہوئے شعر کہتے تھے، مختلف سے مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی مضمون غیب سے ان کے خیال میں آتا تو وہ عام شاعروں کی طرح اسے کاغذی پیرہن میں محفوظ کرنے کے بجائے فوراً اپنے ازار بند، میں محفوظ کر لیا کرتے، مطلب یادداشت کے طور پر ازار بند میں گرہ ڈال لیا کرتے، اور اگر کبھی طبیعت ایک دم حاضر رہی اور آمد، مسلسل ہوئی تو غالباً جتنے بھی پاجامے گھر میں موجود ہوتے (بشمول بیگم صاحبہ کے پاجاموں کے) پہن لیا کرتے تھے، اور پھر فرصت سے بیٹھ کر ان گرہوں کو کھول کر ان میں منتخبہ اشعار کو صفحۂ قرطاس، پر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔

غیر شاعرانہ ازار بند کا اس قدر شاعرانہ استعمال مرزا غالب سے پہلے اور بعد میں کسی شاعر نے نہیں کیا۔ پہلے والوں کی تو ہمیں خبر نہیں البتہ دور حاضر میں ازار بند کے اس شاعرانہ استعمال سے محرومی کا سب سے بڑا سبب آج کے بیشتر شعرا کی ازار بند کی سہولت سے محرومی ہے کیونکہ شاعر برادری کی اکثریت دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر پتلون کو اپنائے ہوئے ہے۔ دن میں خیر مجبوری ہے البتہ رات کے وقت ہمارے خیال میں پاجامہ پہن کر ازار بند کی سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ اگر کسی شاعر بھائی کے ہاں پاجامہ نہ ہو تو صرف ازار بند عرف ناڑا ہی کمر سے باندھ کر چچا غالب والی شاعرانہ سہولت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ شعروں کے نزول کے وقت مرزا غالب بیاض کی جگہ ازار بند کا استعمال کس لئے کیا کرتے تھے، اس کی وجہ ان کے کلام کے سرسری مطالعہ سے ہی معلوم ہو جاتی ہے، اصل ان کے ہاں آمد اس قدر شدّ و مد کے ساتھ ہوا کرتی تھی کہ شعروں کی رفتار بلکہ یلغار کی تاب صرف ازار بند ہی لا سکتا تھا، کاغذ تو ان بھاری بھر کم اشعار کے 'لینڈ' (LAND) کرتے ہی 'چیں' بول دیتا۔

اردو کے بیشتر ڈگری یافتہ نقادوں محققوں اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تو ان کا ذہن خوب چلتا ہے، دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں لیکن جہاں تک ادبی چھان پھٹک اور تحقیق کا تعلق ہے یہ زیادہ تر مکھی پر مکھی بٹھا کر موضوع سے سرسری گزر جاتے ہیں اپنے پیشرو محققین کی ریسرچ سے سر مو اختلاف نہیں کرتے بلکہ پٹی پٹائی لکیر کو مزید پیٹ کر خود کو لکیر کا فقیر ثابت کرتے ہیں۔ اب مرزا غالب پر ریسرچ کرنے والے ٹولے ہی کو لیجئے ہر محقق لٹھ لیے بس ان کی شاعری کے درپے 'نظر آتا ہے، کسی کو یہ توفیق ہی نہیں ہوتی کہ شاعری کے علاوہ بھی مرزا کی کسی اور شے' کو موضوع تحقیق بناتے۔ آخر مرزا غالب کی شخصیت صرف شعر و ادب تک ہی محدود نہیں ان کی شخصیت کے کچھ اور پہلو بھی تو ہیں جن پر ریسرچ کی جا سکتی ہے، مثال کے طور پر ان کی دستار نما ٹوپی ہے ان کا چغہ نما جبہ ہے، ان پر بھی تو ریسرچ کی جا سکتی ہے۔ سچ پوچھئے تو مرزا غالب کی مخصوص ٹوپی اور منفرد چغہ نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم نے تو آج تک گھوڑے کو بیٹھی ہوئی حالت میں اور مرزا غالب کو بغیر ٹوپی کے کسی تصویر کسی پورٹریٹ میں نہیں دیکھا بلکہ ہمارا تو دعویٰ ہے کہ کوئی بھی اردو داں بغیر ٹوپی کے مرزا غالب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ جب مرزا غالب نے پہلے پہل اس دنیا میں قدم رنجہ فرمایا تھا تب بھی ان کے سر پر ٹوپی موجود تھی، البتہ اس کا سائز تب یقیناً چھوٹا رہا ہوگا بہر حال اس باب میں ریسرچ کا کافی مواد موجود ہے کوئی ریسرچ اسکالر اگر بسم اللہ کرے تو مرزا غالب کی ٹوپی اور چغے میں کافی دور تک اپنی ریسرچ کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔

مرزا غالب کی ٹوپی اور چغہ یقیناً ریسرچ اسکالروں کی توجہ کے مستحق ہیں لیکن فی الحال ان سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے ان کا ازار بند، کیونکہ اس پر ابھی تک ویسی توجہ نہیں دی گئی جیسی کہ دی جانا چاہئے تھی۔ ٹوپی اور چغے پر ازار بند کو فوقیت ہم اس لئے بھی دے رہے ہیں کہ ٹوپی اور چغے کا تعلق صرف مرزا کی شخصیت سے ہے جب کہ ازار بند شخصیت کے ساتھ ساتھ

ان کی شاعری کا بھی لازمی حصہ ہے ذرا سوچئے اگر ازار بند کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا تو شعروں کی مسلسل آمد کے وقت بطور یادداشت کے مرزا گرہ کس میں لگاتے اور جب گرہ ہی نہ لگتی تو نہ کلام محفوظ ہوتا نہ دیوان غالب چھپتا نتیجتاً دیوانِ غالب کے بغیر اردو زبان کا شعر و ادب کس قدر بے مایہ، کس قدر حقیر ہوتا، دوسرے لفظوں میں واقعتاً یتیم ہوتا، یسیر ہوتا پس مرزا غالب کے ازار بند کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اردو کی تمام یونیورسٹیوں اور کل اردو اکیڈمیوں کو چاہئے کہ اس موضوع پر مقالے لکھوائیں سیمینار و سمپوزیم منعقد کروائیں اور ظاہر ہے یہ سارے ہنگامے اس عنوان کے تحت ہی ہوں گے۔ "مرزا غالب اور ازار بند" کلام غالب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ دینی کتب کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی اردو کتاب کا کریڈیٹ "دیوان غالب ہی کو جاتا ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق دیوان غالب ہی وہ واحد شعری مجموعہ ہے جو بالکل، کی طرح آئے دن چھپتا رہتا ہے، البتہ بالکل بلا ہدیہ تقسیم ہوتی ہے اور دیوانِ غالب معقول قیمت کے عوض ہاٹ کیک، کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور یہ بات کسی عام شاعر کے لئے یقیناً اعزاز سے کم نہیں لیکن دیوانِ غالب کا کمال اس کے آئے دن شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی تعداد نہیں بلکہ کلام غالب کی وہ شرحیں ہیں جن کی رفتار اشاعت اور تعداد دیوانِ غالب کے کل ایڈیشنوں کی تعداد کے اگر برابر نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے غالب پر ریسرچ کرنے والے اسکالروں کی طرح ان کے شارحین کی بھی کمی نہیں بلکہ ایک انبوہ کثیراں موجود ہے البتہ اس انبوہ کثیراں میں شعر فہم شارحین تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں ماضی میں زیادہ تر کا تعلق شارحین کے اس گروہ سے ہے جو ہر اس شعر کی تشریح کرنے بیٹھ جاتا ہے جو لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ ان شارحین کلام غالب کی کوششوں، کاوشوں کے نتیجے میں جو حاصل تشریح آتا ہے اس کا تعلق موضوع سخن کے سوائے ہر چیز سے ہوتا ہے۔ یہاں بطور نمونے کے مرزا غالب کا صرف ایک شعر مع تشریح کے پیش ہے، شارح کا تعلق ظاہر ہے شارحین کے شعر نافہم گروہ سے ہے۔ مرزا غالب کا مشہور شعر ہے ۔

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

شارح موصوف فرماتے ہیں کہ شعر مذکورہ میں مرزا غالب دراصل اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جو کسی سراپا ناز کی محفل میں ایک دن پیش آیا تھا اگرچہ مذکورہ سراپا ناز بھی کافی مہذب اور سلیقہ مند تھی اور اس کی محفل میں بھی عموماً شرفاء ہی حاضری دیا کرتے تھے، خود مرزا غالب کو بھی مفتی شہر، مفتی صدرالدین آزردہ کی سفارش پر اس محفل میں داخلہ ملا تھا جہاں احباب سرِ شام چراغ جلتے ہی جمع ہوتے سب کے جمع ہوتے ہی محفل میں شمع جلتی چونکہ وہ دور شرافت کا دور تھا تب بدمعاش بھی تھوڑے بہت شریف ہوا کرتے تھے نتیجتاً اس سراپا ناز کی شریف محفل میں ناؤ نوش کے دور بھی شرافت سے چلتے چھیڑ چھاڑ بھی شرافت سے ہوتی شمع محفل کے گرد جمع پروانے بھی شرافت سے شمع کا طواف کرتے اور طواف میں بھی پہلے آپ پہلے آپ کا مظاہرہ کرتے قصہ مختصر یہ کہ ہر کام شرافت کے جامے میں ہوتا جہاں شرافت کے دریا قدم قدم پر بہتے ہوں وہاں دھول دھپے کا ماحول مرزا غالب کی ذرا سی نادانی کا کارن بن گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن جب محفل پورے شباب پر تھی کہ کسی کی شریفانہ چھیڑ پر سراپا ناز، کے گلابی ماتھے پر مارے شرم کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں مرزا غالب سے اس سراپا ناز، کا یوں بھری محفل میں شرم سے پسینہ پسینہ ہونا دیکھا نہ گیا، انہوں نے جھٹ اپنی دستی باالفاظ دیگر استعمال شدہ رومال سراپا ناز کی خدمت اقدس میں اس شاعرانہ درخواست کے ساتھ پیش کر دیا

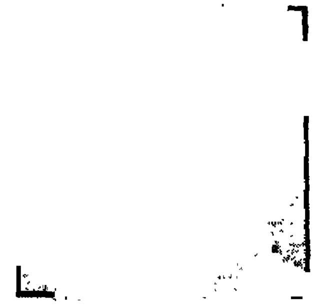
نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

سراپا ناز کے حضور رومال عرف دستی پیش کرنے کے جوش میں مرزا غالب کو یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ رومال کا جائزہ لے کر یہ دیکھ لیتے کہ ان کا رومال بد قسمتی سے کس قدر گندہ اور میلا ہے کیونکہ ان دنوں مرزا شدید زکام میں مبتلا تھے، جب صورتحال ایسی نازک ہو تو محفل چاہے کتنی تمیز تہذیب والی ہو اس کا درہم برہم ہونا یقینی ہے اور سراپا ناز چاہے کتنی ہی مہذب اور سلیقہ مند ہو اس کا آپے سے باہر ہونا بگڑنا یہاں تک کہ دھول دھپے پر اتر آنا لازمی ہے۔ یہ مرزا غالب کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے حقیقت چھپائی نہیں یعنی اپنے دھول دھپے کی کارروائی پر پردا نہیں ڈالا بلکہ اسے من و عن بیان کر کے شعرا حضرات کے تعلق سے عام اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا کہ یہ حضرات مقطعوں میں ہفت تعلّی سے کام لے کر صرف اپنی بڑائی ہی ہانکتے ہیں، کبھی کبھی شعرا حضرات کو مقطع میں اپنی پٹائی کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔!

ملاحظہ فرمایا آپ نے فاضل شارح نے شعر کی تشریح کے نام پر کس چابکدستی سے شعر میں موجود مذکور پیش دستی میں سے دستی کو الگ کر کے پہلے تو اسے استعمال شدہ رومال میں بدلا پھر اس رومال کو مرزا غالب کے ہاتھوں سے سراپا ناز، کی خدمت میں پیش کروا کے شرفاء کی محفل میں دھول دھپ کروا لیا، مرزا غالب کو بھی شاید دورِ جدید کے شارحین کے ہاتھوں اپنے اشعار کے ہونے والے حشر کا اندازہ تھا تب ہی تو وہ اس حشر کے تعلق سے پیشگی یہ شعر کہہ گئے ۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

□□



رحمان واگلے سازؔ

اموشیٔ لب، ضبط جفا بھی ہے کوئی چیز
رجرأتِ اظہار وفا بھی ہے کوئی چیز

ٹھتے ہیں اب دستِ طلب بارِ کرم سے
ٹے ہوئے پر دل کی دعا بھی ہے کوئی چیز

ا مرضی کی مختار ہے خود فطرتِ آزاد
ے کاتبِ تقدیر رضا بھی ہے کوئی چیز

ب آکے ذرا عہد وفا کا تو بھر رکھ
ی ہوئی آنکھوں میں قضا بھی ہے کوئی چیز

رخیز ہوں سنگسار بھی گر اپنے لہو سے
رت کی مگر آب و ہوا بھی ہے کوئی چیز

ہ تیز جو یہ آتش جنگ امن کے رہبر
خونِ شہیدانِ وفا بھی ہے کوئی چیز

جد میں ادا ہوتی ہو سجدوں کی نمائش
ں جیسی عبادت کی جگہ بھی ہے کوئی چیز

ور ہو گر زیرِ قفس طائر آزاد
بازوئے بسمل کی ندا بھی ہے کوئی چیز

بھاہے کوئی سازؔ کے افکار پریشاں
اہل نظر طرزِ ادا بھی ہے کوئی چیز

●7120-VANBUREN WAY
BUENA, CA-90620 (USA)



رام یتن پرساد یادو

بچپن مرے بچپن!

مجھے یاد ہے
اپنا بچپن
جو مست ہواؤں جیسا تھا
پیڑوں کے نیچے
تتلیوں کے پیچھے
دن بھر دوڑا کرتا تھا میں
ذرا بھی نہیں
فکر تھی من میں اور
بجلی سی
پھرتی تھی تن بدن میں
اب نہیں رہا
میرے اندر بچپن کا وہ شور
دھیرے دھیرے
اترنے لگا ہے
زندگی کے بھنور میں
کڑوا بدمزہ ذائقہ
تو ایسا سوچتا ہوں
کیا پھر سے میں مناسکوں گا
اپنے اس روٹھے
الست اور البیلے بچپن کو؟

●MAQSOODPUR, P.O. FATUHA-
803201, DIST. PATNA (BIHAR)

عبد الوحید خلجی

(۱)

سچ

پوچھو
دن رات سے
زمیں آسمان سے
پوچھو
تاریخ سے اتہاس سے
پیار کا گیت
کہاں چھپا ہے؟

(۲)

چھاؤں بدن

گویا
میں تتلی
تیرے باغ کی
دیکھے ہیں۔ میں نے
کئی
چمن کے پھول
مجھے مت بتا
گلاب
کالا بھی ہوتا ہے

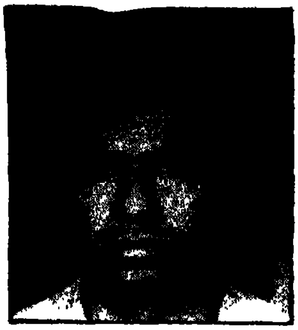
(۳)

پیڑ پودوں کی۔ تھکن
تازگی میں کھو گئی.....
زندہ سورج دیکھ کر

●NEAR QALANDARI MASJID,
MAKRANA- 341505 (RAJ)

شاھد اختر

P.O.BOX NO.1067, H.P.O
NAWAB GANJ KANPUR-208002 (U.P.)



برگد

شام کا وقت تھا، تھوڑی دیر پہلے ترشح کے سبب موسم خاصہ خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں لان میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپیں لڑا رہا تھا۔ اسی وقت چوکیدار نے آکر بتایا "صاحب کوئی عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے بمبئی سے آئی ہے۔"

"کون......ہے؟"

"شکل سے تو بھیک مانگنے والی لگ رہی ہے۔ میں نے بھگانے کی بہت کوشش کی مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی.... کہتی ہے آپ کو صرف اپنا نام بتا دوں۔!

"کیا۔۔نام ہے....؟

"عشرت....! نام سنتے ہی میں بری طرح چونکا۔ پھرتی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ عین وقت پر خود کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو کرسی سے ٹکرا کر گر ہی پڑتا جانے سے پہلے میں نے دیکھا کہ احباب بھی کچھ کچھ حیرت میں تھے۔ گیٹ کے پاس عشرت پانچ بچوں سمیت میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے اندر آنے کو کہا پھر چوکیدار کے رویے کے لئے معذرت طلب کی۔ میری باتوں کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے لپٹ کر رونا چاہتی ہے مگر اسکی عسرت اور بدحالی شاید اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی حالانکہ میں پیش قدمی کر سکتا تھا آخر وہ کوئی غیر نہیں میری پھوپھی زاد بہن تھی لیکن چوکیدار کی حرکت کے لئے میں معافی مانگ چکا تھا اب اس کے ساتھ رونے کی ضرورت مجھے فضول سی لگی بلکہ اندر کہیں جھنجھلاہٹ بھی ہوئی۔ عجیب عورت ہے بلاوجہ روئے چلی جا رہی ہے۔ میرے پیچھے چلتے ہوئے وہ اب تک برآمدے میں آچکی تھی۔ تلے اوپر کے بچے جو پتا نہیں کب سے نہیں نہائے تھے اتنے ہی گندے اور میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بچوں کے چہروں پر محرومی کے ساتھ کچھ خوف بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی چپلیں کیچڑ میں سنی ہوئی تھیں۔ ڈھیر ساری کیچڑ موزک کے فرش پر پھیل گئی تھی۔ بچوں نے گیٹ تک سنے قدموں کے نشان دیکھے اور پھر ماں کے قریب دبک گئے۔ عشرت نے برقع اتار کر الگ رکھ دیا۔ رونے کی آواز پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ اسی کے ساتھ بچوں کے چہروں پر ہراس کی لکیریں بھی گہری ہو گئیں۔ عشرت پر اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ آواز سن کر میری بیوی بھی باہر آگئی۔ دوست بھی اٹھ کر قریب آگئے اور معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"بات کیا ہے۔ کیوں روئے چلی جا رہی ہو؟"

"بھئی جان۔۔ میری اماں مر گئیں اور کسی نے مجھے خبر تک نہیں کی۔"

"کیا؟ مجھے جھٹکا سا لگا تھا کیوں کہ پھوپھی کا انتقال ہوئے تو سال بھر ہو گیا تھا۔

"آخری وقت اماں کی صورت نہیں دیکھ پائی۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیتا۔ ابھی پچھلے ہفتے پڑوس والے غفور چچا کا لڑکا بمبئی گیا تھا تو اس نے بتایا.... بھئی جان آپ تو لکھ سکتے تھے۔" اس سوال کا میں کیا جواب دیتا اپنی غلطی پر نادم، سر جھکائے اس کے سامنے کھڑا رہا "مختار نے تمہیں خط نہیں لکھا"۔ مختار، عشرت کا بڑا بھائی تھا اپنے بچاؤ کے لئے شاید میرے پاس یہی ایک جواب بچا تھا ہر چند کہ یہ کہنے میں مجھے تھوڑا سا تکلف ہوا مگر جیسے تیسے جان چھڑائی۔ بیوی نے کچھ تسلی بخش جملے ادا کیے جس کا فوری اثر ہوا۔ اس کے گریہ میں حیرت انگریز طور پر کمی آگئی۔ بیوی نے نوکر سے پانی لانے کو کہا۔ صورت حال سے اب تک دوست بھی واقف ہو چکے تھے۔ پانی پینے کے بعد عشرت کے حواس بحال ہوتے نظر آئے۔ دوستوں نے چلنے کی اجازت مانگی میں بھی یہی چاہ رہا تھا کیوں کہ عشرت کے آجانے سے ماحول بدل گیا تھا۔ میں نے بیوی کو اشارہ کیا تو وہ عشرت کو اٹھا کر اندر لے گئی۔ سفر کی تکان اور بھوک سے سب نڈھال لگ رہے تھے کیوں کہ وہ جس طرح کھانے پر ٹوٹے تھے اس سے ان کی اشتہا کا اندازہ لگ رہا تھا۔ میں پاس بیٹھ کر انہیں دیکھتا رہا۔ اس اثنا میں پھوپھی کا کوئی ذکر نہیں نکلا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی عشرت نے پھر رونا چاہا، میں نے تقریباً ڈانٹنے کے سے انداز میں اسے منع کیا۔ تم لوگ اس کمرے میں جا کر آرام کرو۔ سامنے والے کمرے کی طرف میں نے اشارہ کیا وہ بچوں کو لے کر جانے لگی اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "مختار بھئی جان یہاں آتے ہیں۔۔یا۔۔ نہیں۔۔" "پھوپھی کے انتقال کے بعد سے اب تک نہیں آیا ہے۔ میں نے کئی بار اسے بلایا مگر بیوی بچوں میں ایسا مست ہے کہ کہیں آتا جاتا نہیں۔" "وہ شروع سے ہی ایسے ہیں.... جب اماں کے مرنے کی خبر بہن کو نہیں دے سکتے تو اور کیا امید کی جائے وہ تو اماں کے دم سے سب

جڑے ہوئے تھے۔" عشرت کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔ وہ بچوں کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔ آپا میز پر سے برتن سمیٹنے لگی میں کرسی سے ٹیک لگا کر ماضی کو۔۔۔

پھوپھی کا خیال آتے ہی ایک عجب دنیا کی سیر کرنے لگتا ہوں۔ کیسے لوگ ہوتے تھے۔ چند سالوں میں زندگی کا پورا نقشہ و معنی ہی بدل گئے۔ پھوپھی کے بارے میں میری معلومات بہت محدود تھیں۔ میں کب سے انہیں جانتا ہوں یہ بھی یاد نہیں اور تو اور مجھے ان کا نام تک نہیں معلوم۔ لیکن اسوقت میں آٹھ دس برس کا تھا جب پھوپھی کے لئے میری دلچسپیاں بڑھنی شروع ہوئیں۔ گھر باہر کا ہر آدمی انہیں پھوپھی کہتا تھا یا کہا جائے کہ ہر رشتہ پھوپھی پر آکر ختم ہو گیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پھوپھی سے زیادہ خستہ حال پورے خاندان میں کوئی نہیں تھا اور ان سے زیادہ شفیق۔۔۔ مطمئن اور محبت کرنے والا بھی کوئی دوسرا نہیں تھا۔

لو باقاعدگی سے ہم لوگوں کو پھوپھی کے یہاں لے جاتے تھے۔ ان کی خوشیاں چھپائے نہیں چھپتی تھیں۔ چھوٹا سا گھر.... سات بچے.... چھ لڑکیوں کے بعد مختار پیدا ہوا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی پھوپھا پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ تب سے کونے میں کھٹولے پر پڑے بیڑی پیتے اور کھانستے رہتے۔ پھوپھی بیچاری چکر گھنی کی طرح ناچتی ناچتی پھرتیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہمیں کہاں بیٹھائیں.... کیا کھلائیں۔ ہم لوگ جب تک وہاں رہتے پھوپھی خاطر مدارات میں معروف رہتیں۔ گرمی کے دنوں میں بجلی ہونے کے باوجود گھر میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ لو چارپائی برگد کے نیچے ڈال لیتے۔ پھوپھی برہم ہوتیں کہ اب اتنا چھوٹا گھر بھی نہیں ہے کہ جہاں اپنے بھائی کو نہ بٹھا سکوں۔ میں جان بوجھ کر پھوپھی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا۔ پھوپھی یہ بتائیے کہ اس میں چار پائے ہوتے ہیں مگر لوگ چارپائی کیوں کہتے ہیں، پھوپھی مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتیں۔ شاید وہ میرے سوال کا مقصد جانتی تھیں۔

لو کی عادت تھی۔ وہ شروع سے کھانے پینے کا ڈھیر سارا سامان لے کر جاتے تھے۔ اس حرکت پر پھوپھی بہت ناراض ہوتیں، لو کا یہ طریقہ کار انہیں سیدھے اپنی عزت پر حملہ لگتا مگر ایک تبسم میں جانے کتنے دکھوں کی پردہ پوشی کیے رہتیں۔ کم و بیش بیس برس کی مدت میں مجھے ایسی ایک ساعت یاد نہیں جب میں نے پھوپھی کو افسردہ یا اداس دیکھا ہو۔ اس گھر کی زبوں حالی میری سامنے تھی اور میں اکثر سوچتا کہ پھوپھی اگر نماز روزہ نہ بھی کریں تب بھی خدا کے حضور شرمندہ نہ ہوں گی۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوا پھوپھی میرے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتی گئیں۔

پھوپھی کا گھر دیکھ کر مجھے شدید افسوس ہوتا۔ ایک کمرہ، چھوٹا سا صحن ہا ایک کونے میں کھڈی والا بیت الخلاء جہاں ٹاٹ کا پردہ اڑ اڑ کر گھر کی کہانی بیان کرتا۔ دوسرے کونے میں مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔ چولہے کے پاس ہی گھڑونچی تھی جس پر بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ اس پر پھوپھی کے جہیز کا نقش و نگار والا تانبے کا کٹورا۔ جس میں پانی پینے کے بعد لو ہمیشہ کہتے کہ اس کا لطف ہی الگ ہے۔ گھڑے کے نچلے آدھے حصے میں کائی لگ چکی تھی مگر مجھے کبھی کراہیت کا احساس نہ ہوا اس کے برخلاف اپنے گھر میں صفائی کے لئے میرے معاملات قدرے مختلف تھے۔ کوئی موسم ہو چینی کے پیالوں میں چائے اور پاپے کھلانے کے بعد سارے بچوں کو دو تین گھنٹوں کے لئے باہر جانے کا حکم ہوتا۔ بچے بھی مکان کی تنگی اور گھر کے حالات سے واقف ہو چکے تھے اس لئے آپ ہی زیادہ سے زیادہ باہر رہنے کی کوشش کرتے لیکن دھیرے دھیرے لڑکیاں بڑی ہوتی گئیں اور گھر چھوٹا۔ ظاہر ہے لڑکیاں اب اس طرح باہر رہ کر مڑگشتیاں نہیں کر سکتی تھیں۔ سب بہنوں میں کشور تیسرے نمبر پر تھی۔ وہ اپنے تمام بھائی بہنوں سے صرف شکل و صورت ہی میں الگ نہیں تھی۔ مزاج بھی سب سے جدا تھا۔ رانیوں والی عادت و اطوار ویسے ہی نخرے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سب سے زیادہ وہ اپنی طرف متوجہ کرتی۔

پھوپھی کے دروازے پر برگد کا بہت پرانا پیڑ لگا ہوا تھا چوں کہ ہم لوگوں کا بیشتر وقت اسی کے زیر سایہ گذرتا اس لئے مجھے بھی کچھ موہ سا ہو گیا تھا اس پرانے برگد سے۔ آس پاس کے دو چار بزرگ مستقل چبوترے پر لیٹے بیٹھے نظر آتے۔ کتنے لوگوں کا چھپر بنا تھا یہ برگد میں اکثر سوچا کرتا۔ بوڑھے اور ضعیف برگد کے نیچے حقہ پیتے اور گھنٹوں ماضی کی باتیں گڑگڑاتے رہتے۔ برگد کی عمر کے بارے میں وہ اکثر بحث کرتے مگر کبھی اتفاق رائے نہیں ہوتا۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے سو برس ہو گئے ہیں، کوئی کہتا کہ دو سو سال سے ہے۔ کوئی اس سے زیادہ بتاتا تو کوئی کم۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہتا۔ کبھی کبھی زیر لب مسکرا بھی دیتا۔ ہم عمروں کو گولر توڑتے اور چنتے دیکھتا جسے وہ مزے لے لے کر کھاتے اور میری طرف اس طرح دیکھتے گویا کہہ رہے ہوں "میاں کبھی اس پھل کو بھی کھا کر دیکھو"۔ میرے لیے ان کی نگاہوں میں ہمدردی ہوتی۔ وہ مجھ سے بولنا چاہتے مگر تھوڑے فاصلے پر کھڑی میری کارا انہیں روک دیتی۔ ان کے چہروں کے آتے جاتے رنگ میری سمجھ میں آنے لگے تھے۔ سچ پوچھو تو مجھے اس ماحول میں بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ برگد کے چبوترے کے دائیں طرف تھوڑا آگے چل کر ایک بہت بڑا ٹیلا تھا ٹیلے کے اس پار بہتی ہوئی ندی۔ ٹیلے کے اوپر سے دیکھنے پر سارا منظر بہت دل آویز معلوم ہوتا۔ بارش کے دنوں میں ندی میں اس قدر پانی بڑھ جاتا کہ نیچے رہنے والوں کو وہ جگہ چھوڑنی ہی پڑتی۔ پانی گھروں کے اندر تک گھس جاتا۔ پندرہ بیس دنوں بعد یہ پانی مکانوں سے تو نکل جاتا مگر ذہنوں سے نکلنے میں بہت وقت لگتا۔ شہر سے باہر تک کے لوگ یہاں باڑھ کا لطف لینے آتے تھے۔ فوٹو گرافی ہوتی، پکوان پکتے۔۔۔ درختوں پر جھولے ڈالے جاتے ہر چند یہ نہ سیر و تفریح کا مقام تھا نہ تحمل مگر ان لوگوں کی تاویل یہ تھی کہ اس کی ہر داغ بیل وزرا و سفرا نے ڈالی ہے۔ کچھ فاصلے پر کسی بزرگ کی خانقاہ تھی جس

کی وجہ سے جمعرات کو خاص طور سے یہ جگہ Picnic spot بن جاتی۔ لوگ بہت خوش و خرم دکھائی دیتے۔ عورتوں اور لڑکیوں کی وجہ سے رونق کچھ اور بڑھ جاتی کیوں کہ وہ سب خوب سج دھج کر آتی تھیں۔ ساون کے دنوں میں درختوں پر جھولے ڈالتیں اور شور شرابے کے ساتھ لمبی لمبی پینگیں بھرتیں۔ کشور مجھے وہاں کھڑے ہوئے دیکھتی اور ناگواری کے ساتھ منہ بنا کر اندر چلی جاتی۔ اس وقت تک میں بہت چھوٹا نہیں تھا اتنا بڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس برہمی کا سبب پوچھے بغیر معلوم ہو جاتا۔ پر نہ جانے کون کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔ پھوپھا کے علاوہ اس گھر میں صرف کشور تھی جس سے اب تک میں بے تکلف نہ ہو سکا تھا بلکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے فاصلہ قائم رکھنا چاہتی ہے پھوپھا سے حدِ فاصل کی وجہ مجھے معلوم تھی مگر کشور کا رویہ میری لیے تکلیف دہ تھا۔ جس جگہ میں ہوتا کشور وہاں ایک ساعت نہیں ٹھہرتی مگر یہ احساس مجھے ہر پل رہتا کہ دو آنکھیں میری ایک ایک حرکت کو دیکھتی رہتی ہیں۔ ایسے میں جب کبھی اس سے نگاہ ٹکراتی وہ برا سا منہ بنا کر آڑ میں ہو جاتی۔ ناراضگی جتانے کا اس کا یہ طریقہ مجھے حیرت ناک لگتا اور جب بہت مغزماری کے باوجود خفگی کے سبب تک نہیں پہنچ پاتا تو تحیّر اور بڑھ جاتا۔

عشرت کے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز سن کر میرا ذہن منتشر ہوا۔ اٹھ کر میں کمرے میں گیا تو عشرت اپنے بچے کو بری طرح پیٹ رہی تھی۔ میں نے بچے کو الگ کیا۔ کیوں مار رہی ہو؟"

"گڈو کی موٹر دیکھ لی ہے اسی کے لئے ضد کر رہا ہے؟"

"تو اس میں مارنے کی کیا بات ہے۔۔ میں ابھی موٹر دلاتا ہوں۔" میں نے اپنے بیٹے کو بلایا۔ سمجھا بجھا کر موٹر عشرت کے بچے کو دلا دی۔ وہ فوراً خاموش ہو گیا اور چہرے پر ایسی خوشیاں جھلکنے لگیں جیسے دنیا جہاں کی تمام نعمتیں اسے حاصل ہو گئی ہوں۔ وہ موٹر کو فرش پر دوڑانے لگا۔ میں گڈو کو لے کر باہر نکل آیا۔ بیوی نے کھانے کی تجویز رکھی۔ میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ کھانا کھانے کے دوران کئی بار میرا ذہن پھوپھی کی طرف گیا مگر ہر بار بیوی کے کچھ نہ کچھ بول دینے سے خیال پارہ پارہ ہو جاتا جب کہ میں فی الحال انہیں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیوی گڈو کو لے کر ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھنے چلی گئی۔ سگریٹ جلا کر دیوار کے سہارے تکیہ پر ٹیک لگائی اور ایک بار پھر ماضی کے تار و پود جوڑنے لگا۔ درگاہ کے قرب و جوار میں بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔ قوال خانقاہ کے صحن میں جھوم جھوم کر قوالیاں گاتے۔ محرابوں کی آڑ میں لہراتے سائے اور سرگوشیاں اس وقت مجھے زیادہ حیرت زدہ کرتی تھیں۔ حلیم، بریانی، بوٹی، کباب وغیرہ کے خوانچوں سے آتی تیز خوشبوئیں لالچ پیدا کرتیں تھیں۔ زائرین و عقیدت مند نماز کے اوقات میں بھی اپنے معمولات اسی طرح جاری رکھتے جیسے غیر اوقات میں۔ سجادہ نشینوں، مجاوروں کے عمل اور طور طریقے مجھے اس وقت تذبذب میں ڈالے رہتے۔ ایک بات جو مجھے اس وقت سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ یہ کہ اگر نماز سے زیادہ ضروری کوئی دوسرا عمل تھا تو ابو نے اس کا ذکر کبھی کیوں نہیں کیا۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ نماز سے اہم کوئی کام نہیں۔ پھوپھی اس بات کو بہت سختی اور ڈھیر ساری مثالوں کے ساتھ پیش کرتیں مگر درگاہ کا ماحول دیکھ کر میں پھوپھی اور ابو کے ساتھ خدا کی طرف سے بھی بدگمان ہو جاتا تھا۔

پھوپھی کی ساری لڑکیاں تقریباً ایک ساتھ جوان ہو گئیں۔ سال بھر کی چھٹائی بڑائی لڑکیوں کے معاملے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہاں یہ ضرور ہے کہ غریب کی لڑکیاں امرا کے مقابلے جلدی بالغ ہوتی ہیں۔ پھوپھا اس لائق ہی نہیں رہے کہ کچھ کر سکتے۔ جب کسی لائق تھے تب کچھ نہیں کیا اب تو ان کے سات خون معاف تھے۔ بنڈل میں بیڑیاں ختم ہونے لگتیں تو ماتھے پر شکنیں بڑھ جاتیں۔ لڑکیاں کیسے کم ہوں گی اسے انہوں نے اپنا مسئلہ کبھی سمجھا ہی نہیں۔ محشر اور رفعت جو کہ پہلے اور دوسرے نمبر پر تھیں ان کے رشتے برابر آ رہے تھے۔ لڑکے برسر روزگار اور بظاہر شریف بھی تھے۔ ایک رشتہ پھوپھی کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن پیسوں کا مسئلہ تھا۔ ابو اگر یہ بات نہ بھی بتاتے تو مجھے معلوم تھی۔ پھوپھی کی اعانت کے لئے اس بار میں اپنے آپ کو نہیں روک پایا۔ کسی سے کچھ بتائے بغیر میں پھوپھی کے یہاں پہنچ گیا۔ کشور دالان میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ دھیرے سے سلام کی آواز آئی۔ اسی آہستگی سے میں نے جواب بھی دیا۔ وہ حسب معمول پیٹھ گھما کر بے نیازی کا مظاہرہ کرتی جھاڑو دینے میں مصروف رہی۔ میں پھوپھی کی تلاش میں اندر گیا۔ اس اثنا میں کئی بار پلٹ کر کشور کی طرف دیکھا۔ ویسی ہی بے نیازی بلکہ ہتک آمیز بے نیازی وہ اختیار کیے بیٹھی رہی۔ محشر ریڈی میڈ فراکیں سینے میں مصروف تھی۔ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا کہ اماں تو ہیں نہیں.... کام پر.... گئی ہیں...."

"کام پر.... کون سا کام.... کہاں....؟" میں سخت حیرت میں تھا۔

"پاس میں ایک بنگلے پر کام کرتی ہیں.... محشر کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات مجھے بتانے کی ہرگز نہیں تھی۔

"کب سے کام کر رہی ہیں وہاں؟"

"پانچ سال ہو گئے۔" مشین چلاتے ہوئے اطمینان سے اس نے جواب دیا۔ "آپ دس منٹ رکیے میں ابھی بلا دیتی ہوں۔" دانت سے تاگا توڑتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں رہنے دو.... میں پھر آ جاؤں گا...." ایک لفافہ (جس میں پانچ ہزار روپے تھے) میں نے محشر کی طرف بڑھایا.... یہ پھوپھی کو دے دینا...."

"کیا۔۔ ہے اس میں....؟"

"کچھ نہیں.... بس.... تم.... انہیں دے دینا...." اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی میں دروازے کی طرف مڑا۔ چوکھٹ کے پاس کشور کھڑی

تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ گاڑی میں آکر بیٹھا تو وہ پردے کا کونا پکڑے جھانک رہی تھی میری نگاہ کا اٹھنا تھا کہ دھڑام سے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے گردن ایک طرف جھکا کر کندھے اُچکائے۔ شاید میں اپنی کج فہمی پر ہنسنا چاہتا تھا۔ پہلی بار کسی نے میرے لئے ہذلت آمیز رویہ اختیار کیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی برا نہیں لگا۔ تمام خیالوں کو جھٹک کر میں نے گاڑی آگے بڑھائی محشر کے اس نئے انکشاف پر میں راستے بھر مغموم وافسردہ رہا۔ شہر کے مشہور بلڈر عنایت علی کی بہن دوسروں کے ٹھیکرے صاف کر رہی ہے۔ یہ تصور ہی میرے لئے شرمناک تھا مگر اس میں لڈو کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ کب چاہتے تھے کہ پھوپھی یہ سب کریں وہ تو پورا خرچ اٹھانے کو تیار تھے۔ پر پھوپھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئیں۔ کبھی کبھی مجھے ان پر غصہ آتا مگر بعد میں پھوپھی کی عظمت کچھ اور بڑھ جاتی۔

وہ رات بہت مشکل میں گزری تھی۔ کبھی لگتا کشور میرے سرہانے بیٹھی رو رہی ہے۔ اگلے ہی پل پھوپھی کا منور چہرہ ہنستا مسکراتا میرے سامنے ہوتا آسمان سے اترتا ہوا ایک نور کا پیکر پاس آتے آتے پھوپھی کی شکل میں منتقل ہو جاتا۔ ذرا اور ذرا دیر میں آنکھ کھل جاتی۔ صبح ہوئی تو معمولات سے نمٹ کر میں لان میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت پھوپھی آتی ہوئی نظر آئیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ میرے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ میں امردوں کا بھرا ہوا پالی تھین تھا۔ میں پھوپھی سے نظریں چرا رہا تھا۔ برقع کے اندر سے ایک ہاتھ نکلا جس میں وہی لفافہ تھا جسے میں کل محشر کو دے آیا تھا۔ "جلدی میں تم کل یہ گھر پر بھول آئے تھے" ہاتھ آگے بڑھانے میں مجھے دقت سی ہوئی جیسے رعشہ آگیا ہو۔ کسی طرح لفافہ سنبھال لیا۔ لڈو کا بھی خوف تھا کہ کہیں وہ باہر نکل آئے تو مشکل اور بڑھ جائے گی۔ جانے سے پہلے پھوپھی مسکرائی تھیں۔ اندر آنے پر لڈو کو انہوں نے بتایا کہ حکیم کے یہاں تمہارے بہنوئی کی دوا لینے آئی تھی۔ سوچا کھڑے کھڑے تمہیں دیکھتی چلوں۔ مجھ میں اب تک اتنی قوت واپس نہیں آئی تھی کہ کچھ بول سکوں۔ پھوپھی نے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ میری اچانک خاموشی پر مجھے ٹوکا بھی اس کے باوجود بھی میری قوت گویائی واپس نہ آسکی۔ ایک کھسیانی ہنسی البتہ میرے ہونٹوں پر ضرور آگئی تھی۔ میں پھوپھی کا تبسم زار چہرہ دیکھتا رہا جہاں خود اعتمادی وافتخار کے ہزار رنگ کہکشاں بکھیر رہے تھے۔ جانے سے قبل ہمیشہ کی طرح انہوں نے مجھے دس روپے دیئے تھے۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

کشور کو چھوڑ کر باقی پانچوں لڑکیوں کی دو سال کے اندر شادیاں ہو گئیں۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا مگر جیسے اب تک یقین نہ آیا ہو۔ اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اترا ہوا محسوس ہوا تھا حالانکہ میں کسی اعداد و شمار میں نہیں تھا مگر پھوپھی کا ہر مسئلہ مجھے اپنا مسئلہ لگتا۔ کچھ کر سکنے کا اختیار میرے پاس نہیں تھا اس کے باوجود میں ان کے لئے فکرمند رہتا۔ رات جاگ جاگ کر پھوپھی کی مانگی ہوئی دعائیں میرے دیکھتے دیکھتے کس طرح بار آور ہوئیں یہ خیال آج بھی مجھے خوشگوار حیرت میں ڈالتا ہے۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے کا تصور بہت عارضی تھا جب یہ معلوم ہوا کشور نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہر ہر طرح سے اسے منایا گیا مگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ شادی نہ کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو بھی دل کا بھید نہیں دیا۔ بس ہر بات کا ایک ہی جواب تھا کہ "نہیں کرنی ہے.... اور مجھے کوئی .... بوجھ.... نہ سمجھے.... اپنی دال روٹی کے لئے یہ مشین بہت ہے۔ کشور کا یہ فیصلہ پھوپھی کو اندر سے مسمار کرتا رہا۔ کہیں نہ کہیں ان سب چیزوں کے لئے ذمے دار شاید میں ہی تھا یہ سب مانتے ہوئے بھی میں کچھ نہ کر سکا۔ آج خیال آتا ہے کہ لڈو کے سامنے مجھے احتجاج" تا چاہئے تھا۔ شاید وہ مان جاتے مگر تعجب ہے کہ یہ ہمت اس وقت کیوں نہیں آئی۔

خود کو مجرم سمجھنے کا احساس میرے دماغ سے کسی بھی پل نہیں نکلتا۔ پھوپھی کے یہاں جانے میں تکلف ہوتا۔ وہ کل والی کشور جو بات بے بات ناراض ہو جایا کرتی تھی، جس کے غصے اور خفگی کا اظہار اکثر ہتک آمیز ہو جایا کرتا مگر کبھی اس میں پرائے پن کا احساس نہیں ہوا۔ جیسا کہ اب ہونے لگا ہے۔ اس کی ضرورت سے زیادہ خدمت اب میرے اندر خجالت پیدا کرتی ہے۔ سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ آج دروازے سے گھسو تو مسکراتے ہوئے کورنش بجالانے والے انداز میں سلام کرتی ہے۔ جتنی دیر وہاں بیٹھو کچھ نہ کچھ کھلاتی پلاتی رہے گی۔ باتیں تو اس قدر کرنے لگی تھی کہ میں تعجب سے اس کا منہ تکتا رہتا۔ اپنے بارے میں ایک لفظ نہیں بولتی اور میں صرف اسی کے بارے میں جاننے کے لئے آتا تھا میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو جواب میں صرف اتنا کہتی کہ بھابھی کیسی ہیں؟ میری قوت گویائی اس کے بعد پھر سلب ہو جاتی۔

پھوپھی کا جب انتقال ہوا تو وہ رمضان کی ستائیسویں شب تھی۔ دوپہر سے بارش ہو رہی تھی مغرب کی نماز ختم ہی ہوئی تھی کہ کشور کا فون آیا۔ روتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ اماں نہیں رہیں۔ ریسور رکھتے ہی تیز گرج کے ساتھ بجلی چمکی تھی۔ گاڑی میں سوار ہو کر ہم لوگ الٹے پیر وہاں پہنچ گئے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے چاروں طرف اولتیاں گر رہی تھیں۔ کچھ لوگ باہر ہی برگد کے نیچے کھڑے تھے۔ ہم تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ کشور دوڑ کر لڈو کے سینے سے لپٹ گئی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں نے چپ کرانے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ لڈو نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مختار نے آکر اسے لڈو سے الگ کیا۔ دالان میں پھوپھی لیٹی ہوئی تھیں۔ کس قدر نور تھا چہرے پر۔ میں بھی کشور کی ہی طرح رونا چاہتا تھا، شاید اس سے بھی زیادہ، مگر یہ ہو نہیں پایا۔ بارش کے پانی میں میرے آنسو

اختر شاہ جہاں پوری



مجھے زندگی کا پتا دے گیا — وہ ہاتھوں میں بجھتا دیا دے گیا
کوئی عکس جس میں ابھرتا نہ تھا — وہ اس آئینے کو جلا دے گیا
مری خاک تو اتنی نم بھی نہ تھی — مگر وہ تو پیکر نیا دے گیا
پرندہ فضا میں جو گم ہو گیا — مری فکر کو راستا دے گیا
میں اب خون کا کس پہ دعویٰ کروں — کہ جب وہ مجھے خوں بہا دے گیا

●RANGEEN CHOUPAL, SHAHJAHANPUR - 242001 (U.P.)

حسن نظامی



طے مجھ سے زندگی کا کہاں فاصلہ ہوا — ہے میرا غم، کہ پھول سے دامن بھرا ہوا
ہریالیوں کے واسطے آنکھیں ترس گئیں — ہر کھیت میں ملا ہمیں پتھر اگا ہوا
اڑتی ہوئی پتنگ کے مانند میں بھی ہوں — مضبوط ایک ڈور سے لیکن بندھا ہوا
ہر سمت احتجاج کی آواز مر گئی — کس خاموشی کے ساتھ یہ محشر بپا ہوا
اس شہر کو فقیر کی جب بد دعا لگی — بارش ہوئی نہ پھر کوئی منظر ہرا ہوا

●SHAMSHER NAGAR JHARIA, DHANBAD - 828111

اتل اجنبی



شہر میں بھٹکے ترے ایسے، نہ بھٹکا کوئی — چاہتے یہ بھی رہے سوجھے نہ رستہ کوئی
دام بس پوچھ کے رہ جاتی ہے دنیا جیسے — کوئی سستہ نہیں مجھ سے نہ ہے مہنگا کوئی
وقت کی مار سے جو پیڑ جھلس جاتے ہیں — لوٹ کر آتا نہیں ان پہ پرندہ کوئی
یہ الگ بات ہے سب جان نہ پائے ورنہ — اس کی باتوں میں تو لگتا تھا اشارہ کوئی
یہ سیاست ہے کہ سازش کہ ہے کچھ اور اتل — اس کی محفل میں ترا ذکر نہ چرچا کوئی

● 8/15 BARA FAUJDARAN, DAULAT GANJ GWASIOR- 1 (M.P)

اطہر شکیل



اپنے ہی خون کے دریا میں اترنا ہوگا — زندہ رہنے کی تمنا ہے تو مرنا ہوگا
عشق تو آگ ہے اور وہ بھی ہو کی اپنے — مجھ کو خود اپنے ہی شعلوں سے گذرنا ہوگا
ڈھونڈ ہی لے گا ہر اک درد مداوا اپنا — وقت کے ساتھ ہر اک زخم کو بھرنا ہوگا
تم ہو کاغذ کا کوئی پھول تمہارا کیا ہے — مجھ کو خوشبو کی طرح روز بکھرنا ہوگا
کام وہ بھی جو طبیعت پہ گراں ہے میری — میرے حالات یہ کہتے ہیں کہ کرنا ہوگا

●MOHALLA PUNJABIAN, NAGINA , 246762, DIST .BIJNUR (U.P)

پردیپ ساحل



کبھی خوابوں خیالوں میں بھی جو سوچا نہیں ہوگا — وہی ہوگا کہ جو اکثر یہاں ہوتا نہیں ہوگا
مرے حصے میں اس کا جسم ہی آیا تو کیا کیجئے — کہ میں نے ہی اسے پوری طرح چاہا نہیں ہوگا
یہی ہوگا ہمارے شہر میں بھی دیکھنا اک دن — ہزاروں لوگ ہوں گے پر کوئی چہرہ نہیں ہوگا
کہ جس نے تم پہ اتنی مہربانی کی، عنایت کی — کہ اس کا نام چاہے کچھ بھی ہو دنیا نہیں ہوگا
اسے اب کون سمجھائے کہ ترچھا بلب کرنے سے — فقط سایہ ہی لمبا ہوگا، قد اونچا نہیں ہوگا

●A-1715, JAHANGIR PURI, DELHI-110033

هم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اورفوری تاثرات کی چند جھلکیاں

۹

دو کے ادبی رسائل میں شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر
صدی کا ایک اہم ترین تاریخی ادبی واقعہ بن گیا ہے۔
بی دنیا نے اس غیر معمولی ادبی دستاویز کا اپنے اپنے طور
قدم کیا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ پاکستان اور
ئی بستیوں میں بھی جس جوش و خروش کے ساتھ ہم
و ادب نمبر کی پذیرائی کی گئی ہے اس کی مثال کم کم
ی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ خاص نمبر اب بھی
ع گفتگو بنا ہوا ہے۔ اس کے متعلق خطوط موصول ہو
ں اور اب خاص نمبر کڑی عملی تنقید سے گزر رہا ہے۔
یکھی جا چکے ہیں کیونکہ جلد دوم کی ترتیب و تہذیب کی
الی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی میں بھی شاعر کا
خاص نمبر موضوع سخن ہی رہے گا اور جو ادبی مکالمے
. کے تناظر میں قائم ہوئے ہیں وہ مزید روشن ہوں
بھی تو اس نمبر کے بہت سارے اسرار کھلنا باقی ہیں
بھی اسے عادت ذہنی سے آگے دیکھنا باقی ہے۔ ایک
ی تعبیر کا ہمیں انتظار ہے۔
بے شمار موصولہ خطوں کے ذخیرے میں سے کچھ اور
، میں دیئے جا رہے ہیں۔ ابھی خاص نمبر کا مطالعہ
ہے لہٰذا خطوں کا سلسلہ بھی جاری ہے (الف۔ الف)

احمد جلیلی

اعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔
کل سے اب ہاتھ آیا ہے۔ اوراق الٹے تو ہر صفحے پر نظر
گئی۔ جانے اتنا سارا معتبر مواد آپ کیسے فراہم کرتے
پنے محترم والد مرحوم کی آپ نے جو روایت قائم رکھی
شاعر کے جو دستاویزی نمبر نکال رہے ہیں وہ لاہور
ش نمبروں سے کم نہیں۔

●H.NO. 22-1-733/1,
SULTAN PURA, HYD-24

ی جعفر

ں نے ابو محمد سحر صاحب سے شاعر کا ہم عصر اردو
مربے کر دیکھا تھا۔ بہت اچھا لگا۔ اس پرچے سے
ہا گیا ہے اور اس کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن مضمون
آنے میں تین چار ماہ لگ جائیں گے۔ یہ ایسا پرچہ ہے جسے
میرے پاس ہونا چاہئے تھا۔ اس میں آپ نے میرے حوالے
بھی دیئے ہیں۔

سید احمد رئیس

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر مل گیا، بہت بہت شکریہ
بڑا انتظار تھا اس معرکتہ الآرا شمارۂ خصوصی کا، دیکھ کر جی خوش
ہو گیا، بے ساختہ آپ کے لئے دل سے ہزاروں دعائیں
نکلیں، اللہ آپ کو سلامت رکھے اور حوصلہ اور استقامت اور
کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ جلد اول، میں آپ نے جس
قدر اہم ادبی تحریریں یکجا کردی ہیں، اور جس مہارت،
ہنرمندی اور اخلاص و محبت سے تزئین و ترتیب کا فن کارانہ
مظاہرہ کیا ہے وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ لائق تقلید
بھی۔ برسوں آپ کے اس جلیل القدر کارنامے پر لوگ
سر دھنیں گے اور آپ کو سلام پیش کریں گے۔ جلد اول میں
'آگرہ اسکول' کے حوالے سے جو مواد یکجا کیا گیا ہے وہ
خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس گوشہ کا نام 'سیماب اسکول'
ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ آگرہ کا ایک محترم نام سیماب ہے اور
سیماب ہی در حقیقت، آگرہ، ہے۔ اس ضمن میں بہت سی
قابل قدر تحریریں آپ نے فراہم کی ہیں مگر پھر بھی یک گو
نہ تشنگی کا احساس رہا، آئندہ خصوصی اشاعتوں میں اس سلسلے
کو اور وسعت دی جانی چاہئے کہ اس موضوع پر بالالتزام
ایک مکمل منظر نامہ سامنے آجائے اور قاری کو اس موضوع
پر ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہ ہو۔ تنقید، شاعری، افسانہ
نہ کے عنوان کے تحت ایک کائنات جلوہ گر ہے، سوانحی لغت
، شاعر ڈائرکٹری خاصے کار آمد گوشے ہیں، آئندہ خصوصی
اشاعتوں میں اگر 'شاعر' میں مندرجہ تحریروں کا کسی نہج سے
کوئی اشاریہ بھی شامل کردیا جائے تو وہ ایک بڑا دلچسپ اہم
کارنامہ ہوگا اور شاعر میں لکھنے والوں کی (شروع سے آج تک
کی) ایک مکمل تاریخ مرتب ہو جائے گی۔ جلد اول ہی میں
ماشاء اللہ آپ نے اتنی حشرت سامانیاں فرمائی ہیں کہ جلد
دوم/ سوم میں کیا کچھ ہوگا، ابھی سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ابھی
یہ خصوصی نمبر زیر مطالعہ ہے، پھر بھی اس کے حوالے سے
گفتگو ہوگی انشاء اللہ۔ ہاں! ایک بات، آپ نے اقبال اور
سیماب کے عنوان کے تحت سید عنایت علی (علیگ) کا
مضمون مندرجہ شاعر آگرہ (۷-۱۹۴۳ء) سے منتخب کیا ہے۔ کیا
یہ عنایت علی، رضوی۔ بی اے (علیگ) تو نہیں جو اس زمانے
میں نگار، شاعر اور دوسرے ادبی پرچوں میں لکھتے رہے ہیں مگر
یہ اکبر آباد کے نہیں تھے۔ اجمیر میں رہتے تھے۔ ان کی بہت
کی تحریریں عنایت تھی۔ سید عنایت علی (علیگ) کے نام سے
بھی درج ہوئی ہیں۔ [سید عنایت علی اور عنایت علی رضوی
غالباً ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں جو فی الحال تحقیق طلب
ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو۔ الف۔ الف]

●3-D-28/ 45, NAZIMABAD,
KARACHI, (PAK)

شاہدہ حیدری

ہم عصر اردو ادب نمبر مل گیا ہے۔ تفصیل سے پڑھ
نہیں سکی ہوں۔ اس کی شاندار ضخامت اور خوبصورتی
مرعوب کردیتی ہے۔ آپ کی محنت اور لگن اس کے ہر حصے
سے عیاں ہے۔ اور اس کے لئے جتنی بھی تعریف کی جائے
کم ہے۔ یقیناً آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔
اور یہ ہر بار کی طرح اس بار بھی متاثر کرتا ہے۔ ہر حصے
کی ابتدا کرتے ہوئے آپ نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے
ساتھ گراں قدر باتیں کہی ہیں۔
اس نمبر کو دیکھنے کے بعد علامہ سیماب اکبرآبادی کی
عظیم شخصیت کے اور بھی بہت سے پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔
یوں تو ان کی بزرگ، ذبر تر ادبی حیثیت اور ان کے اعلیٰ مقام
سے کون واقف نہیں۔ مگر آپ نے کچھ نئی باتوں اور حقائق
کو سامنے لا کر عام قاری کو فیضیاب ہونے کا موقع دیا ہے۔

●REENA HOUSE JAGJIWAN ROAD,
GAYA -823001 (BIHAR)

رفعت صدیقی

"شاعر" کا "ہم عصر اردو ادب نمبر" وصول ہوا۔
سرسری طور پر جائزہ لیا تو ایک عجیب سی حیرانی ہوئی۔ بارہ سو
سے زیادہ صفحات... اس عظیم الشان نمبر کے ایک ایک صفحے

سے آپ کی اور آپ کے مستعد عملے کی برسہا برس کی جان توڑ محنت اور لگن جھلکتی ہے۔ ان ناسازگار حالات میں اردو کی ایسی عہد ساز دستاویز کا منصۂ شہود پر آنا اردو زبان و ادب کے ستاروں کے لئے مژدہ جانفزا سے کم نہیں۔ میں اس جام ارغوانی سے جرعہ جرعہ پیتا رہوں گا کہ خمار برسہا برس تک رہے۔ بہر حال میری جانب سے اس شاندار کارنامے پر تہہ دل سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈائریکٹری میں میرا تعارف اور پتے کو جگہ دینے کیلئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک بات۔ میرا مضمون بہت اچھے انداز میں شائع کیا گیا ہے لیکن مضمون کے ساتھ، کسی اور صاحب کی فوٹو شائع ہوگئی ہے۔ اس سہو کا ازالہ آئندہ کے کسی شمارے میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ [ادارہ کو اس سہو پر افسوس ہے]

●FLAT NO.3, 'B' BLOCK, HUMAYUN NAGAR, HYD.28(A.P)

عالم خورشید

ہم عصر ادب نمبر ابھی سرسری طور پر دیکھ سکا ہوں، اب مجھے احساس ہوا کہ عام شماروں کی صحت خراب کیوں ہوگئی تھی۔ یہ اندازہ تو تھا کہ نمبر اچھا ہوگا مگر اتنا اچھا ہوگا اس کا اندازہ قطعی نہ تھا۔ اس رنگارنگ نمبر پر کتنی محنت صرف ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا بھی بے حد مشکل کام ہے۔ کسی سنک یا جنون کے سہارے ہی یہ کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ خدا آپ کے اس جنون کو سلامت رکھے۔

اس نمبر کا سب سے اہم حصہ فکشن کا گوشہ ہے جو بے حد بھرپور ہے۔ امید اگلے نمبر میں آپ غزل کے حوالے سے بھرپور گوشہ تیار کریں گے۔ تفصیلی رائے پھر کبھی۔ سر دست اس کارنامے کے لئے مبارکباد قبول کریں۔

●C/O THE D.A.(P) EHEBITION ROAD, PATNA-800001.

ارمان نجمی

ہم عصر اردو ادب نمبر موصول ہوا۔ واقعی بہت خوب صورت نمبر شائع کیا ہے آپ نے جس کے لئے آپ اور آپ کے رفقائے کار تحسین و تعریف کے قابل ہیں۔ آپ نے ادارت کا حق اس طرح ادا کیا ہے کہ اصناف کے جائزے کے ساتھ اپنے ادارتی آراء کا تفصیلی اظہار کیا ہے جس سے تمام جائزے جامع اور مکمل ہوئے ہیں۔ رہی اختلاف کی گنجائشیں تو وہ تو ہر بات سے ممکن ہے۔ مگر یہی اختلافات تو ہماری فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا ہے کہ اختلاف کو برداشت ہی نہیں کرپاتے۔

●AL DARAB GENERAL HOSPITAL AL DARAB, GIZAN (K.S.A)

پرکاش تیواری

ہم عصر اردو ادب نمبر ملا، شکریہ، محنت کا پھل مل گیا: بہت خوبصورت چھپا ہے۔ نیا انداز اور نیا اسلوب دل کو بھاتا ہے۔ مواد بھی بہت اچھا ہے۔ نئے لکھنے والوں نے بھی کافی متاثر کیا ہے۔ اس کے گٹ اپ نے اسے اور بھی خوب صورت بنادیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی قیمت بہت ہی کم ہے۔ کم از کم پانچ سو روپئے تو ہونا ہی چاہئے تھی۔ خیر! نمبر کی اشاعت پر ایک بار پھر دلی مبارکباد۔

●B-4, ROSE APT. SEC- 14(EXTN) ROHINI, NEW DELHI-85

قمر جمالی

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر مل گیا ہے۔ اس MAGNUM کی اشاعت پر مبارکباد بہت بہت مبارکباد۔ نمبر ابھی مطالعے میں ہے۔ تفصیلی رائے بعد میں دوں گی۔

●FLAT NO. 117-C.A. G. COLONY P.O. YOUSUF GUDA, HYDERABAD-45

غلام نبی خیال

یہ خاص نمبر نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ آپ کی مساعی کا ایک شاندار ماحصل بھی ہے جس کی تکمیل میں آپ اور آپ کے معاونین نے خون پسینہ ایک کیا ہوگا۔

مجھے آپ کی اردو کے تئیں بے لاگ اور بے خوف وفاداری اور جاں نثاری ان سینکڑوں اردو کے علمبرداروں کا منہ چڑانے پر مجبور کررہی ہے جو اردو کو محض اپنی سیاست گری اور دکانداری کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس مظلوم زبان کی ترویج کے لئے کچھ بھی نہیں کررہے ہیں۔

●RAWALPURA HOUSING COLONY SRINAGAR-190005 (KASHMIR)

رئیس وارثی

"شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر کی عدیم المثال اشاعت پر ڈھیر ساری مبارکباد قبول فرمایئے آپ نے انتہائی محنت جانفشانی، عرق ریزی اور سچی لگن سے اردو ادب کی ایک ایسی دستاویز فراہم کردی ہے جو تاریخ ادب میں ایک شاہکار سے کم نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اتنے ضخیم شمارے میں کتابت کی بہت ہی کم غلطیاں ہیں، نثر و نظم، مضمون تبصرے، مکتوبات، تصاویر گویا ایک سے ایک نایاب چیز موجود ہے جو قاری کو مسلسل اپنی جانب مبذول رکھتی ہے یقیناً اس کامیابی کا سہرا آپ کی کاوش پیہم کے سر جاتا ہے۔

●74-13 WOODSIDE AVENUE, ELMHURST, N.Y.11373- (USA)

محمد توفیق خان

میں آپ کے لئے اجنبی سہی لیکن آپ کے دادا صاحب مرحوم سیماب اکبر آبادی اور والد محترم جناب اعجاز صدیقی کی تحریروں کا عاشق رہا ہوں۔ صحیح تاریخ تو یاد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور خیال ہے کہ ۴۰ء یا ۴۱ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی سرونج تشریف لائے تھے اس وقت سرونج کا ادبی ماحول کیا ہوگا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میں شاعر کو اس وقت سے پڑھ رہا ہوں اور آج بھی یہ پرچہ میرے مطالعے میں رہتا ہے۔ اگر آپ کے خاندان میں کسی کی شاعری کا ذکر نہ بھی کیا جائے اور صرف اردو صحافت پر ہی لکھا جائے تو آپ کی ادبی خدمات پر ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ آپ نے "شاعر" کو کلاسیکی شاعری اور روایتی شاعری سے لیکر نئی نسل کی نمائندگی تک ایک بڑے ادبی حلقے کو روشناس کرایا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسے ایسے معلوماتی مضامین شائع ہوتے ہیں کہ ۳۲ صفحے کے اس دبلے پتلے "شاعر" کو میں اپنی سب سے اہم فائل میں رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ابھی حال ہی میں باقر مہدی کا ایک ایسا ہی مضمون شائع ہوا ہے اسی طرح کبھی کبھی آپ کے خاص نمبر کے اعلان پانچ سال تک پڑھتا رہتا ہوں تو ذہن میں ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے لیکن ایک طویل انتظار کے بعد جب نمبر دیکھتا ہوں تو دل یہ چاہتا ہے کہ فوراً بمبئی پہنچ کر ہی مبارکباد دوں۔ ہم عصر نمبر دیکھ کر بھی یہی دل چاہا ابھی پڑھ نہیں پایا ابھی ایک سال تک تو اسے دیکھوں گا۔

●SIRONJ-464228 (M.P)

مکتوبات

۱۹۹۹ء میں شاعر کے عام وخاص شماروں کو ۱۹۹۸ء کے شماروں سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) کے بعد دو خصوصی شماروں نے اردو ادب کے باذوق قارئین کو سخن کے نئے ذائقوں اور مطالعے کے ایک نئے احساس سے سرشار کیا ہے۔ مذکورہ شماروں پر پسندیدگی کے خطوط برابر موصول ہو رہے ہیں۔ جنوری تا دسمبر، ہر شمارے پر قارئین کے تلخ وشیریں خطوں کا زبردست دباؤ رہا ہے۔ قارئین شاعر کے یہ خط ہمارا حوصلہ، ہماری دلچسپی اور شاعر کو خوب سے خوب تر بنا دینے کی کوششوں کو قوت دینے والے ہیں۔ بہت سارے تعریفی وتوصیفی خطوط تو ہم شائع بھی نہیں کرپاتے، مگر ہم ان خطوط نگار حضرات کے شکر گزار ضرور ہوتے ہیں اور ہر شمارے کی ترتیب وتہذیب میں ان کی محبتوں کو شامل رکھتے ہیں مکتوبات کے اس مقبول ترین اور اہم ترین باب کے لئے ایسے خطوں کو ترجیح دی جاتی ہے جن میں رسالے کے مندرجات کے حوالے سے کوئی علمی، ادبی و تحقیقی بحث قائم ہو سکے۔ کوئی ایسا خوب سیرت مکالمہ قائم ہو سکے جو بصیرت افروز ہو؟ معلومات میں اضافہ کرتا ہو، نئی نسل کی ذہنی تربیت میں معاون ہوتا ہو، ہم اس باب کو مزید دلچسپ اور بامعنی بنانا چاہتے ہیں۔ روایتی اور میکانیکی پیٹرن کو توڑنا چاہتے ہیں، کسی تنازعے اور سنسنی کے بغیر۔ یقین ہے کہ شاعر کے بے شمار قارئین ہمیں اپنا قلمی تعاون دیں گے۔ اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازیں گے کیوں کہ شاعر آپ کا اپنا رسالہ ہے۔

اکتوبر کے شمارے پر آراء خاصی بڑی تعداد میں موصول ہوئی ہیں لیکن ستمبر اور ماقبل دیگر شماروں پر بھی آراء کی بڑی تعداد موجود ہے اور ابھی سلسلہ جاری ہے لہٰذا نئے پرانے خطوط جنوری ۲۰۰۰ء کے اس شمارے میں سجا دیے گئے ہیں۔

[الف الف]

اکتوبر ۹۹ء

لطیف الزماں خاں

یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ اہل ڈاک میں بھی باذوق حضرات پائے جاتے ہیں اس کے باوجود کبھی کبھی شاعر مل جاتا ہے سب سے زیادہ دلچسپی میری اس عبارت سے ہوتی ہے جو آپ سیماب صاحب کی کسی تحریر سے شائع کرتے ہیں۔ اب ایسی اردو لکھنے والے تو دور کی بات ہے پڑھنے والے بھی مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

اس وقت اکتوبر ۹۹ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپ نے "اساتذہ اور طلباء بھی تو اردو ادب کے قاری ہو سکتے ہیں؟" کے عنوان سے جو کچھ لکھا وہ صحیح لیکن جو اساتذہ نصاب تک نہیں پڑھتے انہیں آپ کیا کہیں گے۔ ہمارے ہاں تو حال یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا وہ محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے اس لئے کہ اسے کچھ کرنا نہیں ہوتا صرف تنخواہ لینی ہوتی ہے سو پابندی سے لیتا ہے۔ طلباء نصابی کتب نہیں خریدتے بلکہ تیسری چوتھی جماعت سے لے کر ایم اے، تک گائڈ بازار میں ملتی ہیں وہ گائڈ پڑھتا ہے اور پاس ہو جاتا ہے۔ ٹی وی پر اتنے چینلز ہیں اور پروگرام ایسے اور اتنے ہیں کہ ادبی کتاب یا ادبی رسالہ کون پڑھے۔ کون سر کھپائے۔

مرحوم مولانا صلاح الدین صاحب ادبی دنیا جیسا رسالہ ایک روپئے میں قاری تک پہنچاتے تھے۔ جو کچھ تھا اردو کی خدمت میں لٹادیا اور رسالہ بند ہو گیا۔ صہبا لکھنوی افکار شائع کرتے رہے ٹرسٹ بنا تا ہزار جتن کئے رسالہ بند ہو گیا [خدا کا شکر ہے کہ افکار دوبارہ جاری ہو گیا ہے (ادارہ)] مولوی عبدالحق صاحب مرحوم ہر شخص سے ایک پیسہ طلب کرتے تھے کسی نے نہ دیا۔ آپ نے شاعر کی قیمت صرف نو روپئے رکھی ہے اس زمانے میں چائے کی پیالی چار پانچ روپئے میں اور ایک سگریٹ دو روپئے میں آتی ہے۔ آپ کب تک رسالہ شائع کر سکیں گے۔ صدیقی صاحب اساتذہ اور طلبہ سے توقع نہ کیجئے آپ کو معلوم تو ہوگا ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے عصری ادب شائع کرنا بند نہیں کیا وہ خود بخود بند ہو گیا۔

●C-149, GHALIB NUMA, HALI ROAD, GILGISHT, MULTAN,(PAKISTAN)

محمد سعید الظفر چغتائی

اکتوبر ۹۹ء کا شمارہ موصول ہوا۔ علامہ سیماب کے یادگار رسالے میں ناموزوں اشعار اکثر چھپتے ہیں اس لئے محمد اظہار الحق کی نعت تصویر کے نیچے [قدر کے بجائے] اقدار کے بعد اور مصنف اقبال توصیفی کے ایک شعر کے دونوں مصرعے دیکھیے:

کیا ہوا تیرا (وہ؟) پندار انا
کیا ہوئے سارے غبارے تیرے

غبارے بہ تشدید 'ب' ہے۔ تعجب نہیں ہوا کہ اب بھی روایت پڑگئی ہے۔ مگر یہ جان کر یقیناً حیرانی ہوئی کہ قتیل شفائی جیسا شاعر اپنی شاعری کی ناپ تول سے اتنا معصوم ہے۔

نو شعر میں ۶/ مصرعے خارج الوزن (تفصیل دیکھئے):

تیسرا مصرعہ: جو ہٹ والے لفظ میں ایک رکن کم

چوتھا مصرعہ: 'سو کوس' پڑھنا پڑتا ہے

گیارہواں مصرعہ: بار بار کا پھیلاؤ کرکے 'بربار'

بارہواں مصرعہ: آدھا رکن کم (چھ کے بجائے ساڑھے پانچ)

چودھواں مصرعہ: یا تو "ہوئی" پڑھیں ورنہ آدھا رکن کم

آخری مصرع: ناپ کا 'پ' گرتا ہے اور ۶/ رکن پھر بھی پورے نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے وہ ناموزوں کو رنگ ورس میں گنتے ہوں۔

اختر سعید خان کی دونوں غزلیں معیاری اور پرکیف ہیں، انہیں چھاپنے کے لئے ان کو اور آپ کو مبارکباد۔

●KABIR COLONY, JAVEDPURA ALIGARH-202002 (U.P)

نصر قریشی

شاعر کے مئی ۹۹ء کے شمارے میں اداریہ کے تحت غزل، غزل کار اور ناقد، میں اہل شعور کو دعوت فکر و نظر دینے کے بعد آپ نے غزل کے امکانات اور مستقبل کے بارے میں ذہن ودل کو بصیرت دینے والے مضامین شائع کئے ہیں۔ اکتوبر ۹۹ء کے شاعر میں معتبر شاعر ظہیر غازی پوری اور غزل شناس ڈاکٹر پنہاں نے غزل کی حمایت میں بھرپور دلائل کے ساتھ بحث کی جو بحث برائے بحث نہیں ہے بلکہ سنجیدہ انداز میں غور کرنے کی ہے دعوت بھی ہے۔ اس اردو کش دور میں اردو پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ روز بروز سمٹتا جارہا ہے۔ اردو رسم الخط تو ایک زمانے سے نرغۂ دشمناں میں جائے اماں کی تلاش میں اور خود کو بچانے میں سرگرداں ہے۔ ایسے ڈستے ماحول میں اردو زبان کا نام عوامی سطح پر غزل کی وجہ سے مقبول ہے۔ آپ کی اس تحریر سے ہر سنجیدہ ذہن کو اتفاق ہوگا کہ "نئی غزل اور زیادہ معیاری اور بڑی شاعری کے زمرے میں آئے کلاسیکی غزل ہی کی طرح زرخیز ہو۔ عالمی شاعری کے ساتھ رکھی جاسکے۔ یہ ممکن ہے کیونکہ آج کی غزل میں اس کے امکانات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ مرے نہیں ہیں۔ صنف زندہ ہے تو اس کے اوصاف بھی زندہ ہیں۔ بس یہ ہے کہ ہمارے غزل کاروں کے لئے کچھ نئے ضوابط، اصول

اور حدوں میں ان کی تربیت از بس ضروری ہو گئی ہے"
(افتخار امام صدیقی) شاعر نے اردو زبان وادب کی تشہیر وبقا کے سلسلے میں تاریخی خدمات انجام دی ہیں اور اپنے زمانہ آغاز سے تا حال ادب کے بدلتے رجحانات، تحریکات اور نظریات کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے قارئین کو صحیح سمتوں سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے اسی لئے ملک ادب میں شاعر کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ محترم المقام سیماب اکبر آبادی، اعجاز صدیقی نے نامساعد حالات میں بھی 'شاعر' کو زندہ رکھ کر اردو کا نام جگائے رکھا ہے۔ لائق خانودے کے لائق جانشین افتخار امام نے بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ یہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا روشن اظہار 'شاعر' کے بیشتر خصوصی شماروں کے علاوہ "ہم عصر اردو ادب نمبر بھی ہے جو اردو مخالفین کے درمیان اردو زبان وادب کی روشن زندگی کی ایک تابناک علامت ہے۔ ہم اس نمبر کو دنیا کے کسی کونے میں اردو کی حمایت میں فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

●774-HATIA BAHADUR GUNJ,
ALLAHABAD- 211003 (U.P.)

ناصر راهی

"غزل ہزار چہرہ، معجز نمایا اندھا کنواں" اردو غزل کی شعوری حیات کے لئے رہنما مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اساتذہ وطلباء کے علاوہ جو لوگ اصناف سخن کے راقم ہیں، میرے خیال میں وہ بھی قاری ہی ہیں اور زبان کی بقاء وسالمیت کے لئے ان کا قاری ہونا کہیں ناگزیر ادبی فریضہ ہے۔ سیماب اکبر آبادی کا خطبہ اقتباس اصل شعر کی پہچان پر ایک عمدہ تحریر ہے۔ نظمیں غزلیں سبھی معیاری وپیاری ہیں۔ چاروں کہانیوں نے متاثر کیا۔

●TELCO. BARINAGAR
JAMSHED PUR-831008

سلیم شهزاد

ناول کا مطالعہ اچھا ہے۔ لیکن غزل پر مکالمہ بے سبب اور جذباتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جدیدیت کے خاتمے کے بعد مابعد جدیدیت کے فلسفانہ تسلط نے شعر وادب کی تخلیقیت کو ماند کردیا ہے، بھلے آپ کے نظام صدیقی صاحب اس کی وکالت کرتے ہیں، تخلیقیت کی اولیت مسلم ہے کہ یہ کسی بارت، یا دریدا کے بے رس فلسفے سے جنم نہیں لیتی۔ بہر حال! غزل کو HIGH LIGHT کرنے میں آپ کی مساعی جمیلہ کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔

●337- MANGALWAR WARD,
MALEGAON- (M.S.)

حکیم منظور

پہلے شارق جمال صاحب نے 'طمانیت' کی 'ی' کو غیر مشدد بتا کر اپنے مبلغ علم، کا پتہ تو خیر دیا ہی مگر اس عمل میں کتنے گمراہ ہوئے ہوں گے، کون جانتا ہے۔ اب اکتوبر میں تاج پیامی صاحب نے میرے شعر کی ٹانگ اپنی بے جا برسر خود غلط اور دور از کار تشریح سے توڑ دی ہے۔ شعر ہے:

اپنے اپنے طور پر دونوں کی تھی اک اپنی بات
اس نے کچھ پوچھا نہیں، میں نے بھی کچھ مانگا نہیں

تاج صاحب نے دوسرے مصرعے سے لفظ بھی نکال کر اپنے 'حق' کا استعمال کیا ہے اور یہ کہہ کر کہ محاورہ 'بات پوچھنا' ہے بات مانگنا نہیں اور اس مستزاد "استادی کا حق" ادا کرتے ہوئے ان کا یہ لکھنا مجھے 'میں نے کچھ کہا نہیں، لکھنا چاہئے تھا مگر قافیہ کی تنگی تھی، مجھے بے حد گراں گزرا۔ پندرھویں صدی کے ذہن کا اکیسویں صدی میں کیا کام!؟ میرے شعر میں 'بات' کے معنی محض منہ سے نکالی ہوئی بات نہیں۔ تاج صاحب کو معلوم ہوگا کہ فیروز اللغات میں لفظ 'بات' کے باسٹھ (۶۲) معانی بتائے گئے ہیں: جن میں میرے شعر کے حوالے سے یہ چند برمحل ہیں:

"کہانی، گلہ، شکوہ، ضد، ہٹ، وجہ، عزت (حیثیت) عندیہ، منشا، مقصد، مدعا، معاملہ، ڈھنگ، سبھاؤ، دعویٰ، انداز،

اب پہلے مصرعے میں بات کی جگہ اِن الفاظ میں کوئی بھی لفظ رکھ کر دیکھئے کہ شعر کے کیا معنی بنتے ہیں اور محترم تاج صاحب نے سطح اور سطحی طور پر شعر کو پڑھ کر، اس پر کیا قیامت ڈھائی ہے۔ یہ خود ساختہ استادوں کا نیا قافلہ اردو زبان کو مار کے رکھ دے گا۔ ان کو آپ کی سرپرستی حاصل رہی تو اردو قلی قطب شاہ کے زمانے کی طرف پلٹ جائے گی۔ مزید ان کا یہ کہنا کہ غزل کا مقطع بھی بے کار ہے، مجھے بے حد ناشائستہ محسوس ہوا۔ ان کو شاید کہنا تھا کہ، ان کی غزل کا بھی مقطع..... ، مگر استادوں کو کون سمجھائے کہ لفظ 'بھی' کی تقدیم و تاخیر سے جملہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کو کوئی شعر یا کوئی غزل پسند نہ آئے مگر یہ حق انہیں کس نے دیا کہ وہ کسی غزل یا شعر کے بے کار ہونے کی سند بانٹتے پھریں، وہ کہہ سکتے تھے کہ انہیں مقطع پسند نہیں آیا، مگر یہ کہنا کہ مقطع بے کار ہے حد درجہ قابل اعتراض ہے، ویسے جس شخص کو 'بات' کے معانی ہی کا اندازہ نہ ہو بلکہ جانتا ہی نہ ہو، اس سے الجھنا میرے خیال میں غیر سود مند ہے تہذیب کلام کا خیال رکھنا کئی لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

●10-PARTAP PARK PRESS ENCLAVE,
SRINAGAR-1 (KASHMIR)

جمال اویسی

غزل پر تو بہت دنوں سے بحث چل رہی ہے۔ تازہ شمارہ میں بھی جناب ظہیر غازی پوری کا ایک ادبی فیچر شامل ہے جو غزل پر ہے۔ پھر آپ مسلسل غزل اور غزل گائیگی اور غزل اور غزل کلچر وغیرہ پر اداریے لکھ رہے ہیں۔ آپ بہت اچھا لکھ رہے ہیں لیکن ان کی افادیت صرف اچھا کہہ دینے بھر نہیں ہے، یہ ہمیں نئے زاویے سے سوچنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ غزل اور کلاسیکی آداب شاعری سے متعلق آگرہ اسکول کی خدمات کا بھی معترف ہوں، سیماب صاحب اکبر آبادی کو میں نے بھی پڑھا ہے اور "شاعر" کے ذریعہ مزید جانکاری ملتی رہتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اتنے سارے شاگرد تھے جن میں مختار صدیقی جیسے مشہور نظم نگار بھی شامل ہیں "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے آگرہ اسکول کا میں نے بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر آپ اپنے ادبی ورثہ کو سنبھال کر نہ رکھیں اور ان کا نئے ادبی ماحول سے تعارف نہ کرائیں تو دونوں طرف کا نقصان ہوگا۔

●MOHALLA FAIZULLAH KHAN,
DARBHANGA (BIHAR)

شهاب اختر

شاعر کا اکتوبر شمارہ ملا۔ اداریہ میں آپ نے ایک حق بات کہی اسی حق بات کے کہنے میں محبوب الرحمٰن فاروقی نے اپنا اداریہ لکھنے کا حق کھودیا ہے۔ آپ اس حق کوئی تحریک کو آگے بڑھائیں۔ سچ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی آنکھ کے پانی کا سوچنا چاہئے جس زبان کی روزی وہ کھاتے ہیں اس کی تبلیغ اور نشو نما میں کسی طرح کی حصہ داری اپنی نہیں دینا چاہتے۔ یہ تو حرام کاری ہوئی نا۔ جتنے لوگ اردو سے دولت کماتے ہیں اور اپنے گھر سکھ سے رہتے ہیں اس تعداد کے پانچ فیصد لوگ سالانہ ۱۰۰ روپئے اردو رسالوں کے نام کردیں تو اردو رسائل کے فنڈ میں کروڑوں روپئے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اردو کی نصابی کتابوں پر بھی غور اب ضروری ہے۔ ہم اب نئی صدی کے آغاز پر ہیں۔ ہمیں عالمی صلاحیت کے روبرو ہونے کی اہلیت پیدا کرنی ہوگی۔

اب چند باتیں غزل کے تعلق سے۔ افتخار بھائی! یہ کہنا درست نہیں کہ غزل ہر دور میں مقبول رہی اور معتبر بھی اس

لئے آگے بھی رہے گی۔ حق تو یہ ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ لیکن غزل کو اپنے موضوعات بدلنے ہوں گے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ غزل فارسی شاعری سے مستعار ہے غزل کے اوزان عربی اور فارسی آہنگ سے ہیں۔ ر اس بات میں تو کوئی سچائی نہیں کہ نظم گو شعراء غزل مخالف ہیں۔ ایسا بہر صورت نہیں۔ آپ اختر الایمان کے یک نام سے اس بات کا اعلان نہیں کر سکتے اور نہیں کرنا چاہئے۔ اب بات رہ جاتی ہے صنف غزل کی تو اس پر ہی گفتگو ہو۔ ویسے بھی ادب میں مخالف رائے رکھنے کی اجازت ہے۔ میں غزل کا مخالف نہیں تو طرفدار بھی (آج کی غزل) نہیں ہوں۔ غالب سی غزل لکھ جائے کوئی میں پھر دیوانہ ہو جاؤں گا۔ ایک بات میں درست مانتا ہوں کہ صدی کے آخر میں غزل پہ بحث کی شروعات آنے والی صدی میں بہتر معلوم ہوگی۔

یہ شمارہ خاص ہے۔ نظام صدیقی اور ممتاز احمد خان کے مضامین بے حد اہم ہیں مرزا حامد بیگ اور سمیرا ناظم کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ سمیرا ناظم کی کہانی میں Inner filling لہری ہیں اور یہ کہانی قاری کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ قدرت سے لگاؤ کہانی کا تھیم Project ہے اور Releation کے جڑاؤ کی حمایتی ہے یہ کہانی۔

شاعری کے حصے میں رؤف خلش، اختر سعید خاں، قتیل شفائی، لطف الرحمن، کشمیری لال ذاکر، اور شگفتہ یاسمین پسند آئے۔

●CALCUTTA CLOTH STORE,
KAPRA PATTI,JHARIA- 828111(BIHAR)

پرویز اختر

شمارہ اکتوبر ۹۹ء کے تمام مشمولات حسب روایت بہت عمدہ ہیں۔ اس وقت شعری کائنات میں 'غزل' کی وہی حالت ہے جو کہ دنیا میں 'مسلمان' کی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آپ غزل کے لئے جو بھی کر رہے ہیں وہ جہاد کے آس پاس ہی ہوگا۔ اس شمارے میں قتیل، اختر سعید خان، لطف الرحمن اور مصحف اقبال توصیفی کی غزلیں نہایت ہی عمدہ ہیں۔

●QUZI SARAI,
CHANDPUR-246725 (U.P.)

شہباز صبیح

"شاعر" کا شمارہ اکتوبر ۹۹ء زیر مطالعہ ہے۔ "ادبی فیچر" غزل۔ ہزار چہرہ معجز نما یا اندھا کنواں" بہت پسند آیا۔ اس معروف اور معتوب صنف کے مستقبل کے روشن امکانات کے متعلق محترمی ظہیر غازیپوری کے خیالات کافی امید افزا ہیں اس سلسلے میں غزل کے معنی سے متعلق پنہاں صاحبہ نے کافی وقت ضائع کر دیا کہ غزل کے معنی "عورتوں سے باتیں کرنا ہے" جب کہ غزل کی عمومی تعریف یہ مشہور ہے کہ "غزل کے معنی محبوب سے باتیں کرنا ہے" اور محبوب کا دائرہ نہایت وسیع ہے، یہاں تک کہ تنگنائے غزل ایک صریح الزام معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنف غزل تمام اصناف سخن پر بھاری ہے۔ طویل بیانیہ مثنویاں ہوں یا رزمیہ شاعری کے طویل ترین مراثی، غزل کی ایمائیت ،اشاریت ان اصناف کو بھی بخوبی ادا کرتی ہے صرف ذہن رسا درکار ہے مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں اٹھایا نہ گیا

شہادت امام حسینؓ کی جانب خوبصورت اشارہ ہے۔ ایسے ہزاروں اشعار ہیں جو اشاروں میں واقعات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ محترمہ پنہاں نے چند اقتباسات کے بعد غزل کی اصل معنی کی جانب رجوع کیا اور غزل شناسی کا حق ادا کیا ہے مبارکباد کی مستحق ہیں کہ سات سمندر پار سے بزم 'شاعر' میں شرکت کرتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ستیہ پال آنند کی نظم قابل ستائش ہے۔

افسانوں میں 'تعاقب' نے متاثر کیا۔ نظام صدیقی صاحب کے مضامین نہایت معلوماتی مگر دماغی ورزش کی دعوت دیتے ہیں کافی دنوں تک دماغ اس میں الجھا رہتا ہے اور ابہام تفہیم کی کشمکش قائم رہتی ہے۔"

●623, WASIABAD, ALLAHABAD

اشرف خان

اکتوبر کا شمارہ ملا۔ چند سطور غزل کے تعلق سے تحریر کر رہا ہوں۔ ادبی فیچر سے معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ بحث کافی پرانی ہے۔

''غزل کی شاعری بہت خوبصورت ہے''

غزل اردو شاعری کی محبوب اور روایتی صنف سخن ہے۔ جس کے دم سے اردو شاعری کا نکھار ہے۔ مگر غزل کی تنگ دامنی کو بنیاد بنا کر اسے مطعون کرنے کی کئی بار کوشش کی گئی۔ لیکن وہ بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔ اور زمانے نے دیکھ لیا کہ اردو شاعری کی آب غزل ہی کے دم سے ہے۔ اس لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو "اردو شاعری کی آبرو" کہا ہے۔ ہمارے جن شاعروں نے اپنے خون جگر سے چمن غزل کی آبیاری کی ہے۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ بلکہ اس میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو شاعری پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ اردو شاعری میں آج تک صنف غزل ہی میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اور صرف یہی بات غزل کی مقبولیت کے اظہار کیلئے کافی ہے۔ آج غزل کا میدان اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ صنف غزل میں ہر قسم کے مضامین باندھے جا رہے ہیں۔ بلکہ اس کی تنگ دامنی پر شک کی سابقہ روایت بھی ختم ہو چکی ہے۔ اور آج تو یہ حالت ہے کہ اردو شاعری میں غزل ہی نے حالات و واقعات سے نبرد آزما ہو کر اپنے آپ کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ اور آج کی جدید شاعری کے اظہار کا سب سے پسندیدہ ذریعہ بھی غزل رہی ہے۔

●AT: DHOTRA, P.O.MURTIZAPUR
DIST. AKOLA-444107(M.S.)

ستمبر ۹۹ء

دلنواز صدیقی

"شاعر" جاں فشانی اور جوئے شیر لانے کا مظہر ہے۔ کہانیوں میں البتہ علامتی غرب اور ایک مریض ثقافت کی نقالی نظر آتی رہتی ہے کبھی کبھی۔ اس کم مایہ تہذیب کا ادب ہم نے پڑھا ہی نہیں پڑھایا بھی ہے اور پڑھاتے بھی ہیں۔ لیکن بات جب موازنہ اور تفہیم (evaluation) کی ترقی ہے تو بات صنف ادب سے آگے افکار اور ان کی صحت تک پہنچتی ہے۔ اگر چہ فی الوقت مواصلاتی ٹکنالوجی کے بل پر ناقص اور غیر ثقہ خیالات کی ترویج ہوگی۔

ادب دور کہاں عہد اہل حرمت میں
زباں اسکی، سخن اس کا، لہجہ اسکا ہے

[دل نواز صدیقی]

لیکن باہوش انسانوں کو ان کی طاقت سے مرعوب ہو کر اپنی اعلیٰ اقدار کو طاق میں نہیں رکھ دینا چاہئے ورنہ ہمارے بزرگوں کی روحوں کو تکلیف پہنچے گی۔

دشمن کی طاقت سے مت ڈر کام لیا کر حکمت سے
شاہ کو اکثر شہ دے دی ہے اک چھوٹے سے مہرے نے

[دل نواز صدیقی]

●RODGEWORD ROAD,
SHIPPENILLE, PA 16254 USA

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

شاعر میں تبصرے کے لئے کتابوں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے جس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کتابوں پر تبصروں کے لئے مختلف اہم مبصرین کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اب شاعر میں باقاعدہ تبصرے دیئے جا رہے ہیں۔ نئی کتابوں کے ساتھ پرانی کتابوں پر بھی تبصرہ دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی اہم کتاب کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ ہم عصر اردو ادب نمبر۔۲ میں کئی سو کتابوں پر تبصرے دیئے جائیں گے۔ کتابوں اور تبصروں کی اس دوڑ اور پیشکش کے ساتھ "نقد و نظر" کو مزید خوب سیرت بنایا جائے، اس پر غور کیا جا رہا ہے کیونکہ ہم مطمئن نہیں ہیں۔ تبصروں کو ابھی کچھ اور دلچسپ، متنوع اور معلوماتی ہونا چاہئے۔ شاعر کے مبصرین اس بات کا خیال کرتے ہوئے اپنے تبصروں کو زیادہ سے زیادہ بامعنی اور گرانقدر بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ شاعر میں تبصرے کے لئے کتابوں کا زبردست دباؤ ہے اور ہر صاحبِ کتاب کا اصرار بھی رہتا ہے کہ جلد تبصرہ شائع کیا جائے، جو ممکن نہیں۔ نقد و نظر کیلئے کئی ایک منصوبے زیرِ غور ہیں۔

[الف۔ الف]

تاریخ حیدر آباد

ڈاکٹر حمید الدین شرفی

حیدر آباد کا چار سو سالہ جشن منانے کے سلسلے میں ایسی کتاب کا شائع ہونا ضروری تھا۔ بڑی جاں فشانی سے اس کتاب کا مواد تیار کیا گیا ہے اسی لئے یہ کتاب خوبیوں سے بھرپور ہے، مصنف نے مورخین کے اس گروہ کی تائید کی ہے جو بھاگ متی یا بھاگ نگر کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ راقم الحروف کو یاد آتا ہے کہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی [سابق صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ] کی لکھی ہوئی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی سوانح میں یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ بادشاہ نے اپنی شاعری میں اپنی تمام محبوباؤں اور بیگمات کا ذکر کیا ہے لیکن بھاگ متی کا نام کہیں نہیں ملتا۔ یہی بات ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی لکھی ہے۔ اگر بھاگ متی کا وجود تھا، جس سے بادشاہ کو اس قدر محبت تھی کہ اپنے بسائے ہوئے شہر کا نام اسی سے موسوم کیا، تو نہ صرف اس کا ذکر ہوتا بلکہ موثر طور پر ہوتا۔

اس کتاب میں شہر حیدر آباد کی تاریخ کے توسط سے اس کی تہذیب، عمارتیں، شاہراہیں، پل، تالاب، باغات، محل، حویلیاں، ڈیوڑھیاں، محلے، کوچے، عجائب گھر، مجسمے، اسپتال، کلبیں، جامعات، سواریاں، جانے اور کیا کیا، یہاں تک کہ کھانوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ کھیلوں کی تفصیل میں کرکٹ، فٹ بال، باسکٹ بال کے میدانوں کا طول و عرض اور کھیل کے طریقوں اور اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف ان سے متعلق حیدر آباد کے مشہور کھلاڑیوں کے نام دیئے جاتے تو مناسب تھا، زبان میں کہیں کہیں "حیدر آبادیت" در آئی ہے۔

کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ اہل حیدر آباد اور حیدر آباد سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے جس کی قیمت برائے نام ہے۔ طباعت ستھری ہے۔ سرورق دلکش ہے۔

ضخامت: ۱۰۷ صفحات O قیمت: ۱۵ روپئے O ناشر: روزنامہ سیاست حیدر آباد (آندھرا پردیش) **مبصر: محافظ حیدر**

ساز غزل

بہزاد فاطمی

جناب بہزاد فاطمی نہ صرف شاد عظیم آبادی کے پوتے بلکہ بذاتِ خود ایک نہایت عمدہ، لطیف و نفیس غزل گو ہیں۔ ان کے اعلیٰ تغزل کی چند مثالیں یہ خیال انگیز اشعار ہیں :

غم نہیں اس کا کہ جلتا ہے نشیمن اپنا
آبروِ صحنِ چمن کی تو بچا لی جائے

نہیں یہ بات کہ حاجت نہیں کسی سے مجھے
مری اَنا نے بچایا گداگری سے مجھے

خزاں کا روپ نہ رنگِ بہار اپنا ہے
یہ کم نہیں کہ دلِ داغ دار اپنا ہے

ان اشعار میں ندرت بھی ہے، سلاست بھی۔ یہ ذاتی تجربات و احساسات کے آئینہ دار ہیں اور عام درد مندانہ و بصیرت مندانہ خیالات کے عکاس بھی۔ اسلوب بیان کلاسکی ہے۔ مگر اندازِ فکر میں عصری آگہی بھی نمایاں ہے۔ جناب بہزاد نے بہت کم کہا ہے، لیکن جو کچھ کہا ہے وہ بہت ہی سنجیدہ و پختہ اور پُر معنی ہے۔ ان کا کلام کم گوئی و نغز گوئی کا نمونہ ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر اور پُر لطف شاعری ہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر ساز غزل کی پذیرائی کریں گے۔

ضخامت: ۱۲۰ صفحات O قیمت: پچاس روپئے O پتہ: ۱۰۲، گنیش اپارٹمنٹ، ایسٹ بورنگ روڈ، پٹنہ (بہار)

مبصر: عبدالمغنی

اسلامی معلومات کوئز

حامد اقبال صدیقی

کوئیز (Quiz) انگریزی لفظ ہے اس کے معنی ہیں کسی کی عام معلومات کا اندازہ کرنے کے لئے اس سے زبانی یا تحریری سوالات کرنا، پہلے یہ لفظ لطیفہ بازی اور علمی چھیڑ چھاڑ کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اب لوگوں کی ذہانت کو جانچنے کا ایک سائنٹفک طریقہ بن گیا ہے چنانچہ آج ریڈیو، ٹی وی میں کوئز شو، کوئیز کن ٹیسٹ کے نام سے مختلف موضوعات پر پروگرام ہوتے رہتے ہیں اور سوالات وجوابات کے ذریعے لوگوں کے علم، ذہانت اور حاضر دماغی کا امتحان لیا جاتا ہے۔

یہ ایک طریقۂ تعلیم بھی ہے مگر اردو والوں نے اس کو آزمانے کی زیادہ کوشش نہیں کی حامد اقبال کے ذہنِ رسا کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے پہلی بار اسلامی معلومات کو عام کرنے کیلئے اس سائنٹفک طریقے کا استعمال کیا ہے۔

کوئیز میں اسلامی معلومات پر ایک ہزار سے زیادہ سوالات وجوابات ہیں جنہیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ آگے بڑھایا گیا ہے، پہلے انبیاء علیہم السلام پھر رسول پاک کو لیا ہے پھر امہات المومنین، اولادِ رسول صحابہ کرام، عبادات، قرآن اور دیگر آسمانی کتابیں، مقامات مقدسہ، غزوات و سرایا اور متفرقات وغیرہ اس طرح پوری بنیادی اسلامی معلومات کو بڑی خوبصورتی سے اس چھوٹی سی کتاب میں بند کر دیا ہے۔

اس اہم کتاب کے مرتب حامد اقبال صدیقی شاعر کے سابق مدیر اعجاز صدیقی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور علم و دانش اور زبان و ادب کا ذوق انہیں اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں ملا ہے ان کی خداداد قابلیت و صلاحیت کو سمجھنے کے لئے ایک واقعہ سنیئے۔

میرے ایک دوست اور شاگرد جناب احمد گھوگھاری جو آج کل ممبئی میونسپل کارپوریشن کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں ہیڈ آفیسر ہیں کچھ سال پہلے جب اردو سے ایم اے کررہے تھے تو رعشہ کی وجہ سے قلم پر ان کی گرفت ختم ہوچکی تھی انہوں نے یونیورسٹی سے رائٹر (Writer) مانگا' یونیورسٹی نے اجازت دے دی ان دنوں حامد اقبال برہانی کالج میں پڑھتے تھے اور بی اے فرسٹ ایر کے طالب علم تھے گھوگھاری صاحب نے انہیں اپنا رائٹر بنایا دونوں ساتھ ہی امتحان ہال میں جاتے، سوالات گھوگھاری صاحب پڑھتے اور جوابات حامد اقبال لکھتے اور جب نتیجہ نکلا تو گھوگھاری صاحب کا نمبر فرسٹ کلاس طلبہ کی فہرست میں درج تھا، حالانکہ ان کی مادری زبان گجراتی تھی اور بی اے میں بھی شاید انہیں صرف سکینڈ کلاس ملا تھا۔

ویسے حامد اقبال بھی اپنے دو بڑے بھائیوں کی طرح اردو زبان وادب کے میدان کے بھی شہ سوار ہیں انہوں نے "گھر آنگن" اور بعض دوسرے ناموں سے ہفتہ وار اخبار بھی شائع کئے ہیں لیکن کوئیز ان کی پہلی باقاعدہ تالیف ہے اس میں انہوں نے اسلام کی بنیادی معلومات کو جس خوبصورتی سے سوالات وجوابات کے پیرائے میں ترتیب دیا ہے وہ علم وادب کے علاوہ دین وایمان سے ان کے فطری لگاؤ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

عام طور پر بازار میں اسلامی کوئیز کی کتابیں دستیاب ہیں لیکن پیچیدہ، بکھری ہوئی اور اغلاط سے پُر ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ ایک جملے میں جواب کے بجائے بڑے بڑے سوال اور ان کے تفصیلی جوابات سے کوئیز کی افادیت اور مقصد فوت ہوتا ہے۔ طلباء کو جوابات یاد کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ موجودہ کتاب صحت متن اور مختصر ترین لفظوں میں یعنی ایک جملے میں جواب کے سبب ایک مستند کتاب منظر عام پر آئی ہے جو بچوں اور بڑوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ ہر مسلم گھرانے میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

یہ چھوٹی سی کتاب (معنوی اعتبار سے بڑی) کتابت، طباعت، اور گٹ اپ کے اعتبار سے بھی بے انتہاد لکش ہے۔ اور اس لائق ہے کہ مسلم مدارس میں اس کو باقاعدہ قابل نصاب کیا جانا چاہئے۔ قیمت بھی بہت مناسب ہے۔

ضخامت: ۱۲۰ صفحات O قیمت: ۲۵ روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۶ء O ناشر: ہز پبلی کیشنز، ۲۲۸۔۲۰۲۔ دینا تھ بلڈنگ: تیسرا منزلہ، روم نمبر ۱۲، پی، بی، مارگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

مبصر: حامد اللہ ندوی

مطالعہ تصوف

محمد قادر لون

"مطالعہ تصوف" ایک تحقیقی کتاب ہے۔ مصنف نے بڑی دیدہ ریزی سے صوفیائے کبیر کے اقوال کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ اور فقر، توکل، شطحات، زہد ومجاہدہ، علم باطن، رجال الغیب وغیرہ پر ان کے خیالات سے بحث کی ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ قدیم کتب صوفیا میں ایسی بہت سی باتیں ملادی گئی ہیں جو اہل سنت کے عقائد سے میل نہیں کھاتیں، اہل علم کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ چھان بین کرکے اصل حقائق کو سامنے لائیں۔ غلام قادر لون نے یہ کام بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کردیا کہ گذشتہ کئی صدیوں سے یعنی مجدد الف ثانی سے حال کے بزرگان دین مثلاً حضرت عبدالقادر رائے پوری اور شاہ یعقوب مجددی تک سب اس قول کی تفسیر رہے ہیں کہ شریعت کو قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنا ہی طریقت ہے۔

"تم یہ ہرگز نہ دیکھو کہ مسلمان کیا کرتا ہے، اس کے کسی فعل کو شریعت نہ سمجھو تم یہ دیکھوں کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ انسان کا ہر فعل حجت نہیں بن جاتا۔ ایک موٹی سی بات یاد رکھنا، تمہارے سامنے کوئی شخص اگر آسمان پر اڑ کر بھی دکھلادے اگر اس کا فعل سنت کے خلاف ہو، خواہ کتنا ہی بزرگ ہو اس کے پیچھے نہ لگنا۔ اور دوسرا شخص اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پوری پابندی کرتا ہے اس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہو تم اس کے پیچھے لگ جانا" (سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری)

پس شریعت تمام دینوی اور آخرتوں کی کفیل ہے۔ سعادت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ اس میں شریعت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑتی ہو۔ صوفیا کی طریقت وحقیقت دونوں خادم شریعت ہیں (مکتوبات امام ربانی)

"شریعت وطریقت کا پردہ مت چاک کرو، شریعت وطریقت میں کوئی ایجاد نہ کرو، اور شریعت وطریقت کے خلاف کوئی بات بھی ہرگز نہ کرو، بس سلف صالحین کے طریقے پر چلے جاؤ" [سیرت فخر عارفین]

"ہنر ش نیز بگو" کے عنوان سے خود مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صوفیوں نے اسلام کے آفاقی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ اسلام کے آفاقی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ اسلام آفاقی دین ہے اور اس کا خطاب تمام بنی نوع انسانی سے ہے۔ اختلافات وتفریق کو ہوا دینے کے بجائے خلوص، ہمدردمندی، محبت اور اخوت کے چراغ روشن کئے۔

مختصراً یہ کتاب تصوف کا تنقیدی مطالعہ ہے اور اس لحاظ سے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ البتہ تصوف اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے جس کا اس کتاب کے مطالعے سے پتہ نہیں چلتا۔

ضخامت: ۶۰۵ صفحات O قیمت: ۱۱۰ روپے O مطبوعہ دسمبر ۱۹۹۴ء O پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ مبصر: انور خان

عہد نبوی کا مدنی معاشرہ قرآن کی روشنی میں

ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی

پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کا اپنی دعوت کے لئے اساس اور لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لئے مرکز کی حیثیت سے منتخب فرمایا یہاں ایک ایسے معاشرہ کی بنیاد ڈال کر اس کو مستحکم کیا جس میں متمدن معاشرہ کی ساری خوبیاں مثلاً عقیدہ، علم، تعاون باہمی، یکجہتی کی روح اور توسیع، اپنے پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود تھیں۔

ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی کی کتاب، "عہد نبوی کا مدنی معاشرہ قرآن کی روشنی میں" دراصل عربی مقالہ "مجمع المدینۃ المصور فی عصر النبوی کما بصورۃ القرآن" کا اردو ترجمہ ہے، اس مقالہ پر قاہرہ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے اور جو کچھ بتایا ہے قرآن حکیم کے ارشادات کی روشنی میں بتایا ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کا ماحول ۳ برس کی مدت میں کس طرح منزل منزل ترقی کرتا رہا۔ وہاں کے اجتماعی سیاسی اور اقتصادی نظریات میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں؟ ان شعبوں میں کیا کیا اقدامات کیے گئے اور وہ کون کون سے واقعات وحوادث تھے جو مدنی معاشرے میں انقلابی حرکت پیدا کرنے کا سبب بنے۔

چار ابواب اور دس فصلوں پر مشتمل اس کتاب میں مدنی معاشرے کی تمام جزیات سے بحث کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فاضل مصنف اور مترجم دونوں نے مطالعہ اور اسلوب بیان کا حق ادا کیا ہے۔ اس کتاب کا ہر لائبریری اور مسلم گھر میں ہونا فائدہ مند ہوگا۔

ضخامت: ۷۰۷ O صفحات قیمت: ۱۵۰ روپے O مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۴ء O ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵ مبصر: شمیم طارق۔

کتاب : زار

جوگندرپال ۔ ذکر، فکر، فن

ترتیب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم O ضخامت: ۵۴۴ صفحات O قیمت: تین سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ اے، گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی

میرے حصے کی زمین ۔ (حصہ اول)

شاعر: شہریار O ضخامت: ۱۸۸ صفحات O قیمت: دو سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد بلڈنگ، علی گڑھ (یوپی)

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

مصنف: ڈاکٹر غلام قادر لون O ضخامت: ۳۵۶ صفحات O مطبوعہ: ستمبر ۱۹۹۹ء O پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کلاسیکیت اور رومانویت ۔ (تنقیدی مضامین)

ترتیب کار: علی جاوید O ضخامت: ۴۰۸ صفحات O قیمت: پانچ سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: رائٹرس گلڈ (انڈیا) لمیٹیڈ۔ ۲۲۔ غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورہ، دہلی۔ ۱۱۰۰۳۴

جنگلوں نے پہاڑی راستہ (شاعری)

شاعر: وزیر آغا O ضخامت: ۱۱۲ صفحات O قیمت: ۱۳۰ روپئے (پیپر بیک) O مطبوعہ: اگست ۱۹۹۹ء O پتہ: کاغذی پیرہن، آفس نمبر ۴، پہلی منزل اسلم آرکیڈ، میکلوڈ روڈ لاہور (پاکستان)

کالی ماٹی (ناول)

ناول نگار: علی امجد O ضخامت: ۱۸۴ صفحات O قیمت: سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: اردو مرکز ۲۴۷۔ ایم آئی جی۔ لوہیا نگر، پٹنہ: ۸۰۰۰۲۰ (بہار)

دلوں کی صلیب ۔ (شاعری)

شاعر: تاج سعید O ضخامت: ۱۶۰ صفحات O قیمت: ۱۷۵ روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۳۔ صدر، پشاور (پاکستان)

اور ۔ (شاعری)

شاعر: جینت پرمار O ضخامت: ۱۲۰ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی۔ ۲ O مصنف: ۳۔ مدھوبن اپارٹمنٹ سوواج، احمد آباد۔ ۱۳ (گجرات)

لمس کا کرب ۔ (افسانے)

افسانہ نگار: خورشید ملک O ضخامت: ۲۲۴ صفحات O قیمت: دو سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۸ء O پتہ: خورشید ملک، تارین تکلی، شاہجہاں پور (یوپی)

میرے قبیلے کے لوگ (انٹرویوز اور مضامین)

مصنف: ڈاکٹر خالد سہیل O ضخامت: ۲۱۰ صفحات O قیمت: دو سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۸ء O تقسیم کار: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سیرت پاک کے بعض اہم پہلو (مضامین)

مرتبہ: مقصود الٰہی شیخ O ضخامت: ۳۴۰ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپئے (پاکستان میں) مطبوعہ: ۱۹۹۷ء O پتہ: ۲۴۔ پارک مل ڈرائیو، بریڈ فورڈ | ویسٹ یارک شائر | BD8-ODF (یوکے)

بانو کی کہانیاں (افسانے)

کہانی کار: بانو ارشد O ضخامت: ۱۷۶ صفحات O قیمت: ۵ پونڈ (ایک سو پچاس روپئے) مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: بانو ارشد

12-CAHROSE AVENUE EDGWARE,
MIDDLESEX- HA8-6EG (U.K)

افق (شعری مجموعہ)

شاعر: سعدیہ روشن صدیقی O ضخامت ۲۰۸ صفحات O قیمت: دو سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی (پاکستان) مصنفہ: پوسٹ بکس نمبر ۲۶۵۵۵، ابو ظہبی (ABU DHABI) یو۔ اے۔ ای

صادق الخیری حیات اور ادبی خدمات

مصنفہ: ڈاکٹر ظل ہما O ضخامت: ۳۰۴ صفحات O قیمت: دو سو پچاس روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء (طبع دوم) O ۱۹۹۷ء (طبع اول) O پتہ: شاہد پبلی کیشنز، ۲۲۵۳۔ گلی ریشم والی، کوچہ چیلان، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

عوضانہ [حمد، نعت، منقبت اور موضوعاتی نظمیں]

شاعر: قاضی فراز احمد O ضخامت: ۱۶۰ صفحات O قیمت: سو روپئے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: قاضی فراز احمد۔ پوسٹ اور مقام ساکھرے، تعلقہ: راجاپور۔ ضلع رتناگیری ۴۱۶۷۰۹ (مہاراشٹر)

ادبی رسائل

تخلیق ۔ خلیجی ریاستوں میں اردو

مدیر: اظہر جاوید O مہمان مدیر: لیئق جاوید منظور O ضخامت: ۴۸۰ صفحات O قیمت: دو سو روپئے (پاکستان میں) ۵۰ درہم۔ ریال O مطبوعہ: نومبر ۱۹۹۹ء O پتہ: بھگوان اسٹریٹ، پرانی انارکلی۔ لاہور (پاکستان)

ترجمان ۔ (خاص نمبر۔ کتابی سلسلہ)

ترتیب و تہذیب: جابر حسین O ضخامت: ۸۴۸ صفحات O قیمت: ۱۲۵ روپئے O مطبوعہ: نومبر ۱۹۹۹ء O پتہ: اردو مرکز عظیم آباد، ۲۴۷۔ ایم آئی جی۔ لوہیا نگر، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۲۰

تسطیر (سہ ماہی کتابی سلسلہ۔ خاص نمبر)

مدیر: نصیر احمد ناصر O ضخامت: ۴۸۰ صفحات O قیمت: ایک سو بیس روپئے (پاکستان میں) مطبوعہ: خصوصی شمارہ ۹ اور ۱۰۔ جولائی اگست ۱۹۹۹ء O پتہ:

17-D, SECTOR-B-2, MIRPUR (A.K)
POST CODE- 10250 (PAK)

تکمیل (کتابی سلسلہ) رام پنڈت نمبر

مدیر: مظہر سلیم O مہمان مدیر: وقار قادری O ضخامت: ۲۸۸ صفحات O قیمت: ۷۵ روپئے O مطبوعہ: جنوری تا دسمبر ۱۹۹۹ء پتہ: کوہ نور ٹیچرز کالونی، شانتی نگر، نزد واٹر ٹینک، بھیونڈی، ضلع تھانے (مہاراشٹر)

آموزگار (ماہنامہ کتابی سلسلہ)

مدیر: اکبر رحمانی O ضخامت: اسی صفحات O قیمت: فی شمارہ ۲۰ روپئے O زرِ سالانہ ۸۴ روپئے O پتہ: ماہنامہ آموزگار ۳۷۔ بھوانی پیٹھ، جل گاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

کوہسار جنرل (سہ ماہی کتابی سلسلہ)

مدیر: مناظر عاشق ہرگانوی O ضخامت: ۹۶ صفحات O قیمت: فی شمارہ ۱۵ روپئے O مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء O رابطہ: برہ پورہ، بھاگل پور (بہار)

نئی صدی (سہ ماہی۔ اردو اور رومن رسم الخط میں)

مدیر: رشید منظر O اس کا شمارہ اولیں نئے سال کے اوائل میں شائع ہو رہا ہے۔ ادبی رسائل کے عالمی قارئین و قلم کار حضرات درج ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

174- WHITTINGTON WAY, PINNER,
MIDDX HA5 5JY- (U.K)

پیامِ اردو (ماہنامہ)

مدیر: سعادت احمد ضخامت: ۴۲ صفحات قیمت: ۱۰ روپئے زرِ سالانہ: ۱۲۰ روپئے مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء پتہ: ۹۹، ۹۶۔ ا۔ ۲۲ سلطان پورہ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۲۴ (اے پی)

■ ■ ■

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اجرا ۱۹۳۰ء

شاعر

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۱واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۷۱
شمارہ — ۲

فون: 3829904

فروری ۲۰۰۰ء

اردو ادب کا عالمی منظرنامہ - ۲

[پاکستان]

(جلد اوّل)

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۲۰ روپے

لائبریریوں سے	زرِ سالانہ
۱۲۰ روپے	۱۰۰ روپے

معاونین سے	تاعمر خریداری
۲۰۰ روپے	۵۰۰۰ روپے

خلیجی ممالک	برطانیہ	امریکہ	پاکستان
۹ سو روپے	۱۵ پاؤنڈ	۲۵ ڈالر	۲۵۰ روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

[redacted]

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3776, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکرِ امروز

نوائے تجدید

پھر بھی میرے ساز میں آواز باقی ہے ابھی
بے پَری میں قوتِ پرواز باقی ہے ابھی
عالمِ بالا سے جاری ہیں ابھی سرگوشیاں
خلوتِ الہام کا غماز باقی ہے ابھی
سیکڑوں اسرار قدرت میں نے کہہ ڈالے تو کیا
میرے دل میں اک اچھوتا راز باقی ہے ابھی
سننے والا ہو تو پھر نغمہ سرا ہوجاؤں میں
سوزِ فطرت میں مذاقِ ساز باقی ہے ابھی
نغمۂ نو پھر لبِ خاموش میں بیتاب ہے
پھر مرے تارِ نفس پر بارشِ مضراب ہے

پھر خموشی سے مری پیدا ہے تفسیرِ حیات
خوابِ ہستی میں ہیں پھر آثارِ تعبیرِ حیات
ذرّے ذرّے سے مرے رخشاں ہیں لاکھوں آفتاب
خاکِ باقی سے مری رقصاں ہے تنویرِ حیات
پھر مری پستی سے ہے ایوانِ رفعت کی نمود
پھر مری ہستی سے ہے تحریکِ تدبیرِ حیات
پھر مری ہر سانس سے اک زندگی بیدار ہے
پھر مجھے منظور ہے تنظیم و تعمیرِ حیات
از سرِ نو نظمِ عالم مائلِ تجدید ہے
مقطعِ ہستی سے پیدا مطلعِ امید ہے

[۲۵ - اشعار پر مشتمل طویل نظم کے آخری دو بند۔

کارِ امروز (بار دوم) ۱۹۴۷ء]

سیماب اکبرآبادی

اردو کا مابعد جدید پہلا تخلیقیت افروز سخن ور مقیم اثر بیاولی

"پچاس دیوانوں کا ایک دیوانہ شاعر "مقیم اثر بیاولی بیسوی صدی کی آخری ڈھلان پر نیا جمالیاتی اور اقداری ایک ایسا مکاشفہ ہوگا جس کے ایک ہاتھ میں "لا" اور دوسرے میں "اللہ" یہ جدیدیت گزیدہ نیو کلیائی آتش نمرود اور ہمہ جہت مادّی خرابے کے متوازی مابعد جدیدیت تخلیقیت آفریں روحانی معمورے کی تخلیق، تشکیل و تعمیر کرے گا۔ اور مابعد جدید تخلیقیت افروز غزل اور نظم کا کعبۂ شعروادب بنے گا اور بھٹکی ہوئی غزل اور نظم کا قبلہ بھی درست کردے گا [نظام صدیقی]"

یادش بخیر! مقیم اثر نے اپنے شعری سفر کا آغاز ۱۹۶۲ء سے کیا ۱۹۸۹ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "لا تقنطوا" زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ جو انقلاب آفریں درد مند انسانیت افروز غزلوں نظموں اور گرانقدر ناقدان فن مرحوم ڈاکٹر ظ انصاری، سلیم شہزاد اور استاد مرحوم حضرت وقار حیدری مالے گانوی کی ناقابل تردٓ آراء پر مشتمل تھا۔

"ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی" مرحوم حسرت موہانی کے مصداق ۵ رسال کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "نغمۂ سنگ" ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا جس میں وقار سخن حضرت وقار [مرحوم] نظام صدیقی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر نیّر مسعود (لکھنؤ) محمد احمد رمز کانپوری، اختر الاسلام کی مختصر اور طویل قابل توجہ آراء اپنے دامن میں ستاروں کی جگمگاہٹ کی مظہر بنی ہوئی ہیں۔

موصوف کا تیسرا مجموعہ " **بدن نژاد قبا** "منظر عام پر ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر ان چھوئے آیا۔ (ان اچھوئے ۴۷ر مجموعوں سے ہٹ کر) جس کی رسم اجراء کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی سیمینار اور ایک عالمی مشاعرہ شاعر کے وطن مالوف بیاول [یاول] ضلع جلگاؤں میں مارچ ۲۰۰۰ء کے آخری ہفتے میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا جارہا ہے پروگرام میں مدعوئین کی رضامندیاں حاصل ہوتے ہی پروگرام کی قطعی تاریخ کا اعلان اخبارات و رسائل کے توسط سے جلد ہی ارباب ذوق تک پہنچ جائے گا۔

پچاسوں دیوان کی تخلیق کا سہرا اسی دیوانے شاعر کو حاصل ہے۔ جو کسی مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ میری دیدہ و شنیدہ حقیقت ہے۔ شاعر کا مصاحب ہونے کے ناطے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ الکٹرانک میڈیا خصوصاً کمپیوٹر کے اس تیز رفتار حیرت زا تخلیقی عہد میں اس قدر "وقیع و کوہ پیا" آسمانی وسعتوں پر مشتمل یہ کارنامہ نابغۂ روزگار کارنامہ ہے۔ تعدادی اعتبار سے اس بھاری پتھر کو اٹھانا تو درکنار اسے چھونا بھی کار دارد کے مترادف ہے۔ چونکہ شاعر کے پاس فی نفسہ پچاس ہزار اشعار کا غزلیہ، نظمیہ، آزاد نظمیہ، آزاد غزلیہ، قطعات اور نعتیہ کلام کا ایسا خزانہ موجود ہے جو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے ارباب حل و عقد کو اپنی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ میری دعا ہے کہ کسی طرح یہ سرمایۂ بے مثال لاثانی و مہر آہنگ آنکھوں کی زیارت کا مرکز اور دلوں کی ترجمانی کا ایسا والہانہ خوبصورت کتابی کارنامہ بن جائے جس سے آنے والی نسلیں معنی کے نئے کرۂ ارضی میں داخل ہو کر بزرگوں کے عظیم و قدیم سرمایۂ سخن کی طرح اس "چشمۂ جاریہ" سے بھی فیض سخن حاصل کرتی رہیں۔

مقیم اثر بیاولی کے غیر مطبوعہ دیوان

(۱) شکستِ آواز (۲) جرَس گل (۳) رقصِ شرر (٤) زنجیر صبا (٥) پیراهن خاك (٦) جلوهٔ سراب (٧) برقِ نظر (٨) وحشتِ در (٩) غزالِ شوق (١٠) سرُودِ شام (١١) شعاع درد (١٢) طاؤسِ رنگ (١٣) نگار دشت (١٤) تبسم اشك (١٥) طوافِ نور (١٦) شعورِ زخم (١٧) زخم جنوں (١٨) رمِ غزل (١٩) لمسِ ماورا (٢٠) موجِ بے زنجیر [آزاد غزلوں کا مجموعہ] (٢١) لوحِ صحرا (٢٢) آسمانِ بے زمین [غالب کیلئے کھی گئیں غزلیں] (٢٣) شعلهٔ زارِ حرف (٢٤) تیغ خود نگر (٢٥) آگ لگائیں برف کے پر (آزاد نظموں کا مجموعہ) (٢٦) خاك خاك موج (٢٧) ورق ورق گلاب (٢٨) لهو بهی اك معجزہ (٢٩) نم آتش خیز (٣٠) صدائے شہراجنبی (٣١) قطرۂ بحرکشا (٣٢) کعبهٔ گل (٣٣) آئینه محوِ تخلیقیت (٤٣) حیرت آئینه (٣٥) بهشت ذات (٣٦) شفق زارِ نظر (٣٧) ریت ریت پیام (٣٨) سنگ آئینه نما (٣٩) نکهت صدرنگ (٤٠) آئینه بدن خاك (٤١) آب آب سلگتی دائرے (٤٢) آب جوئے شعله خوُ (٤٣) گلدستهٔ نگاه (٤٤) سرحد امکاں سے اُدھر (٤٥) جهتِ سفر افروز (٤٦) ماهیچ (٤٧) مدوجزرِخواب

تحریر : صابر زاہد...... ۱۸۰، ہڈکو کالونی، مالیگاؤں ـ ۴۲۳۲۰۳ / ضلع ناسک (مہاراشٹر)

❖

شمارہ ـ ۲ [فروری ۲۰۰۰ء] جلد ـ ۱۷

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ ۲

پاکستان میں اردو ادب۔ ایک اشاریہ

جون جولائی ۱۹۹۹ء کا مشترکہ خصوصی شمارہ اسی عنوان سے شائع کیا گیا تھا جسے ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور مذکورہ شمارہ آج تک موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے کہ پہلی بار ایک اہم ترین عنوان کو مجموعی طور پر بطور اشاریہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایسا موضوع ہے جو تحقیق طلب ہے۔ ریسرچ اسکالرز کا موضوع ہے۔ خصوصی شمارے کے بعض عنوانات "اردو کی نئی بستیوں کے چند مستشرقین اردو" وغیرہ تو سنجیدہ ادب کے قاری کو چونکا گئے۔ اس شمارے کی پذیرائی نے کئی سوال قائم کئے۔ کئی نئے گوشے ابھارے۔ اردو کی نئی بستیاں ہوں یا اردو ادب کا عالمی منظر نامہ، رسالہ شاعر کا خصوصی موضوع ہے جس پر ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۰ء سے باقاعدہ کام ہو رہا ہے اور اب دیگر اداروں، رسائل اور اشخاص وغیرہ نے اسی موضوع وعنوان کو اپنالیا ہے اور اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ہمارا پروجیکٹ بہر حال دوسروں سے مختلف ہے اور اس کی ایک مثال اردو ادب کا عالمی منظر نامہ تھا۔ اس خصوصی شمارے کے ساتھ ہم سے یہ بھی استفسار کیا گیا کہ اس میں پاکستان کو کیوں نہیں شامل کیا گیا؟

اور اس استفسار کا جواب آسان نہیں۔

قارئین شاعر ذرا سا اپنے ذہن پر زور دیں تو انہیں یاد آجائے گا کہ ۱۹۸۲ء کے شماروں میں ہم نے "پاکستان میں اردو ادب نمبر" کا اعلان کیا تھا۔ جیسا کہ شاعر کی روایت رہی ہے، اس کا ہر خاص نمبر ضخیم اور بے حد منفرد و مثالی ہوتا ہے۔ حالیہ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) ایک مثال ہے۔ اعلانات اور تیاری کے دوران بعض ناگزیر وجوہ نے ہمیں مجبور کر دیا کہ پاکستان میں اردو ادب نمبر نہ شائع کیا جائے۔ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں اپنے ارادے کو بادلِ نخواستہ ترک کرنا پڑا مگر اس موضوع پر کسی خاص نمبر کا خواب روشن رہا کہ اس خواب کو اردو زبان نے، بدترین صورت حال میں بھی پردۂ دل پر روشن رکھا۔ لیکن یہ کل بھی آسان نہیں تھا۔ اور آج بھی آسان نہیں ہے بلکہ اور مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن اس وقت ہماری تمام تر گفتگو اردو کے حوالے سے ہے کہ ہندوستان کے بعد پاکستان دوسرا بڑا ملک ہے جہاں اردو قومی زبان ہے اور اردو کا چلن عام ہے۔ صرف زبان وادب ہی کو موضوع کیا جائے تو اس کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی ہزاروں صفحات میں موضوع کی سمائی ہو گی جو آسان نہیں ہے۔

یہ خصوصی شمارہ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ کے تحت ترتیب دیا گیا ہے جو موضوعِ گفتگو کا محض ایک اشاریہ ہے سرسری، ادھورا، تشنہ۔ کیونکہ زبان وادب کے حوالے سے پاکستان میں بہت کام ہو رہا ہے اور یہ کام مختلف سمتوں میں بڑا پھیلاؤ لئے ہوئے ہے۔ ادبی اصناف کا تنوع ہے۔ نئی اور تازہ کار نسل اپنا بھرپور تعارف کروا رہی ہے۔ اردو کے چھوٹے بڑے سرکاری غیر سرکاری ادارے ہیں، اکاڈمی ادبیات اردو، مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی اور اس کی کارآمد کتابوں کا سلسلۂ اشاعت، نئی کتابیں آرٹس کونسل کا تعارف اور دائرۂ کار، اردو لغت بورڈ، نصابی کتابیں، اردو ذریعہ تعلیم اور درسی کتابیں، فنونِ لطیفہ، اہم ترین اشخاص کا تعارف، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ادبی مجلے، پاکستان میں تحقیق کی رفتار غالب، اقبال اور فیض، اقبال اکاڈمی اور سیماب اکاڈمی کی سرگرمیاں پاکستان کے دیگر مشاہیر، مذاکرے، تجزیے، جائزے۔ ایک عظیم پروجیکٹ، ایک سمندر موضوع لہٰذا اس شمارے کو ہمارے اس پروجیکٹ کی فی الحال ایک چھوٹی سی کڑی سمجھا جائے جسے اردو کی نئی بستیاں نمبر کے لئے ہم کر رہے ہیں اور اسے عنوان دیا گیا ہے 'اردو ادب کا عالمی منظر نامہ' اور یہ منظر نامہ پاکستان کے اردو ادب پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اردو کی نئی بستیوں سے ایک ایک نئی بستی کا انتخاب کیا جائے گا اور یقین ہے کہ ہم کسی ضخیم "پاکستان میں اردو ادب نمبر" کو شائع کرنے میں بھی کامیاب رہیں گے۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں کا ادب بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ تخلیق ہو رہا ہے۔ اردو ادب پر علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے صوفی شعرا خود ایک موضوع ہے، لوک داستانوں کی طرح یہ صوفی شعرا جو سرائیکی، سندھی، پنجابی، اور پشتو وغیرہ زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ موسیقی اور شاعری کے امتزاج سے تصوف کے فروغ اور قومی یکجہتی کے لئے جو کام ان صوفی شعرا نے کیا ہے اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس تاریخ کا اعادہ ضروری ہے۔

ہندوپاک کے سیاسی حالات کچھ بھی ہوں اس سے قطع نظر پاکستانی ادب، موسیقی، گائیکی، ٹی وی ڈرامے وغیرہ ہندوستان میں بہت مقبول ہیں۔ عوامی سطح پر پاکستان کے قلم کاروں اور فن کاروں کے لئے بڑی محبتیں ہیں، خلوص ہے حالانکہ سیاسی اور مذہبی سطح پر تعلقات میں کشیدگی کا عمل تیز تر ہے لیکن یہ بھی طے ہے کہ نفرتوں کی تمام انتہاؤں اور صورتوں کے اختتام پر دوستی ومفاہمت کے دروازوں کو وا کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں، وہ چاہے کل ہو، ماہ وسال بعد ہو یا ایک صدی پر ہو۔ منظر نامہ بہر حال بدلے گا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں پاکستانی ادب کو ترجمہ کیا جاتا ہے۔ شاعری اور افسانے بطور خاص۔ حالیہ دنوں میں ہندی کے دو اہم رسالے 'شیش' اور 'ادبھاؤنا' نے پاکستان کے شعر وادب پر خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں پاکستان کے ادب اور وہاں کی ثقافت پر مضامین وغیرہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے جب کہ اس کا دوسرا رخ بھی دونوں جگہ موجود ہے اپنی پوری انتہاؤں کے ساتھ۔ ادیبوں شاعروں کے درمیان بھی بڑی عام سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ دونوں طرف بڑے پیچیدہ مسائل ہیں جن کے ساتھ دونوں طرف کا عام آدمی جینے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا خصوصی شمارہ آدمی سے آدمی کی محبت کے نام ہے۔

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟



احمد ندیم قاسمی

کوئی وعدہ اگر پورا نہ ہوگا
تو کیا اب حشر بھی برپا نہ ہوگا

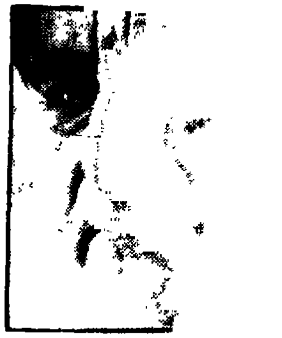
محبت کرنے والے تو بہت ہیں
کوئی مجھ سا، کوئی تجھ سا نہ ہوگا

جمالِ یار کا اجمال یہ ہے
سنا ہوگا مگر دیکھا نہ ہوگا

کوئی ابلیس ہے، کوئی فرشتہ
تو کیا اب آدمی پیدا نہ ہوگا

جہنم میں چلے کیوں اس کا شہکار
خدا کچھ بھی ہو، پر ایسا نہ ہوگا

● 45-A, Mozang Road,
Lahore (pak)



اظہر سعید خاں

ایک شعلہ سا نظر سے گزرا
دیکھنا کیا وہ ادھر سے گزرا

سخت باہر بھی تھا طوفاں لیکن
رات جو دیدۂ تر سے گزرا

کشتِ ویراں یہ جو تم دیکھتے ہو
ابر سو بار ادھر سے گزرا

فرق اتنا ہے کہ سیلابِ جنوں
تم نے دیکھا، مرے سر سے گزرا

میں نہ وحشی تھا نہ سودائی تھا
خود بیاباں مرے گھر سے گزرا

خلشِ آبلہ پائی نہ مٹی
شوق ہر راہ گزر سے گزرا

ہوسِ سیر و تماشا نہ گئی
منزلِ شمس و قمر سے گزرا

کچھ نہ دیکھا ہو یہی لگتا ہے
اور کیا کیا نہ نظر سے گزرا

● H-2 Al- Aisha, Khayaban-
e-Jami, Clifton, Karachi (pak)



ضیاء جالندھری

اُسے گفتگو کا سلیقہ بھی ہے، شعورِ لذتِ لفظ بھی
وہ بیاں، وہ لہجے کی چاشنی
کہ دل و نظر ہمہ اشتیاق، سماعتیں ہمہ تشنگی
کوئی انجمن ہو کہ تخلیہ
وہی رکھ رکھاؤ، وہی رچاؤ، وہی طریقہ سلوک کا

کبھی ذکر ہجر و وصال کا
کوئی قصہ رنج و ملال کا
کبھی تلخیِ غم زندگی کی حکائتیں
کبھی دوستوں کی طرح طرح کی شکائتیں
کبھی شعر و نغمہ کی محفلوں کی کہانیاں
کبھی آدمی کی ہوس پرست نہاد محورِ داستاں
کبھی شہرت و زر و مال کی طلب و تلاش پہ تیکھی جملہ تراشیاں
کبھی اپنے عصر کی ہولناک سیاسیات پہ تبصرہ
کبھی زیرِ بحث گمان و مذہب و فلسفہ

مجھے اس سے اپنے کئی برس کے تعلقات پہ ناز ہے
میں اسیرِ سحرِ جمال بھی ہوں قتیلِ حسنِ سخن بھی ہوں
پر یہ جانتا ہوں یہ رسم و راہ رفاقتوں کا فریب ہے
یہ محبتوں کا بدل نہیں
یہ بکاؤلی کا کنول نہیں

مری آرزو ہے کہ وہ کبھی مجھے اپنی خامشی بخش دے
جہاں اس کی ذات کا اپنے آپ سے وصل ہو
جہاں اپنے دل کے عمیق غار کی رات میں
وہ نمائشوں کے سبھی لباس اُتار دے
جہاں اصل آئنہ رنگ ہو
جہاں روح روح کو پا سکے
مری آرزو ہے پہ آرزو تو سراب ہے
مری آرزو ہے پر آرزو تو جنوں ہے یا کوئی خواب ہے

●No, 17, Street No, 13, F-712
Islamabad (Pak)

پاکستانی اردو کے خدوخال

عالمی اثرات، قواعدی و معنویاتی انحراف، جدت طرازی اور مقامیت کے حوالے سے

ڈاکٹر عطش درّانی

ایک نہایت ہی فکر انگیز اور اہم مضمون قارئین شاعری کی نذر ہے۔ یہ مضمون پاکستان کے سرکاری ادارے "مقتدرہ قومی زبان" سے شائع ہونے والے معیاری علمی و تحقیقی جریدے ماہنامہ "اخبارِ اردو" کی اشاعت فروری ۱۹۹۶ء میں شامل تھا۔ اس مضمون کے بارے میں ادارے کی طرف سے ایک مختصر سا شذرہ بھی درج کیا گیا تھا:

"پاکستان میں پچھلے پچاس برسوں میں اردو کا جو کینڈا فروغ پارہا ہے اور اس نے جس طرح زبان کے نئے نئے سرچشموں اور رنگارنگ ماخذوں سے اکتساب کیا ہے اس سے اب پاکستانی زبان کے واضح خدوخال ابھر کر سامنے آچکے ہیں۔ آج کی پاکستانی اردو بالکل اسی طرح کلاسیکی اردو سے ممتاز، جدا اور منفرد ہوچکی ہے جس طرح امریکی انگریزی اپنے لہجوں، املا معنی، تسمیہ، لفظ سازی اور نولفظیت کے حوالے سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ مقتدرہ کے شعبہ، لغات و اصطلاحات کے سربراہ اور لسانیات و اصطلاحات کے معروف محقق ڈاکٹر عطش درّانی نے پاکستانی اردو کے ایسے کئی گوشوں کا ایک ابتدائی جائزہ لیا ہے۔ ان پہلوؤں سے مزید تحقیق انجام دی جاسکتی ہے۔ کئی نئے گوشے سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ پاکستانی ادب کے بھی بیسیوں پہلو پیش نظر ہیں۔ تاہم یہ سطور اس خیال سے شائع کی جارہی ہیں کہ جہاں اہل فکرو نظر کو ان پہلوؤں سے لکھنے کی دعوت دی جائے وہاں پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر "پاکستانی اردو" کے نام سے ایک مجموعہ مقالات بنیادی دستاویز کی حیثیت سے شائع کرنے میں بھی مدد ملے۔" [ص:۱۱]

عطش درانی صاحب کا مذکورہ مقالہ محرک بحث بنا اور "اخبارِ نو" کی مختلف اشاعتوں میں مقتدر اہل قلم حضرات نے اپنے گرانقدر خیالات سے موضوع کو مزید سجانے، سنوارنے اور دیگر مباحث کو حوالوں کے ساتھ ابھارنے کی سعی کی ان میں ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر جیلانی کامران، حکیم محمد سعید، جناب شان الحق حقی، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، پروفیسر نیاز عرفان، جناب خلیق الرحمٰن سیفی اور جناب محمد اسلم کھوکر شامل ہیں پھر ان تمام مضامین کو "پاکستانی اردو کے خدوخال" کے عنوان سے مقتدرہ قومی زبان کے ادارے سے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا گیا نئے موضوع پر اس وقیع کتاب کے کچھ چھ ابواب ہیں۔ حصہ اول پاکستانی اردو کے بدلتے ہوئے خدوخال، حصہ دوم: پاکستانی اردو بنام پاکستانی انگریزی۔ حصہ سوم: پاکستانی اردو اور پاکستانی زبانیں، حصہ چہارم: شعری و ادبی تجربات۔ حصہ پنجم: عصری تجربے اور تجزیے۔ حصہ ششم: مذاکرہ ۳۳۴ صفحات کی اس کتاب کو ڈاکٹر عطش درانی نے مرتب کیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور اہم کتاب "پاکستانی اردو مزید مباحث" شائع ہو چکی ہے۔

اس قابل مطالعہ کتاب کے مباحث و مسائل کا تعلق کم و بیش ہندوستانی اردو سے بھی ہے۔ کلاسیکی اردو کے حوالے سے ان مباحث و مسائل پر خاصہ لکھا جاچکا ہے۔ اور اب بھی معیاری زبان کی بحثوں میں دہلی لکھنؤ کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ علاقائی زبانوں پر اردو زبان کے اثرات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مشترکہ تہذیب و تمدن کی جو صورت گری ہے اس میں اردو نے ایک بنیادی کردار ادا کیا ہے لیکن اب ہندوستانی اردو کے خدوخال تبدیل ہو رہے ہیں۔ یوں بھی اس زبان کا فطری مزاج جذب و اخذ ہی کا ہے اور آزادی کے بعد سے تاحال علاقائی زبانوں کے فروغ، ہندی سرکاری زبان کے اثرات، کم ہوتے ہوئے رسم الخط اور بولیوں ٹھولیوں کے اختلاط سے آج اردو کا روزمرہ بہت تبدیل ہوا ہے۔ شعر و ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں بلکہ بہت ہوئے ہیں لیکن ابھی تک اس پہلو سے کوئی تحقیقی جائزہ نہیں لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں معاصر ادبی زبان کا کینڈا کیا بن رہا ہے۔ اردو کے بیشتر قلم کار ہندی اور انگریزی کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں کی سرکاری زبان سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ بولتے، لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں، علاقائی زبانوں کے ادب سے بھی واقف ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی دیگر بڑی زبانوں کے ادبا شعرا کے ساتھ خال خال ہے۔ ہندی کے نئے قلم کاروں میں تو بالکل ہی نہیں۔ سرکاری مجبوریوں اور اپنے آپ کو باقی رکھنے کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قائم اردو اکاڈمیوں سے وابستہ اردو والے علاقائی زبانوں کے شعر ادب کو اردو میں منتقل کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ عمل ایک حد تک تو صحیح ہے، تاہم یہ صرف اردو ہی کے لئے کیوں ہے؟ علاقائی زبانوں میں اردو شعر و ادب کے قلم کاروں کو کتنا مقبول کیا ہے؟ غزل، جو ہندوستانی ثقافت کا ایک اہم ترین جزو ہے، اس کے اثرات پر بھی کہاں کام ہوا ہے۔ لغت سازی ہو رہی ہے۔ کلاسیکی اردو کا ذکر ہو رہا ہے، مقامی الفاظ کو لغت میں شامل کئے جانے کی بات ہو رہی ہے لیکن کسی نئی لغت کی ترتیب و تدوین کیلئے معاصر زبان کے مسائل کے ساتھ نئی ادبی زبان کا تحقیقی جائزہ بہت ضروری ہے۔

پاکستانی اردو کے خدوخال میں وہاں کی علاقائی زبانوں کے اثرات کے ساتھ ہندوستانی فلموں، ہندوستانی روزمرہ اور ہندوستانی ٹی وی پروگرام بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ انگریزی تو ہندوستان کے لئے بھی ناگزیر ہے لیکن پاکستان پر اس زبان کا خوف زیادہ طاری ہے اور انگریزی کے خلاف مختلف سطحوں پر احتجاج ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی کے اس مضمون کے تناظر میں ہندوستانی اردو کے نئے خدوخال کو معاصر شعر و ادب کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اردو تو ہندوستان کی مٹی سے پیدا ہوئی ہے، ہندوستان کی زبان ہے۔ ہندوستان سے باہر اردو کی نئی بستیوں میں بشمول پاکستان، اردو کی موجودہ ادبی زبان کی تفہیم کے لئے یہ ایک کلیدی مقالہ ہے۔ اگر قارئین، شاعر نے

سے پسند کیا تو مذکورہ کتاب کے دیگر مضامین یا ان سے اقتباسات شاعر کی آئندہ اشاعتوں میں دیئے جائیں گے۔ کیا فرماتے ہیں ماہرین لسانیات، نقادانِ ادب، اساتذہ زبان و بیان، ماہرین لغت نویسان اور قارئینِ ادب اس مضمون کے بیان میں؟ (الف الف)

●

اردو برصغیر کی زبانوں، بولیوں، روزمرّوں، محاوروں، بول چال، شعر و ادب اور علم و تحقیق کی ایک ایسی مشترکہ تہذیبی میراث ہے، جو اپنے بولنے والوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ استعمال کرنے والوں کے باعث پہچانی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کی واحد اور منفرد زبان ہے، جس کے "بولنے والوں" کی اپنی کوئی الگ اور دوسری زبان (مادری، مقامی، علاقائی) بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے دنیا بھر کے زبان شماری کرنے والوں کو زبان بولنے والوں (Speakers) کے حوالے سے ایک عجیب سی مشکل درپیش ہوتی ہے اور اس میں وہ عموماً ٹھوکر ہی کھاتے ہیں۔ اپنے صوتیاتی، ساختیاتی، معنویاتی، قواعدی، نحوی اور لغوی اصولوں اور املا کے لحاظ سے یہ دیگر مقامی زبانوں سے اس حد تک مماثل اور مربوط ہے کہ بعض اوقات اسے مادری زبان سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دیسی (Indigenous) اور مقامی (Native) بولنے والوں (Speakers) میں امتیاز نہیں ہو پاتا۔ عرف عام اور گروہی سیاست سے قطع نظر اردو بولنے والے (Urdu speaking) کی اصطلاح معانی کو بہت محدود کر دیتی ہے جب کہ اردو استعمال کرنے والے (Urdu users) ہی اس مفہوم کے صحیح حقدار ٹھہرتے ہیں۔ اردو بولنے اور لکھنے والا خواہ دوسری کوئی بھی زبان بولتا اور لکھتا ہو، وہ اردو بولنے اور لکھنے والا ہی شمار ہوتا ہے۔ اقبال، فیض اور ظفر علی خان زبان کے حوالے سے اسی طرح سند کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے میر، غالب، ابوالکلام، محمد حسین آزاد وغیرہ۔ اس حوالے سے صرف برصغیر میں ان کی تعداد پچاس کروڑ سے زائد ہے اور یوں یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان (انگریزی اور چینی کے بعد) ٹھہرتی ہے۔

ویسے بھی اردو بول چال کے سانچے (Registers) بے حد کم اور محدود رہے ہیں نیز بہت بڑے عرصے تک اردو ادبی کینڈوں (Genres) سے بالکل نکل نہیں سکی، اس لئے یہ کبھی بھی بولی (dialect) کی سطح پر جا کر "اردو بولنے والے" کی صحیح مصداق نہیں ٹھہر سکی۔ عرف عام میں "اردو بولنے والے" اردو بولی نہیں بولتے تھے بلکہ عادتاً صرف اردو بول چال کا کینڈا (Genre) استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ یہ کینڈا کوئی بھی استعمال کرتا ہو وہ اردو بولنے والا (Urdu speaking) ہی شمار ہوگا۔

اردو زبان کا آغاز پنجاب سے ہوا یا دکن سے، شمالی ہند میں پروان چڑھی یا اس نے کلکتہ میں ادبی فروغ پایا، سندھ میں اس کی جڑیں ہیں یا سرہند میں مگر پاکستان بننے کے بعد اسے برگ و بار لانے کے لئے جو آزاد فضائیں یہاں میسر آئیں، وہ اس سے پہلے مفقود تھیں، سوائے چند ریاستوں (حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور، خیرپور وغیرہ) کی سرپرستی کے یا کسی حد تک انگریزوں کے کالجوں میں منشیوں کی قلم فرسائی کے۔ تحدید اور تسدید کے باوجود اس زبان نے قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں اپنی حیثیت منوا رکھی تھی اور ہر پہلو سے ایک وسیع ذخیرۂ ادب کا سیل رواں تھا، جو لاکھوں اہل قلم اور کروڑوں قارئین کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا۔ تحریک پاکستان اور اردو ہندی تنازع کے سبب سیاسی توجہ بھی حاصل تھی اور یوں قیام پاکستان کے ساتھ ہی اسے پاکستان کی قومی زبان کا مقام ملا۔ رسمی طور پر ہی سہی مگر آج تک اردو پاکستان کے ہر آئین کی رو سے قومی زبان ہی کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے فروغ کے لئے مقتدرہ قومی زبان کے علاوہ بھی سینکڑوں ادارے کام کر رہے ہیں۔

پاکستان میں اردو کو پھر سے یہاں کی دیگر زبانوں کے ساتھ میل ملاپ کے مواقع میسر آئے۔ باہمی لین دین کا عمل وسیع پیمانے پر جاری ہوا۔ سرکار دربار میں رسوخ نہ پانے کے باوجود یہ سیاستدانوں کی ضرورت بھی بنی رہی اور باہمی رابطے، اشتراک و یک جہتی کے ساتھ ساتھ دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں، مذہبی درسگاہوں اور علم و فن کی ضرورتوں کی زبان بھی ٹھہری۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ میں ابھی اس نے اپنا کردار ادا کیا اور طبّی، انجینئری اور زرعی درسگاہوں میں بھی بہت حد تک تشریح و تدریس کی زبان بنی رہی۔ چنانچہ آزادی کے ان پچاس برسوں میں پاکستان میں رفتہ رفتہ اس باہمی تعامل سے اردو کا ایک نیا لہجہ، منفرد آہنگ اور جدا اسلوب وضع ہو چکا ہے۔ ہمارا ابتدائی اور مسلمہ مفروضہ (Assumption) یہ ہے کہ اردو نے اپنے تمام رنگ برصغیر کی مقامی زبانوں ہندکو اور پالی (شمالی پنجاب)، ہندی رہندوی (وسطی پنجاب)، دکھنی (جنوبی ہند)، اُپ بھرنش (شمالی ہند) اور کھڑی بولی (اطراف دہلی) وغیرہ سے حاصل کئے ہیں، جیسے قدیم زمانے میں یونانی، بعد ازاں فارسی، عربی، پھر یورپی زبانوں خاص طور پر انگریزی کے ساتھ اشتراک عمل سے اپنا رنگ و روپ ملا۔ پاکستان میں اب یہ زبان پھر سے اپنے ماخذوں کے ساتھ ترقی کی اگلی منزلوں میں تعامل کر رہی ہے اور آئندہ ایسے استفادے کے امکانات مزید بڑھتے جائیں گے۔

پچھلے پچاس برسوں سے پاکستان میں اردو کا جو کینڈا (Genre) فروغ پا رہا ہے اور اس نے جس طرح زبان کے نئے نئے سرچشموں اور رنگارنگ ماخذوں سے استفادہ کیا ہے، اس سے اب پاکستانی زبان کے واضح خدوخال ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ آج کی پاکستانی اردو بالکل اسی طرح کلاسیکی اردو سے ممتاز، جدا اور منفرد ہو چکی ہے، جس طرح امریکی انگریزی اپنے لہجوں، املا، معنی تسمیہ، لفظ سازی اور نولفظیت کے حوالے سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ اگلے پچاس برس میں یقیناً یہ ایک جدا زبان ٹھہرے گی۔ اس جائزے میں جو بات ہم بطور فرضیہ (Hypothesis) یا بہ ثبوت (Thesis) تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ یہی ہے کہ پاکستانی اردو کی اپنی الگ رنگت (Shade) ہے اور اس رنگت کو فروغ انہی اصولوں کی روشنی سے ملتا ہے جو یہاں کے باشندوں نے اردو بولنے کے لہجوں اور لکھنے کے اسلوبوں سے وضع ہوتا ہے۔ یہ اصول واضح اور اظہر من الشمس ہیں۔ انہیں تقابلی بیانیہ (Comparative) انداز سے جانچنے اور نکات وار بیان کرنے اور مرتب کرنے کے بعد اردو کی لسانی ترقی کے کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

پاکستانی اردو کا تاریخی ورثہ اتنا متموّل اور اس کا تذکرہ اس قدر عام ہے کہ اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ورثہ جہاں اردو کے کلاسیکی شعری و ادبی ذخیرے، علمی و سائنسی تحریروں اور صحافت و سیاست کے خارزاروں سے نکل کر سامنے آیا ہے، وہاں بازاروں میں لین دین، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ ہر دو قسم کے افراد کے روزمرہ استعمال، ادبی نگارشات نیز مختلف اور متنوع روزمروں اور محاوروں کے بولنے والوں نے بھی اس کے فروغ میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے، یہی عمل اب پاکستان میں دہرایا جا رہا ہے۔ یہ عمل بول

چال کے سانچوں(Registers)، ثقافتی کینڈوں(genres)اور تحریری محضروں(discourses) سبھی میں دہرایا گیا ہے۔

پاکستانی اردو کے بڑے ماخذ ہمارے کلاسیکی اور روایتی شعر وادب، مشاعروں کی ریت اور ادبی نگارشات کے تنوع اور تجربات کے علاوہ مقامی الفاظ، معانی، روزمروں، محاوروں، قواعد وانشا کے طریقوں، صوتیاتی انداز اور دخیل ودوغلے الفاظ کی تشکیل جیسے بیسیوں پہلوؤں سے سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کی دیگر زبانوں کے علاوہ اب انگریزی بھی دخیل الفاظ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے بلکہ بول چال میں تو اسما(Nouns) سے بڑھ کر اب افعال، مصادر اور اسم مجرد(Abstract) وکیفیت تک کے الفاظ میں ترکیبیں انگریزی سے وارد ہونے لگی ہیں۔ جن کی جھلک ادبی تحریروں میں بھی عام طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ الفاظ کے قدیم معنی بدل رہے ہیں، نئے روزمرے اور محاورے تو شامل ہو ہی چکے ہیں، جملوں کی ساخت اور صرفی ونحوی تبدیلیاں بھی واضح ہیں، مقامی اصوات اور عالمی زبانوں کے اثرات کے باعث حروف تہجی کی تعداد اور املا کے قواعد بھی بدل رہے ہیں۔ ایسے چند گوشوں کا ایک اجمالی سا جائزہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

پاکستان میں اردو ایک نئی اور اجنبی زبان نہیں۔ چند دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر یہ آزادی سے پہلے صدیوں سے مقامی بول چال، لین دین، شعر وادب، مراسلت اور درس و تدریس کا ذریعہ رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر زور ادبی محضروں(discourses) تک رہا۔ چنانچہ اس کا کینڈا وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا ایک لازمی اور لابدی امر تھا، جو اب بھی وقوع پذیر ہے۔ کوہلر اور مینوکسکی جیسے ماہرین بشریات کا کہنا ہے کہ سماجی و تاریخی قوتیں ثقافتی نمونے اور انداز وضع کرتی ہیں۔ ثقافت زبان کا انداز متعین کرتی ہے اور جواباً زبان کسی قوم کا اجتماعی شعور پروان چڑھاتی ہے۔ جب کوئی غیر ملکی زبان استعمال کی جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھ ثقافتی اثرات لے کر آتی ہے اور انہی اثرات سے زبان کا کینڈا بھی بدلتا ہے۔ لسانی تعامل کی بات کریں تو ماہر لسانیات ایف ڈی سائیسر جیسا ماہر کہتا ہے کہ زبانوں کے میل جول کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے، وہ جدت طرازی کو زبان کی شکستگی کے حوالے سے روکتا ہے اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اسے عام کر کے زبانوں کے میل کو پسند کرتا ہے۔ لسانیات کی اصطلاحوں میں بات کریں تو ہمیں اوریل وینز یچ جیسے ماہر کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ جب دو زبانیں باہم تعامل کرتی ہیں تو وہ صرفیہ (Morpheme) کی سطح پر باہم ملتی ہیں (جیسے ریل گاڑی، چوکی دار، اگال دان)۔ یہ تعامل چار طرح سے سامنے آتا ہے۔

(الف) دخیل الفاظ: جیسے صابن، برات، تولیہ، لالٹین، ہسپتال تو مغربی زبانوں سے تارید کے بعد داخل تھے ہی، ان کے علاوہ "کفنانا"، "فلمانا"، "فراڈیا"، "فلاپیٹ" وغیرہ بھی اب اردو میں دخیل اور مروج ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں توڑ مروڑ کا عمل بھی جاری ہے جیسے "تلاشنا"، "تعبیرنا" جیسے فعل متعدی۔ (ب) معنویاتی تبدیلی: جیسے خصم، زحمت، عنایت، تکلیف، بندہ، "اپناپن"، "پس رو"، "چلت انداز"، "بندہ بننا"۔ (ج) ترجمہ کاری: جیسے "ماہ عسل"، "جزوقتی"، "غسل آفتابی"، "جشن سیمیں"۔ (د) دوغلے الفاظ: جیسے "کجلدار"، "ریل گاڑی"، "تھانیدار"۔

ان میں معنویاتی تبدیلی کے ساتھ ہم قواعدی تبدیلی بھی شامل کر سکتے ہیں جیسے صرفی انداز میں تبدیلی مثلاً جمع متکلم مونث "ہم جائیں گے"، کی بجائے اب ہم جائیں گی" پاکستانی درسی کتب میں اور عام بول چال میں بھی مستعمل ہے اور نحوی ترکیب میں تبدیلی جیسے "نے" اور "کو" کا استعمال مثلاً مجھے لاہور جانا ہے کی بجائے "میں نے لاہور جانا ہے" اب درست معلوم ہوتا ہے بلکہ اکثر ادیب اسے استعمال کر رہے ہیں۔ املا میں امالے کا استعمال "میں کوئٹے سے آیا، گھوڑے پر بیٹھا" وغیرہ۔ املا میں ہائیہ آوازوں کی تبدیلی جیسے "پودہ"، "راجہ" میں "ہ" کا استعمال وغیرہ۔ معنویاتی تبدیلی میں اسلوبیاتی انحراف بھی شامل ہوتے ہیں جیسے محاوروں، روزمروں، ترکیبوں میں فرق مثلاً "شب اجالنا"، "نیلے پانیوں کی مسافتیں"، "بھنے خان"، "خوابوں کی چاندنی"، "چہکتی ہوئی کھڑکی" وغیرہ۔ یہ کام شاعر یا ادیب عام طور پر انجام دیتا ہے۔ کیا یہ زبانوں کی شکست وریخت ہے یا نئے تجربات کے نتائج؟

پاکستانی اردو کے ادیبوں نے اپنے متون(Texts) میں فکری اور ساختیاتی سطح پر بھی ان گنت تجربے کیے ہیں، جن کا جائزہ کسی تنقیدی مضمون میں لیا جاسکتا ہے۔ تاہم انہوں نے اسلوبیاتی حوالے سے قواعد معیارات سے جو انحراف کیا ہے اس کا تجزیہ ہمارے موجودہ دائرہ کار میں آتا ہے۔ انحراف کے یہ تجربے نہ صرف ہو رہے ہیں بلکہ بڑھتے چلے جارہے ہیں اور اب تو یہ اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ کلاسیکی اردو کے تعلیم یافتہ فرد کے لئے انہیں سمجھنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ "شب کو اجالنے کا ہنر" (گلزار بخاری) کا ذکر معنویاتی انحراف کے ضمن میں ہم کر چکے ہیں۔ اس طرح معیار سے انحراف کی مزید چند مثالوں کو ذیل میں پیش کرنے سے پاکستانی اردو کے خدوخال کے اس بنیادی قواعدی پہلو کی طرف توجہ دینے اور غور وخوض کرنے میں آسانی ہوگی:۔ع

☆زمیں پہ پاؤں دھرا تو "زمین چلنے" لگی (شکیب جلالی) ☆مرے کمرے میں "یادیں سو رہی ہیں" (کفیل آذر) ☆"مہکتے بیٹھے" دریاؤں کا پانی (ناصر کاظمی) ☆وہی لمحہ میری "آنکھوں میں چپٹ جائے گا" (شہزاد احمد) ☆میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو "گھر کردے" (افتخار عارف) حدافق پر "شام تھی خیمے میں منتظر" (وزیر آغا) ☆گزرتے موسموں کے "قہر سے گھائل بدن سنولا گئے" (ریاض مجید) ☆چھت پر "پگھل کے جم گئی" خوابوں کی چاندنی (عادل منصور) ☆یہ پیڑ "دھوپ نہائیں" جو ابر چھٹ جائے (راشد متین) ☆وہ "چہکتی ہوئی کھڑکی"، نہ "مہکتے در وبام" (سلطان اختر) ☆رات کے ہاتھ "مرے جسم کو سہلاتے ہیں (توصیف تبسم) ☆"نیند کے در" پہ ہوتی ہے دستک (وحید اختر) ☆"خواب تصنیف کر رہا تھا" (نثار ناسک) ☆"چلی ہے شاخ ثمر "خواب" بریدہ "ہوئے (ممتاز کنول) ☆پھول کی طرح مرے "جسم کا ہر لب کھل جائے" (پروین شاکر) ☆وہ چاند بن کر مرے "جسم میں پگھلتا رہا" (پروین شاکر) ☆میں "گہرے پانیوں "میں زمین تک اتر گیا (بشیر سیفی) لپٹی ہے شاخ شاخ سے "سانپوں کی شوک" بھی (یوسف حسن) ☆"چاندنی کا گھر" میرے گاؤں میں تھا (اسلم کولسری) ☆پھر سمندر سے یہ "گہرائی چلی جائے گی" (سلیم کوثر) ☆جسم "پگھلی ہوئی آگ" میں غسل کرنے لگے (شہریار)

یہ انحرافات صرف نظم ہی میں نہیں ہپاکستانی اردو نثر میں بھی در آئے ہیں۔ واقعیت پسندی، حقیقت نگاری اور کائنات شناسی کے رجحانات نے جہاں شاعری میں کئی اسالیب وضع کئے ہیں وہاں ان رجحانات نے اردو نثر کو بھی بہت حد تک متاثر کیا ہے، اگرچہ ان کا جائزہ یہاں نہیں لیا جاسکتا۔ اردو نثر کی دیگر مثالوں کا تفصیلی تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں معیار سے انحراف کی کچھ مثالیں پیش کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے:۔

☆ (الف) انگریزی لفظ کے ترجمے کے معیار سے انحراف: "وہ کرائسس "جو اس فقرے میں سمٹ آیا۔" (آصف فرخی ۱۹۹۴ء۔ نقاد بطور دشمن، "دریافت") ☆(ب) ثقیل اصطلاحوں کی طرز پر معنویاتی انحراف: شاعرانہ زبان "علمی دبازت" کی متحمل نہیں۔ (ادیب سہیل، ۱۹۹۴ء فارمل ازم، "صریر") ☆(ج) قدیم ضرب الامثال رمحاوروں کی طرز پر وضع جدید: "مرا ہوا آدمی "اپنے کام کا نہ دوسرے کے کام کا" (انور سجاد ۱۹۹۴۔ تمیز کی تلاش، "ادبیات")

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستانی اردو کا واضح نکھار ۱۹۶۵ء کے بعد سامنے آتا ہے۔ اس سال پاک بھارت جنگ نے پاکستانی اردو کی انفرادیت کو بہت حد تک آگے دھکیلنے اور کلاسیکی اردو کا رخ موڑنے کے لئے کسی طاقتور بم کا سا کردار ادا کیا۔ بلکہ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد تو اس پاکستانی اردو نے بھی نئی سمتوں کا تعین کر لیا ہے جن میں معنویاتی "انحراف" زیادہ واضح ہے۔ اردو شعر و ادب میں ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں، جن سے پاکستانی اردو کے اس اصول "معیار سے انحراف" کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ معیار سے یہ انحراف معنویاتی اور قواعدی دونوں طرح سے ہو رہا ہے۔

تحریری زبان کے حوالے سے پاکستانی اردو کے دیگر خدوخال کا جائزہ لینے کا آغاز ہم حروف تہجی کی بحث سے کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت عام خیال یہ تھا کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد ۳۶ یا ۳۷ ہے۔ بعض افراد ہمزہ کو شامل کرتے تھے۔ بعض بھاری یا ہائیہ اصوات کے حروف بھ، پھ، تھ کو شامل کر کے ۴۷ قرار دیتے تھے۔ ان میں لھ، مھ، نھ، شامل نہیں تھے۔ یعنی کولھو، دلھن، تمھارا، تمھاری، انھیں، جنھیں وغیرہ کو کولہوں، دلہن، تمہارا، تمہاری، انہیں، جنہیں، لکھا اور بولا جاتا، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح "رھ" کی صوت "سرھانا" وغیرہ میں مستعمل ہے اور یوں آج یہ حروف ۵۵ یا ۵۶ سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے "آ" کو الگ حروف شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے دو الف کے برابر قرار دیا جاتا تھا مگر اب شان الحق حقی، وارث سرہندی، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اہل علم و قلم اور اسحاق جلالپوری، تاج محمد اور ڈاکٹر ممتاز منگلوری جیسے ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ یہ ایک الگ آواز یا صوت ہے اور اسے "الف مد آ" کی بجائے صرف "آ" بولنا چاہئے۔ اسی طرح ایک اور بھاری صوت "وھ" کی انگریزی الفاظ "وھیل" کی (بمعنی پہیہ)، "وھیل مچھلی"، "وھائٹ ہاؤس" وغیرہ کے ساتھ اردو میں شامل ہو چکی ہے۔ اسی طرح نون غنہ (ں) الگ حرف صوت ہے اور اسنہ (نھ) بھی ایک الگ حرف ہے، جیسے مونہہ، بانھ وغیرہ۔ ان حروف کی ترتیب بھی پہلے اب پ ت ٹ ث وغیرہ ہوا کرتی تھی، جن میں ہائیہ اصوات شامل نہیں کی جاتی تھیں، انہیں آخر میں الگ سے لکھ دیا جاتا تھا مگر "اردو لغت" کی ترتیب اب ان کی شمولیت کے ساتھ یوں بنتی ہے:

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، ں، نھ، و، وھ، ہ، ء، ی، ے، ان اصوات میں اگر "پانی" اور "رانی" میں آنے والی صوت "ن" جو پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں بھی پائی جاتی ہے، الگ شمار کر لی جائے اسی طرح ننگ کی آواز جو جنگ، بنگ، رنگ، میں آتی ہے الگ آواز اور جیسا کہ ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے ماہرین نے تجویز کیا ہے کہ اس میں حرف کے اندر نقطے کی بجائے دائرہ دیا جائے تو اسے الگ حرف کے طور پر بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ں۔ اس طرح اردو حروف تہجی کی تعداد ۵۸ ہو جاتی ہے۔ تدریس کے لحاظ سے ان کی ترتیب بھی ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور بہت سے ایسے محققین کے خیال میں تعددِ استعمال (Frequency) کے حوالے سے ہونی چاہئے جو ان کی تحقیق کے مطابق یوں بنتی ہے:۔

ا، ے، ن، ر، ی، ک، و، ہ، م، ل، ت، س، ب، د، پ، گ، ج، ء، چ، ش، ع، آ، ح، تھ، ق، خ، ز، ف، کھ، ٹ، بھ، ص، چھ، ض، ط، گھ، دھ، ٹھ، پھ، غ، ڑھ، جھ، نھ، ث، ڈ، ذ، ظ، مھ، ڈھ، ژ، رھ، لھ، ان میں اگر ان کے بعد "وھ"، "نھ"، "ں اور ںَ" کو شامل کر لیا جائے تو یہ ترتیب تعددِ استعمال کی ہو گی۔ لیکن یہ ترتیب یاد کرنے کے اعتبار سے بہت مشکل ہے۔ ہم صوت اور ہم شکل حروف زیادہ آسان ہوتے ہیں۔ پھر بھی پاکستان کے ٹیکسٹ بک بورڈ بڑے حروف علت (VOWEL) "ا"، "ی"، "و" کو شروع میں لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ رجحان ابھی ترقی پذیر ہے۔ دیکھیں آگے چل کر حروف تہجی کی ترتیب بھی کیا بنے۔ فی الوقت اردو لغت بورڈ کراچی کی مذکورہ بالا ترتیب یعنی ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ وارث سرہندی کا "علمی اردو لغت" اور شان الحق حقی کا "فرہنگ تلفظ" بھی اسی ترتیب کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

پاکستانی اردو کے دیگر خدوخال میں اردو الفاظ کے استعمال کی حد تک (۱) "انگریزی آمیزی یعنی انگریزی سے دوغلانا (۲) انگریزی سے ترجمہ (۳) انگریزی افعال کا عینہٖ استعمال (کرنا، ہونا جیسے متعدی اور لازم مصادر کے ہمراہ)، (۴) عربی سے گریز اور فارسی امر کا زیادہ استعمال، (۵) مقامی الفاظ و تراکیب، روز مروں اور محاوروں کا استعمال اور (۶) مقامی زبانوں کے لہجے اور انداز پر اردو کی نولفظیہ (Neologisms) (۷) نئی اصلاح سازی شامل ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

جہاں تک انگریزی آمیزی کا تعلق ہے، یہ رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بولنے اور لکھنے والوں کی تن آسانی ہے۔ کون ترجمہ کرے اور کیا ترجمہ کرے۔ مفاہیم کا تنوع بھی حائل ہے۔ دوسری بڑی وجہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ اہل اردو نے ادبی ثقافت کے فروغ کے شوق میں اردو بول چال کے سانچے ترقی نہیں کرنے دیئے جس کے باعث اس بحران اور خالی جگہ کو انگریزی سانچوں کے ٹکڑوں نے پُر کیا۔ اردو اخبارات میں عام طور پر انگریزی الفاظ ہی نہیں، ترکیبیں اور جملے تک بعینہٖ ملیں گے۔ اخباری زبان سانچوں اور کینڈوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے، اس لئے ہمیں زیادہ تر اخباری زبان ہی کا تجزیہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یہ خالی جگہیں کبھی انگریزی سے اور کبھی مقامی زبانوں سے پُر ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر جمع کے لئے انگریزی "S" کو اردو میں "ز" کی حیثیت حاصل ہے جیسے "فارم" کی جمع "فارمز" "کلاس کی جمع "کلاسز" وغیرہ اردو تحریروں میں عام ہیں۔ پہلے انہیں اردو طرز پر جمع بنا لا جاتا تھا، جیسے، فارموں، کلاسوں، لیڈران، ہیڈ ماسٹروں، ایڈیٹران، ایڈیٹروں، ممبران وغیرہ، مگر اب تو یہ تکلف بھی

نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح "ازم" (Ism) جس کے لئے پہلے "یت" یا "پسندی" کے لاحقے اور امر استعمال ہوتے تھے۔ اب اکثر تن آسان ادیبوں کے ہاں مشروک ہو رہے ہیں۔ پہلے انگریزی کے الفاظ فریٹ منٹ، ہول ٹائم، ڈسپلن، کومیڈی ٹریجیڈی وغیرہ اسما اردو میں لکھ دیے جاتے تھے۔ اب تو ایسے انگریزی الفاظ کے اردو املا کا التزام بھی نہیں ملتا۔ انگریزی حروف ہی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ خاص طور سے اردو کے بڑے افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں کے ہاں اس کی کثرت ہے۔ کہیں کہیں دونوں طریقے یعنی اردو املا اور انگریزی ہجے ایک ہی جملے میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً

☆ "جب کوئی تہوار ہو تا Thanks giving یا لیبر ڈے "تو اچانک (بانو قدسیہ، ۱۹۹۴ء موسم سرما میں نیلی چڑیا کی موت، "ادبیات")۔ ☆ یہ بات محض Exposure کے خوف سے نہیں" یا پھر "نقاد کی دشمنی کا تصور یقیناً ایک تنقیدی Concept ہے۔ (آصف فرخی، محولہ بالا، ۱۹۹۴ء)۔ ☆ "دوسروں سے Share کرنے کی خواہش" (سحر انصاری ۱۹۹۴ء ممتاز حسین، اردو تنقید کا ایک معتبر نام، "قومی زبان") روسی فارملزم کی طرف آنے سے پہلے "یا اگر اس ادبی Regimentation پر کسی جانب سے"۔ (ادیب سہیل، محولہ بالا، ۱۹۹۴ء) ☆ یہ اس کا پہلا "نائٹ میر" تھا" (سلیم اختر، ۱۹۹۴ء روشن دن کا تاریک رات میں سفر "تخلیق") ☆ "وہ Chain lover ضرور ہوگا۔۔۔۔ صرف یادوں کے Butt End سیٹ تارہ جائے گا" (پروین شاکر ۱۹۹۴ء فراز کی شاعری۔ پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء حصہ نثر)۔ ☆ "طوفان میں خود کو خوش رکھنا بھی تو "نفسیاتی سب جیکٹ" ہے۔ (آغا بابر، ۱۹۹۴ء ناٹک سے وابستگی، "ادبیات")۔

اردو اخبارات میں یہ روش عام ہے، دیکھیے "اخبار اردو" کے ۱۹۹۵ء کے شمارے جن میں اس طرف خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی ہے: "ان فٹ امیدوار"، "پرموشن بورڈ کا اجلاس"، "پلاٹوں کی الاٹ منٹ"، "پریشر گروپ ضروری ہو گیا"، سٹریٹ پاور کے ذریعے"، "ڈیڈلاک ختم"، "ریفرنڈم کا اختیار"، "گرینڈ آپریشن کا سلسلہ"، "پولیس کا جنرل ہولڈ اپ"، "پروڈکشن آرڈر جاری کر لیا گیا"، "غلط مارکیٹنگ کے خلاف احتجاج"، "میڈیا ٹرائل کرنا" وغیرہ انگریزی کے حوالے سے اور "پولیس کا مک مکا"، "دس لاکھ کا تیل دے گیا"، "چوروں نے چوکا لگا دیا"، "حکم امتناعی کی سلامی"، "کرپشن کے چھپڑ میں ڈبکیاں" جیسے الفاظ مقامیت آمیز کے ذریعے صحافتی محضر (Discourse) وضع کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہاں تک تو بات درست ہے کہ صحافت بول چال، سنسنی اور خبر کے لئے جن سانچوں اور کینڈوں پر انحصار کرنا چاہتی ہے اس کی کمی دوسری زبانیں پوری کریں گی لیکن اردو کے ثقہ ادیبوں کی طرف سے تن آسانی کا یہ رویہ اور یہ لسانی آلودگی افسوس ناک بھی ہے اور قابل نفرین بھی۔ انگریزی آمیزی کے منفی رجحان میں ایک اور پہلو زیادہ قبیح ہے اور وہ ہے انگریزی افعال کو اردو مصادر "کرنا" یا "ہونا" سے ملا کر مصادر بنانا مثلاً فیل کرنا، لیٹ آنا، ڈسمس کرنا، کنٹراسٹ کرنا، ایجوکیٹ کرنا، پریکٹس کرنا، جیسے افعال بول چال میں تو عام استعمال میں آچکے ہیں۔ بعض، بہت دور کے افعال، جن کا ترجمہ اردو میں آسان ہے لیکن انہیں بعینہ اردو املا میں لکھنا مشکل ہے، اب پاکستانی اردو تحریروں میں عام طور پر ملتے ہیں جیسے آئیڈیالائز کرنا، پرائیویٹائز کرنا، وغیرہ نیز ایسے جملے عام ہیں: "یہ تصویر مجھے بہت ہانٹ کرتی ہے"۔ "میں ایڈجسٹ کر رہا ہوں"۔ "الرٹ کر دیا ہے"، "ہم بھی واک کر آئیں"، ایسے جملے ہمیں روزمرہ گفتگو کے علاوہ اردو ادبی تحریروں میں بھی عام ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ "Socialize نہیں کر سکتی۔۔۔۔ "یا کمپرومائز کر لو" یا پھر ڈرنک آفر کر رہی تھی" (بانو قدسیہ محولہ بالا) ☆ "وہ بہت دنوں تک فری لانسنگ کرتا رہا" (حمید اختر، ۱۹۹۴ء لندن کا تحفہ۔ "تخلیق")۔ ☆ "ہم اس چیز کو Discard کر دیتے ہیں" یا "انسان کو Cope کرنا آجائے" یا "Compromise کر لیں" (بانو قدسیہ، محولہ بالا)۔ ☆ "اپنا وی سی آر خود آپریٹ کرو" یا "ڈاکٹر نے اس سے ریلیکس ہونے کے لئے کہا" (ممتاز احمد خاں، ۱۹۹۴ء۔ اک روبوٹ کی کہانی۔ "سریر")۔ ☆ "پارٹ کس نے کیا تھا" یا "خوش مزاج شخص کو Avoid کرتے رہے" (آغا بابر۔ محولہ بالا)۔

اردو شاعری اس لسانی آلودگی سے ابھی تک پاک تھی اور پاکستانی شاعری میں یہ بات ایک امتیاز کی حیثیت رکھتی تھی مگر پچھلے دنوں ایک شاعر کا ایسا کلام بھی دیکھنے کو ملا چونکہ نام بڑا نہیں، اس لئے قابل تذکرہ نہیں۔ تاہم اس سے شاعری میں بھی آلودگی کے خطرے کی گھنٹی ضرور بجتی سنائی دے رہی ہے۔ تاہم اردو کے نثری ادیبوں میں یہ لسانی آلودگی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ بہت جلد یا تو اردو کا وجود نہ رہے گا یا پھر اب جسے ہم منفی رجحان قرار دے رہے ہیں شاید آگے چل کر یہ "ہنگلردو" یا "بگڑی (Pidgin) اردو" کا روپ دھار لے۔ افسانہ نگار یا ڈرامانگار کے ہاں کردار کی زبان بیان (Narration) کے حوالے سے کسی حد تک قابل معافی ہے اور انگریزی زدہ مترجم را خاز نقاد کو بھی معاف ہی کرنا پڑے گا لیکن بیانیہ (Narrative) میں جہاں ادیب کی طرف سے اظہار مطلب کیا جا رہا ہو وہاں تو اردو کا مزاج خراب کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ ایک تاریخی تقاضا ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ جب ہم فارسی سے اردو کی طرف آئے تھے تو مقامی یا قدیم اردو میں فارسی نے پوری جگہ لے رکھی تھی اور جملے یا مصرعے میں کہیں کہیں اردو حروف اور الفاظ استعمال میں آتے تھے۔ شاعری میں ریختہ کی مثال سامنے ہے۔ بعد ازاں پورے سے نصف جملے فارسی کے ہونے لگے اور پھر تان صرف فارسی ترکیبات پر آن کے ٹوٹی، اردو آگے بڑھتی رہی۔ جس اردو کو انشاء اللہ خان "دریائے لطافت" میں غیر فصیح کہتے تھے، وہی بالآخر فصحاء کا معیار ٹھہری۔ اب یہی صورت کچھ انگریزی سے اردو کی طرف آنے کی ہے۔ ابھی تو ہم "انگریزی میڈیم" کے زور اور شور میں ہیں، بلکہ ہمارے بہت سے لکھاری انگریزی پڑھ کر اردو لکھتے ہیں کہ انگریزی میں تو وہ جگہ بنا نہیں پائیں گے، چلو اردو والوں کو "بنائیں"۔ اسی "بنانے" کے چکر میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، آغا بابر جیسے ادیب شاید محض اپنی تحریروں کے "رعب اور دبدبے" کی خاطر ایسا کرتے ہیں جبکہ آصف فرخی اور ادیب سہیل جیسے نقاد محض تحریریں بوجھل کرنے کے شوق میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی نگارشات پر چند گھنٹے اس "انگریزیت" کو سنوارنے میں صرف کر دیں تو شاید وہ اردو زبان کے محسنین میں شمار ہوں۔ پاکستانی اردو کا انگریزیت کا یہ رجحان کس کروٹ بیٹھے گا، اس کا ایک اندازہ تو مذکورہ بالا نکات کے علاوہ اردو کے ذخیرہ میں اس کی "وسعت" سے ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فہیم اعظمی نے "صریر" مئی ۱۹۹۷ء میں جدت اور تجربہ یا سہیل انگاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اردو یا اور عمداً استعمال کرنا ہمارے خیال میں قابل قبول نہیں۔

انگریزی آمیزی کے بعض مثبت پہلو بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں انگریزی سے ترجمہ کر کے بعض نئے الفاظ تو اردو کو ملے تھے، نئے انداز کی تراکیب اور نئے روز مرے اور محاورے بھی انگریزی طرز پر اردو میں ترجمہ ہو کر چلے آرہے ہیں۔ مثلاً اطلاعی گھنٹی(Call bell)، آفتابی غسل(Sun bath)، پردہ سیمیں(Silver screen) ، پرواز(Flight)، تجربی علوم(Practical Sciences)، اطلاعاتی علوم(Applied sciences)، جزوقتی(Part-time) ، جشن زریں(Golden Jubili) ، جشن سیمیں(Silver Jubili)، چھٹی حس(Sixth Sence)، دوہرا قتل(Double Murder)، ذہنی غسل(Brain Washing) ، زیرزمین(Under Ground)، سرد خانہ(Cold Storage)، ماہ غسل(Honey Moon)، قرطاس ابیض(White paper) ، شام بخیر(Good Evening) ، صبح بخیر(good morning) ، علامتی ہڑتال(Token Strike)، غسل لینا(Take bath) ، کالا دھندا(Black Market) ، کھلا چیک(Open Check) ، کھلے ذہن(Open Mind)، کھلے عام (Openly) ، ماں بولی(Mpther Tongue)، محفوظ(Reserved) میکانیہ(Mechanism) ، نصف بہتر(Half Better) ، یوم سیاہ(Black Day) ، قومیت (Nationality)، کلیت پسندی(Collectivism) کرداریات(Characterology) وغیرہ۔

ایسے ہزاروں الفاظ اور تراکیب وضع ہو کر استعمال ہو رہے ہیں، جن کی سند معروف ادیبوں کے ہاں عام طور پر مل جاتی ہے۔ مثلاً ☆اعتماد میں لینا Take into confidence ۔ "مجبوراً مرزا کو اپنے اعتماد میں لینا پڑا"۔ (مشتاق یوسفی۔ ۱۹۶۴ء "مظنون") الفاظ واپس لینا(Take words back)۔

گفتگو ہونا تھی جتنی ہو چکی بس کیجئے   آپ توبہ کیجئے، الفاظ واپس لیجئے   (فدا حسین حشم)

حاضر منڈی(Spot Market)

جب تیل خریدنا ہو پیارے   حاضر منڈی کے بھاؤ لینا   (خدا یار خاں حاصل)

☆دستخط لینا(Take Signatures) ۔ "ذرا صاحب کے دستخط لے لینا" (فرخندہ لودھی ۱۹۹۴ء۔ بسکہ دشوار ہے ـــــ "رلوی")۔

یہ رجحان بعض حکام کی پیروی میں بول چال اور ذرائع ابلاغ کی حد تک ہی سہی، عام ہے، جیسے "اقدام لینا" (take Step) وغیرہ۔

تارید یعنی اردوانے کا عمل تو اردو میں آغاز ہی سے جاری ہے، ہسپانوی، پرتگالی، ولندیزی، انگریزی الفاظ جانے کس کس طرح سے اول بدل کر اب اردو کے الفاظ بن گئے، "تولیہ، صابن، پرات، لالٹین، کی مثال پہلے آ چکی ہے۔ ایسی سینکڑوں دیگر مثالیں موجود ہیں۔ پاکستانی اردو میں یہ عمل کچھ اور طرح سے آگے بڑھا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ "فراڈیا" کی طرز پر "فٹ پاتھیا" ع ہر جگہ مل جائیں گے اس شہر میں فٹ پاتھیے (خالد عرفان)۔ ☆"بوریت" (اکتاہٹ کے معنی میں)۔ "گرمی اور انتظار کی بوریت نے ماحول کو تلخ تر بنا رکھا تھا" (ریاض انور، ۱۹۶۱ء "نئی قدریں")۔

"فلائیٹ"، "اڑان کے ساتھ ساتھ "پرواز" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ بلکہ اس سے مصدر "فلائیٹ پکڑنا" اکثر ادیبوں کے ہاں مل جاتا ہے۔

عربی سے گریز اور فارسی کی طرف رجحان بھی پاکستانی اردو کا ایک اہم پہلو ہے۔ عربی کا مضمون لازم ہونے یا حکام کی طرف سے "ثمہ" جیسے عربی الفاظ اردو میں داخل کرنے کی ناکام کوششوں کے باوجود اردو الفاظ میں خاص طور پر اصطلاح سازی کے حوالے سے عربی ذرا سی پیچھے ہٹی ہے اور اس کی جگہ فارسی نے لی ہے۔ عربی کا استعمال "ئیہ" کے لاحقے کی حد تک آگے آیا ہے۔ جیسے استقبالیہ، ابتدائیہ، اشاریہ، دیوالیہ، دورانیہ، عشائیہ، مزاحیہ، نشریہ، بحریہ، فضائیہ وغیرہ بلکہ یہ نولفظیت بھی معنویاتی انحراف کی حد تک جا چکی ہے جیسے سراج منیر نے "امکانیہ" کا لفظ "امکان" کی نشانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ (بحوالہ ۱۹۷۹ء، ماہنامہ "کتاب")۔

فارسی امر نے لاحقہ کی صورت میں اب اردو میں خاصی جگہ بنا لی ہے اور تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جیسے "کار"، "پسند"، "گرد"، "گیر"، "پرست" وغیرہ بطور لاحقہ عام استعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً بنکار، تخریب کار، تخلیق کار، تقسیم کار، سیاست کار، صداکار، تخریب پسند، حریت پسند، دہشت پسند، عینیت پسند، شہرت پسند، دہشت گرد، وحشت گرد، زبان گیر، وقت گیر، داداگیر، مادہ پرست، مفاد پرست کے علاوہ زبان گیر، پھڈے باز اعصاب شکن جیسے الفاظ معنویاتی انحراف کی مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں جیسے:

☆اس صنف میں منٹو جیسا "تجزیہ کار" اور "زبان گیر" (زبان کے معنوں میں) کیسے شامل ہے"۔ (ڈاکٹر حنیف فوق۔ "افکار" ندیم نمبر)۔ ☆"علم نجوم بسا اوقات "اعصاب شکن" (تحیر خیز معنوں میں) حد تک صحیح اور اٹل ثابت ہوتا ہے"۔ (انور علیگی، ۸ر جون ۱۹۸۰ء "جنگ" کراچی)۔ انحراف کی یہ صورتیں اسم کے علاوہ صفت میں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جیسے: خود مرادی (مطلبی، خود غرضی کی بجائے) ☆"خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور ہے" (جون ایلیا، مارچ ۱۹۷۰ء عالمی ڈائجسٹ)۔ عقائدلی (عقیدوں کی۔ عقائدی کی بجائے) ☆"عقائدلی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں" (ڈاکٹر سید عبداللہ، "جام نو" احسان دانش نمبر)۔

"انہ" کا لاحقہ بھی اسما کے ساتھ استعمال میں عام دیکھنے میں آتا ہے جیسے، ظہرانہ، عصرانہ، میلانہ، کرزانہ، سڑکانہ وغیرہ۔

پاکستانی اردو کی ایک اور شناخت اسم مجرد یا اسم کیفیت کے سلسلے میں پیش قدمی سے ہوتی ہے جو اب واضح تر ہوتی جا رہی ہے۔ اسم مصدر اور اسم مجرد کے لئے کوئی امتیاز موجود نہیں تھا۔ علامت مصدری کا لاحقہ "نا" ہی کام میں لایا جاتا تھا، جیسے قومیانا، اسلامیانا وغیرہ، اب اسم مجرد کے لئے فارسی لاحقوں "کاری"، "داری"، "سازی" یا اسم کیفیت کے لئے عربی لاحقہ "یت" استعمال میں لایا جا رہا ہے مثلاً To Nationalize اور Nationalization دونوں کے لئے "قومیانا" ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ ing اور tion کے لئے فارسی لاحقے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ سوداکاری (Bargaining) ، اور "نج کاری" (Privatization) جیسے لفظوں کا چلن اس کا بڑا ثبوت ہے۔ (i t y-) کے ترجمے کے لئے "یت" کا لاحقہ عام مستعمل ہے، جیسے Nationalyty کے لئے "قومیت" کی طرز پر ایمانیت (صفت ایمانی کے لئے)، ایمائیت (اشارہ

وکنایہ کا اسم کیفیت)، روانیت(روانی) یکانیت(یکا نگی)، لذتیت(لذت)، جبریعت(جبر)، جذباتیت(جذباتی پن)، ڈرلائیت(ڈرلاپن)، فراریعت(فرار) اور کلیت وغیرہ۔ بعض ایسے اسماء ادیبوں نے معنویاتی انحراف کرتے ہوئے بھی استعمال کئے ہیں جیسے:

☆ تجربیت(تجربے سے): "اس تجربیت کا دامن تمام اصناف پر محیط ہے" (حاصی کرنالی، "سیارہ" عبدالعزیز خالد نمبر) ☆ ذاتیت(صفت ذاتی)

آپ کو دیکھتے نہیں ہرگز　　آپ کی ذاتیت کو دیکھتے ہیں　　(راحت شکیل)

☆ حساسیت(جذبہ احساس)

ان کی چشم کرم سے شکوہ ہے　　میری حساسیت نہیں جاتی　　(اکرم شوقی)

☆ عاصیت(گناہ گاری) عاصیت کے بھنور میں سفینہ ہستی (ابرار عابد)

فارسی لاحقے کی مثالیں سینکڑوں ہیں۔ سوداکاری، نج کاری وغیرہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسم مجرو کے لئے خاص طور پر "کاری"، "سازی" اور "بندی" کے لاحقے استعمال میں آرہے ہیں، جیسے صداکاری، قومیت سازی، فلم بندی، عکس بندی، صدابندی وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض کیفیات کے لئے بھی ادیبوں نے اس روش کو استعمال کیا ہے، جیسے: تصویر کاری(محاکات کے معنوں میں) "ہمارا یہ شاعر تصویر کاری پر فریفتہ ہے" (ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، "سیارہ" عبدالعزیز خالد نمبر)۔ ☆ تہہ داری(گہرائی کی شدت ظاہر کرنے کے لئے) "اس میں تہہ داری موجود ہے" (علی حیدر ملک "افکار" ندیم نمبر)۔ ☆ جان تابی(زور یا قوت کے معنوں میں) "ترے قلم نے دکھائی قلم کی جاںتابی" (سلیمان اختر)

پاکستانی اردو کے عناصر میں جس سب سے بڑے پہلو کی طرف ہم آنا چاہتے ہیں اور جس کی مثالیں درج کرنے کو کثرت سے ملتی ہیں، وہ ہے مقامیت کا اثر۔ سانچے، کینڈے اور محضر کے حوالے سے ہم صحافتی زبان میں اس کا ذکر کر چکے ہیں لیکن ادبی محضر میں بھی یہ شدت سے سامنے آیا ہے۔ روزمرہ، محاورہ، ترکیب اور تشبیہہ و استعارہ میں مقامی زبانوں کے (۱) "دخل" اور (۲) "طرز" نے خاصا اثر دکھایا ہے۔ سندھی اور پشتو جیسی زبانوں سے ذرا کم اور پنجابی، سرائیکی سے ذرا زیادہ اثر مرتب ہوا ہے۔ ان زبانوں سے اردو کے ادیبوں کی زیادہ تعداد بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ اب سندھی کا اثر بھی قدرے بڑھ رہا ہے۔ دخل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

لوئے، اوپرے(اوپرکا)، اوپرے(باہر کا، اجنبی)، اوپرے دل سے(ظاہرا)۔ گل بات، گنجلدار، ماسی(ملازمہ)، سوٹا(کش)، کڑکی(مفلسی)، ہڈ حرام(مفت خور) اور لشکارا (آب و تاب) جیسے بیسوں الفاظ امڈے چلے آرہے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

☆ بکواس ہونا(بیکار ہونا) "اوہ زوبیہ تم تو نری بکواس ہو" (اسما اعجاز، مئی ۱۹۷۹ء، "آنچل") ☆ اوپرے دودھ(اوپر کا دودھ) "یہ رواج عام تھا کہ بچے کو اوپرے دودھ سے پالا جائے"۔ (ناصر زیدی، جولائی ۱۹۸۰ء "سنگی گھر)۔ ☆ بھرواں(ابھرا ہوا) "گول گول بوٹیاں، گودے کی بھرواں ہڈیاں" (بیگم آمنہ نازلی، ۴ر دسمبر ۱۹۷۹ء "جنگ") ☆ گند مچانا(گڑبڑ کرنا)

سب کو بنا رہا ہے ملزم　　پھر گند مچا رہا ہے ظالم　　(شید اجمال)

☆ فنا(پیانہ) "فنا مار کر قلم پکڑنا سکھایا کریں" (سید قاسم محمود، اکتوبر ۱۹۷۹ء "سیارہ ڈائجسٹ") ☆ شو میں آنا(شان دکھانا) "خواہ مخواہ شو میں آرہی ہو" (آسیہ سلیم، فروری ۱۹۷۷ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔ ☆ پھڈا(گڑبڑ) "بعد میں پھڈا تو نہیں کروگی،، (شمیمہ نقوی، نومبر ۱۹۷۴ء، "پاکیزہ") ☆ تھڑا(چبوترا) "رات کسی تھڑے پر گزار دیتا" (اظہر جاوید، ۱۵ر فروری ۱۹۸۰ء "حریت")۔ ☆ آرام سے چلنا "روزی آرام سے چلتی رہی" (سائرہ ہاشمی، ۱۹۹۴ء سویرے والی گاڑی، "علامت")۔ ☆ فٹ(پھٹ سے) "وہ فٹ گاڑی روک کر اسے بٹھالیتا"۔ ☆ کھڈا(گڑھا) "عین اس کی چارپائی کے نیچے ایک بڑا سا کھڈا موجود تھا" (سید قاسم محمود، دسمبر ۱۹۷۴ء "سیارہ ڈائجسٹ")۔ ☆ رڑکنا(مس ہونا) "نیچے لوہے کی قینچی رڑک رہی تھی" (پروین عاطف، جنوری ۱۹۷۹ء "کتاب")۔ ☆ چپ کرنا(چپ ہونا) "چپ کر و بیگم" (انجم انصار، ۲۶ر مئی ۱۹۸۰ء "جنگ")۔ جڑا جتھا(پس انداز کیا ہوا) "باپ کا جڑا جتھا کھا رہا تھا" (نگہت سلیم، ستمبر ۱۹۷۷ء "خواتین ڈائجسٹ")۔ ☆ ڈر پڑنا(نقصان ہونا) "نوے روپے کی ڈر پڑ گئی تھی" (احمد ندیم قاسمی، فروری ۱۹۷۶ء، "سب رنگ")۔ ☆ چک پھیریاں کھانا(چکر کھانا) "اس کے ذہن میں بڑے گرداب چک پھیریاں لگا رہے تھے"۔ (ریحانہ زیدی، نومبر ۱۹۷۷ء "پاکیزہ")۔ ☆ آس پڑوس(اڑوس پڑوس)، بحوالہ: جون ایلیا، فروری ۱۹۷۵ء، "عالمی ڈائجسٹ" اور نزہت افتخار، ۱۸ر اگست ۱۹۷۶ء، "امن" کراچی)۔ ☆ بادشاہو(حضرت) "بس بادشاہو مولا کی دنیا کے رنگ دیکھ رہا ہوں" (مسعود مفتی، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء، "الف لیلیٰ ڈائجسٹ") ☆ چوٹل(چوٹ کھایا ہوا) بحوالہ: احسان دانش، جہان دانش")۔ ☆ چونکیل(چوکنا) "چونکیل جانور کی طرف متوجہ ہوئے" (بانو قدسیہ، "شہر بے مثال")۔ ☆ ٹاواں ٹاواں(اکا دکا) "وہاں ٹاواں ٹاواں نمازی بیٹھا نظر آتا تھا" (منصور قیصر، ۱۹۶۸ء، "نئی قدریں" شمارہ: ۲)۔ ☆ چہرہ شہرا(چہرہ مہرہ) "تمہارے چہرے شہرے کو دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں" (تمثال عسکری، ۲۳ مئی ۱۹۷۸ء "امن" کراچی)۔ ☆ پھڑ تول(تہلکہ) "سارے اسٹیشن پر پھڑ تول مچ گئی" (اشفاق احمد، مارچ ۱۹۷۷ء سیارہ ڈائجسٹ)۔ ☆ زخمانا(زخمی کرنا)

جو نگاہوں کو نہ زخمائے وہ عشوہ کیا ہے　　جو کسی دل میں نہ ٹوٹے اسے پیکاں نہ کہو　　(جمیل ملک)

☆ ریڑھ مارنا(تباہ کرنا) "اردو بولنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے فارسی اور انگریزی کو بھی ریڑھ مارنی پڑتی ہے"۔ (ابن صفی، مارچ ۱۹۷۹ء "نئے افق")۔ ☆ شوشا(دکھاوا) (انور مقصود کا مشہور ٹیلی فیچر پروگرام بھی ہے)۔ "آج کل دنیا شوشا کی ہے"۔ (وحیدہ نسیم، مارچ ۱۹۷۸ء "زیب النساء")۔ ☆ بڑا گوشت(گائے کا گوشت)

یہ مجبوریاں دعوتوں کی نہ پوچھو　　ہمیں بھی بڑا گوشت کھانا پڑے گا　　(نزہت آرا)

☆بھونکار (بھونک) "وہ رکتا ہے اور کتے کی بھونکار کی جانب دیکھتا ہے" (انور سجاد، ۱۹۸۰ء "نئی قدریں"، شمارہ: ۲)۔ ☆بھیتے بھیتے ہو جانا (تار تار ہو جانا) "کھوپڑی ہنڈیا کی طرح بھیتے بھیتے ہو جاتی" (احمد ندیم قاسمی، فروری ۱۹۷۶ء، "سب رنگ")۔ ☆بندہ بننا (انسان بننا) "اب وہ وحشی نہیں بلکہ کافی بندے بن چکے ہیں" (حنیف کرن، ۶/ جون ۱۹۸۰ء "جنگ" کراچی)۔ ☆بیمار شمار (بیمار وار) "پچھلے دنوں ذرا بیمار شمار رہا ہوں" (عطاالحق قاسمی، ۲۹/ دسمبر ۱۹۷۹ء "نوائے وقت" لاہور)۔ ☆تڑی دینا (دھمکی دینا)

مری اس پر نظر جب سے پڑی ہے دکھا کر آنکھ وہ دیتا تڑی ہے (آغا خرم جمیل)

☆لوترا (نکما، ناکارہ) "اب بھی کچھ کسر رہ گئی ہے بہن۔ اور مارو اس لوترے کو" (حفیظ احسن، دسمبر ۱۹۷۰ء، "فنون")۔ ☆مونہہ ماری کرنا "مونہہ میں روزہ ہو تو مونہہ ماری نہ کر" (رئیس امروہوی)۔ ☆پوتڑوں کے بگڑے ہوئے (پیدائشی بگاڑ کے ساتھ) "بھلا کہیں پوتڑوں کے بگڑے ہوئے بھی سنورے ہیں" (شکیلہ شمشاد، دسمبر ۱۹۷۵ء "پاکیزہ")۔

جہاں تک "دخل" کے باعث نئے مصادر، روزمروں اور محاوروں کی تشکیل کا تعلق ہے، پاکستانی اردو میں اس کی رفتار بہت تیز ہے۔ فلمانا، پس نوشت، اکی دکی (اکادکا کی بجائے)، زہرناک ہونا، (زہریلا کی بجائے)، سر درد ہونا (دردسر ہونا کی بجائے)، شام پڑنا، شام چھانا، شام ڈوبنا، شام اترنا وغیرہ، گولی دینا (چکمہ دینا کی بجائے)، گولی مارنا (لعنت بھیجنا)، گیند کرانا (گیند کھلانا)، لڑائی ہونا (لڑاکا ہونا کی بجائے)، لفٹ کرانا (التفات کرنا)، مرچیلی ہونا (مرچوں والی ہونا)، مسکہ لگانا (مکھن لگانا) وغیرہ۔ بعض نئی تلمیحات اور کنایے بھی وضع ہوئے۔ فلم "پھنے خاں" نے اس لفظ کو طرم خان کی جگہ رکھ دیا، جیسے:

☆"جی ہاں بڑے پھنے خاں معلوم ہوتے ہیں" (خالد نصیر ۱۹۶۱ء، "جام نو" یوم پاکستان ایڈیشن)۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ نے بہت سی تلمیحات کو جنم دیا، جن میں سے "ہلواڑا نکل جانا" بہت منفرد ہے۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت کے ہوائی اڈے "ہلواڑے" کی تباہی اب بھی لوگوں کو یاد ہے چنانچہ "تباہ ہو جانا" کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے، جیسے:

☆"اس کے پیٹ کا ہلواڑہ نکل گیا" (شاہدہ ارم، مئی ۱۹۷۹ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔ اسی جدت اور صرف جدید نے بہت سے نئے روزمرے اور محاورے جنم دیے ہیں۔ شام کے محاوروں کے ساتھ ساتھ، پس قدمی اور پس رو، اعتماد میں لینا وغیرہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانا، ٹیکسی پکڑنا، سواری اٹھانا، دھڑ دھڑا کے بخار چڑھنا، جیسی جدتوں سے عام افراد بھی واقف ہیں۔ آواز دینا کی جگہ آواز مارنا بھی اب عام ہے۔ پہلی چڑھنا، پہلی تاریخ آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اب چند مزید محاوروں اور استعمال کی مثالیں پیش کی جائیں تو بات زیادہ واضح ہو سکے گی، جیسے: ☆آنکھ کی جھپکی میں (پلک جھپکتے)

اک برق پا براق پہ جب ہو گیا سوار طے کر گیا تو آنکھ کی جھپکی میں شش جہات (نشتر جالندھری)

☆آنکھیں اگلنا (آنکھیں نکالنا) بھابی نے آنکھیں اگل کر میری طرف دیکھا (حفیظ احسن، دسمبر ۱۹۶۱ء "نئی قدریں"۔ ☆آواز نہ ہونا (اہمیت نہ ہونا)

طائر ہوں مگر قوت پرواز نہیں ہے اس شہر میں میری کوئی آواز نہیں ہے (حیرت انبالوی)

☆پھیکی پھکاند (پھیکی سیٹی) "پھیکی پھکاند مرغی اور وہ بھی آدھی کچی، آدھی پکی" (مسرت پراچہ، مارچ ۱۹۷۷ء "سیارہ")۔ ☆دل کے محاوروں میں سے دل بھرنا (دل جوئی کرنا)، دل پڑا رہنا (دل لگا رہنا) اور دل کھلا کرنا (دل میں وسعت پیدا کرنا) کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ہے تنگ صحن گلستاں تو دل کھلا کر لیں اگر بہار نہیں زخم ہی ہرا کر لیں (یٰسین قدرت)

چند بالکل نئے، عجیب اور جدید محاوروں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆سناٹا جھولنا (سناٹا چھانا) "اس کے دل میں بھی سناٹے جھول رہے تھے" (مسرت افزا روحی، نومبر ۱۹۷۵ء، "خواتین ڈائجسٹ") ☆شعور سنبھالنا (ہوش سنبھالنا) "میں نے شعور سنبھالتے ہی دل و دماغ پیار اور خلوص اپنے شوہر کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔" (قمر سلطانہ، دسمبر ۱۹۷۵ء "اردو ڈائجسٹ")۔ ☆غوطہ دینا (غوطہ کھانا) "ٹاؤن ہال کے اوپر سے ایک طیارہ غوطہ دے کر ابھرا" (سید قاسم محمود ۱۹۶۸ء، "نئی قدریں" شمارہ نمبر ۲)۔ ☆اڑان بھرنا (چوکڑی بھرنا) ہرنوں کی ڈاریں اڑانیں بھرتی ہیں (محمد خالد اختر، دسمبر ۱۹۷۰ء، "فنون")۔ ☆آنکھ بجھنا (بینائی جاتے رہنا)

بجھ گئی آنکھ تو کیا پیراہن تر لائے چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر لائے (پروین شاکر)

☆پیغام بجھنا (نسبت ختم ہونا) "اپنی بے سروسامانی کا ذکر کیا تو پیغام بجھ گئے" (محمد رفیق، جنوری ۱۹۷۲ء، "اردو ڈائجسٹ")۔ ☆تماشا کرنا (تماشا بنانا)

مجھ کو محفل میں تماشا نہ کرو کم سے کم خود کو تو رسوا نہ کرو (رفعت عطا)

☆چنگاریاں چھونا (ایذا پہنچانا)

لہو رگوں میں مظفر چھڑائے مہتابی ملے ہے کیا اسے چنگاریاں چھونے میں (مظفر وارثی)

جدید الفاظ و محاورات کا یہ ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے کئی لغات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایسی ایک مختصر سی کوشش مکرم لکھنوی نے ۱۹۸۲ء میں کی تھی۔ اگرچہ تبدیلی خاص طور پر قواعدی تبدیلی پر کئی ثقہ قسم کے اہل علم نے قلم اٹھایا ہے اور تصحیح و صحت زبان کا شوق بھی عام رہا ہے مگر پاکستانی اردو کی اس تبدیلی کے چلن پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور حکیم محمد اشرف جیسے اہل علم کی تحریریں اور کتابچے بھی ملتے ہیں۔ بعض لوگ اس قسم کے تجربات اور تبدیلیوں کو زبان کی شکست و ریخت قرار دیتے ہیں۔ بعض علاقائی اثر و نفوذ کو "سلینگ" سے زیادہ درجہ نہیں دیتے جب کہ یہ صرف زبان کی وسعت اور کینڈے کی تبدیلی ہے۔ بقول فہیم اعظمی "حقیقت یہ ہے کہ زبان کا سٹرکچرنگ عمل ایک معاشرتی عمل ہے جو زبان کو وسعت دیتا ہے۔ اس میں الفاظ اپنی افادیت کھو سکتے ہیں، نئے الفاظ ان کی جگہ لے سکتے ہیں، الفاظ کا اضافہ ہو سکتا ہے، تلفظ اور لہجے پر اثر پڑ سکتا ہے

لیکن اسے شکست وریخت کہنا درست نہیں"۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی اردو کے ان خدوخال کو قواعد، صرف ونحو، اسلوبیات اور انشاپردازی کے حوالے سے زیادہ واضح کیا جائے اور ان پر مبنی ویبسٹر کی پیروی میں پاکستانی اردو کا ایک جامع لغت مرتب کیا جائے۔ جو املا، ہجے، معنی اور استعمال کے حوالے سے وضاحتیں پیش کر سکے۔ اس سے قدیم لغت نگاری میں محاوروں، روزمروں اور ضرب الامثال کو جو بے جا اہمیت دی گئی تھی، اس میں بھی کمی آئے گی اور پاکستانی لغت نگاری "الفاظ" تک محدود کرنے اور ان مذکورہ اور دیگر ممکنہ پہلوؤں کو الفاظ کے تحت محض ذیلی حیثیت دینے میں بھی مدد ملے گی۔ اس ضمنی فائدے کے ساتھ جدید اردو ادب میں لغت و قواعد کے حوالے سے آنے والی ان تبدیلیوں کو بھی نہ صرف ریکارڈ پر لایا جاسکے گا بلکہ ادب سے معنویاتی طور پر مستفید ہونے میں عام قاری کو بھی مدد فراہم ہو سکے گی، جس سے اردو کا مستقبل واضح اور روشن نظر آئے گا۔

بات دراصل یہ ہے کہ دور جدید میں زبان کی ادبی ثقافت اور اس کا کینڈا (genre) صدمے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ ادب محض تحریر ہے اور لیونارڈ بلوم فیلڈ جیسے بلند پایہ محقق اس بات کا تحقیق کے ساتھ انکار کر چکے ہیں کہ زبان محض تحریر کا نام ہے۔ اصل زبان تو بول چال میں ہوتی ہے۔ سائیسر جیسا ماہر لسانیات کہتا ہے کہ بالآخر ہر ادبی زبان جو ثقافت کی پیداوار ہوتی ہے، بولے ہوئے لفظ یا بول چال کی زبان سے الگ ہو جاتی ہے۔ جب کہ روزمرہ بول چال کی زبان بھی زیادہ کاروبار حیات کو چلاتی ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں میں ماہرین لسانیات نے تحریر کو مطالعہ زبان کے سلسلے میں یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے جب نوم چومسکی کی تحقیقات سامنے آئیں تو زبان کو بول چال اور تحریر دونوں صورتوں میں قبول کیا جانے لگا۔ یہ بھی عبوری دور تھا۔ اب نفسی لسانیات کا دور ہے۔ مائیکل ہالیڈے کا نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ ایس ایم شاہد نے اس بنیاد پر "خواندگی اور زبان" پر تحقیق انجام دی ہے، جو قابل توجہ ہے۔ اس حوالے سے آج لسانیات کی دنیا میں قواعد کی بجائے جو محض تحریری زبان کا تجزیہ ہوتے ہیں، گفتگو اور اس کی قبولیت معیار ٹھہرنے لگی ہے، جو بول چال کے تقاضے ہیں، آج یہ سمجھا جاتا ہے کہ زبان کی کئی ہیئتیں (forms) ہیں جو زبانی روایات اور ادبی روایات کے علاوہ بھی کئی پیچیدہ صورتوں میں موجود ہیں۔ پاکستانی اردو میں ایسی کئی ہیئتوں کا احساس ہوتا ہے۔ جن کا تحقیقی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

پاکستانی دور سے پہلے اردو کی ان مختلف ہیئتوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل تھی۔ اب تک اردو کے سلسلے میں ہم صرف ادبی ہیئت کو جانتے تھے لیکن وقت نے ہمیں بتادیا کہ گفتگو، بول چال، ادب علم، صحافت، معلومات عامہ، اشتہارات، فارموں، درخواستوں اور فہرستوں کے متعدد سانچوں، کینڈوں، محضروں اور متون کی متنوع ہیئتیں موجود اور برسر عمل ہیں۔ زبان دراصل ہمارے تجربات (Experiences) کے اظہار اور تفہیم کے لئے توسل کاری (Mediation) کرتی ہے اور جب زبان کی کوئی ہیئت (From) اس توسل کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتی تو اس کے سانچے (Registers) اور کینڈے (Genres) تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ محض یہ خیال کہ زبان ابلاغ کرتی ہے اور ابلاغ خیالات کو الفاظ میں اور پھر الفاظ کو واپس خیالات میں منتقل کرنے کا نام ہے، ایک محدود نظریہ ہے۔ دراصل زبان ہمارے ذہن کا نفسیاتی اور سماجی حوالوں سے توسل کرتی ہے، خواہ اس کے لئے اسے الفاظ ملیں یا اشارے، علامتیں یا لہجے۔ آج یہ سب "زبان" میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کی پاکستانی اردو میں توسلات کا وجود ہے اور ان پر عبور رکھنے کے باعث اردو ایک واقعی زبان کی حیثیت سے منفرد ہو چکی ہے اور یہ کہ اس کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خدوخال پر سائنسی تحقیقات انجام دی جائیں تاکہ آئندہ شعر و ادب، صحافت، دفاتر، قانون، علم، تعلیم، خواندگی، گفتگو اور رسمی و غیر رسمی بول چال کے تقاضوں کے حوالے سے بہتر سانچے، محضر اور متون وجود میں آئیں۔ ☆☆☆

تابش دہلوی

غم کو راحت بنا لیا ہم نے
لو یہ دھوکا بھی کھا لیا ہم نے

زندگی خوشگوار ہی رکھی
تلخیوں کا مزا لیا ہم نے

چند موہوم حسرتوں کے سوا
اور دنیا سے کیا لیا ہم نے

بے وفا دیکھ کر زمانے کو
خود سے عہد وفا لیا ہم نے

آئینہ جب بھی رو بہ رو آیا
اپنا چہرا چھپا لیا ہم نے

دل کو برباد ہونا تھا سو ہوا
تیرے غم کو بچا لیا ہم نے

نہ ہوئے غیر سے سبک تابش
اپنا بوجھ آپ اٹھا لیا ہم نے

● Block-3A, 6/9 Nazimabad
Karachi (pak)



قتیل شفائی

اس کا جھوٹ بھی کتنا اچھا لگتا ہے
وہ مجھ کو ہر حال میں سچا لگتا ہے
کچی عمر میں وہ سب رشتے بانٹ چکا
سوچتا ہوں اب وہ میرا کیا لگتا ہے
الگ سا ایک خمار ہے اس کی آنکھوں میں
جاگتے میں وہ سویا سویا لگتا ہے
وہ اس کا مخمور بدن وہ مست نظر
چلتا پھرتا اک میخانہ لگتا ہے
یہ بھی ایک خوبی ہے شہر کے نقشے میں
ہر رستہ اس گھر کا رستہ لگتا ہے
پہنچ نہ پائے جس کی نظر پس منظر تک
مجھ کو تو وہ آدمی اندھا لگتا ہے
مفت پیام کبوتر لے جاتے تھے
ٹیلی فون پہ اب تو پیسہ لگتا ہے
یہاں نہیں تو وہاں ملے گا وہ کیسے؟
مجھ کو تو یہ ایک دلاسا لگتا ہے
مر کر میں اندوہِ وفا سے چھوٹ گیا
اب وہ ستمگر مجھے مسیحا لگتا ہے
دلوں کا ہے یہ کوئی اور نظام قتیل
جس میں کبھی تو غیر بھی اپنا لگتا ہے

●19-Ghalib Colony,
Samanabad Lahore (Pak)



ادا جعفری

کوئی چراغ تو روشن تم اپنے گھر رکھنا
کوئی تڑپ، کوئی منظر ہی آنکھ بھر، رکھنا

ہوا کے سامنے شاخِ گلاب جیسی ہو
جھکو تو سر کو اٹھانے کا بھی ہنر رکھنا

عجیب فیصلہ تھا یہ مرے قبیلے کا
شجر دعاؤں کے ہوتے بھی بے ثمر رکھنا

تمام شہر دھوئیں سے اٹا ہوا ہے ابھی
امانتوں کی طرح دل میں بام و در رکھنا

برس رہے ہیں جو شعلے دلوں تک آنے لگے
کوئی تو آئینۂ جاں سنبھال کر رکھنا

ہوائیں ساتھ کوئی کربلا نہ لے آئیں
سو اب کے زخم دل و جاں کو راہبر رکھنا

یہیں کہیں تو سحر راستے میں پڑتی ہے
کسی جنوں کو ادا اپنا ہم سفر رکھنا

●43/8B,Block-6, P.E.C.H
Society, Karachi (Pak)



نظیر صدیقی

پانچ شعر

بچھڑ کر تم سے دل کی بزم آرائی نہیں جاتی
مگر یہ کیا کہ ملتے ہو تو تنہائی نہیں جاتی

رات سے شکایت کیا بس تمہیں سے کہنا ہے
تم ذرا ٹھہر جاؤ رات کب ٹھہرتی ہے

بہت ممنون ہوں سعی تلافی کے لئے لیکن
جو سمجھو تو مجھے تم سے شکایت اور ہی کچھ ہے

میرا احوال پوچھنے والے
اب یہاں کہنے کو رہا کیا ہے

محبت کے کئی معنی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے
مجھے تیرے، تجھے میرے بدن کی بھی ضرورت ہے

●House No. 1915. Street- 10.
I-10/2. islamabad- 44800 (Pak)



شمیم صبائی متھراوی

خوش رہیں وہ بھی جو مرے شہد میں سم سموگئے
میری خوشی کے ہار میں گوہر غم پروگئے

بات نہ جانے کیا کہی کان میں ان کے آپ نے
میرے صلاح کار بھی آپ کے ساتھ ہوگئے

آمدورفت اقربا، گھر میں ہمارے یوں رہی
چار مزید آگئے، گھر سے کبھی جو دو گئے

سیر گہ حسین تر، کوئی ادھر ضرور ہے
پھر نہ پلٹ کے آئے وہ باغ جہاں سے جوگئے

آپ سے اب میں کیا کہوں اپنے ستم کی داستاں
میرے رفیق ہی مری کشتیٔ جاں ڈبوگئے

اف وہ وداع کی گھڑی وہ ہوئے ایسے مضطرب
اشک گراکے آنکھ سے شانہ مرا بھگوگئے

گیت پرانے کس قدر دلکش ودلپذیر ہیں
جب بھی شمیم نے سنے ان میں شمیم کھوگئے

●124-D, G-2/6, Street- 20
Islamabad (Pak)



ثنا گورکھپوری

بس اب تو جی میں یہی ہے کہ مرکے دیکھتے
کسی سے ہم بھی ثنا عشق کر کے دیکھتے
کوئی سوار وپیادہ نہیں ہے ساتھ
مجھے بھی لوگ تری رہگذر کے دیکھتے
یہ شہر جس میں کہاں ہے کسی کو فرصتِ
ہم آج بھی تجھے اکثر ٹھہر کے دیکھتے ہی
کسی میں تیری صدا ہے کسی میں تیرا اسکو
تجھے فقیر ترے دربدر کے دیکھتے
مسافروں کے مقدر میں ایک شب ہے بہ
وہ میرے ساتھ ستارے سحر کے دیکھتے
تم اپنے روپ کا درپن ہمیں بھی دکھا
تمہارے ساتھ ہی ہم بھی سنور کے دیکھتے
نجوم و ماہ و ثریا کو دیکھنا ہے فقط
تمہاری مانگ میں سیندور بھر کے دیکھتے
اٹھا نشت سے اپنی تو لمس چھوڑ
سو واں نقوش بہشت نظر کے دیکھتے
ہوئے طلوع شبستاں میں اس کے کیا کیا
ستارے بند قبا کے اتر کے دیکھتے
وہ رفتہ رفتہ ثنا انتظار کرنے
سو آج ہم بھی ذرا دیر کر کے دیکھتے

36/4, Area 5-D, North Karachi
achi -75860 (Pak)

پاکستان میں اردو ادب

ایک سرسری اشاریہ

افتخار امام صدیقی

پاکستان میں اردو ادب ایک وسیع تر موضوع ہے۔ شاعر کے ایک ضخیم خاص نمبر کا موضوع یا پھر کسی مبسوط کتاب کا موضوع۔ ۲۰ سال قبل رشید امجد نے کتابی سائز کی ۶ ضخیم جلدوں میں پاکستانی ادب مرتب کیا تھا اور اس میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کے بارے میں بھی لوازمہ دیا گیا تھا۔ اب ادھر قیام پاکستان کے پچاس سال مکمل ہونے پر جو پچاس سالہ جائزے ترتیب دیئے گئے یا دئے جا رہے ہیں ان میں پروفیسر غفور شاہ قاسم کی دو کتابیں "پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال" اور اسی کتاب کا اضافہ شدہ ایڈیشن، بہت اہم ہیں۔

جشن زریں پاکستان کے موقع پر کچھ اور بھی کتابیں آئی ہیں۔ اوراق (لاہور) وغیرہ ادبی رسائل میں مختلف اصناف کے تحت کچھ تفصیلی جائزے آئے ہیں۔ ادارہ ادبیات پاکستان سال بہ سال نثر و نظم کے انتخاب بھی شائع کرتا ہے اس کے باوجود موضوع کا وسیع پھیلاؤ مزید کام کا متقاضی ہے۔ شاعر کے زیر ترتیب پروجیکٹ "اردو ادب کی ایک صدی" (دو جلدیں) کے تحت پاکستان میں اردو ادب کا تفصیلی جائزہ شامل ہوگا۔ ذیل میں مختصر مختصر شذرات میں بعض بنیادی عنوانات کے اشاریے تحریر کئے جا رہے ہیں جو قارئین شاعر کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے وہ بہت سرسری اور عمومی ہے البتہ بین السطور میں خاصی روشنی بھر دی گئی ہے:

جس کی جیسی آنکھیں ہیں　　دنیا بالکل ویسی ہے

اردو: قومی زبان مگر سرکاری زبان نہیں ...!

پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ تو اسی دن مل گیا تھا جب پاکستان بنا تھا اور اب پچاس سال مکمل ہو جانے کے بعد بھی اردو قومی زبان ہے لیکن آج تک یہ سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ مقتدرہ قومی زبان کے تحت شائع ہونے والا ماہنامہ "اخبار اردو" نے پاکستان میں نفاذ اردو کے لئے بے حد وقیع کام کیا ہے اور مسلسل کام ہو رہا ہے لیکن اردو پاکستان کی سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے۔ کیوں نہیں ہے کی بحث میں نہ جاتے ہوئے صرف چند امور پر سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ دراصل اردو زبان پاکستان کی دیگر زبانوں اور بولیوں کے درمیان اپنے ماضی کے مکمل ورثے کے ساتھ سرکاری زبان بن جانے کے راستے میں ہے۔ بنیادی طور پر دو یا دو سے زائد زبانوں یا بولیاں بولنے والی آبادیوں سے جڑی ہوئی ہے تاہم اردو کے ساتھ علاقائی زبانوں کا جو تال میل ہونا چاہئے وہ کمزور ہے۔ کوئی بھی زبان ہو وہ اپنا علاقہ اور اپنے تشخص کا تحفظ چاہتی ہے اور یہی کشمکش اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے درمیان ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک تاریخی، تہذیبی و ثقافتی ورثہ ہوتا ہے جس کا احترام ضروری ہے اور احترام نسل در نسل سفر کرتا ہے۔ اس احترام سے ہلکی سی مزاحمت بھی نقصان دہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش اس کی ایک مثال ہے۔ وہاں اردو کو کوئی سرکاری تحفظ نہیں۔ اردو کا وجود برائے نام ہی ہے۔ اردو قومی زبان اور اردو سرکاری زبان کے درمیان پاکستان کی بڑی چھوٹی زبانیں بھی ہیں اور بڑی زبانوں کے اپنے علاقے بھی ہیں۔ پاکستانی اردو کے خدوخال ان زبانوں سے ابھر رہے ہیں اس لئے کہ اردو کا مزاج ہی جذب کرنا ہے۔ جو لفظ بھی اردو بول چال میں آیا وہ اردو ہو گیا۔ لیکن یہ پھیلاؤ جس فطری ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے اس کے نتائج سرکاری زبان کا راستہ نہیں ہیں۔

پاکستان کے ادبی رسائل

پاکستان کے ادبی رسائل کی تاریخ تو قیام پاکستان کے بعد ہی سے بنتی ہے لیکن غیر منقسم ہندوستان میں اس وقت کے ادبی مراکز لاہور، دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی اور بھوپال سے جو ادبی رسائل شائع ہوا کرتے تھے، تقسیم کے بعد ان میں سے بیشتر یا تو پاکستان منتقل ہو گئے یا پھر بند ہو گئے۔ جو رسائل باقی بچ رہے انہوں نے اپنی ایک شاندار تاریخ بنائی۔ وہ بہر حال! اپنا رشتہ ۱۹ ویں صدی کی اردو صحافت ہی سے قائم کرتے ہیں اور اس میں حق بجانب ہیں۔ ایسے ہی عہد ساز اور پاکستان کے پیش رو ادبی رسائل میں سے چند ایک یہ ہیں۔

اردو [جنوری ۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۷ء ☆ جولائی ۱۹۴۹ء تا ۱۹۷۰ء] ہمایوں [جنوری ۱۹۲۲ تا دسمبر ۱۹۴۷ء ☆ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۷ء] نگار [فروری ۱۹۲۲ تا نومبر ۱۹۶۲ء ☆ ۱۹۶۳ء تا حال] عالمگیر [جون ۱۹۲۴ء تا ۱۹۴۸ء] ادبی دنیا [۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۷ء ☆ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۵ء] ساقی [۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء ☆ ستمبر ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۱ء] ادب لطیف [۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء ☆ ۱۹۴۸ء تا حال] افکار [اپریل ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء ☆ ۱۹۵۱ء تا حال] سویرا [جنوری ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء ☆ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۸۷ء] نیا دور [۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء ☆ ۱۹۵۶ء تا حال]

یہ چند عہد ساز ادبی رسائل ہیں جو آزادی سے قبل غیر منقسم ہندوستان سے شائع ہوئے اور تقسیم کے بعد پاکستان سے بھی شائع ہونے لگے۔ ان میں ہر رسالے کی اپنی ایک تاریخی داستان ہے۔ اُن میں سے بعض رسائل اب بھی شائع ہو رہے ہیں لیکن اس طمطراق کے ساتھ نہیں جو ان رسائل کو عہد ساز رسالہ بنا سکے تھے۔ ان تمام رسائل کی زبردست خدمات ہیں۔ تجربے، تنوع، اجتہادی جہتیں، ادبی معرکے، مجادلے، زبان و ادب کی بے لوث خدمت، اپنے عہد اور عصر کو جی لینے کی بھرپور کوششیں۔ شعر و ادب کا ایک ایسا ماحول ان ادبی رسائل نے دیا کہ آج اس طرح کے ادبی رسائل اور مثالیں خال خال ہیں۔

نگار تواب بند ہی ہو گیا ہے حالانکہ فرمان فتح پوری ایک نہایت ہی ذی علم دانش ور ہیں اور ان کی ادبی خدمات غیر معمولی ہیں۔ نیاز فتح پوری مرحوم کے ساتھ انہوں نے کام کیا ہے اور کراچی ہی سے نگار کے کئی خاص نمبر شائع کئے لیکن نیاز صاحب کے انتقال کے بعد [م : ۲۴ر مئی ۱۹۶۶ء] فرمان صاحب کی تمام تر کوششوں کے باوجود نگار پابندی کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔ ڈیمائی سائز اور کم صفحات میں معیاری ادب پیش کرنے کی ممکنہ سعی کی۔ نگار میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک تاریخی حقیقت یہ ہے کہ وہ ادبی رسائل جو اپنے مدیران کی بھرپور سانسوں میں جئے، بعد میں آنے والے مدیران سے سنبھل نہیں سکے۔ کسی بھی ادبی رسالے پر اس کے مدیرانوں کی گہری چھاپ کبھی ختم نہیں ہو پاتی، رسالہ جاری رہے یا بند ہو جائے۔ مدیر کے نام کی گونج رہتی ہی ہے۔ نگار و نیاز ساقی و شاہد" فاران و ماہر 'نقوش و طفیل۔

"نیرنگ خیال" اور "ادب لطیف" آج بھی شائع ہو رہے ہیں لیکن ان رسائل کی کوئی خاص گونج نہیں ہے، باوجود اس کے کہ ان کے مدیران اپنی سی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ تاریخ ساز رسالے جاری رہیں۔

افکار آج بھی جاری ہے اور کئی اعتبار سے اس کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ صہبا لکھنوی اس کے تنہا مدیر ہیں جو اجراء کے بعد سے آج تک اس کو شائع کر رہے ہیں۔ افکار کے ضخیم شخصیات نمبر کی اپنی ایک تاریخ ہے [حالیہ سردار جعفری نمبر] یہ خاص نمبر ریسرچ کا موضوع ہیں۔ بیسویں صدی کی ادبی صحافت کا یہ مثالی کارنامہ ہے کہ کسی رسالے کے ایک ہی مدیر نے ساٹھ سال تک اسے جاری رکھا ہو جب کہ دیگر عہد ساز رسائل کے مدیران تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد وہاں سے نئے ادبی رسائل میں سے بعض نے اپنی ایک تاریخی حیثیت بنائی ہے اور عہد ساز ادبی رسائل کی فہرست میں شامل ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: ماہ نو [مارچ ۱۹۴۸ء تا حال کراچی] نقوش [مارچ ۱۹۴۸ء تا حال] فاران [اپریل ۱۹۴۸ء تا حال کراچی] قومی زبان یکم جون ۱۹۴۸ء تا حال۔ کراچی] قندیل [جولائی ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۰ء لاہور] سنگِ میل [اگست ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۳ء] سب رس [۱۹۴۸ء تا حال کراچی] صحیفہ [جون ۱۹۵۷ء تا ۱۹۸۸ء] سیارہ [اگست ۱۹۶۲ء تا حال لاہور] فنون [۱۹۶۳ء تا حال لاہور] سیپ [ستمبر ۱۹۶۴ء تا حال۔ کراچی] اوراق [جنوری ۱۹۶۶ء تا حال لاہور] تخلیق ۱۹۶۹ء تا حال۔ لاہور] طلوع افکار ۱۹۷۰ء تا حال۔ کراچی] جریدہ [۱۹۸۳ء تا حال۔ پشاور] انہیں رسائل کے ساتھ اور ان کے بعد بھی کئی نئے اور اہم رسائل شائع ہوئے اور سہ ماہی 'خیال' (فیصل آباد) ، ماہنامہ 'آگہی' (کراچی) تک، ان میں سے بعض رسائل اپنی ایک الگ تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

نقوش نے ہند و پاک کے ادبی رسائل میں اپنی ایک منفرد جگہ بنائی اور اپنے نت نئے موضوعاتی ضخیم خاص نمبروں کی وجہ سے بڑے ادبی رسائل میں بہت نمایاں ہو گیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۵۰ء کے درمیان صرف دس شمارے شائع ہوئے اور اس کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور تھے۔ مئی ۱۹۵۰ء تا مارچ ۱۹۵۱ء یعنی شمارہ ۱۱ر سے ۱۸ر تک سید وقار عظیم اس کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۶ء ، اس کے مدیر محمد طفیل ہوئے تو نقوش کی صوری و معنوی حیثیت ہی بدل گئی اور خاص نمبروں کی جو ایک روایت غیر منقسم ہندوستان میں ادبی رسائل نے قائم کی تھی اسے ایک بالکل ہی نیا رنگ روپ دے دیا۔ نقوش کا 'طلوع' محمد طفیل مرحوم کی شگفتہ تحریروں کا مرقع ہے۔ طفیل صاحب نے رسالہ نقوش ہی کی ترتیب و کفالت نہیں کی بلکہ ہند و پاک کے کئی ایک بڑے ادیبوں کی بھی پرورش کی۔ کیونکہ وہ زبردست ادب دوست مدیر تھے اور ادیبوں کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ ہندوستان سے کئی بڑے ادیب پاکستان جاتے اور پھر طفیل صاحب انہیں لدا پھندا بھیجتے تھے۔ انہیں دوسروں سے کام لینے کا ہنر خوب آتا تھا۔ چنانچہ محمد عبداللہ قریشی اور کسریٰ منہاس جیسے قابل قدر عالموں سے نقوش کے کئی موضوعاتی خاص نمبر مکمل کروائے۔ مگر ان لوگوں کا کوئی اور کہیں اعتراف بھی نہیں ہوا۔ 'نقوش' کا لاہور نمبر دو جلدوں میں شائع ہوا جسے محمد عبداللہ قریشی نے ترتیب دیا تھا لیکن ان نمبروں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ قریشی صاحب نے اس کے بعد 'نقوش' سے علاحدگی اختیار کرلی۔ نقوش کے تمام موضوعاتی خاص نمبر اس اعتبار سے تو اہم ہیں کہ اردو میں پہلی بار اس نوع کے کام کئے گئے تاہم ان میں سے بیشتر خاص نمبروں کی کوئی تحقیقی و تاریخی حیثیت نہیں بنتی کیوں کہ زیادہ تر کام حوالوں کے بغیر کیا گیا ہے یہ تاثر قائم کرنے کے لئے گویا سارا کچھ مدیر نقوش کا کیا ہوا ہے۔ وہ میر تقی میر نمبر ہو یا ادبی معرکے نمبر یا خطوط نمبر یا کچھ اور۔ بڑے ادبی رسائل کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسالے کے بانی یا مدیران نے خود بہت کم کام کیا بلکہ دوسروں سے ہی زیادہ مدد لی۔ نقوش کے ساتھ بھی یہی رہا ہے۔

نقوش کے تمام موضوعاتی خاص نمبر ہزار تنقید کے باوجود اس لئے اہم ہیں کہ موضوعات کے انتخاب اور پھر نادر و نایاب مضامین کی جمع آوری میں اس رسالے کا کوئی ثانی نہیں۔ اپنے گٹ اپ اور انداز پیشکش کے اعتبار سے بھی 'نقوش' کے نقوش جاذب نظر ہوتے ہیں۔ طفیل صاحب نے قرآن نمبر اور رسول نمبر کو کئی جلدوں میں مرتب کروا کے شائع کیا اور اپنی آخرت کا سامان بھی کرلیا۔ نقوش کے خاص نمبر پر معیاری تحقیقی کام ہونا باقی ہے۔ نقوش اب بھی جاری ہے۔ یہ خاص لوگوں کا "بہت خاص" رسالہ ہے۔

پاکستان کے دو اور بڑے ادبی رسائل 'فنون' اور 'اوراق' ہیں۔ ان کی ضخیم اشاعتیں سال بھر میں دو، تین بار پابندی سے ضرور شائع ہوتی ہیں۔ ان کے مدیران احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کی اپنی بڑی خدمات ہیں اور اس وقت یہ دو نام دو بڑے ادبی دبستان سمجھے جاتے ہیں۔ فنون کا غزل نمبر (دو جلدیں) ایک یادگار اور اہم ماخذ ہے۔ 'اوراق' میں شعری تجربوں (FORMS) کا تنوع ہے۔ 'انشائیہ' کا زبردست ترجمان ہے۔

اب پاکستان سے کئی اور ماہنامے اور سہ ماہی ادبی جریدے ڈیمائی یا کتابی سائز میں شائع ہو رہے ہیں: تشکیل (کراچی) آئندہ (کراچی) بادبان (کراچی) تسطیر (میرپور) صریر (کراچی) ارتقاء (کراچی) دائرے (کراچی) اقدار (کراچی) مکالمہ (کراچی) سخنور (کراچی) ابلاغ (نوشہرہ) تجدید نو (لاہور) سفید چھڑی (لاہور) آثار (اسلام آباد) خیال (فیصل آباد) معاصر (لاہور) آج (کراچی) عوامی منشور (کراچی) وغیرہ وہ رسائل ہیں جو اپنی اپنی ادبی شناخت بنانے کی سعی کر رہے

ہیں۔ اور بھی رسائل ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کا ادبی رسالہ "ادبیات" گاہے گاہے شائع ہوتا ہے اور اس کی ہر اشاعت ایک ضخیم اشاعت ہوتی ہے۔ حالیہ دنوں میں اس کا عالمی ادب نمبر ۲ ر جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ یہ سرکاری مجلہ اردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں کے شعر و ادب کا ترجمان ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کا رسالہ ماہنامہ اخبار اردو (جہازی سائز) ایک اہم علمی، تحقیقی اور ادبی رسالہ ہے جو پاکستان میں اردو کے نفاذ کے لئے کوشاں ہے۔ یہ ایک اہم خبر نامہ بھی ہے۔ پاکستان اور بیرون پاکستان اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے مسائل پر معیاری مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ کے عنوان سے ڈاکٹر انور رسدید کی ایک گرانقدر کتاب اکادمی ادبیات پاکستان نے جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع کی تھی۔ ۳۸۱ صفحات کی جہازی سائز کتاب میں ابتدا ء سے ۱۹۸۸ء تک کے ادبی رسائل پر غیر معمولی تحقیقی لوازمہ دیا گیا ہے۔ یہ محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ مستقل نوعیت کا کام ہے۔ خدابخش لائبریری (پٹنہ) ہندوستان میں ایک اہم اور بڑا ادارہ ہے۔ اس کے تحت دو کتابیں، "اردو رسائل ۱۹۹۲ء" اور "اردو رسائل۔ ۱۹۹۴ء" شائع ہوئی تھیں لیکن یہ ناقص ترین کام ہے۔ غالب لائبریری (کراچی) میں اردو کے ادبی رسائل کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن ابھی ہندوپاک میں ذاتی کتب خانوں میں ادبی رسائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ ادبی رسائل کی تاریخ پر ابھی بہت سارا تحقیقی کام باقی ہے۔ اس سمندر کی غواصی نہیں کی گئی، اس میں بڑا زبردست ادبی خزانہ گم ہے۔ نصف صدی سے بھی زائد شائع ہونے والے ادبی رسائل کو "قومی سرمایہ" نہیں سمجھا گیا۔ ادبی رسائل کو کوئی انعام یا ایوارڈ نہیں ملتا۔ اور اگر ایسا ہو تا بھی ہے تو بہت معمولی سطح پر ان کی پذیرائی ہوتی ہے۔ وہی مسائل جو ہندوستان کے ادبی رسائل کو در پیش ہیں بعینہٖ پاکستان کے ادبی رسائل کے ساتھ بھی ہیں۔ حالانکہ پاکستان میں اردو قومی زبان ہے اور وسائل بھی زیادہ ہیں لیکن سنجیدہ ادب کے قارئین وہاں بھی محدود ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی بہت ساری وجوہ ہیں۔ پاک ٹی وی، ہندوستانی فلمیں، خوبصورت اور متنوع کمرشیل رسالے [اخبارِ جہاں اور اخبارِ خواتین وغیرہ۔ ان میں ادب بھی ہوتا ہے] مختلف النوع ڈائجسٹ ،اخبارات کے ادبی صفحات، کتابوں کی رسمِ اجراء ، شاندار شعری نشستیں اور مقامی مشاعرے، ادبی رسائل کی معنوی یکسانیت، ادبی گروہی تعصب وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان کے ادبی رسائل میں جو صوری و معنوی تجربے ہوتے رہتے ہیں وہ پاکستانی ادبی رسائل میں کم کم ہیں۔ ممکن ہے کہ پاکستان کے عہد ساز پیش رو ادبی رسائل کے مدیران نے کوئی گوشہ، کوئی پہلو ہی نہ چھوڑا ہو کہ مابعد ادبی رسائل کو کچھ کر دکھانے کا موقع مل سکے۔

اخبارات کے ادبی صفحات

اردو صحافت کی ابتدا کے بعد سے جو اخبارات شائع ہوئے ان سے وابستہ افراد میں سے بیشتر ادیب ہی تھے لہٰذا جہاں خبروں کی رسائی ایک مقصد تھا تو وہیں عوام کی ذہنی تربیت اور آبیاری کے لئے مختلف کالم اور تحریریں شامل کی جاتی تھیں۔ اخبار کا مکمل اسلوب ہی شستہ اور شائستہ ہوتا تھا۔ قومی، ملکی اور سماجی مسائل رائے دینے والے یہ صحافی بعد میں بطور ادیب کے بھی مشہور ہوئے۔ ادب اور صحافت کی ہم آہنگی سے اخبارات اور اس کے مدیران یا عملے کے بیشتر قلم کاروں کی خدمات کی ایک تاریخ اردو صحافت پر لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہے۔ ابتدائی اخبارات کا یہ وصف ہندوپاک سے شائع ہونے والے روزناموں میں آج بھی موجود ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں سے شائع ہونے والے روزناموں میں "امروز" کے ادبی ایڈیشن [قسمت علمی و ادبی] کی روایت مولانا چراغ حسن حسرت نے قائم کی جو ادبی صحافت کا بنیادی معیار نامہ تصور کی گئی۔ اس کے بعد دیگر روزناموں میں ملت، آفاق، حریت، نوائے وقت، جنگ، مشرق ،جسارت، امن جیسے بڑے روزنامے جو بہ یک وقت پاکستان کے مختلف صوبوں اور شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔ ان کے ادبی صفحات کسی ادبی ماہنامے سے کم نہیں ہوتے۔ معاصر اردو اخبارات کے ادبی ایڈیشن اب پاکستانی اخبارات میں ناگزیر ہیں اور ایک مستقل بحث کا موضوع بنتے ہیں کہ کیا ان اخبارات میں شائع ہونے والی ادبی تحریروں کا کوئی مقام ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ یہ ادبی ایڈیشن زبان و ادب کی ترویج واشاعت میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں، کیوں کہ آج یہ ادبی ایڈیشن ،ادبی معرکہ آرائی اور ذاتیات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مختلف وقت میں مختلف ادبا و شعرا ان ادبی ایڈیشنوں سے وابستہ ہو کر اپنے مزاج، اپنے گروہ اور اپنی ذاتی پسند، ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے اردو اخبار کی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے کسی بھی طرح کم نہیں چنانچہ کوئی بھی تحریر اس میں آنے کے بعد شام ہوتے ہوتے بہت دور تک پہنچ جاتی ہے۔ رنگین اور باتصویر ادبی ایڈیشن میں ادبی خبریں ،انٹرویوز شاعری، افسانہ، مضامین، ادبی کالم وغیرہ کی شمولیت سے کسی ادبی ماہنامے کا تصور ابھرتا ہے تاہم آج کی صورتِ حال میں پاکستانی اردو اخبارات کے ادبی صفحات اپنے سابقہ معیار کو قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔

۱۵ر روزہ اور ماہنامہ ادبی اخبارات

روزناموں کی طرز پر پندرہ روزہ اور ماہنامہ ادبی اخبارات کا چلن بڑھ رہا ہے۔ ادب نامہ، احساسِ نو، قلم قافلہ، ادبی اخبار، دلچسپ اور 'بجنگ آمد' وغیرہ اخبارات کو اٹھایئے کسی بڑے روزنامے کی طرز پر شاہ سرخیوں ذیلی سرخیوں، خبروں اور تصاویر کے ساتھ کتب و رسائل کے اشتہارات نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ ۱۵ر روزہ احساسِ نو (لاہور) کے ایک شمارہ [یکم نومبر تا ۱۵ر نومبر ۱۹۹۹ء] کی چند سرخیاں اس طرح ہیں۔ ایک شاہ سرخی:

- لوگ مزاح پڑھنا چاہتے ہیں (ضیاء الحق قاسمی)
- اکادمی ادبیات اردو اور مقتدرہ قومی زبان سرکاری اصطبل سے بندھے ہوئے فارمی گھوڑے ہیں۔ (حسین مجروح)
- ٹی وی کے مشاعروں سے سات سمندر کے مشاعروں تک برسوں سے وہی "سلامت علی نزاکت علی" سنگت کر رہے ہیں۔ (ایضاً)
- چودہ کروڑ کی آبادی میں سنجیدہ ادب کی کتاب صرف پانچ سو چھپتی ہے ایسے میں ادب کی آواز کہاں پہنچے اور کسے سنائی دے (ایضاً)
- ٹائیں ٹائیں فش، کمال فن ایوارڈ ادیبوں کی انشورنس، سب گیا؟

لاہور کے معروف شاعر اور ماہر علم الاعداد و فلکیات عمر زمان کی ایک خبر کے حوالے سے جو سرخیاں لگی ہیں وہ یہ ہیں:

- ۲۰۰۰ء نئے سال میں اہل قلم کے ساتھ کیا ہوگا
- خواتین کی کتابیں زیادہ شائع ہوں گی
- جن کے نام کا عدد ۷ رہے وہ غیر ملکی دورے پر جائیں گے
- امجد اسلام امجد اور احمد فراز کے لئے نشیب و فراز
- کشور ناہید اور نوشی گیلانی آؤٹ ہو جائیں گی

پوری خبر دلچسپ اور سنسنی آمیز اسلوب میں درج کی گئی ہے۔ اسی آخبار کے صفحہ نمبر دو پر مصروفیات کے زیر عنوان جو خبر نامہ ہے اس میں ایک جگہ درج ہے:

"ممبئی سے شائع ہونے والے ماہنامہ شاعرؔ کے ایڈیٹر اور معروف شاعر افتخار امام صدیقی نے ہم عصر نمبر دو جلدوں میں شائع کرنے کا اعلان کیا بڑی مدّت کے بعد ایک جلد شائع ہوئی۔ دوسری شائع نہ ہوسکی جن لوگوں نے ان سے مالی تعاون کیا ان لوگوں کو ایک نسخہ بھی ارسال نہ کیا۔ اگر کسی نے ان کو لکھا تو جواب میں انہوں نے فی نسخہ چار سو روپئے پیشگی اداکرنے کو کہا۔ " [ادب نامہ (کراچی) کے حوالے سے]

اس خبر کی تردید کیا کی جائے کہ "احساس نو" ہو یا کراچی کا "ادب نامہ"۔ اس طرح کے سارے ادبی نوعیت کے اخبارات چٹخارے دار خبروں، غیر مصدقہ سنسنی خیز واقعات، ڈرامائی تحریروں اور چونکا دینے والی سرخیوں ہی سے فروخت ہوتے ہیں۔ جس طرح اردو کے چھوٹے چھوٹے اخبارات اور شامنامے اپنی غیر سنجیدہ زرد صحافت سے زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ ادبی اخبارات سنجیدہ اور معیاری خبروں اور تحریروں سے بھی سجائے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ انگریزی اردو کے بڑے اخبارات ہوتے ہیں۔ "ادبی خبر نامہ" زبان وادب کی ترویج واشاعت میں معاون ہو سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا ادبی اخبارات، پاکستان کے روزناموں میں شائع ہونے والے ادبی ایڈیشن کا توسیعی روپ ہیں بر سبیل تذکرہ یہ واضح کر دیا جائے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے پاکستان سے کوئی مالی تعاون نہیں لیا گیا تھا یہ خبر محض ایک دلچسپ خبر سے زیادہ کچھ نہیں۔

پاکستان کے مشاعرے

اردو مشاعروں نے ہندی کوی سمیلوں اور فارسی مشاعروں ہی سے جنم لیا لیکن اردو عوامی مشاعروں کی اپنی ایک الگ شاندار تاریخ ہے اور آج یہ مشاعرہ اپنی تمام تر خامیوں اور برائیوں کے اپنی ایک تہذیبی اور ثقافتی حیثیت کے ساتھ پوری دنیا میں مقبول ہے۔ متحدہ ہندوستان کے ہر صوبے اور بڑے شہروں میں خاص وعام مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ پھر جب ریڈیو ایجاد ہوا اور اس کا چلن بڑھا تو ریڈیو پر مشاعرے ہونے لگے۔ کل کے ہندوستان اور آج کے پاکستان میں لائل پور، لاہور، کراچی وغیرہ میں بھی چھوٹے بڑے مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے تو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ مشاعروں کی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع پر نیست برائے نام ہی کام ہوا ہے۔ صرف ایک کتاب علی جواد زیدی کی "تاریخ مشاعرہ" کے عنوان سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی تھی لیکن یہ کوئی غیر معمولی کام نہیں ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ "شاعر (آگرہ) کا مشاعرہ نمبر شائع ہوا تھا لیکن یہ محض مصرعہ طروحہ پر ہندوپاک کے مشاہیر شعراء [شاعر کے مجوزہ مشاعرہ نمبر میں شاعر کے 'مشاعرہ نمبر کا تفصیلی جائزہ دیا جائے گا۔ ادارہ] کی غزلوں اور مشاعروں پر تین مضامین پر مشتمل خاص نمبر تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نئے ملک میں مشاعرے سمٹ کر کم رہ گئے۔ بڑے مشاعرے سال بھر میں ایک دو سے زیادہ نہیں رہ گئے البتہ ریڈیو کے مشاعرے یا پھر علاقائی مشاعرے ضرور ہوتے رہے۔ بڑے کل پاکستان یا ہندوپاک مشاعروں کا تسلسل ٹوٹ گیا حالانکہ لاہور اور کراچی کے مشاعروں کی بھی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔ مگر لاہور کے مقصدی مشاعروں اور کراچی کے معیاری عوامی مشاعروں کی آج جو صورت گری ہے وہ کل سے بہت مختلف ہے بالخصوص کراچی کے آج کے مشاعرے۔

ہندوپاک مشاعروں کا انعقاد درمیان میں رک گیا تھا لیکن اب ۱۹۸۰ء ۸۲ء سے بطور خاص ہندوپاک اور عالمی مشاعرے کراچی میں ہو رہے ہیں۔ دوسرے شہروں میں پوری طرح اس روایت کی بازیافت نہیں ہو سکی ہے بطور خاص لاہور میں۔ پاکستان کے صوبۂ پنجاب میں مشاعرے ہوتے ہیں لیکن عوامی مشاعرے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کراچی کے مشاعرے بہت عوامی ہوگئے ہیں۔ مشاعروں کے سیزن میں روزآنہ دن اور رات کے چھوٹے بڑے مشاعرے اور نشستیں ہوتی ہیں اور انڈوپاک یا عالمی مشاعرے کی مناسبت سے یہ ساری چہل پہل کراچی کی ثقافتی زندگی کو بے حد متحرک رکھتی ہے۔ کراچی اسٹیڈیم سے آرٹس کونسل اور نجی محفلوں میں ظہرانہ، عصرانہ اور عشائیہ کی خاص اہمیت ہے۔ جب سے ہندوستان کے پیشہ ور غیر شاعر اور شاعرات کی ان مشاعروں میں شرکت بڑھ گئی ہے کراچی کے مشاعرے ہڑبونگ اور زبردست ہوٹنگ کی نذر ہونے لگے ہیں حالانکہ منتظمین مشاعرہ ان مشاعروں پر خطیر رقمیں خرچ کرتے ہیں اور مدعو شعرا کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں کرتے لیکن ہندوستان کے بیشتر معمولی اور ناشاعر شعراء شاعرات اور کراچی کے NOSTELGIC سامعین کے درمیان "مکالمہ آوازیں "کچھ اور ہی ماحول بنادیتی ہیں۔ شاعری کم اور شاعری کے نام پر نعرے بازی اور مشتعل کر دینے والے مانوس و منظوم جملے فقرے زیادہ۔ اب واہ واہ سبحان اللہ کی جگہ 'تالیاں' آگئی ہیں۔ ہندوستان کے میلوں ٹھیلوں کے عوامی و تفریحی مشاعرے اب کراچی میں بھی منتقل ہوگئے ہیں۔ منتظمین مشاعرہ، شعراء اور سامعین کے درمیان اس مشترکہ سازش پر کسی اور موقع سے لکھا جائے گا۔ چونکہ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں کے ساتھ دوسرے صوبوں اور شہروں میں ہندوپاک مشاعرے منعقد نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا وہاں کے مشاعرے اب بھی کسی حد تک بجے سجائے، دھلے دھلائے اور میکانکی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے معیاری وادبی شعرا کو ان شہروں میں کم کم ہی مدعو کیا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں اور پروگراموں میں ہندوستانی اور باد شعرا کے داخلے بند ہیں۔ [سیاسی وجوہ سے] مشاعروں میں بیٹھ کر پڑھنے کا رواج ہے۔ ناظم مشاعرہ برائے نام رابطے کا کام کرتا ہے جب کہ ہندوستان میں عوامی مشاعرے ناظم مشاعرہ کے رحم وکرم پر رہتے ہیں۔ اسٹیج پر تشریف فرما شعرا عموماً داد نہیں دیتے، پڑھنے والا شاعر سامعین کی داد پر کسی ردّ عمل کا اظہار نہیں کرتا ہاں اشعر کو مکرر اور سہ کرر ضرور

پڑھ دیتا ہے۔ ترنم سے پڑھنا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ہندوستان کے مترنم شعرا کو پسند کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام ہی شعرا ایک ہی طرح کے زیر و بم کے ساتھ تحت میں شعر سناتے ہیں فیض احمد فیض کی طرح بیاض یا کاغذ کے بغیر کم ہی شعرا اپنا کلام سنا پاتے ہیں۔

کتابوں کی رسم اجراء

پاکستان میں نئی کتابوں کی رسم اجراء کا چلن بہت عام ہے۔ اس موقع پر خوبصورت ساسوونیر بروشر شائع کیا جاتا ہے اس کے لئے اشتہارات جمع کئے جاتے ہیں تاکہ کتاب پر آنے والی لاگت یا تو واپس مل جائے یا پھر وہ کم سے کم رہ جائے۔ کتابوں کی بہت زیادہ قیمت اس کے فروخت میں مانع ہوتی ہے۔ خوبصورت گٹ اپ والی کتابیں اجراء کے موقع پر اور خوبصورت ہو جاتی ہیں کہ اجرائی تعریفی تقاریر اور مقالے اس کی صوری و معنوی خوب سیرتی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ کتابوں کی فلیپ نگاری خاصی بدنام ہے۔ اس ضمن میں بعض قصے اور کئی لطیفے بہت مشہور ہیں۔ رسم اجراء کے بعد انواع و اقسام کے کھانوں پر مشتمل ڈنر، کتاب، صاحب کتاب اور منتظمین جشن اجراء کے مرتبہ و مقام کا تعین کرتا ہے۔ مختلف شہروں میں قائم بہت ساری انجمنوں اور اداروں میں سے چند ایک اجرائی رسموں کے انعقاد ہی کے لئے مختص ہیں۔ رسم اجراء کے پروگراموں میں سامعین کی تعداد بھی خاصی ہوتی ہے اور کسی بڑی تقریب کا سا گمان ہوتا ہے۔ اس موقع پر کتاب اور صاحب کتاب کے ساتھ ادبی سیاستیں بطور خاص موضوع بنتی ہیں۔ پاکستان کی ثقافتی سرگرمیوں میں نئی کتابوں کی رسم اجراء کا ایک خاص اور اہم کردار ہے۔

پاکستان کی مشہور ادبی شخصیات

پاکستان میں ادبی شخصیات اسی طرح مشہور ہیں جس طرح وہاں کے سیاست داں، فلم اور ٹی وی آرٹسٹ یا پاکستانی کرکٹرز۔ یہاں کچھ ایسی ادبی شخصیات کے نام تحریر کئے جا رہے ہیں جو ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بھی مشہور ہیں یا ہندوستانی مشاعروں اور یہاں کے غزل کاروں کے ذریعے مشہور ہوئے [مرحومین کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے] وہ چند نام یہ ہے: احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، انتظار حسین، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، افتخار عارف، احمد فراز، حمایت علی شاعر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض قتیل شفائی: ظفر اقبال، مظفر وارثی، منیر نیازی، انور سجاد، منشایاد، آصف فرخی، احمد ہمیش، شہزاد احمد، ادا جعفری، زاہدہ حنا، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، محمد علی صدیقی، فرمان فتح پوری، سحر انصاری، انور سدید، خالدہ حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، سلیم اختر، جون ایلیا، محسن احسان، صہبا لکھنوی، ریاض صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، رفیع الدین ہاشمی، تابش دہلوی، محسن بھوپالی، وغیرہ ہم بغیر ذہنی کاوش کے یہ نام کسی فہرست سازی کے بغیر لکھ دیئے گئے ہیں۔ نام اور بھی ہیں۔ ایسے نام بھی ہیں جن کے کار و افکار کی گونج دونوں طرف ہے۔ حالیہ برسوں میں پاکستان کی نئی نسل سے بھی کچھ نام پاکستان سے باہر آئے ہیں لیکن سیاسی وجوہ سے ہند و پاک کے درمیان ادبی رابطے کمزور ہوئے ہیں۔ شخصی سطح پر یا پھر اپنے اپنے طور پر رابطوں سے ہٹ کر دونوں ملکوں کے درمیان ادبی و ثقافتی سرگرمیاں نہیں کے برابر ہیں۔

پاکستانی ادب اور مذہب

خداداد مملکت پاکستان چونکہ ایک اسلامی ملک کے بطور دنیا کے نقشے پر ابھرا ہے لہٰذا سرکاری سطح پر اسلام کی اشاعت حکومت پاکستان کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے چنانچہ حکومت پاکستان اس ضمن میں اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اور ایک مجموعی اسلامی فضا کے تحت عوام و خواص اپنے روزمرہ کو بسر کرتے ہیں۔ پاکستانی اردو قلم کاروں نے اپنی تخلیقات میں اس مجموعی اسلامی فضا کو سمونے کی سعی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ شعری مجموعوں کے ابتدائی صفحات حمد و نعت کے لئے وقف ہیں۔ تقریباً ادبی رسائل میں حمد و نعت کو بطور خاص جگہ دی جا رہی ہے۔ بقیہ مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں۔ کراچی سے "نعت رنگ" جیسا وقیع رسالہ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا حالیہ 'حمد نمبر' خاصے کی چیز ہے۔ 'اسلامی ادب' ایک وسیع تر موضوع ہے۔ کچھ اور بھی رسالے 'نعت رنگ' کی طرز پر جاری ہوئے ہیں جو ادبی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ جدید نعت گوئی میں نئی نسل کے شعرا کی دلچسپی بڑھ رہی ہے اور صنف نعت غزل کے آس پاس غزل کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ جدید مرثیہ اور جدید نعت گوئی میں روایت کی روح تو ہے لیکن اسے جدید حسیت سے بھی مملو کیا جا رہا ہے۔ صنف نعت کا اپنا کوئی مخصوص فارم نہیں ہے لہٰذا ہیت کے بھی تجربے ہو رہے ہیں اسلامی نظریے کے تحت جو کچھ بھی تخلیق ہو رہا ہے وہ کتنا داخلی ہے اور کتنا خارجی، اس کا تجزیہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اسلامی فکر کے حامل قلم کاروں کے ساتھ ساتھ وہ قلم کار بھی ہیں جو خود کو "روشن خیال" کہتے ہیں اور اپنی روشن خیالی کا اظہار نثر و نظم کے ذریعے کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں ایسے روشن خیال قلم کاروں کی کمی نہیں ہے۔ اسلامی ادب، مذہبی ادب یا کچھ اور اصل بات تو یہ ہے کہ اس نوع کا ادب، کتنا ادب ہے اور کتنا نہیں۔ اس بحث سے قطع نظر حمد و نعت اور مرثیہ نگاری کی اپنی ایک روایت ہے اور اعلیٰ ادب تخلیق ہوا ہے۔ پاکستان کے بعض قلم کار واقعی اعلیٰ اسلامی ادب تخلیق کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ شعری مجموعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ شعرا غزل و نظم سے تائب ہو کر صرف اور صرف حمد و نعت ہی تخلیق کر رہے ہیں۔

۱۹۹۰ء کے بعد کی پاکستانی اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ 'اسلامی ادب' کی تخلیقی رفتار اور تناسب، مجموعی شعر و ادب کے تناظر میں کتنا ہے؟

خواتین کا ادب

بیسویں صدی کی آخری چند دہائیوں میں پاکستان سے خواتین قلم کاروں کی خاصی بڑی تعداد افق ادب پر نمودار ہوئی اور پھر اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاریخ ادب اردو کا یہ ایک اہم ترین ادبی واقعہ ہے جو حیرت انگیز بھی ہے۔ حالانکہ اردو نظم و نثر میں خواتین کی شمولیت ہمیشہ ہی رہی ہے لیکن بہت خاموشی کے ساتھ۔ کہیں کہیں سے کوئی نام ضرور چمکا ہے ورنہ قلم کار خواتین ہمیشہ ہی سے بے توجہی کا شکار رہی ہیں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے لیکن پاکستان کے وجود کے بعد اور بالخصوص ۱۹۷۰ء کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سارے نام نظم و نثر کے حوالے سے ابھر کر آئے۔ ہندوستان کی آزادی اور پھر تقسیم سے قبل بطور افسانہ نگار چند خواتین میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، حجاب امتیاز علی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی وغیرہ کا تخلیقی سفر آزادی اور تقسیم کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ

جاری رہا بلکہ ان میں سے ہر ایک نام نے اپنے قلم کی پہچان بنائی اور اعتبار حاصل کیا مگر شاعری میں ادا جعفری نے بطور شاعرہ اپنے آپ کو منوایا۔ ان کا تخلیقی سفر آج بھی جاری ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر بھرپور تحقیقی و تنقیدی کام ہونا چاہئے۔ شاعر کا ایک حالیہ شمارہ "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" شائع ہوا تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی اور عادتاً ذہنی کے تحت یہ کہا گیا کہ کیا واقعی اتنی خواتین اردو ادب میں موجود ہیں۔ حالانکہ مذکورہ شمارہ محض اپنے موضوع پر ایک ہلکا سا اشاریہ تھا جب کہ یہ موضوع تو بہت وسیع ہے۔ اکادمی ادبیات اردو نے ۱۹۹۴ء میں انگریزی میں ایک کتاب پاکستانی لٹریچر کے تحت: SPECIAL ISSUE WOMEN'S WRITING کے موضوع پر ۳۲۷ صفحات کی ایک کتاب شائع کی تھی جسے مہمان مدیران یاسمین حمید اور آصف فرخی نے مرتب کیا تھا اس میں اردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں کی ۲۶ افسانہ نگار اور ۳۸ شاعرات کی تخلیقات کو ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ کتاب کے آخر میں ' GLOSSARY SOURCES اور CONTRIBUTORS دیا گیا ہے جس میں قلم کاروں کا تعارف ہے۔ اپنے موضوع پر یہ اہم ماخذ تو ہے لیکن مزید وسعت بھی چاہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اکادمی نے اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب شائع کی ہے کہ نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی خواتین کے ادب نے ہندوستان اور اردو کی نئی بستیوں کی تازہ کار خواتین قلم کاروں کی زبردست حوصلہ افزائی کی ہے اور انہیں آزادیٔ فکر کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ خواتین کی شمولیت سے ادب میں بڑی چہل پہل ہے۔ تانیثی ادب اور تانیثی تنقید کی بات ہو رہی ہے، لکھا جا رہا ہے۔ شاعرات اور افسانہ نگار خواتین کی کتابیں آ رہی ہیں۔ کئی ایک خواتین کی زیر ادارت ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ابلاغ (سیدہ حنا) تجدید نو (عذرا اصغر) روشن خیال (زاہدہ حنا) آثار (ثمینہ راجہ) جریدہ (زیتون بانو) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ادبی مجالس اور مشاعروں کی نظامت بھی خواتین کر رہی ہیں۔ شاہدہ حسن (کراچی) ایک مثال ہے۔ خواتین ادبی کالم لکھ رہی ہیں پاکستان کے چھوٹے بڑے روزناموں میں یہ کالم شائع ہو رہے ہیں۔ علم و ادب کے تمام شعبوں میں خواتین مصروف کار ہیں۔ دو نمبر کی تخلیقات بھی آ رہی ہیں اور ایسی تخلیقات کے ساتھ جن خواتین کے نام آ رہے ہیں ان کے بارے میں بھی سرگوشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے پس پشت ظاہر ہے کہ مرد حضرات ہی ہوتے ہیں اور پاکستان میں یہ کام بہت ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں عوامی مشاعروں کی حد تک تو ناشاعرات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جن لوگوں سے یہ ناشاعرات کلام لاتی ہیں ان سے ہر ایک کی واقفیت نہیں ہوتی۔ اب پاکستان میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔ کچھ مدیران رسائل بھی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں ان میں سے بعض تو صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں اور بعض شوق دلانے کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ فنون، اوراق اور تخلیق جیسے ادبی رسائل نے بہر حال خواتین قلم کاروں کی سرپرستی و رہنمائی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ "احمد ندیم قاسمی فنون اور پروین شاکر" ایک روشن مثال ہے۔

پاکستانی خواتین کے شعر و ادب کو صحیح معنوں میں اگر کہیں سے گفتگو آغاز کہا جائے تو وہ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض ہیں جب کہ نثر نگاروں میں عصمت چغتائی رشیدہ جہاں اور ممتاز شیریں سے خواتین کے ادب پر گفتگو کا آغاز ہو گیا تھا مگر ان تمام خواتین کا کوئی رشتہ، کوئی تعلق عالمی فیمنسٹ بر لیشن مومنٹ سے نہیں تھا۔ جو بھی تبدیلیاں آئیں وہ مرد سماج کے جبر، ظلم اور استحصال کا محض ردعمل تھیں۔ اور جو بھی احتجاجی لے تھی اس میں شدت کسی آگ یا شعلے کی طرح نہیں تھی لیکن بعد کی خواتین نے اپنے احتجاج کی لے تیز کی۔ کھرے اور بے باک لہجے میں مرد سماج کے بخیے ادھوڑے گئے ہیں۔ شاعری میں بھی اور افسانے میں بھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مرد سے براہ راست مکالمے میں ان خواتین نے خود کو عورت کے بجائے مرد ہی کی طرح پیش کرنے کو احتجاج اور بغاوت سمجھا جب کہ اس نئے DISCOURSE کا تقاضہ اور تھا۔ خواتین مدیران رسائل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عورت، عورت نہ ہوتے ہوئے مرد ہی کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اب تک خواتین کے ادب پر خود خواتین نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ شعر و نثر کی انتخاب نہیں آئے۔ ان کے رسائل کے خاص نمبر شائع نہیں ہوئے۔ ان کے اپنے مشاعرے، سیمینارز نہیں ہوئے یہاں تک کہ وہاں کے غزل سنگروں میں مرد اور عورت دونوں ہی نے خواتین کی شاعری کو بطور خاص نہیں گایا۔ نہ ہی آڈیو، ویڈیو اور CD کیسٹ آئے۔ صرف پروین شاکر، زہرہ نگاہ یا پھر ایک آدھ کوئی اور شاعرہ۔ اور بس چند غزلیں۔

پاکستانی قلم کار خواتین کا ادب شعر و افسانہ تک محدود نہیں رہا۔ سفر نامہ، سوانح، انشائیہ، یادداشتیں، تراجم، دینی شاعری، تنقید، تاریخ، ناول اور دیگر جملہ اصناف میں وہ اپنا تخلیقی اظہار کر رہی ہیں۔ بلکہ انگریزی میں بھی خواتین اہل قلم شاعری کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر شاہینہ آصف کی نظموں کا مجموعہ THE ORDINARY WOMEN شائع ہوا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ صالحہ خاتون نے کیا ہے۔ وزیر آغا اور جیلانی کامران کے انگریزی میں دیباچے دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے شعر و ادب پر اردو زبان و ادب کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور وہاں بھی لکھنے والی خواتین کا اضافہ ہو رہا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ۲۰ویں صدی کی آخری چند دہائیوں کو محیط ہے اور متقاضی ہے کہ اس پر بھرپور تحقیقی و تنقیدی کام کیا جائے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جو بہر حال نظر انداز ہو رہا ہے یہاں تک کہ تاریخ ادب اردو کے جدید تاریخ نگاروں نے بھی اس باب کو نظر انداز کیا ہے۔

حرف آغازیہ

مندرجہ بالا تمام ذیلی عنوانات اپنے آپ میں ایک مستقل باب یا کتاب کے حامل ہیں۔ اشاریوں اور بین السطور میں کچھ کہنے اور بتانے کی سعی کی گئی ہے۔ بلکہ اسے ابتدائیہ کہا جائے تو مناسب رہے گا کہ ہم نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے موضوع کے روپ سروپ کے آس پاس اپنے قارئین کو لے جانا چاہا ہے۔ ہمارے لئے پاکستان کے تمام اردو والے جو ادب سے کسی نہ کسی سطح پر وابستہ ہیں، قابل احترام ہیں۔ کہیں کسی کی دل آزاری، تقدیم و تاخیر مذاتیات، علاقائی ادبی سیاستیں یا کوئی ایسی بات واقعہ جو کسی کے لئے اعتراض کا باعث ہو، یہ سب کچھ اس ادبی فیچر کا مقصد نہیں۔ قارئین شاعر سے التماس ہے کہ اس ادبی فیچر کو شاعر کے صاف ستھرے مزاج ہی کے تناظر میں دیکھیں اور پڑھیں اور اپنی گرانقدر رائے سے نوازیں۔ ◻◻



Vilasrao Deshmukh
Chief Minister

From strength to strength in 100 days!

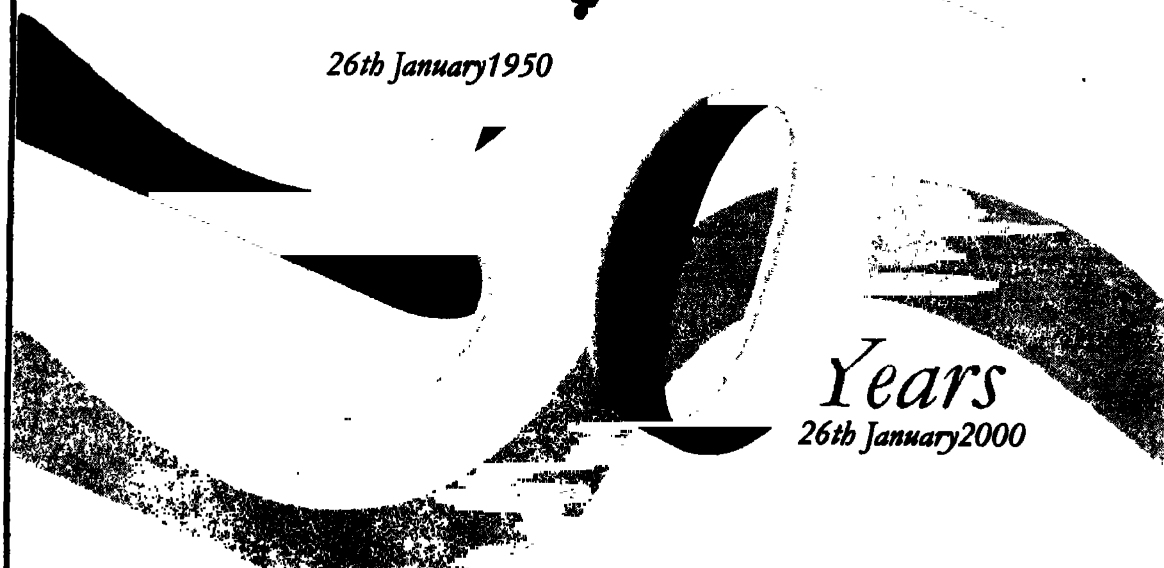
DEMOCRATIC FRONT GOVERNMENT

Your OWN government!



Chhagan Bhujbal
Dy. Chief Minister





BEST WISHES ON REPUBLIC DAY!

Happy Families ● Happy States ● Happy Nation

Directorate General of Information and Public Relations
Government of Maharashtra

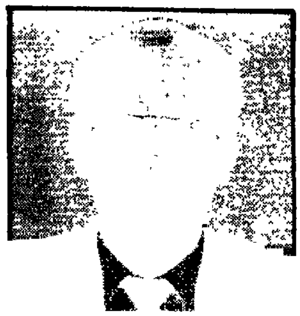


شبنم رومانی

دیوالی

شیام کی بنسی کی دھن، رام کے چرنوں کی دھول
چار طرف روشنی، چار طرف سرخ پھول
جیسے کراں تا کراں درد جگادے کوئی
جیسے بھرے شہر میں آگ لگادے کوئی
لال پری رات کو جیسے اُڑاتی ہے تخت
روشنیوں کے مکاں، روشنیوں کے درخت
کوئی مدھو راگنی، کوئی جواں مالتی
آتشِ رخ پر کوئی آبِ رواں ڈالتی
یہ ترے سینے کی ہوک، یہ مرے سینے کا داغ
تو بھی مجسم چراغ، میں بھی مجسم چراغ

●207, Ghadiyali Bldg , Sadar
Karachi (Pak)



غلام حیسن ساجد

کئی دن سے دشتِ فراق کے وہ سراب میرے نہیں رہے
مجھے جن گلابوں پہ ناز تھا، وہ گلاب میرے نہیں رہے

مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا ہے تجاوزِ غمِ عشق نے
مری نیند میری نہیں رہی، مرے خواب میرے نہیں رہے

کبھی اپنے آپ بکھر گئی مری چشمِ گریہ کی روشنی
کبھی نخلِ صبر سے ٹوٹ کر گل آب میرے نہیں رہے

مری جان! مجھ پہ نہیں کھلا جو کیا ہے آپ نے فیصلہ
میں نہیں رہا ہوں حضور کا کہ جناب میرے نہیں رہے

وہی میں ہوں اور ہے وہی نگر، کبھی کچھ ابھی ہے وہی مگر
وہ سوال میرے نہیں رہے، وہ جواب میرے نہیں رہے

●541-Jinah Street,
Jalal Colony, Siddiquea
Road,New Gil Gisht, Multan- (pak)



نذیر قیصر

کچھ سامان ہمارا اس کے پاس رہا
آنسو اور ستارا اس کے پاس رہا

ہم سبزے سے ایک گلاب اٹھا لائے
باقی موسم سارا اس کے پاس رہا

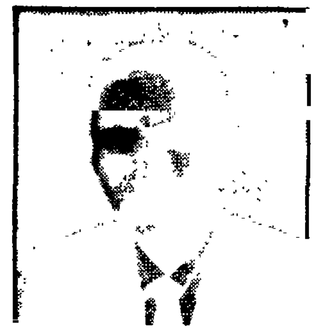
آج بھی ساری رات ہم اس سے دور رہے
آج بھی خواب ہمارا اس کے پاس رہا

تاریکی میں لہر ہمارے ساتھ آئی
سورج اور کنارا اُس کے پاس رہا

ہم اپنا دل اُس سے واپس لے آئے
لیکن وہ دوبارہ اس کے پاس رہا

کیسا سفر تھا رات ہمارے ساتھ رہی
صبح کا پہلا تارا اس کے پاس رہا

●11/7, Modern Colony,
Peco Road, Lahore (Pak)



احمد صغیر صدیقی

یں ٹھیرے تھے کبھی ہم نہ سفر میں ہم تھے
ے آسیب تھے اور اپنے ہی سحر میں ہم تھے

اندھیرا تھا کہیں بھی نہ اجالا کوئی
کسی واہمۂ شام و سحر میں ہم تھے

گماں پر کہ پڑھا جائے گا ہم پر کوئی اسم
نے کب سے کسی جادو کے اثر میں ہم تھے

ح کو نور سے نسبت تھی بدن خاکی تھا
ق سورج سے تھا اور موم کے گھر میں ہم تھے

اُدھر اور ہی اک دھن میں زمانہ سارا
ادھر رنگِ دگر، فکرِ دگر میں ہم تھے

●102-A, Marjina, Coplex, Gulsha
-e- Iqbal 13- B, Karachi (Pak)



نکہت بریلوی

ہم سینہ نگارانِ طلب پر جو گھڑی ہے
شعلوں سے زیادہ ہے قیامت سے کڑی ہے

ہم آج کی شوریدگیٔ طرفہ میں گم ہیں
اے دل تجھے اندیشۂ فردا کی پڑی ہے

گرنے کو ہیں افلاک کی آنکھوں سے ستارے
اب سلسلۂ شب یہی دو چار گھڑی ہے

ہم اہلِ جنوں کے لئے سرکار سے تیری
مل جائے تو آزار کی راحت بھی بڑی ہے

اس مقتلِ احساس میں اس عہدِ ستم میں
نکہت جو گذر جائے غنیمت وہ گھڑی ہے

●A-826, Block -H,
North Nazimabad, Karachi (pak)



اقبال حیدر

ققنس راگ......اور آگ

ملگجے ملگجے بادلوں کے تلے
کوہساروں کی سب چوٹیاں
بند آنکھوں کی رنگت میں ڈھلنے لگی ہیں
پپڑیاں خشک ہونٹوں پہ جمنے لگی ہیں
یہاں نرم تلوے
چمکتی سڑک کا سیہ پیرہن.....
......دھجیاں کر رہے ہیں
بگولے وہاں چوکڑی بھر رہے ہیں
جہاں اک پرندہ
کہ جس کی ہر اک آتشیں سانس
ملہار رُت کا خشک خواب ہے
آخری گیت گانے کو بیتاب ہے

●R-736, Sector- 15- A/3, North
Karachi, Karachi (Pak)



مرزا حامد بیگ

Mughal Sarai, Bijli Ghar Road, Attok (pak)

جنم جوگ

مجھے اُدھر جانا تھا لیکن بروقت جا نہیں سکا۔

گدلے پانی کی نہر کے رُخ پر، اس اجاڑ حویلی تک، جو میرے بچپن اور لڑکپن کی سرحد پر آباد تھی اور جسے میری جوانی سے بڑھاپے تک کے سفر نے اجاڑ کر رکھ دیا۔

وہ میرا لڑکپن تھا اور ہمارے گھر کے قریب بہنے والی گدلے پانی کی نہر کے دونوں اطراف میں دور تک پھیلے ہوئے شاداب علاقے گرمیوں کی طویل دوپہروں کی پناہ گاہ تھے۔ آموں کے گھنے باغات میری گزرگاہیں تھیں اور باغوں کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں گھومنے والی غلیلیں اور ہریل طوطوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

بس وہی دن تھے، جب میں نے پہلی بار بیک وقت نہر کے گدلے پانی میں تیر کر آتی ہوئی کٹی پھٹی انسانی لاشیں دیکھیں اور شام کو آبادی میں چھڑکاؤ گاڑی کے گزر جانے کے بعد ایک ایک کرکے روشن ہوتے ہوئے لیمپ پوسٹ اور سینما والوں کی بگھی کا پھیرا۔ اس کے بعد یہ سب معمول کا حصہ بن گیا۔

سارا دن اسی آوارگی میں گزر جاتا۔ رات گئے گھر کو پلٹتا تو سب گھر والے سوئے ہوئے ملتے اور نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوبا بار دلی کھانا گرم کر دیتا بس یہی میرا گھر سے رشتہ تھا۔ میں بھی کھانا کھا کر سو رہتا اور میرے گرداگرد، سوتے جاگتے، گدلے پانی میں کٹی پھٹی انسانی لاشیں تیرتی رہتیں۔

ایک روز رات کو، والد صاحب قبلہ نے تھانیدار کی وردی اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے فرمایا: "یہ ملعون تھے ہی اس قابل۔ ان کا کون ہے رونے والا؟ لیکن میٹرو پولس نے اپنی حدود سے انہیں اس طرف ہانک کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ یہ آموں کے باغات نہ ہوتے اور اتنی بہت سی سوکھی ٹہنیاں نہر تک نہ جھک آتیں تو آگے جا کر سڑتے، کتے کے پلّے۔"

اگلے روز عصر کے وقت میونسپل کمیٹی کی چھڑکاؤ گاڑی گزر گئی تو ان سڑتی ہوئی لاشوں کو نہر کے گدلے پانی میں سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔

گھڑیال والے چوک میں لیمپ پوسٹ روشن ہو گئے تو حسب معمول سینما والوں کی بگھی گزری۔ بگھی کے پیچھے کے ساتھ فلم کے قد آدم اشتہار جھول رہے تھے اور ہچکولے کھاتی نشست پر گرامافون دھرا تھا۔ سینما والوں کا مستعد کارندہ بگھی رکوا کر پہلے ساؤنڈ بکس کی سوئی بدلتا اور پھر سج سج گرامافون ریکارڈ تبدیل کرتا جاتا۔ کچھ دیر چوک میں رک کر اور گھماؤ غلیل کی طرح ٹھہری ہوئی زندگی کو نئی کروٹ دے کر بگھی آگے بڑھ گئی اور میں سڑتی ہوئی لاشوں کے ساتھ گدلے پانی میں تنہا رہ گیا۔

بس وہی دن تھے، جب کٹی پھٹی لاشوں کے ساتھ سوکھی ہوئی شاخوں کا سہارا لیے ہوئے، گراموفون کے حصول کی چینک دل میں جاگی۔ معاف کیجئے، میں شاید پھر بہک گیا۔ یاوہ گوئی کے ضمن میں ہمیشہ سے ملعون چلا آیا ہوں، لیکن بخدا، حاشیہ آرائی مقصود نہیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ آموں کے باغات میں گدلے پانی کی نہر کے رخ پر ایک ویران حویلی بھی تھی اور جب میں نے عصر کی اذانوں کے ساتھ پہلی بار اس حویلی میں قدم رکھا تھا تو حویلی کے وسیع و عریض صحن میں ایک باوقار خاتون مٹی کے کوزے بھر بھر کر چھڑکاؤ کرنے میں مصروف تھی۔

میں حد بندی کی اوٹ میں چپ چاپ، دم سادھے اسے اس کام میں مشغول دیکھتا رہا۔ چھڑکاؤ کے بعد اس نے صحن میں ایک ایک کر کے دو آرام کرسیاں لا کر رکھیں، بالکل آمنے سامنے۔ پھر وہ دونوں کرسیوں کو تا دیر کھڑی تکتی رہی۔ اس کے بعد وہ ایک تپائی اٹھا لائی اور تپائی پر اس نے گرامافون لا کر سجا دیا۔

گرامافون کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر، وہ ایک بار پھر اندر گئی اور پیتل کی اونچی سماوار اور دو پیالیاں اٹھا لائی۔ سماوار میں بھری گرم سبز چائے کی خوشبو لپٹیں لے رہی تھی۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے برابر کی تپائی پر رکھے گرامافون کو کھولا، اس میں چابی بھری، ساؤنڈ بکس کو پھونک مار کر صاف کیا، اس کی سوئی بدلی اور دیر تک باریک تیلیوں کی پٹاری میں رکھے ریکارڈ الٹتی پلٹتی رہی۔

شام کی اذانوں تک وہ جیسے کسی کی منتظر رہی اور میں اسے چھپ کر دیکھتا رہا۔ شام کے سرمئی اندھیرے کے پوری طرح چھا جانے تک وہ تنہا بیٹھی رہی تھی اور اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ اس نے صحن میں رکھی جملہ اشیاء کو ایک ایک کر کے اندر پہنچایا تھا۔

وہ کس کی آمد کی منتظر تھی؟ وہ کون تھا جس نے آنا تھا پر نہیں آیا۔ بس یہی کچھ جاننے کی خاطر میں نے اپنی کئی شامیں اس حویلی کی حد بندی میں دم سادھے، چھپ کر گزار دیں۔ لیکن آنے والے کو نہیں آنا تھا نہ آیا۔ پر وہ تھا کون، جس کا اسے انتظار تھا۔

میں نے کسی سے پوچھا نہیں۔ پوچھتا بھی تو کس سے۔ کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی جو میرے بے معنی سوال پر توجہ دیتا۔ گھر میں کھونٹی پر ٹنگی تھانیدار کی وردی تھی اور باہر آموں کے گپ چپ باغات۔ ہریل طوطوں کے جھنڈ، اور گھماؤ غلیل کی سنسناہٹ، اور یا پھر نہر کے گدلے پانی میں تیرتی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں، چھڑکاؤ گاڑی کے مصروف کارندے اور سینما والوں کی بگھی کا پھیرا۔

بس یوں ہی گزر گئی۔

پھر ہم لوگ شہر چلے آئے اور کئی برس تک ادھر جانا ہی نہیں ہوا، لیکن گراموفون کے حصول کی خواہش دل میں ویسی کی ویسی رہی۔ کئی برس گزر گئے۔

میں کالج میں پڑھ رہا تھا جب ایک بار گھر والوں کے ساتھ، شاید کسی عزیز کی فوتیدگی پر ادھر جانا ہوا۔ پرسا دینے اور دعائے مغفرت کے بعد میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

عصر کا وقت رہا ہوگا جب میں یونہی گھومتا گھامتا اس حویلی کی طرف نکل گیا۔ حد بندی گزار کر میں نے دیکھا کہ حویلی کا وسیع وعریض صحن بالکل خالی تھا۔ نیم تاریک برآمدے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھی اور آہستگی کے ساتھ جھک کر چلتے ہوئے، اس وقت وہ زمین پر بکھرے ہوئے برتن سمیٹ رہی تھی۔

میں اس روز بلا جھجک اور بلا اجازت برآمدے تک چلا آیا تھا۔ پکی اینٹوں کے فرش پر اٹھتے ہوئے میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ داہنی ہتھیلی کو آنکھوں پر لاتے ہوئے اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور حیرت کے ساتھ کچھ دیر مجھے تکتی رہی۔

"میں حامد ہوں"۔

"حامد!" اس نے نہ پہچانتے ہوئے میرا نام دوہرا لیا۔

"تھانیدار کا بیٹا حامد۔۔۔۔ میں شہر سے آیا ہوں۔ اب ہم وہیں رہتے ہیں۔"

"بسم اللہ۔ آؤ۔ آجاؤ حامد۔ ادھر آؤ۔ میں نے ٹھیک طرح کبھی تمہیں دیکھا ہی نہیں۔"

میں آگے بڑھا تو اس نے جھک کر لالٹین اٹھائی اور میرے چہرے تک لاتے ہوئے دیر تک اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے تکتی رہی۔

پھر اس نے مجھے ماتھے پر بوسہ دیا اور بولی:

"ماشاء اللہ، جوان ہوگئے۔ تمہارا ابا بو کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہیں جی، بس کچھ بوڑھے ہوگئے۔ گزشتہ سال تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے پر اب گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے انہیں، چلنا پھرنا بہت کم ہو گیا۔"

"ہاں۔ تم بھی تو جوان ہوگئے۔"

"بس جی، آپ کے سامنے ہوں۔"

"خدا تمہیں لمبی عمر دے۔ باپ کا سایہ قائم رکھے۔ مجھے اب دکھائی نہیں دیتا۔ آپریشن کروایا تھا۔ پہلے ایک آنکھ کا، پھر دوسری کا لیکن نظر ٹھہرتی نہیں۔ ڈھور ڈنگر سنبھالے نہیں جاتے تھے۔ اس لئے بیچ دیئے۔ اب گوالے تک جانا پڑتا ہے دودھ کی خاطر۔ ابھی ابھی لوٹی ہوں ادھر سے۔ تمہارا ابا بو چاچا تو ادھر ہوتا ہے نا۔ نیک بخت ہے۔ وہ لوگ اسے آنے ہی نہیں دیتے ادھر۔ اب تو سنا ہے بیمار رہتا ہے۔ ایک خط آیا تھا۔ اس سال ساون بھادوں میں چھٹی ملے گی تو آئے گا۔"

اس روز مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ انتظار کی عمر اتنی طویل بھی ہو سکتی ہے۔

"بیٹھ جا نا ادھر موڑھے پر۔ سنا کیسے آیا تھا۔ خیر تو ہے نا؟"

"وہ۔۔ ہاں جی ہم سب ادھر آئے تھے، موہن پورہ میں، دعا کے لئے، شام کو واپس جانا ہے ہم نے۔ میں نے سوچا ادھر سے بھی ہو تا جاؤں۔"

"ہاں بیٹا، اچھا کیا۔ خون کی کشش ہوتی ہے، کھینچتا ہے اپنی طرف۔"

"وہ ماں جی ا۔۔۔"

مجھ سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا۔

"وہ ایک گراموفون تھا آپ کے گھر میں۔"

"ہاں۔ رکھا ہے۔ تمہارے بابو چاچا ہی لائے تھے۔ اندر پڑا ہے۔ مجھ سے تو سنبھالا نہیں جاتا۔"

"ماں جی۔ اب تو بابو چاچا بھول بھال گئے ہوں گے اسے۔۔۔"

"ہاں بھول گیا۔ تجھے چاہیے؟ تو لے جا۔"

"ہاں ماں جی، مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"تو لے لے نا۔"

میں بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ اندر رکھا ہے۔ نیچے پٹاری میں ریکارڈ بھی ہوں گے۔ لیکن اتنے پرانے ریکارڈ اب تجھے کیا بھائیں گے۔ نئے لے لینا شہر سے۔"

یہ سن کر میں وہاں مزید کتنی دیر رکا، کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نیم تاریک سیلن زدہ کمرے سے اسے اٹھا لایا، پرانے ریکارڈوں کی پٹاری سمیت۔ پھر شہر کیا آیا، بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کالج، کالج سے یونیورسٹی۔ پہلے حصول تعلیم کے سلسلے میں جکڑا رہا، پھر طویل بے روزگاری کاٹی۔ ملازمت ملی تو شادی اور گھرداری کے انجھیڑوں میں پڑ گیا۔ گراموفون پر گرد جمتی چلی گئی۔

ایسا نہیں کہ ادھر جانے کا خیال نہیں آیا۔ بس یکے بعد دیگرے الجھتا چلا گیا۔ یہ زندگی کا پھیلاؤ مار گیا۔ بہت انجھیڑے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام، بظاہر بہت معمولی، غیر اہم، لیکن انہیں کئے بغیر چھٹکارا بھی نہیں۔ بہت سے کام نمٹا چکا، تب بھی ٹیلی فون کے بل کا جھگڑا ابھی باقی ہے۔ سوئی گیس کے بل کی درستگی اور پراپرٹی ٹیکس کا مسئلہ۔ پے بل کو کمپیوٹرائز کروانے کیلئے اکاؤنٹس آفس کا چکر ابھی رہتا ہے اور اسی میں تاخیر ہو گئی۔

ادھر سے وقفے وقفے کے ساتھ اپنے کاموں کے سلسلے میں شہر آئے ہوئے افراد سے ملاقات ہوتی تو جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں۔ کئی بار سوچا کہ بڑے بیٹے کو سختی سے کہوں کہ ادھر سے چکر لگا آئے۔ یہ معلوم کر آئے کہ اب حویلی کے شب و روز کیسے ہیں۔ لیکن اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ جانے کہاں رہتا ہے۔ ہمیشہ کہتا رہا کہ ابو کالج میں بہت مصروفیت ہے، ایک دن کے لئے بھی غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ اس نے کبھی ادھر جانے سے انکار نہیں کیا، لیکن گیا بھی نہیں۔

شہر کے اپنے معاملات ہیں۔ ادھر جاتا تو تاخیر سے آنے پر معذرت کر لیتا۔ یہی کچھ سوچتا آیا ہوں۔

لیکن آج معاملہ ہی کچھ ایسا آن پڑا کہ خجالت کے احساس نے کہیں کا نہیں رہنے دیا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اطلاع ملتے ہی نکل کھڑا ہوا ہوں۔

وہ ایک اطلاع، جس کا مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہا۔

آج صبح، حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں نمٹا رہا تھا کہ خصوصی طور پر محض مجھی کو مطلع کرنے گاؤں سے ایک بھلا مانس چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ حویلی بیک وقت اجڑی اور پھر سے آباد بھی ہو گئی۔

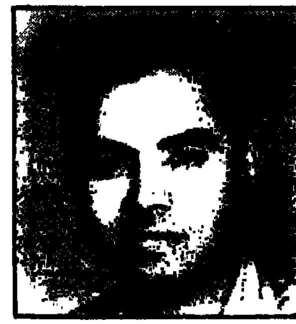
"اپنے بیٹے کے قاتل کا علم ہونے کے باوجود تم جیسا آدمی خاموش ہے۔"
وہ دھیمے انداز میں مسکرایا اور میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔
"اپنے گھر میں کھانے پینے کی چیزیں اکٹھی کر لو۔"
"بھلا کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"بس تمہیں بتائے دیتا ہوں۔"
"ایسے حالات کا امکان تو نظر نہیں آتا۔"
اب اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آج وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔
"تم میری بات کا جواب گول کر گئے۔"
"میرے دل سے اپنے بیٹے کا غم دور نہیں ہوا ہے۔"
"تو پھر تو چپ کیوں ہو۔"
لمحہ بھر کے لئے وہ خاموش رہا، اس کی خاموشی میں معنی خیزی تھی گویا اس کے وجود کے سمندر میں طوفان برپا ہو مگر اوپر سے سطح پرسکون تھی۔ طنزیہ لہجے میں آہستگی سے بولا۔

"ہاں میں نے اب مجبوراً اپنے آپ کو اپنی طبیعت کے خلاف کام کرنے پر تیار کر لیا ہے۔"
میں حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا، لمحہ لمحہ میرے دل میں اندیشے بڑھ رہے تھے، وہ پرعزم انداز میں کہنے لگا،
"آنے والے ہنگاموں میں سب سے پہلے اپنے بیٹے کے قاتل کو ختم کروں گا۔"
"کہیں پکڑے نہ جاؤ۔" میں گھبرا گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں انجان راہوں میں گم ہو گئیں۔
"نہیں!" اس نے اعتماد اور اطمینان سے جواب دیا۔ "اس شہر کے ایسے ہنگاموں میں نہ کبھی کوئی عدالت ہوتی ہے نہ قانون، نہ تھانہ نہ پولیس اور نہ کسی پکڑ دھکڑ کا خطرہ۔" یہ کہہ کر وہ اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر چلا گیا، میں مزید کسی سوال کی دہلیز پر پہنچا تو قصہ گو میرے ساتھ نہ تھا، میرے اعضاء ہوا میں اڑنے لگے۔ میں نے باہر نکل کر اپنے علاقے پر حسرت اور بے بسی سے نگاہ ڈالی اور اپنی تلاش میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں بھی نہیں تھا۔!!! □□

بقیہ صفحہ ۷۳؍ بکھراؤ

"وہ کیسے؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔
"جی کل رات چالیس برس بعد بابو چاچا حویلی لوٹ آئے ہیں، لیکن جب آئے ہیں تو ماں جی گزر گئیں۔"
"گزر گئیں!"
"آخری دنوں میں آپ کو یاد کرتی تھیں۔"
"مجھے؟ مجھے یاد کرتی تھیں؟؟"
میرے گرداگرد سڑتی ہوئی لاشوں کے انبار لگتے گئے۔ ایک کے بعد ایک، گدلے پانی میں بہہ کر آتی ہوئی۔
"دیکھتے نہیں کتنی تاریکی ہے۔ کمیٹی والے آج لیمپ پوسٹ روشن کرنا بھول گئے کیا؟"
"جی۔ جی میں تو آپ کو اطلاع کرنے آیا تھا۔ آپ آرہے ہیں نا؟"
"ہاں۔ ہاں آرہا ہوں۔"
یہ دیکھنے کے لئے کہ اب اس حویلی کا واحد مکین کس حال میں ہے۔ وہ، جس نے اپنی جوانی میں شادی کے بعد شاید دو راتیں بھی اس حویلی میں نہ گزاری تھیں۔
یہ سب پرانی باتیں ہیں، اور اس وقت جب کہ میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تو مجھے ادھر جانا ہے اور اسے دیکھنا ہے، جو اتنی مدت بعد پلٹا تو اسے حویلی خالی نہیں ملی۔ وہ دھندلائی ہوئی منتظر آنکھوں نے اسے خوش آمدید کہا اور ہمیشہ کے لئے مندتی چلی گئیں۔
پھر میں چلا آیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ اسی نیم تاریک سیلن زدہ کمرے میں، جہاں سے میں نے گراموفون اٹھایا تھا، پرانے ریکارڈوں سمیت۔
حویلی میں، بابو چاچا اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ پہچانتے بھی تو کیسے۔ انہوں نے کچھ بھی تو جواب میں نہیں کہا۔ یا شاید میں نے کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔

"آپ کو دیکھنے اور ماں جی کے لئے دعا کرنے حاضر ہوا تھا"۔
"ہاں بیٹا! موت برحق ہے اور یہ ایک رسمی کارروائی، کئے لیتے ہیں"۔ دعا کے بعد میں نے پوچھا۔
"اب آپ اس حویلی میں اکیلے ہیں۔ کیا محسوس کرتے ہیں ان کے چلے جانے کے بعد؟"
وہ تادیر خاموش رہے، پھر بولے:
"میں اس کا گنہگار ہوں۔ یہ تسلیم، لیکن میں قابلِ نفریں تھا، اسے جوانی میں اکیلا چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا کرتی تو میں بخدا بہت پہلے لوٹ آتا۔ انتظار وہ کرتی رہی اور ہلاک میں ہوتا رہا۔ پر اب، جب کہ مجھے اس کی ضرورت تھی تو وہ گزر گئی۔"
بابو چاچا بولتے رہے اور میں بیٹھا سنتا رہا۔
واپسی پر آموں کے باغات میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گدلے پانی پر جھکی ہوئی سوکھی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں اور بہہ کر آنے والوں کو تھامنے کے لئے وہاں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ □□



خالد اقبال یاسر

یسے ہی منصب تھے ایسا ہی حشم پہلے بھی تھا
ر گروی لکھنے والوں کا قلم پہلے بھی تھا

تت کی گردش سے سطوت میں کمی آئی نہیں
اہ ساماں ابروئے شاہاں کا خم پہلے بھی تھا

اہی ایوانوں میں صدیوں سے یہی معمول ہے
شم جمشید اور ایسا جامِ جم پہلے بھی تھا

ربا پرور سلامت، مسندیں خالی بہت
عائے عدل کے ساتھ ابن عم پہلے بھی تھا

ق آیا ہی نہیں ہے بے زبانی میں کوئی
ی حالت کا خیال اتنا ہی کم پہلے بھی تھا

پ ہی پھوٹے تو پھوٹے کوئی کونپل کوئی شاخ
ج بھی ہے اور اس مٹی میں نم پہلے بھی تھا

بے اثر رہتے نہیں اب بھی حروفِ مستعار
. کے لہجے میں پرایا زیروبم پہلے بھی تھا

●Academy of Letters, Sector -H-8/1, Islamabad (Pak)



غالب عرفان

کیا بولتی ہیں شب کی مسافر مری آنکھیں
کیا ڈھونڈتی ہیں خواب میں آخر مری آنکھیں

ہو دل میں اجالا بھی کہ اب ہونے لگی ہیں
آئینۂ ادراک پر ظاہر مری آنکھیں

محروم بصارت ہے یہاں میرا قلم اور
منظر کو بیاں کرنے سے قاصر مری آنکھیں

افکار کے اک بوجھ تلے بند ہیں لیکن
کرلیتی ہیں محفوظ مناظر مری آنکھیں

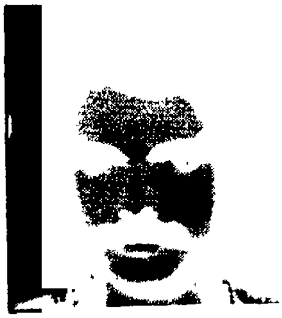
دیکھا ہے جو، لانے نہ دیا اس کو زباں پر
کیوں ہو گئیں خاموشی پہ قادر مری آنکھیں

سو جھوٹ کے ملبوس میں عریاں تر کردار
سچائی کے ہر روپ کی ماہر مری آنکھیں

کچھ تم ہی پہ موقوف نہیں ہے کہ کوئی شخص
ملتا نہیں مجھ سے کہ ہیں ساحر مری آنکھیں

انسان کا دل بن کے تواریخ میں موجود
لمحات کا عرفان ہیں شاعر مری آنکھیں

●L-715, 5/C-4, North Karachi, Karachi-75850 (Pak)



شوکت ہاشمی

گھر سے باہر قدم میں نے رکھا نہیں تھا کہ گھر بجھ گیا
گھر بجھا کر سفر پر روانہ ہوا تو سفر بجھ گیا

ہجر کی شام کے اس ستارے سے خوش تو بہت ہوں مگر
دل میں غم بھی بڑا اس اداسی کا ہے یہ اگر بجھ گیا

یوں ہوا پھر اسے بھی پرندوں کی ہجرت کے دکھ کھا گئے
صبح اور شہر کے درمیاں زندگی کا شجر بجھ گیا

اے میری روشنی سے بھی زندگی تیرا ماتم کروں
کیا کہوں اس چکا چوند میں میرا کیا کیا ہنر بجھ گیا

وہ سفر میں میرا آخری موڑ تھا اور ہوا چل پڑی
آخری موڑ تھا کہ چراغ سرِ رہگذر بجھ گیا

اس محبت کے دکھ کی کہانی مجھے آج بھی یاد ہے
اور کہانی یہی ہے سلگتا رہا عمر بھر، بجھ گیا

میں نے سب کو چراغ نظر دے دیا تھا کہ منظر کھلے
اور منظر کھلا تو میرا ہی چراغ نظر بجھ گیا

دیر سے گھر پلٹنے کے انجام سے کون واقف نہیں
اے ستاروں کے تاجر تجھے علم ہے ترا گھر بجھ گیا

خیمۂ عمر کے اس اندھیرے میں شوکت نہیں بھولتا
اک دیا جو محبت نے روشن کیا تھا مگر بجھ گیا

●S.P. Sahiwal, Sahiwal (Pak)





شاہین مفتی

جب سے اک پھول کھلا گوشۂ رخسار کے پاس
تتلیاں اڑنے لگی ہیں دلِ بیمار کے پاس

اور کیا حرفِ اطاعت کی وضاحت کرتے
رکھ دیا کاٹ کے سر آپ کی تلوار کے پاس

بارشِ سنگِ ملامت سے خیال آیا ہے
بس یہی ایک ہنر تھا کفِ اغیار کے پاس

دھڑکنیں تیز ہوئیں اور قدم رکنے لگے
پھر ترے شہر میں آکر تیری دیوار کے پاس

دلِ گم گشتہ کو اب ڈھونڈ کے کیا لینا ہے
گر گیا ہوگا کہیں کوچۂ دلدار کے پاس

دیکھئے آتی ہے کس وقت ہماری باری
اک جہاں بیٹھا ہوا ہے مری سرکار کے پاس

اس کو ہر صاحبِ تعبیر سے محفوظ ہی رکھ
وہ جو اک خواب ہے اس چشمِ گنہگار کے پاس

●B-10, Shadman Town,
Gujrat (Pakistan)

شبنم شکیل

دل نے منزل پالی تھی
میں اب مرنے والی تھی

بچپن سے سب سہنے کی
عادت ماں نے ڈالی تھی

کنکر تھے کچھ ہنڈیا میں
اور اک بچوں والی تھی

جو کچھ میں نے سوچا تھا
وہ تصویر خیالی تھی

اک نازک سی لڑکی تھی
یا پھولوں کی ڈالی تھی

میں تو دنیا دار نہ تھی
اس نے بات سنبھالی تھی

وجہ جینے کی ہر بار
دل نے ڈھونڈ نکالی تھی

●House -9- Street- 2, F-7/3,
Islamabad (Pak)

ماہ طلعت زاہدی

اچھے لوگوں کے لئے

وہ لوگ جو اچھے لگتے ہیں
اور جن سے ہو دل مانوس بہت
جنہیں دیکھ کے آنکھیں روشن ہوں
جنہیں دیکھ کر چہرے کھل اٹھیں
جنہیں دیکھ کے رات گذر جائے
جنہیں دیکھ کے دن آسان بنے
جنہیں دیکھ کے درد ٹھہر جائے
خود اپنی ذات مہان بنے
بس ایسوں ہی کی سنگت میں
یہ وقت کٹے تو پھر کیا دکھ
اور ایسوں ہی کی فرقت میں
یہ اشک بہیں تو پھر کیا سکھ

●House No. 1784, Street No.10
I-10/2, Islamabad (Pak)

علی تنہا

Radio Pakistan/ Multan (Pak)



گائے

موتگ موٹھ میں بڑا کون اور چھوٹا کون، اس لئے جب جان عالم سفید شال اوڑھے باہر آیا۔ لان میں سرما کی دھوپ سینکتے وہ چلا اٹھے۔

"خیر جان عالم بادشاہ کی، خیر سفید جھنڈے کی۔"

اس نے سیڑھی سے نیچے پاؤں رکھتے ہی تیوری چڑھائی۔

"تم یہاں تڑکے دوبارہ نظر نہیں آؤ۔ یہ سینگ اٹھا کے، سنا؟"

وہ تینوں جان عالم کی دوسری ماں سے تھے۔ اس کی بھاری آواز سن کے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہی اودھم جو پہلے مچا رہے تھے، جاری رہا۔ آسمان پر، کہیں کہیں بھوری بدلیاں تیر رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا، عصر تک گھوم پھر کے لوٹ آئے۔ لیکن سو، ؤس نے پہلا پہر کھوند ڈالا۔ جان عالم کی سیاہ چمکدار آنکھیں دہکتے بینوی چہرے پر ٹھہ گئیں۔ واپس ہونے کیلئے مڑنا بے سود تھا۔ دن، سفید اطالوی بِل کی طرح کروٹ لے کر پھول رہا تھا۔ سرما میں دھوپ کے چکیلے گچھے، بِل کی جھاگ کی صورت ہر سو پھیل گئے۔ وہ بادل نخواستہ سیاہ فل بوٹوں میں لمبے ڈگ بھر تالان کے قریب آگیا۔

"یہ گٹار تم سے چھوٹے گی؟ تاریں نہیں اس کی ٹوٹنیں کیا؟" درمیان میں مانگ نکالے مجھلے نے سر ہلایا۔

"تاریں ٹوٹ جائیں تو سرکار، معلوم ہے؟ کیا ہوتا ہے۔ عصر پڑ جاتی ہے۔ عصر سے ڈر لگے تو گٹار سے صرف ایک شے اچھی ہے، بلیک ڈاگ۔"

"بلیک ڈاگ نہیں بولو۔ کرے کاؤ کہو، کرے کاؤ۔۔۔"

تینوں کھلکھلا کے ہنس کر گٹاریں اٹھا کر بجانے لگے۔ گو ان کے درمیان فاصلہ دن بدن بڑھتا رہا۔ ماؤں کی وجہ سے وسیع جائیداد کی تقسیم کے ساتھ ہی خون بھی بدل گئے۔ ہاتھوں میں سینگوں سی گٹاریں لئے گھوم گھوم کے بجاتے رہے۔ اسے یہ سینگ شہ رگ کے قریب محسوس ہوا کیونکہ سفید خون کے سینگ نکلتے ہی جان عالم نے دیکھ لئے۔ اگرچہ ان کے بزرگ، رتھوں پر سوار دوسروں کے سینگ مروڑنے آئے تھے۔ یہاں سینگ اپنے ہی سر کے درپے ہوئے۔

"بلڈ از وائٹ اینڈ یو آر ریڈ۔۔۔"

جان عالم نے ہزیانی چیخوں اور دھاچوکڑی سے بے زار لان سے گذر کر سفید خون کو مڑ کے دیکھا تک نہیں۔ سرما کی ملائم سفید پشم سی نرم دھوپ سے نکل کے پورا دن کمرے میں گذارنا بھیانک خواب تھا۔ خواب اس کے لئے حقیقت سے زیادہ اذیت ناک ہے، حقیقت کو خواب سے جدا کرنا، ناخن کو گوشت سے اتارنا ہے۔ اس کی ہر حقیقت خواب کیا ہوئی، جان عالم کو خوابوں ہی سے نفرت ہو گئی۔ خواب نہ ہوتے تو زندگی اجیرن کیوں ہوتی؟ جان عالم نے بہت سوچ سمجھ کے گائے کی واپسی کا وقت عصر رکھا۔ گائے زوال کے وقت لوٹتی ہے۔ یہ وقت جان عالم پر بہت بھاری گذرتا ہے۔ گائے ہی اس وقت کو سہار سکتی ہے۔ آدمی کی ذات تو ذرہ ہے، پہاڑ سے بوجھ کو کہاں اٹھاتا پھرے۔ ایک وقت ہی ہوتا تو بات بھی تھی۔ زمین کو، دو ناتواں سینگوں نے اٹھانے کے ساتھ سہوانی کو بھی سہارا دے رکھا ہے۔ اس لئے وہ جب بھی باہر نکلا ہے، دھن جگرے والی گائے کو مڑ کے ایک نظر دیکھا ضرور ہے۔ کس لئے کہ دو بیگھے میں پھیلے باڑے کو اکیلی گائے کی ذات ہی آباد رکھتی ہے۔ سہوانی ہوتا تو باڑے میں بھیروں ناچ ہوتے۔ اس باڑے نے آبادی بھی دیکھی ہے۔ سہوانی کا باپو، بچپن میں، جان عالم کی انگلی تھامے اینٹوں کے ڈھیر کی سمت اشارہ کر کے کہتا۔

"یہ چھوٹی اینٹ کی بارہ دری تھی۔ کہا میری مایا نے سرکار کہ اگلی پیڑھی نے آدمی بڑا بڑا پیدا کیا ہے۔ میری یاد میں، اس کی دیواریں باقی تھیں، چھت دیکھی نہیں میں نے۔"

جان عالم کو، ڈرتے ڈرتے دیکھ کے دوبارہ بولا۔

"اس بھنڈار میں جمعرات کو روحیں آتی ہیں۔ چراغ میں جلائے رکھتا ہوں۔"

"روحیں؟" جان عالم نے طیش میں سہوانی کے باپ کا ر گوں بھرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "کھوسٹ کی کھوپڑی الٹ گئی ہے۔ اٹھواؤ اینٹیں یہاں سے۔"

اینٹیں اٹھوا کے باڑے کے گرد دیوار چن دی گئی۔ اس دیوار پر جان عالم چاکروں کے ساتھ بہت کھیلا ہے۔ سہوانی کو پہلی بار دیوار پر چراغ جلاتے دیکھ کر اس نے پکڑ لیا اور عمر قید شروع ہو گئی۔ اس قید کی نشانی گائے کی رسی ہے۔ باقی رسیاں خود بہ خود ٹوٹ گئی ہیں۔ صبح نکل کے وہ عصر کا سایہ بڑھتے ہی گائے کی رسی تھامے باڑے میں کھانستا ہوا داخل ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے ڈھلکی کھال، سہوانی کی گدلی اور میلی ہے۔ لبوں سے نیچے گرتی مونچھیں، چوہے کی دم کی طرح پھدکتی رہتی ہیں۔ چوہے کی دم کو تاؤ دے کر، آخور سے ٹیک لگائے گھٹنے سکیڑ لیتا ہے۔ دودھ کی بالٹی آنے تک اپنی کھال میں مست دن بھر کی ذلت اور خواری بھلا دیتا ہے۔ اس دوران میں گائے ڈکرائے یا دولتیاں جھاڑے، سہوانی چہرے پر چھایا تک نہیں پڑنے دیتا۔ بچھڑا البتہ آتے ہی دن کے زخم ہرے کر چھوڑتا ہے۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، ہونکتا ہوا اٹھتا ہے۔ بالٹی چھوکرے کے ہاتھ سے لے کر گائے کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا، بچھڑے کو تھنوں سے جدا کرتا ہے۔ ایسے میں اگر جان عالم گائے کے گرد بَیل کی طرح منڈلائے تو سہوانی کا سر گھوم جاتا ہے۔ لیکن اس کے دریا سے بھرے گہرے دل میں غصہ مچھلیوں کی طرح ڈبکی لے کے ڈوب جاتا ہے۔ ان مچھلیوں نے دریا

کے اندر رہنا سیکھ لیا ہے۔ باہر نکل کے ان کا دم ہی گھٹتا ہے۔ جان عالم کو اس کیفیت کا علم ہے اس کے اندر باہر کو ان مچھلیوں نے، پھٹی صدری کی طرح جگہ جگہ سے کتر ڈالا ہے۔ صدری کی کترنیں دیکھ کے جان عالم نے سہوانی کے لئے نیا دھسا، خرید کر کندھے پہ ڈال، زوال کے وقت باڑے میں قدم دھر کے دیکھا کہ کھونٹا گائے سے آزاد ہے اور باڑے میں گائے کا خواب باقی ہے۔ خواب کو اس نے باڑے میں پہلی بار اکڑوں دیکھا۔ جان عالم کے ہونٹوں پہ پپڑی جم گئی۔ چاہا، خواب سے گائے کا پوچھے۔ مگر بجھائی کچھ نہ پڑا سوال پپڑی پر ایک اور تہہ جما کر رہ گیا۔ یہ خواب تھا یا کسی ساونت کی روح، تلوار اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن یہ تو اس کے اپنے سورماؤں کی روحیں تھیں جو جان عالم کے انتظار میں صدیوں سے اس کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ عصر کا وقت، اس پر ہمیشہ بھاری گزرا ہے۔ اس نے گائے کے بجائے سہوانی کو یاد کیا۔

گائے پار سال ہری کرانے کے بعد آتے ہی کہنے لگا۔

"جب میں ندی پار کرتے ہی پانی کے بیچ پہنچا ہوں تو دیکھ کے پانی، گائے چمک گئی۔ رسی ہاتھ سے چھڑا کے اللہ بیلی ہو گئی۔ میں بولوں، گائے تیرے ساتھ، سہوانی پاکھنڈ کر گئی۔ جواب آیا، گائے کو پاکھنڈ بولتا ہے بدبخت۔ سیتا ہے ہونٹ یا سی لوں تجھے سالم۔ مڑ کے جو حضرت کو دیکھا تو خواب کھڑے سرخ پیلے ہو رہے ہیں۔ کہا، سہوانی اتار گٹھڑی اور دے اسے ایک جھانپڑ۔ دیکھ میری نیت، خواب تن نہ گیا! بولا اتاروں تیری گٹھڑی یا اڑاؤں تیرا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں نون کی طرح پگھل رہا میں تو۔ جوڑ کے دونوں ہاتھ کہا۔ تو جم جم جی، سر اتار یا گٹھڑی، بات ایک ہی ہے۔ سن کے ڈھٹی بات کو، خواب کھلکھلا کے ہنس دیا۔ اٹھ کے میری پلکوں پر جو بیٹھا ہے تو آج اترے گا سرکار۔"

سہوانی کی بکواس پر اسے تاؤ آیا تھا۔ اب سامنے خواب کے اس کی سٹی گم ہو گئی۔ جوں جوں زوال کا وقت ڈھلتا گیا۔ ہوش ٹھکانے آتے گئے۔ گائے کا انتظار، اندھیرے کی طرح پھیلتا گیا۔ اس انتظار میں سب گلیاں، گلیارے شام کے دھندلکے میں ڈوب گئے۔

گھروں کو لوٹتے، لوگوں کا شور، خواب سا چاروں اور تن گیا۔ جان عالم باڑے کے حصار میں ٹلکتے ٹلکتے، پیتل کی بالٹی ہاتھ میں پکڑے چھوکرے کی آمد پر چونکا۔

"گائے مر گئی سرکار۔"

"گائے مر گئی؟"

وہ تڑپ کر چھوکرے کی سمت پلٹا۔

"کون لایا ہے یہ خبر۔ کہاں ہے وہ سہوانی کا بچہ، کہاں ہے......"

"دوپہر کو سرکار، خبراں آئی ہیں۔"

جان عالم کے تیور بدلے دیکھ کر چھوکرا، بالٹی زمین پر پھینک کر اڑن چھو ہو گیا۔

"یہ چھلاوہ کہاں گیا، گائے مار کے، کہاں گیا....؟"

اس کی نظروں سے ایک ایک شے غائب ہو گئی۔ پہلے زوال کا وقت گزرا، اس کے پیچھے گائے اور سہوانی گئے۔ وہ بڑبڑاتا باڑے سے نکل، حویلی کی سیڑھیوں پر سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ سنگ سیاہ کی گھسی سیڑھیوں کا پیچواں راستہ اوپر سے آتا، اس کے گرد سانپ کی طرح ڈھیر تھا۔ سیڑھیوں کے بالکل سامنے، لان میں ٹلکتے اندھیرے کو غور سے دیکھنے پر پانچ کرسیاں اور ساگون کی لمبی میز نظر آئی۔ صبح سے شام تک ان کرسیوں پر آیا طوفان گزرا کئے۔ اس نے تینوں بھائیوں کے بعد، گائے والوں کو یاد کیا۔ وہ گائے لینے آئے تھے۔ چھوٹتے ہی بولے۔

"دودھ گائے کا چوکھا ہے؟"

"تو لیٹر ایک وقت کا۔"

"اس کا مطلب ہے فیڈنگ بڑھانے سے دودھ آسٹریلوی گائے کے برابر آ جائے گا؟"

"آسٹریلوی کے برابر؟"

جان عالم نے چمک کر دہرایا۔

"چولستانی گائے کی برابری کس گائے سے لگے ہیں کرنے۔ گائے یہ صحرائی ہے، باہر کا کھاجا دیکھ کر بپھر جاتی ہے...."

"بپھر جاتی ہے؟"

"ہاں بپھر کر طوفان اٹھا لیتی ہے"

جان عالم نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

"چولستانی گائے خالہ جی کا ویہڑہ نہیں ہے۔ آسان ہوتا اس کا پالنا تو جانم... کھونٹے کھونٹے سے سندھی جناب کو نظر آتی۔ گائے یہ وہ نہیں، شکر ادا کر بھائی والی۔"

وہ چاروں کرسیوں پر طوفان کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ گائے نے انہیں گویا سینگوں پر اٹھا لیا۔ جان عالم، سیڑھیوں پر بیٹھا، ہاتھ کا پنجا ماتھے پہ رکھے کرسیوں پر گذرے طوفان کے بعد ایک اور آندھی میں گھر گیا۔ اوپر والی منزل میں راک موسیقی کا جھگڑا اچل رہا تھا۔ گائے کی موت کا سائیکلون، دونوں منزلوں کو زمین سے اٹھائے کھڑا تھا۔ جان عالم نے دوڑ کر اپنے کمرے میں پناہ لی دروازہ بند کر کے، کھڑکیوں پر سے پردے کھینچنے کے باوجود، شور گھٹ گھٹ کر اندر آتا رہا۔ کسل مٹانے کو، اس نے کیا کیا جتن نہ کئے۔ ناچار پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور گلوگیر آواز میں ساتھ والے پلنگ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ماں تیرا شور، میرا باپ سنتے سنتے سن ہو کے گذر گیا۔ اب اولاد تمہاری کا شور، ایک دنیا سن رہی ہے۔ تم گئیں، مگر اپنے دانت کیوں چھوڑ گئیں۔ مجھ پر اے سوتیلی ماں تیری طرح، یہ بھی ترس نہیں کھاتے۔ صرف مجھے کھاتے ہیں۔

"میرے پلے اب کیا رہا ہے، کیا رہا ہے....؟"

تکیہ گود میں رکھ کر، شور سنتے، رات کے پچھلے میں کہیں اس پر نیند کا غلبہ ہوا۔ نیند شور کی چادر میں کب آن گھسی۔ اس کا پتہ، دن چڑھے ہوا۔ گائے کے سینگ ہلاتے ہی دنیا نے سارے مہرے بدل ڈالے۔ بادشاہ کی جگہ غلام اور غلام کی منزل پر، تاج اتارے سرنگوں بادشاہوں کے پہرے ملے۔ وہ جس بادشاہ کی سمت بڑھا غلام نرسنگھے بجا کر اسے پیچھے ہٹا دیتے۔ ہر جگہ گائے کے سینگ موجود ہیں۔ گائے مر کر اپنے سینگ کہاں کہاں نہ چھوڑ گئی۔ اس نے بڑی مدت کے بعد شطرنج کھیلتے، ڈرائنگ روم میں بارہ سنگھے کا سر دیکھ کر دیوار سے اتار لیا۔ حیرت سے الٹا پلٹا چولستانی کے سیاہ سینگوں کی طرح بارہ سنگھے کے نوک دار سینگ گھٹے دار اور ملائم تھے۔ جان عالم کو یہ کون دے گیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا دیوار میں ٹنگی نگینوں جڑی چاندی کی پلیٹ پر کھدے عباسی کے نام پر چونکا۔

عباسی جاڑوں میں شکار کے بعد لدا پھندا، جان عالم کے سامنے مال غنیمت

ڈال دیتا۔ "یہ مرغابی شمال میں برف باری کے بعد، پہلی بار میں نے شکار کی۔" نیل گائے کی کھال وہ اچھال کر پہاڑ پر اپنی جواں مردی کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں شکاری خون اتر آتا۔ بارہ سنگھے کے نوک دار سینگ دیکھتے اسے عباسی کی گرج دار آواز میں، سینگوں کی قطار دکھائی دینے لگتی۔ گائے کی ذلت سینگوں سے بھری ہر جگہ موجود رہی۔ زمین کے اندر سینگ، زمین کے باہر سینگ، سینگوں کے سنگینوں میں گھرے جان عالم پر پہلے زوال کا وقت کیا کم بھاری رہا کہ اب دن کے پورے ماتھے پر سینگ ہی سینگ نکل آئے۔ وہ جس پہر کو بھی دیکھتا ہے، سینگوں سے ٹکرا جاتا ہے۔ لے دے کے ایک خواب تھے۔ جن میں پہلے سینگوں کا گذر نہیں تھا۔ مگر تابہ کے ہوتے ہوتے، خوابوں کے بھی سینگ نکل آئے۔ پہلے پہل سینگوں پر سوار خواب دیکھ کے جان عالم کو ہنسی آجاتی تھی۔ مگر اب خواب اس پر ہنسنے لگے۔ اس بے رحم ہنسی پر اس نے بہت غور کیا۔ لیکن غور کے آخر میں وہ آپوں آپ ہنسنے لگ جاتا۔ اس کے مسکراتے چہرے پر کھل کے ہنسی سے سب بہت خوش ہوئے۔ لیکن ہنسی، اسے ہنساتے ہنساتے اپنے سینگ پسلیوں میں بھی چبھا دیتی۔ ہنسی کے اندر گائے کی ڈکراہٹ سے وہ گھبرا جاتا۔

"ہنستے ہنستے یہ آپ کو ہو کیا جاتا ہے؟ کیوں آنکھیں پھاڑنے لگ جاتے ہو۔ ہنسی کے بعد تمہارا چہرا لگڑ بگڑ کی طرح بگڑ کیوں جاتا ہے؟"

جان عالم کوشش کرتا رہا، ہنسنے کے بعد اپنے چہرے سے لگڑ بگڑ کا چہرہ اتار پھینکے۔ لیکن لگڑ بگڑ کا چہرہ اتارنے کی جلدی میں اسے اپنے اوپر پھر ہنسی آجاتی۔ ہنسی اپنے سینگوں سے جان عالم کا چہرہ چیر پھاڑ کر رکھ دیتی۔ چیر پھاڑ کو دوبارہ جوڑنے میں جو بھی شکل بن جائے وہ اس کی لاچاری ہے۔ بہت سوچ کے، جان عالم نے تہہ کر لیا، اب وہ گائے کے بارے میں سوچنا ہی تج دے گا۔ گائے کا دھیان مٹانے کی خاطر اس نے باڑے کی جگہ پلازہ تعمیر کروالیا۔ پلازے میں بھانت بھانت کی دنیا دیکھ کے وہ ہنسنا ہی بھول گیا۔ ہنسی گائے کے سینگوں کی طرح گم ہو گئی۔ نئی دنیا کے ہنگاموں میں جان عالم کے خواب تک بدل گئے۔ اور جگ رتوں کی وجہ سے خواب مٹتے مٹتے بے خوابی میں بدل گئے چہرے کی گلابی زردی میں ڈھلنے کی وجہ سے وہ مل گیا۔ ایک بار پھر خوابوں کی کھوج میں، اسے خواب سے چہرے اچھے لگنے لگے۔ اس لئے پلازے کی سیڑھیاں چڑھتے، سرخ و سپید، دور نگے خواب سا بڈھا نظر آگیا۔ اس کے سر پر گتوں کا پہاڑ لدا تھا۔ بندگی بے چار کی گیروے کپڑوں میں پہاڑ کی گراں باری سے بے خبر، اوپر جا رہی تھی۔ جان عالم نے بڈھے کی قابل رشک توانائی دیکھ کر پوچھا۔

"یہ بنڈل کہاں لے جا رہے ہو....؟"

"آسمان کی ترپ جاتی ہے خان۔ سیدا خوچہ اوپر جاتا مانگتی ہے۔"

بڈھے نے بھرویں سنہری داڑھی کو جھٹکا دے کر جان عالم کو دیکھنا چاہا۔ مگر سر پر پہاڑ کی وجہ سے دیکھنا ممکن نہ تھا۔

"آخری منزل تو بہت دور ہے، اتنا بوجھ لے کر کیسے جاؤ گے؟"

"منزل دور ہے تو فکر نہیں۔"

بڈھے کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ اس کے روغنی سرخ چہرے پر داڑھی جٹا کی طرح جھول رہی تھی۔ وہ برگد سا لہلہاتا ہوا، گویا پہاڑ پر ہوا کے تند تھپیڑے جھیل رہا تھا۔

"اس کا مزدوری کتنا ملے گا خان؟"

برگد نے دوبارہ جان عالم کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر پہاڑ پر سے کون درخت مل سکتا ہے۔

"پروردگار کا شکر اے۔ بوت ملتی۔ بوت...."

جان عالم اس کی سادگی پر ہنس پڑا۔ ہنسی اتنے دنوں کے بعد جھونکا بن، اس کے ستے چہرے پر جھوم گئی۔ خوشی میں خواب سے برگد کو اوپر چڑھتے، بڈھے کے پاؤں سیڑھیوں پر ہولے کی طرح پڑ رہے تھے۔ جان عالم کے چہرے پر ہنسی دیر تک چپکی رہی۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھے، سامنے بھوسلے رنگ کی عمارتیں، گائے سے مہربان چہرے اٹھائے دھوپ میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے ہنسی کے سینگ دوبارہ یاد آئے۔ بھوری عمارتوں کے سنگ آسمان تک بلند تھے۔ اور گایوں کا ریوڑ گویا زمین کے آخری مغربی کنگورے تک چیر تار کیا تھا۔ مغرب کی آخری حد پر ہرے دریا سا خواب ناک دوب کا میدان تھا۔ معلوم پڑتا گائیں، گھاس کے ہرے دریا سے ایک گھونٹ پانی مانگنے کے جرم میں اینٹوں اور پتھر میں بدل گئی ہیں۔ اس کا لپ لپ کرتا دل مٹھی میں آگیا۔ چولستانی گائے، خواب سی یاد آ کے جان عالم پر زوال لپ کے وقت کی صورت بھاری پڑ گئی۔ گائے نے مر کے بھی خواب جہاں تہاں بکھیر دیئے تھے۔ چولستانی زندہ ہوتی تو یہ خواب سینگوں پر جھولتے آنکھوں میں پلتے اور نہیں تو سہولی کی پھٹی صدری میں چھپ کر رات گذارتے اور صبح اس کی کھوی میں بیٹھ کر باہر چلے جاتے۔ گائے اور سہولی کے گم ہوتے ہی دھوپ میں ہجوم کرتے، خوابوں کی گائیں اس کے چوگرد پھیل گئیں۔ لاٹھی ہوتی تو انہیں ہانک کر راہ دیتا۔

جان عالم کو اپنے پرکھ یاد آگئے۔ وہ لاٹھیاں اور تلواریں سونتے مارے مارے پھرتے تھے کہ خواب کا کوئی سینگ سر دیکھیں تو اس کا کام تمام کردیں۔ ان کی یہ بھول، عمر کی دھوپ ڈھلتے ہی خوابوں نے تمام کردی۔ وہی خواب مٹی سے نکل کے سورماؤں کی طرح گایوں پر سوار اس کے دو بدو کھڑے تھے۔

قیامت خیز گرمی میں رن پڑنے سے پہلے، اس کے جی میں آئی کہ زیادہ نہیں تو ایک آدھ خواب ہی اوڑھ لے۔ آخر وہ کیوں بزرگوں کی غلطی دہرائے۔ آنکھیں میچے جان عالم، خواب کا سینگ پکڑے، ریلنگ پر جھکا وہ گھڑی یاد کرنے لگا جو اس پر بہت بھاری گذری تھی۔ اسی جگہ جہاں وہ کھڑا تھا، زوال کو گائے جھپک لیتی تھی۔ گائے کے مرتے ہی جگہ تو مٹ گئی مگر اس کے سینگ نکل آئے۔ جان عالم زندہ خواب پکڑنے کو آگے بڑھا لیکن دغدغے میں بھری دوپہر کو زوال کے وقت سے ٹکرا گیا۔ اسی طرح جیسے وہ گائے دیکھنے کو باہر نکلا تھا۔ خالی باڑے کے کچے صحن میں کروڑہا ذرے ڈوبتے سورج کی چھوٹ سے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ زوال کا وقت کتنا بھاری گذر رہا تھا، جان عالم کو اس کا اندازہ خاکی عمارتوں پر گرتی دھوپ سے آہستہ آہستہ ہوتا گیا۔ □□

شفیق احمد شفیق

یہ سانحہ بھی انوکھا ہوا تمہارے بعد
مرا وجود نہ واضح رہا تمہارے بعد

سب آشنا ہوئے نا آشنا تمہارے بعد
مرا نہ تھا کوئی میرے سوا تمہارے بعد

ہے خشک پیڑوں پہ جاری ہواؤں کا نوحہ
ہے گرتے پتوں کی ہر سو صدا تمہارے بعد

تمہارے قرب کی خوشبو لہو لہان ہوئی
اکیلے پن کا وہ طوفاں اٹھا تمہارے بعد

فضا میں اڑ گئیں سب تتلیاں امنگوں کی
نہیں ہے دل میں کوئی اب دعا تمہارے بعد

تمہارے جسم کی چھاؤں ضمانت جاں تھی
میں برگ سبز تھا زرد ا گیا تمہارے بعد

بدن کے دشت پہ بس دھوپ ہی کا موسم ہے
نہ گھر کے پھر کبھی برسی گھٹا تمہارے بعد

تمہارے جاتے ہی اک جنگ چھڑ گئی مجھ میں
میں خود سے مدتوں لڑتا رہا تمہارے بعد

جو رنجشیں تھیں تمہارے سبب سے تھیں سب کو
کسی کو اب نہیں مجھ سے گلہ تمہارے بعد

●DT/78/18, Saman Abad,
'F' B,Area, Karachi (Pak)



رضی الدین رضی

تھی کھنک آواز میں اور گفتگو تیری طرح
تو نہیں تو کون تھا پھر ہو بہو تیری طرح

ایک جھونکا ہے کہ جو مہکائے رکھتا ہے بدن
ایک خوشبو ہے ابھی تک چار سو تیری طرح

ایک جیسی جستجو تھی ایک سی لاحاصلی
رات دن بھٹکا تھا میں بھی کو بہ کو تیری طرح

میں نے پوچھا کون اور کس کی طرح تھا اجنبی
اس کی جانب سے جواب آیا کہ 'تو۔ تیری طرح'

تو نہ مل پایا چلو اپنا پتہ ملتا کہیں
کاش کرلیتا میں اپنی جستجو تیری طرح

ہجر کے خدشات پر اس نے رضی مجھ سے کہا
میں نے تو کی ہی نہیں یہ آرزو تیری طرح

●Co/, Kitab Nagar, Hasan Arced,
Multan Cantt. (Pak)



جعفر بلوچ

دور ابھی ہے منزل یار واب تم نے کیا سوچا ہے
او سر بازو او جاں ہار واب تم نے کیا سوچا ہے

کیا میرے افسردہ چمن کو اور افسردہ کر دو گے
اے میری ناراض بہار واب تم نے کیا سوچا ہے

رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی ہے بھیڑ وفا کے بندوں کی
جبر سرشتو، عشق آزار واب تم نے کیا سوچا ہے

صفحاب کوئی بھی مترا اپنے مصحفِ جاں میں نہیں
کرب نویسو زخم نگار واب تم نے کیا سوچا ہے

امن اور خیر کے نام پہ تم نے دنیا کو تاراج کیا
امن پرستو خیر شعار واب تم نے کیا سوچا ہے

اہلِ ستم کو دادِ ستم کیا دو گے یونہی آئندہ بھی
صبر کے اے سرمایہ دار واب تم نے کیا سوچا ہے

ہجر کے ماتے درد کے مارے رو دھو کر خاموش ہو۔
ہجر بہا گو، دردملہار واب تم نے کیا سوچا ہے

-Ghazali Park, Behind Wehdat
olony, Lahore (Pak)



انوار فیروز

میں لفظوں سے بہلتا جارہا ہوں
یہ کیوں پھر آج دھوکہ کھارہا ہوں

مرا جذبہ تو ہوگا تیز تر ہی
میں شعلہ ہوں بھڑکتا جارہا ہوں

مرے تو نام میں ہی روشنی ہے
میں دنیا میں اجالا لارہا ہوں

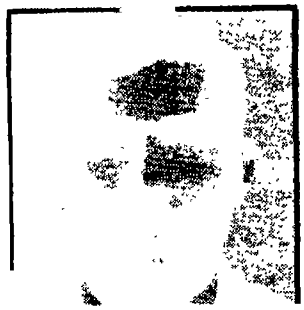
اڑانیں دیکھ کر ششدر ہیں سب ہی
فلک کو میں زمیں پر لارہا ہوں

کسی سے دشمنی میری نہیں ہے
میں کیوں اتنا بدلتا جارہا ہوں

جو جھوٹے ہیں وہ جھوٹے ہی رہیں گے
انہیں میں آج بھی جھٹلا رہا ہوں

میں ہوں انوار دشمن تیرگی کا
اجالا دہر میں پھیلا رہا ہوں

●D/538, Satelite Town,
Rawalpindi- 46300(Pak)



صابر آفاقی

بیدار ہم اس طرح سے آگے تو نہیں تھے
اب جاگ کے سمجھے ہیں کہ جاگے تو نہیں تھے

جلدی طلب قرض تنفس میں بہت کی
ہم لوگ ترے شہر سے بھاگے تو نہیں تھے!

بیمار تو ہوتے تھے مگر عشق سے پہلے
روگ ایسے مری جان کو لاگے تو نہیں تھے

وہ جوش قیامت تھا کہ پہنچے سر منزل
واماندۂ منزل سے ہم آگے تو نہیں تھے

صراف نے کیوں سلک گہر ہی نہ بنایا
ہم بھی زر خالص تھے سہاگے تو نہیں تھے

اس طرح کے اشعار وہ کہتے بھی تو کیسے!
اس طرح کے صدمے کبھی آگے تو نہیں تھے

رشتے جو ہمارے تھے وہ کیا ٹوٹتے صابر
زنجیر تھے کچھ سوت کے دھاگے تو نہیں تھے

●P.O. Box No.9,
Muzaffar Abad-131016 (Pak)

منصور ملتانی

جو اپنے ہاتھ کی گردش سے باہنر نہ ہ
وہ لاکھ چاک گھمائے پہ کوزہ گر نہ ہ

مزہ تو جب ہے مجھے یوں جلائے آتشِ عش
میں راکھ ہوتا چلا جاؤں اور خبر نہ ہ

خفا نہ ہونا کبھی مجھ سے میرے ہم سف
اگر سراب مجھے حاصل سفر نہ ہ

میں کھیلوں عشق میں ہولی تو کیسے ممکن ہ
جنوں کا رنگ ردائے شعور پر نہ ہ

زباں سے لاکھ کرے دعویٰ مسیح
جو زہر بانٹتا پھرتا ہے چارہ گر نہ ہ

اڑا رہا ہوں اندھیروں میں آس کے جگ
ہے دل میں خوف کہیں تہمت شرر نہ ہ

نہیں ہے کوئی بھی منصور عہد حاضر م
فرازِ دار کے قابل کسی کا سر نہ ہ

14/212, Old Area Port,
arachi - 11(Pak)

طاہر نقوی
Flat No. G-3, Sunny Arcade, Black-7
Grishan-e-Iqbal, Karachi (Pard)



بکھراؤ

آج کئی روز بعد مجھے کالو دکھائی دیا، وہ گلی کے نکڑ والے پان سگریٹ کے کھوکھے پر کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔

کالو سے میری دوستی اب خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ میں اس علاقے میں جب نیا نیا آیا تو سب سے پہلے اسی سے مڈ بھیڑ ہوئی، اس نے میرا سامان اتروایا، گھر میں رکھوایا، صفائی ستھرائی کے لئے ایک مزدور بلوایا اور دوڑ کر کھانے پینے کی چیزیں لے آیا۔ اس سے مل کر میری ڈھارس بندھی، ساتھ ہی میں حیران بھی تھا کہ اس دور میں یہ شخص ایک اجنبی کے ساتھ ایسا پر خلوص رویّہ کیوں اختیار کئے ہوئے ہے۔ تاہم یہ سوچ کر میں چپ رہا کہ اچھے لوگ ہر علاقے اور مذہب میں موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کا تانا بانا اب تک صحیح سالم ہے۔ یہ نیکی مجبوراً کی ہوئی نہیں تھی، مجبوراً کی ہوئی نیکی سے آزادی کی بدی بہتری ہوتی ہے۔ پھر اکثر و بیشتر وہ میری خیریت دریافت کرنے آجاتا اور میری ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ یوں یہ راہ رسم اجنبیت سے آگے بڑھ کر اپنائیت اور بے تکلفی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ میں اس بات سے مطمئن بھی تھا اور مجھے اس کی عادت سی ہو گئی۔ جب تک میں اس سے نہ مل لیتا مجھ میں ادھورے اور خالی پن کا احساس رہتا، اس سے باتیں کر کے مجھے سیری حاصل ہوتی، اس کی باتیں تصنع سے پاک ہوتیں۔ ان میں کوئی مصلحت نہ ہوتی، کوئی منافقت نہ ہوتی۔ دراصل باہر سے نظر آنے والے اس پستہ قد نے ہمارے عہد کے ظاہری قد آوروں کو روند ڈالا تھا اچانک ایک روز کسی پڑوسی سے بات چیت کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ کالو محلے کا بدمعاش ہے اور دور دور تک اس کی یہ شہرت پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سن کر میں سنسنا کر رہ گیا اور جب کالو مجھ سے ملنے آیا تو مصلحت کوشی میرے دل کو اپنے پنجوں سے کھرچنے لگی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنا رویہ روکھا رکھا، وہ فوراً بھانپ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اٹھ کر جانے لگا، یہ لمحے میرے اوپر بڑے کٹھن گذرے میں اواس لمحوں کی تیز بارش سے بھیگتا رہا۔ اس نے اس عرصے میں میرے ساتھ جو بھلائی کی اور مجھے اپنائیت دی وہ میری نظروں میں گھوم گئی اور میرا دل بھر آیا۔ میں نے سوچا کہ بھلا مجھے اس کے کردار کے اس رخ سے کیا سروکار۔ چنانچہ میں نے بے اختیار ہو کر اسے روک لیا اور گلے لگایا۔ یکایک میری اس تبدیلی سے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا میں بمشکل اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا سکا، وہ میرے اندر پیدا ہونے والے اس جوار بھاٹا کو محسوس کرتے ہوئے قہقہے لگانے لگا، البتہ ان قہقہوں کے پیچھے اس کی اتھل پتھل حالت میں بھی دیکھ رہا تھا۔

تاہم ہمارے درمیان اس پردے کے ہٹنے کے بعد ہماری دوستی کا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ کالو علاقے کے لوگوں کی نظروں میں بدمعاش ضرور تھا مگر اس نے کبھی محلے میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی۔ سمندر اس وقت بہت پچھتاتا ہے جب نالے اور ندیاں اس کے ظرف کو آزماتے ہیں۔ وہ صبح کہیں نکل جاتا اور رات ہی کو نظر آتا، نا جانے کہاں رہتا، میں پوچھتا تو ہمیشہ ٹال دیا کرتا محلے کی گلیوں میں ہمیشہ نظریں جھکائے سب کو سلام کرتا ہوا گذرتا، ضرورت پڑنے پر آس پڑوس کے آڑے وقت کام آتا، کبھی کسی کو اس سے شکایت پیدا نہ ہوئی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو مقامی کالج میں پڑھتا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ کہیں دور رہتا تھا، کالو اس محلے میں تنہا ہی رہتا اور اپنے بیوی بچے کو نا جانے کیوں علیحدہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی بیوی اور بیٹے کو اس کے روز و شب کا علم بھی نہیں تھا۔

پھر اچانک ایک روز وہ محلے سے غائب ہو گیا، میں بہت پریشان ہوا، اس دوران میں اسے محلے میں تلاش کرتا رہا، اس کے بارے میں آس پاس کے لوگوں اور اس کے حلقے کے ساتھیوں سے دریافت کیا، اس کے گھر جا کر دستک دی مگر دروازہ نہ کھلا، چنانچہ میں یہ سوچ کر خاموش بیٹھ رہا کہ چند روز بعد وہ خود ہی نمودار ہو جائے گا۔

چنانچہ آج مجھے کالو نظر آیا تو میں لپک کر بے قراری کے عالم میں اس کے قریب پہنچا اور خوشی سے بے اختیار پکارا۔

"کالو"!

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور کھلکھلا اٹھا، ہم نے اپنے ہاتھوں میں گرم جوشی کی دھوپ بھر کر مصافحہ کیا، پھر وہ میرا بازو تھامے قریبی گھاس پھوس کے ایک ہوٹل میں لے گیا اور ہم کونے والی بنچ پر جا بیٹھے۔

"یار کہاں رہے؟" میں نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

"ایک مشن پر تھا" اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔ میں نے اسے کریدنا چاہا مگر حسب عادت اس نے مجھے کچھ نہ بتایا تو میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس دوران چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے آگئیں، میں نے گھونٹ لے کر پھر پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا کہ تمہارے بیٹے کو کس نے مارا تھا؟"

چند لمحے وہ اداس رہا، پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"پچھلے دنوں میں اسی کام پر لگا ہوا تھا"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" وہ خلاؤں میں تکتے ہوئے بولا، یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی اندرونی کیفیت کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے بے چینی

سے کہا،

"تو پھر تم اسے گرفتار کراؤ"۔

اس نے مجھے طنزیہ انداز میں یوں دیکھا گویا میں کوئی بے وقوفی کی بات کر رہا ں، وہ کچھ بتانا چاہتا تھا مگر اس کے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے، اس کے لفظوں کی میلی نکھوں میں آنسو الجھے ہوئے تھے، اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور وہ چائے پئے بغیر انک اٹھ کر باہر چلا گیا۔ چند لمحے میں بت بنا اکیلا بیٹھا رہا، میرے ذہن میں جو لفظ تھے وہ ہوا کے دوش پر اڑنے لگے پھر چائے کے پیسے دینے لگا تو معلوم ہوا پیسے وہ پہلے ں دے چکا ہے۔ میں نے باہر نکل کر کالو کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ میں کے تھکے قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا ما کہ میں نے اس کے بیٹے کا ذکر چھیڑ کر اسے ناحق افسردہ کر دیا۔

اس کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے سوچا رات کا کھانا کھاتے ہی کالو کی رف جاؤں گا اور معافی مانگوں گا، دوسرے کے درد کے احساس ہی سے کسی آدمی کا ہود ثابت ہوتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ دفعتاً دستک ہوئی، میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو کالو تھا، اس کے گلے میں بازو حمائل کر کے میں اسے اندر یا اور زبردستی کھانا کھلایا، کوئی ایسا رشتہ تھا جس سے ہم دونوں یوں بندھے ہوئے تھے۔ اس دوران میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"یار میں نے تمہیں خواہ مخواہ اداس کر دیا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں، میں خود ہی جذباتی ہو گیا تھا۔"

"لیکن تم چلے کیوں گئے فوراً۔"

"میں نے سوچا اپنے ساتھ تمہیں کیوں غمگین کروں، گھر جا کر میں دیر تک وتا رہا۔"

ں چند لمحے خاموش رہا اور اسے تسلی دیتا رہا، پھر آہستگی سے پوچھا۔

"ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے۔"

"تمہاری بات کا میں نے کبھی برا نہیں مانا"

اس کے باوجود میں ذرا ہچکچایا، پھر کہا۔

"تم ٹھنڈے دل سے سوچو تم نے بھی تو کسی ماں کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی ر کسی بیوی کے شوہر کو مارا ہو گا"۔

نہیں۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔ "میں بدمعاش اور غنڈہ ضرور ہوں لر میں نے کبھی کسی انسان کی جان نہیں لی۔" اس انکشاف سے مجھے حیرانی کے ساتھ طمانیت ہوئی، انسانی رشتوں کا جو بھرم اس کے کردار میں تھا وہ بہت کم یکھنے میں آتا ہے۔

"ہاں میں نے توڑ پھوڑ اور ہنگامہ ضرور کیا ہے۔"

"یہ بھی کیوں کرتے ہو؟"

"اس کا مجھے معاوضہ ملتا ہے" وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"میں سمجھا نہیں!" میں حیران ہوا۔

"میں نے جائز نوکری اور مزدوری کی تلاش کی لیکن مایوسی ہوئی، پیٹ پالنا اور بچے کو تعلیم دلوانی ہی تھی، آخر بااثر لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

میں نے اسے مزید کریدا مگر حسب عادت اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں اپنی اندرونی کشمکش سے دوچار تھا شاید وہ بھی اسی کیفیت میں مبتلا تھا، اس کے چہرے پر کسی رنج کی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود سلگانے کے بعد گہرا کش لیا، اب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے پوچھا۔

"تم اپنے بیٹے کے سلسلے میں رپورٹ درج کیوں نہیں کراتے۔"

جواب میں گہری طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی، اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"پولیس نے کبھی کسی قاتل کو پکڑا ہے؟"

میں قائل ہو کر خاموش ہی رہا، وہ زہریلے لہجے میں کہنے لگا۔

"بلکہ میں دھر لیا جاؤں گا۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا، یوں اچانک اٹھ کر چلے جانا اس کی عادت سی بن گئی تھی، میں نے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پلنگ پر لیٹ گیا، نیند میری آنکھوں سے دیر تک غائب رہی، پھر دو تین دن مجھے کالو سے ملنے کا موقع نہیں ملا، وہ اس دوران اپنے دھندوں میں مصروف رہا ہو گا۔ میں خود اپنے گھریلو اور روزگار کے مسائل میں الجھا رہا۔ کالو مالی طور پر میری نسبت زیادہ خوش حال تھا تاہم اس کے رہن سہن اور گھر سے ایسا بالکل نہیں لگتا تھا جب کہ میں اپنی کلاس کے لوگوں کی طرح ستر پوشی اور گھر کی آرائش کے لئے معاشی طور پر ہمیشہ نڈھال رہتا۔ اپنی اسی سوچ میں گم اپنے کام سے تھکا ماندہ واپس آ رہا تھا، ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں دھوپ کا آخری ٹکڑا دم توڑ رہا تھا۔ ایک گلی کے موڑ پر اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کالو ہی تھا کیونکہ اس بستی میں اتنا بے تکلف مجھ سے کوئی اور نہیں تھا۔

"کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟" اس نے کریدا، میں نے ٹالنا چاہا تو بولا۔

"مجھ سے مت چھپاؤ، کسی نے تنگ کیا ہے تو بتاؤ۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"تو پیسے کا مسئلہ ہے؟"

"نہیں بھئی، کالو!" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھ سے چھپا رہے ہو!"

"نہیں بلکہ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک گیا ہوں۔"

"اچھا تو آؤ چائے کی میز پر گپ شپ کرتے ہیں، ساری تھکن جاتی رہے گی۔" چنانچہ ہم دونوں اسی ہوٹل کی مخصوص بنچ پر جا بیٹھے۔ (اس نے ٹھیک ہی کہا تھا، بے لوث دوستوں سے بات چیت سے اعصاب کھل جاتے ہیں اور تھکاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔) مجھے کالو کو دیکھتے ہی غیر شعوری طور پر ہمیشہ اس کے بیٹے کا خیال آ جاتا، تاہم میں اس بات کو دبا لیتا مگر آج نا جانے کیوں مجھ سے رہا نہ گیا میرے اندر کوئی چیز چبھ رہی تھی اور نا چاہنے کے باوجود میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے یہ بات ضرور کروں گا۔ چنانچہ چائے پی کر تھکن کم ہوئی تو میں نے سیدھے سادے لہجے میں کہا۔

"مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے!"

"کیوں؟"

(باقی صفحہ ۲۸، پر دیکھئے)



سجاد مرزا

گردابِ یاس

مرے وجود کے مرکز کی خود فراموشی
تلاشِ ذات کا مفہوم ڈھونڈنے نکلے
وہ عہد جس پہ زمانوں کی گرد جم جائے
شبِ سیاہ میں تاروں کو چومنے نکلے

وہ چاند جو کہ کھجوروں کے جھنڈ سے نکلا
سسک سسک کے سر ریگزار کھو جائے
نہیں ہے تابشِ نظارۂ جمال جہاں
کسی فریب کے پردے میں آنکھ سو جائے!

گذرتی صدیوں کے قدموں کی آہٹیں گم ہیں
کسی دریچے میں یادوں کی روشنی بھی نہیں!
عجیب دھند میں لپٹا ہوا ہے ہر ذرہ
سر خیال سفر آج چاندنی بھی نہیں

گذشتہ عہد، محبت کا عہد تھا گویا
گذشتہ عہد میں انسان کس قدر خوش تھا
گذرتے عہد پہ ہم لوگ طنز کرتے ہیں
کسے خبر کہ کوئی صاحبِ ہنر خوش تھا؟

گذشتہ عہد کے انساں میں خود شناسی تھی
شعورِ ذات کی اب منزلوں سے بیگانہ
کہاں تلاش کرے منضبط معانی کو
وفورِ یاس کے گرداب میں ہے دیوانہ!

●2-Gobind Garh, Gujranwala, 52250 (Pak)



امتیاز ساغر

وصل کی ایک شام

دھوپ جب شام کی خوشبو میں نہا کر نکلی
قریۂ جاں کے کئی رنگ دھنک رنگ ہوئے
ایک مہتاب بدن دل کے سیہ خانوں میں
شمعِ وصل جلانے کے لئے در آیا

شہر کے شور میں اک گوشۂ تنہائی میں
وہی مہتاب بدن اور مری آنکھ کی لو
ایک دوجے کی اندھیروں میں کرن بنتے رہے
شہرِ امروز میں امکان کے در کھلتے رہے
شام خوش رنگ ہوئی انجمن آرائی میں

اب کسی وصل کی خوشبو مرے دامن میں نہیں
ساعتِ دید گزر بھی گئی کب کی لیکن
اس کے انفاس کے خوشبو سے مہکتا ہے بدن
تیرہ بختی میں ستاروں سا دمکتا ہے بدن
رات ڈھلتی ہے تو یادوں کے حسیں بستر پہ
جشنِ تنہائی مناتا ہے دہکتا ہے بدن

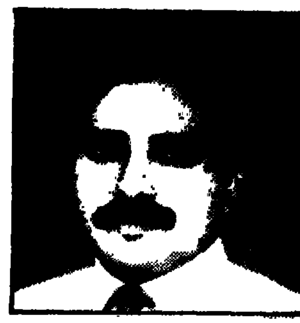
●7-165/C, Model Colony Karachi (Pak)

سید منصور احمد خالد

ترے جلال وجمال کے لازوال در پر

وہی شمالی قطب کا موسم
وہی ہے اک بحرِ بیکراں بھی
کہ جس میں ہر سو گلیشیر ہی گلیشیر ہیں
سکوتِ شب زاد کے مسافر ہیں
بے بصر ہیں
ترے جلال و جمال کے لازوال در پر
خمیدہ سر ہیں
ندا سے کل ہیں دل دعا ہائے نیم شب ہیں
پکارتے ہیں
کہ اپنی رحمت سے ہم کو وہ شعلہ نوا دے
کہ جس کی ہر ہر لپک ہزار آفتاب ڈھالے
کہ ہم کو اس کوہ زمہریر بلند و بالا کو کاٹنا ہے

●Urdu Department, Govt, Islamia College, Gujranwala (Pak)



تنویر قاضی

ایک فقط جب تیر کمان میں رہ جاتا ہے
بچ رہنا جھوٹے امکان میں رہ جاتا ہے

پھر ایسا ہوتا ہے دائرے بنتے بنتے
وہ آور اِک آسیب مکان میں رہ جاتا ہے

پور کا سوچا ہوا کبھی اِک نیک سفر بھی
دھندلے رستے کی پہچان میں رہ جاتا ہے

وہ اجلے پاؤں والی حیران سی لڑکی
ایک ہی چہرہ میرے دھیان میں رہ جاتا ہے

روز مکینوں کا تنویر اِک خواب ادھورا
موسم کی نیلی مُسکان میں رہ جاتا ہے

●H.No.2275, 2-Muslim Town, Rahwali, Gujranwalla, Cantt (Pakistan)

طارق نعیم

قفس سے خود ہی پرندہ رہا کیا میں نے
پھر اس کے بعد یہ سوچا کہ کیا کیا میں نے

وہ اور بھی کسی چشم کماں کی زد پر تھا
کچھ اس لئے بھی نشانہ خطا کیا میں نے

کئی جہان نظر آئے حیرتوں کے مجھے
خود اپنی سمت دریچہ جو وا کیا میں نے

جو درد تو نے دیا تیرے اختیار میں تھا
وہ ضبط جو مرے بس میں نہ تھا کیا میں نے

وہ آنکھیں مانگنے آیا تو میری آنکھ کھلی
اُسے خراج میں کیا کیا ادا کیا میں نے

وہی ہوا کہ جو طارق نعیم ہونا تھا
تمام عمر ہی ردِ بلا کیا میں نے

●'Weekly Muslim' 2-e, Zareen Chambers, Abb- Para, Islamabad(Pak)



محمد مختار علی

سخن میں رنگِ جنوں، آہ میں اثر بھی ہے
تری عطا ہے مرے پاس جو ہنر بھی ہے

ہے اُس سے آنکھ ملانا بھی ایک کارِ عذاب
وہ خوش جمال قیامت کا خوش نظر بھی ہے

رواں دواں ہیں سب ان دیکھی منزلوں کی طرف!
اگرچہ دل میں کئی واہمے ہیں، ڈر بھی ہے!

کسی کی آخری ہچکی ذرا بغور سنو
یہ سرگزشت مفصل بھی، مختصر بھی ہے

سلگ رہی ہے بدن میں جنوں کی چنگاری!
دلِ خراب تجھے اس کی کچھ خبر بھی ہے

اب اس کی چھاؤں بھی دیتی نہیں کسی کو سکوں
وہ ایک نخلِ محبت جو بے ثمر بھی ہے

ہوس کے زہر سے مفلوج ہو گئے ہیں دماغ!
کہ اب اُداس بہت بزمِ اہلِ زر بھی ہے

ہر ایک دن کے مقدر میں رات ہے مختار
ہر ایک رات کے پہلو میں ایک سحر بھی ہے

●Editor 'Kaleem' Hasan Parwana Road, Multan (Pak)



شمع خالد

133,Street No.3, Racepurse Rd, raxalpindi

تھرو پراپر چینل

Trough proper Chanel

رات آہستہ آہستہ بھیگتی جا رہی تھی۔ گھر بھر کی فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ بظاہر تمام افراد خانہ موجود تھے۔ بس ملک جی گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھے۔ ان کا لمبا چوڑا جسم چارپائی پر دھرا تھا۔ کہکشاں باپ کی چارپائی کے پاس بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے پاپا بالکل میرے جیسے ہی تھے۔ جیتے جاگتے زندگی سے بھرے بھرے۔ پھر یہ ایک دم سے سب کچھ ہو گیا۔ موت کسی خودرو پودے کی طرح ہری بھری زمین کو سیم و تھور بن کر بنجر کر دیتی ہے۔ جسم و جان کا ناطہ ایک شخص کا ٹوٹتا ہے اور گھر بھر خاندان، دوست اپنے پیارے سب دکھ کی منجدھار میں ہچکولے کھانے لگتے ہیں۔ گھر بھر کی بساط الٹ جاتی ہے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے سے سرک جاتی ہے۔ وہ چیزیں جنہیں دیکھتے دیکھتے نظریں یہ بھول جاتی ہیں کہ یہ چیز یہاں فکس نہیں تھی۔ بس گھر والے اس چیز کو وہاں رکھ کر یا تو بھول چکے ہوتے ہیں اور یا یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ چیز تو بنی ہی اس جگہ کیلئے تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہر شخص اپنے اپنے مقام پر یوں قابض ہوتا ہے کہ تو بنا ہی اس مقام اور جگہ کے لئے ہے۔ لیکن موت کا ایک تھپڑ اسے تنکے کی مانند ہی اڑا دیتا ہے۔ کہکشاں یہ سب سوچتے ہوئے اپنے ان رشتہ داروں کو دیکھ رہی تھی۔ جنہیں پاپا کی زندگی میں ان صوفوں پر بیٹھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی تھی۔ اور پاپا کی پل بھر پہلے بند ہوتی آنکھوں کو محسوس کرتے ہر شخص یوں گھر میں گھوم رہا ہے جیسے یہ سب وراثت میں انہیں مل گیا ہو۔ بوا جی یوں حکم چلا رہی تھیں۔ جیسے گھر کا ایک ایک ڈیکوریشن پیس اسی نے رکھوایا تھا اور اب وہ ہی اٹھوا رہی ہے۔ کہکشاں اور اس کی امی مہمان بنی دہشت زدہ سی سب کو تک رہی تھیں۔ برسوں کے جمے بھاری بھاری صوفے اور پلنگ اٹھانے کے لئے عورتیں مردانے سے لڑکوں کو بلوا رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کام خاموشی سے ہو رہے تھے۔ آنکھیں حکم چلا رہی تھیں اور ہاتھ محکوم بنے بھاری بھاری سامان کو صحن میں دھر رہے تھے۔ کہکشاں نے ایک لمحہ کے لئے چاہا اور یقین کر لیا کہ وہ اس سین کا حصہ نہیں یا تو وہ فلم دیکھ رہی ہے یا وہ مر چکی ہے۔ اور اس کی روح یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ یہ وہم اسے صرف چند لمحوں کے لئے آیا تھا۔ لیکن وہ اس وہم کو حقیقت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ باپ کی اچانک موت کو نہ دل تسلیم کر رہا تھا اور نہ ہی دماغ۔ اچانک اس کی نظر باپ پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ سانس لے رہا ہے۔ اس نے جلدی سے بھائی کو بلوایا اور اسے اشارے سے بتایا۔ بھائی نے جلدی سے باپ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کرنی چاہی۔ پر وہاں تو گہرا مہیب سناٹا تھا۔ صرف موت کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ ان دونوں کو یوں سرگوشی کرتے بوا جی نے جیسے دیکھ لیا ہو۔ انہیں سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگیں۔ تم دونوں جو مرضی سوچو، یا محسوس کرو۔ جانے والا اب واپس نہیں آ سکتا۔ وہ یہ دنیا چھوڑ کر جا چکا ہے۔ کہکشاں نے باورچی خانے میں پڑے برتنوں کو دیکھا۔ باپ کی جھوٹی پیالی اور گلاس وہیں پڑا تھا۔ وہ سوچنے لگی زندگی کتنی بے اعتبار چیز ہے۔ پاپا کی جھوٹی چائے ابھی تک کپ میں موجود ہے ان کے ہونٹوں اور زبان کو چھو کے واپس آئے گھونٹ وہیں پڑے ہیں۔ پر انہیں پینے والے ہونٹ ـــ وہ ابھی یہ ہی سوچ رہی تھی کہ بوا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ گھر میں اس وقت کتنے پیسے ہوں گے۔ کہکشاں نے حیرت سے سوچا، بوا یہ کیوں پوچھ رہی ہے؟ پاپا کو ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت تو نہیں۔ پھر یہ ـــ یہ سوچتے ہوئے اس نے بتایا کہ میرے پاس ۳ ہزار روپے ہیں بوا کہنے لگی کوئی بات نہیں۔ صبح صبح بنک سے نکلوا لینا۔ کہکشاں سوچنے لگی میرے اکاؤنٹ میں پانچ سو روپے ہیں۔ امی کے اکاؤنٹ میں ایک ہزار بھیا کے تین سو۔ پر پاپا نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ ان کے اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہیں۔

امی جو سر جھکائے آنسوؤں کے دیئے جلا رہی تھیں۔ ایک دم گھبرا اٹھیں۔ بوا کی آواز انہوں نے بھی سن لی تھی۔ کہکشاں نے جو یوں ماں کو پریشان دیکھا تو ماں کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ماں! جس نے یہ مصیبت بھجوائی ہے وہ مدد بھی کرے گا۔ بوا جلدی سے بولیں ہاں بھابھی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے بھائی جو پہنچ گئے ہیں۔ یہ فرض تو ان کا ہے اور کہکشاں دل ہی دل میں کہنے لگی۔ تو پھوپھو جاتے بھائی کو بھی بھائی کے میکے والوں سے کیش کروانا چاہتی ہے۔ زندگی بھر بہن ہونے کا تاوان وصول کرتی رہیں اور آج ـــ

اتنے میں پاپا کے دفتر کے ایک ساتھی نے اخبارات کو فون کرنا شروع کر دیا۔ سناٹے میں اس کی آوازیں یوں گونج رہی تھی جیسے لاؤڈ اسپیکر چل رہا ہو۔ جی ہاں! میں تصاویر بھجوا رہا ہوں۔ ذرا اچھی جگہ یہ خبر لگا دیجئے گا۔

صبح اذان کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے اخبار اٹھا کر سامنے پھیلا دیا۔ چند گھنٹوں میں پاپا کی تصویر سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔ وہ حیرت سے تصویر دیکھ رہی تھی۔ اور سامنے کارنس پر لگی تصویر دیکھ رہی تھی جس میں ابو گولڈ میڈل کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ اور اس تصویر کو چھپوانے کے لئے وہ ہر اخبار کے دفتر گئے تھے۔ آج یہ تصویر بغیر سفارش کے چھپ چکی تھی۔ وہ ابھی تصویر سامنے رکھے دیکھ ہی رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگ گئی۔ لوگ خبر پڑھنے کے باوجود مزید

کنفرم کرنا چاہتے تھے۔ ہر گھنٹی پر کبھی بوا اور کبھی کوئی اور تفصیل سے ایک ایک جزئیات کے ساتھ سانحہ سنا رہے تھے۔ اور پھر ایک آواز نے زور دار نعرہ لگایا، صدر مملکت تعزیت کے لئے آنا چاہ رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سادہ اور یونیفارم والوں نے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ اسپیشل پولیس والوں نے خاموشی سے ایک آلہ نکال کر غیر محسوس انداز میں لوگوں کو چیک کرنا شروع کر دیا کہ کہیں کوئی اسلحہ۔۔۔۔

گانگ بجاتی گاڑیوں، کیمرے، فلیش لائٹیں اور شور نے، گھر سے چند لمحوں کے لئے ماتم کی چادر چھین لی۔ وہ گھر جہاں سے ہلکے ہلکے بین اور بھاری بھاری آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے۔ وہاں چند لمحوں کیلئے روشنیوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ صدر مملکت اس کی ماں سے تعزیت کر رہے تھے۔ پھر جب انہوں نے کہکشاں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ سسک پڑی۔ اور وہ کہنے لگی میرے پاپا بہت ایماندار تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اتنے بڑے عہدے کے باوجود کچھ نہیں بنایا۔ ہمارے پاس رہنے کیلئے چھت تک نہیں۔ برائے مہربانی ہمیں رہنے کے لئے چھت اور بھائی کے لئے نوکری کا بندوبست کر دیجئے۔ صدر صاحب نے اسی وقت اپنے اے ڈی سی کو لکھوایا کہ بیوی کو ایک لاکھ روپیہ اور پلاٹ دیا جائے اور ان کے بیٹے کی نوکری کا بندوبست کیا جائے۔ دوسرے دن تمام اخباروں میں یہ خبر شاہ سرخی کے ساتھ چھپی۔

افسوس کرنے کے لئے آنے والے مرحوم کا ذکر کم اور صدر کا ذکر زیادہ کرتے۔ جن عزیزوں نے میت کے قریب صدر کے ساتھ تصاویر بنوائی تھیں۔ وہ ان فوٹو گرافروں کے اخباروں کے نام اور نمبر پوچھ رہے تھے کہ اپنی تصاویر منگوا سکیں۔

صدر صاحب کی موجوگی میں پاپا کے دفتر والوں نے اعلان کیا تھا کہ "قل" کے ختم کا کھانا ان کی طرف سے آئے گا۔ مولوی صاحبان جوں جوں قرآن پاک کی تلاوت تیزی سے کرتے جا رہے تھے۔ کہکشاں اور ماں اتنا ہی گھبرا گھبرا کر چنوں پر قل پڑھ رہی تھیں۔ آخر ماں نے کہکشاں سے اشارے میں کہا کہ دفتر فون کر کے پتہ کرو۔ کہ کھانا ابھی تک کیوں نہیں پہنچا۔ فون کے بعد کہکشاں گھبرائی ہوئی ماں کے پاس آئی اور کان میں کہنے لگی، ماں! دفتر میں تو کسی کو پتہ ہی نہیں۔ اب کیا ہوگا۔ ماں نے دہل کر سوچا۔ بوا نے بھی کان میں کہا کہ رضوان سے کہو بڑی امام جا کر پکی پکائی دیگیں لے آئے۔ چند رشتہ دار خواتین نے محلے کے لڑکوں کو بھجوا کر پھل منگوائے اور جلدی جلدی چھیل کر مولوی اور ان کے ساتھ قرآن پڑھنے والے بچوں میں بانٹنا شروع کیا۔ گاڑی رکنے کی آوازیں اور پلاؤ زردے کی خوشبو اکٹھے ہی گھر کے اندر آئی۔ تو کہکشاں اور ماں نے شکر ادا کیا۔

چالیس دن تک افسوس کرنے والے وزیروں، ایم این اے اور ایم پی اے کا رش رہا۔ پاپا کے ذاتی دوستوں میں سے کچھ جاتے ہوئے کبھی کبھار کہکشاں یا بھائی کے ہاتھ میں ہزار دو ہزار رکھ جاتے تو دونوں شکر کرتے کہ اگلے ختم کا بندوبست ہو گیا ہے۔

چالیس دن تک صدر کے اعلان کا چرچا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر گفتگو ہونا بھی بند ہو گئی۔ چالیسویں کے ختم کے بعد ابو کے سامان کی تلاشی لی گئی اور کچھ پرائز بانڈ، کچھ شیئرز کے فارم ملے۔ لیکن یہ سب چند ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔ ایک دن وہ چیک بک لے کر بھائی کے ساتھ بینک گئی۔ بینک منیجر نے چائے پلانے کے بعد ان سے کہا کہ وہ اسٹامپ پیپر پر تمام وارثوں کے دستخط کروا کر لائیں اور ساتھ ہی ابو کے دفتر کے لوگوں میں سے کم از کم دو لوگوں کے نام، دستخط اور مہر لگوا کر لائیں کہ وہ انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ محلے کا کونسلر لکھ دے کہ وہ ان لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اور ان کے علاوہ کوئی اور حقدار نہیں۔

دیکھنے میں یہ معاملہ جتنا سیدھا نظر آتا تھا۔ بعد میں اتنا ہی مشکل ہوتا گیا کبھی اسٹامپ کا کاغذ غلط لکھا جاتا کبھی دفتر کا ایک کولہ ملتا تو کبھی دوسرا۔ کبھی بڑی باجی جو بیرون ملک میں تھی۔ پاپا کے مرنے پر بھی نہ آسکی تھی اس کے دستخط نہ ہونے پر فارم واپس آ جاتا۔ اور کبھی چھوٹی بہن کے شناختی کارڈ کا نمبر نہ ملتا۔ بنک کے مسلسل چکر کاٹ کاٹ کر وہ تھک کے بیٹھ گئے۔ آخر پاپا کے ایک پرانے دوست انہیں بنک کے صدر کے پاس لے کر گئے۔ بنک کے صدر کو جب پتہ چلا کہ افسوس کے لئے صدر مملکت بھی ان کے گھر آ چکے ہیں تو اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا جب اکاؤنٹ سے پیسے آئے تو وہ کل ۸ ہزار تھے۔ پاپا کی ایک مہینے کی تنخواہ، جسے پانے کیلئے وہ دو ہزار کا پٹرول اور تین چار سو کے فون اور سو روپے کے اسٹامپ پیپر ضائع کر چکی تھی۔

ہر صبح انہیں یقین ہوتا کہ صدر کا بھجوایا ہرکارہ ایک لاکھ کا چیک اور پلاٹ کی رجسٹری لے کر آ رہا ہوگا۔ لیکن دن مہینے گذرتے چلے گئے۔ مجبور ہو کر کہکشاں نے ایک درخواست داغ دی۔ درخواست کی رجسٹری کی رسید کے ملتے ہی وہ امید کے نئے دیپ جلا بیٹھی۔ گذرتے دنوں کی گرد نے اس دیپ کو بھی بجھا دیا۔ ایک دن اسے پتہ چلا کہ صدر محترم اس کے کالج، ڈگری دینے آ رہے ہیں تو وہ نئے عزم اور حوصلے سے کالج جا پہنچی۔ کالج کی انتظامیہ اور سیکورٹی والے اسے ہر دفعہ آگے بڑھنے سے روک لیتے تو وہ چند لمحوں کے لئے مایوس ہو جاتی۔ لیکن پھر نئے جذبے سے آگے بڑھتی۔ اسی تگ و دو میں صدر کی نظر اس پر پڑی انہوں نے سیکورٹی والوں کو اشارہ کیا کہ اسے ان تک پہنچنے دیا جائے۔ وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچی تو ایک دفعہ پھر فلیش لائٹس میں نہا گئی۔ کانپتے ہوئے اس نے صدر صاحب کو ان کا وعدہ یاد کروایا۔ اور ملاقات کا وقت مانگا۔ صدر صاحب نے اے ڈی سی کو اشارہ کیا۔ اے۔ ڈی۔ سی نے اس کا نام اور نمبر لکھ لیا۔ اس ملاقات نے اسے ڈوبنے سے بچانے کے لئے تنکے کا کام کیا تھا۔ اب وہ پھر فون کھنکھنانے لگی۔ آخر اے ڈی سی نے اسے بتایا کہ وہ فلاں دن ملنے کیلئے آسکتی ہے۔ وہ صبح ہی بھائی کو ساتھ لے کر ملاقات کے لئے جا پہنچی۔ ریسپشن میں بیٹھے افسر نے اسے مہمانوں کے کمرے میں بٹھا کر جب بیرے کو چائے کا اشارہ کیا تو اسے اپنا آپ بے حد اہم لگا۔ چاندی کے برتنوں میں سجے پھل اور خوبصورت نازک سے کپ میں چائے۔ ایر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈی ہوا۔ پھولوں والا خوبصورت قالین اور دیوار پر لگی حسین تصویریں۔ وہ ایک ایک ڈیکوریشن پیس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اور وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دو گھنٹے بعد اے ڈی سی نے جب معذرت چاہی کہ صدر صاحب کو ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا ہے تو وہ پھٹ پڑی۔ اور غصے میں جو منہ میں آتا گیا، کہتی گئی۔ رضوان کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ سوچنے لگا آج کہکشاں آپا نے مروا دیا۔ بھلا کوئی بڑے افسروں سے اس لہجے میں بھی بات کرتا ہے۔ وہ افسر سر جھکائے ساری بات سنتا رہا۔ اور پھر

باقی صفحہ ۴۰ پر دیکھئے



یاور امان

تروینیاں

یہ تو اک طے شدہ حقیقت ہے
جھوٹ کے پاؤں ہی نہیں ہوتے
دیکھ لو پڑھ کے شام کا اخبار

مانگنے والے بہت کم ہیں خدا کے نام پر
ہوگئی رسم فقیری اب ترقی یافتہ
بن گیا ہے اسلحہ کشکول دریوزہ گری

دودھ میں پانی ملا کر دودھ کی
آبرو کم ہو تو ہے بے جا سلوک
اس طرح پانی کی قیمت تو بڑھی

یہ جو رکھا ہے دوش پر سب کے
ہے تو سر ہی، مگر ہے خم آلود
کیوں اٹھا کر اسے نہیں چلتے

آپ ہیں دیوارِ گریہ کی طرح
ہم مثالِ چین کی دیوار ہیں
فرق دونوں کا سمجھتے کیوں نہیں

●C-5, 3rd, Floor, Rashed sqr.
Block 'M' Nazimabad,
Karachi-74700 (pak)

نثار ترابی

ماہیے

غم خوار ہے بہنوں کا
گھوڑی پہ جو بیٹھا ہے
سنسار ہے بہنوں کا

جینے کا ارادہ ہے
مہکے ہوئے آنچل میں
ساجن ترا وعدہ ہے

منہ موڑ کے کیا لوگے
ہم کانچ کھلونوں کو
تم توڑ کے کیا لوگے

صد رشک بہاراں ہیں
یہ کس نے کہا تم سے
تم ایسے ہزاراں ہیں

الجھے ہوئے دھاگے ہیں
جس یاد میں سوئے تھے
اس یاد میں جاگے ہیں

شہتوت کے سائے تھے
پریوں نے ترے نغمے
لہرا کے سنائے تھے

برسات ہی کتنی ہے
اس دور میں اشکوں کی
اوقات ہی کتنی ہے

●N-5,Morgah,
Rawalpindi (Pak)

محمد اقبال نجمی

سوال

اس زمیں پر
روشنی کے سب صحیفے آچکے ہیں
روشنی کو چھوڑ کر پھر
اس زمیں کے رہنے والے
جانے حبس تیرگی میں
کس لیے اب بڑھ رہے ہیں؟

اس زمیں پر
خوشبوؤں نے اپنے دامن وا کیے ہیں
خوشبوؤں کو چھوڑ کر پھر
اس زمیں کے رہنے والے
بے حسی کے پتھروں پر
کس لیے اب چل رہے ہیں؟

اس زمیں پر
پیار کی سب بارشیں بھی ہو رہی ہیں
پیار امرت چھوڑ کر پھر
اس زمیں کے رہنے والے
نفرتوں کے زہر کو یوں
کس لیے اب پی رہے ہیں؟

●108-B, Satelite Town,



اختر ہوشیار پوری

تھا وہ بھی بات کا پکا ہنروروں کی طرح — خموش رہ نہ سکا میں بھی شاعروں کی طرح
کسی سے آئینے کب جھوٹ بولتے ہیں کہ یہ — صداقتوں کے امیں ہیں پیمبروں کی طرح
ہوائے جاں نے ٹھہرنے دیا ہمیں نہ کہیں — نگر نگر میں رہے ہیں مسافروں کی طرح
بدن دریدوں کے ہر زخم کے لب و رخ سے — طلوعِ حرف ہوا ہے سخنوروں کی طرح
گھٹا کے بعد بھی رستی رہیں چھتیں اختر — مرے دیار کی اُجڑی حویلیوں کی طرح

O/548, Kartarpura, Rawalpindi 46000 (Pak)



شاہدہ حسن

طلب جو حد سے بڑھی خواب ہوگئی میں بھی — پھر آئینے ہی میں نایاب ہوگئی میں بھی
وہ نخلِ سبز تھا بادِ سموم سے تھا ہلاک — میں آبجو تھی، تو زہراب ہوگئی میں بھی
کھلا نہ بھید کہ اس تشنگی میں کیا کچھ تھا — بس ایک بوند سے سیراب ہوگئی میں بھی
عجیب ہوتا ہے خاموش زندگی کا عذاب — چلی ہوائیں تو بے تاب ہوگئی میں بھی
کبھی ٹھہر کے جو اس موج نے پکارا نہیں — تو اپنی لہر میں پایاب ہوگئی میں بھی

J- 308, Rufi Lake Drive, Block- 18,Gulshan-e-Iqbal Karachi (Pak)



احمد رئیس

زمیں بدلنی پڑی، آسماں بدلنا پڑا — تمہارے بعد تو سارا جہاں بدلنا پڑا
ہوا چلی تو اڑا لے گئی سبھی تنکے — شجر گرا تو ہمیں بھی مکاں بدلنا پڑا
کہاں سے آئے ہیں چل کر کے آج دیوانے — کہ ہر قدم پہ ثبوتِ زیاں بدلنا پڑا
ابھی تو اور بھی آئیں گے سخت تر لمحے — ابھی سے کیوں تمہیں اپنا بیاں بدلنا پڑا
ابھی سے شہر میں اڑتی ہے خاک کیوں گھر گھر — ابھی سے کیوں ہمیں سوزِ فغاں بدلنا پڑا

3-D- 28/ 45, Nazimabad, Karachi (Pak)



منصورہ احمد

فراق آثار لمحوں کی دہائی کون دے گا — ترے چہرے کے سورج میں دکھائی کون دے گا
مجھے اک بات کہنی ہے اسے کتنے یگوں سے — مگر صحرا کی وسعت میں سنائی کون دے گا
جو اک بے کل سی خوشبو میرے اندر پھولتی ہے — اسے اس کے دریچے تک رسائی کون دے گا
کسی کی قید سے چھٹنا تو خیر اک مسئلہ ہے — مجھے میرے ہی زنداں سے رہائی کون دے گا
میں سلطاں کے درِ دولت پہ اک دستک تو دے لوں — مگر اس ہاتھ کو ذوقِ گدائی کون دے گا

45-A, Mozang Road, Lahore (Pak)



شفیق آصف

پہلے راہِ طلب میں تم تقدیم تو کر لو — یعنی دل کی باتوں کو تسلیم تو کر لو
اجلی اجلی تعبیروں کی خواہش بہتر — پہلے اپنے خوابوں کو تجسیم تو کر لو
مانا ہر اک شے کو بانٹا جاسکتا ہے — خون اگر ہوسکتا ہے تقسیم، تو کر لو
سب تنظیمیں اور تحریکیں ہوجائیں گی — انسانوں کی حرمت کی تعظیم تو کر لو
درد کے رستے چلتے رہنا ممکن تو ہے — پہلے اپنے جذبوں کی تنظیم تو کر لو

Life Medicose, Ansar Colony, Makhdoom Rashid Road, Multan (Pak)

گلزار جاوید
537/d-1, Westridge III,
Allahabad, Rawalpindi (pak)

گھوڑا چنا اور انسان

چپراسی نے شری مان اوما شنکر کی صدا لگائی تو وہ جھٹ سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کپڑوں کی شکنیں بستر کی چادر کی طرح ہاتھ سے درست کرنے لگا۔ اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ اوما شنکر کی آواز پر دائیں سے تیسرا نوجوان بھی اندر جانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ صورت حال کو بھانپ کر چپراسی نے جملہ اس طرح دوہرا لیا۔ "آپ میں سے اوما شنکر پنڈت کون ہے۔" لفظ پنڈت پر ارد گرد نظر دوڑائی تو دائیں ہاتھ سے تیسرا نوجوان خوشی سے کھل اٹھا۔ سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ نام تو میرا بھی اوما شنکر ہے۔ پنڈت نہیں ہوں میں تو اوما شنکر تیاگی ہوں کتنے ملتے ہیں ہم دونوں کے نام۔ کیا اس بار بھی میرے مقدر میں ناکامی لکھی ہے کہیں ایسا تو نہیں۔ انٹرویو میں کامیاب میں ہو جاؤں اور دفتر والے غلطی سے نوکری اسے دے دیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس وقت میری جگہ اسے اندر بلایا گیا ہے۔ شکل سے تو بوڑم لگتا تھا۔ عقل سے پتہ نہیں کیسا ہے۔ بھگوان کرے کسی طرح یہ انٹرویو میں فیل ہو جائے۔ اور اپنی باری پر ٹھیک ٹھیک جواب دے کر میں پاس ہو جاؤں۔ بھگوان ایسا کیوں کریں گے۔ میرے اکیلے کے لئے تھوڑی ہیں بھگوان، اس کے نام کے آگے تو پنڈت بھی لگتا ہے۔ مجھ سے زیادہ تو بھگوان اس پر دیا کریں گے۔ اگر آج بھی پنڈت ہونے کے ناطے بھگوان نے اس کا ساتھ دیا تو عرصہ پانچ سال سے میں جو ایم اے فرسٹ کلاس دھکے کھا رہا ہوں۔ کیا آج بھی ناکام و نامراد لوٹوں گا کیا منہ دکھاؤں گا گھر والوں کو گھر کا خیال آتے ہی اس کے صحت مند جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اف بھگوان تو اتنا کٹھور بھی ہو سکتا ہے۔ نہ میرے پتا حادثے میں اپنی ٹانگوں سے محروم ہوتے اور نہ انہیں مل کی نوکری سے جواب ملتا۔ کتنا سکھی تھا ہمارا پریوار، پتاجی کے معذور ہونے سے پہلے سات سو روپیہ تنخواہ میں اس کی ماتاجی اس چلن سے گھر چلاتیں کہ رئیسوں کا گمان ہوتا تھا ان کے گھر پر اس کے پتا جوڑو انسان نہ تھے۔ ماتاجی سے یہی کہتے ہمارے کون سے دس بیس بچے ہیں، دو ہی تو ہیں بھگوان کی کرپا سے دونوں ہی لڑکے ہیں ان کو اچھا کھلاؤ اچھا پڑھاؤ اچھی شکشا سے بڑی دنیا میں کوئی دولت نہیں۔ ہاں جی بھگوان نہ کرے ان کی جگہ ایک بھی لڑکی ہوتی تو ہم جیتے جی مر جاتے۔ لڑکے والوں کے منہ کتنے پھٹ گئے ہیں۔ آج کل بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بھی بیٹی کا باپ ہونے سے ڈرتے ہیں۔ آج ماتاجی اس کے پتا کی بات کی تائید کرتیں کہاں تو لڑکی نہ ہونے پر اس کے ماتا پتا بھگوان کی دیا کے گن گاتے اور کہاں آج دو دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کی رسوئی میں تین میں سے ایک وقت مشکل سے چولہا جلتا۔ دو ڈھائی ہزار مل سے ملے تھے اور ڈیڑھ ہزار کی یونین نے مدد کی تھی۔ کب تک چلتی چار ہزار کی رقم، ماتاجی نے اس کے پتا سے کئی بار آگیا چاہی کام کرنے کی انہوں نے ہر بار انکار میں جواب دیا۔ اری کیوں چنتا کرتی ہے۔ کاکے کی ماں پرمیشور نے چاہا تو جلد ہی برے دن ختم ہو جائیں گے، وہ بڑا دیالو ہے۔ ہمارے بیٹے نے ایم اے کیا ہے فرسٹ کلاس میں، جلد ہی بڑا افسر لگ جائے گا۔ ہاں ماں! پتاجی ٹھیک کہتے ہیں۔ جلد ہی بڑا افسر بن جاؤں گا میں اور خوب سیوا کروں گا آپ کی اور پتاجی کی۔ پانچ سال کم تو نہیں ہوتے۔ بڑا افسر چھوٹا افسر بڑا بابو چھوٹا بابو بنتے بنتے اب تو چپراسی بننے پر تیار تھا۔ وہ جوان تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ حالات کو سمجھتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی روی شنکر تو بچہ ہے۔ آٹھویں میں پڑھتا ہے۔ وہ کیا جانے سنسار کے گورکھ دھندے کو۔ اس کے ماتا پتا عمر کے اس حصے میں ہیں۔ جہاں علاج کے ساتھ اچھی خوراک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خوراک کے نام پر اسے یاد آیا عرصہ تین سال سے دال ہی ان کی خوراک تھی۔ اور دالوں میں صرف چنے کی دال پکتی تھی۔ ان کے گھر میں اس کے ماتا پتا اور روی شنکر مل کر پرانی ردی سے لفافے بناتے، وہ خود نوکری کی تلاش کے بعد دونوں ہاتھوں میں کپڑے کے پرانے تھیلے لٹکا کر لفافے بیچنے نکل جاتا۔ اکثر اتنے ہی لفافے بنتے جن سے ردی خریدنے کے بعد تھوڑی سی دال اور کچھ کنکی خریدی جا سکتی۔ کبھی اتفاق سے ایک ڈیڑھ روپیہ زیادہ آ جاتا تو اس کی ماتاجی میلوں پیدل چل کر شہر سے باہر سبزی منڈی جاتیں اور وہاں سے سستی مندی سبزی خرید لاتیں جس دن ان کے گھر دال کے علاوہ کچھ اور پکتا وہ دن ان کے لئے کسی تہوار سے کم نہیں ہوتا۔ کیا ان کا دل اچھی خوراک کھانے کو نہ چاہتا تھا۔ کیا پڑوس کے گھر سے چکن کی خوشبو ان کے معدہ میں کھلبلی نہ مچاتی۔ موسم کے پھل دیکھ کر ان کے منہ سے لعاب خارج نہ ہوتا۔ سب کچھ ہوتا مگر ان کی انا مر جاتی۔ ان کی انا ابھی زندہ تھی۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کا عہد انہیں زندگی سے لڑنے پر اکساتا رہا۔ روزانہ دال وہ بھی چنے کی صرف اس لئے ان کی غذا تھی کہ لفافے بیچ کر جتنی آمدنی ہوتی اس سے پھل سبزی چکن تو کیا چنے کی دال کے علاوہ کوئی دوسری دال بھی نہ خریدی جا سکتی تھی۔

اے شریمان کہاں کھو گئے۔ اس وقت تو اتنے بے چین تھے دوسرے کے نام پر اندر جانے کو تیار تھے۔ اور کہاں اب میں تین بار آپ کا نام پکار چکا ہوں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی یا رات کو سنیما چلے گئے تھے۔ آجکل کے نوجوان بھی خوب ہیں۔ گھر میں چولہا نہ جلے پر سنیما کا ناغہ نہ ہونے پائے۔ انٹرویو کے منتظر دیگر نوجوان چپراسی کی بات پر کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ اسے بھی اپنی بے دھیانی پر بڑا غصہ آیا

۔ہاتھوں سے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ انٹرویو کے لئے سب سے پہلے تو اس بار پر اس کی گوشمالی ہوئی کہ وہ دیر سے اندر آیا ہے۔ انٹرویو میں اتنا سست ہے تو نوکری میں وقت پر کیسے پہنچے گا۔ صفائی میں اپنی مجبوری پیش کرنا چاہی جس کی انٹرویو لینے والوں نے اتنی پروانہ کی، الٹا پابندی وقت پر ایک لیکچر دے ڈالا، انٹرویو شروع بھی ہوا اور ختم بھی۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، ہمیشہ کی طرح آج بھی ناکامی اس کا مقدر ٹھہری عذر تجربہ نہ ہونا۔ اس نے احتجاج کیا۔ نوکری کے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے تجربہ۔ کسی نہ کسی کو تو رسک لینا پڑے گا۔ جہاں تک تجربے کی بات ہے تو پانچ سال کا تجربہ ہے۔ میرے پاس دھکے کھانے کا۔ پانچ سالوں میں جتنے رنگ برنگے لوگوں سے مل کران کے جتنے روپ میں نے دیکھے ہیں اتنے تو ان مہذب لوگوں نے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ جو انٹرویو کے بہانے ان داتا بنے بیٹھے ہیں اس کے۔ دیوار سے سر ٹکرانے کا کیا فائدہ۔ ناکامی کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے وہ گھر کی طرف بوجھل قدموں سے چل دیا۔

دال۔ دال۔ چنے کی دال میں نہیں کھاؤں گا چنے کی دال، بھلے ہی بھوک سے مر کیوں نہ جاؤں۔ موت منظور ہے چنے کی دال نہیں۔ روی شنکر ماتا پتا سے لڑ رہا تھا۔ تیرا کیا خیال ہے ہم مجبوری میں پکاتے ہیں چنے کی دال۔ پتا کی آواز دروازے کے باہر کھڑے اوما شنکر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ارے پگلے بڑی گنی دال ہے یہ، اس کو کھانے سے منش بلوان ہوتا ہے، اتنا بلوان جتنا کہ گھوڑا۔ تم نے دیکھا نہیں۔ کنہیا لال اپنے گھوڑے کو چارے کے ساتھ دانا ضرور کھلاتا ہے۔ کتنا مضبوط اور طاقتور ہے اس کا گھوڑا، سارا دن چلتا ہے۔ کنہیا لال کو ڈھیروں پیسے کما کر دیتا ہے۔ اور تھکتا بھی نہیں۔ یہ سب چنے کی دال کا کمال ہے اس کے چھوٹے بھائی روی شنکر نے کھایا کہ نہیں، اس کے پتا روی شنکر کو چنے کی دال کی افادیت سے قائل کر سکے کہ نہیں ، کم از کم وہ چنے کی دال کی اہمیت جان چکا تھا۔ تبھی تو باہر سے باہر ہی لوٹ آیا۔ دوسرے روز دن ڈھلے گھر واپس لوٹا تو ایک ہاتھ میں جسم کو حرارت اور توانائی بخشنے والی خوراک کے بہت سے پوڑے اور دوسرے ہاتھ میں تڑے مڑے نوٹوں کو دیکھ کر ماتا پتا کے ذہنوں میں کلبلاتے سوال ماتھے پر شکنوں کی صورت میں نمودار ہونے لگے، ماتا پتا کے چہروں کا تفکر اس کی انا کی آبرو تھا جو اس کے ہونٹوں پر تبسم بن کر پھیل گیا۔

اس نے دونوں کا ہاتھ پکڑا اور گھر کی دہلیز تک لے آیا، جہاں دروازے کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں سر جوڑے ٹھیلا کھڑا تھا۔ جس سے ان کے بیٹے کے پسینے کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ ☐☐

بقیہ صفحہ ۴۱ / تھرو پراپر چینل

کہنے لگا بی بی میں آپ کی ملاقات تو شاید صدر صاحب سے نہ کروا سکوں۔ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی درخواست ان تک ضرور پہنچے گی۔

امید اور ناامیدی میں ڈوبتے، ابھرتے وہ دونوں گھر واپس آئے تو ماں نے بتایا کہ دفتر سے فون آیا تھا کہ پاپا کی پنشن اور دوسرے واجبات وصول کر لوں۔ دونوں بہن بھائی ماں کو ساتھ لے کر باپ کے دفتر گئے۔ وہ کمرہ جو پاپا کی موجودگی میں اپنا اپنا لگتا تھا۔ آج اجنبی بن کر انہیں بے رحمی سے دیکھ رہا تھا۔ دفتر کے کچھ لوگ دلی ہمدردی اور کچھ دکھاوے کے لئے ملنے آئے۔ چند جملے مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں کہہ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔۔ تو بہت سارے کاغذوں پر دستخط کر کے وہ پاپا کے بقایاجات وصول کر کے نکلنے لگے تو متعلقہ افسر نے دبی زبان میں مکان خالی کرنے کیلئے کہا۔

گھر آکر جب انہوں نے پاپا کی گریجویٹی اور پنشن کی رقم کا حساب کیا تو وہ اتنی بھی نہ تھی کہ ایک فلیٹ ہی خریدا جا سکے۔ اس سے مایوس ہو کر کہکشاں نے پھر صدر صاحب کے لئے فون کرنے شروع کر دیے۔ چند دنوں بعد صدر کے دفتر سے خط آیا کہ صدر مملکت نے ان کی درخواست سکریٹریٹ بھجوا دی ہے۔ پھر جس محکمے میں درخواست پہنچی وہاں سے رسید کی اطلاع آنے لگتی۔ کہکشاں نے ان خطوط کو ایک فائل میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ فائل کا پیٹ آہستہ آہستہ پھولنے لگ گیا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی درخواست تھرو پراپر چینل سفر کر رہی ہے۔

دن گزرتے چلے گئے۔ صدر مملکت کا اے ڈی سی ایک دن اپنی فائلیں درست کر رہا تھا تو اسے اخبارات کی کٹنگس اور کہکشاں کی درخواست نظر آئی۔ اس نے درخواست کو جہاں جہاں مارک کیا تھا۔ وہاں سے فون کر کے اور درخواست کا نمبر بتا کر جواب پوچھا۔ ہر محکمہ بتاتا کہ یہ درخواست اب کس محکمے میں ہے۔ آخر میں اکنامک۔۔۔ ڈویژن نے بتایا کہ درخواست پر انہوں نے Objection لگا کر بھجوا دیا ہے کہ ایک ہی شخص کو فلیٹ اور کیش نہیں دیا جا سکتا۔ اے ڈی سی کو کہکشاں کی مظلوم آنکھیں اور اپنا وعدہ یاد آیا۔ تو سب کام چھوڑ کر وہ اس درخواست کے پیچھے لگ گیا۔ کافی کوشش کے بعد وہ ایک لاکھ کی منظوری لینے میں کامیاب ہو گیا۔ جب درخواست اس کے ہاتھ میں آئی تو جیسے سر سے بوجھ اتر گیا۔ اس نے سوچا وہ یہ فائل لے کر خود اس کے گھر جائے گا۔ اس لڑکی کے پاس جسے اس نے بہن کہا تھا۔

درخواست میں دیئے ایڈریس پر جب وہ پہنچا تو پتہ چلا کہ مرحوم کے دفتر والوں نے مدت ہوئی ان سے یہ گھر خالی کروا لیا۔ کہکشاں اور اس کے گھر والے کہاں اور کب گئے ہیں، محلے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لئے اس نے واپس آکر درخواست داخل دفتر کر دی۔ اور اس پر ریمارکس لکھ دیئے کہ جب وہ صدر کی طرف سے عطیے کی پوری رقم کا چیک لے کر پہنچا تو وہ خاندان وہاں سے شفٹ ہو گیا تھا لہٰذا یہ چیک واپس جمع کروایا جا رہا ہے۔ ☐☐

زرِ سالانہ ارسال کرتے وقت اپنا
خریداری نمبر ضرور درج کیجئے

مسرور جالندھری



درِ کرم ہے تو پھر تا بکے نہ وا ہوگا
ہمارے حال کو آخر وہ دیکھتا ہوگا

میں اس سے رابطہ بڑھاؤں کہ چاند تاروں سے
کچھ اور دیر میں سورج تو ڈوبتا ہوگا

طلوعِ صبح کو جی بھر کے دیکھ لے دنیا
غروب تک تو یہ خورشید کیا سے کیا ہوگا

دل ایک لمحہ جاں بخش کی تلاش میں تھا
خبر نہ تھی کہ وہ اتنا گریز پا ہوگا

ابھی نجوم بھی روشن ہیں، شمع بھی، شب بھی
اس ایک شخص کے جاتے ہی جانے کیا ہوگا

3214-D, G-732 , Islamabad, (Pak)

افتخار اجمل شاہین



کتابِ زندگانی لکھ رہا ہوں
محبت کی کہانی لکھ رہا ہوں

جلا کر میں چراغِ عہدِ رفتہ
وہی خوابِ جوانی لکھ رہا ہوں

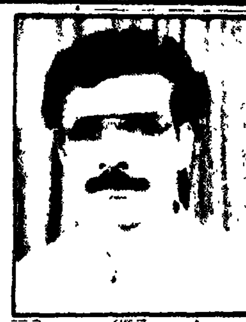
تباہی کا کروں میں کس سے شکوہ
تمہاری مہربانی لکھ رہا ہوں

محبت جس کا بھی مسلک رہا ہے
اسے میں غیر فانی لکھ رہا ہوں

ہے شاہیں شعر میں پر تو اسی کا
اسی کی گلفشانی لکھ رہا ہوں

Flat No 3, Block -M, North Nazimabad, Karachi- 74700 (Pak)

جسارت خیالی



ہوسکے تو کوئی تدبیر نہ ہونے دینا
خواب کی خونچکاں تعبیر نہ ہونے دینا

دکھ کو سہتے ہوئے اخلاص کو کرنا تقسیم
آدمی کو کبھی دلگیر نہ ہونے دینا

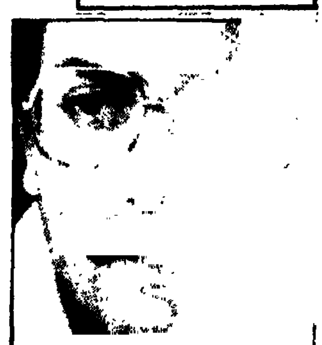
حریت سے ہی تو ملتا ہے زمانے کو دوام
انہیں جذبات کو زنجیر نہ ہونے دینا

خیرہ کردے جو نگاہوں کی عملداری کو
اس طرح کی کبھی تنویر نہ ہونے دینا

جس سے رستا ہو جسارت دلِ انساں سے لہو
ایسا معبد کبھی تعمیر نہ ہونے دینا

Pahad Pur, Leh (Panjab) Pak

عقیل عباس جعفری



زندگی کیا ہے سفر مٹی کا ہے
اور دنیا کیا ہے گھر مٹی کا ہے

زندگی میں اک محبت کے سوا
جو بھی کچھ ہے سر بسر مٹی کا ہے

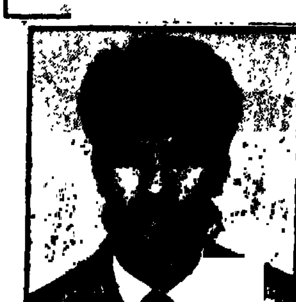
سارے انساں ایک جیسے ہیں مگر
مختلف سب پر اثر مٹی کا ہے

تھا کبھی خوں کا حوالہ معتبر
اب حوالہ معتبر مٹی کا ہے

اس خرابے میں ہے جو بھی کچھ عقیل
خوب صورت ہے مگر مٹی کا ہے

Flat- 12, Block -B-1, Street-30, Sector I/8-1, Islamabad (Pak)

سرفراز تبسم



گھر میرا جل گیا تھا چراغوں کے ساتھ ساتھ
اب اڑتا پھر رہا ہوں ہواؤں کے ساتھ ساتھ

کس کی تمہیں تلاش ہے کوئی یہاں نہیں
جذبے بھی کھو گئے ہیں وفاؤں کے ساتھ ساتھ

خوش ہیں جلا کے سارے درختوں کو! ہوش مند
بچ نہ سکا کچھ اور بھی گاؤں کے ساتھ ساتھ

افسوس ان کے لب پہ مرا نام تک نہیں
جن کے لئے لڑا میں خداؤں کے ساتھ ساتھ

ذہن و خیال کھو گئے چھوٹی سی عمر میں
منزل پہ آگیا ہوں ہاؤں کے ساتھ ساتھ

18-B, Francis Abad, Gujranwala, (Pak)

محمد محمود احمد

ان کہی بات کا اظہار بھی ہو سکتا ہے / پانی جم جائے تو دیوار بھی ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے مصلّے پہ فقط زاہد ہو / رونے والا کوئی میخوار بھی ہو سکتا ہے
پچھلے ساون میں تو آیا تھا گھٹا کی صورت / کیا وہی معجزہ اس بار بھی ہو سکتا ہے
شرط اتنی ہے گریبان سے پکڑے کوئی / بھاگتا وقت گرفتار بھی ہو سکتا ہے
دوسرا پہلو بھی تم ذہن میں رکھ کر جانا / اس کے در سے تمہیں انکار بھی ہو سکتا ہے

Mohalla Gangwi, Miyan Wali, Punjab (Pak)

حسن عباسی

آنکھوں کی طرح راز ہے کھلتا بھی نہیں وہ / سیلاب بھی بن جاتا ہے دریا بھی نہیں وہ
اب جسم کے پرچم پہ اسے کیسے سجاؤں / اب چاند نہیں پہلے سا تارا بھی نہیں وہ
اس بار زمیں آنکھ کی بنجر ہی رہے گی / اس بار تو ساون کا سندیسہ بھی نہیں وہ
میں یاد رہوں اس کو وہ اتنا بھی نہیں ہے / خود یاد نہ آئے مجھے ایسا بھی نہیں وہ
اس شخص کی فطرت بھی حسن میری طرح ہے / جلتا ہوا صحرا بھی ہے پیاسا بھی نہیں وہ

C/o Ali Shan Kitab Ghar, At—Post Khairpur Tahwali, Dist Bhawalpur Punjab (Pak)

ہدایت کاشف

ہجر میں کچھ اس طرح سے رابطے باقی رہے / اپنے گھر میں رنجشوں کے سلسلے باقی رہے
ہو رہی تھیں غرق ساری بستیاں سیلاب میں / کوئی منزل تھی نہ رستہ، قافلے باقی رہے
شیخ کے کہنے پہ میں نے چھوڑ دیں مے نوشیاں / پھر بھی لہجے میں پرانے ذائقے باقی رہے
کیوں نہ روتا بیٹھ کر تنہا فضائے دشت میں / شام سر پہ آ گئی اور فاصلے باقی رہے
تیرے چہرے پر لکھے تھے کس قدر باب وفا / مٹ گئی ساری عبارت حاشیے باقی رہے

Adamwali, Dist Rahimyar Khan, Punjab (Pak)

احمد رضوان

شب ڈھلے گنبد اسرار میں آ جاتا ہے / ایک سایہ در و دیوار میں آ جاتا ہے
میں ابھی ایک حوالے سے اسے دیکھتا ہوں / دفعتاً وہ نئے کردار میں آ جاتا ہے
یوں شبِ ہجر شبِ وصل میں ڈھل جاتی ہے / کوئی مجھ سا مری گفتار میں آ جاتا ہے
دیکھتا ہوں کبھی انکار کی صورت اس کو / اس کا لہجہ مرے اقرار میں آ جاتا ہے
میں کبھی خود کو اگر ڈھونڈنا چاہوں رضوان / دوسرا بھی کوئی اظہار میں آ جاتا ہے

327-Peoples Colony, Mumtaz Abad, Multan (Pak)

شہناز مزمل

دشمنوں سے دوستی کا تجربہ کیسا رہا / بدگمانی میں گماں کا ذائقہ کیسا رہا
آبلوں کے مندمل ہونے پہ بتلانا مجھے / جبر موسم میں انا کا تجربہ کیسا رہا
وقت کے ساحل پہ طوفاں میں گھرے سوچا کیے / بادباں سے کشتیوں کا فاصلہ کیسا رہا
آبلہ پا ہمسفر گردِ سفر میں کھو گئے / کیا بتاؤں ہجرتوں کا سلسلہ کیسا رہا
یہ مری وحشت مری دیوانگی بتلائے گی / کاتبِ تقدیر تیرا فیصلہ کیسا رہا

125-F, Model Town, Lahore (Pak)

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

۱۔	دیوانِ غالب (اردو)			۵۰ روپے
۲۔	دیوانِ غالب (اردو ڈیلکس)			۶۰ روپے
۳۔	دیوانِ غالب (ہندی)	مرتبہ:	نور نبی عباسی	۶۰ روپے
۴۔	خاندانِ لوہارو کے شعرا	مصنفہ:	حمیدہ سلطان احمد	۳۰ روپے
۵۔	مقالات بین الاقوامی غالب سمینار (اردو) ۱۹۶۹ء	مرتبہ:	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۰ روپے
۶۔	(انگریزی) ۱۹۶۹ء			۱۰ روپے
۷۔	غزلیاتِ غالب (اردو) انگریزی ترجمہ	مترجم:	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹۵ روپے
۸۔	(فارسی)			۲۵۰ روپے
۹۔	سیر المنازل	ترتیب و ترجمہ:	ڈاکٹر شریف حسین قاسمی	۴۵ روپے
۱۰۔	غالب کے خطوط (چار جلدوں میں)	مرتبہ:	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۳۵ روپے
۱۱۔	مثنویاتِ غالب	ترجمہ:	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	۶۰ روپے
۱۲۔	نقد قاطع برہان مع ضمائم	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۱۳۔	یادگارِ غالب	مصنف:	الطاف حسین حالی	۱۲۰ روپے
۱۴۔	غالب اور انقلاب ستاون	مصنف:	ڈاکٹر معین الرحمن	۶۰ روپے
۱۵۔	نواب معتمد الدولہ آغا میر	مصنف:	ڈاکٹر انصار اللہ	۶۰ روپے
۱۶۔	دیوانِ غالب (کشمیری)	ترجمہ:	غلام نبی ناظر	۶۰ روپے
۱۷۔	تفہیم غالب	مصنف:	شمس الرحمن فاروقی	۹۰ روپے
۱۸۔	آنند نرائن ملا (شاعر اور دانشور)	مرتبہ:	شاہد ماہلی	۴۰ روپے
۱۹۔	غالب پر چند مقالے	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۲۰۔	سید مسعود حسین رضوی ادیب	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۲۱۔	مولانا امتیاز علی عرشی	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۲۲۔	قاضی عبدالودود	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۲۳۔	حافظ محمد شیرانی	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۲۴۔	آل احمد سرور	مرتبہ:	شاہد ماہلی	۴۰ روپے
۲۵۔	سید احتشام حسین	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۸۰ روپے
۲۶۔	گفتۂ غالب	مصنف:	محمد سیادت نقوی	۶۰ روپے
۲۷۔	غالب کا دیہ کا اودھی روپ (ہندی)	مصنف:	پروفیسر نورالحسن ہاشمی	۴۰ روپے
۲۸۔	انتخاب غزلیات غالب	مصنف:	یعقوب مرزا	۹۰ روپے
۲۹۔	غالب کے چند نقاد	مرتبہ:	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	۶۰ روپے
۳۰۔	توضیحی اشاریۂ غالب نامہ	مرتبہ:	فاروق انصاری	۶۰ روپے
۳۱۔	فخر الدین علی احمد یادگاری مجلہ (اردو)	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۵۰۰ روپے
۳۲۔	فخر الدین علی احمد یادگاری مجلہ (انگریزی)	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۳۵۰ روپے
۳۳۔	غالب پر چند تحقیقی مطالعے	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰ روپے
۳۴۔	ریفڈرنگ فرام غالب	مصنفہ:	پریمہ جوہری	۶۰ روپے
۳۵۔	میخانۂ حرف	مصنف:	تاباں نقوی	۶۰ روپے
۳۶۔	انتخاب مضامین غالب نامہ دو حصوں میں ۱۔ تنقیدات	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۱۵۰ روپے
	۲۔ تحقیقات	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۱۵۰ روپے
۳۷۔	غالب کی شناخت	مصنف:	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۸۰ روپے
۳۸۔	غالب کی آپ بیتی (اُردو)	مصنف:	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۴۰ روپے
۳۹۔	غالب کی آپ بیتی (ہندی)	مصنف:	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۴۰ روپے
۴۰۔	غالب ببلوگرافی	مصنف:	ڈاکٹر انصار اللہ	۲۰۰ روپے
۴۱۔	نقش ہائے رنگ رنگ	مصنف:	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	۱۵۰ روپے
۴۲۔	افکارِ غالب	مصنف:	خلیفہ عبدالحکیم	۲۰۰ روپے
۴۳۔	تلاشِ غالب	مصنف:	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۰۰ روپے
۴۴۔	بیگم حمیدہ سلطان	مرتبہ:	شاہد ماہلی	۵۰ روپے
۴۵۔	پروفیسر نورالحسن ہاشمی	مرتبہ:	شاہد ماہلی	۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔ ۲

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

شاعر

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۱واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد ـــــ ۷۱
شمارہ ـــــ ۳

مارچ ۲۰۰۰ء
فون: 3829904

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔۲

[پاکستان]

(جلد دوم)

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت — روپے

زر سالانہ
۱۰۰ روپے

لائبریریوں سے
۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری
۵۰۰۰ روپے

معاونین سے
۲۰۰ روپے

پاکستان
۲۵۰ روپے

امریکہ
۲۵ ڈالر

برطانیہ
۱۵ پونڈ

خلیجی ممالک
۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکر امروز

شاعر کا نصب العین

شاعر کا فطری فرض ہے ہوے رنگین جذبات کو
تبدیل کردے صبح میں تاریکی ظلمات کو
پھولوں کے دل میں کھول دے باد چمن کے راستے
مربوط کردے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو
رشتے فنا کے جوڑ دے سرچشمۂ جاوید سے
رنگِ حیات تازہ دے دینائے محسوسات کو
نغموں سے اپنے پھونک دے پژمردگی میں تازگی
تجدید کا پیغام دے مایوسی حالات کو
اٹھے اور اپنی مشعل تحقیق کو کردے بلند!
جب حادثوں کے خوف سے تھرآئیں تارے رات کو
چھا جائے انساں زار پر صبح نگاریں کی طرح
برسے دل بیدار پر الہام رنگیں کی طرح

شاعر کے نصب العین میں تہذیب عالم عام ہے
ہر شعر اس کا وحی ہے، ہر اک نوا الہام ہے
شاعر کے نصب العین میں عزم الٰہی ہے نہاں
اس کے قلم کی ہر صدا فطرت کا اک پیغام ہے
شاعر کے نصب العین میں عرفاں کی موجیں ہیں بلند
آغاز اس کی فکر کا آئینۂ انجام ہے
شاعر کے نصب العین میں ہے کامیابی خلق کی
مقصد میں اپنے اس لئے وہ فطرتاً ناکام ہے
شاعر کے نصب العین میں ہیں دو جہاں کی وسعتیں
نظروں میں صبح عرش اور تحت الثریٰ کی شام ہے
پیدا ہوا ہے خلق کی مشکل کشائی کے لئے
شاعر ہے "آوازِ خدا" ساری خدائی کے لئے

[۳۶۔اشعار پر مشتمل طویل نظم کے
یہ دو بند کار امروز سے ماخوذ ہیں]

سیماب اکبرآبادی

بیشتر نقاد صفت شاعر جب نظم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں تو غزل کے لوازمات کو پیمانہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے یہ بھی شکایت ہے کہ غزل اور بے غزلی کی بحث میں پڑنا ادب اور بے ادبی کی بحث میں پڑنے کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ میں تو صلح کل انسان ہوں اس لئے میں نے اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ستیہ پال آنند مرد میدان ہیں اور چونکہ اپنی بات سیدھے اور چبھتے ہوئے الفاظ میں کہتے ہیں۔ اس لئے اس عتاب کے حقدار بھی ہیں۔ جو ان پر نازل ہو رہا ہے..... ستیہ پال آنند کی نظمیں مجھے پسند ہیں کیونکہ یہ اسی خمیر سے اٹھی ہیں۔ جو میری نظموں کا خاصہ بھی ہے....ان نظموں کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو میرا جی نے میری "نارس" کی نظموں کے بارے میں دی تھی، یعنی ان کو دیکھنے کے بعد ایک چلتی پھرتی ہوئی بلکہ بعض اوقات بولتی ہوئی حیات ذہنی کا نقشہ ابھر آتا ہے۔ لیکن زبان و بیان کی سطح پر ان سب نظموں میں ایک قدر مشترک واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ نظمیں روایتی غزل کی لفظیات، استعارات اور زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے یکسر پاک ہیں۔

—— ۱۹۹۶ - اختر الایمان- ("لھو بولتا ھے" کے دیباچے سے اقتباس)

دست برگ ● وقت لاوقت ● آنے والی سحر بند کھڑکی ھے

اور لھو بولتا ھے

کے بعد چار سو سے کچھ زیادہ نظموں کے خالق

ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

مستقبل! آ مجھ سے مل

شاعر کی خودنوشت "داستان میرے شعری سفر کی"

کے ساتھ، جو جدید اردو شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی ہے

دیدہ زیب طباعت، گیٹ اپ ● سہ رنگ ڈسٹ کور

قیمت —— ۱۵۰ روپئے

انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز ۹۲۲ کوچہ روہیلا دریا گنج نئی دہلی ۲ - ۱۱۰۰

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ ۲

[پاکستان]

پاکستان میں فنون لطیفہ

مرتبہ: افتخار امام صدیقی

غزلیں

کہانیاں

ادبی رسائل

محفل ادبی

نظمیں

شمارہ ۔ ۳ [مارچ ۲۰۰۰ء] جلد۔ ۷۱

محفل اپنی

شاعر کی یہ تازہ خصوصی اشاعت

قارئین! آپ نے شاعر کے گذشتہ شماروں میں پڑھا تھا کہ شاعر کا ایک اور خصوصی شمارہ شائع ہونے والا ہے، ہمارے قارئین سوچ رہے تھے، ہم سے پوچھ رہے تھے کہ وہ خصوصی شمارہ کیا ہوگا کیوں کہ ہم نے کوئی واضح اعلان بھی نہیں کیا تھا۔ سو اب وہ خصوصی شمارہ پیش ہے۔ یہ غیر متوقع موضوع بھی آپ کو حیران کر دے گا کہ کم از کم اس نوع کے شمارے کا تصور آج کے حالات میں ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس شمارے کی پیش کش خود ہمارے لئے کسی امتحان سے کم نہیں ہے لیکن یہ شمارہ ہمارے لئے ناگزیر تھا کہ اس کے بغیر نہ ہم اردو ادب کا عالمی منظر نامہ مکمل کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اس عنوان سے اپنے کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اردو ہمارا پہلا عشق ہے اور عشق اوّل جنونی ہوتا ہے۔ وہ نہ تو سرحدوں کو جانتا ہے اور نہ سیاستوں اور مذہبوں کے زیر اثر آتا ہے اور ابھی ہند و پاک تعلقات میں اتنی گنجائش ہے کہ ہم اردو کی بات کر سکتے ہیں یعنی عشق کی بات کر سکتے ہیں۔ حالانکہ روز آنہ ٹی وی اخبارات اور ریڈیو کی خبریں دل دہلا دینے والی ہوتی ہیں۔ اور وطن سے محبت اپنی جگہ۔

اس خصوصی شمارے کے صفحات محدود ہیں۔ شاعر کے دو عام شماروں کی یکجائی میں تمام نقش و نگار ابھارنے ہوتے ہیں اور یہی ہمارا ہنر بھی ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ قارئین شاعر کو کم صفحات اور کم قیمت میں معیاری ادب زیادہ سے زیادہ مطالعے کے لئے دیا جائے اس خصوصی شمارے کو بھی کچھ اسی طرح سجایا گیا ہے کہ قاری کو سرشار کر دیا جائے۔ جتنی شاعری ان دو شماروں میں دی گئی ہے وہ اگر ایک کتاب میں جمع کر دی جائے تو اس کتاب کی قیمت کیا ہوگی یہ آپ جانتے ہیں۔ افسانوں میں پاکستان کے مشاہیر قلم کاروں کے ساتھ نئے افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے، وہ افسانہ نگار جو بہت اچھا لکھ رہے ہیں لیکن ہندوستان کے ادبی رسائل میں کہیں نہیں ہیں۔ افسانے کے قارئین ان کو نہیں جانتے۔ شاعری کے انتخاب کے لئے بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس شمارے کا تقریباً لوازمہ وہ ہے جو شاعر کے لئے موصول ہوا تھا اور ہم عصر اردو ادب نمبر یا عام شماروں کے لئے تھا۔ واضح رہے کہ یہی کچھ پاکستان کا اردو ادب نہیں ہے بلکہ اسے آپ پاکستان میں اردو ادب کا سرسری اشاریہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر ہم اسے سرسری اشاریہ کہہ رہے ہیں تو آپ بھی اسے "عادت ذہنی" کے تحت "سرسری" کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیں۔

پاکستان میں اردو کے نئے شعرا اور نئے افسانہ نگار ابھی ہندوستان میں متعارف نہیں ہوئے۔ ہم نے اس پر کام کرنا شروع کیا تھا لیکن صفحات نے اجازت نہیں دی۔ پھر کسی موقع سے ایک شمارہ پاکستان کے نئے قلم کاروں پر مشتمل شائع کیا جائے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایسا ہی ایک انتخاب ہم ہندوستان کی نئی نسل کے قلم کاروں پر مشتمل پاکستان کے لئے ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ دراصل سرحدوں کے دونوں طرف بعض بہت عمومی نوعیت کے مکالمے سننے میں آتے ہیں کہ "شاعری تو پاکستان میں ہو رہی ہے، یا ادب تو پاکستان میں تخلیق ہو رہا ہے اور اس کی تنقید ہندوستان میں لکھی جا رہی ہے۔ دونوں طرف کے قلم کار اس فضول سی بحث میں پڑے رہتے ہیں کہ پاکستان میں اچھا شعر کہا جا رہا ہے اور ہندوستان میں اس کی نقل ہو رہی ہے یا ہندوستان میں شاعری ہو رہی ہے، افسانہ تو پاکستان میں لکھا جا رہا ہے۔ تحقیقی کام ہندوستان میں زیادہ ہو رہا ہے، وغیرہ وغیرہ یہ سب مفروضے فضول سے اور بے کار سے ہیں؟ یہ بحث لا یعنی ہے۔ اچھا برا ادب تو سرحدوں کے دونوں طرف لکھا جا رہا ہے۔ ہاں اگر مفروضات کا تجزیہ کیا جائے تو حقائق کچھ اور ہوں گے۔

ڈاکٹر عطش درانی کا مضمون "پاکستانی اردو کے خد و خال" غور سے پڑھیے، سوچیے اور اپنی گرانقدر رائے دیجئے۔ ادبی رسائل کے پتوں کی ڈائرکٹری سے استفادہ کیجئے۔ مشمولہ خصوصی شمارے کے دونوں حصوں میں شامل "ادبی فیچر" میں جو کچھ بھی دیا گیا ہے اس سے اختلاف ممکن ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کریں گے لیکن ہمارے خلوص اور ہماری نیت پر شک نہ کیا جائے کہ ہم لوگ ہر طرح کی ادبی سیاستوں سے پرے صرف اور صرف اپنا کام پر یقین رکھتے ہیں۔ قارئین شاعر کو اجازت ہے کہ وہ اس مکمل شمارے پر اظہار خیال کریں اور کریں لیکن تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ۔ اتنی ساری تصاویر اور پتوں کی یکجائی آپ ہی کیلئے۔

شاعر کی آئندہ خصوصی اشاعتیں

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد دوم) اردو ادب کی ایک صدی (دو جلدیں) اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ ۳، صدی شخصیت نمبر سے قبل ایک اور خصوصی شمارہ چند شماروں کے بعد شائع ہوگا اور اس شمارے سے ہم ایک نئے کام اور نئی روایت کا آغاز کریں گے۔ شاعر میں گوشوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ جاری رہا۔ اسی میں کچھ بھی تجربے کئے گئے۔ چونکہ ہم تخلیق کرتے ہیں اور دوسرے اس کی تقلید لہٰذا تقلید و تقلید کے اس کام میں کوئی انفرادیت نہیں رہی۔ اور ضروری گوشے، غیر ضروری گوشوں کی بہتات میں گم ہو کر اپنی معنویت کھو بیٹھے۔ شاعر میں ایک بار پھر گوشوں کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور یہ تجویز اپنی کسی انفرادیت کے ساتھ زیر غور ہے لیکن اب جو خصوصی شمارہ شائع ہوگا وہ بالکل ایک نیا تجربہ ہوگا۔ انتظار کیجئے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کی بہت کم کاپیاں رہ گئی ہیں لیکن اس جلد اوّل کا کام ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئے ہیں۔ شاعر کے مستقل خریداروں کے مسائل ہیں۔ وہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے خواہش مند تو ہیں لیکن حساب کتاب میں الجھے ہو خود بھی پریشان ہو رہے ہیں اور ہماری پریشانیوں کو بھی کم نہیں کر رہے ہیں۔ گذارش ہے کہ حساب کتاب کو ختم کیجئے اور جلد از جلد اپنی محفوظ کاپی ہم سے منگوا لیجئے۔ اگر آپ کی ذات سے شاعر کو تھوڑا سا بھی فائدہ پہنچتا ہے اور اس کے عوض "ہم عصر اردو ادب" حاصل ہو جاتا ہے تو دیر نہ کیجئے اور اپنی کاپی جلد از اجلد منگوا لیجئے ورنہ بعد میں آپ کی بھی شکایت خود آپ ہی کو مایوس کرے گی۔ کیا خیال ہے؟

صدی شخصیت

شاعر کی طرف سے صدی شخصیت کا انتخاب اور اس کے بارے میں دیگر تفصیلات آئندہ شماروں میں ملاحظہ کیجئے۔ نئی صدی کا آغاز ابھی ہوا نہیں ہے۔ سنہ دو ہزار ایک سے قبل ہم اس کام کو مکمل کر کے ایک خاص شمارہ ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ صدی شخصیت کے انتخاب میں آپ بھی شامل رہیں گے۔ اس ضمن میں کوئی تجویز، کوئی مشورہ دینا چاہے تو بلا تکلف ہمیں لکھیے۔



راغب مرادآبادی

رباعیات

خلوت میں مطالعہ، مزا دیتا ہے
لو شمعِ تجسس کی بڑھا دیتا ہے
افکار میں دوڑتا ہے خونِ صالح
جب علم دماغ کو غذا دیتا ہے

O

دریافت کئے نئے جزیرے ہم نے
پائے الفاظ کے ذخیرے ہم نے
شرمائے گی خورشید کو بھی جن کی چمک
پلکوں سے تراشے ہیں وہ ہیرے ہم نے

O

یہ خندہ بلب، یہ گنگناتے چہرے
یہ نغمۂ زندگی سناتے چہرے
کیا جانیے، کیوں غروب ہوجاتے ہیں
ظلماتِ عدم میں، جگمگاتے چہرے

O

زہرابِ غمِ زیست پیے جاتا ہوں
مرتا ہوں مگر سانس لیے جاتا ہوں
میعادِ حیات کے بڑھانے والے
جینا ہے بہر حال جیے جاتا ہوں

O

ہم اہلِ نظر، شاکیِ مقسوم نہیں
طعنوں سے نئی نسل کے مغموم نہیں
اک دن تھا نئی نسل میں اپنا بھی شمار
شاید یہ نئی نسل کو معلوم نہیں

O

حکمت سے بڑھا ربط، بصیرت جاگی
دولت کی ہوس گئی بنے بیراگی
راغب حرمِ ذہن میں چھم چھم کرتی
آئی جو پری علم کی، مایا بھاگی

●No.16/1101-R, F.B. Area, Karachi (Pak)



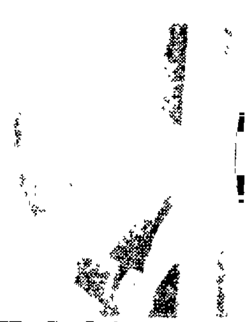
وزیر آغا

کینوس

یہ کس پاگل مصور نے
زمیں کو کینوس اپنا بنایا ہے
ستاروں کے ہزاروں موقلم ٹوٹے پڑے ہیں
ہزاروں رنگ جس نے
مہریاں خورشید کے پلیٹ[ط] سے لے کر
زمیں کی کھوپڑی پر مل دیے ہیں
جزیرے سرخ
صحرا سبز
قلزم زرد رو جس نے دکھائے ہیں
کلس کیلاش کے سارے
اندھیروں سے سجائے ہیں
شفق پر جا بجا
پیتل کی ٹوٹی پتیاں بکھری پڑی ہیں
گھروندوں میں جدھر دیکھیں
فقط کالک ہی کالک ہے
خدا مالک ہے
کس پاگل کو اس نے
اس زمیں کے حسن کا، تزئین کا
سب کام سونپا ہے
سفیدی آنکھ میں جس نے بھری ہے
سیاہی زرد چہروں پر ملی ہے
لہو کا آبِ زر جس نے
کنٹیلے منجروں کی اوک سے گرتا دکھایا ہے!!

ط Palette (تختۂ مصور)

●58, Civil Lines Sargodha (Pak)



آفتاب اقبال شمیم

زندگی جیسی ایک لڑکی

نظر کے بدلتے ہوئے پینترے سے
فنا کر کے
دیتی ہے خیرات بھی پھر سے جینے کی
آدھی شکن کے تبسم سے اک جرعۂ وہم پینے کی
میں اک ستارہ اشارے کے رخ
اور محرابِ وعدے کی قبلہ نمائی میں
اس کی طرف منہ کئے
بے نیازی کے معبود کے روبرو ہوں
تمنا کے سو بار ٹوٹے ہوئے تار میں حرف حرف آیتوں کو
پروتے ہوئے سجدہ جو ہوں

●House No. 15, I-9/1, Islamabad (Pakistan)

پاکستان میں فنون لطیفہ

مرتبہ: افتخار احمد صدیقی

پاکستان میں فنون لطیفہ کی جو بھی روایت ہے وہ غیر منقسم ہندوستان کی صدیوں کی روایت سے جڑی ہوئی ہے اور اب اس روایت میں پاکستان بطور ایک ملک کے شامل ہو رہا ہے۔ وہ فلم ہو یا موسیقی، ڈرامہ ہو کہ مصوری، ماضی کے ذکر اور حوالے کے بغیر بات مکمل نہیں ہو گی۔ پاکستانی فلموں کا کبھی بھی وہ معیار نہیں رہا جو ہندوستانی فلموں کا تھا یا اب ہے۔ حالانکہ اب پاکستان میں کچھ بہتر فلمیں بننے لگی ہیں اور فلم کے ہر شعبے میں جدید تکنیک کا استعمال ہونے لگا ہے لیکن مجموعی طور پر پاکستانی فلم کمزور ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ملک کی تقسیم کے بعد جو موسیقار ہجرت کر کے پاکستان گئے انہوں نے اسی میلوڈی کو برقرار رکھنے کی سعی کی جو آزادیٔ ہند اور تقسیم سے قبل تھی۔ پاکستان میں بنی پرانی فلموں کے بہت سارے گانے 'سدا بہار گانے' کہلائے اور آج بھی جب کبھی یہ پرانے گانے پاک ٹی وی یا ریڈیو پر بجتے ہیں تو روح کو نہال کر جاتے ہیں۔ سدا بہار موسیقاروں میں ناشاد، رشید عطرے، خورشید انور، نثار بزمی وغیرہ وہ سچے فن کار تھے جن کا فن ہی ان کی دنیا تھی اور وہ اپنی اپنی دنیاؤں کو مکمل طور پر جی لینے کے لئے کوشاں رہے۔ اس فہرست میں اور بھی نام ہیں۔ ان موسیقاروں کو ادبی شعرا کا تخلیقی تعاون بھی حاصل رہا تھا۔ کمرشیل NON کمرشیل کا جھگڑا ہی نہیں تھا۔ اب تو فلمیں، موسیقی اور شاعری سب ہی کمرشیل ہو گئے ہیں۔ پاکستانی فلموں کی مجموعی ناکامی کے بہت سارے اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہندوستانی فلمیں ہیں کہ گھر گھر وی سی آر اور ویڈیو کیسٹ کا زبردست کاروبار ہے۔ دوسری بڑی وجہ ٹی وی ڈراما ہے۔ اس کے علاوہ تشدد اور مار دھاڑ سے لبریز پنجابی فلمیں اور معیاری فلموں سے عوام کی عدم دلچسپی ہے۔ البتہ پاکستانی موسیقی سفر سفر زرخیز رہی۔ وہاں کے چاروں صوبوں کی آب و ہوا میں موسیقی رچی بسی ہوئی ہے۔ پنجاب اور سندھ بطور خاص۔ اور پھر ہلکی پھلکی موسیقی میں غزل گائیکی نے پاکستان کا نام روشن کیا۔ مہدی حسن غزل گائیکی کے امام ہیں۔ غزل گائیکی اور مہدی حسن بذات خود ایک اہم اور وسیع موضوع ہے جس پر کام نہیں ہوا۔ ایک تو غزل اس پر رس بھری موسیقی اور مستزاد مہدی حسن کی آواز۔ مہدی حسن نے غزل گائیکی کو نہ صرف یہ کہ ہندوپاک ہی میں اپنی انتہا تک پہنچایا بلکہ ایک دنیا ان کی آواز کی گرویدہ ہوئی اور پھر غزل گائیکی ہر خاص وعام سے گزرتی ہوئی گھر گھر پہنچ گئی۔ مہدی حسن نے ایک نئی تجارتی منڈی کا آغاز کیا اور وہ گھرانے جہاں پوپ اور تیز موسیقی کا شور حاوی تھا، غزل گائیکی نے ایسے شور کو، اس کی شدت کو کم کیا اور پھر یوں ہوا کہ غزل گلوکاروں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ ایک نیا سامع پیدا ہوا کم از کم ہندوستان میں ایک ایسا نیا سامع ضرور پیدا ہوا جو اردو زبان اور اس کے رسم الخط سے تو واقف نہیں لیکن غزل نے اسے دیوانہ کر دیا۔ بالکل الگ سامع جو نہ مشاعروں میں آتا ہے اور نہ ہی کوئی سیمناروں میں جاتا ہے۔ مہدی حسن نے غزل گائیکی کو فیشن میں داخل کیا اور اس فیشن نے سامعین کی کھیپ کی کھیپ پیدا کر دی۔ مہدی حسن کے بعد غلام علی اور جگجیت سنگھ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مہدی حسن کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ وہ اپنے "انتخاب" کی وجہ سے بھی مشہور ہوئے۔

پاکستان میں آج کا اردو ڈرامہ ٹی وی اور ریڈیو کے حوالے سے جانا جاتا ہے بالخصوص ٹی وی سیریلز یا ٹیلی تھیٹر موضوع گفتگو زیادہ بنتے ہیں جب کہ فلم اور ٹی وی سے بہت پہلے ڈراما موجود تھا بلکہ ڈرامے ہی نے فلم کو جنم دیا۔ ماضی میں اسٹیج ڈرامے سے بہت سارے ادیب جڑے ہوئے تھے۔ اب ان کی جگہ کاروباری قلم نے لے لی ہے۔ پاکستان میں ڈرامہ ہے، تھیٹر ہے۔ آرٹس کونسل ہیں۔ (سرکاری ادارہ) کراچی اور لاہور میں ڈرامہ ہال بنے ہوئے ہیں پروفیشنل تھیٹر کو فروغ ہوا ہے لیکن جدید اور تجرباتی تھیٹر کی کمی ہے آج تھیٹر پہلے سے کہیں زیادہ مقبول ہوا ہے۔ فلم اور ٹی وی کے باوجود ڈرامے کے ناظرین میں کل کے مقابلے اضافہ ہوا ہے۔ لیکن پاکستان میں ابھی 'جدید تھیٹر' کا آغاز نہیں ہوا او جو ڈرامہ ہو رہا ہے وہ کسی غیر معمولی معیار کو قائم نہیں کرتا حالانکہ پاکستان میں ڈرامہ لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کے لئے ڈرامہ نگار موجود ہیں لیکن "اسکرپٹ رائٹرس" البتہ کم ہیں جو فلم، اسٹیج، ٹی وی اور ریڈیو کے لئے لکھی جانے والی اسکرپٹ میں فرق کر سکیں۔ ان سب کی اپنی اپنی تکنیک ہے۔ ہلکے پھلکے طنزیہ کامیڈی ڈراموں کا چلن پاکستان میں زیادہ ہے۔ یک بابی ڈراموں میں چند کرداروں کے درمیان مکالمہ یا پھر ایک آدھ منظر کی تبدیلی اور ڈرامہ.... معیاری تھیٹر کی بہر حال پاکستان میں کمی ہے۔

پاکستانی مصوری خاصی متمول ہوئی ہے۔ وہاں کے فن کاروں نے عالمی معیار مصوری سے استفادہ کیا ہے۔ مصوری کے موضوع پر پاکستان میں اردو انگریزی میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں مصوری کے موضوع پر عالمی مذاکرہ، سیمناروں اور نمائشوں میں پاکستانی فن کاروں کی شمولیت اور پذیرائی ہوئی ہے۔ چغتائی آرٹ [عبدالرحمٰن چغتائی جو شاعر اور افسانہ نگار بھی تھے] اور صادقین کی خطاطی ومصوری نے عالمی شہرت حاصل کی حنیف رائے، جمیل نقش، موجد، اقبال مہدی، اسلم کمال، زوار حسین اور ایسے ہی کئی بڑے نام ہیں جنہوں نے اپنے اپنے طور پر پنسل برش، رنگ، کینوس اور نقطوں، لکیروں کے ذریعے اپنا تخلیقی اظہار کیا۔ پاکستانی مصوری کی روایت میں ماضی کے ساتھ اب معاصر نظریہ فن میں اسلامی تہذیب کے اثرات نمایاں ہو چکے ہیں پاکستانی خطاطوں کے ہاں تو یہ عمل تیز تر ہے کہ خطاطی کی روایت ہی اسلامی ممالک سے جڑی ہوئی ہے لیکن پاکستانی مصوروں اور خطاطوں نے اپنے اپنے تخلیقی جوہر بھی دکھائے ہیں۔ ان میں سے ایک اسلم کمال بھی ہیں۔

ذیل میں پاکستان میں فنون لطیفہ کے تحت چند ایک اقتباسات دیئے جا رہے ہیں جو ظاہر ہے کہ ایک بڑے موضوع کا احاطہ نہیں کر سکیں گے تاہم پاکستان میں معاصر فنون لطیفہ کے بارے میں مجموعی طور پر کچھ معلومات ضرور فراہم کر سکیں گے۔ اس ضمن میں بہت کچھ لکھنا اور بتانا باقی ہے اور ایک اہم مکالمہ بھی قائم ہوتا ہے کہ کسی اسلامی ملک میں فنون لطیفہ کا کردار ومقام کیا ہو سکتا ہے؟۔

آواز کا نیا جہان

افتخار امام صدیقی

ایک آواز، سروں اور راگوں کی روح سے گزرتی ہوئی پوری دنیا کو فتح کر گئی۔ اور پھر یوں ہوا کہ آواز کا یہ سفر جسم و روح سے ہوتا ہوا مقام اخفٰی تک چلا گیا۔ اب وہ آواز جس کا نام نصرت فتح علی تھا، کائنات بھر میں گونج رہی ہے۔ ایک نام جو سورج کی طرف چمکا اور پھر کسی اور کہکشاں کی طرف چلا گیا۔ ایک دنیا جو اس آواز میں گم ہو گئی تھی، اب ایک خاموشی میں اس آواز کو سن رہی ہے۔

زمانہ جسے شوق سے سن رہا تھا
وہ آواز جانے کدھر کھو گئی

نصرت فتح علی کا فن نصرت فن کہا گیا رہا اور اب ایک روایت بن گیا ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی، کبھی نہ بھلائی جانے والی روایت۔ اختراعی ذہن نے مغربی موسیقی کے ساتھ مشرقی موسیقی میں اپنی کلاسیکی روایت کو اس طرح ضم کیا کہ ساعتوں میں رس ہی رس بھر گیا۔ آواز کا کینڈا ایسا تھا کہ سر تا سر، چلت پھرت کانوں کو بھلی لگتی تھی۔ کھرج میں آواز کی تیاری اور ریاضت سے گائیکی میں زبردست جان پڑ جاتی ہے۔ اور سننے والے پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ نصرت فتح علی کی آواز میں ہلکا سا نسائی لوچ ان کے کام آیا اور ان کی گائیکی کی جان بن گیا۔ ورنہ بہت سارے گلوکار جن کی آواز میں نسائی لپک آ جاتی ہے وہ فن پر عبور رکھنے اور تیار گلے کے باوجود اچھے گلوکار نہیں بن پاتے۔ نصرت فتح علی نے اپنی آواز کی اس لپک سے گائیکی میں جو کمال پیدا کیا وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔
قوالی ہو یا غزل، ہلکے پھلکے گیت ہوں یا ٹھمری دادرا، کوئی بندش، کوئی خالص راگ۔ وہ اپنی آواز کی روشنی سے ایک نئی روشنی خلق کر دیا کرتے تھے۔ ہندو پاک میں ان کے عقیدت مند اور ان کے چاہنے والے بے شمار ہیں بلکہ انہوں نے ہر طرح کی موسیقی سننے والوں کو یکساں طور پر اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ ہندوستانی فلموں میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنی آواز اور فن کا جادو جگا رہے تھے ان کی طرزوں اور ان کے NOTES کی نقل ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی آواز سے شاید موسیقی کا ایک نیا جہان معنی بنانے والے تھے کہ اچانک سرگم ٹھہر گئی۔ آہ! ---

کلاسیکی موسیقی۔ بازیافت کیسے؟

سہراب اسلم

حالانکہ یہ تاثر عام ہے کہ کلاسیکی موسیقی قسطوں میں مر رہی ہے اور اس کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ویسے تو راگ کا سرگم سات اترے چڑھے سروں پر مبنی ہے اور ان ہی کی ترتیب سے راگ تخلیق ہوتے ہیں۔ یعنی مختلف سروں کو ملانے سے مختلف راگ وجود میں آتے ہیں۔ لیکن موسیقی کی الف ب تو یہی سرگم ہے۔ جس طرح الف، ب کی شد بد پیدا کئے بغیر کوئی شخص پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ اس طرح لازم ہے کہ موسیقی بالخصوص کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے کے لئے سارے گاما پادھانی کی شد بد حاصل کی جائے۔ لیکن ایک ایسی محفل جس کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہو جو سرگم کے مدو جذر کو سمجھنے سے عاری ہو، کلاسیکی موسیقی سے مطمئن کیونکر ہو سکتی ہے؟

کلاسیکی موسیقی کے زوال میں فرنگی کی آمد نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے بول عموماً ہندی اور بھاشا زبان کے ہوتے ہیں۔ جو اس وقت عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مگر فرنگی نے جوں ہی پاک و ہند کے علاقوں پر قبضہ جمایا، فضا ہی بدل گئی۔ فارسی تو ختم ہوئی اور اس کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی۔ بھاشا اور ہندی کی سرپرستی کے لئے فرنگی کے پاس نہ وقت تھا اور نہ ضرورت.... نتیجہ یہ کہ آہستہ آہستہ پڑھے لکھے لوگ کلاسیکی موسیقی کے ان بولوں سے بے خبر ہوتے چلے گئے۔ جو عام طور پر کلاسیکی راگ یا راگنی گاتے وقت استعمال کئے جاتے تھے۔ اس دور کے ہمارے کلاسیکی فنکار اجتہاد پر آمادہ نہ تھے۔ اور ان کا خیال تھا زبان بدلنے سے کلاسیکی موسیقی اپنا حسن اور نکھار، عزت و وقار کھو دے گی۔ وہ لکیر کے فقیر بنے رہے اور نئی زبان کو یا اس کی شاعری کو استعمال کرنے کی طرف بہت کم راغب ہوئے۔ جس سے یہ تاثر عام ہوا کہ کلاسیکی موسیقی کا عوام سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ خواص کی چیز ہے، حکمرانوں کی باندی ہے۔

اگر ہمارے کلاسیکی گویے عوام کی تعلیم و تربیت کو اپنے فن کا جزو ایمان سمجھتے تو یہ صورتحال جو آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ آج بھی فرو گزاشت کلاسیکی موسیقی کے راستے کا سنگ گراں بنی ہوئی ہے۔

کلاسیکی موسیقی گانے والے عموماً پیشہ ور لوگ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دربار اور دیوان ہمیشہ سجے رہیں گے لہٰذا عوام کے ذوق کی تربیت کرنے کی کیا ضرورت ہے یہ نا عاقبت اندیشی ان لوگوں کو لے ڈوبی اور صدیوں کی میراث آج لاوارث ہے!

روایتی حکیموں کی طرح بڑے بڑے کلاسیکی گویوں نے اس ہنر کو اپنے خاندانوں اور گھروں تک محدود رکھا۔ وہ شوقیہ سیکھنے والوں کو "عطائی" کے پر حقارت لفظ سے یاد کرتے رہے۔ اور اکثر دیکھا گیا کہ استاد کا بیٹا یا بھتیجا تان پلٹے لگا رہا ہے اور عطائی شاگرد کو دہی لانے کے لئے پیالی تھما دی گئی ہے۔

بخیلی کے اس رویے نے اس عظیم فن کو پھیلنے نہ دیا اور جوں ہی راجے مہاراجے نابود ہوئے کلاسیکی موسیقی کی شام غریباں کا آغاز ہو گیا۔

اب ان بخیلوں کے وارث تو ہیں مگر انہیں سننے اور سمجھنے والا خال خال ہے۔ جائیں تو جائیں کہاں.... ٹی وی اور ریڈیو والے ان پروگراموں کو جنہیں کلاسیکی موسیقی کہا جاتا ہے۔ اس وقت نشر کرتے ہیں۔ جب ان کا اسٹاف آرام کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے اور لوگ سونے کے موڈ میں!

ملکہ پکھراج نے بہت دلیرانہ اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتی ہے!

"کلاسیکی موسیقی ایک مداحی فیشن میں شامل ہو چکی ہے۔ ایسے اکثر مداحوں کا حال وہی ہے جو دور حاضر کے تجریدی آرٹ کے متعلق ہوا ہے۔ کم مائیگی، میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ماڈرن آرٹ کی ٹیڑھی، نیکی بدی کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود کسی کے سامنے اپنی نا سمجھی کا اعتراف کرنے سے ہمیشہ گریز کرتی ہوں۔ بلکہ بہت بڑے قدر دانوں کی طرح بڑے فخر سے اس کی داد دینے میں پیش پیش رہتی ہوں۔"

یہ اچھی صورتحال نہیں ہے ہم کلاسیکی موسیقی کے عظیم ورثے کو ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اس عظیم فن کا رشتہ عوام سے استوار کیا جائے۔ حکمران آتے جاتے رہتے ہیں..... عوام قائم رہتے ہیں۔

سرسوتی کو کیلاش پربت سے اتر کر دھرتی کے بیٹوں کے پاس جانا ہی پڑے گا۔ اور ہاں اگر سرسوتی کو ہمارا اتا پتا معلوم کرنے میں دقت پیش آئے تو ہم سرسوتی سے کہیں گے کہ وہ امیر خسرو، لطیف بھٹائی، شہباز قلندر، سچل سرمست، خواجہ فرید یا پھر بلھے شاہ کے دروازوں پر دستک دے۔ ہم وہیں کہیں، بیٹے گاتے، بھنگڑا دھمال ڈالتے ہوئے مل جائیں گے۔

تب ہم سرسوتی کو خوش آمدید کہیں گے!

[مطبوعہ: ادبیات (اسلام آباد) شمارہ ۳۴ـ۱۹۹۵ء ص: ۸۰ـ۶۷۹]

● ۷ـ جہانگیر پارک، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور، (پاکستان)

تھیٹر کی تلاش

انور سجاد

اب تک یوں ہوتا رہا کہ جب بھی ہم نے پاکستان میں تھیٹر کے بارے میں پڑھا لکھا، بات کی تو اکثر اس کی تاریخ جغرافیے کی بھول بھلیاں میں آوارگی کے لئے نکل گئے اور ابھی تک اسی آوارگی میں ہی ہیں کہ مدت سے کوئی سیمینار نہیں ہوا کہ نئی آوارگی کے لے نکل سکیں اگر کسی اور پہلو کا ذکر ہوا بھی تو سطحی طور پر چند آراء، چند گلے شکوے، شکایتیں، کچھ معذرتیں اور بہت سی مجبوریاں۔ چند ایک لوگوں نے (جن میں صفدر میر، زینو، نمایاں ہیں) صورتحال کا سنجیدگی سے تفصیلی جائزہ لے کر تجزیہ بھی کیا، بیماریوں کی تشخیص بھی کی اور علاج بھی تجویز کیا، لیکن.... (اور یہ بہت بڑا لیکن ہے) ہم نے ان میں سے ایک بھی تجویز پر عمل درآمد ہوتے نہیں دیکھا، بلکہ تھیٹر تو ان تجاویز کی مخالف سمت ہی میں گیا۔ تب یوں ہوا کہ بروکریٹک سرد خانوں کے پیٹ ایسی رپورٹوں، تجاویز سے پھٹنے پر آگئے اور تھیٹر پر سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ بند ہو گیا کہ ایسی گفتگو یہی ادارے کراتے تھے۔ کسی پرائیویٹ ادارے یا شخص کو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ اس قسم کی کوئی حرکت کرے۔

جس زمانے میں تھیٹر پر بڑے بڑے سیمینار بڑی بڑی کانفرنسیں ہوئیں، رپورٹیں مرتب کی گئیں، مختلف جرائد کے موٹے تازے ڈرامہ نمبر نکلے اس زمانے میں مسئلہ تھیٹر کو پبلک میں مقبول کرانے اور اس کی ترویج اور ترقی کا تھا۔ آج کے تھیٹر کے حوالے سے پلٹ کر دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ ترویج اور ترقی کے مسائل تو کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اور تھیٹر کی مقبولیت تھیٹر کو لے کر بگٹٹ بھاگی جا رہی ہے۔ وہ مسائل ان سے پیدا شدہ مسائل کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ صورتحال اتنی پیچیدہ، انتشار زدہ اور الجھ چکی ہے کہ سلجھائیں تو کیسے، سرا ہی نظر نہیں آتا۔ آیئے پھر بھی ایک بار اور کوشش کر دیکھتے ہیں۔

میں زیادہ تر لاہور کے حوالے سے بات کروں گا کہ لاہور کو ملک کا تاریخی، ثقافتی، تہذیبی، علمی اور ادبی قسم کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے (اگرچہ اب یہ شہر گذشتہ بارہ چودہ برس سے دھول، دھویں، گندگی، تعفن کا گہوارہ بنتا جا رہا ہے۔) مجھے معلوم نہیں کہ گذشتہ کئی برس سے آرٹس کونسلیں وغیرہ یا پرائیوٹ ادارے ملک کے دوسرے حصوں میں کیا کر رہے ہیں۔ اس بارے میں اب تو کوئی بھی قابل اعتبار رپورٹ میسر نہیں۔ اخباروں کے ہفتہ وار ایڈیشنوں، ہفتہ وار رسالوں یا شوبز کے ماہناموں میں کبھی کبھار کوئی اطلاع پاکستان کے دوسرے شہروں کے بارے میں چھپ جاتی ہے۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کیا ہو رہا...؟ جب تک وزراء سے مرصع کوئی بڑا پروگرام نہ ہو کچھ پتا نہیں چلتا۔ آرٹس کونسلوں کی سالانہ رپورٹوں کو لیا جائے تو آپ جانیں سرکاری کاغذوں میں سرکاری کارگزاریوں کے حوالے سے سب اچھا ہی نہیں بلکہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے ورنہ گرانٹیں اور ملازمتیں جسٹی فائی نہیں ہوتیں۔ البتہ کراچی کے "ڈراموں" کے ویڈیو دیکھنے کے بعد بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہاں خواجہ معین الدین کی اعلیٰ روایت، علی احمد کے "کنہ مشق تھیٹر، راحت کاظمی کے "تھیٹر والے" اور اسلم اظہر کے بے بی "دستک" کے باوجود کراچی کے کمرشل تھیٹر نے لاہور کو بھی پچھاڑ دیا ہے۔ کاش لاہور کے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر اور پنجاب کا ہوم ڈیپارٹمنٹ کراچی کے ارباب بست و کشادہ کی طرح لبرل ہوتے تو لاہور کے تھیٹر میں مجرے دیکھ کر مزید "دل پشوری" ہوتا۔

میں گذشتہ پینتیس برس میں تھیٹر کے بارے میں چھپے میٹریل کے مطالعے اور سیمیناروں میں کی گئی تقاریر اور مضامین کو سننے کے بعد خوشگوار نتائج پر نہیں پہنچا ہوں۔ مجھے ان سب میں کسی نہ کسی انداز میں جذباتیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ڈرامے کے وجود کے جواز کی تلاش اور اسے جسٹی فائی کرنے پر بہت زور نظر آتا ہے۔ خاص طور پر تاریخی حوالوں سے .... یعنی مذہبی رسومات، راس دھاریوں، نٹ میراثیوں کی جملہ بازیوں اور سوانگ وغیرہ سے لے کر آغا حشر، رفیع پیر، حکیم احمد شجاع اور خاص طور پر امتیاز علی تاج تک، روایت کی دریافت میں ایک باقاعدہ ارتقا کی تلاش کی سعی نظر آتی ہے۔ جس کے بیچ امانت لکھنوی کی اندر سبھا پر بہت زور دیا جاتا ہے..... وغیرہم۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف ہو اور آپ میرے اس اعلان پر خفا بھی ہوں لیکن میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں.... کہ ہمارے تھیٹر کا اگر کوئی ماضی ہے تو وہ باقاعدہ تسلسل میں نہیں ہے اور جو بھی ہے اتنا قابل فخر نہیں ہے ماسوائے ایک آدھ "حادثاتی وقوع" کے.... روایت؟ میں سمجھتا ہوں بارہا اپنے تھیٹر کا تاریخ جغرافیہ کھنگالنے کے بعد کہ ہمارے تھیٹر کی روایت بہت دھندلی ہے اور اس کی بنیاد بہت نحیف۔ اپنے بزرگوں اور اپنی نسل کی مخلصانہ کوششوں کے باوجود ایسی روایت بہت دھندلی ہے اور اس کی بنیاد بہت نحیف۔ اپنے بزرگوں اور اپنی نسل کی مخلصانہ کوششوں کے باوجود ایسی روایت کا حصول ممکن نہیں ہوا۔ دریافت نہیں کی جا سکی جس کی بنیاد مضبوط ہو اور جس پر عظیم الشان (یا غیر عظیم الشان) کوئی بھی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ ماضی کا حال برا، حال کا اور بھی برا حال ہے اور مستقبل؟ یہ بھی تو ماضی اور حال کے توسط سے نظر آیا کرتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خواہ مخواہ یاسیت کا شکار ہو رہا ہوں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ آپ کو رجائیت پسندی (کہ اب تو خاص طور پر زندہ رہنے کے لئے کسی بہانے کی تلاش ضروری ہو گئی) مجبور کر رہی ہے کہ آپ مثبت سوچ اختیار کریں اور ماضی کو کھرچ کھرچ کر کوئی ایسی "روایت" ڈھونڈ نکالیں جو موجودہ صورتحال کو چھیل چھال کر کوئی اچھی اور مثبت صورت نکال سکے۔ (مثلاً" جیسے شعیب ہاشمی کہتے ہیں کہ اس "کمرشیل تھیٹر" جسے میں "لچر تھیٹر" کہتا ہوں کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ تھیٹر کو ایک مستقل اور بہت کثیر آڈئینس میسر آ گئی ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ "مستقل" اور "بہت کثیر" آڈئینس تھیٹر کو

نہیں بلکہ بے تکے 'لایعنی' بے ساختہ جگت باز جو خود کو کامیڈین کہتے ہیں انہیں میسر آئی ہے) اور بہر حال یوں آپ مستقبل کے بارے میں پرامید ہو جائیں کہ جدوجہد وغیرہ قسم کی ایکٹیوٹی بہر حال جاری رہنی چاہئے کہ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ یاس اور ناامیدی کے مارے ایک قنوطی بن جائیں گے۔ اگر ترقی پسند یا سوشلسٹ آپ کو نہیں ماریں گے تو پروفیسر جیلانی کامران ایسے روشن خیال اسلام پسند آپ کو ماریں گے اور اگر آپ کسی طرح ان سے بچ بھی گئے تو آپ خود ہی مر جائیں گے کیونکہ یاس اور ناامیدی موت کا دوسرا نام ہے اور مرا ہوا آدمی اپنے کام کا نہ دوسرے کے کام کا۔ تا آنکہ لوگ آپکی لاش کو کیش کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں۔

☆انور سجاد۔ 'نشیمن' چونی منڈی' لاہور (پاکستان)

☆اردو دنیا کے مشہور افسانہ نگار، آرٹسٹ، ڈرامہ نگار اور فن کار ڈاکٹر انور سجاد کا ایک طویل مضمون 'تھیٹر کی تلاش' ادبیات (اسلام آباد) میں شائع ہوا تھا جسے "پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء حصہ نثر کے انتخاب میں شامل کیا گیا تھا جو صفحہ نمبر ۵۵ تا ۷۲ کو محیط ہے۔ پاکستان میں تھیٹر کے موضوع پر یہ ایک نہایت ہی جامع، فکر انگریز تنقیدی مضمون ہے جو اپنے موضوع پر ایک بنیادی ماخذ بھی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے جو ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں وہ یہ ہیں: تاریخ، مسلمان اور ڈرامہ، تراجم، بیوروکریسی اور کلچر، موجودہ صورت حال، تھیٹر اور اخبارات، ۴ تجاویز ان ذیلی عنوانات میں اتنا وقیع اور سنجیدہ لوازمہ سمودیا گیا ہے کہ یہ مقالہ پاکستان میں تھیٹر کے حوالے سے استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ (الف الف)

پاکستان میں تھیٹر کا مستقبل

علی احمد

۱۹۶۶ء میں لاہور میں عظیم الشان، ڈرامہ سیمینار ہوا تھا جس میں اس سوال پر کہ آیا پاکستان میں تھیٹر کی دنیا کے کچھ لوگ گرگ باراں دیدہ قسم کے دانشوروں کا کہنا تھا کہ یہاں تھیٹر کی روایات نہیں ہے لہٰذا اسے فروغ دینا بہت مشکل ہے اس کے برعکس نوجوانوں کے ایک گروپ کا موقف تھا کہ ہمارے ہاں تھیٹر کی روایات ہیں اور اس فن کو یقیناً فروغ ہوگا طویل بحث مباحثے کے بعد آخر کار سیمینار میں نوجوانوں کے موقف کو تسلیم کر لیا گیا اور آج وقت نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ نوجوانوں کا موقف صحیح تھا۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے وہ ڈرامے جو آج کل کراچی اور لاہور میں اسٹیج ہو رہے ہیں ایک محتاط اندازے کے مطابق ان دو شہروں میں سال میں کم از کم ۵۰۔۶۰ ڈرامے اسٹیج کئے جاتے ہیں۔

پندرہ سال پہلے کے نوجوان اب نوجوان نہیں رہے ان میں سے کچھ نے ٹی وی کی راہ لی کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے اور کچھ نے اپنی سرگرمیاں محدود کر دیں تاہم ان سر پھرے نوجوانوں نے گذشتہ بیس سالوں میں کئی معیاری اور اچھے ڈرامے پیش کئے ہیں ان میں چند مشہور اور قابل ذکر یہ ہیں۔ انسپکٹر جنرل (صفدر میر) کمرہ نمبر پانچ (امتیاز علی تاج) پیسا (اظہار کاظمی) زخم ہنستے ہیں (نصیر انور) لال قلعے سے لاہور کھیت، مرزا غالب بندر روڈ، تعلیم بالغاں (خواجہ معین الدین) ذات شریف، صبح ہونے تک، نیا بخار، راکھ اور انگارے سفید پوش، آدھی روٹی ایک لنگوٹی، قصہ جاگتے سوتے کا، کاغذی شیر، شیشے کے آدمی، سونے کی دیواریں، روشنی (علی احمد) آپ کی تعریف، آداب عرض، سوئے کہاں (نعیم طاہر) لفنگے کی ڈائری، صاحب بی بی اور غلام، بیوی اپنی پسند کی، کس کی بیوی کس کا شوہر (کمال احمد رضوی)، آخری بات (بانو قدسیہ)۔ خواہ مخواہ (رشید عمر تھانوی)، قصہ ایک محبت کا (عتیق اللہ شیخ) پیسا بولتا ہے (نذیر ضیغم)، جولیس سیزر (ضیاء محی الدین)، ڈارک روم (سرمد صہبائی)، جب تک چکے سونا، راز داں اپنا (انور عنایت اللہ)، خالہ جان، شیشوں کا مسیحا (انتظار حسین) تحوخیری (اصغر بٹ)، نظام سقہ (ممتاز مفتی) سرخ قتیہ (قدرت اللہ شہاب) ہاؤس فل (جمیل بسمل) کلچر و لچر (سلیمان پیرزادہ) خوابوں کی کرچیں، صفر کی طرف (اقبال نظر) اگرچہ ان ڈراموں میں اکثر غیر ملکی ڈراموں سے اخذ کیے گئے ہیں تاہم ڈرامے معیاری تھے۔ ان میں حصہ لینے والے تعلیم یافتہ اور ذہین افراد تھے اور ان میں اکثر ٹکٹ لگا کر دکھائے گئے تھے اور ان میں اکثر ڈرامے ہر لحاظ سے کامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ان ڈراموں نے لاہور اور کراچی میں تھیٹر کو مقبول عام بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور لوگ ڈرامہ دیکھنے کی طرف بتدریج مائل ہونے لگے۔

ڈرامے کی روایات کو فروغ دینے میں ٹی وی نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا ہے ابتدا ہی سے ٹی وی کا مقبول پروگرام ڈرامہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج پورے ملک میں آڈی ٹوریم نہ ہوتے ہوئے بھی مسلسل ڈرامے ہو رہے ہیں۔ لوگ جوق در جوق ٹکٹ لے کر ڈرامہ دیکھنے آتے ہیں اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے یا یوں کہہ لیں کہ حقیقت کا تاریک پہلو ہے کہ آج کا تھیٹر بے روح ہے اسے صحیح معنوں میں تھیٹر نہیں کہا جا سکتا۔ آج کا تھیٹر فلم کی طرح تھیٹر انڈسٹری بن گیا ہے جہاں ہر شخص پیسا کمانے کی دوڑ میں مصروف ہے۔ اس انڈسٹری میں بھانت بھانت کے افراد کاروباری مقاصد کے لئے تھیٹر برپا کر رہے ہیں۔ تھیٹر کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں آج کی تھیٹر انڈسٹری ایک عارضی چیز ہے اور اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو فلم انڈسٹری کا ہوا ہے یعنی جتنی تیز رفتاری سے یہ عروج پر پہنچی ہے اتنی ہی تیز رفتاری سے یہ زوال پذیر بھی ہوگی۔ اس لئے کہ تھیٹر اور فلم انڈسٹری ٹی وی اور دیگر ابلاغ عامہ کی پوری عمارت ایک غلط مفروضے پر قائم ہے۔ مفروضہ یہ ہے کہ ابلاغ عامہ کا مقصد عوام کو تفریح مبہم پہنچانا ہے۔ ایسی تفریح جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ ہو جو ناظرین کو خواب و خیال کی دنیا میں پہنچا دے۔ [جریدہ (پشاور) ٹیلی ویژن ڈرامہ نمبر۔ مرتبہ: زیتون بانو، تاج سعید۔ ۱۹۹۶ء۔ ص۔ ۹۴۔ ۹۳]

☆پاکستان کے مشہور ڈرامہ نویس اور اسٹیج ڈائرکٹر علی احمد [پ: ۲؍ فروری ۱۹۲۷ء] نے اپنی تمام عمر رقص، موسیقی اور اداکاری کو فروغ دینے میں صرف کی۔ آزادی سے قبل IPTA سے وابستہ ہوئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد لاہور میں بچوں کے تھیٹر کی بنیاد رکھی اور پھر آرٹ تھیٹر کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ پھر کراچی منتقل ہو گئے۔ اور وہاں NATAK تھیٹر [نیشنل (اکاڈمی تھیٹر اینڈ آرسٹ کراچی] قائم کی۔ (زیتون بانو)

ڈرامے کی قوت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طویل عرصے سے لوگوں میں اسٹریٹ پلے کا رجحان تیزی سے ترقی کرنے لگا ہے اس کی بڑی وجہ

یہ ہے کہ تھیٹر اور اسٹیج کو سجانے اور اس میں شائقین کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنانے پر بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ سو ڈرامے کے شیدائی ان تمام لوازمات سے بچنے کے لئے کسی گلی کسی چوک یا کسی کھلی جگہ میں ڈرامہ کھیلنے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ چنانچہ چند اداکار گلی کے کسی نکڑ پر لوگوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور مکالمے بولنے لگتے ہیں۔ اور باتوں ہی باتوں میں وہ ون ایکٹ پلے کی پوری کہانی اسٹیج کے لوازمات کے بغیر پیش کر دیتے ہیں اور یوں تماشائیوں کو حیرت زدہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں اس سلسلے میں مدیحہ گوہر اور ان کے شوہر شاہد ندیم نے اجوکا تھیٹر کی بنیاد اسی غرض سے رکھی تھی اور انہوں نے شہر کی گلیوں اور محلوں میں کئی کامیاب ڈرامے پیش کئے اور جب اس تجربے کی بنیاد مضبوط ہوئی تو انہوں نے دیہات اور قصبوں کا رخ اختیار کیا اور وہاں کے ناخواندہ خواتین و حضرات کے پسندیدہ موضوعات کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا۔ جو بہت پسند کئے گئے۔ انڈیا کے کئی شہروں میں بھی اسٹریٹ ڈرامہ بڑا مقبول ہو رہا ہے۔ اور وہاں بھی ناٹک منڈلیاں بڑی کامیابی سے گلیوں میں ڈرامے پیش کر رہی ہیں چند دن پیشتر مجھے ایک دوست بتا رہے تھے کہ کراچی میں بھی اسٹریٹ ڈرامہ بڑا مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ جس جگہ بھی ڈرامے کے شائقین جمع ہو جاتے ہیں، آرٹسٹ فوراً اپنا کام شروع کر دیتے ہیں لیکن جونہی پولیس عوام کا مجمع دیکھتی ہے تو ان لوگوں کو مار بھگانے کے لئے ان کا پیچھا کرتی ہے اور عوام کے اس ہجوم کے ساتھ ڈرامہ آرٹسٹ بھی ان کے ہمراہ بھاگ جاتے ہیں۔ [جریدہ (پشاور) ٹیلی ویژن ڈرامہ نمبر مطبوعہ: ۱۹۹۶ء سے ایک اقتباس۔ ص۔ ۱۷]

ڈرامے کے فروغ میں تاج سعید نے خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پہلے رسالہ 'فنکار' کا ڈرامہ نمبر اور اس کے بعد ایک کتاب "ڈرامہ روایت اور مسائل" جو پاکستانی کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اور پھر رسالہ 'جریدہ' (پشاور) ٹیلی ویژن ڈرامہ نمبر [نومبر ۱۹۹۶ء ـــ ۶۰۸ صفحات] آخر الذکر خاص نمبر اپنے موضوع پر ایک دستاویزی شمارہ ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن کی ۳۲ ویں سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ٹی وی ڈرامے کو ہر زاویے سے موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک وقیع دستاویز بن گیا ہے جو پاکستان ٹی وی کے حوالے سے ہمیشہ ہی موضوع گفتگو بنے گا۔ اس میں صرف ٹی وی یا ٹی وی ڈرامہ نہیں ہے۔ اس میں ماضی حال اور مستقبل تینوں زاویوں سے تھیٹر، ڈرامہ، موسیقی، اداکاری اشخاص وغیرہ پر گرانقدر مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن ڈرامہ مذاکرہ اس نمبر کا بہت LIVE باب ہے۔ زیتون بانو اور تاج سعید نے "جریدہ" کے موضوعاتی خاص نمبروں کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ (الف الف)

پی ٹی وی ڈرامے

ارشد چھال

تفریحی پروگراموں میں پی ٹی وی کے ناظرین ڈرامہ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں، اور ٹیلی ڈرامے میں پی ٹی وی نے گذشتہ ۳۰ سالوں میں باقاعدہ اپنی ایک روایت اور پہچان قائم کی ہے۔ ڈرامے کے ضمن میں پی ٹی وی نے ہمیشہ ناظرین کے لئے مختلف موضوعات کا انتخاب کیا اور اس تفریحی سلسلے میں دلچسپی کو برقرار رکھا۔ پی ٹی وی کے ابتدائی تین سالوں میں لائیو ڈرامے پیش کئے گئے۔ اس دور کے ناظرین کا خیال ہے کہ اگر ان لائیو ڈراموں کا ریکارڈ ہوتا تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی کہ پی ٹی وی نے ابتدا سے ہی ڈرامے کے میدان میں کامیابی حاصل کیں یہاں تک کہ جب پی ٹی وی سے 'وارث' ٹیلی کاسٹ ہوا تو آٹھ بجتے ہی گلیاں اور بازار سونے دکھائی دینے لگے۔ ڈرامہ سیریز اور ڈرامہ سیریل کے ساتھ ساتھ طویل دورانیے کے ڈراموں نے ناظرین میں اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ لوگوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ پی ٹی وی کے ڈراموں سے نہ صرف فن کاروں نے بلکہ پی ٹی وی کے پروڈیوسروں، ڈیزائنروں، کیمرہ مینوں اور انجینئروں تک نے بہت شہرت حاصل کی۔ یاور حیات، شہزاد خلیق، نصرت ٹھاکر، ساحرہ کاظمی اور دیگر کئی ہی ڈرامہ پروڈیوسروں کو ہم لوگ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ پی ٹی وی سے اب تک ہزاروں ڈرامے پیش کئے جا چکے ہیں جنہوں نے نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر شہرت پائی اور ایوارڈ حاصل کئے۔ تاہم پی ٹی وی نے اپنے ڈراموں میں ہمیشہ اپنی مثبت اقدار، ثقافت، اور تہذیبی روایتوں کی عکاسی کی۔

["پاکستان ٹیلی ویژن کے ۳۲ سال مطبوعہ: جریدہ (پشاور) ٹیلی ویژن ڈرامہ نمبر۔ نومبر ۱۹۹۶ء]

ازم کی تلاش

غلام رسول

میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ میری تصاویر میں رنگ تازہ لگیں اور ساتھ ہی اپنی پوری طاقت کا مظاہرہ بھی کریں۔ رنگوں میں اس قدر اثر ہو کہ وہ تصویر دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیں اور وہ بس ان میں محو ہو کر رہ جائے۔ رنگوں کے امتزاج اس قدر پرکشش ہوں کہ وہ ایک جادو کی سی کیفیت پیدا کر دیں۔

دیواریں اور خزاں کچھ عرصہ سے میرا موضوع ہیں۔ رنگ دھیمے اور subtle ہیں تاکہ موضوع کے موڈ کو اچھی طرح اجاگر کر سکیں۔ سری بہلول کی دیواریں ایک خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہاں صدیوں پہلے کی بدھ تہذیب دفن ہے۔ کبھی وہاں بدھ مت کے پجاری تھے پھر بہلول لودھی نے وہاں قلعہ بنایا اور آج ان سب کے اوپر جدید یعنی بیسوی صدی کے لوگ رہتے ہیں۔ تہذیبوں کے انبار نے اس گاؤں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ ماضی بعید سے لے کر حال تک فن تعمیر دیکھنے کو ملتا ہے۔ صبح اور شام کے دھندلکوں میں یہ گاؤں ایک عجیب نظارہ دیتا ہے۔ پتھروں، اینٹوں اور مٹی سے بنے ہوئے مکانات اور دیواریں ایک عجیب جادو والی کیفیت رکھتی ہیں۔ یہاں کی دیواروں پر خون کے دھبے ہیں۔ بڑھتی ہوئی فوجوں کے بوٹوں کی آواز ہے ہزاروں انسانی جسم اس میں گڑے دیکھتا ہوں۔ تاریخ کسی کا ساتھ نہیں دیتی اور وقت ہر زمانے کے ساتھ بدلتا ہے۔ خزاں کے موسم میں گرتے ہوئے پتے ہوا کے روش پر سفر کرتے ہیں۔ اور روشنی میں چمکتے ہوئے ایک خاص موسیقی پیدا کرتے ہوئے اس گر کر اس میں دفن ہو جاتے ہیں۔ سفر زندگی اختتام کو پہنچتا ہے۔ ان کی جگہ نئے پتے اگ آتے ہیں۔ آج کے مشینی دور میں انسان اور قدرت کی ہم آہنگی اور ذوق جمال مزید پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ انسان بھی مشین کا پرزہ بن کر رہ جائے۔ قدرت اور انسان کو قریب لانا اور ہم آہنگ کرنا میری تصویر کا اولین مقصد بھی ہے۔ "سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات" میری تصاویر میں زندگی و موت، امید کی کرن اور جہد مسلسل کے اشارے ملتے ہیں میری کوشش ہے کہ میری

تصاویر حقیقت کے بالکل قریب ہوں۔ ابھی سفر فن جاری ہے اور منزل دور ہے۔
[ازم کی تلاش۔ مطبوعہ: ادبیات (اسلام آباد) ۱۹۹۳ء ص: ۲۴۰۔ ۲۳۹]

تجربه ، رنگوں اور خطوں کا ایک نیا جہان معنی

علی تنہا

زوار حسین کہتا ہے کہ میرے نزدیک مصوری کے عمل کی دو ماہئیتیں ہیں۔ ایک تو آپ مصوری فی الذہن کہہ لیں اور دوسری کو مصوری فی العمل سمجھ لیں۔ ذہنی اعتبار سے ہر انسان ایک مصور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس اصول کو پالیا جائے جس کے ذریعے ہم جان سکیں کہ حصول ادراک ہے کس چڑیا کا نام؟ اور ذہین انسان کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں انسان ناطق کی تہہ میں ایک خاموش حیوان مصور موجود رہتا ہے۔ ہم اس کی شناخت ذہن کے مختلف افعال کی مدد سے سر انجام دے سکتے ہیں۔ یہ تو ہوا، مصور فی الذہن، اب آیئے دوسری طرف، یہ جو مصوری فی العمل ہے، یہ ایک فن ہے یعنی ایسا فن جو دوسرے فنون پر اولیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا آغاز قبل از تاریخ سے ہے۔

زوار حسین بتاتا ہے کہ میرے خیال میں مصورانہ فضیلت، بڑی جبلتوں کے ہم مرتبہ ہے۔ گو میگڈول صاحب نے اس کا ذکر جبلت کے طور پر نہیں کیا۔ یہ اظہار وعصر کے اعتبار سے، اپنی تاریخ کے استقلال وتقدم کی بنیاد پر کسی بڑی جبلت سے ہر گز کم نہیں ہے۔

چونکہ مصور کا تعلق عالم نگاہ سے ہے۔ اس لئے مصوری کے عمل کو چار بصری عناصر کے طور پر ہم دیکھ سکتے ہے۔ یعنی .... نمبر ایک سطح نمبر ۲ روشنی نمبر ۳ رنگ اور نمبر ۴ ہیت، مصوری کے ہر عمل میں یہ چار عناصر موجود رہیں گے۔ گویا اس لحاظ سے مظاہر کی دنیا کا بیشتر رقبہ انہی عناصر پر محیط ہے اور ان عناصر کی تفہیم کا یہی اساسی ذریعہ ٹھہرے گا۔ جب کوئی بڑا مصور کسی تمثال یا مظہر کو بیان کرتا ہے۔ فی الحقیقت یہ بیان دیتا ہے کہ اس مظہر کے بارے میں، اس کی معلومات کا دائرہ کس حد تک قوی یا کمزور ہے۔ مصوری کا کلیہ عمل فہم وادراک کا عمل ہے۔

زوار حسین کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں تخلیقی عمل بہر نوع جاری ہے۔ ہر چند Talent کافی ہے۔ مگر اس کی شناخت کے ذرائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تخلیقی عمل قدرت کا عظیم عطیہ ہے۔ مگر اس کو جاننے کے لئے ہمارے ہاں اب تک کیا کیا گیا ہے؟ خیر۔ فن کو جاننے کے لئے شعور نقد کی ضرورت ہے۔ اور نقد بہر کیف ایک اکتسابی عمل ہے۔ جس کے ذریعے ہم فن کے حسن وقبح کو جان سکتے ہیں۔ اور اصل ونقل کے مابین امتیاز قائم کر سکتے ہیں۔ سو جب تک فن کے حقیقی منصب کو نہ سمجھ سکیں، زندگی سے اس کے روابط کے مفہوم کا علم ہر گز نہیں ہو سکتا۔ تجسس کے بغیر فن کار بے معنی ہے۔ اس کے لئے زوار حسین نے مصوری کے تجریدی سفر کو بلیغ اور پر حیرت بنانے کے لئے قیام کیا ہے۔ اور اس وقفۂ عارضی میں اس نے مغرب کے فن وفلسفہ کے بارے میں یادگار مقالات رقم کئے ہیں۔ تاکہ سامعین کو فن کی اساسی مباحث کے بارے میں بتایا جائے۔

زوار حسین نے ایک بار دوران گفتگو بتایا کہ اردو کے مشہور ناقد محمد حسن عسکری مرحوم کو اردو کی تنگ دامانی کا خیال ستاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فرانسیسی مطالب کو اردو پوری صحت کے ساتھ، اس کے ثقافتی وتہذیبی پس منظر میں بیان کرنے سے عاجز ہے۔ مگر اس کے برخلاف زوار حسین کا دعویٰ ہے کہ اس نے فرانس کے نابغۂ دہر فن کاروں کے خیالات کو اردو میں ترجمہ کرتے وقت ذرہ بھر دقت محسوس نہیں کی۔ بلکہ اردو زبان کو یوں استعمال کیا ہے کہ مجھے شک ہے کہ کیا فرانسیسی زبان بھی ان مطالب کو اس توانائی، حسن اور گہرائی سے ادا کر سکتی ہے؟

پاکستان کے مشہور دانش ور مصور کے فن پر علی تنہا نے ایک مضمون 'زوار حسین کا فن' تحریر کیا تھا جو 'ادبیات' [شمارہ ۲۲۔ سرما ۱۹۹۳ء۔ ص: ۸۱۔ ۲۸۰] میں شائع ہوا تھا، اسی مضمون سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔ زوار حسین ایک مصور ہی نہیں، ایک دانشور بھی ہیں۔ فن کے حوالے سے ان کے کئی ایک مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ بقول علی تنہا: وہ ایک جاگا ہوا COULARIST ہے۔ اسی واسطے زوار حسین کی پینٹنگس، حیات، موضوع مواد" اور تکنیک کے حوالے سے ایک الگ بیان کی حامل ہیں۔ (الف الف)

مصوّری اور مصوّری

گلزار آفاقی

مصوری زمانہ قدیم سے ہی انسان کی تخلیقی سرگرمیوں کا ایک اہم اور موثر ذریعہ رہی ہے۔ غار کا اندرونی ماحول اندھیرے اجالے کے پر اسرار اور ڈرامائی امتزاج کے ساتھ قرون اولیٰ کے مکینوں کی صناعی کی صلاحیتوں کو انگیخت کرتا اور وہ اپنے گردو پیش کے مشاہدوں اور خوف وخوشی کے ذاتی احساسات اور تجربوں کو غار کی دیوار پر نقش کر دیتے۔ آگ اور پتھریلے آلات کی دریافت نے غار کی مصوری کو مزید جلا بخشی۔ اب قدیم انسان غار کے اندر سورج کی محدود اور تنگ بند سی روشنی کے بعد بھی وقت کی نسبتاً پھیلی ہوئی کائیوں میں آگ کے الاؤ میں دیواروں پر تصویر کشی کے ساتھ پتھر کی مورتیں اور مجسمے بھی تخلیق کرنے لگا۔ یورپ اور ایشیا میں دریافت ہونے والے آثار قدیم دور کے انسان کی تخلیقی سرگرمیوں کے زبردست امین بن کر سامنے آئے ہیں۔ فرانس میں لیسکاکس (Lascaux) کے غاروں میں شکاری جانوروں کے نقوش، البتامیرا کے غاروں میں منقش سانڈھ، ایلورا اور اجنتا کی دیواری نقش نگاری، قافلہ انسانی کے ابتدائی ادوار کی تخلیقی وصناعی کاوشوں کی دستاویزی شہادتیں ہیں۔ وقت کے اگلے مراحل میں موہنجو داڑو اور ہڑپہ سے دریافت ہونے والی رقاصہ کی مورتی باریش پروہت کا دھڑ، مہر گڑھ (بلوچستان) کے ظروف، گندھارا تہذیب کے تصویری آثار، اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور بطور خاص شاہراہ قراقرم کے گردو نواح میں حجری کندہ کاری (Rock Carving) اور تصویر کشی کے دوسرے نمونے اس ارتقاء کی داستان بیان کرتے ہیں، جس کا نقش اول کسی نیم تاریک غار میں ابھرا تھا اور جو سفر کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا برصغیر میں آریائی، ایرانی، یونانی، ترک، وسطی ایشیائی اور یورپی اثرات کے جلو میں مصوری کے مغلیائی، گجراتی، پہاڑی، پالا، راجپوت اور بنگالی مکاتب فکر کی ترتیب وتشکیل پر منتج ہوا۔ پھر مصوری اور نقش گری کے اس مجموعی کینوس پر آزادیٔ ہند سے قبل کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور کی نقاشی کی درسگاہوں سے جنم لینے والے متنوع اسالیب کے اثرات مرتب ہوئے۔ فنون لطیفہ کی عالمی تحریکوں کی گرمی بھی ہماری مصور برادری کی تخلیقی سرگرمیوں کا رزق بنی۔ ہماری مصوری کے ارتقا کے اس وسیع وعریض کینوس کو سجانے میں برصغیر کے نامور مصوروں نند لال بوس، جیمنی رائے،

اوبندر ناتھ ٹیگور، رابندر ناتھ ٹیگور، روی ورما، امرتا شیر گل، عبدالرحمٰن چغتائی، سوبھا سنگھ، ایس این گپتا، بی سی سنیال، استاد اللہ بخش، فیضی رحیمن، زین العابدین، اینا مولا احمد، شاکر علی اور زبیدہ آغا نے نمایاں رنگ بکھرے جب کہ آج کے عہد میں پاکستانی مصوری پر صادقین، مرتضٰی بشیر، حنیف رامے، اے جے شمزہ، احمد پرویز، ایس صفدر، معین نجمی، خالد اقبال، اعجاز الحسن، کولن ڈیوڈ، سعید اختر، منصور، اے جمیل نقش، بشیر مرزا، منصور راہی، شاہد سجاد، اے آر ناگوری، اقبال جعفری، گل جی، ناہید علی، قدیر نثار، مہر افروز، سلیمہ ہاشمی اور اقبال حسین کے نام نمایاں ہیں۔ غلام رسول بھی جہان رنگ و روشنی کے اس قافلے کا ایک نقش گر ہے۔ [مضمون "غلام رسول" سے ایک اقتباس۔ مطبوعہ: ادبیات، شمارہ ۲۵ ، ۱۹۹۳ء۔ ص:۲۴۱]

سرورق کو مجھ سے محبت ہے

اسلم کمال

"سرورق ڈیزائن میرے نزدیک محض ایک کمرشیل جاب نہیں ہے۔ سرورق کو مجھ سے محبت ہے، مجھے سرورق سے عشق ہے، یہ میرے ساتھ عہد بہ عہد چلتا آرہا ہے۔ میں اس کی بدولت اب تک فطری دانش کے ارتقا کا شاہد ہوں۔ یہ میرے جوہر تصویر کشی کو چمکاتا ہے، یہ مجھے حریص لذت تخلیق بناتا ہے۔ کتاب کے سرورق کا نہایت مختصر سا یہ انچوں میں رقبہ دل عاشق کی طرح پھیلے تو میری لائبریری ہے، میری لیبارٹری ہے اور میری رصدگاہ ہے اور سمٹے تو ایک آئینہ بھی ہے جس میں اپنے فنی خدوخال سنوارتا ہوں، یہ ایک چوکھٹا بھی ہے اور ایک فریم بھی ہے جس میں میرا ہر ایک خیال ہر ایک خواب تصویر بن کر از خود فٹ ہو جاتا ہے۔ سرورق کا یہ فریم میں جب چاہوں میرے حجرۂ وجدان کی کھڑکی بن جاتا ہے جہاں میں کائنات کا مشاہدہ کرتا ہوں اور زمان و مکان کے حیرت کدہ کے پراسرار اجنبی خلاؤں کی تیرگی روشنی کا دریا بن کر میری روح میں ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہے۔ کہکشاؤں سے تسلسل اور توانائی، آفتابوں سے روشنی، تپش اور شعاعیں، ماہتابوں سے نور، کرنیں اور قوسین اور ستاروں سے زاویے، مثلثیں اور چوکوریں سمیٹ کر میں واپس آجاتا ہوں اس دنیا میں جو میری نہیں مگر میں اس سے ہوں، اس کیلئے ہوں۔"

یہ لمحہ ایثار کا ہے اور یہ شہر مفارقت ہے۔ یہ گلی جس میں نقش پائے رفتگاں مدھم پڑچکے ہیں، چند قدم آگے جہاں دیواروں پر تنہائی کا رنگ ہے اور دروازے پر جس کے خاموشی کا قفل پڑا ہے۔ یہ میرا نگار خانہ ہے۔ جس میں میرا دروجدان کھلتا ہے میں "اسلم کمال" اس کی دہلیز پر ان گنت زمانوں سے کھڑا ہوں۔ میں وقت کی الجھی ہوئی لہریں کھول رہا ہوں، میں کھوئے ہوئے تناظر کی تلاش میں ہوں، میں ایک مقدس رزمیہ کی بکھری ہوئی ابجد کا امین ہوں، میں فنا کے لشکروں کے مقابل شہر بقا کا آخری محافظ ہوں، یقین میری قوت، استغراق میرا اجر اور صداقت میری نجات دہندہ ہے۔ میں "لا" سے "الا" کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ نوری سالوں کا یہی سفر خلائی جزیروں کے آگے دور افتادہ کہکشاں تک ہے، مجھے ان گنت آفتابوں، مہتابوں اور ستاروں سے نوازے گا۔ تب میں لوٹ آؤں گا نئی ابجد اور تازہ رنگ لے کر اپنے جلو میں خلا کے نئے آفاق لے کر تب میں اپنے آپ سے آملوں گا۔ لاریب یہ سلسلہ ہے انوکھی فتوحات کا اور یہ بشارت ہے ان کے لئے جو حمد کرتے ہیں سرچشمہ رنگ و نور کی۔ جو بڑا مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔" [اسلم کمال۔ ۵۶۸، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور]

☆پاکستان کے مشہور مصور، خطاط، ڈیزائنر، ادیب، شاعر، کالم نگار اسلم کمال کی یہ دو خوب سیرت تحریریں، شاذیہ رحمٰن کے مضمون "اسلم کمال: ایک ہمہ جہت فن کار" [مطبوعہ: ادبیات۔ ص: ۲۲۶-۲۲۷، شمارہ ۲۳، بہار ۱۹۹۳ء] سے اقتباس کی گئی ہیں۔ سرورق ڈیزائنر اسلم کمال نے شاعر کے یادگار کرشن چندر نمبر کا سرورق بھی ڈیزائن کیا تھا۔ (الف الف)

پاکستانی خطِ کوفی

ابن کلیم

اسلم کمال نے خطِ کوفی کے گول م، کو اپنی مخصوص وضع قطع دے کر تکونی اشکال میں ڈھالا ہے اور مملکت خداداد پاکستان کے پرچم ستارہ و ہلال کی جھلک اس خط میں دکھائی ہے۔ اسلم کمال نے اپنے مخصوص انداز کوفی کے دوائر کو پرکار کی مدد سے مکمل طور پر چاند کی شکل دے دی ہے اور دیگر کئی حروف کو بھی نوک پلک کا اپنا ایک الگ اور منفرد انداز بخشا ہے اور اپنی پہچان کا حوالہ بنایا ہے۔ ان کے ہاں تکونوں، چاند نما دائروں کی نوکوں اور جیومیٹری کے تمام اوزار کے استعمال سے صفحۂ قرطاس پر بکھرے ہوئے تیکھے انداز کے الفاظ کی ساخت یہ سب خوبیاں اپنے اندر بھرپور انفرادیت سمیٹے ہوئے ہیں۔ اسلم کمال نے خط کوفی میں جو تصرف کیا ہے وہ اب سے پہلے کسی کی سوچ میں نہیں آیا تھا یعنی سینکڑوں سال سے خط کوفی سیدھی لائنوں اور کرولائنوں میں ایک ہی حجم سے لکھی ہوئی سکیل کی صورت والی تحریر کا نام ہے مگر آپ جب اسلم کمال کی رقم کردہ خطاطی کی کوئی بھی تصویر دیکھیں گے تو آپ کو ایک خوبصورت تصویری پیکر جمال نظر آئے گا۔ ان کے ہاں "س" کے دندانے بھی ایک نوک پر بنتے ہیں۔ "ر، د" نچلی طرف کوفی کی نوک بناتا ہے تو بائیں طرف اندرونی ڈھلوان خط نسخ کے "ر" سے مشابہت کرتی ہے اور "ح" کے شروع والے کرو کو دونوں طرف موڑ کر ڈبل نوک بنائی گئی ہے۔ نون کو چاند کی شکل دے دی ہے تو میم کو ایک نقطے پر مشتمل کھڑا سر بنایا ہے۔ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ اسلم کمال نے خط کوفی کو بنیاد بنایا ہے مگر اس میں جدتیں کی ہیں لہٰذا اس کا نام طرز کمال ہونا چاہئے، یہ جائزہ ہے مگر ہماری دانست میں اسلم کمال کے خط کوفی کا یہ نام ہونا چاہئے "پاکستانی کوفی" [مطبوعہ: ادبیات، شمارہ ۲۳۔ ۱۹۹۳ء صفحہ: ۲۳۰]

تذکرۂ خطاطین

محمد راشد شیخ

ماضی قریب میں ہمارے ہاں پاک و ہند میں بھی فن خطاطی میں جو بلند معیار پیش کیا گیا ہے وہ کسی طرح بھی عالمی معیار سے کم نہیں۔ برصغیر میں بیسویں صدی میں فن خطاطی کے تین بڑے دبستان نظر آتے ہیں، یعنی لاہوری، دہلوی، اور لکھنوی۔ لکھنوی طرز کے سب سے بڑے استاد شمس الدین اعجاز رقم گزرے ہیں۔ دہلوی طرز کے امام محمد یوسف دہلوی (م ۱۹۷۷ء) تھے جن کی روش کو ان شاگرد رشیدہ عبدالمجید (م ۱۹۹۴ء) نے آگے بڑھایا۔ لاہوری طرز کے بانی اور موجد طرز جدید صوفی عبدالمجید پرویں رقم (م ۱۹۴۶ء) تھے۔ ان کی ایجاد کردہ روش کو قبول عام کا

درجہ ملا۔ پرویں رقم کے انتقال کو پچاس سال ہو چکے ہیں، مگر اب تک کوئی خطاط ان کی ایجاد کردہ روش میں مزید خوبصورت اضافہ نہ کر سکا اور بعد میں آنے والے خطاطوں نے انہی کی تقلید کی۔ قیام پاکستان کے بعد کے دور میں جن حضرات نے سب سے معیاری کام پیش کیا ان میں حافظ محمد یوسف سدیدی اور سید نفیس الحسینی مدظلہ شامل ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف خط نستعلیق کا اعلیٰ معیار پیش کیا، بلکہ معیاری عربی خطوط میں بھی مہارت کا ثبوت دیا۔

ہمارے عہد میں اسلامی خطاطی کے نادر شہ پاروں پر مشتمل کتب خاصی تعداد میں طبع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، البتہ اردو زبان میں اس موضوع پر کام کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ اردو میں، اس موضوع پر جو کتب شائع ہوئیں ان میں معیاری کتب کی تعداد اتنی بھی نہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکے۔ ماضی میں جو چند ایک کتب شائع ہوئیں ان کا طباعتی معیار پست ہے نیز ان میں کئی اغلاط بھی در آئی ہیں۔ اس موضوع پر، اردو زبان میں تحقیقی کتاب کی ضرورت، راقم عرصے سے محسوس کرتا تھا، دیگر یہ کہ ہمارے ہاں اب تک، عظیم خطاطوں پر انفرادی نوعیت کا کام، جیسا کہ ایران، مصر ترکی وغیرہ میں ہوا، نہ ہو سکا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیے کہ حافظ محمد یوسف سدیدی کے انتقال کو دس سال، محمد یوسف دہلوی کے انتقال کو بیس سال اور عبدالمجید پرویں رقم کے انتقال کو پچاس سال ہو چکے ہیں، مگر اب تک ان کے فن، حالات زندگی اور نوادر کے بارے میں مفصل تو کیا، مختصر کتاب بھی شائع نہ ہو سکی۔ ان کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ چند اخبارات و رسائل ہیں۔ یہ وہ عظیم خطاط ہیں کہ اگر کوشش کی جائے تو ان میں سے ہر اک کے بارے میں کم از کم ایک ایک مفصل کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔

عہد حاضر میں خطاطی کے موضوع پر معیار طباعت کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے بہتر کام ترکی اور ایران میں ہوا ہے، ہمارے ہاں اردو زبان میں چند ایک کتب شائع ہوئی ہیں، مگر وہ طباعت کے عالمی معیار سے بہت پیچھے ہیں۔ راقم، اردو زبان میں کسی ایسی کتاب کی ضرورت کئی برسوں سے محسوس کرتا تھا، جس میں نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے عظیم خطاطوں کی نمائندگی ہو، بلکہ اس صدی کے نامور خطاطوں کے کام کا عمدہ انتخاب بھی شامل ہو، نیز خطاطوں کے حالات زندگی بھی درج ہوں۔ اس کے علاوہ ایسی کتاب جدید طباعت سے آراستہ ہو۔ کیوں کہ خراب طباعت خطاطی کے حسن کو دھندلا کر دیتی ہے۔

☆ پاکستان سے فن خطاطی پر ایک نہایت ہی معیاری معلوماتی، دیدہ زیب کتاب تذکرۂ خطاطین آئی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات اس اعلیٰ درجے کی کتاب میں شامل سند سے لئے گئے ہیں جسے محمد راشد نے تحریر کیا ہے۔ یہی اس کتاب کے مرتب بھی ہیں۔ اردو میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے خاصے کی چیز ہو گئی ہے اور محفوظ کئے جانے کے قابل ہے۔ مستقل استفادے کی اس کتاب کے بارے میں کوئی بھی رائے کتاب کی معنویت کو مکمل طور پر اجاگر کرنے سے قاصر رہے گی۔ فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے ہند و پاک سے اس موضوع پر شائع ہوئی یہ گرانقدر کتاب ہر اچھی رائے سے بالاتر ہے۔ یہ کتاب نئے ہزارے اور نئی صدی کو ایک خوب سیرت تحفہ ہے جو ہندوستان میں بھی درج ذیل پتے پر دستیاب ہے:

DIRECTOR APPLIED PUBLICATION PVT. LTD.,
1739 / 3 (BASEMENT),NEW KOHINOOR HOTEL,
PATAUDI HOUSE, DARAYA GANJ, NEW
DELHI-110002

ادارہ شاعر اس کتاب کی خریداری کے لئے قارئین شاعر سے سفارش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ براہ راست محمد راشد شیخ کو بھی مبارک بادی کا خط لکھا جائے۔ ان کا پتہ بھی درج کیا جا رہا ہے: (الف الف)

MHD. RASHID SHAIKH,
B-108, AL-FLAH HOUSING PROJECT
MALIR HALT, KARACHI- 75210 (PAK)

تذکرۂ خطاطین پر رائے

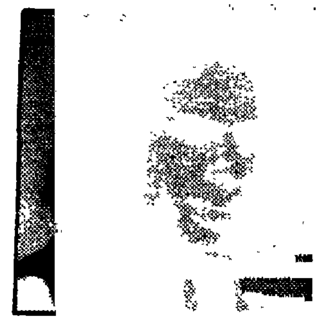
مشفق خواجہ

انسان نے اپنے ذوقِ جمال کے اظہار کے لئے جو ذرائع اختیار کئے ہیں ان میں اسلامی خطاطی اس اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے کہ یہ محض ایک فن لطیف نہیں، کئی فنون لطیفہ کا مجموعہ ہے۔ صریر خامہ دنیا کی قدیم ترین موسیقی ہے جو حروف میں منجمد ہو کر مصوری کی انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔ اسلامی خطاطی کا یہ امتیاز بھی اپنی مثال آپ ہے کہ اس کا بڑا ذخیرہ کلام مجید، احادیث نبوی اور حکیمانہ اقوال واشعار پر مبنی ہے۔ بیشتر بڑے خطاطوں نے موضوعات کے اسی دائرے میں رہتے ہوئے اپنے کمال فن کا اظہار کیا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطاطی سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں، ذہن جلا پاتا ہے اور دل پاکیزہ خیالات کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جس میں بیسویں صدی کے ۲۰ر ممتاز خطاطوں کے فن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور اسی مطالعے کو ان خطاطوں کے کمالِ فن کے نمونوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ترکی، مصر، عراق لبنان، پاکستان اور ہندوستان کے ان مایہ ناز خطاطوں کو ہم قریب سے دیکھتے ہیں جنہوں نے چودہ صدیوں کی خطاطی کی روایات کو اپنے ذاتی امتیازات کے ساتھ ہم تک پہنچایا ہے۔

محمد راشد شیخ خطاطی کی تاریخ اور فن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس دشت بلکہ جنت نگاہ کی سیاحی میں ایک عمر بسر کی ہے۔ انہوں نے خطاطوں اور ان کے فن کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کس حد تک مستند ہے اس کا اندازہ 'کتابیات' سے کیا جا سکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ یہی نہیں انہوں نے علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ عملی تگ و دو بھی کی ہے۔ خطاطی کے نمونے اور خطاطوں کے حالات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جو صعوبتیں برداشت کی ہیں، ان کی مثالیں پرانے زمانے میں ملیں تو ملیں، موجودہ زمانے میں ناپید ہیں۔ یہ کتاب نہیں عشق و جنوں اور محنت و مشقت کے سفر کا حاصل ہے۔ کتاب کی معنوی و صوری خوبیاں مصنف کے علمی ذوق اور ذوقِ جمال کی آئینہ دار ہیں۔

3-D, 9/24, NAZIMABAD, KARACHI- 18 (PAK)

□□



جون ایلیا

طفلانِ کوچہ گرد کے پتھر بھی کچھ نہیں
سودا بھی ایک وہم ہے اور سر بھی کچھ نہیں

میں اور تجھ سے خود کو چھپاؤں گا یعنی میں
لے دیکھ لے میاں! مرے اندر بھی کچھ نہیں

قطرہ وہ بے حساب گماں ہے کہ الاماں
اس کے حساب سے تو سمندر بھی کچھ نہیں

نسبت میں ان کی جو ہے اذیت وہ ہے مگر
شہ رگ بھی کوئی شے نہیں نشتر بھی کچھ نہیں

بس اک غبارِ وہم ہے یک کوچہ وہم کا
دیوار بود کچھ نہیں پس در بھی کچھ نہیں

اک گرد کے قرار کا حالِ محال ہے
تیری گلی بھی اور مرا گھر بھی کچھ نہیں

یہ شب کا رقص و رنگ تو کیا، سن مری کہن
صبح شتاب کوش کا دفتر بھی کچھ نہیں

پہلو میں ہے جو میرے کہیں اور ہے وہ شخص
یعنی وفائے عہد کا بستر بھی کچھ نہیں

کیسا ڈراؤنا ہے یہ شہر وجود بھی
ایسا ڈراؤنا کہ یہاں ڈر بھی کچھ نہیں

یہ شہر دارو مولوی و محتسب ہی کیا
پیر مغان و رند و قلندر بھی کچھ نہیں

گزرے گی جون شہر میں رشتوں کے کس طرح؟
دل میں بھی کچھ نہیں ہے زباں پر بھی کچھ نہیں

●R-273, sector-14-b
Shadman Town, north karachi- (pak)



محسن احسان

نذرِ آتش

ہوا میں اڑتے پرندوں سے گفتگو کرتے
لہو بدن میں جو ہوتا تو ہاؤ ہو کرتے

تمام شہر ہے کاذب گواہوں کا مسکن
حصول عدل کی کس در پہ جستجو کرتے

ہمیں بھی سبز رتوں کی بشارتیں ملتیں
زمیں میں بیج اگر جرأت نمو کرتے

اگر وصال بھی ہوتا تو ہم ستارہ شمار
کبھی ہوا سے کبھی خود سے گفتگو کرتے

کہیں نہ جیب و گریباں نہ تار پیراہن
رفو گرانِ ہنر مند کیا رفو کرتے

پھر اس کے بعد تلاش خدا نہ تھی مشکل
کچھ اور روز اگر اپنی جستجو کرتے

بس ایک بار جو توفیق التجا ملتی
ہم ایک سجدۂ شکرانہ بے وضو کرتے

حنوط ہو گئیں وہ خواہشیں کہ جن کیلئے
رقم کچھ ہم بھی سرِ لوحِ آرزو کرتے

نظامِ وقت پہ محسن جو دسترس ہوتی
طلوعِ ماہ سرِ مشرق سبو کرتے

●85-G, III, Hayat Abad,
Peshawar(Pak)

ستّار سید

مایوس کیوں ہے اے دلِ خلوت شعار چل
میلہ لگا ہوا ہے سر کوئے یار چل

ممکن ہے مل ہی جائے کہیں قافلۂ عم
ہے رہنمائے شوق، سمندر غبار چل

کب تک رہے گا سایۂ دیوار غیر میں
یہ شہر اس قدر نہیں مہمان دار چل

دوشِ ہوا پہ برگِ خزاں دیدہ کی طرح
وحشتِ طلب میں موجِ خیالِ بہار! چل

ایجاد کر کوئی نیا منہاجِ آرز
راہِ قدیم پر نہ غریب الدیار چل

سیّد کہاں ہے طبعِ رواں، دیکھ تو سہ
موسم بدل رہا ہے سوئے جوئے یار چل

141-D,Angoori Bagh Colony
aghbanpura, Lahore (Pak)



محسن بھوپالی

ھائیکو

پھولوں کا موسم
آؤ مل کر لہرائیں
خوشبو کا پرچم

○

میں نے دیکھا ہے
اس کی روشن آنکھوں میں
کل کا سپنا ہے

○

پہلی بارش میں
سب منظر آجاتے ہیں
اصلی حالت میں

○

دھوکا ہے جانی
اوپر ہے برفیلی تہہ
اندر ہے پانی

○

کاٹا جب امرود
مجھ سے پہلے کھانے کو
کیڑا تھا موجود!

○

دنیا سے چھپ کر
آ۔۔ فطرت نے پھیلادی
کہرے کی چادر

●Block- IV, F-5/3A
Nazimabad Karachi (Pak)



ناصر شہزاد

گیت

سہیلی۔۔ سیاں بڑے بے درد
جب سے لگے یہ نیناں ان سے ہوگیا چہرا زرد
سہیلی، سیاں بڑے بے درد
ہردے اندر آس براجے
کستوری میں باس
تن کی ترشنا اور بڑھائے پی درشن کی پیاس
بانورے بادل گھومیں جھومیں چھت کی راتیں سرد
سہیلی، سیاں بڑے بے درد
ہونٹ، عناب کی کھلتی کلیاں
رنگ شہاب، گلاب
کچے گھڑوں نے جیت کے چھوڑے کتنے چڑھے چناب
دھرتی کے سب ارپن درپن ریت، بگولے، گرد
سہیلی، سیاں بڑے بے درد
وید، وچار، قدیم کتھائیں
گیہوں، جوٹبار
سولہ سنگھار بناں پریتم کے بے مصرف، بے کار
جیون روگ وجوگ کا پانسہ نرد سے بچھڑے نرد
سہیلی، سیاں بڑے بے درد
دریا۔۔ اندر، محل.. منارے
مورتیاں، مندر
پانی کی کتنی پرتیں ہیں او گوپی چندر
لکھنے بیٹھوں تو لگ جائے لمبی چوڑی فرد
سہیلی، سیاں بڑے بے درد

●Mohalla Islamabad
Sahiwas, Punjab (pak)



اظہر جاوید

ھجرت

سنا ہے کچھ پرندے موسموں کے ساتھ ہجرت کرتے رہتے ہیں
کہیں جب برف گرتی ہے
ہوا جب سرد ہو کر تیر سے برسانے لگتی ہے
فضا جب بے وفا ہو کر بہت تڑپانے لگتی ہے
پرندے کوچ کرتے ہیں
پرانی بستیوں سے اجنبی دیسوں کی راہوں پر
سفر آغاز کرتے ہیں
نئی پرواز کرتے ہیں
وہی حالات ہیں، موسم نے پھر انداز بدلا ہے
کسی کی چاہتوں نے نغمگی کا ساز بدلا ہے
وفا کا رنگ دھندلایا، پڑی ہے برف جذبوں پر
جفا کے سرد جھونکوں نے کیا ہے دل کو اب چھلنی
یہ ہونی تو نہیں ٹلنی
چلو پھر کوچ کر جائیں
وہ جن کے واسطے زندہ تھے ان کے ہی اشارے پر
کہیں پردیس کی بے مہر دنیاؤں میں مر جائیں

'Bhagwan Street, old Anarkali,
Lahore (Pak)

علی حیدر ملک

66, Noor Plaza, Block-M, North Nazimabad,
Karachi (pak)

دیوار کا لکھا

چلتے چلتے ذرا دیر کو وہ اچانک ٹھٹکا پھر ایک دم رک گیا۔ اپنے سامنے ایک
نید کنواری دیوار کو دیکھ کر اس کی انگلیوں میں شہوت ہونے لگی۔ وہ ٹکٹکی باندھے
ار کو دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لوگ باگ آجا رہے تھے۔
تے بولتے، اپنی اپنی دھن میں مگن۔ کسی کو نہ اس کی پروا تھی نہ اس دیوار کی۔ اسے یہ
چ کر قدرے حیرت ہوئی کہ لوگ اس سفید کنواری دیوار کے وجود سے بے خبر
ں ہیں۔ یہ لوگ اسے دیکھ کیوں نہیں رہے۔ وہ دیوار انہیں اپنی طرف متوجہ
ں نہیں کر رہی؟ وہ کچھ دیر کھڑا یوں ہی سوچتا اور حیرت کرتا رہا۔
ی کی انگلیوں میں شہوت کی چونٹیاں رینگتی رہیں۔
ار جیسے اُس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ طلب کر رہی تھی۔
ا پورے ماحول میں اسے صرف وہ دیوار سب سے جاندار اور بولتی ہوئی محسوس
رہی تھی۔ بقیہ تمام چیزیں بے جان اور خاموش سی نظر آرہی تھیں۔ اس نے
ے بار پھر سفید کنواری دیوار کو غور سے دیکھا۔ پھر آس پاس کی دوسری دیواروں
نگاہ ڈالی۔ رنگ برنگی دیواریں جن پر مختلف قسم کے پوسٹر چسپاں تھے اور طرح
ح کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

ز مندگی سے بچنے کے لئے شادی سے پہلے نوّے سال سنیاسی بابا سے ضرور
ورہ کریں۔"

سانحہ شاہی بازار کے ذمہ داروں کو سرِعام پھانسی دو۔"

الب علم رہنما سرفراز جانی کو رہا کرو ورنہ....."

مہوریت بحال کرو۔"

ان و مال کی حفاظت کے لئے شہر کو فوج کے حوالے کیا جائے۔"

ہنگائی ختم کرو۔ تنخواہوں میں اضافہ کرو۔"

وسٹروں کی عبارتیں اور نعرے پڑھ کر کچھ سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ پھر زیرِ لب
رایا۔ سفید کنواری دیوار اسی طرح اسے اشارے کر رہی تھی۔ آنکھ مار رہی
ی۔ اس کے دل میں پھر بے چینی ہونے لگی۔ انگلیوں کی سنسناہٹ اور بڑھ گئی
نک ایک خیال اس کے دماغ میں کوندے کی مانند لپکا اور اس نے فوراً گھر جانے
ہلہ کر لیا۔ مگر گھر جاتے ہوئے بھی وہ مُڑ مُڑ کر دیوار کو دیکھتا رہا۔ گھر پہنچ کر
وں کے تسمے کھولتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

انتی ہو آج ایک عجیب بات ہوئی....."

یا؟" ـــ اس کی بیوی نے پوچھا اور دل میں سوچنے لگی کہ اب وہ حسبِ معمول
پنے دفتر کا کوئی غیر دلچسپ واقعہ مزے لے لے کر سنائے گا۔ اپنی کارکردگی کی
کوئی لمبی داستان بیان کرے گا لیکن خلافِ توقع اس نے کہا۔

"آج دفتر سے واپسی میں مجھے ایک سفید کنواری دیوار ملی تھی۔۔۔"

"اچھا؟" ـــ اس کی بیوی نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"اور سنو۔ وہ دیوار مجھے اشارے کر رہی تھی۔ اپنی طرف بلا رہی تھی۔ دعوت دے رہی تھی۔ میرا دل بے چین ہو گیا اور میں رک کر بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔۔۔"

"اچھا تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ دیواریں بھی تمہیں اشارے کرنے لگی ہیں اور دیواروں کو دیکھ کر تمہارا دل بے چین ہونے لگا ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔"

وہ کچھ بولا نہیں۔ جوتے اتار کر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔

"چائے پیو گے؟" ـــ بیوی نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی خواہش نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

رات گئے جب اس کی بیوی بچے سو گئے تو وہ خاموشی سے اٹھا۔ بالٹی میں پینٹ گھولا۔ ہاتھ میں برش لیا اور گھر سے باہر نکل پڑا اور چلتے چلتے اس دیوار کے پاس پہنچ گیا جو اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔ رہ رہ کر اپنی طرف بلا رہی تھی۔

سڑک اب سنسان ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی کوئی اسکوٹر یا کار سناٹے کو چیرتی ہوئی زوروں سے گزر جاتی۔ چند لمحوں بعد پھر سناٹا چھا جاتا۔

اس نے برش کو رنگ کی بالٹی میں ڈبویا اور پھر لکھنے کے لئے برش کو دیوار کے ایک سرے پر دبایا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا لکھے۔ آس پاس کی دیواروں پر نظر دوڑائی۔ تمام دیواریں نعروں سے بھری تھیں لیکن یہ سارے نعرے بہت پرانے ہو چکے تھے۔ اس کے لئے ان فرسودہ نعروں میں کوئی کشش نہیں تھی۔

وہ کوئی نیا اور اچھوتا نعرہ لکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر کے تامل کے بعد اس نے برش اٹھایا اور لکھا۔

"جمہوریت اوڑھئے۔ جمہوریت بچھایئے۔ جمہوریت کھایئے۔"

"طالب علم ہونا فخر کی بات ہے اور اُستاد ہونا شرم کی۔"

"زراعت پر ٹیکس لگا کر جاگیرداروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔"

"جنگل میں جانوروں سے ڈرو اور آبادی میں انسانوں سے۔"

"ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے کافر ہیں۔"

"قومی یکجہتی ـــ نامنظور نامنظور۔"

"پوری قوم کا سنیاسی بابا سے علاج کراؤ۔"

اس کے ذہن میں کئی اور بھی نعرے ابھر رہے تھے اور وہ انہیں دیوار پر لکھنا بھی چاہتا تھا مگر دیوار ختم ہو گئی۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ اپنے ذہن کے پردے پر ابھرنے والے تمام نعرے دیوار کے پردے پر منتقل نہیں کر سکا۔
ملال بھرے دل کے ساتھ اس نے اپنا برش اور رنگ کی آدھی بھری آدھی خالی بالٹی اٹھائی اور بوجھل قدموں سے گھر واپس آگیا۔ گھر میں بیوی بچے سب سوئے ہوئے تھے۔ وہ بھی خاموشی کے ساتھ بستر پر دراز ہو گیا مگر بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔
رہ رہ کر اسے یہ احساس ستانے لگا کہ اس نے سفید دیوار کو سیاہ کر کے اچھا نہیں کیا۔ ہر جگہ نعرے لکھنا بری بات ہے۔ یہ احساس لمحہ بہ لمحہ شدید ہوتا گیا۔ بالآخر جب ناقابل برداشت ہو گیا تو وہ بستر سے اٹھا اور برش اور رنگ کی بالٹی ہاتھ میں لے کر پھر اس دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک بار غور سے اپنے لکھے ہوئے نعرے پڑھے اور برش اٹھا کر انہیں مٹانے لگا۔ ابھی اس نے دو ہی نعرے مٹائے تھے کہ پولیس کی موبائل وین آکر اس کے پاس رکی۔ "اتنی رات میں تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اوئے؟" پولیس کے ایک سپاہی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔
"پکڑو اسے یہ تخریب کار معلوم ہوتا ہے۔" وین کے انچارج اے ایس آئی نے بلند آواز میں کہا۔ دو سپاہی وین سے کود کر نیچے اترے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر وین میں اٹھا لے گئے۔ وین وہاں سے روانہ ہو کر قریبی تھانے پہنچ گئی۔ تھانے میں اس سے طرح طرح کے سوال کئے جانے لگے۔ کیا کرتے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ پیشہ کیا ہے؟ کس پارٹی سے تعلق ہے؟ اس نے ہر بات سچ سچ بتادی مگر اس بات پر پولیس والوں نے یقین نہیں کیا کہ اس کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے اور سفید دیوار دیکھ کر اس کی انگلیوں میں، اس کے پورے جسم کو کچھ ہونے لگا تھا۔ پولیس والوں نے جب یہ دیکھا کہ کچھ ملنے ملانے کی امید نہیں تو فجر کے وقت اسے چھوڑ دیا۔
گھر واپس آیا تو اس کی بیوی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی بیوی نے سخت اور کھردرے لہجے میں اس سے پوچھا۔
"رات بھر کہاں تھے؟"
اس نے منمنائی ہوئی آواز میں رات کا پورا واقعہ سنایا۔ سفید کنواری دیوار۔ انگلیوں کی شہوت۔ دیوار پر نعرے لکھنا۔ نعروں کو مٹانے کے لئے دوبارہ جانا.... وہ سب کچھ آہستہ آہستہ اور سچ سچ بیان کرتا رہا مگر اس کی بیوی کو اس کی کسی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ بہانے بنا رہا ہے۔ حقیقت میں وہ کسی اور عورت کے ساتھ...... □□

بقیہ: صفحہ ۲۲۔ زندگی کی ڈھلتی شام

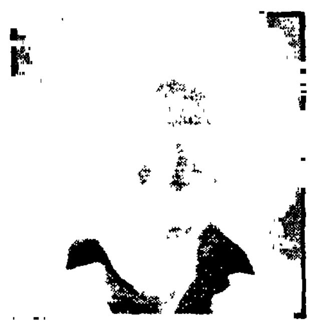
انسان تھی اور یہیں موجود تھی۔ مگر ایک ہی ملک اور ایک ہی خطے میں یہ طویل فاصلے برسوں پر محیط رہے۔ اس دوران کئی مرتبہ میں کراچی بھی گئی لیکن شاہ بانو سے نہ مل سکی۔ وہ کراچی کے کسی دور دراز ایسے علاقے میں رہتی تھی جہاں تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ کراچی میں بسنے والے عزیزوں نے معذرت کرلی۔ خود اس کی فرسٹ کزنیں مجھے اس سے نہ ملوا سکیں۔ فون اس کے گھر نہ تھا۔ اسٹینس ان کے اور شاہ بانو کے درمیان حائل تھا۔ میرے ملنے کی لگن اس تک ضرور پہنچتی رہی۔ مجھے پتہ چلا وہ بھی مجھے ملنے کو تڑپتی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی اتنی ہی جلدی اپنے گھر سے رخصت کر دیا جتنی جلدی وہ خود ہوئی تھی۔ اس کے سر پر اپنے گھر کی چھت نہ تھی اور اس کی بیٹی کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا۔ وہ زندگی کی کسی بھی خوبصورتی سے آشنا نہ تھی۔ بدصورتیوں سے اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔
اس کی بیٹی نے بیوہ ہونے میں اتنی ہی عجلت دکھائی۔ یوں شاہ بانو گویا مجموعہ آلام تھی۔ ماضی کی راکھ کریدنے کے لئے میرے پاس شاید اب وقت زیادہ ہے۔ یا زندگی کی آدھی صدی گزر چکنے کے بعد یادوں کا انبار زیادہ ہو گیا ہے اور اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ اوپر آن گرتا ہے اور انسان اس کے ملبے تلے کچلا جاتا ہے۔ دب کے رہ جاتا ہے۔
اس روز محرم کے آخری دنوں کی مجلس تھی۔ میں نے کمرے میں پہلا قدم ہی رکھا تھا۔ آمنہ شوخی سے بولی۔
"ایک خاتون بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"
"کون ہیں۔؟" میں نے فطری تجسس سے پوچھا۔
"پہچانئے۔" پہلے والے لہجے میں ہی اس نے جواب دیا۔
کمرے میں اس وقت صرف دو خواتین تھیں۔ ایک کو تو میں جانتی تھی۔ وہ شاہ بانو کی بڑی بہن تھیں جو اسی شہر میں رہتی تھیں۔ دوسری خاتون ضعیف تھیں۔ انہیں دیکھ کر کمرنج کا خیال آتا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ سر تا پا سفید کپڑوں میں ملبوس۔ خشک اجڑے سفید بال۔ جھریوں سے اٹا چہرہ۔ چرمرایا ہوا جسم، دانتوں سے بے نیاز پوپلا منہ، آنکھوں میں جمی دکھ کی راکھ۔
نحیف، بزرگ چہرہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میری آنکھوں میں حیرت پاکر شاہ بانو کی بہن گویا ہوئیں۔ "ارے یہ شاہ بانو ہے۔ تم نے پہچانا نہیں۔؟"
"ہئیں؟ شاہ بانو یہ تم ہو۔؟" مجھے چیخ مار کر اس سے لپٹ جانا چاہئے تھا۔ میں نے ایسا کرنا چاہا بھی مگر کر نہیں سکی۔ ایسا کچھ ہوا نہیں۔ بس میرے ذہن میں یادوں کی آندھیاں تیز تر ہو گئیں اور میں نے کہا تو صرف یہ کہا۔
"شاہ بانو! تم سے ملنے کا کتنا اشتیاق تھا مگر خوشی کا ہر لفظ کئی تعزیتوں میں گم ہو گیا ہے لیکن اگر جادو بسیا.....!"
"یہ سب قسمت کی باتیں ہیں بنو۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سمجھ لی۔ میری آنکھوں میں آنسوں تھے۔ اس کی پلکوں پر بھی میں نے نمی محسوس کی۔ اور مجھے لگا زندگی کی دوپہر پوری تمازت کے ساتھ ڈھل رہی ہے۔ گھر سے باہر شام ڈھل رہی تھی۔ □□



امجد اسلام امجد

بت کا ثمر ملتا نہیں ہے
سکہ اب کہیں چلتا نہیں ہے
میں کیا، جو سخن دنیا میں گونجا،
ے سننا تھا وہ سنتا نہیں ہے !
ا اہلِ دل سربازار دنیا
ڑے ہیں ۔راستہ ملتا نہیں ہے
ا اپنے بادباں، کھولو نہ کھولو
سندر تو کبھی رکتا نہیں ہے
ری رہتی ہے کشتِ دل ہمیشہ
ی رُت میں اسے چھتا نہیں ہے
ر سے شام ہونے آگئی ہے!
ی درد آشنا، ملتا نہیں ہے
مارا دل ہے یوں، قصر وفا میں
ہ پتھر ،جو کہیں لگتا نہیں ہے
وائے شامِ غم بوجھل ہے اتنی
راغ آرزو ، جلتا نہیں ہے
مانہ آپ ہی بدلے تو بدلے
ی کا زور تو چلتا نہیں ہے
ہیں امجد کوئی قیمت وفا کی
یہ سودا، اب یہاں بکتا نہیں ہے

●22-Mumtaz Street ,Garhi
Shahu, Lahore (Pak)



جعفر شیرازی

وہاں جو پیراہن رکھا ہوا ہے
ترا عکس بدن رکھا ہوا ہے

ہتھیلی ہے مری کیا دیکھتے ہو
یہاں عہد کہن رکھا ہوا ہے

اداسی وہ قبا ہے جس کو میں نے
کبھی کا زیب تن رکھا ہوا ہے

تری آنکھوں میں مستی کے علاوہ
بلا کا بانکپن رکھا ہوا ہے

زمانے دیکھ کانٹوں کی زباں پر
ابھی میرا بدن رکھا ہوا ہے

وہ اک تیشہ ہی تھا جس نے ابھی تک
وقار کوہکن رکھا ہوا ہے

میں ان قریوں میں جعفر کھو گیا ہوں
جہاں دیوانہ پن رکھا ہوا ہے

●554-K, Farid Town,
Sahiwal (Pak)

اسرار زیدی

صحرا صحرا ، ذرّہ ذرّہ ہوتا ہے
ہر ذرّے میں ایک بگولہ ہوتا ہے

موسم پل پل رنگ بدلتے رہتے ہیں
سچائی کا بھی اک چہرہ ہوتا ہے

ایسے بات بنانے سے کب بنتی ہے
اس کا بھی کچھ طور طریقہ ہوتا ہے

نقش انہی کے لوحِ جہاں پر کندہ ہیں
جن ہاتھوں میں زہر کا پیالہ ہوتا ہے

برسوں بعد کہیں جاکر یہ بھید کھلا
خون سے بڑھ کر درد کا رشتہ ہوتا ہے

بستی مہر بہ لب ہے، اتنا دھیان رہے
خاموشی کا اپنا لہجہ ہوتا ہے

●Lahore (pak)



انور شعور

اہل جہاں کے کام بھی کرتے رہا کرو
ہم درد سے کلام بھی کرتے رہا کرو

قابو رہے زبان پہ لیکن کبھی کبھی
یہ تیغ بے نیام بھی کرتے رہا کرو

برداشت اور صبر کی کیا بات ہے مگر
تسکینِ انتقام بھی کرتے رہا کرو

کافی نہیں نگاہ ملانا نگاہ سے
کچھ نامہ وپیام بھی کرتے رہا کرو

کرتی ہے کچھ قیام مسافر کو تازہ دم
چلتے ہوئے قیام بھی کرتے رہا کرو

رہنے دیا کرو نہ سبھی کام ناتمام
کچھ کوششیں تمام بھی کرتے رہا کرو

بنتے ہیں کلیات خیالات خام سے
ظاہر خیال خام بھی کرتے رہا کرو

سرگوشیوں میں سیکھتے رہنے کے ساتھ ساتھ
دل کی زبان عام بھی کرتے رہا کرو

اپنے لیے جیے تو بھلا کیا جیے شعور
کچھ خدمتِ عوام بھی کرتے رہا کرو

●31/24-A,Crescent Complex,
Block- 11,Gulshane-e-Iqbal,
Karachi(Pak)



محمد اظہار الحق

چلی شبِ ماہ دھیرے دھیرے سحر کی جانب
رواں ہو چاندی کی ناؤ جیسے بھنور کی جانب

بنی ہوئی ہیں کنارِ دریا پہ خواب گاہیں
کھلے ہوئے ہیں وصال کے در سفر کی جانب

یہ سنگ مرمر یہ شاخِ انگور یہ کنیزیں
مگر کوئی کھینچتا ہے مٹی کے گھر کی جانب

شراب انجیر پوستینیں طلائی فرغل
چلا پہاڑوں میں قافلہ کاشغر کی جانب

یہ آج عشرت کدے میں ہے اضطراب کیسا
نگاہیں سب کی لگی ہوئی کیوں ہیں در کی جانب

چہار آئینہ سبز گھوڑا سنہری پٹکا
چلا کوئی دھوم سے اچھوتے نگر کی جانب

طواف اس خاک کا کریں غول جگنوؤں کے
کھلیں ہمیشہ گلاب کے پھول سر کی جانب

کڑھے ہیں دیکھو یہ پھول ریشم سے چاندی کے
اٹھی ہے دیکھو وہ تیغ دستِ ہنر کی جانب

●78-C-2, Street-8, I-8/1,
Islamabad (Pak)



ناصر زیدی

میں ایک پیکرِ نادیدہ کے حصار میں
نجانے کون ہے وہ، کس کے انتظار میں

وہ خشمگیں ہی سہی، احترام لازم
یہ کم شرف ہے کہ اب تک نگاہِ یار میں

کرو قبول کہ نفرت سے مجھ کو ٹھکر
تمہارے پاس ہوں اور پورے اختیار میں

میں اپنی ہمتِ پرواز کھوچکا
خزاں سے خوف زدہ موسمِ بہار میں

تمام شہر مخالف ہوا کرے
میں مطمئن ہوں کہ اس حلقۂ نگار میں

-3,Setelite Town
ralpindi (Pak)

عذرا اصغر

606, g-101/1, Islamabad (Pak)



زندگی کی ڈھلتی شام

نہ وہ سن جدائی کے لئے موزوں تھا اور نہ کبھی جدا ہونے کا خیال آیا تھا، مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور جغرافیہ بدل گیا اور جب ہم بچھڑے تو ایک خلیج ہمارے درمیان حائل ہو گئی۔

سات آٹھ برس کا ساتھ رہا تھا ہمارا۔ میرا اور اس کا۔ وہ شاید تھوڑی سی بڑی تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم ساتھ کھیلے تھے اور ساتھ ساتھ بڑے ہو رہے تھے۔ وہ کھڑ کھڑا کے چلنے والی لڑکی تھی جدھر سے گذرتی بھونچال مچا دیتی۔

چوڑے چوڑے ہاتھ پیر، چپٹا سا جسم، جس میں نزاکت اور لچک نام کو نہیں تھی۔ جھوٹ بولنے کی حد تک محنتی اور اکھڑ۔ مگر بے حد رحم دل اور محبت کرنے والی۔ وہ مجھے ہمیشہ ایسے ہی یاد رہی جیسے میرے ماضی میں آباد گرمیوں کی پر کیف شامیں۔ میں زندگی بھر ان پر بہار، لطیف شاموں کو کھوجتی ہی رہی ہوں۔ اور یہ تو سراسر میری کج فہمی ہے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ یادیں اور خواہشیں رنگین تتلیوں کی طرح کبھی گرفت میں نہیں آتیں پھر بھی ہم ان کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔

"چھوڑو بھئی، مفت میں دل دکھانے سے کیا فائدہ؟" شعور ہمیشہ اخلاص سے سمجھاتا ہے۔ عقلمندی دکھاتے ہوئے میں حال میں پلٹ آتی ہوں۔ لیکن اس "حال" میں اچانک میرا اور اس کا ٹکراؤ ہو گیا تو ماضی دندناتا ہوا میرے سامنے آن کر کھڑا ہو گیا ہے۔

کنویں پر چرخیاں گھوم رہی ہیں۔ سقے مشکیں بھر بھر جا رہے ہیں۔ پیتل کی ٹلیاں بھر بھر گنجے بوری والے سر اشنان کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے یہ منظر نہایت غیر اہم اور روز کا معمول ہے۔ مردان خانے کے بڑے چبوترے سے ملحق وہ کنواں جانے خاندانی وجاہت کے طور پر تھا یا بلند مرتبے کا مظاہر یا جنت کے حصول کا سستا ذریعہ۔

صبح و شام بھشتی چمڑے کی مشکیں بھر بھر۔ کمر کے گرد سرخ کپڑے کی گدی پر مشک سہارے، انگلی سر پر ڈالے ڈیوڑھی ڈیوڑھی آواز لگاتے۔

"بی بی جی پانی آیا۔"

آواز سنتے ہی کنواری کنیائیں لپک جھپک مچیوں اور کمانچوں میں جا چھپتیں۔ بہویں کولے دیوار کی آڑ میں ہو بیٹھتیں۔ بڑی بوڑھیاں سروں پر دوپٹے کا پلو کھینچ لیتیں اور کوئی ایک یونہی جواباً بول پڑتا۔

"آجا بھیا۔" حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت نہ ہوتی۔ بھشتی لال انگلی کو ہاتھ سے سہارتا گھڑونچی تک پہنچتا۔ شر شر گھڑوں میں پانی ڈالتا اور اگلی مشک بھرنے چلا جاتا۔ دن میں کئی کئی مشکیں آتیں۔ گھروں میں نلکے ہوتے۔ نوکر چاکر، بچے بالے سارا دن کسی نہ کسی ضرورت سے پانی کھینچتے رہتے مگر پانی کی ضرورت کبھی ختم نہ ہوتی۔ بھشتی کے بغیر گذارہ ناممکن تھا۔ پانی کا مل نہ کر لیا۔ بس بھشتی کو روپیہ دو روپیہ۔ اٹھنی چونی ماہوار چلا گیا۔ تہواروں پر دے دلا دیا گیا۔ بیاہ شادیوں پر انعام اکرام عطا ہو گیا اور اناج اٹھنے پر سال چھ ماہی حصہ مل گیا۔ یہ سب خوشی خواہاں کے سودے ٹھہرتے۔ نہ حساب نہ کتاب۔ گرمیوں کی شاموں میں بھشتی اندر باہر، ہر جگہ چھڑکاؤ کرتا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی۔ صحن اور چبوترے پر پلنگ سر شام ہی بچھ جاتے۔ دریوں پر سفید چادروں والے بستر لگا کر ٹھنڈا ہونے کو چھوڑ دئے جاتے۔ نہا دھو کر کپڑے بدل کر بچوں کی ٹولی باغ کے لئے نکل جاتی۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتے، رہٹ کے پانی کو ہاتھوں میں اچھالتے، خربوزے، ککڑیوں اور آم توڑ توڑ کر کھاتے۔ شور مچاتے، اچھلتے کودتے جھٹ پٹے سے گھر لوٹتے لڑکے لڑکیوں کے رکھوالے، نگہبان بنے بزرگوں کی طرح حکم چلاتے۔ کیا مجال جو ذرا اونچ نیچ ہو جائے۔

حال میں لوٹ کر میں سوچتی ہوں۔ "دنیا کتنی بدل گئی ہے۔؟" پانی خرچ کرو تو پیسہ دو۔ آم خربوزے تول کر لو اور سسک سسک کر کھاؤ۔ بزرگوں سے سنا ہے۔ "نیتوں میں فتور آجائے تو برکت اٹھ جاتی ہے۔" اور "برکت بی بی" واقعتاً ہم سے روٹھ چکی ہیں۔

عمر کی ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد میں مڑ مڑ کر دیکھنے کی عادت میں مبتلا ہو چکی ہوں۔ کچھ برس پہلے تو ایسا نہ تھا۔ زندگی نرا شور شرابا تھی۔ گھمبیر ہی گھمبیر تھی۔ نگاہ آگے آگے ہی جاتی تھی۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا احمقانہ فعل لگتا تھا۔ اور تب بھی۔ جب پیچھے پلٹنا مجھے پسند تھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ زندگی اور اس کے ہنگامے پوری توانائیوں کے ساتھ میرے ہمرکاب تھے تب بھی ساتھ کھیلی ہمجولیوں اور کزنوں میں شاہ بانوں ہمیشہ قریب تر رہی، جانے ہم دونوں میں کونسی قدر مشترک تھی۔

اس روز جاوید بھیا بالٹی میں پانی بھرے صحن میں چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ وہ جانے گھر کے کس کونے سے لپک جھپک نکلی، پانی سے بھرا بھرا ڈونگا چھپاک سے شاہ بانو کو تر کر گیا۔

"دیکھ کر چلا کرو نا۔؟" جاوید بھیا نے بازو سے جھٹک کر اسے ایک طرف کر دیا۔

شاہ بانو نے لرز لرز کے روتے ہوئے کہا۔

"بجو دیکھنا اب جانے کیا ہو جائے۔"

"کیوں۔ کیا ہو گا۔؟"

"جانے۔ پتہ نہیں کیا۔؟ لڑکا یا لڑکی۔" وہ بدستور ہچکیوں کے درمیان بولی۔

"مگر کس کے۔؟"

"میرے اور کس کے۔؟" وہ غصے سے پھنکاری۔

"تمہارے تیرے۔؟"

"ہاں ہاں میرے۔" وہ یقین سے بولی۔" مجھے جاوید بھیا نے ابھی ابھی ہاتھ لگایا ہے نا۔؟"

"پھر۔؟"

"خالہ اماں کہہ رہی تھیں آجکل تو ذرا کسی مرد نے لڑکی کو ہاتھ لگایا اور بچہ ہوا۔"

کئی دن وہ بھی سہمی سہمی پھری اور میں بھی ڈرتی رہی۔

گرمیوں کی ایسی ہی شاموں میں دھوبن کپڑے لاتی۔ کوئی ایک ذمہ دار بہو بیٹی کاپی لے کر آتی۔ گھر بھر کے کپڑے الگ الگ ہو کر تقسیم ہوتے۔ تانبے پیتل کے بڑے بڑے تسلوں میں نیلے، پیلے، ہرے، گلابی رنگ گھلتے، ململ کے دوپٹے اور پاپلین کے غرارے رنگے جاتے۔ الگنیوں پر قوس قزح سی بکھر جاتی۔ چاندنی راتوں میں سفید بستروں والے پلنگوں پر بیٹھ کر کلف لگے دوپٹے چنے جاتے۔ گپیں چلتیں۔ خوشیاں ہی خوشیاں۔ اطمینان اور گہری طمانیت۔ شاہ بانو سب سے باریک دوپٹہ چنتی۔ بڑے بھی اس کے پیچھے پھرتے۔ یہی وقت ہوتا جب شاہ بانو مکمل نخرے پر اتر آتی۔ ورنہ اس گھر میں شاہ بانو کی حیثیت ہی بھلا کیا تھی۔ چھوٹی تائی اماں کی بھانجی۔ بن ماں باپ کی لاوارث بچی۔ اس کی بڑی بہن جانے کس کے پاس تھی اور اکلوتا بھائی آوارہ۔ یوں بھی جب کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ ہو تو انسان بھٹکنے کے سوا کیا کرے۔؟ احسن بھیا کا بھی کچھ یہی معاملہ تھا۔ جہاں رات پڑی سو گئے۔ جدھر کو منہ اٹھا چل کھڑے ہوئے۔ جس گھر پہنچ گئے اور وقت ہوا یا کسی نے پوچھ لیا تو کچھ کھا پی لیا ورنہ فاقہ مستی میں دن بسر ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی شاہ بانو کو ملنے آتے۔ شاہ بانو ان کے گلے لگ کر روتی۔

"بھیا تم کچھ کر لو نا۔؟" "تو کیوں فکر کرتی ہے۔ میں پاکستان چلا جاؤں گا بس پھر تو دیکھیو۔"

وہ شاہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے۔ ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر وہ چلے جاتے۔ چھوٹی تائی اماں کے یتیم بھانجے، آوارہ غنڈے لفنگے۔ "کیا پتہ ذرا کسی نے منہ لگایا تو وہیں پڑ رہیں۔ بھلا کوئی کیوں بیٹھک میں بیٹھاتا۔ یوں بھی ڈیوڑھیاں کیا تھیں۔ آج کی بڑی بڑی کوٹھیوں کے دو دو بیڈ رومز تو سما ہی جائیں۔ ارے کم علم پودینے کے باغوں کا طعنہ دیتے پھریں تو بھلے پھرا کریں۔ ایسے طعنوں سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔

پاکستان، مسلمانوں کا حسین خواب معرض وجود میں آ چکا تھا۔ سال بھر سے چپکے چپکے سبھی منصوبہ بندی میں لگے تھے۔ کئی نوجوان خاموشی سے کھسک لئے تھے۔ عمر رسیدہ حویلیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ پرکھوں کی ہڈیوں کی رکھوالی کر رہے تھے۔ کیسے بزرگوں کی قبروں کو بے چراغ چھوڑ دیں؟ اڑوس پڑوس کے غیر مسلموں نے گھروں اور جائیدادوں پر نظر لگا رکھی تھی۔ ہر طرف منصوبے تھے۔ مگر کوئی کب تک ہلتی دیواروں کو تھامے رکھ سکتا ہے۔ آنے والوں کو آنا ہی پڑا اور بعد میں آنے کا خسارہ اٹھایا۔ جنہوں نے کچھ نہیں کھویا، یہاں بہت کچھ پا لیا۔ جو سب کچھ کھو کر آئے، کچھ نہ پا سکے اور خوار ہوئے۔ حیثیت سے زیادہ پا لینے والوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ شناخت کھو گئی۔ دماغ الٹ گئے۔

اور میں تو نادانستگی میں ہی بس ان شاموں کو کھوجتی رہی ہوں۔ وہ سوندھی، نرم ٹھنڈی، پرکیف شامیں، نئے دیس کی شاموں میں "پھو گرم" کھیلتے کھیلتے اچانک "آنکھ مچولی" کھیلتی باغوں کی شامیں سامنے آن کھڑی ہوتیں۔ رہٹ کی چرچوں، ڈولوں سے نکل کر نالیوں میں بہتے بہتے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے تن من بھگو کر رکھ دیتے۔ اس ثقافت کی قوس قزح وہیں الگنیوں پر لٹکی رہ گئی تھی۔ دو تین برس بعد کسی سے سنا۔

"شاہ بانو بیاہ کر پاکستان آگئی ہے۔" پھو گرم کی ٹھیکریاں بکھر گئیں اور میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ جلدی جلدی میں نے حساب لگایا۔ بمشکل اس کی عمر تیرہ برس بنتی تھی۔

"ہائے میرے اللہ۔" میرے منہ سے حیرت کا کلمہ نکلا۔

"ملنگو کچھ حیا کر۔" آپا نے کیڑی کاڑا کھیلتے دیکھ کر مجھے ٹوکا۔

"لو بھلا۔ مجھ سے پورے دو برس بڑی ہے شاہ بانو۔" میں نے مکمل بے حیائی سے جواب دیا اور گٹہ چوم کے سر کے پیچھے اچھال دیا۔

"شاہ بانو کا میاں حکیم کی دکان پر چورن کوٹتا ہے۔" بڑے بھیا خود اس سے مل کر آئے تھے۔

"ہائے بے چاری شاہ بانو۔؟ نام شاہ بانو اور مقدر۔؟ میرا جی کڑھ کے رہ گیا۔

"جاوید بھیا اگر اس سے شادی کر لیتے تو کیا تھا۔" بالآخر میں نے آپا سے کہہ ہی دیا۔

"کیوں کر لیتے؟"

کیوں نہ کرتے "فسٹ کزن تھے' ساتھ رہے تھے"

"کیوں رکھا جاہل۔ پڑھا لیتے۔ بس خدمت ہی لی نا۔؟"

"ہنہ! سر گتوار لٹھ، جاہل سے جاوید شادی کر لیتا؟" آپا چڑ گئیں۔

"اپنی اپنی پسند ہے۔ جاوید کا کیا قصور کہ سزا بھگتتا۔" آپا نے دلیل دی۔

"تو اتنی جلدی کیا تھی۔ مل جاتا کوئی ڈھنگ کا رشتہ۔"

"بند کرو بک بک۔" آپا نے ڈانٹا۔ اور یہ بڑے لوگ بس ڈانٹ کر چپ ہی تو کرا سکتے ہیں نا۔ دلائل ختم ہو جائیں تو بس ڈانٹ پلائی جا سکتی ہے۔" بڑبڑانا میرا ابھی حق تھا۔

"شاہ بانو کا میاں جوتے کی دکان پر سیلز مین ہو گیا ہے"۔

"چلو کچھ تو ترقی ہوئی۔" میں نے سوچا۔ "مگر ہر ایک کا پیر پکڑ پکڑ جوتا پہناتا ہو گا بیچارا۔" مجھے کڑھنے کو پھر بہانہ مل گیا۔

تابڑ توڑ شاہ بانو کے سات آٹھ بچے ہو گئے اور پھر اس کا میاں مر گیا۔

"لو نام نہاد شاہی بھی گئی"۔ دکھ کے مروڑ میرے دل میں اٹھنے لگے۔ "اتنی سی عمر میں اس نے یہ دکھ بھی دیکھ لیا۔ یہ غم بھی سہہ گئی۔ وہ جو قبل از وقت یتیم ہوئی۔ قبل از وقت بیاہی گئی اور قبل از وقت ہی بیوہ ہو گئی۔ جانے اس کی پیدائش بھی بروقت تھی یا نہیں۔

میں کہ جو والدین کے سائے میں پلی بڑھی۔ بہن بھائیوں کی لاڈلی رہی اور مناسب وقت پر بیاہی گئی، صاحب حیثیت شوہر کی بیوی بنی۔ عزت، محبت، اختیار سبھی کچھ پایا۔ شاہ بانو سے ملنے کی تمنا دل میں پالتی رہی۔ میں ان شاموں کو تو نہیں پکڑ سکتی تھی جو میرے بچپن کا ایک خوبصورت حصہ تھیں لیکن شاہ بانو تو جیتی جاگتی

بقیہ صفحہ ۱۸۰ پر دیکھئے



نصیر احمد ناصر

وا پھر رخصتی کے گیت گاتی ہے

ے کس رات کا سایہ ڈراتا ہے
ے کس خواب کی نیندیں جگاتی ہیں
ے کس یاد کا چہرہ رلاتا ہے
ِ ی آنکھوں کے رستوں میں
جانے کون سے لمبے سفر کی دھول اڑتی ہے
ھے کس دیس کی مٹی بلاتی ہے؟

میر ے ہاتھ مری آنکھیں ہیں

برے ہاتھ مری آنکھیں ہیں
ان پر دھوپ اور چھاؤں کے
مارے منظر لکھ سکتی ہو
ہائی کا لمس بدن کے ہر موسم میں کھلتا ہے
یکھنے والے ہاتھ
ی خوش قسمت کی جانب اٹھتے ہیں
دست، انھیں بے توقیر نہیں کرتے
غام لیا کرتے ہیں!!

●17-D, Sector B-2, Mirpur- 10250
(A.K.) Pakistan

سرمد صہبائی

موسم بہار کی پہلی نظم

جس موسم میں
ہرے بھرے پیڑوں کی بانہیں
آہستہ آہستہ عریاں ہو جاتی ہیں
تیز ہوائیں
رستوں پر گرتے پتوں کی تنہائی سے
لپٹ لپٹ کر سو جاتی ہیں

اس پل میری دھڑکتی اوک سے
کھڑکی کے پیاسے تالو پر
میٹھی دھوپ کا رس بہتا ہے

مرجھاتی لڑکی کی گود میں
اک تازہ کونپل کھلتی ہے

لہر لہر میں
اس کے سینے کے ساحل پر
رک جاتا ہوں
اک گھبرانا سیلا بادل
بن کر اس پر جھک جاتا ہوں

●Pakistan Television,
Islam abad (Pak)

صفدر صدیق رضی

کراچی

وہی شہر اجتماعی خودکشی پر آجکل آمادہ ہے
جس کے رگ و پے میں
عظیم المرتبت اجداد کی تاریخ کا رنگ
ارفع و اعلیٰ نسب پرکھوں کا آہنگ
اور عالی شان تہذیب و تمدن کا لہو
اک عمر سے اب تک رواں ہے
یہ عجیب الخلق قریہ زندگی کا چیستاں ہے
زندہ رہنے کی تمنا بھی یہاں ہے
رزق ہے آب و ہوا ابر و ساحل ہے
سمندر ہے
یہاں سب کچھ میسر ہے
یہاں پر حسن ہے خوشبو ہے موسیقی ہے علم و فن ہے
شہرت ہے
روایت اور جدت ہے
محبت اور جرأت ہے، نزاکت ہے نفاست ہے
فراست ہے سلاست ہے
ذہانت ہے فطانت ہے
معیشت ہے نظامت ہے
مگر یہ شہر محروم عدالت ہے

DB-2, / III, Gulshan -e-Hamidi,
Block-3, Gulshan-e-Iqbal,
Karachi- 75300 (Pak)



اکبر حمیدی

اگر کسی بڑی مسند پہ جاگزیں ہوتا
تو پورا عہد مرا حاشیہ نشیں ہوتا

الف کے بعد کوئی حرف ہی نہ ہو جیسے
کیا شہر میں کوئی لکھا پڑھا نہیں ہوتا

ملا نہ راستہ کوئی ہزار رستوں میں
کیا راستوں میں کہیں راستہ نہیں ہوتا

ہوئی ہے سیر دو عالم کی بے یقینی میں
میں اک نظر بھی نہ چلتا اگر یقیں ہوتا

مرے زمانے میں ہوتا جو میرزا غالب
تو وہ بھی میری طرح سے یہیں کہیں ہوتا

اسی زمیں نے مجھے بھی جنم دیا اکبر
کسی کے کہنے سے میں کیسے بے زمیں ہوتا

●House 2029, Street- 32, I-10/2,
Islamabad (Pak)



حسن عباس رضا

میرے دکھ پر نہ روسکا اے دوست
تجھ سے اتنا نہ ہوسکا اے دوست

میرے غم کا نہ ایک آنسو بھی
تیرے عارض بھگو سکا اے دوست

خیر، میں نے تو رتجگے کاٹے
تو مگر کیوں نہ سو سکا اے دوست

مجھ تک آنے میں کیسی مجبوری
میں تھا تیرے پڑوس کا اے دوست

عمر میلے میں گم ہوئیں یادیں
پر ترا غم نہ کھوسکا اے دوست

تو میرا ہم سفر تو ہوجاتا
کم سے کم ایک کوس کا اے دوست

کتنا پایاب تھا ترا دریا !
جو نہ مجھ کو ڈبو سکا اے دوست

●House No. 11, Street No.29
Korang Town Islamabad (Pak)



ابرار حمید

تواتر سے یہ فرصت ہے میسر
ابھی دل کو محبت ہے میسر

تمہیں جو بھی میسر ہو، ہمیں کیا
ہمارے گھر کوراحت ہے میسر

ترے دم سے سرافرازی ملی تھی
ترے ہاتھوں ہزیمت ہے میسر

کہاں تک عرصۂ محشر رہے گا؟
کہاں تک یہ قیامت ہے میسر

میسر ہے دلِ بے خواب ہم کو
کہ جب تک خوابِ غفلت ہے میسر

اذیت ہے، میسر اس کا ہونا
یہ ہونے کی جو ذلت ہے میسر

ترے زیرِ نگیں تب تک رہیں گے
کہ جب تک استطاعت ہے میسر

ابھی یہ شور تھمنے کا نہیں ہے
ابھی سانسوں کی تہمت ہے میسر

ردائے خاک میں، یا خواب میں ہیں
ہمیں کیسی محبت ہے میسر ۔ !

●694-E, Gulshan-e-Raavi,
Lahore (Pak)

محمود احمد قاضی

Millat Colony No.2, Rahwali, Gujranwala (Pak)

دربان



ہم سب دار لخلافے میں جمع تھے کہ ہمیں بادشاہ کی طرف سے کھانے کی عوت موصول ہوئی تھی۔

دعوت نامے جن پر ہمارے نام اور نمبر درج تھے ہاتھوں میں پکڑے ہم ا تنگ کوچوں کے ذریعے محل کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ مرد حضرات نے ں تقریب کے لئے اپنے سب سے بہترین کپڑوں کا انتخاب کیا تھا ان کے چہرے ر جسم آفٹر شیو لوشنوں اور باڈی کلونوں کی مہک سے لبریز تھے۔ عورتوں نے بھی بکیلے رنگ رنگیلے لباس پہن رکھے تھے۔ ملبوسات کے رنگوں سے میچ کرتے جوتے ن کے پاؤں میں لشک لشک جاتے تھے اور اسی رنگ کے آویزے اور بندے ان کے نوں میں لپک لپک جاتے تھے۔ رنگ و نور کا ایک سیلاب تھا کہ یہاں امڈ آیا تھا۔ محل کے صدر دروازے پر سیکورٹی شاف کی چیکنگ کے بعد ہم سب لفٹ کی طرف وانہ ہوئے۔ لفٹ باری باری ہم سب کو لے کر پانچویں منزل کی طرف چل پڑی۔ ب ہم سنگ سفید کے بہت بڑے استقبالیہ کمرے میں تھے جہاں چھت سے نہایت بتی اور خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے۔ ارد گرد پھیلی روشنی آنکھوں کو خیرہ رہی تھی۔ یہیں سے وہ سبزہ زار وہ وسیع لان نظر آرہا تھا جو پانچویں منزل پر واقع ونے کی وجہ سے ایک معلق باغ کا منظر پیش کر رہا تھا یہاں ایک طرف شامیانے سب تھے اور قریب ہی کھانے کی میزیں سجائی گئی تھیں۔ ہلکی موسیقی کی وبصورت دھونوں کے جلو میں ہمارے قدم اس وسیع لان کے درمیان بنے پانی کے حوض کی سمت میں بڑھ رہے تھے۔ حوض کے درمیان بنے فوارے سے طراف سے پڑنے والی روشنی سے منعکس ہوتا پانی اچھلتا ہوا عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ اس مبہوت کر دینے والے چار چوفیرے میں گھرے ہوئے میرے آگے ڑھتے ہوئے قدم رُکنے لگے کہ میں نے اسے دیکھا۔

وہ محراب نما داخلی دروازے کی دیوار کے ساتھ اپنے قد، گرانڈیل جسم، بڑی ڑی مونچھوں، خوبصورت پگڑی اور سفید براق وردی کے سینے پر سجے پیتل کے ہنکدار تمغوں کے ساتھ یوں کھڑا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں نیزہ تھا۔ اپنے دنوں ہاتھوں میں سفید دستانے پہنے وہ مجھے اتنا ساکن اور بے حرکت نظر آیا کہ اگر وہ کبھی کبھی اپنی آنکھیں نہ جھپکا رہا ہوتا تو میں سمجھتا کہ شاید وہ کوئی مشینی آدمی ہے۔

اکتوبر کی شام ہلکی سی خنکی میں حیرت زدہ کھڑا میں اسے دیکھے جا رہا تھا کہ مجھے نا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہونٹ ساکت۔ آواز ندارد۔ مگر ترسیل ہو رہی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کا مجھ سے کیا سمبندھ تھا۔ کیا وہ میرا گرائیں تھا۔ دوست تھا یا...... میں متذبذب حالت میں وہیں کھڑا رہا۔ بادشاہ سے مصافحہ کرنے کے بعد باقی سب لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ پلیٹوں پر چمچوں کی کھنک اور ہڈیوں کے کچر کچر چبائے جانے کی آواز کی خراشوں کے درمیان اس کی آنکھیں مجھ سے یوں ہمکلام ہوئیں!

"ہیلو!"

"ہیلو!"

میں نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ میں نے حیرانی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہاتھ تو ملاؤ!"

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا!"

"کیوں؟"

"میں اپنے کسی عضو کو ہلا نہیں سکتا۔ اسی طرح اٹینشن۔ پگڑی کا شملہ اونچا۔ مونچھوں کا یہی زاویہ۔ نیزے پر دائیں ہاتھ کی گرفت۔ پہلو میں لٹکا بائیاں ہاتھ۔ چمکدار جوتے۔ چوڑی دار پاجامہ انگھ کھا نما لمبا کرتا۔ دونوں ہاتھوں میں سفید دستانے ۔ یہ سب کچھ تو ہے۔ مگر مجھے ہاتھ ہلانے کی۔ منہ پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑانے کی ۔ جھپکنے کی۔ تھوک نگلنے کی۔ کھنکارنے کی۔ ڈکار لینے کی۔ جماہی لینے کی۔ ہنسنے کی ۔ بولنے کی ایک دو قدم آگے پیچھے جانے کی اجازت نہیں!"

"مگر کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ میں ایک دربان ہوں اور مجھے اپنی شفٹ میں اس آسن اسی حالت میں پتھر کی طرح جامد و ساکت کھڑے رہنے کا حکم ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ کرنے کا اذن ہی نہیں!"

"مگر یہ تو سراسر زیادتی ہے!"

"لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے۔ اور اس کے عوض مجھے جو بھتہ ملتا ہے اس سے وہاں پیچھے خان پور ساہنسی میں موجود میری بوڑھی ماں، میرے مریض باپ اور میرے بیوی بچوں کا پیٹ پلتا ہے۔ بچوں کی اسکول کی فیسیں۔ ان کی یونیفارم۔ نان نفقہ سب کچھ اسی حوالے سے چلتا ہے۔

"تم ارے یار چھوڑو یہ سب کچھ اور آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"بھوک تو مجھے بہت لگی ہے۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ میں تو یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا اور تم کھانے کی بات کر رہے ہو۔ اور پھر بادشاہوں کا کھانا میری قسمت میں کہاں کہ میں تو ایک دربان ہوں۔ بے نمبرا ہوں۔ یار، کھانا اسے ملتا ہے

جسے کہ نمبر الاٹ ہوتا ہے ویسے بھی ایک دربان کے راتب اور بادشاہ کے کھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"اس فرق کو چھوڑو اور آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ!"

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو بھوک مجھے اتنا نہیں ستاتی جتنا یہ کہ میں یہاں سے ہل نہیں سکتا۔ میں کبھی کبھار زیر ناف کھجانا چاہتا ہوں۔ مسکرانا چاہتا ہوں۔ بولنا چاہتا ہوں مگر میں ایسا اس لئے نہیں کر سکتا کہ میں ہر وقت نگران آنکھوں کے نرغے میں رہتا ہوں۔ اور اب تو شاید میں ایسی باتوں ایسی فضا کا عادی ہو چلا ہوں کہ

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

"ارے ایک دربان اور شعر!" میں چونکا مگر اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے واقعی اب کسی بات پر افسوس نہیں ہوتا ہاں افسوس ہے تو اس بات کا کہ آج تک بہت سی ہونے والی چیزوں اور پیش آنے والے واقعات میں میری اپنی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں رہا مثلاً اسکول میں داخلے کا وقت آیا تو مجھ سے میری مرضی نہیں پوچھی گئی اور اس طرح ٹاٹ والا اسکول میرا مقدر رہا۔ پھر جب میں ہائی اسکول میں تھا تو مجھ سے میری مرضی پوچھے بغیر اسکول چھڑوا دیا گیا۔ پھر ملازمت بھی مجھے میری مرضی کی نہیں ملی۔ کھانے پینے، پھلوں کے انتخاب، جوتوں کپڑوں کی پسند میں بھی میری مرضی شامل نہیں رہی۔ پھر میری شادی کر دی گئی۔ یہاں بھی دوسروں کی مرضی چلی۔ اور وہ جو ٹوٹی چک کے پیچھے کھڑی گھنٹوں میرا انتظار کیا کرتی تھی پتھر کی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی مرضی مجھ پر ٹھونس دی اور ایک ایسی عورت میرے سپرد کر دی جسے میں جانتا تک نہ تھا۔ بیوی تو میری اچھی ہے۔ بھلی مانس سی عورت ہے۔ مگر میری مرضی کی نہیں۔ دوستوں میں بیٹھتا ہوں تو وہاں بھی میری مرضی نہیں چلتی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کراری مرچوں والے آلو چھولے کھاؤں مگر وہ آئس کریم کھانے پر مصر ہوتے ہیں۔ شام کو اپنے کوارٹر میں میرا جی اونچی آواز سے "ٹکرتے انگور چڑھایاتے ہر گھماز فنایا" یا "آئی جان شکنجے اندر جیوں ویلن اچ گنا" گانا چاہتا ہوں مگر یہاں بھی "اونچی آواز سے بات کرنا منع ہے" کا بورڈ مجھے خاموش کر دیتا ہے اور یوں میری مرضی دھری کی دھری رہ جاتی ہے کیا تم میری مرضی مجھ تک لوٹانے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟ کیا تم...."

اس کا فقرہ نامکمل رہتا ہے کہ مجھے میرے دوست کھانے پر بلانے کے لئے پکار رہے ہیں اشارے کر رہے ہیں۔

"تم جاؤ۔ وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے!"

"اور تم....."

"میں تو .....بس مجھے تو یونہی کھڑے رہنا ہے اور اپنی شفٹ کے ختم ہونے کا انتظار کرنا ہے۔"

میں بادل ناخواستہ کھانے کی میزوں کی طرف چل پڑتا ہوں۔ کھانا زہر مار کرتا ہوں کہ میرا دھیان اب بھی دربان میں اٹکا ہوا ہے۔ میں سوچتا ہوں کوئی تدبیر کرنی چاہئے کہ وہ وہاں کھڑے کھڑے ہل جل سکے۔ کسی آتے جاتے کو مذاق کر سکے۔ کوئی فقرہ اچھال سکے۔ مسکرا سکے۔ ہنس سکے حتیٰ کہ کسی واقف کار کو آنکھ ہی مار سکے۔ میرا ذہن الجھا رہا۔ حالانکہ کھانا بہت اچھا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ریت نگل رہا ہوں۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو پھر وہیں سے گزر ہوا وہ ابھی تک وہیں اسی حالت میں اسی آسن میں برف بنا کھڑا تھا۔

پگڑی کا وہی اکڑا ہوا کلف اور شملہ، مونچھوں کا وہی زاویہ۔ وہی سفید براق بے شکن وردی۔ ایک ہاتھ ویسے ہی نیزے پر جما ہوا میرا اس کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہو رہا تھا۔

لیکن اب تو اس کی آنکھیں بھی خاموش تھیں۔

"ہیلو!"

جواب ندارد

"کچھ بولو۔ کچھ کہو بھئی۔"

خاموشی اس کے ہونٹوں اور سارے وجود کے ساتھ لپٹی رہی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں اب بھی ایک سوال چھپا بیٹھا تھا۔

"دیکھو، سنو!" میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ قریب سے گزرتے ایک شخص کا ہلکا سا دھکا مجھے لگا اور میں چکنے فرش پر پھسلتا ہوا خود بخود لفٹ کے دروازے کے عین سامنے جا پہنچا۔

"آؤ بھائی!"

کسی نے مجھے لفٹ کی طرف کھینچا اور میں اس دربان کی آنکھوں میں اٹکا سوال وہیں چھوڑ کر لفٹ کے ذریعے نیچے اتر آیا۔

دربان کی آنکھوں میں دھرنا مارے بیٹھا وہ سوال آج بھی مجھے تنگ کرتا ہے ۔!!

□□

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات "شاعر" بمبئی

(مطابق فلرم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت	: بمبئی	وقفۂ اشاعت	: ماہنامہ
پرنٹر و پبلشر	: ناظر نعمان صدیقی	ملکیت	: ناظر نعمان صدیقی
پتہ	: ۲۸/۲۰۲ اوریناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ، پی بی مارگ، بمبئی ۴	قومیت	: ہندوستانی۔
ایڈیٹر	: افتخار امام صدیقی		میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا
قومیت	: ہندوستانی		تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
پتہ	: ۲۸/۲۰۲ اوریناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ، پی بی مارگ، بمبئی ۴	دستخط	: ناظر نعمان صدیقی۔ ۲۸ ر فروری ۲۰۰۰ء



عارف شفیق

ریادشت یہ جنگل نہ ہوگا
جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا

یں شام تک واپس نہ لوٹا
کی آنکھ میں کاجل نہ ہوگا

بات تھی وہ منہ پہ کہہ دی
مجھ سا کوئی پاگل نہ ہوگا

معلوم ہے دشتِ طلب میں
وں کا کوئی بادل نہ ہوگا

گا ہجر میں یونہی میں تنہا
س کا سائباں آنچل نہ ہوگا

دوستاں ہے ساتھ اب تو
ساتھی سر مقتل نہ ہوگا

تشنہ ہے محرومی کا صحرا
بوندوں سے تو جل تھل نہ ہوگا

ہوں منتظر صدیوں سے جس کا
جھپکی تو پھر وہ پل نہ ہوگا

رکھ نہ عارف دوستوں سے
ف کا گھر کبھی دلدل نہ ہوگا

●SP -1, Mezinine Floor
Block -1 Al- Karam Squa
F.C.Area ,Karachi (Pak)

عباس رضوی

ہے یہ کیسی زمیں کون سا آسماں میں کہاں ہوں
میرے چاروں طرف ہے دھواں ہی دھواں میں کہاں ہوں

دشت میں بے اماں رات کا رقص ہے بے ستارہ فلک ہے
مٹ چکے ہیں سبھی راستوں کے نشاں میں کہاں ہوں

میرے لعل و گہر خاک میں مل چکے بام و در جل چکے
لٹ چکیں بستیاں جا چکے کارواں میں کہاں ہوں

اب نہ ہونے کی لذت کا احساس ہے اور نہ خوفِ عدم ہے
کیا کہوں درمیانِ یقین و گماں میں کہاں ہوں

میرے ہمدم میرے ہمسفر کیا ہوئے اور وہ گھر کیا ہوئے
کس سے پوچھوں بتائے غمِ رائیگاں میں کہاں ہوں

سرخ شعلوں میں رقصاں ہیں پرچھائیاں نوحہ گر ہیں فضائیں
مرگِ انبوہ میں جشن کا ہے سماں میں کہاں ہوں

●A-360, Block -'J', North Nazimabad
Karachi (Pak)



صبا اکرام

نہ گھر میں چین نہ باہر کے رت جگوں میں ہے
دلِ خراب گھرا کیسی الجھنوں میں ہے

پھر آرزوؤں کے موہن کو دے رہی ہے صدا
وہ گوپیوں کی کہانی جو پن گھٹوں میں ہے

منافقت ، نہ ریا دوستی کے پردے میں
بعافیت ہے یہاں وہ جو دشمنوں میں ہے

نئے نئے ہیں ستم روز اور نئی گھاتیں
کہ آجکل وہ مرا دوست فرصتوں میں ہے

میں ہوٹلوں کے نگر میں تلاش کرتا ہوں
وہ سوندھی باس جو مٹی کے برتنوں میں ہے

خود اپنے من میں ہی ڈھونڈو ا سے صبا اکرام
سکونِ شہر، نہ جنگل ،نہ پربتوں میں ہے

●B-3, Block-'N' North Nazimabad,
Krarchi -(Pak)



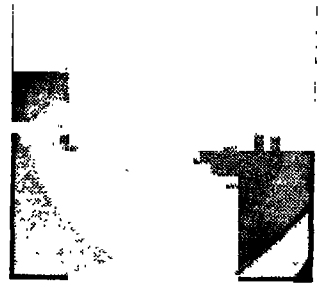
آفاق صدیقی

نیم جاں فاختہ

وہ جو گلگوں سی اک روشنی
ذہن و دل کے دریچوں کا پندار تھی
آج حسرت کشیدہ شب و روز کا
پیکر درد ہے
خوف و دہشت سے
مہر و فا کا لہو سرد ہے

نیم جاں فاختہ
جانے کب تک یونہی
شاخِ زیتون کی
اپنے کام و دہن میں سجائے ہوئے
امن عالم کے خوابوں میں کھوئی رہے
بے یقینی کی چھائی ہوئی
یہ جو چاروں طرف سرمئی گرد ہے
جانے کب تک چھٹے
سہما سہما ہوا مقتلِ جاں کا ہر فرد ہے
شاخِ زیتون بھی زرد ہے

●R-113, Street-26-A, Buffer Zone, North Karachi- 73850 Karachi (Pak)



یٰسین افضال

احتساب

شہر اندر شہر ہے شہر خموشاں
اور۔۔۔ ظاہر سب کے باطن کی گواہی
نفسا نفسی کا ہے عالم
لوگ باہر تنگ قبروں سے نکلے جا رہے ہیں
جو نہ پہچانے کسی سے جا رہے ہیں
مٹ چکا ہے فرق رنگ و نسل کا
اک ہو کا عالم ہے
کسی کا کوئی بھی پرساں نہیں ہے
روئیں روئیں کو زباں دی جا رہی ہے
ایسے میں سارے زمانے سے کہیں روپوش
اک مرد جواں نامرگ
قبروں سے نکلنے والے
نامانوس مُردوں کی طرح ناکام
اپنے آپ کو خود سے بچانے کیلئے
توبہ کے سارے بند دروازوں سے
سر ٹکرا رہا ہے
کس قدر ناعاقبت اندیش تھا وہ
دھجیاں خود اپنے ہی ناموس کی
اس نے بکھیری تھیں ہوا میں
اس کے چہرے کی لکیروں پر
بڑی سچائیوں سے
وقت نے گزرا ہوا اس کا زمانہ لکھ دیا ہے
حادثاتی موت اس کی لغزشوں کی
ایک مجموعی مگر جھوٹی سزا تھی
نفس نے خوش ذائقی کا زہر کھایا تھا

●2-K-7/1, Nazimabad, Karachi (Pak)

اقتدار جاوید

ناموجود

سفر سے لوٹ آیا ہوں
میں اک دنیا سے آخر لوٹ آیا ہوں
عجب رُت ہے
ابھی تک ساحلِ بے خواب پر آنچ
ہلاتی ہو
کسے آواز دیتی ہو
کسے واپس بلاتی ہو

چلو بیٹھیں
انہی گیلے کناروں پر
جہاں پالو دائی گیت ملاحوں نے چھیڑا تھ
بڑے بوڑھوں نے اتنا ہی بتایا
ساتویں جانب
پرندہ ہانپ جاتا ہے
افق ناپید ہوتے ہیں
زمانے ختم ہوتے ہیں
حدیں باقی نہیں رہتیں
طلسماتی کہانی میں
بڑا لسا سمندر ہے بڑی اونچی چٹانیں ہیں
بہت سی داستانیں ہیں!!

3adshahpur, Dist Mandi
hauddin Punjab (Pak)

شمس نغمان

E-253, Gali No. 2, Lunda Bazar, Rawalpindi (Pak)

جنگل میں گمشدہ شہر



فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں چک ۳۱۳ر کے میاں جی صبر و شکر ے ساتھ زندگی کے دن اچھے بھلے کاٹ رہے تھے کہ نہ جانے ایک شب ان پر کیا ری کہ ان کا دل بیٹھنے لگا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ساون جھڑی لگ گئی اور ابدن اندر مٹی مٹی سا ہونے لگا تھا۔

وہ رات بھر چارپائی پر سیدھی طرح لیٹ نہ سکے تھے۔ کروٹیں بدلتے رہے کروٹیں بدلتے بدلتے جب وہ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ سے نیم جان سے ہو گئے تو ان نکشاف ہوا کہ وہ اپنے بیٹے۔ بہو۔ پوتے اور پوتی کے لئے بے چارگی کی حد تک ں ہو گئے ہیں۔

بیٹا، بہو، پوتا اور پوتی کونسے امریکہ یا یورپ میں رہتے تھے کہ میاں جی کو ان پہنچنے کے لئے ہزار جتن کرنے پڑتے۔ اپنے ہی ملک میں یہی اسلام آباد میں ہی یہ سب لوگ مقیم تھے۔ بس بندے کا ارادہ مضبوط ہونا شرط ہے۔

میاں جی نے آخر فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ صبح فجر کی نماز کے بعد پہلی بس میں ر ہو کر فیصل آباد پہنچیں گے اور وہاں سے بس یا ریل گاڑی جو بھی پہلے تیار ملی اس ں سوار ہو کر راولپنڈی اور پھر اسلام آباد اپنی آنکھوں کے تاروں کے پاس پہنچ ئیں گے۔

زیادہ سے زیادہ نو دس گھنٹے ہی تو لگیں گے۔ اور نو دس گھنٹوں کا یہ عرصہ شوق ر اور خواہش قرب کے جذبوں میں ایسے کٹے گا کہ جیسے آنکھ بند کرو اور منزل پالو۔

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد میاں جی نے بڑے رازدارانہ انداز میں چاچا دالکریم سے کہا۔

"عبدالکریم میں اپنے بیٹے علی اصغر کے پاس اسلام آباد جا رہا ہوں۔ یہ گھر کی یاں اپنے پاس رکھ۔ واپس آ گیا تو گھر میرا۔ نہ آیا تو گھر تیرا۔ میرا مطلب ہے ہونی انھونی تو بندے کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔"

"لیکن یہ تجھے بیٹھے بٹھلائے کیا سوجھی۔ آگے نہ پیچھے کئی برس بیت گئے۔ میرا جہاں تک خیال ہے جب سے بی بی جی اللہ بخشے فوت ہوئی۔ تو نے کبھی اپنے یے، بہو، پوتے اور پوتی کا نام تک بھی نہ لیا تھا۔ یہ راتوں رات تجھے کیا ہوا۔ کیا ک کوئی بلاوہ آیا ہے ان کی طرف سے؟"

"نہیں یار۔ بس بندے کے اندر ہی اندر تہوں میں کئی اور بندے چھپے بیٹھے تے ہیں۔ ہر رنگ ہر عمر اور ہر مزاج کے بندے۔ بس ان میں سے کوئی نہ کوئی بندہ ب کی مانند اچانک خود بخود سر نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ سی ہوا ہے۔"

"یار نبی بخش اللہ خیر کرے۔ بھائی تو خیر سے جا اور خیر سے واپس آ۔ پر یہ گھر کی کنجیوں کا بوجھ میرے اوپر نہ ڈال میں گنہگار بندہ ہوں۔"

میاں جی جن کا اصل نام نبی بخش تھا اور اصل نام سوائے ان کے سانس بندھے یار عبدالکریم کے اب کسی اور کو یاد نہیں رہا تھا۔

حالانکہ یہ گاؤں بہت چھوٹا سا تھا۔ سو گھروں سے بھی کم گھر آباد تھے۔ مگر سبھی گھر اپنی اپنی الگ اور مصروف دنیا بسائے ہوئے تھے۔ اس مصروف دنیا کی بھیڑ بھاڑ میں کسی کو کسی سمت ایسا کوئی راستہ نہ ملتا تھا کہ وہ جس پر چل کر کسی دوسرے کے نام کی تختی پڑھ سکے۔

لیکن اس کے باوجود کہ سبھی گھروں کی دنیا الگ الگ تھی۔ اس گاؤں کی فضا میں اس قدر بے حسی بھی نہ تھی۔ اب سبھی بڑے بوڑھے اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کو ناموں سے نہ سہی بندے کو بندے کی پہچان کی نسبت سے تو جانتے تھے۔ تبھی تو میاں جی کے یوں اچانک گاؤں چھوڑ جانے کی خبر فجر کی نماز سے سورج کی پہلی شعاؤں کے زمین چومنے سے پہلے ہی گھر گھر پھیل گئی تھی۔

کچھ لوگ حیران تھے۔ کچھ لوگ بے یقینی کی حالت اضطراب میں یقین اور بے یقینی کے الجھاؤ میں الجھے ہوئے تھے۔

ادھر میاں جی کے سفر کی تیاری عبدالکریم نے قریباً قریباً مکمل کروا دی تھی ایک عرصہ بعد وہ اپنے بیٹے، بہو، پوتے اور پوتی کے پاس جا رہے تھے کچھ گاؤں کی سوغاتیں ساتھ باندھنا لازمی تھیں جن میں دو چار کلو باداموں والا گڑ، اللہ بخشے بی بی کے ہاتھوں سے کاتے ہوئے سوت سے بنے ہوئے چار خانے چار کھیس۔ دو چاندی کی جھانجھریں خاص اپنی پوتی کے لئے۔ یہ بھی بی بی جی مرحومہ نے دین محمد سنار سے خاص طور پر اپنی بہو کے لئے تیار کروائیں تھیں۔ لیکن نہ بیٹا شادی کے بعد دوسری بار گاؤں آ سکا نہ میاں جی اور بی بی جی ان کے پاس جا سکے۔

بس عید کے عید بہو کی جانب سے عید کارڈ باقاعدگی سے آ جاتا جسے وہ اپنی آنکھوں سے لگا لیتیں پھر کئی بار کاغذ کے اس ٹکڑے کو چومتیں اور مسکرا مسکرا کر میاں جی سے کہتیں۔

"علی اصغر کے ابا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے سے علی اصغر کی خوشبو بھی آتی ہے نا؟" میاں جی بی بی جی کے دل کے اندر بہ آسانی جھانک سکتے تھے اور اندر اندر سے تڑپتی ممتا کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتے۔

"جھلیے۔ خوشبو تو آنی ہے۔ تجھے علی اصغر کی آخر پتہ تو اصغر کے ہاتھوں سے لکھا ہوتا ہے۔ سنا ہے کہ بہو انگریزی اسکول کی پڑھی ہوئی ہے۔"

میاں جی کی بات سن کر بی بی جی عید کارڈ بڑے اہتمام سے اپنے ٹرنک میں سنبھال دیتیں اور دو نفل شکرانے کے پڑھتیں۔ میاں جی عبدالکریم کو یہ سارا قصہ سناتے ہوئے ہمیشہ یہی بات دہراتے۔

"یار عبدالکریم ماواں دی کڑیاں جھلیاں شیواں ہوندیاں نیں!"

اور بی بی جی عید کارڈ سنبھالتے آنکھیں بند کر گئیں۔ نبی بخش اپنے وقت سے پہلے اس قدر بوڑھا ہو گیا کہ لوگ اصل نام بھول گئے۔ پورا گاؤں انہیں میاں جی۔ میاں جی کہنے لگا۔

تبھی تو اس چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں کے لئے یہ خبر بڑی حیرت انگیز اور اہم تھی کہ میاں جی اسلام آباد جا رہے تھے۔

میاں جی نے رات سوچا تھا کہ وہ فجر کی نماز کے فوراً بعد سفر پر روانہ ہو جائیں گے لیکن ظہر کی نماز بھی گاؤں میں ہی پڑھ چکے تھے۔

لوگ آ جا رہے تھے اور چاچا عبدالکریم سب سمجھتا تھا کہ آنے والے سبھی لوگ اپنی اپنی ضرورتوں کی پوٹلیاں بھی ساتھ باندھ لائے ہیں جو وہ ایک ایک کر کے میاں جی کے سامان میں ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔

میاں جی از خود بھی حیران تھے کہ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کی محبتوں کا بوجھ اپنے کمزور اور ناتواں دل پر اٹھائے آخر کتنے دنوں تک ٹھر سکیں گے۔ انہیں تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شائد وہ گاؤں چھوڑ کر بے وزن سے نہ ہو کر رہ جائیں۔

ماسی جنداں اپنے ساتھ گوٹے اور چاندی کے تاروں سے گندھے دو پراندے لائی تھی۔

"یہ دو پراندے ہیں بھائی نبی بخش، ایک بہو کے لئے۔ ایک تمہاری پوتی کے لئے۔ بس میرا ایک چھوٹا سا کام بھی تیرے جوگا ہے۔ تو تو جانتا ہے نا۔ میں نے اس سال عمرہ پر جانے کے لئے پکا ارادہ کیا ہے۔ بس تیرے بیٹے کی ذرہ سی کوشش سے میرا ویزا لگ جائے گا۔ اور میں نگوڑی مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں جا پہنچوں گی۔ کیا پتہ اپنے پیارے نبی کے صدقے میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں۔"

اس کے ساتھ ہی ماسی جنداں نے ایک سفید لفافہ اور تھما دیا جس میں اس کا شناختی کارڈ، تصویریں اور ہزار ہزار کے دو نوٹ رکھے تھے۔ ماسٹر رحیم داد نے اس موقع پر ماسی کو ٹوکا۔

"چاچی ایسے تھوڑے ہی لگتا ہے ویزا۔ پہلے پاسپورٹ بنے گا۔ پھر وہاں سعودی ایمبیسی میں سفارش نہیں چلتی۔ پہلے تو یار لوگوں نے ایجنٹ چھوڑ رکھے تھے اب سعودی والے ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ میں جو گیا تھا پار سال۔ اب ویزا لگوانے خود جانا پڑتا ہے۔ کونسلیٹ ایک ایک بندے کو خود چیک کرتا ہے!"

ماسی جنداں نے سخت برا منایا۔

"تو نہ بیچ میں بول۔ اپنا علی اصغر بیٹا جو وہاں ہے خیر سے اسلام آباد میں۔ اتنا بڑا آفیسر ہے۔ اتنا سا کام بھی نہ کروا سکے گا۔ میرا ل"

اور میاں جی جنہوں نے ساری عمر سوائے اپنے دل کے کسی کا دل نہ توڑا تھا۔ عبدالکریم سے کہا کہ وہ ماسی جنداں کی امانت کی پوٹلی بھی ان کے اٹیچی کیس میں سنبھال دے۔

میاں جی کے اٹیچی کیس میں امانتوں کی پوٹلیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ علی بہادر نے ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ پی ٹی سی میں داخلہ کی درخواست میاں جی کے حوالے کرتے ہوئے بار بار تاکید کی تھی کہ انکل اصغر سے پہلا کام یہی کروانا ہے کہ ڈائریکٹر صاحب کو ایک فون کر دیں۔ بس ایک فون سے اس کی زندگی سنور جائے گی۔ ورنہ وہ برباد ہو جائے گا۔

اور راجہ دلدار کا قصہ تو بہت ہی ٹیڑھا تھا۔ راجہ یہ بھی تو جانتا تھا کہ علی اصغر اسلام آباد میں ۲۵ گریڈ کا افسر ہے اور حکومت میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ علی اصغر کے ایک فون سے اندھیروں میں گم فائلیں روشنیوں میں تیرنے لگتی ہیں۔

راجہ دلدار کئی بار اسلام آباد جا چکا تھا اور جب بھی وہ گیا اس نے ہمیشہ ٹوہ لگائی کہ علی اصغر کی اہمیت دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بقول وہ بڑا پاور فل آفیسر تھا تبھی تو اس کو یقین تھا کہ میاں جی کے اسلام آباد جانے سے اس کے سوئے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ اب زمین کا پرانا جھگڑا طے ہوا ہی سمجھو۔ میاں جی بھی جانتے تھے کہ چک خوشی والی زمین میں سے ۲۵ کنال زمین کا رقبہ اس نے ٹھیکیدار نور الٰہی نے دس ہزار بیانہ دے کر باقی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا اور شرط یہ لگا دی تھی کہ وہ زمین کی وہی قیمت لگائے گا جو دس سال پہلے راجہ دلدار کے باپ نے جس بھاؤ خریدی تھی۔ یعنی کوڑیوں کے بھاؤ۔ یہ سب کچھ پٹواری شیر عالم کا کیا دھرا تھا۔ جس نے بھاری رقم لے کر ساری زمین ٹھیکیدار نور الٰہی کے نام انتقال پر چڑھا دی تھی۔

راجہ دلدار نے خوشامد سے میاں جی کے کندھے دباتے ہوئے بڑی عاجزی اور انکساری سے کہا۔

میاں جی اگر علی اصغر صاحب کمشنر صاحب کو فون کر دیں کہ وہ پٹواری کو بلوا کر نور الٰہی کے نام چڑھایا ہوا انتقال منسوخ کر دے۔ تو پٹواری کی کیا ہمت جو نہ کر سکے۔ اور۔!"

"اور کیا۔" چاچا عبدالکریم اس لمبے قصے کو جاری نہ رکھنا چاہتا تھا۔

"اور اگر میرا یہ کام ہو گیا نا۔ میاں جی تو چک خوشی والی کماد کی کھڑی فصل آپ کے حوالے کر دوں گا!" میاں جی یہ بات سن کر تڑپ اٹھے۔

"توبہ کر بدنصیب۔ توبہ کر۔ کہاں اس عمر میں میرے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے بنا کفن قبر میں لٹکائے گا۔ توبہ کر۔ توبہ!!"

دلدار نے میاں جی کے چہرے اور آنکھوں میں اترے غضب کو بھانپ لیا اور ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"میاں جی کج بندے ہوتے ہی لالچ کی پوٹلی۔ اسے معاف کر دیں۔ لالچی نہ ہوتا تو لکھوں لکھ نہ ہوتا۔ اگر ہو سکے تو اس کا کام کروا دیں۔ بڑی رقم ڈوبی ہوئی اس دوزخی کی!"

عصر کی نماز تک میاں جی کے اٹیچی کیس میں امانتوں کی پوٹلیوں کے انبار لگ گئے تھے۔ وزن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا جیسے۔

مولوی عبدالقدوس کی درخواست کہ اسے محکمہ اوقاف کی ملازمت کسی اچھے سے گاؤں میں مل جائے اور اگر ہو سکے تو اسی گاؤں کی مسجد میں اس کی تعیناتی ہو جائے۔ میاں جی کے نزدیک سب سے اہم درخواست تھی۔

حاکم علی ڈھلون کی ٹریکٹر خریدنے کے لئے قرضہ کے حصول کی

خواست۔ ماسی برکتے کی درخواست بھی اس وزن میں شامل تھی جس بیچاری نے
پنے مرحوم خاوند کی ساری پنشن کسی فنانس کارپوریشن کے حوالے کردی تھی اور
۔اس اسکینڈل میں خود روٹی اور پانی کو ترسنے لگی تھی۔ اور تو اور۔

بڑی حویلی اور گاؤں کے بڑے چوہدری ظہور بخش نے بھی تاجے نائی کے
پیغام بھجوایا تھا کہ اگر میاں جی چاہیں تو وہ انہیں اپنی کار کے ذریعہ فیصل آباد اور
بذریعہ جہاز فیصل آباد سے اسلام آباد پہنچا سکتا ہے۔

بس میاں جی کو اپنے ساتھ سنہرے آموں کی تین پیٹیاں لیجانی ہوں گی جو
ں مقیم اپنے علاقہ کے بڑے چوہدری صاحب کو پہنچادیں ساتھ ایک بند لفافہ
ارسال کیا تھا اور کہلوایا تھا اگر علی اصغر ذرہ سی سفارش کردے تو بڑی نہر کے پل
یکہ اسے مل جائے گا۔ اور اگر بڑی نہر کے پل کا ٹھیکہ اسے مل گیا تو وہ خود علی اصغر
ے پاس جاکر حاضری دے گا۔

میاں جی جنہوں نے کبھی سوائے اپنے دل کے اور کسی کا دل نہیں توڑا تھا ایک
ب کشمکش اور شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔ اسی بے کلی اور بے چین حالت میں
وں نے عصر کی نماز پڑھی۔ سلام پھیرا۔ دعا کی اور قاصد سے کہا۔ "بہتر تاجے!
ہدری سے جاکر میرا سلام بولنا۔ شکریہ بھی ادا کرنا اور کہہ دینا کہ بندے کو رب
۔خی نہیں کرتا بندہ آپ ہی دوزخی ہو جاتا ہے!"

اور اس سے پہلے کہ ضرورتوں اور لاشوں کی پوٹلیوں کا بوجھ پہاڑ برابر وزنی
جاتا۔ عبدالکریم میاں جی کو فیصل آباد کی بس میں سوار کر کے مسجد میں واپس
لیا۔ اسی شام

سورج کے غروب ہوتے ہی اس نے میاں جی کے گھر کو جاکر کھولا۔ اسے
ے لگا جیسے میاں جی مسجد میں رہ گئے ہوں۔ وہ میاں جی کے بستر پر لیٹ گیا۔

پل پل۔ سانس سانس۔ ہ میاں جی کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگا۔ اب
ں جی سمندری پہنچ گئے ہوں گے۔ اب میاں جی فیصل آباد پہنچ کر پنڈی کے لئے
یگن میں بیٹھ گئے ہونگے۔ کیا پتہ ریل گاڑی میں ہی بیٹھ گئے ہوں۔ اب
۔ہ اب۔!! پھر اسے نیند آگئی۔ عبدالکریم دراصل ذہنی طور پر کبھی بھی میاں جی
ے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

اگلی صبح جب اس کی بیوی اسکے لئے پراٹھوں اور لسی کا ناشتہ لائی تو وہ کہنے لگا۔
نیک بخشے اس وقت میاں جی اپنے بیٹے۔ بہو۔ پوتے اور پوتی کے پاس بیٹھے
ں گے۔ ایک جشن ساسماں ہوگا۔ یا پھر خوشیوں کے میلے لگے ہوں گے۔ نبی بخش
اچھا ہی کیا۔ جو چلا گیا۔ اب دیکھو کیا پتہ وہ لوگ میاں جی کو واپس آنے ہی نہ دیں۔!"

"رحیم کے ابا۔ میاں جی تو چلے گئے پر تو راتوں رات آدھا ہو گیا اور اگر
اں جی واپس نہ آئے تو۔ پھر تیرا کیا بنے گا؟"

"ہوئے جھلیے۔ دلوں کے اندر اندر جو اصل خواہشیں چھپی ہوتی ہیں جب وہ
ہر ہو جائیں نا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی عام سا شخص اچانک اپنی کرامات کے ذریعہ
یری یا ولائت ظاہر کردے۔ تو پھر۔ تجھے پتہ نہیں۔ جدائیوں کے کتنے پہاڑ
ر و شکر کے سہنے پڑتے ہیں۔" ماسی برکتے جیسے عبدالکریم کی باتوں کو بالکل سمجھ نہ
ی ہو کہنے لگی۔

"تیریاں تو اں ای جانیں۔ آگے بھلا ساری عمر تیری سمجھ آئی ہے۔ جواب
آئے گی!"

ایک عبدالکریم کی بیوی ہی کیا۔ عبدالکریم کو پورے گاؤں میں کوئی نہ سمجھ سکا
تھا۔ ساری عمر اولاد نہ ہوئی بڑے اچھے اچھے اور اونچے اونچے گھروں سے رشتے بھی
آئے بلکہ ایک دو رشتے تو حسن اور جوانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن دوسری
شادی نہ کی بس یہی کہتا رہا۔

"اللہ نے اگر اولاد دینی ہے تو اسی عورت سے دے گا۔"

ساری زمین پٹے پر دے دی۔ پٹہ داروں نے جو کچھ دیا کبھی حساب نہ دیا نہ کیا۔
بس ایک آٹے کی چکی اپنے پاس رکھی اور اس کی آمدنی کا بہت سارا حصہ مسجد
میں لگا دیا۔ نہ کبھی کسی بیٹھک میں بڑھ چڑھ کر باتیں کیں نہ کسی کی چغلی کھائی نہ اپنا
دامن تار تار کیا۔

گاؤں والوں کا خیال تھا کہ عبدالکریم پر درویشی کا یہ رنگ میاں جی نے چڑھایا
تھا۔ اس میں سچ یوں بھی ظاہر ہوتا تھا کہ میاں جی کے بغیر عبدالکریم نے تین دن
بڑی بے قراری اور بے چینی سے گذارے تھے۔ وہ اپنے اندر کی کیفیت کا اظہار کسی
سے نہ کرتا۔ اسے اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے۔

چوتھا دن بھی گذر گیا۔ چوتھے روز عشاء کی نماز کے بعد عبدالکریم نے
جوں ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ اچانک اس کی نظر مسجد کے حجرہ کی دیوار پر
جاٹک گئیں۔ ایک کونے میں کوئی شخص اپنا سر گھٹنوں پر لگائے بیٹھا تھا۔ اس شخص
نے خود کو چارخانیئے کھیس سے مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔

عبدالکریم کا دل دھڑکا آنکھوں کی پلکیں جہاں تھیں وہیں ٹھہر گئیں۔ وہ
تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سوت کے چارخانیئے کھیس کے اندر چھپے ہوئے شخص
پر سے آہستہ آہستہ کھیس اتارنے لگا۔ اس کی آنکھیں پلکیں جھپکنا تو بھول ہی گئیں
تھیں۔ اس کا دل ایک دھچکے کے ساتھ اس کے جسم کے اندر کہیں ٹوٹ کر گر گیا۔
اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لب تھر تھرا رہے تھے۔ "نبی بخش تم!" وہ بے اختیار
سا ہو گیا اور نبی بخش سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

"نبی بخش تم واپس آگئے؟"

میاں جی نے اسے سینہ سے لگایا۔ اس کے کندھوں پر تھپکیاں دیتے ہوئے
بولنے لگے۔ ان کی آواز میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ لہجہ بڑا معتبر اور ملائم تھا۔

"ہاں عبدالکریم میں واپس آگیا ہوں۔ میں اسلام آباد گیا تھا۔ وہاں بڑے
بڑے عالیشان پلازے تھے۔ سنگ مرمر سے بنی ہوئی سرکاری عمارتیں تھیں۔
سر سبز درختوں کے جھرمٹوں میں سجی سجائی کوٹھیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے
جنگلوں میں سے اٹھتی ہوئی خوشگوار ہوائیں اور خوشبوئیں تھیں۔ بدن کو اچھی لگنے
والی سنہری دھوپ تھی۔ لمبی لمبی کاریں تھیں اور ان میں بیٹھے ہوئے خوبصورت
لوگ تھے اور اس بھیڑ بھاڑ میں ایک عالی مرتبت آفیسر علی اصغر بھی تھا۔ اس کی
بیوی بھی تھی۔ ان کا بیٹا علی مراد بھی تھا اور بیٹی کبرا ای اصغر بھی تھی۔

لیکن عبدالکریم!۔ میرا بیٹا۔ میری بہو۔ میرا پوتا۔ میری پوتی شائد اس بڑے
عالی شان شہر کے کسی جنگل میں گم ہو گئے تھے۔ میں نے اچھا کیا۔ میں واپس آگیا
۔میں ڈر گیا تھا۔ کہیں اس شہر کے کسی جنگل میں تمہارا نبی بخش بھی گم نہ
ہو جائے"۔ □□

كرامت بخاری

خـــزاں

اگر ہوا کا مزاج بدلے تو اس سے کہنا
میں زندگی کی اداس شاخوں کا زرد پتا

تمہاری تند اور تیز لہروں سے گر پڑوں گا
مگر یہ موسم، اداس منظر ہوا یہ جھونکے

انہیں بتادو کہ شاخِ جاں پہ جو زخم ہوگا
بدلتے موسم کی زندگی اس کو پُر کرے گی

حقیقتوں کے حصار سے اپنا رنگ لے کر
ہر ایک پتا نظام نو کی نوید ہوگا

●25-n, Civic Centre,
Melody Islamabad (Pak)

رفیق سندیلوی

بدن اک واهمه هے

بدن اک واہمہ ہے
اور میں اس واہمے کی منفعل حالت میں خوابوں کی توانائی پہ زندہ ہوں
میں اک بدرنگ، بدصورت پرندہ ہوں
میں اپنا بھاری جثہ ساتھ لے کر اڑ نہیں سکتا
زمیں پر رینگتا ہوں سیدھ میں اور موڑ کوئی مڑ نہیں سکتا
مرے پہلو میں چیونٹوں، کیڑوں اور حشرات کی لمبی قطاریں ہیں
قطاریں ٹوٹ جاتی ہیں تو میں کچھ دیر، پچھ بل منتشر مخلوق کی اس کھلبلی پر غور کرتا ہوں
ہزاروں جانداروں کے گھنے انبوہ میں اس کلبلاہٹ
کھڑکھڑانے والی اس فوری قیامت سے بھی ڈرتا ہوں
میں اپنے سُن بدن کے زخم کے گہرے شگافوں کو
مسلسل راکھ مٹی اور نمک کے ساتھ بھرتا ہوں
خلا میں وسوسوں کے سرمئی بادل رواں ہیں
بدن اک واہمہ ہے
اور میں اس واہمے کی منفعل حالت میں خوابوں کی توانائی پہ زندہ ہوں
میں اک بدرنگ، بدصورت پرندہ ہوں
خدا کا ایک بندہ ہوں

●379, Street No. 23, Rawial Town,
Islamabad (Pak)

صبیح رحمانی

حمدیه هائیکو

اے ربّ رحمان
صورت کے طالب ہیں ہم
بے چہرہ انسان

✡

کیا تیرا عرفان
ہم کو نہیں ہے خود مولا
اپنی بھی پہچان

✡

کیسے تجھے پائیں
تجھ کو ڈھونڈنے نکلیں تو
سوچیں تھک جائیں

نعتیه هائیکو

کھولے سب جوہر
آپؐ نے نوعِ انساں کو
فکر نو دے کر

✡

سیرت کے انوار
سورج بن کر ابھرے ہیں
انؐ کے پیروکار

✡

لکھیے ان کا نام
اُجلے موسم اتریں گے
دل پر صبح و شام

E-25,Phase -5,TNT Flats,
haman No. 2,
orth Karachi-75850,
arachi-(Pak)

عزم بہزاد

، شرطِ وصال ٹھہری وہی ہے اب وجہِ بدگمانی
ہے اس باب میں خموشی ادھر ہے پہلی سی بے زبانی

ارے سے کیا شکایت کہ رات سب کچھ بجھا ہوا تھا
ں لکھ رہی تھی دل پر شکستگی کی نئی کہانی

آشوبِ وضع داری ہمارے اعصاب پر ہے طاری
پہ ترتیبِ خوش کلامی دلوں میں تنظیم نوحہ خوانی

، لہجے میں یہ توازن بڑی صعوبت کے بعد آیا
اجوں کے دشت دیکھے کئی رویوں کی خاک چھانی

سانسیں بحال کرنے یہ کس فضا میں رُکے ہوئے ہیں
نہ آثارِ درد مندی نہ کوئی تہذیبِ میزبانی

ے ملامت کی رہگزر ہے اور اس پہ تنہائی کا سفر ہے
نے منزل سے آنکھ پھیری نہ ہم نے رستے کی بات مانی

اسی کو ڈھونڈ لاؤ کہ شام اپنے عروج پر ہے
ہوؤں کے فریب دیکھو یہ رنگ ہیں کتنے داستانی

ے آئینے میں لرزاں یہ شعلۂ آرزو نہیں ہے
لحہ بسنگ رہے ہیں وجود میں صبر کے معانی

سوچا ہے عزم تم نے بہار کس رت کا نام ہو گا
ے تم بھی گزر رہے ہو تو پھر یہ کیسی غلط بیانی

●11-C-3/R-329, Sir Syad Town,

اقبال مجیدی

دل ہے ویران رہگزر خاموش
پھر رہا ہوں میں دربدر خاموش

دن کو دیوار و در کی سنتے ہیں
اور رہتے ہیں رات بھر خاموش

کیا ہوا آپ کی طبیعت کو
کیوں ہیں آپ آج اس قدر خاموش

کوئی دستک سنی نہیں جاتی
آج کیوں ہے یہ گھر کا گھر خاموش

اب مجیدی گلہ کریں کس سے
لوگ بہرے ہیں اور نگر خاموش

●R-273, Sector- 14-B,
Shadman Town, North Karachi,
Karachi(Pak)

ارشد محمود ناشاد

شمیم نکہت افزائے جہاں رہنا پڑے گا
اسی خاکِ چمن کا رازداں رہنا پڑے گا

سفر لکھا گیا ہے اور کہیں رکنا نہیں ہے
بہ شکلِ موجۂ آبِ رواں رہنا پڑے گا

کہانی کے مسافر شاہزادے کی طرح اب
طلسماتِ انا میں جاوداں رہنا پڑے گا

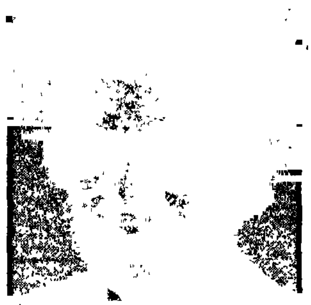
اکیلی بستیوں سے چاند کا رشتہ نہیں ہے
دلِ ہجر آشنا کو ضو فشاں رہنا پڑے گا

نہ جب تک موسمِ ظلِ ہما ناشاد اترے
اسیرِ گردشِ سیارگاں رہنا پڑے گا

●Mohammad Nagar, Mirza
Road, Attock Cantt- 43602 (Pak)

قیوم راہی

B-9, GULSHAN-E-ZUBAIDA, FL-12, BLOCK-E,
NORTH NAZIMABAD, KARACHI-74700 (PAK)



سمندر

وہ کراچی کی ایک سہانی شام تھی۔ سرسراتی ہوئی خنک آلود ہواؤں میں تازگی سی گھلی ہوئی تھی۔

میں زیب انساء اسٹریٹ پر بے دلی کے ساتھ تھکا تھکا سا چلا جارہا تھا۔ ان دنوں میرے جسم، میری روح، میری سوچوں پر ایک سستی، بے کیفی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ میں بے حد اکتا چکا تھا۔ چونیاں سے کراچی تک طویل سفر میں نے اس توقع پر کیا تھا کہ شاید ماحول کی تبدیلی میرے احساسات پر کچھ خوشگوار اثر ڈال سکے۔ سنا ہے آب و ہوا کی تبدیلی بعض اوقات صحت اور خیالات کی بہتری کا سبب بن جاتی ہے۔

زیب انساء اسٹریٹ پر بے مقصد گھومنے کے بعد میں چند گلیوں میں سے گذر کر ایک روشن اور بارونق بازار میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سامنے کچھ فاصلے پر نجمی سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ہوا ایک ریستوران میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم جیسے کسی نے میرے دردل کو جھنجوڑ ڈالا ہو۔ میرے اندر ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا جس میں مسرت کا احساس بھی شامل تھا جو اس نا آسودہ کیفیت میں کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

میں نے تو ایک جھلک میں ہی سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ سر سے پاؤں تک وہ ذرا بھی تو نہ بدلا تھا۔ وہی دبلا پتلا جسم، وہی متوازن چال، سنجیدہ چہرے پر چاکلیٹ کلر فریم والی خوبصورت عینک، گہرے کتھئی رنگ کی پتلون، کریم کلر کی بش شرٹ، ہمیشہ سے ہی یہ اس کے پسندیدہ رنگ تھے۔

کچھ یاد نہیں، غالباً میں نے اسے آٹھ نو برس بعد دیکھا تھا۔ جدائی کے اس طویل عرصے میں وہ مجھے کئی موقعوں پر یاد آتا رہا تھا۔ میرا ایک طویل عرصے تک اس سے خصوصی رابطہ جو رہا تھا۔ لیکن میں اس کی پیچیدہ شخصیت کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے بارہا اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت گہرا تھا۔ میں اس کی تہہ تک کبھی نہ پہنچ سکا تھا۔ میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک بہترین انسان اور ایک پیارا دوست ہے۔

بعض لوگ پہلی نظر میں ہی بہت اچھے لگتے ہیں اور دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ نجمی کے سلسلے میں ایسا ہی ہوا تھا۔ میں ان دنوں اپنے قصبے چونیاں سے نیا نیا لاہور آیا ہوا تھا۔ اور وہاں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ اس کا تبادلہ ہوا اور وہ میری برانچ میں آ گیا۔ مجھ سے چند برس سینئر تھا۔ میری ملازمت نئی نئی تھی۔ میں ابھی وہاں کے اہلکاروں سے پوری طرح گھل مل بھی نہ سکا تھا۔ لیکن نجمی میں کوئی کشش تھی کہ میں جلد ہی اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس نے بھی ہر طرح سے میری دلجوئی کی اور دستِ تعاون بڑھایا۔ یوں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

میں ان دنوں کرایہ پر رنگ محل کے ایک سہ منزلہ مکان کی تیسری منزل کے ایک پورشن میں رہتا تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں وہاں اکیلا رہتا تھا۔ محلے میں ایک لڑکی سے میرا عشق چل رہا تھا۔ نجمی شادی شدہ تھا اور ایک بیٹے کا باپ۔ وہ عمر میں مجھ سے دس بارہ برس بڑا تھا۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہنا اس کی عادت تھی، جیسے وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہو۔ پتہ نہیں وہ ہر وقت کیا سوچتا رہتا تھا۔ چھٹی کے دن وہ اکثر میری رہائش گاہ پر آتا تھا۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو پریشر کوکر میں گوشت بھون کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی بڑی تعریف کرتا اور بڑی رغبت، بڑی اپنائیت سے مزے لے لے کر کھاتا۔ وہ میرے عشق کے قصے بڑی دلچسپی سے سنتا تھا۔ ویسے ہماری کئی دلچسپیاں مشترک تھیں۔ میں موسیقی کا رسیا تھا اور افسانوی اور شعری ادب کا دلدادہ تھا۔ وہ بھی اس معاملے میں میرا ہم مذاق تھا۔ بلکہ مجھ سے ایک دو قدم آگے ہی تھا۔ ان موضوعات پر ہماری دیر تک گفتگو رہتی تھی۔ فلمیں میں بھی دیکھتا تھا اور وہ بھی۔ لیکن ہم دونوں نے کبھی اکٹھے پکچر نہیں دیکھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کے بغیر فلم دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا۔ بعض اوقات تو وہ مجھے ایک انتہائی پُراسرار شخصیت معلوم ہونے لگا تھا۔

ایک چھٹی کے دن وہ مجھے ریلوے اسٹیشن لے گیا۔ وہاں ہم کافی دیر تک ٹہلتے رہے۔ جب گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ مجھے ریل کی پٹریوں پر لے گیا۔ ہم دونوں چلتے چلتے دور نکل گئے۔

اس نے کہا "دراصل مجھے یہ ماحول، یہاں کا سب کچھ بڑا اچھا لگتا ہے۔ یہ ریل کے ڈبے، یہ چنگھاڑتا دوڑتا ہوا انجن، یہ پٹریوں کا دور تک پھیلا ہوا جال، یہ مسافروں کی ریل پیل۔ بتا نہیں سکتا مجھے یہاں آ کر کیا ہو جاتا ہے، کیوں ہو جاتا ہے۔"

"یہ سب کچھ تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔"

"شاید ہماری دوستی کی ایک وجہ یہ بھی ہو"

"شاید"

پھر اس نے ایک دم موضوع بدل دیا "یار ستار میری ایک بات غور سے سنو"

"کیا؟"

"معاملہ بس عشق تک محدود رہنا چاہئے"

"جی؟" میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔

"میرا مطلب ہے شادی کے جھنجھٹ میں مت پڑنا"

"کیوں؟" میں حیران تھا۔

"انسان بندھ کر رہ جاتا ہے۔ آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ چین اور بے فکری

سے نہ جی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔"

"میں سمجھ نہیں سکا آخر کہنا کیا چاہتے ہو تم"

"تم شاید سمجھ نہیں سکو گے یار۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اس نے میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش وہ سمجھا میں خفا ہو گیا ہوں۔ بولا "اب دیکھو نا بعض اوقات اچانک یوں لگتا ہے کہ زندگی، یہ کائنات، یہ سب کچھ جو تمہارے اور میرے سامنے ہے بے کار ہے، ن بے کار، بے مصرف، بے مقصد۔ زندگی کا کوئی جواز ہی نہیں ملتا مرے سے"۔

میں نے گہرا سانس لیا "ہاں یار ایسا ہو تو جاتا ہے کبھی کبھار"

"تو ایسے میں ہی تو انسان کا مرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہی وہ سنہرا موقع و تا ہے جب زندگی کی قید سے رہائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور اس عمل کے لئے ڑ کی پٹریوں سے اچھی جگہ کیا ہو سکتی ہے۔ تم بور تو نہیں ہو رہے میری باتوں سے"۔

"نہیں بھئی۔ ایسی بات نہیں ہے"

تو سنجی۔ میرے یار۔ تمہیں ریل گاڑی اور اس کی پٹریاں اس وجہ سے اچھی لتی ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جب تمہاری بیوی میکے چلی اتی ہے تو تم ریل کے ڈبے میں بیٹھ کر انہی پٹریوں پر سے گزر کر اُسے لینے جاتے و۔ لیکن مجھے کیوں اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ؟ میں کیوں بچوں کی طرح خوش ہونے تا ہوں یہاں آکر۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے اس کی۔ تو کیا میں بھی تمہاری طرح واہش مرگ میں مبتلا ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ اس آرزو کی چنگاری میرے تحت شعور کی راکھ میں کہیں دبی ہوئی ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہے شاید ہرگز نہیں و سکتا۔ میں اُلجھ کر رہ گیا۔

"آؤ اب واپس چلتے ہیں یار۔ بہت گھوم پھر لئے" اُسے جیسے کوئی ضروری کام ۔ آ گیا ہو۔ وہ بعض اوقات میرے گھر سے بھی ایک دم اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ بات کو حور اور موضوع کو تشنہ چھوڑ کر۔ وہ خود بھی شاید ایک تشنہ، ایک ادھورا انسان تھا ن دنوں۔

"چلو" میں نے جواب دیا۔

اور اس نے تیز تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

پھر ایک بار جب وہ اپنی بیوی کو کراچی لینے گیا ہوا تھا میری محبوبہ مجھ سے یشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ نہ جانے کیسے اچانک اس کی شادی ہو گئی اور وہ پشاور سدھار ئی۔ میں کئی دنوں تک مغموم اور دل برداشتہ رہا۔ آخر جلد ہی میں نے خود کو سمجھا بھا لیا۔ جب وہ کراچی سے واپس آیا تو دفتر جانے سے ایک دن قبل شام کو میرے س پہنچا۔ دفتر میں ہماری بات چیت کم ہی ہوتی تھی۔ ہم اپنے اپنے کاموں میں صروف رہتے تھے۔ "ملاقات" کے لئے وہ فرصت اور خاص ماحول کا قائل تھا اور فتر اس "خاص ماحول" کے زمرے سے خارج تھا۔ وہ میرے لئے کراچی سے وہن حلوہ لایا تھا۔ اس نے بڑی محبت کے ساتھ حلوے کا ڈبہ مجھے دیا۔ میں نے وش ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بھی مسکرایا۔ پھر سفر کی باتیں، کراچی کی باتیں اور ندمیں دفتر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں نے اپنی محبوبہ کی شادی کا ذکر چھیڑا تو وہ ۔ جانے کیوں مسکرایا "اچھا" پھر سوچ کر بولا "کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے تم ا بہت بہادر اور حقیقت پسند واقع ہوئے ہو۔ تم نے اچھا کیا جو اس بات کا اثر نہیں

لیا" پھر اس نے اپنی عادت کے مطابق اس موضوع کا سلسلہ اچانک منقطع کر دیا۔ بولا "چائے نہیں پلواؤ گے؟"

میں نے بجلی کے ہیٹر پر پانی کی کیتلی رکھ دی۔

اس نے پاس ہی رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ رفیع بڑی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔

رہا گردشوں میں ہر دم مرے عشق کا ستارا
کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارا

یہ گانا اسے بے حد پسند تھا۔ وہ آنکھیں موندے ڈوب کر سنتا رہا۔ پھر جب رفیع کی آواز کا سوز اس شعر میں ڈھلا:

پڑے جب غموں سے پالے رہے مٹ کے مٹنے والے
جسے موت نے نہ پوچھا اسے زندگی نے مارا

تو اس نے آنکھیں کھول کر کئی لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر اس نے ٹیپ کو کئی بار ریوائنڈ کر کے اس شعر کو سنا۔ یہ اس کی خاص ادا تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے پسندیدہ گانے ریوائنڈ کر کے دس دس بار سنتا تھا۔ میں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ گانے کے بول ختم ہوئے تو اس نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔ میں نے چائے کی پیالی اس کے آگے بڑھا دی۔ اس نے چائے کے ایک دو گھونٹ پی کر پیالی میز پر رکھ دی اور بولا "اب کی بار کراچی میں جی نہیں لگا یار"

"کیوں تمہیں تو وہاں کی راتیں بڑی پسند تھیں۔ جگمگاتی ہوئی پُر کیف حسین راتیں"

"دراصل یار جب تک انسان خود کو کسی نہ کسی طرح بہلائے رکھتا ہے۔ فریب دیے رکھتا ہے، اسے سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جاتے ہیں، وہ خود کو دھوکا دینے کے قابل نہیں رہتا تو زندگی کا سارا نشہ اُتر جاتا ہے۔ وہ بالکل تنہا رہ جاتا ہے، اس کا جی بری طرح گھبرانے لگتا ہے اور ریل کی پٹریاں اسے اپنی طرف بلانے لگتی ہیں۔ یہ ریل کی پٹریاں بھی کیسی مفید چیز ہیں یار"۔

میں نے خصوصاً اس ضمن میں کبھی اسے جان بوجھ کر قائل نہیں کیا تھا تاکہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کھل کر بیان کر سکے۔ میں تو بس چپ چاپ غور سے اس کی باتیں سنتا رہتا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے رویے سے اسے پختہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں بھی اس کے ان خیالات اور تاثرات پر "صاد" کرنے لگا ہوں۔

وہ ادب، موسیقی، فلم اور کبھی کبھار زندگی پر فلسفیانہ گفتگو تو کھل کر کر لیتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ذاتی حالات پر بات کرنے سے ہمیشہ گریز کیا تھا۔ میں جب بھی کسی نہ کسی اشارے کنایے سے اسے کریدنے کی کوشش کرتا وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ٹال جاتا۔ وہ کہیں راج گڑھ کے علاقے میں رہتا تھا اتنا مجھے معلوم تھا۔ لیکن میں نے اس کا گھر نہیں دیکھا تھا اس نے دکھایا ہی نہیں۔ کبھی مجھے وہاں لے کر نہیں گیا حالانکہ میری ہمیشہ آرزو ہی رہی کہ اس ماحول کو دیکھوں جہاں وہ رہتا ہے۔

ہماری ملاقاتیں بڑے تواتر اور تسلسل کے ساتھ برسوں جاری رہیں۔ ہم ریلوے اسٹیشن بھی جاتے رہے۔ شام کے وقت انار کلی میں گھومتے رہے۔ گھوم پھر کر جب ہم تھک جاتے تو کبھی لوئلٹن، مارکیٹ کے ایک پُر سکون ریستوران میں چلے جاتے جہاں چائے اور سگریٹ پیتے ہوئے دیر تک بیٹھے رہتے۔ کبھی خاموش تو کبھی

بولتے ہوئے۔ کبھی رات کے وقت مال روڈ پر ٹہلتے ہوئے دور تک نکل جاتے۔ چلتے چلتے وہ بلا ارادہ ہال روڈ، بیڈن روڈ، ٹیمپل روڈ کی طرف مڑ جاتا۔ ہمارے پروگراموں میں بھی کوئی نظم و ضبط نہیں تھا۔ کوئی سلیقہ کوئی اصول نہیں تھا جس کی بیشتر ذمہ داری مجی پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں، میں کیا کوئی بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بیشتر باتوں میں ایک غیر معمولی انوکھے پن کا دخل ہوتا تھا۔

ایک چھٹی کے دن صبح ہی سے کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بارشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شہر کی بہت سی گلیوں اور سڑکوں پر پانی بھر گیا تھا۔ سہ پہر کو بارش تھم گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ "یار صبح سے بور ہو گیا تھا گھر میں پڑے پڑے" بعض اوقات میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جسے "چین" کہتے ہیں اسے کسی جگہ بھی نہیں ملتا اور وہ ایک بے قرار روح ہے جو ادھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔

ایک دن اس نے اس لڑکی پر اظہار رائے کیا، جس نے شاہی مسجد کے مینار سے گر کر خودکشی کر لی تھی۔ کہنے لگا "یہ خودکشی کا بڑا مشکل اور بھیانک انداز ہے۔ پسند نہیں آیا مجھے" پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولا "ریل کی پٹریوں پر نہیں جا سکتی تھی تو کہیں سے پوٹاشیم سایانائڈ ہی حاصل کر لیتی۔"

پوٹاشیم سایانائڈ کے بارے میں اسے اس دن پتہ چلا تھا جب ہمارے دفتر کے ایک افسر کا نوجوان بیٹا جو میڈیکل کا اسٹوڈینٹ تھا اس زہر کے استعمال سے اپنے کنبے کو داغ جدائی دے گیا تھا۔ جب مجی کو پتہ چلا کہ یہ ایسا زہر ہے جس کے ذائقے کے بارے میں آج تک کوئی نہ بتا سکا۔ کہنے لگا "اچھی چیز ہے" اس نے مرنے والوں پر کبھی افسوس نہیں کیا تھا۔ وہ تو بس خودکشی کے طریقوں پر سوچتا اور اظہار رائے کیا کرتا تھا۔ وہ شاید جنم جنم کا روگی تھا۔ خواہش مرگ بھی تو ایک روگ ہی ہوتا ہے۔

میں اب اس کے بارے میں کچھ اور بھی جان چکا تھا۔ مثلاً موت کے بارے میں اس کا رویہ خاصا رومینٹک تھا۔ وہ اذیت پسند تھا۔ اسے اداس اور غم زدہ رہنا مرغوب تھا۔ میں نے کبھی اسے خوش نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار کراچی سے آنے کے بعد اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا (وہ اس قسم کی بیشتر باتیں کرتے ہوئے اپنے چہرے پر تبسم کا ملمع چڑھا لیتا تھا) "یار اس بار ایک عجیب بات ہوئی۔ بڑا لطف آیا"۔

"اچھا"

"ہاں.... گاڑی ایک جنگل سے پاس سے گزر رہی تھی کہ مجھے اپنا گھر یاد آ گیا"

"پھر"

"پھر فوراً ہی غالب کا شعر میرے اندر گونجنے لگا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن جیسا کہ پہلے بھی بیان کر چکا ہوں میں اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی حالات کو مجھ سے ایک سربستہ راز کی صورت میں پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ اور میں اس معاملے میں اس سے واضح انداز میں گفتگو کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکا تھا۔ نہ جانے اتنی قربت کے باوجود ہمارے درمیان ایک فاصلہ کیوں تھا۔

پھر میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ لاہور کی تحصیل قصور کو جب ضلع کا درجہ دے دیا گیا تو چونیاں تحصیل قصور ضلع میں آ گئی۔ وہاں نئے انتظام کے تحت عملے کی ضرورت پڑی تو میں نے اپنا تبادلہ چونیاں کرا لیا جہاں جلد ہی میری شادی ہو گئی۔ میں لاہور اور مجی سے رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا۔ نہ میں نے اسے خط لکھا نہ اس نے مجھے۔ یوں برسوں ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں علم نہیں ہو سکا کہ کس حال میں ہیں۔

کوئی دو برس قبل جب میں لاہور کے دفتر میں اس سے ملنے گیا تو مجھے پتہ چلا کہ اس نے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور وہ کراچی چلا گیا ہے۔ اس غیر متوقع اطلاع پر مجھے کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔ اس کے تو کئی اقدام ڈرامائی ہوا کرتے تھے۔ بڑے عجیب چونکا دینے والے۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس بار وہ یقیناً کسی غیر معمولی دباؤ کی زد میں آ گیا تھا ورنہ وہ لاہور ہرگز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لاہور اُسے بے حد عزیز تھا۔ کتنی ہی بار وہ مجھ سے لاہور سے اپنی غیر معمولی وابستگی کا برملا اظہار کر چکا تھا۔

بہر کیف اس شام کراچی میں اسے دیکھ کر مجھے ایک ڈھارس کا سا احساس ہوا۔ میں بڑے تجسس کے ساتھ تیزی سے اس ریستوران کی طرف چل دیا جس میں ابھی کچھ دیر پہلے مجی داخل ہوا تھا۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا وہ ایک خالی گوشے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھا کہ میں اس کے نزدیک پہنچ گیا تب بھی اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور اداسی کی رم جھم ہو رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "ارے یار ستار تم!.... یہاں کیسے؟" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے انتہائی گرم جوشی سے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کو ڈبڈبایا ہوا سا دیکھا۔ اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا "کچھ کھاؤ گے؟"۔

"نہیں یار، صرف چائے پیوں گا"۔

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہ ہوا تھا اور اس وقت ٹولنٹن مارکیٹ کے ریستوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ ایک بار میں بھی اس سے لپٹ کر رو دوں۔

اس نے میرے لئے چائے منگوائی۔ چائے کے ایک دو گھونٹ پی کر اس نے پوچھا "وہیں چونیاں میں ہو؟"

"ہاں یار" میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن میں اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"تین..... ایک لڑکا دو لڑکیاں"۔

"خوش تو ہو؟" اس کی آواز میں دھیما پن تھا اور ایک سوز سا بھی۔

"ہاں" میں نے جھوٹ بول دیا۔ (ہائے کیسا پیارا دوست بچھڑ گیا مجھ سے)

"کراچی کیسے آئے۔ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ کتنے دنوں کا پروگرام ہے؟

بس سیر و تفریح، آب و ہوا کی تبدیلی۔ پرسوں حیدر آباد جا رہا ہوں۔ وہاں سے چند دن بعد لاہور جاؤں گا۔ اپنے ایک دوست کے گھر ڈرگ روڈ کے علاقے میں مقیم ہوں"۔

"اچھا کہاں کہاں کی سیر کر ڈالی۔ کلفٹن گئے تھے؟"

"ہاں.... زندگی میں پہلی بار سمندر بھی دیکھ لیا"
وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے نہ جانے کیا سوچنے لگے۔
میں نے کہا "تم سناؤ کیا حال چال ہیں؟"
"ٹھیک ہیں"
"یہاں کیوں شفٹ ہوگئے۔ کیا کر رہے ہو۔ کیسی گزر رہی ہے؟"
وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "بس یار بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ ہزار احتیاط کے باوجود انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ بوریاں، کچھ بزدلی، کچھ غلطیاں مجھے کراچی لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہاں ایک اچھے ادارے میں ایک معقول ملازمت مل گئی۔ اب کچھ چھٹیاں جمع ہیں تو سوچ رہا ہوں چند دنوں کے لئے لاہور چلا جاؤں۔ بے حد یاد آتا ہے"
"اس کا مطلب ہوا کہ تم ابھی تک خود کو یہاں ADJUST نہیں کر سکے"
راصل اُسے اس موضوع کی طرف لا رہا تھا جس کے بارے میں جاننے کی مجھے ئی ہوئی تھی۔
"یہ کیسے جانا تم نے.... لاہور کی یادیں تو ایک فطری جذبہ ہے" اس نے ی سے کام لیتے ہوئے بات کو آگے نہ بڑھنے دیا۔
اتنے دنوں کے بعد ہم ملے مگر اتنی جلدی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نہ جانے کیا تھا ہم دونوں کو۔ یوں ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے مرہ ہوں ایک دوسرے سے۔ کچھ دیر بعد میں نے امرتسر ٹی وی اسٹیشن سے ن جانے والی فلموں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آج کل وہ افسانوں مطالعے کی بہ نسبت اشعار کے مطالعے کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اور ٹیپ ڈ پر اپنے پسندیدہ نغمے سننے کا محبوب مشغلہ اب کچھ زیادہ ہی محبوب ہو گیا ہے۔ ں نے مجھے اپنا موجودہ پتہ لکھ کر دیا۔ شاید اب وہ اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے ابھی دل کا ایک بوجھ بھی تو ہلکا کرنا تھا۔
"اور سناؤ ....." الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے۔
"کیا سناؤں یار... کیا پوچھنا چاہ رہے ہو تم"
"میں"
"ہاں"
"میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ جو ایک دیرینہ خواہش تھی تمہاری، اس کا کیا بنا؟"
"کونسی خواہش؟"
"بھئی وہی.... خواہش مرگ"
اس نے ایک دم میری آنکھوں میں جھانکا، پھر نگاہیں نیچی کرلیں۔ وہ نہ جانے کہاں ڈوب گیا تھا۔ پھر جب وہ ابھرا تو بولا "بڑی عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے یار۔ مجھے تو کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اس بات کا"
"خیریت تو ہے؟"
"خیریت ہی تو نہیں ہے یار" اس نے ایک آہ بھری "کچھ دن ہوئے میری اس خواہش نے بھی دم توڑ دیا۔ اب تو مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا" ایک زخمی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تڑپنے لگی۔
میں نے سوال کیا "آخر کیوں؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"
وہ بولا "ستار! میرے کراچی آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں اپنی بیوی بچے کے مستقبل اور ان کے تحفظ کی فکر سے آزاد ہو سکوں۔ تم جانتے ہو یہاں میری سسرال ہے۔ تم سمجھ گئے میرا مطلب"۔
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا حالانکہ میں اس کی بات ذرا دیر ہی سے سمجھ سکا تھا۔
وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا "لیکن یہاں ایک عرصہ گزارنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ تو بڑی بے وفائی کا دور ہے۔ بڑی ہی نفسا نفسی کا زمانہ ہے۔ لوگ تو جیتے جی کسی کی پرواہ نہیں کرتے، مر جانے کے بعد کا تو کہنا ہی کیا ہے.... مرنے والوں کو تو بہت جلد بھلا دیا جاتا ہے، یادوں کی لوح پر سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے.... اب کوئی مرے بھی تو کس آس پر۔ سو جینے کا ایک بڑا سہارا ابھی چھن گیا مجھ سے"۔
میں ایک سناٹے کے طلسم میں بندھا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اس سے کیا بات کروں۔
کچھ دیر بعد وہ ہڑبڑا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص پراثر اضطراب نمایاں تھا۔ کہنے لگا "آؤ یار چلتے ہیں"۔
اس نے بل ادا کیا اور ہم دونوں ریستوران سے باہر آگئے۔
بس اسٹاپ تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بس کی طرف بڑھا تو وہ مصافحہ کرکے بولا "اچھا یار لاہور کو میرا اسلام کہنا"۔
"اچھی بات ہے"
اور میں "خواہش مرگ" اور "جینے" کے تعلق کو کھوجتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔
اور آج جب کہ اس شگفتہ اور نکھری نکھری شام کو میں انار کلی کی گہما گہمی میں اکیلا گھوم رہا ہوں۔ مجھے چند دن قبل کی مجی کے ساتھ گزاری ہوئی کراچی کی شام یاد آگئی ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے اس کا سراپا بار بار ابھر رہا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ مدت تک خواہش مرگ کے سہارے جیتے رہنے والے اس پُراسرار شخص کا نیا اقدام پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔ □□



ثمینہ راجہ

آسیب صفت یہ مری تنہائی عجب ہے
ہر سمت تری یاد کی شہنائی عجب ہے

یوں ہے کہ ترے ساتھ ملاقات کے باوصف
اس بار مرے دل کی شکیبائی عجب ہے

اب سلسلۂ رنج و محن ٹوٹ ہی جائے
اُن آنکھوں کا اندازِ پذیرائی عجب ہے

اب مجھ پہ ہے شہزادۂ جنّات کا قبضہ
یوں میرے در و بام کی تنہائی عجب ہے

سورج سے اترتے ہیں مرے ہر بن مو پر
آنکھیں بھی رکھوں بند تو بینائی عجب ہے

نس نس میں پھسلتا ہے ترے قُرب کا نشہ
ہر موجۂ خونناب کی گہرائی عجب ہے

پگھلا ہوا سونا تھے ابھی گھر کے در و بام
یہ دھوپ گھڑی بھر میں ہی کجلائی عجب ہے

ہر دن ستم ایجاد ہے ہر شام سیہ فام
یارب یہ تیری انجمن آرائی عجب ہے

●House No. 84, Street No. 20, G-1/10, Islamabad(Pak)

ثروت زہرا

دامن تک آگیا ہے سفر کوئے یار کا
کتنا طویل دن ہے مرے انتظار کا

توڑے کوئی تو ساعتِ پیہم کی دھڑکنیں
یہ درد اب نہیں ہے مرے اختیار کا

میرے سوال چاٹ گئے میرے ذائقے!
اب ایک سا مزا ہے، خزاں کا، بہار کا

اتنا جلی کہ سارے زمانے جھلس گئے
آؤ کبھی بجھاؤ دیا اعتبار کا

اس زندگی کے خوف سے خود موت مر گئی
کیا خاک مر سکیں گے، گیا خوف دار کا

●P.O Box No. 17608, Gulshan Post Office, Karachi (Pak)

فوقیہ مشتاق

دو آنکھیں اور ایک خ

پاس مرے ایک خواب ہے
اور دو آنکھیں ہیں
آنکھیں کر دوں گی خیرات
بچے گا خواب
ڈرتی ہوں یہ خواب کہیں
میراث کی صورت نہ بن جائے
آنے والی نسل کی آنکھوں میں
اور پھر
ایک ادھوری لڑکی
آنکھوں کو کر دے خیرات
اور بڑھا دے آگے خواب

Noor Plaza, Block - 'M', Nazimabad, Karachi (Pak)











عاصم صدیقی

خواب اپنا بھنور میں رکھا ہے — جب سے اسکو نظر میں رکھا ہے
خوف اتنا ہے شہر پر طاری — گھر کو محصور گھر میں رکھا ہے
اپنے بچوں کی ہر خوشی کے لئے — خود کو پیہم سفر میں رکھا ہے
ہم نے آنکھوں کو وا کیا ہی نہیں — ورنہ سب کچھ بشر میں رکھا ہے
لذت ہجر کے سوا عاصم — کیا بدن کے کھنڈر میں رکھا ہے

R/5 Sect 14/B ST. 8, Maria Homes, N.Karachi (Pak)

سہیل اختر

غموں میں آس کے پہلو نکل ہی آتے ہیں — کہ تیرگی ہو تو جگنو نکل ہی آتے ہیں
ہزار گھات میں ہو دشت دل کی تنہائی — تمہاری یاد کے آہو نکل ہی آتے ہیں
ہزار جبر ہو اک روز دھشتوں کے اسیر — کفن بدوش سحر کو نکل ہی آتے ہیں
اگرچہ ترک تعلق کو اک زمانہ ہوا — کبھی کبھی مگر آنسو نکل ہی آتے ہیں
کبھی تو آمرے اشکوں کی سمت بھی اے دوست — کبھی تو لوگ لب جو نکل ہی آتے ہیں

59-B, S.Town, Bahawalpur - (Pak)

اکرم تبسم

لہجے کی لذت سے خالی بات میں — ہم نے ساری رات گذاری رات میں
بھرے پرے رستے بھی ویراں لگتے ہیں — جب وہ ہاتھ نہیں ہوتا ہے ہاتھ میں
بادل، بجلی، سرد ہوا تو تجھ سے تھے — پہلے جیسے رنگ کہاں برسات میں
وہ جو سرخ گلابوں جیسا ہے اس نے — سوکھے پھول مجھے بھیجے سوغات میں
یار تبسم اب شکوہ کیوں کرتے ہو — زہر تو گھولا تم نے خود حالات میں

771-II -B. Nelam Block Allama Iqbal Town Lahore-18 (Pak)

علی آزر

تار رباب لہجہ تو چہرہ گلاب تھا — کتنا حسین تھا وہ مگر ایک خواب تھا
دشوار زندگی ہے بہت تیرے ساتھ بھی — تیرے بغیر جینا بھی گویا عذاب تھا!
شاید یہ میری آنکھیں ہی بے نور ہو گئیں — ورنہ تمہارا چہرہ ہمیشہ کتاب تھا!
جانے وہ بات کیا تھی کہ حاصل نہ کر سکا — سب کچھ تھا مجھ میں، میرا مقدر خراب تھا
یخ بستہ راستوں میں تھا چمکیلا آفتاب — موسم کے رخ بدلتے ہی وہ اک سحاب تھا

51-A, Street Phase-V, Defence Housing Authority, Karachi

حامد علی سیّد

جس نے بھی عزم نو کو سہارا بنالیا — مجھو سمندروں میں کنارا بنا لیا
ٹوٹا تھا ایک بار انا کا محل سرا — میں نے غم حیات دوبارہ بنالیا
لا کر ہرے درختوں کو اپنے خیال میں — کاغذ پہ دلفریب نظارہ بنا لیا
لاتے کہاں سے اپنے لیے تتلیوں سے رنگ — بچوں نے خواہشوں کو غبارہ بنا لیا
وہ بھی تو لوگ تھے جو مقابل ہوا کے تھے — تو نے کیوں خود کو وقت کا مارا بنا لیا

B-44 Nazia Square, Block 20, F.B. Area, Karachi (Pak)

نقوش نقوی

دل و نگاہ کی گہرائیاں نہ دیکھ — اے دوست میرے عہد کی تنہائیاں نہ دیکھ
یہ دیکھ تیرے عشق میں کیا حال ہے میرا — کیسی ہوئی ہیں شہر میں رسوائیاں نہ دیکھ
گلزار کہہ رہا ہے خزاں کی زبان سے — فصل بہار میں مری رعنائیاں نہ دیکھ
یہ رونق تمام تو دوچار پل کی ہے — اہل جہاں کی انجمن آرائیاں نہ دیکھ
ہر ہاتھ میں نقوش ہے، سنگ وسناں بلند — اس شہر میں ہماری پذیرائیاں نہ دیکھ

P.B.No. 17830, Gulshan-e-Iqbal H.P. Office, Karachi-75300

رضیہ شمع

گلے شکوے ہزاروں ہیں مگر وہ سب بھلا دے گا — اچانک سامنے آکر مجھے بت سا بنا دے گا
اسے دیکھوں گی میں اور سوچتی رہ جاؤں گی اس کو — مجھے دیکھے گا وہ اور سوچ پر پہرے بٹھا دے گا
میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں گی پھر اس کی رفاقت میں — وہ جب تک سامنے بیٹھا رہے گا کچھ پلا دے گا
جلا کر راکھ کردے گی کسی خواہش کی چنگاری — ہوا دے گا وہ پھر ایسی مجھے شعلہ بنا دے گا
اسے معلوم ہے کیا سوچتی ہوں دیکھ کر اس کو — وہ سب کچھ جان جائے گا تو بس پھر مسکرا دے گا

21-G, Model Town Extension, Lahore (Pak)

محمد ضیغم مغیرہ

تری نگاہ فقط لشکر و سپاہ پہ ہے — مرا یقین تو بس ایک بارگاہ پہ ہے
وہ جانتا نہیں قوت یقین و ایماں کی — مرے غنیم کا سب ناز مال وجاہ پہ ہے
مری نگاہ میں بدر و حنین روشن ہیں — اساس میرے تفکر کی لاالہ پہ ہے
ملے گی منزل مقصود کس طرح ان کو — وہ جن کے سوچ کی بنیاد زادِ راہ پہ ہے
خیال و فکر و نظر کی نمو کی خواہش میں — نہ مدرسے پہ بھروسہ نہ خانقاہ پہ ہے

Mansoora. Multan Road, Lahore (Pak)

تسنیم فاطمہ

نقشِ مقتل خطِ عصیاں کا مٹایا بھی نہیں — رکھ دیا سر ترے در پر تو اٹھایا بھی نہیں
میں نے اس شخص سے آنسو کی وضاحت چاہی — جس کو موتی کے پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں
مصحفِ علم پہ یہ خوں سے لکھی ہے تحریر — شعر ہر شخص کے قرطاس پہ سجتا بھی نہیں
آپ کیوں خواہش ناکام لیے بیٹھے ہیں — چاند بچوں کے کٹوروں میں اترتا بھی نہیں
عشق۔ وعدہ شبِ ہجراں غم قربت کہ وصال — یہ تو دھاگوں کا قبیلہ ہے سلجھتا بھی نہیں

106- 4th Floor Dilkusha Chambers, Near Rimpa Plaza Maristan Road, Karachi (Pak)

غضنفر عباس سید

آخری در بھی مقفل ہوگیا — باب ہجرت اب مکمل ہوگیا
سوچتا ہوں کیسے میری ذات کا — رابطہ مجھ سے معطل ہوگیا
کس قدر مانوس تھا وہ رات سے — دیکھ کر سورج کو پاگل ہوگیا
دل زمیں پر جب کبھی اترا کوئی — آسماں تاروں سے جل تھل ہوگیا
مل گیا عباس اذنِ آرزو — دل کا پہلا مسئلہ حل ہوگیا

46- P, Fareed Town Sahiwal (Pak)

وضاحت نسیم

کچھ بھی تو نہیں خواہش دنیا مرے آگے
مت کیجئے اظہار تمنا مرے آگے

جو کچھ مرے بارے میں کہا اس نے برا ہے
اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ کہتا مرے آگے

اک عرصۂ تنہائی گزارا ہے مسلسل
تنہائی بھلا چیز ہے اب کیا مرے آگے

کیا تم کو نہیں یاد جو میں یاد دلاؤں
وہ طرز تغافل جو کبھی تھا مرے آگے

ہر چند کہ ہے ایک سا ہنگامۂ ہستی
ہر روز بدل جاتی ہے دنیا مرے آگے

A-891, Block- H, North Nazimabad, Krarchi- 74700 (Pak)

محمد ادریس بابر

ہر خوشی کے ثانوی ہونے کا غم
سب غموں کے عارضی ہونے کا غم

پھر وہی دشتِ تمنا پیش پا
پھر وہی ہم ہیں، وہی ہونے کا غم

روزِ اوّل سے رہا ہے ساتھ ساتھ
آدمی کے ،آدمی ہونے کا غم

پیش گوئی کرنے والے کو بھی ہے
حادثے کے واقعی ہونے کا غم

شام ہونے پر نہ ہونے کا گماں
اور اس کے ساتھ ہی ہونے کا غم

56-A, Mumtaz Hall, Engineering University, Lahore (Pak)

سورج نرائن

ہر جانب ہے عدل ،کچہری لگتی ہے
ساری بستی، گونگی بہری لگتی ہے

تن پر تجھ کو اوڑھ کے چلتا رہتا ہوں
اسی لئے تو دھوپ سنہری لگتی ہے

اس کا مسکن سڑکوں اور درختوں بیچ
میری خواہش ایک گلہری لگتی ہے

رب نے میری زیست کو کیسے نظم کیا
ہر موسم میں یہ بے بحری لگتی ہے

اس پر کل پانی کا قحط بھی اترے گا
آج زمیں جو ہم کو نہری لگتی ہے

Mohalla Sangedh, Kohat (Pak)

محسن شکیل

کس تائید کی حیرانی ہے کس تردید میں ہم
رہتے ہیں باہم ہونے کی کس تجرید میں ہم

نئے سفر کی گرد اڑاتی قدموں کی وحشت
اور منزل کے امکانوں کی تمہید میں ہم

ایک دھندلکا حدِ نظر تک سب آنکھوں میں ہے
وہ جلوۂ ادراک سے آگے جس کی دید میں ہم

آنچل کی اک اوٹ میں چہرے کی خوشبو رکھنا
ہوا کی صورت چھونے آئیں گے تقلید میں ہم

بہت پرانی ایک اداسی کی پرچھائیں میں
تیری یاد کے اک لمحے کی ہیں تجدید میں ہم

382, AC Samangli- Housing Scheme, Queta (Pak)

رعنا ناہید رعنا

خوشبو ہو کہ تاروں کی ضیاء ختم نہ ہوگی
دنیا سے کبھی رسم وفا ختم نہ ہوگی

انسان کے احساس کو آتی ہی نہیں موت
دب جائے گی لیکن یہ انا ختم نہ ہوگی

ہم لوگ ضرورت ہی ضرورت ہیں بہر حال
مانگیں گے دعا بھی تو دعا ختم نہ ہوگی

اس دورِ پر آشوب میں لینے دو ہمیں سانس
ہم سانس جو لیں گے تو ہوا ختم نہ ہوگی

یہ سانس بھی چلتی ہوئی تلوار ہے رعنا
کہتے ہیں جسے زیست وہ کیا ختم نہ ہوگی

House No. 1027, G-10/4, Islamabad (Pak)

پاکستان میں اردو کے ادبی رسائل

افتخار امام صدیقی

ذیل میں پاکستان کے اردو ادبی رسائل کی ایک فہرست دی جارہی ہے۔ اسے پاکستان کے معروف شاعر وادیب سجاد مرزا نے بطور خاص شاعر کے " ہم عصر اردو ادب نمبر" کی جلدوں کے لئے مرتب کیا تھا۔ بعض تکنیکی وجوہ اور غیر معمولی ضخامت کے سبب یہ فہرست مذکورہ جلد میں شامل نہ ہو سکی تھی۔ اب اس خصوصی شمارے کی رعایت سے اسے شائع کیا جارہا ہے۔ شاعر میں پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں کے نام اور پتے شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ قارئین شاعر کا ایک اصرار یہ بھی تھا کہ پاکستان کے تمام ادبی رسائل کے نام اور پتے شائع کیے جائیں۔ ہم خود بھی عالمی شاعر ڈائرکٹری کے لئے کام کر رہے ہیں لہذا ضرورت پیش آئی کہ پہلے ایک ابتدائی فہرست پاکستانی رسائل کی دی جائے اس کے بعد پاکستان کے مدیرانِ رسائل کے تعاون سے ایک مکمل فہرست ڈائرکٹری میں دی جائے۔ ادبی رسائل کی تاریخ پر کام تو ہوا ہے۔ اس کا مختصر احوال اسی شمارے میں ادبی رسائل کے ذیل میں کیا گیا ہے تاہم معاصر ادبی رسائل پر کوئی بہت ٹھوس اور معیاری کتاب حالیہ برسوں میں شائع نہیں ہوئی جب کہ ہندوپاک کے ادبی رسائل اپنے پیچیدہ مسائل کے گرفتار ہیں اور زبان وادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔

ادبی رسائل کی اس فہرست کے ضمن میں کچھ وضاحتیں بھی ضروری ہیں۔ یہ فہرست چونکہ چند سال پہلے شاعر کے لئے ترتیب دی گئی تھی لہذا اس دوران بعض رسائل کے پتے تبدیل ہوگئے۔ کچھ رسائل بند ہوگئے۔ حالیہ برسوں میں بعض نئے ادبی رسائل کا اجراء بھی ہوا ہے۔ نئے ادبی رسائل کا اندراج، پتوں میں تبدیلی، اور رسائل کے دستیاب فون نمبر اور اردو حروف تہجی کے بجائے انگریزی حروف تہجی کی ترتیب، یہ سب کچھ ادارہ شاعر کی طرف سے ہے۔ تاہم ادبی رسائل کے نام اور پتوں کی فراہمی کے لئے ہم سجاد مرزا صاحب کے شکر گزار ہیں۔

پاکستانی ادبی رسائل کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ "عالمی شاعر ڈائرکٹری" کے لئے ہم اسے مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ ادبی رسائل جن کے نام اس فہرست میں نہیں آسکے ہیں، ان کے مدیران سے التماس ہے کہ یا تو وہ اپنا موقر جریدہ شاعر کے تبادلے میں جاری فرمائیں یا پھر اپنے رسالے کے نام، پتے اور فون نمبر سے مطلع فرمائیں۔ وہ ادبی رسائل جن کے نام، پتے اور فون نمبر اس فہرست میں شامل ہیں ان کے مدیران سے گزارش ہے کہ وہ اپنے اندراجات پر نظر ثانی کی زحمت کریں اور کہیں کوئی تسامح ہوا ہو تو اس کی تصحیح سے آگاہ کریں۔ ادبی رسائل کے نام اور پتے انگریزی میں دیئے جارہے ہیں۔ اس ناگزیریت کی وجوہ پر ہم عصر اردو ادب نمبر میں 'شاعر ڈائرکٹری' کے تحت خاصی بحث کی گئی ہے۔ شاعر ایک عالمی ادبی رسالہ ہے اور انگریزی میں پتے دینا عالمی ضرورت اور فی الحال ہماری مجبوری ہے۔ پاکستان میں تو اردو میں پتے لکھنے کا چلن ہے لیکن پاکستان سے باہر ہندوستان اور اردو کی نئی بستیوں یا پھر دیگر ممالک کے لئے پتے وہی انگریزی میں تحریر کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بے شمار قلم کار و قارئین ادب پاکستانی رسائل کو پڑھنے اور حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات پاکستانی رسائل کو ارسال کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سارے لوگ ہم سے ادبی رسائل کے پتے طلب کرتے ہیں اور ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ ہندوپاک کے ادبی رسائل کی زیادہ سے زیادہ ترسیل واشاعت ہو۔ اردو کا کوئی بھی ادبی رسالہ ہو دنیا کے کسی بھی علاقے سے شائع ہوتا ہو، اسے ہم اپنے ہی خاندان کا ایک فرد تصور کرتے ہیں۔ رسالہ شاعر پاکستان میں خاصی بڑی تعداد میں ارسال کیا جاتا ہے۔ وہاں کے قلم کار شاعر سے اس طرح محبت کرتے ہیں گویا شاعر ہندوستان سے نہیں پاکستان سے ہی شائع ہو رہا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ ایسی ہی ایک فہرست ہندوستان کے ادبی رسائل کی پاکستان کے لئے بھی شائع کی جائے۔ اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل کی ایک فہرست پہلے ہی شاعر میں شائع کی جاچکی ہے۔ بہر حال! اس فہرست میں ابھی گنجائشیں ہیں اور اردو کے معاصر عالمی ادبی رسائل ہمارا موضوع ہے۔ مدیرانِ رسائل سے تعاون کی درخواست ہے تاکہ عالمی شاعر ڈائرکٹری مکمل ہو۔ اردو کے عالمی ادبی رسائل کی کوئی انجمن بنائی جاسکے۔ اردو کے معاصر ادبی رسائل پر شاعر کا کوئی خاص نمبر ترتیب دیا جاسکے۔ واضح رہے کہ ادبی رسائل کی طویل عمری پر انہیں مبارکباد دینے کا سلسلہ بھی شاعر ہی نے شروع کیا تھا۔

ادبی رسائل کے تعلق سے ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہندوپاک کے قلم کار و قارئین اپنے ادبی رسائل میں لکھنا اور انہیں پڑھنا چاہتے ہیں لیکن سرحدوں کے ادھر ادھر سیاسی باتوں اور اعلیٰ سطح پر سیاسی معاہدوں میں عوام اور شعر وادب کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کھیل کود، تجارتی وفد اور تجارتی سہولتیں، سیاسی اشخاص اور ان کے شور شرابے، اخبارات کی شاہ سرخیوں میں بہت نمایاں لیکن کتب ورسائل کے لئے ہندوپاک میں کچھ نہیں ہوا۔ ڈاک کی شرح ہندوستان سے باہر کے لئے زیادہ ہے لیکن پاکستان میں تو اتنی زیادہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہاں ادبی رسائل کے مدیران کس طرح یہ بھاری بوجھ برداشت کر رہے ہیں۔ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب "سارک" ممالک کے درمیان قربتوں اور محبتوں اور لین دین کا ذکر ہوتا ہے لیکن زر مبادلہ کے لئے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہوتی جب کہ پڑوسی ممالک کے ساتھ تو ہر سطح پر رعایت ہونی چاہیے۔ آپ دنیا کے کسی بھی حصے سے وہاں کی کرنسی یا ڈالر اور پونڈ کے چیک، ڈرافٹ وغیرہ ارسال کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان سے پاکستان یا پاکستان سے ہندوستان کے لئے ایسی کوئی سہولت نہیں۔ دونوں طرف کے ادب ذوق حضرات کتب ورسائل کس طرح حاصل کریں۔ دونوں ممالک میں کتب ورسائل کے لین دین کا بڑا کاروبار ہو سکتا ہے۔ اس سے جعلی کتابوں کی نکاسی رکے گی۔ بغیر اجازت کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگا۔ غیر معیاری ڈائجسٹ اور کاروباری رسائل کی اشاعت پر اثر پڑے گا۔ دونوں ممالک میں شعر وادب کے حوالے سے جو نفسیاتی اور جذباتی مبالغہ آرائیاں اور غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہوں گی۔ ادبی رسائل کی ماہانہ اشاعتوں میں تسلسل کے ساتھ تعداد اشاعت میں بھی اضافہ ہوگا۔ تجارت کو فروغ حاصل ہوگا۔ مقابلہ آرائی کے تناؤ سے ادبی رسائل میں تنوع پیدا ہوگا اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان اتحاد و یگانگت، امن و سلامتی کا ایک نیا تصور ابھرے گا۔ ادبی رسائل کی یہ فہرست ہمارے ایسے ہی خوابوں کا ایک تعمیری قدم ہے۔ □□

A

آگہی
AAGAHI (MONTHLY)
EDITOR:SYED MHD. MEHFOOZ ALI,
A- 334, BLOCK-12,
GULBARG, ' F " B ' AREA,
KARACHI (PAK)

آئندہ
AAINDAH (MONTHLY)
EDITOR: MEHMOOD WAJID,
D-106, ASMA GARDEN,
BLOCK-1, METROWEL III,
KARACHI-75330 (PAK)
PH. 6349393- FAX 2638275

آج
AAJ (QUARTERLY)
EDITOR: AJMAL KAMAL
B-140, SECTOR -II-B,
NORTH KARACHI-75850
KARACHI-(PAK)
E.MAIL: aaj @ DIGICOM, NET. PAK
WWW. PAKDATA. COM / aaj

ادب دوست
ADAB DOST (MONTHLY)
EDITOR: A.G. JOSH,
39-COMMERCIAL ZONE,
LIBERTY MARKET,GULBARG-III,
LAHORE (PAK)
PH. 5763143

ادب پاک
ADAB PAK (MONTHLY)
EDITOR: AKHTAR FIROZE
BLOCK-C,FLAT-13,SECTOR- SIK,
NORTH KARACHI,
KARACHI- (PAK)
PH, 6988313

ادب لطیف
ADAB-E- LATIF (MONTHLY)
EDITOR: SIDDIQA BEGUM,
33-C-3, GULBARG- III,
LAHORE-54660 (PAK)
PH. 5761917

ادبی دنیا
ADABI DUNIA (MONTHLY)
EDITOR ARIF SHAFIQUE
SP-1, MEZZANINE FLOOR
BLOCK-1,AL- KARMA SQUARE,
F. C. AREA,
KARACHI (PAK)
PH, 6363243

ادبیات
ADABIAT (QUARTERLY)
EDITOR: KHALID IQBAL YASIR,
ACADEMY OF LETTERS,
SECTOR- H- 8/1,
ISLAM ABAD (PAK)
PH. 254169- 251147

افکار
AFKAR (MONTHLY)
EDITOR: SEHBA LUCKNAWI
105-C, NATIONAL AUTO PLAZA,
MARSTON ROAD,
KARACHI- 74400 (PAK)
PH. 7765561

اخبار اردو
AKHBAR-E-URDU (MONTHLY)
EDITOR: IFTIKHAR ARIF
MUQTADRA QAUMI ZABAN ,
H-8/4, PITRAS BUKHARI RD,
ISLAMABAD, (PAK)
PH. 449465

علامت
ALAMAT (MONTHLY)
EDITOR: SAEED SHEKH
520- JAHANZEB BLOCK,
IQBAL TOWN,
LAHORE (PAK)

العلم
AL-ILM (QUARTERLY)
EDITOR: SYAD MUSTAFA ALI-
-BAREILVI,
I-J-45/ 10, NAZIM ABAD,
KARACHI- 74600 (PAK)

اقدار
AQDAR (QUARTERLY)
EDITOR: SHABNAM ROOMANI,
207, GHADYALI BLDG.,
SADAR,
KARACHI (PAK)

اوراق
AURAQ (QUARTERLY)
EDITOR: WAZIR AGHA,
3/ 115- SARWAR ROAD,
LAHORE CANTT- (PAK)

B

بادبان
BADBAAN (QUARTERLY)
EDITOR: NASIR BAGHDADI,
E-2, 8/ 14, MAYMAR SQUARE,
BLOCK-14, GULSNAN-E-IQBAL,
KARACHI- 75300 (PAK)
PH. 4947230

بجنگ آمد
BAJANG AAMAD (FORTH-
-NIGHTLY)
EDITOR: AKHTAR SHUMAR ,
9-KHANNA STREET,
SHAM NAGAR,
CHAUBURJI
LAHORE (PAK)

بازگشت
BAZGHASHT (MONTHLY)
EDITOR: JAMSHED MASROOR,
6-A, STREET- 32,
NEW ISLAMIA PARK,
LAHORE (PAK)

بشرہ
BUSHRA (QUARTERLY)
EDITOR: MHD. YUSUF,
B-A-22, AKRAM PARK
SHAD PARK,
LAHORE- 54900 (PAK)

C

چہار سو
CHAHARSOO (MONTHLY)
EDITOR: GULZAR JAVED,
537/ D-1, WESTRIDGE - III,
ALLAHABAD,
RAWALPINDI (PAK)
PH. 862495

D

دانشور
DANISHWAR (QUARTERLY)
EDITOR: IFFAT ANIS,
22-GANGA RAM MANSION
MAAL ROAD,
LAHORE (PAK)

دائرے
DAIRE (MONTHLY)
EDITOR: HASNAIN KAZMI,
SHAHEEN CHEMBERS,
4-COMMERSIAL AREA,
BLOCK-7,8, K.C.H.S.,
KARACHI- (PAK)

دریافت
DARYAFT
EDITOR: WAZIRI PANIPATI,
F-44, JAHANGIR ROAD, (E),
KARACHI- (PAK)

دلچسپ
DILCHASP (MONTHLY)
EDITOR: MHD.IQBAL NAJMI,
108-B SATELITE TOWN,
GUJRAN WALA (PAK)
PH. 251603

دنیائے ادب
DUNYA-E-ADAB (MONTHLY)
EDITOR: AUJ KAMAL,
C-B- 45, AL- FALAH SOCIETY,
AHAH FAISAL COLONY,
KARACHI- 75230 (PAK)
PH. 4571322- FAX 4589654

F

فراست
FARASAT (QUARTERLY)
EDITOR: SOHAIL AKHTAR,
59-B, SATELITE TOWN,
BAHAWALPUR (PAK)

فنون
FUNOON (QUARTERLY)
EDITOR: AHMAD NADIM QASMI,
45-A, MOZANG ROAD,
LAHORE (PAK)
PH. 6315763

G

غنیمت
GHANIMAT (MONTHLY)
EDITOR: ZAMAN KUNJAHI,
SA' ADAT BLDG.
14-A, ABIT RD,
LAHORE (PAK)

H

ہائیکو انٹرنیشنل
HAIKU INTERNATIONAL-
-(QUARTERLY)
EDITOR: SYAD MERAJ JAMI,
D-12, MUNIBA ARCADE,
BLOCK-7, GULSHAN-E-IQBAL,
KARACHI- 75290 (PAK)

ہم عصر
HAM ASAR (QUARTERLY)
EDITOR: FAIZ MHD.-
-CHOWDHRY,
65-C, SHAH RUKN-E-ALAM-
HOUSING SCHEEM,
MULTAN- 60650 (PAK)
PH. 553365

I

ابلاغ
IBLAGH (QUARTERLY)
EDITOR: SYADA HINA,
69- B, A.S.C.COLONY,
NOSHERA (PAK)
PH. 0923 / 3944

ادراک
IDRAK (BOOK SERIES)
EDITOR: SOHAIL ANJUM,
29- KHAIBAR MEDICAL
CENTRE,
DUBGARI GARDEN,
PESHAWAR (PAK)

افہام
IFHAM (MONTHLY)
EDITOR: JAMIL MIRZA,
DAR-UL- QALAM, URDU
BAZAR,
SIALKOT (PAK)

انشاء
INSHA (BOOK SERIES)
EDITOR: SHAH ANJUM
556- AMAN SHAH COLONY,
UNIT II, LATIF ABAD,
HYDERABAD (PAK)

ارتباط
IRTEBAT (MONTHLY)
EDITOR: AKHTAR MIRZA,
842 / 13, AL-AMIR,
PAKKA BAZAR,
MAILSI (PAK)

ارتکاز
IRTEKAZ (QUARTERLY)
EDITOR: RAGHIB SHAKEB,
F-83/ 2, MARTIN QUARTERS,
JAHAN GIR ROAD,
KARACHI-74800 (PAK)

ارتقاء
IRTEQA (QUARTERLY)
EDITOR: HASAN ABID,
A /10- WILAYAT ABAD -2,
MANGHOOPIR ROAD,
KARACHI- (PAK)

J

جمالستان
JAMALISTAN (MONTHLY)
EDITOR HAKIM -
-WALIURREHMAN NASIR,
3-C, AWAMI FLATS,
REWAZ GARDEN,
LAHORE (PAK)

جریدہ
JAREEDA (QUARTERLY)
EDITOR: TAJ SAEED,
P.O. BOX.323,
PESHAWAR- 25000 (PAK)
PH. 252164, 271338

K

خیال
KHAYAL (QUARTERLY)
EDITOR: ANJUM SALEEMI-
-NAZAR JAVED,
RAHEEM CENTRE,
PRESS MARKET,
AMINPUR BAZAR,
FAISALABAD (PAK)

M

ماہ نو
MAH-E- NAU (MONTHLY)
EDITOR: QAIM NAQVI,
32-A, HABIBULLA ROAD,
LAHORE-54000 (PAK)

معاصر
MA' ASIR (QUARTERLY)
EDITOR: ATAUL HAQ QASMI,
TAJ CENTRE,
39-COMMERCIALZONE,
BARNI MARKET GULBARG- III,
LAHORE (PAK)

عوامی منشور
MANSHOOR (MONTHLY)
EDITOR: TUFAIL ABBAS,
261-C / II, CENTRAL -
COMMERCIAL AREA,
TARIQ ROAD, P.E.C.H.S.,
KARACHI-75400 (PAK)
PH.449714-FAX. 444032
E. MAIL: PURPLE @ CYBER-
-NET. PAK

منظر نامہ
MANZAR NAMA (MONTHLY)
EDITOR: RUBINA RAUNAQE HAYAT,
TASHKEEL PUBLISHERS,
2-J, 8/6, NAZIMABAD,
KARACHI (PAK)

محفل
MEHFIL (MONTHLY)
EDITOR: MHD. KHAN KALEEM,
SHAIKH BLDG., ROYAL PARK,
LAHORE (PAK)

مفیض
MUFEEZ (QUARTERLY)
EDITOR: MHD. IQBAL NAJMI,
108-B: SATELITE TOWN,
GUJRAN WALA (PAK)

مکالمہ
MUKALMA (QUARTERLY)
EDITOR: MUBIN MIRZA,
R-20, BLOCK-18,
F. B. AREA,
KARACHI-(PAK)
PH. 4938993

N

نعت رنگ
NA' AT RANG (QUARTERLY)
EDITOR: SABIH REHMANI,
E-25, PHASE-5, TNT FLATS,
SHADMAN N0.2,
NORTH KARACHI,
KARACHI-75850 (PAK)

نقوش
NAQOOSH (QUARTERLY)
EDITOR: JAVED TUFAIL,
IDARAH FAROGH-E-URDU,
URDU BAZAR,
LAHORE-54000 (PAK)

نردبان
NARDBAN (MONTHLY)
EDITOR: YUSUF KHALID,
9-OLD CIVIL LINES,
SARGODHA (PAK)

ناوک
NAWAK (MONTHLY)
EDITOR: ABID HUSAIN NAJAM,
MAIN BAZAR, JALALPUR JATAN,
GUJRAT (PAK)

نیا قدم
NAYA QADAM (QUARTERLY)
EDITOR: JASARAT KHAYALI,
PAHAD PUR,
DIST. LEH (PUNJAB) PAK

نیرنگ خیال
NERANG-E-KHAYAL (MONTHLY)
EDITOR: SULTAN RASHK,
8 - PMA. HOUSE, LIAQAT ROAD,
RAWAL PINDI-46000 (PAK)

نگار
NIGAR (MONTHLY)
EDITOR: FARMAN FATEH
PURI,
28/ C, BLOCK- 13- D,
GULSHAN -E- IQBAL,
KARACHI- 75300 (PAK)

ندرت
NUDRAT (QUARTERLY)
EDITOR: TAHIR SALEEM,
LIFE MEDICOS, ANSAR COLONY,
CHONGI- II,
MULTAN (PAK)

P

پندرھویں صدی
PANDRAHWIN SADI
(MONTHLY)
EDITOR: ASRAR AHMAD
SAHADRI,
37-C, SATELITE TOWN,
GUJRAN WALA (PAK)

پذیرائی
PAZIRAI (MONTHLY)
EDITOR: ZULFIQAR HUSAIN-
-ZULFI,
P.O. BOX . 8090,
LAHORE (PAK)

Q

قلم قافلہ
QALAM. QAFLA (MONTHLY)
EDITOR: GULBAKSHALVI,
BAKSHALVI STREET,G.T. ROAD,
KHARIAN (GUJRAT) PAK

قومی زبان
QAUMI ZABAN (MONTHLY)
EDITOR: ADEEB SOHAIL,
D-159, BLOCK-7,
GULSHAN-E-IQBAL,
KARACHI-75300 (PAK)

R

رابطہ
RABITA: (MONTHLY)
EDITOR: MHD. AYAZ GHAZNAVI,
LOTIA BLDG., CLUB ROAD,
KARACHI-75530 (PAK)

رشحات
RASHHAT (QUARTERLY)
EDITOR: IQBAL SAHAR ANBALVI,
48- L.G. BILAL CENTRE,
NICILSON ROAD,
LAHORE-54000 (PAK)

رجحانات
RUJHANAT (QUARTERLY)
EDITOR: TAHIR ASLAM GORA,
PAKISTAN BOOKS & LITERARY
SOUNDS,
LOWER MALL,
LAHORE- 54000 (PAK)

S

سب رس
SAB RAS (MONTHLY)
EDITOR: KHWAJA-
-HAMIDUDDIN SHAHID,
143-D, BLOCK-B,
NORTH NAZIMABAD,
KARACHI- 74700 (PAK)

صدف
SADAF (QUARTERLY)
EDITOR: RASHID ALI ZAI,
ASAD ACADEMY, MERA-
KUTUB KHANA
HAZRA DIST. ATTOCK (PAK)

صاعقہ
SAEQA (MONTHLY)
EDITOR: SYAD SALEEM RIZVI,
4-A, KHAN BAHADPRU PLAZA,
EAST CIRCULAR ROAD,
GUJRAT (PAK)

سفید چھڑی
SAFID CHADI (MONTHLY)
EDITOR : SHEKH MHD. IQBAL
131- REHMAT PARK,
SARGODHA (PAK)

صحیفہ
SAHIFA-(QUARTERLY)
EDITOR: AHMAD NADIM QASMI
NARSINGH DAS GARDEN.
KALAB ROAD,
LAHORE (PAK)
PH.363824

سجاد
SAJJAD (QUARTERLY)
EDITOR: SHAKIL QAMAR.
P.O. BOX. 55,
SAHIWAL (PAK)

صریر
SAREER (MONTHLY)
EDITOR: FAHIM AAZMI,
C-14, BLOCK- 20,
F. B. AREA,
KARACHI-75950 (PAK)

سویرا
SAVERA (QUARTERLY)
EDITOR RIYZ AHMAD,
15- CIRCULAR ROAD,
LAHORE (PAK)

سیارہ
SAYYARA (QUARTERLY)
EDITOR: NAEEM SIDDIQI
D-1, MANSOORA, MULTAN RD,
LAHORE (PAK)

سیپ
SEEP (QUARTERLY)
EDITOR: NASEEM DURRANI,
P.O. BOX 3224,
KARACHI- 75730 (PAK)

شاداب
SHADAB (FORTH NIGHTLY)
EDITOR: KANWAL FIROZ,
P.O. BOX 562, IQBAL TOWN,
LAHORE (PAK)

شام و سحر
SHAM-O-SAHAR (MONTHLY)
EDITOR: SHABIH- UL- HASAN,
14-A, URDU BAZAR,
LAHORE (PAK)

سخنور
SUKHANWAR (MONTHLY)
EDITOR: NAQOOSH NAQVI,
P.O.BOX. NO. 7830,
GULSHAN-E-IQBAL,
KARACHI- 75300 (PAK)
PH. 4901974, FAX 4901,

T

تجدید نو
TAJDEED-E-NAU (MONTHLY)
EDITOR: AZRA ASGHAR,
G.P.O, BOX. 2986,
ISLAMABAD- (PAK)
PH, 242402 / 242526

تخیّل
TAKHEEL (MONTHLY)
EDITOR: TARIQ SULTAN,
CANTT G.P.O. NO. 6141,
LAHORE CANTT (PAK)

تخلیق
TAKHLEEQ (MONTHLY)
EDITOR: AZHAR JAVED,
BHAGWAN STREET ,
OLD' ANARKALI,
LAHORE- 54000 (PAK)
PH. 7230807

ترسیل
TARSEEL (QUARTERLY)
EDITOR: SHAFIQE AHMAD-
-SHAFIQE
DT/ 78/ 18, SAMANABAD,
F.'B' AREA,
KARACHI (PAK)

تشکیل
TASHKEEL (QUARTERLY)
EDITOR: AHMAD HAMESH,
2-J, 8/8, UROOJ CLINIC BLDG,
NAZIMABAD,
KARACHI- 74600 (PAK)
PH, 629190

تسطیر
TASTEER (QUARTERLY)
EDITOR:NASEER AHMAD NASIR
17-D, SECTOR-B-2,
MIRPUR (A.K.) 10250 (PAK)

تحریریں
TEHRIREN (MONTHLY)
EDITOR: HAFIZ SIDDIQI,
CHOWK URDU BAZAR,
LAHORE- 54000 (PAK)

طلوع افکار
TULOO-E-AFKAR (MONTHLY)
28-H, RIZVIA SOCIETY,
NAZIMABAD,
KARACHI-74600 (PAK)

U

اردو ادب
URDU ADAB (MONTHLY)
EDITOR: 1QBAL HUSAIN,
P.O.BOX. 2633,
ISLAMABAD-44000 (PAK)

W

وطن دوست
WATAN DOST (MONTHLY)
EDITOR: BUSHRA REHMAN,
8-C, AHMAD PARK,
NEW GARDEN TOWN,
LAHORE, (PAK)

Y

ید بیضا
YAD-E-BEZA (MONTHLY)
EDITOR: TAB ASLAM,
MURREY COLLEGE ROAD,
SIALKOT (PAK)

ہماری ادبی کتب

(۱)	ادبیاتِ مودودی	—	ادبی تنقیدی تحریروں کا مجموعہ	40/-
(۲)	اوراقِ گم گشتہ	—	علامہ اقبال کے غیر مدوّن افکار	35/-
(۳)	صلِ علیٰ صلِ علی	—	ہندوپاک کے اہم شعرا کی نعتوں کا مجموعہ	22/-
(۴)	عکسِ اسرارِ خودی	—	اسرارِ خودی کا منظوم اردو ترجمہ	14/-
(۵)	عکسِ رموزِ بے خودی	—	رموزِ بے خودی کا منظوم اردو ترجمہ	20/-
(۶)	کلیاتِ اقبالؒ	—	علامہ اقبال کا مکمل مجموعہ کلام	120/-
(۷)	ماہر القادری کے تبصرے	—	مذہب سیاست اور تصوف کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے	60/-
(۸)	میرا مطالعہ	—		52/-
(۹)	نغمۂ احساس	—	کیف آور اور وجد انگیز نظموں کا مجموعہ	9/-
(۱۰)	نور کی ندیاں رواں	—	نعیم صدیقی کی ۵۳ نعتوں کا مجموعہ	30/-
(۱۱)	یادِ رفتگاں	—	معاصر ادبی، مذہبی، سیاسی اور صحافتی شخصیات کے تذکرے	60/- 70/-
(۱۲)	یدِ بیضا	—	ابوالمجاہد زاہدؔ کا شعری مجموعہ	80/-
(۱۳)	یہ قدم قدم بلائیں	—	محمد عامر عثمانیؒ کا شعری مجموعہ	50/-
(۱۴)	اقبال۔ شخصیت اور پیام	—		42/-

فکر امروز

تبدیلیاں

میلان بدلنے والا ہے، رجحان بدلنے والا ہے
بدلی ہوئی دنیائے نو کا انسان بدلنے والا ہے
افسانۂ ملک وملت کے سب سانچے بدلے جائیں گے
موضوع بدلنے والا ہے، عنوان بدلنے والا ہے
اس عالم امکاں میں اب تک جو ہو نہ سکا تھا وہ ہوگا
اب اپنی حدّ ممکن تک امکان بدلنے والا ہے
ہوش اور خرد کی دعوت ہے دل اور دماغ عالم کو
ہذیان میں ہوگی تبدیلی، بحران بدلنے والا ہے
وہ آئیں جو ہیں آزاد نگر، کچھ کام کریں آگے بڑھ کر
ہٹ جائیں پرانے بازی گر، میدان بدلنے والا ہے
کچھ کام نہ دیں گے یہ کہنہ آداب عبور دریا کے
کشتی باں سے کوئی کہہ دے طوفان بدلنے والا ہے
اب ساغر ومینا کے بدلے خوناب رکھے جائیں گے
محفل سے پہلے محفل کا سامان بدلنے والا ہے
شیطان کی امت اب اپنا سالار نیا تجویز کرے
اس پاپ کی ماری دنیا کا شیطان بدلنے والا ہے
یارب امید نو بن کر مغموم دلوں کو ڈھارس دے
مایوس پرستاروں کا ترے ایمان بدلنے والا ہے
سیماب بدلتی دنیا کی تغیر پہ حیرت کیا معنی!
یہ عالم حادث ویسے بھی ہر آن بدلنے والا ہے

[فروری ۱۹۴۷ء ... از شعر انقلاب، مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۷ء]

سیماب اکبرآبادی

متبہ نقش ...

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

شاعر

اشاعت کا
۷۱واں
سال

علمی ادبی
وتہذیبی
ماہنامہ

جلد — ۷۱
شمارہ — ۴

فون: 3829904

اپریل ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ
۱۰۰ روپے

لائبریریوں سے
۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری
۵۰۰۰ روپے

معاونین سے
۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ۔ امریکہ ۲۵ ڈالر ۔ برطانیہ ۱۵ پونڈ ۔ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400

بیشتر نقاد صفت شاعر جب نظم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں تو غزل کے لوازمات کو پیمانہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے یہ بھی شکایت ہے کہ غزل اور بے غزلی کی بحث میں پڑنا ادب اور بے ادبی کی بحث میں پڑنے کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ میں تو صلح کل انسان ہوں اس لئے میں نے اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ستیہ پال آنند مرد میدان ہیں اور چونکہ اپنی بات سیدھے اور چبھتے ہوئے الفاظ میں کہتے ہیں۔ اس لئے اس عتاب کے حقدار بھی ہیں جو ان پر نازل ہو رہا ہے..... ستیہ پال آنند کی نظمیں مجھے پسند ہیں کیونکہ یہ اسی خمیر سے اٹھی ہیں۔ جو میری نظموں کا خاصہ بھی ہے۔...ان نظموں کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو میرا جی نے میری "نارس" کی نظموں کے بارے میں دی تھی، یعنی ان کو دیکھنے کے بعد ایک چلتی پھرتی ہوئی بلکہ بعض اوقات بولتی ہوئی حیات ذہنی کا نقشہ ابھر آتا ہے۔ لیکن زبان و بیان کی سطح پر ان سب نظموں میں ایک قدر مشترک واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ نظمیں روایتی غزل کی لفظیات، استعارات اور زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے یکسر پاک ہیں۔

—— ۱۹۹۶ - اختر الایمان- ("لہو بولتا ھے" کے دیباچے سے اقتباس)

دست برگ ● وقت لاوقت ● آنے والی سحر بند کھڑکی ھے

اور لهو بولتا ھے

کے بعد چار سو سے کچھ زیادہ نظموں کے خالق

ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

مستقبل، آ مجھ سے مل

شاعر کی خود نوشت **"داستان میرے شعری سفر کی"**

کے ساتھ، جو جدید اردو شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی ہے

دیدہ زیب طباعت، گیٹ اپ ● سہ رنگ ڈسٹ کور

قیمت —— ۱۵۰ روپئے

اسرسنل اردو سلبکسنز ۹۲۲ کوچہ روھملا، دریاگنج۔ نئی دھلی۔ ۱۱۰۰۰۲

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

٦٦

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

٦٦

[illegible] [illegible] [illegible]

محفل اپنی

شاعر کا یہ شمارہ

محترم قارئین! شاعر کا نیا شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء پیش ہے۔ اس سے قبل فروری مارچ کا مشترکہ خصوصی شمارہ ماہ مارچ ہی میں آپ کو مل گیا تھا اور اب اپریل کا یہ شمارہ۔ اب آپ کا محبوب رسالہ شاعر ماہ بہ ماہ آپ تک پہنچتا رہے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ نئی صدی اور نئے ہزارے کی ابتداء ہی سے رسالہ شاعر بروقت آپ کو مل جایا کرے اور یہ تسلسل اسی طرح قائم رہے۔ اور مستقبل میں شاعر کے لئے جو منصوبے ہیں وہ آپ سب کے تعاون سے تکمیل پذیر ہوں۔ یہ شمارہ بھی سابقہ شماروں ہی کی طرح شاعر مزاج اور شاعر معیار ہے۔ شاعر کی آئندہ اشاعتیں بھی ہماری تخلیقی تہذیب کا اظہاریہ ہوں گی۔

شاعر کے خریداروں سے

شاعر کے خریداروں کی ایک بڑی تعداد میں سے پانچسو، چھ سو خریدار حضرات ایسے بھی ہیں جو بروقت اپنا زرِ سالانہ ارسال نہیں کرپاتے بہت سوچ سوچ کر، ٹھہر ٹھہر کر، کبھی کسی شرط کے ساتھ تو کبھی کسی عذر کے ساتھ، کبھی کوئی گزارش، تو کبھی کوئی شکایت، کبھی رسالہ گم ہو جانے کی بات تو کبھی کچھ اور اسی میں مدتِ خریداری کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ ہزار دشواریوں اور زبردست گرانی کے باوجود نہ تو ہم نے زرِ سالانہ میں اضافہ کیا اور نہ ہی عام شماروں کی قیمت ہی بڑھائی اور مسلسل یہی کوششیں کررہے ہیں کہ شاعر کے عام و خاص شماروں سے آپ بھرپور استفادہ کرسکیں آپ کو اپنی رقم کا صحیح مصرف پوری طرح محسوس ہو۔ سو روپئے سالانہ کی اب کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔ سو روپئے اب دس روپئے کے برابر ہوگئے۔ دس روپئے، ایک روپئے کی قیمت کے اور ایک روپیہ؟؟.... آپ دیکھئے کہ ہم شاعر کے ہر شمارے کو کس طرح تخلیقی نور سے سجا رہے ہیں۔ کیسے کیسے خاص نمبر اور خصوصی شمارے آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کررہے ہیں۔ ہم جو کچھ کررہے ہیں، وہ آپ ہی کے لئے ہے اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آپ ہی کے لئے ہوگا۔ اے رسالہ شاعر کو اب بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اپنا زرِ رفاقت ارسال کیجئے؟ اپنے بقایاجات ادا کیجئے۔ شاعر کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے۔ مسائل اپنی جگہ، اختلافات اپنی جگہ اور شکائتیں بھی اپنی جگہ۔ ان سب سے ماورا ہو کر آپ کو ہر حال میں شاعر کو زندہ رکھنا ہے۔ وہ رسالہ شاعر جس کا نہ کوئی دفتر ہے، نہ گھر ہماری بے سروسامانی میں اضافہ نہ کیجئے اور ہمیں اپنا بھرپور عملی تعاون دیتے ہوئے اپنا زرِ سالانہ اور اپنے بقایاجات وقت پر ارسال کرکے شکریے کا موقع دیجئے۔

بقیہ صفحہ ۱۴/ ادبی فیچر

ہے اور اپنی متعدد نگارشات میں فرماتے ہیں کہ "ہر باشعور اور ایرہ غیر اتقاد مابعد جدیدیت کی بے وقت کی راگنی الاپنے میں سرگرم ہے۔ مابعد جدیدیت کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ نئی نسل کے سر پر زبردستی کیوں تھوپی جارہی ہے۔ ابراہیم اشک نے مابعد جدیدیت کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے قارئین کے لئے ایک نئی اصطلاح "معنویت" پیش فرمادی ہے اور اپنے متعدد مضامین میں اس کا بھرپور دفاع بھی کیا ہے۔ عرض کرتے ہیں کہ "نئی نسل کے لئے معنویت کی اصطلاح کیوں صحیح ہے اس کی اگر وضاحت نہ کی جائے تو بات ادھوری رہے گی۔ معنویت دراصل ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس میں نئی نسل کی مکمل پہچان چھپی ہوئی ہے۔ نئی نسل نے چونکہ اپنی تخلیق کی بنیاد احساس، معانی آفرینی، وسعت و عظمت پر رکھی ہے اس لئے یہ نسل ایک معنوی دور سے گزر رہی ہے اور اپنا سفر معنویت کی ڈگر پر چل کر پورا کررہی ہے اس لئے اس نسل کو معنویت کی نسل کہا جائے۔ محترم جمال اویسی نے مابعد جدیدیت کو ردِّ تعمیریت سے رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "۔ مابعد جدیدیت ابھی یہاں صورت حال کے بطور ابھر رہی ہے۔ ابھی اس کی قلعہ بندی نہیں کی گئی ہے اور ابھی اس کے دائرہ عمل سے سب کچھ باہر ہے۔ مابعد جدیدیت کو جو ہونا چاہئے وہ نہیں ہے لہٰذا مابعد جدیدیت کا سوال ہنوز حل طلب ہے؟ اصل میں یہ دور ردِّ تعمیریت کا ہے پرانی اور بوسیدہ عمارت کو ڈھادو، کمزور دیواروں کو گرادو، پھر انہیں اینٹوں اور پتھروں کے نئے گارے گلابے اور مسالے کی مدد سے نئی تعمیر کی جائے۔ ردِّ تعمیریت کا منصب اعلیٰ انسانی اقدار کی بازیافت ہے اور ان قدموں کی تلاش ہے کہ جن کے ذریعے انسان اپنے آپ میں عظیم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ردِّ تعمیریت کی طرف کون قدم بڑھائے گا تو میں نے اپنی شاعری کے ذریعے قدم بڑھادیا ہے۔" جناب ابرار مجیب نے "شاعر" میں مابعد جدیدیت کی سخت لفظوں میں مخالفت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جب ہم جدیدیت سے انحراف کررہے ہیں تو اسی تحریک سے اصطلاح مستعار کیسے لے سکتے ہیں اردو کے لسانیاتی مزاج پر غور کریں تو مابعد جدیدیت کی اصطلاح ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا سوبات کی ایک بات انضمامیت ایک ایسی اصطلاح ہے جو نئے ادبی رجحان کی نمائندگی کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ یعنی ابرار مجیب نے بھی مابعد جدیدیت کے تقابل میں ایک دوسری اصطلاح "انضمامیت" کی رٹ لگادی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے انضمامیت "کی بھرپور نمائندگی بھی کی ہے۔

یہ تھے اب تک کے چند شعراء و ادباء نیز ناقدین کے نظریات و تاثرات جو مابعد جدیدیت کے اثبات و نفی میں تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی جدیدیت کے بعد کوئی نیا نظریہ کھل کر سامنے آیا ہے؟ ایک ایسا نظریہ کہ جسے نئی اصطلاح کا نام دیا جائے کیا مندرجہ بالا اصطلاحات نئی نسل کے مزاج پر پوری اترتی ہیں؟؟ یا پھر مابعد جدیدیت کا سکہ ہی سکہ رائج الوقت قرار دیا جائے گا؟؟؟

● 569- BADR MANZIL, BLOCK- B-15, PATEL NAGAR, BHIWANDI DIST. THANE (M.S.)

دیوان ولی

چھاپا ہوا

اہتمام سے

غرسین دی تاسی کی

شہر پاریز کی

پادشاہی چھاپے خانے میں

سنہ ۱۸۳۳ عیسوی

مطابق سنہ ۱۲۴۹ ہجری

LES

OEUVRES DE WALI.

à Monsieur le Rév. Ch. Forster.

Hommage affectueux de l'éditeur & traducteur

Garcin-Tassy.

گارسین دتاسی GARCIN DETASSY [پ: ۲۰ر جنوری ۱۷۹۴ء مارسیلز فرانس۔ م: ۲ر ستمبر ۱۸۷۸ء۔ پیرس (فرانس)] نے دیوان ولی مرتب کرکے ۱۸۳۳ء میں پیرس سے شائع کیا۔ اس پر ۱۴ر صفحات کا مقدمہ لکھا اور ولی دکنی کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی۔ سرورق پر ولی کا یہ شعر درج کیا۔

شہرت ہوا ہے جب سو ولی ترے شعر کا مشتاق تجھ سخن کا، عرب تا عجم ہوا

اس شعر کے نیچے فرانسیسی ترجمہ دیا ہوا ہے۔ ہندوستان سے انہوں نے ولی کے کئی قلمی نسخے منگوائے جو پیرس کے کتب خانوں میں اب تک موجود ہیں۔ دیوان ولی کے جس نسخے کے صفحوں کا عکس دیا جارہا ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس پر دتاسی کے دستخط ہیں مگر تاریخ درج نہیں ہے۔ یہ قیمتی نسخہ پروفیسر انوار احمد خاں (دہلی) کے پاس محفوظ ہے اور انہیں نے یہ عکس عطا کیے ہیں جو ان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جارہے ہیں۔ (الف الف)



مظہر امام

ہوائے نا آشنا سے کہنا

کبھی کبھی میں اُداس لمحوں میں سوچتا ہوں
یہ کیسی راہیں ہیں
جن پہ میرا کہیں کوئی نقشِ پا نہیں ہے
مری بیاضِ سفر کی تحریر مٹ چکی ہے
مرے خیالات منتشر کی طرح
ہوائیں
غبار ملبوں کا اُڑ رہا ہے!
مری نگاہوں کے سامنے ہے
وہ سیلِ خوں
جس میں سارے آدرش بہہ گئے ہیں
یہ کیسی انصاف کُش فضا ہے
کہ سانس لینا بھی اک سزا ہے!

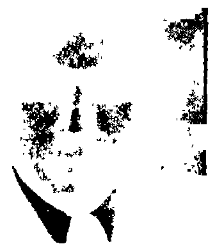
گلی کے نکڑ پہ لاش کب سے پڑی ہوئی ہے
کہ وارثوں میں ابھی وراثت کی جنگ جاری ہے
اور اب تک
کسی عدالت سے فیصلے کی خبر نہیں ہے!

مگر میں کس سے کہوں کہ آؤ
مری نظر سے یہ حادثہ اک نظر تو دیکھو!

ہمارے دریا ہمارے صحرا سے دُور بہتے ہیں
تشنگی ہونٹ پر جمی ہے
پرانے رستوں پہ ٹھوکریں ہیں
نئے خیالوں پہ سخت پہرے لگے ہوئے ہیں
ہمیں اجازت نہیں ہے اب خواب دیکھنے کی!
ہماری اپنی شناخت کیا ہے
کہ ہم تجارت کا مال ہیں
اور ہمیں سے بیوپار چل رہا ہے!

ہوا سے کہنا
ہوائے نا آشنا سے کہنا
کسی شناسا کو ساتھ لائے
جو آ کے شانوں پہ ہاتھ رکھے
کہے کہ، تم سے بچھڑ کے خود سے بچھڑ گیا ہوں
کہیں سے جگنو تو کوئی چمکے
کہیں سے گھنگرو تو کوئی چھنکے
کہ اب ہمارے تھکے قدم کے
پچاس برسوں کے اس
مسلسل سفر کی تکمیل ہو چکی ہے!

●176-B. POCKET- I, PHASE-I MAYUR VIHAR DELHI -110091



شمیم فاروقی

آگ جلتی رہے دھواں ہوں میں
کچھ پتہ تو چلے کہاں ہوں میں
آج تک بولتا رہا ہے کون
لوگ کہتے ہیں بے زباں ہوں میں
تھا کبھی حرفِ معتبر کی طرح
آج اک وہم ہوں، گماں ہوں میں
تھی زمیں بس میں آسماں بھی تھا
آج دونوں کے درمیاں ہوں میں
تیرا میرے بغیر مصرف کیا
تُو اگر تیر ہے کماں ہوں میں
آپ ہی اک نہیں جنابِ شمیم
جانے کتنوں کا رازداں ہوں میں

●LADY IMAM COMPOUND,
PATTHAR KI MASJID,
PATNA-800006 (BIHAR)

مابعد جدیدیت ،شاعری ،فن ،غزل ،الیکٹرانک میڈیا اور ......

ادبی فیچر

شاعر میں ما بعد جدیدیت پر مضامین اور ادبی فیچر کے تحت مباحث کی پیش کشی کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ معاصر علمی و ادبی اور فکری مسائل ومباحث پر مکالمہ روشن رہے اور تازہ بہ تازہ ادبی صورتِ حال اور ادب کے بدلتے ہوئے منظر ناموں کا اندراج ہوتا رہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ ما بعد جدیدیت [کسی مغربی فلسفے کے ذکر کے بغیر] پر سب سے پہلا سوال رسالہ شاعر ہی میں قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان شاعر کے شمارے رکھے جاسکتے ہیں ۱۹۹۰ء سے تا حال کے شمارے بطور خاص فرق صرف یہ ہے کہ ما بعد جدیدیت پر ہمارا مکالمہ اور اس کے مضمرات وہ نہیں جو اس عنوان سے ہندو پاک کے ادبی رسائل میں زیرِ بحث ہیں ما بعد جدیدیت کی اسی پوری بحث کو اگر درمیان سے نکال دیا جائے اور معاصر اردو ادب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک پوری بحث کے اثرات اردو ادب پر وہ نہیں جو سمجھے جارہے ہیں ۱۹۹۰ء کے بعد کا اردو ادب ترقی پسندی اورجدیدیت سے بہت مختلف ہے۔ ٦/ دسمبر نے اردو ادب ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے شعرو ادب کو بھی تبدیل کیا ہے موجودہ سیاسی صورت حال نے ٦/ دسمبر کو بھول جانے میں کوئی مدد نہیں کی یہ ٦/ دسمر شاید اسی طرح باقی رہے گا جس طرح ہندوستان کی تقسیم ۔اس کے علاوہ ہندوستان کے بعض بنیادی مسائل جو آزادی کے بعد سے اب تک حل نہیں ہوسکے ہیں صوبوں اور زبانوں کے مسائل ہیں۔ خود اردو اور اس کا رسم الخط ،مختلف شبہات و خطرات کے نرغے میں رہتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے ٹی وی اور کمپیوٹر کے ذریعے دنیا کو سمیٹ کر تقریباً ہر گھر میں اس طرح پہنچا رہا ہے کہ زمین کے دوسرے سرے تک لمحہ بہ لمحہ وقوع پذیر ہونے والے حالات سے بے خبری کا امکان ہی نہیں رہ گیا ہے آج کا فن کار خود اتنا زیادہ باخبر اورحسّاس ہوگیا ہے کہ وہ اپنے عصر میں تو جی ہی رہا ہے، آنے والے زمانوں کی دھمک بھی محسوس کررہا ہے پرنٹ میڈیا کی رفتار بھی تیز تر ہے۔ بلکہ الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ بنے رہنے کی اس کی اپنی جدوجہد غیر معمولی ہے انٹرنیٹ اس کی مدد کررہا ہے ۔ عالمی سطح پر بنیادی انسانی حقوق کی جنگ بھی جاری ہے کہ آدمی آدمی کا دشمن بنا ہوا ہے مابعد جدیدیت [یہ اگر کوئی اصطلاح ہے تو] کافلسفہ کوئی ایسا انوکھا، نرالا اور انسان کا نجات دہندہ بھی نہیں کہ آج اسی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور شور مچایا جائے

ترقی پسندوں کی آئیڈیا لوجی کے بھی اپنے دعوے تھے جدیدیوں نے ان کا رد کرتے ہوئے اپنے دعوے پیش کئے اور شعرو نثر کو اپنے دعووں سے بھرنا چاہا ما قبل ترقی پسندی اور جدیدیت ،شاعری تھی اور کہانی بھی اور جو ادبی روایت ہمارا ورثہ بنی ہے اس روایت میں ترقی پسندی اور جدیدیت اپنے اصطلاحی مفہوم، اپنی آئیڈیا لوجی اور اپنے سیاسی و سماجی رویوں اور عالمی طاقتوں کے ساتھ نہیں ہے ورنہ تو میر، نظیر، غالب، اقبال، سیماب، اور ایسے ہی کئی فن کار زبانوں زمانوں سفر نہیں کرتے ترقی پسندی اور جدیدیت پسندی سے پہلے بھی ادب نما ان دونوں رجحانات کے چالیس پچاس سال میں بھی ادب تخلیق ہوا۔ اب بھی ادب تخلیق ہورہا ہے اور آئندہ بھی یہ سفر جاری رہے گا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت پسندی کے ساتھ آزادی کے بعد' سیکولر ادب 'کا نعرہ بھی ہمارے درمیان کام کرتا رہا ہے اور اس نعرے کے تحت بھی خاصہ شعرو ادب تخلیق ہوا ہے ہندوستانی سیکولرازم اور عالمی سیکولرازم یہ سب کچھ بھی سیاسی کھیل رہے ہیں۔ تعمیری ادب ،فکری ادب اور جانے کیا کیا کچھ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں‌کہ ہمارے درمیان ادبی سطح پر جو کچھ بھی ہورہا ہے ہم اسے شاعر کے صفحات پر بطور مکالمہ پیش کرتے رہنا چاہتے ہیں کیونکہ رسالہ شاعر اپنی عمر کے ستر سال میں ہمیشہ ہی LIVE ادبی رسالہ رہا ہے ہم نے نئی نسل کے قلم کاروں اور نقادوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے عصر کو جس طرح اپنا تجربہ ،مشاہدہ اور اپنی واردات سمجھ رہے ہیں اسے تحریر کریں اور جو قلم کارو قارئین ،مابعد جدیدیت، کی بحث کو فضول اور لا یعنی سمجھ رہے ہیں ان سے گذارش ہے کہ وہ محض اسے بے کار اور غیر ضروری نہ کہیں بلکہ کوئی تعمیری ادبی مکالمہ قائم کریں اور جس نوع کی بحث جاری ہے اسے روایت بمقابلہ ترقی پسندی بمقابلہ جدیدیت بمقابلہ مابعد جدیدیت کے انداز میں نہ لیں اور اپنی آزارئی فکر کو پابند نہ کریں

علامہ شارق جمال نے لفظ 'طمانیت' کو موضوع کرتے ہوئے خاصی تحقیقی بحث کر لی۔ حکیم منظور ہوں یا طلحہ رضوی برق یا کوئی اور ،علمی و تحقیقی مسائل میں لہجہ نرم اور اظہار میں انکسار بہت ضروریٔ ہے کہ علم ہمیں یہی درس دیتا ہے۔ اور پھر خدا نے اپنے بندوں کو بہت معمولی علم عطا کیا ہے لہٰذا اس معمولی علم کی انتہا پر ہم لا علم ہی رہیں‌گے۔ ہماری لا علمی ہی

دراصل ارتقاء کی روح ہے۔ ہم نہ معلوم سے معلوم کی طرف سعی کرتے ہیں۔ تو ہمیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔ کوئی چیز حرفِ آخر نہیں۔ جو انتہا ہے، دراصل وہی ابتدا ہے۔ ہم سب ابتدا سے انتہا اور پھر ابتدا کی طرف سفر کے ایک چکر میں مصروف رہتے ہیں اور صدیوں سے یہ سفر جاری ہے۔ فنِ عروض ہمارے اسی علمی سفر کی ایک دین ہے جو مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہے لہٰذا اختلاف کی گنجائش بہر حال رہتی ہے اور یہ ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ کہ جو ۱۹ بحریں ہیں (بلکہ ۲۱/ بحریں) ان میں زحافات سے جو فروعی بحریں بنتی ہیں ان میں عروضیوں کا اجماع کہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض فروعات بخود بوجہ عمل زحاف مشتبہ ہوگئی ہیں۔ پھر یہ کہ بعض اساتذہ نے پنگل شاستر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے شعری آہنگ کو کچھ اور وسعت دی ہے لیکن بحورِ مقررہ سے ایسے کلام کی فنّی پرکھ کلام کو مشکوک بنائے گی۔ ارکانِ عشرہ میں کھینچ تان کر سمویا' بھی جائے تب بھی بات نہیں بنے گی بلکہ شاید بحروں کی نئی صورتیں پیدا ہوجائیں گی۔ عروضیاتِ فارس نے ۲۱/ بحروں ہی میں سے ۹/ بحریں اور استخراج کیں، اردو میں ان کا چلن نہیں ہے۔ ۱۹/ بحروں میں سے بھی سب کہاں چلن میں ہیں مثلاً بحرِ جدید کہ اردو میں سوائے ایک دو فروع کے مستعمل نہیں۔ یہ فن کوئی ہزاروں سال پرانا نہیں ہے اور جو کچھ فنِ عروض میں ہے وہ ہماری لا محدود موزونیت، آہنگ اور اس کی موسیقی کی افہام و تفہیم کے لئے ہے۔ یہی حال لغت کا ہے کہ ہمارے حقیر و مستند لغت بھی اختلاف سے پاک نہیں ہم شاعر میں بہت آسان اور بہت صاف و واضح اسلوب میں فنِ عروض کی مبادیات کو پیش کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس ضمن میں علامہ سیماب اکبر آبادی کی مشہور زمانہ کتاب 'راز عروض' جس کے پندرہ سولہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ ہماری رہنمائی کرے گی۔ علامہ شارق جمال اور سید مبارک علی صاحبان 'راز عروض' پر مفید حواشی قلم بند کررہے ہیں تاباں ضیائی کے مختصر سے دلچسپ مضمون پر اظہارِ خیال کی بڑی گنجائش ہے کیوں کہ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ ہماری روز مرہ گفتگو میں موزوں جملے اور فقرے لاشعوری طور پر ادا ہوتے رہتے ہیں کیونکہ ہر انسان کے اندر اس کی اپنی ایک موسیقی موجود رہتی ہے۔ ہماری پرانی نثری کتابوں کا اسلوب و آہنگ شعری آہنگ سے بہت قریب ہوتا تھا۔ جدید اردو شاعری میں نثر و شعر کی حدیں ایک دوسرے میں گم ہونے لگی تھیں۔ کرشن چندر کے افسانوں کے اسلوب پر یہ تنقید کی گئی کہ ان کی نثر شاعرانہ ہے تمام آسمانی اور مذہبی صحائف نثر میں ہیں لیکن ان کا اسلوب و آہنگ ......

۲۱/ ویں صدی مکمل طور پر کمپیوٹر کی صدی ہوگی اور مواصلاتی نظام کے تحت سارے کام انجام پذیر ہوں گے ادب پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بھرپور ہوں گے۔ صنفِ غزل کے حوالے سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ کتابی رسالی (رسائل و جرائد) غزلیہ شاعری سے باہر غزل کا تخلیقی و تشہیری سفر کچھ اور ہے۔ غزل کے لئے اب فنِ عروض کا ازسرِ نو جائزہ ضروری ہوگیا ہے۔ ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ [الف۔ الف]

فنِ شاعری کا جاننا .... اور حقیقت چند اعتراض کے دفاع کی

شارق جمال



ماہنامہ "شاعر" کے ستمبر ۹۹ء کے شمارے میں میرا ایک مضمون "فنِ شاعری کا جاننا ضروری ہے۔" شائع ہوا تھا۔ جس میں جناب حکیم منظور کی غزل کے دو شعر کو سامنے رکھ کر دو لفظ "دے" اور طمانیت سے متعلق لکھا تھا کہ۔ اس مصرع میں۔ اب صدائیں بھی دے کوئی ..... در کوئی کھلتا نہیں "دے" کی یائے مجہول ساقط الجر ہے۔ دبا کر وزن کو پورا کیا گیا ہے۔ گو یہ یائے مجہول حروفِ علت میں سے ہے اور حروفِ علت کا دبانا جائز ہے۔ لیکن وہاں، جہاں مصرع کی روانی میں پڑھنے پر کوئی قباحت نہ ہو۔ فصاحت اور سلاست مجروح نہ ہوتی ہو۔ حروفِ علت کے دبانے سے اہلِ فن نے گریز کیا ہے۔ مزید دلیل میں اہلِ فن کی یہ تحریریں بھی پھر نقل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ اس ضمن میں شوق نیموی شاگرد رشید شمشاد لکھنوی اپنی تالیف "اصلاح والایضاح" میں لکھتے ہیں۔

"مؤلف الفاظ ہندیہ سے (اس باب میں ہندی اور اردو دونوں زبان کے الفاظ شمار کئے جاتے ہیں) حرفِ علّت الف۔ واؤ۔ یے۔ گرانا جائز رکھتا ہے۔ ہاں جہاں کہیں ان کے گرانے سے نظم میں ثقل پیدا ہوجاتا ہو۔ معیوب سمجھتا ہے۔"

مرحوم مولانا آبر احسنی گنوری اپنی کتاب "میری اصلاحیں" حصہ دوم میں رقم طراز ہیں۔

.... لیکن بعض ہندی (اردو) الفاظ کے حروفِ علت ایسے ہیں۔ جن کا گرانا فصاحتِ کلام کو سخت نقصان

پہنچاتا ہے۔ ان کو ہرگز نہ گرانا چاہئے۔ا"

"میری اصلاحیں" حصہ اول میں بھی مولانا تاجور مرحوم نے اس سلسلے میں مزید لکھا ہے کہ

حروف علّت کے گرنے کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ بعض ہندی کے الفاظ بھی ایسے ہیں جن کا گرانا فصاحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ گویا ان کا گرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً : کیا۔ کیوں۔ یوں (وغیرہ)۔ .... ان کے علاوہ بھی جن گرتے ہوئے ہندی حروف کو مذاقِ سلیم پسند نہ کرے۔ ان کو نہ گرانا ہی فصیح ہے۔"......

لفظ طمانیت سے متعلق میں نے لکھا تھا۔ کہ یہ لفظ مخالفت۔ پیامبر۔ صلاحیت۔ مکالمہ۔ منافرت (بروزن مفاعلن) کے وزن پر ہے۔ اس سلسلے میں شاعر کے دسمبر ۹۹ء کے شمارے میں جناب ظہور رضوی برق نے لفظ طمانیت سے متعلق لکھا ہے۔ کہ......

"یہ لفظ طمانیت ہے" اور تین مستند لغتوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس کے معنی لکھے ہیں۔ اور نون دوم کے حذف ہونے والی عبارت بھی نقل کی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ.......

"اس نون ثانی کے حذف ہونے کے جواز کے بعد بھی طمانیت کا تلفظ یائے مشدد سے ہی ہوگا۔ اور یہ قطعاً غلط نہیں۔"

نون ثانی کے حذف ہونے کے بعد یائے معروف کے مشدد ہونے کی کوئی سند یا تحریر برقؔ صاحب نے نقل نہیں کی۔ اس لئے اسے ماننے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اسی شمارے میں جناب حکیم منظور نے اپنے دفاع میں لفظِ مذکورہ طمانیت سے متعلق لکھا ہے کہ.......

"شارق صاحب نے میری غزلوں پر توجہ کرنے کی زحمت فرمائی ہے۔ شکر گزار ہوں میں ان کا۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اشعار کی خوبی پر انہوں نے نظر نہیں فرمائی۔ صرف "فرضی" اور غیر حقیقی خامیوں کی نشان دہی پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ طمانیت میں "یے" مشدد ہے۔ اور میرے سامنے اس وقت دو لغات ہیں۔ فرہنگ عامرہ اور فیروز لغات دونوں میری تصدیق کرتے ہیں۔ شارق صاحب نے "ی" کو غیر مشدد بنا کر اجتہاد کیا ہے۔ مگر مجھ پر اس کا ستم کیوں ڈھایا ہے۔ اپنے ہی مزاج کو سند بنا کر اعتراض کرنا میرے خیال میں نا مناسب رویّہ ہے۔ یہاں تو لغت دیکھنے کی فرصت کسی کو نہیں (خود شارق صاحب کو بھی نہیں۔ ورنہ اعتراض نہ کرتے)......"

حکیم صاحب نے دو لغت کا ذکر کیا ہے۔ اور لغت دیکھنے والی بات بھی لکھی ہے۔ اب میں لفظ "طمانیت" سے متعلق کئی لغات کی تفصیل ذیل میں پیش کر رہا ہوں۔ جس سے حکیم صاحب سمجھ لیں گے کہ مجھے لغت دیکھنے کی فرصت تھی یا نہیں۔

(۱) نور اللغات۔ حصہ سوم ص: ۵۲۷

طمانیت :۔ ع ۔ " بضم اوّل وکسر نون اوّل وسکونِ یائے معروف وفتح نون دوم....... اردو میں اس جگہ طمانیت بفتح اول بولتے ہیں۔"

"نور اللغات" میں جب یہ لکھا گیا ہے کہ اردو میں "ط" کو بفتح بولتے ہیں تو یہ بھی کیوں نہیں لکھا گیا کہ اسے یائے مشدد کے ساتھ بھی بولتے ہیں۔ یا جب لفظ پر زیر زبر کی حرکت لگائی گئی ہے۔ تو تشدید کی حرکت سے لفظ کو کیوں محروم کیا گیا؟۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان میں اس لفظ طمانیت کو طمانیت بغیر تشدید کے بروزن صلاحیت (مفاعلن) بولتے ہیں۔

(۲) فرہنگ آصفیہ۔ حصہ سوم ص: ۲۴۸

طمانیت :۔ ع...... (یہ لفظ جس طرح بفتح طائے مفتوحہ ویک نون مکسور مشہور ہے۔ غلط ہے۔ صحیح بضم اول کسر نون اول ویائے معروف وفتح نون ثانی بمعنی سکونِ قلب تصور کرتا ہے گو صراح (ایک لغت) سے ایک نون کے حذف کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔"

یہاں بھی صاحبِ تالیف نے یائے معروف کے مشدد ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟؟؟

(۳) لغات کشوری۔ ۱۷۴ ص: طمانیت ....

اس لغات کشوری میں جب لفظ طمانینت پر چار حرکتیں دی گئی ہیں۔ تو پانچویں تشدید کی حرکت کیوں نہیں۔ یہاں تشدید نہ دینے سے کیا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مذکورہ لفظ میں یائے معروف غیر مشدد ہے۔؟؟؟

(۴) غیاث اللغات (فارسی) ص: ۳۰۳

طمانینت۔ "بضم طائے مہملہ وکسر نون اول ویائے معروف وفتح نون ثانی......... گو از صراح جواز حذف یک نون ظاہر میشود۔"

فارسی زبان کی اس لغت "غیاث اللغات" میں بھی۔ پیش۔ زیر۔ زبر کا ذکر ہے۔ ان حرکتوں کا مولف نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ یائے معروف کے مشدد ہونے کا (نون دوم کے حذف کے ذکر کے ساتھ) ذکر کیوں نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان میں یائے معروف مشدد نہیں۔

اب ذرا لغات سے ہٹ کر بھی لفظ طمانیت سے متعلق زبان و قواعد کی کتب میں بھی اس باب میں معلوم کیا جائے کہ اس سلسلے میں کیا کیا لکھا گیا ہے۔ اپنی کتاب "زبان اور قواعد" میں رشید حسن خاں صاحب رقم طراز ہیں۔ کہ

طمانیت کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ "طمانیت کہنا سخت غلطی ہے " (قاموس) حالانکہ اردو میں صرف طمانیت

مستعمل ہے۔ یہی بات صاحب نور نے لکھی ہے۔" طمانینت" کو تو اردو لغات میں لکھنا ہی نہیں چاہئے تعجب ہے صاحب آصفیہ پر ،جنہوں نے اردو میں بھی "طمانینت" کو صحیح اور طمانیت کو غلط بتایا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے "یہ لفظ جس طرح بہ فتح طائی (غیر) منقوطہ ویک نون مکسور مشہور ہے۔ غلط ہے۔ صحیح بضم اول وکسر نون اول ویائے معروف وفتح نون ثانی، بہ معنی سکون قلب، تصور کرنا چاہئے گو صراح سے ایک نون کے حذف کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔" یہ عجیب منطق ہے "طُمانینت" اردو میں‌تو کوئی بولتا ہی نہیں اس قدر ثقیل لفظ رائج ہو بھی نہیں سکتا تھا اس کے علاوہ جب صراح سے ایک نون کے حذف کا جواز ملتا ہے تو پھر اسے کیوں نہ مانا جائے؟ لغت پرستی بھی عجیب چیز ہے۔ کہ بعض اوقات خوش مذاقی بھی اس کے سامنے ماند پڑجاتی ہے اردو میں "ط" کا زیر ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بہ ہر صورت ،اردو میں اب صرف ایک لفظ ہے "طمانیت" "ط" مفتوح ، اور "ن" مکسور، آگے یت "[زبان و قواعد ۔ص ۱۵۳]

رشید حسن خاں نے بھی ط مفتوح اور "ن" مکسور، آگے یت لکھ کر بات ختم کر دی۔ کہ طمانیت بغیر تشدید کے ہے۔ اگر یائے معروف مشدد ہوتی تو ضرور لکھتے۔.......

.....آگے ملاحظہ فرمائیں۔ کہ جو لوگ اسے غلط طور پر یائے مشدد سے تلفظ قائم کر کے اس کا وزن مفاعی لن کا لیتے ہیں، درست نہیں۔ ڈاکٹر منظر اعظمی کی کتاب سے تحریر نقل کرتا ہوں۔

"ایسے تلفظ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جس کے اختیار کرنے سے اردو زبان کے اجنبی بن جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً (بے شمار الفاظ کی بھیڑ میں.... طمانیت کو طمانیت.... پڑھنے کا مطالبہ محض سعی نامشکور ہے۔ اس لئے کہ....."[اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوشش۔ ص۔ ۶۸]

لیجئے یہاں منظر صاحب نے بات ہی صاف کر دی۔ یائے مشدد کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ کہ طمانیت میں یائے مشدد ہی نہیں۔

حکیم صاحب نے جن دو لغتوں کا یعنی "فرہنگ عامرہ" اور "فیروز لغات" کا ذکر کیا ہے۔ ان میں مندرجہ بالا لغتوں اور کتب کے مقابلے میں "فرہنگ عامرہ" کی کوئی حیثیت واہمیت نہیں۔ اس میں یائے مشدد کے ساتھ یہ لفظ مذکور ضرور ہے۔ لیکن اکثریت کے مقابلے میں قلت کی کوئی سند نہیں مانی جاتی۔ اب رہی فیروز لغات کی بات۔ غالباً یہ فیروز اللغات ہے۔ حکیم منظور صاحب کی پیش کردہ لغت، فیروز اللغات سے بھی پوری تفصیل نقل کر رہا ہوں۔ کہ حکیم صاحب نے مذکورہ لغت کی مکمل تفصیل نہیں لکھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) "فیروز اللغات"۔ ص: ۲۶۹

طمانیت۔ (ط۔ ما۔ ن۔ یت۔ اردو۔ مؤنث)............

طمانینت۔ ط۔ ما۔ نی۔ نت۔ ع۔ مؤنث ....

طمانیت پر پہلے "ط" پر زبر دے کر لکھا گیا ہے۔ آگے الگ الگ حرف لکھے گئے ہیں۔ نون کے نیچے زیر ہے۔ م۔ الف۔ پر کوئی حرکت نہیں۔ یائے معروف پر زیر کی حرکت ہے۔

دوسرے جگہ نون۔ ی۔ ملا کر اور ن۔ ت ملا کر (یت) لکھا گیا ہے۔ اتنی حرکتیں دینے کے بعد مؤلف تشدید کی حرکت اگر تھی تو کیا دے نہیں سکتا تھا۔ ؟؟؟ اگر بقول حکیم صاحب طمانیت میں یائے مشدد ہوتی تو صاحب فیروز اللغات اسے یوں لکھتے ط۔ ما۔ نی۔ یت۔ یا ط۔ م۔ ا۔ ن۔ ی۔ ی۔ ت۔........

کسی لغت میں تشدید کی حرکت نہیں۔ تشدید کا ذکر نہیں۔ خود حکیم صاحب کی دیکھی ہوئی اور پیش کردہ بات یا سند بھی جو فیروز اللغات سے دی ہے۔ غلط ثابت ہو رہی ہے۔ پھر کس بنیاد پر لفظ طمانیت میں یائے معروف مشدد ہے۔ اور یہ لفظ بروزن مفاعیلن ہے۔ بروزن "خطاپوشی" ہے۔ یہ لفظ "اساطیری" لفظ کا ہم وزن ہے۔

مندرجہ بالا پانچوں لغت کی تفصیل کی روشنی میں اور دو زبان و قواعد والی کتاب کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ مذکور جو طمانینت سے طمانیت بن کر اردو میں بروزن صلاحیت۔ مراجعت۔ مغائیرت ہے۔ اور دو مزید مجموع پر یہ مشتمل ہے۔

اپنے مضمون میں میں نے اظہار سلیم صاحب کے ایک مصرع کو بروزن ۔

مفاعی لن مفاعی لن مفاعی لن مفاعی لن

پر اور باقی غزل کے مصرعوں کو ۔

مفاعی لن مفاعی لن مفاعی لن مفعولن

پر بتایا تھا۔ شاعر کے مذکورہ شمارے میں جناب اظہار سلیم لکھتے ہیں۔ کہ.....

"........غزل کے مطلع کے بعد والے شعر کے پہلے مصرے میں "ہے" زائد شائع کردیا گیا .... شارق صاحب تصیح فرمالیں۔ غزل کے ارکان ہیں۔ ۔

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن

بے شک، جناب اظہار سلیم کی پوری غزل سوائے ایک مصرع .... ہوا کی سازشوں سے باخبر رہنا ضروری ہے
کے اسی وزن وارکان میں ہے۔ میں نے کب کوئی اور وزن بتایا ہے۔ لیکن رسالے کے صفحات پر جس طرح الفاظ شعر ہوں گے اسی کے مطابق تو لکھا جائے گا نا؟.... ماننے کی بات ہے۔ کہ کمپوزنگ کی غلطی سے لفظ "ہے "زائد چھپ گیا ہے۔ جب چھپ گیا ہے تو قارئین کیا اسے چھوڑ کر پڑھیں گے۔؟؟؟.... یہ بھی شاید کمپوزنگ ہی کی غلطی ہے۔ کہ آپ کے خط کے ساتھ مذکورہ مصرع کو یوں چھاپا گیا ہے۔

ہوا کی سا فرشتوں سے باخبر رہنا ضروری

یہاں یہ بھی غور طلب بات ہے۔ کہ لفظ "ہے" کے بغیر کیا مصرع کا مضمون ادھورا نہیں رہتا۔؟؟؟.... کیا مصرع مذکورہ میں "ہے "کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟؟؟ ہوتی ہے اور "ہے "کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ سلیم صاحب کی غزل کی دوسری غلطی ہے۔ اگر "ہے "کو حذف کرتے ہیں۔ تو مصرع ہی باعتبار مفہوم تشنہ رہ جاتا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے یہ مصرع نامکمل ہی رہ جاتا ہے۔ خیال کیجئے کہ غزل کمپوز کرنے والے نے (اگر اس کی غلطی ہے تو) مصرع کو نامکمل دیکھ کر "ہے "بڑھا کر مکمل کر دیا۔
ہر شاعر کو اپنے کلام پر کئے گئے اعتراض کا دفاع کرنا ہی چاہئے۔ یہ حق ہے۔ دفاع کا سب کو حق ہے۔ لیکن اس طرح کہ دفاع میں کوئی جائز بات ماننے والی سامنے آتی ہو۔ جیسے حکایت کی صورت میں ایک واقعہ اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں کہ اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔ حکایت: - کہتے ہیں برسوں پہلے ایک قد آور ادبی شخصیت نیاز فتح پوری کے نام سے بہت مشہور تھی۔ نیاز صاحب نے اپنے وقت کے مقبول شاعر، جگر مراد آبادی کے ایک شعر۔

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر   وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

پر اعتراض کیا۔ "وہ کون سی شے ہے۔ جو حسن کو بھی نصیب نہیں۔ حسن اس سے بے خبر ہے۔ یہ ایک مہمل بات ہے۔ جگر کا شعر ناقص ہے۔"
اس اعتراض کا جواب خود جگر صاحب نے تو نہ دیا۔ مگر علامہ سیماب نے جو استاذ الاساتذہ تھے۔ جگر پر اس حملے کا جواب دیا۔ اس لئے بھی کہ اس بات کی گونج عرصے تک سنائی دی تھی کہ جگر نے سیماب سے بھی اصلاح لی ہے۔ علامہ کا جواب تھا کہ..... نیاز صاحب کا اعتراض درست نہیں۔ جگر کا کہنا کہ۔ وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے "وہ ہے کیفیت حسن۔ جس سے معشوق خود بے خبر ہے۔ "وغیرہ وغیرہ
اگر اس طرح کا اعتراض ہو تو اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟۔ مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔ کہ فن شاعری کا علم بہت وسیع ہے۔ اس میں مکمل مہارت کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔ میں اب بھی طفل مکتب ہوں۔ آگرہ اسکول، سیماب اسکول کا ایک فرد ہوں۔ اس اسکول کے کسی فرد نے کبھی کسی غلطی کو ماننے سے گریز نہیں کیا ہے۔ مانا ہے، اپنی تحریروں سے یا خاموش رہ کر۔ انسان ہی غلطی کرتا ہے لیکن اسے مان لینا چاہئے۔ وما توفیق

●TAKIA MASOOM SHAH, MOMIN PURA, NAGPUR- (M.S.)

بول چال اور عروض کی انیس بحریں

تاباں صباتی

اہل عروض تو جانتے ہی ہیں مگر مبتدی شعر اخال خال ہی آگاہ ہوں گے کہ عروض کیا ہے اور اس علم کا موجد کون ہے۔ اس کی معلومات کے لئے ماہر عروض جناب ذاکر عثمانی راویری اپنی تالیف نکات العروض میں لکھتے ہیں ۔

"غالباً دوسو سن ہجری ایک رات خانہ کعبہ میں ابوعبد الرحمن خلیل بن احمد بصری فیر ہو دی نے یہ دعا مانگی کہ خدایا ! مجھے اک ایسا علم عطا کر جو سب سے جدا اوربالکل اچھوتا ہو صبح باہر تشریف لائے دیکھا ایک ٹھٹیرا برتن پر ضرب لگارہا ہے۔ برتن کی آواز کچھ ایسی دلکش معلوم ہوئی کہ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "بخدا اس سے ایک چیز کا اظہار ہوتا ہے" یہی وہ الہام تھا جو علم عروض کی ایجاد کا سبب ہوا یعنی انہوں نے اپنے کمالِ فن سے اسی دن تن تن تن کی آواز کو علم عروض کے اوزان میں تحلیل کرلیا " [نکات العروض۔صفہ ۸]

ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ ہم آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں اس سے عروض کی بحریں نکالی جائیں۔ گو کہ اس میں مجھے محنت بہت کرنا پڑی [اور محنت کس کام میں نہیں] یہ بھی سچ ہے کہ ڈھونڈنے سے تو خدا مل جاتا ہے۔ ارباب علم و فن اور خصوصاً عروض سے دلچسپی رکھنے والے احباب ضرور اس مضمون کو پسند کریں گے۔ علم عروض دقیق تو ہے ہی مزید یہ کہ اس میں اختلافات بہت زیادہ ہیں نکات العروض کے مولف اپنی تالیف میں لکھتے ہیں۔

"عروض پر ۹۹ فیصد تالیفات ایسی ہیں جو بنیادی لغزشوں کے تحت گمراہ کُن ہیں اور خود ان کے مؤلف بھی گمراہ نظر آتے ہیں"۔[نکات العروض صفحہ ٦]

حالانکہ اردو شاعری میں کچھ ہی سالم بحریں مروج ہیں البتہ زحافات کی مدد سے ایک ایک بحر سے کئی بحریں نکلی ہیں۔ اہل ذوق کی دلچسپی کے لئے ان پانچ بحروں! مضارع، خفیف، مقتضب، مجتث اور بسیط مفرد بحریں کی محذوف اوزان میں عبارتیں اور باقی سالم بحروں کی عبارتیں پیش ہیں۔

(الف) ۔مفرد بحریں

(۱) ہزج :۔ دونوں ملکوں میں آپسی کشیدگی اور سرحدوں پر چھوٹی موٹی وارداتیں "یہی ہو تا رہا تو اک نہ اک دن جنگ پھر ہو گی / مفاعی لن۔ مفاعی لن۔ مفاعی لن۔ مفاعی لن
اور ملک کی صورت حال بگڑ جائے گی۔ (۲) رجز :۔ "اندور سے بھوپال اگر میرا ابھی جانا ہوا / مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن" تو تھوڑی دیر کے لئے
سیہوررک کر آپ سے شرف نیاز حاصل کروں گا۔ (۳) رمل :۔ "عالم و جاہل برابر ہو نہیں سکتے، یہ سچ ہے / فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن" مگر طرہ انتیا
یہ ہے کہ جاہل اپنے آپ کو بہت عقل مند اور دانا سمجھتا ہے۔ اور یہی اس کی نادانی کی دلیل ہے۔ (۴) متقارب :۔ یہ دنیا ہے "عجائب و غرائب کو کیا دیکھتے ہو / فعولن
فعولن۔ فعولن۔ فعولن" خود اپنی پیدائش اور تحقیق کو دیکھو، کتنی عجیب و غریب ہے۔ اس پر غور کر لو تو سب سمجھ میں آ جائے گا۔ (۵) کامل :۔ ایسے کی صحبت میں بیٹھ
گے تو خود بھی بدنام ہو جاؤ گے "سبھی جانتے ہیں وہ چور ہے تو پھر اس سے کیسی موافقت / متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن" اس سے دور ہی رہو تو بہتر ہے
(۶) وافر :۔ تاباں ضیائی نے وافر بحر کا رکن متفاعلن بتایا جب کہ ہے "مفاعلتن یہی غلطی تو سب ادبی مہارتیوں / مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن" نے بھی کی۔ (۷)
متدارک :۔ اب ملک کے سیاسی لیڈروں کو کون سمجھائے "بار بار انتخابات ہوں گے تو پھر / فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن" ملک کی مالی حالت بگڑ جائے گی۔

(ب) مرکب بحریں

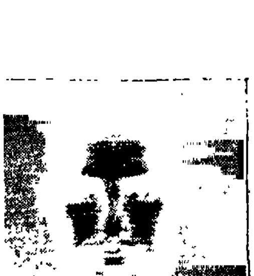
منسرح :۔ وہ شخص عزت دار ہوا کرتا تھا مگر اب "اس کے لئے کوئی بات کیسے کرے وہ بدنام / مستفعلن۔ مفعولات۔ مستفعلن مفعولات" ہو چکا ہے۔ (۹) سریع :۔
نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی مجھ پر تیرا احسان ہے، میرے یار / مستفعلن مستفعلن مفعولات" مگر دوستی میں احسان جتایا نہیں جاتا۔ (۱۰) مضارع :۔ اس بار نتائج بڑے
چونکا دینے والے آئے ہیں۔ چھوٹوں نے یہ چناؤ بڑوں کو ہرا دیا / مفعول۔ فاعلات۔ مفاعیل۔ فاعلن۔ اخرب مکفوف محذوف [سالم :۔ مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن
فاع لاتن] ہارنے والے بڑے تجربہ کار ہوتے ہیں۔ (۱۱) خفیف :۔ اگر میں نے تمہیں دل سے پکارا تو "تم پلٹ کر ضرور آؤ گے / فاعلاتن مفاع لن فعلن / سالم مخبوا
مسکن / سالم : فاعلاتن مستفع لن فاعلاتن مستفع لن" مجھے یقین ہے۔ (۱۲) مجتث :۔ "جو شخص اپنی حفاظت نہ کر سکے وہ پھر / مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن
مخبون۔ مخبون۔ محذوف۔ مسکن / مجتث سالم : مس تفع لن۔ فاعلاتن۔ مس تفع لن۔ فاعلاتن / سالم اردو میں نایاب ہے "کسی دوسرے کو کیا سنبھال سکتا ہے۔ (۱۳)
مقتضب :۔ آج جو لوگوں کو دیکھو "بات تو بنا لینا ان کو خوب آتا ہے "فاعلات، مفعولن فاعلات، (مفعولن / مقتضب سالم :۔ مفعولات، مس تف علن مفعولات، مس
تف علن / مطوی مطوی مسکن المضاعف / سالم اردو میں نایاب ہے۔ "جب عمل کی پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ (۱۴) بسیط :۔ "کبھی کبھی وہ کسی کسی کو ہنسا
اتار لا دیا کر / مفاعلن فاعلن فعولن ، مفاعلن فاعلن فعولن / مخبون سالم، مخبون سالم / مسدس المضاعف / بسیط سالم : مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن / س
اردو میں نایاب ہے۔" تا ہے کہ پھر اس کے لبوں پر ہنسی لوٹ کر نہیں آتی۔ (۱۵) طویل :۔ "کسی نے بتایا ہے ہمارے لئے تم بھی / فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن.
بھلائی کی باتیں کرنے لگے ہو۔ خدا نے تمہیں دیر سے سہی چلو توفیق تو دی۔ (۱۶) مدید :۔ تم وہاں کی بات کرتے ہو اب تو یہاں / فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن.
بھی دہلی سے کم مہنگائی نہیں۔ (۱۷) قریب :۔ وہ مورتی ہو یا تصویر "ہنر مندی تو ہم اس کو ہی کہیں گے / مفاعیلن مفاعیلن فاع لاتن۔ "جو شاہکار منہ سے بول اٹھے
(۱۸) مشاکل :۔ پچھلے چناؤں میں دیکھا ہے کہ جیتنے والے اپنوں ہی کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس بار تو سوچ لیا ہے کہ "ہم اسی کو جتائیں گے جو سب کا بھلا چاہے / فاع لا
مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن۔" (۱۹) جدید :۔ ایسے کام میں تو ایک غیر بھی مدد کر دیتا ہے "تم سے اس کی دوستی ہے، کچھ تو کرو / فاعلاتن فاعلاتن مس تفع لن
بے چارے کا گھر بس جائے گا۔

172- AZAD ROAD, SANAWAD - (M.P.)

نئی نسل کو نئی اصطلاح کی تلاش؟

مابعد جدیدیت کے حوالے سے

روح الرور



گزشتہ کئی برسوں سے ملک اور بیرون ملک کے بیشتر شعراء، ادباء اور ناقدین حضرات نے جدیدیت کی اصطلاح سے انحراف کرتے ہوئے نئی نسل کو نئی اصطلاح سے متعارف کروانے کے لئے ایک زبردست اصطلاحی مہم چھیڑ رکھی ہے اور متعدد قلم کار اپنے اپنے جدید فکری و نظریاتی اصطلاحات سے قارئین اردو کو روشناس کروانا چاہتے ہیں، کوئی مابعد جدیدیت کی اصطلاح پیش کر رہا ہے تو کوئی معنویت کی۔ کوئی انضامیت کی اصطلاح پیش کر رہا ہے تو کوئی رد تعمیریت کی غرض کہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں، سب یہی چاہتے ہیں کہ انہیں کی منتخبہ اصطلاح کو قبول کیا جائے۔ تاکہ ادب عالیہ کی تاریخ میں انہیں کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب جب بھی موجودہ شعری و ادبی رجحان سے انحراف کیا گیا ہے تو نتیجے کے طور پر نئی نسل کے لئے نیا نظریہ وجود میں آیا ہی ہے۔ خواہ وہ میر و غالب کا دور رہا ہو یا انیس و دبیر کا۔ ہر دور میں ایک ادبی انقلاب آیا ہے۔ اور ایک نیا نظریہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ دور مت جائیے ماضی قریب کو لے لیجئے کہ روایت پسندی و قدامت پرستی کے خلاف، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، منشی پریم چند، ن۔م۔ راشد، انصاری، سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، جاں نثار اختر، سردار جعفری

، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجاز لکھنوی، آل احمد سرور اور زیدؔ عابد، وغیرہ نے علم بغاوت بلند کیا اور نئی نسل کے لئے ایک نیا نظریہ "ترقی پسندی" دیا۔ جو آگے چل کر ایک تحریک بن گئی۔ یہ اور بات تھی کہ اس ادبی تحریک کا تعلق براہ راست کیمونزم سے جاکر ملتا تھا۔ جس کے سربراہوں میں کارل مارکس، میکسم گورکی، لینن اور اسٹالن جیسے مدبر، مفکر اور فلاسفر گزرے ہیں۔ اور اس تحریک کی جڑیں روس، چین مشرقی یورپ اور شمالی کوریا وغیرہ میں تھیں۔ لیکن اس گھنا اور تناور درخت کا سایہ پورے عالم ادب پر پھیلا ہوا تھا۔ جس سے استفادہ کرتے ہوئے جھنڈ کے جھنڈ شعرا و ادبا اس سرخ آندھی کے لپیٹ میں آتے چلے گئے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سارے عالم میں ترقی پسندی کا ڈنکا بجنے لگا۔

ترقی پسند تحریک! سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اور دبے کچلے سسکتے بلکتے ہوئے غریب و مزدور کے حق میں تھی۔ اس تحریک کا مقصد کمزور و بے بس اور مجبوروں کو استحصال سے بچانا اور ان کے جائز حقوق کو اپنی علمی لیاقت اور ذہنی قوت کے ذریعے انھیں دلوانا یا دوسرے لفظوں میں چھین لینا تھا۔ اپنی علمیت سائنس اور جسمانی قوت ہی کو خدا تصور کرنا اور مادیت کے حصول ہی کو اپنا نصب العین بنانا ہی اس تحریک کی ناکامی کا سبب بنا۔ لیکن اس لٹریچر نے جو سامایہ ادب دنیا کو دیا ہے وہ نصف صدی کو محیط اور غیر معمولی ہے۔

ترقی پسند تحریک کا زوال شروع ہوا تو ایک ایک کر کے فنکار اس سرخ انقلاب سے کنارہ کش ہونے لگے۔ اور دوسری پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موقع پرست و مصلحت پسند قلم کاروں نے نئی نسل کے مزاج کو دیکھتے ہوئے نئے بدلتے ادبی منظر نامے کے مطابق ایک نئی اصطلاح "جدیدیت" کی داغ بیل ڈال دی۔ جدیدیت کی اس نئے ادبی رجحان میں اتنی کشش، اتنی تڑپ اور اتنی سحر انگیزی تھی کہ فنکار اس جدید بینر تلے آتے چلے گئے۔ اور اچھے بُرے قلم کاروں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔

جدیدیت اپنی طلسماتی نظریے اور جدید تخیل ہی کے بدولت مقبولیت کی ارتقاء کو چھونے لگی۔ اس لئے اہل قلم اسے بے حیل و حجت تسلیم کرتے چلے گئے۔ یہ اور بات تھی کہ جدیدیت اپنے آپ میں خود ایک معمہ تھی۔ جسے حل کرنے کے لئے دانتوں تلے پسینہ آجایا کرتا تھا۔ اور یہی وہ خاص اوایا خاص صفت تھی کہ جس کی وجہ سے یکایک نئی نسل چونک پڑی تھی۔ ویسے جدیدیت اپنے لب و لہجہ میں ایک نئی سوچ، گہری فکر، اور علامت استعارہ بھی رکھتی تھی۔ لیکن جدیدیت کا جدید نظریہ بھی کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ بہت جلد قلمکار اس سے بھی بیزار نظر آنے لگے۔ دراصل جدیدیت کا تعلق دل سے کم اور دماغ سے زیادہ تھا۔ اس لئے اس دماغی بخار سے نجات حاصل کرنے کے لئے لوگ راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ جس سے اس نظریئے پر بہت ہی برا اثر پڑا۔ اس نازک موقع کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک سوچے اور سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت جدیدیت کی اصطلاح سے انحراف کرتے ہوئے اس کے مقابلے میں ایک نیا نظریہ "مابعد جدیدیت" کا اعلان کر دیا۔ جس پر کافی لے۔ دے ہونا شروع ہو گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ متعدد قلمکاروں نے باقاعدہ "مابعد جدیدیت" کے خلاف ادبی جنگ چھیڑ دی۔ جن میں وزیر آغا۔ وارث علوی۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ فضیل جعفری، سلیم شہزاد، ابراہیم اشک، ابرار مجیب، بدر عالم خلش، جمال اویسی اور کئی ایک نئے نقادوں اور قلم کاروں نے مابعد جدیدیت سے بحث کرتے ہوئے ایک نئی اصطلاح کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ بعضوں نے تو اپنی پسند اور اپنے استعداد کے مطابق نئی اصطلاح پیش کرنے کے بعد اس پر اصرار بھی کیا کہ انہیں کی منتخبہ اصطلاح نئے ادبی مزاج کے مطابق ہے۔ لہٰذا اسے ہی شرفِ قبولیت کا درجہ دیا جائے۔ مابعد جدیدیت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصطلاح جدیدیت ہی سے مستعار ہے۔ جب کہ اصولاً اگر کسی چیز سے انحراف کیا جاتا ہے تو اس کے کسی بھی جز سے استفادہ کرنا غلط ہوتا ہے۔ جس طرح ترقی پسندی کی پیداوار جدیدیت تھی بالکل اسی طرح جدیدیت کی پیداوار مابعد جدیدیت بھی ہے۔ مابعد جدیدیت مطلع اردو ادب پر ایک ایسے نظریئے کے بطور ابھر رہی ہے کہ جو شعوری ہوتے ہوئے بھی لاشعوری، مبہم اور ایک نا سمجھ میں آنے والا نظریہ ہے۔ ایک ایسا نظریہ کہ جسے اگر لایعنی سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ مابعد جدیدیت کے تعلق سے اب تک جو نظریات و تاثرات کھل کر سامنے آئے ہیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریئے کا معمہ ہنوز حل طلب ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مستعار نظریئے پر غیر ملکی ہونے کا بھی الزام ہے۔ اس لئے اس کی انفرادیت بھی خطرے میں ہے مابعد جدیدیت سیاسی، سماجی اور ذہنی صورتِ حال ہے اس لئے اسے خالص فکری یا ادبی نظریہ کہنا سراسر غلط ہے۔

ویسے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جدیدیت کا دور تقریباً ختم ہو رہا ہے اور جو چند بچے کھچے جدیدیئے رہ گئے ہیں وہ بھی رختِ سفر باندھے نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ نئی نسل کے لئے کسی نئی اصطلاح کا انتخاب کیا جائے۔ تاکہ ۲۱ رویں صدی کا استقبال اسی نئی اصطلاح کے ساتھ کیا جائے۔ ماضی کے دریچوں سے اگر جھانک کر دیکھا جائے تو متعدد ادوار ایسے ملیں گے کہ جن میں انقلابات آئے ہیں اور موجودہ شعری و ادبی رجحان کے مطابق نئے نظریے نے جنم لیا ہے۔ بالکل اسی طرح موجودہ نسل کو بھی نئی اصطلاح سے متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدیدیت کے بعد کیا واقعی کوئی رجحان کھل کر سامنے آیا ہے؟ کہ جسے نئی اصطلاح کا نام دیا جائے یا نیا نظریہ تسلیم کیا جائے؟ پھر بھی یہ تاثر قائم کرنا پڑتا ہے کہ ہنوز ایسا کوئی رجحان یا نظریہ ظہور پزیر ہوا ہی نہیں ہے کہ جسے کوئی ادبی نام دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود بھی چند ذمہ دار و چند غیر ذمہ دار حضرات محض اپنے مبلغ علم اور اپنا اصلاحی گھوڑا آگے دوڑانے کے چکر میں ایک نامعلوم نظریئے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بعند بھی ہیں کہ انہی کی پیش کردہ اصطلاح کو قبول کیا جائے۔ اب تک تو یہی سننے میں آتا تھا کہ منزل کی جستجو کیلئے راستے کا صحیح تعین ہی منزل آشنا کرتا ہے لیکن یہ نا سنا تھا کہ ایسی بھی کوئی منزل ہوتی ہے کہ جس کا راستے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس جدید ترقی یافتہ اور جدید ٹکنالوجی کے دور میں جہاں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو جائے۔

لہٰذا اسی سلسلے میں مختلف مقامات اور متعدد اخبار و رسائل کے ذریعے جو متضاد رجحانات سامنے آ رہے ہیں انہی کا احاطہ کرتے ہوئے چند ناقدین کے مختصر مختصر اقتباسات حاضر خدمت ہیں ... جن ... کے مطابق ... کے بعد آنے ... خود ... فیصلہ کریں کہ کس فنکار کی منتخب کی ہوئی اصطلاح نئی نسل کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اردو ادب

کے نامور محقق و نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ادب کے بدلتے منظرے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی ایک تصنیف "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ"۔ میں نئی نسل کو تجدیدیت کی راہ پر گامزن کرنے کیلئے ایک نئی اصطلاح "مابعد جدیدیت" سے قارئین اردو کو متعارف کروانا چاہا ہے اور جدوجہد بھی کی ہے کہ موجودہ شعری و ادبی رجحان کو مابعد جدیدیت" ہی کے نام سے منسوب کیا جائے۔ مابعد جدیدیت کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ارشاد فرمایا کہ۔

> "ما بعد جدیدیت کسی ایک نظریئے کا نام نہیں ہے بلکہ کئی نظریوں کا نام ہے اور ان سب کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی معانی پر بیٹھائے ہوئے پہرے یعنی اندرونی اوربیرونی دی ہوئی لیک کو رد کرنا ہے اور جدیدیت کے بعد کا دور "ما بعد جدیدیت " کہلائے گا لیکن اس میں جدیدیت سے انحراف بھی شامل ہے جوادبی بھی ہے اور آئیڈیالوجیکل بھی تاہم مابعد جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھنا قدرِ مشکل اسی لئے ہے کہ ہمارے ذہن ابھی تک ترقی پسندیت اور جدیدیت کی آسان تعریفوں کے عادی ، مابعد جدیدیت ایک کھلا ڈھلا ذہنی رویہ ہے دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت تکثیریت کا فلسفہ ہے رہی بات مابعد جدیدیت کی تھیوری کا تو میں عرض کروں گا کہ یہ خاص پیچیدہ ہے۔ ما بعد جدیدیت کے بہت سے ایشو اس طرح سے کامن سنس میں نہیں آتے جس طرح ترقی پسندیت یا جدیدیت کے ایشو کو ہم عام آدمی کو سمجھاسکتے ہیں"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مذکورہ ریمارکس اور اسی طرح دوسرے ریمارکس پر شدید بحث چھڑ گئی۔ متعدد فنکار اثبات و نفی میں باقاعدہ اختلافی جنگ پر آمادہ ہو گئے اس طرح مابعد جدیدیت چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گئی ہے۔ لہٰذا چند شعرا و ادبا کے نظریات و تاثرات مابعد جدیدیت کے تعلق سے پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔
مشہور جدید ناقد جناب شمس الرحمان فاروقی نے مابعد جدیدیت کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مابعد جدیدیت کوئی ادبی نظریہ نہیں ہے، بلکہ فکری صورتِ حال ہے ایسا نہیں کہ جدیدیت کے بعد کوئی نظریہ سامنے آیا ہو جسے ہم مابعد جدیدیت کا نام دیں"۔
نامور ناقد جناب وارث علوی فرماتے ہیں کہ "مابعد جدیدیت کی اصطلاح موزوں نہیں ہے جہاں تک ادبی نظریئے کا سوال ہے تو نئی نسل کے پاس اپنا ایک ادبی نظریہ ضرور ہے جو جدیدیت سے مختلف رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہے" مابعد جدیدیت کی شدید مخالفت کرتے ہوئے جناب فضیل جعفری نے کچھ اور ہی عقدہ کھولا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "مابعد جدیدیت تاریخ کی مخالف ہے اس لئے وہ قوم پرستی کی بھی دشمن ہے مابعد جدیدیت کے نزدیک قوم پرستی ایک ایسی لعنت ہے جو دنیا کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کردے گی"۔
تخلیقی فنکار کی بحالی کے حوالے سے مظہر امام صاحب نے اپنے زریں خیال کا مظاہرہ اثبات میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔ "اگر نئی نسل کو اپنی شناخت کے لئے واقعی کسی لیبل کی ضرورت ہو تو مابعد جدیدیت کا لیبل زیادہ مانوس معلوم ہوتا ہے مابعد جدیدیت کا تصور اور اس کے فلسفیانہ اساس پر گفتگو ہوتی رہنی چاہئے۔ کیونکہ جدیدیت کے پاس تو اپنے نقاد اور اپنے مبلغ تھے، ایک بڑا آرگن تھا۔ اور جدید تر نسل کے پاس اپنے نقاد نہیں ہیں۔ نئی نسل کے مسائل پر گفتگو کرنے والے شعراء اور ناقدین کنفر پن کے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔
"ہم عصر اردو ادب نمبر شاعر" میں جناب افتخار امام صدیقی نے فرمایا کہ "ترقی پسندی، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی اصطلاح میں قید ہونے کے بجائے پہلے سے موجودہ فلسفوں اور نئے فلسفوں کو دیکھا اور سمجھا جائے نئی نسل کو پھر فکر و فلسفہ کے نام پر نئی اصطلاحوں اور مغالطوں میں الجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ترقی پسند اب بھی خواب دیکھ رہے ہیں اور جدیدیوں کو اب بھی اصرار ہے کہ جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ جدیدیت کے زیر اثر ہے اور یہ کہ مابعد جدیدیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟"
اردو چینل کے وسیلے سے جناب عبدالنبی عزیزی نے مابعد جدیدیت سے اپنی بے زاری کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے جھگڑے نے آج اردو زبان و ادب کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا تو اردو دشمنوں نے بھی نہیں پہنچایا۔ مہمل گوئی کئی حد تک الہام گوئی کی وکالت کی وجہ سے قاری ادب سے دور ہوتا چلا گیا اور اس نے ڈائجسٹوں میں جا کر پناہ لی اور اب مابعد جدیدیت سے تو ایسا لگتا ہے کہ بقیہ قارئین کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ عبدالمتین جامی نے کہا ہے کہ "میں نہ تو مابعد جدیدیت" کا قائل ہوں اور نہ ہی "بعد الماجو العبد" کا بلکہ میں تو اول سے ہی یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ مابعد جدیدیت دراصل جدیدیت کی ترقی یافتہ شکل ہے بلکہ یوں کہئے کہ تجزیاتی دور کی جدیدیت فی زمانہ اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے۔"
"شاعر" کے حوالے سے جناب حبیب حق فرماتے ہیں۔ "مابعد جدیدیت کے متعلق میری رائے بہت زیادہ اچھی نہیں ہے کہ کیونکہ شکست و ریخت اور ناحقیقیت پسندی یعنی خارج کے وجود سے انکار مجھے پسند نہیں ہے"۔ ماہنامہ شاعر میں ہی عشرت شاہین عرض کرتی ہیں کہ۔ "مابعد جدیدیت نے انسانی تہذیب کو آج ایسے مقام پر لا پٹکا ہے کہ جہاں جرائم کی بھی اپنی ایک معیشت بن گئی ہے۔ مابعد جدیدیت کلچر نے ان جرائم کو بہت حد تک استناد عطاء کیا ہے"۔ محترمہ اطہر سلطانہ فہیم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "ساتویں دہائی میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح عام ہوئی ہے۔ نئے قلم کار تکنالوجی اور ساتھ ساتھ ماحولیات کی جانب توجہ دینے لگے اور اس کے علاوہ مابعد جدیدیت میں اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا کہ ادب اور آرٹ کا منصب علم میں اضافہ کرنا"۔ معروف نقاد جناب سلیم شہزاد بھی مابعد جدیدیت سے اختلاف کرتے ہوئے گویا ہوئے ہیں کہ "مابعد جدیدیت کے پس پشت یورپی اور امریکی نظریات روبعمل ہیں اور خود ان کے خطہ ہائے زمین پر بھی اس کی اصطلاح کے معنی متعین نہیں اور ویسے بھی مابعد جدیدیت تعریف وضع کرنے کے خلاف ہے۔ مابعد جدیدیت سے شدید انحراف کرتے ہوئے جناب ابراہیم اشک نے تو باقاعدہ ایک اصطلاحی مہم چھیڑ رکھی

بقیہ صفحہ ۴۲ پر دیکھئے



نشتر خانقاھی

(۱)

، کو جائیں یہ بے خانماں مکین بتا
سِ پا کو ترستی ہو، وہ زمین بتا

ہیں مگر بدلے ہوئے سے چہرے ہیں
چلے گئے کل کے فلک نشین بتا؟

ہے، شہر ہے یہ سخت گیر لوگوں کا
تو نام ہی اپنا بتا ، نہ دین بتا

ہے لہو، یہ سمجھنے والوں کو
جذب بھی کرتی ہے آستین بتا

ں کے لئے ہیں عذاب جتنے ہیں
جس کو میسر ہو وہ ذہین بتا

عمر مشینوں میں کاٹنی ہے مجھے
پنے آپ کو انساں نہیں مشین بتا

، تو عام سی عورت، قبول صورت سی
اچاہے جو اس کو ، بہت حسین بتا

(۲)

دلدلی تال ہمارے ہیں، کنول اور کے ہیں
ہم نے وہ پیڑ اگائے ہیں کہ پھل اور کے ہیں

کیا یہاں میرا ہے، کیا میرا نہیں ہے، مت پوچھ
ذہن میرا ہے مگر اس میں خلل اور کے ہیں

آج سے پہلے جو آتے تھے، وہ کل میرے تھے
آج کے بعد جو آئیں گے وہ کل اور کے ہیں

دکھ بھری نیند کے عالم میں یہ شاہی سپنے
تم کہاں آگئے دیکھو، یہ محل اور کے ہیں

سانس لینے کا گنہگار ہوں، میں بھی، تم بھی
ورنہ یہ اور کے لمحے ہیں، یہ پل اور کے ہیں

کوئی مالک ہے زمینوں کا تو فصلوں کا کوئی
نام میرا ہے، مگر کھیت میں ہل اور کے ہیں

کہہ کے یہ چھوڑ گیا کون قلندر مجھ کو
جسم و جاں تیری مگر فکر و عمل اور کے ہیں

●373- CHAMANDA ROAD, JATAN, BIJNOR-246701- (U.P)



غوث محمد غوثی

عرضِ ہنر میں ذرا بھی حسن اگر ہے
حق میں ہمارے یہ ذرہ لعل و گہر ہے
قدر کرو، اس چراغِ آخرِ شب کی
فیض رساں وہ اگرچہ کم ہے مگر، ہے
جوششِ دیدار ،صبر و ضبط کہاں تک؟
کب سے یہ گہرا ، نقابِ دورِ سحر ہے
رشکِ ارم ہے بہارِ کوچۂ محبوب
سلسلۂ رنگ، تاحدودِ نظر ہے
اب بھی یقیں ہے، انہیں کے قول و قسم پر
آگ میں کیا جل بجھا یہ تم کو خبر ہے
حق کے لئے، کار زارِ فکر و عمل میں
وہ، تنِ تنہا یہاں بھی سینہ سپر ہے
کچھ تو کھلے، پھول کیوں ہیں رنگ پریدہ؟
گوشۂ رنگینیٔ بہار کدھر ہے
گرم ہے رُت زندگی کی، ملیے اُسی سے
ایک طرح سے وہ سایہ دار شجر ہے
غور کرے بھی تو کیسے، اپنی کمی پر
وہ تو انا کے نشے میں ،خاک بسر ہے
اپنی یہ خو ہے برائے حفظِ محبت
اپنے لئے ہی دماغ نقد و نظر ہے
اہلِ ہمم کا مقولہ کیوں ہو یہ غوثی
فیصلہ دل مقدرات ہی پہ ہے

●SARAI REHMAN
ALIGARH- 202001 (U.P)



جتیندر بلو

6-CORFTON LODGE
CORFTONROAD,EALING.LONDON-W52.HU(U.K)

اعتراف

میں صبح کالج جایا کرتا تھا۔ بعد دوپہر، لائبریری کی کتابوں میں گھرا رہتا تھا۔ شام کو اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان پہ، رات دیر تک کہانیاں اور مضامین لکھا کرتا تھا۔ میری تخلیقات پسند کی گئی تھیں اور میں دنوں میں مشہور بھی ہو گیا تھا۔ مگر تحریروں کی قلیل آمدنی سے گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ غربت کا تعلق، میرے ساتھ بچپن سے رہا تھا،اس حد تک کہ میں نے پیٹ بھر کر کبھی من پسند کھانا نہیں کھایا تھااور نہ ہی کبھی قیمتی لباس پہنا تھا۔ میں نادار لوگوں کے حالات، مسائل، مجبوریاں اور محرومیوں سے واقف تھا۔ مجھے احساس تھا کہ غربت، دیمک بن کر آدمی کو چاٹ جاتی ہے، وہ کینسر سے زیادہ مہلک ہے اور آدمی کی نصف عمر بھی ہڑپ کر لیتی ہے۔ لیکن میں نے غربت کی زنجیریں اتار پھینکنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں کسی باعزت علاقے میں جگہ خرید کر اپنا گھر بساؤں اور شادی کے بعد اپنی اولاد کو انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلاؤں۔

ذہن بالکل خالی ہے۔ کوئی جذبہ، خیال، احساس یا نیا تجربہ میرے اندر موجود نہیں ہے، جسے میں الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنا اندرونی خلفشار دور کر پاؤں۔ لیکن دل ہے کہ وہ کوئی ناول، مضمون یا کہانی لکھنے کو بے چین رہتا ہے۔ دراصل چند اسباب نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اوّل تو یہ کہ ایک طویل عرصے سے میں نے کچھ لکھا نہیں۔ دوئم میری انگلیاں لکھنے لکھانے کو ترپتی ہیں اور سوئم رسائل اور اخبارات سے غیر حاضر رہنے پر قارئین کے نزدیک میری ادبی موت واقع ہو چکی ہو گی۔ اس کیفیت سے دوچار ہونے پر میں زبردستی قلم اٹھا کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن تخلیق تو تخلیقی عمل کے بعد ہی وجود میں آیا کرتی ہے کہ وہ لاشعوری فعل قرار دی گئی ہے۔ اور میں پھر بھی باز نہیں آتا، قلم گھسیٹتے چلا جاتا ہوں۔ لیکن چند جملے ہی لکھ پاتا ہوں کہ 'وہ شام' "وہ کمرہ" 'وہ حادثہ' اور وہ مخصوص کردار میرے سامنے ابھر آتے ہیں۔ جنہوں نے میری روح کو یوں گرفتار کر رکھا ہے کہ قلم اپنے آپ ہی میری انگلیوں سے پھسل جاتا ہے اور میں سر تھام کر رہ جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ احساس جرم اتنا گہرا کیوں ہوتا ہے؟ وقت کے گزرنے پر بھی وہ اپنی شدت نہیں کھوتا، بلکہ زنجیر بنا پاؤں میں پڑا رہتا ہے۔

صبح، ڈاک سے ایک سرکاری پرچے کے مدیر کا خط آیا ہے۔ اسے پڑھ کر میں پھڑک اُٹھا ہوں کہ اس کا متن ہی کچھ ایسا ہے۔ چند رسمی جملوں کے بعد وہ رقم طراز ہے۔

"وقت آگیا ہے کہ الیکٹران میڈیا، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ای میل اور ویب سائیٹ کے آنے پر ہم اپنی زبان کا صدیوں پرانا ادبی ورثہ یکجا کر کے اُسے دستاویزی صورت میں محفوظ کر لیں۔ ورنہ تیزی سے بدلتے ہوئے دنیاوی رجحانات کے ساتھ ہمارا ادب، ثقافت، تاریخ اور ورثہ گل ہو کر رہ جائے گا۔ آنے والی نسلیں بھی ان سے محروم رہیں گی۔

ادارہ چونکہ نثر کی ادبی تاریخ مرتب کر رہا ہے، وہ آپ کی دو شہرہ آفاق کہانیاں "جزیرہ اور مونگرل" کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ادارہ آپ کی ادبی خدمات کو سراہتا، آپ کی غیر مطبوعہ تخلیق کے عوض پانچ ہزار روپوں کا معاوضہ مقرر کر چکا ہے۔ ہمیں آپ کی تازہ کہانی کے ساتھ، آپ کے سوانحی حالات، ادبی معرکے، ذاتی دلچسپیاں اور مشاغل کا تحریری صورت میں انتظار رہے گا..... مایوس نہ کریں کہ آپ ایک لمبے عرصے سے خاموش ہیں اور ہم فکر مند ہیں۔"

آخری سطریں پڑھ کر میری انگلیاں اپنے آپ اوپر نیچے ہونے لگیں۔ جانے یہ خط کا اثر تھا یا میرے دماغ کا۔ بائیں ہاتھ نے لپک کر، پلنگ سے جڑی ہوئی میز سے قلم اٹھا لیا۔ وہاں کورے کاغذات، رائٹنگ بورڈ، پین پنسل اور لغت ہمیشہ سے دھرے رہتے تھے۔ میری بیوی نے گھر کے ہر کمرے میں یہ لوازمات رکھ چھوڑے تھے کہ جانے کس پل سرسوتی ماں مجھ پر مہربان ہو جائے۔ اس کا اٹل وشواس تھا کہ میرا دماغ، جذبات اور قلم ہم آہنگ ہو کر عہد رفتہ کی طرح چلنے لگیں گے۔ اچانک شششی بالا چائے کا پیالہ تھامے داخل ہوئی۔ میں نے پیالہ لے کر خط اس کے حوالے کر دیا۔ جوں جوں وہ اسے پڑھتی گئی، اس کا چہرہ روشن ہوتا چلا گیا اور جب وہ اس مقام پر پہنچی، جہاں رقم درج تھی تو وہ یک بار گی مجھے دس برس پہلے والی محبوبہ دکھائی دی۔ وہ میرے فن کی دیوانی تھی، امیر گھرانے کی بیٹی تھی۔ لیکن اس نے میری خاطر اپنے جیون کے تمام سکھ تج دیے تھے۔ خط ختم کرنے پر وہ چھوٹتے ہی بولی: "کہہ کہہ کر تھک چکی ہوں۔ ایسا لکھو ایسا

لکھو، دنیا دیکھتی رہ جائے۔ مگر تم کہتے ہو، ادب مر چکا ہے۔ نقاد بے اصول بے ضمیر ہو چکے ہیں۔"

"ششی بالا جو تم نے کہا ٹھیک کہا۔" چائے گرم تھی۔ ہلکے ہلکے گھونٹ بھر کر میں بولا: "آج ادب میں الٹے سیدھے لوگ چلے آئے ہیں۔ میری مراد اُن ادیبوں سے ہے، جو میڈیا کے ذریعے، شاہی نوکروں کے اثر و رسوخ سے یا ذاتی امیری کبیری کے بل پہ انعام یافتہ بن جاتے ہیں۔ پھر وہ دیش کے دانشور بھی کہلائے جاتے ہیں۔"

لیکن میرے کہے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بولی "تم بات کو الجھاتے ہو..... میں تو یہ جانوں کہ انگلینڈ سے لوٹتے ہوئے تمھیں ڈھائی برس ہونے کو آئے۔ مگر تم ایک لفظ بھی نہ لکھ پائے؟ کیوں نہیں لکھ پائے؟ جواب تمہارے پاس ہے..... میرے پوچھنے پر تم ہمیشہ کنی کاٹتے رہے؟ .... اور تھک گئی پوچھتے پوچھتے۔"

میں گھونٹ بھرتا، مشرقی عورت کی وابستگی پر غور کرتا رہا۔

"اب بھگوان کے واسطے خاموشی کو توڑ ڈالو۔ لکشمی ماں ہمارے گھر آنے کو تیار کھڑی ہے۔" اس نے خط میری جھولی میں ڈال دیا۔ "کتنا سمان دیا ہے اکادمی والوں نے تمہیں.... پر تم ہو کہ قلم سے ناطہ توڑے بیٹھے ہو..... میری نوکری نہ ہوتی تو ہم سڑک پر ہوتے اور بچے تمہارا منہ دیکھا کرتے؟" رسوئی چار ہاتھ پہ تھی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھ گئی۔ میں بے ساختہ پکار اٹھا۔ "ششی بالا تم ناراض ہو؟ تم سدا گلا کرتی رہیں، میں قلم کیوں نہیں اٹھاتا؟ مگر تم کیا جانو میں کن حالات سے گزرا ہوں؟"

"وہ کیا ہیں؟ کبھی بتایا تو ہوتا؟" اس نے رسوئی سے اونچی آواز میں کہا: "میں نے جب بھی جاننا چاہا، تم گردن جھکائے خود میں کھو گئے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ آواز گھر کے ہر کونے میں گونج اٹھی۔

چائے اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھی۔ جس ڈھنگ سے اس نے دروازہ بند کیا تھا، لگتا تھا کہ میری زندگی کا دروازہ بند ہوتا جارہا ہے۔ سائیکارٹسٹ کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ میرے ضمیر پر جو بوجھ ہے، اس سے نجات پانے میں ہی میری سلامتی ہے۔ ورنہ ہر شام، سورج ڈوبنے پر بوجھ بڑھتا جائے گا اور انجام کار میں لاعلاج ٹھہرایا جاؤں گا۔ لیکن اس کرۂ ارض پر میں واحد شخص تھا، جسے علم تھا کہ اصلی گڑبڑ کہاں ہوئی ہے؟ اور اس سے نجات پانے کا طریقہ بھی کیا ہے؟ لیکن اس پر عمل کرنا میری بربادی کا پیش خیمہ تھا، جو مجھے منظور نہ تھا۔ لیکن اب یقیناً برف کا منجمد تودا توڑنے کا وقت آن پہونچا تھا۔ مزید جھلانا یا حالات سے بھاگنا ممکن نہیں رہا تھا کہ وقت کا پہیہ اپنے حساب سے گھومتا ہے۔ وہ روکے نہیں رُکتا۔ بہتوں کو بناتا ہے، بہتوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ لیکن لوگ باگ اسی خیال میں رہتے ہیں کہ ان کا وقت ٹھیک نہیں چل رہا، ستارے ساتھ نہیں دے رہے اور یہ سب تقدیر کا لکھا ہے۔ لیکن میں ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ میرا اندھ وشواس تھا کہ زندگی اتفاقات اور حادثات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ آدمی اپنی محنت شاقہ، صحیح سوچ اور ان تھک سرگرمیوں سے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ تقدیر نام کی کوئی شے نہیں۔ اس فلسفے کو بنیاد مان کر میں نے ایک مضمون لکھا، جسے لندن یونیورسٹی کے لینگوج ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر آرتھر ایلس جارڈن نے پڑھا تو دنگ رہ گیا۔ مضمون کے نکات، باریکیوں اور نظریات نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ پھر اسے جب علم ہوا کہ میں قومی زبان کے علاوہ چند علاقائی زبانوں پر بھی دسترس رکھتا ہوں تو وہ خطوں اور فون کے ذریعے مجھ تک پہنچنے لگا۔ وہ بذات خود یورپین زبانوں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ بھارت میں اپنے قیام کے دوران، مشرقی زبانوں پر کچھ کام بھی کر چکا تھا۔ پھر اس نے یورپین اور انڈو ایرئن زبانوں کا ایک تقابلی پروجیکٹ تیار کیا۔ ملتے جلتے الفاظ مثلاً بہتر BETTER ودھوا اور WIDOW وغیرہ وغیرہ، کی جڑیں کہاں ملتی ہیں؟ انہوں نے کن حالات میں مختلف براعظموں میں سفر کیا؟ اور وہ وہاں کی مروجہ زبانوں میں کیوں کر ضم ہو گئے؟ میں چونکہ تاریخی شعور بھی رکھتا تھا، اس لئے پروفیسر نے وہ پروجیکٹ خوشی خوشی مجھے سونپ دیا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیا کہ پردیس کا لالچ اور پیسوں کی بہتات پیش نظر تھی۔

لندن یونیورسٹی کا ایک ہوسٹل جو رسل اسکوئر کے قریب واقع تھا، مجھے وہاں ٹھہرا لیا گیا تھا۔ میں ہر صبح انڈین آفس لائبریری میں، ہندوستانی زبانوں کے مخطوطے دیکھا کرتا۔ فارغ ہونے پر پروفیسر کے دفتر میں چلا آتا۔۔ وہ شخص گیان کا بھنڈار تھا۔ اس سے مغربی تہذیب اور جدید طرز زندگی پر تبادلہ خیال کر کے، میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا۔ لیکن مجھے واجب عزت دیا کرتا تھا۔ کئی بار اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ اس کی بیوی کی عمر اس سے نصف تھی۔ مجھ سے مل کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ لیکن میاں بیوی کے درمیان کوئی بھی شے مشترک نہ تھی۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس کی بیوی نے پروفیسر کے مرتبے اور اس کی ذہانت ہی سے شادی کی ہو گی۔ عمروں کا فرق تو واضح تھا ہی، ذہنی طور پر بھی اُن میں کوئی ٹھوس ہم آہنگی نہ تھی۔ اولاد کا خانہ بھی خالی تھا۔ بعد ازاں اس کے ایک چہیتے شاگرد نے بتایا کہ پروفیسر کے آگے پیچھے اس کی بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جو اس کی جائیداد، کتابوں کی رائلٹی اور اس کی پنشن کو کیش کر پائے۔

ایک ڈھلتی دوپہر کو میں اپنے پروجیکٹ پہ کام کر کے اور اسے قدرے آگے بڑھا کر، پروفیسر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ خاصا بے چین نظر آیا۔ ہاتھ پاؤں اور چہرہ اس کے ساتھ نہ تھے۔ لگا وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ جلد نارمل ہو گیا۔ سگار سلگا کر اور اپنی دودھیا داڑھی کو کھجا کر بولا: "میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دماغ میں وہ طاقت نہیں رہی جو کبھی اس کا جوہر تھی..... اگلے برس ریٹائر بھی ہونا

ہے۔ دو برس کی ایکسٹینشن پہلے ہی لے چکا ہوں۔"

"مگر پروفیسر تمہاری کتابوں سے اور تمہاری موجودہ سوچ میں تو کوئی فرق نہیں ہے؟"

"تم میری بہت سی کتابیں پڑھ چکے ہو۔" پھر گہرا کش لے کر بولا: "لیکن ان سے ہٹ کر میں نے کچھ لکھا ہے۔ وہ نہ تو فکشن ہے، نہ تنقید اور نہ ہی تاریخ۔ ہر لفظ میرے اندر سے نکلا ہے۔ تم پڑھ کر بتاؤ کہ اس کی اشاعت پر ادب میں میرا مقام کیا ہو گا؟"

میز کی دراز کھول کر، اس نے ڈائریوں کا ایک بنڈل نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔

"یہ میری زندگی کا کل سرمایہ ہے اور مجھے اس پر ناز بھی ہے۔ جس جس ڈائری پہ لال نشان لگے ہیں، وہ تمہارے ملک کے متعلق ہے۔ ڈائریوں کو پڑھ کر اپنی فرینک رائے دو۔ پلیز۔"

اس کے دفتر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ مشہور تھا کہ اس نے جب سے دفتر سنبھالا ہے، دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ بلکہ اس کی چابی دریائے ٹیمز کی نذر کر دی تھی۔ حالانکہ کمرے میں اس کی نادر کتابیں شیلفوں میں دھری رہتی تھیں۔ ذاتی ڈائریاں بھی میز کی دراز میں رکھی رہتی تھیں، جن پر تالہ ڈالنا وہ اخلاقی جرم سمجھتا تھا۔ فرصت میں کوئی بھی ڈائری نکال کر پڑھتا رہتا تھا۔ جملوں کی رد و بدل اتنی ہنر مندی سے کرتا تھا کہ پڑھنے والے کو کوئی الجھن نہ ہو۔

اس کی ڈائریاں انوکھے حادثات، تجربات اور مشاہدات سے بھری پڑی تھیں۔ گھریلو زندگی کے حالات بھی بڑی گہرائی سے بیان کئے گئے تھے۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے گھر کا بچہ تھا۔ بچپن میں اپنے سوتیلے باپ کی ہوسناکی کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک دن گھر سے بھاگ کھڑا ہوا ملازمت کے دوران وہ ایک عمر رسیدہ ناولسٹ کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نیک عورت نے ہونہار بچے کو تعلیم دلوا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ لب کھولتے ہی اسے کامیابی نصیب ہو۔ پھر وہ اچانک چل بسی۔ لیکن تب تک آرتھر شعور سنبھال چکا تھا۔ وہ اپنی سگی ماں کے جنازے میں شامل نہیں ہوا تھا۔ لیکن ناولسٹ کے جنازے میں، قبر تیار ہونے تک ساتھ رہا تھا۔

پھر چند دنوں بعد میں نے سرخ نشان لگی ڈائریاں پڑھنی شروع کیں۔ پہلی ڈائری پڑھی تو آکاش سر سے غائب ہو گیا۔ دوسری پڑھی تو دھرتی پیروں تلے سے کھسک گئی۔ میں حیران تھا کہ اس نے میرے دیش کے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کو مختصر سے عرصے میں کتنی ہوشمندی سے سمجھا ہے۔ غریب غربا استحصال زدہ لوگ، لیڈران کا انہیں گمراہ کرنا۔ یہ تو روزمرہ کی عام سی باتیں تھیں۔ مگر جب اس نے متوسط اور امیر طبقے کی مذہبی سازشیں، ان کی بالادستی 'ریاکاری' دوہرے معیار اور ان کا بھارتیہ ہونے سے زیادہ یورپین ہونا بیان کیا تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ادب سے سیاست تک جو اخلاقی گراوٹ اس نے دیکھی تھی، وہ اس کی آنکھ، سوچ اور قلم سے نہ بچ پائی تھی۔ ہر تحریر کردہ واقعہ میری حیرت میں اضافہ کئے جا رہا تھا۔ کس طرح آزاد ہندوستانی لوگ، سفید چمڑی کے باشندوں کو خدا کا درجہ دیا کرتے تھے۔ بعض امیر زادیاں تو پروفیسر کے ساتھ اکیلے میں ڈنر کرنا پسند کرتی تھیں۔ میں جوں جوں پڑھتا گیا، ایک ہی بات میرے دل و دماغ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ کاش یہ سبھی تجربات میرے ہوتے، میں ان حالات سے گزرا ہوتا! میں نے انہیں محسوس کیا ہوتا! میں نے انہیں لکھا ہوتا؟ پھر بلاشبہ میں عظیم سوانح نگار تسلیم کیا جاتا۔

پروفیسر خوش تھا کہ میں نے سبھی ڈائریاں دھیان سے پڑھی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈائریوں کا مواد اس قدر نرالا، حیرت انگیز اور ڈرامائی ہے کہ کتاب کے چھپنے پر، اسے جیون بھر کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کامیابی، شہرت اور دولت اس کے قدم چومے گی۔

پروفیسر حسین طلباء کی سنگت میں بہت خوش رہتا تھا۔ بعض چہیتوں کے واسطے تو اس کی جیبیں ہر دم کھلی رہتی تھیں۔ وہ ان کی بے جا ناراضگی بھی برداشت کر لیتا تھا۔ اس کی بیوی، شوہر کی کمزوری سے واقف تھی۔ مگر مجبور تھی۔ لڑکے اس کے دفتر میں آ کر، بنا پوچھے کوئی بھی کتاب اٹھا کر چل دیتے تھے۔ ایک بار میں نے پروفیسر سے کہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم اپنی کئی انمول کتابوں سے ہاتھ دھو چکے ہو گے؟"

اس کا جواب بڑا انوکھا تھا۔

میں لوگوں کو الگ نظر سے دیکھتا ہوں۔ بہت سے اسٹوڈنٹ میری کتابیں لے جاتے ہیں۔ بہت سے مار بھی لیتے ہیں، چند لوٹانا بھی بھول جاتے ہیں۔.... مگر ایک روز کتاب تھامے، گردن جھکائے میرے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں... خود سے بھاگنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ امتحان بڑا کڑا ہوتا ہے۔ آدمی کی جان بھی لے لیتا ہے۔"

میں خاموش، خیال کی گہرائی میں اترنے لگا کہ آواز آئی۔

"دوسروں پہ اعتبار کرنا ضروری ہے۔ ورنہ انسانیت تباہ ہو جائے گی۔"

پروجیکٹ مکمل ہو گیا تھا۔ میں گھر لوٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ بچوں کے علاوہ ششی بالا کے واسطے بھی بہت سی چیزیں خریدیں، اس وشواس کے ساتھ کہ چھ سات ماہ کی دوری کا احساس جاتا رہے گا۔

اگلی صبح مجھے جہاز پکڑنا تھا۔ اس شام پروفیسر نے یونیورسٹی کے ایک نیم کشادہ ہال میں، میرے اعزاز میں الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ میں شاپنگ سے بھرے چند تھیلے، پروفیسر کے کمرے میں رکھ کر پارٹی میں شامل ہو گیا۔ مدھم روشنی ہال کے ہر کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر کے منظور نظر لڑکے، لڑکیاں اور پسندیدہ لیکچرار وہاں موجود تھے،

جن کے ساتھ میں مکمل مل چکا تھا۔ پروفیسر نے اپنی تقریر میں میری غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر بڑھا چڑھا کر کیا۔ میں نے بھی پروفیسر کی ذہانت اور اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور طلباء کا بھی۔ پھر صحیح معنوں میں پارٹی شروع ہو گئی۔ کھانا پینا، ناچ گانا، شور شرابہ، مذاق قہقہے لطیفے، غرضیکہ وہ سلسلہ شام دیر تک چلتا رہا۔ کئی اسٹوڈنٹ نے مجھ سے انڈیا میں ملنے کا وعدہ بھی کیا۔ رات گہری ہونے لگی تو میں نے پروفیسر سے اجازت چاہی۔ اس سے بغل گیر ہو کر، کئی طالب علموں سے بھی لپٹا۔ کئی لڑکیوں نے الوداعی بوسے میرے گالوں پہ چھوڑے۔ میں بھاری دل، اُداس نظروں اور ان کی محبت کو ساتھ لئے پروفیسر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ داخل ہو کر اپنا سامان اٹھایا۔ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں حیران پریشان پیروں کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ من من کے ہو چکے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ تھیلے اپنے آپ میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر الگ ہو گئے۔ اگلا پل ضائع کئے بغیر میں پروفیسر کی میز کی طرف پلٹا۔ دراز کھول کر تمام ڈائریاں چھانٹ ڈالیں۔ سرخ نشان کی ڈائریوں کے علاوہ، چند اہم ڈائریاں بھی نکال لیں۔ انہیں تیزی سے تھیلوں میں ڈالتے ہوئے قیمتی فلیٹ، آرام دہ زندگی، موٹر کار اور بچوں کی اعلیٰ تعلیم ذہن میں گھومنے لگی۔ وہ ڈائریاں مجھے سونے کی اینٹیں لگ رہی تھیں۔ بتی بجھا کر، میں دبے پاؤں باہر چلا آیا۔

اپنے وطن پہونچ کر، اور اپنے گھر کی چوکھٹ کو پار کرتے ہوئے یہ احساس میرے ساتھ تھا کہ لندن میرے واسطے ایل ڈارو ڈو (ELDORADO) ثابت ہوا ہے۔

اب میں اپنی دیرینہ خواہشات کو اپنی مرضی کے تحت ہنستے ہنستے پورا کروں گا۔ اگلے روز ابھی میں نے سفر کا سامان پوری طرح سے کھولا بھی نہ تھا کہ پروفیسر کا فون آیا۔ آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ لہجہ کھویا کھویا سا۔ الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔ "میں.... میں میں.... برباد ہو گیا ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"میری ڈائریاں چوری ہو گئی ہیں؟"

"کب؟ کیسے؟ یہ تو بہت بُرا ہوا؟"

"ہاں۔ میں میں کہیں کا نہیں رہا.... تمہیں کچھ خبر ہو تو بتاؤ؟"

"نہیں تو۔"

"میں تم پر شک بھی تو نہیں کر سکتا.... تم بلند کردار کے مالک ہو۔"

ریسور رکھنا تھا کہ اس کا آخری جملہ میرے دماغ میں سوراخ کر بیٹھا۔ آن کی آن میں ایک بات میرے ذہن میں صاف ہو گئی کہ مجھ میں اور ایک جرائم زدہ شخص میں فرق ہی کیا ہے؟ میں جو آشاوادی، آدرش وادی اور انسان دوستی کا پرچار کرنے والا ادیب ہوں، صحیح معنوں میں کتنا گرا ہوا شخص ہوں۔ میں گھٹنوں میں سر داب کر دیر تک بُت بنا رہا۔

کتابوں میں لکھا ہے، ماہر نفسیات کا بھی کہنا ہے کہ "وقت" ہمدرد معالج کا رول ادا کرتا ہے۔ وہ گہرے سے گہرا گھاؤ بھر ڈالتا ہے اور آدمی کئی حادثوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ظالمانہ تھا۔ مجھے وہ ڈائریاں ششی بالا اور بچوں کی صورتوں میں کھلتی بند ہوتی دکھائی دیتیں۔ ان کے چہرے غائب ہو جاتے اور ڈائریاں چلنے پھرنے لگتیں۔ میں چیخ اٹھا کرتا کہ مجھے اپنے کئے کی سزا اتنی کڑی کیوں مل رہی ہے؟

ایک روز پروفیسر کی بیوی کا خط آیا۔ لکھا تھا۔

"پروفیسر ہسپتال میں ہے۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ کاغذ پر لکھ کر جتاتا ہے کہ چوری کی گئی ڈائریاں تم نے پڑھ رکھی ہیں۔ اس کے تمام حصے تمہارے دماغ میں تازہ ہیں۔ تم پروفیسر کے ساتھ اہم حصوں پر تفصیلی گفتگو بھی کر چکے ہو...... وہ چاہتا ہے کہ عظیم مصنف کو بلایا جائے اور بائیو گرافی کا کنٹریکٹ اسے سونپا جائے۔ وہ تمہیں محنتی، ایماندار اور انسان دوست سمجھتا ہے.... اپنے فیصلے سے آگاہ کرو جلد۔"

میں دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ خیال آیا کہ ایسی کمینی اور غیر اخلاقی حرکت کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی مجھے؟ کیا میں ذہنی طور پر اتنا کنگال ہو چکا ہوں کہ مجھے دوسروں کی محنت اور سرمائے کو اپنانا ہو گا؟ نادم دل نے تجویز کیا کہ فوراً واپس جا کر پروفیسر سے معافی مانگ کر کہو کہ آدمی کا لالچ پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ایماندار سے ایماندار شخص بھی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور میں ایک زندہ مثال تمہارے حضور میں، دست بستہ کھڑا ہوں، جو بھی سزا مقرر کرو گے، مسکرا کر قبول کروں گا۔

میری دن رات کی پریشانی، ششی بالا پر گراں گزر رہی تھی۔ وہ اس خیال میں تھی کہ اگر شوہر اپنی بیوی سے مہینوں دور رہے تو وہ انجانے میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کا بوجھ، ضمیر پر مدتوں رہتا ہے۔ میں نے بھی لندن میں یقیناً کوئی کھیل کھیلا ہے۔ مگر ایک روز میں چیخ اٹھا: "اصلیت یہ نہیں ہے؟"

"تو پھر کیا ہے؟" وہ بھی ترکی بہ ترکی چیخ اٹھی تھی۔

میں اسے کیا جواب دیتا کہ ایک چور تمہارے سامنے کھڑا ہے جس نے ایک شریف بے ضرر شخص کی جیون بھر کی پونجی چرا لی ہے۔ خاموشی متواتر میری ڈھال بنی رہی اور میں اس کا فائدہ اٹھاتا رہا اور وہ کڑوے گھونٹ پیتی رہی۔

میری نیند، میری آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اگر وہ چند گھنٹوں کے لئے مہربان ہو بھی جاتی، تو میں ہر خواب میں پروفیسر آرتھر کو دیکھا کرتا۔ کبھی وہ میرے ساتھ اپنے گھر پہ بیٹھا ہے، کبھی دفتر میں، کبھی پب میں اور کبھی ویسٹ منسٹر برج پر کھڑا ہے۔ میں لگاتار بولے جا رہا ہوں۔ مگر وہ دم بخود، ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک رات کے

پچھلے پہر، میں نے ایسا بھیانک خواب دیکھا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔

"اکادمی کا سیمینار چل رہا ہے۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا ہے۔ میں لندن شہر کے متعلق اپنے تاثرات بیان کر رہا ہوں۔ لوگ دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ اچانک صدر داخلے سے چند سپاہی نمودار ہوتے ہیں، ان کے پیچھے انسپکٹر اور آخر میں پروفیسر آرتھر۔ وہ کمر پہ ہاتھ ٹکا کر دروازے کے وسط میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں پرچہ پڑھنا بھول جاتا ہوں۔ ہال میں سے شور اٹھتا ہے۔ انسپکٹر ہتھکڑی اچھالتا اسٹیج پر چلا آتا ہے۔ لوگ فقرے چست کرتے ہیں۔ ادبی دوست میری عظمت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں ہتھکڑی پہنے، پروفیسر کے قریب سے گزرتے، رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ وہ نرم لہجے میں جواب دیتا ہے۔ "میں نے کہا تھا نا.... خود سے بھاگنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ امتحان بڑا کڑا ہوتا ہے۔ آدمی کی جان بھی لے لیتا ہے۔"

میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ ششی بالا بھی جاگ گئی۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی، شریر کانپ رہا تھا اور چہرہ شرابور تھا۔ اس نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا۔ "کیا ہوا؟ برا سپنا دیکھا ہے؟"

میری زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ میں نے اقرار میں گردن ہلادی۔ اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اور میرا ماتھا چوم کر مجھے بحال کرنا چاہا۔ لیکن میں نے ایک ہی جھٹکے میں خود کو آزاد کر لیا۔

"ششی بالا، میں لندن جانا چاہتا ہوں؟ پروفیسر سے معافی مانگنا چاہتا ہوں؟"

"معافی؟ کس بات کی معافی؟..... کیا قصور کیا ہے تم نے؟"

یہ سننا تھا کہ میرے حواس لوٹ آئے اور میں محتاط ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ جلانا چاہا۔ لیکن میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ سوچا کہ اندھیرے کی آڑ لے کر اپنا جرم قبول کر لوں۔ لیکن خوف میری ریڑھ کی ہڈی تک سمائے بیٹھا تھا کہ ایسا کرنے سے میں اپنی بیوی کی نظر میں کہیں کا نہیں رہوں گا؟ صریحاً بے موت مارا جاؤں گا۔

ایک دوپہر، میں کچھ لکھنے کی شعوری کوشش کر رہا تھا کہ پروفیسر کے ایک چہیتے کا فون آیا۔

"مجھے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ کل رات پروفیسر ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے..... مگر جاتے وقت بھی اس کے خاموش ہونٹوں پہ تمہارا نام تھا۔"

میری پوری دنیا زیروزبر ہو چکی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ دن دن بھر، گھر سے غائب رہنا میرا معمول بن چکا تھا۔ ششی بالا پریشان تھی۔ میری کیفیت یہ تھی کہ شب و روز میرے نزدیک اپنا مزا، نشہ اور ذائقہ کھو بیٹھے تھے۔ اکثر یہ خیال اذیت ناک ثابت ہوتا کہ پروفیسر میری وجہ سے چل بسا ہے اور میں خود کو گنہگار تصور کرتا۔ مگر کبھی کبھار یہ خیال بھی ڈھارس دیتا کہ چلو اب یہ پورا قصہ تمام ہوا، نہ کوئی خط آئے گا، نہ ٹیلی فون اور نہ کوئی مجھے پریشان کرے گا؟ شعلے بجھ چکے ہیں، صرف دھواں رہ گیا ہے، سو وہ بھی جلد فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ اب آگے کی سوچو کہ میں پھر سے آزاد ہو گیا ہوں۔ میں ڈائریوں میں تبدیلیاں اتنی ہنرمندی سے کروں گا کہ سب میرا اپنا لگے۔ سطر بہ سطر، نکتہ بہ نکتہ لفظ بہ لفظ میرا مخصوص اسلوب تو قارئین مان ہی چکے ہیں، جب ڈائریوں میں اپنے رنگ بھروں گا تو ادبی دنیا میں قیامت آجائے گی۔ میری سوانح کی اشاعت پر میڈیا، ناقدین اور قارئین میرا قد آسمان کو چھوتا ہوا پائیں گے۔

اس رات کئی بے خوف راتوں کے بعد میں سکون سے سویا تھا۔ بلکہ سونے سے پہلے ششی بالا کو ٹوٹ کر پیار بھی کیا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھی کہ یہ سب سائکاٹسٹ کے علاج کا نتیجہ ہے اور میں دھیرے دھیرے گرہست کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

ششی بالا کام پہ جا چکی ہے۔ بچے بھی اسکول جا چکے ہیں۔ میں گھر پر اکیلا ہوں۔ مدیر کا خط دنوں سے میز پر رکھا ہے۔ میں نے چھپائی ہوئی ڈائریاں نکالیں، انہیں چوم کر فاتح عالم کی طرح جھوم اٹھا۔ پہلی ڈائری کے نوٹس اپنے حساب سے تیار کئے۔ لیکن جب انہیں سپرد قلم کرنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پروفیسر آرتھر سامنے بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ سر پہ وہی گنتی کے چند بال، چھدری چھدری داڑھی، سرخ دہکتے گال اور آنکھوں سے ٹپکتی ذہانت۔ ہاتھ میں سلگتا سگار۔ میں کانپ اٹھا لہو خشک ہو گیا۔ آنکھیں جھپک کر دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ نہ پروفیسر، نہ اس کی ذات، نہ خاک۔ ذہن کو جھٹک کر، دوبارہ پورے ہوش و گوش کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ مگر چند ہی سطریں لکھ پایا تھا کہ پروفیسر میرے دائیں ہاتھ پہ، گز بھر کے فاصلے پہ بیٹھا کش لیتا دکھائی دیا۔ پھر وہ اٹھ کر کبھی بائیں طرف، کبھی سامنے آن کھڑا ہوتا اور کبھی میری پشت پہ کھڑا آہستہ سے کہتا۔ "میں تم پر شک بھی تو نہیں کر سکتا..... تم بلند کردار کے مالک ہو۔" ان دو جملوں میں جانے کون سا زہر چھپا تھا کہ برسوں تک اس نے مجھے اندر باہر سے چھلنی کیا تھا۔ نہ تو میں کچھ سوچ سکتا تھا، نہ سن سکتا تھا اور نہ ہی کچھ محسوس کر سکتا تھا۔ کانٹا میرے حلق میں اٹکا، مسلسل میری آتما کو چھوتا رہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کب مجھے مکتی ملے گی؟ کب میں ایک شفیق باپ کی طرح، ایک ذمہ دار شوہر کی طرح اور ایک ایماندار ادیب کی طرح باقی زندگی ہنستے کھیلتے، لکھتے پڑھتے گزاروں گا؟ یکبارگی غصّے نے مجھے اپنی زد میں لے لیا اور میں ایک کے بعد دوسری ڈائری اٹھا کر دیوار پر اچھالنے لگا۔ وہ اوندھی سیدھی، کھلی ادھ کھلی، فرش پر پھیل کر میرا منہ چڑانے لگیں۔ میرا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ چاہا کہ ان کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دوں کہ ان ہی کے سبب میں اپنی ذات سے بیگانہ ہوا ہوں۔ لیکن میں ایسا کر نہ پایا۔ بلکہ انہیں اکٹھا کرتے ہوئے پریشان دل نے مشورہ دیا۔ "تم سوانح ضرور لکھو، اسے کتابی چہرہ بھی دو۔ مگر اس کا تعلق نہ تم سے ہو نہ

باقی صفحہ ۲۷۰ پر دیکھئے



عقیل شاداب

جیون کا مضمون

نصف صدی پہلے وہ لڑکی
لولیٹر کی طرح حسیں
اور خوشبودار تھی
لیکن اب
دیوانی مقدمے کی فائل کی
طرح دبیز اور
خستہ حال ہے
وقت کے جج نے اور وکیل نے
ورق ورق پر
اپنے قلم سے
جانے کیا کیا رقم کیا ہے
کاغذ کاغذ کالا کر کے
کیسا بے جا
جرم کیا ہے
قدرت کا
قانون عجب ہے
جیون کا
مضمون عجب ہے

●BRIJ RAJPURA,
KOTA- 324004 (RAJ)



مہدی پرتابگڈھی

غـــزل

غزل نے پامال راہ چھوڑی
بتانِ فارس کی چاہ چھوڑی
جدید اسلوب فن نکالا
پرانی جائے پناہ چھوڑی

بدل دیئے لفظ کے معانی
بدل کے رکھ دی روش پرانی
مٹایا ماحول کا کہاسا
ہوئی ادب کی فضا سہانی

طلسم جساروِلب جو ٹوٹا
نکھار چہرے پہ سج کے آیا
گلال تتلی نے کل دیا جب
غزل کے عارض کا رنگ نکھرا

غزل ہواؤں کی گنگناہٹ
غزل ہے بارش کی شوخ آہٹ
غزل ہے قوس قزح چتون
غزل پرندوں کی چہچہاہٹ

غزل ہے کیفِ نزولِ شبنم
غزل ہے حسنِ وصال موسم
سحر کی پاکیزگی غزل میں
غزل ہے کشتِ اُمید کا نم

غزل ہے آئینہ زندگی کا
غزل ہے سرچشمہ رُوشنی کا
غزل کا سمجھو مزاج مہدی
غزل نے کھولا درِ آگہی کا

●28- SCHOOL WARD,
PARTAB GADH, 230001 (U.P)



خوشتر مکرانوی

قوتِ احساس مجھ سے چھین مت
زندگی کی راس مجھ سے چھین مت

خواب کے وشواس اندھے ہو چلے
روشنی کی پیاس مجھ سے چھین مت

فکر میں محفوظ ہیں رنگینیاں
آتما کی باس مجھ سے چھین مت

قید کردے چاہے لفظوں میں مجھے
آنکھ کا آواس مجھ سے چھین مت

آتے جاتے موسموں سے کیا کہوں
اپنی خوشتر آس مجھ سے چھین مت

●NOOR BALKHI, MANZIL,
MAKRANA- 341505 (RAJ)



سلیمان اطہر جاوید

9-4-134/11, ARUNA COLONY,
TOLI CHOWKI, HYDERABAD-500008 (A.D)

ہندی غزل

غزل کلچر کا اپنا ایک ثقافتی کردار بھی ہے اور غزل کے اس کردار پر شاعر کے سابقہ شماروں میں ادارتی شذرات تحریر کئے گئے ہیں اور ۲۱ رویں صدی کی اردو غزل پر ایک نیا مکالمہ قائم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مکالے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صنفِ غزل نے جہاں اردو زبان کا مسلسل دفاع کیا ہے اور کر رہی ہے، وہیں ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کی اصنافِ شاعری میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے اور پورے ہندوستان، بلکہ پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں پر حکومت کر رہی ہے۔ دیگر زبانوں میں غزل کے امکانات پر رسالہ شاعر کی طرف سے مختلف لوگوں کے ذریعے تحقیقی و تنقیدی کام لیا جارہا ہے اور یہ شاعر کے ایک خصوصی شمارے کا موضوع ہے۔ زیرِ نظر مضمون ہندی غزل کا ایک تعارف ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر جانکی پرساد اور دیگر حضرات کام کر رہے ہیں۔ جس طرح اردو والوں نے اپنے رسم الخط کے لئے کوئی جامع عملی کام نہ کرتے ہوئے شور زیادہ مچایا ہے، اسی طرح اردو غزل جیسی زندہ، فعال اور جادوئی صنف سخن سے بھی اردو کے لئے کوئی کام نہیں لیا اور اب ہندوستان کی دیگر زبانوں میں یا پاکستان و اردو کی نئی بستیوں میں جو غزل تخلیق کی جارہی ہے اس پر بھی کوئی کام نہیں کیا جارہا ہے۔ اب ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اردو والے کیا کر رہے ہیں؟ [الف۔ الف]

غزل، اردو شاعری کی آبرو ہے اور اب تو یہ دیگر زبانوں کی شاعری کی آبرو میں بھی اضافہ کا باعث بنتی جارہی ہے۔ آندھرا پردیش کے اپنے دور کے ملک الشعراء آنجہانی داسرتھی نہ صرف تلگو کے مشہور اور ممتاز شاعر تھے بلکہ انہوں نے تلگو میں غزل کو رواج دیا اور بے شمار غزلیں کہیں۔ انہوں نے اردو کے کئی الفاظ (خط، وغیرہ) اپنی تلگو غزلوں میں بطور ردیف استعمال کئے۔ تلگو کے ایک اور معروف شاعر گیان پیٹھ انعام یافتہ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے تو صرف اپنی تلگو غزلوں کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ تلگو کے اور شاعروں نے بھی صنف غزل میں طبع آزمائی کی اور نام کمایا ہے۔ تلگو کے علاوہ ہماری دیگر زبانوں گجراتی، پنجابی، سندھی، کشمیری ڈوگری، بنگالی اور مراٹھی وغیرہ میں بھی غزلیں کہی جارہی ہیں اور غیر ملکی زبانوں انڈونیشیائی اور جرمن وغیرہ میں بھی غزل کو رواج مل رہا ہے لیکن اردو کے بعد جس زبان میں غزل کو فروغ حاصل ہوا اور ہو رہا ہے وہ ہے ہندی!

مفاد پرست سیاستدانوں اور ان سے منفعت کے خواہاں ادیبوں اور شاعروں کے اردو کے بارے میں جو بھی منفی خیالات ہوں، ہندی ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد ایسی ہے جو اردو زبان و ادب کی عظمت اور اہمیت کی معترف ہے۔ ہندی اور اردو میں تعاون اشتراک کو دونوں زبانوں کے لئے فالِ نیک تصور کرتی ہے اور اردو شعر و ادب سے استفادے کو مبارک اور مسعود۔ چنانچہ ہندی والوں نے اردو شعر و ادب سے اور جو بھی حاصل کیا ہو، اردو غزل کو اپنے ہاں رواج دیتے ہوئے ہندی شاعری کو نیا روپ اور آہنگ دیا اور ہندی غزل کے ناقدین کی سخت ترین تنقید کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی غزل بھی اپنی ایک کشش اور مقام رکھتی ہے۔

ہندی غزل کے بادی النظر میں دو رنگ ہیں۔ ایک تو وہ ہندی غزلیں جن کو اردو کہنا چاہئے لیکن جو ناگری رسم خط میں تحریر کی گئی ہیں۔ گویا ان غزلوں کی ہندی صرف ناگری رسم خط تک ہے۔ اگر رسم خط تبدیل کر دیا جائے تو یہ اردو غزلیں ہی کہلائیں گی اور دوسرے وہ جن میں اردو الفاظ وغیرہ کا استعمال تو کیا ہی گیا ہے لیکن ہندی اور کہیں کہیں سنسکرت کے الفاظ بھی مل جائیں گے۔ جہاں تک پہلی نوعیت کی غزلوں کا تعلق ہے یہ تو ظاہر ہے کہ جن ہندی شاعروں کا اردو شاعری کا مناسب مطالعہ ہے ان کے پاس ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی عرض کروں گا کہ ایسے ہندی غزل گو جو تھوڑی بہت فارسی بھی جانتے ہیں ان کی ہندی غزلیں زیادہ جاذب نظر اور وقیع ہیں۔ بطور مثال پیش کئے جانے والے اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا لیکن میں یہاں چند ہندی شاعروں کے مجموعوں کے نام درج کروں گا جس سے ہندی شاعری (بالخصوص غزل پر) اردو کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً دشینت کمار کے مجموعے کا نام ہے "سائے میں دھوپ" ڈاکٹر کنور بے چین (شامیانے کانچ کے) ظہیر قریشی (چاندنی کا دکھ) ہنمنت نائیڈو (جلتا ہوا سفر) شیام بے بس (محلوں میں قید روشنی) ونیش دھد تیج (عبادت حاشیے کی) اور رمیش رنجک کے مجموعے کا نام "دریا کا پانی" ـــــ ایسا ہونا فطری بھی ہے کیونکہ اردو میں فارسی کے زیر اثر غزل گوئی کا آغاز ہوا اور فارسی کے الفاظ

محاورے اور ضرب الامثال وغیرہ اردو میں استعمال کئے جانے لگے۔ یہی نہیں ایرانی موسم، پھل پھول، تاریخی کردار اور تلمیحات وغیرہ بھی اردو غزل میں عام ہوئیں۔ بالکل اسی طرح اردو کے زیر اثر ہندی میں غزل گوئی کے آغاز کے نتیجے میں اردو الفاظ اور محاورات وغیرہ سے ہندی والوں کو مفر کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ اردو اور ہندی کے باہمی رشتے کی روشنی میں ایسا ہونا ناز بس ہے۔

غزل کو ہندی میں کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے بلکہ بعض شاعر تو اپنی غزلوں کے باعث ہندی کے نامی گرامی شاعر ہیں۔ اس سلسلے کا ایک اہم نام دشینت کمار کا ہے۔ دشینت کمار کو ہندی غزل میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اور تو اور کہنے والے دشینت کمار کو عصر حاضر کا کبیر داس قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا کہنے میں تھوڑا بہت مبالغہ اور مروت بھی ہو لیکن دشینت کمار کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت اور انفرادیت اپنی جگہ ہے۔ دشینت کمار سے پہلے بھی ہندی میں غزل کہی جا رہی تھی چنانچہ ان سے قبل کے غزل گو شاعروں میں شمشیر بہادر سنگھ، بلبیر سنگھ رنگ، بال سروپ راہی اور شیر جنگ گرگ کے نام لائق ذکر ہیں لیکن دشینت کمار نے ہندی غزل کو ایک پیرایہ عطا کیا، ایک اسلوب دیا۔ دشینت کمار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے غزل کو اپنے سماجی حقائق کا آئینہ دار اور عام آدمی کے دکھ درد کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے ہاں معاشراتی انتشار واختلال اور اخلاقی اقدار کے زوال کی تصویر کشی ملتی ہے۔ دشینت کمار نے ہندی اور اردو، دونوں زبانوں کی شعری روایات سے استفادہ کیا ہے۔ پھر یہ بھی کہ ان کی غزل روایت سے ہٹی ہوئی اور ایک تیکھے پن کی حامل ہے۔ مجموعی طور پر دشینت کمار کا یہی انقلابی کردار ہے کہ ہندی غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی اور نئی نسل غزل گوئی پر زیادہ مائل۔ ہندی کے ایک ناقد ڈاکٹر کنور بے چین نے دشینت کمار کے بارے میں لکھا ہے۔

> دشینت کمار کی غزل میں جو آگ ہے، وہ اس انسان کی آگ ہے جو سماجی برائیوں کو دھیان سے دیکھ کر اور سماج کے بیچ رہ کر اس کے درد کو سمجھ کر اندر اندر سلگ رہا ہے۔ دشینت کمار نے فرد کے احساسات کو سماجی شعور سے جوڑنے کا اہم کام کیا ہے۔''

مختصر یہ کہ دشینت کمار نے ہندی غزل کو ایک شکل دی اور ایک صحت مند جہت سے آشنا کرایا۔ دشینت کمار کے مجموعے کا نام "سائے میں دھوپ" ہے۔ ایمر جنسی کے دوران قانون کے نام پر جنتا کو دبانے اور ہراساں کرنے کی سعی، انسانی حقوق کی پامالی اور تاناشاہی، عوام پر جبر اور ظلم و ستم، کمزور معیشت اور اظہار رائے پر قدغن..... ان سارے موضوعات کی انہوں نے نہ صرف تصویر کشی کی بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کی، احتجاج کیا۔ دشینت کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو پتہ نہیں تھا ہمیں اب پتہ چلا　　اس دیس میں ہماری حکومت نہیں رہی
میرے سینے میں نہیں تو تیرے سینے میں سہی　　ہو کہیں بھی آگ لیکن آگ جلنی چاہئے
ہر طرف اعتراض ہوتا ہے　　میں اگر روشنی میں آتا ہوں
یہ سارا جسم جھک کو بوجھ سے دوہرا ہوا ہوگا　　میں سجدہ میں نہیں تھا آپ کو دھوکا ہوا ہوگا
یہاں تک آتے آتے سوکھ جاتی ہیں کئی ندیاں　　مجھے معلوم ہے پانی کہاں ٹھہرا ہوا ہو گا
کئی فاقے بتا کر مر گیا جو اس کے بارے میں　　وہ سب کہتے ہیں اب ایسا نہیں ایسا ہوا ہوگا
یہاں تو گونگے اور بہرے لوگ بستے ہیں　　خدا جانے یہاں پر کس طرح جلسہ ہوا ہوگا
اب تو اس تالاب کا پانی بدل دو　　کمل کے پھول مرجھانے لگے ہیں

ان اشعار میں پائی جانے والی عصری حسیت، اشاریت، معنوی تہہ داری اور عوامی فضا شاعر کے عالی سماجی فکر کی توثیق کرتے ہیں، دشینت کمار نے دراصل وہی لکھا جو ان پر بیتی یا جو انہوں نے آس پاس دیکھا اپنی ایک غزل کے مطلع میں وہ کہتے ہیں ۔

میں جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں　　وہ غزل آپ کو سناتا ہوں

دشینت کمار کے ہاں غزل رنگ اشعار بھی ملتے ہیں۔ وہ حسن و عشق اور گل و بلبل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں سیدھی سادی اور تغزل کی حامل بھی ہیں لیکن انداز بیان، تیکھا اور طرحدار، جو صاف صاف بتاتا ہے کہ یہ دشینت کی غزل ہے۔

ایک جنگل ہے تیری آنکھوں میں　　میں جہاں راہ بھول جاتا ہوں
تو کسی ریل سی گزرتی ہے　　میں کسی پل سا تھر تھراتا ہوں
میں تجھے بھولنے کی کوشش میں　　آج کتنے قریب پاتا ہوں
چلو اب یادگاروں کی اندھیری کوٹھری کھولیں　　کم از کم ایک وہ چہرہ تو پہچانا ہوا ہوگا

دشینت کمار کی ہندی غزل کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ہم عصر اور بعد کے کئی شاعر ان سے متاثر ہو کر نہ صرف غزل گوئی پر آمادہ ہوئے بلکہ

ان کے رنگ میں غزلیں کہنے لگے۔ ایسے کئی شاعروں میں گرجا کمار ماتھر رام ورش مصر، گوپال داس نیرج، سوریہ بھان گپت، رام او تار تیاگی، کنور بے چین، چندر سین وراٹ، عدم گونڈوی، ظہیر قریشی، رمیش رنجک، کرشنا نند چوبے، گرجا شرن اگروال، افسار قمری، مدن موہن اوپندر، وریندر راگنی ہوتری، شیو کمار پرلک، نریندر وشش، سرور حسین سرور، نند لال پھاٹک، ونود کمار شرما، شام بے بس، مدھ مجی اور سیو پرشاد سدھار تھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہندی غزل کے بارے میں عمومی طور پر ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ اس میں اردو کے مقابلے میں حسن و عشق کی باتوں کا تناسب کم ہے۔ ہندی غزل گو شاعروں نے زیادہ تر مسائلی شاعری کی ہے اور نجی جذبات واحساسات اور غم و عشق سے ترک تعلق کیا ہے۔ غم عشق اور غم ذات کو ہندی غزل میں کچھ ایسے زیادہ پیش نہیں کیا گیا۔ گل و بلبل اور ہجر و وصال کے موضوعات۔ اپنی ذات کے دکھ اور غم محبوب کی ترجمانی ہندی غزل میں نسبتاً کم ہی ملتی ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

آئینہ خود سلام کرتا ہے — حسن جب ہو شیار ہوتا ہے — (کرشنا بخشی)
ٹھیس اٹھی پھر ہلکی ہلکی — ہائے جلن یہ میرے جی کی
بنا تمہارے لگی چاندنی — بجھی بجھی سی، پھیکی پھیکی — (سیودھ کمار دویدی)

ہندی غزل گو شاعروں کا ہاتھ زندگی اور زمانے کی نبض پر زیادہ ہے۔ عوام دشمن اور استحصالی طاقتیں، حکمرانوں کی بے راہ روی نظم و نسق کی بے راہ روی، پر فریب سیاست، سیاستدانوں کی مفاد پرستی اور قیادت کی گمرہی........ ان رخوں پر ہندی غزل گو شاعروں کی نظر خاصی ہے۔ انہوں نے ایمائیت اور اشاریت سے بھی کم اور توضیح و صراحت سے زیادہ کام لیا ہے۔ کسی تکلف کے بغیر دو ٹوک انداز میں احتجاج کیا اور اپنے رد عمل کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے

الگاؤ کا جو پاٹ پڑھاتے ہیں قوم کو — ان گرجنوں کو ان کے پدوں سے ہٹائیے — (ارملیش)
کسے سنائیں دکھ، کس سے فریاد کریں — رہبر ہوئے ہیں دلال، دیکھ لو اب بھیا — (شیام بے بس)
خاک نئی تعمیر کریں گے — اہل سیاست توبہ توبہ — (بلویر سنگھ رنگ)
بیچ کر ملک مسکراتے ہیں — قوم کے مسخروں کے کیا کہنے — (بشیر سنگھ گرگ)
لوگ شرمائیں اسے اپنا وطن کہتے ہوئے — ایسی خدمت نہ کرو قوم کے ٹھیکیدارو
لوٹ کر کھیت کو کچھ چالاک ڈاکو — ساری تہمت موسموں پر دھر گئے ہیں
سکھ سدا چھکڑوں پہ بس آتا ہی ہوگا — گاؤں کی میٹنگ میں وہ کہہ کر گئے ہیں

اسی کے ساتھ معاشرتی ناانصافی، عدم مساوات، سماج کے ٹھیکیداروں کا بر خود غلط رویہ، مہنگائی، کساد بازاری، بے کاری، بے روزگاری، افلاس اور ناداری پر بھی اور زبانوں کے فنکاروں کی طرح ہندی کے غزل گو شاعروں نے بھی اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے شاعر ٹوٹ ٹوٹ گیا ہے، بکھر بکھر گیا ہے۔ اپنی ریزہ ریزہ شخصیت کو سمیٹتا ہوا وہ پوری آواز سے کہتا ہے

درد جب ناگوار ہوتا ہے — آدمی تار تار ہوتا ہے — (کرشنا بخشی)
کہیں کفن تک نہیں میسّر — اور کہیں دیوالی تھی کی — (سبودھ کمار دویدی)
شہر میں پھیل کر یہ سناٹا — ہر سڑک کو اداس کر دے گا — (گلشن بہار)
شور گھر میں مچائیے دن بھر — وقت چپ رہ کے اب نہیں کٹتا — (گلشن بہار)
ہم کہ صدیوں سے یونہی ننگے بدن — جسم کے احساس جیسے مر گئے — (ونود تواری)
پہلے فٹ پاتھ کی ہر لاش اٹھائی جائے — پھر سڑک سے کوئی بارات نکالی جائے
ایک بھی پھول نہ حصے میں ہمارے آیا — ان بہاروں سے نظر اپنی ہٹائی جائے — (شیام پرشاد اگروال)

ایمر جنسی کے زمانے میں کہی گئی ہندی غزلوں میں نہایت جرأت مندی، بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ نظم و نسق اور ارباب بست و کشاد پر تنقید کی گئی اور ان کا مضحکہ اڑایا گیا۔ مخفی مباد کہ میں یہاں صرف غزلوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ نظموں میں صورت حال بلاشبہ اور شدید ہوگی۔ دشینت کمار کی غزلوں سے پیش کیے گئے اشعار سے تھوڑا بہت اندازہ ہوگا۔ اب یہاں سوریہ بھان گپت کے یہ دو اشعار بھی ملاحظہ فرمالیں

زندہ ہونے کا احساس تک بھی نہیں — یہ کہاں پر گئی ہے ٹھہر زندگی
اک غلامی سے ہم دوسری میں پھنسے — دھوکہ کھائی ہوئی ہر نظر زندگی

ہندی غزل میں احتجاج کی لے کہیں کہیں اور تیز ہو گئی ہے۔ غزل گو شاعروں نے قطعی تکلف برطرف رویے سے کام لیا ہے۔ الفاظ کے انتخاب، مصرعوں کے دروبست اور بلند آہنگی نے احتجاج کی لے اور اس لہجے کو مزید بھرپور اور گمبھیر کر دیا ہے۔ چندر سین وراٹ کی ساری غزل میں یہ فضا ملے گی۔ ردیف سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے

بہروں کا دربار زور سے بول یہاں　　　سیاست ہنکار، زور سے بول یہاں
ان کے کان نویدن نہیں سنا کرتے　　　سنتے ہیں للکار زور سے بول یہاں
اونچے بولوں کا ہی ارتھ سمجھتے ہیں　　　یہ بگڑے بدکار زور سے بول یہاں
اپنی جے کے نعرے ہی سنتے آئے　　　سنا انہیں پھنکار زور سے بول یہاں
ستہ کے کانوں میں رہتا تیل پڑا　　　کم سنتی مکار زور سے بول یہاں
یہاں چھین کے لینا پڑتا اپنا حق　　　حاکم سے حقدار ،زور سے بول یہاں
عدالتی چھاپر کھاجگتی ہے ورنہ　　　سوتی ہے سرکار زور سے بول یہاں
ان کی رنی واسوں تک کیسے پہنچے گی　　　جن کی چیخ وپکار زور سے بول یہاں
چپ کردے اپنے بولوں سے تو ان کے　　　منہ پر ٹانکے مار زور سے بول یہاں
تو پہلی آواز اٹھا تو کورس میں　　　گائیں گے سب یار زور سے بول یہاں
ان کو بھی ڈر ہے بہا لے جائے گا　　　جنا کروش کا جوار زور سے بول یہاں

مذہب کبھی خواہ کچھ رہا ہو لیکن ان دنوں سیاستدانوں اور تنگ نظر اور کوتاہ ذہن قیادت کے نزدیک دوسرے مذہب والوں کے خلاف دشمنی اور نفرت پھیلانے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ مندر اور مسجد کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہوتی ہے، فسادات ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہایا جاتا ہے، خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ وہ لوگ وطن دشمن ہیں جو یہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور یہ رویہ ملک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ فنکاروں نے، شاعروں اور ادیبوں نے، خواہ وہ کسی زبان کے ہوں، اس رویے کے خلاف احتجاج کیا ہے وطن دشمنوں اور مذہب کے نام پر نفرت اور عداوت پھیلانے والوں کی شدید مذمت کی ہے، ان کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کیا ہے اور دیگر مذاہب کے احترام پر زور دیا ہے۔ ہندی کے غزل گو شاعر بھی اس خصوص میں کسی سے کم نہیں، کسی اور زبان کے شاعروں سے پیچھے نہیں، کہیں کہیں تو ان کے لہجے کی کاٹ اور تیز ہے، ضرب اور کاری ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہوگا ۔

ایشور کا نام لینا کہیں چھوڑدیں نہ لوگ　　　مذہب کو اس قدر نہ سیاسی بنائیے
ہتھیارے چھپے بیٹھے ہیں سنتوں کے وش میں　　　مندر میں ذرا سوچ سمجھ کر ہی جائیے
دھرم گرندھوں کا پرکاشن جنہیں سمجھا ہم نے　　　صرف اپرادھ کتھاؤں کے وہ دفتر نکلے　　　(ارملیش)
اب تو مذہب کوئی ایسا بھی چلایا جائے　　　جس میں انسان کو انسان بنایا جائے　　　(نیرج)
بندے ہیں ہم رحیم کے بھگت رام کے　　　کیوں رام اور رحیم کو لڑوا رہے ہو تم
مل جل کے ہم رہیں گے مل جل کے رہیں گے　　　نفرت کا زہر کیوں ہمیں پلوا رہے ہو تم　　　(دنیش وصد پچی)
دو مرے پھر مر گئی انسانیت　　　گلی کوچوں میں ہنسی اگی　　　(ویدپرکاش امیتابھ)

اور اب سیاست سے متعلقہ موضوعات پر چند اشعار۔ 'دَل بدلوں' کے بارے میں کنور بے چین کا شعر ہے ۔

اس کا نہ کوئی دین نہ ایماں نہ دھرم ہے　　　اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں جاتا ہے آئینہ

انتخابات میں بعض ریاستوں بلکہ مرکز میں بھی سیاسی جماعتوں کا جو حشر ہوا ہے اس کو پس منظر میں رکھتے ہوئے نریش ندیم کا یہ شعر پڑھیئے ۔

جب کبھی سوئی ہوئی مخلوق اٹھتی ہے ندیم　　　ایک لمحے میں وہ نپٹاتی ہے صدیوں کا حساب

اس کے علاوہ عدم گونڈوی، نندلال پھاٹک، کلدیپ سلیل، رام درش مصرا، سرور حسن سرور، ہنمنت نائیڈو، شام بے بس، وید پرکاش امیتابھ، رمیش اجک اور سدھارتھ وغیرہ کئی شاعروں نے اپنی غزلوں میں ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر اظہار خیال کیا ہے۔ کڑی تنقید کی ہے۔ کیونکہ جس طرح جگر نے کہا ہے ۔

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل　　　شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

کنور بے چین کہتے ہیں ۔

جو وقت کی آندھی سے خبردار نہیں ہیں　　　کچھ اور ہی ہوں گے وہ قلم کار نہیں ہیں

ہندی غزلوں کا اردو غزل سے موازنہ کرنا مقصود نہیں اور نہ کوئی مقابلہ کیا جانا چاہئے اس لئے کہ غزل اردو کی ایک وقیع گرانمایہ، ممتاز ترین اور مقبول ترین صنف ہے۔ اس کی کئی سو سالہ تاریخ ہے۔ جب کہ ہندی میں غزل ابھی نووارد ہے۔ اس کی زیادہ عمر نہیں۔ اس کے باوجود ہندی غزل کا اپنا مقام ہے۔ ان پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے اردو اور ہندی غزل کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو کچھ اور ہی نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں۔ اور تو اور خود ہندی شاعری کے ناقدین جن میں ڈاکٹر

پربھاکر ماچوے، ترلوچی شاستری، ڈاکٹر مہیشور تیواری، کیلاش گوتم اور مادھو مدھوکر وغیرہ شامل ہیں، ہندی غزل کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ سری ترلوچن شاستری کے بموجب "مردو (غزل) کی اونچائیاں ہندی (غزل) میں کھوجنا سراب میں پانی کی تلاش ہے۔" اسی طرح گیان پرشاد دیویک نے لکھا ہے کہ "ادھر لکھی جارہی بے شمار غزلوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہندی غزلوں کے پاس اپنی معنویت ہے نہیں۔" کسی کو ہندی غزل میں کچاپن محسوس ہوتا ہے بعض ایسے ہیں جن کو ہندی غزل الفاظ کی بازی گری محسوس ہوتی ہے۔ چند ایک کو شکایت ہے کہ ہندی غزل میں ہندی کے چھند کم ہی ملتے ہیں۔ کسی نے ہندی غزل کو اردو کا عکس قرار دیا ہے۔ کسی کو ہندی غزل میں ہندی کا محاورہ نہیں ملتا۔ کچھ ایسے ہیں جنھیں ہندی غزل میں آوردکا احساس ہوتا ہے اور اس کا اپنا کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کو ہندی پن کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ ہندی میں غزل کے نام پر جو لکھا جارہا ہے وہ نہ The best poetry ہے اور نہ The best song وہ غزل نما ہے غزل نہیں۔ بعض تو ہندی میں غزل سے اس حد تک مایوس ہیں کہ کہا نہیں جاسکتا۔ جیسا کہ ڈاکٹر پربھاکر ماچوے نے مدھر نجمی کے موسومہ اپنے خط مورخہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں لکھا ہے کہ "ہندی میں انگریزی سائینٹ کے ساتھ جو حشر ہوا وہی غزل کے ساتھ لکھا ہے" ویسے مادھو مدھوکر کے خیال میں (ہندی) غزل کو فنی آداب کا پابند ہونا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ساری باتیں واجبی اور مناسب ہیں اور نہ میں انھیں غیر واجبی اور نامناسب قرار دیتا ہوں۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ جب ہندی شاعری کے ناقدین ان خیالات کے حامل ہیں تو شعر وادب کے ایک غیر ہندی طالب علم کی حیثیت سے میرا کچھ کہنا کہاں تک درست ہوگا لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں اس ضمن میں معروضی رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندی غزل میں کچّاپن ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ یہ ابھی پختگی کی منزل سے دور ہے۔ خود اردو غزل بھی اس منزل سے گزر چکی ہے۔ یہ کہنا کہ ہندی غزل میں ہندی کے چھند کم ملتے ہیں، ہندی غزل میں ہندی پن اور ہندی محاورہ نہیں ملتا یا یہ اردو غزل کا عکس ہے، کسی حد تک درست ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے کہ ہندی میں غزل اردو سے آئی ہے اور اس میں اردو کی بحریں اوزان، اس کا عکس یا محاورہ ملتا ہو تو تعجب کی بات نہیں خود اردو غزل فارسی سے متاثر ہے اور اس میں فارسی کی بحریں، اوزان، محاورہ اور فارسی پن آج بھی ہے۔ لیکن کیا لسانی، کیا ادبی، کیا موضوعاتی اور کیا تہذیبی، ہر زاویے سے ہندی غزل میں ہندی پن قابلِ لحاظ حد تک پایا جاتا ہے اس کو کم دکھانے کی سعی نامشکور ہوگی۔ اما شنکر تیواری، انل گوڑ، مدھر نجمی، کرشنانند دوبے، کنور بے چین، چندر سین وراٹ، بھوانی شنکر، کرشنا بخشی امیش اور راجیش ریڈی وغیرہ کی غزلیں پڑھئے۔ اندازہ ہوگا کہ ان شاعروں نے بھارتی روایات اور سنسکار سے ہندی غزل کے رشتے کو استوار رکھا ہے اور یہاں کے اساطیر، امیجس اشارات اور محاورے سے ہندی غزل کو قریب بھی کیا ہے۔ بطور مثال چند اشعار درج ہیں ۔

کیسے بتائیں تمہیں کیسا ہے رام پھل — آنسو کے ایک گاؤں کا مکھیا ہے رام پھل
مارا ہے جس کو روز مہاجن کے بیاج نے — بے بس سے اک غریب کا روپیہ ہے رام پھل (کنور بے چین)
پیٹ کی آگ سے یادی مکت ہوتا ہے ہمیں — تو دلوں میں کرانت کی بھی آگ جلنی چاہئے
ایک حملہ پھر ہوا شبھ لابھ پر — زندگی بیمار دروازے پہ ہے
آستین قرض میں ڈوبی ہوئی — سرپ کی پھنکار دروازے پہ ہے
میستی ہوگی کہیں بھومیکا — جب کہ اُپ سمہار دروازے پہ ہے (بھوانی شنکر)
ہم نے دیکھا ہے سورے سے پہلے — گہن تم اندھکار ہوتا ہے
آپ پڑھئے سو ئم میں چہرہ — ایک دم اشتہار ہوتا ہے (کرشنا بخشی)
میرے لیے میرے ہاتھوں سے نکلتے کیوں ہیں — موم کی طرح یہ وشواس پگھلتے کیوں ہیں
یہ گھنے مون کے جنگل یہ اندھیرے کے پہاڑ — زندگی میں ہمیں ہر موڑ پہ ملتے کیوں ہیں (راجیش ریڈی)
پہیلی بھومیکا، گونگی شکایت ہم کو لے ڈوبی — ہماری دیہہ کی ٹھنڈی حرارت ہم کو لے ڈوبی
ہمارے بچ نکلنے کی بہت امید تھی لیکن — ہماری ایک ہی مدرا تتھاگت ہم کو لے ڈوبی
سموچی عمر تو گزری ہزاروں سرخیاں پڑھتے — محض دو چار اکثر کی عبارت ہم کو لے ڈوبی (اوما شنکر تواری)

The best poetry یا The best song نہ ہونے کا شکوہ بھی یونہی سا ہے۔ کسی بھی زبان کی کل شاعری کہا best ہوتی ہے۔ ہندی میں بھی یہی صورت حال ہے۔ انگریزی سائینٹ کو بھی اردو میں کچھ زیادہ اچھے دن دیکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ ہندی میں جو حشر ہوا وہ بھی تعجب خیز نہیں لیکن اردو غزل کی بات قطعی اور ہے۔ انگریزی بہر کیف بیرونی زبان ہے۔ ضروری نہیں کہ انگریزی کی اصناف ہندی کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ بیشتر ہندوستانی زبانوں کو انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے تجربے بھاری پڑے ہیں لیکن اردو اور ہندی کی بات بالکل مختلف ہے۔ مجھے اردو اور ہندی کے رشتے پر گفتگو کرنے کی ضرورت

نہیں۔ ہندی سے گیت اور دوہے جیسی اصناف اردو میں لی گئیں اور کامیاب ہیں اردو سے ہندی میں غزل یا کوئی اور صنف لی جائے تو یقیناً وہ کامیاب ہو گی۔ سانٹ کی طرح، کامیابی کے بارے میں کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہئے۔ اب رہی یہ باتیں کہ ہندی غزل میں معنویت نہیں یا ہندی غزل کو الفاظ کی بازی گری قرار دینا اور اس میں فنی آداب کا مطالبہ کرنا تو عرض یہ ہے کہ ہر زبان میں اور ہر دور میں شعر و ادب معنویت کا حامل، الفاظ کے استعمال میں سلیقہ مند اور فنی آداب کا پابند ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ بے معنی، الفاظ کی بازی گری اور فنی آداب کو پامال کرتا ہوا بھی۔ کم یا زیادہ کی بات اور ہے لیکن کونسی زبان ہے جس میں ایسا نہیں، اردو میں کیا کچھ تماشے دیکھنے میں نہیں آرہے ہیں۔ ہندی میں بھی ایسا ہوتا ہے لیکن محض اس بناء پر اچھے صحت مند اور مثبت اقدار کے حاصل ادب سے صرف نظر کرنا اچھی، صحت مند اور مثبت تنقید کو زیب نہیں دیتا۔ ہندی میں بلاشبہ، ٹیڑی تہذیب اور ٹیڑی فکر و نظر کی وجہ سے ٹیڑی غزلیں سنانے والے موجود ہیں۔ وزن، بحر ارکان، قافیوں، ردحافات اور دیگر محاسن شعری سے ارادتاً یا غیر ارادتاً روگردانی کرنے والے بھی مل جائیں گے۔ مثلاً ہندی کے ایک ممتاز شاعر رمانا تھ اوستھی نے "صحیح" کے ساتھ "نہیں" کا قافیہ باندھا ہے۔ شعر ہے ۔

جو بھی ہو گا وہی صحیح ہو گا　　　　جو نہیں ہو نا ہے نہیں ہو گا

سلیل کمار نے اپنے شعری مجموعے "ہوس کے شہر میں" کی ایک غزل میں "بناتا" اور "کہاتا" کے ساتھ "ہوتا" اور "سنتا" کے قافیے استعمال کئے ہیں۔ ہندی غزل میں ایسی اور مثالیں بھی مل جائیں گی لیکن میں یہ بھی کیوں نہ کہدوں کہ اردو میں بھی ان دنوں کیا کچھ بے تکلفی برتی نہیں جا رہی ہے۔

یوں ہندی غزل کا سفر جاری ہے۔ اردو میں ایک زمانے کے بعد غزل کو اوج و عروج اور اقبال حاصل ہوا اور وہ اردو شاعری کی آبرو ہوئی۔ ہندی غزل بھی خوش آیند امکانات کی حامل ہے۔ اوروں ہی کو نہیں ہندی شاعروں اور ناقدوں کو بھی اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ □□

بقیه صفحه ۲۰ / اعتراف

تمہاری شخصیت سے۔ وہ سوانح عمری پروفیسر آر تھر ایر جارڈن کی ہو، جو اس کے بچپن سے موت تک کے واقعات اپنے ساتھ لئے ہو۔"

اور میرے دماغ نے دل کا مشورہ قبول کر لیا۔

پس نوشت: اپنی داستان رقم کر کے اور اپنے گناہ کا اعتراف کر کے میں زندگی سے دوبارہ ہمکنار ہوا ہوں۔ برسوں کا بوجھ گھنٹوں میں چھوٹ گیا ہے۔ میں گنگناتا، مدتوں بعد اپنا دل پسند لباس پہن کر گھر سے باہر چلا آیا ہوں۔ یہ ڈھلتی دوپہر، یہ ابھرتی شام یقیناً میری اپنی ہے۔ میں ایک آزاد پنچھی کی طرح فضا میں اڑنا چاہتا ہوں، جس کا پورا آکاش اپنا ہوتا ہے اور وہ ہر سمت میں اڑنا پسند کرتا ہے۔

رات دیر سے گھر لوٹا، کمروں کی روشنی گل تھی۔ میرے پاؤں میرے ساتھ نہ تھے۔ ششی بالا میری اس عادت سے واقف تھی۔ سوچا، وہ اور بچے سو رہے ہیں، انہیں اٹھانا مناسب نہ ہوگا؟ دبے پاؤں میں بیٹھک میں چلا آیا۔ میز کے قریب ششی بالا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رقعہ دھرا تھا۔ "میں صبح تک یہی جانوں کے میرا شوہر ایماندار، شریف اور بھلا آدمی ہے۔ ہر کسی کو نیکی کی راہ دکھاتا ہے۔ اسی واسطے اس نے جنم لیا ہے۔ پر آج تمہاری داستان "اعتراف" پڑھ کر ہر بات صاف ہو گئی برسوں سے ایک چور تمہارے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ مگر تم نے مجھے اس کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔ مجھے بسدا خود سے الگ رکھا۔ کتنے ہوشیار ہو تم اور کٹھور بھی۔ پروفیسر کی موت کے ذمہ دار تم ہو، صرف تم میری نظر میں تم گناہ گار ہو۔ ان حالات میں میرا ایک گنہگار کے ساتھ رہنا مناسب نہ ہوگا؟ میں بچوں کے ساتھ لئے جا رہی ہوں۔ وہ تم سے ملتے رہیں گے۔ مگر ہماری ملاقات اب........؟؟؟ □□

بقیه صفحه ۳۲ / ڈبل بریس سوٹ

سے سننے کے بعد اس نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے آہستہ سے میرے کان پکڑے اور کہا، "بدمعاش کہیں کے! بھیم تال میں تو آپ کسی طرح قبول ہی نہیں کر رہے تھے جب کہ مجھے پورا یقین تھا"۔ اس کے بعد اس نے میرے کان آزاد کئے اور سنجیدگی کے عمق میں غوطے لگاتے ہوئے کہا، "خیر، اس وقت میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ آپ ہی کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے لہٰذا خواہ مخواہ کی تلخی پیدا کرنے سے کیا فائدہ بہر حال انسان جب بھی سدھر جائے، اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔ چونکہ آپ نے مجھے اپنا سمجھ کر ہی سب کچھ بتلایا ہے، یقیناً میری خوش قسمتی ہے۔ آپ نے سدھر جانے کا یقین دلا کر میرے دل میں اپنے تئیں عزت، محبت، عظمت اور عقیدت کئی ہزار گنا بڑھا دی ہے۔ لہٰذا میں صدق دل سے آپ کو اپنی گذشتہ زندگی کے اوراق سیاہ کرنے کے لئے معاف کرتی ہوں۔ ارے آپ نے میری فراخ دلی کو کبھی نہیں پرکھا۔ اگر آپ بتا دیتے کہ اب بھی آپ کے دل میں اس لڑکی کے لئے جگہ ہے تو بخدا میں کوشش کر کے اس کے ساتھ آپ کی شادی کرا دیتی اور اپنے ہاتھوں سے اسے دلہن بنا کر آپ کو پیش کر دیتی اور زندگی بھر اسے اپنی سگی چھوٹی بہن ہی کی طرح سمجھتی۔ بہر حال آپ نے اسے بھول کر اس کے ساتھ سراسر زیادتی کی ہے۔ خیر میں نے تو آپ کو معاف کر دیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جس طرح گوتم بدھ کی بیوی نے ان کو زندگی بھر معاف نہیں کیا تھا، اسی طرح وہ لڑکی بھی آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔" □□



رؤف خیر

یک مصرعی نظمیں

ں پردہ

ست پس پردہ عجیب ہوتی ہے

انت

ا شاخ ثمرور بے پرندہ ہو نہیں سکتی

ظر

ں نظر نہیں ٹھیری، وہ دیکھتا کیسے

الیے

سرافراز ہو گئے تھے شالیے سب دکن میں آکر

سان

ں جنت سے جو محروم ہے وہ شداد ہے یہ

راط وتفریط

یط سے بچنا ہو تو افراط سے بچنا

ال

ش بدن تو گویا چلتا ہے تن بدن سے

ستداء

انہ ہم سے ہرکس و ناکس کی اقتداء

ش فہمی

خوش گماں ہوں کہ تو بدگماں نہیں ہوگا

نظر

جھگڑ ہے کہ دشمن کی نظر

طۂ شناخت

تل ہے کتابی چہرے پر

فر

ا حضر میں ہے لیکن سفر میں لذت ہے

●9-10-202/ 19 GOLCONDA, RISAL
-BAZAR, HYDERABAD-500008



ارشد عبدالحمید

دخل در معقولات

چھٹی منزل کی چھت پر
کمپیوٹرائزڈ نیون بورڈ کے پیچھے
کوئی ہے
جو شفاف سڑک کے راہگیروں پر
اندھادھند گولیاں برسا رہا ہے
سات بچے اور آٹھ عورتیں سڑک پر تڑپ رہی ہیں
جیتا جیتا خون کچھ اس طرح بہہ رہا ہے
جیسے پرنالے چھوٹ جاتے ہیں
مرسڈیز بینز کے 'ای' ماڈل کا مالک
کار کے پہیوں کو خون آلود ہونے سے صاف بچالے گیا ہے
خریدار دکانوں میں چھپ گئے ہیں
دکانداروں نے اپنے اپنے شٹر گرالیے ہیں
میں نے حال ہی میں فرسٹ ایڈ کا کورس پورا کیا ہے
لیکن نو منٹ بعد ٹھیک دس بجے
گیارہویں سڑک کی بارہویں عمارت میں
وارڈ بوائے کی نوکری کیلئے میرا انٹرویو ہے
ویسے بھی
سرکاری کام میں مداخلت
مجھے اور پولیس، دونوں کو پسند نہیں ہے۔

●AHMAD VILLA, KALI PALTAN,
TONK-304006 (RAJ)

اکبر حیدرآبادی

جواب، لالہ و گل ہیں، نہ یاسمین اُس کا
بجھا بجھا سا بس اک عکس ہے چمن اس کا

زباں پہ بات جو آئی، اتر گئی دل میں
شکر کی طرح ہے شیریں بہت سخن اس کا

دھنک میں رنگ یہ سارے کہاں سے آئے ہیں؟
تھا آسماں کی نگاہوں میں پیرہن اس کا

وہی کشش، وہی دوشیزگی کی رعنائی
ہے بے نیازِ سن و سال بانکپن اس کا

عجب نہیں کہ یہ پھول جل کے راکھ ہو جائے
نگاہ برق ہے اور آتشیں بدن اس کا

رہی ہے اس سے بہر حال گفتگو اکبر
کبھی نظر تو کبھی دل تھا ہم سخن اس کا

● - 30 TUFFL ROAD BRISTOL
BS 105 EG

خورشید ملک

TARIN TIKLI ,
SHAJAHANPUR- 242001 (U.P)



ڈبل بریس سوٹ

سچ پوچھا جائے تو گھومنے پھرنے کا صحیح لطف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب ساتھ میں کوئی ہم مزاج ہو، بصورت دیگر سیر و تفریح کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کلیہ بھی نہیں ہے کیونکہ کبھی کبھی ساتھ میں ہم مزاج نہ ہونے کے باوجود سیاحی کا بھرپور مزہ حاصل ہوتا ہے مثلاً میں جس کے ساتھ پہاڑ پر گیا تھا اس کے بارے میں میری معلومات حد درجہ محدود تھی کیونکہ چند روز قبل ہی میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، لہٰذا اس کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم دونوں خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دراصل وہ میری بیوی تھی اور ہم ہنی مون منا رہے تھے۔ بالعموم ہوتا کیا ہے کہ شادی کے بعد ہر جوڑا کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے میں گزارتا ہے اور مستقبل کے لئے منصوبے بھی بناتا ہے۔ گویا وہ غیر شعوری طور پر خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ ہم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے اور تربیتی دور ہی سے گزر رہے تھے۔

سیزن میں نینی تال بہت مہنگا ہو جاتا ہے اور بھیڑ بھاڑ بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں بھوالی کافی سستا اور پرسکون بھی رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے بھوالی کو ترجیح دی تھی۔ بھوالی میں ایک ہی مناسب ہوٹل یعنی ٹورسٹ ہوٹل ہے۔ ہم اسی میں ٹھہرے تھے۔ کسی زمانہ میں بھوالی میں ایشیا کا سب سے بڑا سینی ٹوریم تھا۔ وہ تو اب بھی ہے مگر اب اس کی وہ اہمیت نہیں رہ گئی ہے کیونکہ اب ہر شہر میں دق کا بہ آسانی اور مکمل علاج ہو جاتا ہے۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم نے پورا ہنی مون بھوالی میں ہی گزار دیا ہو بلکہ ہم یہ کرتے تھے کہ علی الصباح بھوالی کے قرب وجوار کے علاقوں میں گھومنے نکل جاتے یعنی کبھی نینی تال کبھی رانی کھیت، کبھی الموڑہ، کبھی باگیشور، کبھی رام نگر، کبھی گرم پانی تو کبھی بھیم تال مگر شام کو ہر حال میں بھوالی آجاتے، گویا بھوالی کو ہم نے اپنے ہنی مون کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔

جس روز ہم بھیم تال پہنچے اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہلکورے کھا کھا کر تیر رہے تھے مگر بارش کے امکانات نہیں تھے البتہ فضاء کی رومانیت میں اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔ بھیم تال میں بھی نینی تال کی طرح ایک جھیل ہے مگر اس کے مقابلہ میں کافی چھوٹی ہے۔ وہاں نینی تال کی طرح خوبصورتی بھی نہیں ہے۔ دراصل وہاں سیاحوں کے لئے کشش کا باعث وہ ٹاپو ہے جو جھیل کے عین وسط میں واقع ہے۔ سیاح بذریعہ کشتی ٹاپو تک پہنچتے ہیں۔ جھیل کے کنارے ایک مختصر بازار ہے جس میں چند ہوٹل بھی ہیں جو سیاحوں کے لئے کھانے پینے کا سامان پہنچاتے ہیں۔ ہم کافی دیر تک ٹاپو پر رہے۔ وہیں ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کھالیا۔ دن ڈھلنے پر ہم واپس ہونے ہی والے تھے کہ ایک فوٹوگرافر نے ایک تصویر کھنچوانے کی عاجزی سے درخواست کی۔ ہم راضی ہوگئے۔ اور ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوز بنایا۔ تصویر کھنچوانے کے بعد میں نے فوٹوگرافر کو روپے دیئے اور کہا کہ ہم پرسوں خود یہاں آکر اپنی تصویر لے لیں گے۔

اس نے اپنی تشہیر کرنے کے لئے بہت سی تصاویر ایک بورڈ پر آویزاں کر رکھی تھیں۔ بیوی ان تصاویر کو غور سے دیکھنے لگی، غالباً وہ فوٹوگرافر کی مہارت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ چونکہ مجھے ان تصاویر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا میں ہائیڈل ڈپارٹمنٹ کی ان ستم ظریفیوں کو دیکھنے لگا جن کی وجہ سے جھیل نہ صرف مزید چھوٹی ہو گئی تھی بلکہ اس کی خوبصورتی بھی متاثر ہو گئی تھی۔ "سنئے"، اچانک بیوی نے مجھے آواز دی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، "اس تصویر میں آپ کے ساتھ یہ کم عمر لڑکی کون ہے؟" میں نے اس تصویر پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور قبل اس کے کہ میں حیرت واستعجاب سے اچھل پڑتا میں نے اپنے آپ کو بہ مشکل تمام سنبھالا۔ میری چند لمحوں کی خاموشی بھی اس سے برداشت نہیں ہوئی لہٰذا اس نے قدرے درشت لہجہ میں استفسار کیا، "بتایئے تاکہ آپ کس کمسن اور حد درجہ خوبصورت لڑکی کے ساتھ یہاں گلچھرے اڑانے آئے تھے؟" اس وقت تک میں بالکل سنبھل چکا تھا لہٰذا میں نے ہنستے ہوئے کہا، "ابھی تک تو یہی سنا تھا کہ ہر بیوی اپنے شوہر کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھنا گوارا نہیں کرتی ہے مگر آج معلوم ہوا کہ وہ اپنے شوہر کی ہم شکل کے ساتھ بھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھ سکتی۔"

"مجھے بیوقوف نہ بنایئے"، اس نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا، "اس تصویر میں آپ کا ہم شکل نہیں بلکہ خود آپ ہیں۔ دو انسانوں میں سو فیصد مشابہت ہونا ناممکن ہے۔ اب بتا بھی دیجئے کہ یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے بدستور ہنستے ہوئے کہا، "وہی مرغ کی ایک ٹانگ! ارے جب میں اس تصویر میں ہوں ہی نہیں تو اس لڑکی کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں؟"

"میں ہرگز نہیں مان سکتی" اس نے پیر پٹکتے ہوئے کہا۔

"تو نہ مانو" میں نے بھی جھلا کر جواب دیا اور ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔

اس وقت میرا دماغ کمپیوٹر جیسی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ابھی اور اسی وقت بیوی کو مطمئن نہ کر لیا تو پھر میں زندگی بھر اس کا اعتماد نہیں حاصل کر پاؤں گا۔ اگر میں نے فوراً ہی اس کے دماغ میں یکایک تعمیر ہو گئی شک کی بلند قامت دیوار کو منہدم نہ کر دیا تو اب تک میں نے اس کے اوپر اپنا جو اچھا تاثر قائم کیا ہے وہ زائل ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شاید ابھی ٹھیک سے شروع نہ ہوئی ہماری ازدواجی زندگی میں ایسی دراڑ پڑ جائے جس کا کہ پر کرنا محال ہو جائے۔

اچانک میرے ذہن میں اک زبردست قسم کی تاویل آ گئی چنانچہ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس تاویل کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کھسک کر بنچ کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ بہر حال میں نے پیار بھرے لہجہ میں کہا، "جانِ من، یقین کرو اس تصویر میں میں نہیں ہوں، اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ شخص جس طرز کے سوٹ میں ملبوس ہے، اس طرز کے سوٹ سے مجھے سخت الرجی ہے۔ اس لئے میرے پاس تم نے اس طرز کا کوئی سوٹ نہیں دیکھا ہوگا۔ سوٹ دو چار سال میں تو بدلے نہیں جاتے ہیں۔"

شاید اسے میری تاویل پر کچھ کچھ یقین ہوا مگر اس کا ذہن اس تصویر کو جھٹلانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ غرضیکہ کچھ یقینی اور کچھ غیر یقینی کیفیات سے دوچار ہو جانے کی وجہ سے وہ تذبذب کا شکار ہو گئی، نتیجتاً اس نے نیم خاموشی اختیار کر لی۔ اس نے از خود بولنا بند کر دیا اور میری باتوں کا جواب بھی وہ محض ہوں ہاں، نہ، نہیں وغیرہ میں دینے لگی۔ کبھی کبھی وہ صرف گردن ہلا کر اثبات یا نفی کا اشارہ بھی کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ رات میں اسے رام کرنے کی کوشش کروں گا۔

بھوالی پہنچ کر ہم نے رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا۔ میں بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنے اور میرے چند کپڑے دھوئے اور خاموشی سے آکر لیٹ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بدن چھونے کی کوشش کی مگر وہ بدک کر ڈبل بیڈ کے کنارے کھسک گئی۔ میں نے بھی اس کی طرف کھسک کر اپنی کوشش جاری رکھی۔ اوّل تو میں اس کا غصہ فرد کرنا چاہتا تھا اور دوئم میں ہنی مون کی ایک رات خوامخواہ میں ضائع نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے یعنی عورت کی مسلسل نہ نہ، بالآخر نیم ہاں، میں تبدیل ہو جاتا، چنانچہ اس نے میری بہت کوششوں، منتوں اور سماجتوں کے بعد اپنا بدن چھونے کی تھوڑی بہت اجازت دے ہی دی۔ اس کے بعد تو مجھے قلعہ فتح ہی کر لینا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر آئے اور جو اس حقیقت کا بیّن ثبوت تھے کہ اس کے اندر خود سپردگی کا جذبہ عود کر آیا ہے۔

اس رات مجھ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ اگر عورت کی تھوڑی بہت مرضی نہ شامل ہو تو ایک اکیلا مرد اس کو کبھی مغلوب نہیں کر سکتا ہے۔ ہوتا کیا ہے کہ مرد کی پیہم کوششوں کے دوران عورت کے بھی فطری جذبات تھوڑے بہت بھڑک اٹھتے ہیں، نتیجتاً اس کی مدافعت قدرے ماند پڑنے لگتی ہے۔ اسی کے باعث مرد اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر عورت کو بعد میں پشیمانی ہوتی ہے تو وہ مرد کے اوپر زنا بالجبر کرنے کا الزام عائد کر دیتی ہے۔ اس رات میں بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا اگر اس کی تھوڑی مرضی شامل نہ ہو جاتی۔ ممکن ہے کہ بعد میں اسے پچھتاوا ہوا ہو مگر اس نے میرے اوپر زنا بالجبر کرنے کا الزام عائد نہیں کیا کیونکہ وہ بہر حال میری بیوی تھی۔

صبح کو وہ کافی نارمل نظر آئی مگر بہت بجھی بجھی تھی۔ بہر حال اس نے مجھ سے تھوڑا بہت بولنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم دونوں پیدل ٹہلتے ہوئے گھوڑا کھال گئے کیونکہ وہ بھوالی کے نزدیک ہے۔ وہاں ملٹری کا ایک مشہور اسکول ہے۔ ہم دوپہر تک واپس آ گئے اور کھانا کھا کر سو گئے۔ شام کو ہم نے سینی ٹوریم دیکھا۔ صبح کو ہم پھر بھیم تال گئے۔ فوٹوگرافر سے اپنی تصویر لی، بہت اچھی آئی تھی۔ فوٹوگرافر نے اس کی ایک کاپی اپنے بورڈ پر بھی لگا دی تھی۔ بیوی نے اس تصویر اور پہلے والی تصویر کا کئی بار بنظر غائر جائزہ لیا اور ساتھ ہی میرے سراپے کا بھی جائزہ لیتی رہی مگر اس نے کسی قسم کے ردّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہیں سے ہم ایک ٹرک پر بیٹھ کر رام نگر چلے گئے۔ وہاں بہت ٹھنڈ تھی۔ وہاں ہم نے مربّے اور اچار وغیرہ بنانے والی فیکٹری دیکھی اور شام تک بھوالی آ گئے۔

ہم ہنی مون ختم کر کے واپس آ گئے۔ بیوی نے دوبارہ پھر کبھی اس تصویر کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید اس نے میری تاویل پر یقین کر لیا تھا۔ میں نے بھی اپنی طرف سے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ میں دبی چنگاری کو کرید کر اسے شعلے میں تبدیل کا قائل نہیں تھا۔ غرضیکہ ہم ہنسی خوشی ازدواجی زندگی گزارنے لگے۔

مگر ہائے وہ تصویر........

جب جوانی نے میرے اندر اتھل پتھل شروع کی تو میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہو گیا۔ پھر تو میں اس کی دلدل میں دھنستا ہی چلا گیا۔ شروع میں میں امرد پرست بھی رہا۔ مگر جلد ہی اس لعنت سے توبہ کر لی۔ میں ہر لڑکی سے صرف تین چار بار استفادہ کرنے کے بعد اس سے قطع تعلق کر لیا کرتا تھا تاکہ کوئی لفڑا نہ ہو جائے یا پھر وہ لڑکی

ہمیشہ کے لئے میرے گلے نہ پڑ جائے۔ شروع میں میں ہر قسم کی عورت سے مستفید ہو جاتا تھا مگر بعد میں ایڈس کے خوف سے میں نے کافی احتیاط برتنا شروع کر دی تھی۔ اسی دوران مجھے ایک اچھوتی لڑکی مل گئی جس سے مجھے انوکھی اور قطعی منفرد لذت ملی۔ اس کے بعد تو میں اچھوتی لڑکیوں ہی کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ مگر موجودہ معاشرہ میں کسی لڑکی کا اچھوتا رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ آزادانہ ماحول مخلوط تعلیم اور ڈیٹنگ وغیرہ کی وباجو نہ کرائے کم ہے۔ والدین اپنی لڑکیوں کو ان کے بوائے فرینڈس کے ساتھ بھیجنا معیوب نہیں سمجھتے ہیں البتہ بعض سمجھ دار مائیں اپنی لڑکی کو کسی لڑکے کے ساتھ بھیجنے سے پہلے مانع حمل کی گولی دودھ میں گھول کر اسے ضرور پلا دیتی ہیں۔ ویسے تو اب آبادی پر کنٹرول کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے انواع واقسام کے طریقے رائج ہیں جن میں سے بعض حد درجہ بے ہودہ بھی ہیں۔ ان طریقوں سے اصل مقصد کا حصول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، البتہ ناجائز حمل کی شرح کافی حد تک کم ضرور ہو گئی ہے، کیونکہ ابھی تک کوئی ایسا قانون نہیں بنا ہے جو غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کو ان طریقوں کو استعمال کرنے سے منع کرے۔ یہ بھی کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک طرف آبادی پر کنٹرول کرنے پر بہت زور صرف کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مردانہ طاقت بڑھانے والے ان گنت کیپسول بازار میں آتے جا رہے ہیں۔ ویاگرا نے تو قبر میں پیر لٹکائے بوڑھوں کو اس قدر جوان کر دیا ہے کہ ان کو دوشیزاؤں کی طلب محسوس ہونے لگی ہے۔ اب تو سنا ہے کہ اس سے بھی طاقتور کیپسول آنے والا ہے اور عورتوں کے لئے بھی اس قسم کے کیپسول بنائے جا رہے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔

میں بتا رہا تھا کہ اس معاشرہ میں کسی لڑکی کا اچھوتا رہ جانا بہت محال ہے۔ اگر پچیس سالہ غیر شادی شدہ لڑکی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کنواری ہے تو فوراً سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ سفید جھوٹ بول رہی ہے یا پھر اس کے بدن میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہے۔ اس لئے میں بارہ سے پندرہ سال کی عمر والیوں کی تلاش کرتا تھا کیونکہ عام طور سے اس رینج کی لڑکیاں اچھوتی ہی رہتی ہیں بشرطیکہ ان کو مجھ جیسا کوئی نہ مل گیا ہو۔ لڑکیوں کے لئے یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ صرف ایک بار کے استعمال سے ہی ان کا تقدس ختم ہو جاتا ہے۔ میڈیکل معائنہ یا مشاق مرد سے ان کی چوری پکڑ میں آ جاتی ہے۔ اس کے برعکس ابھی تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے جو یہ بتا سکے کہ فلاں مرد نے کبھی مباشرت کی ہے یا نہیں اور اگر کی ہے تو کتنی بار؟

مجھے باکرہ کی تلاش میں دقت نہیں ہوتی تھی کیونکہ مجھے ان کی شکل سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا تھا۔ بدصورت لڑکیاں اپنی تعریف کی بہت بھوکی ہوتی ہیں لہٰذا میں ان کی تعریفوں کے پل باندھ کر ان کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتا۔ اس کے علاوہ میں جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو موٹی رقمیں دے کر ان کی لڑکیاں ہتھیا لیتا۔ گویا میں عرب شیوخ کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو باکرہ کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی دولت خرچ کر کے بیک وقت کئی کمسنوں سے شادی کر لیتے ہیں، جب کہ میں شادی وادی کا جھمیلا نہیں پالتا تھا۔ میں ان کی طرح دولت مند بھی نہیں تھا۔

ایک دن میرے ایک بے تکلف اور راز دار دوست نے مجھ سے پوچھا ،"تم کسی لڑکی سے صرف تین چار بار ہی مستفید ہوتے ہو، تو کیا اپنی بیوی....." میں نے ان کا عندیہ سمجھ کر بیچ میں ٹوک کر کہا، "احمقانہ سوال ہے، ارے بھئی وہ میری شریک حیات ہو گی لہٰذا اس کو بار بار استعمال کر کے میں حق شوہریت کی ادائیگی کروں گا۔"

"تم کو نوخیز لڑکیوں کی چاٹ لگ چکی ہے تو کیا تم کسی نوخیز لڑکی ہی سے شادی بھی کرو گے"؟

"نوخیز لڑکیاں محض میرا شوق ہیں مگر میں شادی کسی ایسی بالغ لڑکی سے کروں گا جو واقعی کنواری ہو گی۔"

"اگر وہ کنواری نہ نکلی تو؟"

"تو اسے میں جدید معاشرہ کی ہی ایک دین سمجھوں گا مگر بیوی کو مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا اور اپنی بدقسمتی پر صبر کر لوں گا"۔

"کیا شادی کے بعد بھی تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟"

"نہیں، میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ شادی کے بعد میں بالکل سنبھل جاؤں گا اور صرف بیوی ہی پر اکتفا کروں گا"

"مجھے یقین نہیں ہے"۔

"تم دیکھ لینا"۔

جس لڑکی کے ساتھ میری شادی طے ہوئی اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا بتایا گیا کہ اس کی عمر سترہ سال ہے اور اس نے نسواں اسکول سے ہائی اسکول کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے، وہ سنجیدہ، کم گو، امور خانہ داری میں طاق اور قبول صورت ہے وغیرہ، بظاہر ایسے کوئی لچھن تھے جن سے اس کی سیرت اور کردار پر انگلی اٹھائی جا سکتی (بعد میں یادگار شب کے دوران مجھے اس کے اچھوتے بدن کی تصدیق ہو گئی تھی۔)

ابھی شادی میں چھ ماہ باقی تھے کہ اتفاق سے مجھے ایک کم سن اور حد درجہ خوبصورت لڑکی دستیاب ہو گئی۔ وہ بنگلور کے ایک بہت بڑے تاجر کی اکلوتی اولاد تھی۔ محض پڑھنے کے شوق ہی میں وہ یہاں اتنی دور آئی تھی۔ اس کے ایک قریبی رشتہ دار یہاں تھے مگر چونکہ ان کا گھر اس کے کالج سے بہت دور تھا لہٰذا وہ ہوسٹل میں رہتی تھی البتہ اتوار اور چھٹی کا دن وہ انہیں کے گھر گزارتی تھی۔ ان سے میری بھی علیک سلیک تھی مگر ان کو میری حرکتوں کی خبر نہیں تھی۔ ایک اتوار کو ان کے گھر پر اس سے تعارف ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی میری رال ٹپک پڑی مگر موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے اپنی دلی کیفیات کو چہرے تک نہیں آنے دیا چونکہ میرا گھر اس کے کالج کے قریب تھا لہٰذا انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ہفتہ میں کم از کم دو بار اس کی

خیرت لے لیا کروں اور اس کی انگریزی بھی دیکھ لیا کروں، اندھا کیا چاہے محض دو آنکھیں، چنانچہ میں نے ہفتہ میں دو بار نہیں بلکہ تین چار بار اس سے ملنا شروع کر دیا اور بعد میں روز آنہ اس سے ملنے لگا۔ چند ملاقاتوں ہی میں وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی مگر وہ میرا ادب بھی بہت کرتی تھی کیونکہ وہ میری انگریزی کی علیت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اور حال فی الحال میں اس کی کوئی سبیل ہی نظر آرہی تھی مگر جب دینے والا دینے پر آتا ہے وہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

ہوا یہ کہ ایک دن اس نے بتایا کہ اسے شروع ہی سے پہاڑ دیکھنے کا بہت شوق تھا اور اب پہاڑ کے قریب پہنچ کر یہ شوق مزید بڑھ گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جو بھی اسے پہاڑ گھمائے گا اس کا پورا خرچ وہ برداشت کرے گی۔ کسی غیر مرد کے سامنے ایسی تجویز رکھنا اس کے بھولے پن اور معصومیت کی دلیل تھی۔ مگر میری تو اندھی لگ گئی تھی چنانچہ میں نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ میں نے اسے بتایا کہ سب سے قریب نینی تال ہے لہٰذا وہیں چلنا مناسب رہے گا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ اگلے ہفتہ ہی اس کا کالج دس دن کے لئے بند ہونے جا رہا تھا۔ اس نے بنگلور فون کر کے بتا دیا کہ وہ تعطیلات میں لڑکیوں کے ایک وفد کے ساتھ مسوری گھومنے جا رہی ہے لہٰذا ایک موٹی رقم اسے بذریعہ ٹی، ایم، او، بھیج دی جائے، شاید اس نے مصلحتاً نینی تال کا نام نہیں لیا تھا۔ رقم تو تیسرے ہی دن آگئی مگر میرے سامنے یہ دقت آگئی کہ میرے سب سوٹ ڈرائی کلینر کے پاس پڑے تھے، اس کے وہاں شادی تھی لہٰذا ہفتہ دس تک سوٹ ملنے کا بھی امکان نہیں تھا، ویسے ابھی یہاں سوٹ کی ضرورت نہیں تھی مگر نینی تال کے لئے سوٹ ضروری تھا۔ لے دے کر میرے پاس صرف ایک ٹریڈ کا کوٹ تھا جو نینی تال کے لئے ناکافی تھا۔ مجبور ہو کر میں نے اپنے اسی دوست سے رجوع کیا مگر اس کے بھی سوٹ ڈرائی کلینر کے پاس پڑے تھے، بس ایک سوٹ اس کے پاس تھا، وہی اس نے مجھے دے دیا۔ سوٹ دیکھ کر میں نے بہت برا منہ بنایا مگر مجبوراً اسی پر قناعت کر لی مگر جب اس کو وجہ معلوم ہوئی تو وہ ہتھے سے اکھڑ کر بولا، "کمبخت تو چھ مہینے بھی انتظار نہیں کر سکتا"۔ میں نے کھکھیاتے ہوئے اسکی ٹھڈی پر ہاتھ رکھ کر اس کا غصہ فرد کیا۔

نینی تال میں میں نے ایک خاصے مہنگے ہوٹل میں قیام کیا کیونکہ مفت کی گنگا تھی جس میں مجھے حرام کے غوطے لگانا تھے۔ پہاڑ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں، مزید یہ کہ چند روز میں ہی اسے اپنے خوبصورت بدن کی گونا گوں رعنائیوں کا بخوبی احساس ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو مکمل جوان تصور کرنے لگی اور میرے لئے تو بقول شاعر ؎

وصل تو ممکن ہوا مگر یہ مشکل ہو گئی
اس بت کافر کو شوق روز مرہ ہو گیا

ہر لڑکی کو سیڑھیاں چڑھتے یا اترتے وقت اپنے بدن کے نشیب و فراز اجاگر ہونے کا احساس ہوتا ہے خواہ وہ کسی لباس میں ملبوس ہو، ساڑی میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، ویسے اتنے اجاگر بھی نہیں ہوتے جتنا ہماری دور بینی نگاہیں محسوس کرتی ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے آپ کو کافی لپیٹ اور سمیٹ لیتی ہے۔ بھیم تال میں اس نے بھی یہی کیا مگر لپٹے اور سمٹنے کے باوجود اسے کشتی سے اترنے میں تردد ہو رہا تھا میں نے فوراً سہارے کے لئے اپنا ایک ہاتھ بڑھا دیا مگر سب کے سامنے اسے ہاتھ تھامنے میں جھجک محسوس ہوئی۔ بالآخر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا مگر دوسرے ہاتھ سے اسے لپیٹنے اور سمیٹنے میں مزید پریشانی ہوئی۔ بہر حال وہ بہ مشکل تمام کسی نہ کسی طرح سے اتر کر ٹاپو پر چڑھی۔ حیا کے بوجھ سے اس کی گھنیری پلکیں جھک گئی تھیں اور رخسار گلنار ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ مجھے اس قدر اچھی لگی کہ اگر لوگ باگ نہ دیکھ رہے ہوتے تو میں اس کے یاقوتی ہونٹوں پر ایک بوسہ ثبت کر دیتا۔ اسی موقع کی تصویر فوٹو گرافر نے لے لی تھی حالانکہ نہ تو اس نے اجازت لی تھی اور نہ ہی بعد میں بتایا تھا۔ غنیمت رہا کہ بیوی سے حجت کے دوران فوٹو گرافر خاموش رہا تھا ورنہ بھانڈا ہی پھوٹ جاتا۔ ممکن ہے کہ اس دن اس کے کسی ساتھی نے تصویر لی ہو مگر وہ تصویر اس قدر خوبصورت آئی تھی کہ اگر اس لڑکی سے دوبارہ وہی پوز بنانے کے لئے کہا جاتا تو شاید کبھی کامیاب نہ ہو پاتی۔

میں نے محض اس کی خاطر 'صرف تین چار بار' والا اپنا اصول توڑ دیا۔ اس کی تعطیلات کے اختتام کے قریب اس کے لئے کوئی فرق نہ پڑنے پر جب میں نے یاد دہانی کرائی تو وہ ٹھنک کر بولی، "پلیز چند دن اور"۔ غرضیکہ 'چند دن اور" کے چکر میں کیف و انبساط کے پورے بیس دن گزر گئے۔ وہ کالج میں بتا کر گئی تھی کہ وہ بنگلور جا رہی ہے۔ خیریت رہی کہ اس کی غیر حاضری پر اس کے گھر سے استفسار نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے گھر سے کالج کے وفد کے بارے میں پوچھا گیا۔ کالج میں تاخیر سے پہنچنے پر اس نے اپنی علالت کا بہانہ کر دیا تھا۔ غرضیکہ ہم بال بال بچ گئے تھے۔

نینی تال سے واپس آنے کے بعد میں نے ایک دم سے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے جب بھی مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو میں ہر بار اسے جل دے گیا۔ اس نے اپنے رشتہ دار سے بھی شکوہ کیا تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ شادی کی تیاریوں میں الجھ گیا ہوں جب اسے میری شادی کی خبر ملی تو اس نے فوراً کالج چھوڑ دیا اور بنگلور چلی گئی۔ شاید اس نے جو خواب سجا رکھے تھے وہ چکنا چور ہو گئے تھے، چنانچہ اس نے دل برداشتہ ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد پھر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں نے بھی اسے اپنی زندگی کا ایک بیتا ہوا ورق سمجھ کر بھلا دیا۔

شادی کے چند ماہ بعد ہی میں نے بیوی سے اپنی تمام لغزشوں کا اعتراف کر لیا جن میں تصویر والا واقعہ بھی تھا۔ میں نے اسے یہ بھی یقین دلا دیا کہ شادی کے بعد سے میں ہمیشہ کے لئے سدھر گیا ہوں۔ سب کچھ بہت غور

بقیہ صفحہ ۲۷ پر دیکھئے

مٹھی بھر غزلیں

اشفاق حسین

آوارگی کی راہ پہ ثابت قدم رہیں
اچھا ہے اس نگر میں جو ہم کم سے کم رہیں
کیا لوگ ہیں کہ سانس اکھڑنے کے باوجود
اس جستجو میں ہیں کہ کہیں پاؤں جم رہیں
اک اور شام عہد شکن سر پہ آگئی
اک اور زخم کھانے کو پھر تازہ دم رہیں
کیوں وضعِ احتیاط کریں اختیار ہم
دل زخم زخم ہے تو یہ آنکھیں بھی نم رہیں
اب خود بھی مطمئن نہیں اپنی وفا سے ہم
اب کیوں وفا کے نام پہ زیرِ ستم رہیں
ویسے تو مانتے ہیں نہیں ہیں خدا کو ہم
لیکن یہ چاہتے ہیں کہ اس جیسے ہم رہیں
آ پہونچی ہے یہاں پہ بھی موجِ ہوائے درد
کس سرزمیں پہ جا کے اب اشفاق ہم رہیں

◆

سکونِ دل کی خاطر اک سہارا ڈھونڈتے ہیں
جو گردش میں نہیں ہے وہ ستارا ڈھونڈتے ہیں
یہ سیلِ بے یقینی پار کیسے ہو کہ جب ہم
کنارے پر کھڑے ہیں اور کنارا ڈھونڈتے ہیں
ابھی تو تجھ سے وابستہ ہیں پچھلے زخم سارے
شبِ رفتہ تجھے ہم کیوں دوبارا ڈھونڈتے ہیں
کوئی گھر ہی نہیں تو بے گھری کا زخم کیسا
سکونت کے لئے اک استعارا ڈھونڈتے ہیں
ہماری خواہشِ بے خواہشی جو راکھ کر دے
ہم اپنی شخصیت میں وہ شرارا ڈھونڈتے ہیں
زمیں اچھی لگی ہے آسماں پر جا کے ہم کو
کہاں ہے اس زمیں پر گھر ہمارا ڈھونڈتے ہیں
سروں پر آگیا سورج مگر اشفاق ابھی ہم
سحر ہونے کا ہلکا سا اشارہ ڈھونڈتے ہیں

◆

جبر کے ہر تعمیر شدہ پیکر سے نکلے ہیں
جب سے اپنے گھر کے بام و در سے نکلے ہیں
نرم زمیں اور پانی کے محتاج نہیں ہیں ہم
ہم تو وہ کونپل ہیں جو پتھر سے نکلے ہیں
کوئی تو اپنے جیسا اپنے اندر ہے موجود
اپنی ذات کے باہر کس کے ڈر سے نکلے ہیں
سوچنے والی آنکھیں ہر پل سوچتی رہتی ہیں
درد کے طوفاں آخر کس ساگر سے نکلے ہیں
شور کی چادر کے پیچھے ہے خاموشی کا رقص
کیسے کیسے منظر، پس منظر سے نکلے ہیں
کس سے جنگ لڑیں گے کس کو فتح کریں گے ہم
دشمن کے ہتھیار خود اپنے گھر سے نکلے ہیں
نامانوس فضاؤں کو اشفاق نہ دو الزام
خوف کے جو بھی رستے ہیں اندر سے نکلے ہیں

◆

کھو جاؤں کہیں خلاء میں جا کر
میرے لئے بس یہی دعا کر
اب خواہش سائباں نہیں ہے
لے جاؤ یہ آسماں اٹھا کر
بے گھر کیا کتنی خواہشوں کو
اپنے لئے ایک گھر بنا کر
کاٹی ہے یہ فصل میں نے کیسی
خوابوں کے نگر پہ ہل چلا کر
دنیا کا یہی رہے گا عالم
دنیا کا بہت نہ غم کیا کر
مفہوم بدل گیا خوشی کا
اک شخص کا غم گلے لگا کر
میں غیر ہوں تیرے واسطے اب
اب مجھ سے تپاک سے ملا کر
ہے عمر کی پانچویں دہائی
کچھ کارِ جنوں کی ابتداء کر
کٹتی ہی نہیں ہے رات اشفاق
میں تھک گیا دل جلا جلا کر

◆

کہا کس نے مسلسل کام کرنے کے لئے ہے
یہ دنیا اصل میں آرام کرنے کے لئے ہے
مری حالت پہ محفل میں یہ اظہار تاسف
حقیقت میں مجھے بدنام کرنے کے لئے ہے
محبت اور پھر ایسی محبت جو ہے تجھ سے
چھپائیں کیوں یہ خوشبو عام کرنے کے لئے ہے
کرے گا کون تجھ کو تیری بے مہری کا قائل
یہاں جو بھی ہے تجھ کو رام کرنے کے لئے ہے
بہت چھوٹا سا دل اور اس میں اک چھوٹی سی خواہش
سو یہ خواہش بھی اب نیلام کرنے کے لئے ہے
یہ کارِ عشق میں الجھی ہوئی بے نام دنیا
حقیقت میں نمود و نام کرنے کے لئے ہے
ذرا سا عشق اور پھر اس کا چرچا ہر جگہ پر
تماشائے دلِ ناکام کرنے کے لئے ہے
غزل کہنا اور اس میں اپنے دل کی بات کہنا
یہی کافی ہمیں بدنام کرنے کے لئے ہے
بہت دن رہ چکے نام آوروں کے بیچ اشفاق
اب اپنا نام بس گمنام کرنے کے لئے ہے

◆

دل اک نئی دنیائے معانی سے ملا ہے
یہ پھل بھی ہمیں نقلِ مکانی سے ملا ہے
جو نام کبھی نقش تھا دل پر وہ نہیں یاد
اب اس کا پتہ یاد دہانی سے ملا ہے
یہ درد کی دہلیز پہ سر پھوڑتی دنیا
اس کا بھی سرا میری کہانی سے ملا ہے
کھوئے ہوئے لوگوں کا سراغ اہلِ سفر کو
جلتے ہوئے خیموں کی نشانی سے ملا ہے
خاطر میں کسی کو بھی نہ لانے کا یہ انداز
بپھری ہوئی موجوں کی روانی سے ملا ہے
لفظوں میں ہر اک رنج سمونے کا قرینہ
اس آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پانی سے ملا ہے
اشفاق اسے ہم ہی سمجھتے ہیں کہ ہم کو
کیا سلسلۂ شب کی گرانی سے ملا ہے

● 440 - WELDRICK ROAD , EAST RICH MOND HILL ONT L4B 2M3 CANADA

رفیع حیدر انجم

AZAD NAGAR,
P.O & DIST. ARARIA - 854311



بارش کے بعد

اس شہر میں تبدیل ہو کر آنا میرے لئے خواب جیسا تھا۔ ایک حیرت انگیز اور مسرت آمیز خواب! کئی سے اپنی ملازمت کے سلسلے میں شہروں شہروں پہچان کا رشتہ استوار کرتے کرتے اچانک میں ایک ایسے شہر میں آگیا ہوں جس کے نیلے آسمان تلے یادوں کے خوبصورت اور آوارہ بادل مختلف ٹکڑوں اور صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ کوئی ایک شبیہہ مکمل بھی نہیں ہونے پاتی کہ کوئی دوسری صورت اسے اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ تصویریں اسی طرح بنتی اور بگڑ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی جب میں یادوں کے گھنے اور تاریک جنگل سے گذر رہا ہوتا ہوں، مجھے کچھ چہرے جگنوؤں سے چمکتے نظر آتے ہیں یا پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر کے آسمان پر کوئی ستارا سا ابھی ابھی روشن ہوا ہے اور تاریکی کے گھنے جنگل سے روشنی کی ایک لکیر سی گذری ہے۔ میں روشنی کے تعاقب میں دور تک چلا جاتا ہوں۔ میرا سفر اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ فاصلوں پر قابو پانا میرے اختیار میں نہیں رہ جاتا۔ لیکن آج جب میں نے اپنے سفر کا از سر نو جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ اس سفر پر زادِ راہ کے لئے میرے پاس اپنی ذات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں ایک کامیاب افسر اور ملک کا مشہور و معروف شاعر تو ہو گیا ہوں لیکن عزت، شہرت اور دولت کے باوجود میں اپنی ذات کے مرکز سے کبھی باہر نہیں نکل سکا۔ میں نے جب کبھی دائروں کو توڑنے کی کوشش کی تو میرے اندر کے جذبۂ افسری نے قدم روک لئے اور جب کبھی میرے مداحوں نے اس خود ساختہ دائرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اپنے مرکز و محور میں سکڑ سمٹ کر رہ گیا۔ دراصل میں نے زندگی گذارنے کے کچھ معیار مقرر کر رکھے ہیں لیکن اس معیار پر ہر کوئی پورا اترے یہ قطعی ضروری نہیں۔

خود احتسابی کے اس عمل سے گذرنے اور تمام حالات پر غیر جانبداری سے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ بہتا ہوا پانی نشیب ہی کی سمت جاتا ہے۔ لیکن کیا میں ان دائروں کے باہر آسکوں گا جس نے میری ذات کو محصور کر رکھا ہے؟ کیا میں اس حصار سے باہر آکر اپنے اس دوست تک پہنچنے کی دیرینہ آرزو پوری کر سکوں گا۔ جسے میں کبھی بھول نہیں پایا۔ اور جس کی یاد کبھی جگنو اور کبھی ستارا سی محسوس ہوتی ہے۔

میرے ذہن پر اندیشوں کی کالی کالی بدلیاں سی چھانے لگی ہیں اور میں کچھ مضطرب سا ہو گیا ہوں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے چھ ماہ گذر چکے ہیں اور اس عرصے میں میں ہر روز اپنے اس دوست سے ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا ہوں جس کے ساتھ میں نے اپنی عمر عزیز کا بہترین لمحہ گذرا تھا۔ وہ میرے کالج کے دنوں کا سب سے پیارا دوست تھا کیوں کہ وہ ایک اچھا آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی اچھی نظمیں بھی لکھا کرتا تھا۔ شعر و ادب پر اس کے ساتھ باتیں کر کے مجھے خوشی ہوتی تھی۔ وہ ایک ستھرے ادبی ذوق و شعور اور خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ اس قدرِ مشترک نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے کافی قریب کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف میرا ہمدرد و ہمراز تھا بلکہ زندگی کے تلخ و شیریں لمحات کا واحد گواہ بھی۔ کالج کے لان میں بیٹھ کر ہم نے کئی شامیں گذاری تھیں۔ یہ شامیں کبھی خوش گوار ہوتیں اور کبھی اداس اور بے کیف۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اسی شہر کی سڑکوں، بازاروں اور کوچوں میں ہم نے مل کر کچھ عرصہ بے روزگاری کے کنکر بھی چنے تھے۔ ہم دونوں کی زندگی کے حقیقی رنگ ایک جیسے تھے اور خوابوں کی بے سرو سامانی میں بھی ویسی ہی یکسانیت تھی۔ ہم دونوں نے اپنے حالات کو بہتر بنانے کی یکساں کوششیں کی تھیں لیکن یہ محض قسمت کی بات ہے کہ میں سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا اور وہ ناکامی کے بعد بھی میری خوشی کا جشن مناتا رہا۔ اس کامیابی کے بعد یہ شہر مجھ سے چھوٹ گیا اور میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ترقی کے دو چار زینوں تک اس کے خط مجھے ملتے رہے لیکن پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

اس شہر میں جب میرا تبادلہ ہوا تو میں بہت خوش تھا۔ یہاں آکر سب سے پہلے ایک مقامی ماتحت سے میں نے اس کی ساری تفصیل حاصل کر لی ہے۔ وہ ان دنوں اسی شہر میں ایک بے حد معمولی آدمی کی طرح گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ شاعری اس نے بہت پہلے ترک کر دی تھی۔ اب وہ شعر و ادب کو فضول کا شغل اور تضیع اوقات سمجھنے لگا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ادب میں شہرت، عزت اور مرتبہ اسے ہی حاصل ہو سکتا ہے جسے

اعلیٰ عہدہ یا اچھی خاصی دولت میسر ہو۔ پتہ نہیں، اس کے اس خیال میں کہاں تک سچائی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ اب اسے دو وقت کی روٹی جٹانے کے لئے صبح سے شام تک فٹ پاتھ کی گرمی، بارش اور ٹھنڈک سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اسے کبھی کبھی پولیس کے ڈنڈے بھی سہنے پڑتے ہیں اور اکثر و بیشتر اپنا مختصر اثاثہ سمیٹ کر سر چھپانے کی جگہ بھی تلاش کرنا پڑتی ہے۔ وہ لوگوں کے لئے نظر کے چشمے درست کرتا ہے۔ فریم اور لینس لگاتا ہے لیکن اس کے وجود پر اب تک کوئی ایسی نظر التفات نہیں پڑی جو اس کی زندگی کا رُخ موڑ سکے۔

میں نے تو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے لیکن اسے بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس شہر کا ایک بڑا افسر ہو کر آیا ہوں۔ کیا اس خبر سے اسے خوشی نہیں ہوئی ہوگی؟ کیا وہ مجھ سے ملنے کے لئے خود نہیں آسکتا یا اس نے مجھے بالکل ہی فراموش کر دیا ہے؟...... یہ درست ہے کہ میں اپنے حصار میں قید ہو چکا ہوں لیکن وہ تو آزاد ہے۔ اپنی مرضی کا مالک و مختار...... لیکن نہیں ...... وہ اپنی مرضی کا مالک کب ہے؟ کیا فٹ پاتھ کی زندگی اس نے اپنی خوشی سے اختیار کی ہے؟ پھر بھی اگر وہ مجھ سے ملنے کے لئے آجاتا تو کیا میں ملنے سے انکار کر دیتا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے معلوم ہی نہ ہو کہ میں یہاں ہوں۔ اس کے شہر میں...... اگر واقعی وہ میرے موجودگی سے لاعلم ہے تو اسے اپنا پتہ بتانا میرا فرض بنتا ہے۔ لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو شاید اس کی انانیت مجروح ہو جائے گی۔ وہ اپنی محرومیوں کا شکار ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے، اس کا ضمیر ابھی اتنا ہی روشن ہوگا۔ اسے میرے سوا اور کون بہتر سمجھ سکتا ہے؟ میں اسے حکم دے کر یہاں آنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

میرے ذہن پر چھائی ہوئی کالی کالی بدلیوں نے میرے وجود کو پوری طرح ڈھک لیا ہے اور اب میرا وجود خود میرے لئے بوجھ سا بنتا جا رہا ہے۔ اس بوجھ کو اپنے کاندھوں سے اتار دینے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ مجھے خود ہی چل کر اس سے ملاقات کرنا چاہئے۔ اس کے لئے یہ ایک سرپرائز کی بات ہوگی۔ ویسے بھی میں اس کے لئے افسر تو کبھی بھی نہیں رہا۔ میں اس سے ایک دوست کی حیثیت سے ہی ملوں گا۔ آج فرصت کا دن ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے ملاقات کے لئے ایک عام آدمی کی طرح جاؤں گا۔ میں اپنی کار بھی نہیں لے جاؤں گا اچانک اس کے سامنے آکر اسے حیرت زدہ کر دوں گا۔

یہ سوچ کر میں خود کو بے حد سبک اور تر و تازہ محسوس کرتا ہوں۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کونپل پھوٹنے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے، کوئی غزل گنگناؤں، میں جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے کوارٹر سے نکل پڑتا ہوں۔ برامدے میں کھڑا چپراسی اپنی مستعدی کا اظہار کرتا ہے لیکن میں اسے نظرانداز کرتا ہوا سڑک پر آگیا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور بازار بہت دور بھی نہیں ہے۔ پچیس تیس منٹ میں چہل قدمی کرتا ہوا وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ کچھ لوگ مجھے پہچان کر سلام کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں لیکن میں انہیں نظرانداز کر دیتا ہوں جیسے یہ ہاتھ میرے لئے اٹھے ہی نہیں تھے۔ میں لوگوں کے درمیان سے ایک عام آدمی کی طرح گذرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں۔ سڑک پر تنہا پیدل چلتے ہوئے مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس شہر کی سڑکوں، بازاروں پیڑ پودوں، مکانوں اور لوگوں سے ایک عرصہ بعد انسیت کی تجدید ہونے لگی ہے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد میں فٹ پاتھ پر لگی ہوئی چشمے کی ایک دکان کے سامنے رک جاتا ہوں۔ میری نگاہیں اسے تلاش کرنے لگی ہیں۔ لیکن وہاں مجھے نو دس برس کا ایک لڑکا بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ سنبھل جاتا ہے اور اس کی ہوشیار نگاہیں مجھے ایک گاہک کے طور پر تاڑنے لگی ہیں۔

"آیئے صاحب، چشمہ چاہئے؟" لڑکے نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔

"یہ اسلم پرویز کی دکان ہے؟" میں اس سے دریافت کرتا ہوں۔

"ہاں صاحب...... ابّا ادھر ہی کہیں ہوں گے۔ آپ بیٹھئے نا...."

لڑکے نے ایک تپائی میری طرف کھسکا دی ہے۔ میں اس تپائی پر بیٹھنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ پہنے دبلا پتلا سا ایک آدمی میرے قریب آکر حیرت سے مجھے تکنے لگا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں گہری دھند میں کھڑا ہوا ہوں اور مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ اسلم پرویز ہے۔

"تم نے مجھے پہچانا؟ میں خورشید انور ہوں۔"

"خور.... شید.... ان ...... ور ....." وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"میں ہوں تمہارے کالج کے دنوں کا دوست خورشید۔"

"ارے آپ...... یہاں کیسے؟" وہ ایک لمحے کے لئے جیسے سکتے میں آگیا تھا۔

"تمہیں نہیں معلوم........ میں چھ ماہ سے اسی شہر میں ہوں۔"

"اچھا ......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مجھے بٹھانے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔

"چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔ پھر باتیں ہوں گی۔" میں نے اس کی پریشانی کو سمجھ کر اسے وہاں سے باہر لانے کی کوشش کی۔

موسم ابر آلود تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی پل بارش ہوگی۔ میں اسے لے کر ایک چائے خانے کے اندر آیا تو پھر تھوڑی ہی دیر میں زوردار بارش ہونے لگی۔ ہم دونوں بھی یادوں کی برسات میں بھیگتے رہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا میں جاننا چاہتا تھا کہ اس تیز رفتار زندگی نے اسے کہاں اور کب ٹھوکر ماری؟ کیا وہ اپنے حالات سے مطمئن

بہ خطِ شاعر

بھگوان داس اعجاز

ساحل

ساحل نہیں نگاہ میں، دھند نہ دیتی راہ
کرے کہاں تک سامنا، اک بوڑھا ملاح

ساحل کتنی دور ہے، وہ جانے کس اور
کھو کر آنکھیں جھیل کی، بھٹکا غوطہ خور

ساحل پر طوفان نے دئے جھونپڑے ڈار
ہمت والا بھی کوئی اب اترے گا پار

دیکھ کنارے ڈوبتی، کشتی کتنی بار
اپنی ڈونگا لے چلا، ساحل سے منجدھار

دریا مانگتی بستیاں، اجڑ گئے گھر گھاٹ
بہت بڑھے برسات میں، دریاؤں کے پاٹ

ندیا تٹ میلہ لگا، سبھی گھاٹ پہ ہاٹ
ندیا آئے ناؤ میں، ہاٹ رہے نہ گھاٹ

اجڑا آئے سال بھر، ساحل بیسوں بار
قسمت بنا ساگر تلے، ساگر تٹ پہ جوار

T-451- BALJIT NAGAR,
NEW DELHI- 110008

اقبال فرید میسوری

تہی منزل سا تو پیر ملنا بہت تھا
کہ تیرے سامنے رستہ بہت تھا
لہو کو روشنائی کرتے خوش ہوں
قلم کو دار کا نشہ بہت تھا
وہ بالی عمر کی معصوم خواہش
کہ جب تتلی کو چھو لینا بہت تھا
اب اس کے بعد جو ہوگا سو ہوگا
تری چوکھٹ پہ سر رکھنا بہت تھا
وہ شاید ڈوبنے سے بچ بھی جاتا
سہارا اس کو تنکے کا بہت تھا
دعائیں مانگ کر میں مطمئن ہوں
خدا سے بات کر لینا بہت تھا
بتا ان سے شکایت کیسے کرتا
کہ ان سے دو گھڑی ملنا بہت تھا

P.O.BOX 335, DAMMAM- 31411
(SAUDI ARABIA)

شبنم مناوری

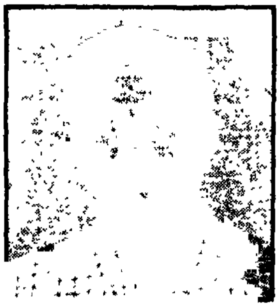
لاشعور

نیند جب تم کو نہ آئے
اور طلب ہو خواب کی
لیٹ کر بستر کسی ہموار پر
پاؤں کے تلوے ملا کر پاؤں سے
انگلیاں ہاتھوں کی کرکے انگلیوں میں دست رس
سر سرہانے کی طرف پیوست کرکے کہنیاں
جسم کو جذب شعور و غور سے
خوب ڈھیلا چھوڑ کر — دونوں آنکھیں بھینچ لو
کیف — مستی — سرخوشی
جسم جیسے ایک بجتا ساز ہے
نیند کی آغوش میں ہو تم لب مدہوش ہو
رائیگاں ہے زندگی اور زندگی کے ذائقے
خواب پنہاں ہیں ازل سے نیند کی آغوش میں

P.O.BOX . 317, RIYADH- 11352
(SAUDI ARABIA)

امین بنجارا

267-JOGI GATE
JAMMU-1 (J & K)



قیامت

"۔۸ر مئی آرہی ہے صاحب۔"

"۔تو........؟"

"۔قیامت ہوگی بھیا۔"

"۔کیا......۸ر مئی کو قیامت ہوگی ——؟

"جی ہاں —— ساری کائنات نیست ونابود ہو جائے گی۔"

"۔یااللہ ——!"

"۔۸ر مئی کو مہاپرلے ہوگا مہاپرلے......"

پوری دنیا کا ناش ہو جائے گا۔"

"۔آپ رہیں گے نہ ہم۔"

"۔اوہ مائی گاڈ۔"

"۔صرف ایک ماہ بعد ——؟"

"۔اُف......یہ قیامت....."

ہر گلی ہر کوچے، ہر گاؤں ہر شہر میں اسی بات کے چرچے تھے۔ گھر ہویا دفتر، اسکول ہو یا کالج، بینک ہو یا ہسپتال، بس اڈہ ہو یا ریلوے اسٹیشن، سبزی منڈی ہو یا فش مارکیٹ، ٹی اسٹال ہو یا پنواڑی کی دوکان، سبھی جگہوں پر موضوعِ گفتگو ۸ر مئی ہی تھا۔

دارالحکومت سے شائع ہونے والے ایک غیر سائنسی میگزین میں چند روز قبل چھپی اس رپورٹ نے، کہ ۸ر مئی کو پوری دنیا تباہ ہو جائے گی، لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ علم نجوم کے ایک ماہر کی اس پیش گوئی کے بعد ملک کے کئی نامور سائنسدانوں نے، بلکہ پوری دنیا کے معروف ماہرین ارضیات وفلکیات نے تحقیقی عمل تیز کر دیا تھا اور تمام تر نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس پیش گوئی کو بالکل غلط، بے بنیاد اور غیر ضروری قرار دے دیا تھا۔ سرکاری سطح پر بھی اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پرائیویٹ چینلو کے ذریعے سائنسدانوں کے اس موقف کو بار بار دوہرایا گیا کہ ۸ر مئی کو قیامت کے آنے کی خبر بالکل جھوٹی ہے مگر پھر بھی ہر طرف دہشت وسراسیمگی کا عالم نظر آرہا تھا۔ کئی معروف جیوتشیوں نے بھی ستاروں کے علم کو گہرائی سے کھنگالنے کے بعد ۸ر مئی کو قیامت آنے کے اندیشے کو مسترد کر دیا تھا لیکن "ڈر" ہر کسی کی رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔

"۔۸ر مئی آرہی ہے صاحب۔"

"۔تو........؟"

"۔قیامت ہوگی بھیا۔"

"۔کیا......۸ر مئی کو قیامت ہوگی ——؟

"جی ہاں —— ساری کائنات نیست ونابود ہو جائے گی۔"

"۔یااللہ ——!"

"۔۸ر مئی کو مہاپرلے ہوگا مہاپرلے......"

پوری دنیا کا ناش ہو جائے گا۔"

"۔آپ رہیں گے نہ ہم۔"

"۔اوہ مائی گاڈ۔"

"۔صرف پندرہ دن بعد ——؟"

"۔اُف......یہ قیامت....."

مجھے حیرت تھی تو صرف اس بات پر کہ آج ایک نجومی کی پیش گوئی پر یہ لوگ قیامت کے نام سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ ان لوگوں کو تو صدیوں پہلے ہی خوف زدہ ہو جانا چاہئے تھا جب قرآن پاک نے انسان کی اخلاقی زندگی کی بنیادوں کو مضبوطی فراہم کرنے اور اس جہانِ فانی میں چار روزہ قیام کے بعد ان کو ہمیشہ ہمیشہ کی ایک زندگی عطا کرنے کے لئے قیامت کی پیش گوئی کی تھی۔ یہ لوگ تب بھی نہیں سہمے تھے جب مالک کل نے طوفان نوح برپا کر کے انہیں قیامت کی جھلک دکھائی تھی۔ ان لوگوں کے دل تب بھی نہیں لرزے تھے جب کربلا کے میدان میں حق کے علمبرداروں کو بھوکے پیاسے شہید کر دیا گیا تھا..... کیا سانحہ کربلا کسی قیامت سے کم تھا ——؟ کیا کشتوں کے پشتے لگاتی ہوئیں رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سبق آموز نہیں تھیں؟ کیا آج بھی ہمارے معاشرے میں قیامت برپا نہیں ہو رہی ہیں؟ ۸ر مئی کو آنے والی قیامت کے تصور سے کانپنے والے لوگ ان قیامتوں کو کیسے برداشت کر رہے ہیں جو فلسطین، شام، سوڈان، افغانستان، عراق، ایران، کویت، سربیا، کوسووا، البانیہ سومالیہ اور یمن میں برپا ہو چکی ہیں —— میں سوچ رہا تھا کہ وہ ڈھیروں قیامتیں ان لوگوں پر تھر تھراہٹ طاری کیوں نہیں کر رہی ہیں جن قیامتوں

نے کشمیر کراچی اور چیچنیا کی فضاؤں کو خوں بار بنا رکھا ہے۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دھرم، مذہب، عقائد، رنگ و نسل اور زبان کے نام پر ایک دوسرے کو کاٹ کھانے والے، مقدس رشتوں کو پامال کرنے والے، زندوں اور مردوں کا سودا کرنے والے، عورتوں کی عصمت و آبرو سے کھلواڑ کرنے والے اور یتیموں اور لاچاروں کا حق مارنے والے یہ لوگ ۸ر مئی کے ذکر سے اس قدر ہراساں کیوں ہیں۔؟ دونوں عالمی جنگیں ان لوگوں نے خود معرضِ وجود میں لائیں تھیں۔ پوری دنیا کی بنیادوں کو ہلا دینے والی اور کروڑوں انسانوں کو نگل جانے والی وہ جنگیں قیامتیں ہی تو تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے جنم داتا یہ لوگ خود تھے۔ اس قیامت کو جھیلنے، بھوگنے اور اس کے لرزہ خیز مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے آج بھی بے خوف و ہراس ہرے اور کیسری پرچم لہراتے پھر رہے ہیں۔ کیا ۱۹۸۴ء کے ہندو سکھ فسادات قیامت سے کم تھے؟ کیا بابری مسجد رام جنم بھومی کا تنازعہ کئی اور قیامتوں کے ظہور پذیر ہونے کا اعلان نہیں کر رہا ہے؟ سندھی مہاجر فسادات، شیعہ سنّی ٹکراؤ اور ہریجنوں اور اعلیٰ ذاتوں کے مابین قتل و غارت ایسے واقعات قیامت خیز نہیں ہیں؟ جب سے یہ کائنات بنی ہے تبھی سے قیامتیں بپا ہو رہی ہیں اور ہر قیامت کے پیچھے ہماری ذہنی و اخلاقی گراوٹ کار فرما ہے ——— رشوت، بے روزگاری، بداخلاقی، بدکرداری، سیاسی پستی، معاشرتی انتشار، تعلیمی پسماندگی، توہم پرستی، فرسودہ رسم و رواج اور ایسی ہی دوسری برائیاں اصل میں قیامتیں ہی ہیں اور ان کے خالق ہم خود ہیں۔ ایٹم، کروز، اسکڈ اور کیمیکل ہتھیاروں کا خالق اور ایک نجومی کی تک بندی پر خوف زدہ ——— بیچارہ انسان !

اصل میں خوف کی سب سے بڑی وجہ بے راہ روی، غفلت اور گمراہی ہے۔ خوف تبھی پیدا ہوتا ہے جب آدمی ہر طرف سے بے خوف ہو جائے اور خدا کے اس وعدے کو فراموش کر دے کہ ایک دن روز محشر، ہوگا...... آخرت ہوگی...... یوم حساب ہوگا ——— شاید یہ لوگ مقدس صحیفوں کی تعلیمات کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ ان کے ایمان ڈگمگا چکے ہیں اور اعمال بگڑ چکے ہیں ——— اللہ بھگوان گاڈ...... غرضیکہ مالک حقیقی کی کسی بھی صورت میں ان لوگوں کا یقین قائم نہیں رہا۔ اسی لئے تو ان لوگوں نے ایک نجومی کی اڑائی ہوئی پر یقین کر لیا۔ اور افسردگی و شکستگی کا شکار ہو کر رہ گئے ———

"۔۸ر مئی آرہی ہے صاحب۔"

"۔تو......؟"

"۔قیامت ہوگی بھیا۔"

"۔کیا......۸ر مئی کو قیامت ہوگی———؟

"جی ہاں——— ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے گی۔"

"۔یا اللہ———!"

"۔۸ر مئی کو مہا پرلے ہوگا مہا پرلے......"

پوری دنیا کا ناش ہو جائے گا۔"

"۔آپ رہیں گے نہ ہم۔"

"۔اوہ مائی گاڈ۔"

"۔صرف نو دن بعد———؟"

"۔اُف......یہ قیامت......"

"۔لیڈیز اینڈ جینٹلمن ——— ایسا کچھ نہیں ہوگا......۸ر مئی کو قیامت کے آنے کی خبر محض توہم پرستی پر مبنی ہے......"

یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ڈاکٹر وششٹ پردھان اساتذہ، طلباء اور اخبار نویسوں کے سامنے شعبہ ہائے فزکس، کیمسٹری، باٹنی جیالوجی اور جغرافیہ کے صدور اور چند ذہین و فطین ریسرچ اسکالروں پر مشتمل اس کمیٹی کی رپورٹ پیش کر رہے تھے جسے وزارت تعلیم کی ہدایت پر ہفتہ بھر پہلے ہی وائس چانسلر نے تشکیل دیا تھا اور اس مسئلے پر غور خوض کر کے چھ دن میں اپنی رپورٹ پیش کرنے کا ٹاسک سونپا تھا۔ دراصل انتظامیہ یہ چاہتی تھی کہ تعلیم یافتہ طبقے کے ذریعے اس پیش گوئی کی تردید کر کے عوام کو بے چینی کے حصار سے باہر نکالا جائے اور ان کا حوصلہ بڑھایا جائے۔

شعبۂ جیالوجی کا صدر ہونے کی حیثیت سے میں بھی اس کمیٹی کا رکن تھا اور شہلا بھی ——— شہلا، وکرم کالونی میں میرے فلیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر رہنے والی اسکول ٹیچر زبیدہ خان کی بیٹی، جو اب زبیدہ آفتاب حیدر بن چکی تھی۔ اپنے پہلے شوہر کی موت کے بعد زبیدہ اپنی اکلوتی بیٹی اور ملازمت کے سہارے زندگی کے ماندہ ایّام گزارنے کی خواہاں تھی لیکن اُس کے ماں باپ نے اسے زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر کے اس کا نکاح آفتاب حیدر سے کر دیا جس کی ٹرانسپورٹ نگر میں اسپیئر پارٹس کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ جس وقت زبیدہ کی دوسری شادی ہوئی اس وقت شہلا نو برس کی تھی...... شوخ، چنچل، ڈال ڈال اِتراتی پھرتی ایک خوش رنگ تتلی ...... لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی حسن و جمال کے اس معصوم سے پیکر نے سادگی کا لبادہ اوڑھ لیا اور اب اس کی کل کائنات کتابوں میں سمٹ کر رہ چکی تھی ——— شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ڈیپارٹمنٹ کی اس ہونہار اور ذہین طالبہ کا اکیڈیمک ریکارڈ قابلِ رشک تھا۔ میٹرک سے لے کے بی۔ بی تک اوّل ...... ایم اے اور ایم فل دونوں میں گولڈ میڈلیسٹ......اور اب میری ہی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔

حصول تعلیم میں اپنی محنت، دلچسپی اور لگن کی وجہ سے شہلا مجھے ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے اسکالروں کی نسبت زیادہ عزیز تھی۔ لیکن اس کی ایک عادت مجھے اچھی نہیں لگتی تھی ——— کھو جانے کی عادت ——— ہنستے، کھیلتے، قہقہے لگاتے یا کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اچانک وہ کہیں کھو جاتی..... دور خلاؤں میں گھورنے لگتی۔ آنکھوں میں

ویرانیاں سی اتر آتیں، چہرے پر اداسی کے بادل چھا جاتے اور اس کی آواز ...... مجھے اکثر یوں لگتا جیسے وہ نہ بول رہی ہو بلکہ الفاظ میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد تھک ہار کر از خود ہی اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے ہوں...... ایک ایک جملہ تعاقب کرتا محسوس ہوتا۔ میں چونکہ اس کا ٹیچر تھا اس لئے میں نے کئی بار اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے کریدنے پر وہ ہر بار "کچھ نہیں سر"، "بس یونہی سر" کہہ کر بات ٹال دیتی ـــــ ابھی کل بھی تو ایسا ہی ہوا تھا جب میں کمیٹی کے دوسرے اراکین سے ملنے کے بعد اپنی رپورٹ مکمل کرنے کے لئے شعبے میں پہنچا تھا۔ شہلا پہلے ہی سے میرے آفس میں موجود تھی۔

"۔ کہو شہلا ـــ تمہاری اسٹڈی کیا کہتی ہے؟"

"۔ سر قیامت ضرور آئے گی۔"

"۔ وہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن میں ۸ر مئی کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔"

"۔ آٹھ کو آئے یا اٹھارہ کو ...... یا پھر ...... اٹھائیس کو ...... لیکن...... لیکن آئے گی ضرور......" وہ ابنارمل ہوتی جا رہی تھی اور میں پریشان ـــــ اُس کی اس عادت سے میں ہمیشہ پریشان رہا تھا۔

"جب قیامت آئے گی نا تو بڑا شور شرابا ہوگا ـــ بلڈنگیں مسمار ہو جائیں گی، آسمان ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا، زمین کا سینہ پھٹ جائے گا، ندی نالے دریا سمندر سب اُبل پڑیں گے۔ ہر طرف آہ و بکا ہو گی ـــ اتنا شور ہو گا کہ کانوں کے پردے پھٹ پڑیں گے ـــ سن رہی ہو نا...... اس روز ذرا کانوں میں کاٹن دے رکھنا ـــ" میں نے اسے نارمل کرنے کیلئے ہنستے ہوئے کہا۔

"۔ کچھ قیامتیں دبے پاؤں بھی چلی آتی ہیں سر ..... " شہلا نے دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں پر رکھتے ہوئے آنکھیں بھینچ لیں۔

"۔ اچھا سنو ـــ " میں نے بریفنگ شروع کر دی۔

"ڈاکٹر شرما نے قیامت کی پیش گوئی کو غیر ضروری اور سائنسی اصولوں کے خلاف قرار دیا ہے اور فزکس والوں کا کہنا ہے کہ ۸ر مئی کے آس پاس کوئی ایسے آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں جس سے یہ گمان ہو کہ قیامت آنے والی ہے....."

"۔ فزکس والے جھوٹ بول رہے ہیں سر...... سب جھوٹ بول رہے ہیں..... قیامت آئے گی اور جلد ہی آئے گی ـــ" شہلا اپنی نشست سے کھڑی ہو چکی تھی۔ اس نے میرے آفس کی دیواروں کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پر بہار چہرے پر اَن گنت خزائیں اُتر آئیں تھیں۔ آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے اور ـــ اور ـــ اس کی آواز ـــ

"شہلا..... شہلا..... سنو..... یہ اچانک تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟"

"۔ سر ..... آفتاب سوا نیزے پر ہے..... گرمی کی حدت بڑھ رہی ہے...... یہ...... یہ قیامت کے آثار ہی تو ہیں....."

شہلا کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

"۔ سر آفتاب سوا نیزے پر ہے۔"

"گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے۔"

"۔ یہ قیامت کے آثار ہی تو ہیں۔"

میں نے اپنی رپورٹ میں قرآن پاک کے حوالے سے لکھا کہ قیامت کو ایک دن وقوع پذیر ہونا ہی ہے اور اس مقدس صحیفے نے قیامت کی جن نشانیوں کو بیان کیا ہے وہ نشانیاں ہمارے ارد گرد کے ماحول میں نظر آ رہی ہیں۔ میں نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا کہ آسمان اور خلاء میں چھوڑے گئے سیاروں کا کسی وقت بھی آپس میں ٹکراؤ ہو سکتا ہے اور یہ سیارے آگ کے طوفان کی طرح زمین پر برس کر اس کو خاکستر کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلاء میں چھوڑے گئے یہ سبھی سیارے زمین سے ٹکرا کر اس کو پاش پاش کر ڈالیں لیکن فی الحال ۸ر مئی کو قیامت آنے کے امکانات دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو اس افواہ پر کان نہیں دھرنے چاہئیں اور نہ ہی اس امر کی تشہیر کرنی چاہئے کہ ۸ر مئی کو پوری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ البتہ میں نے اپنی رپورٹ کے آخیر میں کمپیوٹر ٹکنالوجی کے حوالے سے سائنسدانوں کے اس اندیشے کو ضرور بیان کر دیا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو رات ٹھیک بارہ بجے سارے کمپیوٹر نظام ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے اور یکم جنوری ۲۰۰۰ء کو تمام سٹلائٹس زمین سے ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ یکم جنوری ۲۰۰۰ء کا دن ہی قیامت کا دن ہو...... ایک مسلمان ہونے کے ناطے میرا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا کہ قیامت کسی بھی پل آسکتی ہے اور اپنے سبجیکٹ کے حوالے سے مجھے یقین تھا کہ یکم جنوری ۲۰۰۰ء سے بہت پہلے ہی سائنس دان کمپیوٹر ٹکنالوجی میں پیدا ہونے والے بحران کا حل تلاش کر لیں گے۔ اپنی رپورٹ میں اس امر کے ذکر میں میں نے لوگوں کو راحت کا احساس دلانے کے لئے کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لوگ کم از کم ۸ر مئی کو تو بھول لیں جس نے ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین لوٹ رکھا تھا...... تاہم ڈاکٹر وششٹ پردھان کے ذریعہ کمیٹی کی مشترکہ رپورٹ پیش کئے جانے کے باوجود بھی لوگ سہمے سہمے سے نظر آ رہے تھے۔

"۔ ۸ر مئی آ رہی ہے صاحب۔"

"۔ تو........؟"

"۔ قیامت ہو گی بھیا۔"

"۔ کیا...... ۸ر مئی کو قیامت ہو گی ـــ؟"

"جی ہاں ـــ ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے گی۔"

"یا اللہ ـــ!"

"۔ ۸ر مئی کو مہا پرلے ہو گا مہا پرلے...... پوری دنیا کا ناش ہو جائے گا۔"

"۔ آپ رہیں گے نہ ہم۔"

"۔ اوہ مائی گاڈ۔"

"۔صرف ایک دن بعد——؟"   "۔اُف...... یہ قیامت....."

وکرم کالونی کے لوگوں نے اگلے روز متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ۷ر مئی کی شام سے کالونی کے ایک سرکاری اسکول کی گراؤنڈ میں ایک "دوروزہ سَرودھرم سمیلن" منعقد کیا جائے جس میں ہر مذہب کے پیروکار شریک ہوں اور سب مل جل کر عبادت الٰہی میں مشغول رہیں تاکہ وہ آنے والی ارضی وسماوی آفات سے محفوظ رہ سکیں۔ شہلا کی ماں زبیدہ آفتاب حیدر کالونی کی چند عورتوں کے ساتھ میرے پاس بھی آئی تھی..... کل مذہبی اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دینے میں نے ان عورتوں کو کافی سمجھایا کہ فی الحال ۸ر مئی کو کچھ بھی ہونے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں اور انہوں نے میرے خیالات کی تائید بھی کی تھی لیکن شائد سَرودھرم سمیلن ہی ان کے لئے نجات کا واحد راستہ تھا۔ادھر دل ہی دل میں بھی خوش تھا کہ چلو ان لوگوں کو خدا تو یاد آیا۔

اس شام میں سمیلن میں شریک ہونے کے بجائے بستر پر دراز ہو گیا۔ سونے سے پہلے میں نے سورۂ یٰسین پڑھ کر اپنے آپ پر دم کر لیا تھا۔ میں نے آج سورۂ یٰسین کو دوسری بار پڑھا تھا..... پہلی بار تب..... جب میرے والد حالتِ نزع میں تھے اور آج دوسری بار اپنے آپ کو موت کی سختی سے بچانے کے لئے ممکن ہے قیامت آ ہی جائے۔ لیکن قیامت نہیں آئی۔ ۷ر مئی کی شام بھی گزر گئی اور ۸ر مئی کا دن بھی.... سَرودھرم سمیلن دو دن تک پورے عروج پر رہا۔ کبھی تلاوتِ قرآن کریمہ تو کبھی بائبل کی آیات ، کبھی گیتا کے اشلوک تو کبھی گرنتھ صاحب کا پاٹھ......

دوسرے دن صبح سویرے ہی بینڈ باجوں کے شور نے مجھے نیند سے بیدار کر دیا۔ میں نے بیڈروم کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ سَرودھرم سمیلن کے شرکاء ناچتے گاتے اور مٹھائیاں تقسیم کرتے ہوئے ۹ر مئی کا استقبال کر رہے تھے۔ توبہ کر کر کے ہلکے اور ثواب کما کما کر بھاری ہو چکے یہ لوگ پُرمسرت اور پُرسکون زندگی جینے کا ایک اور چانس پا کر کتنے خوش تھے۔

"۔الحمد للہ..... الحمد للہ۔" میرے ہونٹ بھی غیر ارادی طور پر حرکت میں آ گئے۔

یونیورسٹی جانے کے لئے جب میں گھر سے نکلا تو اچانک خیال آیا کہ شہلا سے ملتا چلوں۔اس کے گھر کا دروازہ کھلا تھا میں اسے پکارتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"شہلا..... شہلا......"

شہلا سامنے ہی دیوار سے پشت لگائے بیٹھی تھی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں کمرے کی دیواروں کو گھورے جا رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر مایوسیوں کے سائے کچھ زیادہ ہی پھیلے ہوئے تھے، ویران آنکھوں میں آنسوؤں کے کئی طوفان ایک ہی ساتھ اُمڈ آئے تھے..... اور اس کی یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔

"۔شہلا.... شہلا لوگ قیامت کے نہ آنے پر باہر خوشیاں منا رہے ہیں، مٹھائیاں تقسیم کر رہے ہیں اور تم یہاں اداس بیٹھی ہو....."

"قیامت تو آ کر چلی بھی گئی سَر......"

"۔کیا.......؟"

وہ ایک دم سے اٹھی اور مجھ سے لپٹنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"شہلا.... کیا ہوا شہلا.... شہلا....؟" میں نے اسے جھنجھوڑا۔

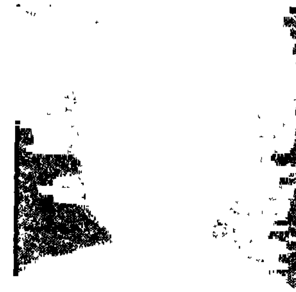
"۔میں نے کہا تھا نا سَر..... کہ آفتاب سوا نیزے پر ہے...... گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے..... قیامت کے یہ آثار میں برسوں سے دیکھ رہی تھی اور میں نے..... برسوں تک اپنے آپ کو اس قیامت سے بچائے رکھا لیکن..... کل رات امّی کے سمیلن میں چلے جانے کے بعد اچانک آفتاب سوا نیزے سے نیچے اتر آیا اور..... اور..... اور اس نے ایسی قیامت ڈھائی کہ میرا سب کچھ..... جل کر راکھ ہو گیا..... میں تباہ ہو گئی سر.... میں برباد ہو گئی......."

"۔یا اللہ....." مجھے یوں لگا جیسے ایک ہی ساتھ کئی قیامتیں مجھ پر بھی ٹوٹ پڑی ہوں۔ اس نے صحیح کہا تھا۔ قیامتیں دبے پاؤں بھی چلی آتی ہیں۔ان کا شور صرف انہی کو سنائی دیتا ہے جن پر وہ گزرتی ہیں۔ قیامت کی ماری شہلا مجھ سے لپٹی ہوئی بے تحاشہ روئے جا رہی تھی اور میں اپنی حیرت زدہ نگاہوں سے اس کے چہرے پر اس قیامت کے آثار تلاش کر رہا تھا جو گزشتہ شب اس پر گزری تھی....... □□

بقیہ صفحہ ۳۵ر بارش کے بعد

ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے بار بار یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ میری بے تکلفی اور اپنائیت کی بوچھار سے محفوظ ہونے کی بجائے احتیاط کی چھتری تانے ہوئے بیٹھا ہے اور اس کی گفتگو میں دوستی کی گرمجوشی کم اور احترام کی آنچ زیادہ ہے۔ ایک طویل عرصے کی مفارقت میں آتے ہوئے فاصلوں نے ہم دونوں کے درمیان ایک انجانی سی دیوار کھڑی کر دی تھی۔اس نے اس دیوار کو گرانے میں اپنی طرف سے کوئی پہل نہیں کی۔ مجھے اس سے ملاقات کی خوشی پر مایوسیوں کے سائے لہراتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں آہستہ آہستہ اُداسی کے گرداب میں ڈوبنے لگا۔

بارش کے تھمتے ہی ہم وہاں سے نکل آئے۔ باہر کی سڑک قدرے نیچی اور جابجا ٹوٹی ہوئی تھی جس میں بارش کا پانی ٹھہر گیا تھا۔ سڑک پر آتے ہی اس نے اپنی چپل اتار کر ایک ہاتھ میں لے لی اور دوسرے ہاتھ سے پاجامے کا پائنچہ گھٹنوں سے اوپر اٹھا کر بڑے آرام سے کیچڑ میں لتھڑتا ہوا چلنے لگا۔ مجھے اس کی گنواروں جیسی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی اور میں سڑک کی دوسری جانب اپنے جوتوں اور پتلون کو پانی اور کیچڑ کی زد سے بچاتا ہوا بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے۔ □□



پنہاں

شکستہ ہیں بہت اعصاب میرے
شگفتہ ہیں مگر سب خواب میرے

ابھی کچھ اور برسیں گے یہ آنسو
ابھی صحرا نہیں سیراب میرے

ہوائیں بادلوں کو لے اڑی ہیں
سمندر ہوگئے پایاب میرے

اندھیرے بُن رہے ہیں میرے اندر
کبھی خورشید اور مہتاب میرے

ذرا چھو کر مرے زخموں کو دیکھو
یہی ہیں اطلس وکمخواب میرے

وہی پلکوں تلک آتے نہیں اب
جو آنسو تھے بہت بیتاب میرے

بس اگلے موڑ پر منزل تھی میری
لٹے جس راہ میں اسباب میرے

کنارے لگنے والی ہے یہ کشتی
یہیں آجائیں سب گرداب میرے

کتابِ زندگی پڑھتی ہوں پنہاں
ادھورے ہیں ابھی کچھ باب میرے

●1752-ALPINE DR., CARRO-LLTON TX. 75007 (USA)



ارمان نجمی

داؤ پہ داؤ لگاتے ہیں
بازی ہارنے جاتے ہیں
ڈور اُلجھتی جاتی ہے
جتنا بھی سلجھاتے ہیں
شعلوں نے جب گھیر لیا
آگ سے ہاتھ چھڑاتے ہیں
کن راہوں پر قدم رکھا
سائے سے گھبراتے ہیں
اُجلے ہیں ان کے ملبوس
دور سے آگ لگاتے ہیں
اڑنے والے طائر بھی
اک دن جال میں آجاتے ہیں
یہ گلیاں تو سونی ہیں
کس کو صدا لگاتے ہیں
سب راہوں کے پھیر میں گم
ہم بھی خاک اُڑاتے ہیں

●AL-DARAB GENERAL HOS-PITOL ALDARAB GIZAN (K.S.A)



شہاب صفدر

کٹ گئے روز و شب مرے، داغ و چراغ ڈھونڈتے
اپنا جواز ڈھونڈتے، تیرا سراغ ڈھونڈتے

دیکھی تھی ای کدن جہاں، آتشِ حُسن گُل فشاں
آنکھوں میں راکھ بھر گئی، پھر وہی باغ ڈھونڈتے

ایک حسیں خیال کو، آئنہ جمال کو
پھر رہے دل پکارتے، شل ہے دماغ ڈھونڈتے

ایسے جیے کہ مر گئے، زیرِ زمیں اتر گئے
جانے اماں گلاشتے، کُنجِ فراغ ڈھونڈتے

کھیل تمام نجت کا، پھیر شہاب وقت کا
رہ گئے میر میکدہ، آج ایاغ ڈھونڈتے

●NEW KAYBER TOWN,
NEAR P.T.I., D.I. KHAN (PAK)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اورفوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۹)

آغا گل

"ہم عصر ادب نمبر" کا واضح مطلب یہ ہے کہ Contemporary Literature اس میں افسانے کی مختلف اقسام ہوں گی۔ سمبالک (Abstract) ،بغیر پلاٹ کے بغیر کرداروں کے۔ خطوط کی شکل میں لکھے گئے افسانے۔ پھر زمانی لحاظ سے افسانے ہر نسل اپنے دور کے مطابق سوچتی اور برتاؤ کرتی ہے۔ تقسیم ہند کے دور کے افسانے سرد جنگ کے دور کے افسانے ۔افسانے پر سیاسی وسماجی اثرات امریکی دباؤ کی وجہ سے افسانوں پر عقیدے کا دباؤ روسی اثرات کے تحت کیموزم کے اثرات، آج کے بکھرے ہوئے مصروف انسان کے افسانے اردو افسانہ لکھنے والوں کا تعارف چند سطور کا۔یا پھر ڈائریکٹری کی نوعیت کا تعارف۔ حروف تہجی کے لحاظ سے اُن کا نام۔اب اس کی روشنی میں دیکھیں تو آپ خود فیصلہ کریں گے۔ حتیٰ کہ دلت افسانہ بھی الگ ہونا چاہئے تھا۔ جب کہ ادب نمبر چند افسانوں کا خصوصی مطالعہ ہے۔یا پھر اس کا نام خصوصی مطالعہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ صرف دوستانہ مشورہ ہے۔ کیونکہ میں بلوچستان یونیورسٹی میں ادب کا استاد رہ چکا ہوں۔

●GUL HOUSE , PINNY ROAD QUETTA-87300 (PAK)

واجد قریشی

شاعر برابر مل رہا ہے۔ تازہ شمارہ دسمبر ۹۹ء میں اپنی غزل دیکھ کر حیرت ہوئی۔ آپ میں PRESERVE کرنے کی صلاحیت کمال کی ہے، تصاویر تو تصاویر کلام تک نہ صرف محفوظ رکھتے ہیں بلکہ یاد بھی رکھتے ہیں۔ تبھی تو ہم عصر نمبر جیسا ضخیم دستاویز منظر عام پر لے آئے۔ بھائی اردو کے دبلے پتلے نحیف وزار قاری پر (جو شاعر کے ہی عام شماروں سے مشابہت رکھتا ہے) آپ کا یہ دستاویز کسی پہاڑ کے وزن سے کم نہیں ہے۔ اس کا پڑھنا، سمجھنا،اور پھر اس پر رائے قائم کرنا کیا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے؟۔ پھر بھی اس نمبر کے متعلق تاثرات نظر سے گذر رہے ہیں۔ لگتا ہے شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ بھی اردو میں "طلسم ہوش ربا" کے قاری پیدا ہو چلے ہیں۔ یا پھر تاثرات برائے تاثرات ہی پیش کئے جارہے ہیں۔

آخر آپ کی اس زبردست محنت کی پذیرائی کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔ یقین مانیے میں اس کا شعری حصہ بھی مکمل نہیں کرپایا ہوں۔ اس کے مشمولات دیکھ کر میر کا شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ جو آپ پر صادق آتا ہے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

●9/3- HAVELI MEER SAHIB, UJJAIN -456006 (M.P)

فرید قریشی سحر

آپ کا یہ ہم عصر اردو ادب نمبر نہیں بلکہ اردو ادب کا تاج محل ہے ایک تاج محل وہ تھا جو مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنی شریک حیات ممتاز محل کی محبت میں تعمیر کیا تھا جس کو دیکھنے کے لئے آج بھی لوگ دور دراز کے ممالک سے آتے ہیں۔ مگر آپ نے بھی اردو ادب کا تاج محل اردو ادب کی محبت میں تعمیر کیا ہے جو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس ادبی تاج محل میں آپ نے نہ صرف غزل و نظم کی صنف کو اجاگر کیا بلکہ ادب کی اردو اصناف کو بھی اجاگر کیا ہے جو ایک مشکل کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے ادب کے پرستاروں اور ادب کے اسکالرر کے لئے ایک مستقل رہنمائی دے گا۔ آپ کے ادبی تاج محل کو دیکھ کر میں برملا یہ کہوں گا کہ آپ نے اپنے والد اعجاز صدیقی اور اپنے دادا جان علامہ سیماب اکبر آبادی کو اس نمبر کی اشاعت سے ایک ابدی زندگی بخش دی۔ لوگ بھول چکے تھے کہ آگرہ اسکول بھی کوئی اسکول تھا جس نے ادب کی آبیاری کی تھی۔ آپ کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ آپ نے آگرہ اسکول کی عظمت کو اُجاگر کیا۔ اس لئے میں آپ کی کاوش کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور آپ کی درازیء عمر کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا کرے (آمین) تا کہ آپ اردو ادب کی مزید خدمت کر سکیں۔

ہم عصر اردو ادب نمبر میں شاعری کے علاوہ آپ نے ادب کے اتنے موضوع جو تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی سوانحی اور تاریخی ہیں ان سب کی یکجائی ایک مشکل کام ہے آپ نے اردو ادب کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کر رکھا ہے میں آپ کے اس نمبر پر تبصرہ لکھوں گا جو طویل ہوگا کیونکہ موضوعات بہت سے ہیں۔ یہ بھی اردو ادب کی خدمت کے مترادف ہوگا۔ آخر میں پھر ایک بار افتخار امام صدیقی صاحب آپ کو اس عظیم کارنامے پر دلی مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ یہ وہ دستاویز ہے جو سنبھال کر رکھی جائے گی جس سے آنے والی نسلیں، قومیں استفادہ کریں گیں۔

●904 - SOUTH CATALINA AVE, 18, LOSANGELES, CA 90006 (U.S.A.)

نظر بریلوی

ہم عصر نمبر پڑھنے کے بعد خط لکھنے کی سوچ خود بخود پیدا ہو گئی۔ لیکن کیا لکھا جائے؟ مواد کی تعریف کی جائے معیار کی تعریف کی جائے ضخامت کی تعریف کی جائے یا ہر باب سے پہلے آپ کے فٹ نوٹ کی تعریف کی جائے جو کہ آپ کی گہری بصیرت کے مظہر ہیں جواب میں تاخیر کے یہی اسباب تھے، ہم عصر نمبر کی تاخیر سے جو شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے وہ ہم عصر نمبر دیکھ کر کافور ہو گئے۔ اور ہم عصر نمبر دیکھنے کے بعد فن پاروں کے انتخاب میں درپیش مشکلات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے یقیناً آپ داد کے مستحق ہیں (لفظ داد یقیناً آپ کی کاوشوں کی تعریف کے لئے کافی نہیں ہے)۔ گو آپ کے بے شمار کارناموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن جس بے لوثی سے آپ نے ہم عصر نمبر نکالا ہے یہ یقیناً ایک اور حیرت انگیز کارنامہ کہلائے گا۔ پھر حصہ دوم وسوم نکالنے کا عزم جزاک اللہ... آپ نے آل سیماب ہونے کا حق ادا کر دیا۔

یوں پرستار وطر فدار میسر ہیں اسے
کون کہتا ہے کہ اردو پہ زوال آیا ہے

●POST. BOX. NO. 9046, IMCO. M.A.B. AHMADI KUWAIT- 61004.



تاباں ضیائی

وہ نکلے گا طریقے سے نکالو
اگر کانٹے کو کانٹے سے نکالو

جہاں میں تجھے تقسیم کرکے
صدی کو ایک لمحے سے نکالو

سمیٹو ایک کوزے میں سمندر
سمندر ایک کوزے سے نکالو

یذیدیت انا کی بس گئی ہے
اسے تم دل کے کونے سے نکالو

اندھیرا پاؤں پھیلانے لگا ہے
ذرا خود کو دریچے سے نکالو

172, AZAD ROAD SANAWAD- 451111 (M.P)



خرم خرام صدیقی

فراق و وصل میں اندیشہ ہائے غم ملے ہیں
محبت میں خوشی کے استعارے کم ملے ہیں

بظاہر جسم و جاں کے واسطے سے بات کی ہے
مگر ادراک کی پہنائیوں میں ہم ملے ہیں

مری گفتار میں عرضِ وفا کے چند تیور
نمایاں تھے مگر پھر بھی اُنہیں مبہم ملے ہیں

یہ خوش فہمی کی عادت اِسقدر مہلک نہیں ہے
اِسی عادت سے زخموں کے ہمیں مرہم ملے ہیں

کسی نے حسرتوں پر ضبط کی تلقین کی ہے
کنارے پھر ہماری آنکھ کے پُرنم ملے ہیں

H.NO. 1-B, BLOCK C., SHAH RUKN-E-ALAM COLONY MULTAN (PAK)



رئیس وارثی

اک لمحہ ٔ وصال تھا واپس نہ آسکا
وہ وقت کی مثال تھا واپس نہ آسکا

ہر اک کو اپنا حال سنانے سے فائدہ
میرا جو ہم خیال تھا واپس نہ آسکا

شاید مرے فراق میں گھر سے چلا تھا وہ
زخموں سے پائمال تھا واپس نہ آسکا

شاید میں اس کو دیکھ کے سب کو بھلا ہی دوں
اُس کو یہ احتمال تھا واپس نہ آسکا

کتنے خیال روپ حقیقت کا پا گئے
جو مرکزِ خیال تھا واپس نہ آسکا

74-13 WOODSIDE AVE, ELMHURST NY 11373

حنیف نجمی

ہیں آنکھیں مگر لطفِ منظر نہیں ہے
کہ مجھ کو یقیں روشنی پر نہیں ہے

مری سوچ پر تبصرہ کرنے والو
مرے جسم پر کیا مرا سر نہیں ہے

کبھی جنگلوں میں بھی مسرور تھے ہم
اور اب عافیت گھر کے اندر نہیں ہے

ہیں یوں منتشر آسماں پر ستارے
کسی کا کوئی جیسے محور نہیں ہے

یہ کس نے متاعِ لہو نذر کردی
کہ شکوہ بلب کوئی خنجر نہیں ہے

FAISAL VILLA, TOWN MODHA-210507 DIST. HAMIPUR - (U.P)



منظور حسرت

زخم تازہ کے لئے دل میں جگہ بھی رکھنا
اور پھر دل میں تمنا بھی کسی کی رکھنا

یہ بھی کیا بات کہ ہر شے میں ملاوٹ کرنا
دردِ الفت، غمِ دنیا سے جُدا ہی رکھنا

وہ تو ملتا ہے فقط اپنی غرض سے ورنہ
اُس کو آتا نہیں اوروں کا تو دل بھی رکھنا

دوسرے لوگوں کے گھر چاند سجانا ہر دم
اپنے آنگن میں سدا غم کی سیاہی رکھنا

یہ بھی کیا سیکھ لیا ہے مرے حسرت تم نے
ہر گھڑی اپنی طبیعت کو خفا سی رکھنا

ENGI. SEC., P.O.BOX 263, ABUDHABI (U.A.E.)

مکتوبات

● شاعر کے گذشتہ شماروں[اکتوبر، نومبر، دسمبر ۹۹ء اور جنوری ۲۰۰۰ء] پر قارئین کے خطوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سب کی سمائی فروری مارچ کے خصوصی شماروں میں نہیں ہو سکی لہٰذا اس شمارے میں صرف دسمبر ۹۹ء کے شمارے پر موصول خطوں میں سے چند ایک شامل کئے جارہے ہیں۔ دسمبر اور دیگر شماروں پر قارئین کی گرانقدر آراء کو مئی ۲۰۰۰ء کے شمارے میں پیش کیا جائے گا۔ شاعر کے صفحات محدود ہیں اور ہم مکتوبات کے باب کو کچھ اور روپ دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ باب مزید LIVE ہو جائے۔ ہم شکر گزار ہیں اپنے ان بے شمار قارئین شاعر کا جو اپنی محبتوں سے بے طرح نوزتے رہتے ہیں۔ شاعر کے مشمولات کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ارسال کرتے رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ قارئین کا بے پناہ خلوص اور تعاون ہمیں اسی طرح ملتا رہے۔ آپ کے خطوں کے ایک ایک حرف، لفظ اور ایک ایک سطر ہمارے لئے اہم ہوتی ہے۔ ہر شمارے کی ترتیب وتہذیب میں معاون ہوتی ہے۔[ادارہ]

محمد عظیم فیروز آبادی

شاعر دسمبر ۹۹ء کے شمارے میں جناب عبداللطیف اعظمی کا تحقیق میں تاریخ کی اہمیت پر ایک گرانقدر مضمون شائع ہوا ہے جس میں صحیح تاریخوں کی اہمیت یا عدم واقفیت کی بنا پر تحقیق کا اصل منشاء ہی فوت ہو جاتا ہے اور اہم واقعات کے تسلسل یا ان کی صحیح سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سنگین غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اس مضمون کے ساتھ آپ نے یہ زیادتی کی ہے کہ اسے ہم عصر اردو ادب نمبر میں شائع نہ کر کے دسمبر ۹۹ء کے پرچے میں جگہ دی ہے اس سے خواجہ احمد فاروقی سے لطیف صاحب کے ملاقات نہ کر سکنے کا واقعہ غلط ہو گیا ہے۔ حالانکہ بریکٹ میں آپ نے اس کی وضاحت کردی ہے لیکن اس واقعہ سے خود صحیح تاریخوں کی اہمیت کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کے ساتھ آپ کے کاتب نے بھی یہ زیادتی کی ہے کہ مضائقہ کا املا 'مذائقہ' لکھا ہے۔ ایسی غلطی لطیف صاحب سے ہو ہی نہیں سکتی۔

●NADIR BUX & CO. FIROZEABAD (U.P)

ستیہ پال آنند

آپ کی تمام نظمیں بہت پسند آئیں۔ اس سلسلے کو شاعر کے ہر شمارے میں جاری رکھئے۔

●606, ADAMS STREET, HEMDON VA 20170 ' 4613 (USA)

سلیم شہزاد

آپ کی نظمیں عمدہ ہیں۔ اسی شمارے میں آپ نے نثری نظموں کے خلاف چند باتیں کسی صاحب کی شائع کی ہیں اور ان پر اپنی نثری نظمیں بھی شامل کردیں۔ مزا آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے اور تروینی جیسی ننھی ننھی چیزوں کے مقابلے میں نثری نظم کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کوئی بڑا تخلیقی تجربہ ممکن ہے۔

●337-MHB COLONY MALEGAON (M.S)

مختار شمیم

آپ کی نظموں نے متاثر کیا[شاعر: دسمبر ۹۹ء] خاص طور سے دوسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں نظمیں اپنی تخلیقیت کے لحاظ سے بھرپور ہیں۔ مختصر نظمیں وسیع تناظر میں وارداتی حسیت کا بہتر نمونہ ہیں۔ سادہ زبان لیکن ترسیل کے تمام تر امکانات کے ساتھ، ان نظموں کی یہی تخصیص ہے۔ سمندر تو آپ کی ذات وشخصیت کا استعارہ ٹھہرا۔ موج در موج ہمیں بھی بے چین کر گیا آخر۔

●F-2, (STAF QUAR) GOVT.GIRLS P.G. COLLEGE , INDORE - 4 (M.P)

ممتاز احمد خان

ستمبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں اپنا مضمون اردو میں معیاری ناول کا مسئلہ دیکھا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اسے برائے بحث شائع کیا۔ اردو ناول کے سلسلے میں کچھ نقادانِ فن بڑے تحفظات رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات کی اکثریت سمجھتی ہے کہ ناول کا ارتقا نہیں ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کے ذہنی افلاس پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ مغرب کے ناول کے مارے ہوئے ہیں ان کی قریب کی نگاہ کمزور ہے مگر سچائی کا اظہار ہو کر رہتا ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جس برصغیر میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، جوگیندر پال، خدیجہ مستور، عزیز احمد، عصمت چغتائی، ڈاکٹر احسن فاروقی، محمد خالد، اختر، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، ذوقی، عبدالصمد، انتظار حسین، بیدی، کرشن، شوکت صدیقی، حیات اللہ انصاری، مستنصر حسین، تارڑ، انیس ناگی اور چند اور ناول نگار ہوں وہاں یہ شکوہ کیا جائے کہ یہاں کوئی ڈھنگ کا ناول کیوں نہیں لکھا گیا ہے؟ اسے کیا نام دیا جائے۔

مذکورہ مضمون بہت پہلے لکھا گیا تھا۔ میں نے بعد میں اسے اپ ڈیٹ کیا تھا اور اس میں اقبال مجید، عبداللہ
شموئل احمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، علی امام نقوی
سیّد محمد اشرف ایسے چند اور فن کاروں کو شامل کیا تھا مگر آ
کے یہاں یہ والا مضمون چھپ چکا تھا۔ بہر صورت بیسہ
صدی کی آخری دہائی سے لے کر اب تک ناول کا موسم
چل رہا ہے۔ اگر کوئی اکادمی ہمارے ناولوں کو 'انگری
'جرمن' 'فرانسیسی' 'روسی' 'چینی اور جاپانی زبانوں میں تر
کردے تو مغرب سے تعریفی آراء یقیناً سامنے آئیں گی
ناولوں کا اب تک ترجمہ ہوا ہے ان کی تعریف میں کی گئی
محض قرۃ العین حیدر کے دو ناول آگ کا دریا اور گردشِ ر
چمن چیلنج بن سکتے ہیں۔

1837/ 14, DATAGIR SOC,
:.AREA, KARACHI (PAK)

عطیہ خان

دسمبر کے شمارے میں ادبی فیچر کے تحت ذکاء ال
شایاں صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ "ان آخری دو دہا
کے اندر یکایک حشرات الارض کی طرح شاعری کے ا
اوراق پر اچانک اتنی بڑی تعداد میں خواتین کا وجود کیسے ہو
جب کہ گذشتہ تین چار صدیوں میں ان کا نام شاعری میں
نظر نہیں آتا" اگر سماجی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس سوال کا جو
آسانی سے مل سکتا ہے۔ گذشتہ صدیوں میں بلکہ اس ص
کے نصف اوّل تک خواتین کو اپنی علمی قابلیت بڑھانے
محروم رکھا جاتا تھا۔ ان کی تربیت صرف گھر گرہستی کا
سنبھالنے ہی کے لئے ہوتی تھی۔ تعلیم قرآن شریف
لینے اور خط لکھ پڑھ لینے تک ہی محدود ہوتی تھی بلکہ
صدی تک تو انہیں لکھنا بھی نہیں سکھایا جاتا تھا کہ نہ جا
کس کو خط لکھ دیں۔ علمی وادبی کتابوں تک ان کی رسائی
تھی۔ شعر وادب کی کتابوں سے انہیں دور رکھا جاتا تھا۔
عروض سے واقفیت کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ پردہ نشین، گ
چہار دیواری میں محصور، علم وادب کی تعلیم سے محروم خوا
بھلا شاعری کیسے کرتیں۔ اگرچہ اسوقت بھی اکثر خوا
تلامیذ الرحمٰن ہوتی تھیں جو فاعلاتن فاعلات، سے ناوا
کے باوجود اچھے اشعار موزوں کرلیتی تھیں لیکن انہیں ا
کلام کی اشاعت کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ان کا کلام گھر کی ر
میں پڑھا جاتا تھا تو ان کا ذکر تذکروں میں کیسے آتا۔

یہ حالت صرف مشرق ہی میں نہیں تھی۔ مغرب میں عورتوں پر بہت پابندیاں تھیں۔ انھیں اپنی صلاحیتوں اظہار کے مواقع نہیں ملتے تھے۔ اگر کوئی عورت کسی معمولی صلاحیت کا اظہار کرتی تو اسے چڑیل قرار دے دیا تھا اور اس کے لئے موت برحق ہو جاتی تھی۔ اسے دریا ڈال دیا جاتا تھا اگر وہ ڈوب گئی تو چڑیل نہیں تھی اگر بچ گئی ڑیل ہونا ثابت ہو گیا۔ پھر اسے سر بازار جلا دیا جاتا تھا۔ زمانے میں عورتوں کی یہ حالت تھی اس زمانے میں وہ ادب میں اپنا مقام کیسے بنا سکتی تھیں۔ بیسویں صدی نصف آخر سے عورتوں کے لئے سطح بزم عالم ہموار ہونا ع ہوئی اور بڑی تیزی سے عورتوں کا وجود زندگی کے ہر میں نظر آنے لگا ہے۔ وہ دن بہ دن اپنی قابلیت کے سکے ی ہیں۔ اس عرصے میں دنیا کے مختلف ممالک میں نیں پہلی بار وزیر اعظم بنی ہیں۔ برطانیہ میں پہلی بار ن اول ایک پروفیشنل خاتون ہیں اور ان کی آمدنی اپنے ٹونی بلیر سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ ہے۔

مشرقی خواتین میں بھی پچھلی چند دہائیوں سے ہی تعلیم چا زیادہ ہوا ہے اور وہ جس طرح زندگی کے دوسرے ں میں نمایاں طور پر نظر آنے لگی ہیں اسی طرح شاعری سیدان میں بھی آگئی ہیں۔ سوال دراصل یہ پوچھنا چاہئے دن بہ دن شاعروں کی تعداد حشرات الارض کی طرح ، بڑھتی جا رہی ہے؟"۔ برطانیہ میں تو اردو داں طبقے کا ، سے بڑا مشغلہ مشاعرے ہی ہیں اور ان مشاعروں میں ین کی تعداد کم ہوتی ہے۔ اور شاعروں کی زیادہ۔ اردو ، رسالوں میں کتابوں کے تبصرے والا حصہ دیکھا جائے۔ ری مجموعوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ان میں ات کے مجموعے تو کم ہی ہوتے ہیں۔ اگر اعداد و شمار اکٹھا جائیں تو شاعرات کی تعداد مشاعروں کی مجموعی تعداد کی ۔ دس سے پندرہ فیصد ہی ہوگی۔ کم و بیش یہی تعداد ں کے اور کئی شعبوں میں بھی نظر آتی ہے۔ سماج میں جو بیاں آ کر رہی ہیں ان کا عکس ادبی دنیا پر پڑنا لازمی ہے۔ غالب، کالی داس اور شیکسپیر جیسے شاعر روز نہیں پیدا تے۔ شاعرات میں ابھی تک اگر کوئی یہ مقام حاصل نہ لی تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آئندہ بھی بلند پائے کی رات پیدا نہیں ہوں گی۔ شاعرات کی بڑھتی ہوئی تعداد یہ کر گھبرانے کے پیچھے شاید یہی اندیشہ ہے "ہے یہ ٹوٹا دانہ کامل نہ بن جائے"

●52, BRENT WAY LONDON, N31AP (U

ـمر جہاں

نیا سال نئی صدی اور نیا ہزارہ مبارک ہو، شاعر کا تازہ شمارہ دسمبر ۱۹۹۹ء ملا، شکریہ حالیہ شمارے میں "ادبیات میں خواتین کا تناسب؟" دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن پڑھ کر ذہن انگنت سوالوں سے بھر گیا۔ (شاید اس عنوان کو پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے) تو اب ان سوالات کا مقابلہ بھی ڈٹ کر کیجئے۔

(۱) "خواتین کیلئے ادب تخلیق کرنا اور خود خواتین کا ادب کی تخلیق میں گذشتہ چند دہائیوں سے یکایک بے تحاشہ شامل ہو جانا، توجہ طلب ہے.... یکایک اس رواں صدی کے آخری حصوں میں خواتین نے شدت کے ساتھ ادبیات کی جانب رخ کیوں کیا ہے....؟"[بحوالہ: ادبیات میں خواتین کا تناسب؟ از ذکاالدین شایاں ماہنامہ شاعر دسمبر ۹۹ صفحہ ۱۰ تا ۱۱]

جواب: میں پوچھتی ہوں کہ اس امر میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، کیا ذکاالدین صاحب کو یہ یقین نہیں کہ ان تخلیقات کی خالق یقیناً وہ کمزور ذات ہے جسے مرد نے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رکھنا چاہا اور ہمیشہ اسے دوسرے درجہ کی شہری کی حیثیت سے درجہ دوئم پر دیکھنا پسند کیا۔ اُن کی ذات اور شخصیت کو ہی نہیں ان کی تحریر اور نگارشات کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا۔ کھلے لفظوں میں اور بھری بزم میں ان کے ہنر کی تعریف کرتے ہوئے بھی شرماتے رہے۔ آخر کیوں۔؟ وہ کون سی ریت اور رواج تھے جس کے تحت انہوں نے بزم شاعری میں خواتین کے داخلہ کو ہی معیوب اور معتوب نگاہوں سے دیکھا اور فن شاعری کو عورتوں کے طبقہ میں صرف شاہدان بازاری تک محدود کر دیا۔ شریف عورتیں جذبات کے اظہار میں کیا بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں آزاد تھیں۔؟ وہ تو خدا بھلا کرے نئے تعلیم یافتہ اذہان اور ترقی پسند شاعر و ادیب کا جنہوں نے آنچل کو پرچم بنا لینے کی ذھن میں شریف عورتوں کو کھلی فضا میں سانس لینے کی آزادی عطا کی۔

(۲) "خواتین کا تخلیقی ادب کیا محض اس لئے منظر عام پر نہیں لایا گیا کہ ادبی مورخین نے اسے پوشیدہ رکھنا چاہا؟ یا حقیقتاً خواتین کا تخلیقی ادب ایسا تھا ہی نہیں کہ قابل ذکر ہوتا، یہ مسئلہ اہل ادب اور اہل فکر کیلئے شدید غور و خوض کا متقاضی ہے....."

جواب: چلئے اسی بہانے عورتوں کے ادب پر غور و خوض تو ہو جائے گا، ورنہ اہل ادب اور اہل فکر کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ خواتین کے ادب کا مطالعہ کریں، ہاں اُن کے نام کا ورد وہ ضرور کرتے ہیں، لیکن ادب کا سنجیدہ مطالعہ ان کے شایان شان شاید نہیں، یہ صورتحال ہنوز برقرار ہے۔ آج بھی خواتین لکھنے والیوں کے قارئین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کافی محدود ہے۔ شایاں صاحب فرمائیں گے کہ ان کا ادب ہی اس لائق نہیں ہے، لیکن یہ بات موجودہ ادبی تناظر میں کہنا کہاں تک صحیح ہے، یہ تو کوئی منصف مزاج قاری ہی کہہ سکتا ہے۔ کم از کم افسانہ اور ناول کے معاملے میں خواتین قلمکار کی قلمی صلاحیت کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، رضیہ فصیح احمد، جیلانی بانو، زاہدہ حنا، ذکیہ مشہدی، شاعری کی دنیا میں پروین شاکر، کشور ناہید، عرفانہ عزیز، ساجدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری وغیرہ۔

(۳) تنقید کے دائرے میں کسی خاتون نقاد کا حوالہ نہیں۔؟

جواب: حوالہ ملے تو کہاں سے، جب نگاہ کو تلاش ہو، دل کو اعتراف ہو جب نا۔؟ مرد لکھنے والوں کی ادنیٰ تحریریں بھی ستائش کے قابل ہوا کرتی ہیں، ان کا اپنا ایک حلقہ ہے تو "مرا حاجی بگو من ترا حاجی بگویم" والا معاملہ ہے۔ عورتوں کا اتنا بڑا ادبی و علمی حلقہ ابھی بھی نہیں ہے۔ ان کی تعلیم نے انہیں ترقی کے زینے پر تو ضرور ڈال دیا ہے مگر ابھی وہ زینہ پر ہی ہیں ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟۔

(۴) "...... لیکن اس دور میں بھی (۱۹۳۶) آخر شاعرات کی پیداوار کیوں التواء میں رہی؟ اس سوال کا جواب کہیں سے تو ملے.....؟

جواب: یہاں بھی اپنی نظر کی تنگی سے سوال کیجئے۔ جس نے شاعرات اردو کے مقام اور مرتبہ کو پہچانا ہی نہیں، ورنہ ایک طویل سلسلہ ہے عہد قدیم سے ہی تذکروں میں بھی اچھی خاصی شاعرات اردو کا ذکر آیا ہے۔ اُن کے نمونہ کلام بھی پیش ہوئے ہیں اور ان نمونوں سے ہی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ؎

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا محض یہی نمونے ان کی تا عمر کی کمائی ہوں گے؟ یا اور بھی بہت کچھ ہوگا جو ان کے بعد کسی قدرداں کے ہاتھوں پڑنے کی بجائے دیمک زدہ ہو کر واقعی خاک ہو گیا۔؟ یا ابھی بھی کسی بند الماری میں پڑا کراہ رہا ہوگا۔ ؟؟ کون جانے یہ قیاس آرائیاں کب حقیقت بن کر سامنے آجائیں،۔ خواتین کے ادب کے سلسلے میں ابھی تو سوالات کا سلسلہ ہی قائم ہوا ہے۔ ممکن ہے آپ کی پُرخلوص کوشش تحقیق و جستجو کے کچھ اور نئے باب کھول دے۔ آمین

●3-BHIKANPUR HATIA,
HAGALPUR - 812002 (BIHAR)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

نا تمام

حسین داد خاں

حسن داد خاں حیدر آباد کے کم گو، کم آمیز اور اس لئے کم مشہور شاعر ہیں۔ "آوازِ شکست" کے بعد یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں زیادہ تعداد میں غزلیں، چند نظمیں اور گنے چنے گیت ہیں۔

حسن داد خاں کسی استاد سے صلاح نہیں لیتے۔ ان کی غزل گوئی اگرچہ روایتی انداز کی ہے مگر اس میں ندرتِ خیال سادگی اور پرکاری ہے۔ زندگی کے تجربے، مشاہدے اور ان سے پیدا ہونے والے محسوسات کی پیش کش میں اثر ہے:

کنجِ تنہائی اِک دشتِ الم ہے کہ جہاں
عمر کٹتی ہے مگر وقت گزرتا ہی نہیں

شکستہ دل تو بہت ہم بھی زندگی میں رہے
مگر یہ کیسے کہیں زندگی سے پیار نہ تھا

چلو دنیا کو ہنسنے کا بہانہ مل تو جاتا ہے
اگر مجھ کو مری دیوانگی سے کچھ نہیں ملتا

لہو سے پاک جن کی آستیں تھی
وہ قاتل مستند مانے گئے تھے

ساتھ ہی ساتھ عصری آگہی کی عکاسی کرنے والے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں:

مسافرِ شبِ غم صبحِ نو پہ ناز نہ کر
ٹپک رہا ہے ابھی دامنِ سحر سے لہو

آؤ کچھ گردشِ دوراں کے لطیفے کہہ لیں
اس قدر تلخیٔ حالات کہاں ملتی ہے

اس عمرِ مختصر کو کہاں مطمئن کریں
صدیوں کے تجربے بھی بہت دل شکن رہے

آج ہم لوگ کسی گہرے سمندر کی طرح
سو گئے تان کے طوفانوں کو چادر کی طرح

چند پابند نظمیں بھی ہیں جن سے آج کل کی بے سروپا آزاد اور نثری نظموں کی یلغار میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس ہوئی۔ خاص طور پر فیض احمد فیض کی وفات پر کہی گئی "گرو کج جبیں پہ سر کفن...." "ہلاکت" "نذرِ شہدائے کربلا" "پیش گوئی" اور "شناخت" قابلِ ذکر ہیں۔ کسی سے اصلاح نہ لینے کے نتیجے میں کہیں کہیں اسقام پائے جاتے ہیں۔ ایک غزل میں قافیہ غلط ہو گیا ہے۔

(ع : آئینہ تھا ایک چہرے تھے بہت۔ جب کہ دوسرے قافیے ہیں، گہرے، پہرے، بہرے۔) کہیں حشو و زائد بھی در آئے ہیں۔ (رات چپ چاپ دبے پاؤں گزر جاتی ہے۔) ایک غزل کی ردیف میں حیدر آبادی زبان نمایاں ہو گئی ہے۔

وہ سات تھا تو ہر اک غم خوشی کے جیسا تھا
اندھیرا گھر کا مرے روشنی کے جیسا تھا

جب کہ ہونا چاہئے تھا: خوشی جیسا، روشنی جیسا، اجنبی جیسا۔

ضخامت: ۱۸۴ صفحات ☆ قیمت: ساٹھ روپے ☆ سن اشاعت: ۱۹۹۷ء ☆ ناشر: مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد ☆ پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد (اے، پی) ☆ **مبصّر: محافظ حیدر**

سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (افسانے)

حسین الحق

حسین الحق کو بیانہ پر قابو ہے۔ وہ اساطیری اور داستانی انداز میں بھی عمدگی سے لکھ سکتے ہیں۔ ملک کی سیاسی صورت حال پر ان کا تجزیہ خوبصورت ہوتا ہے۔ افسانوں میں سریّت کا استعمال انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے علیحدہ کرتا ہے۔ ان خوبیوں کے باوصف انہیں پڑھنا آسان نہیں۔ بارہا غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مختلف اسالیب پر قابو ان کی دشواریوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کے افسانوں پر تصوّف کی چھوٹ تفہیم کی مشکلات کو بڑھا دیتی ہے۔ کبھی کبھی افسانہ پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ افسانے کو وہ اپنے فطری کلائمکس پر لے جائیں شاعرانہ نثر کی بھول بھلیّوں میں کھو جاتے ہیں۔

جہاں وہ مختلف اسالیب کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرتے کامیاب رہتے ہیں جیسے آتم کتھا، نیو کی اینٹ، خارپشت وغیرہ۔ اس مجموعے میں نو افسانے ہیں۔ کوس کوس بیٹھا، فساد کی سنگینی کو بھگت رہے انسانوں پر ہے۔ ا تصوّف کی آمیزش نثر پر قابو کا پتہ دیتی ہے لیکن ت الجھا دیتی ہے۔ بہت کٹھن ہے یہ ڈگر پنگھٹ کی" ا بھی زیادہ پیچیدہ کہانی ہے۔ اس میں اسلامی تصوّف ا ویدانت کی آمیزش کو قاری کے اعتبار کا امتحان ہے۔ ندی کنارے دھواں، بہار کی سیاست پر ایک افسانہ ہے۔

زمینداروں اور بھومی ہاروں کی کش مکش اور ا کمیونسٹوں کا رول ان باریکیوں کو افسانہ نگار نے خو ہینڈل کیا ہے۔ 'خارپشت' بقول مہدی جعفر ایک ا بن گیا ہے جس کا سرچشمہ خارپشت والا کردار ہے کتھا اور نیو کی اینٹ کی طرح یہ افسانہ بھی حسین الح مخصوص انداز کا آئینہ دار ہے اس افسانے میں تصو آمیزش نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ مندرجہ ذیل جملے نقصان پہنچاتے ہیں۔

"سرمہ اپنی کٹی ہوئی گردن لے کر سیٹر ھیا رہے ہیں لاشوں کے درمیان گھومتے نارد کو گدھ عینک دے دی ہے۔ نارد۔ نادھیم۔ تانڈونا چا جار راج ہنس اپنا آخری گیت گا رہا ہے۔ پاگل کتے آدی رہے ہیں"

ایسے بے معنی جملے افسانے کی معنویت کو کرتے ہیں۔

'مردہ لو تھڑے کی حرکت' 'عصری صورت ایک اچھی طنزیہ کہانی ہے اور معاشرے میں بڑھت غلط قسم کی مذہبیت کا پردہ چاک کرتی ہے۔

مہدی جعفر کہتے ہیں" (حسین الحق کے) ا میں بیانیہ کا عنصر تسلسل کا حامل ہے۔ جملے مربوط ہیں۔ البتہ تخلیقی رو سے مکمل آہنگ نظر نہیں آتا"

اس میں شک نہیں کہ حسین الحق عمدہ زبا ہیں۔ تخلیقی نثر پر ان کا قابو قابلِ تعریف ہے۔ افسانوں میں مختلف اسالیب کو آپس میں گڈمڈ نہ ک مزید اچھے افسانے ہمیں دے سکتے ہیں۔

ضخامت: ۲۰۴ صفحات ☆ قیمت: ۶۰ر رو۔

مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: تخلیق کار پبلی کیشنز ☆ پتہ: حسین نئ، سرسید کالونی، نیو کریم گنج۔ گیا (بہار)
☆ مبصر: انور خان

نئی افسانوی تقلیب (مضامین)

مہدی جعفر

بیس سال قبل یہ مقالہ رسالہ 'جواز' (مالیگاؤں) میں شائع ہوا تھا تو قارئین نے بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ نسلی خلیج، رشتوں کا ٹوٹاؤ، داخلیت اور خارجیت، جبلت اور وجدان جیسی اصطلاحوں سے قارئین مانوس نہ تھے۔

یہ بات تو سمجھ میں آئی تھی کہ مصنف پر یونگ (Jung) کا اثر خاصا گہرا ہے۔ لیکن نئے اردو افسانے کی تفہیم میں ینگ کی نفسیات سے استفادہ کرنے والے مہدی جعفر پہلے ناقد تھے۔ اب یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے اور ایک لمبا عرصہ نئے افسانہ نگاروں پر بھی بیت چکا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں پر بھی قاری کی ایک رائے قائم ہو چکی ہے اور اس مقالے کی تفہیم زیادہ مشکل نہیں ہے۔ کتاب کے آغاز میں ہی مہدی جعفر اس امر کی فصاحت کرتے ہیں کہ جہاں شاعری کا وصف لفظوں کی کاریگری اور آہنگ ہے افسانے کی پہچان اس کے طریق کار سے ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں روایتی افسانہ نگاروں نے نگارش کو زیادہ اہمیت دی اس لئے ان کے افسانے ظاہری حسن کے اعتبار سے بہتر نظر آتے ہیں کہ وہ مواد، موضوع، ماحول، کردار نگاری کی جانی پہچانی آراستگی سے مطمئن افسانہ سازی کا اعتبار رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے نئے افسانہ نگار داخل کی بالکل ہی نئی اور انجان راہوں پر گامزن ہوئے جن سے قاری مانوس نہ تھا اس لئے اسلوب، زبان وغیرہ پر سوالیہ نشان لگ گئے۔

آج دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ جو تبدیلیاں قبل صدیوں میں وقوع پذیر ہوتی تھیں۔ اب دہائیوں میں روپذیر ہو جاتی ہیں۔ اسکے نتیجے میں فرد اور معاشرے میں فراق بڑھا ہے۔ اس وجہ سے افسانوں میں داخلیت کا رجحان بڑھا ہے۔ اردو افسانے اس کی ایک نمایاں مثال 'میں' کا کردار ہے۔ ترقی پسند افسانے میں یہ کردار معاشرے کی عمومی خصوصیات کی نمائندگی کرتا تھا اس کے برعکس انور سجاد، سریندر پرکاش، عوض سعید، محمد عمر میمن اور اکرام باگ کے افسانوں کے کردار آج کے فرد کی انفرادی خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں۔

کتاب کے ابتدائیہ میں مصنف نے افسانے کا طریق کار اور تخلیقی رو، نسلی خلیج اور عصری حسیت، داخلیت اور خارجیت، افسانے کی داخلی شخصیت اور زمین، نئے افسانے میں شکستہ ذات وغیرہ عنوانات کے تحت اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے اور مختلف افسانوں کا ذکر کر کے اپنی بات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے کتاب کے دوسرے حصے میں بیدی، قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش، اقبال مجید اور بلراج مین را سے لے کر نئے افسانہ نگاروں اکرام باگ، شوکت حیات، قمر احسن، سلام بن رزاق اور حسین الحق تک انتیس افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ان کے اسالیب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان کے متعدد افسانوں کے حوالے اور اقتباسات دیئے ہیں۔

نئی افسانوی تقلیب، میں ان تمام افسانہ نگاروں پر تفصیلی گفتگو کے بعد وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ نئے اردو افسانے میں داخلیت اور انفرادیت کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ ان کے خیال میں یہ تقلیب اب اپنے اختتامی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ داخلیت میں بند ریشم کا کیڑا اپنے خول کو کاٹ کر آزاد فضا میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔ سریندر پرکاش کا افسانہ بجوکا، شفق کا افسانہ نچا ہوا گلاب اور دوسرے افسانہ نگاروں کا خارجی سطح سے افسانوی بنت کا رجحان اس بات کو تقویت دیتا ہے۔ یہ مقالہ بیس سال قبل شائع ہوا تھا اور اس لحاظ سے ان کا متذکرہ خیال واقعی صحیح ہے کہ داخلیت اور انفرادیت کا یہ رجحان اب پہلے کی طرح شدید نہ ہو کر ایک متوازن سطح اختیار کر چکا ہے۔ بیشتر نئے افسانہ نگاروں کے افسانے اس کی گواہی دیتے ہیں۔

ضخامت: ۲۰۳ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: معیار پبلی کیشنز، کے۔ ۳۰۲، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱ ☆ مہدی جعفر، بی۔ ۵، ۱۳۵، شاستری نگر، بھوپال۔ ۳ ☆ مبصر: انور خان

انتساب

سلطان اختر

انتساب، سلطان اختر کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جو بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آیا ہے۔ غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان اختر نے معاصر شعری محاورے سے اتنا ہی استفادہ کیا ہے جتنا ہماری شعری روایت میں رچ بس سکتا ہے۔ شاید اسی لئے جدید زندگی کی ژولیدگی اور مدنی معاشرے کی منافقت اور معاندانہ رویے کا اظہار وہ شائستہ لب و لہجے میں کرتے ہیں۔ زندگی کا سفر ان کے لئے بھی خوف اور خدشے سے بھرا ہوا ہے لیکن نامساعد حالات کے پیش نظر وہ تجربے کی آڑ میں تخلیق کی ہتک نہیں کرتے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسے تشکیلی فرد سے ملاقات ہوتی ہے جو ناموافق ماحول میں ایک لطیف طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ زندگی کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ ان کی زبان فارسی آمیز ضرور ہے اسے مشکل زبان اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کے تخلیقی تقاضے کی تکمیل کرتی ہے۔

سلطان اختر کا لہجہ جدید غزل کے مانوس لہجے کے قریب ہے لیکن ان کا اپنا کمال یہ ہے کہ وہ مروج بحور میں الفاظ کے انسلاکات سے نئے آہنگ کی تلاش اور تخلیق کر: چاہتے ہیں اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ایک یا دو جگہ ان کے اشعار پر پیش رو شعراء کا سایہ بھی دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ان کا شعر ہے۔

تیرے نہ آنے کا امکان سر بلند سہی
مگر مجھے تو ترا انتظار کرنا ہے

پڑھ کر بے ساختہ فراق مرحوم کا یہ شعر ہے۔

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقین، نہ کوئی امید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

یاد آتا ہے۔ غزل کے فارم میں یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ غزل کے تخلیقی ارتقا میں دلچسپی رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر اچھے شاعر کے یہاں ایک مثالیں موجود ہیں۔ انتساب کی غزلیں پڑھ کر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جدیدیت کو، روایت کی آگہی اور ذات و کائنات کے ادراک کے ساتھ جن شعرا نے قبول کیا ہے سلطان اختر کا نام ان میں نمایاں ہے۔ جن لوگوں کو جدید معیاری غزلوں کے مطالعہ میں دلچسپی ہو انہیں انتساب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: اسی روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۴ء ☆ ناشر: عصری سنگ میل پبلی کیشنز، ۳۔ الفضل منزل کیمپس، مہیندرو، پٹنہ۔ ۶ (بہار) مبصر: شین کاف نظام

کتاب : زار

اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو
مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی ○ ضخامت: ۲۰۰ صفحات ○ قیمت: ۱۲۰/ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: شب خون کتاب گھر، پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد (یوپی)

ہندی/ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین
مصنف: ابو محمد سحر ○ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ○ قیمت: ایک سو تیس روپے ○ مطبوعہ: نومبر ۱۹۹۹ء ○ پتہ: مکتبہ ادب، ۳۹۔ مالویہ نگر، بھوپال ۴۶۲۰۰۳ (ایم پی)

پروفیسر نور الحسن ہاشمی (شخصیت)۔
ترتیب: شاہد ماہلی ○ ضخامت: ۱۱۷ صفحات ○ قیمت: ۵۰ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، ماتا سندری لین، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو کی عوامی روایت [چہاربیت کے حوالے سے]
مصنف: ڈاکٹر شکیل جہانگیری ○ ضخامت: ۲۰۸ صفحات ○ قیمت: دو سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: ای۔ ۷۷/ ۱۱، جہاں پناہ کالونی، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ادب کی تعمیر (مضامین) ———
مصنف: خالد محمود ○ ضخامت: ۲۴۴ صفحات ○ قیمت: ایک سو پچاس روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

حرفِ خط کشیدہ (شاعری) ———
شاعر: ستار صدیقی ○ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ○ قیمت: سو روپے ○ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ○ پتہ: ۵/۴/۱۷۔۵۔۸۔۵ چراغ علی لین، عابڈس، حیدر آباد (آندھرا پردیش)

جھرنا (بچوں کی کہانیاں) ———
کہانی کار: خاور حسن ○ ضخامت: ۴۸ صفحات ○ قیمت: تیس روپے ○ مطبوعہ: اکتوبر ۹۹ء ○ پتہ: گل بوٹے پبلی کیشنز، رحمان کمپاؤنڈ، روم نمبر۔۱، بھایکلہ، ممبئی ۴۰۰۰۱۱

شہرِ تباں (افسانے) ———
افسانہ نگار: شاہدہ وسیم ○ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ○ قیمت: سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ○ ناشر: ادارۂ فکر جدید، ۹۲۴۔ کوچہ روہیلا خان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رانفل (افسانے) ———
افسانہ نگار: نثار راہی ○ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ○ قیمت: ۱۲۵ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ○ پتہ: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، ۳۱۰۸۔ گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶

کانٹوں میں جگنو (شاعری) ———
شاعرہ: میمونہ روحی ○ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ○ قیمت: ۱۲۰ روپے ○ مطبوعہ: یکم نومبر ۱۹۹۸ء ○ پتہ: قرطاس: پوسٹ بکس نمبر ۲۵، فیصل آباد (پاکستان)

بے اصطلاع (مضامین) ———
مصنف: جوگندر پال ○ ضخامت: ۲۱۲ صفحات ○ قیمت: نوے روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ○ پتہ: ۲۰۳۔ منداکنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۱۹

صہبا لکھنوی (شخصیت اور ادبی خدمات) ———
مرتبہ: نکہت بریلوی ○ ضخامت: ۲۹۶ صفحات ○ قیمت: دو سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: ارتقاء پبلی کیشنز منگھو پیر، کراچی (پاکستان)

دھان کٹنے کے بعد (انور عظیم کے منتخب افسانے)۔
مصنف: انور عظیم ○ ضخامت: ۲۹۸ صفحات ○ قیمت: سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: اردو مرکز عظیم آباد، ۲۴۷ ۔ ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ: ۸۰۰۰۲۰ (بہار)

رشید امجد کے منتخب افسانے (افسانے)۔
انتخاب: ڈاکٹر نوازش علی ○ ضخامت: ۱۹۲ صفحات ○ قیمت: ۱۵۰/ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ○ پتہ: دستاویز، مطبوعات ۵، الحجاز پلازہ، اپونگ روڈ،

اعتبارِ حرف (تنقیدی مضامین) ———
مصنف: اقبال مسعود ○ ضخامت: ۱۱۳ صفحات ○ قیمت پچاس روپے ○ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۷ء ○ پتہ: B۔۱۹، احمد آباد پیلس، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (ایم، پی)

ادبی رسائل

ایوانِ ادب (سہ ماہی) ———
مدیرِ اعلیٰ: انیس دہلوی ○ ضخامت: ۲۰۸ صفحات ○ قیمت: ۲۵/ روپے [فی شمارہ] زرِ سالانہ: ۱۰۰/ روپے ○ مطبوعہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ○ پتہ: ۲۹۳۶، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

جہات (سہ ماہی) ———
مدیرِ اعلیٰ: حامدی کاشمیری ○ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ○ قیمت: ۵۰/ روپے ○ زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے ○ مطبوعہ: جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء پتہ: کمپہ راج باغ، سری نگر (کشمیر)

اردو بک ریویو (ماہنامہ) ———
مدیر: عارف اقبال ○ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ○ (اس خصوصی شمارے کی) ۳۰/ روپے ○ عام شما[رہ] روپے۔ زرِ سالانہ: ۱۰۰/ روپے ○ مطبوعہ: فروری ۲۰۰۰ء ○ پتہ: ۳/ ۱۷۳۹ ل نیو کوہ نور، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶

شیش (ہندی میں اردو ادب) ———
ترتیب کار: حسن جمال ○ ضخامت: ۱۵۲ صفحا[ت] قیمت: فی شمارہ بیس روپے ○ زرِ سالانہ: ۷۵/ رو[پے] مطبوعہ: فروری ۲۰۰۰ء ○ پتہ پینا نواس کے پا[س] پورہ جودھ پور ۳۴۲۰۰۲ (راجستھان)

اردو ادب (سہ ماہی) ———
مدیر: اسلم پرویز ○ ضخامت: ۲۰۸ صفحات ○ قیم[ت] روپے ○ مطبوعہ: اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء ○ پت[ہ] ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

انتساب [سہ ماہی۔ ایک شمارہ قاضی مشتاق احمد کے
ترتیب کار: سیفی سرونجی ○ ضخامت: ۱۹۲ صفح[ات] قیمت: ۱۵۰/ روپے [اس شمارے کی قیمت] عام ش[مارہ] روپے ○ زرِ سالانہ: سو روپے ○ پتہ: سیفی لا[ئبریری] سرونج ۴۶۴۲۲۸۔ (ایم۔ پی)

ہلال (بچوں کا رسالہ، ماں نمبر) ———
مدیر: مرتضیٰ ساحل تسلیمی: ضخامت: ۱۰۸ صفحا[ت] قیمت: ۱۵/ روپے ○ مطبوعہ: فروری ۲۰۰۰ء ○ پ[تہ] الحسنات، اولڈ کھنڈ سار، رامپور ۲۴۴۹۰۱۔ (یو۔ پی)

ادبھاؤنا [ہندی ماہنامہ ○ پاکستانی ادب ن[مبر]
مدیر: اجے کمار ○ ضخامت: ۱۴۴ صفحات [جہازی] قیمت: ۲۰/ روپے (خصوصی شمارہ) عام شمارہ: ۱۵/ ر[وپے] زرِ سالانہ: ساٹھ روپے ○ پتہ: ۲۱۔A، انڈسٹریل ایریا، جی ٹی روڈ، شاہدرہ، دہلی ۱۱۰۰۹۵

روداد (ماہنامہ ادبی اخبار) ———
مدیر: انعام الحق جاوید ○ ضخامت: ۱۸ صفحات (جہازی سائز) قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے ○ زرِ سا[لانہ] روپے ○ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ○ پتہ: ہاؤ[س] ۲۳۷، ۱۰۲۔ اسٹریٹ، ۹/۴۔۹، اسلام آباد۔ (پاک[ستان)]

مکتبۂ قصر الادب

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۱واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۷۱

شمارہ — ۵

فون: 3829904

مئی ۲۰۰۰ء

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹روپے

لائبریریوں سے	زر سالانہ
۱۲۰روپے	۱۰۰روپے
معاونین سے	تاعمر خریداری
۲۰۰روپے	۵۰۰۰روپے

خلیجی ممالک	برطانیہ	امریکہ	پاکستان
۶سوروپے	۱۵پونڈ	۲۵ڈالر	۲۵۰روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکر امروز

❋

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شاعر قوم و ملک کا ترجماں ہے تو اسے عوام ہی کی زبان بھی اختیار کرنی چاہئے تاکہ اس کا پیام ہر خاص و عام کی سمجھ میں آسکے اور اس کا کوئی نتیجہ نکل سکے۔ ایسی زبان جس میں شوکت الفاظ سے بلندی پیدا ہو گئی ہو، عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتی اس لئے قابل ترک ہے۔

میں اس مطالبے کو تسلیم کرنے میں سب سے پیش پیش ہوں مگر صرف اس قدر تبدیلی چاہتا ہوں کہ جو نظم یا غزل قوم کو مخاطب کر کے لکھی جائے یا جس نظم میں اجتماعیات کے مسائل سے بحث ہو، اس کا اسلوب بیان عام فہم ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن جہاں ادب برائے ادب کا سوال ہو، ادب اردو کے احیاء و بقا کا مسئلہ پیش نظر ہو، جہاں قدیم موضوعات کے علی الرغم جدید بلند خیالات کی تخلیق مقصود ہو اور جہاں اردو کے ارتقائی ادب کا مظاہرہ مدِنظر ہو وہاں صاف اور سادہ اشعار کام نہیں دیتے۔ شوکتِ الفاظ کو دانستہ شعر میں دخل دینا بُرا ہے۔ لیکن کسی بلند خیال کے لئے بلند الفاظ لانا بھی ناگزیر ہے [دستور الاصلاح - ص:۱۶ - مطبوعہ:۱۹۷۰ء، چوتھا ایڈیشن، کراچی (پاکستان)]

سیماب اکبرآبادی

"ممبئی کے اشاعتی ادارے "ایڈشاٹ" کے لئے یہ بات طے ہو گئی ہے کہ یہ ادارہ جب بھی کوئی کتاب چھاپتا ہے، وہ خود بخود خوبصورت ہو جاتی ہے۔" **(یوسف ناظم)**

"ایڈشاٹ پبلی کیشنز" کی ہر پیش کش نفاست کی ایک نئی شان رکھتی ہے۔" **(ڈاکٹر کرامت علی کرامت)**

"یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ دیدہ زیب، خوبصورت چھپائی، سٹنگ اور پیش کش کی ندرت میں 'ادارہ ایڈشاٹ یورپ اور امریکہ کے مشہور اشاعتی اداروں سے آنکھیں ملاسکتا ہے۔" **(ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی)**



نفیس و دیدہ زیب پرنٹنگ پر
اترپردیش اردو اکادمی سے دوبار ایوارڈ یافتہ
(۱۹۸۶ اور ۱۹۹۸ کی مطبوعات پر)

ادارہ (ایڈشاٹ پبلی کیشنز ممبئی)
اطہر عزیز کی نگرانی میں
اپنی اشاعتی سرگرمیوں کی پندرہویں سالگرہ پر

اپنے ان تمام قلم کار احباب، مصنفین، قارئین اور تاجرانِ کتب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جن کی قدردانی و ہمت افزائی قدم قدم پر شاملِ حال رہی۔

'ایڈ شاٹ' سے اب تک شائع شدہ مطبوعات کی ایک ناتمام جھلک

❖ **پیغمبرانِ سخن** (علی سردار جعفری) ❖ **شعری آگہی** (باقر مہدی) ❖ **مطلعِ حیات** (احسن رضوی داناپوری) ❖ **فکر و فن اور فکشن** (ڈاکٹر یونس اگاسکر) ❖ **نقوشِ عالی** (ڈاکٹر عالی جعفری کی یاد میں) ❖ **دوسری مخلوق** (محمود ایوبی) ❖ **دلت آواز** (یعقوب راہی) ❖ **خواب خواب خلش** (یعقوب راہی) ❖ **ابرکاری** (مقدر حمید) ❖ **دلت کتھا** (وقار قادری) ❖ **نگاہ اور آئینے کے درمیان** (عارف احمد جی) ❖ **شبیرہ** (ممتاز نکہت) ❖ **میری ناکامیاں اور ہومیوپیتھی کی کامیابیاں** (ڈاکٹر مرزا انور بیگ) ❖ **متاعِ سفر** (میر ساجد علی قادری) ❖ **سلسلۂ سود و زیاں** (اطہر عزیز) ❖ **آنگن کی خوشبو** (دیوناگری۔ گنیش بہاری طرز) ❖ **تنہا تنہا** (سید شکیل دسنوی) ❖ **پتھروں کے گیت** (محمود ہاپسری) .... **و دیگر مطبوعات**

ADSHOT
PUBLICATIONS
SANE BUILDING, 2nd FLOOR, 2 NANA BHAI LANE,
FLORA FOUNTAIN, MUMBAI 400 001
TEL: 2042899, 2825883, FAX: 2846716 RES: 8110972

آپ اپنے مسوّدے کو مطبوعہ شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ قائم کریں۔

سرورق

سیماب لفظ اترتا ہے عرش سے

عمل

حامد اقبال صدیقی

❖

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

[قارئین و قلمکار]

۴۲

مکتوبات

تابش دہلوی	مقصود الٰہی شیخ	رفیع الدین ہاشمی
ش۔ صغیر ادیب	سلطان جمیل نسیم	رشید الدین
محمد انصار اللہ	سلطان سبحانی	خورشید ملک
جعفر شیرازی	شکور انور	غلام نبی خیال
حبیب کیفی	افضال نوید	جاوید مخدومی

۴۴

❖

شمارہ ۔ ۵ [مئی ۲۰۰۰ء] جلد ۔ ۷۱

ادبی سحر

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

انشائیہ

بخط شاعر

منتخب نثری نظمیں

آثار لفظ لفظ

نقد و نظر

کتاب بازار

محفل اپنی

یہ تازہ شمارہ

شاعر کا شمارہ مئی ۲۰۰۰ء نذرِ قارئین ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان اور شکر ہے کہ شاعر ماہ بہ ماہ اپنے بے شمار پڑھنے والوں تک پہنچ رہا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔ غیر سرکاری اور غیر تجارتی ادبی رسائل میں شاعر کی یہ اپنی انفرادیت ہے کہ ماہنامہ ادبی رسائل میں وہ سر فہرست ہے۔ شاعر کا اس وقت جو روپ سروپ ہے وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن ہم اسے کوئی اور نیا تخلیقی روپ دینے کے خواہش مند ہیں اور اس کے لئے کوشاں ہیں۔ صفحات میں اضافے کی بابت غور کر رہے ہیں لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے اور قارئین شاعر کے تعاون کے بغیر تو یہ ممکن بھی نہیں ہے حالانکہ موجودہ حجم میں جو متنوع مواد سجایا جا رہا ہے وہ ۶۴ صفحات ہی کا ہے۔ یہی مواد تو اسّی صفحات میں بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو کیفیت ہے اور کیفیت ہی ہمارا اصل مقصد ہے۔

اغلاط اور اغلاط

شاعر کے گذشتہ شماروں میں کمپیوٹر کمپوزنگ اور پرنٹنگ کی کئی ایک نمایاں غلطیاں رہ پا گئی ہیں۔ کم از کم رسالہ شاعر املا اور دیگر تکنیکی غلطیوں سے پاک ایک ادبی رسالہ ہے۔ دراصل کمپوزر اور پریس میں مشین مین کی تبدیلی اور وقت کی کمی کے سبب ایسا ہوا ہے۔ اپریل کے شمارے کا "ترتیب" کا صفحہ اور اسی طرح متن میں کمپوزنگ کی غلطیاں۔ جنوری کے شمارے میں بھی کئی ایک غلطیاں موجود ہیں جیسے عبد العزیز خالد کی رباعیوں میں اغلاط اور سرخی "مٹھی بھر رباعیاں" میں کمپوزنگ کی غلطی۔ ادارۂ شاعر ان تمام اغلاط کے لئے معذرت خواہ ہے اور اپنے دلی افسوس و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے اپنے مسائل ہوتے ہیں اس کے باوجود ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ رسالہ ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہو کمپوزنگ کی غلطیاں کم سے کم ہوں شاعر کی ترتیب و تہذیب اور اس کی کمپوزنگ وغیرہ کو سراہا جاتا ہے ہمیں اپنی تعریف مقصود نہیں پھر بھی ایک مختصر سا اقتباس اپنی بات کی تائید کے طور پر یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

" دیکھا یہ گیا ہے کہ جب ایک ادبی رسالہ زیادہ دنوں تک ایک مخصوص انداز میں شائع ہوتا رہتا ہے تو اس پر ایک ایسی چھاپ لگ جاتی ہے جس سے نہ وہ خود رہائی پا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے قلمکار اس کے ایڈیٹر کو یہ مشورہ دے پاتے ہیں کہ یار بس بہت ہو گیا اب اس ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی ایسا کنکر پھینکو کہ اس کی شکل و صورت بدل جائے اور اس میں نئے گلاب اپنا رنگ دکھانے کو آ جائیں۔ یہ بات ہمارے ایک دور دراز کے ساتھی افتخار امام صدیقی نے سمجھ لی ہے۔ اس کا رسالہ ممبئی (بھارت) سے ستر برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اس نے گذشتہ برس اس رسالے کا ایک بھاری بھرکم نمبر لگ بھگ ۱۳سو صفحات پر مشتمل "ہم عصر اردو ادب نمبر" کے طور پر شائع کر کے ادبی رسائل کی دنیا میں دھماکہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی عام اشاعتوں کا رنگ روپ بھی بدل گیا ہے۔ ہر ماہ اس کے صفحات پر نت نئے افکار و خیالات کی دنیا آباد ہوتی ہے اور کمپیوٹر کو جس عمدہ طریقے سے اس کے ایڈیٹر نے استعمال کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پچاس صفحات کا ہر شمارہ کئی عمدہ نگارشات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے منظر عام پر آتا ہے۔ پھر ہر بار افتخار امام اپنے شمارے کے لئے نئے سے نیا موضوع بھی تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ گذشتہ دو تین ماہ میں شاعر کے دو اہم شمارے پیش کئے جا چکے ہیں جن میں ایک خاص شمارہ "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" سے متعلق تھا اور دوسرا "اردو ادب کا عالمی کا منظر نامہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور اب ماہ دسمبر کے شمارے میں اس کے ادارے نے اپنی ۷۰ویں سالگرہ کے موقع پر ایک اور خوب سیرت اشاعت خاص شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ غرض یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ "

یہ تاثرات ہیں جناب تاج سعید (مدیر: جریدہ، پشاور) کے ہیں جو انہوں نے اے جی جوش کے رسالے ادب دوست (لاہور) کے حوالے سے دیگر رسائل کے ساتھ شاعر کے لئے تحریر کئے ہیں۔ یہ تبصرہ کراچی کے ادبی رسالے "سخنور" کے فروری ۲۰۰۰ء شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اب اس تبصرے کے تناظر میں شاعر کے کسی شمارے میں کمپوزنگ وغیرہ کی غلطیاں خود ہمیں شرمندہ کرتی ہیں۔ بہر حال!۔

ہم عصر اردو ادب نمبر–۲

قارئین شاعر اور قلم کاروں کے استفسارات و تقاضے ہم عصر اردو ادب نمبر-۲ کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ محفل اپنی کے تحت کئی بار اعلان کیا جا چکا ہے کہ خاص نمبر-۲ ضرور شائع ہوگا۔ سابقہ تجربوں کا اعادہ نہیں کرنا ہے۔ کام مکمل ہو جائے گا تو اعلان کر دیا جائے گا۔ کام جاری ہے۔ ابھی تو ہم عصر اردو ادب کی جلد اوّل کے کام ہی کہاں ختم ہوئے ہیں۔ ہندوستان سے باہر پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں اس کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کو پورا کرنا ہے۔

صدی شخصیت

بیسویں صدی میں اردو ادب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نابغہ روزگار اشخاص کا انتخاب آسان نہیں ہے۔ چند لوگ اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پوری ایک صدی پر اثر انداز ہونے والے قلم کاروں کا انتخاب جمہوری طور پر ہو اور اس میں پوری اردو دنیا شامل ہو، اس کے لئے خاکہ بنایا جا رہا ہے اور ہند و پاک ہی نہیں، اردو کی نئی بستیوں کو بھی اس میں شامل کیا جائے گا۔ ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ مکمل انتخاب کے بعد شاعر کا "صدی شخصیت نمبر" شائع کیا جائے گا۔

اردو ادب کی ایک صدی

شاعر کا یہ ایک بالکل ہی انوکھا اور نیا تجربہ ہوگا یہ کام بہت پھیلاؤ لئے ہوئے ہے کیوں کہ اس میں پاکستان اور اردو کی نئی بستیاں بھی شامل رہیں گی۔ ☆☆

Khwaja Ahmad Faruqi
Professor Emeritus
University of Delhi

7, University Road,
University of Delhi, Delhi - 110007
Tel : 236768

2/XII

عزیز کرم میں نے کل ایک خط بھیجا ہے۔ ملا ہوگا۔

ابھی فرحت سلمہا میرے پاس آئی تھیں۔ ان کی یہ درخواست ہے کہ اولیاتِ فاروقی محض ایک خاکہ ہے۔ اس کو مضمون کے طور پر ان کے نام سے ہرگز شائع نہ کیا جائے۔ البتہ اس مواد کو آپ خود جس طرح چاہیں استعمال کرلیں۔ اس کی اجازت ہے۔ یہی بات میں نے کل کے خط میں لکھی تھی۔ اب اس کی مزید وضاحت اور صراحت ہوگئی۔

خدا کرے آپ کا منسلع بخیر ہو اور آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔ آپ کے لیے ایک مضمون لکھا رکھا ہے۔ کاغذات میں کہیں رل گیا ہے۔ بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد سے میری زندگی نہایت بے ترتیب ہوگئی ہے۔

آپ کا خواجہ احمد فاروقی،

خواجہ احمد فاروقی بنام افتخار امام صدیقی

اُردو کے صاحب اسلوب نقاد و ادیب خواجہ احمد فاروقی مرحوم [پ: ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۷ء — م: ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۵ء] نے خاکسار کو کئی ایک خط لکھے تھے۔ یہ خط ان میں سے ایک ہے۔ مرحوم کو علامہ سیماب سے عقیدت تھی اور ان سے مراسلت بھی بعینہٖ قبلہ اعجاز صدیقی سے محبت اور مراسلت بھی۔ اسکے بعد خاکسار سے بڑی شفقت فرماتے تھے۔ گویا ایک ہی خاندان کی تین نسلوں سے دیرینہ روابط تھے۔ شاعر پر ان کی محبتوں کا قرض باقی ہے۔ بہت سارے خطوط وغیرہ محفوظ ہیں۔ "اولیاتِ فاروقی" بھی فرحت صاحبہ مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ اس خط پر تاریخ اور مہینہ درج ہے لیکن سنہ نہیں دیا گیا ہے۔ خاکسار کے پاس خواجہ صاحب کے جتنے بھی خط ہیں ان میں سے اکثر میں سنہ نہیں ہے شاید عادتاً تحریر نہیں کرتے تھے۔ یہ خط غالباً ۱۹۹۰ء کے قبل کا ہے۔ [الف الف]



اختر سعید خاں

ہر نفس سعیِ ضبطِ حال میں تھے
جینے والے ترے وبال میں تھے
اشک بھی چشمِ انفعال میں تھے
آج وہ جانے کس خیال میں تھے
ہم تھے اور آرزوئے سیرِ بسیط
پاؤں زنجیرِ ماہ و سال میں تھے
فرصتِ یک نظر تھی ساعتِ دید
خواب کیا کیا مرے خیال میں تھے
وہ جو سنتے تو ذکرِ غم ہی نہ تھا
لاکھ مضمون عرضِ حال میں تھے
کوئی ہمساز دل بھی ہوتا کاش
رنگ کتنے ترے جمال میں تھے
زندگی دیکھ کر قدم رکھنا
ہم بھی اس راہِ پائمال میں تھے
تجھ سے نزدیک تھے نہ تجھ سے دور
ہم تو ہر رنگ اپنے حال میں تھے
روز و شب ممکنات کے اختر
گردشِ حلقۂ محال میں تھے

● INSIDE ITWARA , ALLAHABAD
BANK ROAD, BHOPAL-462001(M.P)



بشیر بدر

تری جنت سے ہجرت کر رہے ہیں
فرشتے کیا بغاوت کر رہے ہیں
ہم اپنے جرم کا اقرار کر لیں
بہت دن سے یہ ہمت کر رہے ہیں
وہ خود ہارے ہوئے ہیں زندگی سے
جو دنیا پہ حکومت کر رہے ہیں
زمیں بھیگی ہوئی ہے آنسوؤں سے
یہاں بادل عبادت کر رہے ہیں
فضا میں آیتیں مہکی ہوئی ہیں
کہیں بچّے، تلاوت کر رہے ہیں
پرندوں کے زمیں و آساں کیا
وطن میں رہ کے ہجرت کر رہے ہیں
میں اپنے بھائیوں سے مختلف ہوں
وہ دنیا سے محبت کر رہے ہیں
ہماری بے بسی کی انتہا ہے
کہ ظالم کی حمایت کر رہے ہیں
غزل کی آگ میں پلکوں کے سائے
محبت کی حفاظت کر رہے ہیں
ہمارے محترم تنقید والے
امانت میں خیانت کر رہے ہیں

● 11.REHANA COLONY, IDGAH
HILLS, BHOPAL-462001(M.P.)



محمد علوی

وسوسے

سرخ بتی آسمان میں
جھبک جھبک ہو رہی
اتنی رات گئے جہا
کس شہر سے آ رہا
کون سے شہر جا رہا
جہاز میں بیٹھے مسا
کن خیالوں میں کھوئے ہ
جاگتے ہیں کہ سوئے ہ
مسافروں میں کو
ہائی جیکر تو نہیں
اُڑتے اُڑتے جہا
گر نہ جائے کہیں

15/1, PARK PALACE
ARIRA KUNJ SOCIETY,
ALDE, AHMEDABAD-380
07(GUJRAT)

انگریزی غزل، اردو زبان کے خدوخال
اور ایک ادبی بدعت کے حوالے سے.....

ادبی فیچر

ادبی فیچر کے تحت گذشتہ شماروں میں غزل کے بارے میں جو مباحث آرہے تھے اسے پسند کیا جارہا ہے۔ غزل سے متعلق اور بھی مباحث موصول ہو رہے ہیں لیکن فی الحال انکی اشاعت نہیں کی جارہی ہے کیوں کہ جرعات میں یا ادبی فیچر کے ادارتی شذرات میں غزل کے جس کردار کو موضوع کیا جارہا ہے اس پر گفتگو کے بجائے کتابی، رسالی باتیں زیادہ کی جارہی ہیں۔ ہماری بحث کتب و رسائل میں تخلیق کی جانے والی معاصر اردو غزل نہیں ہے۔ آج کی غزل کتنی معیاری اور غیر معیاری ہے اس کا تعلق غزل کاروں اور شاعری کے نقادوں سے ہے۔ غزل مخالفین بھی اسی دائرے میں آتے ہیں۔ انہیں چونکہ نظم کا (آزاد و نثری نظم) دفاع کرنا ہے لہٰذا صنف غزل کی روایت اور اس کے بے پناہ تخلیقی جوہر سے انکار ضروری ہے مگر یہ مباحث بھی فی الحال ہمارا موضوع نہیں ہیں کتابی، رسالی شعراء اور انکے نقاد حضرات ابھی اپنی میکانیکی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ لہٰذا غزل کے اس کردار کی بات ہی نہیں کررہے جس کا ہم بار بار ذکر کررہے ہیں۔ ہم تو معاصر اردو غزل پر بھی نیا تنقیدی مکالمہ قائم کرنا چاہتے ہیں کہ اب تخلیق کی جانے والی غزل کیا ہو؟۔ دراصل معاصر غزل کئی سمتوں میں سفر کررہی ہے۔ معیاری و غیر معیاری کتب و رسائل کی غزل، مشاعروں میں سنائی جانے والی غزل، فلموں میں غزل، غزل گائیکی کے لئے منتخب کی جانے والی غزل، ہندوستان کی دیگر زبانوں میں تخلیق ہونے والی غزل، پاکستان میں اردو غزل اور اردو کی نئی بستیوں کی اردو غزل۔ معاصر غزل کو ان تناظر میں نہیں دیکھا جارہا ہے۔ کوئی تقابلی مطالعہ سامنے نہیں آرہا ہے۔ شاعری کے نقادوں نے خالص غزل کی تنقید نہیں لکھی چنانچہ ہندوپاک کے بعض نقادوں نے اپنی پسند کے چند نام منتخب کر لئے ہیں اور سطرف سے آنکھیں بند کر کے ان ناموں کی تعریف و توصیف میں گم ہوگئے ہیں۔ بعض ادبی رسائل کے مدیران کا عمل بھی یہی ہے جبکہ گم ہوتے ہوئے رسم الخط کے ساتھ اردو کا چلن بول چال کی زبان کے طور پر بڑھ رہا ہے اور غزل سفر کررہی ہے، وہ چاہے جس معیار کی بھی ہو۔ الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ جڑنے والی غزل کا روپ سروپ بھی بول چال کی اردو (جس میں ہندی کے وہ الفاظ جو مشترکہ 'ہندوستانی' تہذیب کا تصور دیتے ہیں) کے ساتھ بن رہا ہے۔

غزل کو اردو زبان اور ہندوستان کا فخر نہ سمجھنے والے ہندوستانیوں میں خود اردو کے قلمکار و نقاد حضرات اپنی اپنی دانشوری کے زعم میں جس مسلسل نقصان سے گذر رہے ہیں اسکا انہیں احساس ہی نہیں ہو رہا ہے جبکہ غزل اپنے طور پر اپنی زندگی کا دفاع کررہی ہے اور دوسری زبانوں کی طرف بڑھ رہی ہے اور برابر اپنے امکانات روشن کررہی ہے۔ گزشتہ دنوں سفر برطانیہ کے دوران بریڈفورڈ کی ایک شعری نشست میں افسانہ نگار قیصر تمکین نے "THE PARIS REVIEW"(AUTAMM99) کا تازہ شمارہ دکھاتے ہوئے کہا کہ اس میں انگریزی زبان میں غزلیں آئی ہیں۔ راقم الحروف نے سمجھا کہ غزل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہوگا، لیکن جب شمارۂ مذکور کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو انگریزی میں غزلیں کہی گئی ہیں اور شاعر ہیں SHRON BRYAN اور DAVID HALL غزلوں کی تعداد چار ہے اور ان میں بحر، قافیہ، ردیف یعنی غزل کا پورا ظاہری و باطنی نظام موجود ہے۔

THE PARIS REVIEW میں شامل یہ چار غزلیں بہت بڑا سوالیہ نشان ہیں ان لوگوں کے لئے جو غزل کے مخالف ہیں، ان نقادوں کیلئے جنہوں نے صنفِ غزل کے لئے کچھ نہیں کیا اور مغربی شاعری اور اسکی تنقید سے بے طرح مرعوب رہے۔ یہ سوالیہ نشان ان لوگوں کے لئے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ غزل کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ انگریزی کی یہ چار غزلیں کس معیار کی ہیں اس سے قطع نظر صرف اس امکان پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غزل دنیا کی بڑی زبانوں میں بھی تخلیق کی جاسکتی ہے اور ہم نے اس امکان پر نہ تو کبھی سوچا اور نہ ہی عمل کیا۔ شاعر کے آئندہ کسی شمارے میں انگریزی کی چاروں غزلیں شائع کی جائیں گی اور دیگر مباحث بھی پیش کئے جائیں گے۔

ذیل میں جو چار مختصر مضامین دئے جارہے ہیں ان میں سلیم شہزاد کا مضمون عطش درانی کے مضمون کے جواب میں ہے اور مستقل بحث کا موضوع ہے۔ مظہر الزماں خاں نے تخلیق، تخلیق کار، نقاد اور قاری کے اشتراک سے جن فکری شذرات کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ غور طلب ہے۔ سید تقی عابدی نے آج کے اردو سماج کی ایک خاص بدعت پر مختصر مختصر اظہار خیال کیا ہے اس پر بھی مکالمہ ہونا چاہئے کیوں کہ جس طرح سے آج کتابوں کا سیلاب آیا ہوا ہے اور سہ ماہی ادبی کتابیں آرہی ہیں۔ ان میں معیاری ادبی کتابیں اور ادبی رسائل گم ہو رہے ہیں۔

محترمہ خیر النساء کا ترجمہ کسی اہم کتاب پر تفصیلی تبصرے کے ذیل میں آتا ہے اور پورے تبصرے میں الفاظ کی مناسب مجموعی تعداد اور اس نوع کے تبصروں کی شمولیت ادبی فیچر کے لئے اپنا جواز فراہم کررہی ہے۔ [الف الف]

پاکستانی اردو کے خد وخال

سلیم شہزاد

عطش درّانی کے مضمون "پاکستانی اردو کے خد و خال" کو اساس بنا کر (الف الف) صاحب نے جو مکالماتی فضا تیار کی ہے اس کے تعلق سے اردو کے متغیر لسانی منظر نامے کے ضمن میں موصوف کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے درّانی کا مضمون کسی کیفیت کے غلبے میں پڑھا اور ماہرینِ لسانیات، نقادانِ ادب، اساتذۂ زبان و بیان، ماہرینِ لغت نویسان (یہاں "نویسان" لکھنے کی ضرورت نہ تھی) اور قارئینِ ادب سے فتویٰ طلب کیا ہے۔ چونکہ خاکسار بزعم خویش خود کو زبان و ادب کا طالب علم اور قاری سمجھے ہے اس لئے جناب (الف الف) کی ترغیب پر چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

درّانی کا پہلا ہی جملہ کہ:-

اردو برّصغیر کی زبانوں، بولیوں، روز مرّوں، محاوروں، بول چال، شعر و ادب اور علم وتحقیق کی ایک ایسی مشترکہ تہذیبی میراث ہے جو اپنے بولنے والوں کی وجہ سے نہیں بلکہ استعمال کرنے والوں کے باعث پہچانی جاتی ہے۔

اسرافِ لفظی اور ابہام خیال کی بُری مثال بن گیا ہے۔ ایک زبان (اردو) کسی علاقے (برِ صغیر) کی متعدّد زبانوں اور بے شمار بولیوں، شعر و ادب اور علم و تحقیق کی "مشترکہ تہذیبی میراث" کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے حضرت عطش کا جو واضح کرتا ہے کہ اردو برِصغیر کی تمام آریائی در اوڑی تہذیبوں کی دین ہے۔ جبکہ اردو کی نمود اور اسکے ارتقاء کی تاریخ اسے عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستان کی بعض ہند آریائی زبانوں (پراکرتوں) کے ارتباط و انجذاب کا نتیجہ ظاہر کرتی ہے "زبانوں، بولیوں، روزمرّوں، محاوروں، بول چال" جیسی اصطلاحات کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا کام کیا ہے درّانی نے اور میں اِسے اسرافِ لفظی سمجھتا ہوں کہ جو بولی ہے کم و بیش فرق سے وہی محاورہ اور بول چال بھی ہے۔ اور یہ سب ایک زبان (جسے معیاری زبان کہا جاتا ہے) کے مظاہر ہیں یقیناً ان سے زبان کے تہذیبی عناصر و عوامل کا اظہار بھی ہوتا ہے اور انہیں "تہذیبی میراث" کہنا بجا نہیں مگر کوئی زبان (بشمول اردو) جسے ماہرین ایک جدید زبان تسلیم کرتے ہوں کسی لسانی علاقے (مثلاً برِصغیر) کی متعدّد قدیم زبانوں اور بولیوں وغیرہ کی واحد اور منفرد میراث نہیں ہو سکتی۔ اردو پر یقیناً جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں مگر اردو لازماً کسی دراوڑ۔ تہذیب کی میراث نہیں۔ ان اثرات کا ایک عرصہ گذرنے کے بعد اردو میں نفوذ ہوا ہے۔ اسکے ابتدائی زمانوں میں تو اردو پر آریائی زبانوں کی تاثر آفرینی مسلم ہے۔ میرا خیال ہے درّانی کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردو پر برِصغیر کی علاقائی زبانوں نے مختلف اثرات مرتب کئے ہیں مگر وہ اسے اتنی زمانی و مکانی دوری سے شروع کر رہے ہیں کہ بات مبہم اور مشکل ہو گئی ہے۔

"زبان بولنے والوں" اور "زبان استعمال کرنے والوں" کا فرق عطش درّانی کا بے اساس لسانی مفروضہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

اردو اس لحاظ سے دنیا کی واحد اور منفرد زبان ہے جس کے بولنے والوں کی اپنی کوئی الگ اور دوسری مادری زبان (مقامی، علاقائی) بھی ہو سکتی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اردو بولنے والا دو بھاشیا ہوتا ہے اور بس۔ ویسے اس بات کی صداقت مشتبہ ہے کیوں کہ ہندوستان میں بے شمار اردو بولنے والے افراد ایسے ہیں جو صرف اردو بولتے اور استعمال کرتے اور مقامی یا علاقائی دوسری زبان میں اظہار سے معذور ہیں مثال کے طور پر (الف الف) صاحب کو لے لیجئے جو مہاراشٹر کا باشندہ ہونے کے باوجود مراٹھی سے نابلد ہیں البتہ بعض مخصوص مقاصد کے لئے وہ تحریری طور پر مراٹھی ضرور استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے "اردو بولنے والے" کی اصطلاح نہیں بلکہ "استعمال کرنے والے" کی اصطلاح محدود معنویت کی حامل سمجھنی چاہئے۔ ویسے یہ تفریق خاصی مبہم ہے کیوں کہ کسی زبان کو بولنا یا استعمال کرنا مترادف ہے۔ آپ کے مفروضے کے خلاف یہ اردو استعمال کرنے والا "اہلِ اردو" میں شمار ہوگا کہ "صرف اردو بولنے والا" جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:-

اردو بولنے والا خواہ دوسری کوئی بھی زبان بولتا اور لکھتا ہو وہ اردو بولنے اور لکھنے والا ہی شمار ہوتا ہے۔

ابتداء میں درّانی نے اردو کو برِصغیر کی زبانوں اور بولیوں وغیرہ کی تہذیبی میراث قرار دیا ہے لیکن آگے چل کر کہتے ہیں کہ:-

اردو بول چال کے سانچے بے حد کم اور محدود رہے ہیں۔

یہ خیال محلِ نظر ہے کیوں کہ اردو بول چال یعنی بولیوں کے سانچے برِصغیر کی علاقائی زبانوں کے اثر میں خاصے متنوع رہے اور آج بھی ہیں اور بازار، سرکار، فنکار، دستکار وغیرہ وغیرہ کے باہمی لسانی بیوپار کے نتیجے میں زبان کی روایتی ساخت میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں۔ اس عمل کو صرف اردو، انگریزی یا ہندو پاک تک محدود نہیں کیا جا سکتا کہ لسانی تغیرات کا یہ ایک آفاقی مظہر ہے۔

ادبی لسانی اظہار میں فکری اور ساختماتی سطح پر تبدیلیاں ہر عہد کے لسانی اظہارات کا وصف ہے (اسے انحراف سے زیادہ طرزِ اظہار یا اُسلوب میں تبدیلی کہنا مناسب ہے) اور ان کی تفہیم کب مشکل نہیں تھی؟ غالب کی تراکیب کلاسیکی تعلیم یافتہ شخص کے لئے کیا واقعی آسان ہیں؟۔ ادبی متون کے توسط سے آنے والی لسانی تبدیلیوں کو بہر حال انفرادی مثالیں کہا جا سکتا ہے جو زبان کے عام استعمال پر اثرانداز شاید کم ہوتی ہیں، ویسے درّانی کا نظم ونثر کے اسالیب کا تقابل متوجہ کن ہے۔ اس ذیل میں خصوصاً فکشن کی زبان پر کام ہونا چاہئے۔

جب زبان کی تقریری سطح پر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو یقیناً انکے تحریری اظہار کے وقت تحریر بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی اور لا محالہ زبان کی بنیادی اصوات (حروفِ تہجی وغیرہ) میں کمی بیشی (اکثر بیشی) واقع ہوتی ہے جیسا کہ اردو اصوات کا بھی معاملہ جدا نہیں۔ یہ درست کہ ر/آ/ ایک جدا صوت ہے۔ مگر روایتی طور پر اسے ر+ا تسلیم کیا جاتا رہا ہے اگر یہ لفظ کی ابتداء میں آئے اسے مفرد صوت مان کر حروفِ تہجی میں شامل کیا جائے (پاکستانی حروف کی طرح) تو اس جیسی دوسری طویل مفرد آوازوں (راو، ای، روغیرہ) کو بھی ہندی کے

بارہ مصوتوں کی طرح شامل کرنا پڑے گا۔ "وہ "مصوتیہ انگریزی نہیں امریکی تلفظ کی خاصیت ہے یعنی "ویل" انگریزی اور "وحیل" امریکی ہے۔

اردو میں ایسی کسی آواز کی شمولیت کے وقت اسکی ذیلی مصوتی خاصیت کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ یوں بھی اردو میں ان کی در آمد فضول ہی کہی جائے گی۔ اُردو کی بنیادی اصوات میں اگر علاقائی زبانوں کی آوازیں بھی جو عوامی روزمرہ کے استعمال سے اردو میں سنائی دینے لگی ہیں، شامل کرلی جائیں تو اس سے مزید انتشار پھیلے گا اور اردو اصوات کی انفرادیت متاثر ہوگی۔ آپ بھلے ہی "رانی" کو "رانڑی" کہیں مگر اسے رانی ہی لکھئے۔

انگریزی کے لاحقہ جمع ر s ر کو اردو میں شامل کرنا مناسب نہیں اخباری زبان کی ساخت میں اگر یہ شامل ہو گیا تو ضروری نہیں کہ معیاری زبان کے قاعدے سے اسے زبان کی روایت میں شامل کرلیا جائے "وہ" کے صرف دو تلفظ ہیں مگر یہ ر s ر کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔

عطش درّانی انگریزی اثرات کو لسانی آلودگی سے تعبیر کرتے ہیں اور غلط نہیں کرتے۔ ناگزیر ہو تو یقیناً کچھ سانچیے انگریزی کے اردو میں استعمال کئے جائیں مگر درّانی کی دی گئی مثالوں کی طرح نہیں کہ جنہیں صرف انگریزی داں اصحاب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ درّانی نے نقادانِ ادب کو اس لحاظ سے چھوٹ دی ہے کہ وہ نثر میں راست انگریزی تراکیب اور اصطلاحات وغیرہ استعمال کرسکتے ہیں۔ میں اسے بھی عجز بیان سمجھتا ہوں کہ بلاوجہ تنقیدی Concept لکھیں جبکہ تنقیدی تصور بآسانی لکھ سکتے ہیں۔ لسانی ردّو بدل کی اس بحث میں متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے درّانی خود ایک ایسی مثال لکھ گئے جسے کہاوت میں ردّو بدل کہا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

پاکستانی اردو کا انگریزیت کا یہ رجحان کس کروٹ بیٹھے گا؟

سب جانتے ہیں کہ "رجحان" کی جگہ کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے "عقائداتی روانیت رایمانیت ربیگانیت ر وغیرہ" ایجاد بندہ لسانی ساختیں محلِ نظر ہیں۔

پنجابی، سندھی اور پشتو وغیرہ کے اثرات سے پاکستانی اردو میں جو نئے اظہارات شامل ہو رہے ہیں انکی شمولیت کو نہ روکا جاسکتا ہے نہ اردو کے معیار پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ علاقائی اثرات ہر زبان کا مقدر ہیں اس لئے اردو کو بھی انہیں بھگتنا ہے۔ ویسے ان کا مطالعہ تقابلی لسانیات کا اچھا موضوع ہو سکتا ہے جس کی طرف درّانی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ لسانی شکست وریخت کا بھی عمل نہیں (بحوالہ فہیم اعظمی) کیوں کہ اس میں پہلے سے موجود لسانی ساختیوں میں تبدیلی ہونے کی بجائے امتزاج اور انجذاب کا عمل دخل زیادہ ہے اور لسانی شکست وریخت میرا خیال ہے لسانی ساخت میں ہو سکتی ہے ساختیوں میں نہیں۔

● 323-MANGALWAR WARD, MALEGAON-423203(M.S.)

إلا الذی نہ ألاذی

مظہر الزماں خاں

ادب پوشیدہ زندگی کے لطیف احساس کا ایک مکمل چہرہ ہوتا ہے۔ وہ چہرہ جسے دیکھا نہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ صرف احساس کی اُس حسّاس آنکھ سے دکھائی دیتا ہے جو آنکھ ہمیں دکھائی نہیں دیتی لیکن بیدار رہتی ہے اور جس کی روشنی کائنات کے اسرار کو منوّر کرتی ہے تو تمام پوشیدہ پردے اُتر جاتے ہیں اور تخلیق کے اندر چھپی ہوئی کائنات زبان بن جاتی ہے۔ لیکن آج کل ہمارے بہترین تخلیقی ادب کو دیکھنے، پرکھنے اور اُس کے اسرار کو کھولنے اور محسوس کرنے والی وہ آنکھ بند ہے۔ تاہم۔ ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے اُس چھپی ہوئی عمدہ تخلیق کو جو ایک عالمی ہستی ہوتی ہے۔ کھولنے، دیکھنے اور پرکھنے کی ناجائز کوششوں میں ریت کے اندر گلے گلے تک ڈوبے ہوئے ہیں لہٰذا ظاہر ہے کہ آباد تخلیقی ادب کو دیکھنے والی آنکھ جب ہم میں موجود نہیں ہے یا بند ہے تو پھر بھلا ہماری ظاہری آنکھ جو ہمیں خود نہیں دیکھ سکتی، حاملہ تخلیقی ادب کو کیسے دیکھ سکے گی چنانچہ ہم



کسی بھی آباد تخلیق کے ظاہری جسم پر لپٹی ہوئی قباؤں کو ٹٹولنے لگتے ہیں تو اس ٹٹولنے اور دیکھنے میں ادب کے ظاہری رنگ ہی ہماری ظاہری آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں اور ہم اُن رنگوں کو قارئین کے سامنے کیک پر پھیلے ہوئے خوشنما کریم کی شکل میں پیش کر کے آپ ہی آپ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے یہ کارنامہ ہائے انجام دیا ہے کہ ہم ہی ادب کے پارکھ ہیں اور خود ساختہ پارکھ کے اس اظہار سے عام سمجھ کا قاری مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اسکے پاس اُس سے آگے بڑھنے کی نہ ہمت ہوتی ہے اور نہ وہ آنکھ ہوتی ہے جو تخلیقی ادب کے بطون میں جھانک کر اُس کے اندر کی آبادی کو دیکھ سکے لیکن عام قاری سے ہٹ کر ایک خاص قاری بھی ہوتا ہے اور اُس خاص قاری کی وہ آنکھ جو اس کے اندر کبھی سوتی نہیں بس جاگتی ہی رہتی ہے وہ دستکیں دے دے کر اُس سے کہتی رہتی ہے کہ بیدار ہو کہ اُس خود ساختہ عارضی پارکھ نے جو کچھ کہا ہے وہ تخلیق کے اندر کی آباد کائنات کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ تو تخلیق کے جسم پر ڈالا ہوا بظاہر خوشنما اور کچا لباس ہے۔ تاہم وہ چپ رہ جاتا ہے کہ اُسکا زبان کھولنا پارکھ کے آگے جرم ہے کیوں کہ اُسے پارکھ کی ظاہری علمیت کا ناجائز خوف ہے۔ ایک ایسا خوف جو کسی دودھ پیتے نادان بزرگ سے کسی متین فطین اور ذہین بچے کا یہ کہنا کہ قبلہ آپ جو حرکت کر رہے ہیں وہ آپ کو زیبا نہیں دیتی کہ یہ کام تو مجھ جیسے بچوں کا ہے کیوں کہ آپ کی یہ نابالغ حرکت آپ کو آگے بڑھنے کے لئے توانائی نہیں دے سکتی لہٰذا ہمارے آج کے کچھ نا سمجھ پارکھ بھی پوشیدہ تخلیقی ادب کے ساتھ کچھ ایسا ہی کھلواڑ کر رہے ہیں جیسے وہ بزرگ اور شرمندہ ہونے کی بجائے فخر سے یہ کہہ بھی رہے ہیں کہ ہم وہ کام کر رہے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے ایک آئینہ ہوگا حالانکہ وہ آئینہ تو کجا لوہے کے ایک زنگ آلود ٹکڑے کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ تاہم وہ بضد ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ کسی بھی چیز کا صرف معلوم ہونا اُس کے موجود ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ علم کے ساتھ قدرت ملتی ہے تو وہ چیز مخلوق و حادث ہوتی ہے کیوں کہ علم کے ساتھ قدرت کا ملنا خالق کا ملنا ہے اور خالق کا ملنا تخلیق کا حاصل ہو جانا ہے اور تخلیق کا حاصل ہو جانا خالق کو پہچان لینا ہے اور خالق کو پہچان لینا تخلیق کا آئینہ ہو جاتا ہے کہ علم عقل کا چہرہ ہے اور عقل علم کی آنکھ ہے اور دونوں ایک دوسرے میں ضم ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ کسی بھی آباد اور معمور تخلیق کو سمجھنے کے لئے تجسس ضروری ہے اور جب ذہنِ اقوام اس میں کمال حاصل کرلیتا ہے تو تخلیق اُس کے سامنے آئینہ بن جاتی ہے کیوں کہ انسان کے خیال کو خیالِ متصل، خیالِ مطلق، مثالی انسان، خیالی انسان کہتے ہیں۔ جس طرح انسان جو کچھ لکھتا پڑھتا ہے، بولتا اور کرتا ہے پہلے وہ اسکے خیال میں رہتا

ہے پھر دنیا پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خیال میں منعقد ہو جاتا ہے اور اُس قید سے آزادی مغر سے ظہور میں آتی ہے۔ بشرطیکہ معتبر ذہنِ انسانی کے خیال کی بیدار آنکھ بن جائے۔ اور جب وہ آنکھ بیدار ہو جاتی ہے تو خالق اور تخلیق دونوں اُسکے سامنے ظاہر ہو جاتے ہیں اور دونوں کا ظاہر ہو جانا اصل کا حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ تحریر کمال تخلیق تو اگر ہے کہ وہ خزانہ خیال ہے اور خزانہ خیال عمر ذخار ہے کہ اُس کا کوئی اختتام نہیں لیکن ہمارے کچھ ناقدین یا خود ساختہ پارکھ خزانہ خیال کی آنکھ کے بجائے خیال خام آنکھ سے کسی بھی معمور و منعم تخلیق کو ظاہر کرنے سے معذور ہیں کہ وہ اشارے، نشان، استعارے، علائم سے دور ہیں کیوں کہ کسی بھی عمدہ اور آباد تخلیق کے اندر ان گنت بستیاں خواب کی طرح پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ وہ خواب اور بستیاں ہی اصل ہیں اور خواب و بستیوں کا اصل حاصل کر لینا تخلیق کا اصل حاصل کر لینا ہے۔ اور تخلیق کا اصل حاصل کر لینا خالق کو دریافت کر لینا ہے لیکن ہمارے بعض پارکھ تخلیق کو[illegible] کے لئے اپنی آنکھوں کو کیمرے کی آنکھ بنائے ہوئے ہیں کہ انہیں تخلیق کے اندر چھپی ہوئی آباد کائناتیں دکھائی ہی نہیں دیتیں وہ تو ایسی تحریروں کو نوخیز دوشیزہ کے ڈوپٹے کی طرح [illegible] تے ہیں جسکے رنگ کچے اور رازدار کہانیوں سے عاری ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی خالق اپنی کسی تخلیق میں باطنی اشیاء یا کردار کا اظہار یوں کرتا ہے کہ اُس کے اندر تمام جہانوں کا علم موجود تھا کہ وہ ہواؤں کو دیکھ لیتا تھا، بیج کے اندر چھپے ہوئے جنگل میں گھومنے لگتا تھا، زمین سے کلام کرتا تھا، بیج کو اپنے پیٹ میں پرورش کر کے اُسے جوان کرتا تھا اور جب وہ اپنے اندر ہی اندر پھل پھول پیدا کر لیتا تھا تو وہ اُسے اپنی غذا بنا لیتا تھا۔ چنانچہ یہاں خالق اپنی تخلیق میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ زمین کی علامت اُسکی اپنی ذات سے ہے اور وہ اپنی ذات کے اندر پوشیدہ علم کو خود اپنے لئے ہی استعمال کرتا ہے کہ اس کے علم سے کوئی فیض یاب نہیں ہوتا۔ اب یہ تحریر خود ساختہ پارکھ کی بظاہر آنکھ میں ابہام کا تنکا بن کر کھٹکنے لگتی ہے اور وہ اُسے ایک معمہ سمجھ کر دوسری تحریر کی طرف دیکھنے لگتا ہے جو یوں بیان کی گئی ہے۔ "وہ بڑا عالم تھا کہ ہر چیز اُس کے سامنے ظاہر تھی لیکن وہ اپنے علم سے کسی اور کو فائدہ نہیں پہونچاتا تھا کہ خود ہی اُس سے فیض یاب ہوتا تھا۔" اب اس تحریر دیراں کو پڑھ کر ناقد کہتا ہے کہ مصنف نے کیا لاجواب چیز لکھی ہے کہ پڑھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جبکہ اس تحریر میں کوئی اسرار ہی موجود نہیں ہے اور نہ یہ تعبیر کی متقاضی ہے۔ تاہم بے آنکھ ناقد کی دسترس میں ہے۔ اور پہلی تحریر اُسکی دسترس سے باہر ہے کہ وہ اُسے دیکھ نہیں سکتا چنانچہ یہ بات یاد رکھی جائے کہ کسی بھی تہہ دار تخلیق کی تحقیق کے لئے اُس کی ذات کا بذاتِ خود موجود ہونا از حد ضروری ہے اور ذات جب بذاتِ خود موجود رہتی ہے تو خالق اور تخلیق ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں اور تب تخلیق اور خالق دونوں آئینہ ہو جاتے ہیں ورنہ تخلیق اور تحقیق دونوں "الالذی نہ لالذی" درمیان کے ہو کر رہ جاتے ہیں یعنی نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم / نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!!!

● HOUSE NO. 256, SPL, C.C.I.B. KACHI GUDDA , HYDRABAD- 500029 (A.P.)

ایک مسیحا کا پیکر یا خونی قاتل کا استعارہ

جگ ثریا ○ ترجمہ - خیر النسا مہدی



کیسے کوئی قابل ماہر نفسیات کو ایک قابلِ پرستش ہیرو بنا سکتا ہے جو صرف اپنے مریضوں کو قتل ہی نہیں کرتا بلکہ کچا کھاتا بھی ہے؟ یہ کیسا تمدن ہے جو ایسے شخص کی مدح کرتا ہے؟ یہ چند سوال ہیں جو تھامس ہیرس (THOMAS HARIS) کی بین الاقوامی شہرت کے ناول (HANNIBAL) کے سلسلے میں پوچھے جا سکتے ہیں؟ اس سلسلے کا پہلا ناول آدم بے گناہ کی خاموشی (THE SILENCE OF THE LAMB) سالہا سال ہوئے شائع ہوا تھا (میں نے یہ ناول تو نہیں پڑھا، مگر فلم ضرور دیکھی ہے کیوں کہ اس فلم کو آسکر (OSCAR) سے نوازا گیا تھا) یہ ناول بھی ہیبت ناک ناولوں کی فہرست میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول دس برس پہلے اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ اسی سلسلے کا یہ دوسرا ناول شائع ہوا ہے، شیطانی ذہنیت کا مالک ڈاکٹر ہنی بال لیکٹر (HANNIBAL LECTER) اِس آدم خور کردار کی تخلیق کرتا ہے، یہ نہایت محفوظ جیل خانے سے مفرور کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ FBI کی مدد کرے جو ایک نہایت اہم آدم خور مجرم کی تلاش میں ہیں یہ مجرم ایک اعلیٰ درجے کا مقدس ہیولا سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ روسی نامور ناول نگار دوستفسکی (DOSTOVSKY) کے مشہور کرداروں رسکلنیکو (RASKOLNIKOV) اور اون کرمازوف (IVAN KARMAZOV) کی طرح نطشے (NIETZCHEAN) (مشہور جرمن فلسفی) کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خود کو "مقدس ہستی" بناتا ہے دوستفسکی کے مخالف ہیرو اپنے متکبرانہ رویے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں لیکن ہنی بال مسلسل ترقی کرتا جاتا ہے۔ اِس ناول میں ہیرس (HARIS) یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ کردار کیوں اور کیسے ترقی کرتا رہا تھا؟

لیکٹر (LECTER) اپنے خونی اور تصادمی مقسوم سے الگ ہو کر ایک بے ضرر دانشور تسکینی (TOSCANY) ایک شہری (یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جو قابل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اس منصب کے لئے نہایت موزوں شخص ہے۔ وہ تین منٹ میں دانتے کی دوزخ (INFERNO) پر نہایت پُر اثر تقریر کرتا ہے جسے سن کر اس کے مخالف نقاد تک دنگ رہ جاتے ہیں لیکن اس کے انتقامی جانی دشمن اسے پناہ نہیں دیتے ہیں۔ سود خور سیاست داں، نہایت گندے برگزیدہ لوگ، رشوت خور پولیس، جنسی امراض میں مبتلا اشخاص اور نفرت کی آگ میں پرورش پانے والے افراد آخر کار اُسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ معصوم بچوں کو اپنی خوراک بنانے والے مجرم اُسے زندہ سوز کھانے کو دیتے ہیں اس طرح اُسے پھر سے خون پینے اور آدم خوری کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہ داستان سہمے، کمزور اور ناتواں دل رکھنے والوں کے مطالعے کیلئے نہیں ہے، ایک بار پھر ہنی بال (HANIBAL) اپنی بے رحمی اور قاتلانہ کرما (KARMA) کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ وہ تمام عمر اپنی ننھی بہن کو جنگ کی آگ میں جلتا ہوا دیکھ چکا ہے۔ یہ دہشت ناک منظر اسے بار بار اُکساتا رہتا ہے۔ ہنی بال آخر کار اپنے کو "دوسرے" (OTHER) میں ڈھال لیتا ہے (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ژاں پال سارتر نے کہا تھا (THE OTHER IS HELL) جو دو (JUDEO) (وہ لوگ جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو دھوکا دیا تھا) اور مسیحی روایات سے شروع ہو کر لوسفر (LUCIFER) یعنی صبح کا تارہ (STAR OF THE MORNING) جنہوں نے جنت کے رکھوالوں کے ساتھ ایک مشکوک جنگ لڑی تھی۔ اس پاکیزہ (PURITAN) شاعر نے ایک فرشتے کو روحانی باغی بنا دیا تھا۔ یہ اس رزمیے کا ہیرو ہے ہنی بال کا خالق جو کچھ غیر شعوری طور سے کر رہا تھا

نہیں وہ دوہری باتیں (DOUBLE TALK) نہیں کرتا۔

دنیا کا دو ہزار سال کا دور ختم ہونے والا ہے آدمی کی تمام بھوک (GAIA) کو مادرِ زمین (MOTHER EARTH) ہضم کرنا چاہتی ہے اور الیکٹرا ایک خونی استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں عوام کو تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔ بچوں کو اذیتیں دے کر مارا جاتا ہے اور روزانہ کی زندگی میں شر کی حکمرانی ہے۔ اس عہد میں "روحانی ادارے" کے تحت گناہ گار اور برگزیدہ تمام لوگوں کا قتل کیا جاتا ہے۔ ہم سب لوگ مجبور اپنی کوتاہیوں اور سکوت کی وجہ سے اس قتلِ عام کے ہنگام میں بچ گئے ہیں۔

ہنی بال (HANIBAL) کو اس صلیبی جنگ کی خصوصیت معلوم تھی کہ ناپاک حملوں میں شر کے خلاف بڑے شر کا استعمال کیا گیا تھا صرف اسی طرح ہماری بے جان روح کو زندہ کیا جاسکتا ہے۔ فاوسٹ (FAUST) کی طرح وہ وقت (TIME) اور تاریخ (HISTORY) کو یکسر بدل دینا چاہتا ہے تاکہ زمانہ پھر سے پچھلی تاریخ اور وقت کا آجائے اس طرح مکمل مزاج سے رفتار روک لینے سے بچ جائیں گے اور ہم زمان و مکان کی قید سے نکل جائیں گے تب ہماری اپنی دنیا ہوگی جسے ابدی تخیل کا محل (ETERNAL PLACE OF IMAGINATION) بھی کہا جاسکتا ہے!

ہنی بال (HANIBAL) کا ڈلیما (DILEMMA) بہاں قاطع مغربی قارئین کے لئے ہے کہ اس جہان یعنی دنیا کی تاریخ کو پلٹنا چاہئے جب خیر نہیں ہے جو شر بھی نہیں ہے تو کیوں ایسا شر پیدا کریں جو غیر موجود شر کا مقابلہ کر سکے؟ مغربی روایات کی حدت میں یہ خلیج کیسے پاٹی جائے؟ ہنی بال کے قارئین اس مابعد الطبیعاتی خلیج میں کب تک الجھے رہیں گے؟ اس کا محرک تو بیچارہ ہے گا شاید اس نے اپنے خالق ہیرس (HARRIS) کو بھی بے خبر رکھا ہے۔ ڈاکٹر الیکٹر شیو بھگت، تاترک جو دہشت تباہی اور تخلیق کے ٹکڑوں کو مجتمع کرنا چاہتا ہے اسے بڑا لمبا سفر کرنا ہے اور وہ اس سے واقف ہے۔ شاید وہ دوبارہ اوتار یا دیوتا بننے سے پہلے اپنے ہم عصر امریکی شاعر سے صلاح لے گا۔ شاعر نے کہا تھا۔

IF THE RED SLAYER THINKS HE SLAYS
OR IF THE SLAIN THINKS HE SLAIN
THE KNOW NOT WELL THE SUBTLE WAYS THE STRONG GODS PINE FOR MY ABODE
AND PINE IN VAIN THE SACRED SEVEN
BUT THOU MEEK LOVER OF THE GOOD
FIND ME AN TRUN THY BACK ON HEAVEN

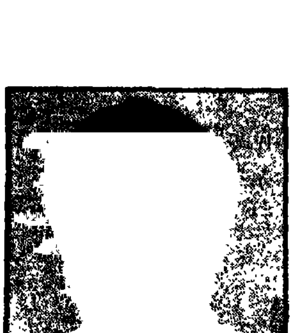
اگر سرخ قاتل یہ سمجھتا ہے کہ اس نے قتل کیا ہے۔
یا مقتول یہ سوچتا ہے کہ وہ قتل ہوا ہے۔
وہ یہ نہیں جانتے کہ مناسب طریقہ کار کیا ہے۔
میں رکتا ہوں اور گذر جاتا ہوں۔
اور سارے طاقتور دیوتا میرے مسکن کے لئے بے چین ہیں۔
اور وہ سات مقدس دنوں کے منتظر ہیں۔
اور تو خیر کا کمزور عاشق۔
اُنکو آسمانوں میں واپس بھیج دے۔

نوٹ:۔ یہ مختصر تبصرہ ۱۴/اگست ۱۹۹۹ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول پندرہ ہفتے مقبول ناولوں میں سرفہرست رہا تھا اور اب بھی ہے تھامس ہیرلیس THOMS HARRIS کا ایک ناول فلمایا جاچکا ہے اس میں مشہور اداکار ANTHONY HAPKIN انتھونی ہاپکن نے کام کیا تھا اُسے OSCAR مل چکا ہے۔ اتفاق سے میں نے یہ فلم دیکھی تھی (خ م)

● E/1, RAVI DARSHAN, OFF CARTER ROAD BANDRA MUMBAI-400 050

ایک ادبی بدعت جو ادبی سنّت بن گئی

سید نقی عابدی



اُردو اور فارسی ادب میں لفظ "رونمائی" ایک لطیف اور حسین کیفیت کا حامل ہے۔ صدیوں سے یہ لفظ ہماری تہذیب میں دُلہن کے چہرے کی جلوہ گری کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے شادی کی زنانہ رسُومات کو "جلوہ" کہتے ہیں جس میں دولہا کو آئینے میں پہلی بار دُلہن کا چہرہ دکھایا جاتا ہے اور پھر کئی دن تک یہ رسم رونمائی دولہا کے محرم رشتے داروں میں جاری رہتی ہے جس میں دُلہن کو نقدی اور تحفے دیے جاتے ہیں۔ چونکہ ادب اور تہذیب کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا اور معاشرے کی ترقی میں دونوں عناصر کی شرکت شاملِ حال رہی اس لئے جب ادبی مشاعرہ ہماری تہذیب کا حصہ بن گیا تو ہماری رسومات اور روایات کی اصطلاحیں جو ادب ہی سے استعار لی گئیں تھیں مشاعرے میں استعمال ہونے لگیں چنانچہ پھولوں کے ہار، کھانوں کی بہار، سولہ سنگار، اور مہمانِ خصوصی کے لئے تقریب کے دولہا یا دولہن کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اجرائی کے لئے "رونمائی" جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے۔

کتاب کی رسم رونمائی نے جس طرح اردو سماج میں رواج پالیا ہے اُسکی مثال کسی اور مشرقی زبان میں موجود نہیں ہے۔ یہ رسم لگ بھگ ۳۶،۳۵ سال سے ہمارے ادبی معاشرے میں جاری ہے۔ میری محدود کاوش اور تحقیق کے مطابق ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کراچی میں ایک مجموعہ کلام کی رسمی تقریبِ رونمائی انجام دی۔ اس سے پہلے اردو ادب میں کسی کے جدید منظوم یا نثری کلام پر مختلف افراد نے یکجا اپنی رائے کا اظہار، کتاب کا تعارف اور کلامِ شاعر بزبانِ شاعر ایک ہی نشست میں انجام نہیں ہوا تھا۔ یہ ادب کا پہلا کامیاب تجربہ تھا چنانچہ اسکے بعد یہ پروگرام اس طرح عام ہوا کہ ہر مقام پر ہر شام میں، ہر نام کی نسبت سے اس کام کو بطور انعام جاری رکھا گیا اور آج شاید ہی کوئی ایسا مقام یا کوئی ایسی شام نہ ہو گی جس میں کہیں کسی کتاب کی رسمِ رونمائی انجام نہ ہو رہی ہو اور اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ ادبی بدعت ادبی سنت میں تبدیل ہو گئی۔

اگر اردو ادب کی پانچ چھ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے اولین نثر اور نظم نگاروں نے اپنے کلام اور بیان کی تشہیر و تبلیغ اور حفاظت کا کبھی بھی خیال نہ کیا۔ صرف بادشاہوں، حکمرانوں۔ ملک الشعراء اور درباری شاعروں کے دیوان یا وہ قصائد جو صرف اُنکی شان میں تخلیق ہوئے تھے کتابی شکل میں نظر آتے تھے، آج بھی محفوظ ہیں۔ عام لوگ اپنے اعتقاد اور مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مذہبی کلام کو بھی جمع رکھتے اور اس کام کے لئے اصل سے نقل کر لیتے اور بیشتر کلام مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہوتا تھا۔ بعض اوقات اساتذہ کا کلام اُنکے شاگردوں کی جانب سے شائع ہوتا اور بعض اوقات شاگردوں کے نام ہی کا ہو کر رہ جاتا۔ تقریباً گذشتہ دو سو سال سے شاعروں کو اپنے کلام کی جمع آوری کا احساس ہوا چنانچہ میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، میر حسن دہلوی، غلام ہمدانی مصحفی، مرزا غالب اور کئی دیگر نامور شعراء نے اپنی زندگی ہی میں اپنا دیوان مرتب کر کے شائع کروا لیا لیکن کسی قسم کی رسمِ رونمائی انجام نہ دی. یہاں تک کہ دیوان شائع ہونے کے کئی کئی سالوں بعد بھی لوگوں کو مکمل خبر نہیں ہوئی تھی. میر انیس، مرزا دبیر اور کئی بڑے شعراء نے کلام کی جمع آوری اور اُس کی حفاظت کی بالکل فکر نہ کی جس کی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ یہ عظیم شعراء اپنے اشعار کو آخروی منزل کا اساسہ اور زینت سمجھتے تھے اور تشہیر و تبلیغ سے گریز کرتے تھے ورنہ میر انیس کے پاس انتقال کے وقت اتنا روپیہ موجود تھا کہ تمام کلام کو بدرجہ احسن شائع کروا کر مفت تقسیم کر سکتے تھے۔ مغربی دنیا میں کتاب پر تبصرہ BOOK REVIEW کی رسم تقریباً (۱۵۰) سال سے جاری ہے جس میں ایک قابل محقق اور مقبول تنقید نگار بڑی تمکنت اور نزاکت اور ادبی حوالوں سے اُس کتاب پر تبصرہ کرتا ہے جس سے قاری اور مولف دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔

اردو ادب میں رونمائی عموماً مجموعۂ کلام اور دیوان کی ہی ہوتی ہے۔ رونمائی درحقیقت ایک مثبت اقدام ہے اگر اس کو صحیح طریقے سے انجام دیا جائے تو ادب کی خدمت ہو سکتی ہے۔ رونمائی کے مثبت نتائج میں سب سے اہم صاحبِ دیوان کے کلام کی تشہیر ہے تاکہ بیشتر لوگ کلام سے واقف ہو سکیں جو شاعر کی ہمت افزائی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ اسکا دوسرا مثبت اثر علمائے ادب اور ناقدین کی گراں قدر آراء اور مشورے جس سے صاحبِ کلام اپنے کلام کے محاسن اور اُسکے عیوب سے بھی بڑی حد تک واقف ہو سکتا ہے تاکہ آئندہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ تیسرا فائدہ ایسی ہی تقریبات کے عوض تمام لوگوں میں ادب کا ذوق و شوق بڑھتا ہے اور یہی محفلیں ادب کے پرچار کا سبب ہوتی ہیں۔ لیکن آج کی ادبی صورت حال میں رونمائی کی یہ تقاریب اپنے اصلی مقاصد سے دور ہوتی جا رہی ہیں بلکہ خود سرائی اور خود نمائی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی تقریبِ رونمائی کی تقاریب شروع ہو جاتی ہیں معاصر اردو ادب کے بعض ادیب و نقاد اور محقق "ماہرین تقریظ" ہو گئے ہیں چنانچہ مطالعۂ کتاب کے بغیر لفظوں کے طومار سے گدھے اور گھوڑے ایک ہی اصطبل میں باندھ کر، تقریباً ہر کتاب پر کچھ جملوں اور لفظوں کو بدل بدل کر وہی پرانی شراب نئے پیالوں میں اُنڈیل دیتے ہیں جس کا نشہ صاحبِ کتاب، شاعر پر بڑی حد تک طاری رہتا ہے چنانچہ اُس کا دماغ آسمان پر اور اُسکے پیر ہوا میں معلق رہتے ہیں اور وہ بڑی حد تک اپنے مقام کو بھول کر ہوائی محلوں کی سیر میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے کو خدائے سخن جان کر اساتذہ شعراء ہی نہیں بلکہ غالب اور حافظ کو بھی اپنے برابر ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ آج سے چند سال قبل کتاب کی رونمائی صرف ایک بار ایک ہی زمان و مکان میں کی جاتی تھی لیکن آجکل ایک کتاب کی رونمائی مختلف اقساط میں مختلف شہروں بلکہ مختلف ممالک میں مختلف تاریخوں میں کی جاتی ہے جس کے لئے مختلف انجمنوں، ادبی، سماجی، ثقافتی اداروں سے مدد لی جاتی ہے مشاہدات بتلاتے ہیں کہ اس قسم کی تشہیر کا اثر معکوس ہوتا ہے۔

ہماری نظر میں کتاب کی رسمِ رونمائی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ان نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) کتاب کی رونمائی سے زیادہ فکر کتاب کے کلام کی صحت، کتابت اور طباعت پر دینا چاہئے کیوں کہ کلام کے چھپ جانے کے بعد کوئی شاعر اپنے معیار کو چھپا نہیں سکتا، جب تک کلام شائع نہیں ہوتا شاعر کی مٹھی بند رہتی ہے۔

(۲) کتاب کی تقریظ اور محفلِ رونمائی کے مقالات کے لئے مشہور و معروف افراد کے بجائے اُن اشخاص کو ترجیح دی جائے جو کتاب کو ایمانداری سے پڑھ کر محاسن اور عیوبِ کلام کی پہچان کر سکیں۔ اور غیر جانبدارانہ اظہار کر سکیں۔ قاری کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب تصویر کے دونوں رُخ اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ قاری کا اعتماد نفسِ شاعر کی نسبت بڑا اہم مسئلہ ہے۔ وگرنہ بقول خالد عرفان ۔ کبھی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں: کتاب چیخ رہی تھی کہ میں کتاب نہیں۔

(۳) کتاب کی رونمائی صرف ایک بار وہ بھی اُس شہر میں کی جائے جس میں شاعر سے لوگ کم و بیش واقف ہوں اور اُس کے علمی، اخلاقی، سماجی اور شعری قد سے آشنائی رکھتے ہوں۔

(۴) جلسۂ رونمائی میں کتاب برائے تقسیم یا برائے نام قیمت پر برائے فروخت ہونی چاہئے کیوں کہ عموماً اس تقریب کا اثر کچھ دنوں تک سامع پر طاری رہتا ہے اور اسی وقفے میں وہ مجموعۂ کلام کا مطالعہ کر سکتا ہے ورنہ بعد میں کتاب کتب خانہ کی زینت بن کر ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو جاتی ہے۔

(۵) صاحبِ دیوان شاعر کو چاہئے کہ کچھ منتخب کلام اپنے اندازِ بیان میں سنائے تاکہ لوگ کلام بہ زبانِ شاعر سے حظ اٹھا سکیں۔

(۶) مقامی روزناموں اور منتخب جرائد میں اس تقریب کی روداد مختصر اور صحیح دینی چاہئے اور مبالغہ سے حتی المقدور کنارہ کشی کی جائے کیوں کہ بقول مولانا روم ۔

خوشتر آں باشد کے سرِ دلبراں ؛ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں۔

● 83 - FARECKER DRIVE ST. JOHNS NF , CANADA A1E 5X3



کالیداس گپتا رضا

جاوداں بھی لکھوں اور غرقِ فنا بھی لکھوں
مجھ سے ممکن نہیں ہستی کو قضا بھی لکھوں

ہائے رے جبر کہ باوصف غمِ ذلّت کے
تجھ کو منصف بھی لکھوں اور خدا بھی لکھوں

کیا خبر، بھیک میں پا جاؤں حسیں مستقبل
کیوں نہ ماضی کو فقیروں کی صدا بھی لکھوں

بددعاؤں ہی سے خط بھر دیا؟ کیا نیکی کیا
اب جو ممکن ہو تو اک حرفِ دعا بھی لکھوں

کیوں مجھ کو اتنا کہ گلشن کی طلبگاری میں
خشک موسم کے بگولے کو صبا بھی لکھوں

یہ بھی تحریر کروں، کیسی ادا، کیسا مزاج
شہر کا ذکر ہے تو آب و ہوا بھی لکھوں

وقت کہتا ہے، کیوں زہر بھی جام مے کو
اور گھٹن کی عفونت کو نشا بھی لکھوں

لکھ چکا ہوں میں سبھی خوابِ روایت، حسرت
اب دمِ نو ہے، کوئی باب نیا بھی لکھوں

تھک گیا ہوں میں پتا آپ کا لکھتے لکھتے
تازہ دم ہولوں تو کچھ اپنا پتا بھی لکھوں

چاہتا ہوں کہ تجھے باوفا ہی نہ لکھوں
ٹمٹماتا ہوا باطن کا دیا بھی لکھوں

اے سخن فہم کی چپ! تیری اداؤں پہ نثار
تجھ کو قاتل بھی لکھوں، اور سے سوا بھی لکھوں

خوش سے تھے چکبست، تخلص ہی نہ تھا ورنہ میں
کے ڈی گپتا بھی لکھوں اور رضا بھی لکھوں

2-A, JALDARSHAN 43-A, 4TH FLOOR,
NEEPEN SEE RD. MUMBAI-400 036

خواجہ ریاض الدین عطش

چراغِ الفت کریں گے روشن محبتوں کو اُجال دیں گے
نچوڑ کر دل کا قطرہ قطرہ وفا کے سانچے میں ڈھال دیں گے

کریں گے اشکوں کے لعل وگوہر تمہاری چاہت پہ ہم نچھاور
ہم اپنی خوشیوں کا لمحہ لمحہ تمہارے دامن میں ڈال دیں گے

سجا کے ماتھے پہ چاند ٹیکا پہنا کے تاروں کے پھول گہنے
تمہاری آنکھوں میں بھر کے کاجل کمالِ چشمِ غزال دیں گے

یہ نیلگوں آسماں کی چادر سجی ہوئی کہکشاں سے جس پر
ہم اس کو آنچل کا روپ دیکر تمہارے شانوں پہ ڈال دیں گے

تمہارے تپتے لبوں کو خونِ جگر کی لالی کا رنگ دیکر
تمہاری فرقت کی سونی راتوں کو رنگِ شام و وصال دیں گے

جو چھین کر لے گیا زمانہ تمہارا عہدِ شباب تم سے
ہم اپنے حسنِ نظر کے ہاتھوں تمہیں وہ حسن و جمال دیں گے

بہار چپکے سے جا چکی ہے مگر وہ خوشبو کا ایک موسم
جو پھول بن کر دیا تھا تم نے ہوا میں اس کو اچھال دیں گے

وہ روشنی رو ٹھی ہوئی تھی وہ حسرتیں اور وہ آرزوئیں
ہم آ گئے ہیں تو تمہارے دل سے وہ سارے سارے ملال دیں گے

جمالِ رفتہ کی تابشوں کو عطشؔ اجاگر کریں گے پھر سے
تمہارے خوابوں کے آئینے کو تمہارا چہرہ بحال دیں گے

1604- TAHOE CIRCLE-DRIVE
WHEELING, ILLIONS 60090(U.S.A)

جوگندر پال

204-MANDAKNI
NEW DALHI-110019

پرندے

بے وجوہ

میں تم سے محبت کرتا ہوں، شیکھا۔
اچھا، بتاؤ، بھلا کیوں؟
کیوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔
نان سنس! یہ کیا جواب ہوا؟
تم نہیں جانتیں شیکھا، بے وجوہ صرف نفرت کی جاتی ہے۔

ڈیموکریسی

خدائی کورٹ میں ثابت ہو گیا کہ اچھے تو عمر بھر دوزخ بھگتتے ہیں اور بُروں کو جیتے جی جنت نصیب ہو جاتی ہے، چنانچہ سبھی پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد خدا پر کرپشن کے چارج کو جائز تسلیم کر لیا گیا۔

مگر خدا تو واحد اپنی ذات ہے، اُسے الگ کر کے خدائی کورٹ اُس کی خدائی کو کسے سونپتی؟

آخر چھوٹے چھوٹے خداؤں نے اپنا ڈھول پیٹ پیٹ کر ایسا سماں باندھا کہ اور تو اور، خود خدا بھی چکر میں آ کر ایمان لے آیا اور اُس نے خود آپ ہی تجویز کیا کہ ساری خدائی کو اُن ہی کے سپرد کر دیا جائے۔

آئینہ

کوئی ایسے بھی کرتا ہے

اُس نے ساری عمر خود کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گزار دی۔

مگر وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بھی کہاں رہا؟ آئینے میں ہر بار اُسے کوئی اور ہی دکھائی دیتا، تاہم وہ ہمیشہ سر جھٹک کر باور کر لیتا، اور کون؟ میں ہی تو ہوں۔

گھور بڑھاپے تک بھی اُس کی آئینے کی عادت نہ چھوٹی، مگر اب وہ اپنے جھریوں میں اَٹے ہوئے وجود کو آئینے کے سامنے بہ مشکل اکٹھا کر کے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا کہ وہ جوان جہان آئینے میں کہاں کھو گیا۔

پھر ایک دن آئینے میں سے بڈھا اپنی کھانستی ہوئی بے صبر آواز میں بول اُٹھا، آئینے میں سبھی کھو جاتے ہیں مورکھ۔ کل دل میں بھی کہاں دکھونگا؟ بھوت کے بھوت گھور گھور کر دیکھتے رہ جاؤ گے۔

دعا

وہ کئی سال سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا اور نہایت مضمحل، اور اب لمبی تان کر سو جانا چاہتا تھا، اِتنا گہرا، کہ آنکھ کھلنے میں نہ آئے۔

بالآخر خدا نے اُسکی سن لی۔

وہ بڑی گہری نیند سو گیا اور مٹی کا مٹی پڑا رہا اور اِس طرح اپنے گھور سپنوں سے پکی قبر پر پھول پھول بر آمد ہونے لگا۔

کھلونے

ہمارے منّے کے پاس ڈھیروں کھلونے ہیں، مگر میں اُسکا سب سے پسندیدہ کھلونا ہوں۔

مجھے اپنی دو ٹانگوں پر کھڑے پا کر وہ بے اختیار ہنسنے لگتا ہے، جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہو، اور میں جھٹ اپنے دونوں ہاتھ بھی زمین پر ٹکا کر اُسکا گھوڑا بن جاتا ہوں اور وہ اُچھل کر میری پیٹھ پر آ بیٹھتا ہے۔ چل میرے گھوڑے جھٹک جھٹک جھٹک!

منّے کو تعجب ہے کہ دادا ہنٹری کے بغیر ہی کیوں کر اِتنا تیز چلتا اور اِتنے زور سے ہنہناتا ہے۔

جان

دونوں دشمن پڑوسی ملکوں کے سربراہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر بیک وقت اپنا اپنا ہاتھ نیوکلیئر بم میزائل کے بٹن کی طرف بڑھا دیا۔

مگر بٹن دبانے سے عین پہلے دونوں کے ہاتھ نا معلوم کیوں کر مٹی ہو کر رہ گئے اور اُنکے پیچ و تاب کے باوجود اُس وقت تک مٹی کے مٹی رہے جب تک اُنہوں نے ٹھنڈے ہو کر ارادہ نہ بدل لیا۔

کیا مٹی میں بھی جان ہوتی ہے؟ ☆☆☆

ندا فاضلی
103-AMAR APTS.,DAND-PARA-1
KHAR(WEST)MUMBAI-400052



یوتوشینکو کی شاعری

یوتوشینکو روس کے ممتاز و مقبول جدید شاعر ہیں۔ اُنہوں نے ایک بار کہا تھا۔ شاعری شاعر کی سوانح ہوتی ہے: ان کی شاعری کا مجموعی مزاج سوانحی ضرور ہے لیکن یہ ایک ایسے فرد کی سوانح ہے جو ذات کے نہاں خانوں تک محدود نہیں ہے، اس کی ذات میں ملکی تہذیب سیاست اور ماضی و حال کی تاریخ بھی شامل ہے۔ عہدِ اسٹالن سے سویت روس کے بکھراؤ تک اس شاعری میں ہر دور کو عام آدمی کے غم و خوشی کا آئینہ بنایا گیا ہے۔ یہ شاعری شکست و خواب کا مرثیہ ہی نہیں دہراتی نئے خوابوں کا قصیدہ بھی سناتی ہے۔

یوتوشینکو کی تعمیری عمر اسٹالن کی خود مختاریت کی عینی گواہ رہی ہے اس دور کی دہشت، انکی بعد کی شاعری میں کئی جگہ نمایاں ہے۔ اسٹالن کے جنازے کے جلوس میں ایک سو پچاس افراد کی موت کے موضوع پر اپنی ایک نظم میں ان کے آخری مصرعے یوں ہیں!

یہ وہ آدمی تھا/ جس نے ہمیں/ عوام کو پیروں تلے کچلنے کا سبق سکھایا۔

ایک اور نظم میں اس دور کی جھلک اس طرح ملتی ہے۔

اسٹالن کا جرم یہ نہیں تھا/ کہ اس کے حکم سے/ بہت سوں کو قید کیا گیا/ یا جان سے مارا گیا/ اس کا جرم یہ ہے/ کہ اس کی وجہ سے/ انسانی روح کو بے حس بنایا گیا۔

اردو کے ترقی پسندوں کی مانند اس نے اشرافیہ کی زبان میں عوامی مسائل کو موضوع نہیں بنایا۔ عوام کی چلتی پھرتی، ہنستی روتی، لڑتی جھگڑتی بول چال کی بھاشا میں ہی اپنے قلم کا جادو جگایا۔ لوک محاوروں اور غیر روایتی الفاظ کے نغماتی آہنگ نے اس کی شاعری کو طبقاتی حصار بندی سے ہی آزاد نہیں کیا، روس کی شاعری میں نئے شعری آہنگ کو بھی روشناس کرایا۔ یہ شاعری ایک باشعور ذہن کے طویل سفر کی دستاویز ہے۔ یوتوشینکو اپنے لسانی اور شعری رویّے کے لحاظ سے والٹ وہٹ مین کے قبیلے کے شاعر ہیں، کبیر اور نظیر کو بھی اس شجرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد میں وہٹ مین کی شاعری کی طرح ان کی نظموں سے بھی ناقدین کو شکایت ہے۔ البرٹ ٹوڈ نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"یوتوشینکو کی سب سے بڑی کمزوری، زندگی کے تعلق سے ان کا فوری ردِ عمل ہے۔ وہ اپنے خیالات کو نہ جذبہ و احساس کی آنچ میں تپاتے۔ ہیں اور نہ فکر کو لا شخصی بناتے ہیں۔ وہ کسی مقام پر ٹھہرتے نہیں، تیز رفتاری سے گذر جاتے ہیں"

اس اعتراض کے جواب میں یوتوشینکو کا بیان ہے۔

"کبھی سیر نہ ہونے والی بھوک نے مجھے پالا ہے اور کبھی نہ بجھنے والی پیاس نے مجھے ڈھالا ہے۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں بھولتا کہ کہیں کوئی ایسا ضرور ہوگا جو اسے ممکن بنائے گا جو میرے لئے ناممکن ہے"

یوتوشینکو کی تخلیقی رفتار اپنے ہم عصروں میں مقابلتاً زیادہ ہے۔ اب تک ان کی نظموں کے چھیالیس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ نہایت مقبول شاعر ہیں۔ ان کی ہر کتاب ایک لاکھ سے زائد تعداد میں شائع ہوئی ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کے قلم کی دیگر کاوشوں میں کئی ناول، کئی کہانیوں کے انتخاب، کئی مضامین کی کتابیں اور بہت سے فلمی منظر نامے شامل ہیں۔ ان میں سے دو پر انہوں نے خود ہدایت کاری کی ہے۔ یوتوشینکو ایک سیاح ہے جس کی سیاحت کا رقبہ مسلسل وسیع ہوتا رہا ہے۔ اس کی شاعری خارج و باطن کے تضاد میں روح کا نغمہ ہے۔

یوتوشینکو صرف فنکار نہیں عملی سیاست میں بھی فعال ہیں۔ وہ سماجی حالات کے محض تماشائی ہی نہیں ہیں، ان میں اپنے اتفاق و انحراف کے ساتھ شریک بھی ہیں۔ وہ ایک سپاہی کی طرح ادب و سیاست کے مختلف محاذوں پر بہ یک وقت سرگرم رہے ہیں اور لب بھی ہیں۔ ولادیمر کے ناول "صرف روٹی کافی نہیں" کی حمایت سے چیکو سلوواکیہ پر روس کے حملے کی مذمت تک یوتوشینکو کی باغیانہ اور سرکار مخالف سرگرمیوں کا ایک وسیع دائرہ ہے۔ اپنے ان اقدامات کی وجہ سے انہیں ملک بدر کیا گیا۔ ادبی کلب سے باہر کیا گیا کئی پابندیاں عائد کی گئیں۔ لیکن اس سب کے باوجود انسانی اقدار پر ان کے اعتبار اور نئے نئے خوابوں کے انتظار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "ریئیا" (یوتوشینکو کی ڈ/نیت) راست بیانیہ کے شاعر ہیں۔ ان کا شعری اسلوب کہانی کے آرٹ سے مماثل ہے وہ ہر مسئلے کو کہانی کی طرح کردار یا کرداروں کی صورت میں سوچتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی ہے اور سیاست کی غیر انسانی وحشت کے خلاف بھی ہے۔ ☆☆

مٹھی بھر نظمیں

یو توشینکو کی نظمیں

ترجمہ: ندا فاضلی

بہادری

لوگوں کی رائے ہے
میں بہت بہادر ہوں
لیکن میں خود کو جانتا ہوں
اپنی کمزوریوں کو پہچانتا ہوں
میں نے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے
صرف بزدلوں کی طرح اپنی تذلیل نہیں کی
اپنے طور سے زندگی کو جیا ہے
میں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا ہے
صرف جھوٹ اور بناوٹ پر ہنستا رہا ہوں
جو دیکھتا رہا ہوں وہ لکھتا رہا ہوں
ہاں یہ سچ ہے
میں ذہانتوں کا طرف دار رہا ہوں
جعلی قلم کاروں سے برسرِ پیکار رہا ہوں
میں نے وہی کیا جو ضروری تھا
ایسا کرنا میری مجبوری تھا
اس میں بہادری کی کون سی بات ہے۔؟
آنے والی نسلیں
جب ہمارے بارے میں سوچیں گی
تو انہیں حیرت ہوگی
کہ کبھی ایسا بھی زمانہ تھا
جب تھوڑی سی ایمانداری بھی
بہادری سمجھی جاتی تھی ●

جھوٹ

کم سنوں سے
جھوٹ بولنا غلط ہے
جھوٹ کو سچ کی طرح تولنا غلط ہے
ان کو بتانا
خدا آسمان میں ہے
اور امن و سکوں جہاں نہیں ہے۔ غلط ہے
وہ عوام ہیں
وہ تمہاری بات سنتے ہیں
انہیں سمجھاؤ،
مشکلوں کا شمار مشکل ہے،
انہیں سمجھاؤ
حالات بے رحم ہیں
وقت سنگ دل ہے۔
انہیں سمجھاؤ.
مصیبتیں آتی ہیں
مگر انہیں ٹالا جا سکتا ہے
انہیں سمجھاؤ
حالات رُلاتے ہیں
مرحلے ستاتے ہیں۔
جن کو خوشی کی قیمت نہیں معلوم
وہ خوشی کی قدر نہیں کرتے
ان کی بے دھیانی پر انہیں ٹوکو
غلط راستے پر چلنے سے روکو
تمہاری معافی سے آج وہ بھلے ہی بری ہو جائیں
لیکن ایسا نہ ہو اس معافی کی بنا پر
کل وہ ہمیں مجرم ٹھہرائیں ●

ٹرین کار

یہ ٹرین سے کٹا ہوا پرانا کمپارٹمنٹ
جو ایک دنیا دیکھ چکا ہے
اب بجھے ہوئے کوئلوں کے ڈھیر پر
گھاس پھوس سے گھرا ہے۔
سنسان کونے میں اُداس کھڑا ہے۔
کئی دنوں کی ویرانی کے بعد
اب یہ ایک گھر بن چکا ہے
یہاں آگ دہکنے لگی ہے
کھڑکیوں پر پھول دار بیل کھلنے لگی ہے
دیواروں پر روشنی چمکنے لگی ہے۔
الماریاں آ گئی ہیں
کھونٹیاں لگا دی گئی ہیں
تصویریں لٹکا دی گئی ہیں
ان تبدیلیوں نے اس کے ماضی کو چھپا دیا۔
لیکن یادیں
بہت سخت جان ہوتی ہیں
جب بھی کوئی ٹرین قریب سے
سیٹی بجاتی ہے
یا دھواں اُڑاتی ہے
تب اس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔
اسے ماضی کی یاد ستاتی ہے۔
گذرتی ٹرین اسے دور سے بلاتی ہے
لیکن اس کی شکتی کھو چکی ہے
اس کے پہیئے بے حرکت ہیں
اس کی رفتار ختم ہو چکی ہے
کبھی وہ بھی دن تھے
جب اس میں اپنی آگ تھی
پٹریوں سے اس کی دوستی تھی۔
ہوا سے ہم رشتگی تھی
رفتار میں نغمگی تھی
مگر اب یہ خاموش ہے، اداس ہے!
نہ کوئی آس ہے نہ کوئی پاس ہے
سچ ہے! جوانی اُڑان ہے
بڑھاپا تھکان ہے ●

میرا کتّا

کھڑکی کے شیشے سے منہ لگائے
وہ یوں ہی چپ چپ
انتظار کررہا ہے
وقت گزر رہا ہے
میں خاموشی سے اس کے ریشمی بالوں کو سہلا رہا ہوں
اسے کیسے سمجھاؤں
جس کا وہ منتظر ہے
میں بھی اس کے انتظار میں وقت بِتا رہا ہوں
یہ کتا واقف ہے
یہاں پہلے ایک حسین عورت تھی
وہ میری کون تھی؟
بیوی..... نہیں
بہن..... نہیں
ہاں کبھی کبھی وہ بالکل کسی معصوم بیٹی کی طرح
میری مدد کی طالب تھی
خیر۔ وہ رخصت ہو گئی
تم ابھی تک میرے ساتھ ہو
یہ رات بھی پہلے کی طرح گذر جائے گی
اب یہاں کوئی عورت نظر نہیں آئے گی
میرے پیارے کتے تجھ میں بہت خوبیاں ہیں
سوائے ایک عیب کے
میں پیتا ہوں
اور تو کم بخت نہیں پیتا۔ ●

بٹوا

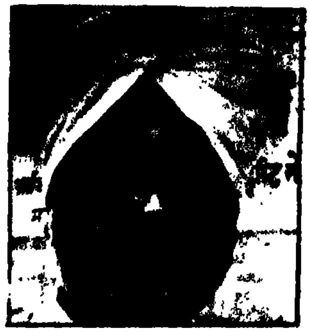
میں دن کی روشنی میں
بیچ رستے پر پڑا
ایک بٹوا ہوں
تم مجھے دیکھے بنا
میرے آس پاس سے گذر رہے ہو
کیا تمہارے پاس واقعی نظر نہیں ہے؟
تمہیں کیوں میری خبر نہیں ہے
کمال ہے!
میں تمہارے ہی قدموں کی دھول میں چھپا ہوں
بس ذرا جھک کے دیکھو
میں سامنے ہی پڑا ہوں
بس ہاتھ کا ایک اشارا
اور میرا سب کچھ تمہارا
میرا مالک کون ہے
اس کی فکر فضول ہے
گھبراؤ نہیں!
کوئی رسّی میں بندھی گھنٹی نہیں بجائے گا
قریب کھڑا کوئی بچّہ تالیاں بجا کر تمہاری
ہنسی نہیں اُڑائے گا
گھبراؤ نہیں
کوئی چہرہ کسی کھڑکی کی اوٹ سے نہیں مسکرائے گا
کوئی تمہیں بے وقوف نہیں بنائے گا
میں فریب نہیں حقیقت ہوں
برا نہ ماننا
مجھے صرف ایک ہی خدشہ ہے
مجھے جس کی تلاش ہے
جسے مجھے اٹھانا چاہئے
وہ شاید مجھے نہیں اُٹھائے گا ●

رشک

میں حاسد ہوں
میرے اس راز سے میرے علاوہ کوئی واقف نہیں
اس حسد کا نشانہ
کہیں ایک لڑکا ہے!
مجھے حسد ہے
اس کی بے خوفی سے
میں اتنا بے خوف کیوں نہیں ہوں
مجھے حسد ہے
اس کے ہنسنے کے انداز سے
میں اپنی عمر میں اس طرح کیوں نہیں ہنسا
وہ زخموں سے کھیلتا ہے
شان سے ہر غم کو جھیلتا ہے
میں اس طرح کیوں نہیں جیا
اس نے کتاب کے ان اوراق سے کبھی منہ نہیں مو
جنہیں میں نے جان بوجھ کر چھوڑا
اسے اندھیرے سے نفرت
اور اجالوں سے پیار ہے
وہ مجھ سے زیادہ صاف گو ہے
مجھ سے زیادہ ایماندار ہے
وہ اپنے فائدے کے لئے بھی جھوٹ نہیں بولتا
میرا ہاتھ کبھی قلم کو بیکار سمجھ کر گرا دیتا ہے
وہ اُسے باکار سمجھ کر اٹھا لیتا ہے
وہ جب کسی گرہ کو نہیں کھول پاتا
تو اسے کاٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے
مجھے اس طرح مشکل کو سلجھانا نہیں آتا ہے
وہ محبت کرتا ہے تو اسے نبھاتا ہے
میرا مزاج مسلسل بدلتا جاتا ہے
میں اپنے حسد کو چھپاتا ہوں، اور مسکراتا ہوں
اس مسکراہٹ سے خود کو بہلاتا ہوں
لیکن میں اسے کبھی نہیں بھلا پاتا
جو مجھ سے زیادہ جانتا ہے
اور مجھ سے زیادہ زندگی کو پہچانتا ہے۔ ●

مجھے وزیر آغا کی رائے سے اتفاق ہے کہ ستیہ پال آنند نے تمثیل سے باہر کھڑے ہو کر تمثیل کے کرداروں کو دیکھنے، نیز خود سے باہر نکل کر خود کا نظارہ کرنے کی جو روش اختیار کی ہے، وہ اردو نظم کو ایک انوکھی قوت عطا کر رہی ہے۔ مجھے اختر الایمان کی رائے سے بھی اتفاق ہے کہ ستیہ پال آنند کی نظمیں غزل کی لفظیات، استعارات اور زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے یکسر پاک ہیں۔ خود سے باہر نکل کر خود کا نظارہ کرنے والی روش ایک غیر شخصی رویّے کی غمّاض ہے اور غزل کی زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے رہائی عمومیت کی پُر فریب دلاویزی سے رہائی ہے۔ ستیہ پال آنند نے طریق کار کی بوقلمونی اور موضوعات کی رنگارنگی کے خصائص اپنی شاعری میں پیدا کر لئے ہیں۔ وہ ایک مخصوص کھردرے، نوکیلے اسلوب کی سعادت سے بھی سرفراز ہو گئے ہیں۔

——— بلراج کومل



رتن سنگھ

22-ADARSH NAGAR,NARBADAROAD,
JABALPUR (M.P)

ٹھہرا ہوا لمحہ

پھولوں سے لدے ہوئے گل مُہر کے پیڑ نے مُجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ جب لال سرخ انگاروں سے پھول اِس پر لگتے ہیں تو میں اپنے فلیٹ کی گیلری میں بیٹھ کر سامنے پڑوسی کے گھر میں اُگے اس پیڑ کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ اور اِسکی خوبصورتی ہے کہ اُسے دیکھتے دیکھتے دل نہیں بھرتا۔

اتفاق سے اس پیڑ کی ٹہنیوں کا جھکاؤ بھی میرے گھر کی طرف ہے، اور مجھے لگتا ہے جیسے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اِسکی ٹہنیاں بڑی ہوتے ہوتے دن بدن میرے قریب آتی جاتی ہیں۔

اِن پھولوں کا حُسن؟ اُسکی تو خیر پوچھو ہی نہیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے شبنم میں بھیگے ہوئے پھولوں کی رنگت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے زندگی کی کالی رات سے جوجھ کر فتح پانے والے شور بیروں کے لال لال چہرے، پسینے کے قطروں سے تربتر ہو رہے ہوں۔ پھر جیسے جیسے سورج نکلنے پر زندگی میں روشن اُجالے پھیلنے لگتے ہیں ویسے ویسے اِن پھولوں کے حُسن پر نکھار آنے لگتا ہے۔ جتنی زیادہ دھوپ اُتنی زیادہ اِنکی لالی۔

میں بے سُدھ ہو کر اِنہیں نہارتا رہتا ہوں۔ نہیں یہ بات مُجھے اِس طرح کہنی چاہئے کہ میں تو پورے ہوش وحواس کے ساتھ اِنکی طرف دیکھتا ہوں مگر انکی خوبصورتی میں گم ہو کر اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہوں۔

عجیب نظارہ ہے آیئے آپ میری آنکھوں سے اِس پیڑ کی طرف دیکھئے زمین کے اوپر سے نیچے کی طرف دھنستی جڑوں کے اوپر موٹا سا تنا جو آہستہ آہستہ پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اِس تنے سے چاروں طرف کو نکلتی ہوئی بڑی بڑی شاخیں اُن شاخوں سے پھوٹتی چھوٹی بڑی ٹہنیاں۔ ٹہنیاں پتوں اور پھولوں سے لدی ہیں، اور اِن سب کے بیچ سے آسمان کے نیلے نیلے چھوٹے بڑے رنگت کے ٹکڑے جھانکتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ آسمان ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر اس پیڑ کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے نیچے جُھک آیا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ پیڑ ہی آسمان کی بلندیوں کو چھو کر اس پر اپنی خوبصورتی کی انمٹ چھاپ چھوڑ رہا ہے۔

کبھی لگتا ہے کہ سورج کی کرنیں اِسکے پھولوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لاکھوں کروڑوں میلوں کا سفر کرتی بھاگی چلی آ رہی ہیں۔ کبھی لگتا ہے وہ کرنیں پھولوں کی لالی کو اپنے وجود میں سمیٹ کر تحفے کے طور پر آسمان کی طرف لئے جا رہی ہیں۔

اِن میں سے پہلی بات سچی ہے یا دوسری، یا دونوں۔ اسکا فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کو جیسا ٹھیک لگے وہی سچ مان لیں۔

ایک دن میں اِسی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے گل مہر کا پیڑ آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہا ہو۔ جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو۔ لو اب مجھے اچھی طرح پوری طرح دیکھ کر حقیقت کو سمجھ لو۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں اُس وقت کس کیفیت میں تھا۔ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ یا جاگنے اور سونے کی بیچ کی منزل میں تھا۔ غالباً اُس وقت مجھے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر کی گیلری میں یا کہیں اور۔ زمین پر تھا یا ہوا میں معلق تھا۔ یا آسمان میں تھا یا کہیں اور مجھے کسی چیز کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔

کوئی احساس تھا تو صرف یہ کہ وہ گل مہر کا پیڑ اپنی جڑوں سمیت، تنا، شاخیں، ٹہنیاں، پھول اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لئے اپنی جگہ سے اٹھا اور سارے کا سارا چلتا ہوا آیا اور میرے وجود میں آ کر سما گیا میں نے حیران ہو کر اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔

"باپ رے باپ"۔ گل مہر تو اپنے بیچ سے جھانکتے آسمان کے تمام ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ میرے اندر ڈیرا جمائے جھوم رہا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں تو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ پیڑ میرے اندر آ کر سما گیا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اس ہوا سے ٹہنیاں جھول رہی ہیں۔ ہوا کی لہروں کے پتوں کے بیچ سے گذرتے ہوئے سرسر کی آواز بھی میرے کانوں کو سنائی دے رہی ہے۔ ایک مدھر سا سنگیت ہے جس کی سر لہریاں میرے وجود کیا انگوں سے یوں ٹکرا رہی ہیں جیسے بہتی ہوئی ندی کی لہریں ندی کے کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ جس طرح ندی کے پانی کے نیچے ریت کا ہر کن پانی سے بھیگا ہوتا ہے۔ اسی طرح میرے وجود کا کن کن بھی ہوا کے سنگیت سے شرابور ہو رہا تھا۔

یہاں تک کہ میں نے اپنے اندر اگنت تتلیوں کو بھی پھولوں کے گرد منڈراتے ہوئے دیکھا۔

عام طور پر جب بھی اِن ننھی ننھی تتلیوں کو پھولوں کے گرد منڈراتے

دیکھتا تھا تو دل میں کبھی کبھی خواہش اُبھرتی تھی کہ اُن میں سے کوئی میرے پاس بھی آئے۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے کوئی تتلی آجاتی تو دل میں انجانی سی خوشی بھر جاتی تھی اور اب تو وہ سب کی سب میرے اندر منڈلا رہی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اِتنی خوشیوں کو کہاں سمیٹ کر رکھوں۔

خوشی کی کوئی انتہا تھی۔ اُسے بیان کرنا تو در کنار اُسے محسوس کرنے کرنے کیلئے میرے احساسات چھوٹے پڑ رہے تھے۔

تبھی ایک ٹہنی مقابلتاً زیادہ جھول گئی تو مجھے احساس ہوا کہ کوئی پنچھی ہوا میں اُڑتا ہوا آیا اور اُس شاخ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسکی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اُس نے پنکھ پھڑ پھڑائے، ذرا سا پُھدکا اور پہلے والی شاخ سے اُڑ کر دوسری شاخ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُس نے چونچ کھولی اور چہچہایا۔

"اُو اِی۔ اُو۔ اُو۔ اِی۔ اُو"

اُسکی آواز کو سن کر ٹہنیوں میں بیٹھے ہوئے دو تین پنچھی ایک ہی آواز میں بول پڑے۔

اُو۔ ٹو۔ ٹو۔ اُو۔ ٹو۔ ٹو۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ ہم یہاں ہیں۔ ہم یہاں ہیں۔

بس پھر کیا تھا۔ اچھی خاصی راگ رنگ کی محفل جم گئی۔

اب منظر یہ تھا کہ ہرے ہرے پتّوں کے بیچ لال لال پھول، اُنکے بیچ سے جھانکتا آسامان، ہوا کی سرسراہٹ، پکشیوں کی چہچہاہٹ، تتلیوں کے ننھے ننھے پنکھوں کے پھڑ پھڑانے سے نکلتی بڑی باریک سی مدھم سی آواز جیسے ستار کے تاروں سے نکلنے والے وہ مدھم سُر جو کسی کو سنائی نہیں دیتے، مگر اسی سطح سے دوسرے سُر سنگیت میں ڈھلنا شروع ہوتے ہیں

پکشیوں کا یہ سنگیت اونچا ہوتا ہو تا جب سَم پر پہونچا تو میں نے محسوس کیا کہ پیڑ کا قد بڑھنا شروع ہو گیا، شاخیں پھیلنی شروع ہو گئیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے گل مہر کا پیڑ سارے آسمانوں کی بلندیوں کو پار کر گیا۔ اور پورے برہمنڈ پر چھا گیا۔

ہر طرف خوبصورتی بکھر گئی۔ سارا برہمنڈ سنگیت سے بھر گیا۔ ہر طرف پھول کھلے تے ہر طرف پنچھی چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہر طرف گل مُہر کی ٹھنڈی چھاؤں پھیلی تھی۔ اُس چھاؤں کے بیچ بیچ نرم نرم گرم دھوپ کے ٹکڑے تھے جو سردیوں میں جسم و جاں کو راحت بخشتے ہیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے اُس گل مہر کے نیچے دنیا بھر کے سکھوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا اور دھرتی پر زندگی سکھوں کی چادر اوڑھے رواں دواں تھی۔

میں بھی سکھوں کی اِس چادر کو اپنے تن پر اوڑھے سکون کا احساس کر رہا تھا کہ ماحول میں کچھ تبدیلی آئی۔ ہوا کی لہریں کچھ تیز ہوئیں۔ پیڑ کی شاخوں نے قدرے زور سے جھولنا شروع کیا اور اُسکے ساتھ ہی لال لال پھول ٹوٹ کر میرے وجود کے اندر گرنے لگے۔ نرم نرم پھولوں کی اِس ہلکی ہلکی کن من کا بھی عجیب سکھ تھا لگتا تھا جیسے کوئی دلفریب شخصیت اپنا آپ نچھاور کرنے کیلئے میرے اوپر پھول برسا رہی ہو۔

یہ پھول ٹپ ٹپ گر رہے تھے اور میں اُنکے لَمس سے شرابور ہو رہا تھا

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ساری دھرتی مانسرور بن گئی ہو اور اُسکے پاک پوتر جل میں زندگی رنگ برنگے پھولوں کی طرح کھل کر پورے جوبن پر آکر اپنے ہونے سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ مجھے گل مہر کے پیڑ، پتّوں اور لال پھولوں کے بیچ اَنگنت خوبصورت چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ عورتیں۔ مرد بوڑھے، بچّے۔ جیسے وہ بھی وقت کے گل مہر پر پھول بن کر کھل آئے ہوں۔ دھرتی پر موجود ساری زندگی اِس گل مہر میں سمٹ آئی تھی۔

پھر اچانک جیسے ننھی سی چیونٹی کے کاٹنے پر آدمی ہڑ بڑا اُٹھتا ہے ویسے ہی میں تصور کی دنیا سے باہر آیا۔ جاگ کر حقیقت کی دنیا میں داخل ہوا اور میری نظر اُس طرف اُٹھ گئی جہاں ایک میلا کچیلا آدمی پھٹے پُرانے چیتھڑے پہنے آدھا ننگا آدھا ڈھکا اپنی ہتھیلیوں سے گل مہر کے گرتے ہوئے پھولوں کو نہار رہا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ جیسے بجلی کا تار چھو گیا ہو "زندگی تو اسی طرح میلی کچیلی ہے"۔

"ایسی صورت میں مجھے سکھ کی چادر اوڑھنا زیب نہیں دیتا" میں نے سوچا۔

برہمنڈ تک پھیلا ہوا پیڑ اُسی وقت سمٹ کر میرے اندر سے نکل کر پڑوسی کے آنگن میں چلا گیا۔ اُس پر اب بھی لال لال پھول مہک رہے ہیں اُن کے گرد تتلیاں منڈرا رہی ہیں۔ پھولوں کے بیچ سے سرسراتی ہوئی ہوا گذر رہی ہے۔

میلے کچیلے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور لال لال پھولوں والے گل مہر سے پوچھا:-

"تم تو لاکھوں کروڑوں سالوں سے اِس دھرتی پر ہو۔ اِس لمبے عرصے میں نسل در نسل اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھا۔ ایسے میں محض دو ہزار سالوں میں انسان پر کیا بیت گئی؟

گل مہر خاموش رہا۔ ولیش دیشانتر سے آئی بھانت بھانت کی چڑیاں اپنے سنگیت سے آواز میں چہک چہک کر میرے سوال کا جواب تو دے رہی ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔

میلا کچیلا آدمی اب اِس منظر سے دور چلا گیا ہے۔ لیکن ہے تو وہ دھرتی پر پھیلے زندگی کے گل مہر کے نیچے۔ اور اُس جیسے لاکھوں کروڑوں۔ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے لال لال چیونٹیاں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں، میرے تن بدن کو کاٹ رہی ہیں۔ میں درد سے بلبلا اُٹھتا ہوں ۔

تھوڑی دیر پہلے گل مہر کے اپنے وجود کے اندر آجانے سے میں نے سکھ کی انتہا دیکھی تھی۔ اور اب۔ ہاں اب۔ دکھ کی انتہا دیکھ رہا ہوں۔

سکھوں کے چند روشن لمحوں کے بعد دکھوں کی کالی لمبی رات گھر آئی ہے میں گھبرا کر پھر گل مہر کے پیڑ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ زندگی کا گل مہر

آنے والی رات کے گہرے اندھیروں میں دھیرے دھیرے ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ ہوا چل رہی ہے پھولوں سے لدی گل مہر کی ٹہنیاں حرکت میں ہیں۔

لیکن وقت؟ وہ لمحہ تھکا تھکا سا ٹھہرا ہو لمحہ محسوس ہو رہا ہے۔☆☆

بقیہ صفحہ ۳۱ منظر بدل گیا ھے

دوسرے روز جمی نے انگریزانہ بے باکی سے لئیق سے کہا کہ وہ امیقہ سے ڈیٹ مانگنے جارہا ہے۔ "تمہارا کوئی چانس نہیں!" اور وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا "پاگل آدمی میری ماں ٹیپیکل ایشین ہے !! مار کھائے گا اور مجھے بھی مروائے گا" گورے نے کہا "میں مذہب بدلنے کو تیار ہوں" وہ اعتبار ہی نہیں کر رہا تھ کہ اُس نے کوئی انہونی یا عجیب بات کی ہے۔ دل ہی تو ہے۔ عمروں کا فرق بے معنی ہے۔ لئیق کی شادی تو دور کی بات تھی اب امیقہ کی دوسری شادی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

ایک مسئلہ اور بھی اچانک ابھر آیا۔ لئیق کا اس سے بھی کوئی تعلق واسطہ نہ تھا پھر بھی وہ اس نئے مسئلے سے کسی طور الگ نہ تھا۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں میں شور اٹھا کہ ہندوستان نے تین ایٹمی دھماکے کئے ہیں تو پاکستان نے پانچ دھماکے کر ڈالے۔ آگے کیا ہوگا اسے بلکہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا!!۔☆☆

● زرِ سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے، میں اپنا تعاون دیجئے۔

● منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں مع خریداری نمبر ضرور درج کیجئے۔

● ڈرافٹ یا چیک پر صرف THE SHAIR BOMBAY درج کیجئے۔



مظفر حنفی

ہرت ، کہیں جاگیر ، کہیں مال بچھایا
میرے لئے دنیا نے بڑا جال بچھایا

داغوں سے بوسیدہ ہے زخموں سے ہے چھلنی
تیرے لئے قالین بہر حال بچھایا

ش ہوں کہ مرے سینے پہ تیروں کی اُگی فصل
نٹوں نے مری راہ میں اقبال بچھایا

چھا ہے زمانے کو نئی گھات نہ سوجھی
ب کے بھی وہی دامِ مہ و سال بچھایا

پردیس نہ جانا کبھی بنگال کو ہم نے
کلکتہ میں دلّی کبھی بھوپال بچھایا

● P-1/7,CIT SCHEME VII,M
CALCUTTA-700054(W.B.)



طلحہ رضوی برقؔ

ریزشِ خوں، صدقہ ہائے جاریہ بنتی گئی
زندگی ہر رخ سے دشتِ ماریہ بنتی گئی

کارزارِ زیست میں مومن کو بادِ تند بھی
خوش صدائے الجبل یا ساریہ بنتی گئی

طاق تھا اپنا وجود اب یہ متاعِ یک عدد
کیا ہوا کیسے ہوا اعشاریہ بنتی گئی

زلفِ شبگوں ان کی پھیلی دوش پر کچھ اس طرح
دل پہ عکسِ لشکرِ تاتاریہ بنتی گئی

مَاخَلَقتُ الجِنَّ وَ الاِنسَ سے ہستی برقؔ کی
روشنیٔ سورۂ الذّاریہ بنتی گئی

●DANISHKADA,SHAHTOLA,DANAPUR
CANTT. PATNA-801503(BIHAR)



حمید الماس

فیصلے کے موڑ پر

میں ایسے موڑ پر اب آگیا ہوں
جہاں یہ فیصلہ کرنا ہے مجھ کو
تمہاری چاندنی جیسی رفاقت چھوڑ کر
تنہا
اتر جاؤں نشیبی گھاٹیوں میں
یا
اپنے عہدِ پارینہ کو دہرانا مناسب ہے
مگر اس کشمکش کی دھند میں مجھ کو نظر آئیں
کہیں
تشکیک کی کالی فضائیں
تمہاری نیم وا آنکھوں کی ہلکی سی روشنی
رخ کی تمازت
مرمریں پاؤں کی بے تابی
نئے منظر
نئی راہوں کی شادابی

- 1169, 26TH A MAIN 9TH BLOOK ,
JAYANAGAR , BANGLORE -560069
(KARNATAKA)

علی احمد فاطمی

229 - A, LUKER GANJ,
ALLAHABAD - 211001 (U.P.)

اردو افسانہ: ۱۹۶۰ء کے بعد

شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کے لئے افسانہ مذاکرہ کے تحت ایک سوال نامہ 'افسانہ: ۱۹۶۰ء کے بعد' ترتیب دیا گیا تھا۔ مذکورہ سوالنامہ ہند و پاک کے نئے افسانہ نگاروں اور فکشن کے نئے ناقدین کو خاصی بڑی تعداد میں ارسال کیا گیا تھا۔ سوال نامے کے جوابات بھی خاصے اُمید افزا موصول ہوئے تھے۔ ان میں سے جلد اوّل میں الف تا س کے تحت قلم کاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ الف تا س کے کئی نام ابھی باقی ہیں۔ حرف 'س' کے بعد جو نام آتے ہیں اور جن کے جوابات دوسری جلد میں شامل کئے جائیں گے۔ ان میں سے ایک علی احمد فاطمی کا نام بھی ہے۔ اردو فکشن کے نئے ناقدین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے فکشن کی تنقید لکھی ہے اور لکھ رہے ہیں۔ ان کے یہ جوابات ۴/اکتوبر ۱۹۹۵ء کے تحریر کردہ ہیں یعنی کئی سال قبل۔ بہ ظاہر سوال نامہ اور اس کے جوابات پرانے ہو گئے، لیکن ایسا ہے نہیں کیوں کہ سوال نامہ وقتی اور سرسری نہیں تھا جیسا کہ فکشن پسند قارئین اور ناقدین نے ہم عصر اردو ادب نمبر میں ملاحظہ کیا ہوگا۔ ۲۰/ویں صدی کے نصف آخر کا اردو فکشن موضوع بنتا رہا ہے، بنا ہے اور بنتا رہے گا۔ "اردو ادب کی ایک صدی" کے تحت اردو فکشن کی تاریخ نگاری میں یہ سوال نامہ اور اس کے جوابات اہم ماخذ ہیں۔ علی احمد فاطمی سے اردو فکشن پر تازہ ترین مکالمہ متوقع ہے لہٰذا خاص نمبر کی جلد دوم میں کسی نئے مکالمے کی خاطر اس جواب نامے کو عام شمارے میں شائع کیا جارہا ہے کہ اس میں بعض بہت اہم اور بنیادی مسائل رقم کئے گئے ہیں جو آج بھی اردو کہانی کے تنقیدی مباحث ہیں اور آئندہ بھی یہ مباحث قائم ہوں گے۔ اب معاصر اردو افسانہ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے کچھ اور مختلف ہو گیا ہے۔ لیبل لگانے والے آج کی اردو کہانی کو حسبِ دل جو چاہیں لیبل لگائیں۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ (الف۔ الف)

آپ کے اشاریے سے غالباً چھ مختلف قسم کے سوال پھوٹتے ہیں چونکہ سوال بہت اہم اور بنیادی ہیں اس لئے ان کا مختصر اجواب دے پانا ممکن نہیں پھر بھی اپنی محدود بساطِ علم کے مطابق ٹوٹے پھوٹے انداز میں کچھ اوراق کالے کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا ہنر مجھے نہیں آتا اس لئے امکان ہے کہ میں بہک جاؤں آپ کو حق ہے کہ اپنے طور پر تراش خراش کر لیجئے لیکن اس طرح سے کہ نفسِ مضمون متاثر نہ ہو۔ میں نے اپنی آسانی کے لئے سوالوں کی ترتیب ذرا بدل دی ہے۔

آپ کا پہلا سوال ہے کہ افسانہ کیا ہونا چاہئے سامنے کا سوال تو ہے لیکن خاصا الجھا ہوا ہے۔ افسانہ کا شمار جدید ترین نثری افسانہ میں ہوتا ہے، اگر افسانے کا مطلب کہانی یا داستان سے ہے تو اس کا چلن بہت پرانا ہے شاید شاعری سے بھی زیادہ پرانا۔ کہانی کا مطلب ہی ہوتا ہے کہنے سننے کی بات۔ کہانی کہنا اور اس سے زیادہ کہانی سُننا انسان کی فطرت میں شامل رہا ہے اگرچہ جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے کہانی سنانا اور کہانی لکھنا کو دو الگ الگ فن اور صنف قرار دیا ہے اور شاید یہ سچ بھی ہے لیکن ان دونوں میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے اس کا پُر شوق، تجسس آمیز عمل۔۔۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو انسان کے بڑے سے بڑے وجدان میں پنہاں رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقدس کتابوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی بڑی بڑی روحانی و اخلاقی باتیں کہانی کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ کہانی کہنا ہو یا کہانی سننا یا اب کہانی پڑھنا ان سب کے پیچھے مسرت کا جذبہ کار فرما رہتا ہے اور انسان کی یہ مسرت ایک بہت بڑی صداقت ہے، اسی کی تلاش میں وہ تارے بھی توڑتا ہے، زمین کھودتا ہے اور طرح طرح کی ایجادات و انکشافات کرتا ہے اگر کسی شے میں مسرّت نہیں ہے تو پھر وہ ایک بہت بڑی سچائی سے دور ہے۔ پریم چند نے ایک جگہ کہا تھا۔ "جو چیز مسرّت بخش نہیں ہو سکتی وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ جہاں مسرّت ہے وہیں صداقت ہے۔ ادب تخلیقی چیز ہے لیکن اس کی ممتاز صفت مسرّت زا ہے اس لئے وہ صداقت ہے۔۔۔ "مسرّت و صداقت کے فلسفوں کی بڑی شاخیں ہیں جس میں اس وقت الجھا نہیں جاسکتا یہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ادب مسرّت و صداقت کی تلاش کا ہی نام ہے۔ تہذیب کی تبدیلی و ترقی اسی لئے ہوتی ہے کہ انسان اپنی مسرّتوں و صداقتوں کو محسوس کر سکے۔ فلسفہ بھی یہی کام کرتا ہے چونکہ فلسفہ عالموں کے لئے ہوتا ہے اور ادب عام انسانوں کے لئے اس لئے ان دونوں کو پیش کرنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ادب میں زندگی کی ہو بہو تصویر پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا اس میں تخیل کی کار فرمائی اور عام دلچسپی ضرور ہوا کرتی ہے۔ پریم چند نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ۔۔۔ "حقیقت جب مجاز کی شکل لے لیتی ہے تب عوام اسے سمجھنے لگتے ہیں"۔ اور یہیں سے عمل و حرکت۔ فن و صنعت کے سارے کھیل شروع ہونے لگتے ہیں۔ آپ دیکھئے پہلے کہانیوں میں طویل طویل واقعات ہوا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے واقعات و حادثات بڑھتے گئے انسان تجربات سے مالا مال ہوتا

گیا۔ وقت بدلتا گیا فطری طور پر کہانی کے روپ بھی بدلتے گئے۔ ادب واقعات نہیں تجربات ہوتے ہیں لیکن ان تجربات میں دلچسپی اور دلکشی اسی وقت آتی ہے جب تجربات واقعات کی شکل میں پیش کئے جائیں کچھ اسی طرح سے کہ اس میں حقیقت کی نقل ہو ، نیا پن ہو اور زندگی کی امنگ ہو۔ آج کہانی اپنے ارتقائی سفر میں ہے اور کچھ اس منزل پر آ گئی ہے کہ اب لکھنے والے کو لکھنے سے قبل ایک ہزار بار سوچ لینا چاہئے کہ وہ کیا لکھنے والا ہے۔ وہ جس موضوع کو پیش کر رہا ہے اسے فکر و خیال کی بنیادی تہوں میں اتار لینا چاہئے اس کے خون میں تحلیل ہو جانا چاہئے کچھ اس طرح سے کہ جب وہ لکھنے بیٹھے تو تخلیق کا فطری عمل اس کے ذہن و قلم میں سما جائے۔ پھر اسے احساس بھی نہ ہو کہ وہ کس موضوع پر کہانی لکھ رہا ہے۔ اگر لکھنے کے دوران اس کے ذہن میں ہمہ وقت موضوع سوار رہے گا تو پھر فن کارانہ لچک اور تخلیق کی مہک کے ختم ہونے کا احتمال رہے گا۔ اور کہانی میں بلاوجہ کا تناؤ پیدا ہوگا۔ اسی لئے کہانی سے کہانی کار کے Detachment کی بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ "کوئی بھی ناول یا کہانی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ مصنف نے خود کو شعوری طور پر قصے سے الگ نہ کر لیا ہو۔" اسی لئے کچھ لوگ کہانی کو ایک لاشعوری تصویر بھی مانتے ہیں جس کی کوئی منطق نہیں ہوتی، اسی لئے وحدت زماں و امکاں وغیرہ کی باتیں اب بہت پرانی سی لگتی ہیں جو گیندر پال نے بھی کہا تھا۔ "فن کی معراج دراصل زندگی کے مانند آزادروی ہے۔ جو کہانی کار اپنی کہانیوں میں واقعات کو قابل یقین بنانے میں اڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اسی کاز کی نفی کرتے ہیں جس پر وہ اڑے ہوتے ہیں۔" کہانی کی تکنیک۔ کردار۔ پلاٹ وغیرہ پر زیادہ باتیں نہیں کی جا سکتیں اس لئے کہ زندگی کا آزادانہ رویہ اور اس کا متضاد عمل فکر و خیال کو کسی ایک نکتے پر ٹھہرنے ہی نہیں دیتا، اسی لئے ایک کہانی کیا، کسی بھی صنف پر حتمی بات کہہ پانا ناممکن سا ہوا کرتا ہے اس لئے کہ تکنیک نئے نئے مواد سے ہم آہنگ ہو کر ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

کہانی کے سلسلے میں ایک بات ضرور اہم ہے جس پر وہ قلم سے لے کر شمس الرحمن فاروقی تک سبھی نے زور دیا ہے وہ یہ کہ کہانی کی بنیاد دلچسپی پر ہونی چاہئے جسے کبھی کہانی پن کے نام سے بھی لوگ یاد کرنے لگتے ہیں حالانکہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں اور کبھی کبھی الگ ہوتے ہوئے بھی ایک شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ جس کہانی میں دلچسپی ہو اس میں کہانی پن بھی ہو، یا جس میں کہانی پن بھی ہو اور دلچسپ بھی ہو۔ دلچسپی کا معاملہ بھی غور طلب اور بحث طلب ہے کہ اس کے معیار و اقدار کیا ہیں۔ دلچسپی صرف راجہ رانی کی روایتی کہانی میں یا دلچسپی صرف رومانی، یا جاسوسی کہانی میں ہی نہیں ہوتی، دلچسپی اس حقیقت کی نقالی میں بھی ہوتی ہے جو آپ کو بہت سارے مقام پر غور و فکر تحیر و تجسس کی منزل پر لا کر کھڑا کر دے۔ ایک سوال کا ایک اضطراب ، بے اطمینانی پیدا کر دے۔ دلچسپی غم انگیز اور دلدوز واقعات میں بھی ہوتی ہے۔ افلاس و غربت اور نفسیاتی بصیرت میں بھی ہوتی ہے اگر وہ زندگی سے بہت قریب ہے۔ کہانی کے دیگر عناصر دلکشی و دلچسپی کے تابع ہیں۔ وقار عظیم نے اچھی بات کہی تھی۔ "بعض اوقات جو کچھ منطق کی نظر میں بے معنی اور مضحکہ خیز ہے یہاں بامعنی بھی ہے اور اہم بھی۔ یہ منطق دلچسپی پیدا کرتی ہے، اسے قائم رکھتی ہے، اسے بڑھاتی ہے اور کہانی ختم کرنے کے بعد بھی جاری رکھتی ہے.... یہ منطق معقولیت اور نفسیاتی احساس کی پابند ہو کر بھی کبھی کبھی اس سے منہ موڑ لیتی ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ کہانی کہنے اور لکھنے کے طریقے اس قدر بدل گئے ہیں کہ دلچسپی، فکر، اسلوب وغیرہ میں بے پناہ تبدیلیاں آ گئی ہیں اس لئے آج افسانے کے سلسلے میں کوئی حتمی کسوٹی بنانا مشکل ہو گیا ہے لیکن تجربات نے کچھ وسعت عطا کی ہے تو کچھ بنیادی عناصر کی اہمیت بھی اجاگر کی ہے۔ کوئی کہانی میں نظریے کو اہمیت دیتا ہے، کوئی تہذیبی رنگارنگی کو۔ کوئی تکنیک کو۔ حقیقت یہ ہے کہ تکنیک اپنے آپ میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دراصل کہانی کا مرکزی خیال ایک سچے اور اچھے کہانی کار کے ذہن میں مدتوں رچتا بستا ہے اور اس تخلیقی وجدان کا حصہ بن جاتا ہے۔ پھر جب خیال کہانی کا روپ لینے لگتا ہے تو تکنیک اپنا راستہ خود بنانے لگتی ہے۔ تو دراصل تکنیک کہانی کار کے تخلیقی وجدان کی ایک شکل ہوتی ہے اس کے آئینۂ فکر کا ایک مرتعش اظہار۔ ہمیں ایک بات اور نہیں بھولنا چاہئے وہ یہ کہ نثر کا بنیادی مزاج بیانیہ ہوتا ہے۔ کہانی جو نثر میں لکھی جاتی ہے اس کے لئے بیان اس کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اچھی کہانی اور اس کی دلچسپی کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے کہ اس کا بیان کس قدر جاندار ہو سکا۔ وہی بیان زندہ رہتا ہے جو کہانی کی باطنی تنظیم کو اجاگر کرے اور اس میں معاونت کرے۔ خوبصورت بیان خیال کو تعمیری شکل دیتا ہے اور خیال کو تاثیر کے حوالے سے دور تک پہنچانے کی لازوال کوشش کرتا ہے۔ ایک گونج پیدا کرتا ہے۔ اکثر کہانیاں کردار، واقعات کے بغیر محض اپنے خوبصورت بیان پر زندہ رہتی ہیں (بیان کی خوبصورتی کا مطلب الفاظ کی خوبصورتی نہیں ہے بلکہ اس کا فطری بہاؤ ہے) احمد ہمیش نے اورنگ آباد کی ایک محفل میں کہا تھا کہ کہانی سٹرھی ہوتی ہے وہ بیانیہ کے بغیر آگے بڑھتی ہی نہیں ہے (حالانکہ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب وہ مکھی جیسی کہانیاں لکھنا چھوڑ چکے تھے) جس صنف کا تعلق گہرے اور جاندار بیان سے ہو تو اس میں حسن بیان ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ افسانہ ایک واقعہ، ایک پہلو اور کبھی کبھی ایک لمحے کی تصویر پیش کرتا ہے اور اکثر اس میں نفسیات و جمالیات کی گرہیں بھی کھلتی ہیں اور اس میں دلچسپی کا عنصر ضروری ہو تو پھر کہانی میں زبان و بیان کی غیر معمولی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کوئی کچھ بھی کہے، کہانی کی اسلوبیاتی رمضیاتی قدر و قیمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا یہاں پر وقار عظیم کی ایک بات اور سنتے چلئے۔ "حسن بیان خواہ سادگی کی صورت اختیار کرے خواہ رنگینی کی، خواہ اس پر استعارے کا پردہ پڑا ہوا ہو، خواہ کنایے کا، اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب لکھنے والا کہی جانے والی بات اور بات کہنے کے اسلوب میں صحیح رشتہ قائم کرے تو یہ بات محض خداداد نہیں ہوتی اس کی پرورش خون جگر سے ہوتی ہے۔"

اس پر بحث ہوتی رہی ہے اور پھر ہونی چاہئے کہ حسن کا تصور کیا ہے۔ نشاط و مسرت اصلاً کیسے حاصل ہوتی ہے؟ بیان اور بیانیہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ وارث علوی نے اپنے مضامین میں کہانی کے تعلق سے جذبۂ حیرانی اور آرزوئے نشاط وغیرہ کی اصطلاحیں بار بار استعمال کی ہیں تو ان کا مطلب کیا ہے؟ فاروقی اور ان کا شب خون کیا کہتا ہے۔ ترقی پسندوں کا جمالیات سے متعلق مارکس کا نظریہ کیا ہے، اور کیا ہونا چاہئے؟ بہر حال سب ایسے موضوعات ہے جن میں تضاد ہے بُعد ہے۔ تو پھر افسانے کے فن پر اتفاق و اتحاد کیسے ممکن ہے۔ لیکن یہ نااتفاقی یا رنگا رنگی خوش آئند ہے، یہی زندگی کی دلیل ہے اور اسے اسی طرح چلتے رہنا چاہئے۔ اسی سے لہو گرم رہتا ہے اور لہو کا گرم رہنا ضروری بھی ہے قرأت و سماعت کا سرد لمس ادب کو موت کے قریب لے جاتا ہے۔

آپ کا ایک سوال ہے..... **کیا افسانے کے لئے قاری اہم ہے؟**

یہ سوال تو ایسا ہی ہوا جیسے آپ کہیں کہ کیا جسم کے لئے روح ضروری ہے؟ یا آنکھ کے لئے روشنی ضروری ہے؟ ایک افسانہ کیا، پورے ادب کے لئے قاری کی اپنی زبردست اہمیت ہے۔ ادب اور قاری لازم و ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل۔ ایک دوسرے کے دوست اور دشمن بھی جس چیز کو پسند کرے اسے لافانی بنادے اور جس کو ٹھکرادے وہ گمنامی کے گہرے غار میں چلا جائے..... ویسے تو نقاد بھی قاری ہوتا ہے۔ قدرے ذہین اور پڑھا لکھا قاری۔ خود تخلیق کار بھی اپنے آپ میں اوّلین قاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن آپ کے سوال کا مطلب ہے ایک عام قاری لیکن اس عام قاری میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ صوفی، حکیم، استاد، بزرگ و خورد، رنگا رنگ، مختلف المزاج اس میں کھو جانے کی ادا ہوتی ہے اور ادب جاننے کی بھی۔ کسی کو قدیم ادب سے لگاؤ ہوتا ہے تو کوئی جدید ادب کو پسند کرتا ہے۔ کچھ قاری ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر طرح کی چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ادب کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسے پان چبارہے ہیں پھر اسی طرح وہ تھوک بھی دیتے ہیں۔ لیکن شاہکار تخلیق وہی ہوتی ہے جس میں ہر عمر، ہر عہد اور ہر مزاج کا قاری داخل ہو جائے، جو زماں و مکاں سے بے نیاز ہو جائے۔ جو تاریخ و جغرافیہ زبان و تہذیب کی عام سرحدوں کو بھی پار کر لے۔ تخلیق کو اصل مقام تو قاری ہی عطا کرتے ہیں، بغیر تنقید کئے ہوئے، بغیر کچھ لکھے ہوئے، شاید اس لئے کہ وہ ایک پاکیزہ معصومانہ ذہن سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور بے لاگ ہو کر اپنی رائے رکھتے ہیں۔ ایک سنجیدہ قرأت کے لئے جس طہارت کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ ایک ناقد میں کم ایک عام قاری میں زیادہ ملتی ہے۔ وارث علوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔۔ " قاری کے اعصاب زندہ ہوتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ تنقید جھوٹ بولتی ہے۔"

علی سردار جعفری نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ ایک تخلیق کار جن Association' of Ideas کے ساتھ تخلیق کرتا ہے قاری بھی اپنے Association of Ideas کے ساتھ تخلیق کو قبول کرتا ہے۔ اسی لئے ردّ و قبول کے مدارج و سطحیں ہوا کرتی ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ علمی سطح پر اس کا مذاق و مزاج بھی مختلف ہوا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تخلیق کار ہمہ وقت قاری کا خیال اور تخلیقی عمل کے ذرّیں لمحات میں بھی اس کے اعصاب پر قاری سوار رہے تو بہت ساری مصیبتیں ایک ساتھ کھڑی ہو سکتی ہیں اس لئے ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ ذہین تخلیق کار اپنی عام اور دلکش تحریر و تخلیق میں ہی نازک اور گہرے نکتے پیدا کر دیتا ہے اور تخلیق کی عظمت و برتری بھی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ سہل ممتنع میں بڑی سے بڑی بات کہہ جائے۔ ایسی تخلیقات دائرۂ قاری کو بڑھاتی ہیں۔ نقاد کی طرح قاری میں بلاوجہ کی انا نہیں ہوتی۔ اس میں رشک و حسد بھی نہیں ہوتا اس کی اپنی ایک تہذیب نفس ہوتی ہے۔ وہ عالم و فاضل تو نہیں ہوتا لیکن باطنی طور پر تربیت یافتہ ہوتا ہے یا لاشعوری طور پر ہونا چاہتا ہے۔ وہ ادب سے غم و نشاط کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ فکر و نظر کی کشادگی ملتی ہے۔ جہاں یہ سب کچھ ملتا ہے اس فن پارے کو بغیر اعلان کئے ہوئے جاوداں بنا دیتا ہے اور جہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ نقادوں نے تخلیق کار کو بلاوجہ عظیم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ تخلیق کار بھی گم ہو جاتا ہے۔

ایک بار دہلی اردو اکاڈمی نے افسانے پر ایک بڑے سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں افسانے پڑھے گئے اور بعد میں ان افسانوں پر تجزیاتی مضامین سنائے گئے۔ ان مضامین میں افسانوں کو ضرورت سے زیادہ بلند و بالا ثابت کیا گیا لیکن آج وہ افسانے کہاں ہیں۔ کئی تخلیق کاروں نے اپنے مال و دولت یا اثر و رسوخ سے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی اردو میں ان دنوں ایسی کساد بازاری خاصی گرم ہے۔ لیکن تخلیق اپنی جگہ سے ہل نہ سکی ہاں بعض نقادوں کے چہرے ضرور بے نقاب ہو گئے۔ ہر ادب میں شاہکار تخلیقات وہی ہوتی ہیں جنہیں قارئین نے اپنے ماتھے سے لگایا اور قلب و جگر میں جگہ دی ہے۔ نقاد نے تو بعد میں اس کی وضاحت و تشریح کی۔

کسی نے کہا ہے کہ زبان و ادب کو شاعر اور افسانہ نگار پروان چڑھاتے ہیں اور شاعر و افسانہ نگار کو قاری۔ اس لئے ہمیں قاری کی سب سے زیادہ فکر کرنی چاہئے۔ افسوس کہ ہم نے زیادہ بے توجہی اسی سے برتی۔ ہر سطح پر، چنانچہ ادب کا قاری ہم سے روٹھ گیا۔ اس کی بہت سی سیاسی اور سماجی وجوہ ہیں جن پر اس وقت تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن ایک قصور تخلیق کاروں کا بھی ہے۔ اگر ہم نے قاری نہیں پیدا کیا تو سارا علم و فضل بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ ادارے، اکادمیاں سب جگہ تالے لگ جائیں گے۔ کتابوں میں دیمک لگ جائے گی۔ اگر قاری ہے تو ادب ہے، ادیب ہیں، شاعر ہیں، زندگی ہے۔ پھر اسی کے بطن سے تخلیقی ادب کے انکھوے پھوٹیں گے۔ اس لئے آج تنقید و تخلیق سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قاری پیدا کریں۔ مغربی ادیبوں کے اس اعتراض پر کہ روس میں انقلاب کے بعد اعلیٰ ادب کیوں نہیں پیش کیا گیا۔ روس کے ممتاز ادیب ایلیا اہرن برگ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کا کہنا ٹھیک ہے کہ ہم نے ٹالسٹائی جیسا بڑا ادیب اس بیس تیس سال میں نہیں پیدا کیا لیکن ہم نے وہ شخصیت پیدا کی ہے جو آپ ایک ہزار سال میں نہیں کرسکتے۔ ہم نے بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔"گریٹ ریڈر" جو آپ کے معاشرے میں نہ اب ہے اور نہ اس کی موجودہ صورت میں کبھی ہوگا۔"

ہمارے یہاں صورت حال مختلف ہے۔ ہم نے گذشتہ بیس پچیس برس میں نہ بڑی تخلیقات پیش کی ہیں اور نہ قاری پیدا کئے یا بڑھائے۔ اردو کے جدید افسانوں نے تو قاری کی تعداد اور گھٹائی ہے۔ وارث علوی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "جدید افسانے کا کوئی قاری ہے ہی نہیں۔" ہو سکتا ہے یہ جملہ بہت سخت ہو لیکن یہ سچ ہے کہ اردو ادب کا قاری رفتہ رفتہ ادب سے روٹھ رہا ہے۔ معدوم ہو رہا ہے۔ اس عمل میں ان جدید افسانوں کا بڑا دخل ہے جس میں نشاط ہے نہ کیفیت نہ زندگی کی حرارت، جب یہ سب نہیں تو افسانوی قرأت کا وہ لطف وحظ نہیں جو فطری طور پر نثری تحریر اور بالخصوص افسانوی تحریر میں فطری طور پر جذب وپیوست ہوتا ہے اور جس کے سہارے قاری بڑی فکر اور مشکل فلسفے کو بھی انگیز کرتا ہوا اختتام تک کا سفر طے کر جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اس لئے قاری بھڑک گیا اور بھٹک گیا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ قاری کل ہی مر گیا، بس اسے دعوت دینے اور پہنچنے کی ضرورت ہے اور آج کا جدید تر افسانہ شاید اسی کشمکش سے دوچار ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ قاری کے بغیر ادب زندہ نہیں رہ سکتا اور افسانوی ادب سے قاری کا ایک مخصوص رشتہ ہوتا ہے۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھتے ہیں جو کسی وجہ سے شاعری میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ چنانچہ شعر وادب کے لئے قاری اہم ہی ہیں، ناگزیر بھی ہے۔

آپ نے ۶۰ء کے بعد اردو افسانے کے تجربات کے بارے میں سوال کیا ہے۔ اس پر منفی انداز میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود میں نے ہی کئی مضامین سپرد قلم کئے ہیں اس لئے اب میں اس نوع کی بحثوں کو چھیڑتے ہوئے ہرگز مسرت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن محض آپ کی ہدایت کی تکمیل کے لئے چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

عام خیال ہے کہ ۶۰ء کے بعد کے اردو افسانوں کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو اس سے قبل کے افسانوں کو حاصل ہوئی تھی۔ ایسا کیوں ہوا اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایلیا اہرن برگ نے ایک معقول سا جواب دے کر ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر یورپ کے ادباء کو خاموش کر دیا ہو لیکن یہ سوال ہے اپنی جگہ پر اہم اور اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح طوفان آنے سے قبل کی خاموشی بڑی معنی خیز ہوتی ہے۔ ہواؤں کی سنسناہٹ اور سرگوشیاں طوفان آنے کا پتہ دیتی ہیں اسی طرح طوفان کے گذر جانے کے بعد بھی ایک خاص قسم کا سناٹا چھا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے، ایک عہد تھا جب دنیا کے بڑے حصے میں انقلابات آرہے تھے۔ ہندوستان بھی انقلابی آہنگ سے دوچار تھا۔ جنگ آزادی، حصول آزادی، ترقی پسند تحریک کا قیام، فرقہ وارانہ فسادات، قتل وغارت گری یہ سب کچھ تقریباً پندرہ بیس برس میں ہو گیا۔ اب اس عہد کا ادب دیکھئے خاص طور پر افسانے، منٹو، کرشن، بیدی، عصمت، قاسمی، عباس، وغیرہ ایک سے ایک بڑا نام، ایک سے ایک بڑے افسانے، ایک تاریخ ترتیب پائی۔ ۱۹۵۰ء کے آس پاس افسانہ نگاروں کی ایک نسل اور سامنے آئی غلامی اور جنگ کے مسئلے تو نہ تھے لیکن بدلا ہوا سماجی اور تہذیبی ماحول ضرور تھا۔ زمینداری ٹوٹ رہی تھی۔ نچلا طبقہ سر اٹھا رہا تھا۔ کوٹھیاں کھنڈر ہونے لگیں تو فلیٹ تیار ہونے لگے۔ چوپال ویران ہوئے تو ریستوران اور کافی ہاؤس آباد ہونے لگے۔ بیل گاڑی رخصت ہوئی تو موٹر اسکوٹر رائج ہونے لگے۔ پردہ ہٹا تو اسکول کالج آباد ہونے لگے۔ ایک نئی تہذیب، ایک نیا مزاج، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، اقبال متین، عابد سہیل، جوگیندر پال، جیلانی بانو وغیرہ کے افسانوں میں ایسے ہی مسائل نظر آئیں گے یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہوا۔ پھر اچانک شعوری طور پر مناظر بدل دیئے گئے۔ ایک سوچے سمجھے انداز میں سارے سماجی مسائل، ذات کے نہاں خانوں میں گھس گئے اور کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلانے لگے۔ علامت، تجریدیت جو عام طور پر افسانے میں بیانیہ کی ضد ہوا کرتے ہیں، نئے افسانے میں عود کر آئے۔ اب افسانے کے موضوعات تھے تنہائی، عدم تحفظ، الہام، انجماد، معمہ اور چیستان۔ وارث علوی نے اس طرح کے افسانوں کو ہڈیوں کے ڈھانچے اور پرورژن کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سب کس سماج اور کس سیاست کی دین تھے۔ ہرچند کہ یہ کانٹوں بھرا راستہ آیا اور گذر گیا لیکن یہ مختصر سا وقفہ کیونکر آیا؟ یہ سوال آج بھی غور طلب ہے۔ دراصل یہ رجحان ایک منفی احساس کے تحت ترقی پسندوں کے افکار ونظریات کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے پیدا ہوا یا کیا گیا تھا۔ چونکہ ترقی پسندوں نے اعلانیہ طور پر خارجیت کو اہمیت دی تو جدیدیوں نے اس کی ضد میں باطنیت کو گلے لگایا۔ ترقی پسندوں نے اجتماعیت پر زور دیا، جدیدیوں نے انفرادیت کو سب کچھ سمجھا۔ ایک نے احتجاج ومزاحمت کا نعرہ بلند کیا تو دوسرے نے یاسیت وقنوطیت کی آہ بھری۔ غرضیکہ سب کچھ الٹا پلٹا۔ جدیدیوں کا بھی استقبال کیا جاتا اگر ان میں مثبت وصحت مند جذبہ کارفرما ہوتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سارے ہی لوگوں کی نیت خراب تھی یا اس بھیڑ میں کچھ اچھے افسانے نہیں لکھے گئے! لیکن ان کی تعداد برائے نام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ افسانے، افسانے کم تھے ایک بے نام فلاسفی کا پیچیدہ اظہار اور کہیں کہیں تو محض مجذوب کی بڑ تھے اس پر ہمارے ناقدین نے اور کمال دکھایا۔ ناقدین کا ایک مخصوص گروہ ایسے افسانوں کی اشاعت کو لائق تحسین وتعظیم قرار دیتا رہا۔ پھر تو یہ بھی ہوا کہ کچھ دنوں تک افسانے قاری کے لئے نہیں بندھے ٹکے گروہ بند ناقدین کے لئے لکھے جاتے رہے انہیں عام قارئین کی پرواہ نہ تھی۔ انہیں تو بس اپنے نقادوں کو خوش کرنے کی فکر تھی ادھر نقاد بھی فتوؤں اور ہدایتوں کا انبار لگانے لگے انجام کار افسانے کی ایسی درگت ہوئی کہ ان کا رشتہ قاری سے بالکل ہی کٹ گیا۔ وارث علوی نے ایک جگہ بڑی مزے کی بات لکھی ہے۔

"جدید افسانے جو افسانوی ساخت ،بیانیہ، زبان اور اسلوب کی سطح ہی پر دم توڑ دیتے ہیں اور ادب لطیف ،نثری نظم اور خلیل جبرانیت کا ملغوبہ بن جاتے ہیں یا لطیفہ ،چٹکلہ، حکایت، صحافتی تمثیل اور فنتاسی کا بے کیف نمونہ ان کی بھی ایسی علامتی اور اسطوری تفسیریں پیش کی جاتی ہیں کہ اس طریقہ کار کے تحت نوح کا ہر مقطع علامتی اور اسطوری قرار دیا جاسکتا ہے. ہمارے علامتی نقادوں کی حالت ضبط تولید کے ان رضا کاروں کی سی ہوگئی ہے جو دفتر کے اندراجات پُر کرنے کے لئے لُنجے ،لنگڑے اور بوڑھے بھکاریوں تک کو خصیّ کرڈالتے ہیں."

جس طرح غزل اپنی نازک طبعی کی وجہ سے بہت سے کھردرے الفاظ، موضوعات برداشت نہیں کرتی اور اس سے قبل کہ قارئین ناپسند کریں خود ہی Reject کردیتی ہے۔ اسی طرح افسانہ جو کہ نثری بیانیہ ہوتا ہے اور اس میں کھردرے موضوعات کو تو آسانی سے سمویا جاسکتا ہے لیکن اس کی شرط اس کی زبان ہے، اس کا بیانیہ ہے۔ اگر افسانہ نگار اُس سے ہٹا تو اس سے قبل کہ ایسے افسانوں کو قارئین رد کریں خود افسانہ ہی اسے REJECT کردیتا ہے۔ جدید افسانے کے پیچیدہ اور مبہم اسلوب کے ساتھ یہی حشر ہوا چنانچہ اپنے غیر فطری عمل کی وجہ سے یہ وقفہ، یہ شور وغل جتنی تیزی سے اٹھا تھا اتنی ہی تیزی سے دم توڑ گیا۔ اب جب کہ نئے افسانے اس حصار سے نکل آئے ہیں، میں دوبارہ اس فضا میں جانا پسند نہیں کرتا اسی لئے میں نے مثالیں دینے سے گریز کیا ہے اب چونکہ آپ کا سوال تھا اس لئے اختصار کے ساتھ چند سطریں لکھ دی ہیں۔

اردو افسانے کی تنقید یقیناً غور طلب ہے شاید بحث طلب بھی بحث طلب اس لئے کہ یہ تنقید کسی بھی طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ ویسے تو بعض لوگوں کی نظر میں پوری اردو تنقید ہی نزاعی، ناکافی اور غیر ضروری ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو افسانے کی تنقید کے بارے میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو میں افسانے کی تنقید برائے نام ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی کتاب افسانہ، جمیل احمد کندھائے پوری کی افکار نو احسن فاروقی وقار عظیم، ممتاز شیریں کی کتابیں اس کے علاوہ احتشام حسین ،اختر اورینوی، ممتاز حسین، محمد حسن ،قمر رئیس، سید محمد عقیل، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عابد سہیل، وہاب اشرفی، وارث علوی، سلیم شہزاد، خورشید سمیع، مہدی جعفر، اور پاکستان میں مظفر علی سید، عتیق احمد، علی حیدر ملک، شہزاد منظر، رسید امجد، صبا اکرام، انور شدید، مرزا حامد بیگ، فردوس انور، قاضی، آزاد کوثری، اے خیام، آصف فرخی وغیرہ کی تحریریں فکشن کی تنقید سے بھری پڑی ہیں ان میں سے بعض کی مکمل کئی کئی کتابیں ہیں۔ یونیورسٹیوں میں افسانے اور افسانے کی تنقید پر باقاعدہ پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے تو فکشن کی تنقید پر ہی پی ایچ ڈی کی ہے۔ اور صدہا مضامین وکتب کی فہرست تیار کی ہے۔ نجانے کتنے رسائل کے خصوصی نمبر نکلے ہیں جن کا تعلق نقد افسانہ سے ہے لیکن اتنی بھیڑ اور اتنے کاموں کے باوجود اردو فکشن اور بالخصوص افسانے کی تنقید کو نہ صرف ناکافی سمجھا گیا بلکہ غیر معیاری بھی سمجھا گیا جب کہ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ بیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔ علی حیدر ملک نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "عالمی ادب پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی شاعری کی نہیں، نثر کی اور نثر میں بھی فکشن کی صدی ہے۔ ... یہ دور فکشن کا دور ہے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس سے ادب کے کسی سنجیدہ طالبعلم کو انکار کی مجال نہیں ..." لیکن وہی علی حیدر ملک یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو فکشن کی تنقید ایک بنجر ریگستان ہی کی مانند ہے۔ وارث علوی نے تو پوری ایک کتاب ہی لکھ دی "فکشن کی تنقید کا المیہ" جس میں انہوں نے اردو نقاد کو طرح طرح کے القاب و آداب سے نوازا ہے۔ شہزاد منظر جو افسانے کے اچھے نقاد بن کر ابھرے ہیں ان کو بھی شکایت ہے کہ .... "اردو میں افسانے کی تنقید بہت کم لکھی گئی ہے۔ یہ شعبہ ہمیشہ سے نقادوں کی بے اعتنائی کا شکار رہا ہے"۔ لیکن اس کے اسباب کیا ہیں؟۔

عام طور پر ایک سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ تخلیق اپنی مقدار و معیار کے اعتبار سے کم تر ہے تو تنقید فطری طور پر عدم توجہ کا شکار ہو جایا کرتی ہے لیکن اردو افسانے کی یہ صورت ہرگز نہیں ہے۔ اردو شاعری میں تو ایک عہد میں دو یا تین بڑے شاعروں سے زیادہ نہیں ہوئے لیکن افسانے کے ایک ہی عہد میں بیدی، منٹو، کرشن، عصمت، قاسمی، عباس، قرۃ العین حیدر وغیرہ پیدا ہوگئے۔ دوسری وجہ جو ذرا اہم وجہ ہے کہ افسانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک پھیلاؤ رکھتا ہے۔ ہیت کے اعتبار سے اور موضوعات کے اعتبار سے بھی۔ اسی وسعت میں چپکے سے دیگر علوم بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سیاسیات، عمرانیات، نفسیات، تہذیب وتاریخ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ سب اتنے گہرے اور وقیع علوم ہیں کہ ان سب پر بہ یک وقت دسترس حاصل کرنا عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا اور ہیں علی حیدر ملک نقاد حضرات اتنے جنجال پالنا نہیں چاہتے وہ تو کھڑا کھیل فرخ آبادی کے قایل ہیں اور مضمون لکھنے کے لئے سستا اور ریڈی میڈ نسخہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ ہمارے زیادہ تر نقاد سہل انگاری کا شکار ہیں۔ وہ تنقید نگاری میں مختصر راستہ (Short cut) اپناتے ہیں دوسرے یہ بھی کہ کہ تنقید کے لئے جس طرح عرق ریزی، ایمانداری اور غیر جانب داری کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس کا دامن بھی تنقید سے چھٹتا جارہا ہے۔ شہزاد منظر نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ سہل پسندی اور تقریباتی تنقید کا دور ہے اس لئے ہمارے زیادہ تر نقاد، ادیبوں کی مدح سرائی میں مصروف ہیں اور اردو افسانے اور ناول پر لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔" تیسری اور شاید بڑی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اردو ادب کا تہذیبی مزاج شاعرانہ ہے۔ مدتوں سے اردو ادب کا مطلب اردو شاعری ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ آپ ابتدائی نثر دیکھئے شاعرانہ مزاج واسلوب سے بھری پڑی ہے۔ یہ سلسلہ مولانا ابو الکلام آزاد تک پھیلا ہوا ہے۔ نثری معراج اس کا شاعری ہو جانا سمجھا گیا

ہے۔ شرر، سرشار، رسوا، سب کہ سب اسی مزاج کے شکار تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول تاریخی یا سماجی کم رومانی زیادہ سمجھے گئے۔ پہلی بار پریم چند نے جب یہ روایت توڑی اور نسترن و نسرت کی جگہ دھنیا اور منی کو دی، شہزادہ گلفام کی جگہ گیسو اور مادھو آئے، چمنستان و پرستان کی جگہ کھیت کھلیان اور اودھ سارے نے لی تو اردو قارئین اور ناقدین کے درمیان ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ رومان طرز کے افسانہ نگاروں اور ناقدوں نے پہلے پہل اس کی شدید مخالفت کی۔ بعد میں کسی طرح اس تبدیلی کو قبول کیا گیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ملاحظہ کیجئے جب بیسویں صدی میں ہم نے پریم چند کی نثر کی تحریروں کو بڑی مشکل سے قبول کیا تو [illegible] صدی میں شاعری کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ شیفتہ نے بڑی آسانی سے بازارو شاعر کہہ کر کنارے کر دیا تو اردو کی نازک مزاجی اور معیار پرستی بھی فکشن کی تفہیم و تنقید کے آڑے آئی جس سے پورے اردو ادب کو اگر کچھ فائدے پہنچے ہیں تو اچھے خاصے نقصانات بھی ہوئے ہیں۔

فکشن کے نقاد کے طور پر جو اتنے بہت سے نام میں نے گنائے ہیں سچ یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر نقاد شاعری کے ہی ہیں۔ یہ حضرات فکشن کی حقیقت کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن ان کے اصل تنقیدی جوہر شاعری ہی میں کھلتے ہیں۔ فکشن پر ان کی تنقید کو ذائقے کی تبدیلی بطور نقاد، ہمہ جہتی، ہمہ دانی کے اظہار کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ فکشن کے عظیم سرمایے۔ رنگارنگ تجربے اور تہذیبی مظاہرے نے بعض ادیبوں کو پورے طور پر بھی متوجہ کر رکھا ہے اور ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے فکشن کی تنقید کو اہمیت و فضیلت دے رکھی ہے۔ مثلاً وارث علوی، قمر رئیس، عابد سہیل، سلیم شہزاد، شہزاد منظر، مرزا حامد بیگ، آصف فرخی وغیرہ، برابر کام کر رہے ہیں ان حضرات کی عالمی ادب پر نظر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ لوگ کاروباری تنقید یا سہل انگاری کا شکار نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ حضرات اور ان کی تقریریں، کتابیں فکشن کے بھرے پُر سرمائے کو دیکھتے ہوئے تشفی بخش ہرگز نہیں ہیں۔

یہ سچ ہے کہ افسانے کی کوئی بوطیقا نہیں ہے لیکن کیا شعریات پر بے شمار صفحات کالے کرنے کے باوجود ہم نے اردو شاعری کی بوطیقا تیار کر لی ہے؟ تنقید ایک سنجیدہ عمل ہے۔ علم و صداقت کا عمل ہے۔ تنقید بار بار یہ بھی کہتی ہے۔

بارشِ سنگ ملامت ہے خرد کا پتھراؤ　　اپنے سر سے ہو جسے پیار مرے ساتھ نہ آئے

مجھے تنقید سے زیادہ قرأت کی فکر ہے۔ قاری سب سے بڑا ناقد ہوتا ہے اور سب سے بڑا مورخ بھی وہی تنقید کو جنم دیتا ہے اور تاریخ کو بھی۔

آپ نے عالمی معیار کے اردو افسانوں کی فہرست پوچھی ہے۔ یہ فہرست تو وہی دے سکتا ہے جس نے عالمی ادب کا اور خاص طور پر عالمی فکشن کا بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا ہو۔ یہ ہیچ مداں اس لائق نہیں جو اس طرح کی فہرست ترتیب دے سکے۔ ہاں ۶۰ء سے ۹۰ء کے درمیان اردو میں لکھے گئے کچھ اچھے افسانوں کا ذکر ضرور کر سکتا ہوں حالانکہ، یہ عمل بھی بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں تو کچھ معیاری و عمدہ افسانے یہ ہو سکتے ہیں مثلاً پیتل کا گھنٹہ (قاضی عبدالستار) دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) بابا لوگ (غیاث احمد گدی) سب سے چھوٹا غم (عابد سہیل) ہزاروں سال لمبی رات (رتن سنگھ) بجوکا (سریندر پرکاش) مراجعت (سلام بن رزاق) کابلی والے کی واپسی (انور قمر) جلتے پروں کی اڑان (ساجد رشید) راستے اور کھڑکیاں (انور خان) گھڑیال (شوکت حیات) ڈار سے بچھڑے (سید محمد اشرف) پہچان (غضنفر) زہرہ (محسن خان) تاوان (شفیع مشہدی) لکیر (طارق چھتاری) ڈونگر واڑی کے گدھ (علی امام نقوی) اینڈ حسن (حسین الحق) گدھ (ارون کمار) وغیرہ

یہ فہرست صرف ہندوستان کے افسانوں کی ہے جو کسی طرح مکمل نہیں ہے۔ ۱۹۸۰ء میں میں نے بیس نئی کہانیوں کا انتخاب کیا تھا۔ آج اگر میں پھر سے بیس نئی کہانیاں منتخب کروں تو شاید یہی کہانیاں ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب ذاتی طور پر میری پسند و سمجھ کا ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔

آج کے افسانوں سے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ آج سے پندرہ بیس سال قبل جدید افسانے نے جو چیستان اور معمّے کی شکل اختیار کر لی تھی اس کی مذمت ہوئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طبقۂ فکر کی طرف سے بھی ہوئی جس نے ابتدا میں تجربات کے حوالے سے ایسے افسانوں کا استقبال کیا تھا۔ نتیجتاً کہانی سے کہانی پن اور وہ دلچسپی غائب ہو گئی تھی جو کہانی کے اجزائے لاینفک ہیں۔ جب یہ عناصر غائب ہوئے تو کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری، جزیات نگاری غرضیکہ سبھی نگاریاں غائب ہو گئیں۔ نئے افسانے کی ان گمشدہ جہتوں پر ایک مضمون لکھتے ہوئے میں نے تفصیل سے ان عناصر کی گمشدگیوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ نئے افسانوں میں کردار واپس آ رہے ہیں ظاہر ہے کہ جب کردار آئیں گے تو ان کے سارے لوازمات اور گرد و پیش کا ماحول بھی آئے گا اور اب رفتہ رفتہ یہ سب بھی آ چلے ہیں۔ الیاس شوقی نے حال میں جو اردو افسانہ نمبر ترتیب دیا ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ دیوانِ اردو نے جو خاص نمبر اور انتخاب ترتیب دیا ہے اسے بھی ملاحظہ کیجئے۔ یا محسن خان کا افسانہ زہرہ، مشرف عالم ذوقی کے افسانے مت رو سالک رام یا نور جہاں پھول جہاں... غضنفر کا گڑ دتیل، سلام بن رزاق کا باباہم، ذکیہ مشہدی کا فلفتہ، نثار راہی کا بھمتہ، خورشید اکرم کا اچھن بھیا وغیرہ۔ ان افسانوں میں افسانوی فضا، کردار سازی۔ جزیات نگاری اور ڈھیر سے ڈھیر وہ سب کچھ جو ایک اچھے افسانے کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے ملنے لگا ہے۔ نئے افسانوں میں کرداروں کی واپسی کا یہ عمل فال نیک ہے۔ یہ سچ ہے کہ رئیس بھاگی، بھمتہ، اچھن بھیا، زہرہ، سالک رام وغیرہ، رضو باجی، کالو بھنگی، لاجونتی، گوپی ناتھ جیسے لافانی کردار تو نہیں ہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتے کہ نئے لکھنے والوں کے مسائل، مصائب، مزاج و مذاق مختلف ہیں ان کے واقعات تجربات بھی مختلف ہیں ان کی وابستگی اور سپردگی بھی بہر حال مختلف ہے۔ اب

باقی صفحہ ۴۷ پر دیکھئے



راهی قریشی

کھ کے ڈھیر سے شرر نکلا
جہاں تھا وہاں کھنڈر نکلا

عداوت گہنہ رفیقاں میں
یک دشمن تو معتبر نکلا

کی ٹھوکر لگی، وہ تھی دہلیز
ں جس جا رکے، وہ گھر نکلا

۔ تبسّم نے دی سزا آخر
ن آنکھوں سے عمر بھر نکلا

صداقت نے خودکشی کر لی
ٹ کچھ اتنا معتبر نکلا

شناسائی تھی، ہوئی بے فیض
۔ تعلق تھا بے اثر نکلا

زارِ حیات میں راہی
ف سایہ ہی ہمسفر نکلا

● 36-BANK COLONY, KOTHARI
BHAVAN RD. GULBARGA-58510



اسلم حنیف
ترجماتی ماہیے

● لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیٌٔ
تو سب سے یکتا ہے
قول ہے خود تیرا
"نہیں مثل میرے کوئی شے"

● عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُور
تو ہی پہچانتا ہے
سینوں کے احوال
بس تو ہی جانتا ہے

● لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ
یہ بھی ہے صفت ذاتی
نیند تو کیا معنی
تجھے اونگھ نہیں آتی

● رَبُّ الْمَشْرِقِ وَرَبُّ الْمَغْرِب
نہیں کوئی تجھ جیسا
رب ہے بس تو ہی
مشرق اور مغرب کا

● لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاس
منکر یہ نہیں سمجھے
رب کا کرم بے حد
ہے حال پہ انساں کے

● P.O. GINNAUR, DISTT.
BUDAUN-202522(U.P.)



انور مینائی
جاپانی تنکا

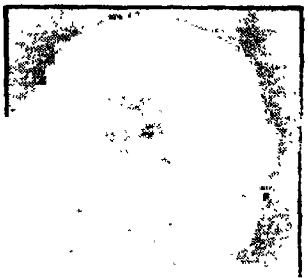
[صوتی او قاف بالترتیب ۵+۷+۵+۷+۷ میں]

اے جادوگر کیا
ایسا کوئی جادو ہے
جس کے چلنے سے
جنگ کی ڈائن مر جائے
دنیا جنت کہلائے

گھراسناٹا
سائیں سائیں کرتی شب
کچے اپنے گھر
بارش سے ہم ڈرتے ہیں
مینڈک ٹر ٹر کرتے ہیں

شبنم کے قطرے
لمس شعاؤں کا پا کر
جب کھو جاتے ہیں
سورج ہنسنے لگتا ہے
یہ کیسا المیہ ہے

● AL-AMEEN ADUCATIONAL
COMPLEX,OLAR-563101 (KARN.)



مقصود الٰہی شیخ
24-PARK HILL DRIVE,
BREDFORD - BDB ODF (U.K.)

منظر بدل گیا

یہ ایک ماں کی کہانی ہے،
نہیں یہ ایک بیوی کی کہانی ہے،
نہیں یہ ایک بیوہ کی کہانی ہے،
نہیں! نہیں! یہ ایک عورت کی کہانی ہے جس کی قسمت میں سکھ نہیں لکھا تھا۔

وہ ایک سخت کوش اور مضبوط انسان نکلی جو کچھ اس نے کیا شاید اسکی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے اونچا روحانی درجہ مل گیا ہوتا۔ وہ لیڈر بن گئی ہوتی مگر تقدیر کی بات ہے وہ سدا آزمائشوں میں گھری رہی۔ وہ نہ ہوا جو وہ چاہتی تھی یا چاہا کرتی!

اس میں کوئی کمی یا کمتری نہیں تھی۔

اونچے قد اور پُر کشش شخصیت سے مرعوب کرنے والی لڑکی، نازک تھی۔

وہ شرمیلی تھی۔
وہ بڑی خوبصورت تھی۔
رنگ گندم، بدن سُنہرا۔
بال گھنے اور بھورے۔
آنکھیں نیلی، پیشانی چوڑی۔
ناک ستواں، دہانہ حسین ترین لبوں سے مزین۔
سینہ بھاری، سرین گول اور بھرے بھرے۔
کمر پتلی، چال باوقار و متوازن اور آواز سریلی تھی۔
گھر میں چاند تو ملنے والوں کی آنکھوں کا تارا۔

مگر عجب بات یہ ہوئی کہ کہیں اسکا رشتہ طے نہ ہوا! کبھی قطار نہ بندھی۔ جیسے جیسے وقت گزرا سناٹا بڑھتا گیا۔ وجہ سمجھ میں کسی کے نہ آئی بے سبی سبب بن گئی کہ گھر والے رشتوں کا پیچھا کرنے لگے۔ کوئی مقابلے اور پلے کا تو ہو۔ اسکے سوا والدین نے کبھی کوئی خواہش ہی نہ کی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک صاحب انگلستان سے چھٹیاں گذارنے آئے تو اِنکو کسی نہ کسی طرح گھیر گھار لیا گیا۔

وہ تھے لمبے قد، چوڑے ہاتھ پیر کے اور دلکش شخصیت کے مگر جیسے بجھے بجھے سے ہوں۔ بے رس۔ اکتائے ہوئے۔ چپ چپ۔ پرے پرے رہنے والے۔ پر کٹے سے، بہن بھائی کے ہاتھوں پکڑے گئے اور باندھ دیے گئے۔ جو دیکھتا، کہتا جوڑا اچھا ہے۔ خدا یا نبھ جائے۔ کسی کی نظر نہ لگے۔ سب کو دلہن سے ہمدردی اور خلوص تھا۔ عمر نکلی جا رہی تھی اور رشتے تو آسمانوں میں ہوتے ہیں۔ شہزادے تو باہر سے ہی آتے ہیں۔ اب لیلیٰ مجنوں کا زمانہ نہیں رہا۔ باقی رانجھا کب ہیر کے دیس کا تھا۔ مہیوال بھی دور دیس سے ہی آیا تھا۔ فرہاد بھی کسی دوسری جگہ کا ہوگا۔ شکنتلا کا راجا بھی شکار پر نکلا تھا۔ جند جان ایک ہونی چاہیئے۔ کیا دیس اور کیا پردیس۔

تو اس طرح اُنہوں نے، میاں نجیب نے انیقہ سے سادہ طریقے پر بغیر دھوم دھام کے شادی کر لی۔

رسمیں سب ہوئیں چھچھورپنا کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ سب مطمئن بھی نظر آئے مگر وہ جو بات ہوتی ہے باجوں گاجوں والی، سُہاگ اور رنگوں بھری ایسا کچھ نہ تھا۔

پھر نجیب کی تعطیلات ختم ہو گئیں وہ چلے گئے۔
انکو گئے کئی روز ہو گئے۔
دن پر دن بیتنے لگے۔

دھیرے دھیرے پتہ لگا انکے بارے میں، کسی کو بھی زیادہ جانکاری نہ تھی۔ اِنکے اماں ابا زندہ نہیں تھے۔ کریدا، بھائی بہن کورے بلکہ غیروں جیسے نکلے۔ نجیب یونیورسٹی سے نکلے اور انگلینڈ جا پہونچے۔ باقی عاقل بالغ تھے۔ خاندان اچھا۔ شریف۔ کھاتا پیتا۔ اپنے گلی محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسکے علاوہ اور کوئی بات نہ نکلی۔ کسی نے ذات نہ پوچھی، آخر پوچھ تاچھ کیوں کی جاتی۔ صاحبزادے پڑھ رہے ہوں گے یا کمارہے ہونگے۔

بے خبری دور دور محیط ہو گئی۔

انیقہ پہلے کون سی چوکڑیاں بھرتی ہرنی تھی۔ وہ تو جیسے تھی ویسی ہی رہی۔ خاموش۔ صابر۔ قانع۔ روز صبح ہوتی، شام ہوتی۔ اس کے ماتھے پر شکن نہ آتی۔ رات شاید کروٹیں بدلتی ہو پر اسکا کمرہ ہمیشہ کی طرح بے شور رہتا۔

ایسا صاف ستھرا جیسے کسی کی آمد کا منتظر!

البتہ انیقہ کے پاپا اور ممی اندر ہی اندر کڑھنے، گھلنے لگے تھے۔ اِن کے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب، سانسیں غیر ہموار اور بظاہر رُکے رُکے

قدموں کی آہٹیں یہاں وہاں دھمالیں ڈالتی محسوس کی جاسکتی تھیں۔

ایک دن ممی کی اشکوں بھری سرگوشیوں نے پاپا کو کلینک اپنے نائبین پر چھوڑ کر انیق دیو نیک بیٹی کے لئے وقت نکال کر انگلینڈ، یورپ وغیرہ جانے والوں کو ٹیلیفون کھڑ کھڑانے پر مجبور کردیا۔

اتنی سی بات تھی۔

پاپا جمیل، شہر کے سینئر سرجن، بارسوخ، جدید دور میں پرانی وضع، قدیم جانے مانے خاندان کے سپوت نے پہاڑ کھود کر نہر نکال لی۔ قسمت سے نہر ریت بھری نکلی۔ جن کے ہاتھ مسیحائی دکھاتے تھے اب وہ کھر دری زمین میں خود ہی جھلس رہے تھے۔ مگر وہ بہادر تھے۔ انکی شریکِ حیات ہمت والی تھیں۔ انکی بیٹی بڑی خوبصورت، بڑی صابر۔ وقت کی نہ مہربانی جھیل جانے والی۔۔۔ سب نے یہ بدخبری بڑے سکون سے سنی کہ نجیب برسوں سے کسی میم کے ساتھ رہتے تھے۔ شاید ایک دو بچے بھی تھے۔ انیقہ سے شادی کے بعد وہیں اپنی اُسی رکھیل کے پاس چلے گئے اور تلاش کے بعد ان سے رابطہ کرنا چاہا تو وہ ٹیلیفون تک سننے نہ آئے۔

پاپا ممی اس سے نظریں کتراتے، چراتے چھپے چھپے پھرتے تھے اور انیقہ ماں باپ کو دکھ یاد نہ دلانے کے خیال سے سامنے نہ آتی۔

ایک روز انیقہ نے ممی پاپا کے سامنے اپنا پاسپورٹ اور ائر ٹکٹ رکھ دیا کہ وہ انگلینڈ جارہی ہے۔ پاپا نے کہا وہ خود جانے کا پروگرام بنارہے تھے۔ ممی نے کہا کوئی اور جائے نہ جائے وہ بیٹی کے ساتھ انگلینڈ جائیں گی اور نجیب کو اسکے کرتوتوں کا آئینہ دکھا کر رہیں گی۔ اگر وہ کچ سبھاؤ سے سیدھا نہ ہوا تو اپنی لختِ جگر کو بخیریت گھر لے آئیں گی۔ نہ وہ پہلے بھاری تھی اور نہ قیامت تک اُسے کوئی بوجھ سمجھے گا۔ اِنہیں اقرار تھا کہ انہوں نے اپنی کومل سی کلی کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب وہ آزاد ہوگی۔ اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہ کرے گا۔ سماج گیا چولہے بھاڑ میں!!

"کوئی چولہے بھاڑ میں نہیں جائے گا اور نہ کوئی انگلستان جائے گا" انیقہ نے پُرعزم لہجے میں کہا: "میں کوئی انوری سروری نہیں۔ آج کے دور کی پڑھی لکھی لڑکی ہوں اور زمانے سے لڑنے، نمٹنے کیلئے آمادہ"۔

اس طرح ایک حسین، خوبصورت، نازوں میں پلی لڑکی والدین کے گھر سے اپنا گھر بسانے نئے دیس میں آگئی۔

اچانک بیوی کو اپنے چوکھٹ پر دیکھ کر نجیب کے اوسان خطا ہو گئے انیقہ خود ہی اندر گھسی اور میم سے اپنا تعارف کرایا۔۔۔۔۔ پھر یہ ہوا کہ میم نے ہی انیقہ کیلئے دوسرے گھر کا انتظام کیا۔ انیقہ نے میم کے دونوں بیٹوں اور بیٹی کو بھی اپنا لیا۔ وہ یہ ثابت کرنے میں جٹ گئی کہ ایشیائی لڑکی میں بہت سہار ہوتی ہے۔ خدا نے اِسے بھی ایک بیٹا دیا جسے ماں سے اتنا پیار ملا جتنا انگلستان اور پاکستان کے درمیان فاصلہ ہے اور سمندر رہے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ نجیب ایک رات سوئے تو سوتے رہ گئے۔ انکی میم تین ماہ کے اندر اندر ان سے جاملی۔ انکے بچوں نے شادیاں کر کرالیں۔ انیقہ کا بیٹا لئیق بھی بڑا ہو گیا۔ ہونہار اور قابل۔ ماں دن رات خواب بننے لگی۔ وہ پاکستان سے چاند سی بہو لانا چاہتی تھی۔ ایک خلیج جو اس کے اور وطن کے درمیان، اسکے اور اپنوں کے بیچ جانے کہاں کہاں سے پیدا ہو کر فاصلہ کررہی تھی انیقہ اسے پاٹ دینا چاہتی تھی۔ یہی ایک راستہ سوجھ رہا تھا لیکن لئیق کو وہاں سے، ایک انجانے دیس سے کوئی نسبت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسے ضد تھی تو یہی کہ اس نے جو لڑکی پسند کی ہے ماں اسے دیکھ لے۔۔۔۔ وہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے۔

"اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ چھٹیاں منانے جارہے ہو جاؤ" ماں نے کہا "تمہیں آج تک کسی بات سے منع کیا؟" ذرا سانس لے کر وہ بولی "میری طرف سے آئندہ بھی کوئی روک ٹوک نہیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ گنہگار بنو گے خود جواب دو گے۔ یہاں نہیں تو وہاں بھگتو گے"۔

لئیق اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ انیقہ جلال میں تھی "مجھے مجبور نہ کرو، تم زور ڈالو، منت کرو، کچھ ہی کرو۔ میں شادی کی اجازت نہیں دیتی۔ بس نہیں دیتی آئندہ بھی نہیں دوں گی۔ خود کرلو۔ باپ تو مرا تھا سمجھو ماں بھی مرگئی۔۔۔۔ باقی مرضی تمہاری۔ مجھ سے یہ بات پھر نہ کہنا"۔ اب ماں کی آواز رُندھی ہوئی بھی لگ رہی تھی۔

لئیق کا دل پگھل رہا تھا۔ اسنے ماں کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ آنکھیں بھر بھر آئیں مگر اس وقت وہ آنسو نہیں بہانا چاہتا تھا۔ وہ ماں سے محبت کرتا تھا۔ ان کی عزت کرتا تھا۔ انیقہ نے بڑی مشکلوں سے بیوگی میں اسے جس طرح پالا تھا وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ اس پر یادوں کی بارش ہونے لگی مگر وہ سنبھل گیا۔ ماحول کو خوش گوار بنانے کیلئے ماں کو شیشے میں اتارنے کیلئے اپنی بات نئے سرے سے سنانے لگا۔ ماں بیٹا بڑے خوبصورت اور دل پسند عادتوں والے ایک ہی طرح کے خلیق انسان اس وقت آمنے سامنے اڑے بیٹھے تھے۔ اس عمر میں بھی کسے ہوئے چھریرے بدن، موٹی موٹی آنکھوں اور سرخ و سفید رنگت پر سنہرے بالوں والی انیقہ کو جو دیکھتا متاثر ہوتا۔ دوسری طرف لمبا چوڑا اشکیل و وجیہ لئیق بھی اپنا جواب آپ تھا۔

ماں اداس اور خفا تھی۔

"ماں تو گرل فرینڈ ہی ہوتی ہے مگر سمجھ لو گرل فرینڈ ماں نہیں ہوتی"۔

ماحول میں تناؤ آیا ہوا تھا لئیق اٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

بات جیسے دب گئی۔

تعطیلات دور تھیں ابھی بکنگ بھی نہ ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پر لئیق کے دفتر کا ساتھی ملنے آیا۔ وہ ابھی شاور لے رہا تھا۔ ماں نے دو چار منٹ کیلئے اندر بلا کر بٹھالیا۔ وہ دیکھتا رہ گیا اُسے انیقہ ایک ایسی خوبصورت خاتون لگ رہی تھی جو لئیق کی ماں نہیں بہن ہی ہوسکتی تھی۔ اِس نے پوچھا تو انیقہ نے محظوظ ہوتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ لئیق کی ماں ہی ہے۔

باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھئے



رفیق راز

غضب ہوا اس سال ہوا صحرا تقسیم
اب تو یہاں ہوگی ہر سال گھٹا تقسیم

نیلے سمندر میں گرنے سے پہلے ہی
ہو جاتے ہیں بہتے ہوئے دریا تقسیم

رنگ برنگے پھولوں میں طے پایا ہے
پو پھٹتے ہی ہوگی بادِ صبا تقسیم

ایک نئے انصاف کا منظر اُبھرے گا
ڈوبنے والوں میں ہوگا تنکا تقسیم

پیاس بڑھے گی جنگ پہ نوبت آئے گی
ہو کے رہیں گے شہر کے سب دریا تقسیم

اب کے سفر آئے گا سب کے حصے میں
ریگستان بھی راتوں رات ہوا تقسیم

● RADIO KASHMIR,
SRINAGAR,(KASHMIR)



عاصم شہنواز شبلی

کہیں چاندنی کہیں تتلیاں کہیں پھول کا بھی گمان ہو
ہے ضرور کیا کہ زبان پر وہی کھردرا سا بیان ہو
سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی شہرتیں سبھی عزتیں
کوئی لفظ ایسا عطا کرے جو غزل کا میری نشان ہو
گئے موسموں کی وہ بات تھی مگر آج بھی ہے یہی تڑپ
وہی ساتھ ہو وہی باغ ہو وہی رات ہو وہی لان ہو
کہیں چوڑیوں کی کھنک ملے کہیں پائلوں کی جھنک ملے
میرا ایک شعر بھی ساقیا ترے میکدے کی زبان ہو
مجھے آج بھی اسی شہر کی گھنی راہ میں یہ تلاش ہے
کسی موڑ پر کہیں آس پاس وہ ایک نیلا مکان ہو
مری زندگی میں خدا کرے کبھی وقت ایسا نہ آئے جب
نہ سلام ہو نہ پیام ہو نہ یقین ہو نہ گمان ہو
ترا فیصلہ ہے یہی تو پھر مرا فیصلہ بھی یہی سمجھ
مرے پاس میری انا رہے ترے پاس تیر و کمان ہو
یہ مطالبہ تو عجیب ہے ترے دل کا عاصم بے نوا
کبھی دار پر بھی نماز ہو، کبھی دشت میں بھی اذان ہو

● 89/5, RIPON STREET, SHIBLI
HOUSE ,CALCUTTA-16(W.B.)

پرویز اختر

اک بار گیا تھا تو خبر سے نہیں
دوبارہ کبھی پھر میں اُدھر سے نہیں
ہے اب بھی محبت کی عبادت مرا ش
میں آج بھی بچپن کے اثر سے نہیں
حد درجہ ترے عشق میں برباد ہوا
اب تک بھی مگر تیر جگر سے نہیں
دل سے ہی سبک دوش ہوئے عشق کی ذ
کا شایہ کسی اور ہنر سے نہیں
پیروں میں نہ معلوم سی زنجیر پڑی
رستوں میں رہا پر کبھی گھر سے نہیں
صیاد سا حیوان تھا اک ننھی سی
وہ منظرِ غمناک نظر سے نہیں
حالانکہ نہیں دیکھتا کیا کیا میں تما
لیکن ابھی اُمیدِ بشر سے نہیں

OHALL QAZI SARAI,
NDPUR, BIJNUR-246725(U.P.)

م- نـــاگ
C/O,AMEN BUILDING, 4TH FLOOR, FLAT NO. 21
AIBRAHEM REHMATULLAH ROAD MUMBAI-3

بچپن



سرِ شام ہی اندھیروں نے نور جہاں کے گھر پر ڈورے ڈالے اور وہاں کے ہر اُجالے کو قصداً و جبراً نگلنے لگے۔ آج سارا آسمان گھنگھور گھٹاؤں سے گھرا رہا۔ سورج کی شکل خال خال ہی دکھائی دی۔ اور پھر نور جہاں کی ماں دوپہر کو اپنے کسی شناسا کے گھر چلی گئی۔ کھانا کھا کر جب نور جہاں انگنائی میں آئی اور جنگلے پر کھڑی ہوئی تب ہم لوگ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔

نور جہاں کے گھر کوئی نہ تھا۔ ماں بھی نہیں تھی۔ کتنے دن بیت گئے اس کی ماں نے اسے اکیلا نہ چھوڑا۔ پہرے بٹھائے نہیں تو کیا وہ یوں رُک جاتی ؟۔ وہ ہمیں کھیلتا ہوا دیکھ کر اپنے آپ کو روک نہ پائی جھٹ جھونپڑے کا دروازہ بند کیا، زنجیر چڑھائی اور اپنے پاؤں کی زنجیر کھول کر ایک ہی جست میں تار کا جنگلا پھلانگ کر تیر کی طرح ہماری ٹولی میں آن ملی۔ ہم سب ایک دوسرے کو مسرت و استعجاب سے دیکھنے لگے۔ اور گلی ڈنڈا چھوڑ ڈیپ ڈاپ کھیلنے لگے۔

نور جہاں کھیلنا چاہتی تو ہم اُسے منع کرتے کیوں کہ اسکا بدن بدبو خارج کرتا تھا۔ جب ہم اِسے کھیل میں شامل نہ کرتے تو وہ منہ بسورے اپنی انگنائی سے ہمیں زبان نکال کر چڑھایا کرتی۔ وہ بہت کم نہاتی تھی ایسا نہیں تھا کہ وہ صحرا میں رہتی تھی یا پانی مہنگا تھا۔ نہیں پانی تو افراط تھا لیکن وہ بہت کم نہاتی تھی اور جب نہا لیتی تو کھیلنے کا بہانہ ڈھونڈتی۔ سارا بچپن کھیل میں بیتا تھا اور اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک دھند لکا سا تھا کہ جیسے چیزیں ڈوب رہی ہوں اور اُبھر رہی ہوں کہ اندھیرا اُجالا ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنی پہچان کھو رہا ہو۔

پچھلے دو ماہ سے وہ ہمارے احاطے میں کم آئی تھی کیوں کہ اس کی ماں ہمیشہ گھر پر رہتی اور اس پر کڑی نظر رکھتی تھی ماں اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی کہ ماشاءاللہ اب وہ جوان ہو گئی ہے اور اب اسے بچکانے کھیل نہیں کھیلنے چاہئے، ڈوپٹے سے سینہ ڈھکنا چاہئے، گھر پر کچھ سینا پرونا، کھانا پکانا سیکھنا چاہئے۔ لیکن کھیل تو نور جہاں کی جان تھے اِنہیں کیسے چھوڑ دیتی بچپن اسے چھوڑ رہا تھا مگر وہ بچپن کو نہ چھوڑتی تھی۔

اِسے جنگلے پر کھڑا دیکھ کر میں نے پوچھا "اب کب نہاؤ گی نور جہاں"

"جمعہ کو"

"دھڑ سے نیچے نہاؤ گی کہ سر سے"

"دونوں سے" وہ جواب دیتی۔ میں ہنستا۔ وہ منہ بسورے چلی جاتی!

وہ ہم سب میں عمر کے لحاظ سے بڑی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے جنسی شعور غنودگی کی رضائی اوڑھے سو رہے تھے۔ اور کوئی احساس پختہ یا عیاں نہیں تھا۔

"نور جہاں تم گھر جاؤ. تمہاری ماں بوم مارے گی"

مگر وہ نہیں گئی۔ نور جہاں کا کچھ نہ بدلا تھا سوائے جسم کے، اور ہمارا بہت کچھ بدل گیا تھا!

اب جو لڑکا داؤں دینے گیا تو کسی محفوظ مقام پر چھپنے کیلئے ہم نور جہاں کے پیچھے بھاگے وہ جدھر بھاگی ہم اُدھر بھاگے اور کونے میں چھپ گئے۔ گلی اور ڈنڈا دور دور پڑے تھے۔ نور جہاں مطمئن تھی کہ وہ داؤں والے سے پوشیدہ تھی داؤں بھلے ہی کسی پر آئے اِس پر آنے والا نہیں تھا۔ پر داؤں تو اِسی پر آیا منوہر جو ہم سب میں بڑا تھا اِس نے اپنی نگاہوں کا کاکروچ نور جہاں کے ڈھیلے ڈھالے فراک کے چوڑے گلے میں چھوڑ دیا۔ کاکروچ فراک کے اندر کلبلانے لگا تو نور جہاں وہاں سے فراک جھٹکتی بھاگی اور داؤں اس پر آ گیا!

کھیل چلتا رہا۔ نور جہاں کچھ نہ سمجھی۔ منوہر اور بھی منچلا ہو گیا وہ اندھا دھند بھاگا اور نور جہاں کو جا لیا۔ نور جہاں ہنس رہی تھی کہ کیسے چھکایا اور کتنا دوڑایا۔ منوہر خوش تھا کہ بدن جو آکار لے رہا تھا اور کانسی رنگت جو تیج دے رہی تھی اور کچے آم کی بوباس جو مہک رہی تھی وہ محظوظ ہوتا گیا۔ نور جہاں پہلے کی طرح اب کوئی سوکھی سڑی لڑکی نہ تھی اب تو اس میں ایک اُٹھان تھی۔ ایک بارود تھی کہ ڈھونڈ لو فیتہ اور لگا دو آگ اوہ ایک زلزلہ تھی کہ جب جھٹکا لگے تو اندر کی قیمتی دھات باہر نکل آئے!

کیا نور جہاں سمجھ نہیں رہی ہے کہ یہ بچپن کا کھیل نہیں۔ اِسکے کچھ اور اصول ہیں، الگ ضابطے ہیں وہ جو رام کشن پانی کے نل پر نور جہاں کا منتظر۔ تو کیا وہ نگاہوں کا مطلب نہیں سمجھتی۔ بغل والا چوہان کارپینٹر۔ جو کار پینٹ نہیں کرتا بلکہ رندے سے لکڑیاں چھیلتا ہے اسکا رندا کتنا تیز ہے۔ اس رندے سے کیا وہ فقط لکڑیاں ہی چھیلتا ہے ؟۔ جب نور جہاں سامنے آئی تو رندا چلا دیا!

تو کیا نور جہاں پھر بھی انجان ہے ؟

اسکول جانے کیلئے میں نور جہاں کو بلانے جھونپڑے میں گیا۔ وہ گندے کپڑے پہن کر اپنی جانگھ کھجلا رہی تھی۔ ماں نے دیکھا تو چیخی "کھجا کیوں رہی ہے رانڈ۔ کتنی دفعہ بولی پیشاب کو پانی لیا کر"۔

نور جہاں میرے سامنے جھینپ گئی۔ اسکی ماں نے مجھے دیکھا تو بولی "کیوں ری اچھے اسکول نہیں جانا ہے چل تیار ہو"

وہ بولی "مگر آج تو چھٹی ہے"

میں نے کہا "نہیں تو کس نے کہ دیا"

نور جہاں کی ماں نے کہا "کاہے کی چھٹی کیا تیرا باپ مر گیا ہے"

میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور بستہ ایک طرف رکھ دیا اس کی ماں آنگن میں گوبر کے اُپلے تھاپنے چلی گئی۔ نور جہاں نے منہ ہاتھ دھوئے۔ منہ ہاتھ پونچھے اور مجھ سے بولی "چھوٹے ٹھہرو ذرا میں کپڑے بدل لوں۔ نہیں تم جاؤ نہیں ذرا آنکھیں بند کر لو کھولنا نہیں جب تک میں نہ کہوں" اور وہ کپڑے اتارنے لگی۔

میں تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر اچانک مجھے چھینک آگئی اور میری آنکھیں کھل گئیں تو میں نے جو دیکھا اس حالت میں نور جہاں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔

نور جہاں نے فوراً قمیص اپنے سامنے کر لی تو لمحہ بھر کے لئے صرف اسکی بھری بھری کاسنی رنگ کی ٹانگیں ہی میرے سامنے رہ گئیں۔ "تمہیں کہا تھا نا کہ آنکھیں نہیں کھولنا" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

جب ہم اسکول جانے لگے تو میں نے اس سے پوچھا "آج تو تمام سوالوں کے صحیح جواب دوگی نا نور جہاں"

"جب تم صحیح جواب دے سکتے ہو تو مجھے جواب دینے کی ضرورت کیا ہے۔ میری ناک سلامت ہے پکڑنا میری ناک اور مارنا چانٹا!"

"لیکن ایسا کب تک چلے گا"

"جب تک تم بڑے نہیں ہو جاتے"

کھیل پھر شروع ہوا میں اور نور جہاں باتھ روم میں جا گھسے اور دروازہ بند کر لیا۔ دھک دھک دھک کی تیز آواز جیسے چھاتیوں میں پانی کا پمپ چل رہا ہو۔۔۔ ہم اس لڑکے کا انتظار کرنے لگے جو ہمیں ڈیپ کرنے آنے والا تھا۔ لیکن جب بہت دیر تک وہ نہ آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"اب تم جاؤ نور جہاں تمہاری ماں آگئی ہوگی"۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولی "تم نے جو اس دن ماسٹر کے کہنے پر میری ناک پکڑی تھی اور ایک طمانچہ جڑ دیا تھا تب مجھے تم پر بڑا غصہ آیا تھا"

میں بولا "تم ابھی تک وہ بات نہیں بھولیں نور جہاں میں نے کوئی دل سے تو نہ مارا تھا ماسٹر نے کہا اس لئے مارا اور پھر تم نے سوال کا جواب بھی تو غلط دیا تھا میں کہاں قصوروار تھا تم سوال کا صحیح جواب دینا سیکھو پھر دیکھو کہ کون تمہاری ناک پکڑ کر چانٹا رسید کرتا ہے"

وہ ہنسی۔ "تمہاری ایسی ہی باتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں چھوٹے میں تمہیں انعام دوں گی"

"۔۔۔کیا؟"

ان دنوں مجھے کافی انعامات ملتے تھے، ہر سال فرسٹ آنے پر والد صاحب کی طرف سے، ڈبیٹ میں، کھیل میں، اسکول کی طرف سے، بھائی صاحب کی طرف سے۔ اس لئے میں پوچھ بیٹھا۔

"کب دوگی انعام"

"ابھی لو" اور اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دئے۔

پھر بولی "میرا انعام پسند آیا"

"چھی۔ گندی لڑکی ہو تم" میں نے منہ پھیر لیا تو وہ ہنستی ہوئی دروازہ کھول کر بھاگ گئی۔

"کل میں نہاؤں گی کل جمعہ ہے" جاتے جاتے اس نے کہا۔

وہ چلی گئی۔۔۔ پھر شام ہو گئی اب جو بادل گھر آئے تھے برس گئے۔

اور اب شام کے جھٹ پٹے نکلتی شب دیجور آگئی تھی۔ غسل خانے کے پیچھے صابن کے جھاگ اور کائی کے چھلکے والا گندے پانی کا چھوٹا سا ڈابر بھر گیا تھا اور مینڈک ٹرٹرانے لگے تھے۔

نور جہاں کے کہنے کے مطابق اس رات میں اچانک بڑا ہو گیا۔ اتنا بڑا کہ میرا سر گھر کی چھت سے باہر نکلنے لگا۔ صبح اٹھ کر میں نے سوچا چلو یہ مژدہ نور جہاں کو سنائیں وہ کیا کہتی ہے!

مگر جب میں اس سے ملنے اس کے جھونپڑے پر گیا تو اس کی ماں نے کہا کہ نور جہاں کی تو شادی ہو گئی ہے اور وہ اپنی سسرال میں ہے۔۔۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔۔۔ ارے یہ کیا ہو گیا!

میں نے اس کی ماں سے کہا "راتوں رات نور جہاں کی شادی بھی ہو گئی اور وہ سسرال بھی چلی گئی خالہ کیوں مذاق کرتی ہیں"

نور جہاں کی ماں نے کہا "مذاق کیسا کیا میں نے تجھ سے کبھی مذاق کیا ہے بیٹا؟"۔☆☆☆

مغل فاروق پرواز

ہوس اشجار پر چھائیں پہ سایہ کون کرتا ہے   بدن دہلیز پر دیکھوتو ایسا کون کرتا ہے
مرے ہونٹوں پہ جانے یہ بھلا سا نام کس کا ہے   مری آنکھوں میں راتوں رات پگھلا کون کرتا ہے
ترے ہوتے ہوئے مجھ پرنہ کھل جائے کہ اب میری   اکیلی جان کو جی بھر کے تنہا کون کرتا ہے
یہی موقع ہے میں اس کو وہ سب منظر دکھاؤں گا   مگر اس وقت اس عالم میں ایسا کون کرتا ہے
سفر کے موڑ سے سب کو گذر جانے کی جلدی ہے   سفر کے موڑ پہ اتنا اُجالا کون کرتا ہے

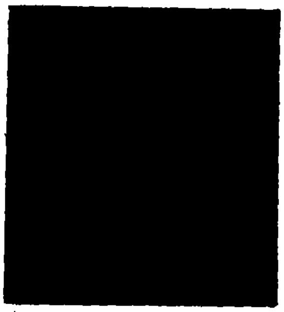
● ,I.B.R.C,J.N. MEDICAL COLLEGE, A.M.U. ALIGARH(U.P.)



قیوم راز

کچھ ایسا کہوں کچھ نہ سمجھ پاؤں غزل میں   لفظوں کو گھماؤں کہ میں چھا جاؤں غزل میں
ٹکرانے کی طاقت نہ ہی کہہ دینے کا یارا   اپنی اسی غیرت کو میں بہلاؤں غزل میں
وہ معرکے سر کرتا رہے لوح و قلم کے   کم تو نہیں یہ بھی کہ میں شرماؤں غزل میں
جب عزم کی ٹھہرے تو پہاڑوں کو اُڑادوں   ڈرنے کی اگر بات ہو، ڈر جاؤں غزل میں
یارب! مجھے توفیق عمل دے تو بڑی بات   یا اتنی عنایت کہ میں پچھتاؤں غزل میں

● LECTURAR JUNIOR COLLEGE MARUL-425503(M.S.)



حلیم صابر

کل فقط تھی زندگی میرے خلاف   ہوگئی اب موت بھی میرے خلاف
صرف میرے ہاتھ میں اک آئینہ   چہرگی بے چہرگی میرے خلاف
رات کا سناٹا میرا ہم نوا   رت جگے کی نغمگی میرے خلاف
میرا ہنسنا اس کے حق میں ساز گار   اس کی زہریلی ہنسی میرے خلاف
اس صدی ہی پر نہیں الزام کچھ   تھی ہمیشہ ہر صدی میرے خلاف

● 2,CHAMRU SINGH LANE,CALCUTTA-700011

ریاض الدین ریاض

جل گئے خواب تو ہوا احساس   میرا دشمن تھا خود مرا احساس
بے حسی کام کر گئی اپنا   اس سے پہلے کہ جاگتا احساس
زخم تو کب کے بھر گئے لیکن   اب بھی ہوتا ہے درد کا احساس
وقت بے رحم حکمراں جیسے   اور خاموش التجا احساس
منزلوں کا سراغ کیا ملتا   بے یقینی سے جاملا احساس

● 547/2, KHANDOOPARA, BHIWANDI-421302 DIST.THANE



کرشن چندر چودھری کمل

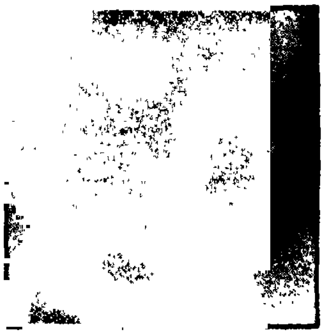
آنسو کی بوند ہی کو بناتے رہو چراغ   ہر حال میں لہو سے جلاتے رہو چراغ
آندھی کا تیز جھونکا جھپٹتا ہے بار بار   دامن کی اوٹ ہی میں چھپاتے رہو چراغ
جن کو ہے روشنی کی ازل سے یہاں تلاش   ان کے گھروں میں بھی تو سجاتے رہو چراغ
اِک دن یہی چراغ رہے گا سفر میں ساتھ   طوفاں میں ہر طرح سے بچاتے رہو چراغ
کیوں ان سے مانگتے ہو کمل روشنی کی بھیک   تاروں کو توڑ کر ہی بناتے رہو چراغ

● STATE DISPANCERY, AT/ P.O. AMAS-824212 DIST. GAYA

سلیم آغا قزلباش

58 - CIVIL LINES, SARGODHA (PAK)

شرافت



شرافت ایک غیر فطری شے ہے۔ اگر یہ خودرو ہوتی تو اس کی شجر کاری وآبیاری کے لئے اتنی بے ثمر کوششیں ہر گز نہ کی جاتیں۔ ویسے بھی "بقائے بہترین" کا نظریہ، شرافت کی برتری کو نہیں، زور آور کی بدمعاشی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ زور آور، بااختیار اور صاحبِ ثروت شخص بھی تو شریف آدمی ہو سکتا ہے۔ آپ کا کہا سر آنکھوں پر، مگر یہ مت بھولیں کہ اس کی شرافت پر بالعموم کلاشنکوف، کرنسی نوٹوں اور ووٹ خریدنے کی اہلیت کا دستِ شفقت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ماننا پڑے گا کہ شرافت کی دو بڑی اقسام ہیں: اولاً خاندانی شرافت، ثانیاً خود ساختہ شرافت۔ اوّل الذکر نہ چاہتے ہوئے بھی ہر دم گلے پڑی رہتی ہے۔ ظاہر ہے جو بندۂ خدا قرض داروں، ٹھیکے داروں اور رشتہ داروں کا ستایا ہوا ہو گا وہ شرافت کی ڈگر پر چلنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے! ثانی الذکر شرافت، مرضی اور پسند کے تابع ہوتی ہے۔ وہ آپ کے ہر اشارے پر حکم بجالاتی ہے۔ آپ جب چاہیں اسے ٹھوکر مار کر خود سے دور پھینک دیں۔ یہ دونوں ٹانگوں میں دُم دبائے کونے میں جا بیٹھے گی اور جب آپ اس کو پچکاریں گے تو یہ دُم ہلاتی آپ کے پاس آجائے گی اور پھر آپ کے تلوے چاٹنے لگے گی۔

فلموں میں ہیرو کو ایک شریف آدمی اور وِلن کو ایک بدمعاش آدمی کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مگر گذشتہ کئی سال سے ہیرو نے وِلن کا چلن اختیار کر لیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ وہ اب بدمعاشی یا غنڈہ گردی کے ذریعے اپنا ہیروپن دکھاتا ہے۔ یہ تبدیلی سماجی حوالے سے ہماری اجتماعی نفسیات کی غمازی کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی شخص آپ کا گریبان پکڑے اور آپ اس نازک موقع پر غلطی سے اسے صرف اتنا کہہ دیں: میرا گریبان چھوڑ دے 'تو جانتا نہیں میں ایک شریف آدمی ہوں"۔ تو اس کے بعد گریبان پکڑنے والے کے چہرے پر تمسخر اور حقارت کا ایک ایسا گنگا جمنی منظر آپ کو نظر آئے گا، جو شاید اس سے پہلے آپ نے کبھی دیکھا نہ ہو گا۔ یوں بھی بیچارا شریف آدمی، مارے شرمندگی کے اپنے گریبان تک میں منہ نہیں ڈال سکتا، کیونکہ اکثر دوسروں نے اس میں ہاتھ ڈال رکھا ہوتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ شریف آدمی شادی یا ولیمے میں شرکت کے لئے جانے سے قبل، کھانا گھر سے کھا کر جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر بھوکا ہی واپس آتا ہے، کیونکہ شادی یا ولیمہ کی دعوت میں اس کی ساری ہمت ایک عدد پلیٹ اور چمچ کے حصول میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی کا کام انجام دینے کے لئے فرہاد کی ہمت چاہئے۔ اسی طرح ایک شریف آدمی کھلے بندوں، سوائے اپنی بیوی کے اور کسی سے لڑ جھگڑ نہیں سکتا، بلکہ یہ کام بھی وہ حالات کا محتاط جائزہ لینے کے بعد ہی کرتا ہے، کیونکہ جلد بازی کی صورت میں، بیوی بپھر کر میکے کو سدھار جائے گی اور بچوں کی نفری کو انتقاماً شریف شوہر کے پاس چھوڑ جائے گی۔ آگے کا حال بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریف آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اکثر اس کی شرافت کا امتحان لیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ جلنے کڑھنے، پریشان رہنے، بڑبڑانے اور ہاضمہ کی خرابی میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی ایک اور خاص پہچان یہ ہے کہ اس کی نظر بڑھاپے سے پہلے ہی کمزور ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کے سر کے بال اور منہ کے دانت بھی بُرا وقت آنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ افرادِ خانہ کی عاقبت نااندیشیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے ہمہ وقت سرِ تسلیم خم رہتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے سوا، زندگی بھر کوئی اچھی نوکری حاصل نہیں کر سکتا۔ شریف آدمی کی آخری بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی سبکیوں اور ناانصافیوں کو برداشت کرنے کا ماہر ہوتا ہے۔ حقیقت میں شریف آدمی کا دل سے کوئی احترام نہیں کرتا۔ احترام صرف بدمعاش کا کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے ہاتھ میں کچھ دینے کے لئے بھی ہوتا ہے اور چھین لینے کے لئے بھی۔ دوسرے یہ کہ شریف آدمی کو شریف آدمی کہنا آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے، جب کہ بدمعاش کو اس کے سامنے بدمعاش کہنے کی آپ جرأت نہیں کر سکتے۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ شریف آدمی بالعموم معاشی مسائل میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے برعکس بدمعاش آدمی کو کم از کم کوئی معاشی مسئلہ لاحق نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں شریف آدمی کی سیدھی انگلیوں سے گھی کبھی نہیں نکلتا۔ مگر بدمعاش آدمی کی ٹیڑھی انگلیوں سے بھی گھی فی الفور نکل آتا ہے، بلکہ اس گھی کے ساتھ شکر بھی مفت میں مل جاتی ہے۔ دونوں میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ شریف آدمی کے لئے یہ دنیا ایک نہایت غیر محفوظ جگہ ہے۔ اس کے مقابلے میں بدمعاش آدمی کے لئے یہ بہترین قیام گاہ ہے۔ سچ پوچھیں تو اس دنیا میں شریف آدمی کے ساتھ لوگ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا کہ کھیل کے میدان میں کھلاڑی فٹ بال کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بدمعاش آدمی محض ابرو کے اشارے سے دنیا کا ہر کھیل روک سکتا ہے۔ آخری فرق بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ شریف آدمی کی ماں بہن کو لوگ اپنی ماں بہن نہیں سمجھتے، جب کہ ایک منجھے ہوئے بدمعاش کی ماں بہن کو لوگ فوراً اپنی ماں بہن کہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اپنے چال چلن سے شریف اور بدمعاش آدمی دور ہی سے پہچانا جاتا تھا، مگر جب سے شلوار قمیص کے پہناوے کا رواج عام ہوا ہے، شریف اور بدمعاش آدمی میں فرق کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔

روایت کے مطابق حاتم طائی کی شرافت اور سخاوت ضرب المثل ہے۔ لیکن

کر حاتم طائی کے پاس مال وزر نہ ہوتا تو کیا واقعی اس کا اتنا ہی احترام کیا جاتا! اس سوال کا جواب دینے کی ذمہ داری آپ کو سونپ کر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے ہاں آج کل شریف آدمی صرف اُسے کہا جاتا ہے جو دوسروں کے کسی کام نہیں آسکتا یا پھر کسی کام کا نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ اسے کوئی غیر شریفانہ لقب عنایت کرنے کی بجائے، شریف آدمی کہہ کر اس کا قصہ پاک کر دیتے ہیں۔ تاہم جب کبھی کسی جان پہچان والے سے بے عزتی کرانے کے بعد بڑے کرب سے یہ کہا جاتا ہے: "میں آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔" تو دراصل یہ بیان معترض کے "عذرِ شرافت" ہی کو آشکار کرتا ہے، جو ایک طرح سے اس کا اعتراف شکست بھی ہے۔ لیکن اگر اس موقع پر یہ کہہ دیا جائے: "تیری بدمعاشی کی ایسی تیسی، تو نے مجھے سمجھ لیا رکھا ہے!" تو تڑی دینے والا ایک دم کرائے کے کواٹر سے نکل کر شاہی ایوان میں داخل ہو جائے گا اور دربان اس کے لئے سارے دروازے ایک جھٹکے سے وا کرتا چلا جائے گا۔ خدانخواستہ میرا مقصود دنیا سے "شرافت" کی بیخ کنی کرنا ہرگز نہیں ہے۔ آپ جی جان سے اس کے گن گایئے، اس کو کندھوں پر اٹھا کر نعرے لگایئے، اس پر پھول نچھاور فرمایئے۔ سلیبس میں بطور درسِ اوّل شامل کیجئے، اس کو پھیلانے کے لئے ٹی، وی ڈرامے پیش کیجئے، فلمیں بنایئے، کالم اور کہانیاں لکھئے۔ تقریری مقابلے کرایئے، تنظیمیں بنایئے، گیت اور نغمے نشر کروایئے، میں لب روکتا ہوں! مگر اس سب کے باوجود یہ یاد رہے کہ شرافت دکھانے کی حد تک بڑے کام کی چیز ہے، مگر جو شخص اسے آزمانے پر اتر آئے۔ اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے اور کھانے کے ذکر سے مجھے خیال آیا ہے کہ پھلوں میں خوبانی کو خوبصورت خواتین شوق سے کھاتی ہیں، سیب صاحب لوگوں کے کھانے کی چیز ہے، آم، عام طور پر سبھی کھالیتے ہیں، اناس، مہنگی ہونے کی وجہ سے عوام الناس کے کھانے کی چیز نہیں رہی، لے دے کر پھلوں میں صرف ایک پھل شریفہ باقی بچتا ہے جو شریفوں کو راس آسکتا تھا، مگر وہ بھی اب ان کی پہنچ سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔

ہر چند کہ شریف آدمی کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچنے کے لئے صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاسکتے ہیں، مگر اس سے اس کی استعداد کار میں بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوسکتے۔ شریف آدمی تو سواریوں سے بھری زندگی کی تیز رفتار ریل گاڑی کی آخری بوگی کے باہر ہینڈل پکڑے، جھولتا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو نہ تو بوگی کے اندر اپنا پاؤں رکھ سکتا ہے اور نہ ریل گاڑی سے کود کر جان دینے کا حوصلہ ہی رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ "ہونے اور نہ ہونے" کے بین درمیان جھولتا رہتا ہے اور شرمندگی اور توہین کے تابڑ توڑ تھپیڑے کھاتا اپنے وجود کے پھڑ پھڑاتے بادبان کو سنبھال رکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے، تا آنکہ اس کا وقت رخصت آجاتا ہے اور وہ ریٹائرمنٹ سے ہمکنار ہو کر باقی ماندہ زندگی، گھر والوں کی خدمت کرنے میں گزارنے لگتا ہے۔ یوں بھی ایک بھرے پرے گھر میں ایک عدد ریٹائرڈ شریف النفس دادا بزرگ کو پوتوں کی دیکھ بھال کا فریضہ سونپنے کے سلسلے میں ایک نہایت موزوں ہستی خیال کیا جاتا ہے۔ نیز اسے ٹیلی فون، بجلی، پانی اور رسوئی گیس کے بل ادا کرنے اور بازار سے سودا سلف لانے کے لئے بھی اکثر بھیج دیا جاتا ہے،

طرفہ تماشا یہ کہ اسے بس کا کرایہ بھی نہیں دیا جاتا، یہ کہتے ہوئے کہ پیدل چلنا اس کی صحت کے لئے مفید ہے۔ دفتروں میں اسے اپنی شرافت کی وجہ سے دن بھر دھکے کھانے پڑتے ہیں اور "باباجی آپ کی مت ماری گئی ہے۔" کا فقرہ اتنی بار اس کے کانوں میں پڑتا ہے کہ رہی سہی مت بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ تاہم شریف آدمی کو جیتے جی کوئی نہیں چھوڑتا۔ بالفرض محال اگر دنیا والے اسے چھوڑ بھی دیں تو کم از کم گھر والے اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے۔ البتہ شریف آدمی کے وفات پا جانے کی صورت میں ہر تعزیت کرنے والے کی آمد پر اس کے سامنے مرحوم کے لواحقین گلوگیر آواز میں یہ بات دہراتے نہیں تھکتے: "مرحوم ومغفور مرتے دم تک سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے، کھانا صرف ایک وقت کا کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کا کوئی پوچھ لے تو انکار نہیں کرتے تھے۔ غسل ہمیشہ کمیٹی کے نل کے نیچے کیا کرتے تھے، ساری زندگی میلے کپڑوں میں گزار دی، مگر شرافت کا دامن کبھی میلا نہ ہونے دیا۔" □□

بقیہ صفحہ ۲۸ اردو افسانہ: ۱۹۶۰ء کے

شاید اس طرح کے کردار پیدا ابھی نہیں ہوسکتے۔ صورتِ حال بدل چکی ہے بقول سریندر پرکاش۔

"آج کے دور میں کوئی واحد افسانہ نگار بڑی شخصیت نہیں بن پاتا.... کیا افسانہ نگار کا ادبی قد چھوٹا ہو گیا ہے۔ جی نہیں! لوگوں کا ذہن بدل گیا ہے۔ علم کی حدود پھیل گئی ہیں۔"

اپنی کچھ کمزوریوں اور محرومیوں کے باوجود، اردو افسانے کے میدان میں اگر کچھ ہلچل ہے۔ تو جہ ہے تو عین ممکن ہے کہ کوئی نیا عہد یا کوئی نیا رجحان و میلان کروٹ لے رہا ہو۔ نئی کہانی تلاش کے عمل میں ہے اور اس تلاش کو پوری سماجی سیاسی اور تہذیبی سیاق و سباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی عمر اس کے تجربات و مشاہدات کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر اپنے آپ، آپ کو اس سے بیدی، منٹو جیسی توقعات نامناسب لگیں گی کہ اس سے اس طرح کی توقع کرنا پورے افسانوی ادب کی بقا اور ارتقا کے لئے خطرناک ہوگی علم کے ساتھ ساتھ مسائل پھیل گئے ہیں پھر یہ بھی ہے کہ کسی ایک مسئلہ پر مسلسل لکھ کر اور اچھا لکھ کر اپنی علیحدہ پہچان بنانا الگ بات ہے اور طرح طرح کے مسائل پر الگ الگ ڈھنگ سے لکھ کر اپنی شخصیت کو پس منظر میں ڈال کر محض سماج اور سیاست کی پہچان بنانا ایک دوسری شکل۔ یہ سچ ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں کوئی پریم چند، بیدی، منٹو نہیں ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مسائل کی جو رنگا رنگی، بوالعجبی آج کے افسانوں میں ہے شاید پرانے افسانوں میں نہیں۔ اس میں قصور فنکار کا نہیں بلکہ سماج کا ہے جس نے انسان کی اور فنکار کی ذاتی شخصیت کو مسخ کر کے صرف مسائل ہی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اس کے باوجود نیا افسانہ نگار اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کر کے دردمندی اور سنجیدگی سے اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہو گیا ہے۔ □□

بانو ارشد

12 - Camrose Avenue, Edgware,
Middx HA8 6EG, (U.K.)

قاتل کون؟

اس کے رونے پیٹنے سے تمام ایئرپورٹ پر ایک ماتمی فضا چھائی ہوئی تھی۔ وہ عورت سفید چادر ڈالے نوحہ کناں تھی۔ اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا اب کیا ہوگا جو اچانک یتیم ہو گئے تھے۔ اس کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ چوڑیاں توڑ دی گئی تھیں۔ رنگین دوپٹہ اتار کر اس کو بیوگی کی سفید چادر اڑھادی گئی تھی۔ وہ کبھی اپنی ناک پوچھتی اور کبھی آنسوؤں کو اپنے آنچل سے خشک کرتی لیکن آنکھوں سے ایک سیلاب تھا کہ پھوٹا پڑتا تھا۔ برابر میں ساتھ ہی اس کا سامان بندھا رکھا تھا میں بھی وہاں ایئرپورٹ پر اس کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھی۔ خواتین جو اس کو رخصت کرنے کے لئے وہاں آئی تھیں ان کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک وہ کوئی ایسا جملہ کہہ دیتی کہ دل پر گھونسا سا لگ جاتا۔ اس کی چیخ سے بچے بھی گھبرا جاتے۔

"ارے یہ نئی گاڑی منحوس نکلی میں منع کرتی نہ لو لیکن مرحوم کو مرسڈیز کی بڑی خواہش تھی۔ کہتے تھے کہ بچوں کو شوق ہے۔ ہائے تم نے میرا کہنا نہیں مانا اور اب مجھے اس دنیا میں کس پر چھوڑ گئے ہو میں کیسے سنبھالوں اپنے دل کو؟"

اور دھیرے دھیرے آواز دب جاتی، پھر سسکیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ بوڑھی ساس جو خود ہی اپنے جواں بیٹے کی موت سے ٹوٹ چکی تھی بہو کو گلے سے لگاتی، میری بچی صبر کر صبر۔ مجھے دیکھ اس بڑھاپے میں کیسا جوان پہاڑ سا بیٹا کھو کر صبر کی پتلی بنی بیٹھی ہوں خدا اولاد کا دکھ کسی ماں کو نہ دے۔

"ارے اماں، میرا ہیرا گم ہو گیا"۔ پھر کہتی "ہائے میں نے اس کی قدر نہ کی۔"

ایک مجمع ایئرپورٹ پر اکٹھا تھا۔ وہ لاش کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی۔ منی جو ابھی مشکل سے پانچ سال کی ہوگی ماں کو پیار کرتی پھر اپنی فراک کے دامن سے ماں کے آنسو پونچھتی پھر جا کر دادی کی گود میں بیٹھ جاتی۔ دادی اماں، امی کو چپ کراؤ نا یہ بھی نہ مر جائے ابو کی طرح۔ بھیا دوڑ کر ماں کے پاس آتا۔ امی خدا کے لئے اتنا مت رو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ وہ جو ہو بہو باپ کی شکل کا ہے۔ برابر میں بیٹھی ایک عورت حیران ہو کر کہتی ارے یہ تو بالکل اکمل بھائی کی طرح لگتا ہے۔ ادھر دوسرا بچہ جو مشکل سے گیارہ سال کا ہوگا الگ کرسی پر بیٹھا جیسے اس کا خلاؤں میں گم چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہو کہ یہ سارا بوجھ تو میرے اوپر آ گرا ہے۔ ایک عورت اٹھ کر روتی ہوئی عورت کے پاس آکر تسلی دیتی، ارے کیوں رو رو کر اپنے کو ہلکان کر رہی ہے، تیرے پاس تو یہ دو آنکھیں ہیں ان لاٹھیوں کو تھام لے۔ وہ تو خدا کی امانت تھی۔ اس نے لے لی۔

گلو نے اٹھ کر جیب سے رومال نکالا، ہاں ماں ہم تیری بیساکھیاں ہیں ہمارے لیے زندہ رہ۔ اس نے ماں کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا۔ بس اب پرواز کا وقت آنے والا ہے۔ اس نے جملہ بھی پورا نہ کیا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا اعلان ہو گیا۔ میں نے بھی جا کر خدا حافظ کہا، بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا، میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، اپنے جذبات کو روکا۔

اپنی گاڑی کی طرف لوٹی، گاڑی اسٹارٹ کی۔ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ ایئرپورٹ شہر سے بہت دور تھا۔ میں گاڑی چلا رہی تھی لیکن میرا ذہن مجھے ان وادیوں میں لے گیا جہاں سے اس المیے کی ابتدا ہوئی تھی۔

وہ گھر جہاں ایک خوشحال خاندان رہا کرتا تھا، ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی یہ عورت جو آج محرم کا تعزیہ بنی بیٹھی تھی، کس فخر سے چلا کرتی تھی جیسے قلوپطرہ ہو۔ کسی کو منہ نہ لگانا اس کا شیوہ تھا۔ شوہر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھا کرتا۔ اس کی بغیر مرضی کوئی پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا، پل بھر میں۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور پھر حال میں واپس آنے کی کوشش کی۔ ارے پرسوں نرسوں ہی کی بات ہے جب میں پرسے کے لئے ان کے گھر گئی۔ وہاں منسٹری کے لوگ مسز اکمل سے کہہ رہے تھے، آپ ایک دو دن کے اندر اندر یہ مکان خالی کر دیں، اس میں دوسرے چیف انجینئر صاحب کو منتقل ہونا ہے وہ ہوٹل میں ہیں۔ اندر داخل ہوئی تو ملازمین قالین لپیٹ رہے تھے۔ کوئی پردے اتار رہا تھا کوئی خاتون تکیے کے غلاف اور کشن کارٹن میں جما رہی تھیں۔

لمرا جڑ گیا، ہر چیز جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہے اس گھر کو کیسی آگ
ٹ، یہ عالیشان مکان پگھل پگھل کر بہہ رہا ہے۔ اس لاوے میں اکمل
ب کا خون، اس گھر کی خوشیاں بہہ رہی تھیں وہ آگ جس میں سب
بھسم ہو رہا ہے۔

میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ یہی وہ گھر ہے جہاں سردیوں
امیں کتنی خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ لان کے بیچ میں لکڑیاں جل
ہیں۔ اس کے آس پاس سینکڑوں کرسیاں قطار میں لگی ہیں۔ لطیفوں
قہقہوں کا بازار گرم ہے۔ ایک طرف سے کوک کی بوتلیں فرج سے
جا رہی ہیں دوسری طرف چائے اور کافی چل رہی ہے۔ انواع و اقسام
کھانے میزوں پر چنے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دور پر بچوں کی دوڑ بھاگ
ایک طرف عورتیں خوبصورت رنگ برنگی ساریاں اور شلوار قمیض
ملبوس، زیور سے آراستہ، خوشبوؤں سے معطر ماحول جوان لڑکیاں
، برق لباس میں قہقہوں کے گھنگھرو بجا رہی ہیں۔ اسمارٹ لڑکے
۔ جھانک میں مصروف فقرے بازیاں کرتے نظر آ رہے ہیں۔ سامنے
، میں مسٹر اور مسز اکمل مہمانوں کا استقبال بھی کر رہے ہیں اور مسکرا
۔ اکر کھانے کی میز کی طرف اشارہ بھی کر رہے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ذرا
لمحے کے اندر، اس عورت کی دنیا ہی لٹ گئی۔ وہ عورت جو اپنے
ے کسی کو کچھ نہ سمجھتی تھی، آج کیسے آسمان کی طرف سر اٹھا کر آہ
اد کر رہی ہے۔ لوگوں کے رحم اور ترس کی خواستگار ہے۔ یہ وہی
ن ہے جو کبھی دعوت افطار کی تقریب کر رہی ہے تو کبھی بچوں کے
ہونے پر خوشیاں منا رہی ہے۔ جب بھی کسی بچے کی سالگرہ آتی تو
۔ لوگ جمع کر لیے اور اسی گھر کو بقعہ نور بنا دیا۔ اپنی شادی کی سالگرہ پر
، کپڑے پہنے کہ سلیم اور انارکلی بھی ان دونوں کے لباس پر رشک
ں۔ میرے ذہن پر منظر بدل رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ اکمل ابھی
، ایک دم اٹھ کر مسکراتے ہوئے آئیں گے ارے بھابھی آپ کیسی
اور پھر مسکرا کر......

ایک اور واقعہ ذہن میں سنسنی پیدا کرنے لگا۔ چند روز بلکہ چند ہفتوں
رہو گا۔

ی کلاس دس بجے ختم ہوئی میں کالج سے نکلی اور پانچ منٹ میں اجمل
حب کے گھر پہنچ گئی۔ مسز اجمل بہت ہی ملنسار خاتون ہیں۔ میری ان
، اچھی خاصی شناسائی تھی راستے میں گھر تھا، ایسے ہی اکثر میں ان کے
تھ چائے پی لیا کرتی۔ اس دن گیراج میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں ایک
مرسڈیز اور دوسری سفید مرسڈیز، اسی کے پیچھے میں نے اپنی پیکو
ی کر دی جو ان دونوں شاہانہ گاڑیوں کے مقابلے میں بڑی حقیر سے
۔ میں نے اس احساس کو ٹالا۔ کام تو تینوں گاڑیاں ایک جیسا ہی کرتی
، یعنی مسافر کو اپنی منزل تک پہنچا دیتی ہیں بلکہ اپنی گاڑی کے چوری

ہونے کا کھٹکا بھی نہیں۔ اس احمقانہ خیال کو ذہن سے ماتھے کی لٹ کی
طرح پیچھے ہٹاتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ "لو آ گئیں
زرینہ چائے پینے۔" مسز اجمل نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔
"میں تو انتظار کر رہی تھی۔ آج جمعرات ہے، تمہارا لیکچر دس بجے ختم
ہو گا۔" میں نے دھیرے سے اسلام و علیکم کہا۔ سامنے ہی صوفے پر اکمل
بھائی اور اجمل بھائی دونوں ہی ساتھ ساتھ بیٹھے بڑے اچھے لگ رہے تھے
اجمل بھائی کے چہرے پر نور برستا تھا اور وہ تھے بھی ایسی پوسٹ پر۔ اکمل
بھائی کریم کلر کی شلوار قمیض میں ایک شہزادے سے لگے۔

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "ذرا جلدی سے گرم گرم چائے دیجئے مجھے
ڈاکٹر زیگن کے پاس جانا ہے ان کو شاپنگ کرانی ہے اس فیملی کے پاس
گاڑی نہیں ہے نا۔"

"زرینہ تم ایک لیکچرار ہو یہ سوشل ورکر کیوں بنی پھرتی ہو؟"

"تمہاری اپنی ذمہ داریاں کچھ کم ہیں۔ بچے، گھر، سودا، کالج۔ ارے ہاں یاد
آیا، وہ سراج اور ان کی بیوی آئے تھے رات کو۔ کہہ رہے تھے کہ اس شہر
کی دکانوں میں کوئی نئی چیز آئے تو بس زرینہ بھابھی سے پوچھ لو، اور یہی
نہیں بلکہ وہ چیز خرید کر بھی لا دیں گی۔ کسی کو ہسپتال لے جانا ہو تو وہ
بھی۔"

"چلیے چھوڑیے بھابھی آپ تو چائے پلا دیجیے۔"

"اور سنو زرینہ! وہ کہہ رہی تھیں کہ تم نے جعفری صاحب اور مسز
جعفری کو جو یہاں سے سو میل دور رہتے ہیں، اپنے گھر لا کر رکھا، ان کے
ہاں ڈلیوری ہونے والی تھی، رات گئے ڈاکٹر رشیدہ کو لا کر سارا بندوبست
کیا اور ایک ہفتے کے بعد زچہ اور بچے کو گھر بھی جا کر چھوڑ آئیں۔" وہ
بدستور بولے جا رہی تھیں۔

"بہت قصیدہ خوانی ہو چکی میری۔ بھابھی مجھے جلدی جانا ہے۔"

"ارے ہاں یاد آیا، اکمل کے پیٹ میں کچھ تکلیف رہتی ہے، یہ ایک دن مجھ
سے کہہ رہے تھے کہ زرینہ بھابھی تو سب کے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی
ہیں۔ ان کی ڈاکٹر زیگن کی فیملی سے دوستی ہے، وہ مجھے ان کو دکھا دیں۔
اکمل تم خود ہی زرینہ سے نہ کہہ دو۔"

"اکمل بھائی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھابھی میرے پیٹ میں بہت تکلیف رہتی ہے بہت علاج کرائے لیکن
تکلیف نہیں جاتی۔ ڈاکٹر زیگن نیا آیا ہے اس شہر میں، اس کا بڑا چرچا ہے وہ
مگر بہت مصروف ہے، اور میرا درد کسی طرح جاتا نہیں۔"

"ہاں میں دکھا دوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہماری بیگم صاحبہ تو ہماری کسی بات کو سنجیدگی سے لیتی نہیں، اور خاص
طور سے ہماری کوئی تکلیف۔ ایک عجیب اینٹھن سی ہوتی ہے۔ میں نے
آپ کو اکثر ان کے خاندان کے ساتھ مارکیٹ میں دیکھا ہے۔ تو بس

بھابھی سے ذکر کیا تھا کہ ہماری سفارش کر دیجئے۔"

"چلیے ! ابھی آیئے اکمل بھائی۔ ڈاکٹر زیگن اس ملک میں نئے آئے ہیں، ان کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ یہاں تو گاڑی نہ ہو تو ہر شخص اپاہج ہے مجھے اس کا احساس ہے۔"

"آپ ہمدرد ہیں سیدھی جنت میں جائیں گی۔"

"ارے آپ کو یہ کیسے معلوم ؟! اچھا بھابھی میں چلی۔"

"ارے لڑکی یہ گرم گرم سموسے تو کھالے اور تمہاری چائے بھی بن گئی۔"

"ہاں بھابھی ! چائے آپ پر قرض رہی" میں نے گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھابھی میں ان کے ساتھ ابھی چلا جاتا ہوں۔" اکمل بھائی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ارے شرمایئے نہیں جنرل ہسپتال راستے ہی میں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جی ہاں ابھی تو کافی دیر ہے اسکول کی چھٹی میں، بچوں کو لینا ہے آپ کو بھی مجھے بھی۔"

ہم لوگ پانچ منٹ میں زیگن کے دروازے پر تھے جو ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ہی تھا۔ شاپنگ کے لیے تو دیر ہو چکی ہے۔

"مسز زیگن آپ کے لیے اس شہر کا سب سے بڑا الکٹریشین لے کر آئی ہوں یعنی یہاں کا چیف انجینئر جو نائجیریا میں ۲۰ سال سے رہ رہا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا گرمی ہے کچھ ٹھنڈا تو پی لو یا چائے۔" "ٹھنڈا کہاں ؟ آپ کا تو فرج ہی کام نہیں کر رہا ہے۔ چائے چھوڑیئے ان کو مسئلہ بتایئے۔"

"ادھر آیئے اکمل صاحب۔" مسز زیگن ان کو اپنا ایر کنڈیشنر اور فرج دکھانے لے گئیں۔ میں خوش تھی کہ ایک تیر سے دو شکار۔ دونوں کا کام ہو گیا۔

"میں مزدوروں کو آج ہی بھیج دوں گا وہ سب ٹھیک کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اکمل باہر نکلے۔

"چلیے جناب مجھے اسکول سے بچوں کو لینا ہے۔"

"بھابھی مجھے پہلے گھر چھوڑ دیں ورنہ میری بیوی تو ہنگامہ برپا کر دے گی۔ سارے شہر میں خبر ہو جائے گی کہ آج بیگم اکمل اپنے بچوں کو اسکول لینے گئیں ہیں، ارے معاف کیجیے دل کی بات زبان پر آگئی۔" اکمل نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے ہسپتال، یہ رہا۔"

ڈاکٹر زیگن کے وارڈ میں ایک بھیڑ تھی میں ہجوم کو چیرتی پھاڑتی آگے بڑھی اور ایک نوٹ نرس کو پکڑا دیا۔ ابھی اکمل بھائی مجھ تک پہنچ بھی نہ پائے کہ ڈاکٹر زیگن باہر نکل آئے۔

"کیا بات ہے خیریت۔" انھوں نے پوچھا۔

"یہ ہمارے ملنے والے ہیں اکمل صاحب یہاں کے پرانے چیف انجینئر ہیں آپ کو فرج اور ایر کنڈیشنر کا مسئلہ تھا ان سے بات کر لیجیے۔

"اندر آجایئے آپ دونوں۔" ڈاکٹر زیگن نے کہا۔ ہم دونوں ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمیں کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ بولے۔

"یہ خاتون بہت عظیم ہیں، سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں ہے۔"

"درد تو ان کے پیٹ میں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیا مطلب ؟" "مطلب یہ کہ درد کی بات ہو رہی ہے تو ان صاحب کے پیٹ میں سخت درد ہے، ان کو دیکھیے۔"

"آپ ابھی مصروف ہیں۔ میں پھر آجاؤں گا مجھے اکمل کہتے ہیں۔" شرمندگی مٹاتے ہوئے اکمل نے کہا۔

"ارے نہیں ادھر آیئے، زرینہ کے مریض کو تو میں فوراً دیکھوں گا۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

میں اٹھ کر باہر آئی اور ٹہلنے لگی میرے ذہن میں تھا کہ ابھی بچوں کو بھی لینا ہے فوراً۔ اتنے میں اکمل بھائی نظر آئے۔

"چلیے بھائی جان کے گھر ہی سے اپنی گاڑی لے لوں ابھی وقت ہے۔" اکمل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ بھابھی سے اتنا ڈرتے ہیں یا ڈرامہ کرتے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"سب کی بیویاں آپ کی جیسی تھوڑی ہیں کہ سارا گھر اکیلی جان پہ سنبھالے ہوئے ہیں اور زمانے بھر کے غم اپنے دامن میں سمیٹ لئے ہیں۔" اکمل کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"چلیے چھوڑیے یہ بتایے کہ ڈاکٹر زیگن نے کیا کہا۔" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کل بلایا ہے تفصیل سے معائنہ کریں گے۔"

"چلیے پہلے بچوں کو اسکول سے لے لوں آپ کے بچے بھی۔"

"ہاں ٹھیک ہے منّی کی سالگرہ ہے اگلے ہفتے اور میری بیوی تو آج کل اس ہنگامے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔" اکمل نے ہنس کر کہا۔

ایک دن میں پھر مسز اجمل کے گھر جا دھمکی وہاں سب لوگ اکٹھا تھے۔ اکمل بھائی بھابھی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے سوال کیا۔

"آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا انھوں نے کیا بتایا ؟"

"بس زرینہ بھابھی وہی جس کا خطرہ تھا کہ السر ہے اور ایک خط دیا ہے کہ ابادان جا کر وہاں اسپشلسٹ کو دکھاؤں۔"

"آپ جایئے نا، صحت کا خیال رکھیے یہ ملک صرف پیسے کمانے کے لیے نہیں ہے۔" میں نے بے تکلفی برتنے کی کوشش کی۔

"بس گھر کے مسائل ہیں ادھر منّی کی سالگرہ بھی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں

مجھے کام ہے۔" اکمل یہ کہہ کر نکل گئے۔

"زرینہ! ابھی اکمل کہہ رہے تھے کہ اس دن شمو کی سالگرہ میں آپ کے یہاں گلاب جامن اور نمک پارے کھائے تھے بہت مزیدار تھے کس نے بنائے تھے میں نے بتادیا کہ تم نے۔ اکمل کہہ رہے تھے کیا یہ ممکن ہے کہ زرینہ بھابھی میرے لیے نمک پارے بنادیں، میں روزانہ ٹفن دان میں رکھ کر دفتر لے جایا کروں گا۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لیے۔ منی کی سالگرہ کے بہانے سے بنوا دیجیے۔"

"ہاں بھابھی میں اکمل بھائی کی فرمائش پوری کردوں گی۔ اچھا چلوں گی خداحافظ بھابھی۔"

دوسرے روز اتوار تھا صبح کے دس بجے اچانک گھنٹی بجی۔ سفید مرسڈیز پھاٹک میں داخل ہوئی۔ گاڑی میں سے جیسے شہزادہ سلیم اترا ہو۔ سفید کرتا اور شلوار میں ملبوس۔ ہم لوگ چائے کی میز پر بیٹھے تھے۔ مرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے! یہ صبح صبح شہزادہ سلیم ہمارے گھر کہاں آگیا؟"

"ابھی تک تم اپنے آپ کو انار کلی ہی سمجھتی رہنا اور شہزادہ سلیم کے خواب دیکھتی رہو۔" میرے شوہر وسیم نے اکبر بادشاہ کے دبنگ لہجے میں طنز کیا۔

"بھابھی یہ لیجیے ایک پیکٹ اور گھی کا ڈبہ بھابھی نے بھیجا ہے آپ کے لیے۔"

مجھے آنکھوں آنکھوں میں پیغام مل چکا تھا۔ "ایک ہی پیکٹ" میں نے زور دے کر پوچھا۔

"دوسرا گاڑی میں ہے، بہت کام ہو جائے گا، آپ کے نرم و نازک ہاتھ دکھ جائیں گے بیلتے بیلتے۔"

"جائیے کیا یاد کریں گے آپ بھی، بنادوں گی نمک پارے، دوسرا پیکٹ بھی لے آئیے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"بس تھوڑے سے روز دفتر لے جایا کروں گا۔ چائے کے ساتھ بہت مزہ دیتے ہیں۔ اتنے ہی سینی بھر کر؟ جتنے بھابھی کے لیے بنائے تھے۔"

"جی ہاں ویسے ہی چٹ پٹے بھی ہوں گے۔"

مگر میرا حصہ الگ رکھ دیجیے گا، میں اس کے لیے الگ ایک ڈبہ لایا ہوں۔"

"اچھا تو پوری تیاری سے آئے تھے، بلاوجہ ہی تکلف برت رہے تھے۔" میں نے قہقہہ لگایا۔

"شکریہ بھابھی۔" اکمل نے کہا۔

"آپ ابادان کب جارہے ہیں۔" میں نے سنجیدگی اختیار کی۔

"بس منی کی سالگرہ کے دوسرے روز ضرور ضرور چلا جاؤں گا۔ آپ کا اصرار ہے نا، کون کافر انکار کر سکتا ہے۔" اکمل نے جواب دیا۔

ہم لوگ اکمل بھائی کی بیٹی کی سالگرہ میں شریک ہوئے۔ حسب معمول سالگرہ کا جشن بہت کامیاب رہا۔ رات گئے سب خوشی خوشی واپس آئے۔ اکمل نے نمک پارے رکھ لیے اور بے حد شکریہ ادا کیا۔

تیسرے دن اچانک ایک خبر سارے شہر کو اداس کر گئی۔ اکمل بھائی کی لاش رات ۲ بجے ہسپتال لائی گئی وہ ابادان جارہے تھے۔ جہاز میں سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے گاڑی کرائے پر لی، ساتھ میں ایک سری لنکن بھی تھا۔ وہ تو راستہ میں اتنا سخت قسم کا حادثہ ہوا کہ چار گھنٹے تک شدید زخمی حالت میں سڑک پر پڑے رہے۔ ٹی وی پر اعلان ہوا تو اجمل بھائی کا ایک چیف جو نائیجرین تھا، ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا اکمل انصاری کے نام پر چونکا اور فوراً جائے واردات پر پہنچا۔ ڈرائیور سے خبر پہنچوائی اکمل کے بھائی ڈاکٹر زیگن کو لے کر شام کو ہی روانہ ہوگئے ان کے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اکمل نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ ہم لوگ اس خبر سے سناٹے میں آگئے۔ کسی کو صورت بھی نہیں دکھائی گئی کیونکہ لاش اس قابل نہیں رہ گئی تھی۔ میں ڈاکٹر زیگن کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے رو رو کر ڈاکٹر زیگن سے کہا کہ "میں اکمل کی قاتل ہوں۔"

"نہیں زرینہ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اکمل کا قاتل ہوں کیونکہ میری جب بھی ان سے ملاقات ہوتی میں ان سے کہتا کہ ابادان جایے وہ تو ٹال رہے تھے۔" "جی ہاں" میں نے روتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں نے بھی ان سے ابادان جانے کے لیے اصرار کیا تھا۔ کہنے لگے ہاں میں جانے سے پہلے اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں، ان کو آم پسند ہیں راستے میں آم دیتا جاؤں گا۔ وہاں تو جہاز بھی نہیں جاتا ہے اس لیے ٹیکسی کرلوں گا۔"

"اف میرے اللہ یہ کیا ہو گیا! نہ میں اس روز اجمل بھائی کے گھر اپنی کلاس کے بعد پہنچتی اور نہ ہی اکمل مجھ سے آپ کو دکھانے کی خواہش کرتے۔ ہائے میں ان کی قاتل ہوں۔"

"نہیں زرینہ یہ نہ کہو۔ وہ بہت ہی اچھے انسان تھے۔" زیگن نے کہا۔ میں باہر نکلی، بچے، بھائی سب میت کے ارد گرد ماتم کناں تھے اور میں ایک ایک بچے کے سر پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔

یہ ہاتھ تمہارے باپ کے قاتل ہیں، وہ نمک پارے کتنے منحوس تھے جو ان ہاتھوں نے بنائے تھے۔ یہی وہ ہاتھ ہیں جن سے گاڑی چلا کر میں اکمل کو ڈاکٹر زیگن کے پاس لے گئی تھی۔ یہ ہاتھ اکمل کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

میں نے نمک پارے بنانے کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا ہے۔

گاڑی گھر کے پھاٹک تک پہنچی ہے۔

گھر میں داخل ہوئی تو وسیم نے پوچھا "وہ لوگ پاکستان چلے گئے؟"

"ہاں! وہ لوگ چلے گئے۔"

میں آج بھی سوچ رہی ہوں کہ اکمل کا قاتل ٹیکسی ڈرائیور ہے یا ڈاکٹر زیگن یا میں؟ اس سوال کا جواب مجھے آج تک میرا دل نہیں دے سکا ہے۔

* *

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلّق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۱۰)

[ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں خطوں کا سلسلہ کہیں رکا نہیں ہے۔ ابھی بہت سارے وہ خطوط اشاعت کے منتظر ہیں جو ۱۹۹۹ء کے اوائل میں موصول ہوئے تھے۔ ہم نے خطوں کی اتنی بڑی تعداد کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ شاعر کے خاص نمبروں کی روایت اور ان سے متعلّق موصولہ خطوط کی کوئی بھی تعداد اب بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بھی ایک نئی تاریخ بن رہی ہے۔ بے شمار خطوں کی اشاعت ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔شاعر کے قارئین کا ایک سطری جملہ بھی ہمارے لئے بہت ہے۔ ہم نے بار بار ان سب کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مکرّر شکر گذار ہیں۔ مگر ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے اور وہ ہے طویل تفصیلی خطوں کی عدمِ اشاعت کہ ان میں بڑی کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔بعض غلط فہمیاں اور "عادت ذہنی" کے تحت وہ مفروضات بھی پیش کئے گئے ہیں جن پر ادارے کی طرف سے حواشی ضروری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم "عصر اردو ادب نمر" کے جرعات کو مکمّل طور پر پڑھے اور سمجھے بغیر نمبر پر کوئی بھی رائے غیر ضروری اختلاف ہی پیدا کرے گی۔ایسا ہوا ہے بلکہ ہو رہا ہے۔ہر ایک خط کا جواب ممکن نہیں۔ ہم تو ہر طرح کی تنقید کا خیر مقدم کررہے ہیں لیکن اتنے بڑے مختلف اورمنفرد تخلیقی عمل کی تنقید بھی مختلف ہو نی چاہئیے۔ بعض لوگوں نے خاص نمبر کی ضخامت ہی کو موضوع بنا لیا ہے اور مکالمہ کرنے سے گریز کررہے ہیں۔بے شک! خاص نمبر کی پذیرائی ہماری توقع سے زیادہ ہوئی ہے اور ہم اپنے مقصد میں اس طور کلمیاب رہے ہیں کہ ادب کے ناملعوم قاری تک "ہم عصر اردو ادب نمبر" پہنچ گیا ہے۔ ٹیلی فون سے خطوں سے، دستی،دیگر ذرائعوں سے مذکورہ نمبر جس طرح تقسیم ہوا ہے، ہمارے لئے حیرت انگیز بھی ہے اور باعثِ طمانیت بھی۔ تاہم اردو سماج میں جن بڑے ناموں کی گونج ہے وہ خاص نمبر کی تعریف وتوصیف تو کررہے ہیں اور بار بار کررہے ہیں لیکن اس سے اوپر اٹھ کر مکالمہ نہیں کررہے ہیں کہ ہم جو چاہ رہے ہیں وہ ہو سکے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری جلد کی اشاعت میں تاخیر کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے۔ ہمیں تفصیلی جائزے موصول نہیں ہو رہے ہیں جبکہ وعدے مسلسل ہیں۔دوسری جلد کو جلد اوّل سے زیادہ معیاری اور وقیع بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اچھی بری ہر طرح کی تنقید سے گذر جایا جائے اور پھر کام کیا جائے۔ ہمیں انتظار ہے خاص نمبر پر ایک ایسے نئے مکالمے کا جو ہم عصر اردو ادب نمبر کے تجربے ہی جیسا ہو۔ مجموعی طور پرتو بات مکمّل ہو ہی چکی ہے لیکن اس مکمّل میں ابھی ایک آنچ کی کسر باقی ہے(ادارہ)]

کاوش بدری

ہم عصر اردو ادب نمبر پر تادمِ تحریر دو تین کارڈ اور ایک انلینڈ آپ کے نام پوسٹ کر چکا ہوں۔ آپکی خاموشی آپ کی بے پناہ مصروفیات اور علمی و ادبی دوروں کی علامت نظر آتی ہے۔ روزانہ آپ کا دفتر مبارکباد کے ان گنت مکتوبات کی بہتات سے ایک نیا جنرل پوسٹ آفس بن چکا ہوگا ۔ ان تمام خطوط کو پڑھنے کے دوران آپکے دل ودماغ میں انبساط اور حیرت کے نقوش جگ مگ جگ مگ کرتے ہونگے ۔ یہ نمبر آپکے معترضین لوگوں کے حق میں چھنواں تنقیدی و ادبی دھماکہ ثابت ہوا ہے پتلے پتلے شاعر کے ماہناموں کو پانے والے بہت سارے لوگ ہم عصر اردو ادب نمبر کے اعلان کو پڑھ کر مذاق بھی اڑاتے رہے کہ اس اعلان کو عملی جامہ پہنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ جس دن ۱۲۴۰ صفحات پر مشتمل یہ ہم عصر اردو ادب نمبر انہیں ملا انکے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ نمبر نہ معونت ہے نہ استدراج بلکہ کرامتِ اولیاء اور معجزۂ حضورؐ ہی سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ بہ فرمانِ ربّ العزّت زندہ ہیں اور اپنے خاص بندوں پر احسان فرماتے رہتے ہیں اور پھر یہ قول شیخ اکبر انسان کامل ہی وہ صوفی ہے جو اللہ کی مخلوق کو انکا حق پہونچاتا ہے اور حق سے مراد وہ صلاحیت اور استعداد ہے جو اس عین میں ہے۔ لہٰذا انسانِ کامل ہر عین کو اس کی استعداد کے مطابق دیتا ہے۔ انسانِ کامل بھی اللہ ہی کے طریقے پر عمل کرتا ہے اور اسے متخلق بہ اخلاقِ الٰہیہ یا متصف بہ صفات اللہ کہتے ہیں۔ میں نے انہیں معنوں میں آپکو عظیم صوفی مدیر سے تعبیر کیا تھا۔ اب بعض حاسد میرے اس نظریئے کو چاپلوسی سمجھیں یا ذاتی منفعت سمجھیں اس سے کیا لینا دینا۔ بقول برادرم مظفر حنفی (اس ۳۷ سالہ عمر میں) میں اب اس منزل میں نہیں جہاں کسی کے ذکر کرنے یا نہ کرنے سے فرق پڑتا ہے۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے اداریہ میں، (باب تنقید کے، تنقید کا ایک جہان نو، شاعری سے نثر کی طرف نثر سے شاعری کی طرف، پچھ باب افسانہ کے بارے میں، اُپندر ناتھ اشک ایک نظر میں، "رام لعل ایک نظر میں، معاصر اردو افسانہ ۔ ایک مذاکرہ، معاصر اردو شاعری، مالک رام کا تذکرہ ماہ و سال، ترقی پسندی سے جدیدیت اور نئی دانشوری، نئی نسل اور مابعد جدیدیت ۔ مسائل، قاری اساسِ شعر وادب، سوانحی لغت، عالمی اردو قلمکاروں کے مستند سوانحی اشاریے، نئی صدی کے شاعر ڈائرکٹری۔ غرض ہر باب ہر موضوع پر آپ کی غیر جانبدارانہ تحریر، صالح تنقید، حق دہندگی، استقامت فکر بیباکی وغیرہ کا جواب نہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حرکتِ فلک قسری ہے یعنی ایک فرشتہ ہے جو آسمان کو حرکت دیتا ہے، یہ حرکت نہ طبعی ہے نہ ارادی۔ اسی طرح ہم عصر اردو ادب نمبر کو آپ نے ایک آسمانی ادب سمجھ کر بیٹھ کر کل بن کر اس کے محرک ہیں ۔ اس میں کسی اور کا دخل یاد خل زنہار نہیں ہے۔

مذکورہ ہر باب کی شروعات جو آپ کی پُر مغز تنقیدی وشعری تحریر سے ہوئی ہے اس سے دوران مطالعہ سکر دستی کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مشمولات میں شمس کاف نظام کے مقالہ نظم کی بافت کا مسئلہ اور سلیم شہزاد کے "بازگوئی کا افسانہ" کے تعلق سے میں نے ان سے مراسلت کی ہے۔ دونوں مقالے جاندار ہیں۔ سلیم شہزاد کا مقالہ جس قدر اعلیٰ قدروں سے مزیّن ہے اسی طرح انکے دوسرے

انوی حوالے بھی دلآویز اور پُر اثر ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان
ے تمام افسانوں کو مکمل پڑھ لوں مگر شین کاف نظام کا پر
زاور نئے انداز کا مقالہ جتنا اونچا ہے اتنے ہی انکے دئے
ئے بیشتر شعری حوالے پست ہیں!۔ معاصر اردو شاعری
یا باب تنقید کسی نقاد نے اقبال کے بعد لکھی گئی طویل
موں پر سیر حاصل روشنی نہیں ڈالی حتیٰ کہ ڈاکٹر محمد حسن
نے بھی نہیں۔ آپ سے میں پُر زور اپیل کرونگا کہ آپ
عر کے کسی شمارے یا ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری
میں عمیق حنفی کی "سند باد"، علامہ جمیل مظہری کی "
ب دشراب"، حرمت الاکرام کی "کلکتہ ایک رباب" اور
ناچیز کی "مثنوی قبلہ نما" اور "کاویم"۔ (ادب العالیہ۔
نولاگ میں قوم پسندانہ عناصر اور دراوڑی کلچر کے ساتھ
شاف ذات پر اردو کی پہلی طویل نظم) پروفیسر وارث
بانی یا کسی اور نقاد مثلاً پروفیسر سیّد محمد عقیل، وارث علوی
ہر ہم سے ایک طویل مقالہ لکھوا کر ضرور شائع فرمائیں۔

● 5-S.K.MEERUDDIN STREET,
AMBUR - 635802 (T.N.)

اصر بغدادی

یہ آپکی عنایت بیکراں ہے کہ آپ کی مہربانی سے شاعر
بندی سے مل رہا ہے۔ آپکا وقیع ہم عصر اردو نمبر بھی مل گیا
مگر علالت کی بناء پر تقریباً چھ مہینے خارجی دنیا سے کٹ کر
کیا تھا۔ اب صحت بہتر ہو رہی ہے تو آپکو لکھنے بیٹھ گیا
اری ہی کی حالت میں بادبان مکمل کیا ہے۔ ہم عصر نمبر کا
شتہار اس میں موجود ہے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی
آپ نے اسکو ہم عصر اردو ادب نمبر کا نام کیوں دیا ہے
بت ساری تحریریں تو ایسی شائع کی گئی ہیں کہ اسکا ہم
مرنت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے مگر ایک بات ضرور ہے
اس نمبر سے آپکی عرق ریزی کا انعکاس اُجاگر ہوتا
ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ تاخیر کی وجہ سے اسنمبر کی بے
شمار تحریریں غیر مطبوعہ نہیں رہ سکی ہیں چار چھ تحریریں تو
تو بادبان کے پچھلے شماروں میں چھپ چکی ہیں لیکن اسکے
باوجود آپکی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی لائق ستائش ہے
میرے خیال سے یہ نمبر ایک بے مثال ادبی انسائکلوپیڈیا بن
گیا ہے جس کو ایک قاری تحقیقاتی حوالوں کے طور پر استعمال
کر سکتا ہے۔ مگر ایک بات میں نے اور محسوس کی ہے کہ آپ
نے ادباء اور شعراء کے نام دے کر وقت کی ضرورت کو
حسن طریقے سے پورا کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسکے
ساتھ ساتھ عالمی اردو گاؤں کے ہر ادبی جریدے کے تعلق
سے ضروری معلومات فراہم کرنا بھی ضروری تھا۔ مگر آپ
نے کئی ادباء و شعراء کی کتب کو معاوضہ لے کر نمایاں شائع
کیا ہے جو میرے نزدیک ایک بہت بڑی غلطی ہے اس سے
بے شمار سادہ لوح قارئین تو یہی سمجھیں گے اتنے بڑے وقیع
نمبر میں جب ان کتب کے اشتہار شائع ہوئے ہیں تو یقیناً یہ

ساری کتابیں ہی اردو ادب کی بہترین کتابیں ہوں گی جبکہ
معاملہ اسکے برعکس ہے۔ بہر حال ان ساری باتوں سے قطع
نظر شاعر کا یہ نمبر ایک وقیع نمبر ہے جسکی اشاعت پر آپ
مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسکا دوسرا حصہ
کب شائع ہوگا؟ کیا قارئین کو مزید دس برسوں کے انتظار کا
کرب انگیز وقفہ کاٹنا ہوگا؟

● E-2, 8/14 MAYMAR SQ. BLOCK-14-
GULSHAN-E-IQBAL,KRACHI (PAK)

غفور شاہ قاسم

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) ایک ضخیم
دیدہ افروز اور ذوق پرور ادبی دستاویز ہے جسے نہایت محنت
، منصوبہ بندی، سلیقے اور قرینے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اسکے
مندرجات اور مشمولات معاصر شعری اور نثری ادب کا
EXTENSIVE اور INTENSIVE مطالعہ پیش
کرتے ہیں۔ بلاشبہ اور بلا مبالغہ شاعر کا یہ شمارہ دور حاضر کے
ادب کا EXHAUSTIVE جامع اور بھرپور ادبی جائزہ ہے
شاعر کا یہ نمبر اگر موجودہ ادب کا MICRO
ENCYCLOPADIA ہے تو مزید دو جلدوں کے اضافے
سے یہ MACRO ENCYCLOPADIA کا وقیع مقام
حاصل کرلے گا ادب کے عام قاری سے لے کر ناقدین اور
محققین تک یہ نہایت مفید اور معلومات افزا سرمایہ ہے یقیناً
اپنے آپ کو اپنے مقصد میں تحلیل کئے بغیر اور اپنی تمام تر
توانائیوں کو ایک مرکز اور محور پر مرتکز کئے بغیر اس عظیم
منصوبے کا پایۂ تکمیل تک پہونچنا ممکن نہیں تھا۔ اختر عثمان
کے الفاظ میں۔

رہِ سفال گری چلتے کب یوں ہی حرم آجاتا ہے
کمریں کوزہ ہو جاتی ہیں روح میں خم آجاتا ہے

افتخار امام صدیقی کی کئی برسوں کی ریاضتوں کا یہ ثمر
شیریں اب صاحبانِ علم و ادب کے مطالعہ کی میزوں پر ایک
خوش ذائقہ ماحضر اور ماحصل کی صورت میں موجود ہے
۔ عرصہ پہلے ایک صاحبِ دانش کا زرّیں قول پڑھا تھا کہ
"ادب مر چکا ہے لیکن اُن کے لئے نہیں جو زندہ ہیں، ادب
زندہ ہے لیکن اُنکے لئے نہیں جو مر چکے ہیں"۔ یقیناً ادب
زندہ ہے شاعر کا یہ نمبر زندہ ادب کی زندہ دستاویز ہے جو
ہمارے آئندہ کے ادبی تناظر کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ ہماری
یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ شاعر کا یہ رفیع الشان نمبر ایک ایسا
تخلیقی کارنامہ ہے جو دورِ حاضر کے ادب کی تفہیم و تنقیح میں
حد درجہ معاون ثابت ہوگا۔ انتہاؤں کی اس ابتداء سے فکر و
نظر کی نئی جہتیں روشن ہونگی ادب کے نئے امکانات کے در
وا ہونگے نیا ادبی مکالمہ قائم ہوگا اور نئے ادبی مباحث کو
تحریک ملیگی۔ یہ نمبر ایک نئے ادبی عہد کی نوید اور ایک نئے
ادبی اُفق کی دریافت ہے۔

ایک مدیر بھی محقق کی طرح ایسا کیمیا داں ہوتا ہے جو
ہزاروں ٹن کیمیاوی مواد کو کھوجنے، جلانے اور تجزیہ کرنے
کے بعد صرف چند ماشے چند اونس "ریڈیم" دریافت کرپاتا
ہے۔ افتخار امام صدیقی ادب کے کیمیاداں ہیں کہ اُنھوں نے
اپنے جذبوں میں جذب اور اپنی لگن میں مگن ہو کر اس
عنبریں شامل مواد کی صورت ادب کے قارئین کے لئے
"ادبی ریڈیم" دریافت کیا ہے یہ ایک ادبی کرامت ہی نہیں
ادبی معجزہ بھی ہے۔ بقول غلام احمد ناصر۔

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

ہم سمجھتے ہیں کہ افتخار امام صدیقی جیسا محکم اور اُستوار
تکمیل پسند اور منصوبہ ساز شخص ہی یہ معجزہ دکھا سکتا ہے۔
کہتے ہیں اگر کوئی کوہ پیما راکاپوشی سر کرلے تو اُسے نانگا پربت
دکھائی دینے لگتا ہے اور نانگا پربت کی چوٹیوں تک رسائی
حاصل کرلے تو اسے کوہ ہمالیہ کی ایوریسٹ تک پہونچنے
میں بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ہمیں یقین ہے انشاء اللہ اس
میں بھی وہ ضرور کامیاب و کامران ٹھہریں گے اور اس کی
دو مزید معودہ جلدیں مستقبل قریب میں قارئین کے سامنے
ہونگی۔ رفتار ساتھی ہو تو رستے کہکشائیں بنتے ہیں۔ مسعود
عثمانی کہتے ہیں۔

ایک خواب ہے ساتھ ساتھ میرے
ہیں قوس قزح پہ ہاتھ میرے

انشاء اللہ جلد یہ خواب بھی تعبیر آشنا ہو۔
۔ شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) بجا طور
پر ادبی حلقوں کی جانب سے بھرپور داد کا خراج
حاصل کر رہا ہے۔ اس کامیاب کاوش اور کامران
کوشش پر راقم الحروف کی جانب سے حرفِ تحسین
اور تہنیت قبول فرمایئے۔

● MOHALLA ISLAMABAD,
KUNDIAN,DIST.MIANWALI(PAK)

ساجد حمید

ہم عصر اردو ادب نمبر کا ایک طویل عرصے کے انتظار
کے بعد دیدار ہوا۔ واہ کیا خوب نمبر شائع کیا ہے میرے
بھائی۔ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک حسن ہی حسن
بکھرا پڑا ہے۔ ترتیب و تزئین کا تو جواب ہی نہیں۔ سچ مچ یہ
نمبر آنکھوں سے لگا رکھنے کے قابل ہے آگرہ اسکول کا باب
اس نمبر کی جان ہے۔ موڈ کے مطابق کبھی افسانہ، کبھی شعری
حصہ اور کبھی تنقید پڑھ رہا ہوں۔ جب پورا نمبر پڑھ لوں گا تو
یکسوئی سے اس کا دوبارہ مطالعہ کروں گا۔

● 123/3 ,4TH CROSS
SHASHADRIPURAM, SHIMOGA-
577201(KARNATAKA)

مکتوبات

پاکستان میں اردو ادب

فروری-مارچ ۲۰۰۰ء

تابش دہلوی

شاعر کا اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ ۲ جو پاکستان میں اردو ادب کے متعلق ہے، آپکی مدیرانہ اعلیٰ صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ پاکستانی ادب اور اہل ادب کے متعلق اتنا مواد حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا اور آپ نے اسے نہایت خوش اسلوبی سے نہ صرف حاصل کر لیا بلکہ اسکی ترتیب میں بھی حسن ترتیب کو برقرار رکھا۔ ڈاکٹر عطش درّانی کا مضمون نہایت عمدہ ہے۔ انہوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ دونوں ملکوں کی اردو میں نئی لفظیات کا عمل جاری ہے اور ان ملکوں کی اردو کی آئندہ کیا شکل ہوتی ہے یہ کہنا قبل از وقت ہے اس خصوصی شمارے میں اردو سے متعلق کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا آپ نے احاطہ نہ کیا ہو اور اس بیان میں آپ نے نہایت دیانت داری سے جائزہ لیا ہے جو دونوں ملکوں کے سیاسی تعصبات سے پاک ہے۔ پاکستان کی تحریک میں جو عناصر کار فرما تھے ان میں اردو کے قومی زبان کا عنصر بھی شامل تھا لیکن یہاں کے جاگیر داری معاشرے نے اردو کو اس کا مقام نہیں دیا اور تاحال یہی صورت ہے۔

● III-A,6/9,NAZIMABAD,KRACHI-74600

مقصود الٰہی شیخ

زیر نظر شمارے پر جستہ جستہ نظر ڈال کر از سر نو قائل ہو گیا کہ آپ واقعی گہری نظر رکھتے ہیں اور اس قبیل کے مدیروں میں شامل ہیں جن کی نگاہ دور تک جائزہ لے کر موتی چن لاتی ہے۔ آپ نے پاکستانی ادب پر زبردست دستاویزی قسم کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس محنت کے لئے لائق مبارکباد ہیں۔ آپ کے اشاریئے دلچسپی سے پڑھوں گا مگر یہ بالکل ظاہر ہے آپ موجودہ ادبی رو سے پوری طرح WITH IT ہیں (اردو میں مس لکھ سکتا تھا دوسرا لفظ سوجھ نہیں رہا)۔ انگریزی محاورے کے مطابق پہلا خیال جو قابل تنقید ٹھہرتا ہے وہ یہ ہے کہ افسانوی حصہ کمزور ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس میں متعدد اہم اور بڑے نام غائب ہیں اور نمائندگی مکمل نہیں ہے۔ آپکو اسکا احساس ہوگا۔ اس لئے کوئی سا نام یہاں نہیں لکھ رہا۔ قبول عام سے ہٹ کر بھی یہ عرض کروں گا کہ آپ سے ناانصافی ہوئی ہے۔ ایک اور سہو کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔ آپ نے تذکرۂ خطاطین (محمد راشد شیخ) کی قارئین سے خریداری کی سفارش کی ہے مگر بھارت اور پاکستان کے فروخت کنندگان کا پتہ درج کرتے ہوئے قیمت درج نہیں کی۔

● 24-PARK HILL DRIVE,BRAD- FORD BD8 0DF (U.K.)

رفیع الدین ہاشمی

"شاعر" مل رہا ہے پاکستان میں اردو ادب خصوصی شمارہ بھی ملا۔ میں آپ کے زرخیز ذہن اور عجیب و غریب منصوبوں کو بروئے کار لانے کی غیر معمولی صلاحیت پر حیران ہوں۔ خدا آپ کو توفیق مزید دے آمین۔

ص ۱۸/ "فاران" کراچی اب نہیں چھپ رہا۔

"نقوش" کا رسول نمبر محمد طفیل نے ۱۳/ جلدوں میں شائع کیا۔ قرآن نمبر کی تیاری شروع تھی کہ فوت ہوگئے۔ اسکی دو جلدیں گذشتہ سال جاوید طفیل نے چھاپی ہیں مزید جلدیں بھی آئیں گی۔

"سفید چھڑی" سرگودھا سے شائع ہوتا ہے نہ کہ لاہور سے۔

ص ۴۶/ اردو کے ادبی رسائل کا سب سے بڑا ذخیرہ (غالب لائبریری کے بجائے) گجر انوالہ میں ہے۔

ہر بڑے اردو اخبار کی تعداد اشاعت ایک لاکھ نہیں ہے۔ جنگ یا شاید نوائے وقت کی ہو گی۔

ص ۴۶/ رسالہ "سیارہ" کے مدیر اب حفیظ الرحمٰن احسن کا اور پتہ ایوان ادب اردو بازار لاہور۔

ص ۱۳/ مشفق خواجہ کا پتہ درست یہ ہے: ۳ ڈی ۹/۶ ۲ ناظم آباد کراچی-۱۸

مزید: آپ کا حسن نظر کہ احقر کو بھی "پاکستان کی مشہور ادبی شخصیات" میں شامل کیا ص ۱۲/

مشفق خواجہ نے "تخلیقی ادب" کے پانچ ضخیم یادگار نمبر شائع کئے تھے۔ رسائل میں انکا بھی ذکر ہونا چاہئے تھا۔

ایک سوال: ص ۷/ "اردو ادب کی ایک صدی" کے تحت پاکستان میں اردو ادب کا تفصیلی جائزہ کیا اصناف وار ہوگا یا زمانی ترتیب سے؟

● 28- D,MANSOORA,MULTAN ROAD LAHORE-18 (PAK)

ش۔ صغیر ادیب

شاعر کا تازہ شمارہ "پاکستان میں اردو" مل گیا ہے اگرچہ ابھی پورا نہیں پڑھ سکا ہوں تاہم سرسری ورق گردانی سے ہی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک اہم شمارہ ہے۔ اور پاکستان میں زبان، ادب اور دیگر فنون کا ایک ایسا جائزہ پیش کرتا ہے جو ادھورا اور تشنہ ہوتے ہوئے بھی موقر و معتبر ہے۔ ڈاکٹر عطش درّانی کا مضمون وقیع اور جامع ہے۔ اور پاکستانی اردو کے خد و خال کو پوری طرح اُجاگر کرتا ہے آپ کے مرتب کردہ مضامین بھی پاکستان میں اردو زبان و ادب اور دیگر فنون کی رفتار و ترقی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ آپ نے خود اداریئے میں اعتراف کیا ہے "یہ شمارہ سرسری اور تشنہ ہے۔ آپ کے اس اعتراف پر تبصرے سے گریز کرتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ باوصف اسکے کہ میں نے پورا پرچہ نہیں پڑھا ایک نظر پرچے پر ڈالنے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان گنت اہم نام شامل نہیں ہیں۔ خاص طور پر افسانے کے باب میں کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ اگر آپ پاکستانی ادب کے حوالے ایک نسبتاً مختصر نمبر ترتیب دے رہے تھے تو وہاں کے اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو اوّلیت دیتے۔

بہر نوع ادھورا ہونے کے باوجود یہ ایک اہم شمارہ ہے اور یقینی طور پر محفوظ کئے جانے کے قابل ہے۔ اور میں اس توقع کے ساتھ آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آئندہ آپ ایک مکمل اور ہر پہلو سے جامع نمبر ضرور شائع کریں گے۔

165-BLACK BURAN ST. BLACKBURAN BBI 7NG-LONDON(U.K.)

سلطان جمیل نسیم

فروری کا شمارہ آپ نے پاکستان میں ادب کے حوالے سے مرتب کیا ہے۔ جو پاکستان میں ادبی صورت حال کی ایک جھلک دکھا رہا ہے شاعر اب ایک حوالہ اور تحریک بن گیا ہے آپ نے خود کو علامہ سیماب اور حضرت اعجاز صدیقی کا حقیقی ورثے دار ثابت کر دکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت عطا فرمائے۔ اور آپ آگرہ اسکول کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اسکو بھی پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔

A/49-3,GULSHN-E-IQBAL, KRACHI-75300

رشید الدین

شاعر کا فروری اور مارچ دو ماہ کا مشترکہ شمارہ ملا۔ آپ نے اسے ایک خصوصی اشاعت کہا تھا مگر تجسس برقرار رکھا تھا جو اس شمارے کے ملنے کے بعد ختم ہوا۔ کم از کم مجھ کو یہ گمان نہیں تھا کہ یہ دو ماہ کا مشترکہ شمارہ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ-۲ ہوگا۔ اور آپ صرف ۱۰۰ صفحات اور ۲۰ روپیہ میں اتنا سارا مواد پاکستانی ادیبوں اور شاعروں (وہ بھی نئے) کے متعلق مع تصاویر ہندوستان میں اردو کے قارئین کو بہم پہونچادیں گے۔ مبارک! صد مبارک!! ٹائٹل پاکستانی مصور زوار حسین نے بڑا آرٹسٹک اور خوبصورت بنایا ہے۔ اس پر آپ نے ہری زمین دے کر چار چاند لگا دئے۔ پاکستان کی نئی نسل کے بھرپور تعارف کے ساتھ آپ نے قدیم نسل کے اہم نام بھی اس میں شامل کر دئے ہیں جو بقید حیات ہیں۔ اس میں آپ نے پاکستانی رسالوں کے پتے اور دیگر تفصیلات بھی دے دی ہیں۔ اس شمارے سے یہ بھی پتہ چلا کہ آپکے پڑدادا بھی عالم اور شاعر تھے۔

● RASHID GULSHAN,12-2-823/A/1224 SANTOSH NAGAR COLONY, MEHNDI PATNAM HEYDRABAD-28

محمد انصار اللہ

آپ نے شاعر کا عالمی منظر نامہ۔ ۲ عنایت کیا۔ یہ بھی بہت کام کی چیز ہے۔ آپ کی اس کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ اللہ اجر عطا کرے۔

میں اردو ادب کی تاریخ ۱۸۱۱ء تا ۱۹۱۴ء لکھنے میں مصروف ہوں۔ خدا کرے حسبِ دلخواہ مکمل ہو جائے، دعا کریں۔

● 4/1173, SIR SYED ROAD, SIR SYED NAGAR, ALIGARH (U.P.)

سلطان سبحانی

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ ۲، ملا شکریہ! ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد شاعر کے یکے بعد دیگرے کئی خصوصی شمارے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ دم لینے کے بجائے آپ کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی ہے لہٰذا آپ کی ہمت اور استقلال کی داد دے رہا ہوں۔ زیرِ نظر شمارے میں اگرچہ پاکستان کے کچھ معروف ادباء شریک نہیں ہیں اس کے باوجود یہ شمارہ کافی وقیع ہے اور پاکستانی اردو ادب کے عمدہ خد وخال پیش کر رہا ہے۔ آپ کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قبل ستائش ہے۔

● 193-M.H.B. COLONY, MALEGAON

خورشید ملک

آپ کی کھوپڑی ہے کہ بھوت کا مسکن؟ ایک ضخیم نمبر کے بعد بھی آپ کئی خاص نمبر شائع کر چکے ہیں اور نہ جانے کتنے ہی خاص نمبر مستقبل میں شائع کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ محمد طفیل (نقوش والے) اور آپ کی کھوپڑی کم و بیش ایک ہی جیسے مادّوں سے بنائی گئی ہو گی۔ آپ کی کاوشیں یقیناً لائق ستائش ہیں۔ اردو دنیا کے سر پر آپ کا ہاتھ قابلِ احترام ہے۔

● TRAIN TIKLY,SHAHJHANPUR,(U.P)

جعفر شیرازی

شاعر کا "اردو ادب کا عالمی منظر" موصول ہوا بلاشبہ آپ کی حیثیت ادبی دنیا میں تہلکہ خیز ہے۔ اتنے عظیم شمارے ترتیب دے کر شاعر کو زندہ وجاوید کر دیا ہے سچی بات تو یہ کہ ہر شمارے میں اتنا ٹھوس اور عظیم ادب ہوتا ہے کہ پرچہ ادبی دنیا میں ایک یادگار کی مثال رکھتا ہے۔ "ہم عصر اردو ادب نمبر" "خواتین کا ادب" اور اب پاکستان میں اردو ادب کا خاص شمارہ نکال کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو ادب کے فروغ کے لئے آپ کی ذات نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ایسا لگتا ہے ادب ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے اور آپ ہمہ وقت اسی کارِ حیات میں منہمک رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعر کو عالمی حیثیت حاصل ہے۔

● 554-K,FARIDTOWN,SAHIWAL,(PAK)

شکور انور

شاعر کا زیرِ نظر شمارہ پاکستان میں اردو ادب پر مشتمل ایک معیاری، معلوماتی اور دلچسپ دستاویزی شمارہ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سرورق خوبصورت اور جاذب نظر ہے یہ شمارہ پاکستان میں موجودہ صورت حال کی مکمل معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس منظر نامہ میں آپ نے پاکستان کے اخبارات، وہاں کے رسائل، مشاعرے، رسم اجراء وغیرہ پر دلچسپ جائزہ پیش کیا ہے آخر میں پاکستانی رسائل کے پتے شائع کرنا ایک مشکل ترین کام تھا جسے آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا ہے قارئین کو اس سے یقیناً استفادہ ہوگا۔ ادبی رسائل کے باب میں آپ کے اس جملے "اردو کا کوئی بھی ادبی رسالہ ہو دنیا کے کسی بھی علاقے سے شائع ہوتا ہو اُسے ہم اپنے ہی خاندان کا ایک فرد تصور کرتے ہیں" نے دل میں گہرائی تک اثر کیا کاش دیگر رسائل کے مدیران حضرات کے دلوں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو اردو کے بہت سارے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں مگر اس کے برعکس ہوتا یہ رہا ہے کہ ایک رسالہ دوسرے کا مخالف نظر آتا ہے کوئی ترقی پسندی کی بات کرتا ہے تو کوئی جدید رجحان کا حامی بنتا ہے اور کوئی مابعد جدیدیت کی وکالت کرتا ہے اس کے علاوہ کوئی بھی ایک دوسرے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے اس سے تعمیری ادب کی تخلیق نہیں ہو پاتی ہے بلکہ تفریق بڑھ رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ شاعر ان سب لغویات سے پاک ہے اور اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہے یہ رسالہ اردو ادب کی شاندار روایتوں کا امین ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات بھی معیاری، معلوماتی اور دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں مجموعی طور پر زیر نظر شمارہ آپ کی شاعری کی طرح ہی خوبصورت ہے۔

● SETHANI CHOWK , SHIRPURA KOTA -324006(RAJ)

غلام نبی خیال

پاکستانی ادب کے بارے میں تازہ ترین شمارہ موصول ہوا یہ ایک منفرد کوشش ہے جس میں آپ نے واقعی خونِ جگر کو شامل کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مختصر سے خاص نمبر میں پاکستان بھر کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک نقشہ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

● RAWALPURA HOUSING COLONY,SRINAGAR -190015(J.K)

حبیب کیفی

مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ کو پوری اردو دنیا سے خطوط موصول ہوتے ہیں۔ آپکے دشمن بھی آپ کے کام کی تعریف کیا کرتے ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ اتنی ENERGY لاتے کہاں سے ہیں؟ برسوں کی محنت کے بعد آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر کی شکل میں ایک نایاب تحفہ اردو دنیا کو دیا اور اس برس تین خاص نمبر دینے کے ساتھ ہی ساتھ "شاعر" کو پابندیٔ وقت کے ساتھ نکالتے رہنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اب یہ پاکستانی اردو ادب نمبر کا تحفہ، ماشاء اللہ! میں پچھلے پینتیس برسوں سے شاعر کا قاری ہوں لیکن ان کچھ برسوں میں ایسی چستی پھرتی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اور تخلیقات کا معیار قابلِ ستائش، صحت مند، بے مثال..... اللہ آپ کو اور شاعر کو لمبی عمر دے۔ آمین۔

● 159-ZAKIR HUSSAIN COLONY,3RD-CHOPASNI ROAD,JODHPUR-342004(RAJ.)

افضال نوید

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ اعلیٰ ادبی فن پاروں سے لبریز ہے۔ نذیر قیصر، انور شعور، جون ایلیا، ابرار احمد، شاہدہ حسن، محمد ادریس بابر، سرمد صہبائی اور اسرار زیدی نے متاثر کیا نثری حصہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ایسا خوبصورت اور دلآویز شمارہ نکالنے پر مبارکباد وصول کیجئے۔ آپ کی پیہم جدوجہد عالمِ ادب کے لئے قابلِ قدر ہے۔ پاکستان میں فنون لطیفہ، پاکستان میں اردو ادب آپ کی گراں قدر تحریریں ہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو آفاقیت ہے اس نے بہت متاثر کیا۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح کے معرکے سرانجام دیتے رہیں۔

● 105-140,GARDEN-RIDGE PLACE,SCARBORO,ONT.41K 4H8 CANADA

سیّد جاوید مخدومی

فروری، مارچ کا مشترکہ خصوصی شمارہ ملا جس کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس شمارے سے پاکستان کے موجودہ ادب کا بھرپور مطالعہ ہوا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ پاکستانی ادبی رسائل کے پتے دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کیوں کہ کچھ پرانے پتے یاد تھے گمراتنے نہیں۔ شاعر کا یہ خصوصی شمارہ پڑھ کر مانو آج دل کی حسرت پوری ہو گئی۔ شاعر کا ایک بار پھر شکریہ، شکریہ، شکریہ اور شاعر کو میرا عقیدت بھرا سلام۔ خاکسار کی خواہش ہے کہ جس طرح پاکستانی ادبی رسائل کے پتے دئے گئے ہیں اسی طرح ہندوستان کے تمام ادبی رسائل کے نام اور پتے بھی شائع کئے جائیں۔

● LAC, 2251, SQM AIR FORSE, C/O. 56, AP -O

بقیہ صفحہ ۴۷ - نقد و نظر

کتابت وطباعت دل کو گرفت میں لیتی ہیں۔ سرورق کا لاجوردی رنگ طمانیتِ قلب و نظر کا سامان فراہم کرتا ہے۔

ضخامت: ۱۹۲ صفحات ☆ قیمت: ۳۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء

☆ پتہ: محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی، ۸۴- چکلہ اسٹریٹ ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۳ء ☆ مبصر: عشرت ظفر

نقد ونظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

سیاہ سیاہ (شاعری)

باقر مہدی

باقر مہدی ہمارے دانشور شعراء میں ہیں۔وہ COMMITMENT کے شاعر ہیں ان معنوں میں کہ ان کا ماننا ہے کہ سماجی شعور کے بغیر اچھا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ہر دانشور کی طرح سرکشی ان کو بھی ودیعت ہوئی ہے سیاست میں انہیں چے گویرا پسند ہے تو شاعری میں یاس یگانہ۔زیرِ نظر کتاب تو یگانہ ہی کے نام معنون ہے۔

سیاہ رسیاہ میں باقر مہدی کے پہلے شائع ہوئے تین مجموعہ ہائے کلام: شہر آرزو (۱۹۵۸ء) کالے کاغذ کی نظمیں (۱۹۶۷ء) اور ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں (۱۹۷۲ء) کے علاوہ "کالی غزلیں کالی نظمیں" کے عنوان سے نئی غزلیں، نظمیں اور تراجم شامل اشاعت ہیں۔اس طرح یہ کتاب باقر مہدی کی اب تک کی شاعری کی کلیات ہے۔

باقر مہدی نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔اُنکی تنقیدی اور تخلیقی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا کام معماری نہیں بنیادی ہے اس لئے اُنکی تنقید اور تخلیق میں ایسا گہرا رشتہ ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی تفہیم خاصی مشکل ہے۔ایک سمت اور اکی ہے تو دوسری سمت نمائی۔جیسے کہ پہلے کہا گیا کہ وہ کمٹ منٹ کو پسند کرتے ہیں لیکن انکا کمٹ منٹ مارکس کے اس قول کی تائید وتصدیق کرتا ہے کہ:

IF YOU WISH TO ENJOY ART,
YOU MUST BE AN ARTISTICALLY
TRAINED PERSON.

نثری نظم پر انکا مضمون اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

اشتراکیت کو پسند کرنے کے باوجود باقر مہدی ترقی پسندوں کی طرح ادب کو آئیڈیالوجی کی تبلیغ میں ضائع نہیں کرتے نہ وہ جدیدیت کے طرف داروں کے ان اوصافی امتیازات کو قبول کرتے نظر آتے ہیں جس میں فرد کی تنہائی اور محرومی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔اظہار کی سطح پر باقر مہدی بے باک ہیں۔وہ GRHAM HOUGH کے بیان کردہ تفاعلِ تخلیقی زبان کے مطابق جدید شاعر ہیں کیوں کہ HOUGH کے مطابق جدید زبان ودیعت ہوئی روایتی زبان سے ایک نئی طرح کی علاحدگی (ALIENATION) سے عبارت ہے اسی کی تخلیقی مثال پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

باقر مہدی کو کالا رسیاہ لفظ بہت پسند ہے لیکن انکے یہاں لفظ محرومی، مایوسی، ماتم، وغیرہ کا مظہر محض نہیں ہے مختلف معنوں میں متعدد مقامات پر بایک وقت کبھی معنوں کا حامل ہے ان کے علاوہ یہ لفظ سرخ یا گہرے سرخ کے علامتی معنوں میں بھی مستعمل ہوا ہے باقر اشتراکیت پسند تو ہیں لیکن ترقی پسندوں کا طریقۂ کار انہیں پسند نہیں اسلئے سیاہ یا کالا لفظ ترقی پسند سے اپنی علاحدگی کا اظہار بھی ہے مارکس وادی لوگوں کے نزدیک سرخ رنگ حرارت، طاقت، بغاوت، قوت، عظم وغیرہ کا علامیہ ہے۔باقر اس سے احتراز کرتے ہیں انکے یہاں کالا رسیاہ لفظ سرخ کا نعم البدل بھی ہے اور اس سے تخلیقی انحراف بھی۔چنانچہ خود کہتے ہیں۔

رنگوں کو ڈھونڈلائے علامت کے جال سے
کالے سے لال رنگ کا اظہار کر گئے

باقر مہدی ان معنوں میں نفی کے شاعر ہیں کہ وہ انقلاب کا نعرہ لگا کر ایش ٹبلش منٹ سے کبھی مصافحہ اور کبھی معانقہ کرنے والے ترقی پسندوں کی قلعی کھولنے سے نہیں چوکتے بورژوازی کلچر سے نفرت کا اظہار واعلان کرنے والے جب حکومت کی حلقہ بگوشی میں مصروف نظر آتے ہیں تو باقر قہقہہ لگاتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمہارا دوغلہ پن پکڑا گیا ہے۔

باقر مہدی کی شاعری سے ایک حساس سرکش کا پیکر بنتا ہے۔جو بغاوت اور روایت کے DILEMMA کا شکار ہے۔جسکی سرکشی کا غرور ضعیف باپ کے روبہ رو پگھلنے لگتا ہے (ص ۳۴۴) اس لئے وہ اپنی تمام سرکشی کے باوجود، تمام انحراف کے باوجود ایک اعتراف بھی رکھتا ہے اور شاید یہی اُسے شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

باقر کی نظموں کی بافت توجہ طلب ہے۔ان کے معاصر شعراء میں بافت کا ایسا گہرا شعور کم نظر آتا ہے۔یہ شاید بافت کا شعور ہی تھا جس نے باقر مہدی سے نثری نظموں کے متعلق یہ کہلوایا کہ:

"اُردو میں نثری نظمیں راشد کے فارسی زدہ لب ولہجے کے خلاف ایک ردِ عمل ہیں اور ترسیل کی ایک کوشش ہیں۔ان نظموں میں مروّجہ آزاد نظم کے آہنگ سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور اسی طرح اس یکسانیت کو توڑا گیا ہے جو آزاد نظم کا مقصد رہی ہے (تنقیدی کشمکش۔ص ۱۸۳ تا ۱۸۴)........"

بصری شاعری، آزاد نظم اور نثری نظم دونوں اسی زمرے میں شامل ہیں، میں آہنگ کا احتراز بافت ہی سے مرسل ہو سکتا ہے باقر مہدی نے اپنی نظموں میں یہ کام نہایت حسنِ اُسلوب سے کیا ہے۔

نثری نظم کو ANTI ART ماننے والے باقر مہدی نے غزل جیسے مروّج ومانوس فارم میں بھی بغیر کسی شور وغوغا کے تجربے کئے ہیں اور غزل کے شعر سے جامعیت (QUOTEBILITY) کو حتیٰ الامکان کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگر ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری سے ہٹ کر کوئی شعری رویّہ تلاش کرنا ہو تو باقر مہدی کی شاعری مفید مطلب ثابت ہو سکتی ہے۔

سرورق پر سنگ تراش RODIN کے مجسّے کی تصویر مجموعے کی معنویّت میں اضافہ اور باقر مہدی کی انفرادیت کا اظہار کرتی ہے۔کتابت وطباعت منفرد اور دیدہ زیب ہے۔

ضخامت: ۶۷۳ صفحات ☆ قیمت: ۱۸۰/روپے ☆
مطبوعہ: ۱۹۹۳ء ☆ پتہ: 1 - E، روی درشن، آف کارٹر روڈ، باندرہ (مغربی) ممبئی ۴۰۰۰۵۰ ☆

مبصر: شین کاف نظام

بکھراؤ کا حرفِ آخر

ادیب سُہیل

ادیب سہیل کا مجموعہ "بکھراؤ کا حرفِ آخر" پیشِ نظر ہے کتاب کے ابتدائی صفحات میں فن کار نے "آئینۂ سخن" پروفیسر خورشید بانو نے "حرفِ آخر" اور ناشر سید امام نے "بات سے بات..." کے عنوان کے تحت جو تحریریں پیش

کی ہیں ان سے مجموعے اور صاحبِ مجموعہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ادیب سُہیل نے اپنا ادبی و تخلیقی سفر ترقی پسند تحریک کے اثرات کے تحت شروع کیا لیکن وہ ان چند حساس اور دانشمند اربابِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ ادب میں نظریات کی مہریں نہیں لگانی چاہئیں۔ جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں بحرِ بیکراں بھی جوئے کم آب بن جاتا ہے۔ اب وہ بہت دنوں سے آزاد ہیں۔ نہ وابستگی کی زنجیر ہے نہ تنظیم و تحریک کا کوئی حلقہ ہے جو موئے آتش دیدہ کی طرح فن کار کو جکڑے رہتا ہے۔

پاکستان میں آج لوگ اتباع اور گروہی وفاداری سے ہٹ کر ادبی و تخلیقی کام کر رہے ہیں ان میں ادیب سُہیل کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ایک آزاد قلم کے لئے اپنی بقا اور ہم عصروں میں اپنی پہچان کا مسئلہ ایک چیلنج بھی بن جاتا ہے لیکن ادیب سُہیل نے اس چیلنج کو بخوبی قبول کیا ہے اور گذشتہ کئی دہائیوں میں اپنی ایک باوقار تخلیقی شخصیت قائم کر لی ہے۔

ادیب سُہیل کا ادب سے رشتہ تو بہت پرانا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ تخلیق کے میدان میں اخفائے ذات سے کام لیتے رہے ہیں۔ شعر و ادب کے ذریعے کیریئر بنانے اور حصولِ شہرت کی تگ و دو کرنے سے انہیں للّہی بغض ہے طبیعت کی بے نیازی اور تخلیقی URGE جب دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو آدمی کی شخصیت میں کچھ مخصوص نقوش پیدا ہوتے ہیں عام طور پر ایسی صورت میں فنکارانہ شخصیت مرمر کر زندہ ہوتی ہے۔ تخلیقی اُبال فنکار کو اظہار پر مرکوز کرتا ہے اور بینیازی ادبی حماقت سے دور رہنے پر اصرار کرتی ہے اور یوں فنکار کی شخصیت ہمہ وقت ایک ٹکراؤ سے گذرتی رہتی ہے۔ اسی تصادم کا ایک نتیجہ تو یہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ لکھتا ہے وہ سراسر اسکے دل کی آواز ہوتی ہے جس کا گلا نہیں گھونٹا جاسکتا، جو دبائے نہیں دب سکتی اور غالبؔ کی زبان میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے ۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ادیب سہیل نے شاعری میں جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں معاصر معاشرے کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ شاعری ایک طرف ان کے دل کی آواز ہے تو دوسری طرف ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دکھ درد کی کہانی ہے جنہوں نے دو چند ہجرتوں کی صعوبت برداشت کی اور جن کی پوری دو نسلیں بے یقینی اور جنتگی کے کرب سے دوچار ہوتی رہیں۔ معاشرتی اور تہذیبی سطح پر اپنی باوقار پہچان کا مسئلہ اجتماعی نفسیات کا ایک اہم حصہ ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان نے ان تارکین کی اجتماعی نفسیات میں جو گرہ لگادی ہے وہ کیوں کر کھل سکتی ہے۔؟ یہ سوال آج بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ادیب سہیل کی پوری شاعری پر لسانی اور تہذیبی تصادم کا دلدوز منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فنکار نے متعدد منظومات میں بہیمیت کی ایسی تفصیلات پیش کی ہیں جو ہر صاحبِ دل کو دہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ادیب سہیل نے انسان کشی کے خونی مناظر ہی بیان کئے ہیں بلکہ جنگ و جدال کی نفسیات اور اقوام و ملل کے تنازعات کی فلسفیانہ توجیہ بھی کی ہے اور یوں ان کی شاعری احساس و فکر کا ایک پُر اثر اظہاریہ ہے۔

تاہم میں صرف ایک آدھ نکات پر فن کار سے مکالمہ کرنا چاہتا ہوں ۔ ایک تو یہ کہ شاعری میں DIRECTNES کہاں تک قابلِ قبول ہے ؟ فکری TRANSPARANCY اور بیان کا راست انداز کن معنوں میں مختلف ہیں؟ دوسرے یہ کہ بالکل سامنے کے مناظر کی عکاسی شاعری میں کیا وقعت رکھتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ آنکھوں سے بالکل قریب رکھی ہوئی چیز صحیح طور سے دیکھی بھی نہیں جاسکتی۔ مکانی اور زمانی فاصلے فن کارانہ سطح پر کون سے DIMENSIONS پیدا کرتے ہیں ؟ یہ سوالات میں ادیب سہیل سے کر رہا ہوں، اس لئے کہ وہ ان خطوط پر مجھ سے بہتر غور کر سکتے ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ بکھراؤ کا حرفِ آخر کی شاعری سے ان سوالات کا گہرا تعلق ہے۔

ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۸۰/ روپئے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: اے/۲۰۶، بلاک ۳، گلشنِ اقبال، راشد منہاس روڈ، کراچی (پاکستان)

☆مبصر: علیم اللہ حالی

خموشی بول اٹھی ہے (شاعری)

عبدالاحد سازؔ

"خموشی بول اٹھی ہے" عبدالاحد سازؔ کا ایسا شعری مجموعہ ہے جس میں الفاظ کا جو جہانِ بسیط آباد ہے وہ بے آب و رنگ ، ناظر کا لاتت دار نہیں ، بلکہ الفاظ کی بے کراں زمینوں کی تہوں میں شعلوں کی کاشت کی گئی ہے اور وہ فصل اب سبز قباؤں میں ملبوس ہو کر پڑھنے والے کی بساطِ ذہن کو شادابی سے ہمکنار کر رہی ہے۔

اس کتاب میں پچاس غزلیں ، اڑتالیس نظمیں اور انیس رباعیات ہیں نظموں میں سے بارہ تاثراتی اور چھ ابتدائی عہد کی نظمیں ہیں۔ "خط ترسیل" کے عنوان سے شاعر نے خود ہی پیش لفظ تحریر کیا ہے جس میں اپنے شعری موقف کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ پیش لفظ کے مطالعے سے عبدالاحد سازؔ کے ذہن کی بہت سی تہیں سامنے آجاتی ہیں اس بات کا سُراغ مل جاتا ہے کہ فن کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے۔ کلام کا مطالعہ ان کے شعری موقف کی تصدیق کرتا جاتا ہے۔

"خموشی بول اٹھی ہے" کے سمندر میں جب پہلا قدم پڑتا ہے تو اس گوہر آبدار کی چھوٹ نگاہوں میں بجلیاں بھر دیتی ہیں۔ اپنے قبیلے میں منفرد ہے۔

دیوار نہیں پردۂ فن بند قبا ہے
اک جنبشِ انگشت کہ مہتاب کھلیں گے

بند قبا میں پڑی ہوئی ریشمی گرہوں کو کھولنے کے لئے اگر انگلیوں کی ماہرانہ جنبش درکار ہے تو اس سمندر میں سفر کرنے کے لئے ایسے اعصاب کی بھی ضرورت ہے جو بیکرانی کے منظر سے شکستہ نہ ہوں اور تلاش کے عمل سے پوری طرح واقف ہوں۔ اس خوبی کے ساتھ اگر اس بحر میں اترا جائے تو واقعی احساس ہوتا ہے کہ جب سکوتِ آب صوت و صدا کے پیکر تراشتا ہے تو اس سے کیا الفاظ بساطِ سماعت پر تراوش کرتے ہیں۔

خطوط و رنگ کے روزن سے جھانکنے والے
ذرا کبھی کہ یہ تصویرِ لازوال بنے
سکوتِ بحر میں کس غم کا راز پنہاں تھا
بس ایک موج اٹھی اور آنکھ بھر آئی
یہ عکس عکس تصادم، یہ انجذاب کی دُھن
میں آئینے کی طرف مستقل کھنچاؤ میں ہوں
پہلی کرن کی دھار سے کٹ جائیں گے یہ پَر
اظہار کی اُڑان فقط رات بھر کی ہے

تخلیقیت کی آتشِ تر صرف عبدالاحد سازؔ کی غزلوں میں ہی نہیں بلکہ ان کی نظمیں بھی ایک ایسی ارضِ لامحدود کی طرح ہیں جس کی ہر تہہ میں شعلوں کی سبز قبا فصل لہلہا رہی ہے۔ نظموں میں "متضاد زاوئے، عوج بن عنق، حرفِ موجِ ہوا، نانی اماں کی وفات پر ایک نظم، دل دہی، بے کراں، کہاں جانا ہے اور آخری دور کے انسان" اہم حیثیت رکھتی ہیں۔

"خموشی بول اٹھی ہے" ایک اہم اور خوبصورت کتاب ۔

باقی صفحہ ۴۵ پر دیکھئے

کتاب بازار

انتخاب مضامین ظ انصاری

نگراں: حبیب رضا خان ٥ مرتب: شاہد ندیم ٥ ضخامت: ۳۶۰ صفحات ٥ قیمت: ۱۰۰؍روپے ٥ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: چراغ پبلیکشنز، ۴۴۳؍۱۳۴، تلک نگر، چمبور، ممبئی-۸۹۔

جدید ہندی شاعری

مرتبہ: خورشید اکرم ٥ ضخامت: ۱۴۲ صفحات ٥ قیمت: ۸۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ٥ پتہ: M-7/2، اسٹریٹ نمبر ۶/۶ جوگا بائی ایکسٹینشن، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

یہ زندگی یہ تماشے (پانچ اردو یک بابی ڈرامے)

ڈرامہ نگار: رفعت شمیم ٥ ضخامت: ۱۳۶ صفحات ٥ قیمت: ۱۰۰ روپے ٥ مطبوعہ: اگست ۱۹۹۹ء ٥ پتہ:
135- CHAPLIN RD.WEMBLEY-HAO 4UN (U.K)
فنکار پبلیکشنز، ۷؍ا ے ا۔ ایل آئی جی کالونی کرلا (مغربی) ممبئی ۷۰

آؤ اردو سیکھیں (جدید قاعدہ)

مولفہ: ڈاکٹر ابن کنول ٥ ضخامت: ۶۴ صفحات ٥ قیمت: ۲۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء (تیسرا ایڈیشن) ٥ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۹۷۱۲، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ناز تخیل (شاعری)

تخلیق کار: احسان سہگل ٥ ضخامت: ۴۴۸ صفحات ٥ قیمت: ۲۵۰ روپے ٥ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ٥ پتہ:
VONDELSTRAAT 5,2513-EN,THE HAGUE,HOLLAND
٥ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۳۵، اسلام آباد (پاکستان)

حروف خط کشیدہ (شاعری)

فنکار: ستار صدیقی ٥ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ٥ قیمت: ۱۰۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: ڈریس لین ٹیکسٹائلز، دکان نمبر ۵؍۴؍۷۱-۸-۵ چراغ علی لین، عابڈس، حیدر آباد

سخنہائے گفتنی (ماہنامہ آموزگار کے اداریوں کا انتخاب)

اداریہ نگار: پروفیسر اکبر رحمانی ٥ ضخامت: ۱۲۰ صفحات ٥ قیمت: ۴۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: مکتبہ آموزگار، ۷-۳ بھوانی پیٹھ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں (افسانچے)

افسانہ نگار: عارف خورشید ٥ ضخامت: ۱۰۲ صفحات ٥ قیمت: ۱۷۵ روپے ٥ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: مکان نمبر ۶۷-۱۷-۱ نارائن نگر، جونا بازار، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ادھورے چہرے (افسانے)

افسانہ نگار: دیپک بدکی ٥ ضخامت: ۱۲۲ صفحات ٥ قیمت: ۱۵۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: انٹر نیشنل اردو پبلیکشنز، ۹۲۲۔ کوچہ روہیلا خان دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کانٹوں بھری ہتھیلیاں (شاعری)

شاعرہ: شہلا نگار شمشی ٥ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ٥ قیمت: ۷۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ٥ پتہ: نرالی دنیا پبلیکشنز، ۳۵۸۔ اے، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پہاڑ کاٹتے ہوئے (شاعری)

شاعر: قیصر شمیم ٥ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ٥ قیمت: ۱۲۵؍روپے ٥ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۸ء ٥ پتہ: ۷۷۔ فیئرس لین، فرسٹ فلور، کلکتہ ۷۳ ۰۰۰ ۷

سب کے ہت میں نے لکھی (دوہا، ست سی)

شاعر: اے پی سنگھ ٥ ضخامت: ۸۸ صفحات ٥ قیمت: ۱۰۰ روپے ٥ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: اے پی سنگھ، میسرز جے کے پاورز، شمبھوپورہ، ضلع چتوڑ گڈھ ۳۱۲۶۱۲ (راجستھان)

علمی ادبی اور تہذیبی رسائل

دستاویز۔۹ (عوامی مسائل کی مختلف النوع جہتیں)

ترتیب کار: جابر حسین ٥ ضخامت: ۵۵۸ صفحات ٥ قیمت: ۷۵؍روپے ٥ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ، (بہار)

قصے (ماہنامہ۔ ادب اور احتجاج نمبر)

مدیر: انیس امروہوی ٥ ضخامت: ۳۹۲ صفحات ٥ قیمت: ۲۵؍روپے فی شمارہ ٥ مطبوعہ: ۲؍فروری ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: 104/B، اے۔ بلاک، یاور منزل، لکشمی نگر دہلی ۱۱۰۰۹۲

ارتقاء (جوش سیمینار نمبر)

ادارہ: حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید، محمد علی صدیقی ٥ ضخامت: ۴۸۸ صفحات ٥ قیمت: ۱۰۰؍روپے (پاکستان میں) ٥ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: ۱۰۔ اے، ولایت آباد نمبر۔۲، منگھو پیر روڈ، کراچی ۷۵۰۰ (پاکستان)

عالمی اردو ادب - ۱۹۹۹ء

مرتبہ: نند کشور وکرم ٥ ضخامت: ۳۷۶ صفحات ٥ قیمت: ۲۰۰ روپے ٥ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: J-6، کرشن نگر دہلی ۵۱

رنگ (سہ ماہی)

مدیران: شان بھارتی، راشد انور راشد ٥ ضخامت: ۹۶ صفحات ٥ قیمت: ۱۵؍روپے فی شمارہ ٥ زر سالانہ: ۵۰؍روپے ٥ مطبوعہ: اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: SIJUA، دھنباد ۸۲۸۱۲۱ (بہار)

دستخط (دوماہی)

مدیر اعزازی: اختر بارکپوری ٥ ضخامت: ۹۶ صفحات ٥ قیمت: ۱۰؍روپے فی شمارہ ٥ زر سالانہ: ۵۰؍روپے ٥ مطبوعہ: اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: آؤٹ پوسٹ روڈ، نئی بستی، بارکپور، نارتھ ۲۴ پرگنہ ۷۴۳۱۰۱ (مغربی بنگال)

الریاض جدید (سہ ماہی)

مدیر اعلیٰ: مفتی محمود احمد خاں ندیم قاسمی ٥ ضخامت: ۶۴ صفحات ٥ قیمت: ۱۵؍روپے فی شمارہ ٥ زر سالانہ: ۶۰؍روپے ٥ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: جامعہ ریاض الاسلام، ولی منزل، سرونج، ضلع ودیشہ (ایم پی)

ہم عصر (سہ ماہی)

مدیر اعزازی: اسد فیض ٥ ضخامت: ۸۰ صفحات ٥ قیمت: ۲۵ روپے عام شمارہ ٥ زر سالانہ: ۶۰؍روپے ٥ مطبوعہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: ۶۵ سی، شاہ رکن عالم ہاؤسنگ اسکیم، ملتان ۶۰۶۵۰ (پاکستان)

جامعہ (ابوالکلام آزاد نمبر، جلد اوّل)

مدیر: شمیم حنفی ٥ ضخامت: ۳۱۲ صفحات ٥ قیمت: ۸۰؍روپے ٥ زر سالانہ: ۱۰۰؍روپے ٥ مطبوعہ: جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء ٥ پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵

فیضان (ماہنامہ)

مدیرہ: پروین جاوید ٥ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ٥ قیمت: ۳۵؍روپے فی شمارہ ٥ زر سالانہ: ۳۵۰؍روپے ٥ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: ۳۴۱۔ آر، بلاک ۹، دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاک)

فروغ ادب (سہ ماہی)

مدیر: پرفل کمار دوبے ٥ ضخامت: ۵۶ صفحات ٥ قیمت د روپے ٥ زر سالانہ: ۱۸؍روپے ٥ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: اڑیسہ اردو اکادمی، پریٹن بھون، میوزیم کمپلیکس، بھونیشور ۷۵۱۰۱۴ اڑیسہ

بھوپال ہلچل (ماہنامہ اردو ڈائجسٹ)

مدیر: اقبال بیدار ٥ ضخامت: ۴۰ صفحات ٥ قیمت: ۱۰؍روپے فی شمارہ ٥ زر سالانہ: ۱۰۰؍روپے ٥ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ٥ پتہ: ۹۔ گلشن اقبال، جنسی جہانگیر آباد، بھوپال۔ ۸ (ایم پی)

صدا (ماہنامہ)

مدیر: اقبال مرزا ٥ ضخامت: ۳۸ صفحات (جہازی سائز) ٥ قیمت: ۲۰؍پاؤنڈ سالانہ ٥ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ٥ پتہ:
P O. BOX 630,CROYDON, CR9 2WN (U.K)

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۱واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد — ۷۱
شمارہ — ۶

فون: 3829904

جون — ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	معاونین سے
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکرِ امروز

آج کل ادب برائے ادب کے قدیم نظریے کی تردید و تنقید کی جارہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ادب کا مفاد ملک و قوم کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ میں بھی اس کی تائید میں ہوں۔ وہ ادب ہی نہیں جس سے ملک میں انقلاب پیدا ہو سکے یا جس سے افراد میں بیداری پیدا نہ ہو۔ خیالات کی بلندی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر عالمِ بالا کی باتیں کرنے لگیں اور مافوق الفطرت خیالات موزوں کرکے اپنے غیر انسانی ہونے کا مظاہرۂ فضول کرتے پھریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمارے خیالات میں وہ پستی نہ ہو جو عام طور پر غیر شاعر یا جاہل طبقوں میں پائی جاتی ہے۔ ہم انسان بن کر ہی انسانیت کا درس دے سکتے ہیں۔ مگر انسان بننے کے لئے بلند خیالی اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہے۔ [دستور الاصلاح - ص:۲۰ - مطبوعہ:۱۹۷۰ء، چوتھا ایڈیشن، کراچی (پاکستان)]

سیماب اکبرآبادی

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنی نظموں میں زیادہ تر ہندو دیومالا، بدھ اور یونانی اساطیر کے واقعات اور کرداروں کو علامت بنایا ہے۔ وہ اساطیر اور جدیدیت کے JUXTAPOSITION یا ان کو پہلو بہ پہلو لانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اساطیری کردار اور واقعات ستیہ پال آنند کی نظموں میں جمالیات اور معنویت دونوں پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اساطیر کے سمبل کو انسان کی وجودی کیفیت اور دنیا میں DETROP کے روپ میں نمودار ہونے والے آدمی کی عکاسی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ آدمی جو معاشرے کا حصہ بن کر بھی اکیلا ہے، اور اپنی بے بسی پر قابو پانے کے لئے اس نے دیوتاؤں کی فوج جمع کر رکھی ہے۔ ستیہ پال آنند کی جدید فکر اور اساطیری علامتوں کے JUXTAPOSITION سے تخلیق کی ہوئی نظمیں شعری جمالیات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ علم و فکر کی عمیق سطح پر لے جاتی ہیں ہم ایسے آئینہ خانوں میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں ہم خود اساطیری کردار نظر آنے لگتے ہیں۔

——— ڈاکٹر فہیم اعظمی

دست برگ • وقت لاوقت • آنے والی سحر بند کھڑکی ہے

اور لہو بولتا ہے

کے بعد چار سو سے کچھ زیادہ نظموں کے خالق

ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

مستقبل آ مجھ سے مل

شاعر کی خود نوشت "داستان میرے شعری سفر کی"

کے ساتھ، جو جدید اردو شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی ہے

دیدہ زیب طباعت، گیٹ اپ • سہ رنگ ڈسٹ کور

قیمت ——— ۱۵۰ روپئے

انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز ۹۲۲ کوچہ روہیلا، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

❖

شمارہ ۔ ٦ [جون ۲۰۰۰ء] جلد۔ ۱۷

اردو، اردو، اردو......لیکن عمل؟؟

آج اردو زبان، اس کے رسم الخط اور معاصر شعر و ادب کے بارے میں لکھنا بہت آسان ہے کہ تحریروں کے پشتارے لگے ہوئے ہیں۔ خود شاعر ہی میں گذشتہ ۷۰ سالوں سے لکھا جارہا ہے، بالخصوص آزادی کے کے بعد اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے بارے میں "جرعات" کی اپنی ایک تاریخ بن گئی ہے۔ بیسویں صدی کا نصف آخر ہندوستان میں اردو کے لئے بہت امتحانی رہا ہے اور سخت گذرا ہے۔ آج بھی گمان ویقین کی صورت حال ہے یہ ظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے اور اردو کے نام پر جس طرف بھی نکل جائیے ہمیں ہر شخص اردو کا بے لوث خادم معلوم ہوگا۔ اردو اداروں سے وابستہ افراد تو اردو کے سب سے زیادہ خدمت گذار معلوم ہوں گے۔ لیکن کیا ایسا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، بالکل نہیں ہے، کیوں کہ اردو زبان کے لئے اردو والے عمل کی جن صورتوں سے گزر رہے ہیں اس کے نتائج امید افزا نہیں۔ اردو رسم الخط گم ہو رہا ہے اور اردو بول چال کی زبان بنتی جارہی ہے جسے ہندی رسم الخط سہارا دے رہا ہے اور یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جسے اردو والے سمجھ نہیں پارہے ہیں۔۔۔ ہم اگر اپنی تمام تر سرگرمیوں سے نکل کر باہر دیکھیں اور غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان و ادب کے لئے ہمارے سارے کام کار آمد کم اور فضول زیادہ ہیں۔ بنیادی طور پر ہم نے وہ کام نہیں کئے جو آزادی کے بعد ہی سے ہمیں کرنے چاہئے تھے۔ مگر ہم تو شکایتیں کرنے اور طلب کرنے کی راہوں میں رہ گئے۔ ملک گیر سطح پر کوئی تحریک ایسی نہیں چلائی گئی جو کسی بھی حکومتِ وقت پر دباؤ بنا سکتی۔ یہاں بے شمار شکایتوں کا اعادہ مقصود نہیں کہ ایک کام یہ بھی مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنادیا گیا یا دہلی کی دوسری سرکاری زبان اردو بنادی گئی ہے (پنجابی بھی) تو کیا فرق پڑ گیا یا پڑنے والا ہے۔ اردو والوں نے اپنی زبان کو چلن سے کب جوڑا؟ روٹی روزی سے اس کا رشتہ کب مستحکم کیا؟ عمل کی بنادی صورتوں سے ہم کب گذرے؟ تمام اردو والوں نے رسم الخط اور زبان کی بقا کے لئے باہم کسی ایک لائحۂ عمل کو کب اپنایا؟ ہم نے وہ چھوٹے چھوٹے بنیادی قدم نہیں اٹھائے جو فرد سے ہوتے ہوئے عوام بن جاتے اور وقت کے لئے ناگزیر ہو جاتے۔ شاعر کے "جرعات" میں ان چھوٹے چھوٹے بنیادی کاموں کی طرف بار ہا توجہ مبذول کروائی گئی ہے لیکن ان کی اہمیت کو کبھی بھی نہیں سمجھا گیا۔ کیا ہمارا مسئلہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے ہی کی حد تک ہے؟ کیا ہمیں کچھ اور نہیں کرنا؟

ہم ایک بار پھر ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرف اردو والوں کو متوجہ کر رہے ہیں جو اگر تمام اردو والوں کا روزمرہ بن جائیں تو یقینی طور پر اردو ہندوستان کی دوسری سرکاری زبان بن سکتی ہے کیوں کہ تنہا ہندی زبان کچھ نہیں ہے۔ وہ آج اگر زندہ ہے تو صرف سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب کی سرپرستی بھی حاصل ہے کیا اردو والے یہ بات نہیں سمجھ رہے؟ کیا حکومتِ وقت کو یہ باور نہیں کروایا جارہا ہے کہ ہندوستان کا جو بھی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی تصور ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ہے اس میں ہندی کے ساتھ اردو بھی شامل ہے۔ مگر جی حضوری میں محو، بھیک مانگنے والے، غلام اردو داں حضرات کا مزاج ہی ایسا بن گیا ہے کہ بغیر للیائے ان کی گاڑی ہی نہیں چلتی۔ بہر حال!

"کہنے کو بہت کچھ ہے مگر چپ ہی رہوں گا"

عمل کے چھوٹے چھوٹے قدم کیا ہیں؟ ذرا غور تو کیجئے؟ کیا رسم الخط کے دفاع اور زبان کے فروغ کے لئے ہم اردو والوں کو کسی ملک گیر اجتماعی عملی تحریک کا آغاز نہیں کرنا ہے؟ کیا یہ تحریک ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے نہیں بن سکتی؟

دستخط اردو میں، اپنے پتے اردو میں، اپنے وزیٹنگ کارڈس انگریزی ہندی کے ساتھ اردو میں، اپنے گھر کی نام کی تختی یا اپنا نام اردو میں، بینک چیک اردو میں، اپنی درخواستیں اردو میں، اپنی دکان وغیرہ کے سائن بورڈ اردو میں۔ شادی بیاہ اور تقاریب وغیرہ کے دعوت نامے اردو میں، منی آرڈر فارم، ریلوے رزرویشن فارم، سرکاری درخواستیں اردو میں، خوشیوں کے موقع پر تحفہ اردو کتابوں پر مشتمل ہو، اپنے گھر میں یا آس پڑوس کے کسی ایک بچے کو اردو کی تدریس، اردو کے اخبارات و رسائل کی خرید۔۔۔ یہ اور ایسے ہی بہت سارے چھوٹے چھوٹے قدم ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جاسکتے ہیں۔

آپ کے اختیار میں جو کچھ ہے اور جو آسانی سے ہو سکتا ہے اس پر عمل کا آغاز کیجئے۔ انتظار مت کیجئے۔ عمل کیجئے۔ ہم بھی یہی کر رہے ہیں فرد سے اداروں تک ہماری گذارشات پہنچائیے اور کوشش کیجئے کہ عمل کی یہ صورتیں ملک گیر تحریک بن جائیں۔

یہ تحریک سیاسی بھی ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد سیاست اور مذہب کا شور زیادہ رہا ہے بلکہ ہندوستان کے نام نہاد سیکولرازم کے ساتھ مذہب کو کبھی بھی الگ نہیں رکھا گیا۔ آزادی کے بعد سے ۱۹۹۰ تک جو کچھ بھی ہوا وہ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ ہوا۔ اردو جو واقعی ایک سیکولر زبان ہے [اپنے مزاج اور اپنے عمل کے اعتبار سے بھی] ہمیشہ سے خسارے میں رہی، ملک کی تقسیم کے بعد، سرحد کے اِدھر بھی اور اُدھر بھی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو کا جو تاریخی کردار رہا ہے وہ ہندوستان کی کسی زبان کا نہیں اور اب اردو کے ساتھ صنفِ غزل یہ کام انجام دے رہی ہے۔ اردو اور غزل، دونوں ہی ہندوستان کا فخر ہیں۔ ہمیں اس فخر کو تحریک بنانا ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک، پورے ملک میں جب تک اردو اور مشترکہ تہذیب و تمدن کے دفاع کے لئے کوئی جنگی تحریک نہیں چلائی جائے گی، کام نہیں چلے گا۔ آج احتجاج اور طلب کے اسلوب بدل گئے ہیں۔ ہمارے سامنے اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ۔ آج آدمی سے آدمی کی جنگ زمین اور زبان کے لئے ہو رہی ہے۔ ہم اپنی زبان کے لئے ایک نئی جنگ کا آغاز کب کریں گے؟

اردو ہندوستان ہے اور ہندوستان اردو ہے۔ غزل ایک ایسی طویل ترین شاہراہ ہے جس پر دیگر زبانیں، تہذیبیں سفر کر رہی ہیں۔ اردو تحریک میں شدت سیاسی اور مذہبی انتہا پسندوں کی شدتوں کو کم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔

اردو تحریک، ایک نئی جنگ مگر حکمت، عملی کے ساتھ۔

امتیاز

جون—۲۰۰۰

شمارہ ۵

Birubari
Gauhati
781 016

۳۰ مارچ ۸۰ء

عزیزم افتخار

یہ خط آج اتوار کو صبح ۶ بجے لکھ رہا ہوں۔ رات کو قریب ۴ بجے اعجاز مرحوم نے مجھے خواب میں مطلع کیا کہ آپکے کی سنسکرت ڈکشنری میں انکے کئی خط رکھے ہوئے ہیں۔ میں گھبرا کر اٹھا اور اسی وقت ڈکشنری کی ورق گردانی شروع کرتے ہی منسلکہ پانچ خطوط ملے۔ ۴ خطوط خاص اہمیت سے حامل ہیں۔

ان خطوط کی رسید کا منتظر رہوں گا۔

شمارہ بابت جنوری-فروری ۸۰ء دو دن ہوئے ملا تھا۔ خوب ہے۔

سیماب کا انسان کامل اقبال کے مرد مومن سے بالاتر ہے اگر مواد باہم آجائے تو مضمون کی تکمیل ہو جائے گی۔

تمہارا
رستوگی

منسلکہ ۵ خطوط

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی بنام افتخار امام صدیقی

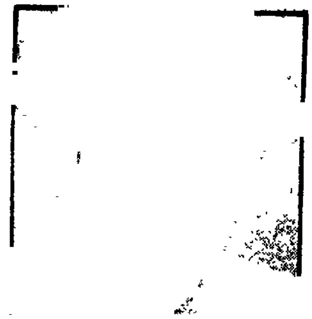
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی[یکم جولائی ۱۹۱۹ء-۵ر فروری ۱۹۹۷ء]ایک ہمہ صفات وہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ علمی وادبی سطح پر انہوں نے ایک بھرپور زندگی کو جیا۔ آنجہانی کے بے شمار خطوط ہمارے پاس محفوظ ہیں اور وہ مکاتیب بھی جن کا ذکر اس خط میں موجود ہے۔ علامہ سیماب کے جس انسان کامل کا ذکر اس خط میں ہے اس کے بارے میں انہوں نے اپنے خطوں اور بعض مضامین میں لکھا بھی ہے۔ ایک خاکہ بھی بنایا تھا۔ وہ کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ علامہ اقبال کے انسان کامل سے کسی تقابل کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ سیماب کا "تصور انسان کامل" مختلف تھا۔ تارا چرن رستوگی پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔[الف الف]

بہ خطِ شاعر

تاج سعید

سوکھے ہوئے پیڑ کو دیکھ کے دل میرا کیوں روتا ہے
جنگل کی خاموشی میں کوئی کنکر چھوڑتا ہے،
چڑیا یاد دلانے میں ناچتی، کیسے مدھر گانے
دل کی دھرتی کا ہر منظر سایوں سا ہوتا ہے!
نیلے امبر پر تاروں کا جھرمٹ روپ دکھاتا ہے
دھرتی کے سینے پر کوئی یاد کے ہار پروتا ہے،
راگ ترانے، بول سہانے، اب کے کام نہیں آتے
سندری کی آواز کا جادو دل میں کوئی بوتا ہے
شبدوں کی تنہائی بےجاب، راس نہیں آتی ہم کو
اس کا نین رس جسم تک میرا رنگ لگا کے جگنو ہے
رستے سونے گلیاں ویراں یہ دنیا کیسی ہے دوست
اس خاموش نگر کا باسی گہری نیند میں سوتا ہے

● "JAREEDA " MAKTABA ARZANG
P.O.BOX NO. 323, PESHAWAR-25000(PAK)



دلنواز صدیقی

لے لیں جو چاہیں وہ سزا لیں مجھ سے
بچ کے وعدہ نہ بچھڑائیں مجھ سے

ہے گراں زیست کا منظر دل پر
اب نہیں اٹھتیں یہ پلکیں مجھ سے

تیرے قدموں کو تو معلوم رہے
کتنے اونچے ہوئے پربت مجھ سے

نازکی میں نہیں پلتے طوفاں
دل میں جو کچھ ہے وہ کہہ دیں مجھ سے

شیشۂ امید ہے ٹوٹا کب کا
چھیڑا کرتی ہیں کرچیں مجھ سے

● 510-RIDGE WOOD RD,
SHIPPINVILLE, PA 16254 (U.S.A)



اسرار اکبرآبادی

جنگلوں جنگلوں تمام ہوا
ڈھل گیا دن سفر تمام ہوا

رنگ دن بھر کی دھوپ کے پی کر
دل تھا روشن چراغِ شام ہوا

وہ اٹھا باغ سے ہرا شعلہ
درد میرا ہوا کے نام ہوا

وقت سب کو مسلتا رہتا ہے
نام ور بھی یہاں انام ہوا

تیرگی میں ہوں روشنی کا کنول
میرا ہونا ترا پیام ہوا

بھیگے ساون میں تم جو یاد آئے
میں گھٹاؤں سے ہم کلام ہوا

دیکھو گم صم سا ہو گیا جنگل
اب چلو گھر کہ وقتِ شام ہوا

راز کیا ہے کہ تو تبسمِ گل
دل میں اسرار کے پیام ہو

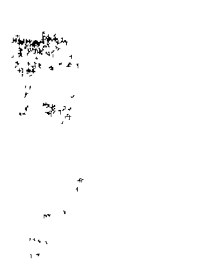
E3-600, ASHOK PARK
SHAHEED NAGAR, AGRA-1 (U.P.)

ادبی تخلیق سچّائی کے بغیر ممکن نہیں ھے

مرتبہ☆ خورشید حیات

● اس بار ادبی فیچر کے تحت افسانہ نگار خورشید حیات کا مرتب کردہ مکالمہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مکالمہ بھی ہے اور مذاکرہ بھی جو کئی سال پیشتر مختلف اصحاب قلم سے بذریعہ مراسلت قائم کیا گیا تھا۔ اس مذاکرے میں بہت سارے نام تھے۔ ان میں سے کئی ایک مرحوم بھی ہوگئے۔ شاعر کے محدود صفحات کے تحت کچھ ناموں کو یہاں شامل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خورشید حیات نے تحریر کیا ہے، تمام مواد کی یکجائی ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے۔
یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ پہلے انسان سے آخری آدمی تک کا یہ موضوع ہے اور ہمیشہ ہی سے زیر بحث آتا رہا ہے کیوں کہ حق کی جستجو اور پھر اس حق کی بے شمار صورتوں سے آدمی کے تجسس کو گذرنا ہی گذرنا ہے۔ حق کو باطل کی کشمکش، سچ کی سفاکیاں، راست بیانیہ، برہنہ گفتاری اور جب ادب کی بات ہوگی تو پھر یہ سچائی ہزار رنگ سے گفتگو کرے گی۔ سچ یا حق تو موجود ہے، قائم ہے اور مسلسل ہے۔ چونکہ یہ ہے لہٰذا اس کا روہی زندگی کا تغیر اور ارتقائی عمل ہے۔ ہاں سے نہیں اور نہیں سے ہاں کی بازگشت میں آدمی سفر کر رہا ہے۔ خدا ہے، یہ ایک سچ ہے لیکن خدا نہیں ہے اسے بھی سچ ثابت کیا گیا ہے۔ سچائی کیا تمام تر اور اک فرد کے اپنے لاشعور، اس کی تربیت اور وجدان پر ہے۔ فن کار کے ہاں یہ سب کچھ ایک عام آدمی سے مختلف ہوگا۔ کوئی بھی فن پارہ، وہ چاہے جس سطح اور جس معیار کا ہو اس میں کہیں نہ کہیں سچ ضرور ہوگا کیوں کہ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ مصنوعی ادب میں بھی سچ کی کار فرمائیاں ہوں گی کیوں کہ کوئی جھوٹ پس پردہ سچ کا التباس بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے تم سے عشق ہے یہ فقرہ سچ بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹ بھی۔ آدمی کی نیت اور اس کی فطرت اس فقرے کو سچ یا جھوٹ کرے گی۔ شعر وادب کا معاملہ بھی یہی ہے۔ بہر حال بحث جاری رہے گی کیا فرماتے ہیں قارئین شاعر اس موضوع کے باب میں؟ [الف الف]

خورشید حیات



جب سے میں نے شعوری طور پر ادب کا مطالعہ شروع کیا تو کئی طرح کی بحثیں اور مختلف النوع حقیقتیں سامنے آئیں۔ کبھی حقیقت نگاری کا مسئلہ آیا تو کبھی رومان پروری نے متاثر کیا۔ آج کی سائنسی دنیا حقائق کی موشگافی کے در پئے ہے۔ لیکن تخیل کی بلند پروازی بھی نئی نئی دنیا منکشف کرتی رہتی ہے۔ ایسے میں مجھ ایسا ادب کا ادنٰی طالب علم کبھی کبھی بڑی اُلجھنوں کا گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ آخر سچائی کیا ہے؟

کیا صرف مادّی حقیقتیں جن کو ہم دیکھتے، چھوتے اور محسوس کرتے ہیں۔ وہی سچائی کے زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں، یا دیدہ حقیقتوں کے علاوہ کچھ نادیدہ حقیقتیں بھی ہیں، جو حقیقتیں تو ہیں مگر سب پر یکساں طور پر منکشف نہیں ہوتیں۔ ایسی حقیقتوں کو ہمہ گیر بننے میں وقت لگتا ہے۔ مگر ہوتی ہیں وہ حقیقتیں! اگر ایسا نہ ہوتا تو سائنسی تھیوری (THEORY) عمل کی صورتوں میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں کرتی۔ بہر حال، یہ تو الگ مسئلہ ہے کہ تخیل کے پردے پر ابھرنے والی سچائی، سچائی ہے یا نہیں؟ پھر اس مسئلے سے منسلک دوسرا مسئلہ بھی سامنے ہے کہ.....

ادبی تخلیق میں سچائی کا کیا رول ہے؟ کیا سچائی کے بغیر ادبی تخلیق ممکن ہے؟؟

کیا نری سچائی ادبی تخلیق کی ضامن بن سکتی ہے یا سچائی کی تخیلی صورتیں بھی ادب کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں؟ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر کسی نہ کسی صورت افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ افلاطون نے تخلیق کا الہیاتی نظریہ پیش کیا۔ ارسطو نے الہیاتی تخلیق اور انسانی تخلیق کا فرق واضح کیا۔ مگر ہر دو نظریہ میں سچائی پر ہی بحث ہوتی رہی۔

دور جدید میں برٹرینڈر سل جیسے فلسفی اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جیسے ناقد نے سچائی کو ادب میں مقام دیا ہے۔ مگر INDIVIDUAL TALENT کو بھی کسی بھی تخلیق کے لئے اسی قدر اہم قرار دیا ہے جس قدر کائنات میں موجودہ حقائق کو۔ پھر بھی ادب کے مفکرین اب تک یہ نہیں طے کر پائے ہیں کہ ادبی تخلیق صرف حقیقت پر مبنی ہے یا ادبی تخلیق کا انحصار صرف رومان پر ہے یا ان دونوں کے آمیزے ہی سے ادب و شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں لاکھ فکر کیجئے ذہن الجھتا ہی جاتا ہے اس لئے میں نے سوچا کہ اس موضوع کو کیوں نہ جدید اذہان کے سامنے لایا جائے اور ان کے افکار و آراء کے انبساط میں ادب کی سمت ور فتار کی کوئی صورت متعین کی جائے۔
جہاں تک میرا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اگر میں یہ سوال رکھوں کہ کیا سچائی کے بغیر کسی قسم کی تخلیق ممکن ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ متفقہ جواب یہی ہوگا کہ سچائی کے بغیر کسی قسم کی تخلیق ممکن نہیں۔ تخلیق بذاتِ خود ایک سچائی ہے جو سچائیوں ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ سچائی سے ہماری مراد کیا ہے؟ سچائی محض متعینہ اصولوں اور ضابطوں کا نام ہے یا ان چیزوں کا نام ہے جن کو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ یا جو چیزیں ہمارے دائرہ محسوسات میں آتی ہیں، یا سچائی نام ہے جس کو عالم گیر سطح پر تسلیم کر لیا جائے۔ اگر سچائی کے محدود معنی اسی حد تک ہیں تو یقیناً صرف سچائی سے ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ اگر ہم سچائی کا پیمانہ ذرا وسیع کر کے دیکھیں اور

ان حقائق کو بھی سچائی تسلیم کریں جن تک ہمارا ذہن اور ہمارا تخیل ہماری رہبری کرتا ہے تو یقیناً ادبی تخلیق سچائی کی بدولت ہوتی ہے۔ تخلیق کے سہارے ، تخیل کے سہارے ہم جن بلندیوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں، جو نیا مضمون خلق کرتے ہیں، جو نئی بات پیدا کرتے ہیں۔ اگر منطقی طور پر یا احساس کے ذریعے دوسرے لوگوں کی بھی رسائی اس منزل تک ہوتی ہے تو ہمیں ان باتوں کو سچ مان لینے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔

اس طرح سچائی کی کئی جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ایک مادّی سچائی جس کو ہم علم طبعیات اور علم کیمیاء کے تجزیے کے سہارے سمجھ پاتے ہیں یا ان کی حقیقت تک پہنچ پاتے ہیں۔ دوسری سچائی وہ مابعد الطبیعاتی سچائی ہے جن کی جانب ہمارا تخیل ہمیں پہونچاتا ہے۔ مگر ان حقائق تک ہم صرف تخیل سے نہیں پہونچتے۔ بلکہ اس میں برسہابرس کے مشاہدے اور تجربے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جسے ہم خارجی دنیا سے ہی اخذ کرتے ہیں جس کو ہمارا INSTINCT قبول کرتا ہے۔ جس کا تجزیہ ہمارا ذہن کرتا ہے اور جس کی حقیقت ہمارا منطقی مزاج اور ذہن متعین کرتا ہے۔ جس کو صوفیوں نے ترک دنیا اور قناعت کی صورت میں حاصل کیا۔ جس کو اقبال کی نگاہوں نے خضر کی آنکھوں سے دیکھا۔ جس کو آرک میڈس نے پانی میں غوطہ لگا کر محسوس کیا۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے گوتم نیلامبر کے مسئلہ تناسخ میں ڈھونڈھا۔ جس کو غیاث احمد گدی نے "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" میں محسوس کیا۔ جس کو احمد یوسف نے "۲۴ گھنٹے کا شہر میں" بھوگا۔ جس کو شوکت حیات نے "درویش" کی صورت میں دیکھا اسی طرح سارا دن دھوپ (غیاث احمد گدی) پرایا گھر (جیلانی بانو) پرندے کی کہانی (انور سجاد) بے سر کا گوتم (رام لعل) قصہ رات کا (انور عظیم) بیک لین ، بے محاورہ (جوگندر پال) اقتدار ، انجام کار ، کالے ناگ کے پجاری (سلام بن رزاق) بانگ ، گھونسلہ، گنبد کے کبوتر (شوکت حیات) نہیں کا سلسلہ ہاں تے ، سفید کوا (حمید سہروردی) تعریف اس خدا کی (شفیع جاوید) کشکول خالی ہے، کاٹھ کے پتلے (انیس رفیع) لہو لہو اندھیرا (مشتاق احمد نوری) خدا کے دستخط (نظام صدیقی) ہوا اور آہنی کیل (علی امام) سورج کا چکر (سیّد محمد اشرف) ٹوٹا ہوا پل، کنواں (م۔ ق۔ خاں) ایک اور طوفان، شاید (فخر الدین عارفی) آگ کی روشنی ، اپنی عدالت (سید احمد قادری) ٹوٹے ہوئے بادل (علی امام نقوی) اللہ پانی دے (نور الحسنین) آتم کھتا (حسین الحق) پس دیوار (عبد الصمد) تلقار مس (سریندر پرکاش) طلوع (ہرچرن چاؤلہ) بچھو گھاٹی، میں ہار نہیں ہوں، کامریڈ (مشرف عالم ذوقی) پوسٹر (قاسم خورشید) انور خاں، رفیع حیدر انجم، اختر واصف، غضنفر، ابن کنول، شاہین نظر اور بہت سارے ساتھیوں کے اہم افسانوں کو شامل کر لیجیے۔ ہندی کہانی کاروں میں کھل جا سم سم (دھیریندر استھانا) لوٹا ہوں ویر وبھائی (شیوال) قلم ہوئے ہاتھ (بلرام) وغیرہ

ان افسانہ نگاروں نے مادّی سچائیوں کے آگے بھی کچھ دیکھا ہے اور اسے انفرادی طور پر اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ اس طرح اپنے قاری کے ذہن کو اس کے محسوسات کو اور اس کے تخیل کو ایک نئی دنیا سے آشنا کیا ہے۔ یہی نئی دنیا جس کو فن کار کی ظاہری آنکھیں نجی طور پر دیکھتی ہیں اور اسے اپنے فن میں اپنے احساس جمال اور اپنے طریقۂ اظہار کے سہارے دنیا کو دکھلانا چاہتی ہیں بعینہٖ دوران عمل یہ اَن دیکھی سچائی عام سطح پر جانی پہچانی جانے لگی ہے۔ فن کار کی یہی شعوری کاوش اسے نت نئے اسلوب کی ایجاد اور طرح نو کی بنیاد رکھنے پر مائل کرتی ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ دیدہ سچائی اور نادیدہ حقیقت جو فن کار کے وجدان میں کسی مخصوص محرک کے ذریعے اچانک نمایاں ہوتی ہے۔ تخلیق کا باعث بنتی ہے۔

میرے ان معروضات کی تصدیق اور بھی ہو جاتی ہے جب فرائڈ خواب کی تھیوری میں تحت الشعور کی باتوں کو حقیقت تسلیم کراتا ہے۔ جب ہم خود کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو نادیدہ حقیقتیں دل و دماغ میں عریاں ہونے لگتی ہیں۔ وہ حقیقتیں عصمت چغتائی کے "لحاف" میں گرم سانسیں لیتی ہیں۔ جو واجدہ تبسم کے یہاں اٹکھیلیاں کرتی ہیں اور منٹو کے ٹھنڈے گوشت میں سراعت کرتی ہیں۔ یہ ساری حقیقتیں ہیں جو کبھی نادیدہ رہی تھیں۔ جن کو تجربے کے خراد پر نہیں پرکھا گیا تھا جن پر مشاہدے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور جن پر تخیل کی دنیا کا ہوا باز مادّی حقیقتوں سے ہٹ کر غور کرتا رہا تھا اس غور و خوض کے نتیجے میں وہ تمام تر ادبی تخلیقات جن کی طرف میں نے اشارہ کیا عالم وجود میں آئیں۔

آج کا خواب کل حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ مائیں جب سولہویں اور سترہویں صدی میں بچوں کو لوریاں دیتی تھیں اور چاند کی خیالی دنیا میں کسی بڑھیا سے تکلی کتاتی تھیں۔ اُس وقت یہ باتیں محض خواب تھیں۔ مگر خواب میں کچھ نہ کچھ سچائی کا عنصر ضرور ہوتا ہے۔ وہی عنصر تجربے پر مجبور کرتا ہے اور تجربہ منزل تک لے جاتا ہے۔
اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ تخیلات، محسوسات اور ادراک کے ذریعے بھی جن حقائق تک انسان کی رسائی ہوتی ہے۔ وہ حقیقتیں ادبی تخلیق کو دلچسپ بھی بناتی ہیں اور پُر اثر بھی اور ان کی ادبیت میں اضافہ بھی کرتی ہیں۔ اس لئے بغیر سچائی کے ادبی تخلیق یا کسی قسم کی تخلیق کا تصور محض کسی مجذوب کی بَڑ ہو سکتی ہے جو کبھی بھی نہ تو ذہن کو روشنی بخش سکتی ہے اور نہ ہی روح کو انبساط۔

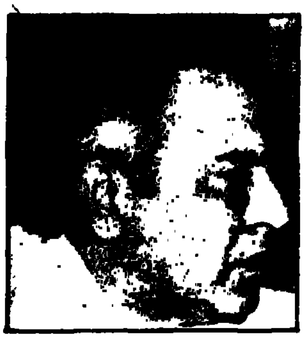
پھر ادبی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ مختلف ادوار میں خواہ شاعری ہو یا نثری تخلیق، سچائیاں مختلف صورتوں میں بھیس بدل بدل کر نمایاں کی گئی ہیں یا نمایاں ہوتی رہی ہیں۔ سچائیاں ہی موضوع بنتی ہیں۔ خواہ وہ سچائیاں مادّی حقیقتوں سے متعلق ہوں یا تخیل کی پیدا کردہ ماورائی حقائق سے۔ ادب کا پیش کرنا ایک فنکاری ہے۔ فن کار کے اپنے تجربے ہوتے ہیں اور ہر فن تجربے کی صداقت پر تصدیق کی مہر لگاتا ہے۔

بہر حال یہ تو ہوئی میری ناقص رائے۔ اس موضوع پر میں نے ادب کے ناقدین، کہانی کار، معلمین اور قارئین کو بھی شامل کیا ہے کہ "ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔" تاکہ اس پر لوگوں کی خاطر خواہ آراء کی روشنی میں بحث کے نئے گوشے نکالے جا سکیں۔

زیرِ بحث موضوع پر میں نے نہ صرف اردو کے اہم ناقدین و افسانہ نگاروں کی گراں قدر آراء کو اس ادبی فیچر میں شامل کیا ہے وہیں اپنی نسل کے اردو ہندی کہانی کاروں کے خیالات جاننے کی بھی سعی کی ہے تاکہ مشترکہ ہندوستانی سماج کے ادبی نظریات بھی سامنے آ سکیں اور ایک بین التقابلی مطالعہ INTER ACTIONAL)

روشن ہو سکیں۔ تمام آراء کی یکجائی تو ایک مکمل کتاب کا لوازمہ ہے تاہم ان میں سے چند ایک یہاں پیش کی جارہی ہیں۔STUDY ☐☐

QRT. NO. 217/T/D, BANGALOW YARD ,BILSAPUR-495004 (M.P.)



گوپی چند نارنگ

سچائی ایک مجرد تصور ہے یا عین ہے۔ جیسے حق، خیر، حُسن، عدل۔۔۔ کسی بھی عین یا قدر کو منطقی زبان میں سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات تو قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نری ادبی سچائی، ادبی تخلیق کی ضامن نہیں بن سکتی۔ لیکن یہ بیان کرنا صرف مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ کس نوع کی سچائی ادبی تخلیق کی ضامن بن سکتی ہے۔ اگرچہ ادب اور حقیقت میں یا ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ ادبی سچائی اور عام سچائی میں بہت فرق ہے۔ یعنی بالعموم ہم جس چیز کو سچائی سمجھتے ہیں وہ ادب میں من و عن بیان نہیں ہوتی۔ اگر سچائی یا سچائی کا تجربہ ہی ادب کی بنیاد ہے۔ لیکن علمی یا سائنسی سچائی ایک چیز ہے، واقعاتی سچائی دوسری چیز، اور ادبی سچائی / تخلیقی سچائی بالکل الگ چیز ہے۔

آپ نے اپنے خط میں "سچائی کی تخلیقی صورتیں" لکھ کر خود اس چور کو پکڑ لیا ہے۔ کیوں کہ فن کار سچائی کو بیان بھی کرتا ہے اور اس کو خلق بھی کرتا ہے۔ اس طرح گویا فنکار اگرچہ سچائی کو زندگی کے تجربے ہی سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن تخلیقی سطح پر اس کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تخلیقی سچائی دراصل عام سچائی نہیں۔ لیکن وہ سچائی کا التباس پیدا کرتی ہے، اس لئے سچائی ہے۔ اور سچائی کا التباس پیدا کرنا فن کی عمل آوری ہے۔ چنانچہ جتنی فن میں قوت ہوگی اتنی ہی تخلیقی سچائی تہہ دار اور معنی خیز ہوگی کوئی بھی ادب تخلیقی سچائی کی حسن کاری اور معنی خیزی سے بڑا ادب بنتا ہے۔ ورنہ عام سچائی اخبار کے صفحات یا علمی کتابوں میں موجود ہے۔ عام سچائی کو بیان کرنے کے لئے ادب یا آرٹ کی ضرورت نہیں۔ ادب اور آرٹ کا جواز یہی ہے کہ اس میں عام سچائی عام سچائی نہ رہے بلکہ سحر کاری کا کام کرے۔ ☐☐

● D-252 , SARVODHAYA ENCLAVE NEW DELHI -110017

عبد المغنی



ادب بہر حال زندگی کا آئینہ ہے۔ اس کے علاوہ ادب کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ زندگی کی تزئین کرے۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ سچائیوں کو ملحوظ رکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ سچائی ایک بہت وسیع لفظ ہے لیکن یہ زندگی کی ایک بنیادی قدر ہے۔ جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سچائی سچائی ہے۔ چاہے اس کو توڑنے مروڑنے کی جتنی بھی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ادب میں کچھ لوگوں نے سچائی کے ایسے تصورات بھی پیش کئے ہیں جنہیں مطلقاً سچائی کہنا مشکل ہے۔ کیٹس کا مشہور قول ہے کہ "سچائی خوبصورتی ہے اور خوبصورتی سچائی۔" اس قول میں سچائی اور خوبصورتی کو ایک دوسرے کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ بڑی اچھی بات لگتی ہے لیکن اس میں ایک دھوکا ہے جو خود کیٹس نے کھایا اور دوسروں کو دیا۔ سچائی تو یقیناً خوبصورتی ہے۔ لیکن کیا ہر خوبصورتی سچائی ہے؟ مثال کے طور پر کیا طوائف کے حسن کو سچائی کہا جاسکتا ہے؟ اس کے برخلاف اقبال نے کہا ہے ۔

حُسن آئینہ حق دل آئینہ حُسن

اس شعر میں حُسن اور حق کو بالکل مترادف نہیں بتایا گیا ہے۔ حُسن اپنی جگہ ہے اور حق اپنی جگہ ہے۔ لیکن حُسن کو آئینہ حق قرار دے کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حُسن کے اندر حق کی عکاسی ہونی چاہئے یعنی خوبصورتی صحیح معنی میں وہی خوبصورتی ہے جس میں سچائی بھی ہو۔ ایسی خوبصورتی بدصورتی سے بدتر ہے جو سچائی سے خالی ہو لہٰذا ادب اپنی خوبصورتی کو اسی وقت برقرار رکھ سکتا ہے۔ جب وہ سچائی کا حامل ہو۔☐☐

● PROF. QRTS.SCINCE COLLEGE COMPOUND PATNA-5

احمد یوسف

ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

TRUTH سچائی کے سلسلے میں ہمیں CHAMBERS بتاتی ہے۔

(۱) حقیقتوں سے مفاہمت (۲) عقیدت مندی (فنون لطیفہ کے تعلق سے فطرت کے ساتھ ایک عقیدت مندانہ لگاؤ

اور حقیقتیں کیا ہیں؟

ظاہر ہے کہ جب حقیقتوں کی بات آتی ہے تو ہم آسمان، چاند، ستارے، خلا کے بے پایاں حُسن۔ نظام شمسی اور ان سے پرے نظام ہائے شمسی کی بات نہیں کرتے بلکہ ٹھوس اپنی دنیا اور اپنی زمین کی باتیں کرتے ہیں۔ جہاں سچ یہ

ہے کہ آدمی پیدا ہوتا ہے۔ پڑھتا ہے۔ لکھتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے اور عمل کی دنیا میں آتا ہے۔ موافقتوں سے خوش ہوتا ہے، مخالفتوں سے دل شکستہ ہوتا ہے۔ جیالا ہوا تو اس سے نبرد آزمائی کی سوچتا ہے۔ ورنہ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اطراف و جوانب میں دیکھتا ہے تو افراد کے درمیان قدروں کا فرق اسے سخت اچنبھے میں ڈالتا ہے۔ پھر اسے پتہ چلتا ہے کہ قد طویل ہوا تو لوا سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور قد چھوٹا ہے تو لوا سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اول الذکر کا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر جاتا ہے اور دوسرا تقریباً بھوکا ہی رہتا ہے۔

پھر یہ دیکھئے کہ الف کے ہاتھوں میں ساری معیشت ہے۔ وہ فرد + فرد + فرد سے کہتا ہے۔ سرمایہ میرا ہے، تمہارے پاس کیا ہے؟ صرف دست و بازو؟ فرد + فرد + فرد کے پاس ان باتوں کا صحیح جواب نہیں ہے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ـــــ اور اگر دست و بازو نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔؟ جس دن اُنہوں نے یہ جواب دیا اسی دن ہم عظیم تبدیلیوں کی سمت نکل کھڑے ہوں گے۔ کاروبار زیست اسی طرح چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا۔ ہم شر سے خیر کا سفر کرتے ہیں کچھ دیر قیام کرتے ہیں۔ پھر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ "خیر" تضادات کا شکار ہو گیا اور ہم آپ ہی آپ غیر ارادی طور پر "شر" کی راہ پر نکل کھڑے ہوئے اور جب شر کے اندر بھی تصادم کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک بار پھر خیر کی جانب۔ تو یہ رہیں ہماری ارضی سچائیاں۔ تو کیا ادب صرف ان ہی سچائیوں کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے؟ غالباً ایسا نہیں ہے کیوں کہ اگر فی الواقع ایسا ہی ہوتا تو پھر ہمیں ادب میں اکہری سچائیاں ہی نظر آتیں۔ سوچتے سوچتے آخر ہم اُس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ نہیں ادبی سچائیاں کچھ اور ہی ہوتی ہیں، سامنے کی سچائیوں سے کچھ فاصلے پر کچھ اور بھی سچائیاں ہیں۔ جن کی تلاش کرنا اور پھر انہیں اپنی گرفت میں لینا ہر باضمیر ادیب کا فرض ہو جاتا ہے۔ "اوور کوٹ" کو لیجئے۔ کلرک کا اوور کوٹ جب کچھ بد معاشوں نے چھین لیا تو اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے وہ کہاں کہاں نہیں دوڑا اور کیا کیا جتن اس نے نہیں کئے، لیکن ہر جگہ اسے ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑا اور جب وہ اذیتیں اٹھا کر مر جاتا ہے تو گوگول اسے روسی ضمیر کی موت سے تعبیر کرتا ہے اور ایک عرصے تک اس کی پریشان حال روح ارباب اقتدار سے، جنہوں نے اسے انصاف سے محروم رکھا تھا، انتقام لیتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح چیخوف ایک افسانے میں (عنوان یاد نہیں آرہا ہے) جب دو یتیم بچے گھر سے بے گھر کر دیئے جاتے ہیں اور ایک یخ بستہ رات میں لحاف کے اندر ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں تو ان کی بے چین روحیں لحاف میں بس جاتی ہیں ـــــ "بھائی تمہیں ٹھنڈک تو نہیں لگ رہی ہے۔ بھائی تمہیں ٹھنڈک تو نہیں لگ رہی ہے۔" شکیب جلالی کا شعر لیجئے۔

آکر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

وہ پرندہ تو اپنی جان سے گیا۔ لیکن اس ظلم و بربریت کی داستان تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہو گئی اور کل کے دن لوگ اسے پڑھیں گے، اور یہ کل پھیل کر ہزاروں سال تک چلا جا سکتا ہے۔

بیدی نے "ایک چادر میلی سی" میں ایک ایسی زندگی پیش کی ہے۔ جہاں قبائلی رسم و رواج اور قبائلی جبلتوں کا آج بھی دور دورہ ہے۔ تلوکا کا قاتل جب سزا کاٹ کر آتا ہے تو وہ منگل سے بڑی کا رشتہ مانگتا ہے یہاں بیدی یہ کہنا چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ قبائلی رسم و رواج تو ختم ہو۔ ان قبائلی جبلتوں سے تو انسان کا پیچھا چھوٹے ورنہ قبائلی زندگی میں تو قتل غارت گری کا ایک سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

تو ادبی سچائیاں دراصل وہ نہیں ہیں جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ آگے کی سچائیاں ہیں یہ وہ بصیرتیں ہیں جس سے انسانی تہذیب نشو نما پاتی ہے۔☐☐

● COMMERCIAL EMPORIAM, SADAR GALI, PATNA-800008(BIHAR)

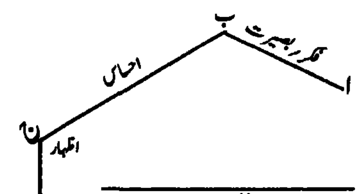
علیم اللہ حالی



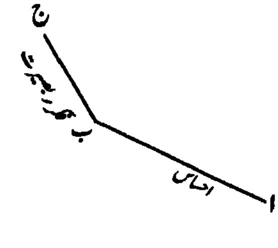
اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں" مگر یہ قضیہ اتنا سادا بھی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سچائی کے لئے صرف ادبی تخلیق کی تخصیص و تحدید نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ سچائی سے اٹوٹ تعلق تو ان بڑے کاموں کے لئے بھی ضروری ہے جو ادبی تخلیق کے زمرے سے باہر ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سچ ہے کیا بلا؟ اس کی پہچان کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس کا عرفان کیسے حاصل ہو سکتا ہے، اس کے اظہارات کیا ہو سکتے ہیں، ادبی تخلیق میں سچ کا عمل دخل کس حد تک ہے۔ سوال سے سوال پیدا ہوتا جاتا ہے، ان سبھوں کو سمیٹنا بھی آسان نہیں۔ اس لئے میں تو یہ کہوں گا کہ آپ نے شرکائے مباحثہ کو بری طرح پھنسا دیا ہے، آپ کا قضیہ سادہ لگتا ہے مگر کوئی مخلصانہ فکر کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے تو نئی الجھنیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور اس کے لئے ان سارے پیچیدہ سوالات سے نمٹنا آسان نہیں۔ میرے لئے دعا کیجئے کہ اس راہِ پُر خطر سے کامیابی کے ساتھ نکل آؤں، چل رے خامہ بسم اللہ۔

سچ کی تعریف و توضیح کے بغیر مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں کوئی بات تیقن کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ جس طرح MONEY کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ MONEY IS WHAT MONEY DOES اس طرح اپنے عجز بیان و فکر پر پردہ ڈالنے کے لئے اگر میں یہ کہوں کہ سچ وہ ہے جو سچ ہے یا سچ خیر کا دوسرا نام ہے تو آپ مطمئن نہیں ہوں گے۔ اس لئے اس مسئلے میں تھوڑی سی وضاحت درکار ہے سچ کے خارجی وجود کا ثبوت مشکل ہے اسی وجہ سے میں سرے سے اس بات کا قائل ہوں کہ سچائی ایک نہیں انیک ہے۔ اپنی نظم "یہ بھی سچ وہ بھی سچ" میں میں نے اسی فکر کو موضوع بنایا ہے۔ جب دور تک سوچتا ہوں تو اس نتیجے تک پہنچتا ہوں کہ انسان اپنے حواس خمسہ سے جب سچ کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ TRAGMENTATION انداز میں ہم تک پہنچتا ہے، اسی لئے ہم جھگڑا کرنے لگتے ہیں کہ یہی سچ ہے وہ سچ نہیں جب کہ دوسرا

فرد اس کی ضد پر اصرار کرتا ہے۔ یہ کتنا بڑا CONFUSION ہے۔ حق کا عرفان عام اذہان سے بالاتر ہے اب ایسی حالت میں ہم ادبی تخلیق میں سچائی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سچائی کی حدود کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اپنے مخصوص نظریات کو سچائی کا نام دینا ایک زبردست خوش فہمی ہے اور اس خوش فہمی میں ہمارے مفکرین ادب اکثر و بیشتر گرفتار رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے سچائی کو اپنے تصورات کا غلام بنادیا۔ اشتراکی ادب کے ہمنوا اشتراکی خیالات و نظریات کو ہی شعر و ادب کی سب سے بڑی سچائی سمجھنے لگے۔ اسلامی ادب کی بات کرنے والوں نے اسلام کے اصول و ضوابط کی تشہیر کو شعر و ادب کا مقصد مان لیا اور اس طرح کے بہت سے اسکول پیدا ہوگئے۔ اب آپ بتایئے کہ سچائی آخر رہی کہاں ؟ ردِ عمل یہ ہوا کہ NON-COMMITMENT پر زور دیا جانے لگا مگر اس نام پر انتشار، بے معنویت، مہملیت اور غیر تخلیقی توڑ پھوڑ کا ایسا طوفان کا ازار اٹھا کہ خدا کی پناہ۔ اس افراتفری میں سچائی اور ادبی تخلیق کے تعلق اور اس کی نوعیت کے سلسلے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہر جنوئن فنکار اپنے ذہن و دل میں سچائی کا ایک مرتب یا غیر مرتب خاکہ رکھتا ہے۔ آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ غلط سوچتا ہے یا سچائی وہ نہیں ہے جو وہ ظاہر کرتا ہے۔ ادبی تخلیق میں سچائی کا انحصار موضوع فکر پر نہیں اس کے انداز اظہار پر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کسی مسئلے کو فن کار نے کس طرح بیان کیا ہے۔ اس کے بیان میں کشش ، دلکشی، تاثیر اور واقعاتی مطابقت ہی اس امر کا مظہر ہیں کہ اس کے فن پارے میں سچائی موجود ہو۔ شعری تخلیقی عمل میں فن کار فکر کو احساس کی سطح پر لے آتا ہے اور اس کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ قاری پہلے احساس کی دولت حاصل کرتا ہے اور پھر فکر سے منور ہوتا ہے۔ اس تخلیقی عمل اور قاری و فن کار کے رشتے کا نقشہ یوں بنایا جاسکتا ہے۔



فنکار



قاری/سامع

آیئے اس نقشے پر تھوڑی گفتگو کرلیں۔ فنکار کے حصے میں فکر، احساس، اور اظہار تین خطوط ہیں۔ فکر کا خط بتدریج اوپر بڑھتا ہے اور "ب" تک پہنچ کر قدرے نیچے اتر کر احساس کی طرف چلتا ہے۔ نقشے میں فکر کی لمبائی احساس کے مقابلے میں کم ہے، احساس زیادہ مدت تک قائم رہتا ہے اور یکایک اظہار میں آجاتا ہے۔ اب قاری یا سامع والا خاکہ دیکھیں، فن پارے سے قاری یا سامع پہلی جو شئے حاصل کرتا ہے وہ احساس ہے، احساس میں تدریجی طور پر رفعت پیدا ہوتی ہے اور یہ انتہا پر پہنچ کر فکر کی منزل میں چلا جاتا ہے۔ خطوط کے نشیب و فراز اور ان کے طول واختصار نیز زاویوں کے تناسب سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ادبی تخلیق میں انتقال احساس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، مگر ادبی فن پارے کی تکمیل فکر یا بصیرت پر ہوتی ہے۔ یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ فکر، بصیرت یا WISDOM بنے بنائے اصول، نظریات، ضوابط، مسلمات، تصورات یا معتقدات کا رہین نہیں ہوتا۔ عظیم تخلیقات میں بصیرت ان سبھوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سچائی کو کسی چوکھٹے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچا ادب وہی ہے جس میں ماحول کے خارجی نقوش کا عکس ہو اور جو عصری واقعات و واردات کا ترجمان ہو۔ اردو کے ایک مشہور نقاد نے تاریخی بصیرت پر زور دیا ہے اور اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے وہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ فن کار مادّی تغیرات کا جائزہ لے کر اپنے عہد و ماحول کو کامیابی کے ساتھ پیش کرے۔ یہ مسئلہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تخلیقی ادب نہ تاریخ ہے، نہ پولس اسٹیشن کی F.I.R. جہاں واقعات و واردات کی خارجی اصلیت پر زور دیا جاتا ہے۔ ان سچائیوں سے تخلیقی ادب کی رشتہ داری نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر غزل کی صنف کو لیجئے اس میں حدیث دیگراں سے زیادہ حادثۂ دیدہ و دل کی باتیں ہوتی ہیں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی بے بادہ و ساغر نہیں ہوسکتی۔ غزل کی دل نشینی کی ایک دنیا قائل ہے۔ غزل کا شاعر باہر کی فضاؤں سے اس قدر متحرک نہیں ہوتا جتنا خود اپنے نہاں خانۂ دل میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں ڈوب کر سُراغ زندگی پاتا ہے۔ اس کے یہاں سچائی کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے محسوسات و جذبات کو اس طرح بیان کرے کہ دوسرے بھی ان ہی کیفیات سے دوچار ہوجائیں۔ اس لئے سماجی حقیقت نگاری، سیاسی بصیرت عصری میلانات و واردات کی اصطلاحیں تخلیقی ادب کو سچائی سے دور کرکے COMMITMENT سے نزدیک کرتی ہیں۔ خارجی نظریات کے لئے وفاداری کا حلف ادب کو پیغام، انقلاب، اصلاح وغیرہ تو سکھا سکتا ہے مگر سچائی کی ضمانت نہیں دے سکتا لہٰذا تخلیقی ادب کے لئے مانگی ہوئی سچائی کی ضرورت نہیں۔ اس سچائی کی جڑیں فن کار کی ذات میں موجود رہتی ہیں اور اس کا اظہار اس کے وہ فن پارے ہوتے ہیں جنہیں وہ مقدس ارتکاز، انتھک لگن اور اٹوٹ جذبے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ☐☐

● WHITE HOUSE COMPOUND , GAYA (BIHAR)

شوکت حیات



میں اس مفروضے کے حق میں ہوں لیکن جو لفظ ساری پریشانیوں کی جڑ ہے وہ ہے "سچائی"۔ یہ بڑا ظالم لفظ ہے ۔۔۔ دنیا ایک زمانے سے سچائی کی جستجو میں سرگرداں ہے ازل سے اب تک فرد اسی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ سارے مذاہب، علوم وفنون، ساری تگ ودو، انسان کی اسی صحرا نوردی کا نتیجہ ہیں۔ انسان ذات سے کائنات اور کائنات سے ذات تک کے مختلف چکر کاٹ رہا ہے۔ پانی کی تلاش میں دھوپ میں تپتا اور لہولہان ہوتا ہوا مسلسل سفر میں ہے اور ہر بار اسے سراب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سچائی کی اسی تلاش کے دوران مذہب، تاریخ، سیاست، سماج، ادب، فزکس، کیمسٹری، بائلوجی جیسے کتنے سارے پہلو اور راستے بن گئے۔ لیکن ابھی تک مکمل طور پر سچائی کسی کے ہاتھ نہیں آئی شاید فطرت کے ارتقائی قوانین کا یہی تقاضا بھی ہے سچائی تک رسائی اتنی آسان ہوتی تو سناتن دھرم کے بعد اتنے سارے مذاہب کی ضرورت نہ تھی، رشی، منیوں، پیغمبروں، ولیوں اور دانشوروں کے سلسلوں کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر خدا پرست مذہبی نقطۂ نظر سے سوچئے تو خدا کی ازلی حقیقت ہی سچائی ٹھہرتی ہے۔ باقی سب کچھ اس کے عکس اور پرتو۔ سناتن دھرم میں اسے آدمی سناتن اسار ستیہ یا برہمیہ ستیہ کہتے ہیں۔ باقی سب کو موہ مایا سے تعبیر کرتے ہیں۔ سائنسی نقطۂ نظر سے سچ اور صداقت کے معیار اضافی ہیں۔ صداقت اور اقدار کی کوئی ایسی ٹھوس کسوٹی ایجاد نہیں ہو سکی جو زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہو۔

میں چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں اس لئے سچائی کی تحدید کے لئے میری سچائی شاید یہی ہے کہ اگر کچھ کہنا ہے تو اسی صنف کے حوالے سے کہوں۔ حالانکہ یہ بھی ایک مشکل کام ہے۔ قطعیت کے ساتھ ادبی تخلیق کے سلسلے میں کچھ کہنا بے حد دشوار ہے افسانہ نگار کے نزدیک سچائی معروضی اور موضوعی دونوں ہوتی ہے۔ معروض کی سچائی جب اس کے باطن کی بھٹی میں تپ کر سامنے آتی ہے تو ارتقاء کے پراسس سے گذرنے کے بعد اس کی SUBJECTIVE TRUTH بن جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ موضوعی حقیقت اپنے اندر گہرائی اور ابعاد سمیٹ کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتی ہے تو دوسروں کی حقیقت بننے کی متحمل ہو جاتی ہے۔ یعنی معروضی حقیقت، موضوعی حقیقت سے گذر کر اور زیادہ بڑی اور متنوع معروضی حقیقت میں پھیلنے کی طاقت حاصل کرتی ہے۔ لیکن سوال اٹھایا جاتا ہے کہ افسانہ نگار کے مشاہدے کی سچائی اپنی تخلیقی شکل وصورت میں مشاہدے کی سچائی کا ہی روپ رہتی ہے؟ یا بدلی ہوئی صورت میں بالکل ایک نئی دنیا سامنے لاتی ہے؟ تو کیا چونکہ اس کا روپ بدلا ہوا ہے اس لئے وہ سچائی نہیں ہے؟ یا یہی اس کے سچ ہونے کا ثبوت ہے؟ یا سچائی کا پرتو ہے؟ جھوٹ ہے؟ کیا جو سچ نہیں ہے؛ جھوٹ ہی ہو سکتا ہے!؟ کمتر یا مختلف سچ نہیں ہو سکتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ تخلیقی ادب میں کچھ جھوٹ نہیں ہوتا!!!

کیا پریم چند نے جس کفن کو دیکھ کر "کفن" لکھنے کی ترغیب حاصل کی وہ صرف اور صرف وہی کفن ہے جس کو انہوں نے دیکھا۔ یا اس کی تصویر ہے۔ یا کفن کو ارتقاع کے مراحل سے گذارتے ہوئے اسے دوسرے معنوں میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش نہیں ہے؟ تو کیا کفن موت کا استعارہ نہیں بلکہ غربت اور افلاس کی تمثیل ہے؟ لیکن اب تک تو ہم کفن کا مفہوم صرف آدمی کی لاش اور جنازے سے وابستہ کرتے تھے۔ سچائی یہ ہے کہ کفن اپنے آپ میں کفن یا کفن کی تصویر رنقل ہوتے ہوئے بھی اور بہت کچھ ہے۔ اور یہی "بہت کچھ ہونے" کا احساس اور دائرہ ہی دراصل افسانہ نگار کی سچائی ہے۔ اعلیٰ تخلیق ہونے کی شناخت اور اس کے منفرد اور مختص ہونے کی پہچان ہے۔ اور یہی "اور بھی بہت کچھ ہونے" کا احساس ہی افسانے کو ایک انوکھی اور ہمہ جہت سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے۔ اور یہی "بہت کچھ ہونا" ہی اس کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ افسانہ نگار اور افسانے کی سچائی میرے نزدیک یہی ہے کہ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کو اپنی فکر، تیور، لہجے اور تخلیقی پراسس کے مراحل سے گذار کر ممکنہ وسعت اور تنوع کے ساتھ گہری سچائی کی بدلی ہوئی صورت رصورتوں میں پیش کردے۔ آدمی کے کفن کو صرف کفن نہیں بلکہ آدمیت اور DEHUMANASATION کے بھیانک سوال کی وسعت عطا کردے۔۔۔ کچھ لوگ انہیں جھوٹ، مبالغہ اور بناوٹ کہہ سکتے ہیں اور یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ادبی تخلیق سچائی کے بغیر بھی ممکن ہے۔ لیکن میں انہیں سچ کی مختلف سطحیں کہوں گا کیوں کہ تمام مفاہیم اپنی اپنی جگہ سچ ہیں۔

ایک اور مثال دوں گا۔ غیاث احمد گدی کی "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" کیا کوئی ایسی ٹھوس اور قطعی گاڑی ہے جس کا نظارہ غیاث احمد گدی نے کیا اگر کوئی ٹھوس گاڑی ہی ہے تو غیاث احمد گدی کی افسانوی بصارت نے اسے کیا اسی طرح قبول کیا؟ اگر من وعن قبول کیا تو تخلیقی مراحل سے گذرنے کے بعد وہ ہوبہو اسی گاڑی کی صورت میں بروئے کار آئی؟ اگر سرتاسر تخیلی ہے تو اس کے تمام تر لوازمات ہمارے گردونواح کی اصلی دنیا سے مشابہت کیوں رکھتے ہیں؟ اور اس کے باجود کلی طور پر کسی ایک گاڑی پر منطبق نہ ہو کر الگ الگ سے کیوں ہیں؟ ظاہر ہے ان کا جواب کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ ان تمام منزلوں میں چشم دید گواہ کی حیثیت صرف اور صرف غیاث احمد گدی کی ہے۔ اور غیاث احمد گدی اپنے تخلیقی لمحوں سے گذرنے کے بعد پھر اس حالت میں واپس نہیں لوٹ سکتے۔ اس لئے ان کی گواہی بھی قابل قبول نہیں۔ (ویسے بھی وہ عظیم فن کار اب ہمارے درمیان نہیں) فن کار کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے مخصوص تخلیقی لمحوں میں دوبارہ لوٹ سکے۔ لہٰذا کسی کا بیان قابل اعتنا نہیں ٹھہرے گا۔ پتہ یہ چلا کہ ان سوالوں پر بحث ہی لاحاصل ہے کیوں کہ ہم ان پہلوؤں سے کسی واضح اور ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

تب یہی سوچنا بہتر ہے کہ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" جبر واستبداد کی علامت ہو یا فرد کی ذہنی آزادی کی حکایت؛ یہاں بھی مشاہدے کا پھیلاؤ ہوا ہے اور منظر کو قطعی اور ٹھوس روپ دینے کے باوجود اسے نئی سطحوں پر لا کر اس کے "بہت کچھ ہونے" کا احساس کرایا گیا ہے۔ جہاں حقیقت اور زیادہ گہری اور جانکاہ حقیقت کی صورت اختیار

کر گئی ہے۔ ہمارے نزدیک "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" کسی عام گاڑی سے زیادہ معنی خیز اور اہم ہو گئی ہے۔ اسی لئے ہم اسے اردو کے چند اہم افسانوں میں شامل کرتے ہیں۔ اب یہ گاڑی مصنوعی ہی سہی، اصل گاڑی کی پرچھائیں ہی سہی لیکن اصل گاڑی سے زیادہ اہم، وقیع، سچی اور اصلی ہے۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فکشن اور افسانے اپنے لغوی معنوں میں جھوٹ اور دروغ گوئی کی بات کرتے ہیں۔ ایسا فریب اور رومان جسے سنا کر دادی نانیاں بچوں کو سلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے اور بعد کے بہت سے افسانہ نگاروں نے لوگوں کو سلایا ہے۔ کچھ لوگ ابھی بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو ایسی آگہی سے دوچار کرنا کہ ان کی نیند ٹوٹے اور وہ نئے سرے سے اپنے عہد اور اپنے وجود کا تخلیقی ادراک حاصل کر سکیں یہی آج کی سچائی ہو سکتی ہے اور تخلیق کا سبب بھی۔ کیا تخلیق کی غیر قطعی اور لامحدود دنیا ہیکو سچائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ آپ نے سچائی کی وضاحت نہیں کی ہے اس لئے اب آپ ہی جواب دیجئے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ سچائی کو افسانہ نگار اپنے اپنے زاویے سے دیکھتا ہے۔ اپنے پہلو سے جائزہ لیتا ہے۔ کسی کے لئے سچائی نفسیاتی حوالے سے مقدم ٹھہرتی ہے۔ کوئی اسے سیاسی اور سماجی حوالے سے دریافت کرتا ہے۔ کوئی اسے عصری حسیت اور آفاقی قدروں کت ترازو پر تولتا ہے۔ کوئی اپنے خمیر کو پیمانہ بناتا ہے۔ کوئی اسے بیک وقت ان تمام ہمہ جہت پہلوؤں سے پرکھنے، سمجھنے اور برتنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے سچائی سے زیادہ اہم دراصل افسانہ نگار کا نقطۂ نظر، VISION اور ضمیر ہے۔ اور شاید وہی اس کی اصلی سچائی اور ایمانداری ہے : جو افسانے کی تخلیق کے لئے لازم ہے۔ □□

● DR.MAHABIR BHAWAN, MAHENDRU, PATNA-800006(BIHAR)

رفیع حیدر انجم



کیسی سچائی؟ آپ کہیں گے، بات "ادبی تخلیق" کی ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ ادبی سچائی۔ لیکن ایک سچائی تو مرد اور عورت کا فطری جنسی عمل بھی ہے۔ ایک نوجوان پاگل عورت دن کو سڑکوں پر ننگی پھرتی ہے۔ وہی رات کو کسی شریف کہلائے جانے والے شخص کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ بھرے پُرے بازار میں اور بارونق سڑکوں پر کتوں کا ایک جوڑا اپنے اردگرد کے ماحول سے بے پرواہ جنسی فعل میں مشغول رہتا ہے۔ بچے اس پر پتھر پھینکتے ہیں۔ مرد و عورت، ادھیڑ عمر اور بوڑھے زیر لب مسکراتے ہیں یا حقارت سے اپنی نگاہیں چراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسی دم ایک سپاہی تمباکو کو چٹکیوں سے ملتا ایک بھدی سی گالی دیتا ہوا گذر جاتا ہے۔ قریب ہی بکرے کی گردن پر چھری چلاتا ہوا ایک قصاب معیاری گالیوں کی قسمیں بیان کرتا ہے۔ سنیما ہال کی بھیڑ میں رنڈیوں اور لونڈوں پر فقرے کسنے والا آدمی کسی ادبی اور تہذیبی محفل میں صدر بنا ہوا نظر آتا ہے۔ پیخانے کی چھت سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں غلاظت میں گرتی ہیں۔ چھینٹے اُڑتے ہیں۔ بدبو پھیلتی ہے اور نالیوں سے نکل کر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آنگن میں سفید سفید کیڑے ہماری روزانہ کی سماجی زندگی کی ایسی غلیظ سچائیاں ہیں جہاں ہم پیدا ہو رہے ہیں اور پل بڑھ رہے ہیں جوان ہو رہے ہیں اور بوڑھے ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور یہی سچائیاں ہمارے تجربوں اور مشاہدوں میں بھی شامل ہیں۔

کیا ہم مثبت اور تعمیری سچائیوں کے بیچ ہیں؟ نہیں تو پھر منفی سچائیوں سے انحراف اور چشم پوشی کیوں؟ زندگی اگر ماں کی گالی ہے تو اس گالی سے پردہ پوشی کیوں؟ یہ بے نیازی کیا ادبی بددیانتی نہیں؟ ایک سچا رائٹر اگر لیڈر یا ریفارمر نہیں ہو سکتا تو وہ لیڈر اور ریفارمر سے اپنی بات کہنے کے لئے امپالا کار میں بیٹھ کر فائیو اسٹار ہوٹل بھی تو نہیں جا سکتا۔ وہ اپنی کہانی تو ہمیں ہی سناتا ہے۔ ہم جو نفرتوں، حقارتوں اور فسادوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بسوں، ریل گاڑیوں اور ٹراموں کی بھیڑ میں اٹکے اور بلند و بالا عمارتوں کے نیچے پسے ہوئے ہیں۔ کینسر نگل رہے ہیں۔ کالرا کھا رہے ہیں۔ ایڈس جھیل رہے ہیں۔

یہی صورت حال ہے۔۔۔۔ اب سچ کو شوگر کوٹیڈ کیپسول بنا کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ پھنیشور ناتھ رینو، غیاث احمد گدی، شوکت حیات اور حسین الحق کے افسانے پوش کالونیوں میں رہنے اور عمدہ تنخواہ پانے والے نہیں پڑھتے۔ یہ افسانے وہ لوگ پڑھتے ہیں اور ان کے کرداروں کو وہ لوگ جیتے ہیں جنہیں سچائی کی کڑوی گولیاں روز نگلنا پڑتی ہیں۔ آج اگر کوئی رائٹر اپنی ذات کے گرد خوبصورت، طلسماتی، الف لیلوی اور سحر انگیز لفظوں کا حصار قائم کر کے یہ سوچتا ہے کہ وہ دوسروں سے منفرد ہے اور اس کی تخلیق سچائی پر مبنی ہے تو وہ یقیناً جعلی ہے۔ افسانہ نگاری فن جادوگری نہیں ہے۔ اس کے لئے جہنم کی اس بھٹی میں خود کو بھی اتارنا پڑے گا۔ جس جہنم کی وہ کہانی لکھنے جا رہا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانے ایئر کنڈیشنڈ چیمبر میں آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر نہیں لکھے اسے اپنے افسانوں کے کرداروں میں جینا پڑا تھا اور جو عصمت سے اس نے یہ بات کہی تو اسے یقین نہیں آیا کہ منٹو طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جا سکتا ہے۔ ادبی تخلیق کو منٹو ایسے سچے فن کار کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر سچائی کی بات کرنا ذہنی عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ □□

● AZADNAGAR , P.O. & DIST. ARARIA-854311 (BIHAR)



غلام مرتضیٰ راہی

قریب جتنی مرے شامِ زندگی آئی
دھندلکے اور بڑھے، اور روشنی آئی

جو ہم نے رخنۂ دیوار چھوڑ رکھا تھا
نظر اسی سے وہ صورت کبھی کبھی آئی

رہی غضب کی روانی مرے سفینے میں
لکیر پانی میں کھنچتی ہوئی چلی آئی

ہماری قوت برداشت میں اضافہ ہوا؟
کہ اس کے بازوؤں کے زور میں کمی آئی

پتہ چلا کہ کہیں اور پھینک رکھا تھا
نکل کے جال سے جب میرے جل پری آئی

ہیں کس شمار میں راہیؔ یہ دوہزار برس
کہ لاکھوں سال میں اکیسویں صدی آئی

● 135-PANI, FATEHPUR-212601(U.P.)



شجاع خاور

کچھ بھی نہ ہاتھ آیا وصیت کے باوجود
نادار ہوں بزرگوں کی دولت کے باوجود

ہمت ہے تو جلائے ہماری طرح کوئی
شمعِ خیال بادِ حقیقت کے باوجود

اپنے تعلقات سبھی سے رہے مگر
کچھ کشمکش تھی میل مروت کے باوجود

ذات اور کائنات کے ثالث بنے رہے
مصروفیت رہی ہمیں فرصت کے باوجود

یہ واقعی بڑے ہی تعجب کی بات ہے
دنیا اسی جگہ ہے قیامت کے باوجود

سب کا ہی نام لیتے ہیں اک تجھ کو چھوڑ کر
خاصا شعور ہے ہمیں وحشت کے باوجود

کل تک شجاعؔ جس کی عنایت پہ ہم جیے
اب جی رہے ہیں اس کی عنایت کے باوجود

● 1-PARK LANE, TALKATORA ,
PARK, NEW DELHI-110001



ولی عالم شاہین

وہ رت ہے کہ پل بھر میں گذر جائے
کس سوچ میں تو گم ہے مرے بزم

یہ حسن تحفظ نہیں ہالہ ہے گہن
اس قید سے باہر نکل آ ماہ

ساحل پہ سمندر کے وہی خواب میں دیکھ
جس خواب کی تعبیر نہ پائی سر

اس درجہ بھی چاہت میں گذرتے نہیں حد
جس بات سے ڈرتے تھے وہی بات ہو

ہونا بھی تو قسطوں میں نہ ہونے کی طرح
جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا ق

اک حرف ہنر کا ہے نشہ اور تو کیا
دستار ہی رکھتے ہیں نہ ہم ساغر

آئینہ ہے حیرت کدۂ دل زدگاں
ملاہو کہ مریم ہو نوریہ ہو کہ

شہرت کی کوئی راہ بھی ہموار نہ کر پا
شاہین کہ شاطر ہے نہ داتا ہے نہ

POST BOX 2276, STATION-D,
TTAWA ON, KIP 5W4 CANADA

بانو قدسیہ
121-C, MODEL TOWN , LAHORE,
(PAKISTAN)

نفسِ نارسا



اندھیرے بینچ پر بیٹھے ہوئے پرانی یادیں خزاں دیدہ پتوں کی طرح اس پر گر رہی تھیں۔

ماں کا خیال تھا کہ تحسین بہت زیادہ پڑھ لکھ کر وکیل بنے گا اور پھر ساری زمینیں چچا قادر علی سے چھڑائے۔ لیکن تحسین سے بی اے کے دو پرچے چھوٹ گئے وہ سوتا ہی رہ گیا اور اکونومکس اور انگریزی کا پرچہ بھی جن کی تیاری دوسرے پرچوں سے زیادہ تھی دئے نہ جاسکے حویلی واپس پہنچ کر وہ سمجھ نہ پایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"تحسین ہمت نہ ہار... واپس جا کر بی اے کر آ... ابھی میرا کافی زیور باقی ہے..."

"اماں پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں لگتا پڑھائی میں..."

ماں کی بڑی بڑی ڈنڈیاں ڈولنے لگتیں۔ ایسے میں کہتی۔ تیرے ابے کو کتنا شوق تھا پڑھائی کا۔ وہ کہتا تھا دیکھنا میں اپنے تحسین کو ولایت بھیجوں گا وہاں سے وکیل بن کر آئے گا۔ چل اور کچھ نہیں تو ان کا شوق ہی پورا کر دے۔

"میں کوشش تو کرتا ہوں بے بے پر مشکل ہے..."

جب وہ گاؤں میں رہتا تو شہر کے خواب پریشان کرتے... جب شہر پہنچ گیا تو پھر گاؤں کی یاد ستانے لگی... وہ کہیں موجود ہی نہ تھا نہ شہر میں اور نہ گاؤں میں... شاید اس کا اصلی بسیرا ان خوابوں میں تھا جو کھلی آنکھوں دیکھے جاتے ہیں...

شاید اسی لئے کبھی وہ محبت نہ کر سکا۔ ہر محبت میں وہ اپنی ذات کی محبت کا خمیر ضرور ملا دیتا۔ وقت گذرنے پر یہی ذات پھول کر ہر دوسری محبت کے اصل کو کھا جاتی۔ تحسین اس قدر خوبصورت تھا کہ عاشق ہونے سے پہلے محبوب بن جاتا۔ باپ کی زمینوں پر چچا کے قابض ہو جانے کے باوجود نہ پیسوں کی قلت تھی نہ سلاموں کی۔ گاؤں والے اسے چڑھتے سورج کی طرح عقیدت واگزار کرتے۔ گاؤں کی ساری کنواریوں کا وہ من چاہا دولہا تھا۔ دولت، حسن، خوش اطواری، خوش لباسی سب نے اس سے محبت کرنے کا حق چھین لیا تھا۔ وہ جب بھی محبت کرتا اس کے عوض اسے اتنی زیادہ پرستش مل جاتی کہ ذات کی محبت کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا اور محبت کرنے کا تجربہ بی اے ہی میں چھوٹ جانے والے پرچے کی طرح اسے فیل کرا دیتا۔

جن دنوں وہ بی اے ادھورا چھوڑنے کے بعد گاؤں واپس آیا وہ بڑا ہی بے کار تھا۔ اس بے کاری کے عہد میں مگرمچھ کی طرح کبھی پلنگ پر لیٹتا، کبھی بڑے سندھی جھولے میں پڑا جھولتا۔ پہلے بھی سنا بیگم سے متاثر تھا لیکن اس بار تو گویا اس شہد رنگی آنکھوں والی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سنا کے بالوں میں گو تیل چپڑا ہوتا لیکن بال اس کے کسی PRLOND کی طرح بالکل بھورے تھے سنا اسے مورچھت کر دیتی پھر غشی کے سے عالم میں وہ گھگھیاتا پھرتا۔ دہلیزوں میں کھڑا، پھاٹکوں سے لگا، آنگنوں میں بھٹکتا۔ تحسین مکمل التجا تو تھا۔ لیکن وہ یہ التجا سنا کے حضور کر نہ سکتا تھا کیوں کہ اس نے بچپن سے اپنے آپ سے محبت کرنا بھی سیکھ رکھی تھی۔

ایک شام سنا بیگم زوم کر کے اس کے فوکس میں آگئی۔

سورج غروب کا عالم تھا۔ آنگن بڑے پھاٹک اور گیروے رنگ کی دیواروں پر گہری نارنجی روشنی سرچ لائٹ کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس وقت سنا مالٹوں سے بھرا ٹوکرا سر پر اٹھائے بڑے پھاٹک کے پہلو والے دروازے سے داخل ہوئی۔ اس کے بھورے بال، شہد رنگی آنکھیں، کیسری لباس، سر پر دھرے مالٹے سب کچھ ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں آگ پکڑ گئے سنا نے منہ میں نرنجی رنگ کا پھول دبایا ہوا تھا۔ پتہ نہیں گلاب کا پھول تھا کہ گیندے کا۔ بڑے برسوں بعد یہ تصویر پھر اسکے آگے آکھڑی ہوئی۔ محبت کرنے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں اذیت پسندی نے اس خوبی کو زنگ لگا دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ اسے قدرت سکھانا چاہ رہی تھی وہ سبق ابھی تک اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

وجہ؟.. آخر کیا وجہ تھی کہ ایک بار گرنے کے بعد وہ برسوں اپنے پینڈے پر کھڑا نہ ہو سکا؟ شاید... وہ دیر تک سوچتا رہا۔

اسے... اپنے آپ سے بھی محبت تھی اور سنا بیگم سے بھی۔

وہ اپنے خاندان سے بھی پیار کرتا تھا اور اپنے آپ سے بھی۔

اُسے مذہب سے بھی پیار تھا اور اپنے آپ کو بھی وہ چھوڑنا نہ چاہتا تھا....

کبھی اپنی ذات کا پیار انا میں بدل جاتا کبھی جھک کر سمجھوتہ کرنے کی

نوبت آتی۔ کبھی خود ترسی اور نرگسیت اسے مجوب کئے رکھتی۔ اسی خود پرستی نے اسے ہمیشہ ہر سفر میں معلق رکھا۔ اگر کبھی کسی وقت وہ اپنے آپ کو بھول کر کسی شخص، مسلک، تحریک یا خدا سے منسلک ہو سکتا تو اس کی سمت مقرر ہو جاتی وہ مصلوب نہ ہوتا۔ لیکن مشکل یہی تھی کہ ہر مقام اور وقت میں وہ لحہ بھر کو بھی اپنا آپ بھلا نہ سکا تکر خور انا ہر وقت گداگر صورت اس کے ساتھ رہی۔ ہر محبت، سمت، مسلک کو اسی نے گڑ بڑا کر اندھلا کر دیا۔

اسٹریٹ لائٹیں بند تھیں۔ پارک میں لگے بلب روشن نہ تھے لیکن فاصلے سے کچھ بچوں کے بولنے چلانے ہنسنے کی صدائیں صاف آرہی تھیں۔ بہت برس ادھر اسی طرح سے سنا کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

تب وہ اپنے والدین کے ساتھ حویلی میں رہتا تھا۔

کھیتوں میں چلتے پھرتے، گھر کے کام کاج کرتے ہوئے، بکریوں، بلیوں، مرغیوں کی طرح الل ٹپ وہ جگہ بہ جگہ پھرتی نظر آتی۔ دیہاتی پالتو جانوروں کی طرح اس کا نہ تو کوئی ٹھور ٹھکانہ تھا نہ ٹائم ٹیبل وہ کسی وقت بھی آجاتی اور کسی وقت بھی کھا سکتی تھی۔ گاجر، پھلی، مولی، ہر قسم کے موسمی پھل، سنگھاڑے، شکر قندی، لیموں، اچار.... اس کے منہ تک پہنچ جاتے۔ وہ گائے، بھینسوں کی مانند چرتی چگتی رہتی تھی عموماً وہ خاموش رہتی لیکن ایسے میں اس کا جسم بولتا رہتا۔ یا پھر وہ بولتی تو بولے چلی جاتی۔ یا کھاتی، چباتی، نگلتی نظر آتی۔ وہ خود بڑے مزے سے زندہ تھی اور دوسروں کے جینے، بولنے، کھانے پینے اور زندہ رہنے پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ زندگی کے پانیوں پر وہ چھوٹے سے بجرے پر سوار دھارے کے ساتھ بہہ رہی تھی پانی میں گر جاتی تو دوبارہ بجرے کا کونہ پکڑ کر اندر سوار ہو جاتی۔ ان ڈبکیوں کو فوری بھول جاتی جو گرنے پر اس نے کھائی تھیں۔ گاؤں کی بہت سی لڑکیاں رنگین کلپ، پلاسٹک کی رنگ دار جوتیاں بھڑکیلے شوخ رنگوں کے لباس پہنے حویلی میں آتی تھیں۔ لیکن جسم آنکھوں اور دہن سے زندہ رہنے والی سنا بیگم کی کہی ان کہی باتوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

حویلی ایک ڈھنڈار سی جگہ تھی جو تحسین کے والد کے فوت ہو جانے پر کھنڈر میں بدل گئی۔ زمینوں پر چچا قابض ہو گئے وہ شہر پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ لمبی ناک والی اس کی ماں اب دبدبے والی عورت نہ تھی۔ وہ شتر مرغ سے بہت زیادہ پروں والی مرغی بن گئی تھی۔

تحسین پارک کی بینچ پر اکیلا بیٹھا تھا۔

روڈ شیڈنگ کی وجہ سے پارک میں اندھیرا تھا۔ سڑک کی بتیاں بھی بند تھیں۔ رکشے روڈ، کاریں موٹر سائکل نظر نہ آتے تھے۔ صرف میکنیکل شور اور بتیوں کی روشنی دور سڑک پر ریلے کی طرح آجا رہی تھی۔

پارک میں ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ اور خوشبو میں باسی پانیوں کی باس فضا میں ہولے ہولے اتر رہی تھی۔

تحسین نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ ایک ہوائی جہاز ائیر پورٹ کی طرف رفتہ رفتہ اتر رہا تھا۔ جہاز کی گڑگڑاہٹ اور بتیوں کا پینتالیس ڈگری کا جھکاؤ ظاہر کرتا تھا کہ ائیر پورٹ کچھ ایسا دور نہیں۔ چند دن پہلے وہ بھی ہوائی جہاز سے لاہور کی جانب سفر میں تھا۔ عین اسی وقت ائیر ہوسٹس اسے کھانے کا ٹرے پکڑا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ اور آواز میں تربیت شدہ مٹھاس تھی۔ سائنس بھی کیا شعبدہ باز تھی، ہوا میں کھانا کھلا رہی تھی اور ایسی مسکراہٹوں کو جنم دے رہی تھی جن کا سچائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تحسین نے سڑک پر نگاہ کی پھر آسمان کو دوبارہ دیکھا۔ آسمان اور زمین پر لوگ آجا رہے تھے۔ کار لوڈر، رکشہ بسیں سڑکوں پر رواں دواں تھیں ہوائی جہاز میں لوگ سیٹ بیلٹ لگا رہے تھے۔ لیکن بتیوں کے علاوہ ان کے وجود کی کوئی شہادت نہ تھی شاید پارک کے اندھیرے میں دوسری جانب بھی لوگ موجود تھے لیکن بچوں کے چیخنے چلانے عورتوں کے ہنسنے کے علاوہ لوگوں کی کوئی شہادت موجود نہ تھی.... ایک معمولی سی لوڈ شیڈنگ نے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان بڑی خلیج پیدا کر دی تھی۔ کوئی ایسا شخص جو شعبدوں سے ناواقف اور انہونی کا قائل نہ ہو سوچ سکتا تھا کہ آسمان میں مخلوق اڑی جا رہی ہے سڑک کی ٹریفک میں زندہ لوگ سوار ہیں

تحسین نے اپنا سر جھٹک کر اپنے آپ کو بینچ پر محدود کرنا چاہا آج کے تہذیبی بھنور سے نکل کر سوچنا چاہا کہ وہ خود کہاں ہے، آسمان پر زمین کے اوپر یا وہ معلق ہے.... مکڑی کی طرح جالے بُنتی زندگی میں... ادھ مری مکھی کی طرح... وہ ہوا میں... پاتال کے اندر... یہاں وہاں کہیں بھی نہ تھا۔ بھلا ایسے انسان کو کیا کہتے ہیں جو نہ کسی سمت... نہ ہی کسی کھونٹے نہ ہی کسی عہد میں مقید ہو اسے ایک چھوٹا سا کھلونا یاد آگیا۔ یہ کھلونا اس نے فرینکفرٹ کی ڈیوٹی فری شاپ پر دیکھا تھا۔ چھوٹا سا بونا... جس کے پیندے میں شاید سیسہ بھرا تھا۔ اسے جیسے کیسے دباؤ، الٹا سیدھا رکھو... کسی کروٹ پر لٹاؤ وہ فٹافٹ اپنے پیندے پر کھڑا ہو جاتا۔ تحسین کو یہ کھلونا دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ یہ کھلونا ماڈرن عہد کا کھلونا ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ کسی اور زمانے میں جب سرمایہ داری نظام نہ تھا۔ انسان زراعت کے سہارے زندہ تھا۔ کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ انسان نے جینے کے لئے اتنے کھیکو نہیں پالے تھے تب انسان گر کر کپڑے جھاڑ کھڑا ہو سکتا تھا... یا شاید اب اتنے سارے حملے سہہ کر اس میں قوت مدافعت کا سیسہ بھر گیا تھا اور مٹگا، کلاشنکوف، بے عزتی، بے علمی، بہت ساری مار کھا کر بھی اپنے جوتوں میں کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

دور سے یوں لگتا تھا جیسے سنا نے منہ میں بھڑکتا انگارہ پکڑ رکھا ہے۔

ہتھی والے نلکے کے قریب تخت پوش پر بیٹھا تحسین نیل کٹر سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کاٹ رہا تھا سنا کی ہمشکل ایک روسی لڑکی کی تصویر اس نے لاہور میں دیکھی تھی۔ فوٹوگرافر نے کریملن کے سامنے نارنجی فلٹر لگا کر لڑکی کا کرشمہ جگایا تھا۔ اسی وقت آگ پکڑی سنا آگے بڑھی تو تحسین کا جی چاہا کہ وہ ہوز پائپ سے اس بھڑکتی آگ کو بجھا دے۔ وہ بڑے ہوٹل، سینما گھر، سکائی سکریپر اور کئی منزلہ بلڈنگوں میں اگر آتشزدگی کا واقعہ ہو جائے تو ایسے راستے اور سیڑھیاں موجود ہوتی تھیں جن راہوں سے لوگ فرار ہو سکتے ہیں۔ لیکن کھلے پھاٹک، ٹوٹی دیوار کے باوجود کوئی چور راستہ ایسا نہ تھا جس سے اس غروب آفتاب کے منظر سے فرار ہو سکتا۔

تحسین گرفتار ہو گیا لیکن اس کے اندر بیٹھی ہوئی ذات کی گرفتاری نے اسی وقت نالش کر دی اور حق مشفع کے لئے لڑنا بھڑنا شروع کر دیا اس لڑائی بھڑائی کا اولاً تحسین کو علم نہ ہوا کچھ بننے بگڑنے سے بہت پہلے تحسین اور سنا ایک رات بڑے شاہ صاحب کی کار میں لاہور پہنچ گئے۔ تحسین نے سنا کو اپنے فلیٹ میں لے جانے سے پہلے مسجد کا رخ کیا اور سنا بیگم سے نکاح پڑھوالیا۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی بار تحسین کو سنا بیگم اپنی اصلی روپ میں نظر آئی۔ وحدت کالونی کے چھوٹے سے فلیٹ میں سنا بھوری سنہری تو تھی لیکن پیلی بدرنگ بلی کے مانند جو گلیوں میں جان بچائے پھرتی ہے اس کا کوئی علمی، فیشنی، دولتی تشخص نہ تھا۔ ایسی شناخت کے بغیر شہری زندگی کے تار و پود میں رنگ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تحسین نے کالج میں دوبارہ داخلہ لے لیا اور سنا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اتنے بڑے حادثے کی گاؤں والوں کو اطلاع نہ بھیجی نہ ہی اپنی ماں کا کبھی خیال آیا۔ وہ جانتا تھا گاؤں والے اتنے جاندار نہ تھے کہ کسی بڑے آدمی کے خلاف ایف آئی آر کٹا سکیں۔ بہت دنوں بعد اسے علم ہوا کہ اسی رات گجر یوسف کا بیٹا بھی گاؤں سے بھاگ گیا تھا۔ سنا کے بوڑھے ماں باپ نے اسی کے ساتھ اپنی بیٹی کے اغوا کو منسوب کر دیا۔

تحسین اپنی ماں کے ساتھ محبت ضرور کرتا تھا لیکن ماں کے ساتھ گذارے ہوئے واقعات یادیں اسے گداز نہ کر سکیں۔ ماں اگر دکھ بھری زندگی گذار رہی تھی تو ان دکھوں کا مداوا تحسین کے پاس نہ تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لایعنی گفتگو نہ کر سکتا تھا۔

تحسین اور ہر دوسرے کے درمیان یہی گونگا پن حجاب تھا وہ کسی سے کیا کہے؟ کیسی باتیں کرے ذات کی محبت کا اندھا شیشہ درمیان میں حائل رہتا۔ اس کے دوست، ماں اور سنا جب تک بولتے وہ بور ہوتا۔ ان باتوں میں اس کی اپنی ذات کو کوئی دلچسپی نہ تھی جب اسے بات پر آمادہ کیا جاتا تو وہ بھی بالکل فروعی باتیں کرتا۔ اسے لگتا اگر وہ اندر کی بہت گہری باتیں کرے گا اپنے جذبات، احساسات، کمینگی، توڑ پھوڑ کا ذکر ہو گا تو اس کے بعد وہ اپنے دل کے قفل کی چابی کسی اور کے حوالے کر دے گا۔ ہر چوری پکڑی جائے گی۔ اپنے اوپر اس قدر تحکم اس کا SELF LONE برداشت نہ کر سکتا تھا۔

سنا بیگم تو کچھ شہری ماحول سے گھبرائی، کچھ تحسین کی خاموشی نے اسے تار تار کر دیا۔ جب تحسین کالج سے لوٹتا تو سنا بیگم بھاگ کر تیل کا چولہا جلاتی اور تازہ روٹیاں پکانے لگتی وہ اسی قدر سیکھ پائی تھی کہ گرم پھلکا، دیسی گھی میں پکا سالن اور صاف ستھرے برتن اظہار محبت کی انتہا تھیں تحسین پر یہ وقت بہت بھاری ہوتا۔

خاموشی کے لمبے لمبے وقفے اور بے معنی ہوں ہاں سے دونوں مجروح ہو جاتے۔

"روتی کیوں ہے سنا..."

سنا گیس کے چولہے پر روٹی سینکتی، ڈوپٹے کے پلے میں سوں سوں کئے جاتی جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو ہر رابطے کو پھپھوندی لگ جاتی ہے اور ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔

"میرے امتحان قریب ہیں، میں جانتا ہوں میں تمہیں وقت نہیں دے سکتا لیکن ایک بار انہیں ختم ہو لینے دو پھر میں تمہیں سیر کراؤں گا سارے شہر کی..."

"مجھے سیر نہیں چاہئے شاہ جی۔"

"پھر اور کیا تکلیف ہے۔" تحسین احساس جرم تلے پوچھتا

"کوئی تکلیف نہیں جی۔"

"کھانے پینے کی کپڑے لتے کی؟.... آرام کی؟..."

"ناں... کوئی نہیں..." اس کی سسکیاں اونچی ہو جاتیں

"گاؤں یاد آتا ہے...؟"

سنا بیگم اثبات میں سر ہلاتی اور ہاتھ کے پچھلے حصے سے آنسو پونچھتی

"تم گاؤں جا سکتی ہو... کم از کم میں تو ابھی وہاں نہیں جا سکتا..."

"کیوں جی؟..."

"میرے لئے گاؤں ختم ہو گیا سنا بیگم خواب ہو گیا میں وہاں کیا منہ لے کر جاؤں؟ میرے لئے اُدھر کوئی گاڑی نہیں جاتی..."

لمبی آہ بھر کر سنا نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ بچپن سے بڑوں کی ہاں میں ہاں ملاتی آئی تھی اپنے آپ کو بھول جانا اس کے لئے آسان تھا

"اب سنا بیگم ہمیں اپنا سارا کچھ ایک دوسرے کو سمجھنا پڑے گا پیسے کی کمی نہیں میں تیرے آرام کا بڑا خیال رکھوں گا..."

آرام؟... وہ کیا ہوتا ہے سنا بیگم نے دل میں سوال کیا

"اگر تو گاؤں گئی ناں تو تیرے بھائی تیرے دو ٹوٹے کر دیں گے..."

"کر دیں دو ٹوٹے کر دیں بڑی خوشی سے جی..."

"محلے کی عورتوں سے میل جول بڑھا لے تیرا دل لگ جائے گا..."

"نہ ان کو میری سمجھ آتی ہے نہ مجھے ان کی.. میل جول میں کیا بڑھاؤں شاہ جی"

محلے کی مڈل کلاس کی عورتیں اپنی نفرتوں، حسد اور غیر ضروری

افواہوں کو بنیادی ضرورتوں کی طرح استعمال کرتی تھیں۔ان تین میں ان کا تحفظ بھی تھااور رنگینی بھی۔ چغلی، غیبت، دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت پر عمل کر کے ان کے بہناپے، دوستیاں، رشتہ داریاں چل رہی تھیں جو بھی سنا بیگم سے ملنے آتی پہلے تو اس کی معلومات بڑھاتی پھر شہری زندگی کے آداب سکھاتی پھر ملنے ملانے والیوں کے کردار پر روشنی ڈالتی اور وقت بچ نکلتا تو کھانے پینے کے طریقے، شوہر کو قابو کرنے کے سنہری اصول سمجھا کر جاتی۔ سنا بیگم جیتے جاگتے دیہاتی معاشرے سے آئی تھی اور خود بہت سگھڑ کڑھی مجھی ہوئی تھی وہ گلی والیوں سے متاثر نہ ہوتی اور نہ ہی اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ شہری خواتین کو کسی طور پر اپنی تانت میں کس سکتی ہولے ہولے اس نے ملنا ملانا چھوڑ دیا اب وہ سارا دن اپنے اور تحسین کے متعلق سوچتی رہتی۔ بھوری کو یہ بات سمجھ نہ آتی کہ تحسین اس سے آگے کیا چاہتا ہے؟ جب وہ تحسین کو پا کر اسی کے رنگ میں رنگی گئی تو پھر تحسین کو اور کیا درکار تھا۔ شام کو تحسین کچھ ایسا بکھرا بکھرا داخل ہوتا کہ سنا بیگم اپنے آپ کو نربل محسوس کرتی اسے لگتا جیسے تحسین اس سے گلو خلاصی کرانا چاہتا ہے۔ تحسین کو اپنی بکل میں نہ چھپا سکنے کا کچھ ایسا بھوری کو دکھ ہوا کہ وہ چپ چپ رہنے لگی تحسین جب کالج چلا جاتا تو وہ آنگن میں چلی جاتی تار پر گیلے کپڑے ڈالتی اور پھر بے چاری منی مرو منڈیروں کو تاکنے لگتی۔ گاؤں سے بھی کوئی نہ آیا لیکن کوئی ڈوم کوا بھی اس کے کسل کو دور کرنے کے لئے کسی بسیرے پر آ کر کائیں کائیں کرنے کو تیار نہ تھا۔

تین سال یوں ہی گذر گئے اس دوران تحسین نے کئی کام کیے۔ اس کے پاس اس قدر اثاثہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو شاندار کوٹھی خرید کر بڑے لوگوں کی زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں اسے یقین ہو گیا کہ سنا بیگم اس قدر دیہات میں گندھی ہوئی ہے کہ وہ ماڈرن لوگوں کے احاطوں کو پھلانگ نہیں سکے گی۔ ان تین سالوں میں تحسین نے کئی کام کیے ۔اور آخر میں ایک مشہور پینٹ کمپنی میں سیلز منیجر ہو گیا۔ بازاروں میں گھومنا، سیل پروموشن کے لئے مختلف قسم کے بینر چھپوانا انڈسٹریل میلوں اور ہارس شو پر اپنی کمپنی کے اسٹال لگانا، کمپنی کا عطا کردہ سیل کا ٹارگٹ پورا کرنا۔ ایک پورا جال در جنجال تھا۔ لیکن تحسین خوش تھا اس کام میں اتنی بھاگ دوڑ، جھوٹ، پی آر ہوتی کہ شام تک وہ محسوس کرتا کہ اس میں بھس بھرا ہے۔ وہ کھانا کھا کر بستر میں دبک جاتا۔ سنا سارا دن دو کمروں میں مقید رہنے کے باوجود تازہ دم ہوتی۔

ان دونوں میں ایک جھگڑا انرجی لیول کا بھی تھا۔

تحسین اپنی ساری تازگی، طاقت، ہمت گنوا کر گھر میں وارد ہوتا۔ سنا اس کی چارپائی کی پائینتی بیٹھ کر اس کی ٹانگیں پاؤں دبانا چاہتی سکون پہنچانے کا یہ طریقہ صدیوں سے اس کے لہو میں گردش کر رہا تھا۔ کئی کمین صدیوں سے دو چیزوں پر تکیہ کرتے آئے تھے۔ خدمت اور خوشامد لیکن یہ دونوں ہتھیار تحسین کے معاملے میں کند ثابت ہوئے۔ خوشامد، تعریف، محبت کا وہ بچپن سے عادی تھا۔ اس سے اتنی محبت کی گئی کہ اسے خود محبت کرنے کا ڈھب بھول گیا۔ جب سنا اس کی ٹانگیں دبانا چاہتی تو وہ ایک دم ٹانگیں سکیڑ کر کہتا۔ "نہیں نہیں... شکریہ..."

"تھکاوٹ اتر جائے گا شاہ جی۔"

"نہیں نہیں نہیں کچھ ایسا تھکا ہوا بھی نہیں" وہ رضائی کو اس طرح اپنی جانب گھسیٹتا کہ سنا بیگم اس حرکت سے دور ہو، کی زبان سمجھ جاتی اس کا منہ لٹک سا جاتا۔ چقماق رگڑنے پر چنگاری نہ نکلتی تو سنا بیگم سوچتی رہ جاتی کہ اس نے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر بڑا گناہ کیا۔ کبھی شاہ بھی کسی کے ہوئے ہیں وہ اولوں کی ماری کھیتی سر جھکا کر بیٹھ رہتی۔ تحسین اس چپ گڑپ کو دیکھتا رہ جاتا۔ سر میں لال نیلے پلاسٹک کے کلپ جو بھورے جھونجھ بالوں کو بٹھانے کے لئے لگائے جاتے اور بھی رنگین ہو جاتے۔ جسم پر بروکیڈ، شنیل، اور بھڑکیلے رنگوں کے آتشی گلابی، فروزی بیگنی کپڑے.... پیروں کے ناخنوں پر گلابی رنگ کی کیوٹکس، ہاتھوں کی جلد کھردری اور ناخنوں میں برتنوں کی میل ... دنداسے اور لپ سٹک میں رنگے ہونٹ ... چوکڑی مار کر بیٹھنے کا انداز، تالی بجا کر پرندے اڑانے کا انداز... جب تحسین اسے گھورتا تو معاً سنا بیگم کو لگتا جیسے وہ حمام میں بے حجاب نظر آ گئی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو شاہ جی..."

"کچھ نہیں بس ایسے ہی......"

"پھر بھی..."

"سوچتا ہوں اسی جمعے تمہیں چڑیا گھر بھی دکھا لاؤں..."

"ہر جمعے یہی کہتے ہیں آپ..."

دل میں تحسین سوچتا اگر کسی دوست، یا بزنس کے معتبر ساتھی نے اس ہونق کے ساتھ دیکھ لیا تو.... پھر....

"بھلی لوک اگر وہاں کسی گاؤں والے نے دیکھ لیا تو..."

"تو مل جائے جو مرضی... ہم کسی سے ڈرتے ہیں۔ کوئی گناہ کیا ہے ہم نے" وہ کڑک کر بولتی شاہ جی کی رانی بن کر اس میں ایک حوصلہ اور شیخی آ گئی تھی۔

"ہاں تو نہیں ڈرتی شیر کی بچی... لیکن زمانہ بدل گیا۔ ہر تیسرے آدمی کے پاس کلاشنکوف ہوتی ہے میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

تین سال کے اندر سنا بیگم کے دل کا توا بالکل ٹھنڈا پڑ گیا اب اس پر زندگی کی روٹی پک نہ سکتی تھی۔ تحسین اور سنا کے درمیان صرف ٹیلی ویژن کی آواز ڈنکے کی چوٹ آتی رہتی ایک دوسرے پر دھونس ختم ہو گئی تو دونوں اپنے اپنے خول میں چلے گئے تحسین سوچتا میں کہاں ہوں، کیا میں اس گاؤں میں رہتا ہوں جہاں ایک ڈھنڈار سی حویلی میں ایک بد روح سی

جان چپ چاپ بیٹے کا انتظار کرتی ہے؟ کیا میں اس پینٹ کی تین منزلہ عمارت میں سرگرداں ہوں جہاں سے ہر وقت پینٹ کی خوشبو آتی ہے۔ کم از کم اس چھوٹے سے فلیٹ میں تو بہت تلاش کے باوجود وہ اپنے آپ کو تلاش نہ کر سکا۔

سنا بیگم اس چوہے کے مانند تھی جو کسی ریسرچ اسکالر کے پنجرے میں بند ہو اور اسے معلوم نہ ہو کہ اسے کیوں اتنی احتیاط سے کھلایا پلایا اور بند رکھا جاتا ہے۔ آنگن میں جا کر کبھی وہ آسمان کو تکنے لگتی۔ رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ کر اسے رشک آتا۔ کم از کم وہ ان مکانوں سے اوپر تو اٹھ سکتی تھی۔

ایک روز جب وہ گلی کے باہر کار پارک کر کے تنگ راستے سے اپنے گھر کی جانب بڑھا تو تحسین کو لگا جیسے کوئی واقعہ، حالات اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے یقین ہو گیا کہ گھر میں کوئی واردات ہو گئی ہے۔

دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

چند عورتیں مخبوط الحواس انداز میں اس کی طرف بھاگی آئیں۔

سفید بالوں والی بڑھیا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ہائے ہائے تیل کا چولہا پھٹ گیا۔" کم عمر بڑے بڑے دانتوں والی گرہستن بولی۔ "نہ ماں جی نہ سنا باجی نے اپنے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگائی میرے کاکے نے آنگن سے خود شعلے دیکھے۔"

ایک اور خبر تراش بولی "ہم تو دیوار ٹپ کر اندر آئیں۔ اوپر کمبل ڈالا.. پر آگ کالا بنو تو آسمان تک جا رہا تھا۔ بھسم ہو گئی بے چاری..."

ادھ جلی سنا بیگم پلنگ پر پڑی تھی۔ اس نے پریم پیالہ اپنے ہاتھ سے توڑ کر اپنے سنہری بدن کو کالی شہر میں بدل دیا تھا۔ تحسین کے دل میں احساس جرم کا تیز الاؤ بھک بھک جل اٹھا لیکن جب ہمسائے کے لوگوں نے مل جل کر جنازے کا انتظام کر لیا تو تحسین عجب طرح سے شانت ہو گیا نہ اس کی آنکھ میں آنسو تھے نہ دل میں کسی قسم کا پچھتاوا۔

دراصل ساری عمر اس کی ہر محبت کے ہمراہ ذات کی محبت غالب رہتی آئی تھی۔ اسی نفس کی چاہت نے اسے سنا کی بے وقت موت سے بچا لیا۔ وہ سنا کی محبت میں کبھی انا کی کشتی ڈبو ہی نہ سکا تھا۔ اسی لئے بڑی آسانی سے پار اتر گیا۔

سنا بیگم کے بغیر جب پہلی رات آئی تو وہ دیر تک اس تصویر کے آگے بیٹھا رہا جو گاؤں سے آ کر اس نے سنا کے ساتھ کھنچوائی تھی۔ تحسین نے بھولے بالوں والی اس بھوری مرغی کو دیکھا اس نے دل میں سوچا ۔۔۔ میں کیوں اس درجہ بیرون کا قائل ہوں۔ خوبصورتی کی تلاش میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں ۔۔۔ میں سنا بیگم کے اندر کا حسن کیوں دیکھ نہیں سکتا۔ اس کا صبر اس کی اچھائی نیکی مجھ پر کیوں اثر انداز نہیں ہو سکی ۔۔۔ غلطی مجھ میں تھی کہ سنا کے پینڈو پنے میں ۔۔۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ دوہری محبتیں کرنے والے محبت وصول تو کر سکتے ہیں خود ان کے تھوہر میں محبت کا پھل نہیں لگتا

تحسین نے رونا چاہا۔ سنا بیگم کی یاد کو تازہ کرنا چاہا۔ لیکن ہر یاد تنگ جوتی کی طرح جلد اتار دینا پڑی۔ اس نے سنا پر ترس کھانا چاہا جو اپنے ماں باپ اور دو بہنیں چھوڑ کر اس کے ساتھ تین سال قید تنہائی کاٹ کر چھوٹ گئی۔ اس نے اس تکلیف دہ موت کے متعلق بھی گہرے غم کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی جس سے سنا کو گزرنا پڑا۔۔۔ لیکن اس کا دل پلاسٹک سے بنا ہوا تھا اس میں کوئی مضحک چیز تو پڑ سکتی تھی لہو کی طرح گرم احساسات کا گذر نہ تھا۔

وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ ایسا کیوں ہے۔۔۔ سنا بیگم سے رہائی پر اسے یک گونہ اطمینان کا احساس کیوں ہوا۔۔۔ وہ اپنے اس احساس پر شرمندہ ضرور تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اندر کہیں بہت اندر اس کی ذات نے اطمینان کا سانس بھی لیا تھا اسے یوں لگا گویا فطرت بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔۔ غیر ضروری لوگ، چیزیں اس کے مدار سے ہٹا رہی تھی۔۔۔ اسے کبھی کبھی شبہ ہوتا کہ گاؤں والے اس کے متعلق غلط گمان جاگزیں ہوں گے لیکن گاؤں والوں کو قسمت نے اس لئے تحسین کی زندگی سے نکال دیا کہ بزدلی ان کا شعار تھی اور شاہوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے اہل نہ تھے۔

سنا بیگم کی موت کے بعد تحسین کی زندگی نے عجیب پلٹا کھایا اس نے گلبرگ میں رہائش اختیار کر لی اور بڑے اسٹائل سے زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک شارٹ کورس کے سلسلے میں جب وہ چند ہفتوں کے لئے کراچی گیا۔ تو اچانک اس کی ملاقات سیٹھ ہوزری والا سے ہو گئی وہ دونوں لفٹ میں اکیلے تھے۔ سیٹھ ہوزری والا دبلا پتلا چھوٹے قد کا سانولا سا آدمی تھا۔ ہوٹل سے باہر اسے دیکھ کر شک بھی نہ گذرتا کہ وہ اتنی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا واحد مالک ہے۔ سیٹھ ہوزری والا کے چہرے پر عینک، ہاتھ میں بید کی چھڑی ٹانگوں پر اونگا پاجامہ جسم پر تنگ سا کرتا، جس پر پچاس سالہ پرانا کوٹ ہاتھوں میں مروڑ تروڑ، چہرے پر باسی مسکراہٹ، انداز ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہتے۔ سیٹھ ہوزری والا تحسین کے حسن وجاہت سے متاثر ہوا۔ تحسین کو سیٹھ نے اس لئے متاثر کیا کہ وہ عجیب الخلقت چیز نظر آ رہا تھا۔

وہ دونوں اٹھے صبح کے ناشتے کے لئے سلیف ہیلپ والے مارننگ روم میں داخل ہوئے۔ سیٹھ نے ایک سادہ ٹوسٹ اور کافی کی پیالی لی۔ تحسین نے دو انڈوں کا آملیٹ اور اس کے ساتھ کئی لوازمات اکٹھے کر لئے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں صبح کے وقت خاموشی تھی لوگ ناشتہ بھی بڑے اسرار و رموز کے ساتھ کر رہے تھے۔ سیٹھ ہوزری والا جس میز پر بیٹھا تھا وہیں تحسین اپنے ناشتے کی پلیٹ لے کر پہنچ گیا۔ تحسین نے اپنی ساری بیک گراؤنڈ خاندانی حالات حالیہ مصروفیت نہ جانے کیوں سیٹھ کو بتا دی۔ سیٹھ

کسی مجھے انگریز ڈپلومیٹ کی طرح ہوں ہاں کر تا رہا۔ اس نے ایک بار بھی اپنے متعلق کوئی انفارمیشن نہ دی۔ پورا ہفتہ تحسین اور سیٹھ ہوزری والا ہوٹل میں ملتے رہے۔ وہ دونوں ایک ہی فلور پر ایک ہی لمبی گیلری کے آر پار رہتے تھے۔ کبھی ڈنر کبھی لنچ کبھی ریسپشن میں ملاقات رہنے لگی۔ جس روز تحسین کو لاہور واپس جانا تھا۔ سیٹھ ہوزری والا اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر پکڑا رہا تھا۔

"جرا تم ہمارا ساتھ کافی روم میں چلیں گا تحسین۔۔۔"

"جی ضرور۔۔۔ لیکن میری فلائٹ میں وقت کم ہے۔۔۔"

"ام جیادہ وقت نہیں لے گا۔۔۔ ام جب فیصلہ کرتا ہے تو پہلے دیر تک سوچتا ہے پھر جھٹ پٹ میں مہر لگا دیتا۔۔۔ چلو۔۔۔"

وہ دونوں کافی کارنر پر جا کر بیٹھ گئے۔ سیٹھ نے دو کریم کافی کا آرڈر دیا

"اپن نے پورا ہفتہ تم کو EXAMINE کیا ہے تحسین۔ تم ہمارا مطلب کا آدمی اے۔۔۔۔

ام تم کو اپنا مارکیٹ مینیجر بنائے گا ادھر کراچی میں تمہارا ہیڈ آفس بنادے گا۔ شروع میں ایریا مینیجر بنائے گا۔۔۔"

"لیکن سر میں تو۔۔۔ یعنی میں نے کوئی ایم بی اے وغیرہ نہیں کیا معمولی بی اے ہوں میں یہاں شارٹ کورس کرنے آیا تھا۔۔۔"

"سیٹھ ڈگری وگری میں نہیں دیکھتا آدمی دیکھتا ہے۔۔۔"

"لیکن سر۔۔۔"

"بے وقوف آدمی۔۔۔ ام بولا تم اگر سیٹھ ہوزری والا کو ہاتھ پکڑاؤ تو پھر اپنا ترقی دیکھنا۔۔۔ تم کو آبائی زمین وغیرہ سب بھول جائیں گا۔۔۔"

سیٹھ ہوزری والا نے ایسا زینہ لگایا کہ تحسین ایک ہی چھلانگ میں ترقی کے ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا اب جو بھی فلائٹ جاتی تھی اوپر ہی اوپر نکلتی سیدھی نہیں جاتی تھی۔ سیٹھ ہوزری والا نے تحسین کے ساتھ ہمیشہ خصوصی سلوک کیا۔ اپنی فیکٹری میں چلتے چلتے وہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر بن گیا آدھے شیئر دلا کر فیکٹری سانجھا دار لا دیا۔ اپنی بھانجی سے شادی کرا دی اور جہیز میں تحسین کو تین کوٹھیاں ملیں۔ اس ساری محبت کے بدلے سیٹھ ہوزری والا نے کبھی باپ کی طرح اس پر احسان بھی نہ دھرا۔ تحسین شکر گزار ہونے لگتا تو سیٹھ کہتا۔۔۔ "ارے ناں بابا ناں۔۔۔ تم ام کو خدا بناتا اے۔۔۔ ام تم کو بتائے۔۔ سچی بات بولے یہ سارا دولت یہاں تمہارے مستک میں لکھا۔۔۔ اب ایک کام کیا سیٹھ ہوزری والا نے جو تمہارے مستک میں لکھا تھا وہ تقدیر ام نے پڑھ لیا۔ ام مستک والے سنگ معمہ چھوڑی نیں کرتا بابا۔۔۔ ام بس اتنا کیا کنجی پکڑا دیا۔ بھلے وہ ڈبو دے۔۔۔ ہمارا ذمے داری نہیں ہے۔ تحسین ام تم کو بتائے دولت کو دوست بناؤ تو دوست ہے۔۔۔ دشمن سمجھو تو دشمن۔۔۔۔ تم دولت کو روتا ہے۔۔۔ لوگ تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ مجبور ہے محبت کرنے پر۔۔۔۔ یہ بھی تمہارا مستک ہے۔

سیٹھ ہوزری والے کا خاندان تحسین کے لئے ایک عجیب سا تجربہ تھا وہ لوگ اسے کبھی پارسی لگتے کبھی ہندو۔۔۔ عورتیں سادہ کاٹن کی ساڑیاں پہنتیں۔ چہرے پر میک اپ نہ ہوتا لیکن لاکھوں کی ایک ہی انگوٹھی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ کبھی تحسین کو لگتا وہ کسی ہندوستانی فلم میں داخل ہو گیا ہے نماز روزے کے پابند باقاعدگی سے زکات دینے والے یہ میمن لوگ بڑے ہی دیندار تھے۔ کسی کا حساب کتاب، اُدھار، لینا دینا ان کے ذمے نہ تھا۔ ان کے گھروں میں دولت ضرور تھی لیکن دولت کی نمائش نہ تھی۔ سیٹھ ہوزری والا کے خاندان نے تحسین کو دولت کے ساتھ ساتھ بڑی ٹھہری ہوئی جانثاری بھی دی۔

ابھی شادی کو کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ ایک دن زعفرانی بیگم نے تحسین سے کہا۔۔۔ "بھئی وہ آپ ہمیں ساس جی سے ملانے نہیں لے جائیں گے۔۔۔"

"مجھے تو گاؤں چھوڑے دس سال ہوگئے زعفرانی۔۔۔ مجھے کیا پتہ گاؤں کس حال میں ہے ماں کیا ہوئی۔۔۔" تحسین نے کہا

"کمال ہے۔۔۔ آپ کو یہ بھی خبر نہیں۔۔۔ کہ اماں۔۔۔۔"

"جب میں کچھ چھوڑ دیتا ہوں زعفرانی تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا مجھے لگتا ہے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا بن جاتا ہے"

سیٹھ ہوزری والا کے خاندان کا ایک یہ بھی چمتکار تھا کہ وہ کسی بات کے پیچھے نہیں پڑتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز بھی تھا۔ زعفرانی بیگم نے کبھی اس کے بعد گاؤں جانے کی آرزو نہ کی زعفرانی بیگم کے ساتھ تو بیس برس بڑی خوشگواری سے گزرے وہ بڑی معمولی باتوں سے خوش ہو جانے والی روح تھی۔ زیادہ دیر ناراض نہ رکھتی۔ تحسین کسی کے غم اور خوشی میں اسی وقت تک شریک رہتا جب تک وہ غم یا خوشی اس کے اپنے موڈ سے وابستہ ہوتی۔۔۔ زعفرانی بیگم نے اپنی بیٹی کے ساتھ تو ایک علیحدہ یونٹ بنالیا۔ تحسین حال مست مال مست خود رو معروفیتوں میں اپنی زندگی گذارنے لگا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ جب بھی چھٹیاں گذارنے یورپ یا امریکہ جاتے اکٹھے ہی جاتے۔

چھوٹی عالیہ فرسٹ ایئر میں تھی تو اس سال تحسین اور زعفرانی آسٹریلیا چلے گئے۔ سڈنی میں ابھی ان کے قیام کا دوسرا دن تھا جب ان کے بیڈروم میں فون کی گھنٹی بجی زعفرانی بیگم غسل خانے میں تھی۔

"یس۔۔۔۔۔۔"

"کراچی سے فون ہے پلیز ہولڈ آن۔۔۔۔"

کراچی سے عالیہ بول رہی تھی۔۔۔ "میں ابھی ابھی۔۔۔۔ ہولی فیملی سے آرہی ہوں سیٹھ ہوزری والا روم نمبر گیارہ میں ہیں پاپا ان کی حالت بہت CRITICAL ہیں آپ لوگ فوراً آجائیں ماما کہاں ہیں۔۔۔"

"نہارہی ہیں۔۔۔۔"

"دراصل پاپا...ابھی میں جھوٹ کہہ رہی تھی انکل ہوزری والا از یڈ... آج صبح سات بجے... آپ اور ماما... فوراً پہنچ جائیں..."

عالیہ رو رہی تھی اس نے ماں کا بھی انتظار نہ کیا اور فون بند کر دیا۔

زعفرانی بیگم ہاتھ روب میں لپٹی لپٹائی باہر آ گئی۔۔۔ "کیا ہوا۔۔"

"سیٹھ ہوزری والا ختم ہو گئے۔۔۔"

"کیسے کب..."

تحسین نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔۔۔ "ہولی فیملی میں تھے.... ہارٹ فیل ہو گیا۔ فائین مین فائین مین...."

"آپ جا کر سیٹیں بک کرائیں میں سامان باندھتی ہوں۔۔۔"

تحسین کھڑا ہو گیا۔ فیصلہ کن لمحات میں اسی طرح گریک دیوتاؤں کی طرح سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر ایستادہ ہو جاتا تھا۔

"زعفرانی۔۔۔ یہ ہماری ہولی ڈے ہے ہم سارا سال گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں ہم یہ چھٹی DESERVE کرتے ہیں۔ فرانس میں ہوٹل بکنگ ہو چکی ہے وہاں سے امریکہ کا سارا شیڈول فکسڈ ہے۔ ہوائی جہاز، ہوٹل بڑی مشکل سے بک ہوئے ہیں پھر اتنی ساری مصیبت سے پروگرام بنا ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے ہوزری والا بہت اچھے آدمی تھے لیکن جنازے میں شریک ہونا ایک IRITUAL ہے۔ تم سمجھو اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمیں ایسا کرنے دیتے؟۔۔۔"

پہلی بار زعفرانی اپنی ریڑھ کی ہڈی پر کھڑی ہوئی۔

"تحسین انکل کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔۔۔ میں واپس جا رہی ہوں آپ میرا ٹکٹ بنوا دیجئے" تحسین کو زعفرانی کے انداز نے بڑی سختی عطا کر دی اور اس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ زعفرانی بیگم کے دباؤ میں آ کر وہ کبھی کراچی نہیں جائے گا۔

وہ پارک کی بینچ پر گم صم بیٹھا تھا۔ چار ہفتے کی چھٹیاں گذار کر وہ کراچی لوٹنے کے بجائے لاہور آ گیا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ اچانک اس پارک میں آ بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں کسی سے ملنے کی خواہش نہ تھی۔ وہ ایک مدت کے بعد تنہائی میں اپنے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔

روڈ شیڈنگ کی وجہ سے سڑکیں، باغیچے اندھیرے تھے۔ قریب ہی فوارہ آنے جانے والی ٹریفک کی روشنی میں طلسماتی سا لگ رہا تھا۔

میں کون ہوں

کہاں ہوں میں

کیا میں کسی مقام پر کسی وقت موجود بھی تھا کہ نہیں۔

کئی چہرے کئی مورتیں اس کے ذہن پر دستک دے رہے تھے جیسے کوئی تتلی سردی کے موسم میں شیشے سے اندر آنا چاہے۔۔۔ لیکن شیشوں سے اندر آیا نہیں جاتا۔ تحسین کے ذمے ان کے کچھ ادھار تھے کچھ دینا لینا بنتا تھا۔ لیکن وہ نہ کبھی پہلے نہ اب اس کے مدار میں داخل ہو سکتے تھے وہ بار بار کبھی ماں.... کبھی ستا بیگم.... کبھی زعفرانی کے متعلق آنسوؤں کے ساتھ سوچنا چاہتا تھا۔

لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اب وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ کتنے بد نصیب ہوتے ہیں۔ جو ساری زندگی محبت نہیں کر سکتے وہ صما بکما یرجعون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جن کا دل اللہ کی طرف سے بند ہو جاتا ہے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبہم سی کیفیت تھی جس میں دل پر قفل پڑ جاتا ہے اور محبت قلب کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔

ایک ہوائی جہاز ہولے ہولے ایئرپورٹ کی جانب اتر رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں بڑی احساس محرومی نے جنم لیا۔ تحسین نے آہستہ آہستہ ان دیکھے خدا سے کہا۔۔۔ "اگر تو مجھے اتنی دولت اور اتنی محبت نہ دیتا۔۔۔ اور صرف ایک بار مجھے کسی سے قلبی لگاؤ محسوس کرا دیتا۔ تو شاید میں آج تیرا ممنون ہوتا۔ میرے رب جب تو کسی کے دل پر مہر لگا دے تو پھر وہ محبت کے تجربے سے کیسے گذرے اس کے بنجر میں شکر گزاری کا پھول کیسے اُگے.... وہ انسان کیوں کر کہلائے میرے آقا؟ کیوں کر؟"

اس وقت سڑک اور پارک کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

فوارہ نظر آنے لگا۔۔۔

ایک چھوٹی سی لڑکی دور سے بھاگتی اس کی طرف آئی اور اس کے پاس بنچ پر بیٹھ گئی لڑکی نے سرخ فراک اور لمبی جرابیں پہن رکھی تھیں۔

"انکل آپ اکیلے آئے ہیں۔۔۔"

"ہاں..."

"آپ کو ڈر نہیں لگتا۔۔۔"

"جو ہمیشہ اکیلے ہوں نا انہیں عادت ہو جاتی ہے"

اس جملے کو سمجھنے کے لئے لڑکی بہت چھوٹی تھی

اس نے فراک کی جیب سے چھوٹا سا ٹیشو نکالا اور اس کا گال پونچھتے ہوئے بولی۔۔۔ "انکل آپ رو رہے ہیں؟"

"نہیں تو"

"انکل آپ پلیز نہ روئیں خدا سے شکایت کریں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔۔۔"

جب لڑکی اس کی آنکھیں پونچھ چکی تو اپنا گیلا ٹیشو جیب میں ڈال کر بولی۔۔۔ "انکل سے تھینک یو آپ کی ماما نے آپ کو تھینک یو کہنا نہیں سکھایا..."

تحسین نے واپس جاتی لڑکی کو دیکھ کر آہستہ سے کہا۔۔۔ "نہیں بیٹے کسی نے مجھے تھینک یو کہنا نہیں سکھایا........." □□

عزیز اندوری

ہر نفس چھین جو کرتا ہے عطا، تم تو نہیں
وہی غربت میں بھی بھیجے گا گھٹا، تم تو نہیں؟

اتصال ایسا ہوا قرب وجدائی کا کہ بس
جسم سے لاکھ ہوئیں سانسیں جدا، تم تو نہیں؟

دستکیں دیتی ہے دروازے پہ کیوں موجِ نسیم
کون دیتا ہے مجھے رنگِ حنا، تم تو نہیں؟

دھوپ نگری میں بھلا کون چلا آتا ہے
سر پہ ڈالے ہوئے زرّیں قبا، تم تو نہیں؟

زیست کرنے کا مجھے کس نے سلیقہ بخشا
کون سیتا ہے یہ بوسیدہ قبا، تم تو نہیں؟

میں نے تو دار پہ جاکر بھی پکارا ہے بہت
کس نے پہچان کے منہ پھیر لیا، تم تو نہیں؟

خودبخود پیر مرے سوئے وفا اٹھنے لگے
کس نے یہ اذنِ سفر مجھ کو دیا تم تو نہیں؟

● 177-JUNA RISALA, STREET NO. 1
INDORE-452006 (M.P.)



منظر ایوبی

نذر سودا

۱۷۰۷ء-۱۷۸۱ء

ہم لٹے، آپ لٹے، اور لٹا کیا کیا کچھ
قہر اس شہر پہ نازل نہ ہوا کیا کیا کچھ
لے گئی چھین کے جنگل کی ہوا کیا کیا کچھ
تھا مرے گھر کے لئے میرا دیا کیا کیا کچھ
اس کو اک روز بچھڑنا تھا، بچھڑ جاتا وہ
اپنے ہمراہ مگر لے کے گیا کیا کیا کچھ
سہل سمجھا تھا بہت ترکِ مراسم تونے
سچ بتا دل کا ترے حال ہوا کیا کیا کچھ
بے نیازانہ ترے شہر سے گذروں کیسے
اب بھی اس خاک سے رشتہ ہے مرا کیا کیا کچھ
صبح بے نور تو ہر شام ہماری بے کیف
دل کے بجھنے سے مری جان بجھا کیا کیا کچھ
میری راتوں کا مقدر کوئی جگنو بھی نہیں
مل گئی جرم محبت کی سزا کیا کیا کچھ
دل میں ہیں زخم تو آنکھوں میں سمندر پنہاں
ہم کو اس دور سے تحفے میں ملا کیا کیا کچھ
چھپ گئے آنکھ سے کچھ ایسے بھی چہرے منظرؔ
باندھ کے نکلے تھے جو عہدِ وفا کیا کیا کچھ

● A-394, BLOCK-I, NORTH
NAZIMABAD, KRACHI-74700 (PAK)



علی ظہیر

موسم

موسم کی موشگافیاں
عریاں ہوگئیں
پھر بہاراں ہے
یا عکسِ بہاراں ہے
لیکن وہ ببول جو چبھے تھے
پچھلے پت جھڑ میں
ابھی تک چبھے ہوئے ہیں
موسم بدل گیا ہے

روح کی صورت

روح کی صورت
ماں کی کوکھ سے
قبر کے کونے تک
بس تاریکی ہے
جو بھی ہے مٹی کی صورت
تاریکی ہی تاریکی ہے
یعنی
جسموں کا کھیل یہ سارا
تاریکی ہی تاریکی ہے
لیکن پھر یہ روشنی کیا ہے؟
ست رنگی یہ خوبی کیا ہے؟
شاید یہ ہے روح کی صورت
انجانی لافانی ہے۔

249/3/71SAZ APAT. RD.1
ARA HILL HYDERABAD

مشرف عالم ذوقی
T-10, TAJ ECLAVE. LINK RD.
GEETA COLONY, DELHI-110031



نئی صدی میں اردو شاعری

بالآخر بیسویں صدی اپنی تمام ترہنگامہ آرائی کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ سن ۲۰۰۰ء کے ساتھ ہی ہم نے ایک نئے ملینیم میں، تمنا کا دوسرا قدم بھی رکھ دیا۔ صدی کے خاتمے تک شاعری کے مستقبل کو لے کر مایوسی اور تفکرات میں ڈوبی ہوئی باتیں کی گئیں۔ ان بحث ومباحثے میں عصر حاضر کے وہ قد آور نقاد بھی شامل تھے، ایک زمانے میں جن کا نام افسانے کی حمایت میں کم اور شاعری کی حمایت میں زیادہ روشن تھا۔ کچھ ادبی رسائل نے خصوصی طور پر اس بحث کو بھی ہوا دی کہ آنے والا عہد قطعی طور پر شاعری کے لئے موزوں نہیں ہے، بلکہ آنے والا عہد یا صدی یا نئی الفی فکشن یا افسانوی ادب کا تقاضا کرتی ہے۔ عام مجموعی خیال یہ تھا کہ STERROTYPED موضوعات اپنے انفرادی شعری اسلوب وضع کرنے میں یکسر ناکام رہے ہیں اس لئے اس عہد کو یا مشینی عہد کو شاعری کے نام وقف نہیں کیا جاسکتا۔ یا مستقبل قریب میں آنے والی نت نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے موجودہ شعری پس منظر کافی نہیں۔ نتیجہ،؟ فیصلہ صادر ہو گیا کہ آنے والا عہد شاعری کا عہد نہیں ہے۔

بحیثیت فکشن رائٹر بھی، میں اس بارے میں مسلسل سوچتا رہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ عرض کروں کہ اس سے زیادہ لغو بحث کسی بھی دوسری زبان کے ادب میں نظر نہیں آئے گی۔ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ جب ترسیلِ اظہار کے لئے الگ الگ صنف سخن موجود ہیں، اور ادیبوں کو کسی بھی صنف کو اپنانے کی آزادی حاصل ہے تو پھر موازنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آیا کبھی اس طرح کی بحث شروع بھی ہو سکتی ہے یا نہیں کہ تنقید بڑی ہے یا تخلیق، شاعری بڑی چیز ہے یا افسانہ۔

شاعری میرے نزدیک بلند مرتبے کی چیز ہے اور مجھے احساس ہے کہ کلیم الدین احمد کے نیم وحشی صنف سخن، کو بھی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ایک مغربی مفکر، اکسٹائن، کا قول تھا کہ آپ اپنے آپ کو سجا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ ایک (مزاحیہ) کامک کیریکٹر بن جاتے ہیں۔ صنف شاعری کی پابندیوں نے اس کے دائرے کو مشکل اور نیم وحشی بنا رکھا ہے۔ یعنی اگر شاعر ان پابندیوں سے دامن نہیں بچا پایا اور وہ محض گنگنانے کی حد تک یا قافیہ پیمائی میں الجھا رہا تو اس کی شاعری بنے بنائے سانچے یا طے شدہ فارمولوں میں گھٹ کر رہ جائے گی اور دم توڑ دے گی۔ اور ہوا یہی۔ کلیم الدین احمد کے نیم وحشی صنف سخن کے ساتھ یہی سلوک دہرایا جاتا رہا۔ لیکن جیسے ہر کہانی ادب میں شمار نہیں ہوتی ویسے ہی، طے شدہ فارمولوں یا بنے بنائے سانچوں میں ڈھل جانے والے ہر شعر کو غزل کی جمالیات کے ساتھ بھی نہیں جوڑا جاسکتا۔ اس لئے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعری اور افسانہ دو الگ الگ صنف سخن ہیں اور ان کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔

پچھلے دس بیس برسوں میں کی جانے والی شاعری کی فضا مجھے کچھ زیادہ ہی راس آئی ہے۔ جب کہ ان دس بیس برسوں میں انفرادی خیال کے نہ ہونے پر اعتراض زیادہ کئے گئے اور اس کا شکار ان دس بیس برسوں میں ابھرنے والے تمام شاعر ہوئے۔ دراصل ہمارا انقاد شاعر کو پیمبر یا فرشتے کے طور پر دیکھنے کا عادی رہا ہے اور اس کی ذہنیت پر مسلسل یہ خیال شب خون مار تا رہا ہے کی جدیدیت اور ابہام سے الگ شاعری کی ہی نہیں جاسکتی۔ اس لئے جہاں کہیں بھی اسے کوئی بات صاف صاف طریقے سے کہی گئی نظر آتی ہے وہ ایک خاص طرح کی جمالیات کے تحت اسے REJECT کر دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انہی نقادوں نے شاعری میں برتی جانے والی ترقی پسندی پر اعتراضات کئے تھے۔ شاعری کو نعرہ، انقلاب یا پروپیگنڈہ تک کہا گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس عہد سے جڑے شعراء کرام خود کو ترقی پسند کہتے تھے۔ اب فرق یہ ہے کہ نئے شعراء خود کو کسی بھی خانے میں قید دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی شاعری نہ جدیدیت کی کوکھ سے جنمی ہے نہ ترقی پسندی کے نعرے یا پروپیگنڈے نے ان کی شعری کائنات کو جلا بخشی ہے۔ اور یہی بات اہم ہے کہ شعراء کی نئی پود کسی مخصوص فکر، تحریک یا نظریے کی پابند نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام تر احساس کے ساتھ آزاد ہے۔ اور یہی آزادی وہ اپنے صوتی آہنگ، کو بھی سونپتی رہی ہے:

"ایک سچے فن کار کو اپنے ذہن کے تمام دروازے کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ تازہ افکار و نظریات سے نابلد نہ رہے لیکن اپنے قلم کو کسی خاص نظریے کا تابع نہیں بنانا چاہئے کیوں کہ کوئی بھی نظریہ کتنا بھی عظیم کیوں نہ ہو، ایک خاص وقت کے بعد متروک و مردود قرار دے دیا جاتا ہے۔ تغیر و تبدل فطرت کا نظام ہے۔ اسی لئے کسی مخصوص نظریے کی تبلیغ کے مقصد سے لکھا گیا ادب بھی جلد ہی اپنی چمک دمک کھو بیٹھتا ہے اور اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔" [نعمان شوق، پیش لفظ: اجنبی ساعتوں کے درمیاں]

ایک اور اقتباس دیکھئے:

"سماج خرابیوں اور بگاڑ کی آخری منزل پر ہے۔ دنیا بہت تیزی سے بدلی ہے۔ تہذیبیں، قدریں، عقیدیں، اصول، رسمیں، پوشاک، ترجیحات سب نے

> اچانک اپنے معنی کھو دئے ہیں۔ صحیح اور غلط کے بیچ کی لکیر تیزی سے مٹی ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو بھی ہو رہا ہے ہماری پسند کے خلاف ہو رہا ہے۔ شاعری ناپسندیدگی اور احتجاج کے اسی اظہار کا نام ہے۔ مسجدوں اور مندروں سے جوتے چوری ہونے کی معمولی وارداتوں سے لے کر سیاست کے گلیاروں میں ہونے والی بڑی اور اول درجے کی بدعنوانیوں تک ایک لمبا سلسلہ ہے۔ برائیوں، خرابیوں اور ذلالتوں کا۔ ایسے میں قلم والوں کی ذمہ داریاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ کچا پکا آدمی تو قلم کی اس خدمت سے فوراً ریٹائر ہو کر بھیڑ میں شامل ہو جانے کو عقلمندی تصور کرنے لگتا ہے۔ بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو بدعنوانیوں کے اس جہان کو قلم کی نوک سے کھرچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لئے قلم کان کھجانے کا کوئی آلہ یا پاجامے میں ازاربند ڈالنے کی کوئی سلائی نہیں۔ ہمارے پاس کرکٹ ٹیموں کا گھراؤ کرنے اور پچ کو کھود کر برباد کرنے کا وقت ہے مگر ملک کے بنیادی مسائل کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں۔ کیا کبھی ملک کے صف اول کے شہریوں نے کرگل میں جا کر کیمپ لگانے اور فوجیوں کی مدد کے لئے کوئی قدم اٹھانے کی زحمت گوارا کی۔ قلم والوں کو یہ باتیں کچوٹتی ہیں شاعر یا ادیب اس تکلیف سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ اسے اس معرکے میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ مستقل، بنا تھکے۔[دھوپ تیز ہے۔ شکیل جمالی]

مندرجہ بالا اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ موجودہ عہد کے شاعر نے کس طرح مخصوص نظریے کی تبلیغ کو ادب کی موت کے بطور دیکھا ہے۔ مسلسل تغیر و تبدل سے گذرتی کائنات میں آج کوئی بھی مخصوص نظریہ وضع کیا جا سکتا ہے یہ نفی کا عہد ہے۔ ہر قدم اصول و قانون کا ایک بت ٹوٹتا ہے اور دوسرا جنم لیتا ہے۔ شاعر نہ کسی آسمانی کہرے میں گھرا ہے نہ وہ محض چند مزدوروں یا دہقانوں کے درمیان ہے اور "بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال" کا ورد کئے جا رہا ہے۔ حقیقتاً آج کے شاعر نے اپنے بدن سے فرسودہ جمالیاتی، سیاسی سماجی، معاشی اور فکری امتزاج کی کیچلی اتار پھینکی ہے وہ اپنے عہد کو لے کر سنجیدہ ہے اور محسوس کرتا ہے کہ:

> "انسانی ارتقا کی تاریخ اس موڑ پر جہاں بیسویں صدی اپنا سفر ختم کر رہی ہے۔ کلون، روبوٹ، انٹرنیٹ اور ایسے نہ جانے کتنے موضوعات ہماری روز کی گفتگو کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ وہ حسّی اور جذباتی نشیب و فراز سے پُر زندگی جو ہمارے پیش روؤں کو ورثے میں ملی تھی، ہمارے لئے شاید قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ میری شاعری میرے حسی تجربات کی زائیدہ ہے جس کی نیرنگی اور بوقلمونی نے میرے اندر ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے۔"[نعمان شوق، پیش لفظ: اجنبی ساعتوں کے درمیان]

شاعر حساس ہی نہیں بلکہ اپنے عہد سے آگاہ بھی ہے۔ کلون سے، روبوٹ سے، انٹرنیٹ سے اور عالمی سیاست سے۔۔۔ شاید اسی لئے، نئی صدی میں اس نے گھٹن اوڑھنے سے انکار کر دیا ہے اور اپنے اندر برسوں سے جمع کی گئی چیخ نکالنے کا وقت آ گیا ہے، وہ ایسا محسوس کرتا ہے۔ اس لئے یہ کہنے میں اسے ذرا بھی قباحت نہیں ہے کہ اس کی شاعری اس کے حسّی تجربات کی زائیدہ ہے۔ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر وہ یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

> "میں اپنے پیش رو شعرا کی طرح اپنی ذات کے حصار میں مقید ہونا پسند نہیں کرتا"

پیش رو شعرا کی اندھی تقلید سے انکار ہی نے، آج کے شاعر کو، خود کو REJECT کرنے کا فن سکھایا ہے۔ وہ اپنے عہد اور مسائل کے اس قدر قریب ہے کہ اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ ممکن ہے، شاعری کا نقاد اس کے لکھے ہوئے سرمائے کو شاعری ہی تسلیم نہ کرے۔ جیسا کہ زیادہ تر ترقی پسند شاعروں کے ساتھ کیا گیا۔ اسے خود کو REJECT کرنے کی پرواہ اس لئے بھی ہے کہ۔

> (۱) شعری تنقید ابھی بھی مروجہ اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ (۲) زیادہ تر نقاد مغرب کی اندھا دھند تقلید میں اندھے رہے ہیں۔ وہ مروجہ سانچوں یا طے شدہ فارمولوں سے آگے بڑھ کر شاعری کو پرکھنے میں یقین نہیں رکھتے (۳) کیا جوش کی انقلاب والی شاعری، ساحر اور وامق کی شاعری ایک عہد کی ضرورت نہیں تھی؟ (۴) تغیر و تبدل سے آنکھیں موڑنے والے کو وہ سچا فن کار تسلیم نہیں کر سکتے۔

نتیجہ کے طور نصیر احمد ناصر تک یہ تسلیم کرنے سے گریز نہیں کرتے کہ اب شاعری کی نئی بوطیقا تخلیق کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور ایسے میں آج کے مسائل سے آنکھیں چار کرنے والے شاعر کی ذمہ داری میں ایک نقاد کی ذمہ داری بھی شامل ہو جاتی ہے۔

> "ان پر (نقادوں پر) یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ بدلتے ہوئے عالمی و ملکی ادبی تناظر میں اردو تنقید کے نئے سانچے وضع کریں اور جینوئن تخلیق کاروں کی نہ صرف نشاندہی کریں بلکہ انہیں ہجوم ناشناس میں گم ہونے سے بچائیں تاکہ اردو شعر و ادب عالمی ادبی رویوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔[نصیر احمد ناصر، تسطیر، ستمبر ۱۹۹۷ء]

ادبی منظرناموں کو عالمی رویوں سے ہم آہنگ کرنے کی بے چینی نے ہی، شاعر کو گلوبل ویلج یا نئے سائبر سماج کا چہرہ دکھایا ہے۔ اسے مابعد جدید ہونے پر بھی اعتراض نہیں ہے، لیکن وہ ہجوم میں گم ہونا نہیں چاہتا۔ یہاں تک کی کسی ازم میں، تحریک میں، فلسفے میں پابندیوں میں اس کا دم گھٹتا ہے نئی صدی کے شاعر کو اپنی آزادی پیاری ہے۔ وہ فرد اور تنہائی کی باتیں نہیں کرتا۔ وہ فلسفہ وجودیت سے بہت دور نکل آیا ہے۔ اس گلوبل، سائبر اور انٹرنیٹ سماج میں اسے اپنی شناخت کی بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ آئن اسٹائن کی طرح اندھیرے میں نہیں ہے کہ "تیسری جنگ عظیم کس طرح لڑی جائے گی۔ جب کی چوتھی جنگ کے طور پر تیر اور بھالوں کا استعمال شروع ہو جائے گا"۔ وہ ایٹمی تجربات سے بھی واقف ہے اور جانتا ہے کہ سکنڈ سے بھی کم لمحے میں ساری دنیا نیست و نابود ہو سکتی ہے۔ شاید اسی لئے ایک خاص طرح کے اٹوپیا میں سانسیں

ہوئے وہ یہ نہیں کہہ سکتا۔

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا ایک لڑکی تمہارا پتہ لے گئی [بشیر بدر]

دراصل حساس فن کار سائبر سماج میں پیش آنے والی ہر ایک تبدیلی کا ایمانداری سے محاسبہ کرتا ہے اور اپنی وضع کی گئی شعری فضا کے لئے یہ کہنے میں اسے ذرا بھی اری نہیں ہوتی کہ۔

"گذشتہ دس پندرہ سالوں میں ہماری زندگی میں سماجی، سیاسی معاشی اور فکری شعور پر نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے جینے کا ڈھنگ بدلا ہے۔ سوچنے کا انداز بدلا ہے۔ قدروں کے پیمانے بدلے ہیں۔ مسائل کی شکلیں بدلی ہیں۔ ذات پات، بنیاد پرستی، علاقائی عصبیت، اصول اور آدرش کا فقدان، دہشت گردی کا زور، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آمد، صارفیت کا غلبہ اور کالے دھندوں کے فروغ سے آج کی زندگی اثر پذیر ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے بعد آج کا فن کار قصباتی، شہری اور ملکی حدود سے باہر نکل کر ساری دنیا سے جڑ گیا ہے۔ اس کے تجربے اور مشاہدے کے لئے ایک بڑا کینواس تیار ہو گیا ہے۔ فن کار چونکہ سماج کا سب سے حساس رکن ہے، اس لئے وہ ہر تبدیلی سے فوراً متاثر ہوتا ہے اور اس کا اثر ادب پر بھی براہ راست پڑتا ہے

[عالم خورشید۔ پیش لفظ۔ زہر گل]

نعمان شوق ہوں، عالم خورشید، خورشید اکبر ہوں یا خالد عبادی یا شکیل جمالی ہوں، آپ واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ شعری سفر میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ غزل کی روایت کو گل و بلبل سے جوڑنے کا لامتناہی سلسلہ نہ صرف منقطع ہوا ہے بلکہ فن کاروں نے شعری حدود سے باہر نکل کر اپنی نثری تنقیدی صلاحیتوں کو بھی ہوا دی خود کو پرانی نسل سے علاحدہ کرنے کا یہ جنون اس بات کا غماز ہے کہ نئے ادبی تقاضوں سے ان کی شعری ادبی فضا کس بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ شاید اسی لئے مستقبل خطرات اور نئے سائبر سماج کی بنیادی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ان کا وژن بالکل صاف ہے۔ اور نعمان شوق سے عالم خورشید تک خالد عبادی اور شکیل جمالی تک نئے ٹن کی فضا، اپنے اسلوب اپنے ڈھنگ کو طے شدہ فارمولوں سے الگ رکھنے پر بضد نظر آتی ہے اور صاف طور پر اعلان کرتی ہے کہ۔

(الف) سچا فنکار وہی ہے جو ذہن کے تمام دروازے کھلے رکھے۔ (ب) کسی مخصوص نظریے کا پابند نہیں ہو۔ (ج) کلون، روبوٹ، انٹرنیٹ، جیسے کتنے ہی موضوعات روزانہ کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ (د) میں اپنی ذات کے حصار میں مقید ہونا پسند نہیں کرتا۔ [یہ حوالے نعمان شوق کی کتاب کے پیش لفظ سے لئے گئے ہیں]

اب عالم خورشید کا کنفیشن دیکھئے۔۔۔

گذشتہ دس پندرہ برسوں میں قدروں کے پیمانے اور مسائل کی شکل بدلی ہے۔ ر دہشت گردی کا زور ر اصول، آدرش کا فقدان ر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آمد ر صرفیت کا غلبہ ر یہاں تک کہ ر الیکٹرانک میڈیا کی ترقی ر کالے دھندوں کا فروغ ر فن کار کا ان تبدیلیوں سے متاثر ہونا ضروری ہے ر [زہر گل کے دیباچے سے۔]

بیسویں صدی تک شعری منظر نامے کو کوزے میں بند کرنے کی تنقیدی سازش سے اکیسویں صدی کا شاعر اب بہتر طور پر نکل آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعمان شوق عالم خورشید تک ازم، اور پابندیوں کے خلاف، احتجاج کی زوردار چیخ سنائی دیتی ہے۔ اپنے پہلے مجموعے نئے موسم کی تلاش میں عالم خورشید نے صاف طور پر کہا تھا۔

"میں شعر و ادب میں کسی تحریک، رجحان یا نظریے کا قائل نہیں نہ ادب کو مکتبی، صوبائی یا ملکی دائروں میں قید کرنے کے حق میں ہوں۔ کیوں کہ ادب تخلیق کرنا کوئی فائل ورک نہیں کہ دس بجے سے پانچ بجے تک دفتر کی کرسی پر بیٹھ کر گھسے پٹے لائن آف ایکشن کے سہارے مکھی پر مکھی چپکانے یا چراغ سے چراغ جلانے کا کام کیا جائے......"

وہ آگے لکھتے ہیں:

"بدلتے ہوئے وقت اور زندگی کی رفتار کے ساتھ ادب کے رنگ و روپ میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ ادب بہر حال وقت اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تحت میں نے جو کچھ محسوس کیا اسے کسی مصلحت کے بغیر اور کسی ازم کو اپنے راہ میں حائل کئے بغیر آزادانہ طور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

یہاں قابل غور امر، ایک اور بھی ہے۔ جہاں پرانی روش، فرسودہ ازم، سے باہر نکلنے کی بے چینی ہے، وہیں ایسا نہیں ہے کہ آنے والی نئی روشنیوں کے درمیان یہ نئی تحریک، ازم، خیمے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ نئی نسل کسی بھی طرح کی پابندیوں کے خلاف ہے۔ روایتی شاعری کی قبا چاک کرنے۔ اپنے آپ کو ازم یا خیمے سے ت دلانے کے بعد وہ پتھریلی سڑکوں پر چلنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری اکیسویں صدی کے تخیلاتی منظر نامے سے گذرتے ہوئے بیسویں صدی میں ا ہونے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں پر بھی یکساں نظر رکھتی ہے۔ پہلے جہاں سیاسی پس منظر یا مذہب کے خلاف نئی شاعری میں ایک باغی جذبہ نظر آتا تھا ہندوستان سے پاکستان تک آج اردو شاعری میں مذہب کی بھی بازیافت ہونے لگی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس مذہب کو افیم، مذہبی فتور، سیاسی تنظیموں کا آلہ کار رکیا جانے لگا تھا، اب شاعری میں نشاۃ ثانیہ کے طور پر اس کی واپسی ہوئی ہے۔ شاید ایسا ہونا بھی تھا۔

"..... کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا پہلے ہی کی طرح ایک مذہبی دنیا ہے اور مذہب اس میں مرکزی ریفرنس ہے۔ جدید دنیا سے کسی طرح دوری مذہب

(باقی صفحہ ۳۱ پر دیکھئے)

عشرت آفریں

بالک تیرے گال
جنگ کی پاگل آگ سے
کیسے ہو گئے لال

●

بالک تیرے نین
دھول، دھوئیں اور دھوپ سے
زخمی اور بے چین

●

بالک تیرے ہاتھ
موت کھلونے تھام کر
نکلے کس کے ساتھ

●

سپنے ڈھونڈ لائیں
سڑک کنارے ننھے ہاتھ
جوتے چمکائیں

کاروں کا سیلاب
پیچھے ٹولی بچوں کی
دوڑنے کو بے تاب

●

کس کے چاکر ہیں؟
پھیلے ہاتھ گلاب سے
یہ بھی گداگر ہیں!؟

●

سپنے میرے ہیں
فٹ پاتھوں پر دق زدہ
بچے میرے ہیں

●

رنگ برنگے پھول
گھوڑے پر شعلوں کے ساتھ
رقصاں ننگے پھول

●

ہنستے، گاتے چاند
شام ڈھلے کی گلیوں میں
شور مچاتے چاند

●

کیاری بھرے گلاب
چمپا جیسی رات میں
آنگن اور مہتاب

جونہی کھلے کتاب
آئے کھڑکی کود کے
بستر پر مہتاب

●

چولہے آنگن میں
ہنسیں کسیلی آنکھوں پر
اکثر ساون میں

●

مجذوبوں ساون
چکنا مکنا سادھو بیلا
پیار میں دہکا دن

●

بوریں جب آئیں
باغ مرے مالیر کے
خوشبو برسائیں

●

بستی خالی ہے
شام نگر جھنجھور کی
جادو والی ہے

●

کس سے کریں سوال؟
سندھو تیرے پھول بن
ہو گئے خواب خیال!؟

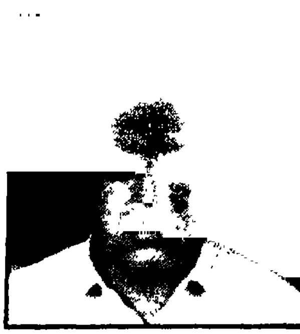
●

پلّہ اور تھاڈل
امرت تھا میرے لئے
سندھو تیرا اجل

● 15310 - CAMINO DELSOL HOUSTON, TX - 77083 (U.S.A.)

آنند لہر

HIGH COURT CAHAMBER NO.29
SADAR COURT, JAMMU-180001



سرحد کے درمیان

حمیدہ کا بس اتنا قصور تھا کی وہ پودینہ لانے کے لئے سرحد کے دوسری طرف گئی تھی اصل میں حمیدہ کے باپ غلام نے حمیدہ کو سب کچھ بتادیا تھا نمبردار کے ظلم کی کہانی سنائی تھی اور یہ بھی بتلایا تھا کہ کیسے راجہ کی دلوی ایک گھوڑسوار کے ساتھ بھاگ گئی تھی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی حمیدہ جان گئی تھی اور یہ بھی جان گئی تھی کہ لڑکی جب بڑی ہو جائے تو راجہ و نمبردار کی سواری سے اسے کوسوں دور رہنا چاہئے۔

مگر یہ نہیں بتلایا کہ جہاں پودینہ اُگتا ہے وہ جگہ دوسرے ملک میں ہے اور بیچ میں ایک سرحد ہے اور جو نظر نہیں آتی مگر آنکھوں کی روشنی کی دشمن ہے پاؤں سے ان کی رفتار چھین لیتی ہے۔ اصل میں پودینہ غلام کے باپ رحمان نے اُگایا مگر اس وقت ملک ایک تھا کوئی سرحد نہیں تھی۔ تقسیم کے بعد ایک سرحد وجود میں آئی جس کی وجہ سے پودینہ ایک طرف رہ گیا اور اس کا مزہ لینے والے دوسری طرف ٹھیک اسی طرح جس طرح سے سائیں پھکڑ کے مزار کے ساتھ ہوا یعنی مزار ایک طرف رہ گیا اور ماننے والے دوسری طرف۔

شاید غلام نے اسے ایک معمولی سا واقعہ سمجھا یہ اس کی نظروں میں کوئی عام بات تھی اس لئے اس نے حمیدہ کو نہ بتلایا تھا۔

گاؤں کے اندر رحمان کے گھر کی پودینے کی چٹنی مشہور تھی جس طرح راجہ کا رحم دل ہونا مشہور تھا۔ راجہ گاؤں کی لڑکیوں کو کپڑے سلا کر دیا کرتا تھا مگر ان کی چھاتیوں کا ناپ خود لیا کرتا تھا۔ نمبردار کی فراخ دلی بھی مشہور تھی جو گاؤں کے لوگوں سے ہر فصل پر اناج لیا کرتا تھا اور پھر مہینے میں ایک بار ان کو کھانا بھی کھلایا کرتا تھا۔ اس چوکیدار کی کہانی بھی مشہور تھی جو دیواروں میں سوراخ کر کے رات کو نوجوان شادی شدہ جوڑوں کو سوتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ بیساکھی کا دنگل عید کا جلوس بھی اس گاؤں کی مشہور چیزیں تھیں یہ سب رحمان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کا تھا حمیدہ اپنے گھر کی سب سے بڑی تھی کیوں کہ اس کی ماں ناہدہ مر گئی تھی، حمیدہ جب بالکل چھوٹی تھی، ہوا یوں کہ ایک دن حمیدہ کی ماں سب کو کھانا کھلا کر بستر پر لیٹی اور پھر مر گئی لیکن ایک اور بھی بات ہوئی تھی وہ یہ کہ مرنے سے پہلے وہ گری بھی تھی اصل میں وہ مرنے سے پہلے بیمار تھی مگر یہ بات اس نے کسی کو نہ بتائی تھی کیوں کہ اپنی بیماری اگر وہ ظاہر کرتی تو گھر کے اندر کھلبلی مچ جاتی اور جو پانچ ہزار روپئے ایک ایک روپے اکٹھا کر کے اس نے جمع کئے تھے وہ خرچ ہو جاتے۔ گاؤں کے اندر ایک ہی ڈاکٹر تھا جو راجہ کی رانیوں کا علاج کرنے میں مصروف رہتا تھا اور کچھ وقت اگر بچ جاتا تو نمبردار کے گھر میں گپیں لگانے میں مصروف رہتا اور سائیں داس کمپاؤنڈر کے علاج کی یہ کہانی ہے۔ اگر مریض کو ویسے ہی ٹھیک ہونا ہوتا تو ہو جاتا اور اگر مرنا ہوتا تو مر جاتا ہے بس حمیدہ کی ماں نے سوچا کہ دوائی پر فضول روپئے خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہونا ہوگا وہ تو ہو ہی جائے گا۔

ناہدہ کی موت کے بعد غلام نے دوسری شادی نہ کی کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ خدا کچھ بھی کر سکتا ہے مگر دوسری ناہدہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ چپ چاپ ناہدہ کا غم اور حمیدہ کا پیار سینے سے لگائے جی رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اُگرواد زوروں پر تھا غلام کے اندر چٹنی کھانے کی اچانک خواہش پیدا ہوئی اور وہ یہ بھول کر کہ پودینہ سرحد کی دوسری طرف ہے حمیدہ سے کہا کہ پودینہ لے آؤ، حمیدہ پودینہ لینے گئی اور پکڑی گئی غلام کے سامنے اسے سپاہی لے کر چلے گئے وہ چیخا مگر سپاہیوں نے کہا کہ اگر زیادہ چیخا تو حمیدہ کو گولی ماردی جائے گی۔ حمیدہ کی ننھی ننھی باہوں میں سخت لوہے کی ہتھکڑیاں پہنادی گئیں۔ سب دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے دریا کا پانی آواز دے کر کہہ رہا تھا کہ یہ سرحد ہے۔ یہ سرحد کی آواز ہے جو ہتھکڑیاں کھنکنے سے ہوتی ہے۔ غلام نے رونا چاہا مگر رو نہ سکا دریا کے پانی نے پھر آواز دی یہ سرحد کی طاقت ہے جو ہر آواز کو خاموش کر دیتی ہے۔ رشتوں کو توڑ دیتی ہے۔ حمیدہ چلی گئی غلام چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پودینے کے پتوں نے مل مل کر کہا "ہمارا کوئی ملک نہیں ہے، ہمیں تو مٹی چاہئے، ہوا چاہئے اور پانی چاہئے۔"

دوسرے دن حمیدہ کو ایک انٹروگیشن سنٹر میں لے جایا گیا اور اخباروں میں یہ خبر سرخیوں میں دی گئی.... "ایک لڑکی پکڑی گئی" "اب اُگرواديوں نے لڑکیوں کے ذریعے ہتھیار لانے کی کوشش شروع کردی ہے"

"ایک لڑکی پودینے کے پتوں کے نیچے ہتھیار دباتے ہوئے پکڑی گئی"

پولس والوں کے لئے انعام "حکومت کی ایک اہم کامیابی"

یہاں حمیدہ سے پوچھ تاچھ کی گئی اسے لگا کہ قیامت آگئی ہے کیوں کہ

انٹروگیشن سنٹر میں اس کی باہوں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح مروڑا گیا معصوم آنکھوں کی نازک پتلیوں کو آگ کے شعلوں کو برداشت کرنے کے لئے کہا گیا بعد میں سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ تو اصل میں پودینے کی چٹنی کی کہانی ہے اور یہ سب اس لکیر کی وجہ سے ہے جسے سرحد کہتے ہیں۔ عام آدمی کو جس سے کوئی واسطہ نہیں اور حمیدہ کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا کیوں کہ وہ تو دھرتی کی بیٹی ہے اور دھرتی کی کوئی سرحد نہیں ہے حمیدہ آسمان کے نیچے رہتی ہے اور آسمان کی بھی کوئی سرحد نہیں ہے۔ یہ سرحد تو ضرورت ہے حکمرانوں کے لئے تاکہ وہ حکومت کر سکیں۔

مگر بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اصلیت ظاہر کرنے کی کوئی بھی شخص جرأت نہ کر سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا خدا کی زمین پر پودینہ توڑنا جرم ہے اسی نے ایک دن خدا سے سوال کیا کہ تو نے زمین کو کھائیوں میں بانٹ کر خود ہی ملک کیوں نہیں بنادئے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے ملک میں نہ جا سکیں۔

اس جیل میں بشیر نامی ایک سپاہی بھی نوکری کرتا تھا۔ جو جوان تھا اور خوبصورت بھی وہ اپنی وردی کی نہایت عزت کرتا تھا۔ ایک دن حمیدہ کی آنکھیں بشیر کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں اور انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی محبت جس کا کوئی ملک نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی سرحد، جس کی کوئی زمین نہیں ہے۔

صمد قصائی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر چپ رہا حالانکہ صمد قصائی بڑا ظالم تھا اس نے کئی قتل کئے تھے۔ پہلے اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا تھا مگر بعد میں اس کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا گیا تھا مگر نہ جانے آج کیوں صمد قصائی بے بس تھا وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔

عجیب و غریب ماحول کے اندر حمیدہ رہ رہی تھی۔ حمیدہ اور بشیر کی محبت کے چرچے عام ہوئے مگر سب صمد قصائی کے ڈر سے خاموش رہے کیوں کہ صمد قصائی کو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اسے تو پہلے ہی عمر قید ہوئی ہے اور جیل سے باہر وہ خود بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں ملکوں کے سپاہی ٹینکوں اور توپوں سے سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ مشقیں بھی جاری تھیں اور دہشت گرد بھی سرحد سے ادھر اُدھر ڈھکیلے جا رہے تھے مگر حمیدہ اور بشیر ایک دوسرے سے محبت کر رہے تھے۔ دونوں کے ملک الگ الگ تھے مگر آنکھوں کے رشتے قائم ہو چکے تھے ایک دوسرے کے جسم اچھے لگنے لگے تھے ایک دوسرے کے ملک اچھے لگنے لگے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا پیار ہوا کی طرح ہے اور ہوا کا کوئی ملک نہیں ہے۔ وہ پانی کی طرح بہتا ہے اور پانی کا کوئی ملک نہیں ہے جس طرح ہوا کی صرف زمین ہے اسی طریقے سے بشیر کی بھی حمیدہ ہو گئی۔

ایک دن کافی دنوں کے بعد بارش برسی تھی زور کا طوفان آیا تھا۔ سب قیدی بیرکوں کے اندر چلے گئے۔ حمیدہ ایک درخت کے نیچے کیوں کھڑی تھی یہ حمیدہ کو بھی معلوم نہ تھا اور بشیر اس درخت کے پاس کیوں گیا یہ بشیر بھی جانتا نہ تھا۔ نظروں سے نظریں ٹکرائیں دونوں کے بدن ایک دوسرے سے لپٹے۔ صمد قصائی نے دیکھا مگر نظریں چرا گیا۔ طوفان تھم گیا مگر وہ دونوں کافی دیر تک وہاں رہے۔ جب جسم ملے تو لگا کہ بارش ان کو چوم رہی ہے اور دھوپ انہیں چھونے کا انتظار کر رہی ہے۔ وقت بیتا آخر طوفان تھم گیا مگر دونوں کے اندر کا طوفان قائم رہا۔

بشیر کو ایک دن معلوم ہوا کہ حمیدہ کے پیٹ میں اس کا بچہ ہے۔ یہ جان کر بشیر پریشان ہوا، وہ گھبرایا بھی، اس لئے نہیں کہ بچہ کیوں ہے یا بچے کو دنیا میں آنے کا حق نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ حمیدہ اور اس کا ملک الگ الگ ہے۔

وقت گذرا حمیدہ کے ہاں بچہ ہو گیا۔ بچہ بڑا ہوا ادھر حمیدہ کی سزا ختم ہو گئی۔ آخری دن حمیدہ جیل سے باہر آئی بشیر باہر کھڑا تھا اس کے گھر والے بھی اس کے ساتھ ہی کھڑے تھے وہ خوش تھے کیوں کہ ان کی بہو نے آج ان سے ملنا تھا، ان کے پوتے نے ملنا تھا۔

مگر جوں ہی حمیدہ جیل سے باہر آئی اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر سرحد پر لے جایا گیا اور سرحد کی دوسری طرف بھیج دیا گیا۔ وہاں کے سپاہیوں نے حمیدہ کو بالوں سے پکڑ کر کہا "اندر آ" بشیر چیخا ایسا مت کرو یہ میری بیوی ہے دوسری طرف کے سپاہی نے کہا "چپ یہ ہمارے ملک کی ہے" مگر سپاہیوں نے بچے کو اندر آنے کی اجازت نہ دی "یہ ہمارے ملک کا نہیں ہے اس لئے اس کے لئے حکم نہیں ہے"

بچہ سرحد کی دوسری طرف آنے لگا بشیر جوں ہی بچے کو پکڑنے کے لئے دوڑا سپاہیوں نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا، یہ بچہ ہمارے ملک کا شہری نہیں ہے۔ سرحد کے ایک طرف حمیدہ کھڑی ہے اور دوسری طرف بشیر اور درمیان میں ان کا بچہ جس کا کوئی ملک نہیں ہے۔□□

بقیہ مکتوبات موصولہ

اردو زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کی شمولیت اس زبان کا مزاج ہے اور یہ ایک خوش آئند بات بھی ہے تاہم انگریزی الفاظ کا استعمال انگریزی تہجی میں تشویش ناک ضرور ہے۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کے مترادفات اردو میں وضع کئے جا رہے ہیں ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی، بلکہ پاکستان میں تو بطور خاص۔ ہمیں اردو میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات و مترادفات کو قبول کرنا چاہئے اور ان کا چلن روز مرہ میں داخل ہونا چاہئے، بالخصوص علمی و ادبی مضامین میں۔ مثلاً یہ کہ انگریزی میں کسی بھی زبان کا لفظ مستعمل ہو وہ ہوتا انگریزی تہجی ہی میں چاہے وہ کسی بھی تہجی کا ہو۔ یہ مقام فکر ہے۔ ایک سطر اردو میں لکھ رہے ہوں تو اس میں ایک لفظ انگریزی تہجی میں تو دوسرا لفظ رومن تہجی میں تیسرا لفظ ترکی میں تو چوتھا لفظ ہندی تہجی میں۔

تو کیا ۲۱ ویں صدی کی اردو اسی نوعیت اور معیار کی ہو گی؟

●HAKIM CHAK, RAFI GANJ,
AURANGABAD-82412 BIHAR



شہناز نبی

اجل ــ مجھ سے مل!

ابھی تو تمہارے خدوخال
آنکھوں کے رستے سے دل میں اتر ہی رہے ہیں
ابھی تو تمہارا وہ روشن سالہجہ
مرے گھپ اندھیرے بدن کی سکڑتی نسوں میں
جلانے کو ہے انگنت مشعلیں
ابھی میرے خلیوں میں
برسوں کی خوابیدہ پہچان کو
رشتہ جسم وجاں کے عمل سے گذرنا ہے باقی
ابھی روح میں جذب کرنا ہے تم کو
یہ مانا کہ ہم تم اساطیری کرداروں سے کچھ الگ ہیں
مگر یہ بھی طے ہے
کہ سوئے دیئے جگمگانے سے پہلے
کہ برفیلی چادر ہٹانے سے پہلے
کہ غرقاب ناویں ترانے سے پہلے
میں جانے نہ دوں گی تمہیں
ستیہ وان ــــ!

● 28-A, RIPON LANE, CALCUTTA-16



قمر قدیر ارم

انتباہ

میں کسی اور کے شبستاں میں
جل رہی ہوں مگر تیری خاطر
میں کسی اور راہگذر میں ہوں
میری منزل تو مگر تو ہی ہے
تو نے آخر یہ کیسے مان لیا
کہ میں تیری جستجو سے الگ
تیری چاہت تری طلب سے الگ
کسی اور کی امانت ہوں؟

ہاں اگر تو رہا یوں ہی محبوس
اپنی ہی ذات کی فصیلوں میں
بڑھ کے تو نے نہ پذیرائی کی
آ کے تھامانہ اگر میرا ہاتھ
تو نے گریوں ہی بے وفائی کی
تو پھر، میں، تیری قسم تجھ سے
ایسے بچھڑوں گی کہ پھر نہیں مل پاؤں گی
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دھوکے میں شباہت کے تری
میں کسی اور کی ہی ہو جاؤں
اور تو بعد میں پچھتائے بہت!

● QASR-E-QAMAR, BARADARI,
MORADABAD- 244001(U.P.)



"دادی کی چھڑی"

آشا پربھات

دادی کی
چھڑی کے سہارے
ممکن نہیں ہے اب
چلنا ان دشوار راستوں پر
ان کنکریلے اور پتھریلے
راستوں کے لئے
تلاش کرنی ہوگی مجھے
کوئی مضبوط چھڑی
جو مستقل رکھ سکے
پھسلن پر بھی
میرے قدموں
کو....
مجھے طے کرنا ہیں
کیکر ببول کے
گھنگھور جنگل
تاریک راتوں کا سفر
اور مقابلہ کرنا ہے
وحشی درندوں کا
جو نہ معلوم
کس گلی، کس سمت سے
دفعتاً نکل آتے ہیں
سونگھ کر
نرم گوشت کی بو
دادی کی چھڑی میں
اب اتنا دم نہیں
اسے امانتِ ماضی رہنے دو
میری چھڑی
میرا مستقبل بنے گی...!

● KOT BAZAR, WARD NO. 16,
SITAMARHI 843302 (BIHAR)



شاہین نظر
P.O. BOX 5576
JEDDAH-21432 (K.S.A.)

خلیجی ممالک میں اردو کی صورت حال

لفظ خلیج سے ہماری مراد مشرق وسطیٰ کی وہ چھ خود مختار ریاستیں ہیں جو سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عمان، اور متحدہ عرب امارات پر مشتمل ہیں۔ ان تمام ممالک کی سرکاری زبان عربی اور غیر سرکاری طور پر دوسری زبان انگریزی ہے۔ اس کے بعد جو زبان ان علاقوں میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے وہ ہے اردو اور اس سے کچھ کم درجے میں ملیالم۔ ملیالم بولنے والے جنوبی ہند ریاست کیرالا سے آتے ہیں جب کہ اردو بولنے والے ایک طرف ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آتے ہیں تو دوسری طرف پاکستان سے۔ خلیجی ممالک میں مردم شماری کا رواج عام نہیں اس لئے اردو آبادی کی صحیح تعداد پیش کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی ایک اندازے کے مطابق یہ پچاس لاکھ سے بھی زیادہ تجاوز کر سکتی ہے۔ یہ آبادی لسانی طور پر اتنی فعال ہے کہ اکثر گمان ہوتا ہے کہ یہ اردو اکثریتی علاقہ ہے۔ یہاں اردو کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بول رہا ہے کہ اکثر جگہوں پر مقامی عرب باشندے اس زبان کو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ خصوصاً خرید و فروخت کے لئے یہ رابطے کی زبان ہے۔ گو ہندوستان اور پاکستان کی دیگر زبانوں کے بولنے والے بھی یہاں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں مگر انہیں یہ شرف حاصل نہیں۔

یہاں ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے اردو کے اخبارات اور رسائل عام طور پر مل جاتے ہیں۔ مگر یہ رسائل یا تو فلمی ہوتے ہیں یا ڈائجسٹ۔ شاعر اور شب خوں جیسے ادبی رسائل نظر نہیں آتے، ہاں کچھ بالخصوص حضرات سالانہ خریدار بن کر ادبی رسائل حاصل کر لیتے ہیں۔ خلیجی ممالک میں مقامی آبادی کم ہے جبکہ وسائل بے انتہا ہیں اس لئے انہیں غیر ملکی کارکنان کی ضرورت رہتی ہے۔ یہاں پر DECISION MAKING POSITIONS یا تو مقامی باشندے ہوتے ہیں یا یوروپ اور امریکہ کے لائے گئے گوری چمڑی والے۔ مزدور طبقہ ایشیائی ممالک سے آتا ہے جن میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور فلپائن قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانیوں کی تعداد ہر جگہ سب سے زیادہ ہے بلکہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ ہندوستانی اگر کہیں پائے جاتے ہیں تو وہ جگہ خلیجی ریاست سعودی عرب ہے۔ یہاں سے نہ صرف یہ کہ جسمانی محنت کش بلکہ بڑی تعداد میں پروفیشنلز یعنی ڈاکٹر اور انجینئر اور مڈل لیول ایگزیکیوٹو مل جاتے ہیں۔ ان میں اردو بولنے والے ہر سطح پر ہوتے ہیں۔

خلیج کے تمام بڑے شہروں سے انگریزی روزنامے نکلتے ہیں۔ ان میں کام کرنے والے صحافی عام طور پر اردو جانتے ہیں کیوں کہ ان میں اکثریت ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ہے۔ چنانچہ ان اخباروں میں اردو کے متعلق خبریں اسی طرح شائع ہوتی ہیں جیسے یہ اردو کے ہی اخبارات ہوں۔

چھ سال قبل جدہ سے اردو کا ایک روزنامہ بھی جاری ہوا ہے جو خلیج میں اردو کی مقبولیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ اخبار اردو بولنے والوں کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بے حد مقبول ہے۔ گذشتہ دو سال سے ایک ہفتہ وار اردو میگزین بھی شائع ہو رہا ہے۔

خلیج میں اردو کی مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ مشاعروں کا انعقاد ہے جو یا تو ہندوستانی اور پاکستانی سفارت خانے کرواتے ہیں یا کچھ پرائیویٹ ادارے۔ ان مشاعروں کی کامیابی نے جہاں ایک طرف ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اشتہارات کے حوالے سے اپنی طرف متوجہ کیا وہیں خلیج کی ملٹی کلچرل سوسائٹی کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مقامی انگریزی اخبارات میں ان کی رپورٹنگ اور شہر میں ان کے عام چرچوں نے ان پر ہر انداز میں یہ منکشف کیا کہ ایک زبان ایسی بھی ہے جس کے بولنے والے اپنے شاعروں کو دور دور سے بلا کر یکجا کرتے ہیں اور ان کی پذیرائی میں پوری پوری رات صرف کر دیتے ہیں۔

خلیج کے کسی ملک میں اب تک اردو کا کوئی اشاعتی ادارہ نہیں ہے اس لئے وہاں مقیم شاعر و ادیب اپنی کتاب اپنے وطن سے شائع کروا کر منگواتے ہیں اور پھر دھوم دھام سے اس کی رسم اجرا ہوتی ہے ڈنر کھائے جاتے ہیں اور اخبارات میں اس کی تصویریں چھپوائی جاتی ہیں۔

یونیورسٹی لیول تک اردو کہیں بھی پڑھائی نہیں جارہی ہے۔ مقامی باشندوں نے اب تک اردو کو انگریزی، فرانسیسی یا روسی زبان کی طرح فارن لینگویج کا درجہ دے کر پڑھنا شروع نہیں کیا ہے۔ یہ حقیقت علمی سطح پر ہماری ناکامی کا پتہ دیتی ہے۔

خلیج میں اردو کے فروغ پر کوئی ریسرچ کرنا چاہے تو ریفرنس میٹریل نام کے برابر ہے۔ ۱۹۹۳ء میں پہلی بار "مشرق وسطیٰ میں اردو" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جو خلیج میں مقیم شاعروں اور افسانہ نگاروں کی نگارشات اور ان کے تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب "بیرونی ممالک میں اردو" کے نام

سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی جس کا اہتمام پاکستان کی مقتدرہ قومی زبان نے کیا اس میں دیگر ممالک کے علاوہ خلیجی ریاستوں پر علیحدہ علیحدہ گوشے بھی شامل ہیں

خلیج کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ادبی انجمنیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو باقاعدگی کے ساتھ ادبی نشستوں کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔ ان نشستوں میں ڈنر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر کسی نشست کا تصور ممکن نہیں۔

تمام خلیجی ممالک میں اردو ادب ریڈیو پروگرام اور بعض ٹی وی پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

خلیج کی تمام ریاستوں میں ہندوستانی اور پاکستانی اسکول ہیں جہاں اردو پڑھانے کی سہولت موجود ہے مگر ہندوستانی اسکولوں میں اکثر والدین کہیں عربی اور کہیں ہندی کو ترجیح دے کر اپنے بچوں کو اردو پڑھنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے چھیڑنا لوگ پسند نہیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ کام گھر میں مائیں کرالیں گی۔ مگر یہاں ایک دوسرا سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ اب ہمارے بیچ ایسی ماؤں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو اردو نہیں جانتیں۔ یہ صورت حال ہماری اپنی پیدا کردہ ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ اب اردو نئی نسل میں منتقل کیسے ہو۔ انگریزی کا ہوّا اور ہندی جاننے کی مجبوری دیارِ غیر میں بھی اپنی زبان سے دور کئے ہوئے ہے۔ اردو کی مقبولیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے میں بصد ادب و احترام یہ گذارش کروں گا کہ خدارا دوام لیجئے اور مستقبل کی فکر کیجئے۔ صرف مشاعروں سیمیناروں اور ادبی نشستوں کا انعقاد کر کے مطمئن نہ ہو جایئے۔ اردو کی بقا کے لئے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیجئے۔ خلیج میں ہندوستانی یا پاکستانی تارکین وطن کا قیام عارضی ہے ان کا قبلہ ہندوستان یا پاکستان کی طرف ہے۔ انہیں واپس یہیں آنا ہے۔ چنانچہ اپنی صفوں کو درست کیجئے اور ان کے لئے سمت متعین کیجئے۔□□

بقیہ صفحہ ۲۵-نئی صدی میں اردو شاعری

مراد نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت اور مذہب کے مابین جو رشتہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے وہ بے حد پیچیدہ بھی ہے [دی نیشنل انٹر سٹ۔ شمارہ ۹۶/۹۷]

آنے والے وقت میں ہمارے لئے حیرت کا باعث کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ ہم کسی بھی واقعے کا تجزیہ یوں بھی کریں گے کہ یوں تو ہونا ہی تھا۔ یا اگر یہ یوں نہ ہو کر یوں ہو گیا، تو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ اکیسویں صدی میں حیرانیوں کی بارش کا یوں گم ہو جانا ممکن ہے کسی سانحے سے کم تصور نہ کیا جائے، مگر شاعری کا اصل ماجرا ہے کہ "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے..... "کو اکیسویں صدی کا یہ "ڈھیلا ڈھالا" اردو شاعر بھی سمجھنے لگا ہے۔ اور چونکہ سمجھنے لگا ہے، اس لئے وہ اپنے کل شعری سرمائے کے لئے کسی نام نہاد نقاد کا محتاج نہیں ہے۔ یوں بھی کچھ برس قبل شاعری کی حمایت میں ایک نقاد نے یہ اعلان تو کیا ہی تھا کہ بے چاری یہ نئی نسل نقاد سے محروم ہے۔ اس کے پاس کوئی اچھا نقاد نہیں جب کہ اہم بات یہ ہے اور برسبیل تذکرہ یہ بات سامنے آنی چاہئے کہ نئے شعرا کی بغاوت انہیں خود اپنی شاعری کا نقاد بننے پر مجبور کر رہی ہے۔ انہیں وارث علویوں۔ فاروقیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے وہ یہ بھی سوچتے ہوں کہ نئے شعری پس منظر میں "علویوں" کی تنقیدی فکر بیسویں صدی تک جا کر ٹھہر جاتی ہے وہ اس سے آگے کا سفر طے نہیں کرتی۔ اس لئے تخلیقیت کے ساتھ وہ تنقید کے میدان میں بھی آئیں، یہ ان کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ حقیقتاً نئی صدی میں شعراء ہوں یا افسانہ نگار پیش آمدہ تبدیلیوں سے نظریں چرانے کا کام نہیں کر سکتے۔ سائنس، ٹکنالوجی، گلوبل ولیج یا سائبر اسپیس کی بات ہو، جس قدر ممکن ہو سکے گا وہ اپنے ادب کے ساتھ شیئر کریں گے۔ اور اب تو احمد فراز تک نے نئی تبدیلیوں کو شعری کائنات میں سمونے کا بے باکانہ اعلان کر دیا ہے۔

"نئی معلومات ہر عہد میں جب آتی ہیں تو ان کا ذکر ناول اور افسانوں میں تو آتا ہے لیکن شاعری میں براہ راست ان کا ذکر کم آتا ہے۔ پھر یہ کہ سائنسی معلومات کی ٹریننالوجی تو آرہی ہے ادب میں لیکن بذات خود وہ ادب کا موضوع نہیں تھا۔ خاص طور پر مشرقی مزاج ابھی تک اس کا ذوق پیدا نہیں کر سکا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب میں بالآخر ایسا ہو گا۔ کیوں کہ نئی باتیں تو آئیں گی، نئی باتوں اور تبدیلیوں کا ذکر جب عشق پر بھی پڑتا ہے تو ادب پر بھی پڑے گا۔ ابھی حال میں کلنٹن اور مونیکا کا جو سلسلہ ہوا، وہ بھی ادب کا موضوع بنے گا ...." [انٹرویو، سالنامہ آثار، پاکستان]

تیزی سے بدلتے ہوئے عہد کی یہ شاعری زیادہ عمدہ ہوگی پائیدار ہوگی، آفاقی ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر نئی صدی کی یہ شاعری اپنے زمانے عہد اور مسائل کے بہت قریب ہوگی۔ زبان کا بحران، شخصیت اور شناخت کا بحران۔ نئی شاعری کے لئے یہ سب مسئلے پرانے پڑ چکے ہوں گے۔ نئی شاعری نئے جادوئی رابطوں کو جنم دے گی اور نئی شعری وحدت خلق کرے گی۔ کم از کم میری نظر میں مستقبل میں کی جانے والی شاعری کا مستقبل زیادہ تابناک ہے۔□□



آغا سروش

اپنا دستور بدلنے کی ہدایت دی ہے
ہم نے سورج کو پھر اک رات کی مہلت دی ہے

شاید اس بار مرے ذوق سفر نے مجھ کو
آسمانوں سے بھی آگے کی مسافت دی ہے

اس قدر رنج نہ تھا تیری جدائی کا مجھے
جتنی دنیا کے سوالوں نے اذیت دی ہے

تم تو آئے تھے اندھیروں کو مٹانے کے لئے
گھر جلانے کی تمہیں کس نے اجازت دی ہے

وقت نے برف کی چادر میں چھپا کر مجھ کو
دھوپ کی طرح چمکتی ہوئی شہرت دی ہے

درج ہے ظلم کی فہرست میں سر میرا بھی
کیوں کہ میں نے بھی یہاں حق کی شہادت دی ہے

مجھ کو اس قبر سے اب کون نکالے گا سروش
اس کے پانے کے لئے جان کی قیمت دی ہے

● 22-3-63, DARABJUNG LANE,
YAKUTPURA, HYDERABAD-500023



سردار آصف

محروم نہیں خواب کہ تعبیر تو اب ہے
ذہنوں میں مرے لفظوں کی تاثیر تو اب ہے

اب ہو گئیں تصویر کی آنکھیں بھی مکمل
دیکھے کوئی تصویر کہ تو تصویر اب ہے

اب تک تو میں الجھا رہا بنیادوں میں اپنی
دراصل مری ہونے کو تعمیر تو اب ہے

معلوم ہے مجھ کو میں خسارے میں نہیں ہوں
خودداری مری مجھ سے بغل گیر تو اب ہے

مشکل سے سمجھ پایا ہوں آزادی کا مطلب
لگتا ہے مرے پاؤں میں زنجیر تو اب ہے

پہلے اسی دنیا کو میں ٹھکرا بھی چکا ہوں
یہ میرا خزانہ، مری جاگیر تو اب ہے

پھر بھی کسی قاتل کے حوالے نہیں کرتا
حالانکہ بہت کند یہ شمشیر تو اب ہے

●D.P.R.O. BIJNOR-(U.P.)



طارق قمر

نقش جاں جب فقیر کھینچتا ہے
ریت پر اک لکیر کھینچتا ہے

شور زنجیریں کرنے لگتی ہیں
جب ردا بے ضمیر کھینچتا ہے

اس نوازش کا شکریہ اے دوست
میرے زخموں سے تیر کھینچتا ہے

چاہتا ہے وہ پیاس کی تقسیم
پانیوں پر لکیر کھینچتا ہے

بانٹ دیتا ہے دن میں دوشالے
شب کو چادر امیر کھینچتا ہے

زندگی کیا ہے یوں کہو طارق
ایک زحمت جو میر کھینچتا ہے

MOHALLA.JAGAT,NEAR
IND INTERCOLLEG,E
AMBHALA-244302 (U.P.)

نسیم محمد جان
C/O, DR. M.NIHAL CHAK REHMAT
P.O. DARBHANGA(BIHAR)

شام ڈھلے

جب کوئی مصیبت آتی ہے تو برداشت کرنے کی طاقت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی ہو گی کہ سالک صاحب کے ساتھ ایسا ہو جائے گا۔ جب میں آیا تھا میرے لئے یہ شہر اجنبی تھا۔ ایک خط سالک صاحب کے نام کا جیب میں پڑا تھا۔ ان سے ملا تو بہت خوش ہوئے فوراً اسکوٹر نکالا بولے

"چلئے"

"کہاں؟"

"ڈریم لینڈ ہوٹل۔۔۔۔ آپ کو میرے یہاں آنا چاہئے تھا۔ یہ کیا بات ہوئی سامان ہوٹل میں رکھ کر ملنے آئے ہیں"

یقین نہ آیا۔ دراصل میں ایسے شہر کا رہنے والا ہوں جہاں ڈرائنگ روم کلچر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ باہر کے کمرے کو سجانے کی کوشش میں آدمی خود بھی نمائشی ہو گیا تھا۔ خلوص، محبت، مروّت اور اخلاق تو اگلوں کے ساتھ دفن ہو چکے تھے۔ اگر کسی سے ملنے جائیں اور وہ چائے کے لئے نہ پوچھے تو سمجھ لیجئے اس کا شمار رئیسوں میں ہوتا ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا جس کے لئے میں کام کا نہیں وہ اس قدر خلیق اور مخلص ہو سکتا ہے۔ سالک صاحب کے اوسط درجے کے ایک کمرے میں آ گیا تھا۔ بہت کہا کھانا ہوٹل میں کھالوں گا۔ آپ لوگ زحمت نہ کریں مگر اس طرح بضد ہوئے کہ انکار نہ کر سکا۔ ان کی اہلیہ کو اب میں بھابی کہنے لگا تھا۔ ہمیشہ خیال رکھتیں کہ وقت پر کھانا مل جائے۔

ایک دن سالک صاحب کہنے لگے جب پو چھوٹا تھا تو اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑا۔ پیٹ سے بہت خون نکلا تھا۔ میں نے اپنا خون دیا۔ سات راتیں بغیر سوئے گذریں پھر بھی تکان نام کی کوئی چیز نہ تھی اسی وقت مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی جس سے محبت ہو اس کا کام کرنے میں تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ جبراً کام کرنا پڑے تو آدمی بہت جلد تھک جاتا ہے۔

اب میں کرائے کا مکان تلاش کرنے لگا چھوٹے شہروں میں مناسب مکان ڈھونڈ لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ سالک صاحب ہر ملنے والے سے کہتے۔

"بھئی یہ احمد صاحب میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہیں کرائے کا مکان چاہئے کوئی ہو تو اطلاع دیں"

ایک مکان پسند آیا تو آس پاس کی گندگی، نالی سے سڑک پر بہتا پانی دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ صاف ستھرے علاقے میں بھی ایک فلیٹ اچھا لگا۔ کرایہ زیادہ تھا پھر بھی تیار ہو گیا۔ مکان مالک سنہا صاحب نے نام پوچھا، سن کر کہنے لگے

"ذرا اپنے بڑے بیٹے سے مشورہ کر لوں۔ دس پندرہ دنوں کے بعد آنے والا ہے"

دوبارہ سنہا صاحب کے پاس نہیں گیا

چار مہینے گذر گئے سالک صاحب سے بہت قریب ہو گیا حالانکہ ہم دونوں کی عمر میں بہت زیادہ کا فرق تھا۔ وہ اس طرح گھل مل گئے کہ میں مشورہ دیتا سگریٹ پینا ترک کر دیں۔ مسکرا کر ٹال جاتے۔ رات میں دیر سے آتے۔ ایسا بھی ہوتا صبح میرے جاگنے سے قبل گھر سے نکل جاتے۔ عمر کا اثر نہ ان کی صحت پر تھا اور نہ ذہن پر دوسروں کے کام آنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ ایک صبح ہم لوگ چائے پی رہے تھے۔ کوئی بزرگ آئے کہنے لگے

"سالک صاحب! بیٹے کی حالت اچھی نہیں ہے۔ بہت پریشان ہوں"

"ہسپتال لے چلئے۔ ڈاکٹر کو فون کر دیتا ہوں"

"ساتھ نہیں چلیں گے"

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا میں پہنچ جاؤں گا۔"

رات گئے واپس آئے۔ بہت خوش تھے۔ بولے

"آپریشن کرانا پڑا۔ دیر ہو جاتی تو کیس خراب ہو سکتا تھا"

سالک صاحب سے ملنے کے بعد یہ یقین آیا کہ لاکھوں میں ایک آدمی ایسا بھی ہوتا ہے جسے دوسروں کے کام آنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے

ایک دن ایک عورت آئی کہنے لگی۔

"میرا شوہر دن بھر کی کمائی شراب میں گنوا دیتا ہے۔ گھر کے لئے کچھ نہیں دیتا" سنتے ہی سالک صاحب غصے سے تقریباً کانپنے لگے جیسے ان کا اپنا معاملہ ہو کہنے لگے

"محلے میں رہنا ہے یا نہیں اس کو۔ تم چلو۔ ابھی آ کر خبر لیتا ہوں"

اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ بھابی اندر سے چائے لے کر آئیں۔ دریافت کرنے لگیں "کہاں چلے گئے آپ کے بھائی جان"

میں خاموش رہا

"عجیب آدمی ہیں۔ باہر والوں کے لئے ان کے پاس ہمیشہ وقت رہتا ہے۔ گھر کی فکر نہیں۔ ذرا پوچھئے گا نوکری سے سبکدوش ہونے میں صرف چند ماہ رہ گئے ہیں۔ آئندہ کے لئے بھی کچھ سوچا ہے۔ پنشن والی نوکری بھی تو نہیں ہے" واپس آئے تو میں نے بھابی کی موجودگی میں سالک صاحب سے کہا۔

"آپ کی شکایت کر رہی تھیں"

جواب ملا

"کون سی نئی بات ہے۔ اس عمر میں شکایت مجھ سے نہ ہوگی تو کیا راہ چلتے لوگوں سے ہوگی۔ کئی بار کہہ چکا ہوں اپنے حصے کی فکر بھی مجھے دے دو سوچنا کیا ہے۔ دو ہی بیٹے ہیں۔ نوکری نہ ملی، تجارت کریں گے۔ بیٹی ہوتی تو اور بات تھی"

بھابی اندر چلی گئیں

ایک دن دفتر میں میرے ایک شریک کار اروند بابو نے دریافت کیا

"احمد صاحب مکان ملا"

"اب تو میں مایوس ہو چکا ہوں"

"ایک مکان میرے ماما کا خالی ہے"

"کہاں"

"شیو نگر"

"مجھے دیں گے"

"ارے میرے ماما کا مکان ہے"

"آپ نے پوچھ لیا ہے"

"ہاں ہاں بات کر چکا ہوں......"

"میرا مطلب ہے......"

"اچھا اچھا سمجھ گیا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مکان آپ کو مل جائے گا چل کر دیکھ لیں۔ کافی بڑا مکان ہے۔ ماماجی کلکتے میں رہتے ہیں"

اور مسکرا کر کہنے لگے

"مکان مالک کا دور ہی رہنا کرایہ دار کے حق میں اچھا رہتا ہے"

مکان دیکھا، پسند آیا۔ ایڈوانس کر دیا۔ کچھ سامان لا کر رکھ دیا۔ سارا کام کچھ اس عجلت سے ہوا کہ سالک صاحب سے مشورہ نہ کر سکا۔ ڈر تھا اتنا اچھا مکان ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ رات میں سالک صاحب کو جب یہ خوشخبری سنائی تو وہ فکر مند ہو گئے بولے

"شیو نگر محلے میں رہ پائیں گے آپ؟"

"کیوں؟"

"محلہ ندی کے کنارے ہے۔ کچھ بدمعاش لوگ رہتے ہیں وہاں"

اس اطلاع سے میں بھی پریشان ہو گیا۔ مجبوری تھی ایسا مکان معقول کرایہ پر کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔

اہلیہ اور بچوں کے ساتھ مکان میں آ گیا۔ سارے محلے والے اس طرح دیکھتے جیسے سوال کر رہے ہوں۔ یہاں کیسے آ گئے؟

پڑوس میں رہنے والوں کی مالی حالت اوسط درجے سے کم تھی۔ پہلی رات اہلیہ بالکل نہ سو سکیں۔ رات بھر درود شریف پڑھتی رہیں صبح ہوئی تو کہہ رہی تھیں۔

"جانتے ہیں لگ رہا تھا کوئی دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گا۔ کچھ آوازیں سن کر چیخنے والی تھی کہ باورچی خانے سے بلی نکل کر بھاگی"

صبح گیٹ پر ایک عورت خالی بالٹی لئے آئی۔ اہلیہ نے کہا

"کھڑی کیوں ہو؟ نل سے پانی آ رہا ہے"

ادھیڑ عمر عورت اندر آ گئی۔ اس نے نل کو اچھی طرح دھویا۔ پھر پانی بھرنے لگی

"آپ کے پہلے والے کرایہ دار گیٹ کے اندر کسی کو نہیں آنے دیتے تھے۔ پانی کے لئے چوک پر جانا پڑتا تھا"

ایک دن اسی عورت کا بیٹا آیا

"میرا نام جدو ہے سامنے رہتا ہوں۔ کوئی ضرورت ہو تو کہئے گا۔ اس محلے میں اطمینان سے رہئے۔ سب دروازہ کھول کر بھی سوئیں گے تو کچھ نہ ہوگا آپ کے کارن پانی کا کتنا آرام ہو گیا"

سالک صاحب آئے تو میں نے جدو کا ذکر کیا۔ کہنے لگے

"شہر کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ کون نہیں جانتا اس کو"

میں نے جواب دیا

"ان کی توانائی کو اگر صحیح سمت مل جائے تو ایسے لوگ بڑے کارآمد ہوتے ہیں"

جب میں نے یہ اطلاع دی کہ پہلی جنوری کو فیملی کے ساتھ ندی کے کنارے گیا تھا۔ ننگے پاؤں ریت پر چلتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سالک صاحب حیرت زدہ سن رہے تھے

"وہاں کھیتوں میں کام کرنے والے سارے لوگ جانے پہچانے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر جدو کی بیوی اور ماں اس طرح خوش ہوئیں جیسے بہت بڑی دولت اچانک مل گئی ہو دونوں بچوں کو بہت پیار کیا ان لوگوں نے۔"

سالک صاحب نے مشورہ دیا

"اب دوبارہ کبھی نہ جائیں گے آپ"

میں نے پہلی جنوری کا ذکر اروند بابو سے کیا تو کہنے لگے

"آپ کی ہمت کی داد ملنی چاہئے۔ وہاں تو ہم لوگ بھی تنہا جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ آپ فیملی کے ساتھ چلے گئے"

سالک صاحب سے اکثر ملتا رہا۔ ان کی نوکری سے سبکدوش ہونے کے دن خاص طور پر ان کے یہاں گیا۔ کہنے لگے۔

"جو رقم ملنے والی ہے دونوں بیٹوں کو دے دوں گا"

ان کے نجی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میری خاموشی کا مطلب سمجھ گئے کہنے لگے

"ایک بار جب پپو چھوٹا تھا تو موتیہاری سے پٹنہ آرہا تھا،۔ان دنوں اسٹیمر سے گنگا پار کرنی پڑتی تھی۔ برسات کے دن تھے۔ ابھی کنارہ دور تھا۔ آندھی آگئی۔ اسٹیمر ڈوبنے لگا۔ میں نے پپو کو کندھے پر بٹھالیا تاکہ اگر میں ڈوب بھی جاؤں تو وہ بچ جائے۔۔۔ والدین کا بھرپور پیار ملا ہے ان کو۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا"

میں عمر میں بہت چھوٹا تھا پھر بھی کہے بغیر نہ رہ سکا

"اولاد کی محبت کا امتحان تو اس وقت ہوتا ہے جب والدین ضعیف ہو جائیں اور ان کی توجہ کی ضرورت ہو"

سالک صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو تین ماہ بعد آئے تو کہہ رہے تھے

"آپ ہی سچے ہیں"

"وہ کیسے؟"

"بیٹا نہیں ہے.... آپ کے گھر بہو نہیں آئے گی"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اب دونوں دور دور رہنے لگے ہیں چھوٹا بیٹا الگ کرائے کے مکان میں رہنا چاہتا ہے۔ بڑے کے پاس ہم دونوں کے لئے وقت ہی نہیں ہے شاید غلطی ہو گئی مجھ سے۔۔۔"

اس دن پہلی بار سالک صاحب کو متفکر پایا۔ ایسا لگا وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں مجھ سے کہیں یا نہیں۔ دیر تک خاموش رہے پھر بولے

"محتاجی بہت بری چیز ہے"

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا

چند دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ سالک صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ فوراً دیکھنے گیا۔ دایاں ہاتھ اور پیر بالکل بے کار ہو چکے تھے آواز بند ہو چکی تھی پلاسٹر لگے بائیں ہاتھ سے سلام کا جواب ملا۔ صرف مجھے دیکھ رہے تھے بھابی کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہنے لگیں

"اللہ جس حال میں رکھے۔ آدمی کر بھی کیا سکتا ہے"

ایک رات دیر سے سالک صاحب کے یہاں گیا۔ اب وہ بولنے لگے تھے سینے پر تولیہ رکھا تھا۔ بھابی چمچے سے کھلا رہی تھیں کہنے لگے

"دنیا عجیب جگہ ہے۔ کسی سے امید نہیں رکھنی چاہئے"

میں نے جواب دیا

"بھابی تو خدمت کر رہی ہیں"

"ان کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں۔ شوہر اور بیوی تو ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں ایک نہ رہے تو دوسرا ادھورا ہو جاتا ہے"

جس کمرے میں وہ تھے اس سے منسلک ان کے بڑے بیٹے کا کمرہ تھا۔ بیٹے اور بہو کے گفتگو کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی سالک صاحب نے بھابی سے کہا

"پپو کو بلاؤ"

بھابی نے پکارا۔ بیٹا اور بہو خاموش ہو گئے۔ بھابی کہنے لگیں

"لگتا ہے سو گئے دونوں"

ایک دن گیا تو پایا سالک صاحب کی صحت تیزی سے گر گئی ہے۔ سگریٹ نوشی کی وجہ سے اپنے تنفس سے پریشان تھے کہنے لگے

"رات بھر نیند نہیں آتی۔ آپ چھوٹے بیٹے سے کہئے کہ ڈاکٹر بنرجی کو دکھا دے" اتنے میں چھوٹا بیٹا آگیا۔ میں نے مشورہ دیا

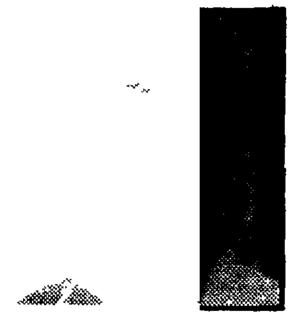
"ابھی کیوں نہیں انہیں ڈاکٹر بنرجی کو دکھاتے ہو۔ قابل ڈاکٹر ہے"

جواب ملا

"یہ کیا اچھے ہوں گے۔ ڈاکٹر کو دکھانا پیسوں کو برباد کرنا ہے اب ایسے ہی رہیں گے۔

"اور پپو اسی اسکوٹر پر باہر نکل گیا جس پر کبھی سالک صاحب کو دیکھا کرتا تھا۔ مجھے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا بات کہاں سے شروع کروں۔ سالک صاحب نے سکوت توڑا

"دیکھئے کب اوپر سے بلاوا آتا ہے۔ اب اسی کا انتظار ہے۔۔۔ ایسی زندگی کس کام کی وہ اور کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خاموش ہو گئے۔ ☐



خوشبیر سنگھ شاد

یہی نہیں کہ فقط رنگ و بو ضروری ہے
کلی کے واسطے پہلے نمو ضروری ہے

ہمارے بارے میں جو کچھ بھی رائے ہو تیری
مگر ہمارے لئے صرف تُو ضروری ہے

جو بہہ رہے ہیں یہ آنسو تو ان کو بہنے دوں
کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضروری ہے

خموشیوں سے نہ کٹ پائے گی پہاڑ سی رات
ہو چاہے خود سے مگر گفتگو ضروری ہے

اداس ہو کے کوئی مسئلہ نہ حل ہوگا
دلوں کو رنج اٹھانے کی خو ضروری ہے

یہ دل جو بات کہے، اس کو مان لے شادؔ
کبھو ضروری نہیں اور کبھو ضروری ہے

●NOVNEET PRINTER, 220-
RAMNAGAR ALAMBAGH,
LUCKNOW-226005(U.P.)

کلیم اختر

خامشی بھی بے نمک، صوت و صدا بھی بے نمک
رات کا آرام، دن کا حادثہ بھی بے نمک
اب تو ملنے کا گلابی سلسلہ بھی بے نمک
حد تو یہ ہے فاصلے کا ذائقہ بھی بے نمک
موسمِ نو کی طلسماتی ادا بھی بے نمک
ہوتے ہوتے ہوگئی آب و ہوا بھی بے نمک
ہر قدم پر مجھ کو منزل کا گماں ہوتا ہے کیوں
جب کہ ہر منظر ہے دھندلا راستہ بھی بے نمک
رک گئی ہے جیسے آکر اِک جگہ پر روشنی
کچھ ہوا بھی بے نمک ہے کچھ فضا بھی بے نمک
دوستی اور دشمنی کا ذائقہ جاتا رہا
آشنا بھی بے نمک نا آشنا بھی بے نمک
جب کہ زیرِ آسماں ہی سب اڑانیں تھم گئیں
پھر بھی کیوں ہے اپنی ہمت، حوصلہ بھی بے نمک
جانے کیسی چاہتوں کے دشت میں ہم آ گئے
زندگی کی رات کیا، صبح و مسا بھی بے نمک
ذکر کیا اوروں کا اخترؔ تُو تو تھا منصف مزاج
کیوں یقیں پر دھند ہے اور فیصلہ بھی بے نمک

●LAHERIA TOLA, GAYA-823001(BIHAR)



شمیم انجم وارثی

(سن ریو-SENRYU)

آئینے کی بات
جو دیکھے سچ سچ کہے
مانے ذات نہ پات

میرؔ ترا دیوان
درد کے ماروں کے لئے
ہے نسخۂ آسان

خوشبو، رنگ، بہار
ان لفظوں سے ہے روشن
سپنوں کا سنسار

ارمانوں کے پھول
خاک میں مل کر خاک ہو۔
دھول میں مل کر دھول

بچی کے جذبات
پاپا مجھ کو لادیجے
کاپی قلم دوات

مٹی کے برتن
پل میں ایسے ٹوٹ گئے
جیسے دل درپن

.D ROAD, P.O.GARULIA,
.TH 24 PRGNS.(W.B.)



آصف الرحمن طارق
1405-HOLAND DRIVE
SOMERSET , NJ. 08873 (U.S.A.)

ایک دکان کی کہانی

سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کس طرح سے شروع کروں، اپنی کہانی سناؤں یا رضیہ کی بات اپنے سے شروع کروں یا رضیہ سے۔ رضیہ میری ایسی دوست ہے کہ اسکے کچھ راز اگر میں نے فاش بھی کر دئے تو وہ برا نہیں مانے گی بلکہ الٹا مجھ سے یہ کہے گی "ہو سکتا ہے تم اس بات کو بہتر سمجھتی ہو اور دوسروں کو اس لئے بتادیا کہ شاید اس میں میرے لئے بہتری کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل رہا ہو۔"

مگر میرا خیال ہے کہ اس کہانی کا جو آپ کو سنا رہی ہوں مرکزی خیال میں ہی ہوں، اس لئے بات اپنے ہی سے شروع کرنی پڑے گی۔ مگر ذرا ٹھہرئیے، ذرا غور سے کہانی کا مطالعہ کریں گے تو تان رضیہ پر ہی ٹوٹتی معلوم ہوگی تو پھر کیوں نہ رضیہ ہی سے قصے کا آغاز کروں، مگر نہیں، رضیہ اس کہانی کے تانے بانے میں کہیں فٹ نہیں بیٹھتی، تو چلئے بات شروع کرتے ہیں اور بسم اللہ اپنے ہی سے کرتی ہوں۔

اب ایسا بھی نہیں کہ یہ قصہ بہت دلچسپ ہے، اور الف لیلیٰ کے قصوں کی طرح دلچسپ اور چٹ پٹا، قصہ کیا ہے ایک واقعہ ہے، اور سچ پوچھیں تو واقعہ بھی نہیں ہے یا شاید ایک تاثر ہے، یا پھر زندگی کی گاڑی کو ایک دوسرے ڈھب سے کھینچنے کا ایک طریقہ۔ بہر حال، جو کچھ بھی ہے خواہ قصہ ہے یا کہانی یا پھر ایک تاثر، ہے بے حد اہم، ہو سکتا ہے آپ کے لئے اہم نہ ہو، میرے لئے بہت اہم ہے شاید اس لئے اہم ہے کہ اس واقعے نے میری زندگی کا رخ بدل ڈالا اور اب جب کہ میری زندگی کا رخ بدل گیا ہے تو میں سوچ رہی ہوں کہ کیا یہ صحیح ہے کہ واقعات لوگوں کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں، میرا تجربہ تو یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ تو تھپٹر کھا کر بھی اپنا منہ سیدھا رکھتے ہیں، اگر ایسا ہے تو پھر اہم بات یہ نہیں ہے کہ تھپٹر بہت زوردار تھا، اہم بات تو یہ ہے کہ اس تھپٹر کی وجہ کتنی اہم تھی۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھپٹروں کا سامنا کرنے والے کا منہ بے حد کمزور اور نحیف تھا۔ میں یہ الٹی بحث لے کر کیوں بیٹھ گئی، میں تو فقط اس واقعے کی روداد سنانا چاہتی ہوں جس سے میں دو چار ہوئی اور آپ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ بیٹھے بیٹھے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، تو آئیے، پہلے قصہ سنتے ہیں پھر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔

قصہ شروع کرنے سے پہلے مجھے اپنے ماضی کا ایک ایسا دریچہ وا کرنا پڑے گا جس کا اس قصے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ دریچہ ہے میرے ماضی کی وہ کھڑکی جہاں سے میں اپنے آپ کو ایک خوش حال گھر کے فرد کے طور پر اچھی طرح سے دیکھ رہی ہوں۔ جی ہاں، میرا ماضی پریوں یا شہزادیوں کی داستانوں کا ماضی تو نہیں، مگر ایسے خاندان کا ماضی ضرور ہے جہاں زندگی کا نام فراغت ہوتا ہے۔

کلثوم، صرف دو بچوں کے گھر میں، دونوں ہی کی خوب خوب اللہ آمین ہوتی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ بچی اس خاندان کی اکلوتی بیٹی ہو، اور خاندان کے لیل و نہار واہ واہ کو چھو رہے ہوں۔ یہ بات میرے لئے دو آتشہ ثابت ہوئی کہ میں ایک کھاتے پیتے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دوسرا میرا بھائی تھا جو عمر میں مجھ سے اس قدر بڑا تھا کہ میں اس سے ڈرتی تھی، اور جو ذرا اور بڑا ہو کر ملک سے باہر ایسا گیا کہ وہیں کا ہو رہا اور پلٹ کر نہیں آیا۔ اور اگر شاید تمام کہانی کو MAGNIFYING GLASS یا محدب عدسے سے دیکھا جائے تو اس کہانی کے مقطع کا بند یہی بات ٹھہرتی ہے کہ میرا بڑا بھائی ملک سے باہر گیا اور پھر باہر کا ہی ہو کر رہ گیا، پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ جن بہنوں کے بھائی ان کی حفاظت کرتے ہیں وہ قلعوں میں رہتی ہیں، اور خاص طور سے ایسے معاشرے میں جس میں ہم سانس لے رہے تھے۔ مگر اب سوچتی ہوں تو یہ بات بھی نہیں تھی کہ میری زندگی میں اتنا بڑا تغیر اس لئے آیا کہ میرا بھائی میرے ساتھ نہ تھا، بلکہ اس واقعے کی جب پرت پرت کھولتی ہوں تو کسی پرت کے نیچے یہ بات نظر آتی ہے کہ بھائی کا دور چلے جانا تو الگ بات ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ اس کو مجھ سے کچھ لگاؤ ہی نہیں تھا۔

اتنا سب کچھ سنا کر میں ایک منٹ کے لئے ٹھہروں گی اور آپ سے ایک سوال کروں گی، مگر اس سوال کا جواب نہ چاہوں گی، یہ سوال تو میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ اپنی بات میں وزن پیدا کر سکوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ "کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک بھائی کو بہن سے محبت نہ ہو۔" ہے تو یہ بہت عجیب سی بات، مگر حقیقت کچھ ایسی ہی تھی، دیکھئے نا دنیا طرح طرح کے لوگوں کا ملغوبہ ہے، ایسے بھی لوگ ہیں جو بہنوں سے محبت نہیں کرتے، ہر چند کہ ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسے ایسوں کا وجود ہے، بالکل اسی طرح جس طرح میں یا آپ پیدا ہوئے۔ ہاں تو میں اپنے بھائی کے متعلق

بات کرہی تھی، رہا میرا سوال تو اس کو گولی ماریئے۔ بھائی یہ سمجھتا رہا کہ ابا کھاتا پیتا ہے، بیٹی کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے گا مگر اس کو کیا پتہ کہ ابا پر کیا گذری۔

اور یہ گذرنے کی داستان بھی خوب ہے۔

کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔ جس طرح پہاڑی کی کیچڑ پر سے پیر پھسل جائے تو آدمی پہاڑ کے اوپر نہیں جاتا، نیچے گرتا چلا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ابا کا پاؤں ایسا پھسلا کہ دو گز زمین کے نیچے جاکر دم لیا۔ چند صدمے ایسے ہوتے ہیں جو برداشت ہو جاتے ہیں، چند ایسے ہوئے ہیں کہ جو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتے اور یہ انسان کی ذات پر منحصر ہے کہ برداشت کی کتنی قوت رکھتا ہے، جس طرح گاڑی کے SHOCK OBSORBRS کمزور ہوں تو گاڑی ذرا سا جھٹکا برداشت نہیں کر سکتی، اسی طرح اگر آدمی کے SHOCK OBSORBRS کمزور ہو جائیں تو وہ ذرا سی بات پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اماں ویسے ہی خاموش طبیعت کی سیدھی سادھی خاتون تھیں، اوپر تلے کے ان واقعات نے تازیانوں کا کام کیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ابا کی طرح جاکر سوئیں نہیں، بس دل و دماغ حالات کے حوالے کر دئے، مخبوط الحواس ہو گئیں اور چارپائی سے جالگیں ان کے SHOCK OBSORBRS بہت کمزور نکلے۔

اتنی داستان سنا کر میں قدرے دم لینا چاہتی ہوں اور شاید پانی بھی پینا چاہتی ہوں تاکہ سانس لے سکوں اور سوچ سکوں کہ پھر کیا ہوا اور حقیقت میں اصل کہانی "پھر کیا ہوا" کے بعد ہی شروع ہوتی ہے، پھر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا، مگر "ہونا" یا "نہ ہونا" انسان کے اختیار میں نہیں، بہت جگہوں پر ہم بے بس ہو جاتے ہیں اور یہی بات میرے ساتھ ہوئی یہاں سے آگے چل کر میں ہانپ گئی اور بے بس ہو گئی، مگر میں بھی یہ کیا فلسفہ لے کر بیٹھ گئی، آیئے، اس قصے کو آگے بڑھا کر ختم کرتے ہیں۔

میں ذکر اپنے بھائی کا کر رہی تھی، اور اب قصہ گاڑی وہیں سے آگے بڑھاتی ہوں۔ میرا بھائی بھی خوب بھائی تھا، اللہ جانے کس کی نظر اس کو کھا گئی، یا نہ جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ سب کچھ پتہ لگنے کے باوجود تسلی کا صرف ایک جملہ لکھا اور میں بھی خوب تھی کہ اسی جملے کے سہارے یہ آس لگا بیٹھی کہ ایسے میں بھائی ضرور آئے گا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ "ایں خیال است و محال است و جنوں" میرا خیال صرف خام خیالی کی حد تک رہا، اس کو نہ آنا تھا نہ آیا اور نہ صرف یہ کہ آیا نہیں بلکہ ایسی چپ سادھی، کہ دم سادھ لیا اور پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔

ایسے میں مجھے سلطنت روم کے وہ کلسیم یاد آئے جہاں بادشاہ وقت قیدیوں کے آگے شیر چھوڑ دیا کرتے تھے اور وہ قیدی اپنی جان بچانے کے لئے شیروں سے نبرد آزما ہو جاتے تھے، بالکل اسی طرح میرے چاروں طرف بھی شیر جمع ہو گئے، جنہوں نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دیں اور مجھے اتنا نوچا کھسوٹا اور اتنا لہو لہان کیا کہ میں ہانپ گئی، بے بس ہو گئی اور اتنی ہانپی کہ ان شیروں سے لڑنے کی سکت نہ رہی اور نتیجے کے طور پر مجھے زندگی گذارنے کا اور ان شیروں سے لڑنے کا ایک اور ہی ڈھب آگیا اور دیکھتے دیکھتے میں نہ صرف شیروں کے حملوں سے بچ گئی بلکہ پہاڑ کی چوٹی مجھے پھر سے نظر آنے لگی۔

اور اب یہاں سے رضیہ پھر میری کہانی میں داخل ہوتی ہے، یہ وہی رضیہ ہے جس کا ذکر میں نے قصہ شروع کرنے سے پہلے کیا تھا۔ اصل میں مجھے اس کی کہانی قدرے تفصیل سے سنانی چاہئے مگر اب اختصار سے کام لوں گی میں نے تو اپنی کہانی بھی بے حد اختصار سے سنائی ہے اور رضیہ کی کہانی کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گی اس لئے کہ اس کی کہانی بھی وہی ہے جو میری ہے، تھوڑا بہت فرق ضرور ہے مگر اس فرق سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ جس طرح انگریزی میں کہتے ہیں کہ BOTTEM LINE کیا ہے تو اس کی اور میری کہانی کی BOTTEM LINE ایک ہی ہے۔ اس کی کہانی بھی پہاڑی سے پھسل کر نیچے کی طرف گرنے کی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہاڑی سے نیچے گر کر اس نے زندگی گذارنے کا وہ نرالا ڈھب نہیں سیکھا جس کا گر میں جان چکی تھی اور یہی گر جاننے کے لئے وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے پوچھا کہ میں کس طرح اور کیوں کر پہاڑی کی چوٹی کی طرف پھر سے گامزن ہو گئی ہوں۔ میں ہنس دی اور اتنا ہنسی کہ میرے آنسو نکل پڑے اور اب یہ نہ پوچھئے کہ یہ خوشی کے آنسو تھے یا درد کے، بہر حال آنسو تھے، اور اسی ہنسی اور آنسوؤں کے درمیان میں نے رضیہ سے کہا "سنو رضیہ بیگم۔ پیسہ کمانا دنیا کا آسان ترین کام ہے، بس شعور اور خیال کو ذرا ادھر اُدھر کرنا پڑتا ہے، پھر پیسہ ہی پیسہ۔ اور تم جو یہ راز جاننا چاہتی ہو تو غور سے سنو، کوئی راز واز نہیں ہے صرف زندگی کو ایک اور ہی ڈھب سے گزارنے کا دوسرا طریقہ ہے، میں نے تو ایک دکان کھول لی ہے، مال ایسا بیچتی ہوں کہ گاہک کو نہ کرتے بن نہیں پڑتی، اور کچھ پتہ ہے مال بھی ایسا ہے کہ گاہک منہ مانگے دام دیتا ہے اور میری یہ بات ذرا قریب آکر، میرے منہ سے کان لگا کر غور سے سنو۔ وہ مال تو تمہارے پاس بھی ہے جو میں نے اس دکان پر سجا کر رکھا ہے، وہ مال تم کیوں نہیں بیچتیں،

ارے رضیہ بیگم!۔ خوب دھڑا دھڑ بکتا ہے، خوب دھڑا دھڑ" □□

● زرِ سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے، میں اپنا تعاون دیجئے۔

● ڈرافٹ یا چیک پر صرف THE SHAIR BOMBAY درج کیجئے۔



پروین جاوید

احساس پہ ہم لوگ تقصیریں بناتے ہیں
وہ اب بھی بے آزار تعزیریں بناتے ہیں

رقصِ حُسن، نے رقصِ جنوں ہے کوچۂ جاں میں
اپنی خواہشیں ہیں، جن کی تصویریں بناتے ہیں

ب ہے رسم یہ اہلِ قفس آزاد ہونے پر
پنے نو واردانِ شوق زنجیریں بناتے ہیں

جاؤ عہدِ نو کے بے گمان تخلیق کاروں پر
کچھ لکھتے نہیں ہیں صرف تحریریں بناتے ہیں

ناوِ فکر و فن کے عہد میں ہم نے یہ سیکھا ہے
ذخیروں میں بسر کرتے ہیں تحریریں بناتے ہیں

بچا لیتے ہیں احساسِ طلب کو اور لے پردیں
دو گیسو کے قصے لکھ کے تعبیریں بناتے ہیں

● R-341/9DASRAGIR SOCIETY F.B
AREA KRACHI-(PAK)



شارق عدیل

تروینیاں

ایسی بھیانک راتیں بھی کچھ میرے بچپن پر گذری ہیں
ماں، کی آنکھ بھی لگ جاتی تھی سوجا سوجا کہتے کہتے
باپ نے یہ قصہ دہرا کر ذہن میں مایوسی پھیلا دی

●

میں، کہ گمنام سی منزل کی طرف نکلا ہوں
پاؤں لکڑی کے مرا ساتھ کہاں تک دیں گے
چاٹتا رہتا ہے احساس ادھورے پن کا

●

مرغ وماہی کی تواضع تو بہت خوب رہی
ساغر ومئے سے مگر خالی رہی میز اس کی
میں، کہ اعصاب کی تسکین کے لئے زندہ ہوں

●

وقت ہونے لگا اب اپنی دوا لے لینا
رات ہوٹل سے مجھے فون کیا تھا اس نے
فرق میں جشن و اداسی کا بتاؤں کس کو

●

نہ جانے کون سی تبدیلیاں ابھر آئیں
لب آئینہ بھی مری وحشتیں بڑھاتا ہے
خدا نظر کو مری سانولی سحر کردے

● P.O. MAREHRA, DISTT. ETAH-207401

سہیل ارشد

اسٹیشن پر کھڑا پیڑ

یہ مانا کہ مرے پتے ہرے ہیں
اٹا ہوں گرد سے میں
دھوئیں کا سر پہ سایا
جڑوں میں چلو بھر پانی
کہ جیسے بھیک میں ڈالے گئے سکے
ہر اک پل بھیڑ میں تنہا
ہے اتنا شور کہ بہرا ہوا ہوں میں
ٹرینوں کی دھما دھم سے
لرزتی رہتی ہے دھرتی
ہے میری آرزو یارب
مجھے بھی ٹرین کوئی اب
اٹھا لے اس جہنم سے
کسی ساحل، کسی وادی میں پہنچا دے
کسی جنگل میں گم کر دے

● NO. 12, DANGAL
P.O.ANDAL-713231 (W.B.)

کفیل فتح پوری



مرے نفس کی روش یوں مہین بھی نہ رہے
کہ اپنے ہونے کا مجھ کو یقین بھی نہ رہے

تمہیں بتاؤ کہ ثابت قدم رہے گا وہ؟
کہ جس کے پاؤں کے نیچے زمین بھی نہ رہے

غزل نواؤں میں زورِ بیاں بھی ہے مفقود
اور اس قماش کے اب سامعین بھی نہ رہے

ہے ایسا قحط تفکر یہ ڈر ہے میرے بعد
کہ باقیات میں اک جانشین بھی نہ رہے

نشاط وعیش میں اتنا نہ ڈوب جائے کوئی
کہ دنیا ہاتھ نہ آپائے "دین" بھی نہ رہے

● U.P. WATCH CORNER, JAGDALPUR,DIST. BASTAR-494001

نظر بریلوی

اس عمر میں الفت کا سبب یاد نہ آئے
اچھا ہے کہ وحشت کا سبب یاد نہ آئے

یاد آئے تو آئے کبھی جنت سے نکلنا
ہجرت پسِ ہجرت کا سبب یاد نہ آئے

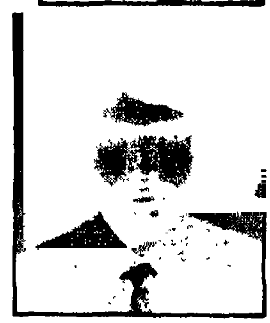
تو آج مرے ساتھ ہے پر بعد میں تجھ کو
ممکن ہے کہ شہرت کا سبب یاد نہ آئے

ہاں یہ بھی سیاست ہے کہ لوگوں کو کبھی بھی
آفت پسِ آفت کا سبب یاد نہ آئے

حالات کی چکی میں یہ ممکن تو نہیں ہے
بندے کو عبادت کا سبب یاد نہ آئے

● IMCO. MAB. PO. BOX NO. 9046, AHMADI, KUWAIT 61004

رضوان الرضا رضوان



ہوا یقین جو نکلے گماں غبار سے ہم
کہ اتنی دور نہ تھے اس بدن دیار سے ہم

عجیب رشتۂ جاں ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں
خیالِ یار ہے ہم سے خیالِ یار سے ہم

ہمارے جرم کی تائید تم نے جو کردی
نظر اب آنے لگے ہیں گناہ گار سے ہم

مگر فسانۂ غم پھر بھی وہ سمجھ نہ سکے
سنا رہے تھے انہیں چشمِ اشک بار سے ہم

یہ کیا کہ پھر وہی منظر خزاں کا لگتا ہے
تھے پُر امید بہت فصلِ نو بہار سے ہم

● 2-KASHMIR HOSTEL,SULEMAN HALL,A.M.U.ALIGARH,

ظفر قاسمی



کس قدر دلچسپ ہے یہ چلتی پھرتی زندگی
کار کی بتی کے جیسی جلتی بجھتی زندگی

ریل کے ڈبوں کے جیسی دوڑتی رہتی ہے یہ
مختلف اسٹیشنوں سے ہے گذرتی زندگی

روز میرے ظرف سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
ماہیٔ بے آب سی میری تڑپتی زندگی

یوں تو کہنے کو فقط ہے چار دن کا یہ سفر
کیسے کیسے راستوں سے ہے گذرتی زندگی

بڑھ رہی ہے لمحہ لمحہ موت کی جانب ظفر
صبح گلشن کی طرح کھلتی نکھرتی زندگی

● C/O BASHAR AHMAD ,HAZARI TOLA,WARD NO.12 BETTIH-845438

فاروق احمد بسمل



کس لئے اس قدر میں پریشان ہوں
بن گئی ہے وہ حالت کہ حیران ہوں

مجھ سے آخر یہ کیسی خطا ہوگئی
بات کیا ہے جو اتنا پشیمان ہوں

میری ہستی یہاں چند لمحات کی
میں فقط ایک دو پل کا مہمان ہوں

میرے دم ہی سے ہیں ساری خاموشیاں
میں ہی آندھی ہوں اور میں ہی طوفان ہوں

جب بھی جی چاہے آواز بن جاؤ تم
میں اکیلا ہوں بے سازوسامان ہوں

● C/O PUBLIC MADICAL HALL,W-NO. 10,H. NO.37,UDHAMPUR-182101 (J&K)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

تفصیلی و مختصر آراء اور تاثرات

(۱۱)

م عصر اردو ادب نمبر کے متعلق بہت سارے تفصیلی
ر تبصروں میں سے دو اہم خط ذیل میں شائع کئے جا رہے
ب خاص نمبر پر تفصیلی تنقیدی خطوط کی اشاعت ناگزیر
ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تنقید نگار کی رائے
ق بھی ہوں۔ "ہم عصر اردو ادب نمبر" موجود ہے اور
ں صاحب ذوق حضرات اس کے مطالعے میں مصروف
شاعر کے ہر شمارے میں تعریفی و توصیفی خطوں کی
۔ بھی ہو رہی ہے۔ اب بھی خاصی بڑی تعداد میں جمع
پنی اشاعت کے منتظر ہیں جبکہ خطوں کی آمد کا سلسلہ
ری ہے۔ قارئین شاعر سے التماس ہے کہ وہ خاص نمبر
ز عات" "ایک ناممکن تخلیقی خواب کی داستان" کا مطالعہ
ریں اور اپنی کسی بھی رائے یا تاثر سے قبل "جرعات" کو
ھ لیا کریں کیوں کہ اب تک کا یہی ہمارا مشاہدہ و مطالعہ
۔ خاص نمبر پر جو بھی تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں یا
ات قائم کئے جا رہے ہیں، ان سب کے بارے میں ہم
ن بھر اپنے "جرعات" میں لکھ ہی دیا ہے یا اس کے بین
میں موجود ہے۔ خاص نمبر کے ہر باب کے ادارتی
ت بھی آپ کی رہنمائی کریں گے۔
مد حسن کے کئی تفصیلی خط شاعر میں شائع ہو چکے
یل کا خط انہوں نے ۸ / مئی ۱۹۹۹ء کو تحریر کیا تھا۔ یہ
خط ہے لیکن اپنے آپ میں کئی اہم باتیں لئے ہوئے
ں میں اختلاف کی گنجائشیں بھی ہیں لیکن ہمیں تو
احب کی گرانقدر آراء سے استفادہ کرتا ہے۔

[الف الف]

محمد حسن

شاعر کا ہم عصر ادب نمبر ملا۔ شکریہ، تمہاری ہمت مردانہ
ت آیا کہ اس قدر استقلال، حوصلے اور دردمندی سے یہ
رتب کیا۔ اس قدر لگن اور ایسی دیدہ ریزی وہ بھی اردو
کے لئے، جس کی قبل از وقت رحلت کی "بشارتیں"
او ادبی منجم دیتے آئے ہیں اور اب بھی دیتے رہتے
تی یہ ہے کہ ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند نمبر مرتب
یلے کرامت ہے لیکن اس سے بڑی کرامت ہے ہر شعبے پر
تمہارے لکھے ہوئے شذرات اور پرانے لکھنے والوں کے خطوط
اور ان کی تحریروں سے وہ اقتباس جو آج بھی مردہ نہیں ہوئے
ہیں۔ پھر حسن ترتیب، وہ بھی ایسا کہ ہر شعبہ بجائے خود ایک
کارنامہ ہے حتیٰ کہ ادیبوں کے پتوں کی فراہمی کا شعبہ۔ بھی دلی
مبارکباد، ایک بار نہیں کئی بار۔

مگر اب اس کو تم کیا کرو، میں کیا کروں کہ اردو ادب میں
تخلیقی سوتے ہی سوکھتے جاتے ہیں پرانے ناموں میں دو چار نام
تمہارے اس "گلدستہ" میں نہیں شامل ہو سکے اس میں تمہاری
کوشش کی کمی نہ ہو گی مگر اس سب کوشش و کاوش کے باوجود
حال کیا ہے۔ گنے چنے چند مضامین چند افسانے اور چند نظمیں
اور غزلیں ہی کام کی ہیں ورنہ باقی سب کا سب فضول۔ انسانی
محنت، دیانت اور خلوص کی اتنی بڑی توہین وہ بھی ان لوگوں بلکہ
مصنفوں کے ہاتھوں جن پر اتنی محبتیں نچھاور کی گئیں ہیں۔

افسانوں کے حصے ہی کو لے لیں تو سوائے جیتندر بلو،
سریندر پرکاش اور سلام بن رزاق کے اور کسی کا افسانہ بھی ایسا
نہیں کہ دامن دل کھینچتا ہو نہ تو موضوع کوئی نیا ہے نہ انداز
بیان کی دل گدازی قابل توجہ ہے بس بقول شخصے دہرائے
ہوئے لفظوں کا ایک بدرو ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے موضوعات کا
قحط، دردمندی کا فقدان اور فکر و فن کا سناٹا بس فقط بک بک
جھک جھک ہے۔ بلو کے ہاں البتہ اس میں ایک ٹھہراؤ ایک
متوازن لہجہ قائم ہے لیکن گل سرسبز ہے سریندر پرکاش کا
افسانہ جس میں دردمندی اور کیفیت کا اضافہ ہوا ہے یہ ہی کھویا
کھویا کسا مگر بندھا سا افسانہ سلام بن رزاق نے لکھا ہے۔ باقی
میں کچھ اور عرض کروں گا تو شکایت ہو گی بقول جگر۔ کیا
جانئے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد
مضامین کے شعبے میں بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔

مگر اس سے قبل ترتیب کے بارے میں کچھ کہتا چلوں
سیماب اکبر آبادی پر تم نے ذرا غلو سے کام لیا صرف ایک
تفصیلی مضمون شائع کرنا چاہئے تھا جو ان کی شاعری ان کی
تنقیدی بصیرت اور ان کی عہد آفریں شخصیت پر محیط ہوتا اس
میں ان کی خامیوں کی طرف بھی اشارے کئے جاتے کہ آخر
انسان تھے فرشتہ نہ تھے اس بورڈ کا بھی ذکر آتا جس میں شعر
تصنیف درج تھی اور ساغر نے جو بحث اٹھائی ہے اس کا بھی۔
دوسرا الگ شعبہ یا مضمون ہونا چاہئے تھا اعجاز صدیقی پر کہ
سیماب کی وراثت کو آپ تک پہنچاتا اور ہم تک پہنچاتا بھی
صرف اس مرد مجاہد کا کام تھا اور اس ناخوشگوار دور میں اس شخص
نے کیا کچھ جھیلا۔ پھر کچھ اپنا حال احوال!

تحقیق والا حصہ اس کے بعد آنا تھا اس میں رشید حسن
خاں اور گیان چند دونوں کے مضامین اچھے ہیں مگر رشید حسن
خاں کا مضمون ذرا اصولی ہے اس پر بحث کا دوسرا گوشہ بھی
سامنے آتا تو خوب تھا۔ پھر اس دور کے دوسرے ارباب تحقیق
کو بھی زحمت دینی تھی۔ نثار احمد فاروقی، حنیف نقوی، کالیداس
گپتا رضا، انصار اللہ نظر اور عابد پشاوری ان میں سے صرف
دو نام ہی نظر آئے۔

تنقیدی حصہ البتہ کمزور ہے کیوں کہ بنیادی طور پر اس کا
کوئی خاکہ تم نے نہیں بنایا۔ اپنے مضمون کے بارے میں کیا
کہوں۔ تنقید ان دنوں گمراہیوں کا پوٹلہ ہے جو ہے وہ اپنے
حواریوں کو بانس پر چڑھانے میں لگا ہے ایسے میں چند
موضوعات کے جائزے کی طرف متوجہ کرنا بڑی ادبی خدمت
ہوتی اصل یہ ہے کہ دنیا میں تنقید کے نئے دبستان اور نئے
انداز وجود میں آئے ہیں اوروں کو جانے دیجئے ہماری تنقید نے
ابھی ساختیاتی اور تقابلی تنقید ہی سے کسب نور نہیں کیا ہے
ساختیاتی (شاید بہتر ترجمہ تشکیل ہوتا) تنقید کے مبادیات کو
بھی جوں کا توں بیان کرنے کے بجائے اس میں ایجاد بندہ کے
عناصر شامل کر دئے گئے ہیں اور اس تصور کے ماتحت من مانے
طور پر اردو کے بعض ادیبوں کے ناموں کی فہرست چپکا دی گئی
ہے اور یہ کام ہندوستان میں بھی ہو رہا ہے اور پاکستان میں بھی،
اس میں مابعد جدیدیت والے بھی شامل ہیں۔ تقابلی تنقید اور
ادبی سماجیات وغیرہ کی تو اطلاع بھی ہمارے یہاں نہیں پہنچی۔
ضرورت ہے کہ ان طرز ہائے تنقید کی مبادیاتی نظریاتی وضاحت
کی جائے اور پھر ان کا اطلاق ہو۔ (ہمارے یہاں تو رولاں بارتھ
اور سوسیر کو سمجھے بغیر ان کے حوالے عام ہیں) اور تو اور ان
سے پہلے کے نقادوں کی بھی یہی درگت بنائی ہے ہم نے۔

تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی کمی کھلی کیوں کہ دور حاضر میں یہی ایک نقاد ہے جس نے حال ہی میں مثنوی، مرثیہ، ناول، افسانہ اور تاریخ ادب کے ضمن میں آنے والی (مضامین نہیں) کتابیں لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں اور حال ہی میں چھپی ہیں۔

حصہ نظم میں مجھے ایک ہی شکایت ہے کہ تم نے سب کو ایک ہی جگہ چھاپ دیا ہے ان میں میرے محبوب شاعروں کی قابل قدر نظموں کی طرف توجہ بھی ختم ہو گئی ہے سب کا ذکر نہیں کرتا راشد آذر، بشر نواز اور ندا کی آوازیں اور انداز سب سے جدا ہے ان میں تمہاری آواز کو بھی شامل کرتا ہوں وہ بھی الگ اور منفرد ہے (اور یہ منہ دیکھے کی بات نہیں ہے) کم سے کم ان شاعروں کی انفرادیت کا احترام تو ضروری تھا اس کے علاوہ بھی مشاعروں کے شاعروں پر ایک الگ باب بھی ضروری تھا خاص طور پر کلیم عاجز اور وسیم بریلوی کی شمولیت لازم تھی۔ آخری حصہ بالکل غیر ضروری ہے اتنے قیمتی صفحے صرف سرسری رالوں کی نذر ہو گئے ہیں یہی درست ہے کہ بعض لوگوں کو اس سے تسلی ہو جائے گی مگر یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔

خیر یہ معاملہ پسند اپنی اپنی کا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ مجھ ایسے بہت سے اردو والوں کا سر فخر سے اونچا ہو گیا اور یہ احساس بیدار ہوا

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

بڑی خوشی ہوئی کہ ابھی ہمت والے نوجوان (یا جواں سال) لوگ ہمارے درمیان ہیں جو زبان و ادب کی زندگی کی ضمانت ہیں۔ دلی مبارکباد۔

● D-7, MODEL TOWN, DELHI-1100

ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنے خط میں ہم عصر اردو ادب نمبر کے مندرجات سے متعلق جو کچھ بھی فرمایا ہے اس بارے میں خاص نمبر کے جرعات اور پھر بعد میں شائع ہونے والے خطوط کے ساتھ اداریتی شذرات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تین جلدوں کا پروجیکٹ ہے بہت سارے ابواب اور نام دوسری اور تیسری جلد میں آئیں گے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ تخلیق پر تنقید و تحقیق زیادہ حاوی نہ ہوں کہ عام طور پر خاص نمبروں میں تنقیدی مضامین شامل رہتے ہیں۔ ہم نے بہت سارے تجربے ہم عصر اردو ادب نمبر میں بکھیر دیئے ہیں۔ معاصر اردو تنقید کے بارے میں خود ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں لکھ ہی دیا ہے کہ صورت حال کیا ہے اور ہوا بھی یہی کہ بڑے بڑے نقادوں نے ہمارا عندیہ سمجھے بغیر ہی اس نوع کے مضامین ارسال کرنا شروع کر دیئے جو عموماً ادبی رسائل میں آتے ہی رہتے ہیں۔ ہم نے خاص نمبر کی جو فہرستیں مسلسل شائع کی ہیں ان میں تنقید کے باب میں تقریباً تمام اہم نام شامل ہیں۔ اب جلد دوم میں وہ نام اپنے تازہ ترین افکار کے ساتھ موجود رہیں گے، بطور خاص لکھوائے گئے مضامین کے ساتھ۔ ابھی بہت کچھ آنا باقی ہے۔

آپ کے تمام اعتراضات کا جواب جلد دوم میں مل جائے گا یہاں صرف آگرہ اسکول کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ مذکورہ باب کی شمولیت ناگزیر تھی۔ اس کا جواز بھی پیش کیا گیا ہے۔ نئی نسل نے اس باب کو اپنے لئے بے حد وقیع اور مفید جانا ہے۔ اس باب میں جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے وہ ایک تعارف نامہ ہے اور بہت مختصر ہے۔ پھر یہ کہ ایک نابغہ روزگار فنکار کے فکر و فن پر کسی ایک مضمون میں تمام پہلوؤں کی کیوں کر سمائی ہو سکتی ہے۔ یہ اور بھی دشوار کام تھا کیوں کہ علامہ سیماب کی عہد آفریں شخصیت کو اب تک مکمل طور پر کہاں پیش کیا جا سکا ہے کہ کسی ایک مضمون پر اکتفا کیا جا سکتا ان کی تمام تر خوبیوں اور عظمتوں کا احوال بھی کہاں مکمل ہوا ہے کہ ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی بات کی جاتی۔ اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ کے ہم عصر نقادوں نے سیماب کو بالکل ہی پرے کر دیا۔ آپ نے خود سیماب پر کتنا لکھا ہے؟ وہ تو کہئے کہ سیماب کا فن ہی مسلسل ان کا دفاع کر رہا ہے۔ سیماب پر کام ہی کہاں ہوا ہے اور کتنا ہوا ہے۔ ہمارے نقادوں کا حال احوال سب کو معلوم ہے ان کے موضوعات اور ان کی دلچسپیاں سب کو معلوم ہیں۔ آپ کو شاعر کا اقبال نمبر یاد ہوگا۔ اس کی بے پناہ پذیرائی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں علامہ اقبال کے بارے میں اتنا کچھ نیا مواد دیا گیا تھا اور نئی نسل سے اقبال کو بالکل نئے انداز سے متعارف کرایا گیا تھا ورنہ تو اقبالیوں نے یک طرفہ تعریفی و تنقیدی تحریروں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ نئی نسل اپنے اسلاف کو از سر نو پڑھنا چاہتی ہے۔ اپنے عصر کے تناظر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ سو ہم یہی کر رہے ہیں۔

یہ آپ نے غلو کی بھی خوب کہی۔ ہم نے تو اپنے آپ کو بہت روک کر، باندھ کر سیماب پر مواد دیا ہے۔ یہ جو کچھ دیا گیا ہے وہ اپنے موضوع پر دس فی صد بھی نہیں ہے اور خاکسار نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ مبنی بر حقائق ہے۔ سیماب کا فن خود ہی اتنا غیر معمولی ہے کہ اسے کسی غلو کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر کے لئے تسلیم کہ غلو کیا گیا تو کیا تمام ہی ناقدین و محققین اپنی تحریروں میں غلو سے پاک رہے ہیں جس شاعر ادیب کو اہم، عظیم، عبقری، نابغہ روزگار ثابت کرنا ہوتا ہے، اس کے بارے میں غلو سے کام لئے بغیر بات ہی نہیں بنتی۔ بے شمار ہیں۔ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ بہر حال! سیر مکمل پڑھے بغیر، جانے بغیر لوگوں کو یہی لگے گا کہ کر رہے ہیں۔ اعجاز صدیقی کے بارے میں جلد دوم میں باب قائم کیا جا رہا ہے، کیا یہ افسوس ناک بات نہیں کہ خ صدیقی مرحوم کے لئے نقادوں نے اردو والوں نے کیا ڈیڑھ سو سال کی ادبی خدمات اور چوتھی نسل میں سے ا شاعر، مجموعی طور پر ہمارے لئے کیا ہوا؟ [الف الف]

ارشد محمود ناشاد

"ہم عصر اردو ادب نمبر" پر مشاہیر اہل قلم کے : سے مسلسل آگہی ہو رہی ہے، دنیا بھر میں شاعر کے ار الشان نمبر کا جو سواگت ہو رہا ہے اس پر آپ تحسین کے ہیں۔ میں اس خاص نمبر سے گاہے گاہے مستفید بلکہ م ہوتا رہتا ہوں، اس نمبر کی کیا تعریف ہو؟ ہر گوشہ د ل حصہ بصیرت افروز، سبحان اللہ۔

خاص نمبر میں موجود کئی محل نظر مقامات کی طر ف کی توجہ مبذول کرانے کی تمنا ہے، اگر فرصت میسر انشاء اللہ یہ تمنا پوری کروں گا۔ اس عریضے میں ایسے : محل نظر مقام کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں، اُم آئندہ کسی شمارے میں اس کی وضاحت سے مفتخر فرما ئیں گا

"ہم عصر اردو ادب نمبر" جلد اول کے صفحہ م معروف افسانہ نگار اعظم کریوی کا ایک خط بنام ڈاکٹر م بیگ عکسا شائع ہوا ہے، یہ خط ۲۵؍اگست ۱۹۵۱ء کا مر قو اعظم کریوی کے تعارف میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے تاریخ وفات ۲۲؍جون ۱۹۵۴ء درج کی ہے، ڈاکٹر حامد : تاریخ پیدائش ۲۹؍اگست ۱۹۴۹ء ہے گویا اعظم کریوی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی پیدائش کے ٹھیک دو سال بعد ر اب ظاہر ہے کہ اعظم کریوی کا مکتوب الیہ دو سالہ بچہ ت ہو سکتا، اس غلطی کو کاتب رکمپوزر کے کھاتے میں نہ جا سکتا کیوں کہ ان سے کسی لفظ کے غلط املا کی توقع تو جا سکتی ہے مگر ایک نام کی جگہ کسی دوسرے نام کی موجود سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ فہرست میں بھی "اعظم بنام ڈاکٹر مرزا حامد بیگ" لکھا ہوا ہے!!!

52-MHD. NAGAR, MIRZA ROAD,
OCK CAWTT-43602(PAK)

مکتوبات

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ - ۲
پاکستان میں اردو ادب
شمارہ خاص فروری/مارچ

شمارۂ خصوصی "پاکستان میں اردو ادب" کو خاصہ پسند کیا گیا ہے اور سراہا گیا ہے۔ تعریفی و تنقیدی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان میں بھی ہماری اس کاوش کو داد و تحسین دی جا رہی ہے۔ شمارے کی خوبیوں اور خامیوں پر نگاہ کی جا رہی ہے۔ مذکورہ شمارہ کوئی مکمل شمارہ نہیں ہے موضوع کے کینوس پر یہاں وہاں لکیریں، نقطے، شیڈس اور رنگ، بکھیر دئے ہیں۔ ایک ادھوری پینٹنگ ہے۔ ایک نامکمل تخلیقی فن پارہ ہے۔ ایک ادھوری دھن ہے۔ ادھورے لفظ و حرف ہیں۔ جب بھی یہ سب کچھ اپنی مکمل شکل بنائے گا، اس وقت کوئی بھرپور مکالمہ روشن ہوگا۔ "پاکستان میں اردو ادب" بہت بڑا موضوع ہے "اردو ادب کی ایک صدی" میں اسے سمجھنے کی سعی کی جائے گی قارئین شاعر کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ - ۳ بھی زیرِ ترتیب ہے شاعر کے لئے تجربوں اور تنوع کے نت نئے رنگ سجانا ہمارا اولین مقصد ہے۔ ہم اپنے قارئین کو ہمیشہ ہی خوب سیرت شماروں سے نوازتے رہتے ہیں انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ [ادارہ]

حامدی کاشمیری

شاعر کا ایک اور گراں قدر نمبر یعنی پاکستان میں اردو ادب موصول ہوا، آپ کی مساعی جمیلہ، صبر و تحمل، جانفشانی اور علم و ادراک کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے بہت کم عرصے میں شاعر کے حوالے سے جو معجزہ کار کارنامے انجام دیئے ہیں، تازہ شمارہ اسی کی ایک روشن مثال ہے، مبارکباد قبول کیجئے۔

یہ نمبر بلاشبہ پاکستان میں اردو ادب کے منظر نامے کی ایک بھرپور جھلک پیش کرتا ہے، آپ نے اپنے موضوع کے تعلق سے وہ خاکہ پیش کیا ہے، جو ایک جامع کتاب کا پیش خیمہ ہے، اور جس علم و خبر، حُسنِ انتخاب اور نقد و تجزیہ کا آپ نے مظاہرہ کیا ہے، اس کے پیش نظر آپ کارواں دواں قلم ہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔ دو ممالک کے تعلقات کے حوالے سے آپ نے صحیح لکھا ہے "یہ بھی طے ہے کہ نفرتوں کی تمام انتہاؤں اور صورتوں کے اختتام پر دوستی دمفاہمت کے دروازوں کو وا کرنا ہی پڑے گا"۔ "پاکستان میں اردو ادب" بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ جائزہ ہے اور اردو ادب کے جملہ شعبوں کا اشاریہ ہے، عطش درّانی کا مقالہ ہمہ جہت ہے، اور تحقیق کا حق ادا کرتا ہے۔

●MASOOD MANZIL ,SHALIMAR
SRINAGAR, (KASHMIR)

آفاق صدیقی

شاعر کا تازہ شمارہ فروری ۲۰۰۰ء نظر نواز ہوا۔ آپ کا حوصلہ لائق صد آفریں ہے اور بہر طور قابل تحسین کہ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ پیش کر رہے ہیں اور جلد اول میں پاکستانی ادب اور اہل ادب کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

تازہ شمارے میں صفحہ سترہ سے جو سرسری اشاریہ شامل اشاعت ہوا ہے اس میں پاکستان کی مشہور ادبی شخصیات کا ذکر بھی ہے جسے دیکھ کر دکھ ہوا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جو نام آپ نے تحریر فرمائے ان میں حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا مثلاً آصف فرخی ہمارے بھائی ڈاکٹر اسلم فرخی کے بہت ہی باصلاحیت فرزند ارجمند ہیں لیکن مشتاق یوسفی، تابش دہلوی اور ادا جعفری جیسی شخصیات سے پہلے ان کا نام آنا مناسب نہیں۔

اب کچھ اپنے بارے میں اور وہ یہ کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک سندھی اردو اور پاکستانی ادب کے حوالے سے جو خدمات انجام دیتا رہا ہوں غالباً آپ کے علم میں نہیں۔ بھائی میرے میں نے تو ۱۹۵۱ء میں سکھر سے ماہنامہ کو بکن جاری کیا تھا۔ پھر متاع کارواں اور کراچی میں ماہنامہ کندن، اور آگہی کا ایڈیٹر رہا۔ اب بزم نشور کا ماہنامہ، قلمرو، میری ادارت میں منظر عام پر آنے والا ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ۱۹۶۴ء میں "قلب سراپا" کے نام سے اور دوسرا "زمزمۂ جاں" کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ سندھی ادب کے بارے میں دس کتابیں اور اردو تحقیق و تنقید کی ۵ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اب جامع کراچی کا شعبۂ پاکستانیات سندھی ادب کے حوالے سے عنقریب ایک کتاب شائع کر رہا ہے۔ اب تک گلڈ اور کئی ادبی تنظیموں کی جانب سے ۱۵ رایوارڈ مل چکے ہیں۔ کانپور، فرخ آباد اور مین پوری میں، بزم آفاق، کی ادبی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا کا اور عالمی طور پر ۱۹۹۷ء کی ورلڈ بک میں ذکر خیر ہے۔ بدقسمتی سے آپ تک میری کتابیں نہ پہنچیں حالانکہ پبلیشروں کو برابر تاکید کرتا رہتا ہوں۔ صرف میرا مسئلہ نہیں اس میں کئی ممتاز شخصیات کے نام رہ گئے ہیں۔ اگر آپ یہ خدمت مجھے سونپ دیتے تو ایسی کوتاہی نہ ہوتی بہر کیف آئندہ را احتیاط۔

پاکستانی ادب اور مذہب والا حصہ بھی کمزور ہے اس میں دبستان وارثیہ کے نعتیہ مجموعوں کا ذکر نہیں جو بڑے اہتمام سے شائع ہوتے ہیں۔ خزینۂ حمد، جہان حمد اور ادراہ فکر نو کی کتاب جو سات سو صفحات پر محیط ہے "بہر زماں بہر زباں" یہ غیر مسلم شعراء کا عالمی تذکرہ و نعتیہ کلام کا بہت ہی خوبصورت اور دستاویزی مجموعہ ہے پھر ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کی کتابیں ہیں۔

اب آپ ایسا کریں کہ جب یہ تمام سابقہ و موجودہ معلومات کو کتابی صورت میں یا کسی خصوصی نمبر میں پیش کریں تو براہ کرم اپنے اس بہی خواہ کو مطلع فرمائیں۔ خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑ ذخیرہ ہے اور میں نے اپنے شاگردان عزیز کو اشاریئے ترتیب دینے پر لگا دیا ہے۔

یہی ہے اور کچھ بھی نہیں کائنات مری
مری حیات ادب ہے ادب حیات مری

R-113, SECTOR-16-A, NORTH
KARACHI 75850

پاکستان میں اردو ادب۔ ایک سرسری اشاریہ" کے تحت ابتدائی سطریں آپ نے ملاحظہ کی ہوں گی۔ پاکستان کی مشہور شخصیات کے ذیل میں جو نام تحریر کئے گئے ہیں وہ قطعی ادھورے نام ہیں اور کسی حفظ مراتب کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ یہ یک قلم لکھے گئے ناموں میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ محترم اسلم فرخی ایک قابل قدر قلم کار ہیں ہندوستان کے علمی وادبی حلقوں میں بھی جانے جاتے ہیں۔ ایسے اور بھی نام ہیں رشید امجد، اسد محمد خاں، حسن منظر، انیس ناگی، شاہدہ حسن، شاہین مفتی، حسینہ معین، سلیم کوثر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، عبدالعزیز خالد، انور شعور، ناصر شہزاد، افضال سید، توصیف تبسم، غلام حسین ساجد، ادیب سہیل، امراؤ طارق، فاطمہ حسن، جیلانی کامران، عرفانہ عزیز، آغا سہیل، مشکور حسین یاد، مسعود اشعر، محمد اظہار الحق، حفیظ تائب، محبت عارفی، خالد اقبال یاسر، صفدر سلیم سیال، احمد ظفر منصور احمد، محمد خالد اختر، سلیم آغا قزلباش، حسن رضوی، اعتبار ساجد، حسن عباس رضا، [یہ نام بھی بغیر کسی ترتیب کے زیر قلم

آگئے ہیں] صفحات کی گنجائش نہیں تھی ورنہ تمام اصناف اور ان میں تقریباً تمام اہم نام تحریر کردئے جاتے ۔ حالیہ مطبوعات پاکستان کی بھی ایک فہرست دی جاسکتی تھی ۔ پاکستان کے تقریباً تمام ہی ادبی رسائل شاعر کے تبادلے میں آتے ہیں انہیں سے وہاں کے معاصر ادب کا منظر نامہ ترتیب دیا جاسکتا تھا۔ ہم نے خود اعتراف کیا ہے ہے کہ سارا لوازمہ بہت سرسری اور ایک ادھورا اشاریہ ہے اب جب بھی پاکستان میں اردو ادب کو موضوع کیا جائے گا، ایک بھر پور خاص نمبر شائع کیا جائے گا۔ مزکورہ خصوصی شمارہ ہندو پاک دوستی کے نام ہے اور ایسا کام ہندوپاک کے ادبی رسائل میں کسی نے نہیں کیا۔ وطن دوستی برحق لیکن ہم جس طرح کی سرحدوں سے بندھے ہوئے ہیں ان کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اور قلم کاروں کو محبِ وطن ہوتے ہوئے بھی "امن ذہن" ہونا چاہئے، اسی میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ ہندوپاک عوام کی بنیادی خواہش بھی یہی ہے۔ [الف الف]

ابو خیّام

"شاعر" کے کچھ شمارے غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ مل جاتے ہیں ۔ دونوں صورتوں میں ڈاک والوں کا شکر گذار رہتا ہوں۔ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ -۲ ابھی پڑھ کر ختم کیا ہے۔ آپ کے پاس آئیڈیاز بھی ہیں اور آپ محنت بھی بہت کر رہے ہیں میں دل سے آپ کا معترف ہوں

● A-997,SECTOR-11A
NORTHKRACHI KRACHI-75850(PAK)

شہناز صبیح

"اردو ادب کا عالمی منظر نامہ -۲ پاکستان میں اردو ادب" موصول ہوا۔ پڑوسی ملک کے اردو ادب کو شائع کر کے آپ نے ہم ہندوستانیوں پر بڑا احسان کیا اور خود بڑا جوکھم کا کام کیا۔ عطش درّانی کا مضمون پسند آیا اردو لشکری زبان ہے اسماء مختلف زبانوں کے اس میں شامل ہیں لیکن جملوں کی ترتیب، تذکیر، تانیث، فاعل، مفعول کی ترتیب قائم رکھنا ہمارا اولین فرض ہے ۔پاکستانی اردو ادب میں ان سے جو انحراف برتا جارہا ہے وہ قابل تشویش ہے اس کی درستگی ضروری ہے ورنہ اردو کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

آپ کا "اشاریہ" پڑھ کر تشنگی بڑھ گئی "تھرو پراپر چینل" نے حقیقت کا بخوبی پردہ اٹھایا ہے شمع خالد کو مبارکباد کہ بہت سے دلوں کو ڈھارس ہوئی جو پراپر چینل سے کام کرنے کو زندگی کا اصولِ زرّیں سمجھتے ہیں۔

افسانہ "بکھراؤ" کی چند ترکیبوں نے بہت لطف دیا مثلاً "گرم جوشی کی دھوپ بھر کر مصافحہ کیا"، "لفظوں کی میلی آنکھوں میں آنسو الجھے ہوئے تھے"، "اُس کے چہرے پر کسی رنج کی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی" وغیرہ

غزلیں کافی تعداد میں ہیں۔ اچھی ہیں۔ خالد اقبال یاسر نکہت بریلوی، نظیر صدیقی، سرفراز تبسم، افتخار اجمل شاہین کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ -۲ پاکستانی ادب کے متعلق اس قدر مواد ریسرچ کے طالب علموں کے لئے خصوصاً بہت بڑا تحفہ ہے۔ اس کار خیر کے لئے شکریہ اور مبارکباد قبول کیجئے۔ "پاکستان میں فنون لطیفہ" کے تحت تھیٹر کے اصلی خدوخال واضح ہوئے اور یہ باور ہوا کہ اس مغربی پود کو مشرق میں پھلنا پھولنا دشوار ہے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے دوران برابر یہ خلش رہتی تھی کہ سرحد پار تھیٹر تیزی سے ترقی کر رہا ہے، ہم ہی محروم ہیں لیکن ادھر حالت بہتر سہی، قابل اطمینان نہیں ہے "زندگی کی ڈھلتی شام" اور جنگل میں گم شدہ شہر پسند آئیں، شاعری تقریباً ایک ہی حالت میں ہے چند اشعار پسند آئے

● 623-WASIABAD AL!AHABA (U.P)

صدف جعفری

"شاعر" کا تازہ شمارہ "اردو کا عالمی منظر نامہ -۲" کے پیراہن میں خوشگوار حیرت سے دوچار کر گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ "آدمی سے آدمی کے نام" شاعر کا یہ ایک چھوٹا سا خصوصی شمارہ بڑی عظمت کا حامل ہے جس سے "آرزدہ-دلان-اردو" کو قدم آگے بڑھانے اور کچھ کر دکھانے کا حوصلہ یقیناً ملے گا اس شمارے میں سرحد کے اس پار کی بہت سی وقیع تخلیقات یکجا کردی گئی ہیں جن سے استفادہ کرنے کے لئے ایک دو نشستیں نہیں بلکہ ایک دو ماہ کی ضرورت ہے۔ تاہم اپنی ذاتی ترجیحات کے تحت جس قدر اب تک پڑھ سکی ہوں ان میں "پاکستانی اردو کے خدوخال" پہلی بار ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے کے باوجود آج بھی بالکل تازہ مضمون لگتا ہے اور دعوت فکر دیتا ہے کہانیوں میں علی تنہا کی "گائے" اور عذرا اصغر کی "زندگی کی ڈھلتی شام" بطور خاص پسند آئیں۔ شعری حصے میں احمد ندیم قاسمی، احمد صغیر صدیقی شاہدہ حسن اور ثمینہ راجہ کی غزلیں زیادہ اچھی لگیں۔ ضیاء جالندھری، وزیر آغا اور نصیر احمد ناصر کی نظمیں عمدہ اور بار بار پڑھی جانے کے لائق ہیں۔ نثار ترابی کے مساوی الوزن ماہیے سے اردو کی تغزل آمیز مہذب شاعری کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ انہیں زبردستی کی کھینچ تان کی حاجت نہیں۔

● SHAH FAMILY LAKHMINIA,
BEGUSRAI-851211

پردیپ ساحل

"شاعر" کا موجودہ "پاکستان نمبر" نظر نواز ہوا۔ یہ یقیناً قابل احترام وداد و تحسین کا مستحق ہے ایسی کوشـ لگاتار اور دونوں طرف سے ہوتی رہنی چاہئے ۔ اس ـ نفرتوں کے ماحول میں اگر ہم اور آپ بھی لکیر کے فقیـ گئے تو یہ غلط ہوگا۔ حالانکہ اپنے امتحانوں کے باعث ا مطالعہ ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کرپایا ہوں، مگر پھر بھی جـ تک پہنچا ہوں مطمئن ہی ہوا ہوں صفحہ ۴ پر آپ کا اشاریہ اس میں ظاہر آپ کے خیالات وافکار اور آپ کی خواہشـ کا مطالعہ کر کے ایک عجیب سی راحت و سکون کا احساس اچھا لگا، آخری اقتباس یقیناً نیکی اور انسانیت کی جیت کا سو ہے۔ اور مجھے پکا وشواس ہے کہ جیت آخر ش دوستی، محبت نیک نیتی کی ہی ہوگی اس طرح کی کوششیں معاشـ پھیل رہے POLUTION کو کم کرنے میں کافی مددگار ثا ہو سکتی ہیں۔ ایسی کوششیں ہوتی رہنی چاہئیں۔

میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ نفرتوں اور بدگمانیوں ا اندھیرا اپنی انتہا کے قریب ہے اور اس کے بعد بجز روشنی کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ سحر ہوگی، ضرور ہوگی اور جلد ہوگی اور یہ کالی اندھیری رات خود اسے ہم تک پہنچا۔ کارن بنے گی۔

A-1715, JAHANGIR PURA,
ELHI-1100033

اندر موہن کیف

شاعر کا شمارہ ماہ فروری و مارچ، اردو ادب کا عالمی م نامہ -۲، کے زیرِ عنوان پاکستان میں اردو ادب ایک اشا باصرہ نواز ہوا، جی خوش ہوگیا۔ آپ نے جس محنت جانفشانی سے یہ شمارہ مرتب کیا ہے اس کی داد نہیں، نی جـ پاکستان کے شعرا میں جناب اظہر سعید خاں، اور جعفر شوکت ہاشمی، شاہدہ حسن، جون ایلیا اور امجد اسلام امجد غزلیں اور ڈاکٹر وزیر آغا، آفاق صدیقی اور ضیاء جالندھر کی نظمیں بہت خوب ہیں ۔پاکستانی اردو کے خدوخال پاکستان میں اردو ادب -ایک اشاریہ، دونوں مضامین عمدہ ہیں اور سیر حاصل ہیں۔ کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکا مگر آپ کا انتخاب ہے تو ضرور اعلیٰ وارفع ہوگا۔ اتنا اچھا خالص ادبی نوعیت کا مجلّہ پیش کرنے پر میری مبارکباد قبول کیجئے۔

96/8, CIVIL LINES, JAHNSI(U.P)

کلیم اختر

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ -۲، ملا، شکریہ، بہت بڑا

...نے۔اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہے۔بلا شبہ ...حساس، ثابت قدم مخلصانہ و ہنر مندانہ، یکی ...نے والے ہیں۔مبارکباد کے مستحق ہیں۔

● KABARIA TOLA, GAYA-82300

...مل افضل

فروری مارچ ۲۰۰۰ء کا خصوصی شمارہ "اردو ادب ...نامہ-۲" تحسین نظر ہوا، اتنا دقیق کام اور حیرت ...والا کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔پاکستان میں ایسا کام یعنی "ہندوستان میں اردو ادب "پاکستان ...ہے؟

● YADGIR-585001

...-ایم - کاظمی

...دب کا عالمی منظر نامہ-۲" پاکستان میں اردو ادب" ...ن کا یہ شرف بلا شبہ آپ کے حسن ظن کا یہ کمال کے لئے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ...ے باب میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، نظیر ...لب عرفان، یاور امان، ناصر شہزاد کی تخلیقات سے بہت پسند آئے۔ پاکستانی اردو کے خدوخال از عطش درانی، ایک اہم مضمون ہے۔آپ کے مضمون "پاکستان میں اردو ادب -ایک سرسری اشاریہ" اسے سرسری کہنا سراسر غلطی ہے۔یہ تو اتنا بھرپور ہے کہ پورا پاکستان، اردو کے توسط سے سامنے آجاتا ہے۔کہانیاں تقریباً سبھی اچھی ہیں۔اتنا بھرپور اور بہترین نمبر شائع کرنے پر مبارکباد ایک بار پھر مبارکباد۔

● B.R.S. MAHILA COLLEGE PUSA, SAMASTIPUR-848125

سحر اکبرآبادی

شاعر کا شمارہ خصوصی "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ" کے تحت پاکستان میں اردو ادب، مطالعے میں آیا۔آپ نے پاکستان کے ہر اچھے شاعر کو نمایاں کیا ہے۔ معاصر پاکستانی شعر و ادب کو متعارف کروایا ہے اردو زبان و ادب پر یہ آپ کا ایک اور احسان ہے۔یہ شمارہ مستقل حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔بہت بہت مبارکباد۔

● 904 SOUTH CATALINA AVE # 18
LOSANGELES, CA 90006 (U S.A)

انور فیروز

شاعر (بمبئی) کا فروری اور مارچ کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا جو پاکستان میں اردو ادب کے موضوع پر ہے۔اردو ادب کا عالمی منظر نامہ کے سلسلے میں پاکستان میں اردو ادب بھی ایک کارنامہ ہے۔اس میں پاکستانی اردو کے خدوخال، پاکستان میں اردو ادب-ایک اشاریہ، پاکستان میں فنون لطیفہ، نظمیں، غزلیں، کہانیاں، پاکستانی اردو ادبی رسائل کے پتے اور قلم کاروں کی تصاویر وغیرہ۔یہ نمبر بھی خوب ہے اور آپ کے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔

● D/538, SETELATE TOWN, RAWALPINDI (PAK)

جبین نازاں

شاعر کا خصوصی شمارہ "پاکستان میں اردو ادب" موصول ہوا بے ساختہ زبان سے آپ کے لئے دعائیں نکل گئیں۔کوئی نہ کوئی موضوعاتی خصوصی شمارہ شائع کر کے آپ ادبی رسائل میں پھیلی ہوئی یکسانیت کو دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ آپ اردو زبان کے سچے سپاہی ہیں۔ پاکستان میں فنون لطیفہ کے تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے کمال کر دیا آپ نے۔سوائے دو تین چیزوں کے جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ڈاکٹر عطش درانی کا مقالہ پاکستانی اردو کے خدوخال، نہایت وقیع اور متنوع ہے۔ (باقی صفحہ ۲۰۹ پر)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

مٹی مٹی میرا دل (شاعری)

مغنی تبسم

مغنی تبسم ایک محقق، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی اول الذکر دونوں حیثیتیں زیادہ مستحکم ہیں اور شاعرانہ حیثیت اب تک ان کے اپنے نظریہ شعر تجربہ پسندی اور غیر شخصی طرز اظہار کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ ان کے گذشتہ مجموعہ کلام "پہلی کرن کا بوجھ" میں اظہار کی نئی جہتوں کی تلاش اور مختلف ضروری اور غیر ضروری ہیئتی تجربوں کے باوجود ایک آنچ کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور میرے اپنے خیال کے مطابق اس کمی کی بڑی وجہ تجربے میں شاعر کی عدم شمولیت کے سوا کچھ اور نہیں۔

"مٹی مٹی میرا دل" مغنی کا نیا مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے اس منزل تک آتے آتے مغنی تبسم، تجربے میں شخصی شمولیت کے نہ صرف قائل ہوگئے ہیں بلکہ اس شمولیت کے فنکارانہ اظہار پر بھی قادر ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غزلیں جامد اصولوں اور مروجہ شعری محاورے سے ماورا محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں جذبہ، احساس، فکر، لفظ، بیان اور دیگر لوازمات شعری مل کر ایک ایسی ناقابل تقسیم اکائی بناتے ہیں جسے سچی شاعری کہا جاتا ہے اور سچی شاعری کا تجزیہ نہ محض پیکر شماری سے کیا جاسکتا ہے نہ سکہ بند موضوعات کی گنتی سے۔ یہ تجزیہ نہ جامد تنقیدی اصولوں کے بس کی بات ہے نہ اس سلسلے میں رائج جارگن اور کلشیز کچھ مدد کر سکتے ہیں کیوں کہ سچی شاعری شاعر کا ایسا وجودی تجربہ ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے، اپنا جمالیاتی نظام خود دریافت کر لیتی ہے اور یہ جمالیاتی نظام نہ صرف زبان و بیان کے مختلف امکانات کو بلکہ ایک تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "مٹی مٹی میرا دل" کی بیشتر غزلیں، زبان و بیان یا اظہاری وسیلوں کی چمک دمک اور داؤ پیچ کے بغیر اپنے قاری سے درست مکالمہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔

ہے تشنگی کا نیا ہی اک ذائقہ لبوں پر

یہ ذائقہ اس سے پہلے نہ مغنی کی شاعری میں ملتا ہے نہ ان کے بہت سارے ہم عصروں کی شاعری میں سبب اس کا شاید یہ ہے کہ اکثر احباب شاعری سے زیادہ نئے پن اور نئے اسلوب کی کھوج میں سرگرداں تھے اور اس بھاگ دوڑ میں وہ چیز جسے "شعری تاثر" کہتے ہیں گنوا آئے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ "تلاش گمشدہ" کا اشتہار دیئے بغیر مغنی تبسم اس کھوئے ہوئے کی بازیافت میں کامیاب ہوگئے۔

اس مجموعے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک فضا اور مزاج کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فضا غمگین نہیں کرتی اُداس کرکے اک HIGH SERIOUSNESS پیدا کرکے زندگی، موت، انسان، کائنات اور وقت کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اکثر غزلوں میں شخصی تجربے مختلف فکری عناصر سے میل کھا کر ایک نئی حقیقت کا اشاریہ بن جاتے ہیں اور یہ اشاریے شعر کی اوپری سطح پر نہیں تیرتے بلکہ اس کی پوری بنت میں شامل ہوتے ہیں۔

سر جھکاتا ہے کہاں تیرا مقدر ہے الگ
گھر کی دیوار جدا راہ کا پتھر ہے الگ
راکھ کے ڈھیر میں پوشیدہ شرر ہے کتنا
اور اس آگ میں جل جانے کا ڈر ہے کتنا
فضا میں نغمہ آواز پا ہے میرے لئے
کراں سے تابہ کراں اک ندا ہے میرے لئے
یوں لگتا ہے سب کچھ کھونے آیا تھا
میں اس گھر میں تجھ کو رونے آیا تھا

یہ پوری کی پوری غزلیں ایسی فضا رکھتی ہیں جس میں ضبط غم اور تہذیب جذبات، ذات کا پردہ بن کر اس فضا کو اور زیادہ پر اسرار اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ ان غزلوں میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اپنے موضوع اور نجی غم کی وجہ سے ان میں ناپختہ جذباتیت اور دلدوز چیخ بن جانے کی کافی گنجائش تھی لیکن شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے سطحیت سے دامن بچاتے ہوئے اشعار میں ایسی دھیمی آگ بھر دی ہے جو روح و دل کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے اور اس پگھلاؤ میں قاری، شاعر، موضوع اور اسلوب سب ایک ہو جاتے ہیں۔ غالب کے الفاظ میں "بادہ شیشے میں ایسے گھل مل جاتا ہے جیسے جان و تن ہوں" مواد اور ہیئت کی یہی ہم آہنگی مٹی مٹی میرا دل کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اسی ہم آہنگی کی وجہ سے شاعر کو لفظوں کی بازیگری کی ضرورت محسوس ہوئی نہ آوردہ رموز و علائم کا سہارا لینا پڑا سادہ مگر تہہ دار بیانیہ ان غزلوں کو ایک ایسے نئے ذائقے کا حامل بنا دیتا ہے جو اردو کے لئے بالکل نیا تو نہیں ہے لیکن جسے اردو والے ایک مدت سے بھلا چکے تھے۔ "مٹی میرا دل" میں مغنی تبسم نے اردو کی بڑی غزلیہ شاعری کی سہی اچھی اور پُر کیفیت شعری روایت کی کامیاب بازیافت ہے۔ ایک مابعد جدیدیت کے علمبردار فریڈرک جیمسن کا ہے کہ، مابعد جدیدیت کی ایک نمایاں پہچان قدیم اسالیب بازیافت بھی ہے۔ وہ اس عمل کو PASTICHE کا نام دیتا ہے اس پر اصرار کرتا ہے کہ قاری کو سامنے کے معنی اور پس معنی میں فرق کرنا ضروری ہے کہ بغیر اس فرق کے قاری پارے کی تہہ داری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم بات کو یوں کہہ سکتے ہیں "فن پارے" میں شامل عمومی استعمال شدہ الفاظ بھی دراصل کئی معنوی تہیں رکھتیں ہیں ایک ذہن کاری پہلی سطح کے معنوں سے گذر کر تہہ با معنوی کیفیات تک پہنچتا ہے "مٹی مٹی میرا دل" کی غزل میں یقیناً یہ تہہ با تہہ کیفیات اساسی حیثیت رکھتی ہیں اور خصوصیت اس مجموعے کو ایک منفرد اور دلکش شعری مجموعہ تی ہے۔ آخر میں کچھ شعر نمونتاً

فرصت عمر ہے کم حرف تمنا سن لو
بات شکووں کی نہ پوچھو کہ یہ دفتر ہے الگ
تیرا خیال تھا تازہ ہوا کے جھونکے میں
جو گرد اُڑ کے گئی ہے ملال میرا تھا
جو سو نہ سکے وہ آنکھ میں ہوں
جو ٹوٹ گئی وہ نیند تو ہے
اس بستی میں کتنے گھر مٹی کے ہیں
بادل ٹوٹ کے برسے گا تو دیکھیں گے
جیتے لمحے لوٹنے بھی تو یاد بنے یا خواب
پرچھائیں تھی پرچھائیں پھر ہاتھ کہاں سے آتی

ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۵۰/روپئے مطبوعہ ۹۸
☆ پتہ: وکاس پبلیشنگ ہاؤس، انصاری مارکیٹ، نئی دلی۔
مبصر: بشر نواز

دفتر جنوں (تبصرے)

ڈاکٹر ھارون ایوب

یہ کتاب اُن تبصروں کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر ہارون ایو نے مختلف النوع کتابوں پر مختلف رسالوں کے لئے لکھے لیا عنوان سے دقیانوسی شاعری کا مجموعہ لگتی ہے۔ تبصروں

ائع کروانے کی بدعت سب سے پہلے شمس الرحمٰن
رؤ انصاری مرحوم نے شروع کی اور ڈاکٹر ہارون ایوب
، آگے بڑھایا۔ اس طرح کا مجموعہ شائع کرنا ہی بے
،، کجا یہ کہ تبصروں پر تبصرہ کیا جائے۔ شفیق الرحمٰن
دیہ مضمون "ریویو" کو اس کتاب میں نقل نہیں
ہیے تھا۔ فہرست پڑھتے ہوئے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ
حمٰن کی کوئی کتاب ہے "ریویو" جس پر ڈاکٹر ہارون
، تبصرہ کیا ہے۔
کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، اتر پردیش،
تعاون سے شائع ہوئی۔ کاغذ، کتابت اور طباعت
ہے۔
امت: ۱۰۹ صفحات ☆ قیمت: پچاس روپے ☆ تقسیم
جامعہ لمیٹیڈ نئی دلی
تافظ حیدر

انیس ناگی - اردو کا اینٹی ہیرو

شاہین مفتی

ایک بالکل مختلف کتاب ہے جسے اردو کی ذہین شاعرہ
شاہین مفتی نے تحریر کیا ہے۔ یہ ایک نئی تیکنک کے
بالکل تازہ کار اسلوب میں۔ کتاب کی ابتداء میں
۔" کے عنوان سے جو چند سطریں درج کی ہیں اسی
، کتاب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ چند سطریں یہ ہیں:
مارے عہد کے متنوع جہات اور غیر معمولی دانشور
، کے شخصی اور تحریری بیانات کی روشنی میں ان کی
قدمہ آپ کے سامنے ہے۔ "انیس ناگی۔ اردو ادب کا
و" کے مطالعے کے دوران تحریر کا عدم تسلسل اور
بلے کا ابہام یقیناً قائم رہے گا۔ یہ مضمون کسی تدریسی
، کے تحت نہیں لکھا گیا اس لئے اسے "روایتی نظام
و شنی میں پڑھنا بے کار ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ اس
ے مطالعے میں آپ کو بھی اس طرح کی بدمزگی رہے
ح کی بدمزگی اس عہد کے دانشوروں کی قسمت ہے۔"
عری، ناول، افسانہ، تنقید، سوانح اور ترجمہ نگار انیس
ب تک ۵۱ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نثر و نظم میں وہ جو
اس میں سے شاہین مفتی نے ان کی شخصیت و فن کو
، ہیرو کے اپنے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ پوری کتاب
.تی ہے اور اپنے آپ کو پڑھواتی ہے۔ ایسی کتابیں کم کم
تی ہیں۔ پوری کتاب میں ۸۷ اقتباسات آئے ہیں لہٰذا
کتابیات کے تحت ان کی تفصیل دی گئی ہے

ضخامت: ۱۰۹ صفحات ٥ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء
☆ پتہ: محمد علی، حسن پبلیکشنز، کرشن نگر، لاہور (پاکستان)
مبصر: افتخار امام صدیقی

دستاویز

[اردو زبان اور رسم الخط سے متعلق]

جابر حسین

بہار قانون ساز کاؤنسل کی اردو رسم الخط سے متعلق دستاویز جذباتیت سے لبریز کوئی خطبہ ہے نہ اردو زبان و ادب کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کی داستان۔ یہ حکومت کی بنائی ہوئی کسی کمیٹی کی رپورٹ یا کسی سیاسی پارٹی کا چناؤ منشور بھی نہیں ہے بلکہ ایسے خواب کی تعبیر ہے جو بڑی صبر آزما آزمائشوں کے بعد اردو والوں کے سامنے آئی ہے۔

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے سلسلے میں وعدوں کے باوجود جو اڑچنیں پیدا کی جاتی رہی ہیں ان کی ایک طویل داستان ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ دوسرے مرحلے پر اردو قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان بھی بن گئی ہے۔ زیرِ نظر دستاویز اسی کا ثبوت ہے۔

منفی رجحان کی حامل افسر شاہی اور عیار سیاست دانوں سے اردو کے حق میں کوئی فیصلہ کرا کے اس کا نفاذ بھی کرا لینے میں بہار کے پرستارانِ اردو کو اوّلیت حاصل ہوئی ہے۔ اگر دیگر ریاستوں کے لوگ اس سے ترغیب حاصل کریں اور بہار کے مجاہدینِ اردو اس کامیابی کو نقطہ آخر نہ سمجھ لیں تو یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جو ذمہ داریاں ابھی پوری ہونی باقی ہیں وہ اور بھی اہم ہیں سماجیاتی تقاضوں کا پس منظر اور عملی ترجیحات کے سلسلے میں آئندہ پانچ برسوں کے ایکشن پلان کا جو خاکہ دیا گیا ہے اس کے لئے کاؤنسل کے کارگذار صدر جابر حسین بھی قابلِ مبارکباد ہیں اور یہ خاکہ اردو والوں کی سنجیدہ توجہ کا متقاضی ہے۔ اس کی ایک جھلک افادیت سے خالی نہیں ہے۔

☆ آڈیو ویڈیو کے ذریعے اردو تعلیم ☆ نصاب اور طریقۂ تعلیم میں جدید کاری ☆ سماجی علوم کی کتابیں اردو میں ☆ بچوں کے لئے اردو ادب ☆ ثانوی سرکاری زبان اردو کے لئے نئی جہتیں ☆ اردو زبان و ادب کے کلچرل ورثے کو عام کرنا ☆ مراسلاتی نظامِ تعلیم میں اردو ☆ سرکاری نیم، سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور اردو ☆ اردو نظامِ املا کی معیار سازی ☆ اردو کتاب خانوں کا جال ☆ ترجمے کے کام میں جدید کاری ☆ اردو کی مختصر ترین تاریخ ☆ اردو اور روزگار ☆ اساتذہ کے لئے ترقیقی نظم ☆ طلبہ کے بیچ اردو ☆ انتخابات اور اردو ☆ مردم شماری اور اردو ☆ اعلیٰ سطحی معائنہ کمیٹی کی تشکیل ☆ عملی ترجیحات نفاذ کمیٹی کی تشکیل۔

ضخامت: ۱۶۵ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: جون ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ (بہار)
مبصر: شمیم طارق

اردو تھیٹر: کل اور آج (ڈرامہ)

مرتبین:

مخمور سعیدی، انیس اعظمی

اردو اکادمی دہلی کی سیکریٹری شپ کے دوران زبیر رضوی نے کئی اچھے کام کیے جن میں ایک اردو تھیٹر پر سیمینار کا یک روزہ انعقاد بھی تھا۔ اس کتاب میں اس سیمینار کا مکمل اور مفصل ذکر ہے۔ جن حضرات نے اس سیمینار میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں: محمد حسن، ریوتی شرن شرما، رمیش چندر، جے این کوشل، انور عظیم، ساگر سرحدی، شیلا بھاٹیہ، جاوید ملک، عزیز قریشی، اقبال مجید، شمس الاسلام، کیرتی جین، رام گوپال بجاج، انورادھا کپور، نشاط قیصر، قمر رئیس، اظہار اثر، رتن سنگھ، ابراہیم القاضی، نیمی چند جین اور زبیر رضوی۔ تھیٹر کے نامور ہدایتکار حبیب تنویر اس میں شریک نہ ہو سکے تھے اس لئے ان کا ایک انٹرویو الگ سے شائع کیا گیا ہے۔

موضوع بحث اہم تھا کہ کیا اردو تھیٹر حقیقتاً اپنا کوئی وجود رکھتا ہے۔ سیمینار کے پہلے اجلاس میں محمد حسن نے اور دوسرے اجلاس میں اقبال مجید نے مقالے پڑھے جن پر بڑی جوشیلی بحث ہوئی۔ یہ رپورٹ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

رپورٹ کے علاوہ اس کتاب میں ایسی تفصیل اور الگ الگ فہرست بھی ہے جو اردو ڈرامے سے متعلق اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے، اس کے محققین کے لئے کار آمد ہے۔ مثلاً اردو کے اہم ڈرامہ نگار اور ان کے ڈرامے، غیر ملکی زبانوں کے ڈرامے جن کے ترجمے اردو میں ہوئے، تھیٹریکل کمپنیاں ۱۸۵۳ء سے ۱۹۶۵ء تک، اردو کے اسٹیج شدہ ڈرامے سنہ وار، اردو تھیٹر پر چند اہم کتابیں، اردو رسائل کے ڈرامہ / تھیٹر نمبر۔ مختلف ڈراموں کے تصاویر سے بھی یہ کتاب مزین ہے

کتاب کے گٹ اپ میں اردو اکادمی دہلی نے اپنے جمالیاتی ذوق کی روایت برقرار رکھی ہے۔

ضخامت: ۲۷۵ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ سنہ اشاعت: جنوری ۱۹۹۵ء ☆ ناشر: دہلی اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۲
مبصر: حافظ حیدر

کتاب بازار

اکتشافی تنقید کی شعریات (نئی ادبی تھیوری)
مصنف: حامدی کاشمیری ☆ ضخامت: ۱۴۰ صفحات ☆ قیمت: تین سو روپے ☆ سن اشاعت: نومبر ۹۹ء ☆ پتہ: کمپیوٹر سٹی، راج باغ، شالیمار، سرینگر (کشمیر) ☆ مسعود منزل شالیمار، سرینگر کشمیر۔

ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید
مصنف: احمد سہیل ☆ ضخامت: ۴۴۸ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے ☆ سن اشاعت: نومبر ۹۹ء ☆ پتہ: تخلیق کار پبلیشرز یادر منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲
131-MEMORY LANE # 201 PALESATINE, TX 75801 (U.S.A)

فارسی ادب کا مطالعہ (انقلاب اسلامی کے تناظر)
مترجم: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ☆ ضخامت: ۱۶۸ صفحات ☆ قیمت: ایک سو روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: مکتبہ فاران، ۷/۴-اے، محمد علی روڈ، نزد نور ہاسپٹل، ممبئی ۳۔

جگن ناتھ آزاد: فکروفن
مصنف: محمد منظور عالم ☆ ضخامت: ۲۶۲ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

ایک غیر مشروط معافی نامہ (افسانے)
کہانی کار: خورشید اکرم ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ساٹھ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ☆ پتہ: تخلیق کار پبلیشرز 104/B یادر منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

میرے حصے کا زہر (افسانے)
افسانہ نگار: فیاض رفعت ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ایک سو روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ☆ پتہ: معیار پبلی کیشنز K-302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱۔

اثبات (شاعری)
شاعر: ڈاکٹر فرید پربتی ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶

منفرد (افسانے)
افسانہ نگار: نعیمہ ضیاء الدین ☆ ضخامت: ۱۵۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے ☆ ۷ پونڈ ☆ ۱۲ ڈالر ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: انشاء پبلی کیشنز، 6-A، کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۷۳
AM-KALBSKOPF-1, 63263 NEU ISENVURG, GRMANY

دوسرا زاویہ (تنقیدی مضامین)
ناقد: ایم۔ کے۔ خالد ☆ ضخامت: ۹۲ صفحات ☆ قیمت: چالیس روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۹۹ء ☆ پتہ: R-123، جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

قصہ شناسی (تنقیدی مضامین)
ناقد: ڈاکٹر قاسم فریدی ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: اسی روپے ☆ مطبوعہ: ستمبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: شہرت منزل قاضی محلہ، اورنگ آباد (بہار)

کیکٹس کے پھول (شاعری)
شاعر: واحد بشیر ☆ ضخامت: ۱۱۸ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ارتقاء مطبوعات، A-10، ولایت آباد-۲ کراچی ۷۵۷۰۰ (پاکستان)

سرود رفتہ (شاعری)
شاعر: ایڈوکیٹ مردان علی خاں نشاط ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت: اسی روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: سٹی ہاسپٹل، اکر بیس، جوناشہر، آکولہ ۴۴۴۰۰۲ (مہاراشٹر)

ایک شعر کا عروضی تجزیہ (تنقید)
مرتبہ: مناظر عاشق ہرگانوی ☆ ضخامت: ۸۸ صفحات ☆ قیمت: پچاس روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مکتبہ کوہسار، بربورہ، بھاگل پور (بہار)

کوئی سفر پہ نکلا ہے (شاعری)
شاعر: مشکور علی ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات ☆ قیمت: پچاس روپے ☆ مطبوعہ: اکتوبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ۴/۱۱۰۰ نیو سر سید نگر، علی گڈھ (یوپی)

A SHORT HISTORY OF URDU LITERATURE
مصنف: اطہر رضا ☆ ضخامت: ۲۰۸ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ:
EUROPIAN URDU WRITERS SOCIETY,21-COLWOOD GARDEN COLLIER WOOD LONDON SW19 2DS (U.K.)

خوابوں سے تراشے ہوئے دن (شاعری)
شاعر: عباس رضوی ☆ ضخامت: ۲۲۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: A-360، بلاک ایل، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰ (پاکستان)

جادۂ شب (شاعری)
شاعر: سید امین اشرف ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ، علی گڈھ۔

نیم سوز (شاعری)
شاعر: قمر نقوی ☆ ضخامت: ۱۴۰ صفحات ☆ قیمت درج نہیں ☆ سنہ اشاعت: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: 3027-S. INDIANA
OLIS PI. TULSA OK 74136-1418(U.S.A)

علمی و ادبی رسائل

پیامِ اردو (افسانہ نمبر)
مدیر: سعادت احمد ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت ۲۵ روپے (افسانہ نمبر) ۱۰ روپے فی شمارہ ☆ زر سالانہ ۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۹۹ / ۹۶-۱-۲ سلطان پورہ، حیدر آباد (اے-پی)

حیات (ماہنامہ)
مدیر: شمیم فیضی ☆ ضخامت ۵۶ صفحات (جہازی سائز) ☆ قیمت: ۱۲ روپے فی شمارہ ☆ زر سالانہ ۱۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: AB-4 پرانا قلعہ روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

گلبن (غزل نمبر)
مدیران: ثریا ہاشمی، سید ظفر ہاشمی ☆ مرتبین حیدر قریشی (جرمنی) رشید افروز (احمد آباد) ☆ ضخامت: ۲۵۶ صفحات ☆ قیمت غزل نمبر: ۳۰ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری تا اپریل ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: C-2، رحیل اپارٹمنٹ، بالمقابل گائکوار حویلی، رائے کھڑ، احمد آباد-۱ (گجرات)

بادبان (سہ ماہی اشاعت خاص)
مدیر: ناصر بغدادی ☆ ضخامت: ۵۱۲ صفحات ☆ قیمت ایک سو پچاس روپے ☆ مطبوعہ: ادبی سلسلہ نمبر ۶، جنوری ۹۹ء، مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: بادبان، E-2, 8/14، معمار اسکوائر بلاک نمبر-۱۴، گلشن اقبال، کراچی-۷۵۳۰۰ (پاکستان)

مجلہ (نذر تابش دہلوی)
مرتبین: ہوش امروہوی، نعیم میرٹھی، مرزا ثمر لکھنوی ☆ ضخامت: ۳۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۵ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: کل پاکستان حلقہ ادب، C-21، چوتھی منزل، شیلوروں سینٹر، بلاک-۱۵، گلشن اقبال کراچی (پاک)

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۱واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد — ۷۱
شمارہ — ۷

فون: 3829904

جولائی ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ❀ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ❀ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکر امروز

❀

شعرائے عرب نے بلحاظ اثر شاعری کو پانچ اقسام پر منقسم کیا تھا۔ مرقص، مطرب، مقبول، مسموع اور متروک۔ ان میں سب سے بڑا درجہ شعر مرقص کا تھا جس کے سننے سے انسان وجد در قص کرنے لگے۔ اس کے بعد شعر مطرب تھا جو سامع کے دل و دماغ کو طرب ناک بنا سکے۔ پھر شعر مقبول جس کا اثر ماہرین فن کی داد و تحسین تک محدود ہو۔ اس کے بعد شعر مسموع جو صرف سن لیا جائے اور کوئی اچھا یا برا اثر نہ کرے۔ پانچواں متروک جسے سن کر سماعت میں ناگواری پیدا ہو۔ ہندوستان میں جس قسم کی شاعری مروّج ہے اور صدیوں سے مروّج ہے اسے صرف مقبول یا متروک کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ یعنی عام طور پر ہماری شاعری کا ماحصل اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ سوسائٹی اسے سنے اور 'واہ' یا "آہ" کہہ کر بھول جائے۔

(۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء کے ایک خطبے سے اقتباس)

سیماب اکبرآبادی



ادبی مسجر

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

نثری نظمیں

منتخب شعر غزلیں

اساطیری لمحات

نثر

سطور

اسرار

مدیر
حامد اقبال صدیقی

❖

مکتوبات

اسلم حنیف نامی انصاری حبیب حق
قاضی رئیس منصور اعجاز

۴۲

❖

شمارہ ۔۷ [جولائی ۲۰۰۰ء] جلد۔ ۱۷

'شاعر'، ہم عصر اردو ادب نمبر اور ادبی رسائل

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر کسی نہ کسی طور پر موضوع گفتگو بنا ہوا ہے۔ ہندوستان، پاکستان یا پھر اردو کی نئی بستیاں، سال ۱۹۹۹ء شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کا سال تھا لیکن سال دو ہزار کے ابتدائی چند ماہ بھی ہم عصر اردو ادب نمبر کے ذکر سے خالی نہیں رہے بلکہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کی اہمیت و مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل میں شاعر نے ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ کوئی پہلو ہو، شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر نے تمام سابقہ مثالیں اور تاریخیں پیچھے چھوڑ دی ہیں۔ اردو کی اہم سے اہم کتاب، تاریخی و یادگار کتاب کی جو بھی ادبی تاریخ رہی ہو، ہم عصر اردو ادب نمبر اس سے آگے نکل گیا ہے۔ اب طویل تبصروں اور مضامین کے بعد اس خاص نمبر پر سیمیناروں کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ گذشتہ سال اگست ۱۹۹۹ء میں اردو کے معروف شاعر و ادیب سید اشفاق حسین نے ٹورنٹو میں اپنی ادبی انجمن "اردو انٹر نیشنل" کے تحت رسالہ شاعر اور ہم عصر اردو ادب نمبر پر ایک خصوصی پروگرام کا انعقاد کیا تھا جس میں خاکسار کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مذکورہ نشست ہر اعتبار سے کامیاب رہی تھی۔ ۱۹۹۸ء میں امریکہ اور کینیڈا کے سفر میں ہر جگہ ہم عصر اردو ادب نمبر کو موضوع کیا گیا تھا۔ عالمی مشاعروں میں، ادبی و نجی شعری نشستوں میں، ہر جگہ شاعر اور ہم عصر اردو ادب نمبر پر گفتگو رہی۔ اردو کی نئی بستیوں میں ہم عصر اردو ادب کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ پاکستان کے تمام ادبی حلقوں نے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہاں کا کوئی ادبی رسالہ یا اخبار ایسا نہیں جس میں خاص نمبر کے اشتہارات یا اعلانات نہ شائع ہوئے ہوں۔ پاکستان کے لئے خاص نمبر کی قیمت اور زبردست ڈاک خرچ کے باوجود وہاں کے ادباء شعراء کسی نہ کسی طور ہم عصر اردو ادب نمبر منگوا رہے ہیں زبردست ڈیمانڈ ہے وہاں۔ رسالہ شاعر، پاکستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچ رہا ہے اور وہاں کی نئی ادبی نسل شاعر سے وابستہ ہو رہی ہے۔ وہاں کے ادباء و شعراء، خاص نمبر کے حصول کے خواہش مند ہیں اس کے مطالعے کے لئے بے چین ہیں، بڑے مثبت اور امید افزاء تبصرے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ پذیرائی کا یہ سفر اب بھی جاری ہے۔

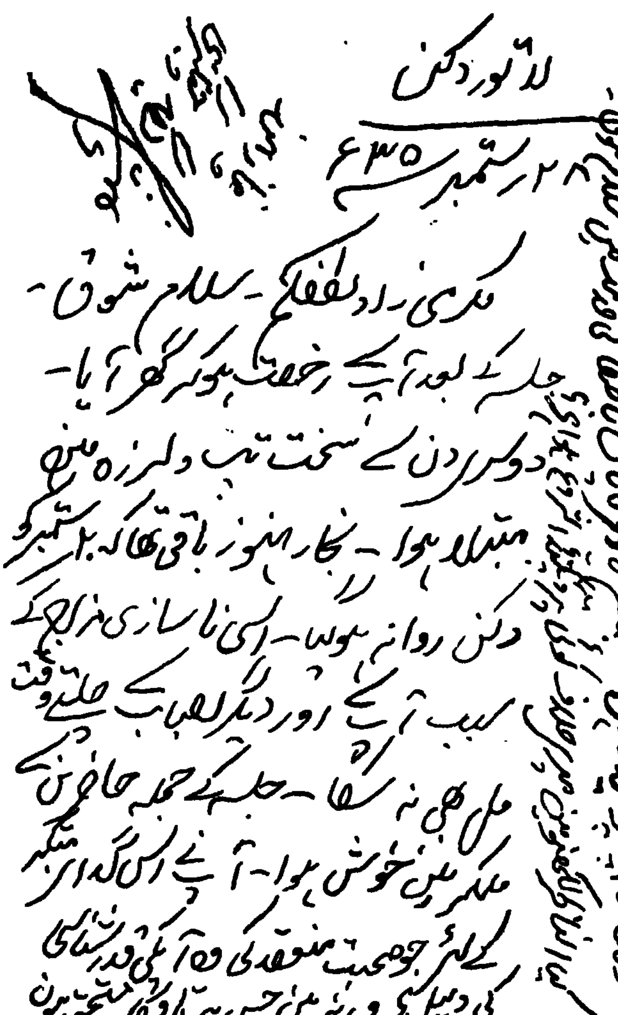
۱۲ر مئی ۲۰۰۰ء کو انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ نے شاعر کے ہم عصر اردو نمبر کو موضوع کرتے ہوئے ایک روزہ مذاکرہ منعقد کیا تھا۔ گلبرگہ شہر تصوف ہی نہیں بلکہ شہر ادب بھی ہے۔ اس شہر میں مشاہیر قلم کاروں کی ایک کہکشاں روشن ہے۔ انجمن کی اپنی کشادہ اور شاندار نو تعمیر عمارت بھی ہے اور اسی کے خوبصورت ہال میں مذاکرہ منعقد کیا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا اولین مذاکرہ تھا جو کسی ادبی رسالے کے خاص نمبر کے بارے میں تھا۔ ایک معیاری ادبی مذاکرہ جس میں باذوق سامعین کی کثیر تعداد اور روایتی اور میکانیکی مذاکروں اور سیمیناروں کے سامعین کی کسی بھی تعداد کے لئے ایک مثال تھی پروفیسر وہاب عندلیب ممتاز دانشور سید مجیب الرحمٰن اور ان کے رفقاء نے دن بھر کے دو اجلاس اس طرح ترتیب دئے تھے کہ سامعین کی دلچسپی آخر وقت تک برقرار رہے۔ حامد اکمل، محمد ہاشم علی، جبار جمیل، حمید سہر وردی، اکرام باگ، خالد سعید، جلیل تنویر، وہاب عندلیب، سید مجیب الرحمٰن صاحبان نے مقالے پڑھے اور کئی قلم کاروں نے تقریریں کیں۔ اس مذاکرے کی دیگر تفصیلات رسائل و جرائد میں آئی ہیں۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کے حوالے سے یہ چند ایک باتیں محض اس لئے تحریر کی جا رہی ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں ادبی رسائل کے کسی بھی بڑے سے بڑے کارنامے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اردو اکاڈمیوں کے اپنے رسالے ہیں اور نئے رسائل کی ایک باڑھ سی آئی ہوئی ہے۔ تماہی رسالے آئے دن شائع ہو رہے ہیں اور ماہنامہ ادبی رسائل کے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ادبی رسائل کی خدمات کے لئے نہ تو کوئی ایوارڈ ہے اور نہ ہی کوئی معقول مالی تعاون جب ۷۱ سال کا رسالہ شاعر اپنے بنیادی مسائل سے باہر نہیں آ سکا ہے تو دیگر ادبی رسائل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ ماضی کے ادبی رسائل کی اہمیت آج کے اردو اکاڈمیوں اور اردو کے سرکاری اداروں سے کہیں زیادہ تھی۔ ہر ادبی رسالہ ایک انجمن اور اس کا مدیر اپنے آپ میں کسی اکاڈمی سے کم نہیں ہوتا تھا مگر آج؟؟ سچ پوچھئے تو معیاری ادبی رسالے کا تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک علاحدہ موضوع ہے جس پر شاعر کے "جرعات" میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

ہم عصر اردو ادب نمبر ایک ماڈل ہے، ایک مثال ہے، ایک تاریخ ہے۔ اس پر مذاکروں اور سیمیناروں کے انعقاد کی خبریں آ رہی ہیں، یہ ہوگا اور ہوتا رہے گا۔ جلد دوّم بھی آئے گی لیکن سوال جو قائم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر یا ایسے رسائل اور ان کے کارنامے کیا بڑے سے بڑے انعام اور ایوارڈ کے مستحق نہیں؟ اردو زبان و ادب کے جو اس وقت "بھائی لوگ" ہیں وہ ادبی رسائل اور ان کی غیر معمولی خدمات کو موضوع کیوں نہیں بناتے، بغیر کہے ان کے لئے وسائل کیوں نہیں جٹاتے؟ ہم اپنے کسی بھی "فخر" کو محسوس کیوں نہیں کرتے؟ اس کو سیاسی و سماجی سطح پر اجالتے کیوں نہیں؟ ہم ۷۱ سالہ شاعر کی ایک صدی کیسے مکمل کریں گے۔ اس کی ایک صدی کا جشن کیسے منائیں گے۔

افتخار امام صدیقی

جولائی ۲۰۰۰ء



لاتور دکن

۲۸ ستمبر ۳۵ء

مکرمی زاد لطفکم۔ سلام شوق۔

جلسے کے بعد آپ سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ دوسرے دن سے سخت تپ و لرزہ میں مبتلا ہوا۔ بخار ہنوز باقی تھا کہ ۲۰ ستمبر کو دکن روانہ ہو گیا۔ اسی ناسازی مزاج کے سبب آپ سے اور دیگر احباب سے چلتے وقت مل بھی نہ سکا۔ جلسے کے جملہ حاضرین کا شکر گزار ہوں خوش ہوا۔ آپ نے اس گدائے بے نکبہ کے لئے جو صحبت منعقد کی وہ آپ کی قدر شناسی کی دلیل ہے ورنہ میں جس [illegible] کا مستحق ہوں

یگانہ بنام مسعود حسن رضوی ادیب

مرزا واجد حسین [یاس عظیم آبادی-یگانہ چنگیزی لکھنوی-پ: ۱۸۸۴ء-م: ۱۹۵۶ء] کا یہ خط جو مسعود حسن رضوی ادیب، [پ: ۱۸۹۳-م: ۱۹۷۵] کے نام ہے اس کا متن پروفیسر نیر مسعود کے مضمون "یگانہ بہ حوالہ ادیب" میں شامل ہے۔ اصل خط کا عکس پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔ [ادارہ] بشکریہ پروفیسر نیر مسعود (لکھنؤ)

مٹھی بھر غزلیں

ظہیر غازی پوری

پھول کی پہرے دار ہوا
ہر لمحہ ہشیار ہوا
جنگل ، دریا ، ریگستاں
سب کی ہے غم خوار ہوا
بحرِ حیاتِ انساں میں
کشتی کی پتوار ہوا
جھولا جھولائے درختوں کو
تازہ خوش رفتار ہوا
جسم و جاں کو کمہلائے
آئے جب آتش بار ہوا
صحرا صحرا سوز تپش
سبزہ سبزہ پیار ہوا
جتنی مہذب عہد میں ہے
کب تھی اتنی خوار ہوا
ہم نے اپنا خون دیا
جب تھی صلیب و دار ہوا
اس سے قائم جان وجہاں
لا ثانی شہکار ہوا
میری نظر میں ظہیر رہی
عقدہ کشا اسرار ہوا

پھولوں کے لب چوم ہوا
گلشن گلشن گھوم ہوا
پت جھڑ میں بھی ہوتی نہیں
کوئی دم مغموم ہوا
دنیا میں اک شئے سے بھی
رہ نہ سکی محروم ہوا
کاغذ پہ ہو مثل شعر
کاش کبھی مرقوم ہوا
جھولے پڑیں جب ساون میں
خوب مچائے دھوم ہوا
ساتھ ہمیشہ رہ کر بھی
کیوں ہے نا معلوم ہوا
اس کے شاہد ہیں اوزون
ہم سے ہوئی مسموم ہوا
خود کو لٹا کر بھی ہے خوش
اتنی ہے معصوم ہوا
ہم انسانوں کی خاطر
جنگل جنگل گھوم ہوا
تیرا قصیدہ لکھ ڈالا
آج خوشی سے جھوم ہوا

● HASHMIA COLONY, PUGMIL, HAZARIBAGH-825301
(BIHAR)

پھول ، شفق ، تحریر ہوا
لمحوں کی تقدیر ہوا
عرش پہ کوئی نقش نہیں
پانی پر تحریر ہوا
عہدِ جنوں کی ہیں پہچان
دروازے ، زنجیر ہوا
برگ شجر سر سبز لباس
کاغذ خامہ سریر ہوا
کھو بیٹھے اپنے جوہر
جب ہوجائے اسیر ہوا
ہست وبود کی ہے شارح
ہوش ربا دل گیر ہوا
گرم رتوں میں شعلہ ریز
برف فضا میں تیر ہوا
حسن و کشش کا آئینہ اور
دنیا کی توقیر ہوا
جان جب اس پر کردی فدا
قبضے میں آئی ظہیر ہوا

رنگ روش انداز ہوا
ہر سو خوش پرواز ہوا
جنگل ، گلشن ، بستی کا
جانے اک اک راز ہوا
دنیا بھر میں پہنچائے
خبریں پیکر ساز ہوا
جانتی ہے گل بوٹوں کے
سارے نیاز و ناز ہوا
شاخِ شجر کا سازِ طرب
خوشبو کی آواز ہوا
اہلِ جہاں کو ہر لمحہ
بخشے نئے اعزاز ہوا
سورج سر افراز ہے تو
خانہ بر انداز ہوا
عالم عالم دیکھ چکی
سارے نشیب وفراز ہوا
دل چاہے تو کہہ دو ظہیر
تاج کی ہے ممتاز ہوا

ہوگی نا مقبول ہوا
جب لائے گی دھول ہوا
خیریتِ جاں رہتی ہے
کرتی نہیں ہے بھول ہو
جینا مشکل اس کے بغیر
جان افزا محلول ہو
پتھر پر لکھتی تحریر
دنیا کا معمول ہو
دن میں شعلہ ریز لگے
صبح سویرے پھول ہو
بے پروا ۔ ہرجائی ہو
من موہے معقول ہو
خون اڑائے جان جلا
جب بن جائے ببول ہ
پانی ، مٹی سے مت
آگ کی بھی مدلول ہ
رکتی نہیں ہے اک لمحہ ظہ
اتنی ہے مشغول ہ

صبح صفت شاداب :
ہستی کا اک باب
روز ازل سے رہتی
شام سحر بے خواب
چاند و ستاروں کے گھر
اب تک ہے نایاب
ربط و رفاقت کی ہیں
سورج دھوپ سراب
لاکھوں طوفاں ہار
ہو نہ سکی غرقاب
پڑھئے تو حیران کر
کچھ ایسا ہے نصاب
گہرے سمندر میں ہر
شور ، گرج ، گرداب
نازک پودوں پر لہرا
بن کر لمس حباب
وقت پڑے گا جب بھی
ہوں گے سب احباب

خیال لفظ ، غزل ترجمہ ، ادب پیما اور ....

ادیب سحر

خیال اور لفظ کی بحث کا آغاز تو زمین پر پہلے آدمی کی آمد ہی سے ہوا تھا۔ آدمی نے سوچا اور اس کا اظہار کرنا چاہا جس کے لئے اسے لفظ کی ضرورت تھی اور پھر اس نے آوازوں کے ہجوم سے لفظ تراشنے شروع کئے اور خیال و لفظ کے اشتراک سے اس نے دوسرے آدمی کو اپنا ہمنوا بنایا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دنیا کا ارتقاء خیال لفظ ہی سے عبارت ہے۔ خیال کے بغیر لفظ اور لفظ کے بغیر خیال۔ یہ ایک اٹوٹ رشتہ ہے، عورت اور مرد کی طرح، دن اور رات کی طرح، دھوپ چھاؤں کی طرح، سردی گرمی کی طرح۔ فنون لطیفہ میں شاعری کے لئے خیال اور لفظ دونوں اہم ہیں، صرف خیال یا صرف لفظ سے شاعری نہیں کی جا سکتی۔ دونوں کے امتزاج سے جو تخلیقی نور روشن ہوتا ہے، وہی شاعری ہے۔ اور یہ تخلیقی نور کسی کسی کے ہاں ابھرتا ہے ورنہ تو کہیں صرف لفظ تو کہیں صرف خیال۔ کہیں یوں بھی ہوا ہے کہ خیال لفظ کی موجودگی کے باوجود ایک آنچ کی کسر رہی جاتی ہے۔ اور 'بڑی' اور 'اپنی' شاعری کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ عموماً یہ ہو رہا ہے کہ یا تو خیال میں لفظ ٹھونسے جا رہے ہیں یا پھر لفظوں میں خیال کو سمونے کی سعی کی جا رہی ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہنر ہے جو ہر شاعر کو نصیب نہیں۔ مرزا حامد بیگ نے شاعر کے ادبی فیچر کے لئے شاعرانہ خیال کی منطق کے تحت 'خیال لفظ' کو مختلف شعراء کے اقوال سے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ بحث دلچسپ ہے۔

محترم یعقوب مرزا نے غزلیہ شاعری کے انگریزی تراجم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ میر، غالب، اقبال اور فیض کی منتخب غزلوں کا کامیاب ترجمہ کر چکے ہیں اور کتابیں شائع ہو گئی ہیں۔ تراجم کا سفر جاری ہے۔ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ غزل کا ترجمہ کس طرح کرتے ہیں کیوں کہ غزل کے شعر کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ دراصل غزل کے لئے ایسے کام کئے ہی نہیں گئے کہ دیگر زبانوں کے ادباء و شعراء اور ترجمہ نگار حضرات کو کوئی مدد ملتی۔ مثلاً یہ کہ ایسی کتابیں تو ہیں جن میں اردو شاعری کی اصطلاحات کے معنی بتائے گئے ہیں۔ مگر انگریزی وغیرہ میں ایسی کوئی لغت نہیں یا ایسی شعری لغت نہیں جو غزل کے حوالے سے تمام ممکنہ معلومات فراہم کر سکے۔ جیسے ہم وزن اور ہم صوت الفاظ۔ شعری تراکیب کے مترادفات یا قریب ترین الفاظ و تراکیب۔ یہ ممکن ہے، مگر ایسا ہوا نہیں جب انگریزی زبان میں غزل کے تمام لوازمات کے ساتھ شعر کہنا ممکن ہے تو پھر ایسی کسی لغت کی ترتیب و تدوین کیوں کر ممکن نہیں۔ یعقوب مرزا صاحب نے اپنے طور پر اپنے طریقۂ کار اور پریشانیوں کا مختصر احوال تحریر کیا ہے۔ ابھی ان سے اور بھی مکالمہ ہوگا۔

کاوش بدری صاحب کا طویل ترین خط جس بحث کو قائم کر رہا ہے اس کا تعلق سہ ماہی ذہن جدید کے تازہ شمارے میں شامل 'ادب پیما' سے ہے اس خط کو وہیں شائع ہونا چاہئے تھا، تاکہ رسالہ مذکور کے قارئین اور ادب پیما کے شرکاء براہ راست مکتوب نگار کی رائے سے واقف ہو سکتے لیکن چونکہ شاعر کی گلوبل ریڈر شپ ہے اور ہند و پاک میں بیسویں صدی کو طرح طرح سے آنکا جا رہا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ شاعر کے بے شمار قارئین یہ جان لیں کہ ایک صدی کے شعر و ادب کو اور اس کے قلم کاروں کو کس کس طرح دیکھا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بھی یہ کام ہو رہا ہے مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'اخبار اردو' میں "بیسویں صدی میں اردو ادب کے معمار" کے تحت تصاویر کا سلسلہ شروع ہے۔ اب تک تین شمارے آ چکے ہیں۔ کچھ اور اشخاص و ادارے بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ رسالہ شاعر نے صدی شخصیت نمبر کا اعلان کیا ہے اور بہت پہلے سے اعلان کیا۔ ہمارا طریقۂ کار بہت مختلف اور پھیلاؤ لئے ہوئے ہے۔ اس میں چند اشخاص یہ فیصلہ نہیں کریں گے کہ کن قلم کاروں نے پوری ایک صدی اور اس صدی کی کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ الگ الگ اصناف اور ادوار کے ساتھ اس انتخاب میں پوری اردو دنیا اپنی رائے دے گی۔ ذہن جدید کا ادب پیما ایک رسالے کا اپنا انتخاب ہے جس پر بحث کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ کاوش بدری صاحب نے اپنے طور پر بحث کو روشن کیا ہے ہماری بحث قطعی معروضی ہوگی۔ کاوش صاحب سے بھی اختلاف ممکن ہے۔ وہ ان دنوں مختلف ادبی رسائل میں بڑے مزے کے علمی و ادبی خطوط لکھ رہے ہیں ان کے خطوں سے متعلق افسانہ نگار ابن اسماعیل (کشمیر) کا ایک دلچسپ خط بھی ملاحظہ کیجئے۔

(افتخار امام صدیقی)

شاعرانہ خیال کی منطق

مرزا حامد بیگ



فرانسیسی شاعر ملارمے کے خیال میں شاعری خیالات سے نہیں الفاظ سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ بات بہت واضح ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعری میں الفاظ اور محض الفاظ ہی اہم کام سرانجام دیتے ہیں، جب کہ سراسر ایسا کچھ نہیں۔ خود ملارمے کی شاعری پر نظر کریں تو اندازہ ہوگا کہ وہ صرف الفاظ کا ہی کیا دھرا نہیں۔ البتہ الفاظ، علامات اور استعاروں کی صورت میں نئے خیالات کی تخلیق کا باعث ضرور بنتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں لفظ کے حق میں یہ جانبدارانہ فیصلہ ملارمے نے اس لئے بھی دیا کہ وہ بنیادی طور پر علامتی شاعر تھا۔ اس نے صرف علامتوں کا ایک نظام مرتب کیا بلکہ اس نے شاعری کی روایتی ہیئت اور موضوعات کو بڑے شد و مد کے ساتھ رد کرتے ہوئے نئے شعری تصورات پیش کئے وہ اپنے اس بیان کی روشنی میں اس لئے بھی حق بجانب دکھائی دیتا ہے کہ اس کے لکھے ہر ایک لفظ میں یکسر

منفرد خیال اپنی جھلک دکھاتا رہا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ نزول تخلیقی عمل میں الفاظ محض الفاظ نہیں رہتے بلکہ اشارے، علامات اور استعاروں کی صورت نت نئے جہان معانی کے در وا کرتے ہیں، یہاں سے علم بیان کی بحث چھڑے گی بقول شمس الدین فقیر: "علم بیان کا مرجع دراصل یہ ہے کہ معانی کے لئے معتبر تلازمے اور لوازم قائم کئے جائیں لوازم (یعنی ضروری تعلق ہونا) دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو دو طرفہ ہوں۔ مثلاً "امام" اور "مقتدی"۔ ظاہر ہے کہ امام نہیں تو مقتدی بھی نہیں اور اگر مقتدی نہیں تو امام بھی نہیں، یا مثلاً "سانس" اور "جان"۔ کیوں کہ اگر سانس نہیں تو جان بھی نہیں اور اگر جان نہیں تو سانس بھی نہیں یا مثلاً "رات" اور "غروب آفتاب"۔ دوسرے لوازم یک طرفہ ہوتے ہیں، یعنی وہ جن میں ایک تو دوسرے کو لازم ہو۔ لیکن دوسرا پہلے کو لازم نہ ہو۔ مثلاً "علم" اور "زندگی"۔ کیوں کہ علم کے لئے زندگی لازم ہے، لیکن زندگی کے لئے علم لازم نہیں۔ یا مثلاً "شیر" اور "گوشت خوری"۔۔۔ اب اگر کسی لفظ کے لغوی معنی نہ مراد لئے جائیں بلکہ اس کے لازم معنی مراد لئے جائیں تو اس کو "مجاز" کہیں گے یا "کنایہ"۔ اگر یہ صاف ظاہر ہو جائے کہ لغوی معنی نہیں بلکہ معنی مراد ہیں تو وہ "مجاز" کہلائے گا۔ اور اگر یہ صاف ظاہر نہ ہو کہ لازم معنی مراد ہیں لیکن لغوی معنی بھی مراد لئے جاسکیں اور لازم معنی بھی، تو اس کو "کنایہ" کہیں گے۔ لہٰذا "مجاز" کی حیثیت جزو کی ہے، اور "کنایہ" کی حیثیت کل کی۔

یہ عبارت "حدائق البلاغت" (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء صفحہ-۷) کی فارسی عبارت کی توضیحی ترجمانی ہے۔ اس میں بعض امثال کا اضافہ شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا ہے۔ دیکھئے "شب خون" الہ آباد- نمبر-۱۲۹۔

اردو کی کلاسیکی شاعری میں پروانہ، آشیانہ، صیاد، شمع، زنجیر اور صحرا وغیرہ الفاظ۔ معانی کے سرسبز منطقوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ‌ ‌ ‌ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دیکھئے غالب نے مسلمانوں کی زوال آمادہ تہذیب کو کس آسانی سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز بنادیا۔ اس سے ایک چیز اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ برتا جانے والا لفظ محض اس خیال کا ہی حامل نہیں ہوتا جو تخلیقی عمل کے ابتدائی مرحلے پر شاعر کے ذہن میں ہو بلکہ شاعر کے پورے تجربے اور وسیع خیالات کے ذخائر کو سمیٹنے کا کام بھی کرتا ہے۔ شعری تجربے میں شاعر اس کے پورے تجربے یا وسیع تر خیالات کے ذخائر تک رسائی کو "الہام" اور "جادوگری" بھی کہا جاتا رہا ہے اور "پگلے کی پیغمبری" بھی۔ افلاطون کہتا ہے: "خدا شاعروں کے دماغ کو معطل کر دیتا ہے اور انہیں اپنے پیغمبروں کے طور پر استعمال کرتا ہے"۔ ولیم شیکسپئر کے نزدیک شاعر، عاشق اور دیوانے میں کوئی فرق نہیں تھا شلز بھی شعری تجربے کو عارضی دیوانگی کہتا تھا۔ دوسری طرف شاعر کو الہام ماننے والوں میں ملٹن، مرزا غالب، ولیم بلیک اور ولیم بٹلر ییٹس جیسے شعرا کے نام آتے ہیں۔ ملٹن نے اسے روح القدس کا فیض کہا، غالب کے خیال میں۔ ‌ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ‌ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ولیم بلیک نے کہا تھا: "میں اس لئے آیا ہوں کہ۔۔۔۔ انگلستان کے اوپر سے بیکن، لاک اور نیوٹن کو اتار پھینکوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ اس کے غلیظ کپڑوں کو الگ کر کے اسے تخیل کا لباس پہنادوں۔" بلیک نے اپنی محبوبہ کو اپنی ہی ایک نظم کے بارے میں خط لکھتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

"میں خود اپنے منہ سے اس کی تعریف کروں تو کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ میں تو محض اس کا محرر تھا۔ اس کے (اصل) خالق عالم بالا کے رہنے والے ہیں۔"

ییٹس نے بھی کم و بیش اسی نوع کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مورس بورا نے اس نوع کے شاعرانہ الہام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شعر گوئی کے عمل میں جو انجذابی اور الہامی کیفیت ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ شاعر نہ صرف اپنے مشاہدے کی حدبندی کے باہر ہر شئے سے بے نیاز ہو جاتا ہے، بلکہ وہ وقت کا احساس بھی کھو بیٹھتا ہے۔۔۔۔ اس تجربے کو رومان پسندوں نے سب سے بہتر طور پر اپنا موضوع بنایا ہے اور وہ اس کے لئے "ابدیت" کی اصطلاح برتتے ہیں، جس سے اس کی مطلق اور کامل ترین حیثیت مترشح ہوتی ہے۔"

والٹ وٹ مین کے خیال میں تخلیق شعر کے وقت شاعر کو انسانی سطح پر ازل و ابد کے ڈانڈے ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور الگزینڈر بلاک کے نزدیک ایک معجزانہ قلب ماہیت کی بدولت وقت کی رفتار تھم جاتی ہے، حاضر غائب ہو جاتا ہے اور مستقبل ماضی کا آئینہ۔ شاعری اور جادوگری کا تعلق جانچنے کے لئے روبن سکیلٹن کی کتاب "THE POETIC PATTERN" میں شاعری اور جادو سے متعلق باب حیران کن صورت حالات سامنے لاتا ہے۔ واضح رہے کہ لیوس جیسا اہم ناقد بھی شاعری کو "جادو کی بیٹی" ہی گردانتا ہے۔ یوں شاعری کے بنیادی عناصر میں شاعرانہ خیال کی حیثیت مرکزی ہی ٹھہرتی ہے۔ خواہ ملارمے کی طرح اس تک الفاظ کے ذریعے ہی رسائی کیوں نہ حاصل کی جائے یہاں خیال سے مراد وہ سوچ کی نہج ہے جسے شاعر نے اپنے تخلیقی تجربے کے دوران کوئی مخصوص شکل عطا کی ہو۔ لیکن اس کے باوجود شاعرانہ خیال کی حد'' کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اس کے محدود دائرۂ کار میں رہ کر یا تو زیادہ سے زیادہ عبدالحمید عدم کی شاعری جنم لے گی اور یا دوسرے درجے کے ترقی پسند شعرا کی کھلی نعرہ بازی۔ یوں اس لئے ہوا کہ بیک وقت اپنے عہد کے زندہ مسائل، فلسفہ اور مابعد الطبعیات سے بچی قربت نصیب نہ ہوئی۔ دوسری طرف کسی نظم یا شعر میں فلسفیانہ افکار کی بھرمار بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ شاعر بڑی شاعرانہ صلاحیت یا شدت فکر کا مالک ہے۔ فی زمانہ ان گنت دقیق خیالات و افکار اس قدر عام ہوئے کہ ہر ایک نے ان کی شد بد پالی۔ اب ان افکار کا کسی بھی صنف ادب میں لشتم پشتم داخلہ ناممکن نہیں رہا۔ لیکن کیا یہ سب کچھ اعلیٰ درجے کا ادب قرار پایا؟ یقیناً نہیں۔ اس کے برعکس عام سے افکار فنکارانہ شدت فکر کے زیر اثر اور دیگر شعری عناصر کا فنکارانہ لحاظ رکھنے کے سبب بہت ممکن ہے کہ فن پارے کو پُر تاثیر بنالیا جائے۔ سو پتا چلا کہ خیال بجائے خود شاعرانہ نہیں ہوتا بلکہ شاعر کا خصوصی ادراک، اس کے جذبے کی شدت اور فنکار کی قوت متخیلہ خیال میں شعریت پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کے خارجی ماحول میں جو صورت حالات اور اس کے باطن میں تموج محسوس ہوتا ہے وہ ایک انوکھے تال میل کے ساتھ شاعرانہ خیال کا باعث بنتا ہے۔ بقول اے۔ سی۔ بریڈلے، "شاعری اور زندگی کے درمیان ایک گہرا

تعلق ہے، لیکن اس تعلق کی طنابیں گویا زیر زمین ہیں۔ "یہ زیر زمین طنابیں شعری تجربے میں شاعرانہ خیال کی سطح پر ایک سمفنی(SYMPHONY) خلق کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یوں شاعر زندگی کے اجزاء اور ان کے تابع جذبات کو زبان بخشتا ہے۔ اس انوکھی سمفنی(SYMPHONY) کے خالق کا مقصد اس دھرتی کے باشندوں (جانداروں) کی آواز پیدا کئے بغیر اپنے سامع یا قاری کو ایک انوکھی محسوساتی فضا سے آشنا کرانا ہوتا ہے۔ شاعر کے لئے اس کے ارد گرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا اس قطعیت اور تیقن کے ساتھ احاطہ کرنا ممکن نہیں جو ایک عالم یا سائنسدان کا حصہ ہے۔ اس لئے بھی کہ شعری عمل فوٹوگرافی کی نسبت تخلیقی مصوری سے زیادہ قریب ہے۔

شاعرانہ خیال کی تشکیل میں چونکہ جذبہ اور متخیلہ (جادوگری یا پگلے کی پیغمبری) دونوں بیک وقت شریک ہوتے ہیں، اس لئے خارج کے حقائق پر ماورا کی چھوٹ کچھ اس انداز سے پڑتی ہے کہ حقیقت، حقیقت رہتے ہوئے بھی سنگین نہیں رہتی۔ کیر کے گور نے حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ زندگی پر بات کرتے ہوئے شعری تجربے کو بھی اپنا موضوع بنایا تھا۔ اس کے خیال میں:

"جہاں منطق کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں وہاں سے شاعرانہ خیال کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔"

دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ طے شدہ حقائق / مسلمات سے انحراف اور ایک نئی کمپوزیشن کا دوسرا نام شاعرانہ خیال ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب   ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا   [غالب]

● 197-MEHRAN BLOCK, ALLAMA IQBAL TOWN, LAHORE (PAKISTAN)

غزل ، ترجمہ اور میں

معصوم مسرا

آپ کا یہ سوال دلچسپ ہے کہ میں ترجمے کیسے کرتا ہوں لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں پھر بھی میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ایک زبان کی ادبی تحریر دوسری زبان میں ڈھالنے کا کام بہت مشکل ہی سہی تاہم بالکل ناممکن بھی نہیں۔ غزل کا ترجمہ کرنا تو بے حد جان جوکھم کا کام ہے۔ غزل کی منفرد نازک خیالی، شستہ زبان، کان اور دل کی مشترکہ کیفیت اور پھر غزل اپنا راز "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" منکشف کئے بغیر چپکے سے قاری / سامع کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اپنا جادو جگا دیتی ہے۔ دراصل غزل اردو ادب کا وہ بے مثال سرمایہ ہے اور یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس کی دنیائے ادب میں دوسری کوئی مثال نہیں۔ ترجمہ کرتے وقت میری پوری کوشش اور خواہش یہی رہتی ہے کہ شاعر کا مزاج، اس کی فکر، اور انداز بیان کو اسی کسک اور تخلیقی لمس کے ساتھ اپنے تراجم میں خلق کروں اس پورے عمل کے دوران میں خود بھی کئی بار اپنے تصور میں بہک جاتا ہوں۔ لیکن پھر بہت جلد حیران پریشان مجھے شاعر کی غلامی کا لطف واپس بلا لیتا ہے۔ میرے اب تک کے تمام تراجم کے پیش نظر میرا یہ دعویٰ کرنا درست نہیں ہوگا کہ میں نے اپنے کام میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ سوائے معذرت کے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں مجبور ہوں، پھر یہ کہ شعرائے کرام کا دعویٰ ہے کہ غزل کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ہو نہیں سکتا۔ لیکن میں اس خیال سے خوف زدہ نہیں۔

آپ کے سوال سے ایک سوال اور بھی قائم ہوتا ہے کہ منتخب شعرا کی منتخب غزلوں کا ترجمہ کرتے وقت مجھ پر کیا گذری یا کیا گذرتی ہے؟۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بنیادی امر ہے کہ مترجم کا ہر دو زبانوں پر یکساں عبور ضروری ہے۔ پھر یہ کہ وہ تخلیقی زبان سے حظ اٹھانا جانتا ہو اس کا وجدان اتنا صاف و شفاف ہو کہ شعرا اپنے پورے تخلیقی جوہر کے ساتھ اس پر آئینہ ہو جائے۔ میرے لئے انگریزی زبان کا مسئلہ پیدا ہوا تھا، انگریزی جاننا ایک الگ چیز ہے اور اس زبان کی پوری تہذیب سے آشنا ہونا ایک الگ بات ہے اور میں نے پھر اس زبان کا باقاعدہ درس لیا۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ، انگریزی شاعری کا مطالعہ، اس کا تخلیقی حسن، شعری تراکیب، شاعری کی افہام و تفہیم اور وہ بھی کسی دوسری زبان کی شاعری یہ بذات خود ایک مشکل ترین کام ہے، اور یہ کام میں اب بھی کر رہا ہوں۔ میں ذکر رہا تھا کہ ترجمہ نگاری کے دوران مجھ پر کیا گذری یا گذرتی ہے۔ دراصل حالات و واقعات ہر ایک انسان کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر جو شاعر ہے اور واقعی شاعر ہے تو وہ عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے، بے حد حساس اور زود رنج۔ اس کے دل و دماغ پر حادثات و واقعات زمانہ اپنی پوری شدتوں کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ میں پہلے شاعر کے مزاج و موڈ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں شاعر کو اس کی شعری سوانح میں دیکھنے کی سعی کرتا ہوں بلکہ میں خود بھی اس عہد میں چلا جاتا ہوں جس میں شاعر اپنے سیاسی، سماجی، اور اقتصادی ماحول میں پروان چڑھا تھا۔ وہ حالات کیا تھے جنھوں نے اسے شاعر بنایا تھا اس طرح شاعر میرے روبرو آ بیٹھتا ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا بلا تکلف اظہار کرتا ہے۔ اپنے شعر کی توجیہہ و تشریح کرتا ہے ادھر میں اپنے تند خو مزاج سے مجبور شاعر سے خوب خوب الجھتا ہوں، سوال در سوال اسے پریشان کرتا ہوں۔ اور خود بھی پریشان رہتا ہوں۔ شاعر بلند پرواز کے ذہن رسا تک پہنچنے کی خواہش میں میری راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ سوتے جاگتے کسی بھی پل مجھے سکون نہیں ملتا۔ شاعر سے اختلاف رائے پر جب ہمارا اتفاق ہو جاتا ہے اور غصے کا بخار اتر جاتا ہے تو خوشی کے عالم میں مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت اصل شعر کے بطن سے ہم شکل شعر نکال لے آتی ہے۔ تہہ داری اردو شاعری کا ایک اہم وصف ہے لیکن انگریزی ادب میں اسے وہ مقام حاصل نہیں۔ فیض کا ایک شعر ہے۔

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب   آج تم بے حساب یاد آئے

اس شعر کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فیض کو غم جہاں کا حساب کرتے ہوئے اپنی محبوبہ بہت یاد آئی کہ غموں میں ان کی محبوبہ روح کو تسکین و آرام دیا کرتی تھی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بے حساب غم جہاں کا اپنی محبوبہ ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ میر تقی میر کا ایک شعر ہے۔

ناگاہ جو وہ صنم ستم ایجاد آگیا　　دیکھے سے طور اس کے خدا یاد آگیا

اس شعر کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اچانک میر کا محبوب اس کے سامنے چھم سے آکود اور میر کو یہ محسوس ہوا گویا آسمان سے کوئی بجلی کوندی ہو، گویا خدا بھی ستم ایجاد ہی ٹھہرا میر کے خیال میں۔ میر کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی رہا ہو گا کہ اس کا محبوب اس قدر خوبصورت ہے کہ جسے دیکھ کر خدا یاد آگیا جس نے اسے اتنا حسین پیدا کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں شعر کا ترجمہ میری ذاتی پسند پر موقوف ہو جاتا ہے۔

جب شعر کا مزا اور اس کا پس منظر مجھے صاف نظر آجاتا ہے تو میں اسے انگریزی نثر میں اتار لیتا ہوں۔ شعر کی فصاحت و سلاست حتیٰ الامکان ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے متبادل انگریزی الفاظ کی حسب ضرورت فہرست تیار کر لیتا ہوں۔ مجھے بعض اوقات اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ انگریزی لغت نے مجھے کئی بار گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی الجھن میں مجھے چپ سی لگ جاتی ہے۔ میں اپنے دل کے کونے کونے کو چھان مارتا ہوں جیسے کوئی آبلہ پا دشت جنوں سے گذرے لیکن آخر کار مجنوں کو لیلیٰ پکار ہی لیتی ہے۔ مجھے انگریزی لغت میں ہم وزن ردیف و قافیہ کی تلاش میں موزوں الفاظ کی قلت محسوس ہوتی ہے۔ قافیے کو قربان کر کے میں یہ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اہل زبان اس احساس کو مادری زبان میں کس طرح ادا کرتے ہیں۔ مثلاً۔ ہے پیارے ہنوز دلّی دور ITS A LONG WAY TO TIPPERAERY MY DEAR یا یہ کہ۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے EVERY TOM, DICK AND HERRY, EVEN MIR

ترجمہ کیا ہے؟ اصل سے نقل پر اصل کا شائبہ، شعر کو دوبارہ اپنی زبان و اسلوب میں تخلیق کرنے کا فن۔ ایک روح کو دوسرے جسم میں منتقل کرنے کا عمل۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے تراجم کو اہل زبان اور صاحب فن حضرات نے نہ صرف سراہا اور پسند کیا ہے بلکہ ہر اعتبار سے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

●19 - HORINGTON DRIVE LENTON SENDS NOTINGHAM NG7 IJQ (U.S.A)

ادب پیما اور دیگر ادبی مسائل

کاوش سدری

دہلی میں ادب پیما کا دھماکہ
سو برسوں میں لکھے گئے اردو ادب کا کلیکشن
شاگردوں کا سلیکشن
استادوں کا ریجکشن



شاعر انقلاب حضرت سیماب اکبر آبادی نے ۱۹۴۷ء ہی میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ

ہوش اور خرد کی دعوت ہے دل اور دماغ عالم کو　　ہذیان میں ہوگی تبدیلی، بحران بدلنے والا ہے

آپ نے پاکستان میں اردو ادب پر ایک سرسری اشاریہ ہی میں وہ روشنی بھر دی ہے کہ طول و طویل تحریر و تقریر سے بھی کوئی بات نہیں بن سکتی۔ خاص باتیں نظروں سے سنائی جاتی ہیں، اشاروں ہی سے بڑے بڑے کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں سچ پوچھئے تو فیضانِ نظر کرامت سے کم نہیں ہوتا۔ دبستان سیماب سے فیض یاب ہونے والے ان گنت دانشور او باء و شعراء نے ہمیشہ محبت کے قرینوں میں ادب کو مقدم رکھا۔ فنی احترام، کلاسیکی اقدار کا تحفظ غزلوں اور نظموں میں جو نمایاں طور پر ہوا وہ سب کچھ دبستان سیماب کا صدقہ ہے۔ آزادی کے بعد بڑی شاعری اقبال، سیماب اور علامہ جمیل مظہری نے کی اور وہ بھی غزل کی زبان میں کی۔ اختر الایمان نے نظم کو غزل کی مٹھاس سے جدا کر کے اسے ایک تلخ نیا لہجہ دیا مگر ان کا بھی ایمان اسی پر موقوف تھا کہ شاعری جدید و دید نہیں ہوتی۔ اچھی یا بری ہوتی ہے اچھی اور سچی شاعری مذہب، تہذیب و تمدن کے بغیر ادھوری ہے۔ بقول آپ کے۔ جس کی جیسی آنکھیں ہیں دنیا بالکل ویسی ہے۔ علوم و فنون، تہذیب و تمدن اخلاق اور فکری توانائیوں اور ادب العالیہ کے تعمیر و تشکیل اور ارتقاء میں ہندوستان کی جملہ ریاستوں کا برابر کا حصہ ہے یہ صرف دلّی یا لکھنؤ والوں کی جاگیر اور وراثت نہیں ہے۔ حضرت ناطق گلاوٹھوی حضرت داغ کے شاگرد تھے مگر انہوں نے بجا طور پر لکھا کہ ـــــ "میں حضرت داغ سے کہیں زیادہ تلمیذ دیوانِ داغ ہوں" اسی مصداق آزادی کے بعد جتنے بھی نامور، معتبر مستند دانشور شعرا و ادباء کہلائے وہ سب کے سب میر و غالب، ذوق و مومن، داغ اقبال، سیماب، یگانہ، فانی، حسرت، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، نظیر، شاد عظیم آبادی کی کلیات ہی کے شاگرد ہیں۔ جمیل مظہری، جوش، فراق، مخدوم، فیض، مجاز، ن م راشد، میراجی، اختر الایمان، جذبی، مجروح، نیاز حیدر اور سردار جعفری ایک دوسرے کے شاگرد یا استاد ہیں۔ پورے ترقی پسند شعر اور پورے جدید یا جدید تر شعراء کا انجوم یا مجموعہ بھی ایک اقبال، ایک سیماب اور ایک جمیل مظہری جیسے عظیم اور مفکر شاعر کا بدل نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دور میں جو اردو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ جملہ ادب کی کھاد بن جاتا ہے اس عظیم دانشور ادیب اور شاعر کے لئے جو نظر سے اوجھل ہے۔ ابھی پیدا ہوا یا نہیں اور وہ کہاں رہتا ہے اس کا علم اس غیر جانب دار محقق، نقاد یا مدیر کو حاصل ہے جو کولمبس یا ابن خلدون کی طرح یا کم از کم ہمارے ادبی کولمبس چشم و چراغ دوراں سیماب و اعجاز جناب افتخار امام صدیقی مدیر ماہنامہ شاعر بمبئی کی طرح نہ صرف ہندوستان کی جملہ ریاستوں میں چھپے ہوئے ارباب قلم بلکہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے نمائندہ فن کاروں سے باخبر ہیں اور ان کے فن پاروں سے اپنا ادبی رشتہ مربوط اور استوار رکھتے ہیں۔ آزادی سے پہلے نقادوں کے مقالے اور تبصرے شعر و ادب کے موضوع پر غیر

فن کاروں کی تعداد صرف ۱۶ ہے اور افسانوں، ناولوں اور تنقیدی کتابوں کی تعداد صرف ۳۰ ہے۔ اہم شعراء (زندہ اور مرحوم) کی تعداد گیارہ ہے جنہیں فتح نصیب ہوئی ان کی ہیبت کزائی دیکھی نہیں جاتی چونکہ اس صف میں مفکر کلاسکی شاعر بھی ہیں اساتذۂ کرام بھی ہیں، ترقی پسند اور جدیدیئے بھی ہیں۔ گویا استادوں اور شاگردوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں۔ دراصل اس چناؤ میں ان جلیل القدر مرحوم شعراء کو رائے دہندوں نے منکر نکیر سے زیادہ ستایا ہے اور قبرستان میں ان کی تذلیل کی ہے۔ نصف صدی پہلے ہی اقبال، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، سیماب، جلیل، صفی، فانی، حسرت، جگر، یگانہ، جمیل مظہری کی قدر و قیمت متعین ہو چکی تھی۔ ان قد آور شعراپر ادب پیا کے معیار سازوں کی مزید آراء گویا شاعروں کی تحسین ناشناس کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان مرحوم مگر زندۂ جاوید اساتذائے کرام کی ادبی عظمت کو نئے بزار یئے کی ناقص میزان میں مزید تولنے یا جدید ادب پیا سے ان کے طول و عرض کا موازنہ ۱۹۶۰ء میں ابھرے ہوئے ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے کرنے کا عمل ایسا ہی ہے جیسے ایک پلڑے میں ہاتھی اور شیر کو رکھ کر دوسرے پلڑے میں باقی تمام جانوروں کو رکھ کر تولا جائے۔ اساتذۂ کرام کے ادبی خون کا حساب کلو کے وزن میں کرنا یا ان کے شاگردوں کے خون کو نسٹ کرکے اسے ان کے استادوں کے ادبی خون سے گاڑھا یا وزن دار قرار دینا دلیلِ کم نظری ہے۔ آج جتنے بھی نامور شعراء، ادباء محققین اور ناقدین ہیں سب کے سب مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں مذکورہ بالا عہد آفریں حضرات کی شعری اور نثری تخلیقات کو پڑھنے کے بعد ہی ارباب قلم بنے۔ موازنہ کسی شاعر کا کسی شاعر سے کرنا ہی کار طفلاں ہے۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ معتبر ادیبوں نے بحیثیت رائے دہندگان استادوں سے زیادہ نمبر شاگردوں کو مرحمت فرمائے۔ مولانا حسرت موہانی کو صرف ۹، فانی کو ۹، ناصر کاظمی کو ۹، یگانہ کو ۱۲، میراجی کو ۱۴، ن م راشد کو ۱۶، جوش کو ۱۶، فیض کو ۱۹، فراق کو ۱۹، اختر الایمان کو ۲۰، اقبال کو ۲۴، یہ گویا اساتذائے کرام میں علی الخصوص نغز گو غزل کے شعراء کو نیچا دکھانے کا چارٹ ہے۔ بیسویں صدی کے لمحۂ موجود میں میر و غالب ماضی سے کہیں زیادہ زندہ ہیں۔ شاعری چاہے ہزاروں برس پرانی ہو، اگر وہ مترنم و موثر اور متحرک ہے اور وسیع تر انسانی و روحانی زندگی کی عکاسی کرے اور اپنی فکری توانائیوں کا سامان فراہم کرے ہمیں اپنا شریک بنا لے تو آج پر کیا موقوف ہزاروں سال بعد بھی زندہ و شاداب اور محفوظ ہے۔ وہ ادب جو وقت گذر جانے کے بعد قدیم کے زمرے میں شمار ہو وہ اپنے عہد کا بھی اچھا ادب نہیں ہوتا۔ ترقی پسندوں اور جدیدوں میں کوئی ایسا عظیم شاعر نظر نہیں آتا جسے ہم ماضی بعید میں لے جاکر میر و غالب کے ہم دوش کھڑا کر سکیں یا ماضی قریب میں اقبال، سیماب، جمیل مظہری کے ہم پلہ قرار دیں۔ ایک نظر ادب پیا کی پیائش کے تحت ہارے ہوئے بارہ شعرائے کرام پر نظر ڈالتے وقت قاری کی آنکھوں سے خون کے قطرے رواں ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اسے حفظ مراتب کا پاس ہو۔

ذیل میں بارہ شکست خوردہ شعراء کی گرامی آراء کی تعداد یوں ہے۔ شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی کو صرف ۳ نمبر، حضرت شاد عظیم آبادی کو ۳ نمبر، بانی کو ۳ نمبر اور ظفر اقبال کو بھی ۳ نمبر ملے ہیں۔ مولانا حالی کی زبوں حالی اس تھرڈ کلاس صف میں دیکھی نہیں جاتی۔ ایک عظیم نقاد اور نظم نگار مولانا حالی کا موازنہ، بانی اور ظفر اقبال جیسے جدید غزل گو شعراء سے جو کیا گیا ہے اس سے زیادہ عبرت ناک منظر تاریخ ادب اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔ انشاء کی زندگی میں بھی نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک دلخراش منظر یہ ہے کہ مفکر شاعر علامہ جمیل مظہری کو صرف ۲ نمبر، غزل کے منفرد کے لہجے کے شاعر مجروح کو ۲ نمبر، اسرار الحق مجاز کو بھی ۲ نمبر، جدید نظم کے شاعر محمد علوی کو بھی ۲ نمبر اور ادب پیا کے موجد حضرت زبیر رضوی کو بھی ۲ نمبر ملے ہیں۔ جدید نظم گو اور گیت نگار شعرا کے ساتھ کلاسکی شعرا کا تقابلی مطالعہ بھی مضحکہ خیز ہے حضرت اکبر الہ آبادی کو اللہ اکبر نے چار نمبر عطا کر دئے ہیں۔ اب اس شعری سلیکشن میں اساتذۂ کرام اور جدید غزل گو شعرا سے بھی زیادہ نمبر حاصل کرکے ہارنے والے دو ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری نے پانچ نمبر اور مخدوم محی الدین نے بھی پانچ نمبر حاصل کر لئے ہیں۔ اس درجہ بندی کے بعد نئی نسل اور مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ذہین طلباء کے نزدیک کلاسکی غزل کے شعرا میں مجروح، جمیل مظہری، حالی، اکبر الہ آبادی، سیماب وغیرہ کی قدر و منزلت کی کوئی خاص گیارنٹی نہیں رہی اس فہرست سازی سے ایک طرف ادب پیا، نقد و نظر کی نئی میزان کے مالک زبیر رضوی بے حد خوش ہیں کہ سو برس کے شعری ادب کا احاطہ کرتے ہوئے ان شاعروں کے نام بھی لئے گئے ہیں جن کی پہچان ۱۹۶۰ء کے بعد بنی ہے، اب مدیر شاعر جناب افتخار امام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ شاعر میں ادب پیا کے تعلق سے ادبی فیچر کا آغاز کریں۔ اور یہ سوال اٹھائیں کہ کیا اردو شاعری میں درجہ بندی ضروری ہے کہ نہیں۔ زبیر رضوی نے حد سے حد آندھرا میں صرف مغنی تبسم کو رائے دہندہ کی حیثیت سے لیا ہے۔ اور جنوب کی دوسری ریاستوں کے اہم اور نمایاں ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کر دیا ہے، فضیل جعفری نے بھی اسی سلسلے میں اپنی تنقید کو نیرجی کی بجائے بوجھ بنا دیا ہے۔ اور باتوں باتوں میں چند نقادوں کا مذاق بھی اڑا لیا ہے۔ جذبہ فکر و فن اور شعر و ادب کی ازلی وحدت کو قدیم و جدید کے ناقص خانوں میں بانٹ کر رکھ دینا دلیلِ کم نظری ہے۔ شاعری ہو یا نثر اچھی یا بری ہوتی ہے۔ یہ نہ قدیم ہے نہ جدید۔

میں اس بحث کو ذہن جدید کے بجائے شاعر کے ادبی فیچر میں اٹھا رہا ہوں کیوں کہ آپ نے بھی صدی شخصیت نمبر کا اعلان کیا ہے اور مسلسل کر رہے ہیں۔ آپ کا انتخاب اور طریقۂ کار کیا ہوگا، مجھے نہیں معلوم۔

● 5 - SK MEERUDDIN STRET, NOORULLAH PET, AMBUR- 635802 (T.N.)

نوٹ: ——————————

کاوش بدری صاحب کا طویل خط جو مدیر شاعر کے نام ہے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ماہنامہ کتاب نما (دہلی) کے تازہ شمارے (جون ۲۰۰۰ء) میں بھی شائع ہوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس خط کے تمام مباحث پر بحث "ذہن جدید" اور "کتاب نما" ہی میں ہو کیوں کہ شاعر کے صفحات پر "صدی شخصیت" کے بارے میں ایک نیا مکالمہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اچھا ہے کہ ہند و پاک کے دیگر ادبی رسائل میں ایک صدی کے ادب پر اور "صدی شخصیات" پر بحث ہو۔

[باقی صفحہ ۱۷ پر دیکھئے]



شین کاف نظام

دعا : بارش : بیاض

ٹنگی ہے کھونٹی میں
زنبیل
طاق میں رکھا ہے
دعا
کونے میں
عصا
کھلا ہے کواڑ
باہر ہو رہی ہے
بارش ساون کی
#
بیتے دنوں کی کھولا
بیاض
میں
پڑھتا ہوں —
بیت بنی صورت
شعر بنی صدا
اندر سے بھیگتا

● KALLON WALI GALI
JODHPUR- 342001

[illegible] احمد شمیم

تم کون ہو؟

بہت دنوں کے بعد
میری پیاسی ویران آنکھوں میں
کھوئے ہوئے خوابوں کے پھول کھلے ہیں ......!

تم کون ہو ؟
کہ چاندنی بن کر میری آنکھوں میں اتر آئی ہو .....،
تمھیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے
کہ کوئی ملکوتی پیکر ہے کہ زمین کی سیر کو آیا ہے
تمھاری نیلی جھیل جیسی شفاف آنکھوں میں
پاکیزگی نہاتی ہے

چمکتے چاند چہرے کے آئینے میں
کائنات کا حسن سنورتا ہے

اور قوس قزح
بدن سے لپٹ کر ٹوٹ جاتی ہے
میں تمھیں تم سے مانگنے کے خواب نہیں دیکھتا

تم میرے سامنے ہو اور یہ بہت ہے کہ چاندنی
میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے — !

● J.K.S. COLONY, PARDIH ,
P.O KAPALI MANGO,
JAMSHEDPUR (BIHAR)

اقتدار جاوید

جیسے اندھک میں سوراخ کوئی

یا کسی صوت کا آمیزہ ہے
یا خلاؤں میں معلق ہوا اک ریزہ ہے
جب خیابرت کی تہہ داری سے
کسی کرتب، کتنی محنت سے
اس کی تصویر ابھر آتی ہے
ماند پڑتے ہیں خدوخال ہمارے
جیسے بے تہہ نظر آنے لگے پاتال ہمارا

یا کہ ہو سیل معانی کی وہ رو لگتی ہے
جس میں الفاظ کنارہ کرلیں
یا ریاضی کا ہے مفروضہ کوئی
جس میں اعداد صفر رہتے ہیں

اپنی ہیئت میں عجوبہ سا ہے
جیسے اندھک میں سوراخ کوئی
جیسے پانی سے لدا شاخ کوئی
جس طرح جال مکڑوں کا بڑے سینے پر
جس طرح اوس کی اک بوند پڑے پتے پر!!!

● BADSHAHPUR,
DIST. MANDI BAHAUDDIN (PAK)

بہ خطِ شاعر

اے خیام
A-997, SECTOR-11A,NORTH KRACHI
KRACHI-75850 (PAKISTAN)

وائلڈ لائف



برف باری تھمی تو تیز ہوئیں چلنی شروع ہو گئیں۔ ہواؤں کی سائیں سائیں کھڑکی کے دروازوں سے سیٹیاں بجاتی ہوئی گذرنے لگیں۔ پھر بارش شروع ہو گئی اور ہواؤں کا زور ٹوٹا تو دونوں نے ونڈ بریکر جیکٹ چڑھائے اور نکل پڑے۔

سڑک پر میونسپلٹی کی گاڑیاں رنگ برنگی روشنی پھیلائے نمک چھڑکتی پھر رہی تھیں تاکہ جمی ہوئی برف پگھل جائے اور پھسلن پیدا نہ ہو۔ ڈرائیونگ میں زیادہ دقت پیش نہیں آرہی تھی۔

"یار ہم لوگ کچھ زیادہ جلدی نہیں نکل پڑے؟"

"رضی بھائی، تاخیر سے بہتر ہے کہ جلدی پہنچ جائیں۔ یہ مقامی لوگ تاخیر کا بہت برا مانتے ہیں۔"

تاخیر کا برا مانتے ہیں اور جلدی پہنچنے پر مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان مسکینوں کے پاس کچھ بھی کرنے کے لئے نہیں ہے، ان کے پاس وقت ہی وقت ہے۔" رضی ہنس پڑا۔

سلیم خاموشی سے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے دور دیکھتا رہا۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر برف جم کر رہ گئی تھی۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ گاڑی رواں دواں رہی۔ سلیم نے سیٹ بیلٹ کو ڈھیلا کیا اور پشت کو پیچھے کر کے لیٹ سا گیا۔

"کیا بہت تھک گئے ہو۔" رضی نے پوچھا۔

"ہاں رضی بھائی۔ بہت تھک گیا ہوں۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔

رضی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ڈرائیونگ کرتا رہا۔

ان کی منزل ایمسٹرڈم سے کوئی ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر بسا ایک گاؤں تھا رضی نے کئی موڑ کاٹے اور ایک بنگلے کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔

اس نے اتر کر بنگلے کے دروازے کے کال بیل کو بجانا ہی چاہا تھا کہ دروازہ کھل پڑا اس نے چونک کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دراصل اسی وقت دروازہ کھول کر کوئی باہر نکل رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"تم۔ رازی۔ اتنی جلدی آگئے۔ ابھی تو ہمارے اپائنٹمنٹ میں پچیس منٹ باقی ہیں۔"

اس کی عمر تقریباً پینتیس سال رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں کتے کی بیلٹ کا ایک سرا تھا دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے کو کھینچ کر بند کر لیا۔ اب تھوڑی بہت ڈچ زبان تو سلیم نے بھی سیکھ لی تھی۔ پوری طرح سمجھ سکتا تھا اور کسی طرح اپنا مافی الضمیر سمجھا سکتا تھا۔

"ہاں بریندا ہو دراصل برف باری کی وجہ سے ہم جلدی نکل پڑے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ذرا اسیزر کو چہل قدمی کرالاؤں پھر باتیں کریں گے اپنے اپائنٹمنٹ کے مطابق۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور سیزر کو کھینچتی ہوئی ایک طرف چل دی۔

رضی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے سلیم کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

رضی گاڑی میں بیٹھا تو سلیم نے کہا۔ "بہت بدتمیز عورت ہے۔"

"یار غلطی ہماری ہے، ہم اتنی جلدی جو آگئے۔ یہ ابھی دفتر سے آئی ہوگی، کتے کو ٹہلانا بھی ضروری ہے۔ پھر اسے کھانا کھلائے گی، اپنے کپڑے تبدیل کرے گی، پھر بیٹھ کر باتیں کرے گی۔"

"پھر بھی رضی بھائی، یہ ہمیں بیٹھنے کو تو کہہ سکتی تھی۔"

یار تم ابھی تک وہیں ہو۔ تمہیں یہاں کی شہریت اختیار کرنی ہے، یہاں کے اطوار بھی سیکھ جاؤ۔ ان لوگوں سے ایسی توقع فضول ہے، یہاں کے طور طریقے مختلف ہیں۔"

سلیم خاموش رہا۔

"چلو کوئی بار دیکھتے ہیں۔"

رضی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ گاڑی سست رفتاری سے چلتی رہی۔ نہروں میں برف جمی ہوئی تھی اور بچے اسکیٹنگ کر رہے تھے۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک بار مل گیا۔ سلیم نے جیکٹ کے اندر ہی اندر ٹٹول کر اپنی جیب کی رقم کا اندازہ لگایا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ رضی نے اپنے لئے کونیک کا آرڈر دیا اور سلیم کے لئے اسپریسو کافی کا۔ سلیم نے اب تک خود کو الکحل سے بچائے رکھا تھا، شاید اس لئے بھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ رقم پس انداز کرنی تھی۔

رضی کو ایسے لوگوں کی تلاش رہتی تھی جنہیں وہ بلیک میل کر سکے یا ان کے کام کرانے کے بہانے سے کچھ رقم اینٹھ سکے سلیم کے معاملے میں اس کا رویہ کچھ نرم تھا رقم کی بجائے وہ کچھ خرچ کرا دینے پر اکتفا کرتا اور ملازمت نہ ہونے کی

صورت میں کہیں کام بھی دلوا دیتا۔
رضی نے جلدی جلدی کونیک کے دو پیگ چڑھائے۔ سلیم آہستہ آہستہ کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ سلیم نے بار مین کو رقم ادا کی اور دونوں نکل پڑے۔ رضی کی ہدایت کے مطابق سلیم نے ایک خوبصورت سا گلدستہ بھی خرید لیا تھا۔ گاڑی برینڈا کے گھر کے دروازے پر رکی تو پورے ساڑھے چھ بجے تھے اپائنٹمنٹ کے مطابق۔ رضی نے بیل بجائی اور دروازہ کھل گیا۔ برینڈا نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ اس کے انداز میں کسی معذرت کا شائبہ نہیں تھا
"برینڈا۔ یہ ہے وہ سلیم۔ دیکھو تمہارے لئے کتنے خوبصورت پھول لایا ہے۔"
"او ہاں، بہت خوبصورت۔۔ شکریہ سالم۔" اس نے سلیم سے پھول لئے اور شیشے کے ایک گلدان میں ڈال دئے۔
"تو تم سالم ہو۔ اچھا نام ہے، مجھے بلانے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔"
سلیم مسکرا کر رہ گیا۔
"آؤ بیٹھو۔" برینڈا نے آرام دہ صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
دونوں کے بیٹھتے ہی وہ خود بھی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔
اس کے قریب ہی اس کا کتا بیٹھا تھا جس کی کچھ زیادہ ہی لمبی زبان باہر لٹکی ہوئی رال ٹپکا رہی تھی۔
"تمہارا اسیز ر بہت خوبصورت ہے۔" رضی نے کہا۔
"شکریہ رازی۔" اس نے کہا اور کتے کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "اگر تم لوگ برا نہ مانو تو میں ذرا آرام سے بیٹھ جاؤں، بہت تھک گئی ہوں، بات تو پھر بھی ہو سکتی ہے۔"
"ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔" رضی نے کہا۔
برینڈا صوفے پر تقریباً لیٹ سی گئی۔ اس کے پاؤں کتے کی طرف تھے۔ کتے نے جیسے اشارہ سمجھ لیا تھا، وہ اس کے تلوے چاٹنے لگا اور برینڈا کے چہرے پر سکون سا چھا گیا۔
"رازی میں نے تمہیں آدھا گھنٹہ دیا ہے، مجھے ابھی اپنے لئے کھانا بھی بنانا ہے، پھر ایک نئی وائلڈ لائف فلم بھی آنے والی ہے ٹی وی پر۔ تمہیں شاید نہیں معلوم مجھے وائلڈ لائف کی فلمیں بہت پسند ہیں، پھر آج ویک اینڈ بھی ہے، تم سمجھتے ہو نا۔"
"ہاں میں سمجھتا ہوں۔"
"پھر ہم کام کی بات شروع کرتے ہیں۔ رازی جیسا میں نے کہا تھا، میرا کام بہت پکا ہوتا ہے۔ پولیس کو شک کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اس لئے پانچ ہزار میں ابھی لوں گی اور پانچ ہزار کام ہو جانے کے بعد۔ سالم میرے لئے ویڈنگ ڈریس بنائے گا اور میں ٹاؤن ہال میں مجسٹریٹ سے وقت لے لوں گی، پھر ہماری شادی ہو جائے گی۔" وہ ہنسی۔ "پھر میں سالم کے لئے مستقل رہائش کا پروانہ حاصل کر لوں گی اور اسے ورک پرمٹ بھی دلوا دوں گی۔ جب تک شہریت نہیں ملتی میں اس سے بقیہ پانچ ہزار کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کچھ۔" رضی نے بولنا چاہا۔
"نہیں رازی، اسی طرح ہو گا جس طرح میں کہہ رہی ہوں۔ شادی میں سالم کے اور میرے کچھ دوست احباب بھی شریک ہوں گے۔ انکے ڈرنک کے اخراجات بھی اسے ادا کرنے ہوں گے، کچھ فوٹو گرافی بھی ہو گی۔ اس کے علاوہ ہر سنیچر کو یہ میرے پاس رہے گا، مجھے ڈنر پر لے جائے گا اور میرے ہی گھر پر رات بسر کرے گا۔ یہاں کی پولیس بہت ہوشیار ہے۔ کبھی کبھی گھر پر اچانک چھاپہ مارتی ہے یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ ہم واقعی شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ عموماً پولیس توقع کرتی ہے کہ میاں بیوی کم از کم ویک اینڈ ضرور ایک ساتھ گذارتے ہیں۔ شہریت ملنے تک تو یہ ڈرامہ چلتا رہے گا۔"
"اور یہ ڈرامہ کب تک چلانا پڑے گا۔" رضی نے پوچھا۔
"میں کوشش کروں گی کہ جتنی جلدی ممکن ہو یہ کام ہو جائے۔ لیکن ایک سال تک معاملہ چل سکتا ہے۔"
کتا باری باری اس کے دونوں تلوے چاٹتا رہا، سلیم کو ابکائی سی آ رہی تھی۔
"ٹھیک ہے، سلیم اگلے سنیچر کو رقم لے کر تمہارے پاس آ جائے گا۔ میں اسے مزید باتیں سمجھا دوں گا۔"
"او کے رازی، اور میرا یہ شوہر سالم تو کچھ بولتا ہی نہیں، لیکن کوئی بات نہیں، میں اسے زبان بھی اچھی طرح سکھا دوں گی۔ کہتے ہیں ڈچ زبان سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ڈچ عورت سے شادی کر لی جائے۔" وہ ہنسی
رضی بھی ہنس دیا۔ سلیم نے مشکل سے خود کو مسکرانے پر آمادہ کیا۔
دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔
"سالم، میں نے تمہیں ڈرنک کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ دراصل آج میرے پاس بالکل وقت نہیں، معذرت چاہتی ہوں۔"
"نہیں برینڈا کوئی بات نہیں، ہم چلتے ہیں۔ اگلے ہفتے میں سلیم کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ باقی معاملات تم لوگ خود ہی طے کرتے رہنا۔"
وہ دروازے تک ان دونوں کو چھوڑنے آئی اور ان کے نکلتے ہی دروازہ بند کر لیا۔
ڈرائیونگ کرتے ہوئے کافی دیر کے بعد رضی نے پوچھا۔
"ہاں سلیم میاں، کیا کہتے ہو۔"
"کچھ نہیں رضی بھائی، آپ نے تو سب کچھ طے کر ہی دیا ہے۔ میں رقم کا انتظام کر لوں گا۔ لیکن رضی بھائی، اب تو میرا کام ہو جائے گا نا۔"
"یار، اب شک کی گنجائش کہاں ہے، یہ عورت بہت تیز ہے۔ یہ خود چاہے گی کہ تمہارا کام جلدی ہو جائے تاکہ تم سے طلاق لے کر کوئی نیا مرغا پھانسے۔ اتنی رقم ملازمت کر کے وہ زندگی بھر پس انداز نہیں کر سکتی۔"
اگلے ہفتے وہ رضی کے ساتھ پھر اسی راستے پر رواں دواں تھا۔ رضی نے اس سے وائن کی ایک بوتل خرید وا دی تھی تاکہ برینڈا پر اچھا تاثر قائم ہو سکے۔ برینڈا ان کی منتظر تھی۔ رضی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وائن کی بوتل دیکھ کر برینڈا

مکمل اٹھی۔

"بہت خوب تم خاصے بااخلاق ہو۔ آج ہم باہر نہیں جائیں گے۔ یہیں پر سوپر اسٹور سے کچھ شاپنگ کریں گے۔ آج تم اپنی پسند کا کھانا بنا کر مجھے کھلاؤ گے۔ ٹھیک ہے نا۔"

سلیم نے رضامندی سے سر ہلا دیا۔

"تم رقم تو لائے ہو گے۔؟" برینڈا نے پوچھا۔

سلیم نے پانچ ہزار کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نے آج ہی ایک گاڑی پسند کی ہے۔" اس نے لفافے کو چومتے ہوئے کہا۔ "آؤ چلیں۔"

اس نے کتے کے گلے میں بیلٹ باندھی اور دوسرا ہاتھ میں پکڑ کر دروازے کی طرف چل دی۔ سلیم اس کا ساتھ دیتا رہا۔ شاپنگ کے دوران اس نے اپنی ضرورت کی چیزیں بھی ٹرالی میں ڈال دیں۔ سلیم کے اندازے کے مطابق برینڈا نے پورے ہفتے کی شاپنگ اس کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔

یہ سب تو ہو گا۔ اس نے سوچا اور رقم ادا کر دی۔

سلیم نے اپنے اسٹائل کا کھانا بھی بنایا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ مرچوں والے کھانے سے برینڈا کی زبان جلنے لگی اور پورا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا لیکن وہ مزے لے لے کر کھاتی رہی اور کھانے کی تعریف بھی کرتی رہی۔

پھر وہ صوفے پر لیٹ گئی اور اپنے پاؤں کتے کی طرف کر دئے۔ کتا اٹھا، اس کے پاؤں کے قریب آیا اور تلوے پر اپنی بھیگی بھیگی زبان پھیرنے لگا۔ برینڈا نے سلیم کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھو، تمہارے انداز میں اپنائیت اور چاہت ہونی چاہئے۔ ڈرامہ اصل کے مطابق ہو تبھی کامیاب ہوتا ہے۔ مجھ سے باتیں کرو تاکہ تمہاری زبان رواں ہو۔"

برینڈا نے ٹی وی پر چینل تبدیل کیا، وائلڈ لائف کی فلم آرہی تھی۔

"دیکھو تم اس پر کمنٹری کرو، ہم دونوں اس پر باتیں کریں گے، میں آواز بند کر دیتی ہوں۔"

دونوں باتیں کرنے لگے۔ سلیم کو وہ بولنے کا زیادہ موقع دے رہی تھی، کبھی کبھی وہ اس کا تلفظ درست کر دیتی۔

"ایسی وائلڈ لائف کی فلمیں ہمارے ملک میں نہیں چلتیں۔"

"اب تم اپنے ملک کو بھول لو سالم۔ تم یہاں کی شہریت حاصل کرنے جارہے ہو۔ اس رنگ میں رنگ جاؤ زندگی کو زیادہ انجوائے کرو گے۔ تمہیں یہ فلمیں گندی لگتی ہوں گی جب کہ یہ حقیقت سے قریب ترین ہیں۔ اچھا اب مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی یہیں سو جاؤ۔"

برینڈا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

اب اس کا یہی معمول تھا۔ ہر سنیچر کو وہ برینڈا کے پاس پہنچ جاتا، ہفتے بھر کی شاپنگ کراتا، اس کے لئے کھانا بناتا، وائلڈ لائف کی فلمیں دیکھتا اور اتوار کو رات گئے رخصت ہو جاتا۔ ایک مہینے کے بعد برینڈا نے مجسٹریٹ سے وقت لے لیا، سلیم نے اس کے لئے ویڈنگ ڈریس لیا اور دونوں کے چند دوست واحباب کے سامنے مجسٹریٹ نے دونوں کی شادی کردی۔ ڈرنک کا دور چلا، دوست احباب رخصت ہوئے اور برینڈا اپنی نئی گاڑی میں سلیم کو اپنے گھر لے آئی۔

"سالم ہمیں تو ہنی مون کے لئے کہیں دور چلے جانا چاہئے تھا، لیکن تم ملک سے باہر نہیں جاسکتے۔ چلو تمہارے پیسے بچ گئے۔" برینڈا ہنس کر بولی۔

سلیم مسکرا کر رہ گیا۔

"آج کیا پروگرام ہے۔؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"تمہارے لئے بہت اچھا کھانا پکاؤں گا۔"

تم بے وقوف ہو سالم۔" وہ ہنس کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

سلیم کچن کی طرف چلا گیا۔ میں بے وقوف نہیں ہوں برینڈا۔ لیکن نہیں شاید میں بہت بے وقوف ہوں۔ چھ برسوں سے تکلیفیں جھیل کر، پولیس سے بچ بچا کر، چھپتا چھپاتا، چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کر کے رقم پس انداز کرتا رہا ہوں تاکہ مستقل قانونی رہائش کی کوئی صورت نکل سکے۔ بے وقوف تو ہوں، آخر ان سب کی مجھے کیا ضرورت تھی، کیا اپنے ملک میں مجھے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔ والدین، بھائی بہن، گھر، عزیز واقارب۔ میں واقعی بے وقوف ہوں برینڈا۔ بہت بے وقوف۔

اس سے اگلے مہینے اسے مستقل رہائش کا کارڈ مل گیا، پھر اسے ورک پرمٹ بھی مل گیا۔ برینڈا کی کوششوں سے اسے اچھی ملازمت بھی مل گئی اب وہ باقاعدہ ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں میں شامل تھا۔

سنیچر کے روز وہ پابندی سے برینڈا کے گھر پہنچ جاتا، اسے ہفتہ بھر کی شاپنگ کراتا، کہیں ڈنر پر لے جاتا، وائلڈ لائف کی فلمیں دیکھتا اور اتوار کو رات گئے واپس چلا جاتا، اس کی شہریت کے کاغذات بھی داخل ہو چکے تھے، زبان بھی خوب رواں ہو چکی تھی اور کسی بھی محفل میں بیٹھ کر وہ ہر طرح کی گفتگو کر سکتا تھا۔ ایک روز برینڈا نے اسے مژدہ سنایا کہ اگلے مہینے کے تیسرے ہفتے میں پولیس سے اس کا انٹرویو ہو گا، اس سے کچھ سوالات کئے جائیں گے اور پھر اسکے کاغذات وزارت انصاف سے وزارت داخلہ بھیج دئے جائیں گے اور اسے اس ملک کا پاسپورٹ مل جائے گا۔

سلیم سے زیادہ برینڈا خوش نظر آرہی تھی۔

"تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ مجھے تمہارے ہاتھوں میں پانچ ہزار کا لفافہ نظر آرہا ہے اور میرا ہاتھ اس سے بہت قریب ہوتا جارہا ہے۔ اب دیکھو نا، یہ گاڑی بھی پرانی ہوتی جارہی ہے، ایک نئی ماڈل کی اسپورٹس کار میں نے پسند بھی کرلی ہے، تم دیکھو گے تو تمہیں بھی پسند آئے گی۔"

سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

برینڈا صوفے پر لیٹ گئی۔ اس نے کتے کو اشارہ کیا، آوازیں دیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
سلیم کرسی پر بیٹھا سے دیکھتا رہا۔
برینڈا نے ٹی وی پر وائلڈ لائف کی فلم لگا دی تھی۔
"یہ نئی فلم آئی ہے سالم۔"
سلیم پھر بھی خاموش رہا۔
برینڈا نے کتے کو آواز دی۔
"سیزر۔ آجاؤ۔"
کتا پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔
"سالم، تم نے یہاں کا پاسپورٹ دیکھا ہے۔ کیسا لگتا ہے اور جب تم اسے اپنے ہاتھ میں لوگے تو کیسا لگے گا۔" برینڈا نے ہنس کر پوچھا۔
سلیم خاموش رہا۔ وہ کبھی ٹی وی کو دیکھتا، کبھی کتے کو اور کبھی برینڈا کو۔
برینڈا پہلو بدلنے لگی
"سیزر۔ کم آن۔" اس نے اپنے پاؤں کتے کے اور بھی قریب کر دئے۔
کتے نے اپنا سر اپنے پاؤں کے درمیان ڈال دیا۔
"سیزر۔۔۔" وہ تقریباً چیخ پڑی
کتا پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔
"سالم۔ تمہیں نیا پاسپورٹ اپنے ہاتھوں میں کیسا لگے گا۔" اس نے پھر پوچھا۔
"اچھا لگے گا برینڈا۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔
"پھر تم ان تمام حقوق کے اہل ہو جاؤ گے جو ہمیں میسر ہیں۔ دیکھو میرا سیزر بھی اب بڑھا ہو گیا ہے۔ آؤ، تم ہی آجاؤ۔"
سلیم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
"آجاؤ میرے پیارے۔ میرے سیزر۔ نیا پاسپورٹ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دوں گی۔"
سلیم کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ بے بسی کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"کتنے دنوں سے وائلڈ لائف کی فلمیں دیکھ رہے ہو کچھ تو سیکھا ہوگا۔ اور پھر پاسپورٹ۔ سالم۔"
برینڈا کے لہجے میں تحکم تھا اور آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں۔
سلیم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا پھر فرش پر جھک گیا اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا برینڈا کے پاؤں کے قریب پہنچا اور اپنی زبان باہر نکال کر چپڑ چپڑ اس کے تلوے چاٹنے لگا۔ ++

بقیہ صفحہ ۱۲ ادبی فیچر

ایک خط کاوش بدری کے حوالے سے

اسماعیل

جناب کاوش بدری مدیروں کے نام اپنے خطوط میں نازک مذہبی اصطلاحات کا استعمال بے محابا، بڑی بے احتیاطی اور خطرناک طریقے سے کرتے ہیں۔ معاصر جریدہ "شب خون" الہ آباد کے تازہ شمارے میں چھپے خط میں "شب خون" کے ملنے کو "ہم نفسی جبرئیل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی بے رس، بے کیف غزل کو "مصحف" کہا ہے۔ خطرہ ہے کہ کہیں وہ آگے چل کر خدائی کا دعویٰ نہ کریں اور فاروقی صاحب کو پیغمبر نہ بنا دیں۔ آپ کو تو "عظیم صوفی مدیر" بنا ہی ڈالا۔ کسی چیز کی تعریف میں وہ غلو کی بھی تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں جس کا ثبوت شب خون کے چند حالیہ شماروں میں چھپے ان کے خطوط کی صورت میں موجود ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کاوش کس قسم کے اسلام کے پیروکار ہیں شاعر کے تازہ شمارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ (اولیاء) بہ فرمان رب العزت زندہ ہیں اور "اپنے خاص بندوں" پر احسان فرماتے ہیں"۔ قرآن کریم واقعی انبیاء، اولیاء، شہداء کو بعد از انتقال "زندہ" کہا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صراحت کر دی کہ وہ کس طرح زندہ ہیں تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ عقیدہ تو تعلیمات قرآنی کے سراسر منافی ہے کہ اولیاء بعد از مرگ، لوگوں، کاوش صاحب کے الفاظ میں "اپنے خاص بندوں" پر احسان فرماتے رہتے ہیں اس بات سے یہ عقدہ بھی کھلا کہ اولیاء کے "اپنے خاص بندے" بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم تو لوگوں کو اللہ کا بندہ کہتے کہتے نہیں تھکتا۔ اصل میں ایک قطعی غیر اسلامی گمراہ کن اور عقل کو چکر میں ڈالنے والے وحدت الوجودی نظریئے نے ان کو اچھا خاصا الجھا دیا ہے اور غالباً وہ خود بھی نہیں جانتے کہ کیا بولتے اور لکھتے ہیں۔ شاعر میں چھپے خط میں انہوں نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے، صحاح ستہ میں اس حدیث کا کوئی وجود نہیں، یہ حدیث انہوں نے تصوف کی کسی کتاب سے نقل کی ہے اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ تصوف کی تمام کتابوں کا پیٹ ایسی ہی موضوع اور من گھڑت احادیث سے بھر دیا گیا ہے۔ کاش، کاوش بدری صاحب قرآن حکیم کا مطالعہ تصوف اور وحدت الوجود کو ایک طرف چھوڑ کر کرتے تو گمراہی سے بچ جاتے۔

● C/O UMAR BOOK SHOP, NEW BRIDGE, CHANKHAN, SOPURE-193201(J.K)

● اس خط کی شمولیت ناگزیر تھی کہ کچھ اور لوگوں نے بھی شاعر میں شائع ہوئے ان کے مکاتیب پر اعتراضات کئے تھے۔ لیکن اس خط کی اشاعت سے ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم حضرت کاوش بدری کے خلاف ہیں۔ وہ صوفی مزاج شاعر و ادیب ہیں۔ بے حد قابل احترام عالم ہیں ان کا مطالعہ وسیع ہے اور قوت شعری بھی غیر معمولی ہے تصوف کے آدمی ہیں لہٰذا بعض باتیں اختلافی ہو سکتی ہیں۔ یہ بالکل ہی الگ موضوع ہے۔
ادبی فیچر کو کچھ اور فکر انگیز اور بحث طلب کیا جا رہا ہے۔ قارئین شاعر کی گرانقدر آراء کا انتظار رہے گا۔ [الف الف]





افضال نوید

آنچل میں نظر آتی ہیں کچھ اور سی آنکھیں
چھا جاتی ہیں احساس پہ بلّور سی آنکھیں

رہتی ہے شب و روز میں بارش سی تری یاد
خوابوں میں اتر جاتی ہیں گھنگھور سی آنکھیں

پیمانے سے پیمانے تلک بادۂ لعلیں
آغاز سے انجام تلک دور سی آنکھیں

تبدیلی ترے دیکھتے رہنے سے یہ آئی
بن بیٹھیں تسلسل سے ترے طور سی آنکھیں

ہر بار کنارے سے لگا کر چلی جائیں
دھندلا ہٹوں میں غمزۂ فی الفور سی آنکھیں

لے کر کہاں رہتی رہی موتی سی وہ صورت
لے کر کہاں پھرتا رہا میں گور سی آنکھیں

صورت گریٔ محض قرینہ نہیں کوئی
ہر لحظہ کہیں ناسخ پہ زور سی آنکھیں

وقت آنے پہ آئی نہ نظر گردشِ افلاک
بیٹھا رہا لے کر میں کسی اور سی آنکھیں

بالفرض نکل جاؤں کسی اندھے سفر پر
باندھے ہوئے رکھتی ہیں مجھے ڈور سی آنکھیں

● 40- GOLDEN LODGE, PACE, 105- SCARBORO QNT, MIK 4H8 CANADA

احتشام اختر

میرے ہی بدن کے لئے تلوار بھی ہوگی
یہ ٹھنڈی ہوا باعثِ آزار بھی ہوگی

گونجی تھی جو آواز مری دشت میں اک دن
معلوم کسے تھا کہ گرفتار بھی ہوگی

بستی سے بہت دور بیاباں میں کبھی موت
یاروں کے لئے سرخیٔ اخبار بھی ہوگی

چلتے رہو یونہی کہ یہ پتھریلی گذرگاہ
قدموں سے ہمارے کبھی ہموار بھی ہوگی

جس چیز کو چوروں کی طرح دیکھ رہے ہو
گر جائے گی ہاتھوں سے تو جھنکار بھی ہوگی

بوتا ہوں اس امید پہ میں دل میں محبت
بنجر تو ہے دھرتی کبھی گلزار بھی ہوگی

آسان سمجھ کر جسے گذرے ہیں کئی بار
معلوم نہ تھا راہ وہ دشوار بھی ہوگی

سوچا ہی نہ تھا اس دلِ نافہم نے اختر
پھینکے گا اگر تیر تو یلغار بھی ہوگی

● 1-ADARSH COLONY, KHEDAL PARK, KOTA-324001 (RAJ)

شہپر رسول

نہ کوئی خواب، نہ ماضی ہی میرے حال کے پار
کوئی کمال نہ ٹھہرا مرے زوال کے پار

نہ میٹھے لفظ، نہ لہجہ ہی اندمال کے پار
جواب کا تو گذر بھی نہیں سوال کے پار

فراق و وصل کے معنی بدل کے رکھ دے گا
ترے خیال کا ہونا مرے خیال کے پار

مسرّتوں کے دکھوں کا تو ذکر بھی بیکار
کہاں ہے کوئی مداوا کسی ملال کے پار

نہیں ہے کوئی بھی سرحد مرے جنوں آگے
جہانِ حسن جہاں ہے ترے جمال کے پار

شکاریوں کی امیدیں سنورتی رہتی ہیں
طیور گھومتے پھرتے ہیں خوب جال کے پاس

تمہارے لفظ اسے کھینچتے تو تھے شہپر
جنوب کیسے پہنچتا مگر شمال کے پاس

DEPT. OF URDU, JAMIA MILLIA-ISLAMIA, NEW DELHI-110025

محمود شیخ
592-NAYA MOHALLA,
MIRZA GHALIB MARG, JABALPUR-(M.P.)

ادبی مقصد اور تحریک

زمین، ہواپانی اور روشنی کا وجود مٹی سے ہے۔ یہ کائنات مٹی ہے۔ نباتات وجمادات، انسان وحیوانات سب کچھ مٹی ہے۔ جس طرح قوت زمین سونا، چاندی، ہیرے، موتی کی شکل میں مجتمع ہوتی ہے۔ وہی قوت عمل، ہواپانی اور آگ کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ آفتابی مٹی کی تمازت اور حرارت اس کی قوت نمو کا اظہار بھی ہے۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کائناتی احساس ہی تخلیقِ مجسم ہے اور انسان، قوتِ احساس نمو کا جیتا جاگتا نمونہ۔ ارسطو کائنات کی تخلیقی حسیعت سے ناواقف تھا اس لئے اس نے انسان کو "حیوان ناطق" سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیوں اور سائنسدانوں نے اس کے اس مفروضے کا اطلاق تمام عالم قدرت پر کیا اور دنیا کو ایک مادۂ مجسم ثابت کردیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو ایک "حیوان" کے ساتھ ہونا چاہئے۔ انسان جو اس کارخانۂ قدرت کی سب سے اکمل واعلیٰ تخلیق ہے اس کا موازنہ "نطق حیوانی" سے کیوں کر ممکن ہے۔ انسان میں اگر کوئی نقص ہے تو صرف اتنا کہ ایک وقت معینہ کے بعد اس کا جسد خاکی خاک میں مل کر گل گلزار ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک وہ نطق احساس کے ساتھ اس دنیا میں ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے تصرف واختیار میں ہے۔ لیکن وہ خود کسی کے تصرف واختیار میں نہیں بجز اپنی فطرت اور نفس کے۔ ہواپانی، روشنی، زمین اور آسمان سب کچھ اس کے لئے ہے۔ لہٰذا ضابطہ اخلاق کے ذریعے انسان کو اس کے فرائضِ زندگی سے واقف کرایا جاتا ہے۔ تاکہ اس کا وجود کائنات کے لئے باعث رحمت اور انسانیت کے لئے وجہ افتخار بن سکے۔ انسان اگر اپنی قوتِ عمل وتسخیر کی تعمیریت سے ناواقف ہے تو یقیناً "حیوان ناطق" ہے اور خیر انسانیت کبھی نہیں ہو سکتا۔ سبب یہ ہے حیوان محض اپنی جبلت نفس کا اسیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے فکر وفہم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کائنات اور انسان احساس مجسم ہیں۔ لیکن انسان کائناتی حقائق کا نقطۂ عروج بھی ہے۔ اس کا حسیاتی نظم زیادہ ہمہ گیر اور وسعت انگیز ہے۔ اسے شعور واحساس نے غور وفکر کی غیر معمولی قوت عطا کی ہے۔ سیب کا درخت سیب نہیں ہے مگر درخت کی اہمیت وافادیت سیب سے ہے۔ دنیا میں قوموں کا عروج وزوال قدرت کے اسی نظم کائنات کا نتیجہ ہے۔ قومیں شعور اقتدار سے باثمر ہو جاتی ہیں۔ مگر باغبان جب اپنے فرائض کو بھول کر تسکین نفس کا شکار ہو جاتا ہے تو ایک دن تمام قوم کے ساتھ خود اسے بھی بدمزہ اور ناقص پھلوں کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔

احساس کبھی دائمی نہیں ہوتا لیکن اسے معاشرتی اخلاق کے ذریعہ دائمی بنایا جاتا ہے۔ وقت، ماحول اور ضرورت کے مطابق انسانی احساسات میں مثبت اور منفی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جس سے انسانی وجود میں حرکت وعمل کے مثبت اور منفی زاویے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ بے عمل آدمی کو احساس پتھر بنا دیتا ہے اور باعمل افراد میں فرائض اور ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرتا ہے۔

طبع انسانی اپنی بقا اور احتیاج کے مطابق شعور عمل اختیار کرتی ہے۔ اور کاروبار جہاں چل نکلتا ہے۔ انسان کیا چاہتا ہے؟ کیا وہ خالق ہے؟ اگر ہے تو اس کے تخلیقی مقاصد اور تعمیری رجحانات کیا ہیں؟ انسان کو اگر حیوان ناطق سمجھ لیا جائے تو اس کی عملی حکمت واضح ہو جاتی ہے۔ جو خود اپنی فطرت نفس کا محکوم ہے۔ اس کے تخلیقی رجحانات اور تعمیری مقاصد بھی اس کی اپنی ذات کے ارد گرد ہی ایٹم کی طرح گردش کرتے ہیں۔ انسان اگر انسان ہے "حیوان ناطق" نہیں ہے تو اس کے مقصد تعمیر پر یقین کیا جاسکتا ہے۔

خیال ایک بیج ہے اور بیج کیا ہے؟ ضرورت...... اور ذہن انسان کی زرخیز وادیوں میں پروان چڑھتا ہے اور صفحہ قرطاس پر منتقل ہو کر اپنی دنیا تلاش کرتا ہے۔ روسو (ROUSSEAU) نے ضرورت اور خواہشات کو اپنی تاویلات میں اس قدر اہمیت دی کہ انسان میں "حیوان ناطق" کی سبھی خوبیاں ابھر آئیں اور اس کا وجود نفسی خواہشات اور ضرورت سے لبریز ہو گیا۔ جس کی چمک دمک کے آگے مشرقی روحانی حقیقتوں کے محل خاک ہو گئے۔ حقیقت اور مجاز کا فرق مٹ گیا۔ جو کچھ نظریں دیکھ رہی تھیں وہی بیج تھا۔ ذہنی، جسمانی اور معاشی ناآسودگیوں سے جاگیردارانہ نظام معیشت کی بنیادیں گرتی نظر آرہی تھیں انسانی شعور مادی حقیقت پسندی کے آئینے میں اپنی شبیہ دیکھ رہا تھا۔ ادیب، شاعر، اور فلسفی نے انسانی ضرورت اور خواہشات کے نئے محرکات تلاش کئے اور نفسی تقاضے باہمی کے جذبات کو اپنی تحریروں میں عام کیا۔ محیر العقل اور غیر ارضی قصوں کے مقابلے افسانہ اور ناول زیادہ پسندیدہ نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ عوامی کرداروں نے راجہ مہاراجہ کی جگہ لے کر تہذیب گذشتہ کے نقوش دھندلا دئے۔

جمہوریت کے ابتدائی دور میں جو ناول اور فسانے تخلیق کئے گئے ان میں معاشرتی جبر اور استحصال کے خلاف سخت احتجاج پایا جاتا ہے۔ مذہبی اخلاقی قدروں سے

پیدا شدہ نفسیاتی مسائل بھی زیر بحث لائے گئے۔ عوامی ضرورت اور خواہش کو زبان عطا کی گئی فطرت انسانی کی جنسی اور مادی توجیہات نے شعور فکر و نظر کا معیار ہی بدل دیا۔ راقم الحروف نے اپنے ایک مقالے جمالیاتی شعور و ادراک میں تحریر کیا تھا۔

"کوئی بھی تہذیبی اور سائنسی نظریہ، ملک و قوم کی بنیادی خواہشات، اس کی مادی اور نفسی ضرورت، مذہبی اور تاریخی شعور کا عکاس ہوتا ہے۔ جس میں فنکار اپنی نفسیاتی شخصیت کے ان ہی رجحانات کو بروئے کار لاتا ہے جو اس کی ذاتی شخصیت اور پسند ناپسند کے ترجمان ہوتے ہیں یہ شخصی عنا[illegible] جمالیاتی قدروں کے تعین میں کبھی کبھی نہایت موثر کردار ادا کرتے ہیں مثلاً آوارہ اور اوباش روسو (JEAN JACQUES ROUSSAU) چارلس ڈارون (CHARL DARWIN) اور سگمنڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD) کا آئیڈیل انسان تھا۔ روسو کی جنس پرستی اور آوارگی کو انہوں نے غیر محسوساتی طور پر جمالیاتی رنگ دینے میں کامیابی حاصل کی۔ جس کے سبب مشرقی جمالیاتی شعور مغرب کے صنعتی کوڑے دان کی زینت بن گیا۔"

عورت اور مرد کے جذباتی رشتے، معاشی ناآسودگی سے پیدا شدہ جذباتی اور نفسیاتی مسائل، مذہبی اخلاقی انحطاط، ابتدائی دور کے افسانوں اور ناولوں کے خاص موضوع تھے۔ چارلس ڈارون نے کائنات کا ایک نیا ارتقائی نظریہ وضع کیا اور حیوان ناطق کو اموبا (EMOEBA) کی ترقی یافتہ شکل میں پیش کر کے ادب و سائنس کو ایک مادیاتی شعور فکر سے آشنا کیا۔ جس نے انسان کی نفسیاتی و جنسی ضرورتوں کے اظہار میں شدت پیدا کی اور مرد و زن کے درمیان نفسیاتی تعلقات کا بیان حجابی قیود سے آزاد ہو گیا۔ قصہ کہانی میں پہلے بھی خدا ترس نیک بندوں کا فقدان تھا، جنسی آزادی نے اسے اندر سے بھی برہنہ کر دیا۔ کارل مارکس نے ڈارون سے متاثر ہو کر DIALECTICAL MATTERIALISM کا اطلاق نظم معیشت پر کیا اور بتایا کہ سرمائے کی غیر منصفانہ تقسیم بنی نوع انسانی کے لئے کس قدر تکلیف کا باعث ہو سکتی ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کے دور میں صنعتی انقلاب یوروپی سرحدوں سے نکل کر دیگر براعظموں میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ صنعتی شہروں کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا۔ جس کے زیر اثر عوامی مادی شعور میں غیر معمولی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ذہنی مریضوں کے علاج و معالجے کے دوران فرائڈ پر انسانی اذہان کی خفتہ مادی قوتوں کا انکشاف ہوا اور اس لئے ذات اسفل (LIBIDO) کو جنسی اور مادی قوتوں کا محرک ٹھہرایا۔ مارکس اور فرائڈ کے نظریاتی ہم نواؤں میں فلسفی، ادیب اور شاعر شامل تھے۔ تخلیقات ادب میں معاشی ناہمواریاں اور نفسیاتی الجھنیں بھی شامل بیان کر لی گئیں۔

شاہوں کے دور حکومت میں بادشاہ اور امیر زادے کہانی کا کردار تھے۔ جن کا نفسی اور جنسی اخلاقی کردار متعین نہ تھا۔ صوفیائے کرام حکایتیں اور تماثیل کے ذریعے عوام و خواص کے قلب و نظر کی تالیف و تربیت میں مصروف تھے۔ مگر جمہوریت کے آتے ہی عوام و خواص، بادشاہ اور فقیر ایک ہوئے۔ اخلاقی اور تمدنی موضوعات کی جگہ عوامی خواہشات اور ضرورت نے لے لی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، تخلیقاتی موضوعات شعور اقتدار کے زیر اثر ہی رہے ہیں۔ نظم جمہوریت نے حکومت کے اختیار عوام کو سونپ دئے اور عوامی زندگی کی محرومیاں اور معاشرتی مسائل ادب کا موضوع اور تخلیقی مقاصد قرار دئے گئے۔

لیکن انسان اپنی ذات کا اسیر ہوتا ہے اور اسے باہری دنیا سے صرف ایک حد تک ہی سروکار ہوتا ہے۔ وہ انہی معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے جو اس کی ضرورت اور خواہشاتی تکمیل میں معاون ہوتے ہیں۔ خود پرستی اور خود ستائی سے وہ جتنا قریب ہوتا ہے۔ ناامیدی اور تنہائی کا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تخلیقی عمل محض تخیلاتی پرواز اور شعوری محاکات کا اسیر ہوتا ہے۔ اخبار اور الیکٹرانک میڈیا اس سے کم وقت میں زیادہ معلومات فراہم کرتے ہیں لہٰذا تجربے اور مشاہدے پر ذاتی معلومات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ تحقیق اور جستجو کے لئے در در خاک چھاننے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ جام جمشید کی طرح، چشمہ شعور STREEM OF CONSCIOUSNESS میں اسے وہ سب دکھائی دیتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جدید نفسیاتی ادب فنکار کی اسی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے۔ جس میں فکر و نظر کے تشکیلی عناصر فنکار کی ذاتی شخصیت و کردار میں نمایاں ہوتے ہیں۔ کافکا اور ژاں پال سارترے کے ناولوں میں ناامیدی، یاسیت اور قنوطیت کے شعوری محاکات مکڑی کے جالے کی طرح متاع فکر و فن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر نفسیاتی بیانیہ کا صیغہ امر واحد متکلم ہوتا ہے۔ جس کی خوبی یہ ہے کہ فن کار اپنی ذاتی شخصیت کے شعوری پیکر تخلیقی واقعات و کردار میں شامل کرتا ہے۔ اس طرح واقعاتی تسلسل اور کردار نگاری کی مشکلیں اس پر آسان ہو جاتی ہیں۔ ایسی تحریریں ذہن کو ضرور متاثر کرتی ہیں مگر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

علوم سیاست نے انسان کو حقیقت پسندی کی طرف مائل کیا ہے۔ عوام کہانی میں خبر دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید افسانہ شعوری محاکات کے ذریعے اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت پسندی کے تقاضوں کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو تاثراتی فضا قائم نہیں ہوتی۔ تخیلاتی پیکر اور کیفیت جذبات کا بیان بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا شعوری علائم، تشبیہ، استعارہ، کنایہ کے متبادل بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ لسانیاتی یکسانیت سے بیانیہ کو آزاد کیا جا سکے۔ لیکن اقوام عالم خصوصاً مشرقی قومیں تحیر و استعجاب، رمز و کنایہ، تشبیہ و استعارہ سے بہت زیادہ شغف رکھتی ہیں۔ ان میں محیر العقل واقعات اور غیر ارضی افعال و کردار سے غیر معمولی حد تک دلچسپی پائی جاتی ہے۔ دادی اماں کی کہانیاں خواہ کتنی ہی غیر حقیقی کیوں نہ ہوں، بہر حال اچھی لگتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک خاص طور پر ہندوستان میں مذہبی قصے، کہانیاں لوگ صدیوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ اور ان کا یقین راسخ ہے کہ جو کچھ انہیں بتایا گیا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ وہ تصدیق نہیں تسکین چاہتے ہیں

حقائق خواہ کتنے ہی واضح کیوں نہ ہوں، جذباتی وابستگی اور نسلی عصبیت کے سامنے عقلی دلائل و شواہد کی اہمیت کچھ بھی نہیں۔ انسانی کردار میں عوام خدائی اوصاف کے قائل ہیں۔ حقیقت پسندی سے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ لہٰذا شتر مرغ کی طرح وہ اپنا سر ریت میں چھپا کر خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔

آج بھی ہندوستانی معیشت دیہی پیداوار پر منحصر ہے۔ شہری آمدنی کے وسائل محدود ہیں۔ آبادی زیادہ ہے اور جدید صنعتوں کا فروغ بہت کم۔ تعلیم یافتہ افراد بھی بے کاری اور بے روزگاری کے خوف سے پریشان رہتے ہیں۔ اہل سیاست اور انتظامیہ اپنے فرائض سے غافل۔ ان حالات میں حقیقت پسندی عوامی دکھوں کا مداوا نہیں ہو سکتی۔ نفسی اور مادی حقیقتوں کا بیان صنعتی طور پر ترقی یافتہ ذہنوں کے لئے تسکین انا کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ وجہ یہ کہ ہزار دانشوری کے باوجود انسان کو تحیر اور استعجاب میں مبتلا ہونا اچھا لگتا ہے۔ شاید اس حقیقت کو مشرقی داستان گو بہتر طور سے سمجھتے تھے یا پھر الیکزنڈر ڈوما، رائڈر ہیگرڈ اور چارلس ڈکنس کو کون جانتا ہے؟

ادب جب خیال، نظریہ فکر و فلسفہ ہوتا ہے، تب وہ سیاست نفس کا ترجمان ہوتا ہے۔ لیکن برِ اعظم ایشیاء میں خدا کے نیک نفس بندے جنہیں اپنے نفس پر اختیار حاصل تھا اور وہ نفس مطمئنہ کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ سیاست و حکومت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے محض انسانی قلب و نظر کی تالیف پر خصوصی توجہ مرکوز کی اور انسان کو بے لوث محبت، اخوت و ہمدردی کی آفاقیت سے واقف کرانے کی غرض سے تخلیقات ادب پیش کیں۔ جس کی کوئی نظیر مغربی ادب میں نہیں ملتی۔ اس ادب کو مغربی فلسفیانہ اصطلاحوں کی مدد سے سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ سیاست نفسی سے اس ادب کا کوئی سروکار نہیں۔ "کاہے کو بیاہی بدیس، بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا۔" ان گیتوں کی معنویت جذبے کی صداقت اور تہذیبی قدروں میں پوشیدہ ہے۔ ان پر کسی مقصدیت کی مہر ثبت کرنا یا انہیں صنعتی معاشرہ سے خارج کرنا اپنی پہچان اور شعوری بے گانگی کی دلیل ہوگی۔ مغربی معاشرہ اگر ایسے گیتوں سے خالی ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے، ہمارا نہیں۔

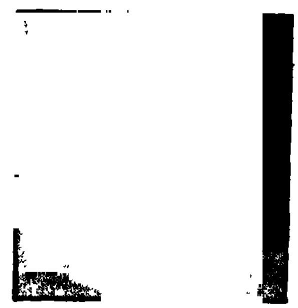
غزل کے اشعار شاعر کے ذاتی مطالعے، تجربے، مشاہدات نفس اور شدت احساس پر مبنی ہوتے ہیں۔ دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنا ہوتی ہے۔ بحر اور اوزان کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ شعوری دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ شاعر کے لئے لفظوں کا انتخاب بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ متصوفانہ شعور و عمل اور سیاستِ نفسی، قومی اور نسلی عصبیت، ذاتی محرومیاں، جمالیاتی تصور زندگی اور مادی حقائق سب کچھ شعوری اور لاشعوری طور پر آپس میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ شدت احساس قلم کے راستے باہر بھی آنا چاہتا ہے تاکہ جذباتی ہیجان کم ہو سکے۔ مگر اصطلاحی نظام عمل، تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور دیگر جزویات زبان اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے کردار و شخصیت کی استعدادی قوت کو بروئے کار لا کر ضبط و تحمل اور فکری توازن عمل کے ساتھ ایک ایک مصرعہ کہتا ہے۔ مقصدیت اور حقیقت پسندی کے اجزائے تعمیر اگر شاعر کی شخصیت میں پہلے سے موجود ہیں اور ان کی بنائے قلب و نظر مضبوط ہے تو اس کے اثرات خود بخود تحریر میں منتقل ہو جاتے ہیں گویا ایک دریا ہے جس کا پانی ریت، مٹی، پہاڑ اور چٹانوں میں پوشیدہ معدنیاتی اور نباتاتی خواص سے معمور بہتا ہے اور زمینیں سیراب ہوتی جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں غزل موجودہ تہذیبی رجحانات سے سخت نالاں ہے اور جو لوگ اس کے مزاج اور مقررہ معیار سخن کے برخلاف اشعار کہتے ہیں انہیں وہ اپنی غنائیت اور لطف بیان سے محروم کر دیتی ہے۔

مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور حکایت کے موضوعات شاعر کے ذہن میں پہلے سے مختص ہوتے ہیں۔ ان پر قوت ارادی کا مضبوط پہرہ ہوتا ہے۔ قوت شعور، خیال، فلسفہ نظریات و مشاہدات کی رہنمائی کے لئے پوری طرح تیار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اردو زبان و ادب کے متصوفانہ اصطلاحی نظام عمل کی متعین کردہ تہذیبی اور لسانی قدریں، لاشعوری محرکاتِ عمل کے ذریعہ پانی کی طرح رس رس کر قوت متخیلہ، ارادہ اور اختیار میں جذب ہو جاتی ہیں۔ جس سے تخلیقی قوت احساس میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے شعری محاسن بھی دمک اٹھتے ہیں اور جذبے کی صداقت میں کیف و سرور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

مشرقی شعور ادب، بیراگ، رہبانیت اور تصوف کی کرشمہ سازی ہے۔ اس کے برعکس مغربی ادب، سرمایہ دارانہ صنعتی شعور کا پیدا کردہ نفسیاتی عمل ہے۔ دونوں میں تفاوت کے باوجود اپنی اپنی طرز سیاست کے لئے وفاداری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ امراء اور رؤسا کی سرپرستی میں جس ادب کی تخلیق ہوئی اس میں شاہوں کی مدح سرائی اور نسلی تفاخر کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن خدائی بادشاہت کے قائل درویش زندگی کی عرفانی صداقتوں پر یقین رکھتے تھے۔

ہمارے دور میں ادبی مقاصد سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ تخلیقات ادب میں زندگی کی مادی ضرورتوں اور نفسیاتی صداقتوں کا اظہار ملتا ہو۔ جس کے بارے میں منشی پریم چند نے کہا تھا "ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہم میں حرکت و عمل پیدا کرے، سلائے نہیں۔ کیوں کہ اب اور سونا موت کی علامت ہوگی" پریم چند سے قبل سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے فنکار کو تخیلاتی دنیا سے باہر آ کر زندگی کی مادی حقیقتوں کو عام کرنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن ترقی پسندوں نے مارکسی نظریات کے زیر اثر معاشی نابرابری کو اہمیت دے کر ادب میں ایک نئے مادیاتی شعور سیاست کو متعارف کیا تھا۔ دوسری طرف جدیدیت کے پیروکار نفسیاتی شعور و عمل کی توجیہات میں مصروف کار ہو گئے۔ یہ سبھی تعلیم یافتہ افراد مغربی فن و فلسفہ سے آزادیٔ فکر و فہم کا درس لے رہے تھے۔ لہٰذا جو کچھ وہاں نہیں تھا اسے وہ اپنے معاشرے میں کہاں دیکھ سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی فن و فلسفہ پر مغربی نفسیاتی شعور فکر حاوی ہو گئی اور آزادانہ غور و فکر کی راہیں مسدود ہو گئیں، اور شعلۂ عشق سیاہ پوش ہو گیا!

[باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھئے]



کاوش عباسی

ہم شعر لکھتے ہیں

ہم شعر لکھتے ہیں
ہم شعر پڑھتے ہیں
جو شعر لکھتے نہیں ہیں
وہ شعر پڑھتے نہیں ہیں
اگر پڑھنے (یا سننے) لگتے ہیں
تو جلد ہی آپ لکھنے بھی لگتے ہیں
اور شاعروں کو وہ پڑھتے نہیں
جن جریدوں میں چھپتے ہیں شاعر وہ بکتے نہیں
جن میں چھپتے ہیں افسانے جاسوسی یا کچھ بہت پیاس کے
وہ بکتے ہیں اور ایسے بکتے ہیں ملتے نہیں
جیسے مرے دیش میں کلاشنکوف اتنی چلتی ہے رکتی نہیں!
جن جریدوں میں چھپتے ہیں شاعر وہ بکتے نہیں

● P.O. BOX 8080 RIYADH - 11482 (K.S.A.)

حیدر قریشی

ماہیے

دن تیس مہینے میں
درد جدائی کا
بڑھتا گیا سینے میں

☆

کوئی سال نہیں بدلا
باون ہفتوں کا
جنجال نہیں بدلا

☆

بن باس نہیں جاتا
گہری جدائی کا
احساس نہیں جاتا

☆

مری چاہت کھو گئی ہے
شاید سونے کی
لنکا میں سو گئی ہے

☆

اب جینا وبال ہوا
ان سے جدائی کا
ہر لمحہ محال ہوا

● AUF DER ROOS -7,
65795 HATTERSHEIM I
GERMANNY



ابراہیم اشک

رباعیات

جینے کا اسے کوئی قرینہ ہی نہیں
باتوں کا اسے کوئی سلیقہ ہی نہیں
اے اشک نہ سمجھے گا وہ سمجھانے سے
جاہل سے مباحث کا نتیجہ ہی نہیں

جو فن ہے اسے فن کی طرح تولا ہے
سچ یہ ہے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے
اے اشک نہیں روک سکیں مصلحتیں
بے باک کہا ہم نے جو منہ کھولا ہے

مضمون سے پہلے کوئی تمہید لکھو
گمراہ کوئی ہے اسے تاکید لکھو
تنقید کا فن سچ کی کسوٹی ہے میاں
سچ بولنا آجائے تو تنقید لکھو

ہر بات کی پہلے سے شہادت ہوگی
بنیاد اگر ہے تو عمارت ہوگی
حالات زمانے کے بتادیتے ہیں
کیا وقت کے ماتھے پہ عبارت ہوگی

تفصیل محبت کی بہت مشکل ہے
تمثیل محبت کی بہت مشکل ہے
یہ کام تو صدیوں میں کرتا ہے کوئی
تکمیل محبت کی بہت مشکل ہے

● 402, HILL VIWE APTS., RASHEED
COMPOUND, KAUSA MUMBRA,
THANE-400 612 (MS.)

نعیم کوثر
31 - SHIMLA HILLS
BHOPAL (M.P.)

نئی گوشالہ



نربھے سنگھ "رسّی جل گئی پر بل نہ گیا" جیسے طرحدار راجپوت تھے۔ لال گالوں پر سانپ کے پھن کی طرح لہراتی سیاہ مونچھیں، خوبصورت آنکھوں میں خاندانی آن بان کی آب و تاب، چوڑی پیشانی پر زعفرانی رنگ میں سفید چاول کا دانہ موتی کی طرح دمکتا تو آس پاس کے گاؤں کے آسمان پر دھنک سی پھیل جاتی۔ سفید گھوڑے پر سوار کمر سے سر کے اوپر تک تنی ہوئی ۳۱۵ بور کی نالی والی رائفل کے ساتھ جب وہ نکلتے تو لوگ سہم کر سڑک کے کنارے یوں سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے جیسے بارش کے بوندوں کی مار کھا کر چھوٹے پودے سرنگوں ہو گئے ہوں۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی ٹھاکر نربھے سنگھ نے آج تک نہ تو کسی پر اپنی رائفل تانی اور نہ ہی کسی کو رسّی سے باندھ کر کوڑے مارے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رقص کرتی تھی اور ہونٹوں سے ہمدردی کے بول ابلتے تھے۔ نربھے سنگھ خاندانی اور پائے کے راجپوت تھے ان کے پُرکھوں نے ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں سورمائی کے جوہر دکھائے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد جب پورے دیش میں آزادی نے سب کو برابری کا حق دے دیا تو بھی نربھے سنگھ کی کئی گاؤں میں پھیلی ہوئی کاشتکاری پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی غریب کسانوں اور کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں آگے بڑھ کر ہاتھ بٹانا نربھے سنگھ کا معمول تھا یہی وجہ تھی کہ دور دور کے گاؤں میں ان کی عزت اور مان تھا۔

نربھے سنگھ ویسے تو سب ہی سے پریم اور اچھا سلوک کرتے تھے لیکن ان گنت مویشیوں اور ڈھور ڈنگر میں گائے اور بیلوں سے دیوانگی کی حد تک چاہت تھی۔ گائے، بچھڑوں اور بچھڑیوں کو اپنے سامنے دانہ اور گھاس ڈلواتے، گھنٹوں ان کی کمر اور سر سہلاتے۔ طرح طرح کے نام رکھ چھوڑے تھے اور جسے نام سے پکارتے وہ گردن اٹھا کر نربھے سنگھ کو پیار بھری آنکھوں سے نہارتی۔

نزہت سنگھ ان کا اکلوتا بیٹا چار سال کا ہوا تو اپنی بیوی کی ممتا کا گلا گھونٹتے ہوئے اسے دہرہ دون کے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ عیسائی مشنری کے اس اسکول کی پورے ملک میں شہرت تھی جہاں بڑے اور کروڑ پتی لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔

"آپ نے نزہت کو وہاں بھیج کر مجھ پر بڑا انیائے کیا ہے!"

پاگل مت بنو ٹھکرائن۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ تلواروں کو زنگ لگ گیا اب تو قلم کی دھار کا دور دورہ ہے!"

"پرنتو میں تو اتنی بڑی حویلی میں اکیلی رہ گئی ہر چیز کاٹنے کو اتارو ہے۔!"

"ارے یہ گائیں اُن کے مستی کرتے بچھڑے۔ بچھڑیاں، سیکڑوں ایکڑ زمین پر لہلہاتی فصل اور میں۔ سب کچھ تو ہے۔" نربھے سنگھ مونچھوں پر تاؤ دیتے رہے۔ مسکراتے رہے اور نزہت سنگھ دہرہ دون کی خوشگوار ہواؤں کے دوش پر انگریزی میں گِٹ پٹ کرتا رہا۔ چھٹیوں میں اپنے گاؤں آتا تو ماں کی بانہیں، باپ کا دلار، گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی پیتل کی گھنٹیوں کی آوازیں، اونچے آم کے پیڑوں سے ٹکراتی ہوا کی ٹھنڈی لہریں اور ندی پر موج مستی کرتے بچوں کی چیخ و پکار اس کے کانوں میں آگ کے انگارے اُنڈیل دیتی۔ وہ بجھا بجھا رہتا۔

"تجھے کیا ہو گیا میرے لال!" ماں کی آنکھوں میں فکر کی بوندیں ابھر آتیں

"۔ماں مجھے گاؤں میں اچھا نہیں لگتا۔!"

"دلو بیٹا۔ دو سال پہلے تک تیرے پاؤں حویلی میں نہیں ٹکتے تھے۔ صبح سے شام تک آم کے باغ ندی کے کنارے اور مویشی کے باڑے میں اچھل کود کرتا پھرتا تھا۔ آج تیرا من نہیں لگتا۔!" نربھے سنگھ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

پاپا مجھے اپنا اسکول اور ہوسٹل اچھا لگتا ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے میں مزہ آتا ہے۔"

"وہ تو اچھی بات ہے کنور بیٹے۔ لیکن یہ ہمارے پُرکھوں کی دھرتی ہے آبائی گاؤں ہے۔ یہ سب کچھ تمہیں سنبھالنا ہے۔"

"ممی مجھے یہ سب برا لگتا ہے۔ ہر طرف دھول اور گوبر کی بدبو۔!"

"راجہ بیٹے یہ تو سینکڑوں برسوں سے یوں ہی چل رہا ہے تمہارے پاپا اور دادا کے دادا۔ ہر کوئی یہاں پیدا ہوئے پلے بڑھے اور پریوار بڑھتا گیا۔!"

دونوں ماں باپ نزہت سنگھ کو سمجھاتے رہے لیکن نزہت سنگھ ہر بات سے اچاٹ، بجھا سا بیٹھا رہا۔ تبھی ٹھاکر نربھے سنگھ کا منیم گرم دھوپ سے جھلسا ہوا اندر آیا

"ٹھاکر سرکار۔ دو بیل اور بیٹھ گئے!

۔ کیا ہوا انہیں منیم جی!

۔ سرکار عمر پوری کر لی۔ بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں دو قدم نہیں چل سکتے!

۔ گوشالہ میں بٹھا دو۔ بہت خیال رکھنا یہ ہمارے پرکھوں کی نشانی ہیں زندگی بھر کھیتوں کی مٹی کو روندا ہے اب آخری وقت میں انہیں آرام دینا ہمارا دھرم ہے منیم جی۔!

نرپت سنگھ نے ماں کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے اوب کر کہا

"پاپا کو بھی بوڑھے بیمار گائے بیلوں کا میوزیم بنانے کا شوق ہے اور مجھے اس بات سے چڑھ ہے ممی!"

ماں کی آنکھیں بھر آئیں وہ تڑپ کر بولی

"۔ ایسا نہ کہو کنور بیٹے۔ بڑھے بوڑھے چاہے گائے بیل ہوں یا ماتا پتا ان کی دیکھ ریکھ اور سمان کرنا تو سب کا فرض بنتا ہے۔"

نربھے سنگھ غصے سے آرام کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگے وہ مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"۔ دیکھ لیا ٹھکرائن لاڈ پیار کا نتیجہ۔! کیا میں پرکھوں کی یادگار ان لاچار بیمار مویشیوں کو قصائیوں کے حوالے کر دوں۔ اچھے اسکول کی اونچی تعلیم نے اسے انگریز بنا دیا ہے۔ اسے سمجھا دو ہماری ریت رواج کو ہماری زندگی میں کوئی نہیں بدلے گا۔۔۔!"

نرپت سنگھ اسکول کی دیواریں پھلانگ کر کالج میں پہنچ گیا۔ ٹھاکر نربھے سنگھ اپنی خاندانی وراثت کی ریت رواج میں الجھے رہے اسی دوران ٹھکرائن نمونیہ میں پلنگ پکڑ گئیں اور پندرہ دن میں حویلی اور اس کے مکینوں کو بلکتا سسکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ نربھے سنگھ نے پانچ گائیں اور اتنی ہی بچھڑیاں کئی گاؤں کے مندروں میں بھینٹ کر دیں اور طے کر لیا کہ نرپت سنگھ کو ملازمت ملتے ہی وہ کھیتی باڑی فروخت کر کے اپنے بیٹے کے ساتھ ہی رہیں گے۔ ڈھلتی عمر کے سفر میں اب وہی تو واحد ان کا سہارا رہ گیا تھا۔ انہیں نرپت سنگھ کے شاندار مستقبل پر پورا یقین تھا اسکول اور کالج میں ہر امتحان میں سر فہرست رہنے کے بعد وہ صوبہ جاتی اعلیٰ سروس کے امتحان میں بیٹھ رہا تھا۔ اور ٹھاکر نربھے سنگھ رات دن پوجا پاٹھ میں جٹ گئے۔ گھنٹوں گئوشالہ میں بیمار لاچار گائے بیلوں کی سیوا کرتے اور ایک ہی رٹ لگاتے

"بھگوان میرا بیٹا اعلیٰ افسر بن جائے" ان کی دعائیں رنگ لائیں۔ نرپت سنگھ نے اس امتحان میں بھی بازی مار لی ہزاروں امیدواروں میں پہلے نمبر پر رہا ۔ نربھے سنگھ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ دور دور گاؤں میں مٹھائیاں بانٹیں اور اپنے گاؤں میں چراغ جلائے۔ نرپت سنگھ دہلی میں مرکزی سیکریٹریٹ میں انڈر سیکریٹری ہو گیا تو نربھے سنگھ نے سوچا اب وقت آ گیا کہ وہ گاؤں کی زمین حویلی اور مویشی بیچ کر دہلی میں مکان خرید لیں گے اور اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ زندگی کے باقی دن گذار دیں۔ نرپت سنگھ پہلے ہی سے گاؤں او مویشیوں سے دور بھاگتا تھا۔ باپ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے فور رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ٹھاکر نربھے سنگھ پرکھوں کی برسوں پرانی حویلی او سونا اگلتے کھیتوں کو کئی دنوں تک اپنے ہونٹوں سے چومتا رہا۔ بار بار مٹھ میں مٹی بھر کر آنکھوں کو سینکتا اور پھر ایک دن اس نے شہر کے دھنوا ساہوکار سے اپنی وراثت کا آخری سودا کر لیا اور ایک شرط رکھی کہ اس کی گ شالہ برقرار رکھی جائے۔ بیمار اور بوڑھے مویشی فروخت نہ کئے جائیں۔

نقدی کا بینک ڈرافٹ بنوانے اور ٹھکرائن کے وہ تمام زیورات جو اس ۔ اپنی بہو کے لئے رکھ چھوڑے تھے ایک مضبوط پیٹی میں سجا کر وہ دلی جانے تیار ہوئے تب ہی اسے نرپت سنگھ کا خط ملا جسے پڑھ کر نربھے سنگھ کے ہاتھور کے طوطے اڑ گئے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ نگاہوں کے سامنے باپ داداؤں کی ارتھیوں کے شعلے ناچنے لگے

"پاپا۔ کل رات نرسنگ ہوم میں آپ کی بہو کے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ پو۔ کی بدھائی۔۔!" ٹھاکر نربھے سنگھ دونوں ہاتھوں سے چھاتی تھامے گم صم بیٹھ رہے۔ حویلی کی اینٹیں انہیں منہ چڑا رہی تھیں

"ہائے رام ایک انڈا وہ بھی گندہ نکلا۔ چوری چھپے شادی بھی کر لی اور ا۔ پوتے کی بدھائی بھی!" اس بے کسی اور بے بسی میں ان کا دکھ بانٹنے والا بھ کوئی نہ تھا۔ نرپت کا خط بھی آگے ان سے پڑھا نہیں گیا۔ منیم جی کو آتے دیکھ کر وہ کچھ ہوش میں آئے۔

"ٹھاکر سرکار حویلی کا قبضہ کل دینا ہے۔ کھیتوں اور مویشیوں کو سپ کر دیا ہے۔ گئوشالہ کا انتظام مجھے سونپ دیا ہے۔ بڑا بھاگیہ شالی ہوں سرکار مگر آپ اتنے دکھی کیوں بیٹھے ہیں؟۔" ٹھاکر نربھے سنگھ نے اپنے لاڈلے خط منیم جی کی طرف بڑھا دیا۔

"۔ لو پڑھو۔!۔ ان کے کانوں میں جیسے لاوا ابھر چکا تھا۔

"پاپا۔ میں اور کملا آپ کی بہو صبح سے دفتر چلے جاتے ہیں۔ ابھی تو چھٹی پر ہے۔ دہلی میں بنگلوں پر موت برس رہی ہے۔ تنہا رہنے والے بوڑھے جوڑوں کا قتل ہو چکا ہے۔ اس لئے ہم نے آپ کے رہنے کا انتظا روٹری کلب کے رین بسیرا میں کر دیا ہے جہاں اسی کے قریب ریٹائ بزرگ مرد عورتیں بڑے سکھ سے رہ رہے ہیں۔"

ٹھاکر نربھے سنگھ تیزی سے منیم جی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گئوشالہ کی طرف بڑھے۔ "دیکھا منیم جی.. ہم... ہم جن کے پرکھے ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں شہید ہوئے وہ آج رین بسیرا میں رہیں۔۔۔ یہ ہے ہمارے اکلوتے ویر نرپت سنگھ کی گئوشالہ۔۔۔ نئے زمانے کے مجبور بزرگ ماں باپ کی آخری آرا گاہ۔ لعنت ہے منیم جی لعنت۔۔۔!" ★★



جینت پرمار

میں سوچتا ہوں یوں ہوا ہو
پنا نام تاروں پر لکھا ہو

نہروں میں اس سے سامنا ہو
، دھول سے سکہ ملا ہو

ندر کی آنکھیں کھول پیارے
کہرے میں کوئی راستہ ہو

ں کائناتیں میرے اندر
، اندر بھی کوئی جھانکتا ہو

ں بھی لگا خواہش کی لاشیں
، اندر کوئی دفنا رہا ہو

آتا نہیں ہے ہم کو لیکن
کے درمیاں بھی فاصلہ ہو

ں مانگتا ہے کون یارو
ی کی شاخ پر پتہ ہرا ہو

● 3-MADHUBAN APTS.,
VADAJ AHMADABAD-38
(GUJRAT)



شاہد اختر

خاک صحرا کی اڑانے سے بھی
فائدہ خود کو مٹانے سے بھی

عجز لازم ہے پسِ گفت وشنید
بات بنتی ہے بنانے سے بھی

اک تعلق ہے حقیقت سے مرا
اور تعلق ہے فسانے سے بھی

کون زیادہ ہے زمانے کے قریب
پوچھ لیتے ہیں زمانے سے بھی

دل کا ملنا تو مقدر کی ہے بات
ہم گئے ہاتھ ملانے سے بھی

کوئی اس جیسا ملنسار نہ ہو
ہم سے ملتا ہے زمانے سے بھی

کیا ملا آپ کو شاہد اختر
ہر طرف چھپنے چھپانے سے بھی

● MOH. SHAHPURA, SASRAM-
821115 (BIHAR)



شکور انور

ہر ایک جرمِ محبت اسے معاف ہوا
قصور میرا ہی نکلا حساب صاف ہوا

میں اس کے کہنے پہ کیوں آگ کو دھواں لکھتا
یہی سبب تھا مرا اس سے اختلاف ہوا

ندی میں جب کوئی پانی کا بلبلا پھوٹا
مجھے خود اپنی حقیقت کا انکشاف ہوا

میں سانحہ تو نہیں ہوں خود اپنی ہستی کا
شکستِ زیست کا کیوں مجھ کو اعتراف ہوا

پھر ایک تازہ غزل چھپ گئی مری انور
پھر ایک دوست پرانا مرے خلاف ہوا

● SETHANI CHOWK, SHRIPURA,
KOTA-324 006 (RAJISTHAN)

آغا گل
GUL HOUSE, PINNY ROAD
QUETTA-87300 (PAKISTAN)

اندھا دن

شہر سے دور بلندیوں پر پہاڑی سلسلوں کے اندر، گھنے درختوں سے گھرا۔ سویا سویا سا۔ بہت اچھا اچھا سا گاؤں اسے اکثر یاد آیا کرتا۔ جہاں کہیں حسن ہے، سکون ہے، آرام ہے۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ حسن کشمیر نہ ہوتا روٹیاں ہوتیں، زلف بنگال نہ ہوتی گنجی لڑکیاں پیدا ہوا کرتیں۔ مگر مٹھی بھر چاول ہوتے۔ وہ بھی سوچا کرتا گاؤں میں پرندے نہ ہوتے، گنگناتے چشمے نہ ہوتے تتلیاں بھی نہ ہوا کرتیں۔ مگر روزگار ہوتا۔ سب کے لئے۔

روزگار ہے بھی تو کہاں بدبودار شہروں میں، دھوئیں سے بھرے بازاروں میں، ڈرگز میں، گلیمر میں، جنگلوں میں، وردیوں میں، کمر سے پیٹی باندھنے میں، جیسے کتے کے گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا ہے۔ پٹے اور پیٹی میں فرق ہی کتنا ہے۔ پھر شہروں میں رہنا ہے کس قدر جان لیوا۔ انسان ہی انسان لاکھوں انسان۔HELL IS OTHERS

گاؤں کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔ ایسا جیتا جاگتا سکون جسے ہاتھوں سے بھی چھوا جا سکتا تھا۔ مگر گاؤں کے باسی شہر کی جانب نقل مکانی پر مجبور ہوئے جاتے تھے۔ گاؤں میں جمعرات کو میلے کا سا سماں ہوتا۔ عورتیں، بچے اور مرد، جوق در جوق چوب بی بی کے مزار پر حاضری دینے جایا کرتے۔ اپنے گناہ بھی بخشوا آتے۔ منتیں بھی مانتے۔ مرادیں بر آتیں تو نیازیں بھی چڑھاتے۔ مزار پہ گھنے درختوں کا سایہ رہتا۔ پر پیچ اور دشوار گذار پگڈنڈی بھی درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ آنا جانا بھی بہت بھلا لگتا۔ جیسے جنت کی سیڑھیاں طے کر رہے ہوں۔

اس کی عمر بھر کی کامیابیاں بھی چوب بی بی کے طفیل تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے چوب بی بی سے فرمائشیں شروع کر دیں۔ کیوں کہ اسے تو یہی بتایا گیا تھا کہ مالک اوپر آسمان میں رہتا ہے چوب بی بی گاؤں پر نظر رکھتی ہے۔ علاقے کا پورا اختیار اسے سونپ رکھا ہے۔ اس نے منتیں مانگ مانگ کر ریوڑیاں بانٹ بانٹ کر اپنا ہر کام نکالا۔ حتیٰ کہ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کر لی۔ کالج کی تعلیم کے لئے اسے بھی چچا زاد، ماموں زاد بھائیوں کی طرح گاؤں چھوڑنا پڑا۔ ماں باپ بہن بھائیوں سے جدا ہونے کی کوفت تو قابل برداشت تھی، مگر مزار سے دوری اسے زیادہ تکلیف دہ لگتی۔ ایک شفیق ہستی، اس کی ہر ضد پوری کر دینے والی، تحفظ دینے والی اب نظروں سے اوجھل رہا کرتی۔ جب بھی وہ گھر جا سب سے پہلے مزار پر حاضری دیا کرتا۔ جاروب کشی کرتا۔ اگر بتیاں کرتا۔ اس نے تعلیم مکمل کر لی تو نوکری بھی چوب بی بی نے دلوا دی۔ شہر میں رہنا اسے دشوار لگتا۔ کبھی کبھی تو سرد شاموں میں جنگل ا پکارنے لگتے۔ ایک مدھر منوہر الوہی شخصیت اپنے آسمانی حسن و جمال ساتھ من کی آنکھوں میں شاہانہ انداز میں اتر آتی "چوب بی بی" آنکھیں موند کر سر جھکا لیا کرتا۔ دل کہتا یہ شہر کے ہنگامے چھوڑ کر ای سکون گاؤں میں پلٹ جاؤ۔ مگر عقل کہتی سکون اور رعنائیوں میں رکھا کیا ہے۔ انسان سکون کھا نہیں سکتا۔ حسن سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ آنکھ انسان کو کچھ نہیں دیتیں۔ اچھا ہی ہوتا کہ انسان کی آنکھیں ہی نہ ہوا کر بہت موسم گذرے، بہت سال بیتے، مگر اس کا ذہن بٹ چکا تھا۔ آ گاؤں میں رہتا مزار کے آس پاس، آدھا شہر میں۔ کبھی یہ دونوں آدھے دھڑ والے بھوتوں کی طرح آپس میں لڑنے لگتے۔

ایک روز اچانک اطلاع پہنچی کہ دادای کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ف گاؤں آ جاؤ۔ شہر سے نکلتے نکلتے بھی رات ہو گئی۔ رات گئے وہ گھر پہ لالٹین کی زرد روشنی میں دادی بہت کمزور سی کھائی دے رہی تھی۔ داد کے آنسو ہی اس کی زبان بن چکے تھے۔ ہر کوئی دادی سے لپٹ رہا تھا۔ ا طفل تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ بھی جاتے ہی دادی سے لپٹ گیا "میں ن سے ملے بغیر مرنا بھی نہیں تھا" وہ پیار سے بولی۔ دادی کی عمر تو نوے بر کے قریب تھی۔ مگر محبتوں میں عمر کا عمل دخل نہیں ہوا کرتا۔

شہر سے ڈاکٹر بلوانے کی بات ہو رہی تھی۔ اگلی صبح اسٹریچر بھی سے منگوانے کا انتظام ہو چکا تھا۔ کیوں کہ دادی کی آرزو تھی کہ وہ آخر بار مزار پہ حاضری دے۔ اس کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اسٹریچر پہ باندھ لے جایا جائے۔

رات بھیگتی چلی گئی۔ برفانی چوٹیوں کے بھیڑیے دور بہت د کھوہوں سے باہر نکل رہے تھے۔ جنگل سائیں سائیں کر رہے تھے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اور اس کا بھائی رات کو دادی کے پاس رہیں۔

آدھی رات کے بعد وہ بھائی کو جگادے اور خود سو رہے۔ یوں سبھی کو دادی کی خدمت کا موقع ملتا رہے گا باری باری۔ سارا خاندان سو رہا۔ وہ دادی سے باتیں کرنے لگا۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی۔ لیکن گھروں میں روشنی کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ جبکہ دادی نے ہمیشہ اپنے کمرے میں لالٹین کو ترجیح دی۔
"بس مجھے اچھی لگتی ہے پیلی پیلی روشنی"
"میرا پیلا پیلا چہرہ اچھا لگتا جو تمہارے غم میں بن گیا ہے۔"
دادی مسکرادی۔ معاً اسے خیال آیا کہ رات بھر میں دادی سے چوب بی بی کے بارے میں تمام تفصیل معلوم کرلے۔ پہلے تو تعلیم تھی ہی نہیں۔ اللہ بھلا کرے انگریزوں کا جاتے جاتے بھی تعلیم تو دے گئے۔ چوب بی بی کے بارے میں پورا ایک کتابچہ بھی تو شائع کیا جاسکتا تھا۔ ثواب بھی ملے گا۔ عقیدت مند بھی خوش ہوں گے۔ دادی اس استفسار پہ بہت خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔
"اچھا تو سنو! تم پہلے انسان ہو اس کہانی کے سننے والے، میرے بچپن میں گاؤں کی ایک حسین و جمیل لڑکی بی بی ایک نوجوان جانو سے محبت کرتی تھی ان دنوں محبت کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اس دور میں بڑی پاکیزہ محبت ہوا کرتی تھی۔"
احتراماً وہ پوچھ نہ پایا کہ پاکیزہ اور STERIALIZED محبت کیا ہوا کرتی ہے۔ ایک مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں کوند گئی۔ اس نے دادی کے لبوں سے گلاس لگادیا۔ دادی نے ایک گھونٹ پانی پیا اور بات جاری رکھی۔ "جانو تھا تو بہت وجیہہ اور طاقتور، لیکن غریبی آڑے آئی انہوں نے بی بی بیاہ کر مال کمانا تھا۔ بی بی کے گھر والوں نے بہانے تراشے، بڑی حیل و حجت سے کام لیا مگر جانو کے عزیزوں کی جانب سے دباؤ بڑھتا رہا۔ آخر بی بی کے باپ نے یہ شرط رکھی کہ جانو برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر صرف ایک کلہاڑی لے کر جائے اور زندہ مارخور بغیر زخمی کئے، اپنی طاقت سے پکڑ لائے۔ گاؤں والوں نے بہتیرا روکا۔ مگر جانو نے شرط مان لی۔ وہ بڑی سی کلہاڑی کندھے پہ رکھ، ڈگ بھرتا پہاڑوں کی چوٹیوں کی جانب روانہ ہو گیا وہ کسی شیر کی مانند چھاتی تانے موت کی جانب خود ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس کی کلائی پہ پہلے سے بی بی نے ایک مشہدی رومال باندھ کر کہا تھا میری محبت تمہاری حفاظت کرے گی۔ بی بی رات دن عبادت میں مصروف رہا کرتی۔ اس کے چہرے پہ نور چھا گیا۔ مہینے گذر گئے جانو نہ لوٹا۔ نہ چرواہوں نے اسے کہیں دیکھا نہ ساربانوں نے۔ عام خیال تھا کہ بھیڑیوں کی نذر ہو گیا۔ تسبیحات اور وظائف سے بی بی میں روحانی طاقت آگئی۔ عورتیں اپنے بچے بچیاں لئے اسی کے پاس چلی آتیں۔ بس بی بی نے دو تین روز دم کیا تو بچہ تندرست۔ پھر ایک روز گاؤں والوں نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ جانو مارخور کے سینگ پکڑے پہاڑ سے اترا چلا آرہا ہے وحشی مارخور کسی پالتو دنبے کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ بہ رضا و رغبت۔ گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ لڑکیاں مبارکباد دینے بی بی کے ہاں چلی آئیں۔ لوگوں نے جانو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جوانوں نے گلے لگایا۔ لپٹ لپٹ گئے۔ ہر شخص جانو کی کامیابی پر فخر کر رہا تھا۔ جانو زخمی بھی تھا۔ لباس تار تار ہو رہا تھا۔ کلائی سے وہی رومال لپٹا ہوا تھا۔ اس کے انداز فاتحانہ تھے۔ بی بی کے بھائیوں نے مارخور ٹٹولا۔ واقعتاً جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ بھائی تو مان گئے۔ باپ نہ مانا اور صاف مکر گیا۔ جانو نے کلہاڑا ہاتھوں میں تولا، یوں لگا جیسے وہ سر بھی اتار دے گا ان کے۔ مگر اس نے پھر اپنے غصے پر قابو پا ہی لیا۔ لوگ جھگڑا کرنے کے لئے بڑھے بھی تو جانو نے انہیں روک دیا۔ اس مارخور کو تھپتھپایا۔ کلائی سے رومال اتار کر مارخور کے گلے میں باندھا۔ اور اسے پہاڑوں کے رخ پہ آزاد کردیا۔ بی بی کہاں تو خوشی سے گنگنا رہی تھی، یہ خبر پہنچی تو صدمے سے لمحہ بھر میں زرد ہو گئی۔ تیورا کر اسی جانماز پر جا گری۔ اس سے پہلے کہ سکتہ زدہ لڑکیاں اسے سنبھالتیں وہ خود اپنی ہی ہمت سے اٹھ بیٹھی۔ بی بی نے تسبیح توڑ پھینکی۔ عورتوں نے تبرکاً وہ دانے جلدی جلدی چن لئے۔ بی بی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔"
اس نے دادی کو پھر پانی پیش کیا۔ مگر قصہ ختم کئے بغیر وہ پانی لب سے لگانے کی روادار بھی نہ تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں خونخوار کتے پنجوں سے زمین ادھیڑتے پھر رہے تھے۔ برفانی بھیڑیے گاؤں کو گھیر چکے تھے۔ دادی ذرا متاثر نہ ہوئی۔ "تم فکر نہ کرو بیٹا یہ کتے یہ بھیڑیے صدیوں سے یونہی غراتے پھر رہے ہیں۔ کوئی کسی پر حملہ آور نہیں ہوتا۔ جیسے دن اندھا ہے، رات کا راستہ نہیں روک سکتا۔ پھر یوں ہوا کہ خدا کو ان کی محبت پر رحم آگیا اگلی صبح تو بی بی کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ سارے دوڑ پڑے پوچھا تو پتہ چلا کہ خدا نے بی بی کو چوب بنادیا ہے۔ بستر پہ لحاف کے نیچے بی بی کے قد کے برابر چوب پڑی تھی۔ اور جانو کو زمین نگل گئی۔"
اس کے ہاتھوں سے گلاس چھوٹ گیا، ایک چھناکا ہوا، پھر سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا۔
"جانو کی کلہاڑی مسجد کی چوکھٹ میں گڑی ہوئی تھی۔ دو جوانوں نے طاقت لگا کر کلہاڑی نکالی اسے احترام سے جنازے کے ساتھ لے چلے۔ عورتوں نے اس لکڑی کو یعنی چوب بی بی کو غسل دیا، کفن پہنایا۔ مردوں نے جنازہ اٹھایا۔ اور پہاڑی پر دفن کردیا۔ کلہاڑی پائنتی میں دفن کردی۔ چوب بی بی بلندی سے گاؤں پر نظر رکھے رہتی ہے۔ اس وقت تو سارا گاؤں اس کے لئے رو رہا تھا۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔"
اندھیری ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ بتی ٹمٹمائی، کپکپائی اور کانپ کر دم توڑ گئی ہر طرف اندھیرے براج رہے تھے۔ بہت دیر بعد وہ بولا۔ "دادی دن کی طرح کہیں ہم بھی روشنی میں اندھے تو نہیں ہو جاتے۔ جیسے الو۔ جیسے چمگادڑ۔ ہم صرف اندھیرے میں ہی تو صحیح طرح دیکھ سکتے ہیں۔" ◆◆



احسان سہگل

عشق میں تڑپنے کی تب نظیر ہوتا ہے
دل کسی کی زلفوں کا جب اسیر ہوتا ہے

اور کسی کے بارے میں سوچتا نہیں ہے وہ
خواہشوں کا اپنی ہی جو سفیر ہوتا ہے

اور بھی حسیں ہوتے ہیں مگر مرے نزدیک
یار میرا محفل میں بے نظیر ہوتا ہے

لوگ دوسرے تو تسلیم کرتے ہیں اس کو
لیکن اپنوں ہی میں اپنا حقیر ہوتا ہے

سوچتا ہے جو اوروں کی بھلائی کا ہر دم
اپنی ذات میں وہ ہی تو منیر ہوتا ہے

اپنی خامیاں کیسے دیکھے نکتۂ فن میں
شخص جو رسالے کا خود مدیر ہوتا ہے

وہ سمجھ نہیں سکتا آج کی نئی باتیں
اس لکیر کا سہگل جو فقیر ہوتا ہے

● VONDELSTARANT-5, 2513 EN
THE HAGUE, HOLAND



مظہرؔ محی الدین

زمیں کی رونقیں کردیں نہ پائمال مجھے
تری پناہ میں رکھ ربِّ ذوالجلال مجھے

چمن میں رہ کے بھی سیرِ چمن سے سیر نہیں
دیارِ ہوش ربا سے کبھی نکال مجھے

سفر زمیں کا نہیں آسماں کا ہے در پیش
میں ٹوٹ پھوٹ نہ جاؤں کہیں سنبھال مجھے

بقدرِ ظرف ملی ہے تونگری دل کو
زمانہ پھر بھی سمجھتا ہے خستہ حال مجھے

برہنہ پا ہے سفر تپتے ریگ زاروں کا
شکستہ پائی کا احساس خال خال مجھے

ابھی تو مرحلۂ بدر بھی نہیں آیا
ابھی سے خوفِ سفر، زندگی سنبھال مجھے

● ALTAF TRADERS, SHAH BAZAR,
HUBLI-580020 (KARNATAKA)

مسعود احمد

ہوائے دشت ترا زور توڑ دیتے
سلگتی ریت پہ آنکھیں نچوڑ دیتے

یہ جیتے جی نہیں ممکن، کوئی سبیل
تو ہم ابھی سے ترا ساتھ چھوڑ دیتے

معاملاتِ محبت پہ بات کرتے ہو
وہ گفتگو کو سلیقے سے موڑ دیتے

یہ بے ہنر جنہیں شیشہ گری نہیں
دلوں کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑ دیتے

ترے خطوط میں لپٹے ہوئے گلاب کے پھ
کبھی کبھی تو مجھے توڑ پھوڑ دیتے

38-ZAFAR COLONY, OKADA
(PAKISTAN)



حیات عامر حسینی

DEPT. OF PHILOSPHY A.M.U. ALIGARH (U.P.)

فلسفہ فن اور جمالیات

کچھ اہم مسائل

(۱) شاعری ایک جمالیاتی معروض ہے۔ یہ بیان ہمارے لئے کئی طرح کے سوال پیدا کرتا ہے۔ مثلاً جمالیاتی معروض سے کیا مراد ہے ؟ کیا جمالیاتی معروض ان تمام معروضات پر محیط ہے جو جمالیاتی تجربات کی تشکیل کرتے ہیں؟ اور جمالیاتی تجربے کے کیا معنی ہیں وغیرہ۔

(۲) کچھ لوگ "جمالیاتی تجربہ" کے وجود سے ہی منکر ہیں حالانکہ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ 'جمالیاتی حکم' AESTHETIC JUDGEMENT کا امکان ہے وہ یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ "جمالیاتی احکامات" کے دفاع میں دلائل بھی دیے جاسکتے ہیں۔

(۳) اس طرح کے اقرار سے ہمارے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان تمام "معروضات شعور" "دلائل" کو بھی "جمالیاتی معروض" کا حصہ مانا جائے یا اس کے ساتھ شریک سمجھا جائے۔

(۴) جمالیات، فلسفہ، سائنس کی طرح ("اس کے کیا معنی ہیں؟ اور آپ یہ کیسے جانتے ہیں" یعنی) علم سے متعلق سوال اٹھاتی ہے۔ (اس طرح یہ اپنا تعلق علمیات EPISTEMOLOGY سے قائم کرتی ہے) یوں "جمالیاتی اقدار" اور 'جمالیاتی تجربات' اور دوسرے اہم تصورات جن کا تعلق فلسفہ فن سے ہے ایسے اہم سوال مثلاً کون سے خصائص یا کیفیات ایک شئے کو خوبصورت بناتے ہیں؟ کیا جمالیاتی معیارات کا کوئی وجود ہے؟ اور "تخلیقی کام" کا فطرت سے کیا تعلق ہے؟ یہ کس کو جنم دیتے ہیں۔

(۵) جمالیات اور فلسفہ فن بہت سے اہم مسائل اور سوالات کو جنم دینے اور ان پر متفق ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے متغائر ہیں۔ فلسفہ فن ان تصورات اور مسائل سے بحث کرتا ہے جو تخلیقی کاموں اور تخلیق، کے تعلق سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان اہم سوالات سے بھی بحث کرتا ہے جن کا بنیادی تعلق جمالیات سے ہے مثلاً فنی اظہار کیا ہے؟ کیا تخلیقی کاموں میں کوئی، حقیقت یا "سچائی" ہے؟ فنی علامات سے کیا مراد ہے؟ تخلیقی کام سے کیا مراد ہے؟ تخلیقی عمل کسے کہتے ہیں؟ کیا فن کی کوئی توجیہ و تعبیر کی جاسکتی ہے؟ اور فن کی توجیہ و تعبیر کے کیا معنی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ

(۶) اس کے باوجود یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم فلسفہ فن اور "فنی تنقید" میں فرق کریں جس کا کام محض فن یا فنی معروض یا تخلیق کی "تنقیدی تحلیل ہے" ان تصورات کی تحلیل یا ان پر بحث جو فنی تنقید کے دائرہ کار میں آتی ہے یا جن سے فنی تنقید استفادہ کرتی ہے، جمالیات سے متعلق ہے۔

(۷) یہ مسائل اس لئے پیدا ہو جاتے ہیں کہ "نقاد" اور "ماہرین جمالیات" "ان سوالات اور مسائل کو گڈمڈ کر دیتے ہیں جو فلسفہ فن کے دائرہ کار میں آتے ہیں (اسلئے ان تمام تصورات اصطلاحات اور سوالات کی صحیح فہم اور تحلیل ضروری ہے جو فلسفہ فن سامنے لاتا ہے)

(۸) ان اہم جمالیاتی سوالات کا جو فلسفہ فن کے ذیل میں آتے ہیں، کی تحلیل سے پہلے یہ لازم آتا ہے کہ اس بنیادی اور اہم سوال پر کہ "ایک شئے کو جمالیاتی طور پر دیکھنے سے کیا مراد ہے؟ سوچا جائے۔ یہ سوال اس اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ "اگر ایسا کوئی طریقہ یا نکتہ نظر ہے (جس کے ذریعہ ہم ایک شئے کو جمالیاتی طور پر دیکھتے ہیں) تو اس میں اور دوسرے طریق اور نکتہ ہائے نظر میں جن کے ذریعہ اشیاء کو دیکھا جاتا ہے، کیا فرق ہے؟ غور سے دیکھا جائے تو یہ سوال (جس کا اوپر بیان ہوا ہے) بھی اپنے طور پر اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ پہلے اس کی نوعیت اور اس سے کیا مطلوب و مراد ہے؟ کو واضح طور پر سمجھا جائے۔

(۹) مذکورہ بالا سوال کے بارے میں بھی کئی متغائر اور اہم نکتہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں۔ ارمسن (URMSON) اور اس کی قبیل کے مفکرین نے کسی منفرد اور مخصوص جمالیاتی زاویہ نظر سے انکار کیا ہے۔ ان کے خیال میں جمالیات کے منفرد خصائص کسی مخصوص رویے یا تجربے کے بجائے ان دلائل میں پوشیدہ ہیں جو فن سے لطف اندوز ہونے والے اپنے فیصلوں کو قوی بنانے کے لئے دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک فن پارے کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا اور مختلف طریقوں سے سمجھا جاسکتا ہے جن کے داخلی محرکات بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

یوں جمالیاتی اور غیر جمالیاتی رویہ فن پارے کے ادراک پر مشتمل نہیں بلکہ ان وجوہ اور اغراض پر منحصر ہے جن کی بنا پر آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

(۱۰) لیکن اس کے علی الرغم دوسرے مفکرین نے اس ضمن میں جو متغائر نظریات پیش کئے ہیں وہ یوں ہیں۔

الف: افادی یا عملی:۔یعنی دنیا کو افادہ یا استعمال کی غرض یا نظر سے دیکھنا۔

ب: جمالیاتی نکتہ نظر یا رویہ:۔یعنی ایک خوبصورت شئے کو محض اس کی خوبصورتی کی وجہ سے دیکھنا چاہے اس کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو اس رویے کے ماننے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی خوبصورت شئے کو اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ یہ ہمیں فرحت، سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ پھر یہ عملی نقطہ نظر ہی ہوا۔ مگر ایسا نہیں [illegible] کیونکہ اس بیان میں (خوبصورت بمعنی محض خوبصورتی) اور اس بیان میں (کہ ایک خوبصورت درخت ہمارے گھر بنانے کے کام آتا ہے) ایک واضح [illegible]

[illegible]:۔اس میں اور جمالیاتی نکتہ نظر میں بھی بڑا واضح فرق ہے۔ مثلاً کسی آثار قدیمہ، عمارت یا باغ وغیرہ کو اس لئے دیکھیں کہ اس سے ہمارے [illegible] اضافہ ہوتا ہے (مثلاً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا طرز تعمیر کیا ہے، اس میں کیا مصالحے اور چیزیں استعمال ہوئی ہیں، یہ شئے کتنی پرانی ہے وغیرہ)

د: شخصی نکتہ نظر:۔یعنی ایک جمالیاتی شئے کو اس تعلق سے دیکھنا کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہے یا اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے مثلاً ایک ڈرامہ یا فلم کو اس غرض سے دیکھنا کہ اس کے ہیرو اور مجھ میں کیا مطابقت اور مماثلت ہے؟

(۱۱) علیحدگی کے غیر ضروری اور ناقابل فہم رویہ کو بھی ایک جمالیاتی رویہ کے طور مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس بات سے انکار ایک ناقابل فہم بات ہے کہ ایک انسان کسی بھی شئے سے محظوظ یا لطف اندوز ہوتے ہوئے اس میں ایک حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ لیکن ایک شخص، ایک فلم یا ڈرامہ کو دیکھنے سے پہلے یا بعد میں، یا کبھی دیکھنے کے دوران جب اس کی توجہ اس سے ہٹ جائے یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ محض ایک ڈرامہ یا فلم ہے۔

(۱۲) غیر جانبداری کا رویہ بھی کم و بیش اس طرح کا معاملہ ہے۔ ایک شخص ایک فلم، ڈرامہ، نظم یا مجسمے کے بارے میں اپنی (رائے یا فیصلہ دیتے ہوئے) غیر جانبدار تو رہ سکتا ہے لیکن جب تک وہ کسی نظم، ڈرامہ، تصویر یا مجسمہ کو سن یا دیکھ رہا ہو وہ اس کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے دوران اس کا اپنا ایک مخصوص رویہ ہوتا ہے۔

(۱۳) ایک فن پارے کو دیکھنا یا اس سے لطف اندوز ہونا بجائے خود ایک گنجلک اور پیچیدہ عمل ہے یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک نظم ڈرامہ تصویر یا مجسمے کو سمجھنے کے لئے اس پورے منظر نامے (واقعات روایات۔ تاریخ و تہذیب) سے آگاہی ضروری بن جاتی ہے جن کا اس میں اظہار ہوا ہے یا جو اس کے دل و روح کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ اس (آگہی) کے بغیر فن اور اسے دیکھنے والے کے درمیان ایک قسم کی دوری قائم ہوتی اور رہتی ہے، جو اس کی فہم یا اس سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ دوری نفسیاتی بھی ہوتی ہے اور سماجی، مذہبی، تاریخی اور تہذیبی بھی۔

(۱۴) جمالیاتی رویہ ہمیشہ معروضی مظہر سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھنا انتہائی ضروری ہے کہ معروضی ہے کیا؟ یہ (کلی) طور پر جسمانی شئے نہیں ہوتا۔ جسمانی مظاہر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے بغیر کوئی فن پارہ معرض وجود میں نہیں آسکتا لیکن ادراکی خصائص کو ہے نہ کہ ان جسمانی خصائص کو جو اس کے ادراک کو ممکن بناتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم کو لے لیجئے۔ اس کے مطالعے میں یا اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم محض اس کے مجرد الفاظ کو نہیں دیکھتے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کے داخلی معنی اور اظہارات کیا ہیں۔ ان میں کیا کیا حقائق پوشیدہ ہیں۔ یہ کن کیفیات اور جذبات و احساسات کو جنم دیتے ہیں۔ ان الفاظ کے قالب میں کون سی تشبیہ اور کون سا استعارہ ڈھلا ہے یا ڈھالا گیا ہے۔ الفاظ کے خارجی اور لغوی معنی سے انکار ممکن نہیں لیکن ایک نظم کی الگ اور منفرد حیثیت ان کے اندرونی معانی میں پیوست اور ان کے ذریعہ تعمیر ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان تمام اجزاء و معانی کا احاطہ کیا جائے تاکہ اس (نظم) کی جمالیاتی شناخت ممکن ہو۔

(۱۵) جمالیات کا تعلق محض ادراکی مظاہر سے نہیں بلکہ ان تجریدی مظاہر سے بھی ہے جن کا تعلق ریاضی اور منطق سے بھی ہے۔ ان کا "لطف و احساس" بہت ہی اعلیٰ پائے کا ہے۔

(۱۶) ادب میں جمالیاتی مظہر کوئی مدرک نہیں ہوتا بلکہ وہ معنی ہوتے ہیں جو اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معنی کا کوئی جسم یا مادی مظہر نہیں ہوتا۔ یوں ادب اور دوسرے فنون لطیفہ میں ایک واضح فرق پیدا ہوتا ہے۔

(۱۷) یہ مسئلہ کہ نقاد فن کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں یا جن تصورات اور اصولوں کی بنیاد پر فن کی تحلیل کرتے ہیں یا جو تصورات وہ سامنے لاتے ہیں، ان کی حیثیت کیا ہے؟ جمالیات اور فلسفہ فن کے حوالے سے بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ جدید فکری اور تنقیدی کتب خیال جو ان سوالات سے بحث کرتا ہے یا جو ان پر محیط ہے "مابعد تنقید" کہلاتا ہے۔ یہ مکتب فکر جملہ تنقیدی بیانات کو جمالیات کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہے اس موضوع کے دائرہ کار کی کچھ توضیح کرتے ہوئے فلسفہ فن کے مسائل پر کچھ مزید بحث کریں۔

(۱۸) مابعد تنقید فن کے بیان، تشریح و تفہیم اور اس کی حیثیت کو اپنا موضوع بناتے ہوئے "فن کی تخلیق" "یا فن کے تخلیقی عمل" کے بجائے نمائندگی کرنے والی (تصویر) سے کیا مراد ہے؟ (مصوری کے حوالے سے) اور علامتی سے کیا مراد ہے؟ یا نظم میں تشبیہ سے کیا مراد ہے؟ (شاعری کے حوالے

سے)یعنی شاعری کے علامتی معانی سے کیامراد ہے؟یا "اچھا"۔ "بہترین"۔، "معقول" اور "معتبر" ہےایسے الفاظ کے معنی اوران کی حیثیت کیاہے؟جب ان الفاظ کااطلاق "فن" پرکیاجائے،ایسے سوالات سے بحث کرتی ہے۔

(۱۹) معنی کامسئلہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ لفظ "معنی" بجائے خود ایک کثیرالمعنی اور مختلف الجہت لفظ ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ سوال کرتاہے کہ اس کے کیامعنی ہیں توبات صاف نہیں ہوتی کہ کون سامعنی،مسئلہ یاان کی کون سی جہت،سوال کرنے والے کے ذہن میں ہے۔ ہمیں اس بات کوخصوصاًاحتیاط سے سمجھناضروری ہے کہ معنی کے متعلق کسی بھی سوال میں اور "معنی" کے کسی مفہوم میں "لفظ" کا معنی پوچھاجارہاہےیااس چیز کاجس کی طرف وہ اشارہ کررہاہے مثلاًلفظ "جنگ" یا "زندگی" کولیجئے۔ہم جب کسی سے یہ کہتے ہیں کہ تم نہیں جانتے کہ جنگ کیاہے توہم یہ مراد نہیں لیتے کہ وہ جانتاہی نہیں جنگ کیاچیز ہے۔ بلکہ ہم اسے یہ کہناچاہتے ہیں کہ اس سے پیداہونےوالے نتائج مثلاًغربت وافلاس،بربادیوں،ہولناکیوں اور تباہیوں سے وہ پوری طرح واقف نہیں۔اسی طرح زندگی سے مطلوب لفظ زندگی کالغوی معنی نہیں بلکہ مختلف توضیحات ہیں مثلاًزندگی کن عناصر سے مل کربنتی ہے؟یازندگی کامدعاکیاہے؟یااس دنیامیں انسان کی زندگی کامقصد کیاہے؟وغیرہ۔اسی طرح ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جوبہت ہی گنجلک اور مختلف الجہت ہیں مثلاًمادہ،تصور،روح،زماں،آدمی،پیار،فلسفہ وغیرہ وغیرہ۔

(۲۰)شاعری(فن)میں جن الفاظ کااستعمال ہوتاہےوہ بھی اسی نوعیت کے ہیں۔یہ الفاظ مختلف قسم کے جذبات واحساسات کوہم میں جگادیتے ہیں اور مختلف تشبیہات وتصورات کوہمارے ذہن میں منعکس کردیتے ہیں۔مثلاًلفظ "بحر" لیں اگر یہ ایک شعری لفظ ہے تو یہ شعری لفظ محض اس لئے نہیں کہ یہ ہمیں خوبصورت یااچھالگتاہے،بلکہ اس لئے ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کے معنی کیاہیں اوراس کی کتنی جہتیں ہیں۔یہ لفظ ہمارے ذہن میں خاموش سمندر یا بپھرے ہوئے بھیانک طوفانی سمندر کاتصور جگادیتاہے۔اس کی طوفانی لہروں،اس میں ڈوبتی ہوئی کشتیوں،اس میں ابھرتے یاڈوبتے ہوئے سورج کے عکس،یا پانیوں کاسینہ چیرتے ہوئے سمندری جہازوں اور کشتیوں،یاپرانے زمانے میں لنگرانداز ہوئے قافلوں اوران کی طوفانوں سے کشمکش،یاکسی شخص کابے پناہ تبحر علمی،اورنہ جانے کتنی ان گنت تشبیہات،تصورات اور خیالات کوہمارے وجود میں منعکس کردیتاہے۔

(۲۱) فلاسفہ جمالیات کاحسن اور فطرت کے مظاہرِ جلال وجمال میں دلچسپی کے علی الرغم یہ نظریہ جمالیات کوفلسفہ فن کی تنقید قراردیتاہے۔اس نکتۂ نظر کانمائندہ امریکی مفکر برڈس لے ہے۔

(۲۲) یوں ہم اس سوال کی طرف آجاتے ہیں کہ فن میں جوکچھ برتاجاتاہےاس کے معنی کیاہیں نہ کہ اس سوال کی طرف کہ فن کیاہے۔خیال رہے کہ یہ سوال اپنے اندر مختلف سوالات،مثلاًفن کی طبقہ بندی یااس کی قسمیں،یااس کے مختلف تصورات اور ذرائع ابلاغ وترسیل اوراس کی نمائندگی کرنے والی علامات وغیرہ کوچھپائے ہوئے ہے۔

(۲۳) جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ فن میں جوکچھ برتاجاتاہےاس کے کیامعنی ہیں توہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک تخلیقی کام سے کیامراد ہےاوراس کی کتنی جہتیں ہیں۔

(۲۴) تخلیقی کام کیاہے؟ایک پیچیدہ، مبہم اور پریشان کن سوال ہے اور یہ سوال اس وقت اور زیادہ پریشان کن بن جاتاہے جب یہ روایتی بیان سامنے آتا ہے کہ صرف "ادب میں معنی ہے" کیوں کہ جوعناصرادب کی تشکیل کرتے ہیں وہ اس معنی میں بامعنی ہیں کہ یہ عناصر دوسرے فنون میں نہیں ہیں مثلاًلفظ "شاہین" کے جومعنی شاعری میں ہیں وہ اسی وزن کی موسیقی کے سُر اوراس کی (علامت)خطِ منحنی میں روایتی طورپر نہیں ہیں۔

(۲۵) لیکن جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ تخلیقی کام کیاہے؟توہم روایتی علامتوں کی بات نہیں کرتے۔ہم شاید یہ پوچھناچاہتے ہیں کہ اس تخلیقی کام میں کیاپیش کیاگیاہے؟یایہ کس چیزیاکن چیزوں کااحاطہ کرتاہے۔شاید ہماراسوال یہ ہوکہ اس کابنیادی خیال کیاہےیااس کے قارئین پرکیااثرات ہیں؟لیکن معاملہ اتناآسان بھی نہیں ہے کیوں کہ جب ہم مصوری یاموسیقی کے حوالے سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کسی تصویر میں لکیروں یاموسیقی میں SYMPHONY کے کیامعنی ہیں؟کیوں کہ ان میں الفاظ کااستعمال نہیں کیاگیاہے بلکہ یہ اصوات اور رنگوں میں مشتمل ہیں(جب ہم ایک تجریدی تصویر کودیکھتے ہیں تو یہ عمل اور بھی مشکل بن جاتاہے)

(۲۶) یہ سوال کہ اس کی جہتیں کیاہیں؟اور بھی پُر فریب اور مشکل ہے۔فلاسفہ نے دوجہتوں یعنی حسّی اور صوری FORMAL VALUES کی عام طورپر بات کی ہے۔حسّی سے مراد محض ایک مظہر کی حسّی لطف اندوزی ہےاوراس میں فن اور فنی کام میں برتے ہوئے گنجلک اور پیچیدہ تعلقات اور معاملات یاتصورات اور جذبات کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔اس میں رنگ(مصوری)سُر(موسیقی)پتھر(سنگ تراشی)اورالفاظ(شاعری)فوری کشش کی چیزیں بن جاتی ہیں۔یہ سچ ہے کہ یہ معروض جسمانی اشیاء نہیں ہوتے بلکہ ان کی حسّی نمائندگی ہوتے ہیں۔

(۲۷) لیکن یہی چیزیں ہمیں صورتی FORMAL اقدار کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور ہم ان کے داخلی تعلقات،یاان میں پوشیدہ تصورات کی متوجہ

ہو،ا تجز ،

(۲۸) جمالیات کے سیاق وسباق میں "ہیئت" کے جو معنی ہیں وہ غیر جمالیاتی سیاق وسباق سے بالکل الگ ہیں۔ عام طور پر ہیئت سے مراد صورت لی جاتی ہے، لیکن ایسا نہیں۔ (مرئی فنون میں [بھی] اس کے معنی محض صورت کے نہیں ہیں) اس سے مراد ایک تخلیقی کام کے جملہ روابط و تعلقات اور تشکیل و تعمیر کا مربوط نظم ہے۔ علاحدہ علاحدہ جزئیات کو ہیئت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً ایک تصویر کو لے لیجئے اس کے تمام رنگ، لکیریں اور ان کے ذریعے ابھارے گئے نقوش، تصورات، جزیات و احساسات ایک "نظم" کی صورت میں اس کی ہیت کہلاتے ہیں۔ ساختی تنظیم ہیئت نہیں کہلا سکتی کیوں کہ ہیئت سے مراد محض ساخت نہیں۔

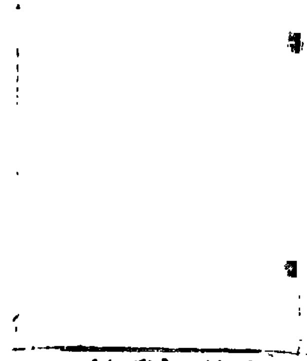
(۲۹) جب ہم ہیئت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد تمام مرئی اور غیر مرئی تشکیلات بھی ہوتی ہیں اور ایک فنی کام کے جملہ روابط و تعلقات اور ان کے اندر پوشیدہ جملہ تصورات و احساسات بھی اور ان کے معانی بھی۔ ایک جزیا عنصر مثلاً تشکیل یا شکل محض "اضافی" ہیئت ہے۔ مثلاً ہم ایک 'نظم' لے لیں محض اس کی تشکیلی ساخت مثلاً مسدس، مخمس اسے فن پارہ نہیں بناتی۔ مختلف تشکیلی اجزاء کا مربوط و منظم اتحاد ہی اسے ایک فن پارہ بناتا ہے کیوں کہ اس کا کوئی بھی حصہ (الگ طور سے) نہ تو یہ کام کر سکتا ہے اور نہ اسے وہ معانی عطا کر سکتا ہے جو اسے ایک مکمل فن پارہ بننے کے بعد مل جاتے ہیں مختلف حصوں کا آپسی ربط اور پھر ان کے داخلی تعلقات ہی اس کے معانی کو ظاہر کرتے ہیں اور اسے ایک فن پارہ بناتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جسم کے مختلف حصوں کی طرح فن پارے کے کچھ حصے زیادہ اہم یا زیادہ معنوی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں مثلاً اگر ہاتھ میں انگلی نہ ہو تو وہ جسم کے (وجود) کی نفی نہیں کرتی۔ لیکن یہ بات دل یا سر پر صادق نہیں آتی۔ لیکن یہ خیال رہے کہ محض دل، سر دھڑ یا ٹانگیں ایک جسم نہیں بناتیں ان سب اعضاء کا منظم و مربوط اتحاد ہی جسم کہلاتا ہے

(۳۰) نظم کی ظاہری ساخت [illegible] مکمل بھی ہو تو وہ بھی اس نظم کو مکمل فن پارہ نہیں بناتی۔ اس کے لئے [جسم میں روح کی طرح] اس کی معنوی ساخت بھی بہت ضروری ہے۔ ان دونوں کا اتحاد اور ارتقائی عمل ہی ایک فن پارے کو مکمل بناتا ہے۔ ارتقائی عمل کے ذریعے ہی فن پارے کو توازن مل جاتا ہے۔ اور ارتقائی عمل نام ہے قوتِ انجذاب، کشش اور اختلاف و اتحاد عمل کا۔ ✤✤

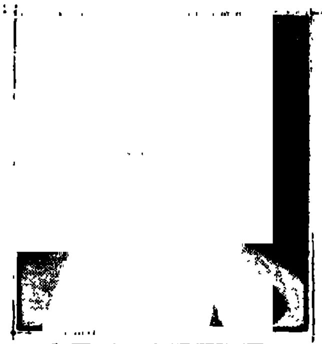
بقیہ صفحہ ۲۱ ادبی مقصد اور تحریک

جمہوریت، کمیونزم اور سوشلزم سبھی نظریاتِ سیاست و حکومت نفسانی خواہشات اور مادی ضرورتوں کا سماجی اظہار ہیں۔ ان کے مقاصد فکر میں کوئی تضاد نہیں اگر کوئی اختلاف ہے تو ملکیت اور سرمائے کی تقسیم پر۔ اور یہی اختلاف ادبی مقاصد کی توجیہات میں نمایاں ہوتا ہے۔ نظم سیاست کا پروردہ ادب مادی ضرورت اور خواہشات نفس کا ترجمان ہے۔ لہٰذا ادبی مقاصد اور حقیقت پسندی کا مفہوم ضرورت اور خواہشات کی تکمیل ہی ہو سکتا ہے۔ جملہ تحقیقاتِ ادب کا مقصد سیاست اور سرمائے کے مروجہ اصول و نظریات کو استحکام دینے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ حقیقت پسندی خواہ کتنی ہی بصیرت افروز اور فلاح انسانیت کے جذبوں سے معمور کیوں نہ ہو بہر حال مادی اور نفسی ضرورت کی ترجمان ہی رہے گی۔ حق و باطل کی تفریق میں سیاست ایک ترازو ہے اور اس کا معیار توازن، عدل و انصاف، اخوت اور محبت نہیں۔ سرمایہ داری۔ کمیونزم یا پھر سوشلزم ہے۔ جو لوگ کبھی شاہوں کے زیر دست تھے آج نظم سیاست کے اسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم جدید ہو، افسانہ ہو یا ناول سب میں انسان دوستی، اخوت اور محبت کا بیان فن برائے فن ہی سمجھا جائے گا۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کا افسانہ "بابو گوپی ناتھ" اپنی تمام دولت ایک طوائف پر لٹا کر بھی اس عورت کو پانے میں ناکام ہے، جو ایک مرد کی فطری ضرورت بھی ہے۔ یہ تشنگی اور شکست انا اسے بزدل اور نکما بنا دیتی ہے۔ زندگی سے ہار کر وہ نرم خو اور رحم دل بن جاتا ہے۔ اس کا عملی کردار جنسی اور مادی ضرورتوں کا محکوم ہے۔ اس کی تمام اچھائیاں جنسی اور مادی نا آسودگیوں نے پیدا کی ہیں۔ "سہائے" منٹو کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ جس کا مرکزی کردار 'سہائے' جسم فروش عورتوں کا دلال ہے۔ اس کی آمدنی بھی اچھی ہے۔ طوائفیں اس کے پاس اپنا مال و زر جمع کرتی ہیں۔ وہ ایک ایماندار بزنس مین کی طرح امانت میں خیانت نہیں کرتا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک طوائف کی حفاظت کرتے ہوئے اس کی جان چلی جاتی ہے۔ سہائے دراصل نسائیت فروخت کرنے والا تاجر ہے۔ عورت کی جان خطرے میں دیکھ کر اس کے لاشعور میں یہ احساس کہیں دبا ہو سکتا ہے کہ اس کی تجارت خطرے میں ہے۔ اس طرح عورت کی حفاظت کا مقصد اپنی تجارت کو تباہی سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی ہو سکتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی "لاجونتی" کو نفسیات جنس کا اظہار مدعا سمجھنا ہی مناسب ہے۔ تقسیم وطن کے دوران وہ ایک مسلمان کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ اسے بیوی بنا لیتا ہے۔ رضاکار تنظیم کی مدد سے وطن واپسی کے بعد ایک بار پھر وہ اپنے پہلے خاوند کے پاس پہنچتی ہے۔ وہ اسے قبول تو کر لیتا ہے مگر پہلے کی طرح اس سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ مار پیٹ نہیں کرتا۔ 'بابو گوپی ناتھ' کی طرح لاجونتی کا شوہر بھی اپنی شکست انا سے مجبور ہو کر ٹوٹ جاتا ہے۔ 'لاجونتی' جنسی مساکیت کا شکار ہے۔ شوہر اسے دیوی سمجھتا ہے لہٰذا لذت جنس سے محروم ہو کر وہ اداس ہو جاتی ہے۔

ہرمن میلویل کا انگلش ناول "موبی ڈک" اور تکژی شنکر پلے کا ملیالم ناول "چمّین" میں بڑی حد تک موضوعاتی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں ناول انسانی جد و جہد اور مشکلات پر فتحیابی کی خواہش کا نہایت موثر اظہار ہیں۔ "پرل ایس بک" کا ناول THE QORD EARTH طبقاتی کشمکش کے درمیان زندگی کی جستجو کرنے والے کسان کی محنت کا ثمر ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان" راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" پریم چند اور کرشن چندر کے بیشتر افسانے زندگی اور تہذیب کے درمیان انسانی وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ دنیا جیسی بھی ہے ایک انسان کو بہر حال اس میں رہنا ہے۔ زندگی میں دشواریاں بہت ہیں مگر ہمت آدم بھی کم نہیں۔ اس کی جد جہد اور زندہ رہنے کی آرزو فطری امر ہے اور اپنے امر کو سمجھنے والا انسان بے مقصد کبھی نہیں ہوتا۔ ✤✤



غزالہ خاکوانی



سیما عابدی

رشمی بادشاہ

جال

میرے چہار جانب
ہے بیورکریسی کا جال ایک پھیلا
معصومیت کو میری
آہستگی سے کتنی
کب سے نگل رہا ہے
اک بازگشتِ آواز
سنتی کبھی کبھی ہوں
لہجوں میں افسرانہ
مجھ سے ہے یوں مخاطب
تم نے ادا ہے کرنی
خوشیوں کی ساری قیمت
اپنے جواں بدن کی
زرخیز سرزمیں سے
کیوں کہ تمہارے آباء
اس اپنی سرزمیں کو
محفوظ کر نہ پائے
جس سرزمیں کی فصلیں
تمہاری سرخوشی کا
اُن کو خراج دیتی تھیں۔

● 126-J/2, GULISTAN
COLONY, BAHAWLAPUR
ROAD, MULTAN (PAK)

نذرِ غالب

کیا ضروری ہے کسی درد کا عنواں ہونا
اپنی قسمت میں کہاں حاصل امکاں ہونا

جانے کیا رنگ دکھائے گی یہ شوریدہ سری
جان و دل چاک تھے اب چاک گریباں ہونا

جب بھی موقع ملے چپکے سے وہ ڈستا ہے ضرور
"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

تو ہی کرتا ہے انا اور محبت کا لہو!!!
تیرے ہی عہد میں انساں کا یہ ارزاں ہونا

اس قدر بولا گیا جھوٹ کہ سچ لگنے لگا
اب ہے مشکل کسی سچائی کی پہچاں ہونا

خواب ٹوٹے تو خیالوں کا سحر بھی ٹوٹا
آنکھ کھلتے ہی وہی کرب دل وجاں ہونا

فاصلوں کی یہ روایات ہیں سنگیں کتنی
امتحاں کا بھی ہر اک گام پہ احساں ہونا

کھیت میں بوتے ہوئے کچھ بھی نہ سوچا سیماؔ
اب جو اُگتا ہے تو کیوں اس پہ پشیماں ہونا

● 2715- SUMMERDALE (GARD)
CHICAGO IL60625 (U.S.A.)

◆

جدائیوں کے کرب سے نجات پاؤں کس طرح
قتیل تم اداس ہو تمہیں ہنساؤں کس طرح

جو دھیمی دھیمی بجلیاں ابھر رہی ہیں جسم میں
سرورِ ضبطِ غم سے ہیں تمہیں بتاؤں کس طرح

نہ جانے میری آرزو حقیقتوں میں کب ڈھلے
میں زندگی کی مانگ میں تمہیں سجاؤں کس طرح

گذر رہی ہے ہجر میں تمہاری میری زندگی
فراق میں ملاپ کے دیئے جلاؤں کس طرح

میں گھونٹ گھونٹ پی تو لوں سمندر اضطراب کا
دکھوں کے دیوتاؤں سے تمہیں بچاؤں کس طرح

جھگڑ رہے ہیں آج مجھ سے میرے اپنے حوصلے
کوئی کہے میں سرحدوں کے پار جاؤں کس طرح

یہ رشمی کا وجود ایک چلتی پھرتی لاش ہے
تمہیں نہیں تو زندگی میں جان لاؤں کس طرح

● 62-B, TAGOR ROAD, CANTT,.
KANPUR-200 001 (U.P.)

اختر آزاد
HOSE NO. 83, ROAD NO. 1,
AZAD NAGAR, JAMSHED PUR (BIHAR)

نسل کشی

"......اور ان عورتوں کے ساتھ جو ہم میں سے نہیں ہیں، تب تک ریپ کرو جب تک کہ وہ سب کی سب پر یگننٹ نہ ہو جائیں۔"

نئی اور پرانی قوموں کے درمیان صدیوں کی یہ لڑائی، صدیوں سے اسی طرح جاری ہے۔۔۔

اور ادھر جب نئی قوم کے اژدر سوچ کو عالمی سطح پر پھیلتے ہوئے پرانی قوم نے دیکھا تو ان سے یہ پذیرائی دیکھی نہیں گئی اور خود بخود احساس کمتری کا شکار ہوتی چلی گئی، کہ اگر اب ہم میں سے کچھ اور لوگوں کی حمایت نئی قوم کو حاصل ہو گئی، یا پھر چھوٹی چھوٹی قوموں کی نظریں ادھر اٹھ گئیں تو دنیا کے نقشے پر ہماری قوم کا کیا حشر ہوگا۔؟ اقلیت، اکثریت میں بدل کر ہمیں آنکھیں دکھائے گی۔ تب کون پوچھے گا ہمیں۔؟ اور کہیں ہمارا صدیوں کا وجود ہی مٹ گیا، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔؟

ایسے اور اس طرح کے بہت سارے سوالوں نے مل کر جب انہیں بری طرح سے جھنجھوڑ دیا تب وہ سب اپنی قوم کے تحفظ کے لئے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار لئے نئی قوم کی سرحدوں میں ایستادہ فوجی لشکروں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے......

سالہا سال یہ لڑائی جاری رہی۔۔۔دونوں طرف سے لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔

لیکن جیت اس کی ہوئی جس کے پاس طاقت تھی۔ جس کے پیچھے سپر پاور تھی۔ نئی قوم جب چاروں خانے چت ہو گئی تو ایسے مرد مجاہد جو قوم کی حفاظت میں پیش پیش تھے۔ ان کے گھروں پہ شب خون مار کر مردوں کو بندی بنایا گیا۔ قطار میں ہزاروں ہزار مردوں کو کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ بھاگنے کی کوشش کرنے والے سرحدوں پر مارے گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی ریگ زاروں میں گھسیٹا گیا۔ پل کے بیچوں بیچ لوگوں کو کھڑا کر کے دونوں طرف سے تیز رفتار گھوڑے دوڑائے گئے۔ بسوں کے ذریعے بھاگتے ہوئے لوگوں پر لانچر سے کہیں راکٹ برسائے گئے تو کہیں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ہماری بم بارڈنگ کر کے انہیں تہس نہس بھی کیا گیا۔

جنرل میجر کے ہونٹوں پہ خوشیاں محو رقص تھیں۔۔۔



"ہم نے اپنے پلان کے تحت سارے مردوں کو خاک میں سلا دیا ہے۔ اس لئے آج ہم سب خوشیاں منائیں گے......ناچیں گے......گائیں گے......اور......اور ان کی ایک ایک عورت کے ساتھ اس وقت تک ریپ کریں گے جب تک کہ وہ سب کی سب پر یگنینٹ نہ ہو جائیں۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ بھی ہماری جنگ کا ہی ایک حصہ ہے۔"

میجر کی باتوں پہ بیشتر فوجیوں کے چہرے اس وقت خوشیوں سے دمک اٹھے۔ اپنی سرحدوں سے نکلے اور عورتوں کو چھوئے انہیں ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ میجر کی بات ختم ہوتے ہی کچھ شراب کی بوتلیں کھولنے لگے۔ کچھ جھومنے لگے۔ کچھ وحشیانہ آوازیں نکالنے لگے۔۔۔اور پھر موج و مستی کی اس ندی میں ایک ایک کر کے سب ڈوبتے چلے گئے۔

عورتیں روتی رہیں۔ لیکن آج ان کی چیخ و پکار اور فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔؟

گھر گھر ننگا ناچ جاری تھا۔۔۔

جنرل میجر اس سہانے منظر کو اپنی آنکھوں کے کیمرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ گھروں گھر نکل پڑا۔ دروزہ کھلوانے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ وہاں ہر گھر آج کے لئے بغیر دروازے کا ہو کر رہ گیا تھا۔ فوجیوں کو جہاں اور جس حال میں عورتیں مل گئیں تھیں وہیں دھر دبوچا تھا۔ لیکن ایک گھر کا دروازہ اندر سے پوری طرح بند تھا۔ میجر چلتے چلتے رک گیا۔ اس گھر کا دروازہ زبردستی کھلوایا گیا۔ اندر اس کا ایک فوجی تھا۔ میجر نے بغور دیکھا۔ عورت پوری طرح کپڑوں میں تھی۔ نوجوان کی وردی بھی پسینے سے تر نہیں تھی۔ بال بھی سلجھے ہوئے تھے اور چادر کی سلوٹیں بھی ٹوٹی نہیں تھیں۔

"حرام خور!" میجر نے غضبناک نگاہوں سے فوجی کو دیکھا اور ایک بھرپور طمانچہ لگا دیا۔ پھر اس عورت کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔
"لے۔۔۔چل۔۔۔جلدی کر۔"

وہ اسی طرح سے سر جھکائے کھڑا رہا۔

"سالے کھوتا ہے یا میں......"

اس بار نوجوان نے ڈرتے ڈرتے نظریں اوپر کیں۔ "سر ان عورتوں

کاقصور صرف اتنا ہے ناکہ یہ ہماری عورتوں میں سے......"

"سور کہیں کا۔ ہمدردی جتلا تا ہے۔" میجر نے لاتوں سے اس کا بھرپور سواگت کیا۔ پھر منت سماجت کرتی عورت کے سارے کپڑے اتار کر نوجون کی طرف ڈھکیلتے ہوئے چلایا۔

"چل۔ یہ آخری وقت ہے تیرے پاس۔۔۔۔"

"اگر ہماری عورتوں کے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو آپ کو کیسا لگتا......؟"

ہونٹوں سے رستے ہوئے خون کو ایک ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے فوجی نے تیکھی نظروں سے میجر کو دیکھا۔

میجر نے فوجی کی اس ہتک آمیز بات پر پہلے تو چیخ چیخ کر آس پاس کے گھروں میں زور آزمائی کر رہے نوجوانوں کو بلایا اور پھر اس باغی فوجی کی جم کر دھنائی کر دی۔

"سالے یہ کیا تیری بہن ہے۔؟"

"تیری کوئی بہن ہے کیا۔؟"

"کمینے تیری یہ ہمت۔۔؟"

پھر میجر نے اس نوجوان فوجی کے ساتھ پہلے اپنے اور بعد میں فوجیوں کے ذریعے وہی گھناؤنا فعل دہرلیا، جو نئی قوم کے عورتوں کے ساتھ گھر گھر جاری تھا۔ سانس کے رکتے ہی اُسے اسی گھر کی چھت سے جھولتے ہوئے پنکھے میں بنا عضو خاص کے ننگا لٹکا دیا گیا۔

اس کے بعد سارے فوجی اور بھی مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے کہ کہیں......

کچھ عورتوں نے دوران فعل ہی دم توڑ دیا۔ کچھ سامسی عورتوں نے دم توڑنے کے لئے خود کو مجبور کیا۔ موقع ملتے ہی چھت سے کود گئیں۔ کنویں میں ڈوب گئیں۔ زہر کھالیا۔ کچھ چاہ کر بھی ایسا نہیں کرپائیں کہ ان کے اوپر فوجی سائے کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ ہڈیاں نوچ رہے تھے...... اور کچھ نے رونے پیٹنے اور چیختے چلانے سے بہتر خود کو سپرد کر کے اپنی جان بچانے میں ہی عافیت جانی۔

مہینوں یہ عمل گھر بدل بدل کر فوجیوں کے ذریعے جاری رہا۔

پھر وہ وقت آ ہی گیا۔ اور بہت ساری عورتیں پر یگنیٹ ہو گئیں۔ میجر فوجی ڈاکٹروں کے ساتھ گھر گھر گھوم کر اور عورتوں کے پیٹ کو چھو چھو کر اس وقت تک دیکھتا جب تک کہ اسے پوری طرح یقین نہ ہو جاتا کہ اس کی کوکھ میں...... اس کے بعد ہی وہ دوسرے گھر کی طرف قدم اٹھاتا۔ معائنے کا کام جب پورا ہو گیا تو ایک بار پھر ان کے چہروں پر فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اس طرح اب نئی نسل دوغلی ہو جائے گی۔"

"نسل کشی کر کے ہم نے اس نسل کا سرے سے صفایا کر دیا ہے۔"

"اب کوئی دوسری قوم، ہماری قوم کو کبھی بھی کسی مقام پر چیلنج دینے کی کوشش نہیں کرے گی، اور اگر کرے گی تو اس کا حشر بھی کچھ ایسا ہی.."

اور پھر وہ سب کے سب خوشیوں بھرے راستوں پر قہقہے بکھیرتے ہوئے نسل کشی کی اپنی اس شیطانی مہم کو پورا کر کے اپنی سرحدوں کی طرف لوٹ گئے۔

اور نئی نسل کی سرحدوں میں وہی عورتیں جو روندی، کچلی، مجبور اور بے بس تھیں، آنسو بہانے کے لئے باقی رہ گئیں۔۔۔ انہی آنسوؤں کی گہری چھاؤں میں وہ سب فوجیوں کے اس گھناؤنے فعل کے زہر کو اپنے اندر گھلتے ہوئے دیکھتی رہیں اور پھولتی رہیں......

ایسے وقت میں ہر عورت دوسری عورت سے آنکھیں چرانا چاہتی تھی لیکن جب غم ایک تھا تو مل کر بانٹنا ہی تھا۔ اس غم کو کچھ کم کرنے کے لئے وقت سے پہلے ہی کچھ ایک عورتوں نے شیطان کی اولادوں کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا۔ کچھ سامسی عورتوں نے پہل بھی کی۔

اس دوران عورتوں کی ایک تنظیم کا وجود عمل میں آیا۔ جس نے ایسا کرنے سے عورتوں کو پوری طرح روک دیا کہ۔۔ "اب ان کی اولادیں ہی ہماری نئی جنگ کے کارگر ہتھیار ہیں۔"

پھر ایک ایک کر کے ساری عورتوں نے اپنے آنسوؤں کو اپنے آنکھوں میں ہی روک لیا۔

دائرہ پھیلتا رہا۔

اور ایک دن وقت کے پالنے میں بہت سارے بچے جھولنے لگے۔۔

اور پھر ان بچوں پر نظریں پڑتے ہی ماؤں کے چہروں پر ایک دبیز مسکراہٹ پھیلنے لگتی تھی۔ کہ وہ سب تو...... اس لئے ان کی دیکھ بھال کچھ اس طرح سے کر رہی تھیں کہ اس لوہے میں زنگ لگنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

ہتھیار دو طرح کے تھے۔ لڑکا اور لڑکی۔ لڑکوں کے نام ان عورتوں نے اپنے شہید مردوں کے نام پر رکھے اور لڑکیوں کے نام پرانی قوم کی بیٹیوں کے ہم نام رکھ دئے۔ اس طرح ایک قوم دو حصوں میں منقسم ہو گئی جس کے یہاں لڑکے نے جنم لیا تھا۔ وہ نئی نسل کے ہی پیروکار رہے۔ لیکن جس گھر میں لڑکی کے پاؤں پڑے تھے۔ پرانی قوم کو اپنانے کی وجہ سے وہاں سب کچھ تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ رہن سہن، پوشاک، دھرم، زبان اور...... اور بہت کچھ...... اور سب کچھ ویسا ہی اپنا لیا گیا تھا۔

لوگ ہتھیار چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو کھلی فضا میں پرواز کرنے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ فیشن ان لڑکیوں کے پیروں سے جب ایک بار شروع ہوتا تو سر پر ہی جا کر ختم ہوتا تھا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو اپنے ذریعے بنائی گئی عبادت گاہوں میں لے جایا کرتیں۔ لڑکیوں کے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی کتابوں کے ذریعے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا، بڑا ہونے پر اس کی روشنی میں انہیں مذہب کا گیان دیتیں۔ لڑکیوں

کے روبرو کبھی نئی قوم کا ذکر نہ کریں۔

لڑکیاں عمر کی سیڑھیاں تیز رفتاری سے چڑھتی رہیں۔۔۔۔۔

لڑکوں کے قدم اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔۔۔۔۔

مائیں آپس میں ملتی رہیں......

باتیں ہوتی رہیں......

تنظیم گھوم گھوم کر اپنا کام کرتی رہی۔۔۔۔

اخبار، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع سے درندہ صفت میجر اور شیطان فوجیوں تک من چاہی خبریں پہنچائی گئیں۔ سب کچھ پکا پکایا تھا۔ اس لئے راکھ کے اندر چھپی چنگاریوں کو صرف ہوا دینا تھی۔

بچوں کے سامنے مائیں کھڑی تھیں۔۔۔۔

"تم پوچھا کرتے تھے ناں کہ تمہارا باپ کون ہے۔؟ کیا نام ہے۔؟ اور اب وہ کہاں ہیں۔؟ اور ایک دن ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ شہر کے سارے مرد مذہب کی تبلیغ کے لئے دوسرے ملک جا رہے تھے کہ سمندر میں ایک بھیانک طوفان آگیا اور کشتی...... لیکن اب جب کہ تم لوگ بڑے ہو چکے ہو اس لئے وہ راز............"

"اب تم ہی نسل کشی کی اس جنگ میں ہمارے ہتھیار ہو۔"

میڈیا کے ڈھولکی، میڈیائی ڈھولک کے ذریعے پرانی قوم کے گھر گھر مرچ مصالحے سے بھری ہوئی ان کی بیٹیوں کی سرخ اور رنگین خبریں پہنچانے کا کام بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ جو پرانی قوم کے لئے باعث شرم اور توہین آمیز تھیں۔ ان میڈیائی خبروں کی وجہ سے اب وہ ساری دنیا میں سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

میڈیائی ڈھولکی کی تھاپ بدستور جاری تھی۔

اب ہر روز اخبار کے پہلے صفحے پر ایک نئی اور انوکھی شادی کی خبر حاشیے کی زینت بنتی۔ جس میں سب سے خاص بات یہ ہوتی کہ لڑکی کے والد کے نام کی جگہ پرانی قوم کے انہی فوجیوں میں سے کسی نہ کسی کا نام ہوا کرتا۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کچھ کے پتے بھی شامل رہتے۔

اس طرح شادی کی یہ خبریں سالہا سال اخباروں میں، ریڈیو میں، ٹیلی ویژن میں جگہ پاتی رہیں۔ ان خبروں کی اشاعت و تشہیر سے جنرل میجر، اس کے دیگر سربراہ اور فوجیوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے تھے۔ قوم کی بدنامی ہو رہی تھی۔ کچھ اپنے بھی لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اور دوسرے تو طنز کے تیر پھینک ہی رہے تھے۔ ایسے میں میجر اور ان کے ریٹائرڈ فوجی اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے لگے تھے۔ اپنی قوم کی عزت کو لے کر یہ لوگ معاملے کو عدالت تک لے گئے۔ لیکن عدالت نے بھی دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ "سن بلوغت کے بعد......" اس لئے وہ سب کے سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

اور ایک دن صبح کا اخبار چائے کے ہمراہ جنرل میجر کے سامنے تھا۔ پہلے ہی صفحے کی دیوار پر شادی کی ایک دھماکہ خیز سرخی ٹنگی تھی۔ وہ بالکل چونک گیا۔ لڑکی کا نام اس کی بیٹی کا تھا۔ ایک نام تو کئی ایک لڑکیوں کے ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کے ابھرتے ہی اس نے ذہن کی دیوار پر جمی ہوئی شک و شبہات کی کائی کو جیسے ہی کھرچ کر الگ کرنے کی کوشش کی کہ اچانک باپ کے نام پر نظر پڑ گئی۔ وہ اندر سے بری طرح کپکپا گیا۔ ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ پیالی کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے نظریں ہٹتے ہی اس نے ایک بار پھر باپ کے نام کو پڑھنا چاہا۔ نام تو اسی کا تھا۔ اور پتہ۔ پتہ بھی اس کے ہی گھر کا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں......

"ارے کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔؟" بیوی خالی ٹرے سنبھالے حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن ہماری بیٹی کہاں ہے۔؟" نہ چاہتے ہوئے بھی سر اسی طرح جھکائے جھکائے اس نے پوچھ لیا تھا۔

"وہ! ارے لو۔۔۔" پیالی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ٹرے میں چنتے ہوئے بولی۔ "تم کل دیر رات کلب سے لوٹے تھے۔ اس لئے بتانا بھول گئی۔ ارے کیا نام ہے اس کا۔؟ جس کا چہرہ بالکل تمہاری طرح ہے۔ کل رات اس کی شادی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے ہی گھر گئی ہے۔"

میجر کی ڈبڈبائی آنکھیں، تعفن اور سڑاند سے بھری ہوئی نسل کشی کی بیس سالہ پرانی دلدل میں دور تک دھنستی چلی گئیں۔ ++

بقیہ صفحہ ۴۰ ماضی

بقیہ صفحہ ۴۰

بھی اس کے نزدیک ہی گونجتی ہوئی وہی آواز تھی جو اسے اکسا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک تھیلا تھا۔ اس نے ہڈیوں کو تھیلے میں رکھا اور اسے کاندھے پر لٹکا کر واپس جانے لگا۔ تھیلا بھاری بالکل نہ تھا لیکن اس کے پاؤں کمزور لگ رہے تھے۔ چھوٹی ندی سے ہواکا، اداس، ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا گزرا۔ چاند ابھر رہا تھا اس کی دودھیا کرنیں پانی کی چادر پر پھیلی تھیں۔ وہ ندی کے کنارے رک گیا اور وہیں کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے سنبھال کر کاندھے سے تھیلا اتارا اور اسے پانی میں اچھال دیا۔ ندی میں چھپاکا ہوا اور نرکٹوں میں چڑیوں کی ایک جوڑی اچھمبھ ہو کر اس کے سر سے اڑتی ہوئی، کھلے میدان کی وسعتوں کو پار کرتی ہوئی، بیر کوں کی سیاہ پرچھائیوں کے پیچھے گم ہو گئی۔

سامنے پہاڑی پر چاندنی میں ڈوبے "یادگار" کا سایہ پھیلتا گیا۔ وہ ایک سنتری کی طرح لگ رہا تھا، رات میں پہرہ داری کرتے ہوئے جس کی نظریں کھلے میدان پر ٹکی تھیں۔ جلد ہی زمین کے ان ٹکڑوں پر ایک نئے کارخانے کی تعمیر ہو جائے گی۔ ++

● ستیہ پال آنند کی نظموں میں ہر جگہ ایک فلسفیانہ رو برسر کار ہے۔ اسی بنا پر ان کے مفاہیم و موضوعات پر تعقل کی گرفت بھی مضبوط ہے۔ وہ وقت کو ماضی اور حال کے صیغوں میں نہیں بانٹتے اور نہ ہی حال کی قیمت پر ماضی کو بے اوقات گردانتے ہیں ...... جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے، نظم اپنی راہ خود بناتی ہے۔ شاید اسی بنا پر زیادہ تر نظمیں اپنی فضا زبان کے برتاؤ اور تکنیک میں غیر رسمی پن کا احساس دلاتی ہیں۔ نظم کے شاعر میں یہ استعداد بہت بڑی کامیابی کے مترادف ہے۔

———— ڈاکٹر عتیق اللہ

دست برگ ● وقت لاوقت ● آنے والی سحر بند کھڑکی ہے

اور لہو بولتا ہے

کے بعد چار سو سے کچھ زیادہ نظموں کے خالق

ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

مستقبل، آ مجھ سے مل

شاعر کی خودنوشت **"داستان میرے شعری سفر کی"**

کے ساتھ، جو جدید اردو شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی ہے

دیدہ زیب طباعت، گیٹ اپ ● سہ رنگ ڈسٹ کور

قیمت ——— ۱۵۰ روپئے

انٹرنیشنل اردو پبلکیشنز ۹۲۲ کوچہ روہیلا دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نذرِ میر تقی میر [۱۷۲۳ء-۱۸۱۰ء]

میر کی زمین میں تین غزلیں۔



جمال اُویسی

①

ں ہوئی نگاہ میں ہے رہگذر کہ ہم
منزل و قیام ہوا ہے سفر کہ ہم

تا ہے ایک صفحہ غزل کا گلی گلی
و زبان ہونے لگی دربدر کہ ہم

ما نہ تھا ذرا کہ سماں ڈوبنے لگا
زندگی ہمارے لئے مختصر کہ ہم

شوق کائنات کی پہنائیوں میں دیکھ
شے ہے اپنے آپ میں گم، بے خبر کہ ہم

می اڑا کے لے گئی سامانِ زندگی
رے ہوئے ہیں شہر میں دیوار ودر کہ ہم

②

کیسے کہوں کہ جل نہ سکی بجھ چکی ہے آگ
سینے میں میرے جھانک کے دیکھو دبی ہے آگ

میں شعر لکھ رہا تھا کہ شعلہ لپک پڑا
معلوم کب مجھے تھا کہ اندر لگی ہے آگ

رنگِ بہار حسنِ چمن سب انہی سے ہے
گل پیکروں میں کیسی سمائی ہوئی ہے آگ

سودا ہے میرے سر میں سمایا ہوا عجیب
منوا کے خود کو چھوڑے گی ایسی لگی ہے آگ

عمرِ عزیز صرف ہوئی اضطراب میں
جامد نظر سے دیکھوں ہوں ٹھنڈی پڑی ہے آگ

خرقہ اتار پھینکئے اب خانقاہ کا
مرشد سمیت مدرسہ میں لگ گئی ہے آگ

کیسے کہوں کہ رازیؔ و خاقانیؔ میں نہیں
جب جب لکھے ہیں شعر اڈتی رہی ہے آگ

دانشوروں کے زعم کو اک تازیانہ ہے
خاشاک کو جلا نہ سکی بجھ چکی ہے آگ

●MOHALLA FAIZULLAH KAHN, DARBHANGA (BIHAR)



افتخار امام صدیقی

کچھ نہیں ہوں میں عملداروں کے بیچ
ہوں جو رحمت کے طلبگاروں کے بیچ

آدمی ! گم ہورہا ہے آدمی
اڑ رہی ہے دھول بازاروں کے بیچ

بے کسی ، بے زارگی ، بے چہرگی
گھر گئے ہم کیسے آزاروں کے بیچ

آگ ہوتی ایک دنیا اور میں
پھول ایسے لفظ ، انگاروں کے بیچ

زندگی اے زندگی ! یہ کیا ہوا ؟
گھِر گئی ہے تو پرستاروں کے بیچ

کون ہے ؟ کس کی دعا کی چھاؤں میں
چل رہی ہے سانس تلواروں کے بیچ

عشق کو دیوانگی میں ہر طرف
"منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ"

رو رہے ہو شور سے کیوں اے امامؔ
دوستی کیا مر گئی یاروں کے بیچ

چینی :- وان چھی
اردو :- ارشد مسعود ہاشمی
KAMRA, MUZAFFARPUR (BIHAR)

ماضی

سامنے کھلا میدان تھا۔ رات اب بھی وہاں بھٹک رہی تھی۔ چاندنی نہ تھی لیکن آسمان کچھ روشن سا تھا اور تارے چمک رہے تھے۔ بے پناہ میدان تاحدِ نگاہ تاریکی میں ڈوبا تھا۔ سحر کی پہلی گھڑی میں ان گنت بیرکوں کے سیاہ سائے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ آگے بڑھتا گیا۔ وہاں کوئی سڑک نہیں تھی لیکن وہ بیرکوں کی ان سیاہ پرچھائیوں کی جانب سیدھا بڑھتا گیا۔ کبھی کبھار اس کے پاؤں کسی پتھر پر لڑکھڑا جاتے۔ ایک بار تو وہ گر بھی گیا تھا اور اس کی ہتھیلیاں پھٹ گئی تھیں لیکن وہ اور بھی تیزی کے ساتھ خود کو آگے کھینچتا گیا۔

وہ بذاتِ خود وہاں جانے کا قطعی خواہشمند نہ تھا۔ وہ خوفزدہ تھا اور اسے احساس بھی نہ تھا کہ وہ ہاتھ جس میں لوہے کا بیلچہ تھما تھا، بری طرح تھر تھرا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا گویا کوئی اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ چونک کر وہ کئی مرتبہ رکا، مڑا، اور سہم کر اس نے پیچھے دیکھا لیکن اس قصباتی اسٹیشن کی ہلکی روشنیوں کے سوا اس کی نظروں کے سامنے کوئی ذی روح نہ تھا۔ ندی پار کرتے ہوئے اس نے ان نوجوان عاشقوں کی جوڑی کو ہراساں کر دیا جو "یادگار" کے دامن میں بسے چیل کے جنگلوں میں جانے کے لئے اس چھوٹے پل کو پار کرکے ڈھلوان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں یقیناً اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ بیلچہ والا وہ بوڑھا آدمی وہاں کیا کر رہا تھا۔

آگے کیا تھا؟ خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ کوئی آواز تھی جو اسے پکار رہی تھی، جو اس کے باہر بھی تھی اور اس کے اندرون میں بھی۔ وہ آواز مبہم تھی اور وہ ان ابھرتے ڈوبتے لفظوں کو سمیٹ نہیں پاتا تھا۔ جو اس کے دماغ کی ترنگوں میں اس کے دھڑکتے دل اور امڈتے خون کی لے پر سماتے تھے، مٹ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا مانو ہوائیں دھیمی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اس آواز سے ہنکتا ہوا وہ بالآخر وہاں پہنچ چکا تھا۔

اب وہ ان بیرکوں کے سامنے کھڑا تھا۔ خالص کنکریٹ کی ان دیواروں نے تیس برسوں سے طوفان کا مقابلہ کیا تھا۔ ایک قبر تھی یہ جس میں ایک جنگ دفن تھی، ایک جرم اور چیختی زندگیاں۔ بیرک ایک قطار میں بنے تھے۔ کھلا میدان قبرستان بن گیا تھا۔ وہ انہیں نہارتا کھڑا رہا۔ وہ ماضی تھا۔ ماضی موت تھی اور موت ہی تھی جو اسے یاد تھی۔

یہاں جنگ میں حصہ لیا تھا اس نے۔ وہ اس بیرک میں امریکی طرز کے کرنابین اور مشین گن سے لیس ایک محافظ تھا جس کے پاس ایک دماغ بھی تھا جو فوجی قواعد سکھانے والے امریکی سارجنٹ کی دین تھا۔ وہ جانباز تھا اور کھلے میدان نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ محافظ رہا جب تک کہ لوگوں کا آخری گروہ جنوب جانے کے لئے اس قصباتی اسٹیشن سے روانہ نہ ہو گیا۔ اور یہیں، قیدی بھی بنا تھا وہ۔

اس کی یادوں کی مشینری عرصۂ دراز سے چکرانا بھول چکی تھی اور اس پر گرد کی ایک موٹی تہہ جم گئی تھی۔ وہ ماضی کو بھول چکا تھا۔ اس نے اپنی یادوں کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس دو بھدے ہاتھ تھے، تختہ جیسا ایک چہرہ، جذبوں سے عاری دو آنکھیں، سات مصنوعی دانت اور ایک دل جو ایک منٹ میں ساٹھ بار دھڑکتا تھا۔

یہ مشین متحرک کی جا سکتی تھی۔ اگر کسی نے بٹن دبا دیا ہوتا تو چکر میں حرکت آجاتی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ بٹن کس نے دبایا لیکن اب اسے ماضی یاد آرہا تھا۔ اپنا بچپن، اسکول کے اپنے دن، ملٹری اکادمی میں اپنی زندگی، اپنی بیوی، پیار کے تمام لمحے اور پرانے گھر کے سامنے خوشبودار بلوط کو یاد کرتے ہوئے وہ اب بھی اپنی زندگی کے پیڑ پر ابھر آئے نمو کے چھلوں کو گن سکتا تھا۔ اسے قید خانہ بھی یاد آیا اور سزا پوری ہونے پر ملنے والا آزادی کا پروانہ بھی۔

یہ کوئی سپنا نہیں تھا، نہ ہی کوئی کہانی، لیکن اس کی یادیں اس قدر گنجلک ہو چکی تھیں، ایسی ابتر، اتنی مبہم!!

شاید راہی وہ تھا جس نے بٹن دبایا تھا۔ یہ تقدیر تھی۔ قسمت! یہ وہ دھیمی آواز تھی جو اسے اکسا رہی تھی۔ زندگی کے ایک خاص نقطے سے شروع ہو کر اسی نقطے پر ختم ہونے والا ایک دائرہ تھی جسے اس نے ہی کھینچا تھا۔ وہ یہاں ان بیرکوں کو بنانے کے لئے پہلے امریکی ٹرک میں آیا تھا مگر ابھی وہ کسی امریکی ٹرک سے نہیں آیا تھا بلکہ ان بیرکوں کو منہدم کرکے وہاں "امریکی نژاد" کارخانہ بنانے آیا تھا۔

بیرکوں کی فصیلیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ تھا۔ ہوا خنک تھی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ موت کی مہک سے بھرے کھلے

میدان پر سکوت طاری تھا۔ خاموشی کو چیرتی ہوئی سیٹی کی گونج سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک ٹرین گذر رہی تھی۔ برقی کھمبوں کی تیز دودھیا کرنیں تاریکی کو پھاڑتی ہوئی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں اور اس کا بڑا سا سایہ میدان پر منعکس ہو رہا تھا۔

وہ چونک کر بیرکوں کے سائے میں ہو گیا تھا۔ کنکریٹ کی دیوار سے بیلچہ ٹکرانے پر ایک تیز آواز گونجی اور وہ ڈر سے کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خوفزدہ کیوں تھا۔ شاید یہ کوئی اندرونی تحریک تھی۔ آخری کچھ دہائیوں نے اس کی زندگی کی ہمت کی قندیلوں کو بجھا کر ایک میلا رنگ دے دیا تھا، زنگ کا رنگ، برف کا رنگ!

اس نے دوبارہ اپنا کام شروع کیا۔ بیلچہ مٹی کے اس ڈھیر سے ٹکرایا تھا جسے ان لوگوں نے دن میں کھودا تھا اور اس کی آواز کھلے میدان میں پھیل گئی تھی۔ اس آواز سے سہم کر وہ رک گیا اور مڑا۔ چاروں طرف سناٹا تھا لیکن اس خاموشی نے اسے ڈرا دیا۔ اسے محسوس ہوا گویا کوئی ان بیرکوں سے جھانک کر اسے گھور رہا ہے۔ سیاہ فصیلوں کو نہارتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خود کو محفوظ محسوس کرنے لگا۔

اس نے طے کیا کہ وہ بیلچہ کا استعمال نہیں کرے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی کھودنے لگا۔ گیلی مٹی مٹھی میں لیتے ہی اس کی ہتھیلیوں میں کیچڑ کی خنکی سمانے لگی۔ یہ وہی مٹی تھی جو خون سے رنگی تھی۔ شاید اب بھی اس میں خون کے کچھ ذرات تھے، یا ہو سکتا ہے، نہیں ہوں، سورج کی تمازت سے وہ کافور بن کر ہوا میں پھیل گئے ہوں دور کناروں تک اور پھر ان سے پرے کھلی زمین میں سما گئے ہوں! زندگی آتی جاتی رہتی ہے لیکن اسکے ترکیبی عناصر تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

سیاہ سایوں کی تاریکی میں ہانپتا ہوا وہ گیلی مٹی کھودتے ہوئے کچھ تلاشتا رہا۔ اسے احساس ہوا گویا اس نے کسی چیز کو مس کیا ہے، کوئی لمبی اور نیلی چیز جسے اس نے زمین سے باہر کھینچا۔ اور پھر فوراً ہی ایک لمبا ٹکڑا، دو لمبے ٹکڑے، ایک چھوٹا ٹکڑا، دو چھوٹے ٹکڑے! کیچڑ سے ان ٹکڑوں کو نکال کر وہ بیرک کی دیوار تلے ان کا ڈھیر لگاتا گیا۔ یہ موت کا جماد تھا۔ یہ بے وقعت چیزیں مردوں کی ہڈیاں تھیں۔ جانگھ کی ہڈیاں، پسلیاں، ریڑھ، لمبی اور چھوٹی، پتلی اور موٹی۔ شاید یہ سب ایک ہی آدمی کی تھیں یا شاید دو کی، تین کی......

دن میں اور دوسرے مزدور کارخانے کی بنیاد کے لئے وہاں کھدائی کر رہے تھے۔ تب کئی اجلی ہڈیاں باہر نکلی تھیں۔ جب انہیں پہلی ہڈی ملی تھی تو کوئی بھی متاثر نہیں ہوا تھا کیوں کہ کھدائی میں تو کچھ بھی مل سکتا تھا ان نوجوان مزدوروں نے اس کا، ایک کھوئے من تانگ افسر کا، مضحکہ اڑاتے ہوئے ہڈی کو ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح سزا کاٹ چکے تھے۔ انہوں ہر طرح کے چھوٹے بڑے جرم کئے تھے۔ چوری، ڈاکہ، زنا......

لیکن اس کے باوجود انہیں اس کا مذاق اڑانے کا حق تھا کیوں کہ اس کا جرم جنگ اور شکست تھا۔ اور تبھی اس کی یادوں کی چکریاں گھومنے لگیں۔

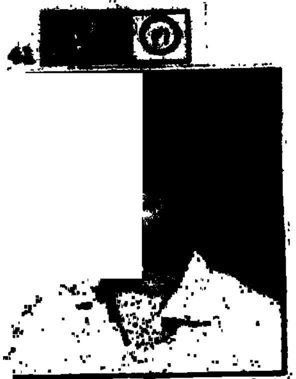
اس نے دوسروں سے نہیں کہا تھا کہ وہ یہاں جنگ میں شامل تھا۔ ماضی ختم ہو چکا تھا، گذر چکا تھا۔ وہ سفید ہڈیوں کو دیکھ کر سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ وہ کھدائی کرتا رہا اور جب ہڈیوں کا ڈھیر بڑھنے لگا تو وہ نوجوان مزدور بھی کہ جن کی نگاہ میں خوف اور موت بے معنی تھی، یہ محسوس کرنے لگے کہ و سوکھی اور بھر بھری ہوتی ہڈیاں ان کے دلوں کو اپنی گرفت میں لینے لگی تھیں۔ اجلی ہڈیوں کا وہ ڈھیر موت کی مستحکم علامت تھا۔ اسی دنیا میں زندگی کا مزہ اور چسکا لیتی ہوئی کھوپڑیوں اور دانتوں کی قطاریں اب موت کی بھیانک مسکراہٹ کا اظہار کر رہی تھیں۔

وہ ہڈیوں کو پھر سے جمع کرنے لگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جو اس کے ساتھ ہی ان بیرکوں سے ضدیوں کی طرح چپکے رہ گئے تھے۔ بندوقوں کی تڑتڑاہٹ کے ختم ہونے کے بعد فتح مندوں کے جسم یہاں سے اٹھا لئے گئے تھے اور ان ظفریابوں کو وہاں اس یادگار کے تلے دفن کر دیا گیا تھا جہاں ناز و عزت ان کے محافظ تھے اور جہاں خود وہ امن، سکون اور خوشیوں کے محافظ! لیکن ہارے ہوؤں، شکست خوردوں کے جسم یہیں ان بیرکوں کے دامن میں گاڑ دئے گئے تھے! جرم جن کا محافظ تھا اور جو خود موت، بے عزتی اور بربادی کے علمبردار تھے۔

وہ اب بھی وہاں موجود تھا۔ وہ دفن نہیں تھا وہاں۔ ان میں سے کوئی ہڈی اس کی نہ تھی۔ اسے قیدی بنا لیا گیا تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا۔ اس نے ان ہڈیوں کو اس طرح چھوا جیسے خود کو چھو رہا ہو، اپنے ہی دانتوں کو آنکھوں کے خالی کٹوروں کو......وہ بھی یہیں گڑا ہوا ہوتا......ان ہڈیوں سے انسانی شکلیں جڑی تھیں جو دوبارہ اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں آ سکتیں۔ اپنی یادوں کے دھندلے سائے میں بھی اسے یہ احساس تھا کہ یہ ہڈیاں کن کن کی تھیں۔ یہ کھوپڑی جس کے سامنے کے دو بڑے دانت تھے مشین گن چلانے والے کی تھی۔ وہ ہڈیوں کو کرید کرید کر دیکھتا رہا۔ یہ جانگھ کی بڑی والی ہڈی! اسے چھو کر وہ بتا سکتا تھا کہ یہ کس کی تھی۔ وہ شراب کا رسیا تھا اور راتوں کو اپنی بیوی کی یاد میں سسکیاں لیتا تھا......ان میں سے کوئی بھی اب زندگی کی رمق نہیں پا سکتا تھا۔ کیوں مر گئے تھے وہ لوگ؟ ان کی زندگیاں کب اپنی قدریں کھو بیٹھی تھیں؟ نہیں، اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی نے انہیں حکم دیا تھا۔ ایسا کیوں کیا تھا اس نے؟ کیا آج بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔؟ اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن کیوں؟ امریکیوں پر اتنی آسانی سے بھروسہ کرنا، یا یہ بھی قسمت کی ہی بات تھی؟ یا خود اس کی بے وقوفی؟

وہ کھلے میدان میں گھٹنوں پر جھک گیا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ لیکن اس کے سینے میں عبادت کا کوئی کلمہ نہ تھا، مستقبل کی کوئی خواہش نہ تھی، اب

(باقی صفحہ ۳۶ پر دیکھئے)



ولی مدنی

ہم نے یوں قرطاس و قلم سے فکر کو دل آویز کیا	پھول کی اک تصویر بنائی خونِ جگر آمیز کیا
زہر کی صورت جب بھی اداسی شاخِ نفس پر چھانے لگی	تیری ادا کو یاد کیا احساس کو یوں گل ریز کیا
دیکھ کے موسم لطف و کرم کا کیوں نہ ہو نازاں بخت رسا	میرے لئے ہی اس نے غموں کا جام و سبو لبریز کیا
اپنی سعی سے باز نہ آئے ہم بھی اے خاصانِ خرد	گر نہ سکی نفرت کی اگر دیوار تو در انگیز کیا
رقص کناں ہر سانس میں ہے پُر کیف سی اک خوشبو پیہم	یوں تو بظاہر ذکر سے تیرے ہم نے بہت پرہیز کیا

● AT & P.O. LAKHMINIA, DIST. BEGUSRAI - 851 211 (BIHAR)



ظہور چوہان

بتا اے تیرہ شبی ہوگی کب سحر مجھ میں	ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں رات بھر مجھ میں
ابھی تو اذن ملا تھا مجھے رہائی کا	ابھی سے آن گرا ہے شکستہ پر مجھ میں
ہرا بھرا تو ہے لیکن ثمر نہیں دیتا	لگا ہوا ہے یہ کیسا بھلا شجر مجھ میں
میں اپنی ذات کی تعمیر جب بھی کرتا ہوں	تو کوئی توڑنے لگتا ہے بام و در مجھ میں
کئی دنوں سے یہ محسوس ہورہا ہے ظہورؔ	بنا رہا ہے کوئی جیسے رہگذر مجھ میں

● MOH. SIDDIQIA, STREET-3 GRASS MANDI, MULTAN - 60000 (PAK)



تسنیم عابدی

دامن ہے تار تار گریبان چاک ہے	اے شاخِ دل بہار کا قصہ ہی پاک ہے
بکھری پڑی ہے پھول کی اک ایک پنکھڑی	انجام زندگی کا بڑا درد ناک ہے
روشن تھا جو چراغ تمنا وہ بجھ گیا	اب شہر آرزو میں دھواں ہے نہ راکھ ہے
مٹی سے اپنا خاص تعلق یہی رہا	روشن جبینِ ناز پہ سجدوں کی خاک ہے
اس بے وفا سے مجھ کو شکایت کوئی نہیں	اس بے وفا کی اب بھی بڑی دل میں ساکھ ہے

● P.O. BOX 2035, ABU DHABI (U.A.E.)



راحت حسن

عکس، کس نقش کی تنویر کا درپن میں نہیں	کون سا رنگ ہے جو آنکھ کے دامن میں نہیں
کیوں ہیں کم ذات مرے دل کے محافظ، یارب!	کیا ہے مجھ میں جو مری جان کے دشمن میں نہیں
میری نظروں میں بیاباں ہی بیاباں کیوں ہے	دن کے سائے کیا مری دھوپ کے آنگن میں نہیں
سب ہی رکھتے ہیں زمانے میں قبائیں لیکن	بات بس یہ ہے کہ پوشاک ہی فیشن میں نہیں
کیسے کھلتا ہے نہ جانے مرا ایماں راحتؔ	اب تو تعویذ بھی کوئی میری گردن میں نہیں

● PREM NISHAN, DOODHPUR, ALIGARH - 202002 (U.P.)



محسن باعشن حسرتؔ

شیشے کا گھر میرے خلاف	ایک اک پتھر میرے خلاف
بارش چھت پر میرے خلاف	گھر کا چھپر میرے خلاف
دیکھا اکثر میرے خلاف	ہر اک منظر میرے خلاف
سچ سولی پر میرے خلاف	کاندھے پہ سر میرے خلاف
سارا لشکر میرے خلاف	میرا مقدر میرے خلاف

● 4 - PRINCEP STREET, 1ST FL. CALCUTTA - 72

بےکتی بات

● شاعر کی ڈاک کا دباؤ شاعر کے لئے موصولہ مضامین نثر و نظم ہی کی طرح ہیں۔ یہ دباؤ کبھی بھی کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ گذشتہ سال سے شماروں میں بہت ساری تنقیدی آراء بعد کے شماروں میں شامل نہ ہو سکیں کہ "مکتوبات" کے صفحات محدود ہیں جب کہ ۸۔۶ صفحات بھی ناکافی ہوں۔ شاعر کا یہ اہم ترین تاریخی سلسلہ اب بھی ہماری گرفت میں نہیں آسکا ہے حالانکہ کئی ایک تجربے ہو چکے ہیں تاہم اب بھی اس میں تجربوں اور تنوع کی بڑی گنجائش ہے۔ اسی گنجائش کو ہم اپنی سوچ بنائے ہوئے ہیں۔ فی الحال اس شمارے میں مکتوبات کے باب میں ان بے شمار خطوں میں سے چند ایک کو شامل کیا جارہا ہے جو گذشتہ سال (۱۹۹۹ء) سے اپریل تک کے شماروں سے متعلق ہیں۔ ان خطوں کے مسائل شاعر میں قائم کیے گئے ان مکالموں سے ابھرے اور بحث کا موضوع بنے ہیں جو معاصر ادبی مسائل کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ معنوی، گروہی یا پھر شخصی مسائل نہیں ہیں جیسا کہ عموماً ادبی رسائل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک عجیب سی ادبی دہشت گردی کا گمان ہوتا ہے۔ زبان مر گئی، ادب مر گیا، قاری مر گیا، جمود طاری ہے، شاعری نہیں ہو رہی ہے، غزل ختم ہو گئی، نصابات غیر معیاری، درس و تدریس کا بیڑہ غرق وغیرہ ہم ہر قلم کار ایک دوسرے سے شاکی ہے۔ شاعر میں کبھی بھی شخصی، گروہی، معنوی یا چٹخارے دار اور سنسنی پھیلانے والے وقتی مسائل پیدا نہیں کیے گئے۔ ہمیں اپنی تعریف و توصیف سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں شاعر کے باذوق قارئین کی مثبت رائے حرارت دیتی ہے اور شاعر کو زندہ رکھتی ہے۔ اس کی گلوبل ریڈر شپ کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ ابھی خطوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ شاعر کے مندرجات پر یا اس کے حوالے سے علمی و ادبی اور فنی مسائل پر مباحث کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ مکتوبات کا کالم شاعر کے قارئین کا کالم ہے۔ یہ سارے خطوط ادارتی شذرات اور حواشی کے بھی متقاضی ہیں تاہم ہمیں اپنے باذوق قارئین پر اعتماد ہے کہ وہ بعض سوال اور مسائل کے بارے میں خود ہی غور کریں گے اور کسی مثبت رائے کو قائم کریں گے۔ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مکتوب نگار حضرات کی آراء سے ادارہ بھی متفق ہو یہ کوئی ضروری نہیں۔ یہ ایک آزاد مکالمہ ہے جو ادب کے دائرے میں محدود رہ کر اس دائرے کو وسیع کرتا ہے۔ مکالموں اور دائروں کا یہ سفر جاری رہے گا۔

آپ کو یہ تجربہ کیسا لگا؟ اپنی گراں قدر رائے سے نوازیے گا

[ادارہ]

نامی انصاری

شاعر (ماہ نومبر ۹۹ء) میں آپ نے اپنے اداریے میں جو سوال قائم کیے ہیں، وہ بر محل اور مبنی بر حقیقت تو ہیں لیکن بے پناہ صارفیت کے اس عہد میں، جہاں اقدار کے بجائے اشتہار کا دور دورہ ہے، ہم اردو زبان و ادب اور اردو کلچر کا تحفظ کس طرح سے کر سکتے ہیں۔ کم از کم شمالی ہند میں اردو اسپیکنگ عوام کو اپنی زبان اور کلچر سے اتنا لگاؤ بھی نہیں ہے جتنا ایک ماڈرن عورت کو اپنے ماڈرن بیٹے سے ہوتا ہے۔ ان کا کام تو ہندی رسم الخط سے چل ہی جاتا ہے، پھر وہ اردو کے لئے کیوں فکر مند ہوں؟ جمعہ کی نماز کے بعد "ضروری اعلان" کے پرچے ہندی میں بانٹے جاتے ہیں۔ میں ان کو لینے سے انکار کر دیتا ہوں لیکن کیا میرا انکار ان کی سوچ کو رتی بھر بھی متاثر کر سکتا ہے؟ اردو کے لئے ہماری آپ کی فکر مندی صرف کتب و رسائل تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ عوام اس سے بے خبر ہیں اور وہ باخبر ہونا بھی نہیں چاہتے کہ اس میں ان کا کوئی مادی، فوری فائدہ مضمر نہیں ہے۔

بشیر بدر نے فیض کی غزلوں کے حوالے سے اپنی کمزور مگر چٹخارے دار غزلیہ شاعری کا جواز فراہم کرنے کی جو خام کارانہ کوشش کی ہے، اس سے شاید ہی کوئی مطمئن ہو سکے پھر انہوں نے سردار جعفری کے نام کے ساتھ اپنا نام بریکٹ کر کے جو ستم ظریفی کی ہے، اس کا کوئی محل نہ تھا۔ جدید شعراء کے راجکمار، شہریار کی غزل (مطبوعہ صفحہ ۵) کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ اس کے مقابلے میں حسن نعیم (مرحوم) کی وہ غزل دیکھئے جو ان کے خط (صفحہ ۲) کے آخر میں درج ہے۔ کیا خوبصورت، مضبوط اور تخلیقی توانائی سے بھرپور غزل ہے جس کا ہر شعر نگینے کی طرح چمکتا ہے۔ بے شک وہ غزل کے سچے اور باہنر شاعر تھے جن کو ہم عصر تنقید نے نظر انداز کر دیا مگر ادبی تاریخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

● 99/295, NALA ROAD, CHAMAN GANJ, KANPUR -208001 (U.P.)

اسلم حنیف

"تجربات" میں غزل کے حوالے سے آپ نے اردو اساتذہ اور طلباء پر بحث انگیز تاثرات کو قلم بند کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو طبقہ رسائل سے واقف ہی نہیں ہے ان تک آپ کے تاثرات کس طرح پہنچیں گے؟ وسیلے پر گفتگو سے قبل بہت سے سوالات پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شاعر اور دیگر اردو رسائل نے اردو میں پتے لکھنے پر جس مہم کا آغاز کیا تھا کیا خود اردو کے اہل قلم نے اس پر عمل کیا؟ چلئے کسی بھی طرح اتر پردیش کے بہت سے سرکاری ڈپارٹمنٹس میں مترجمین بھی رکھ دیے گئے۔ اردو والے بتائیں کہ کتنی درخواستیں وغیرہ لکھ کر ان مترجمین کی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں؟؟

بات تلخ اور بہت تلخ ہے اسے تعصب سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے مگر لکھنا ضروری ہے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم اور اس کو نسلی مزاج کا حصہ بنانے میں عورتوں اور دینی مکاتیب و درسگاہوں نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ "مشرقی تہذیب و تمدن میں نمایاں تبدیلیوں اور دینی کتب کے مختلف زبانوں میں تراجم نے اردو کی بنیادی تعلیمات پر برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ گھریلو پڑھی لکھی خواتین کے پاس آس پڑوس کے بچے قرآنی تعلیم اور اردو کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اس کے بعد اسکول اور مدارس کا دور شروع ہوتا ہے، اب دھیرے دھیرے یہ روایت قصبوں اور دیہات سے ختم ہوتی جارہی ہے اور انگلش میڈیم (پرائیویٹ) اسکولوں نے یہ جگہ سنبھال لی ہے۔ غرباء دینی مدارس میں بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اکثریت سے بچے اردو کی پرائمری تعلیم کو حاصل کر لیا کرتے تھے لیکن یوپی گورنمنٹ نے اقلیت کو وظیفہ کا لالچ دے کر ان مکاتب کو سُونا کر دیا ہے۔ بیچارے شکچھا کے نتائج پر کوئی گہرائی سے نہیں سوچ رہا۔ خصوصاً مسلمانوں میں اردو، مذہبی لٹریچر کی وجہ سے بڑی حد تک ایک مضبوط روایت کی صورت میں آگے بڑھی ہے اس لئے اس کے محدود ہونے میں متذکرہ وجوہات کے ساتھ غیر اردو زبانوں میں قرآن حکیم اور دیگر مذہبی کتب کے تراجم کا بھی نمایاں کردار رہا ہے۔ صورت حال مزید بدتر ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ اس سلسلے میں خود اردو کے فن کاروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو اردو کی خدمت کے باوجود اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے بہرہ ور کرانے میں بے حسی کا شکار ہیں (اس لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں) اور پھر وہی اردو کی زبوں حالی پر کفِ افسوس ملنے میں پیچھے نہیں۔

اردو رسائل کے سامنے سارے مسائل مالی حالات کی کمزوریوں نے کھڑے کیے ہیں۔ اس کے برعکس یہ بھی سوچا ہوگا کہ ایک فنکار جو اقتصادی صورت میں کمزور ہے کتنے رسائل خرید کر پڑھ سکتا ہے؟ کتنے فنکار ہیں جو صرف رسائل میں ا[illegible]

لئے شائع نہیں کئے جاتے کہ وہ اس رسالے کے سالانہ خریدار نہیں ہوتے ؟ مزید ستم بالائے ستم اردو رسائل (بیشتر) اپنے خریداروں کی کمزور سے کمزور تخلیقات کو شان سے شائع کرتے ہیں مگر غیر ممبر پر غیر معیاری، تخلیق کا فتویٰ لگا کر اچھی تخلیقات کو بھی واپس کر دیتے ہیں۔ صوبائی حکومتوں کی مدد سے نکلنے والے پرچوں کے بارے میں تعلقات کو اہمیت حاصل ہے۔ مخصوص قسم کے لوگ بار بار شائع ہو سکتے ہیں مگر غیر متعلق لوگ ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس سے قطع نظر جو لوگ رسائل میں شائع کر دئے جاتے ہیں وہ رسالے کی ایک کاپی کے مستحق بھی قرار نہیں دئے جاتے۔ فنکار کا حوصلہ کیسے بڑھے ؟ اور نئے چہرے کیسے ابھر کر آئیں ؟ ان سبھی مسائل پر سوچنا ہم سبھی کی اہم ذمہ داری ہے۔ [آپ کی یہ باتیں رسالہ شاعر پر صادق نہیں آتیں۔ پوری ادبی دنیا جانتی ہے۔ (ادارہ)]

فنکار کے حوالے سے یہاں ایک تلخ حقیقت کا اور ذکر کر دیا جائے تو بہتر ہی رہے گا وہ یہ کہ فنی ایٹموں کی طرح اب خود فنکار بھی بٹ گیا ہے، غزل کا شاعر رسائل میں صرف غزلیں پڑھتا ہے، تنقید، تحقیق اور افسانہ وغیرہ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یا اسی طرح جو جس صنف میں طبع آزمائی کر رہا ہے اس سے ہٹ کر مطالعہ نہ کرنے کی بنا پر اُسے رسائل میں اشاعت کی قلت کا شدید احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ متنوع مطالعے سے چشم پوشی بھی جریدے کی مجموعی ادبی حیثیت کا اندازہ کرنے میں مانع ثابت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ادبیوں اور مسائل زبان کے بارے میں اس کی معلومات ناقص رہ جاتی ہیں۔

آپ نے غزل کی وساطت سے اساتذہ اور تلامذہ کے بارے میں افسوسناک حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ جمود توڑنے اور بیداری کی تحریک کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے معاصر ادب کے قارئین پر، ادب کے قاری کون ہیں ؟ وہی جو رسالے خریدتے ہیں اور رسائل کی زندگی محدود ہو کر انہی پر آگئی ہے یعنی شاعر، ادیب، ناقد، محقق اور دانشور ہی ادب کے قاری ہیں اس لئے اس طبقے کو اساتذہ سے مل کر انہیں رسائل خریدنے پر آمادہ کرنا ہوگا اگر ان میں بعض لوگ بہ یک وقت بہت سے اردو رسائل کے سالانہ خریدار نہ بن سکیں تو تلامذہ سے تعاون حاصل کریں۔ ہماری یہ کاوشیں یقیناً رنگ لائیں گی۔

میری ایک تجویز اور ہے کہ ہندوستان کے شہروں کے محلوں یا کالونیز میں اور قصبوں اور دیہات میں اردو کی چھوٹی بڑی انجمنیں قائم کی جائیں اور یہ انجمنیں اردو کے ادبی پرچوں کے منگانے کا باقاعدہ اہتمام کریں اس سے رسائل کو فروغ اور پڑھنے والوں میں ادب سے لگاؤ پیدا ہوگا۔ بہر حال اردو کی خدمت میں سستی اب بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے اس لئے ہم سبھی کو آپ کے جرءات پر داد دینے کے بجائے سنجیدگی سے عمل پیرا ہونا چاہئے۔

جناب قتیل شفائی کی غزل پڑھ کر افسوس ہوا ان کے دو مجموعے ابابیل اور صنم میں بحر متقارب کی بیشتر غزلیں ناموزونیت کا شکار ہیں لیکن شاعر میں جو غزل شائع ہوئی ہے وہ متدارک مخبون ہے اگر اسے مسدس مزاحف میں تقطیع کی جائے تو شکست ناروا کی وجہ سے پوری غزل ہی ناموزوں قرار دی جائے گی مگر بار بار کئی آزاد غزل کہہ کر تقطیع کی جائے تو ذیل کے شعر کسی طرح وزن میں نہیں کھپتے۔ تقطیع کے ساتھ نقل کر رہا ہوں:

نام اس کا آئے بار بار مری غزلوں میں
فعلن فعلن فعول فعل فعولن فعلن

لیکن یہ میری نگارش غیر شعوری ہے
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

رکھتی ہے معطر پوروں میرے ہاتھوں کو
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

جو اس کے بدن میں رچی ہوئی کستوری ہے
فعلن فعلن فعلن فعولن فعلن فع

یہ میرے دوست قتیل کہ جن میں رنگ نہ رس
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

ہاں شاعری ان کی ناپ تول میں پوری ہے
فعلن فعلن فعلن فعول فعولن فع

یہ بحر کثیر الآہنگ ہے مگر اس میں فعول، مفاعلن، فعولن اور فعل جیسے مزاحف ارکان آہی نہیں سکتے اور اگر لائے جائیں گے تو شعر ساقط الوزن قرار دئے جائیں گے۔ جو لوگ ماترا ؤں سے وزن کی بات کرتے ہیں وہ در اصل متقارب اور متدارک کے ساتھ اگر ہندی پنگل کے اصولوں کو دوسری بحروں پر بھی منطبق کرنے لگیں گے تو ایک دن سارا عروضی نظام ہی برباد ہو کر رہ جائے گا۔ قطع نظر متذکرہ ارکان کو اگر جائز قرار دے دیا جائے تو ان کے عروضی نام کیا ہوں گے ؟ اور کیا زحافات کا عمومی عمل متدارک کے بنیادی اوزان میں ترمیم کے لئے جائز ہوگا ؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی جواب ہے ہی نہیں اس لئے ان اشعار کو کسی طرح ناموزوں ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا۔۔۔ موضوع و مفاہیم کا تنوع البتہ قتیل صاحب کی شاعری میں پایا جاتا ہے مگر ناموزونیت کا عیب خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

ستیہ پال آنند کے منظوم خط کی اشاعت اگرچہ آپ کی وسیع النظری کی مظہر ہے مگر اس نظم میں غزل کی مخالفت کا رد یہ بیانیہ کے سپاٹ پن سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے وہ حالی کی طرح بالغ نظر نہیں ہیں البتہ کلیم الدین احمد کی طرح محدود فکر کا ضرور ہیں اس کی اہم وجہ کلاسیکی غزل کا محدود مطالعہ اور غزل گویوں کی فہرست فیض احمد فیض پر ختم کر دینا ہے۔ فیض کی غزل خود رومانیت پسندی کی محدود فضا سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے اس لئے وہ غزل مخالف نظریات کی ترتیب کے وقت فیض کے دیگر معاصر اور ان کے بعد کی غزل پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ قطع نظر اس کے ان کی نظم میں کیا دھرا ہے ؟ یہی مفہوم غزل کے ایک شعر میں بھی آسکتا ہے۔ یار لوگوں نے غالب کے شعر کو غزل کے خلاف ڈھال بنالیا ہے۔ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے حالانکہ یہ شعر ایک قصیدے میں گریز کا شعر ہے جسے غزل کی تنگ دامنی پر ثبت کر کے غالب کو بدنام کیا جاتا خود ا تنگ دامنی کا ثبوت فراہم کرتا ہے قطع نظر اس کے ستیہ پال آنند کی نظم کا مفہوم مذکورہ ایک ہی مصرع میں موجود ہے اور غزل کی ایجازی صفت اور اس کی اہمیت کے لئے یہی ثبوت کافی ہے۔ غزل کا ہر شعر مختصر نظم ہوتا ہے۔ اور دو مصرعوں سے زیادہ مختصر نظم ہو بھی نہیں سکتی اس لئے غزل کی مخالفت نظم کی مخالفت ہے۔ رہا غزل میں موضوعات کی محدودیت کا سوال سو ہمیں جدید غزل کو بھی پڑھنا چاہئے جس میں تکرار کی فضا ہے ہی نہیں۔ خود شاعر کے اسی پرچے میں سولہ شاعروں کی غزلیں موجود ہیں اور کم و بیش ایک سو اکیس شعر شائع ہوئے ہیں کچھ شعروں میں مفہوم کی یکسانیت سے قطع نظر اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو اتنے ہی موضوعات بھی مل جائیں گے۔ یعنی ہر غزل اپنے اشعار کی تعداد کے اعتبار سے مختصر ترین نظموں کا مجموعہ ہے۔ اسی سے غزل کی انفرادی خصوصیت، ایجاز و اختصار وغیرہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور کیا چاہیے ستیہ پال آنند کے تصورات کی نفی کے لئے ؟

آخر میں آہنگ پر مشتمل نظموں کے حوالے سے یہ بھی عرض کروں گا کہ رنگ پوئم میں اگر مصرع اس طرح کاٹا جائے کہ اس کے آخری رکن کا کچھ حصہ دوسرے مصرع کے آہنگ میں مخلوط ہو تو دوسرا مصرع ابتداء میں تھوڑی جگہ چھوڑ کر لکھا جانا چاہئے مثلاً آنند صاحب کی نظم کے ابتدائی یہ مصرعے اس طرح لکھے جانے چاہئیں۔

بہت سے رت جگے جھیلے مفاعیلن مفاعیلن
بہت آدھا کاٹس وقت گذرا مفاعیلن مفاعیلن مفاعی
غم پرستی کے سیہ حجرے میں پہروں بیٹھ کر رونے
لن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

ظاہر ہے کہ دوسرے مصرعے کا لن کٹ کر تیسرے

مصرعے میں چلا گیا ہے اس لئے اگر یہ مصرع دوسرے مصرع کے عین نیچے لکھا جائے گا تو بحر کے ابتدائی رکن مفاعیلن کی تقطیع کے مطابق خارج از وزن قرار دیا جائے گا۔ اور تھوڑا حاشیہ چھوڑ کر لکھنے پر رکن کے کٹے ہوئے حصے کو تقطیع کے لئے مصرع میں لانا پڑے گا۔ اس سے مصرعوں میں وزن و آہنگ کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

زیرِ بحث شمارے کے مشمولات قابلِ مطالعہ ہیں۔ مواد کی طوالت کا احساس ہے مگر غیر ضروری کچھ نہیں ہے۔ آخر میں ملک کے ہر ادب کے ادیبوں اور فنکاروں سے میری درخواست ہے کہ وہ مرکزی حکومت پر زور دیں کہ اخباروں اور رسائل کو بھیجی جانے والی ڈاک کو پرنٹیڈ میٹر پر بھیجی جانے والی ڈاک خرچ کے برابر کردے تاکہ ادب کے خدمت گزار کم سے کم ڈاک کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکیں ساتھ ہی آمد و رفت کے سلسلے میں بھی اس طبقے کو سہولتیں فراہم کرانے کی تجاویز بھی گورنمنٹ کے سامنے رکھی جائیں۔ [شاعر اکتوبر ۱۹۹۹ء کے حوالے سے (ادارہ)]

● P.O. GUNNAUR, DIST.
BADAUN-202522 (U.P.)

حبیب حق

میں نے احمد سہیل کا مضمون "مابعد جدیدیت اور اردو تنقید" غور سے پڑھا۔ جناب نے چند باتیں اچھی کہیں ہیں، خصوصاً پہلے چند پیراگراف۔ لیکن آخر میں ان کا یہ کہنا زیب نہیں دیتا کہ مابعد جدیدیت کے مشغلے کو درست طور پر سمجھنے کے لئے وسیع الفکر اور وسیع المطالعہ ہونا لازمی ہے۔ فاشزم یا مارکسزم یا کسی اور ازم یا تحریک کو بخوبی سمجھنے کے لئے ایسا ہی لازمی ہے۔ کیا ہم مثلاً افلاطون کو پورے طور پر جاننے کے لئے محض افلاطون کی تحریروں تک خود کو محدود رکھیں، یا فوکو اور دریدا (یا ہیگل، نطشے، ابن عربی، ابن ابی سینا) کو سمجھنے کے لئے ان کی ذرا ابھی تحریروں تک ہی رسائی رکھیں؟ ہو سکتا ہے اردو کے نقادان فن ایسی صلاحیت سے محروم ہیں جیسی توقع جناب سہیل کو ہے۔ یوں ترقی پسندی پر آئے دن الزامات عائد کرنا بھی کوئی ادبی / تاریخی / سماجی کام نہیں ہے (اس کا مظاہرہ اسی شمارے میں بشیر بدر صاحب نے کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ فیض اب غالباً بکھرے ہوئے خام رومانی شاعر تسلیم کئے جا رہے ہیں۔ جن کے متعدد شعری پیکر یا تو کلاسیکی فارسی اور اردو ذخائر سے اٹھا لئے گئے ہیں یا پھر رومانی قسم کے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اور اختر الایمان کی وفات کے بعد کوئی بھی 'بڑا' شاعر اردو ادب میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ فیض غالب و میر نہیں (اقبال بھی نہیں)، لیکن اس صدی کے پانچ بڑے شعراء کے ساتھ۔ یعنی کہ اقبال، فانی، میرا جی، ن م راشد اور اختر الایمان۔ ایک عظیم شاعر ہیں۔ کیا ہم جوش اور جگر کو اس زمرے میں رکھ سکتے ہیں؟)۔ ترقی پسند تحریک نے باقاعدہ طور پر اردو ادب میں جدیدیت (ماڈرن ازم) کو فروغ دیا۔ اس تصور / کلچر کو اردو زبان کے ساتھ جوڑا جسے ہم یوروپی روشن خیالی کہتے ہیں۔ اردو جدیدیت بھی اسی کو کھ سے نکلی ہے۔ لیکن مابعد جدیدیت کا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ میری بنیادی تنقید یہی ہے کہ مابعد جدیدیت، فلسفیانہ اعتبار سے، اپنا رشتہ یوروپی روشن خیالی سے توڑ کر دنیا، سماج، فن، ادب، علم، فلسفہ کی وضاحت کرنا چاہتی ہے۔ روشن خیالی کے بنیادی طریقۂ کار سے تو پیچھا چھڑانا ممکن ہی نہیں، تو پھر یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اشیاء سے آگاہی کے ذریعہ حاصل نہیں کرتے ہیں۔ اگر آگاہی کا آکے یونگ کے آرکی ٹائپ قسم کی چیز ہے تو بھی اس کا 'شعور' اشیاء کے ذریعے نہیں ہوتا ہے، بلکہ محض ہمارے ذہن کی بدولت۔ اگر آسمان میں تارے ہیں تو اس کا شعور / پہچان / آگہی / علم ہمارے ذاتی 'شعور' کے ذریعہ ہوتا ہے میرے خیال میں یہ سراسر واہیات طرزِ فکر ہے، سراسر گمراہ کرنے والا، سراسر کنفیوژ کرنے والا۔ نقصان دہ ہے۔ علم کا ایک بڑا کام، غالباً اہم ترین کام۔ سماج کے لئے سود مند ثابت ہوتا ہے۔ بازی گری گاہے گاہے تفریحِ طبع کے لئے موزوں ہے۔ بہر حال احمد سہیل نے چند اچھی باتیں کہی ہیں۔ چند ایک اچھے ریفرنس دئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں مابعد جدیدیت کی لفظوں کی بازی گری سے مرعوب ہونا نہیں چاہئے، بلکہ اس کے 'مغز' تک پہنچ کر حقیقت کا سراغ لگانا چاہئے۔

میں چند نظمیں روانہ کر رہا ہوں۔ ذرا 'مختلف' طور کی ہیں اور ذرا مختلف ڈکشن کا مطالبہ کرتی ہیں۔ واضح رہے میں "نثری نظم" کی (بے معنی) اصطلاح کو قبول نہیں کرتا۔ نظم نظم ہے، نثر نہیں۔ اسی طرح نثر نثر ہے، نظم نہیں۔ یہ نہ تو ادبِ لطیف ہے نہ تو ٹیگور یا جبران خلیل جبران جیسی تحریر۔ نثر کی سطریں توڑ مروڑ کر، مصرعوں کے طور پر کاغذ پر ثبت کر دینا نظم نگاری نہیں ہے۔ نظم تخلیق کرنے کے دوران اکثر ضروری الفاظ 'غائب' ہو جاتے ہیں، اور باتیں ذرا اشاروں میں 'علامتی' طور پر کہی جاتی ہیں۔ نثر میں اگر یوں (یا اس سے بہتر طور پر) لکھا گیا ہے کہ:

> لڑکی جو سڑک کے کنارے چلی جا رہی تھی اس کی
> بھاری سرین کو سنبھالنے کی کوشش میں اس کی کمر
> لچک رہی تھی۔

اس واقعہ کو نظم میں کئی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے، جیسے:

> جب سڑک پر اٹھلا کر چلتی دوشیزہ
> کولہے کے بھار کو سنبھالنے کی سعی میں مشغول
> سنبھل رہی تھی اپنے کمر کو

چاہے یہ کتنی ہی بری نظم کیوں نہ ہو، اسے نثر نہیں کہہ سکتے۔ نثری نظم کہنا تو ادب / لسانیات / جمالیات کی کمی پر دلول ہوگا۔ [شاعر نومبر ۱۹۹۹ء کے حوالے سے (ادارہ)]

. DPT.OF BIO CHEMISTRY,
R.A. UNIVERSITY PUSA-848125
(BIHAR)

قاضی رئیس

ماہ نومبر ۹۹ء کا شمارہ دیکھا، حضرت سیماب کے فکر گرانمایہ سے روشنی حاصل کی اور صفحہ بہ صفحہ سفر کی ابتداء ہوئی آخری پڑاؤ کے قریب خود کو بھی شریک انبوہ رواں پایا۔ ممنون ہوں کہ جگہ عنایت فرمائی۔ سرسری جائزے کے بعد ادبی فیچر وغیرہ کا باضابطہ مطالعہ کیا، ادبی فیچر میں آپ نے جو نکات اٹھائے ہیں غور طلب ہی نہیں بلکہ ان سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی علاوہ ازیں احمد سہیل کی تحریر مابعد جدیدیت اور تنقید، ان کی فکری اور علمی زرخیزی کی آئینہ دار ہے جو قارئین شاعر کو لمحہ بھر ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم تحریر کی چند ایک سطور میں جناب سہیل نے اردو والوں کی اس مسئلہ پر بے بسی یا کم مائیگی کا اعتراف (شاید پوری اردو دنیا کی طرف سے خود ہی) یوں کیا کہ "مابعد جدیدیت کا مشغلہ نہ دل لگی ہے نہ ہی یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی آسانی سے ہضم ہوتا ہے" سوال یہ ہے کہ اگر یہ صرف مشغلہ برائے مشغلہ ہے تو پھر، اور بھی غم ہیں...... ہاں یہ اگر فکری روش یا ادب اور زندگی کو نئے انداز میں دیکھنے برتنے کا زاویۂ نو ہے تو پھر بسم اللہ اسے سمجھنے اور برتنے کی کوشش تو ہونی ہی چاہئے اس میں مایوسی کا اظہار کر کے دروازے بند کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، اس امر سے انکار نہیں کہ یہ ایک مشکل گھتی ضرور ہے بلکہ منہ بند سیپیوں کو سمیٹنا اور آرزومندی سے ایک ایک کا جائزہ لینا موتی کی یافت والا عمل ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری محنت رائیگاں ہی جائے کہ خود سہیل صاحب کی بحث ہمارے سامنے ہے جو اس بات پر دال کرتی ہے کہ پڑھنے سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحیت اردو والوں میں ابھی (خال خال سہی) باقی ہے تو مایوسی کیوں؟ (مایوسی تو کفر ہے) سہیل صاحب کی تحریر جس میں نصف مضمون چھوٹے بڑے، نزدیک دور کے حوالوں سے بھرا ہے، یہ اس پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ سہیل صاحب بذاتِ خود اس "مشغلہ" یا پھر مابعد جدیدیت کے قلزم بیکراں کے ایک کامران پیراک ہیں بھارت کے دیگر بزرگوں / علماء اور ایک

ت ناقدین کی ابھی موجود ہے (فہرست نہیں دوں گا کہ جانتے ہیں) اس مسئلہ پر وقفے وقفے سے یا مسلسل گفتگو کا جاری رہا۔ تاہم میری گذارش سہیل صاحب سے یہی ہے وہ اس موقف میں ہیں کہ مابعد جدیدیت کے تمام خدوخال سے کماحقہٗ واقف ہیں تو اس کی تشریح کا فریضۂ عالیہ بھی ۔یں، ہرج کیا ہے؟ یہ امر اردو اور اردو والوں کے لئے سود بت ہوگا۔ ماہنامہ شاعر کے صفحات ہمیشہ تبلیغ علم کے کھلے رہے ہیں، ہاں مگر تعارفی یا موضوعاتی UPPER SURFACE SUMM پر سرفیس سمری کے بعد خوش نے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس لئے جب ابتداء ں صاحب نے) کر ہی دی ہے، اور ابتدائیہ سے ظاہر ہوتا ۔جناب اس ضمن میں اچھی اور مثبت فکری آراء سے ہماری ں کر سکتے ہیں تو آئندہ شماروں میں قسط وار سہی اصل متن رتح کا سلسلہ شروع کریں، لطف رہے گا، چہل پہل نہیں! ایہ گذارش اس مسئلے کو سمجھنے کی دلی خواہش کی بناء ہے جو ن شاعر کے لئے بھی مفید ہوگی۔ خیر ادبی فیچر میں "جدید تر رجحان" کے تحت آفاق عالم صدیقی کی تحریر نے خوش کر فاق صاحب نے اپنی علمیت لاد کر تارے توڑنے کی ں نہیں کی اور نہ ہی غبارے اڑائے بلکہ بڑی ایمانداری اور ۔دری سے ایک ایسے موضوع پر روشنی ڈالی ہے جو ایک OPEN SEC ہے، ایسی تحریروں کی قدر بھی ہونی چاہئے ت افزائی بھی کہ اسی منظر نامے کے بطن سے کل کے نئے ۔رنے کے امکانات روشن ہیں اور یہی تسلسل زنجیر کی ت آگے بڑھتا رہا ہے۔ نثری حصے میں بشیر بدر صاحب کا "فیض صاحب کی غزل" زرخیزیٔ فکر کا عمدہ نمونہ ہے، ان ۔ذنہ فکر کا اشاریہ بھی ہے اور علمی و ادبی کامرانیوں میں نے کا باعث بھی۔ یہ گفتگو اہم و حساس ہی نہیں بلکہ انہوں بند اور ناپسندیدگی کے جذباتی ضابطوں کی روش کو چھیڑ اور ۔لہ کہیں بھی قلم پر سے گرفت ڈھیلی نہیں پڑنے دی، غیر ۔داری کے ساتھ بات مکمل کی یہ مقالہ بھیڑ چال پرستش ۔دیٔ کو بھی لمحۂ فکریہ عطا کرتا ہے۔ نثری حصے میں دو تین ں بھی شامل ہیں جن میں "دل کاری" میں معدد رحمید کہانی ۔ا ہے۔ معدد رحمید کہانی پن سے سنک رہے، ان کی کہانی ۔ے ہوئے مجھے اپنا ہی ایک دوہا یاد آگیا تو آپ بھی سن لیں۔

شاعر بیٹھے ہیں تجل حسن پڑا ہے ماند
کیسا جو کاڑے گیا اہل دل کو چاند

مہندی ٹونکی کی کہانی "میرا جنازہ" بھی قابل مطالعہ ہے ۔ایہ کہنا پڑتا ہے کہ ٹونکی صاحب نے آغاز تو خوب زوردار کیا تھا مگر کہانی کے FORMULA PRINT SUBJECT فارمولہ پرنٹ سبجکٹ نے اس میں موجود ڈرامائی کیفیت کو بھی شبنم آسا کر دیا۔ [شاعر نومبر ۱۹۹۹ء کے حوالے سے (ادارہ)]

● BASERA-91, 15TH LANE ,BARI-
COLONY, AURANGABAD-431001(MS.)

منصور اعجاز

اردو غزل، نصاب، اساتذہ اور طلباء خورشید حیات کا ادبی فیچر پڑھا انہوں نے بہار کی مثالیں دیں ہیں کم و بیش ویسی ہی حالت پورے ملک میں ہے۔ انہوں نے نئے ادیبوں شاعروں سے متعلق نصاب کا سوال اٹھایا ہے جو لائق توجہ ہے مہاراشٹر میں نئے ادیب نئے شاعر ان کے لہجے زبان سے متعارف کروانے کی کوشش بال بھارتی اور کمار بھارتی (پونے) نے شروع کی ہے پرائمری مڈل اور ہائی اسکول کے نصاب میں چند نئے معتبر مقتدر شاعروں ادیبوں کو پڑھایا جارہا ہے۔

اردو زبان کی بقا کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی نے انجینیرنگ اور میڈیکل سائنس کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے فروغ میں چار چاند لگادئے تھے اردو میں ان مضامین کی نصابی کتابیں تحقیقی مواد نئی ایجادات کا کام اردو میں کیا جاسکتا ہے ملک کی یونیورسٹیوں میں اس طرح کا نصاب عمل میں آئے تو اردو زبان و تعلیم کو فروغ ملے گا صرف افسانہ اور شاعری کی کتابوں سے صرف ایک گوشہ ہی سیراب ہو سکے گا۔ ملک کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے صرف اساتذہ اور طلباء ہی اردو رسائل و اخبارات خرید کر مطالعہ کریں تو فی الوقت کافی ہے دیگر شعر و ادب میں دلچسپی رکھنے والوں سے ان کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے لیکن ایسا کب ممکن ہے؟ اردو والے شہرت اور زر کی لالچ میں غزل سنگروں اور گلوکاروں کے لئے اردو سے ناطہ توڑ کر گانے والوں کی زبان میں لکھنے بولنے اور سوچنے لگے ہیں جبکہ ان سے پہلے کے لوگوں نے گانے والوں کو اپنی زبان اپنا تلفظ اپنی تہذیب سیکھنے پر آمادہ کیا تھا ہمارے شعراء و ادباء کا حال بھی اساتذہ اور پروفیسر صاحبان سے مختلف نہیں ہے "بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ" شعراء و ادباء بھی کم ہی رسائل خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں وہ بھی تو مفت خورے ہوتے جارہے ہیں ہر کوئی چاہتا ہے وہ اخبار و رسائل میں چھپے اور انہیں اعزازی کاپی عزت و احترام سے پہنچائی جائے۔ جن رسائل نے انہیں شائع نہیں کیا اس کی بدنامی کرنے، اس سے نفرت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے سے بغض و حسد کا بھی یہی حال ہے کسی رسالے نے مخالف ادیب کو شائع کر دیا تب اس رسالے میں کیڑے نکالنے سے باز نہیں آتے، ایک دوسرے کی تخلیقات پڑھنے سے گریز کرتے ہیں، حوصلہ افزائی یا نقد و تبصرہ اصلاح تو دور ایسے انجان بنتے ہیں جیسے شائع شدہ تخلیق کا انہیں علم ہی نہیں، کوتاہی بغض و حسد کی کوئی حد ہی نہیں۔

اردو ادب کی مختلف اصناف میں غزل کا جو مقام ہے وہ افضل ہے۔ بے شک غزل ہی نے اردو کو ہر زمانے میں عزت کا تاج پہنایا ہے اردو زبان کی مقبولیت غزل سے قائم ہے۔ غزل کے لغوی معنی اور جو تشریحات پیش کی جاتی رہی ہیں ان میں تعریف یہی رہی ہے محبوب سے / محبوب کی باتیں۔ ایک زمانے میں اس پر عمل کرنے والوں سے جو ابتذال آیا اسے ایک لمبے عرصے تک بھگتنا پڑا۔ الطاف حسین حالی، مسعود حسن خاں وغیرہم نے ہماری شاعری میں تشبیہات تلمیحات استعاروں کے استعمال اور تشریحات کے صحیح مفہوم سمجھائے۔ ولیوں صوفیوں کی خانقاہوں، شہنشاہوں کے درباروں، طوائفوں کے کوٹھوں سے ہو کر غزل رزم گاہ میں پہنچی ملک کی آزادی کا ہتھیار بنی، عوامی مسائل اپنے دامن میں سمیٹے ان کی زندگیوں میں داخل ہو گئی۔ غزل ہر دور میں خوبصورت و خوب سیرت رہی ہے، غزل کا حسن اس کا نشہ اور جادو ہر کسی کو سحر زدہ کرتا رہا ہے، زندگی کے ہر پہلو کو غزل نے اپنے دامن میں سمیٹا، غزل ہر نئے دن کے ساتھ نئی اور تازہ بہ تازہ ہوتی رہی اسی لئے غزل کا جادو، اس کا نشہ غزل جاننے نہ جاننے نہ سمجھ پانے والوں کے سر چڑھ کر بولتا رہا اب بھی بول رہا ہے۔ لیکن غزل محبوب سے باتیں / محبوب کی باتیں کے معنی و مفہوم و تشریحات سے میل نہیں کھاتی شعر کہنے والے کو شاعر کہنا صحیح نہیں ہے، تک بندی کر لینا شاعری نہیں ہے ذہین طباع خلاق، نڈر، منصف، غیرت مند شخص ہی شاعر کا بلند مرتبہ پا سکتا ہے۔ غزل بھی غزل سے مستعار اس کا مخفف ہے یہی سچ بھی لگتا ہے کہ ہرن ہر دم ہر پل چوکنا رہتا ہے لمحہ لمحہ بدکتا رہتا ہے تیزی طراری چستی پھرتی اس کا شیوہ ہے یہ کیفیت شاعر کی ہوتی ہے جو غزل میں در آتی ہے وہ اپنے ماحول، گرد و پیش کے ہر لمحے پر چونکتا ہے چوکنا رہتا ہے ایک ایک حرکت، بات کو محسوس کرتا ہے، عصر کو آئینہ دکھاتا رہتا ہے۔ غزل کی آنکھوں میں حیرت حسرت استعجاب لائق دید ہوتا ہے اس کا چہرہ سڈول چمکیلا بدن دیکھنے (محسوس کرنے) والوں میں ایک عجیب کیفیت اور سنسنی پیدا کر دیتا ہے جو غزل کی جمالیات سے منسوب ہے غزل بن میں اور غزل اردو ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

دل نشیں ہے بہت عروسِ غزل
تازہ نظروں سے دیکھتے رہئے

● RASHID STUDIO, YAWAT
MAHAL VIDHARAB (M.)

[شاعر نومبر ۱۹۹۹ء کے حوالے سے (ادارہ)]

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

نصف ملاقات (خطوط)

مرتب: امام اعظم

مظہر امام کے نام مشاہیر ادب کے خطوط کا یہ ایک انتخاب ہے۔ مظہر امام جدید اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور آزاد غزل کے تو بانی ہی ہیں۔ دوردرشن میں ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ وسیع حلقہ احباب اور دائرۂ معاصرین رکھتے ہیں جن سے تقریباً چالیس سال سے ان کی خط و کتابت رہی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کے ان خطوط کا یہ انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں غالباً اردو میں اس نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ انگریزی میں جواہر لال نہرو نے "اے بنچ آف لیٹرز" کے عنوان سے اس طرح کا ایک مجموعہ شائع کروایا تھا جس میں مشاہیر عالم کے انہیں لکھے ہوئے خطوط کا انتخاب تھا۔

"نصف ملاقات" سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ مکتوب الیہ یعنی مظہر امام اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ اپنے دوستوں کے لئے ایک ہمدرد اور پُر خلوص دوست ہیں۔ ایک ذہین اور طباع فنکار ہیں اور اپنے پورے حلقے میں ہر دلعزیز ہیں۔ لیکن اس اشاعت میں اردو ادب، اور اس کے مختلف موضوعات اور رسائل پر اظہار خیال یا بحث شاذ و نادر ملتی ہے جس کی بجا طور پر توقع رہتی ہے۔ معاصرانہ چشمک اور فنکارانہ ایگو کا اظہار بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ مثلاً باقی اپنے ایک خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "جناب (من موہن) تلخ برابر ناراض چلے آرہے ہیں (باقی کی شاعری سے) آج کل وہ اور (حسن) نعیم صاحب ایک دوسرے کے لئے شاعر اور آڈینس کا کام کرتے ہیں۔ اندر سے دونوں دوسرے کو شاعر تسلیم نہیں کرتے۔" حسن نعیم رقم طراز ہیں کہ: "پروفیشنل نقاد تو بک چکے ہیں، دس ہزار روپے لے کر صلاح الدین پرویز پر سنتے ہیں مضامین لکھے جارہے ہیں۔ وہ خود روپے کے زور پر ادب میں داخل ہونے کو فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ بے چارے محمد علوی نے کتنے پیسے ضائع کئے، اس کی آپ کو بھی خبر ہوگی....." شاذ تمکنت کا ایک اظہار خیال یہ ہے کہ: "احمد ہمیش، عادل منصوری، افتخار جالب، ندا فاضلی، راج نرائن راز اور خدا جانے کتنے شاعر جدیدیت کے زمرے میں چلے آرہے ہیں۔ عمیق حنفی سوچ بچار کرتے ہیں لیکن شاعری محض سوچ بچار کا نام نہیں ہے....." کرشن چندر لکھتے ہیں: "آپ کو معلوم نہیں ہوگا کہ میرے اور نفس راج رہبر (جن کی کرشن دشمنی زباں زد خلائق ہے) کے ذاتی مراسم بہت اچھے ہیں۔ اصل میں ان اختلافات میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اگر میں واقعی اول درجے کا ادب پیش کرتا ہوں تو یہ تمام مخالفت تاریخ کی نظر میں بے معنی ہو جائے گی۔ اور اگر میں واقعی برا ادب پیش کرتا ہوں تو میرے دوستوں کی مدح و ستائش مجھے ادبی موت سے کبھی نہ بچا سکے گی....." راہی معصوم نے اپنے ایک خط میں رضیہ سجاد ظہیر کو کرشن چندر سے بہتر افسانہ نگار تسلیم کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے مظہر امام کو "زخم تمنا" ان کے نام معنون کرنے کے شکریے میں جو خط لکھا ہے اس میں ایک وقار اور متانت ہے۔

لیکن چند خطوط ایسے ہیں جن کے لکھنے والوں کا شمار مشاہیر میں نہیں ہو سکتا۔ اور کچھ بھرتی کے ہیں۔ جعفر علی خاں اثر کا ایک خط صرف دو جملوں پر مشتمل ہے "زخم تمنا کے تحفے کا شکریہ قبول کیجئے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔" کلیم الدین احمد کے دونوں خط نہایت ہی رسمی ہیں جو ظاہر ہے کہ مکتوب نگار کے نام کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شامل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم بتاتے ہیں کہ مکتوب الیہ کے نام لکھے گئے پندرہ بیس ہزار خطوط اور ہیں جو صندوقوں میں بند ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں یقیناً کم سے کم ڈیڑھ دو سو خطوط ایسے نکل سکیں گے جو ادبی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اور بے شمار خطوط ایسے ہوں گے جو 'فن اور شخصیت' قدم کی تحقیق میں ریسرچ اسکالر کے لئے بے حد کارآمد ہوں گے۔ اگر مظہر امام اور امام اعظم کے پاس اتنے خطوط کے مطالعے اور انتخاب کا وقت نہ ہو تو یہ ذخیرہ خدا بخش لائبریری یا انجمن ترقی اردو (ہند) کے حوالے کردیا جائے تاکہ وہ انہیں محفوظ بھی کرسکیں اور انتخاب کے مجموعے بھی شائع کرسکیں۔ کتاب کا گٹ اپ اعلیٰ درجے کا ہے

ضخامت: ۲۴۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے ☆
مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی-۲

مبصر: محافظ حیدر

ذات (شاعری)

اقبال مجیدی

میں جب کسی تخلیق کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ سوچ کر کرتا ہوں کہ یہ تخلیق صرف ایک فنکار کی زائیدہ نہیں بلکہ اس کے پورے معاشرے اور ماحول کی زائیدہ و پروردہ ہے۔ مجھ ہندوستانی کو جب کسی پاکستانی اہل قلم کی کسی کتاب کے مطالعے کا مو جاتا ہے تو میں اسے پورے پاکستان کے تخلیقی مزاج و م اس ملک کے مجموعی تخلیقی رویے کا مظہر سمجھتا ہوں کلیۃ مگر بہت حد تک میرا یہ تصور صحیح سمجھا جائے گا۔ چنانچہ مجیدی کے شعری مجموعے سے مجھے پاکستان کی ہم عصر شا اندازہ قد معلوم ہو رہا ہے۔ میرے اس خیال کو جناب اح قاسمی کی اس مختصر سی سند توثیق سے تقویت ملتی ہے جو کے آخر میں ہے ــــ اور اس سے زیادہ جون ایلیا کی تعارف نامے سے جو شروع کتاب میں مجموعے کی قدر میں اضافہ کر رہا ہے مجھے افسوس ہے کہ میں اقبال مجید شاعری پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے جون ایلیا سے ا نہیں لے پا رہا ہوں اس لئے کہ انہوں نے بڑی تاکید سے لکھ دی ہے کہ اس کی شاعری کے بارے میں ہر ایرے غیر کوئی فیصلہ صادر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی یہ ا جون ایلیا دیں یا نہ دیں مگر اقبال مجیدی نے ضرور دی ہے میں یہ سطریں ان کے پر خلوص اصرار کے نتیجے میں لکھ رہا

اقبال مجیدی کی شاعری کے بارے میں یہ بات بلا تردید کہی جاسکتی ہے کہ یہ سچی، سیدھی سادی، بے ریا نقائص سے پاک، بلوریں غیر اکتسابی، غیر اتباعی اور بہت جری اور خود اعتماد شاعری ہے۔ جری اور خود اعتماد ان معنو کہ اقبال مجیدی اپنے دل کی باتیں کہتے ہیں۔ وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے کی دوسرے کیا کہتے ہیں، کس طرح کہتے شاعری بالخصوص غزل کہا جارہی ہے، انہیں خود کس طرح چاہئے۔ ان کے مزاج کی تخلیقی سرمایت انہیں اس با فرصت ہی نہیں دیتی کہ وہ دوسروں کی طرف دیکھیں۔ دنیا میں سفر کرنے والا اور اپنی ذات کے اندر دن میں ہونے والا باہر سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے من میں ڈو سراغ زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اقبال مجیدی کے کلام کی اس خصوصیت کا اظہا ضروری ہے کہ ان کی شاعری TOTALITY میں اثر کرتی اس کے کسی ایک چھوٹے سے جزو کو بطور نمونہ پیش نہ جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مشکل سے کوئی ایس

ے گا جسے بڑی طمانیت اور بڑے فخر کے ساتھ نقل کیا جائے
ز اس کے باوجود کل اعتبار سے ان کی غزل کو کئی قاری کو ایک پر
لون فضا دیتی ہے، تنہائی نصیب کرتی ہے۔ اپنے نہاں خانۂ
ات میں رہنے کی ترغیب دیتی ہے ایک جوگی کی تپسیا کی یاد دلاتی
ہے۔ اور بلا شبہ یہی خصوصیات ہیں جن سے اقبال مجیدی کو
یںان محسوس کرنا چاہئے۔ اور دوسرے فنکاروں کو رشک کرنا
ہئے۔ میں نے اقبال مجیدی کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ
یا ہے ان کی بنا پر ان کا رشتہ میر سے ملتا ہے وہ جب یہ کہتے ہیں۔

شعر کتنے کہے مجیدی نے
بات پر میر کی کہاں آئی

تو دراصل یہ واضح اشارہ ہے میر سے ان کی قربت کا۔ لیکن
سی بہت بڑے شاعر سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ اخذ
رنا بھی آسان نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اخذ بھی کیا
جائے اور نقالی کے لئے مواخذہ بھی نہ ہو۔ میر سے لینے کے لئے
بہت کچھ ہے۔ متعدد شعراء نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق اس
سے جو حاصل کر سکتے تھے کیا۔ اقبال مجیدی کے حصے میں جو کچھ
آیا ہے اس سے میر کا ہلکا سا شائبہ ہوتا ہے۔ شاعری میں خود کلامی
کی فضا، اندرون کی ہلکی ہلکی آواز، ایک محزونیت بردوش تنہائی،
ایک ایسا اکیلا پن جس میں خود آگہی ممکن ہو، رسم و رہ عام سے
بے نیازی اور جادۂ خاص پر چلتے رہنے کی جرأت۔ یہ اور اس طرح
کے بعض دوسرے SHADES سے مجیدی کی شاعری میں میر
کی ہلکی سی شباہت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ شباہت
خاصی HAZY ہے۔ قطرے میں دجلہ اور جز کل میں دیکھتے ہوئے
بہر حال ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جزو جزو ہے اور کل کل
ہوتا ہے۔ جون ایلیا نے مجیدی کی شاعری کے کونین میں
اعتراف کا شہری بتایا ہے۔ میری طرح شاید انہیں بھی انتظار ہوگا
کہ مجیدی کب کس اقلیم کی مرکزیت حاصل کرتے ہیں:

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ضخامت: ۱۲۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ:
۱۹۹۲ء ☆ پتہ: R-273 سیکٹر ۱۴ بی، شادمان ٹاؤن، نارتھ کراچی
(پاکستان) مبصر: علیم اللہ حالی

صحرا کے پھول (میڈیکل)

ڈاکٹر سید سجاد حیدر

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سید سجاد
حیدر کی جدید تصنیف "صحرا کے پھول" اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو
ایک طرف ذہنی معذور بچوں کے والدین کی رہنمائے تعلیم
و تربیت ہے تو دوسری طرف موجودہ ماحول اور معاشرے کو
سازگار بنانے کا ایک مثبت قدم بھی ہے تاکہ ہمارا انسان معصوم
اور معذور بچوں کو جو خود اپنی نگہداشت نہیں کر سکتے اپنے دامن
میں پناہ دے اور ان کی نگہداری کی ذمہ داری قبول کرلے۔ اس
کتاب کا تیسرا اور اہم مقصد جو لاشعوری طور پر اس تحریر کا اصلی
جوہر بن کر ابھرا وہ معذور بچوں کے والدین کی مصیبت، افسردہ
حالت، درد بھری اور مایوس کیفیت ہے جو معذور بچے کے وجود
سے تمام عمر ان کے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے جس کی وجہ سے
گھر کا سارا ماحول اداس اور بے رونق ہو جاتا ہے اور ان والدین کی
زندگی ایک عذاب بن جاتی ہے چنانچہ اس کتاب میں اس کا حل
اور اس درد کا درمان ملتا ہے جو مصنف کے ذاتی تجربوں سے
حاصل ہوا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے قاری افسوس اور مصیبت کو
چھوڑ کر صبر و ہمت اور استقلال کی طرف رجوع ہوتا ہے اور
خوش بین زاویوں سے ان بچوں کی زندگی کا نظارہ کرنے لگتا ہے
جو ان معذور بچوں کی بہبود کا پہلا اور اہم قدم ہے۔

کتاب کی وجہ تالیف مولف نے غالب کے صرف ایک ہی
شعر سے تکمیل کر دی۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خون دل
قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

یعنی ہر کانٹے کی نوک پر میرا خون دل لگا ہوا ہے کیوں کہ میں نے
صحرا کی باغبانی اس طرح کی ہے کہ میں مثال اور قانون بن گیا۔
یہ شعر حقیقت میں ڈاکٹر سجاد حیدر کی قلبی واردات، ذہنی
کیفیات، کشمکش حیات اور پر ثمر کاوشات کا مکمل ترجمان ہے۔
میر انیس نے کہا تھا۔

پتھر کا دل نہیں ہے یہ دل ہے پدر کا

اکلوتا بیٹا قاسم عباس حیدر سلمہٗ جب ذہنی معذور ہو گیا تو
شفیق باپ نے زمین اور زراعت شناسی کی تحصیلات چھوڑ کر
معذور اور ضعیف انسانوں کی بہبودی اور ان کی ذہنی ترقی اور تعلیم
و تربیت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور تقریباً تیس سال
سے زیادہ صحرا پیمائی کر کے صحرا کے پھولوں کی نشو نما کچھ اس
طرح کی کہ صحرا کے پھول سے پھول کا صحرا تیار ہو گیا جس سے
گلچیں کر کے یہ گلدستہ تیار کیا گیا جو تین ابواب، تخلیق، ذہنی
معذوری اور تعلیم و تربیت پر مشتمل ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحات
کی اس خوبصورت کتاب کے پہلے باب "تخلیق" میں کائنات اور
انسان کی تخلیق کو محکم قرآنی آیات، معروف احادیث اور ذو فہم
عقلی اور منطقی دلائل سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ پھر مقصد تخلیق انسان
اور حُسن انسانی کو بڑی خاص ندرت اور شگفتگی سے شاعرانہ
اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ مصنف خود اچھا ادیب ہے
اس لئے رنگین ملیح لفظوں سے اشعار اور جملوں میں موجزن ہے
اساتذہ کے اشعار عرض مطالب پر یوں چسپاں کئے گئے
ہیں جیسے زیورات میں جواہرات۔ اگرچہ اس باب اول کو کئی
عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن تسلسل خیال و بیان کہیں
ٹوٹنے نہیں پاتا اور سب سے اہم مقصد تالیف کی بنیاد ذہنوں میں
اس طرح مستحکم ہو جاتی ہے کہ قاری کا ذہن ان معذوریوں کو
مشیت کا ارمان کر اپنی ساری توانائی کو اس چیلنج کے قبول کرنے
کے لئے آمادہ کر دیتا ہے اور اس طرح مصیبت اور ناراضی، محبت
اور راحت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ ذہنی معذوروں کو سمجھنے کے لئے
بہت ضروری ہے۔ اگرچہ اپنے پروفیشن کی وجہ سے میں نے ان
موضوعات پر کئی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن اردو میں
یہ پہلی کتاب ہے جس میں لذت زبان کے ساتھ سائنس کی
اصطلاحات اور مضمون کے مطالب کو بڑے خاص حُسن سے
پیش کیا گیا ہے۔ وہ حضرات جو جدید تحقیقی انداز میں دماغ کی
ساخت اور اس کی کارکردگی کو جاننا چاہتے ہیں یہ حصہ ان کے
لے تحفہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ تقریباً چالیس صفحات پر تمام لازم
نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مطالب کی مغربی
کتابوں کے طریقۂ کار پر عنوانات اور ذیلی درجات میں تقسیم
بندی کی گئی ہے اور سائنسی اصطلاحات کو اردو مترادف لفظوں
کے پہلو میں رکھا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو اور لغت کی
ضرورت نہ ہو۔ کتاب کا آخری اور سب سے اہم حصہ ذہنی
معذور بچوں کی شناسائی جسمانی اور ذہنی نشوونما ان کے بہبودی
کے دراز مدت تربیتی منصوبے، والدین، خاندان، سماج اور
حکومت کے فرائض بڑے ہی خاص تجربہ کارانہ مہارت سے
رقم کئے گئے ہیں جو ایک عمر کی مشقت اور تجربات کا نچوڑ ہیں
کیوں کہ مصنف خود اس کارواں میں شامل ہے اس لئے یہ وہ میر
کارواں ہے جس کے دامن پر گرد و غبار کارواں کے نقش نظر
آتے ہیں۔

میرے محدود مطالعے میں اردو میں ایسی کوئی دوسری
کتاب نہیں جس میں ادب کی رنگینی، جذبات کی گرمی، تجربات
کی فراوانی، تعلیم کی رہنمائی، تربیت کی ارزانی، محرومین کی مہمانی
کے ساتھ ساتھ جدید سائنٹفک تحقیقات اور فراواں سائنسی
نکات پر بحث کی گئی ہو اور جس کا واحد مقصد ضعیف کو قوی بے
زبان کو متکلم اور نیم جان کو زندگی دینا ہو۔ یہاں ادب برائے
ادب ہوتے ہوئے بھی ادب زندگی کی اقدار کا پاسدار ہے۔ خدا
کرے اردو ادب میں ایسی کتابوں کا رواج ہو۔

ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ
۲۰۰۰ء ☆ پتہ: القمر انٹرپرائزز، رحمان مارکیٹ، اردو بازار،
لاہور (پاکستان) مبصر: ڈاکٹر سید تقی عابدی

ت ا ب زار

سرور کابری (فن اور شخصیت)

تحریر: داؤد اختر کابری ☆ ضخامت: ۱۸۴ صفحات ☆ قیمت: ۲۵۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

بہادر شاہ ظفر - ایک مطالعہ

ترتیب: شاہد ماہلی ☆ ضخامت: ۱۲۴ صفحات ☆ قیمت: ۶۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی - ۲

ذوق دہلوی - ایک مطالعہ

ترتیب: شاہد ماہلی ☆ ضخامت: ۱۰۸ صفحات ☆ قیمت: ۶۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی - ۲

مومن خاں مومن - ایک مطالعہ

ترتیب: شاہد ماہلی ☆ ضخامت: ۱۱۳ صفحات ☆ قیمت: ۶۰/روپے ☆ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی - ۲

ہمت رائے شرما (اردو ماہیے کے بانی)

تحریر: حیدر قریشی ☆ ضخامت: ۷۶ صفحات ☆ قیمت: ۶۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: معیار پبلی کیشنز، کے - ۳۰۲، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - ۱۱۰۰۳۱

ادا جعفری (فن اور شخصیت)

مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، امراؤ طارق ☆ ضخامت: ۳۹۲ صفحات ☆ قیمت: ۲۵۰/ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: اختر بک ڈپو، اردو بازار، کراچی (پاکستان)

آوارہ گرد (افسانے)

کہانی کار: نند کشور وکرم ☆ ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۸۰/ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، J-6، کرشنا نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

نزول (مجموعہ حمد و نعت)

شاعر: شفیق الدین شارق ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: فضلی بک سپر مارکیٹ اردو بازار، کراچی (پاکستان)

پاکستانی ادب: ۱۹۴۷ء تا حال

مصنف: پروفیسر غفور شاہ قاسم ☆ ضخامت: ۲۴۳ صفحات ☆ قیمت: ۲۵۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۵ء ☆ پتہ: محلہ اسلام آباد، کنڈیاں، ضلع میانوالی (پاکستان)

جستجو (شاعری)

شاعر: منصور عثمانی ☆ ضخامت: ۱۸۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: ناہد انجم منزل، نئی بستی، مراد آباد ۲۴۴۰۰۱ (یوپی)

نیلام گھر (شاعری)

شاعر: طاہر مضطر ☆ ضخامت: ۱۴۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: فروری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: 5-ل، کمپنی باغ روڈ، جیول چوک، جموں ۱۸۰۰۰۱۔

شکیل الرحمٰن (تخلیقی تنقید کا ایک منفرد دبستان)

مصنف: اقبال انصاری ☆ ضخامت: ۹۵ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ایف - ۱۶۷، پانڈو نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۱

رشتۂ احساس (ہندی رسم الخط میں)

شاعر: پردیپ ساحل ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۵۵ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: A-1715 جہانگیر پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۳

شعری آگہی (منتخب تنقیدی مضامین)

مصنف: باقر مہدی ☆ ضخامت: ۲۴۸ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: E-1، روی درشن، کارٹر روڈ، باندرہ (ویسٹ) ممبئی ۴۰۰۰۵۰ ☆ ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، سانے بلڈنگ، ناتا بھائی لین، فلورا فاؤنٹن ممبئی ۴۰۰۰۰۱

تعبیر و تشریح (تنقیدی مضامین)

تحریر: محمد ایوب واقف ☆ ضخامت: ۲۳۱ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: بی - ۳۲۲ نیو میونسپل کالونی، گوونڈی (ویسٹ) دیونار، ممبئی - ۴۳

شام کی ٹہنی کا پھول (افسانے)

افسانہ نگار: سلطان سبحانی ☆ ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ۱۹۳-ایم ایچ بی کالونی مالیگاؤں (مہاراشٹر)

ر سا ل ے

مدیر اعزازی: پروین قادر آغا ☆ ضخامت: ۱۱۴ صفحات قیمت: فی شمارہ ۶۰/روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مکان نمبر ۶، اسٹریٹ نمبر ۷۶، G-6/4 اسلام آباد (پاکستان)

تخلیق (دوماہی)

مدیر: منصف علی ☆ معاون: فہیم انور ☆ ضخامت: صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۵/روپے ☆ زر سالانہ ۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: جنوری، فروری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: 2 جی۔ سی۔ آر۔ سی۔ جی روڈ، شب پور، ہاوڑہ ۷۱۱۱۰۲

الفاظ (سہ ماہی)

مرتبین: نور الحسن نقوی، قمر الہدیٰ فریدی، اسد یار خان ضخامت: ۸۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۰/روپے ☆ مطبوعہ: اپریل، مئی، جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ (یوپی)

ہائیکو انٹرنیشنل (سہ ماہی)

مدیر: سہیل احمد صدیقی ☆ ضخامت: ۸۰ صفحات ☆ قیمت: ۴۰/روپے ☆ مطبوعہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: پس پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۹۹۹، ہیڈ پوسٹ آفس گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

استعارہ (سہ ماہی)

مدیران: محمد صلاح الدین پرویز، حقانی القاسمی ☆ ضخامت: ۴۱۶ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۱۰۰/روپے ☆ زر سالانہ ۴۰۰/روپے ☆ مطبوعہ: جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ A-4، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نیاورق (سہ ماہی)

مدیر: ساجد رشید ☆ ضخامت: ۲۴۰ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ روپے ☆ زر سالانہ: ۱۴۰/روپے مطبوعہ: جنوری تا جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۳۶/۳۸ آلو پارو بلڈنگ، چوتھا منزلہ، عمر کھاڑی کراس لین، ممبئی ۴۰۰۰۰۹

تسطیر (سہ ماہی)

مدیر: نصیر احمد ناصر ☆ ضخامت: ۴۲۴ صفحات ☆ قیمت: موجودہ ۳۰/روپے ☆ زر سالانہ: ۳۰۰/روپے (پاکستان) ۵۰۰/روپے (دیگر ممالک) مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء (شمارہ نمبر ۴،۳) ☆ پتہ: سیکٹر بی - ۲ میرپور (آزاد کشمیر) ۱۰۲۵۰ (پاکستان)

کمپیوٹر کمپوزنگ: عبید الرحمٰن خان

فکر امروز

ادبیات کا منشاء مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مظاہر لسانی میں ایک ندرت، ایک مناسبت اور ایک ترتیب پیدا کردے۔ ادبیات کی حدود ایک طرف تو لسانیات سے ملتی ہیں، دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات سے۔ ایک ادب ناآشنا صرف زبان کو ذریعہ اظہار خیالات تصور کرکے بحث کرتا ہے مگر ایک ادیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی حیات باطنی اور جذبات کی غیر آشکار گہرائی کا بھی پتہ لگائے۔ موضوع کے ماخذ کو الفاظ کے طلسم سے ڈھونڈ نکالے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی ماہیت بہ حیثیت صنف انسانی سمجھ سکے اور معلوم کرسکے کہ خیال سے اس کا کیا تعلق ہے اور ترقی و تہذیب علم و عمل پر اس کا کیا اثر ہے۔ (۲۱ اپریل ۱۹۳۲ء کے ایک خطبے سے اقتباس)

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

شاعر

اشاعت کا اکہترواں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۷۱
شمارہ — ۸

فون: 3829904

اگست ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ✿ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ✿ خلیجی ممالک ۶ [illegible]

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

سرورق
حامد اقبال صدیقی

کرامت علی کرامت	خورشید اکرم	شہناز صبیح
پروین جاوید	پرویز اختر	رام پرکاش کپور
حکیم منظور	اقبال حسن آزاد	ام مسلمی

۳۱

شمارہ ۸ [اگست ۲۰۰۰ء] جلد ۷۱

لاتور دکن - ۲۳ ستمبر ۳۳ء

Latur (Dec.)
B. L. Ry.

شفیقی و مخلصی حضرت دل سلام علیکم - آپکا عطیہ "نغمۂ دل" پہونچا۔ شکریہ۔
جہاں تک آپکے کلام کا تعلق ہے میں نے غور سے پڑھا - نیاز فتحپوری اور عزیز لکھنوی نے جو کچھ آپکے
متعلق لکھا ہے میں رو سے پڑھنا نہیں چاہتا - آپ سمجھ گئے ہوں گے کیوں؟ میں آپکی نسبت
خود ذاتی رائے رکھتا ہوں - قریباً بیس سال سے آپکی خدمت میں نیاز حاصل ہے - اگرچہ انقلاب زمانہ نے
مجھے آپ سے بہت دور کر دیا ہے کہیں آپ کہیں - بہت دنوں سے آپکا دیدار بھی نہیں ہوا لیکن
آج سے بیس سال قبل جو رائے میں نے آپ کے متعلق قائم کی تھی اوس میں ابتک کوئی تغیر نہیں ہوا۔
آپ کے سنجیدہ کلام اور آپکے معصومانہ پیکر کا جب بھی معترف تھا اور اب بھی ہوں۔

منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے سلسلہ میں میں آپکو اک معتبر سخنور جانتا ہوں
یہ صحیح ہے کہ آپکے استاد بھائی حضرت ریاض خیرآبادی کو ملک میں علی العموم زیادہ شہرت و مقبولیت
حاصل ہے مگر کلام کی خوبی فقط شہرت ہی پر موقوف نہیں ہے سنجیدگی و متانت بھی بڑی چیز ہے
اور یہی آپکی خصوصیت ہے مگر حضرت ریاض کا کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ شوخی اور چلبلے پن کے آگے
سادگی و سنجیدگی و متانت کا گرم بازاری ہو نہیں سکتا - مثال کے طور پر آپکی یہ غزل [redacted]
پیش کرتا ہوں ـــــ

یہ شرح غم ہے یہ انجام نالۂ سحری — کہ [illegible] کدہ بے اثری
سنے گا قصۂ عبرت کسی زمانے میں — مرا شعار ہے تیرا شیوہ ستم نظری
اُڑا جو پردۂ ظلمت تو وجد میں تھی نسیم — فضا میں گونج رہا تھا ترانۂ سحری!
عجیب راز ہے ناکامیِ نگاہِ کلیم — قصور دید ہوں یا کمال جلوہ گری؟
سمجھ رہا ہوں تقاضائے عشق نالوں کو — نہ امتیاز اثر ہے نہ جوشش بے اثری
گداز دل ہو نہ شکوہ ہو رشک ہو نہ گلہ — ہوئی ہے رازِ محبت کی کیسی پردہ دری
ادھر تو دیکھ کہ تسکین قلب ہو جائے — سنا ہے تیری نظر میں کمال چارہ گری
وہ منزلیں ہیں جنہیں ہم تو آرزو سمجھیں — یہ وہم کے ہیں کرشمے نہ شیشہ ہے نہ پری
نظر کے سامنے تھا نقشہ بزم عرفاں کا — ہوئی جو عالم ہستی سے مجھ کو بے خبری
خیال و خواب ہوا رخصت بہار کے بعد — وہ انبساط تھا دل میں وہ نغمۂ سحری
رہے طواف حرم میں خیال کوئی حبیب — یہی ہے فلسفۂ عشق و حکمت نظری

یہ استعارہ نازک ہے وصف ابرو میں
کہو ضمیر ہلال سپہر فتنہ گری

جزاک اللہ — یہ ہے نغمۂ دل جو ہم ایسے ماوروں کو بھی غرق سوز و گداز کیے بغیر نہ رہا!
مگر نقار خانے میں اس نغمے کو کون سنے گا؟

ہمیشہ آپ کا
یگانہ چنگیزی لکھنوی
[illegible]

یگانہ بنام دل شاہجہاں پوری

شاعر کے گذشتہ شمارے [جولائی ۲۰۰۰ء] میں یاس یگانہ چنگیزی کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ اس شمارے میں ایک اور اہم خط جو دل شاہجہاں پوری [پ ۱۸۷۵ء — م: ۱۹۵۹ء] کے نام ہے، شائع کیا جا رہا ہے۔ یگانہ کی غزل "یگانہ آرٹ" کہلائی لیکن ان کے مزاج و معیار کی غزل کیا ہو سکتی ہے وہ اس خط اور دل صاحب کی غزل بخط یگانہ سے ظاہر ہے۔

حضرت اصغر [illegible] [پ ۱۸۶۹ء — م: ۱۹۰۰ء] کے باہمی کا معاملہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یگانہ کا یہ خط معاصرانہ شخصی چشمکوں کی طرف اشارہ بھی ہے۔ ماہنامہ افکار (کراچی) کا دل شاہجہاں پوری نمبر زیر طبع ہے۔ [بشکریہ انجم صوفی — شاہجہاں پور]۔ (ادارہ)

اردو چینل

قارئین شاعر کو یاد ہوگا کہ ہم نے جرعات کے تحت سب سے پہلے "اردو چینل" کی بات کی تھی اور اردو چینل کے حوالے سے غزل اور غزل اکادمی تک اپنی بات لے آئے تھے۔ ہم نے اردو چینل کا خواب تو اس وقت سے سوچنا شروع کر دیا تھا جب ہندوستان کے ایک سابق وزیر اعظم نے تاریخی لال قلعہ سے ہندوستان کی کئی بڑی زبانوں کے سرکاری چینل شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ زبانیں جن کے اپنے اپنے علاقے ہیں۔ علاقائی سرکاری چینل ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت وقت نے جن زبانوں کے لئے چینل شروع کئے ان کے بولنے والے ہندوستان سے باہر بھی آباد ہیں۔ انھیں اپنی زبان اور اپنی زبان کے کلچر کے لئے سٹیلائٹ چینل کی ضرورت تھی۔ لیکن اردو زبان کے لئے ایسا نہیں کیا گیا جب کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو بولنے والوں کی تعداد ہندوستان کی کسی بھی بڑی سے بڑی زبان کے بولنے والوں سے زیادہ ہے۔ عالمی زبانوں کی درجہ بندی میں ہندی بھی اردو کے بعد ہی آتی ہے بد قسمتی سے اردو کو پاکستان اور مسلمانوں کی زبان تصور کر لیا گیا۔ اردو پاکستان کی قومی زبان تو ہے لیکن ہندوپاک کے تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ خالص ہندوستانی زبان، ہندوستانیوں کی زبان ہے اور ہندی کے بعد یا ہندی کے ساتھ ہندوستان کے سیکولرازم کی روح ہے۔ اس زبان کا اپنا سرکاری چینل ہونا چاہئے تھا یا پھر سرکاری سطح پر ہندی کے ساتھ ہر محاذ پر اردو کو بھی شامل رکھنا چاہئے تھا۔ اور دونوں ہی کام نہیں ہوئے۔ ہندوستان میں اردو کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہندی ہی کی طرح یہ پورے ہندوستان کی زبان ہے اور ہندی کو ہر سطح پر مدد دے رہی ہے جسے محسوس تو کیا گیا لیکن عملی طور پر کوئی ایسا کام نہیں کیا گیا جو ہندی کے ساتھ اردو کو بھی تقویت دیتا۔

سابق وزیر اعظم کی تقریر کے بعد اردو والوں نے اس پر احتجاج نہیں کیا، کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ ہم نے جرعات کے تحت احتجاجی اداریہ لکھا تھا اور اردو سٹیلائٹ چینل کی مانگ کی تھی۔ وہ ہماری تنہا آواز تھی۔ حکومت وقت سے مخاطب ہماری احتجاجی آواز کے پیچھے اردو والے نہیں تھے۔ وہ سب تو اردو اکادمیوں، سرکاری اداروں، یونیورسٹیوں، کالجوں اور نام نہاد اردو خدمت گذاروں کے طور پر اپنے لئے سوچ رہے تھے اور مصروف کار تھے۔ اردو چینل کے لئے ہم نے خواب سوچے، اداریے لکھے اور عملی طور پر کچھ کر گذرنے کا حوصلہ بھی کیا۔ اس دوران یہاں وہاں سے خبریں بھی آتی رہیں کہ فلاں اور وہ فلاں ملک اور کمرشیل کمپنیاں اردو چینل شروع کر رہی ہیں۔ حیدر آباد سے فلک اردو چینل کے اشتہارات بھی شائع ہوئے، ان کے دعوے بھی بڑے تھے، پھر خدا معلوم کیا ہوا۔ پاکستان سے خبریں آئیں کہ ایک اردو چینل شروع کیا جا رہا ہے بلکہ شروع بھی ہو گیا ہے لیکن اس کی کہیں کوئی گونج نہیں ہوئی۔ زی ٹی وی نے بھی اعلان کیا تھا۔ ادھر حیدر آباد میں نائیڈو گروپ کا اپنا تیلگو چینل ہے ETV، اسی کے تحت ہندوستان کی مختلف زبانوں کے چینل شروع کئے گئے ہیں اور اب اکتوبر سے اردو چینل شروع کیا جا رہا ہے۔ ایک خوش کن خبر یہ ہے کہ شارجہ (عرب امارات) سے اردو ٹیلی ویژن نیٹ ورک نے ۱۱ر جولائی سے اپنی نشریات کا آغاز کر دیا ہے جو ۲۴ گھنٹے تفریحی پروگرام پیش کرے گا۔ زی ٹی وی والے اپنا اردو چینل شروع کر رہے ہیں ان کے پاس سرمایہ ہے، وسائل ہیں، وسیع تجربہ ہے۔ ہمارا کام بھی جاری ہے۔ ہندوستان کی کئی بڑی زبانوں کے ایک سے زائد چینل ہیں۔ اردو کے یہ چینل اردو کے لئے خوش آئند ہیں۔ ایک سے زائد اردو چینل کی موجودگی عالمی سطح پر اور بطور خاص ہندوستان میں اردو کے لئے ایک نئی فضا قائم کرے گی۔ عالمی الیکٹرانک میڈیا سے براہ راست اس زبان کا رابطہ معاشی وسائل پیدا کرے گا۔ اور بہت کچھ ممکن ہے۔ چونکہ ہم خود اردو چینل کے لئے کام کر رہے ہیں لہٰذا ہمارے کچھ سوال ہیں کیوں کہ جو بھی اردو سٹیلائٹ چینل شروع ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے اس کا آئیڈیل پی ٹی وی-۲ ہے مگر ہمارا معیار یا ہمارا آئیڈیل یہ نہیں ہے...... بہر حال! بہت سارے سوال ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

یہ اردو پروگرام کیا ہوں گے؟ ان پروگراموں کا مزاج کیا ہوگا؟ اردو پروگراموں سے مراد کیا ہے؟

موجودہ بہت سارے سٹیلائٹ تفریحی چینلس کے پروگراموں سے مختلف پروگرام کیا ہو سکتے ہیں؟

بول چال کی زبان میں ہندی اردو کے مشترک الفاظ یا مشترک زبان کے کلچر کو پروگراموں کی زبان بنایا جائے گا یا خالص اردو کے استعمال سے یہ بتایا جائے گا کہ یہ اردو چینل ہے؟ دراصل عوامی سطح پر اردو زبان کا تصور اب فارسی عربی آمیز زبان سے عبارت ہے۔ سارے ہی تفریحی چینلس فلمی گانوں اور فلموں اور ان سے متعلق طرح طرح کے ضروری، غیر ضروری مضحکہ خیز پروگراموں سے بھرے پڑے ہیں یا انہی پر منحصر ہیں۔ فلموں کی زبان کیا؟ بظاہر تو سب کچھ ہندی کے کھاتے میں چلا جاتا ہے جب کہ گانوں اور مکالموں میں ہندی آمیز یا اردو آمیز زبان استعمال کی جاتی ہے۔ کسی الگ مجموعی انفرادیت کے بغیر جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ اردو چینل ہے کوئی بھی اردو چینل دیگر سٹیلائٹ چینلس کی طرح ہو جائے گا۔

ستیہ پال آنند

وقت کا شائی لاک

میں کیا کروں؟ خود سے پوچھتا ہوں
کہ قرض میں بال بال میرا بندھا ہوا ہے
یہ قرض صدیوں کا، جس کا جوآ
مرے نحیف و نزار بچپن کے نرم کندھوں پہ
پیدا ہوتے ہی رکھ کے مجھ کو کہا گیا تھا
تمہیں چکانا پڑے گا، بچے
یہ قرض سانسوں کے رہتے رہتے!

یہ قرض ماں باپ اور کنبے کا
قرض بہنوں کا اور بھائیوں کا
قرض بیوی کا اور بچوں کا
قرض دنیا کا جس کا دست طلب
ہر اک مرحلے پہ پھیلا ہوا مرے سامنے رہا ہے
یہ قرض تھا حادثوں کا جو میرے جسم پر
بجلیوں کی مانند گر چکے ہیں
یہ قرض سب واجب الادا تھے
مگر جو اپنی رضا سے میں نے
خود اپنے کھاتے میں لکھ لیا تھا
وہ قرض حرف و ندا کا تھا
لفظ کی تہوں کا
کہ جن میں اک غوطہ خور کی طرح
مجھ کو معنی کے مخزنوں کو کھنگالنا تھا!

میں اب بڑھاپے میں اتنا بھاری
یہ قرض کیسے ادا کروں گا؟
کہ وقت کا شائی لاک تو
مرے دل کے ہی آس پاس کا گوشت مانگتا ہے!!

● 605 ADAMS STREEET, HERNDON,
VA 20170 4618 (U.S.A.)

محمد سعید الظفر چغتائی

رباعیات

پانی وہ رواں کہ جس سے امرت شرمائے
راہوں راہوں گھنیری زلفوں کے سائے
خوابوں کی طرح حسین تھی دنیا لیکن
ہم نے نہیں چاہا کہ وہ جنت بن جائے
☆
گر تاج محل نیا نہ کوئی بن پائے
تخئیل ہی گرمائے، جگر ہی برمائے
مرمر میں نہ ڈھل سکے مرے ہاتھ سے تو
آنکھوں ہی میں کوئی خواب زحمت فرمائے
☆
شب بیت گئی: ہے اب سحر کا ہنگام
بس آنکھ لگی کہ جگمگائے در و بام
حسرت رہی جس کی ہوش میں آنکھوں کو
کیا خواب میں جاگے گا وہی ماہِ تمام؟
☆
بہنے نہ دیا آنکھ سے زودِ خوں ناب
آنے نہ دیے زباں پہ اسرارِ کتاب
پیتا رہا زہر و شہد دنیا کے قلم
تب جاکے ہوئی ہے لوحِ سرمستِ شباب
☆
ناگاہ طلسم خوابِ شب کا ٹوٹا
جاگ اٹھا چمن زار کا بوٹا بوٹا
پتھر نہیں سینے پہ جو رکھے تھے پہاڑ
اُن سے عرفانِ غم کا سوتا پھوٹا

● KABIR COLONY, JAMALPURA,
ALIGARH (U.P.)

محمور سعیدی

منزل ہے جو سب کچھ تو سفر کچھ بھی نہیں کیا
یہ حسنِ سرِ راہ گذر کچھ بھی نہیں کیا
کیا ان سے الگ بھی کوئی تقدیرِ چمن ہے [illegible]
یہ شاخ و شجر، برگ و ثمر کچھ بھی نہیں کیا
پل بھر نہ کوئی عکس نظارہ ہوا روشن [illegible]
آئینۂ صد ذوقِ نظر کچھ بھی نہیں کیا
لمحات کے بے کیف تسلسل کے سوا [illegible]
یہ سلسلۂ شام و سحر کچھ بھی نہیں کیا
ہر موڑ پہ اک مرحلہ سخت ہے درپیش
اس راہ میں امکانِ دگر کچھ بھی نہیں کیا
جو سوچ رہا تھا وہی پھر سوچ رہا [illegible]
اس پر مری باتوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا
یہ سچ کی دیوار گرا کر بھی [illegible]
جو کچھ یہ ادھر ہے وہ ادھر کچھ بھی نہیں [illegible]
بیگانہ ہی رہتا ہے، خیالوں میں بھی [illegible]
اس کو مرے خوابوں کی خبر کچھ بھی نہیں [illegible]
کیوں در بدر شہر ہے اتنا [illegible]
محمور ترے واسطے گھر کچھ بھی نہیں [illegible]

M-37/41 C, KRISHNA KUNJ,
[illegible] NAGAR, DELHI-110092



عین رشید

میرے بعد آ

بدلے گا رنگِ شامِ الم
میرے بعد آ
ہو گا ذرا سا درد بھی کم
میرے بعد آ
تنہائیاں بھی اپنی ہیں
اپنی ہیں ساعتیں
خود ساختہ ہیں سارے یہ غم
میرے بعد آ
خوابوں کی اس منڈیر سے دیکھا کئے مجھے
یہ اور بات ہے کہ ہوئی چشم میری نم
نمناکیوں کی بات ختم
میرے بعد آ
ہریالیوں کی بھیڑ
مگر دکھ کی کاشت ہے
بدلے گا رنگ چرخِ کہن
میرے بعد آ

● 28/1/A, GARIAHAT ROAD,
HOUSING ESTSATE,
KOLKATA-700029

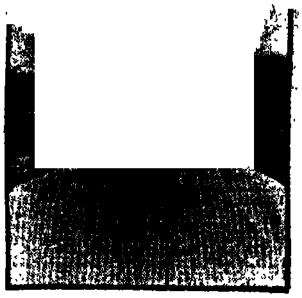


شاہین بدر

خوشبو گئے دنوں کی

گزرتی ساعتوں
بچھڑے ہوئے لمحوں کی خوشبو
آنکھ کے ویران دریچے کی خموشی توڑ کر
باہر نکلتی ہے
تو میری زندگی کے طاقچوں میں
خستہ تن یادوں کی شمعیں جاگ اٹھتی ہیں
مرے مہمان لمحے
میرے خوابوں کے گلستاں میں
تعاقب میں سنہری تتلیوں کے
پھول پودوں تک پہنچتے ہیں
جہاں شبنم کے قطرے
سبز پتوں پر
دعا چہرہ لئے
پاکیزگی کا درس دیتے
گئی رُت کے سنہرے پاؤں میں بجتی ہوئی
پازیب کی دھڑکن
مرے گذرے ہوئے لمحے کی بستی میں مچلتی ہے
تو میری روح کے صحرا میں
بکھری چاندنی کی نیلگوں دھندلاہٹیں
بیدار ہوتی ہیں
میری نم ناک آنکھوں سے گذرتی روشنی
قوسِ قزح کو ماند کرتی ہے
میرے خوابوں کے بوسیدہ بدن پر
مرے ماضی کی سنہری ریشمی پوشاک ہوتی ہے

● A-295, SHADMAN TOWN
SECROT-14-B, NORTH KRACHI,
KARACHI 75850 (PAK)



احمد سہیل

سفاک لڑکی سے آخری مکالمہ

جب لڑکی خاموش ہو جائے
تو خواب تعبیر سے جدا ہو جاتے ہیں
جب لڑکی مسکراتی ہے
تو ہم سے آزادی چھین لی جاتی ہے
ہم دنیا میں عدت کے دن گزار رہے ہیں
مجھے موت دے دو
میں اپنی زندگی میں واپس جانا چاہتا ہوں
موت ایک معمہ ہے
سایوں کے پیچھے وہ اپنی تعریف سن کر رو دیتی ہے
الجھے ہوئے اندھیروں میں
زندگی مجرم بنی کھڑی ہے
تم خزاں سے پہلے آ جانا
زندگی بیچنے والا سپاہی
موت سینے پر سجاتا ہے
موسموں کے بدل جانے سے
پیڑوں سے پتے جدا ہو جاتے ہیں
مگر جدائی کا کوئی موسم نہیں ہوتا
جتنی دیر میں یہ نظم پوری ہو
تم لوٹ آنا
جاڑوں سے پہلے تم مجھے آزاد کر دو
یہ اس دن کی کہانی ہے
جب شہر سرِ شام سو گیا تھا

131-MEMORY LANE, # 201 PALES
INE, TX 75801 (U.S.A.)

مابعد جدیدیت پر مکالمہ کچھ اور ....

د س ح ر

مابعد جدیدیت پر مکالمہ تو رسالہ شاعری میں روشن ہوا تھا اور یہ بات ۱۹۷۹ء ۱۹۸۰ء کی ہے۔ اس کے بعد شاعر کے خاص و عام شمارے اسی نہج پر ترتیب دئے جاتے رہے وہ نئے نام جو ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۰ء کے آس پاس اپنے تخلیقی نور سے ابھر رہے تھے اور پھر جو ۱۹۸۰ء کے بعد اور ۱۹۹۰ء کے درمیان ابھرے، ان میں سے بیشتر کا تعلق شاعر ہی سے رہا ہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ جو حالیہ دو دہائیوں میں قلم کاروں نے آزادیٔ فکر کی بات کی ہے اور ادب تخلیق کیا ہے یا کر رہے ہیں ان کی ترغیب و تحریک کا ایک بڑا سبب رسالہ شاعر بھی ہے یہ اور بات ہے کہ ہم نے کوئی 'لابی' نہیں بنائی 'گروپ' یا 'ادبی گروہ' نہیں بنایا کیوں کہ ہم جس آزادیٔ فکر کی بات کرتے ہیں اس کے لئے کسی ادبی یا سماجی 'اصطلاح' کی ضرورت نہیں تھی پہلے ہی ترقی پسندی اور جدیدیت کی ہنگامہ آرائیوں سے نئی نسل ادب گئی تھی۔ ادب کم اور ادب سے پرے سرگرمیاں زیادہ تھیں۔ چنانچہ نئی نسل کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ پہلے تمام پابندیوں اور حد بندیوں کو توڑے پھر کوئی بات کرے۔ یہ جو ایک چلن میں آگیا کہ تمام فلسفے اور رجحانات مغرب سے مستعار لئے جائیں اور انہیں کے زیر اثر اپنا ادب تخلیق کیا جائے، اس چلن کو تبدیل کرنے کی ضرورت کو ہم نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا ہمارا کلاسیکی ورثہ خود بہت زرخیز اور غیر معمولی ہے اور غزل جیسی ذہین ترین صنف سخن ہمارے پاس ہے۔ اردو میں جو غزلیہ اور پابند نظمیہ شاعری (آزاد اور نثری شاعری نہیں) ہوئی ہے وہی ہماری اچھی اور بڑی شاعری کا ماڈل ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے تو مغربی شاعری کو اور اس شاعری کی تنقید کو اپنا ماڈل بنایا۔ حد تو یہ ہے کہ غزل کے لئے بھی اسی مغربی شاعری اور تنقید کو اپنا معیار و ماڈل بنایا گیا۔ ہم نے ۱۹۷۸ء ہی سے شاعر میں روایت اور اپنے عصر کے امتزاج کو اہمیت دی اور نئی نسل کو ایک ذہن دینے کی سعی کی جس میں ہم کامیاب رہے۔ اور اب ۱۹۹۰ء کے بعد کے قلم کار بھی اسی ذہن کے ساتھ آئے ہیں کہ آزادیٔ فکر کے ساتھ ادب تخلیق کرنا ہے اور ایسا ہو بھی رہا ہے تاہم ابھی کنفیوژن بھی ہے کیوں کہ بچے کھچے ترقی پسند اور جدیدیے جو اپنے وقتوں میں فعال اور حاوی رہے ہیں، مختلف اداروں، ادبی کمیٹیوں، یونیورسٹیوں، سرکاری مشاورتوں اور زندگی کے ان شعبوں سے وابستہ ہیں جو سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نئی نسل اب ان کی جگہ لینا چاہتی ہے اور یہی کشمکش اور تگ و دو یا رسہ کشی، نئی اور پرانی نسل کے درمیان ہے۔۔۔ ادبی فیچر کا سلسلہ معاصر ادبی مسائل پر مکالمہ قائم کرنے اور مثبت و تعمیری مباحث کو روشن کرنے کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ اس میں زبان و ادب کے نت نئے مسائل کو انگیز کرتے ہوئے نئی نسل کو اس میں شامل کرنا مقصود ہے۔ شاعر کی گلوبل ریڈر شپ اور نئی نسل کے قلم کار و قاری میں اس کی مقبولیت نے ہمیں حوصلہ دیا ہے کہ اسے مزید Live بنایا جائے۔ مابعد جدیدیت کی بحث کا دائرہ خود ہمارے اندر بہت وسیع بلکہ لامحدود ہے۔ یہ بحث مستعار مغربی فلسفوں اور رجحانات کے ذکر کے بغیر بھی ممکن ہے۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے ادب اور رجحانات کو موضوع تو کیا جا سکتا ہے، مگر یہی سب کچھ ادب نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ورثے پر فخر کرنا بھی آنا چاہئے۔ اس شعور کے بغیر ہر طرح کا 'کنفیوژن' بنا رہے گا۔ مندرجہ ذیل تین مضامین پر فی الحال کسی ادارتی شذرے کی ضرورت نہیں۔ [الف الف]

اک عمر ہوئی بیزار ہوئے

خالد عبادی

مابعد جدیدیت کے ساتھ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا ہے کہ اسے سمجھنے سے زیادہ سمجھانے کی کوشش کی جانے لگی اور اس کے تعبیری حقائق کو عام کرنے کے چکر میں اس کے فکری و قائع دب کر رہ گئے۔ ورنہ اس وقت مجھے یہ کہنے کی قطعی ضرورت نہ تھی کہ مابعد جدیدیت کا نئے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک تو اس لئے بھی کہ یہ سو فیصدی جدیدیت کے بعد کی صورت حال کو ظاہر کرنے والی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جدیدیت کے بعد (یعنی جدیدیت کی موت کے بعد) لکھنے والوں نے (یعنی جدیدیوں نے) وہ راستہ اختیار کر لیا جس کے ڈانڈے غیر جدیدیت سے ملتے ہیں۔ اسی غیر جدیدیت کو مابعد جدیدیت کہا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئی نسل خود بار بار اعلان کر رہی ہے کہ وہ کسی نظریے یا فارمولے کے تحت ادب تخلیق کرنے کے موڈ میں نہیں۔ ایسے میں اس اصطلاح کو نئی نسل کی تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ کیوں کر نتھی کیا جا سکتا ہے۔ یا جو کبھی شامل محفل ہی نہیں رہا اس پر محفل سے اٹھنے کا یا آداب محفل کے انتقاض کا الزام کیسا؟ یہ ساری صورت حال جدیدیت اور جدیدیوں کے متعلق ہے۔ اس میں خواہ مخواہ نئی شاعری یا نئے ادب کو گھسیٹنا مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں اس کے مابعدیا (موجودانہ) ظہور کی "زمانہ ساز" تاویلیں کا ڑھی جا رہی ہیں۔ بھائی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ جدیدیت کے متوازی چلنے والی تحریک یا رجحان ہے اور یہ (مابعد جدیدیت) اتنی ہی بوڑھی ہے جتنی جدیدیت۔ ممکن ہے آج سے ۳۰۔۴۰ سال پہلے اس کی موجودگی کے باوجود اس کا اظہار ضروری نہ سمجھا گیا ہو یا اس کی جرأت نہ کی جا سکی ہو۔ میں کہتا ہوں مابعد جدیدیت کو اس طرح سمجھنا زیادہ مناسب اور قرین قیاس ہوگا۔ ویسے مثالیں تو کہیں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ انکساری سے کام لیا جائے تو ترقی پسند شاعروں کے اشعار، فیض، مخدوم اور علی سردار جعفری کے ساتھ بھی رکھے جا سکتے ہیں اور عزیز قیسی، شہریار اور ظفر اقبال کے ساتھ بھی۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جدیدیت کے عناصر ادب میں تبدیلی نے اسے مابعد جدیدیت کی شکل دے دی ہے اور جس فن پارے کے لئے آج جدید کا استعمال کیا جا رہا ہے

دراصل وہ مابعد جدید ہے۔ یعنی اس جدید سے یکسر مختلف ہے جو ۷۰ء کی دہائی میں رائج و حاوی تھی۔ ظاہر ہے کہ جدید ہوتے ہوئے بھی جن شاعروں یا ادیبوں نے جدیدیت کی اندھی تقلید سے گریز کرتے ہوئے اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں یا غالی جدیدیوں سے الگ ہٹ کر اپنی الگ پہچان بنائی وہی مابعد جدید کہے جانے کے اصل مستحق ہیں۔ غلط بخشی صرف مثبت ہی نہیں ہوتی منفی بھی ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت سے گفتگو کرتے ہوئے ان باتوں کو نظرانداز کرنا مابعد جدیدیت سے برآمد ہونے والے مثبت نتائج کو ہمیشہ کے لئے سبو[illegible]دینے جیسا ہی ہو[illegible] طرح کی کوششوں کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جدیدیت کی نئی تراش خراش اور اس کی غیر واقعی تاویلا[illegible]ں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس نے پرانی یا معروف جدیدیت کو مسخ کرنا شروع کر دیا ہے اور دھیرے دھیرے وہ جدیدیے جنہوں[illegible]ں تاریخی کردار ادا کیا تھا، حافظے سے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں چونکہ حقیقی صورت حال تک رسائی حاصل کرنے کا باعث ہو سکتی ہیں اس لئے قدرے وضاحتی انداز اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ کہنا صرف یہ تھا کہ نئے لوگوں کی دلچسپی اب ایسی اصطلاحوں میں ذرا بھی نہیں جو مغرب سے مستعار ہوں۔ خاص طور سے ایسے وقت میں جب کہ انسانی نفسیات کی تفہیم اور نسل انسانی کی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں اس کی ترجیحات اس کے تعصبات اور اس کے علائق انتہائی مایوس کن اور ہولناک رہے ہیں۔

خیر..... تو ۱۹۸۰ء کے بعد نئے لکھنے والوں کا جو قافلہ سرگرم سفر ہوا ایک تو اس کے آس پاس کوئی ایسی تحریک یا رجحان نہ تھا جو اسے اپنی جانب متوجہ کر سکتا۔ یا یہ کہ نو بہ نو اور نت نئی پُر فریب تاویلات کے چکر میں اس طرح مسخ کر دیا گیا کہ کوئی واضح پہچان نہ رہی۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے تحریک کاری یا رجحان سازی سے پیدا ہونے والے واجبات و مفسدات کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ اس مزاج اور فطرت کا شاندار مظاہرہ تھا جس کے یہاں رواداری، وسیع القراری اور ہمہ اختیاری کا شمار زندگی کی اولین اور بہترین قدروں میں ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۳۰-۳۵ کے بعد اپنی مٹی کی بو باس اور روایتی سوجھ بوجھ کے ساتھ ابھرنے والی یہ ذہین اور سنجیدہ نسل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نسل کے لوگ مختلف اور غیر مشترک مزاج رکھنے والے رسالوں میں اس تواتر سے چھپتے اور مدیروں کی توجہ حاصل کرتے نظر نہ آتے۔ اب سے پہلے یہ صورت حال اتنی عام اور لائق توجہ نہ تھی۔

۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، خالد جاوید، طارق چھتاری، شاہد اختر، ترنم ریاض اور مظہر سلیم وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں جب کہ شاعری میں نمایاں ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل اور حیران کن ہے۔ افسانہ نگاروں نے جہاں ماقبل کے موضوعات سے کنارہ کشی اختیار کی اور ٹریٹمنٹ کا انداز بدلا، وہیں شاعروں نے اپنے قریب و دور کے ایسے موضوعات کی طرف توجہ کی جو انسان کی زندگی کو براہ راست متاثر کرنے والے تھے۔ فن کے ساتھ بھی انہوں نے جانب داری، غفلت شعاری کے بجائے ہوشیاری اور بردباری کا معاملہ کیا۔ یہی سبب ہے کہ آج ادب میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی جا رہی ہے۔ ایسی خوشگوار تبدیلی جس کا برسوں سے انتظار تھا۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہیں۔ ترقی پسند ہوں یا جدید، روایت پسند ہوں یا کلاسیکی مزاج رکھنے والے ہر چہار جانب سے ان کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

یہ بات انتہائی افسوس ناک ہے کہ کچھ لوگ آج بھی مغرب سے مستعار نظریات و رجحانات کو پسندیدگی اور نیاز مندی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ان ابلاء نے مشرقی حوالوں کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ بالواسطہ یا غیر شعوری طور پر مرتب ہونے والے اثرات کا کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے جس کا میکانیکی عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ بھی کہ تفکر یا دماغ سوزی مشرق کا خاصہ ہے۔ جن کی انہیں مطلق خبر نہیں۔ ٹھیک ہے یہ کام بھی سایۂ دیوار یار میں بیٹھ کر انجام دیا جاتا ہے لیکن اسی سایۂ دیوار نے حافظ، رومی اور میر و غالب جیسے شاعر پیدا کئے اور آئندہ بھی یہ سلسلۂ باد بہاری جاری رہے گا۔ ستاروں کے جھرمٹ اور کنج تنہائی میں بیٹھ کر لکھی گئی چیزیں ہر زمانے میں سامان راحت اور دل کا قرار بنتی ہیں۔ یہاں دوسری باتوں کی گنجائش اور خواہ مخواہ کے غلط مبحث کی کوئی ضرورت نہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار یا اس قماش کے دوسرے شعروں کو ذہن میں رکھیں بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔

نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو ـــــ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ـــــ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ـــــ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
اتنا نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت ـــــ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ
حیرت کا اظہار نہیں کر پائے ہم ـــــ ان آنکھوں نے پھر ہم کو پہچان لیا

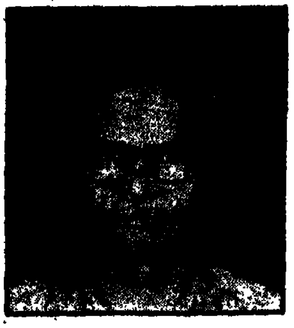
میں نے شروع میں شاعری کے لئے سیاسی بصیرت، دانشورانہ بلاغت اور فنی جسارت کی بات کی تھی۔ اور یہ ساری باتیں خود انکاریت کے حوالے سے کی گئی تھیں۔ آج کی نسل پورے طور پر خود انکار ہے۔ اس کی خاموشی ہو یا اس کی گویائی، اس کا عمل ہو یا اس کی بے عملی سب اس کے اپنے مزاج کے زائیدہ ہیں اور یہ مزاج اپنے سیاق و سباق میں صدفی صد روحانی ہے۔ مجاز و حقیقت کو ایک ہی نظر سے دیکھنے کی کوشش یا ان دونوں کی دوئی پر وانشگاف اصرار سے ایک طرح کا تغافل یا تغافل آمیز بے تعلقی اس مزاج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جس کے یہاں فلسفہ طرازی یا نظریہ سازی سے انکار گویا بے آرامی اور بدکامی سے انکار ہے۔ شاعری ادب کی روح سے ہم کلامی اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب شاعر ایک بار پھر اپنی الہامی کیفیت اور غیبی رسدیابی کے حوالے سے یاد کئے جائیں گے۔ اور ان کی بشریت ایک طرح کے پُر اسرار ہالے میں مامون ہو جائے گی۔ ممکن ہے دوسروں کے لئے اس طرح سوچنا آسان اور فرحت بخش نہ ہو۔ لیکن جب میں آج کی شاعری کو دیکھتا ہوں تو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ہماری تنقید، ہمارے ادبی، تہذیبی و علمی ادارے اور اسی نوع کے دوسرے مراکز، ہمارے بڑے اور سنجیدہ رسائل کسی ایسے شخص کو پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں جسے بغیر کسی پس و پیش کے

شاعر کہا جاسکے یا جسے خود اپنی شاعری ساحری معلوم ہوتی ہو؟ دراصل شاعری کے ناپ تول کے لئے جو پیمانہ وضع کرلیا گیا ہے وہ شاعری کا نہیں بلکہ مفروضہ یا سپنہ شاعری کے ناپ تول کا پیمانہ ہے۔ نئی شاعری ہمیشہ پرانی اور پرانی شاعری ہمیشہ نئی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھے بغیر نہ شاعری کو سمجھا جاسکتا ہے نہ ہی شاعری کے اعجاز کو۔ مندرجہ بالا اشعار سے بھی (جو بالترتیب غالب، ناصر، کلیم عاجز اور خالد عبادی کے ہیں) اس کی توثیق ہوتی ہے۔

● 2-NETAJI MARG, PATNA-800001 (BIHAR)

جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک
شاعری کے حوالے سے

عبد انیس حسی



یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ برصغیر میں جدیدیت، ترقی پسندی کے ردِ عمل کے طور پر آئی۔ لیکن مغرب میں مابعد جدیدیت (Post Modrenism) کے نام سے جو ادب سامنے آیا (یعنی جو ادب زندگی سے مایوس اور بے یقینی کے علاوہ اخلاقی بے راہروی اور اقدار کی شکست وریخت سے عبارت تھا) ہماری جدیدیت اسی سے مشابہہ ہے۔ چونکہ ۱۹۶۰ء کے بعد والی تحریروں میں روایت سے انحراف کلیدی حیثیت رکھتا تھا اسی لئے ہمارے ادب میں اسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اگر ہم بانیانِ مابعد جدیدیت سے اتفاق کرلیں تو ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ہم ایک ہی چھلانگ میں ترقی پسندی سے مابعد جدیدیت Post Modrenism کی اس سطح تک پہنچ جائیں گے جہاں مغربی تہذیب و تمدن کو پہنچنے کے لئے کئی مدارج سے ہو کر گذرنا پڑا۔ کیوں کہ مغرب میں جدیدیت (Modrenism) کے متعلق یہ عام رائے پائی جاتی ہے کہ اس کی آمد اٹھارویں صدی عیسویں میں ہی ہو چکی تھی۔ چنانچہ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ "مغرب میں جدیدیت روشن خیالی پروجیکٹ کا حصہ تھی اور مارکسزم اور ہیومنزم سے الگ نہیں تھی۔ مغرب کا روشن خیالی پروجیکٹ انسان کی تاریخی اور سائنسی ترقی کے خواب سے عبارت تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ خواب پاش پاش ہو گیا" (ایوان اردو دہلی۔ شمارہ جولائی ۱۹۹۴ء)۔ اگر ہم اس نہج پر غور و خوض کریں گے تو یہ عقدہ کھل جائے گا کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی دور آیا ہی نہیں جس کے متعلق مغربی مفکرین نے سوچا تھا۔ یعنی نہ تو ہم نے روشن خیالی پروجیکٹ بنایا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی خواب دیکھا تھا جو چکنا چور ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت مغرب میں روشن خیالی پروجیکٹ بنایا جارہا تھا اس وقت ہمارے یہاں جدوجہد آزادی کا آغاز ہونے جارہا تھا۔ اگر ہم تاریخی حقائق کے تناظر میں سارے حالات کا جائزہ لیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہمارے یہاں سیاسی طور پر روشن خیالی پروجیکٹ آزادیٔ وطن کے بعد ہی بنایا گیا لیکن اس کا اثر ادب پر الٹا ہی پڑا۔ آزادی کے بعد ہی برصغیر میں وقوع پذیر ہونے والے زبردست فرقہ وارانہ فسادات اور کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کے نقل وطن کے سانحے کے نتیجے میں پیدا صورت حال نے ہمارے روشن خیالی پروجیکٹ کو چکنا چور کردیا۔ لہٰذا مغربی ڈھانچے کی جدیدیت ہمارے پاس کبھی نہ آسکی بلکہ ایک ہی جھٹکے میں ہم مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہوگئے۔ لیکن ہمارے ادب پر اس کا اثر پڑتے پڑتے مزید بارہ تیرہ سال لگ گئے۔

ترقی پسندی سے انحراف کے نتیجے میں در آئی جدیدیت میں بھی ادباء و شعراء دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ کچھ ادباء و شعراء نے الفاظ کی شکست وریخت اور بے معنی شاعری کے علاوہ مبہم اور علامتیت کو ہی جدیدیت سمجھا اور کچھ باشعور ادباء کے یہاں صالح جدیدیت تخلیق ہوتی رہی۔ بعض تخلیق کار ایسے بھی تھے جن کی تخلیقات 'شب خون' جیسے رسالے میں ایک رنگ و آہنگ لئے شائع ہوتی رہیں۔ تو شاعر (بمبئی) اور شاخسار (کٹک) یا دوسرے رسالوں میں دوسرا رنگ و آہنگ لئے شائع ہوتی رہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان دونوں طرح کی تخلیقات میں خالص جدید ہونے کا لیبل کس طرح چسپاں ہو۔ میرے ناقص خیال میں ساٹھ کی دہائی میں شائع ہونے والی شعری تخلیقات، جس میں قنوطیت کا رجحان زیادہ پائے جانے کے علاوہ شعری آہنگ اور الفاظ و تراکیب کے استعمال میں نئے پن کو برتا گیا وہ سب کے سب جدید کہلائیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جدیدیت کو ایک رجحان سمجھے جانے کے نتیجے میں تخلیق کاروں کی ایک بڑی جماعت بھیڑ چال چلنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت ایک صورت حال کے سوا کچھ نہیں تھی۔ بقول ڈاکٹر عبدالعلیم "جدیدیت کی بحث میں ہم عام طور پر یہ فرض کرلیتے ہیں کہ جدیدیت کوئی ایک رجحان ہے۔ اس لئے اس کی تعریف میں اور اس کے زمانے کے تعین میں دشواریاں آتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید دور کے تمام رجحانات اس دائرے میں آجاتے ہیں جو گذشتہ چالیس سال سے ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ چاہے وہ مارکس کے اثر سے ہوں، فرائڈ کے اثر سے یا سارتر کے اثر سے" (جدیدیت اور اردو ادب - آل احمد سرور - صفحہ ۶۷)۔

بہر حال ہمارے شعراء کی اس بھیڑ چال کے نتیجے میں ایسی شاعری وجود میں آنے لگی جس میں صرف مایوسی اور بے یقینی کو اولیت کا درجہ ملا۔ مروجہ سبھی اصولوں اور اخلاقی قدروں کو توڑنے کا رجحان عام ہو گیا۔ زبان و ادب کا قلع قمع ہونے لگا جب کی جدیدیت کو وسیع تر معنی میں بھی لیا جاسکتا تھا جس کی کوشش بعض ادباء و شعراء نے اس پراگندہ ماحول میں بھی کی تھی۔ انہی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جدیدیت نے ایک نیا موڑ لیا یعنی جدید شاعری میں وہ بات سمونے کی کوشش ہونے لگی جن کا تعلق براہِ راست جدید عہد کے رجحانات نیز سائنس، ٹکنالوجی، کچھ امید افزا مستقبل کا خواب، تمام مروجہ فرسودہ اصولوں سے انحراف، ظلم و جبریت کے خلاف بغاوت، انسانیت کے جذبے کو ابھار کرنے کا رجحان وغیرہ سبھی موضوعات کو خلاقانہ صلاحیت سے دائرۂ ادب میں نیز شاعری میں احاطہ کیا جانے لگا۔

موجودہ عہد کے تخلیق کاروں کی نمائندگی کرتے ہوئے "سہ ماہی تناظر۔ حیدر آباد" کی مدیرہ قمر جمالی اپنے اداریے میں تحریر کرتی ہیں کہ "ہم نئی نسل نہ خود کو ترقی پسند کہنے کے حق میں ہے اور نہ جدید، بلکہ اس نے اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کرلی ہے جو یہ نظر عائر کلاسیک اور جدیدیت کی درمیانی شکل ہے۔"

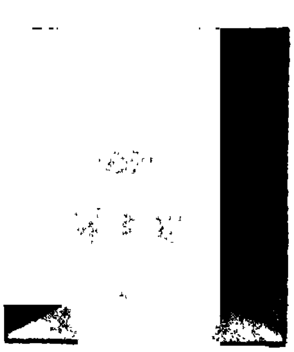
اگر ہم [illegible] کے ہم خیال ہو کر نوبادی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو خود ہی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ دراصل ہم جدیدیت سے انحراف کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس کے وسیع دائرے میں محدود ہیں۔ کیوں کہ جدیدیت کے متعلق اس طرح کا دعویٰ آل احمد سرور نے دہائیوں قبل پیش کر دیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ "جدیدیت تمام فلسفوں اور نظریوں کو توڑنے کا نام ہے۔ ناوابستگی ہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے تمام پچھلے ادوار سے ممتاز کرتی ہے۔ گزشتہ ادب سے اگر اس کا سلسلہ کہیں ملتا ہے تو وہیں سے جہاں ادب نظریوں اور فلسفوں سے بالاتر ہو گیا۔" (جدیدیت اور اردو ادب۔ صفحہ ۱۸) یعنی بالفاظ دیگر موجودہ عہد کا تخلیق کار کسی ازم یا نظریے کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ کار بہت ہی وسیع ہے۔ وہ بیک وقت ترقی پسندی، رومانیت اور جدیدیت وغیرہ رجحانات کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں نے سطور بالا میں یہ بات واضح کر دی کہ مختلف تجربات سے گذرتے ہوئے موجودہ عہد کی شاعری میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ اسی ٹھہراؤ کا نتیجہ ہے کہ ادب میں ایک نیا رجحان دیکھنے کو مل رہا ہے۔ وہ رجحان ہے نئی شاعری کو کوئی نام دینے کا۔ جس کے نتیجے میں کسی نے اس کو "تخلیقیت" کہا تو کسی نے مابعد جدیدیت اور پھر کسی کسی نے اس کو "معنویت" کا نام دینا شروع کر دیا ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ موجودہ عہد کو معنویت، تخلیقیت یا مابعد جدیدیت کا نام عطا کیا جائے موجودہ عہد کی شاعری میں جو ٹھہراؤ آیا ہے کیا اسے جدیدیت سے الگ کیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہم کو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں تخلیق کی گئی سبھی اچھی شاعری کو فراموش کرنا پڑے گا۔ کیا تاریخ سے منحرف ہونا ممکن ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو ۱۹۶۰ء کی شاعری میں بھی یہی باتیں مل جاتی ہیں جس کی طرف آل احمد سرور نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا تھا۔ بلکہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بے راہرو ہونے والے تخلیق کاروں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے لیکن ان کا اتنا چرچہ کیا گیا کہ سب کچھ Confused ہو کر رہ گیا۔ اس لئے اس ناچیز کا خیال ہے کہ ہم بے وجہ مباحث میں الجھے جدیدیت ہی کے سکۂ رائج الوقت کو اپنا لیں تاکہ ہمارے تخلیق کاروں کی انہماکی میں خلل نہ آئے۔ بہر حال ۸۵ء کے بعد جس پیڑھی نے میدان ادب میں قدم رکھا ہے اس نے اپنے پیش روؤں کی ٹھوکروں سے سبق لیا ہے۔ لسانی شکست و ریخت سے گریز کیا ہے۔ ترقی پسندی اور سماجی کوائف کی طرف اس کا ذہن دوبارہ مبذول ہونے لگا ہے۔ اس کے باوجود اسلوب اور شعری رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اس نئی روش کو جدیدیت سے ہٹ کر کوئی الگ شئے تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے جدیدیت کی ایک شاخ تصور کرنا چاہئے

● MEDICAL BAZAR, P.O. POLAMPUR, DIST. CUTTACK - 752 260 (ORISSA)

۶۰ء کے بعد اردو افسانہ (ایک جائزہ)

ساجد احمد



افسانے کے حوالے سے آپ کا سوال نامہ موصول ہوا تھا۔ سوال بہت اہم اور دلچسپ ہیں۔ یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے سوالوں کی ترتیب میں اپنی سہولیت کے لئے تھوڑی سی ترمیم کر لی ہے میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

(ا) افسانہ کیا ہونا چاہئے؟

اس سوال کا جواب میں حضرت جوش ملیح آبادی کے ایک واقعے سے شروع کرتا ہوں۔ جوش کے نواسے نے پوچھا نانا بچے کہاں سے آتے ہیں؟ جوش پہلے تو چونکے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ بچے کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لہٰذا مطمئن ہو کر اسے سمجھانے لگے کہ بچوں کو فرشتے لاتے ہیں یہ آسمان پر پریوں کی گود میں کھیلا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چند ثانیوں تک نواسا جوش کو گھورتا رہا پھر اچانک بول پڑا۔ نانا صحیح صحیح بتاؤ...... نہ بناؤ...... کہانی کی پہلی خوبی تو یہی ہونی چاہئے۔ کہانی کسی تحریک کے زیر اثر لکھی جائے اور خواہ کسی تکنیک پر مبنی ہو۔ افسانہ نگار کا کام صرف افسانہ لکھنا ہے بس وہ بے وقوف نہ بنائے۔ جیسے کہ آج کل خاصے لوگ بنا رہے ہیں ایک اچھا افسانہ لکھنے کے لئے خون تھوکنا پڑتا ہے اگر شریانوں میں خون بہہ رہا ہے تو۔؟ افسانے کے حوالے سے نیر مسعود صاحب کی ایک بات مجھے Fachinate کرتی ہے وہ یہ کہ بریڈمین جیسا بڑا کھلاڑی کسی نئے کھلاڑی کی پہلی گیند پر آؤٹ ہو سکتا ہے۔ یہ گیند اس اچھے شعر جیسی ہے جو کوئی چھوٹ بھیا بھی کہہ سکتا ہے لیکن افسانہ نگاری کسی خطرناک بالر کے سامنے سانچری کرنے جیسا مشکل ہے۔ یہاں ایک شاٹ سے کام نہیں چلتا۔ ہر طرح کی گیند کھیلنے کا ہنر آنا ضروری ہے۔ اصل Treatment تو تب ہی سامنے آتا ہے لیکن یہ تب ہوگا جب افسانہ نگار کے پاس آگ ہوگی۔ آگ نہیں ہے تو سب کوششیں بے کار۔ جس کے پاس جتنی آگ وہ اتنا ہی بڑا فنکار۔ آگ کی تپش ہی تو تخلیقیت کی اساس بنتی ہے۔ راکھ کے ڈھیر سے زیادہ سے زیادہ چنگاریاں ہی نکلیں گی۔ بھڑک کر وہ شعلہ کہاں سے آئے گا جو خرمنِ ہوش کو زیروزبر کر دے۔ افسانہ شاخ سے گیندے کا پھول توڑنے کا عمل نہیں ہے کہ ذرا ہاتھ بڑھایا اور آ گیا۔ یہ تو بالکل ناریل توڑنے جیسا کام ہے۔ جب تک درخت پر چڑھنے کی باریکیاں نہیں معلوم ہوں گی ناریل نہیں ٹوٹے گا۔ زمین پر کھڑے ہو کر تو بہت سے پتھر پھینک رہے ہیں۔ درخت پر چڑھنے کا ہنر اور احتیاط سب سے اہم ہے کیوں کہ ذرا سی بے احتیاطی پر ہو سکتا ہے کہ ناریل تو آگرے مگر سر ہٹانے کا موقع بھی ملے گا نہیں۔؟

کہانی میں سب سے اہم چیز تکنیک ہے موضوع اور دیگر لوازمات اس کے بعد آتے ہیں۔ Compactness کے بغیر Technic میں بھی جھول رہے گا۔ موضوع کوئی غیر اہم نہیں ہوتا اہم ہوتا ہے برتنے کا فن۔ موضوع کی اہمیت اور افادیت ہی تو لکھنے پر مجبور کرتی ہے مگر جب تک ہنر و تکنیک طاقتور نہیں ہوگی اپیل نہیں کرے گی۔ مثال کے طور پر پارٹیشن پر بے شمار کہانیاں لکھی گئیں مگر منٹو کے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو جو مقام حاصل ہے وہ اور کسے ملا ہے بات تو سب وہی کہہ رہے ہیں۔ منٹو تکنیک کا بھی بڑا فنکار تھا۔ تمام تکنیک کی عمدہ مثال "لحاف" (عصمت چغتائی) ہے ظاہر ہے افسانے کا موضوع بہت اہم ہے اور جب پچاس سال پہلے اردو کی ایک خاتون افسانہ نگار نے لکھی ہیں تو یہ بڑی بات ہے مگر

فنی اعتبار سے واقف بہت کمزور افسانہ ہے۔ منٹو نے تو عصمت سے یہاں تک کہا تھا کہ اگر وہ اس افسانے کو لکھتے تو اس طرح ہر گز نہیں لکھتے۔ ایک عورت کے دوسری عورت سے جنسی تعلقات ہیں۔ اس واقعے کی اطلاع کے علاوہ لحاف میں اور کیا ہے؟ جب تک الیہ ابھر کر سامنے نہیں آتا پہلی سطح پر افسانے کا حق ادا نہیں ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ افسانہ علامتی ہو یا بیانیہ اسے افسانہ بہر حال رہنا چاہئے۔ ایک بار پڑھ کر زندگی بھر یہ سہی چند برسوں تک تو یاد رہنا ہی چاہئے۔ بقول لارنس کہانی جھوٹی ہوتی ہے مگر کہانی سے ہم جھوٹ نہیں بلوا سکتے۔

(۲) ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے کی عدم مقبولیت؟

۱۹۶۰ء کے بعد افسانے کی عدم مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو نسل پریم چند جیسے افسانہ نگاروں کی ہیئت اور اسلوب کی تقلید کر رہی تھی ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے افسانے کو بہت نقصان پہنچایا۔ افسانے کو چیستان بنا دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہانی کی تفہیم اس کے قاری کے لئے بہت دشوار ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ عدم مقبولیت کی طرف بڑھنے لگی کیوں کہ قاری سیرابی کے جس عمل سے دوچار ہونا چاہتا تھا وہ مواقع اسے میسر نہیں آ رہے تھے۔ اسے دشت میں سراب اور بگولوں کا عذاب سہنا پڑا لیکن یہ سلسلہ کم و بیش پندرہ برسوں سے زیادہ نہیں چلا کیوں کہ ہیئت پرستوں نے جو عمارت تعمیر کی تھی اس کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ حقیقتوں اور صداقتوں کی آندھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں اور منہدم ہو گئیں۔ معاصر افسانے میں اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اردو افسانہ عالمی معیار کی طرف پھر سے گامزن ہے۔

(۳) افسانے میں کئے گئے تجربوں (اگر واقعی تجربے ہیں) اور اب نئے تخلیقی بیانیہ کے متعلق معروضی رائے۔

افسانے میں تجربے تو ہمارے یہاں یقیناً بہت ہوئے مگر وہ کتنے کامیاب و ناکام رہے یہ الگ مسئلہ ہے۔ جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر اسلوب اور مواد کی سطح پر بہت تجربے ہوئے۔ جیمس جوائس، ورجینا وولف اور کافکا وغیرہ سے ہماری کہانی خاص طور سے متاثر ہوئی پھر وہ تجربے ہمارے یہاں بھی کئے گئے مگر نیر مسعود کے علاوہ کوئی واپس نہیں آیا۔ ظاہر ہے ہیئت کے یہ تجربے اس قدر آسان نہیں تھے کہ کوئی جھٹ بھیا سے نبا جاتا۔ کافکا کے افسانوں سے جو پراسرایت اور کثیر الجہت مفہوم والے ادب پارے وجود میں آئے وہ اس سے قبل ہمارے یہاں نہیں تھے۔ اردو کہانی کے لئے یہ تجربے بیش قیمت بھی تھے۔ خالدہ حسین نے اس پر بہت کامیاب کہانیاں لکھیں۔ شعور کی رو کی تکنک بھی استعمال ہوئی۔ اس کے علاوہ Plotless کہانی کا جو تجریدی افسانہ ہمارے یہاں لکھا گیا اس سے قاری بدظن ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب ناقد افسانہ نگار پر حاوی ہو گئے۔ کچھ تجربے انتظار حسین نے جاتک کتھاؤں کا سہارا لے کر کئے۔ داستانی اور اساطیری زبان کا استعمال بھی ہوا۔ آج کے مسائل پر بہت خوبصورت کہانیاں لکھی گئیں۔ نئے اسالیب اور بیانئے سے ہمیں تیقن، اعتماد، کاٹ اور چبھن بھی حاصل ہوئی۔ نئے تخلیقی بیانیہ کے متعلق میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہیئت کی دبیز دھند سے آزاد ہو چکا ہے۔ آج جو افسانے لکھے جا رہے ہیں ان میں حقائق خود ابھر کر سامنے آتے ہیں اور جزئیات نگاری کا وہ عمل جسے ہیئت پرستوں نے اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی اسے نیا تخلیقی بیانیہ اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور ۷۵ء کے بعد جو نئے لوگ سامنے آئے ان کا بیانیہ بہت مضبوط ہے۔ مثال کے طور پر سلام بن رزاق، شوکت حیات، انور قمر، انور خان، محسن خان، خالد جاوید، سید محمد اشرف، حسین الحق، شموئل احمد، علی امام نقوی وغیرہ۔

(۴) اردو افسانے پر لکھی گئی تنقیدی تحریروں کے تجزیئے کے بعد مجموعی نتائج.....؟

مغرب میں لکھی گئی تنقیدی کتابوں کو دیکھیں تو وہاں مختلف النوع مکاتیب فکر ملتے ہیں۔ ان میں مارکسی، عمرانی، ساختیاتی، تاثراتی، نفسیاتی اور نئی تنقید وغیرہ مکاتب خاص اہمیت کے حامل ہیں اس کا اثر ہمارے یہاں شدت سے محسوس کیا گیا مگر تھوڑا خسارہ بھی ہوا کیوں کہ ہمارے ناقد نے کسی ایک طرح کی تنقید سے شعوری یا غیر شعوری طور پر منسلک ہو کر لکھا۔ اس تنقیدی بوطیقا کو حرف آخر جان کر اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ کسی بھی ادب پارے کو پرکھنے کی میزان ذوق نظر کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ ناقد کو تعصب کی سطح سے اوپر اٹھ کر کام کرنا چاہئے۔ منٹو نے قلم کو جو جرأت عطا کی اس روایت کو آگے بڑھانا تو دور ہم اسے قائم بھی نہ رکھ سکے۔ افسانے میں اختلاط اور فحش نگاری کی بحثیں بہت پرانی ہیں۔ محمد حسن عسکری جیسے اہم ناقد نے بہت تفصیل سے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی اور اب تو کوئی پیغمبر بھی نہیں آنے والا۔ مسئلہ ہمارا ہے کہ ہم کیوں نہیں سمجھ پاتے۔ ہر بار فحش اور رذیل کا پھٹا ہوا جھنڈا لے کر شور مچانے لگتے ہیں۔ کاش منٹو کو ذہنی اذیتیں دینے کے بجائے اس کا حق ہم زندگی میں ہی تھوڑا بہت تو ادا کر پاتے، کاش۔

کہانی کا پس منظر کیا ہے۔ کردار کیا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ سب ہمارا مسئلہ نہیں ہوتا ہمیں تو پچیس پیسے کے پوسٹ کارڈ میں مدیر کو خط لکھنا ہوتا ہے کہ آپ کیا بے ہودہ اور فرومایہ چیز چھاپ دیتے ہیں۔ جب قاری رفیع (submaile) اور سوقیانہ (Vulgar) میں فرق نہیں سمجھ سکتا تو یہ مسئلہ کس کا ہے؟ "TB,6" اور "F" جیسے چینلوں کو لاک دیئے بغیر ہم کون سی تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ بچوں کو کانونٹ میں تعلیم دلانے سے ہمارے تہذیبی ورثے اور زبان کا تحفظ مجروح نہیں ہوتا؟ مغربی ادب میں Bold کہانیاں، ناول جس قدر لکھے گئے، کیا ہمارا معاشرہ اور تہذیب اس ادب کو پڑھنے اور Complex میں مبتلا ہونے کی اجازت دیتا ہے بس۔ "لولیتا" اور "لیڈی چیٹرلیز لور" کو ہم کیسے بہو بیٹیوں سے چھپا لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے یہاں ایسی کتابیں ذرائنگ روم کے شلف میں بطور کور کے رکھی جاتی ہیں اور یہ شعوری کوشش اتنی ہی دور سے نظر آتی ہے جتنی دور سے الماری میں کتاب۔ کہانی اگر فحش ہے تو اسے بالکل رد کیا جانا چاہئے مگر اس طرح نہیں۔ تخلیق کے بڑے چھوٹے ہونے سے قطع نظر بدن کے کھلے بیان میں جو چھوٹ لارنس اور نابوکاف جیسے بڑے لوگوں کو ملے گی وہ کسی نئے لکھنے والے کو کیوں نہیں؟ Pornography کا سہارا لے کر کوئی کتنی دور چلا ہے اب تک۔ اس معاملے میں ہم مغرب سے بہت پیچھے ہیں اور اس کے لئے تنقید نگار کے علاوہ کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں۔

(۵) کیا افسانے کے لئے قاری اہم ہے؟

یعنی افسانے کے لئے قاری اتنا ہی اہم ہے جتنا کسی نومولود بچے کے لئے ماں کا دودھ، مگر ذہین قاری کیوں کہ قاری ایسہ بھی ہے۔ کوئی علامتی افسانہ یا کوئی دوسرا ایسا افسانہ جس کا اختتام خاصہ مبہم ہو تو بغیر کسی سے پوچھے قاری پر اس کی تفہیم و ترسیل ضروری ہے۔ جدیدیت کے دور میں قاری افسانے سے دور اس وجہ سے ہوا کہ اس وقت بیشتر لکھنے والے گنجلک و مبہم افسانے لکھ رہے تھے۔ قاری ہمارے لئے اس لئے بھی اہم ہے کہ مطالعے کے بعد ذاتی اور رسائل ہی میں شائع ہونے والے مراسلات ردِ عمل کے سیاق و سباق میں فن پارے کے از سر نو تجزیے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اس کی نفی کوئی کتنی بھی کرے مگر اہمیت تو بہر حال ہے۔ تخلیق کی قدر و قیمت کا تعین بھی کسی حد تک قاری پر ہی منحصر ہے۔ خواہ وہ رسائل خرید کر نہ پڑھتا ہو اس کے باوجود افسانے سے قاری کا رشتہ لازم و ملزوم کا ہے۔ قاری کے بغیر افسانے کا وجود نہیں پھر بھی کہ افسانہ نگار، ناقد بھی تو قاری ہوتے ہیں۔

(۶) ۶۰ء کے بعد عالمی معیار کے افسانے؟

بغیر کسی شبہ کے ۶۰ء کے بعد بھی اردو میں عالمی معیار کے افسانے لکھے گئے اور خاصے لکھے گئے۔ زبان و بیان پر اتنی پابندی نہ ہوتی تو تعداد اور بھی زیادہ ہوتی۔ کچھ بہت مشہور افسانے درج ذیل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا "ہاؤسنگ سوسائٹی" (قرۃ العین حیدر) "آخری آدمی"، "زرد کتا" (انتظار حسین) "روس نے محبت کے ساتھ" (بانو قدسیہ) "طاؤس چمن کی مینا" (نیر مسعود) "آفتی" (غیاث احمد گدی) "آدمی" (سید محمد اشرف) "بالکونی" (سریندر پرکاش) "کوبڑ" (خالد جاوید)

P.O. BOX NO. 1067, H.P.O., NAWABGANJ, KANPUR - 208 002 (U.P.).

آہ! مجروح سلطانپوری

۱۷ر جون ۱۹۲۰ء ○ ۲۴ر مئی ۲۰۰۰ء



۲۴ اور ۲۵ر مئی کی درمیانی شب میں اردو کے مشہور شاعر مجروح سلطانپوری [اسرار حسن خاں] کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ انہیں سانس کا عارضہ تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۸۲ سال تھی۔ اپنی تاریخ پیدائش کا علم خود مجروح صاحب کو بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ایک بیان میں ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء بھی کہا تھا۔ اوّلین شعری مجموعہ "غزل" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا اور پھر اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۹۶ء میں "غزل" کو "مشعلِ جاں" کے عنوان سے جشنِ مجروح [دبئی میں منعقدہ] کے موقع پر سلیم جعفری مرحوم نے شائع کیا تھا۔ اور اب ۱۹۹۹ء میں "مشعلِ جاں" کا دوسرا ایڈیشن اردو، ہندی رسم الخط میں شائع کیا گیا۔ 'غزل' سے 'مشعلِ جاں' تک ان کے شعری مجموعے میں ۴۱ غزلیں [۷۹۲ شعر] ۴ مختصر و طویل نظمیں، ۳۷ متفرق اشعار دیے گئے ہیں اور یہی ان کی کل جمع تخلیقی کائنات ہے۔ مجروح صاحب نے مزاحیہ شاعری بھی کی اور خوب کی، فلمی گیت نگاری میں، یہاں وہاں یہ رنگ موجود ہے۔ ۱۹۴۵ء سے فلمی گیت نگاری کا آغاز کیا اور فلم "شاہجہاں" سے حالیہ دکھائی جانے والی فلم "کیا کہنا" تک چار سو سے زائد فلموں میں تقریباً ڈھائی ہزار گیت لکھے، گیتوں میں شاعری کی۔۔ ان کی اسی خدمات کے اعتراف میں انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ ان کی شعری خدمات کے لئے اقبال سمان اور کئی دیگر انعامات و ایوارڈس دیے گئے۔ مجموعی طور پر انہوں نے زندگی کے دکھ سکھ پوری طرح جئے اور کامیاب رہے۔

مجروح صاحب نے اردو شاعری کو کیا دیا یہ ایک الگ موضوع ہے تاہم ان کی کتابی شاعری سے چند شعر زبان زدِ خاص و عام ہوئے اور روزمرّہ کا محاورہ بنے لیکن فیض احمد فیض کی شہرتوں کے حوالے سے یہ شعر زیادہ جانے گئے۔ ترقی پسند شعرا میں مجروح صاحب کی یہ انفرادیت ہے کہ انہوں نے نظم پر غزل کو ترجیح دی اور کلاسیکی لفظیات کو اپنی فارسی آمیز شعری تراکیب کے ساتھ شاعری بنانے کی سعی کی اور عمر بھر غزل کا دفاع کرتے رہے۔

بمبئی میں "مجروح اکاڈمی" کے تحت مجروح صاحب پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ادبی کتابی سلسلہ "چراغ" کا "مجروح سلطانپوری نمبر" ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔ مجروح صاحب کا شعری سرمایہ کم ہے پھر بھی ان کی شخصیت اور فن پر ابھی معروضی کام ہونا باقی ہے بالخصوص ان کی گیت نگاری کے بارے میں جو بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے۔ [ادارہ]

بخط شاعر

عبد الرحمن عبد

کرے گا نہ وہ اپنے شہکار کم
حسینوں کے ہوں گے نہ بازار کم

رہے جس قدر فرق گھٹتے رہو
محبت کی ہوگی نہ مقدار کم

زمانہ بدلتا ہے کروٹیں
نہ ہوگا جہاں سے کبھی پیار کم

حکیموں سے دنیا کو بھر دیجئے
نہ ہو پائیں گے دل کے بیمار کم

ق معاشی کا ذرہ ہے دنیا جہاں
یہاں غم زیادہ ہیں غمخوار کم

یہاں چاہے انساں کو کم ہی کرے
مگر کا نہ ہوگا کبھی پیار کم

اسیر محبت ہے ہر کوئی
یہ عشق ہوتی ہے تلوار کم

ہر دنیا جہاں ہے تو پھیلا ہوا
مری سیر کو ہے یہ بازار کم

رہے تو سدا عبد کے سامنے
تری دید سے دل میں ہو پیار کم

● 125 - DOUGLAS ROAD
STATEN ISLAND
NEW YORK-10304 (U.S.A.)

احمد رئیس

محبت میں
یونہی اکثر
یہ آنکھیں
چھلک جاتی ہیں
یونہی سب
خواب لگتا ہے
یونہی کچھ
پھول کھلتے ہیں
یونہی بجھ
دیپ جلتے ہیں
یونہی ہر گام
خوشیاں رقص کرتی ہیں
یونہی ہم
روتے گاتے ہیں
یونہی دل ٹوٹ جاتے ہیں
محبت میں
تو یونہی اکثر
یہ آنکھیں
چھلک جاتی ہیں

● 3-D-28/45, NAZIMABAD,
KARACHI- (PAK)

عشرت قادری

سمجھے ہے تعبیر بتا کس کا بڑا ادراس تھا
شعلہ کا جو شہر میں خوف و ہراس تھا
دونوں ہی اچھے تھے مگر تو اثر رہتے
میں دیدہ ور تھا، وہ ستارہ شناس تھا
کس کو کمنت سے الجھا کر رستہ کرے
تنہا میں اک نیا ہر سو پاس تھا
آنکھوں سے میری جو شعار نمو تم سے
ملاقات وہ پھر تو بہت ہی اداس تھا
اپنا پرایا ہیں سب ہی تمام تم
وہ ہوں لا دیں کہیں جا کر پاس تھا
رستے کو ہیں ادا سے بدبدا کا دری
چہرے پہ جشن میں ہر سو پیاس تھا
سیمت سنور بہت وہ آگے مقدم
قدرت کے کام تھا نہ ہوتا عاسیہ تھا

● MARKAZ-E-ADAB, MLB COLEGE
ROAD BHOPAL-462001



منیر الدین احمد
A.M. SPORTS PLATZ 13
25495 KUMMERFIELD GERMANY

کچّا علم

یہ کون عورت تھی جو میرا نام پکار رہی تھی۔ آواز کہیں دور سے آرہی تھی، البتہ لہجہ مانوس تھا۔ بالکل منفرد لہجہ۔ اس آواز میں ایک جانی پہچانی کھنک تھی، جو ایک زمانے میں مجھے بہت بھاتی تھی۔ عرصہ ہوا کسی نے میرا نام اس طرح نہیں لیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اس آواز کو کیسے جانتا ہوں اور وہ کون عورت تھی، جو مجھ پر جھکی ہوئی مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی بات میرے پلے نہیں پڑتی تھی۔

پھر میں نے اسے کہتے ہوئے سنا: "میں ڈاکٹر ساندرا ہوں اور میں نے آپ کا بائی پاس آپریشن کیا ہے، جو کامیاب رہا ہے، میں آپ کو اس غیر فطری نیند سے بیدار کرانا چاہتی ہوں، جس میں ہم نے آپ کو آپریشن کی خاطر ڈالا تھا۔" میں اس آواز اور لہجے سے خوب واقف ہوں۔ مگر حافظہ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ اس کی شکل و صورت مجھے مانوس لگتی ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر ساندرا نے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا۔ شاید میں پھر نیند کی راجدھانی میں جا پہنچا تھا۔ کیوں کہ جب میری آنکھیں کھلیں، تو دن چڑھ چکا تھا اور اگلی تاریخ آچکی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس دوران میں ایک پورا دن گذر گیا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے چوبیس گھنٹے سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ آپریشن سے آٹھ دس گھنٹے پہلے سے ہر قسم کی خوراک رسانی کی ممانعت کردی گئی تھی۔ حتیٰ کہ پانی کا ایک گھونٹ تک میرے لبوں سے نیچے نہیں اترا تھا۔

میں نے گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا اور اسے ناشتہ لانے کو کہا۔ مگر پیشتر اس کے کہ نرس ناشتہ لے کر لوٹتی، پھر ایک بار ڈاکٹر ساندرا میرے بستر کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس نے اسٹیتھس اسکوپ لگا کر میرے دل کی دھڑکن کو سنا، نبض کو ٹٹولا اور بلڈ پریشر کو چیک کیا۔

پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور کہا: "آپ جانتے ہیں کہ آپ کی بائی پاس سرجری ہوئی ہے۔ چونکہ آپ کی عام صحت اچھی ہے، اس لئے آپریشن کے کوئی منفی اثرات نظر نہیں آرہے۔ کل تک آپ چلنے پھرنے لگیں گے اور اگر کسی وجہ سے کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی، تو اسی ہفتہ کے اندر اندر گھر واپس جاسکتے ہیں۔"

میں اس دوران ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ مجھے اس میں ایک جانی پہچانی لڑکی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کی آواز کی کھنک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں اس کے سہارے پر اس معمے کو حل کرلوں گا۔ مگر میرے دماغ کا ایک حصہ شاید بدستور محو خواب تھا اور میری مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

میرے ذہن کے پردے پر جو تصویر ابھری، وہ ایک سات سالہ لڑکی تھی جس سے میں چالیس سال ادھر ملا تھا۔ دراصل میرا تعارف اس کے ماں باپ کے ساتھ ہوا تھا، جن کے ہمراہ میں ایک ہی طیارے میں روم سے آیا تھا۔ میرا جہاز کراچی سے لیٹ آیا تھا۔ ہمبرگ جانے والی فلائیٹ تیار کھڑی تھی۔ صرف میرا انتظار ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کا جہاز رکتے ہی لفت ہانزا کا ایک کارکن تیر کی طرح ہمارے طیارے کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سواریاں ابھی اپنی سیٹوں سے نہ اٹھی تھیں۔ اس نے ہمبرگ جانے والے مسافر کے بارے میں پوچھا، میں نے اپنا بازو ہوا میں لہرا دیا۔ پھر سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے کمر کو سیدھا کیا۔ اپنے ساتھ سفر کرنے والے ایک دوست سے لمبا معانقہ کیا، جسے روم سے نائجیریا جانے والی فلائیٹ لینی تھی، لفت ہانزا کے کارکن کو ہماری الوداعی رسم کی لمبائی شاید پسند نہ آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور کہا:

"آپ کا بیگ کون سا ہے؟"

میں نے اپنا بیگ اگلی سیٹ کے نیچے سے نکالا اور پیشتر اس کے کہ میں اپنے دوست سے باضابطہ رخصت لیتا، وہ مجھے اپنے پیچھے کھینچتا ہوا جہاز سے باہر نکلا۔ رن وے پر پہنچ کر اس نے میرا بیگ تھام لیا اور کہا کہ لفت ہانزا کے طیارے تک، جو وہاں سے اندازاً سو گز کے فاصلے پر کھڑا تھا اور جس کے انجن اسٹارٹ کئے جا چکے تھے، دوڑ لگانی ہوگی۔

اس نے کہا: "آپ کا باقی ماندہ سامان اگلی فلائیٹ سے آجائے گا"

مجھے ایک ادھیڑ جرمن جوڑے کے پہلو میں فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی جو شاید اس طیارے کی واحد خالی سیٹ تھی۔ مرد تو خیر ہر بات پر مسکرا دیتا تھا، کیوں کہ میری انگریزی اس کے پلے نہ پڑتی تھی۔ البتہ عورت کو انگریزی اچھی خاصی آتی تھی۔ وہ ہمارے درمیان مترجم بن گئی۔ اس کا خاوند پیشے کے اعتبار سے سرجن تھا اور روم میں ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد اپنے شہر لیوبک واپس لوٹ رہا تھا، جو ہمبرگ کے قریب واقع ہے۔

"کیا یہ آپ کا جرمن کا پہلا سفر ہے؟" ڈاکٹر سنتوو سکی نے پوچھا۔ وہ میری باتوں سے جان چکے تھے کہ میں ہمبرگ سے ناواقف ہوں اور ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا بیٹا کار لے کر آیا ہوگا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ مجھے میری رہائش گاہ تک پہنچانے کے لئے تیار تھے۔ مگر ہم رات کے دس بجے پہنچیں گے اور انہیں اپنے شہر لیوبک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو جائے گی۔

میں نے کہا "اگر انسان کے منہ میں زبان موجود ہو اور اس کی جیب میں ایک واقف کار کا پتہ محفوظ ہو، تو پھر بھلا کیا مشکل پیش آسکتی ہے۔"

ڈاکٹر سنتوو سکی کی بیوی مارگٹ نے بتایا کے ان کے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا یورگ میری عمر کا ہے، جب کہ دوسرا بیٹا کارل ہائی اسکول کے آخری سال میں پڑھ رہا ہے۔ ان کی بیٹی ایویلین ابھی بمشکل سات برس کی ہے۔ یورگ اچھی خاصی انگریزی بول لیتا ہے۔ اسے مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ وہ یوں بھی دوسرے ملکوں میں دلچسپی لیتا ہے اور دنیا جہان کے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا ہے۔

"ڈاک کے ٹکٹ میں بھی ایک زمانے میں جمع کیا کرتا تھا۔ کچھ ٹکٹ تو اب بھی میرے بیگ میں ہیں۔ جن کا میں یورگ کے ساتھ تبادلہ کروں گا۔ میں نے اسکول کے زمانے میں ٹکٹ جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس سلسلے میں میری مراسلت دنیا کے کئی ملکوں میں رہنے والوں سے تھی۔ جب میں اسکول کے آخری کلاس میں تھا تو میرے نام آنے والے خطوط کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ میرے والدین کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ٹکٹیں جمع کرنے کا خبط میری تعلیم میں حارج نہ ہو جائے۔ اس لئے مجھے اس سے روک دیا گیا۔ میں نے اپنی لمبی چوڑی مراسلت کو تو بند کر دیا، مگر ٹکٹ جمع کرنے کا شوق میرے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ چکا تھا۔ اس سے میں آج تک اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں۔"

ڈاکٹر سنتوو سکی نے کہا "ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق مجھے بھی رہا ہے مگر دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں میرے البم جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے اس مشغلے کی طرف رجوع نہیں کیا۔ یوں بھی جنگ کے بعد ہمیں از سر نو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لئے بہت تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ یورگ کی نسل کے بچے اس چیز کو کیا جانیں۔"

"تمہاری ہر بات کی تان جنگ پر آکر ٹوٹتی ہے۔" مارگٹ نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ ہماری نسل کی میراث ہے بچوں کو بھلا اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے وہ اپنی زندگی آج کے حالات کے مطابق گذارنا چاہتے ہیں، جس میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق پورا کیا جاسکتا ہے۔"

"معاف کیجئے، میری بیوی جنگ کے بارے میں تھوڑا الرجک ہے۔" ڈاکٹر سنتوو سکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور میرے میاں کو جنگ کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو کے لئے نہیں سوجھتا۔" مارگٹ نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "میں جنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ کیا یہ سچ ہے کہ جرمنی نے ایٹم بم بنا لیا تھا، مگر اس کی تباہ کاری کے پیش نظر ہٹلر نے اس کے استعمال کی اجازت نہ دی تھی۔"

"یہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ اگر ہٹلر کے ہاتھ میں ایٹم بم آجاتا، تو وہ شکست سے بچنے کے لئے یقیناً سارے یوروپ کو تباہ کر دیتا۔"

مارگٹ نے اپنے خاوند کے منہ کھولنے سے پہلے یہ بات کہہ دی۔ چونکہ اس کے پلے کچھ نہ پڑا تھا، اس لئے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے کیا کہا تھا۔ مجبوراً مارگٹ کو یہ بات اسے جرمن میں بتانی پڑی۔

"ہٹلر کے بارے میں تو ہم محض قیاس کر سکتے ہیں، مگر امریکیوں نے ایٹم بم استعمال کر کے دکھایا۔" ڈاکٹر سنتوو سکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"آج کل امریکہ اور سوویت یونین ایک دوسرے کو کھلم کھلا ایٹم بم کے استعمال کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

سرد جنگ میں ہر چیز ممکن ہے۔ اگر ایٹم بم کے استعمال کی نوبت آئے گی تو اس کا سب سے پہلا نشانہ جرمنی بنے گا۔ روس مغربی جرمنی کو تباہ کر دے گا اور امریکہ مشرقی جرمنی کو۔ اس کے بعد شاید دونوں مل کر اپنی فتح کا جشن منائیں گے۔" مارگٹ نے ڈاکٹر سنتوو سکی کا ترجمہ تو کر دیا، مگر اس کے چہرے بشرے سے صاف نظر آرہا تھا کہ اس کو یہ بات پسند نہ آئی تھی۔

"سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو وہ بھلا کیوں قربان کرنے لگے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر سنتوو سکی نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اسے شاید یہ احساس تھا کہ میں اس کے جذبات کو سمجھتا ہوں اور ان سے متفق تھا۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر مجھے دیا۔

"میں آپ کو کسی ویک اینڈ پر گھر آنے کی دعوت دوں گا۔ ہم آپ کو اپنا شہر لیوبک دکھائیں گے اور بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت کریں گے۔"

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی دعوت کو قبول کیا۔ اس دوران میں ہمارا طیارہ ہمبرگ ہوائی اڈے پر اترنے کے لئے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمبرگ کا جگمگاتا ہوا اور حدِ نظر تک پھیلا ہوا شہر ہمارے قدموں میں پڑا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے قصبے سے آیا تھا، جہاں پر زندگی سست روی کی عادی تھی۔ اس کے برعکس بیس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ہر طرف بھاگ دوڑ کا نظارہ تھا۔ ٹیکسیوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ اس کا آخری سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے واقف کار کا پتہ دکھایا، جس کے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا کر دے گا۔ خود میری جیب میں ایک بھی جرمن مارک نہ تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی ضرور تھی، مگر یخ بستگی کا عالم نہ تھا، جس سے مجھے چلنے سے قبل میرے دوستوں نے یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ اکتوبر کے اواخر میں شمالی جرمنی ٹھنڈی ہواؤں کے پنجے میں ہوتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات

بالکل نہ آئی تھی کہ اگر میرا واقف کار اس شام گھر پر نہ ہوا، تو میں ٹیکسی کا کرایہ کیسے ادا کروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ میرا مہمان نواز گھر پر موجود تھا اور ٹیکسی کا کرایہ بھی اس نے بلا چوں و چرا ادا کر دیا۔

مجھے ہمبرگ کے محلوں سے واقفیت پیدا کرنے میں پورا ایک مہینہ لگ گیا۔ اس دوران میں مرا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا، جس کا سردیوں کا سمسٹر چند دنوں میں شروع ہونے والا تھا۔ مگر ڈاکٹر سنتووسکی کے ساتھ ویک اینڈ کا پروگرام بنانا ایسا آسان کام نہ تھا۔ میں نے ایک دو بار فون کیا، مگر ان کی مصروفیت کے سبب بات نہ ہو سکی۔ یوں میں بھی چاہتا تھا کہ تھوڑی بہت جرمن سیکھنے کے بعد ان کے ہاں جاؤں، تاکہ مارگٹ کو ترجمہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جرمن زبان کا کورس یکم نومبر سے شروع ہو گیا۔ میرے پاس چونکہ اور کوئی مشغلہ نہ تھا، اس لئے سارا دن کسی نہ کسی رنگ میں جرمن سیکھنے میں گذرنے لگا۔ وسط دسمبر میں ڈاکٹر سنتووسکی کا فون آ گیا۔ چونکہ ان کے ساتھ براہ راست بات نہ ہو سکتی تھی، اس لئے مارگٹ ہمارے درمیان ٹیلی فون ایکسچینج کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا میں کرسمس کا تہوار ان کی فیملی کے ساتھ گذارنے کو تیار ہوں۔ اس زمانے میں میری معلومات کرسمس کے بارے میں بہت محدود تھیں۔ مگر میں نے سن رکھا تھا کہ جرمنی میں یہ تہوار خالص فیملی آفیر ہے، جس میں باہر کے کسی شخص کو شامل نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا "یہ تو آپ کا فیملی تہوار ہے میں کسی دوسرے موقع پر آ جاؤں گا۔" مگر پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر سنتووسکی میری بات کا جواب دیتے مارگٹ نے کہا "ہم جرمنی میں تمہاری فیملی ہی تو ہیں۔" واضح ہے کہ اس فقرے کے بعد میں ان کی دعوت رد نہ کر سکتا تھا۔

انہوں نے کہا کہ میں ۲۴ دسمبر کی سہ پہر تک پہنچ جاؤں، تو خوب رہے گا۔ کیونکہ اس روز ان کے بیٹے کارل کی سالگرہ بھی تھی۔ میں نے وقت پر پہنچنے کا وعدہ کیا۔ مگر مجھے بالکل پتہ نہ تھا کہ مجھے کارل کے لئے کیا تحفہ لے جانا ہو گا۔ اور کیا مجھے خاندان کے سارے افراد کے لئے کرسمس کے تحفے لے جانا چاہئے یا نہیں۔

میرے واقف کار نے کہا کہ مجھے کوئی بہانہ بنا کر شامل ہونے سے انکار کر دینا چاہئے۔ اس نے کہا "یہ امیر لوگ ہیں تم ان کے لئے کیا تحفہ لے جا سکتے ہو۔" مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا، میں نے سوچا کوئی چھوٹی موٹی کتاب کہیں نہ کہیں سے ہاتھ لگ جائے گی۔ پھر سچ مچ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دکان سے مجھے بالزاک کی ایک کتاب کا جرمن ترجمہ مل گیا، جس کا اس وقت تک کسی نے کور تک نہ کھولا تھا۔ یہ کتاب، جسے دراصل میں خود پڑھنا چاہتا تھا، میں نے کارل کے لئے محفوظ کر دی۔ دیگر افراد خانہ کے لئے بھی اسی دکان میں نہایت عمدہ نئی نکور کتابیں کوڑیوں کے مول مل گئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ مجھے جرمن ادیب وولفگانگ بورشرٹ کے افسانوں کا مجموعہ مل گیا۔ اس وقت مجھے بھی پتہ نہ تھا کہ بورشرٹ جنگ کے بعد پیدا ہونے والے جرمن ادب کا اولین نام تھا۔ اس کی کہانی "اس منگل کے روز" میرا جرمن ادب سے پہلا ترجمہ تھا، جسے میں جرمنی میں قیام کے ابتدائی ماہ کے اندر اردو میں ڈھالا تھا۔

ڈاکٹر سنتووسکی اپنی بیوی مارگٹ اور بیٹی ایویلین کی ہمراہی میں مجھے لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ایویلین سچ مچ ایک خوبصورت گڑیا تھی، انہوں نے کہا "گھر جانے سے پہلے ہم آپ کو لیوبک کے اہم حصوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔" لیوبک کے بارے میں مجھے صرف اتناہی پتہ تھا کہ تھوماس من اس شہر کا نامور سپوت تھا۔ میں نے اس وقت تک اس کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ مگر اس کے ناول "بڈن بروک" کے نام سے واقف تھا۔

ڈاکٹر سنتووسکی نے کہا "کیوں نہ ہم اس عمارت کو دیکھتے چلیں جو 'بڈن بروک' کا لوکیل ہے۔"

قدیم عمارتیں، شہر کے ساتوں گرجا گھر اور زمانہ ہائے وسطیٰ کی تنگ گلیاں مجھے جادو کے زور سے بنائی ہوئی لگتی تھیں۔ پرانے وقتوں کے گھر اتنے چھوٹے تھے جیسے انسانوں کے لئے نہیں بالشتیوں کے لئے بنائے گئے ہوں۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ ان میں بدستور لوگ بستے ہیں۔ ڈاکٹر سنتووسکی نے مجھے اوپر کی منزلوں کی کھڑکیوں میں لگے ہوئے آئینوں کی طرف متوجہ کیا، جو اس طرح لگائے گئے ہیں کہ انسان کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے کہ نیچے سڑک پر سے کون گذر رہا ہے۔ انہوں نے کھڑکیوں میں رکھی ہوئی گدیاں دکھائیں، جن پر گھر کے باسی کہنیاں ٹیک کر گھنٹوں تک کھڑے رہتے ہیں اور گلی کی زندگی کا نظارہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سنتووسکی کا بنگلہ ایک پارک نما علاقے میں تھا۔ اس کے پچھواڑے سے ایک ندی گذرتی تھی۔ اس سال جرمنی میں کرسمس سے پہلے ہی سردی کی لہر آ گئی تھی۔ متواتر کئی روز سے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے دس سے پندرہ ڈگری نیچے چل رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمبرگ کی جھیل آلسٹر کا پانی جمنے لگا تھا ایویلین نے کہا کہ ندی پر برف کی سطح اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ انسان اس پر چل سکتا ہے۔ اسے امید تھی کہ وہ کرسمس کے دنوں میں اس پر اسکیٹنگ کر سکے گی ڈاکٹر سنتووسکی نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا "کون جانتا ہے کہ اس برس سانتا کلاوس ایویلین کے لئے کیا کیا تحفہ لائے گا۔" اس عرصے میں ہم ان کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ یورگ اور کارل دروازے پر میرا استقبال کرنے کے لئے کھڑے تھے۔

یورگ یونیورسٹی میں قانون پڑھتا تھا اور کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اسے انگریزی بولنے کا شوق تھا، جب کہ میں جرمن بولنے پر مصر تھا۔ یہ بات کارل کو اچھی لگی کیوں کہ اس کی انگریزی میری جرمن کی طرح ناپختہ تھی۔ اسے خوشی تھی کہ میں اس سال اس کی سالگرہ میں شامل ہونے کے لئے آیا تھا۔ وگرنہ کرسمس کی وجہ سے ہر سال اس کی سالگرہ کی تقریب کو بھلا دیا جاتا تھا۔ اس روز البتہ یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ سالگرہ کی تقریب الگ منائی

جائے گی۔ چنانچہ ہمیں اس کے اپارٹمنٹ میں جمع ہونے کو کہا گیا جو بنگلے کے شرقی حصہ میں تھا۔ کارل کو تحفوں سے لاد دیا گیا۔ وہ ابھی ان کو کھولنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے سامنے ایک فوکس واگن کار آ کر رکی۔ کاروں کی ایک مقامی فرم کا کارندہ اتر کر آیا اور اس نے کارل کو کار کی چابیاں اور کار کی ملکیت کے کاغذات پیش کیے۔ اس روز کارل کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور ماں باپ نے اس کو کار تحفے میں دی تھی۔ یہ چیز اگرچہ متوقع تھی، اس کے باوجود کارل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ دوسرے سارے تحفوں کا بھلا کر کار میں جا بیٹھا۔ اس نے مجھے اور اویلین کو شہر کی سیر کے لئے چلنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر سنتووسکی نے کارل سے آدھے گھنٹے میں واپس آ جانے کا وعدہ لے کر ہی جانے دیا۔

ہم واپس لوٹے تو بنگلے کے ہال میں کرسمس کا درخت سجایا جا چکا تھا۔ اس پر رنگارنگ کے چاند ستارے، فرشتے، حوریں اور قسم قسم کے کھلونے لٹک رہے تھے۔ اس پر مستزاد سرخ اور سفید موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ جو ہمارے کمرے میں داخل ہونے پر روشن کر دی گئیں۔ مکان کے اندر درخت کا لگایا جانا اور اس کا کسی دلہن کی طرح سجایا جانا میرے لئے نئی چیز تھی۔ کرسمس کے درخت کے نیچے خاندان کے ہر فرد کے لئے تحفوں کا الگ الگ ڈھیر لگا ہوا تھا مجھے بھی خاندان کے ہر فرد کی طرف سے تحفے دئے گئے تھے۔ اویلین کو اس کی توقع کے مطابق اسکیٹنگ جوتوں کا سیٹ ملا تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اگر اس وقت باہر اندھیرا نہ چھا گیا ہوتا تو وہ اسی وقت ندی کے یخ بستہ پانی پر اسکیٹنگ کرنے کے لئے جانے کو تیار تھی۔ ڈاکٹر سنتووسکی اتنے میں پیانو پر کرسمس کی دھنیں بجا رہے تھے۔ چند منٹوں کے اندر سارا خاندان مل کر کرسمس کے گیت گا رہا تھا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی۔ مگر اس بات کا افسوس ہوا کہ میں ان گیتوں میں سے کسی گیت سے واقف نہ تھا اور اگر واقف بھی ہوتا تو میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا، کیوں کہ مجھے سرے سے گانا نہیں آتا۔

"تم کو گانا نہیں آتا تو کیا ہوا۔" مارگٹ نے کہا "تم کو یقیناً ہاتھ کی لکیریں پڑھنا آتا ہوگا۔ ہندستان میں سنا ہے لوگوں کو پامسٹری کا علم آتا ہے۔"

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ جرمنی آنے سے دو تین سال قبل تک میں علم پامسٹری کا طالب علم رہ چکا تھا۔ ان برسوں میں ہفت روزہ "قندیل" (لاہور) میں پامسٹری کی کتابیں قسطوں میں چھاپی جاتی رہی تھیں۔ مجھے اور میرے دوستوں کو اس میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ ہم اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے ایک پوری کتاب اس موضوع پر لکھ ڈالی تھی، جس میں اپنے دوستوں، رشتے داروں اور بے شمار دوسرے لوگوں کے ہاتھوں کے نقوش کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔ میرا ارادہ اسے چند برسوں کے بعد چیک کرنے کا تھا کہ میری اس وقت کی پیش گوئیاں پوری اتری تھیں اور کیا لوگوں کے ہاتھوں کی لکیروں میں اس دوران میں کوئی تبدیلی آئی تھی یا نہیں۔

سب سے پہلے مارگٹ نے اپنا ہاتھ میرے سامنے رکھا اور مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھی کہ وہ دوبار شادی کرے گی، مگر صرف ایک بار وہ بھی عین جوانی میں بیوہ ہو گی۔ اگر اس کا پہلا خاوند مر چکا تھا اور وہ بیوگی سے دوچار ہو چکی تھی، تو پھر اس کی دوسری شادی کا خاتمہ یا تو طلاق کی صورت میں ہو گا یا اس طرح کہ وہ اپنے خاوند سے پہلے مر جائے۔ مجھے اس وقت تک کسی نے نہیں بتایا تھا کہ یورگ اور کارل کا باپ مارگٹ کا پہلا خاوند تھا، جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ اویلین ڈاکٹر سنتووسکی کی بیٹی تھی۔ یہ بات مجھے اس وقت بتائی گئی، جب میں نے مارگٹ سے کہا۔

"دو سے زیادہ شادیاں آپ کی قسمت میں نہیں لکھی ہیں۔"

یہ سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس نے کہا۔

"یہ میری دوسری شادی ہے، مگر تم کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟"

میں نے کہا۔ "یہ میرا پروفیشنل راز ہے، جس کو کھولا نہیں کرتے۔"

اس طرح میں دوسری بات کہنے سے بچ گیا، جس کا تعلق مستقبل کے ساتھ تھا اور جس کے بارے میں مجھے یقین بھی نہیں تھا۔ تاہم میرے سارے شکوک اس وقت دور ہو گئے، جب ڈاکٹر سنتووسکی نے اپنا ہاتھ میرے سامنے رکھا۔ ان کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ شخص کسی عورت کے ساتھ وفاداری نہیں نبھا سکتا۔ ان کو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان کی قسمت میں صرف ایک بیٹی لکھی ہے، مگر 'ڈوب خوان' کی طرح بے شمار عورتیں جو ان کی محبت کا دم بھرتی ہیں، مگر وہ ان میں سے کسی کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔

مارگٹ نے معنی خیز نظروں سے یورگ کی طرف دیکھا، جو اس عرصے میں اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا چکا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ساخت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر ایک فوجی افسر چھپا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ "تم بے شک قانون پڑھتے رہو مگر تمہارا کیریئر ملٹری میں جا کر بنے گا۔"

کارل کا ہاتھ صاف بتا رہا تھا کہ وہ پیدائشی تاجر ہے۔ اس بات کی تصدیق مارگٹ نے فوراً کر دی، کیوں کہ کارل بچپن سے چیزیں خریدنے میں اور ان کو آگے منافع پر بیچنے میں لگا رہتا تھا۔

اویلین کی ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ اس کی زندگی کو ایک زبردست جھٹکا لگے گا، جس کے نتیجے میں اس کو اپنی تعلیم نامکمل چھوڑنی پڑے گی۔ تاہم اسکی زندگی مالی خوشحالی میں گذرے گی۔ پھر ایک فقرہ میری زبان سے نکلا، جس کے لئے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا تاہم اویلین کے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ بے حد نافع الناس وجود ثابت ہو گی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے ذریعے بے شمار لوگوں کو زندگی ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔"

پھر بات اس طرف نکل گئی کہ مارگٹ کے تینوں بچوں کی پیدائش غیر معمولی دنوں میں ہوئی تھی۔ یورگ عین مارگٹ کے برتھ ڈے پر پیدا ہوا تھا۔ اس طرح ماں بیٹے کی برتھ ڈے ایک ہی دن پڑتی تھی۔ کارل کرسمس والے

دن پیدا ہوا تھا اور اولیلین کی پیدائش ۳ مارچ کے روز تین بج کر تین منٹ پر ہوئی تھی۔

ڈاکٹر سنتو وسکی نے اپنی زندگی کے المیے کا ذکر چھیڑ دیا، کیوں کہ ان کی پیدائش ۲۹ فروری کو ہوئی تھی، جس کے سبب ان کی برتھ ڈے ہر چار سال [illegible] آتی تھی۔ وہ بچپن سے قدرت کی اس ناانصافی پر کڑھتے آئے تھے کہ ان کی [illegible] دوسرے لوگوں کی طرح ہر سال نہ منائی جا سکتی تھی۔

مارگٹ نے کہا۔ "کیوں نہ تم [illegible] کی طرح جو یقیناً کرسمس والے روز پیدا نہ ہوئے تھے، تمہاری سالگرہ سال کے کسی دوسرے دن منایا کریں"

ڈاکٹر سنتو وسکی کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو یسوع مسیح کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا نہیں کر سکتے۔

میں نے انہیں چھیڑنے کے لئے کہا۔ "پھر تو آپ کو ڈون خون کی ہمسری کے خلاف بھی احتجاج کرنا چاہئے تھا۔"

مارگٹ نے کہا۔ "ڈون خوان کی ہمسری کو اس نے شاید اپنے لئے اعزاز جانتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔"

آدھی رات تک ہماری محفل بڑے خوشگوار ماحول میں جاری رہی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد سیر کے لئے جانے کا پروگرام تھا۔ رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی اور ہر چیز پر سفیدی کا ملمع ہو گیا تھا۔ جب ہم گھر سے نکلے، تو سورج بادلوں کے پیچھے سے شرمیلی دلہن کی طرح جھانک رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے میں اس نے حجاب کو ایک طرف دھکیل دیا اور کھلے بندوں دھرتی پر اپنے شعاعیں بھیجنے لگا، جو روشنی تو پھیلا رہی تھیں، مگر جن میں گرمی کی حدت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس سال سردی نے سابقہ ریکارڈ توڑ دئے تھے۔

ڈاکٹر سنتو وسکی نے جمی ہوئی ندی کے یخ بستہ پانی پر چل کر اطمینان کر لیا کہ اس پر بلاخوف و خطر اسکیٹنگ کی جا سکتی ہے۔ اولیلین نے اسکیٹنگ شوز پہنے اور دوسرے جوتے میرے حوالے کرتے ہوئے ندی کی یخ پر اتر گئی اس کو اچھی خاصی اسکیٹنگ آتی تھی۔ ماں باپ اور دونوں بھائی اس کی طرف سے مطمئن تھے، اس لئے وہ لوگ اپنے کتے کے ساتھ کھیلتے بھاگتے ہوئے آگے نکل گئے۔ میرے لئے وہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو ندی کے یخ بستہ پانی پر چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس لئے میں قدرتی طور پر کسی قدر فکر مند تھا۔ میں سارا وقت اولیلین کے ساتھ ساتھ ندی کے کنارے پر چلتا رہا۔

راستے میں ایک پل پڑتا تھا، جو اتنا اونچا تھا کہ اولیلین آسانی کے ساتھ اس کے نیچے سے گذر سکتی تھی۔ مگر پھر وہی ہوا، جس کا مجھے شروع سے خطرہ تھا۔ پل کے نیچے یخ کی تہہ مضبوط نہ تھی اور اولیلین کے بوجھ تلے ٹوٹ گئی اور اولیلین میری آنکھوں کے سامنے دھڑام سے پانی میں گر گئی۔ ندی کا پانی خاصا گہرا تھا، جس میں اولیلین پوری کی پوری غائب ہو گئی۔ مگر پھر سطح پر ابھری اور اس نے مدد کے لئے مجھے دہائی دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے خاندان کے لوگ پل کے دوسری طرف میری آواز کی پہنچ سے دور جا چکے تھے۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود اولیلین کی مدد کو پہنچوں۔ میرے لئے یخ بستہ پانی پر قدم دھرنے کا وہ پہلا موقع تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ میں پھسل کر گر جاؤں گا۔ میرے اندر کے محتاط آدمی نے مجھے مشورہ دیا کہ ندی کی یخ پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔ میں نے یہی کیا اور اولیلین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ دوسری بار پانی کی سطح پر ابھری، تو اس نے میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اب میں اسے آہستہ آہستہ کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا۔ چونکہ اولیلین کے کپڑے پانی سے بھیگ چکے تھے اس لئے میں نے اپنا اوور کوٹ اتار کر اس پر ڈال دیا اور اسے کہا کہ اپنے گیلے کپڑے اتار دو۔

اس کو ندی کے کنارے پر چھوڑ کر میں بھاگ کر پل کے اوپر چڑھا تاکہ اس کے خاندان کے افراد کو خبر دے سکوں وہ لوگ دو تین سو میٹر کے فاصلے پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ وہ اتفاق سے پیچھے کو تک رہے تھے، اس لئے میرے اشارے کو دیکھ کر فوراً جان گئے کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اولیلین کے دونوں بھائی ماں باپ کے پہنچنے سے پہلے ہمارے پاس پہنچ چکے تھے انہوں نے اپنے اوور کوٹ اتار کر اولیلین پر ڈال دیئے اور میرا اوور کوٹ مجھے دے دیا، انہوں نے کہا کہ وہ تو سردی کا مقابلہ کرنے کی مشق رکھتے ہیں، مگر میرے لئے یخ بستہ ہواؤں سے پہلا واسطہ تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر سنتو وسکی بھی آ گئے انہوں نے اولیلین کو معائنہ کرنے کے بعد بیٹوں سے کہا کہ بہن کو جلد از جلد گھر پہنچائیں۔ یورگ نے اولیلین کو اپنے کندھوں پر ڈالا اور بھاگتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا، جو وہاں بہت زیادہ دور نہ تھا۔ ہمارے گھر پہنچنے تک اولیلین کو تولیے سے پونچھنے کے بعد ایک گرم کمبل میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سنتو وسکی نے بیٹی کو کوئی دوائی دی اور مارگٹ سے کہا کہ اولیلین کے لئے فوراً گرم گرم شوربہ تیار کیا جائے۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر اولیلین پھر وہی پہلی والی صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے بال سکھائے جا چکے تھے اور وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہمارے درمیان بیٹھی ہوئی چہک رہی تھی۔

یورگ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کل رات والی پیش گوئی میں تم سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ اولیلین کسی وقت تمہیں موت سے بچائے گی۔ جب کہ در حقیقت تمہیں کہنا چاہئے تھا کہ تم اس کو موت کے منہ سے بچاؤ گے۔"

اب سارا خاندان ہاتھ کی لکیروں کے علم کا مذاق اڑانے لگا۔ میں نے کہا کہ میں نے وہی باتیں دہرا دی تھیں، جن کو میں نے پامسٹری کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ یورگ نے کہا کہ اس نے یہ بات گھر میں کسی کو نہیں بتائی تھی کہ اس نے دو ہفتے قبل ملٹری میں کمیشن حاصل کرنے کے لئے درخواست بھیجی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ قانون کا امتحان ختم ہوتے ہی ملٹری سروس میں چلا جائے۔ مارگٹ کو یہ بات سن کر پورا پورا یقین ہو گیا کہ میری پیش گوئیاں ساری کی ساری اپنے وقت پر پوری ہو جائیں گی۔ البتہ اسے یہ پتہ نہ تھا کہ میں

نے اس کے خاندان کے بہت جلد بکھر جانے والی بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔

دوسرے روز کارل مجھے اپنی نئی کار میں ہمبرگ چھوڑنے کے لئے آیا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ اس کے سوتیلے باپ کا اپنے مطب کی ایک نرس کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا، جس کا علم اس کی ماں کو نہیں تھا۔ وہ یہ بات ماں کو بتا کر فکر مند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کارل کو ہاتھ کی لکیروں کے علم پر اعتبار نہ تھا۔ مگر وہ اس چیز پر حیران تھا کہ مجھے کیوں کر محض ہاتھوں پر ایک نظر ڈالنے سے، اس کے خاندان کے مسائل کا پتہ چل گیا تھا۔

چونکہ میں ہمبرگ میں رہتا تھا اور ڈاکٹر سنتووسکی کا خاندان لیوبک میں مقیم تھا، اس لئے ہمارا سال بھر میں بمشکل ایک آدھ بار ملنا ہوتا تھا۔ اگلی ملاقات میں مارگٹ نے مجھے علیحدگی میں بتایا کہ وہ جلد یا بدیر اپنے خاوند سے طلاق لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سنتووسکی نے اپنی محبوبہ کو اپنے بنگلے کے اس حصے میں رہائش دے دی تھی، جو یورگ نے ملٹری سروس جوائن کرنے کے بعد خالی کیا تھا۔ مارگٹ کے دونوں بیٹے اس عرصے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ صرف اویلین ابھی بہت چھوٹی تھی، اور وہ اپنے باپ سے بہت مانوس تھی۔ طلاق ہونے کی صورت میں مارگٹ کو یقین تھا کہ اویلین کی سرپرستی کا حق عدالت کی طرف سے اس کو مل جائے گا۔ مگر ان کو بنگلے سے نقل مکانی کرنی پڑے گی اور کرایے کے مکان یا فلیٹ میں جانا پڑے گا وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سنتووسکی، ماں بیٹی کو مالی امداد دینے میں کنجوسی سے کام لے گا۔ سب سے زیادہ وہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ اویلین کی حساس طبیعت پر ماں باپ کی طلاق کا اثر پڑے گا۔ اس کے اسکول کی آخری رپورٹ سے پتہ چلتا تھا کہ اویلین کو سب باتوں کا پتہ تھا۔ اس کی استانی نے مارگٹ سے اویلین کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کیا تھا۔

اس کے بعد آئندہ برسوں میں میرا لیوبک جانا قریب قریب معطل ہو گیا۔ مارگٹ کے ایک خط سے مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک علیحدہ فلیٹ میں منتقل ہو گئی ہے اور طلاق کی کاروائی شروع ہو چکی ہے۔ مجھے اتفاق سے انہی دنوں یونیورسٹی کے ایک گروپ کے ہمراہ لیوبک جانے کا موقع ملا، تو میں نے مارگٹ کو خط لکھا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اس کو اور اویلین کو ملنے کے لئے آنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا، مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس خاندان کے خوشی و مسرت کے دن بیت چکے تھے۔ ڈاکٹر سنتووسکی کی طرف سے ماں بیٹی کو تھوڑی سی مالی امداد ملتی تھی۔ مارگٹ نے کسی کلینک میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔ اویلین نے کہا کہ اس کا اسکول کے خاتمے پر میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے۔

چند برسوں کے بعد مجھے اویلین کا ایک کارڈ امریکہ سے ملا، جہاں پر وہ کسی ہوائی کمپنی میں ایئر ہوسٹس تھی۔ مارگٹ سے میں نے رابطہ کیا، تو پتہ چلا کہ اویلین نے نیویارک میں رہائش اختیار کر لی ہے اور جرمنی واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ مارگٹ نے مجھے اپنی سالگرہ کے موقع پر آنے کی دعوت دی اس موقع پر اس کے دونوں بیٹے آئے ہوئے تھے۔ بلکہ یورگ نے اس روز خاص طور پر مجھے دکھانے کے لئے اپنی وردی زیب تن کی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ اس دوران میں لیفٹننٹ کرنل کے عہدے پر پہنچ چکا تھا۔ کارل بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور ایک فرم چلا رہا تھا، جس کا کام ایسی فرموں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا، جن کے دیوالیہ نکلنے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ اویلین کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے ایک امریکن کروڑپتی کے ساتھ شادی کر لی ہے، جس کے ساتھ اس کی ملاقات کسی ہوائی سفر کے دوران ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مارگٹ اس کے پاس آ کر رہے، مگر مارگٹ اپنے بچوں کی محتاج بننا نہ چاہتی تھی اور ہر قیمت پر اپنی خود مختاری کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ وہ بدستور ایک کلینک میں کام کر رہی تھی۔

آپریشن کے تیسرے روز ڈاکٹر ساندرا مجھے دیکھنے کے لئے آئی، تو خلاف معمول جلدی میں تھی۔ اس نے کہا کہ وہ تین روز کے لئے نیویارک جا رہی ہے۔ اس کو امید تھی کہ اس کی واپسی تک میری صحت اتنی بہتر ہو چکی ہو گی کہ مجھے گھر واپس جانے کی اجازت دی جا سکے گی۔

میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نیویارک کو محض ہاتھ لگانے کے لئے جا رہی ہو؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "میں یہ بتانے کے لئے جا رہی ہوں کہ میں اس سال کے اختتام پر نیویارک منتقل ہو جاؤں گی، جہاں پر ایک میڈیکل ٹرسٹ کے ہسپتال میں ہارٹ اسپیشلسٹ کی جگہ خالی ہو رہی ہے۔ یہ ٹرسٹ میری ماں نے اس وقت قائم کیا تھا جب میرے باپ کی اچانک ہارٹ اٹیک سے وفات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ۳ مارچ کے روز میری ماں کی سالگرہ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس روز اس کے تینوں بچے گھر آئیں۔"

"کیا تم امریکن ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آدھی امریکن اور آدھی جرمن۔ میرا باپ امریکی تھا، جب کہ میری ماں جرمن ہے۔ اس نے مجھے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جرمنی بھیجا تھا۔ یہاں پر لیوبک میں میری نانی رہتی ہے جس کے پاس رہتے ہوئے میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔"

"کیا تمہاری ماں کی پیدائش ۳ مارچ کے تین بج کر تین منٹ کی ہے اور اس کا نام اویلین ہے؟"

"ہاں مگر آپ کو اس بات کا کیسے پتہ چلا۔؟" ڈاکٹر ساندرا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے، جس کی تفصیل تمہیں اویلین بتا سکتی ہے۔ میری طرف سے اپنی ماں کو سالگرہ کی مبارکباد دینا اور کہنا کہ اس کے ہاتھ کی لکیروں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ صرف میرا علم کچا تھا۔ جس کے سبب میں سمجھتا تھا کہ وہ میری زندگی بچائے گی جب کہ یہ کام اس کی بیٹی کے ہاتھوں سر انجام پایا تھا۔"



تنہا تما پوری

ایک نظم

نیند بچھاؤں اور لپیٹوں
وہی جاگنا سونا ہے
کھیل پرانا کھیلتے رہنا
یوں ہی جیون جینا ہے
اب کے نیند سے کبھی نہ جاگوں
ایسی نیند کہاں ملتی ہے
میرے مقدر میں اب ایسی
آخری نیند کوئی لکھ جائے
آنسو اوڑھ کے
جگنے والی آنکھیں
تھک کر
جلنے لگی ہیں ○

پیڑ اور بادل

پیڑ
جڑوں کو
دھرتی کے اندر پھیلا کر
اپنا سر اونچا رکھتے ہیں
بے جڑ بادل
ان کی ہمت دیکھ کے
آنسو برساتے ہیں ○

لیکن

سب کچھ جل کر رہ جاتا ہے
جب بجلی گر جاتی ہے
لیکن بادل کے دامن پر
کوئی آنچ
نہیں آتی ہے ○

احسان

زندگی
تجھ سے بچھڑنا
اور بگڑنا
اس قدر آساں نہ تھا
بے وفائی کا تری
مجھ پر
بڑا احسان ہے
تجھ کو کھو کر
میں خدا کے
راستے پر آگیا ○

جاگتی کہانی

اونگھ رہی تھی رات
کہانی
جاگ رہی تھی
اُس نے
اپنا بدن بچھا کر
اپنے دکھ کو
اوڑھ لیا تھا
سوچتا آنسو
اداسی کی پلکوں پہ
ٹھہرا ہوا
ایک آنسو
بڑی دیر سے سوچتا ہے
کہ جانا کدھر ہے ○

دو فرشتے

آنکھ میں
ریت ہے سوالوں کی
ذہن
مفلوج بے جوابی سے
دل میں
سوزِ غمِ نہانی ہے
ہاتھ میں
کرچیاں مسائل کی
پاؤں میں
بیڑیاں ہیں مذہب کی
اور
کندھوں پہ
دو فرشتے ہیں!! ○

پہلا سجدہ

گرمی کے موسم کی تپتی رات کو
چھت پر
نیم برہنہ ٹہل رہا تھا
گرم ہوا کے جھونکوں میں
کچھ ٹھنڈے لمحے
ڈھونڈ رہا تھا
پیاس پسینہ پونچھ رہی تھی
شاید دوزخ نے دروازہ کھول دیا تھا
بے چینی کی اس حالت میں
جاگتے بچوں نے
ریڈیو کو آن کیا تھا
حمد کے مصرعے گونج رہے
صبح ہوئی تو
سب نے دیکھا
وہ
سجدے میں پڑا ہوا تھا!! ○

RANGAMPETH- 285220 DIST. GULBARGA, (KARNATAKA)



سید اقبال امروھوی
609/B, A.K. TOWER.S.V. ROAD,
GOREGAON0 (W) MUMBAI - 400 062

اردو میں سائنسی ادب اور اصطلاحات

بیسویں صدی کا نصف آخر خصوصیت سے سائنسی اور تکنیکی ترقی کے لئے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا کیوں کہ اس دور میں تقریباً تمام سائنسی علوم ترقی کی غیر معمولی منازل تیزی سے طے کرتے رہے ہیں۔ خاص طور پر الیکٹرانک کے میدان میں جو ایجادات ہوئی ہیں ان سے علمی دنیا میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ ایک خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اردو زبان بھی اس ترقی سے مستفید ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور کمپیوٹر کی ایجاد و اردو سافٹ ویئر کی تیاری سے اردو جیسی زندہ زبان کو ایک نئی حرارت مل گئی ہے۔ اردو رسم الخط کے بارے میں جو اعتراضات قائم ہوتے رہے تھے کہ وہ موجودہ (اب گذشتہ) دور کی ترقی یافتہ اور طباعت کی جدید تکنیک کے معیار پر پورا نہیں اترتا اس لئے اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئی ہے۔ اب یہ مفروضے کسی حد تک ختم ہوگئے ہیں۔ اب اردو بھی دوسری زبانوں کی طرح ترقی کر سکتی ہے اور اس کے اشاعتی کاموں میں اب کوئی دشواری نہیں ہے اور امید ہے کہ اردو رسم الخط کے جو بھی مسائل ہیں وہ بھی جلد دور ہو جائیں گے اور اشاعتی کاموں میں تیزی آجائے گی۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں جدید سائنسی اور مختلف علوم پر جو کام ہو رہا ہے اس کو اردو میں منتقل کرنے کی کوششوں میں بھی اب تیزی آجانی چاہئے تاکہ اردو داں حضرات کو جدید علوم کی معلومات حاصل کرنے کے لئے دوسری زبانوں پر منحصر رہ کر احساس کمتری کا شکار ہونے سے بچایا جاسکے۔ آج وقت کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم نئے اور پرانے علوم اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کریں تاکہ اردو داں طبقہ بھی ان سے استفادہ کر سکے۔

جب ہم دوسری زبانوں کے علمی اور سائنسی ذخیرہ کو اردو میں منتقل کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں تو قلم کار کے سامنے سب سے پہلے ان علوم و فنون سے متعلق اصطلاحات کا مسئلہ آجاتا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ ماضی میں بھی اصطلاحات سے متعلق مسائل ہمارے سامنے رہے ہیں اور ان پر بحث بھی ہوتی رہی ہے لیکن ان کا کوئی حل برآمد نہیں ہو سکا۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے ۹۴ء میں "ہندوستان میں لسانی مسائل" کے موضوع پر ایک سیمینار میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

> "ترقی کرنے والی زبانوں میں سائنٹیفک اصطلاحات کا مسئلہ بڑا الجھا ہوا رہا ہے اور اب بھی یہ الجھن ختم نہیں ہوئی ہے۔ یاد رکھئے کہ اصطلاحات کے مسائل حل کئے بغیر ہم اپنے ملک میں سائنس کو عام نہیں کر سکتے۔ موجودہ صورت حال میں سائنس ایک طبقہ میں سکڑ کر رہ گئی ہے۔"

حالانکہ حکیم صاحب کا اشارہ تمام ترقی پذیر زبانوں کی طرف تھا لیکن انہیں شاید یہ احساس بھی تھا کہ اردو زبان میں اصطلاحات سے متعلق یہ الجھنیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں سائنسی ادب کی ترقی اور مختلف علوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے علمی اصطلاحات کی الجھنوں کو سمجھنا اور ان کو سلجھانا ہوگا۔ اردو کے کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ اصطلاحات کوئی مسئلہ ہی نہیں اور سائنسی ادب کی تخلیق بغیر اصطلاحات کے استعمال کئے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ اصطلاحات تو کسی بھی علم اور فن کی جان ہوتی ہیں اور وہ علوم و فنون میں معنی اور مفاہیم کے اظہار کے لئے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

اصطلاح کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ الفاظ یا مجموعہ الفاظ ہوتے ہیں جو کسی علم یا فن میں کسی خاص مفہوم کے اظہار کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختصار کی خاطر کسی اصول، ضابطہ، مفہوم یا نظریے کا اظہار کرنے کے لئے زبان ہی میں سے جو الفاظ مخصوص کردئے جاتے ہیں وہ اصطلاح کہلاتے ہیں اس لئے اصطلاحیات (Terminology) کے اصول کے مطابق کسی اصطلاح کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ کسی خاص مفہوم ہی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو نے "فرہنگ اصطلاحات برائے نفسیات، فلسفہ اور تعلیم" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "سائنسی علوم میں جامعیت اور اختصار سے کام لیا جاتا ہے اس لئے اصطلاحات کے ذریعے معنی اور مطالب کے جہان کی افہام و تفہیم کی جاتی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ علمی کتاب یا سائنسی ادب میں کسی نظریہ، ضابطہ یا تعریف کو بار بار دہرانے کے بجائے ان کی جگہ اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر طبعیات میں کسی عنصر کے وزن کے لئے جب کمیت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اسے اس کا مطلب اس عنصر کے وزن سے ہوتا ہے جو ایک خاص طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے اور

جس پر کشش ثقل کا کوئی اثر نہیں ہوتا یعنی ایک عنصر کی کمیت جو زمین پر پیمائش کی جائے گی وہی چاند پر بھی ہوگی اب طبعیات میں جب کمیت کی اصطلاح آئے گی تو پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا مندرجہ بالا مفہوم آجائے گا اور اس کے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ساتھ ہی اس کی جگہ لفظ وزن استعمال نہیں کر [illegible] سکتا اگر کوئی معلم کسی طالب علم سے کسی عنصر کی کمیت دریافت کرنا چاہے گا تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ فلاں عنصر کا ایسا وزن معلوم کرو جو کشش ثقل سے حا[illegible] درجو چاند اور ز[illegible] پر یکساں ہو جب کہ وہ یہ کہے گا کہ فلاں عنصر کی کمیت معلوم کرو۔ کمیت عام زبان میں مقدار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہی اس کے [illegible] ہیں لیکن [illegible] لغت میں اس لفظ کا وہ مفہوم نہیں ملے گا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تاہم طبعیات میں جب جب یہ لفظ آئے گا یعنی اصطلاحاً استعمال ہوگا تو اس کا مفہو[illegible] جائے گا جس کے اظہار کے لئے یہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ طے شدہ اصطلاح کے متبادل کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ اصطلاحیات کے اصول کے منافی ہے۔ بعض اصطلاحات اس وقت الجھن بن جاتی ہیں جب کوئی مترجم کسی علمی کتاب یا مواد کا ترجمہ کرتے وقت کوئی قلم کار سائنسی ادب کی تخلیق کرتے وقت یہ خیال نہیں رکھتا کہ اس علم میں انگریزی اصطلاحات کے متبادل اردو میں کون سی اصطلاحات رائج ہیں۔ اگر کسی قلم کار نے کسی اصطلاح کی جگہ کوئی ایسا لفظ استعمال کردیا جو مروج نہیں ہے تو یہاں مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ لفظ پڑھ کر ہمارا ذہن اصل مفہوم کی طرف نہیں جائے گا اور اگر کسی مترجم نے انگریزی اصطلاح کے لغوی معنی استعمال کردیے تو مطلب بالکل ہی بدل جائے گا۔

اس نوع کے مسائل سے بچنے کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ باقاعدہ اصول وضوابط تشکیل دے کر ہر علم کی اصطلاحات وضع کرنے کا انتظام کیا جاتا اور ان کی تشہیر کی جاتی تاکہ سائنسی ادب کی تخلیق کے وقت قلم کار ان کا استعمال کر سکیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے قیام سے پہلے یہ کام منظم طریقے پر اور باقاعدگی سے نہیں ہوا۔ حالانکہ جامعہ عثمانیہ میں باضابطہ دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا جس کے تحت مختلف علوم کی کتب اردو میں ترجمہ ہو سکیں اور اس اہم کام کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ جامعہ عثمانیہ کی احسان مند رہے گی کیوں کی جدید سائنسی علوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرتے وقت ان مترجمین نے جو اصطلاحات اپنی کتابوں میں انگریزی اصطلاحات کے متبادل کی شکل میں استعمال کیں وہی بعد میں مروج رہیں۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں بھی اصطلاح سازی کا کوئی انتظام نہیں تھا یعنی انگریزی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے متعلقہ علم کے ماہرین اور دانشور حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی با[illegible] وضوابط کے تحت یہ کام ہوتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاحات وضع کرنے کا کام بھی مترجمین کے سپرد تھا اور کسی مترجم کو انگریزی اصطلاح کے متبادل جو مناسب لفظ ذہن میں آیا وہ اصطلاح کے طور پر استعمال کردیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی علم کی مختلف کتابوں میں کسی ایک اصطلاح کے لئے اردو میں الگ الگ اصطلاحات وضع کردی گئیں میرا یہ قیاس اس لئے ہے کہ نفسیات میں مختلف کلاسوں میں جو نصابی کتب شامل تھیں ان میں بھی اصطلاحات میں اختلاف پایا جاتا ہے اس سلسلے میں "مبادی علم النفس" جو ایف اے کے لیول پر نصاب میں شامل تھی اور اصول نفسیات جو بی اے کے لیول پر استعمال ہوتی تھی ان دونوں کتابوں کے آخیر میں دی گئی فرہنگ اصطلاحات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں کتابوں میں اکثر اصطلاحات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اصطلاحات کے مسئلے پر بحث ہوئی تھی اور یہ بات پروفیسر وحید الدین سلیم کی کتاب "وضع اصطلاحات" سے سامنے آئی۔ موصوف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

> "جامعہ عثمانیہ دکن کی ایک جنرل کمیٹی تھی جس میں زبان و علم کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ شامل تھے اور اس کمیٹی میں وضع اصطلاحات کے سلسلے میں بحث ہوئی تھی۔ بحث کے بعد یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کردیا گیا کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بعینہٖ یا بغیر کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلہ میں اردو علمی اصطلاحات وضع کی جائیں۔"

غالباً اس فیصلے کی وجہ سے دارالترجمہ میں تیار کی گئی کسی بھی کتاب میں کسی انگریزی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا گیا اور ان کی جگہ متبادل اردو اصطلاحات وضع کی گئیں۔ لیکن اس بات کا کہیں اظہار نہیں ہوتا کہ کسی ایک علم کے لئے ماہرین یا مترجمین کی علیحدہ کمیٹی تھی اگر ایسا ہوتا تو پہلے اس علم یا فن کی علمی اصطلاحات وضع کی جاتیں اور پھر مترجمین اپنی کتابوں میں صرف انہی وضع کردہ اصطلاحات کا استعمال کرتے۔ ایک ہی ادارے میں ایک ہی علم سے متعلق لکھی گئی اور مختلف لیول پر استعمال کی جانے والی درسی / نصابی کتابوں میں اصطلاحات کا یہ اختلاف علمی کاموں کو معتبر نہیں بناتا یہ اصول اصطلاحیات کے خلاف بھی ہے نیز بعد کے مترجمین کے لئے الجھنیں اور مسائل بھی پیدا کرتا ہے۔ اب یہ مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ ایک بااقتدار ادارہ یہ کام اپنے ہاتھوں میں لے۔ ایسا ادارہ جس میں ماہرین علوم وفنون اور معتبر دانشور شامل ہوں۔ وہ جو لسانیات کے جدید اصولوں سے واقف ہوں، جو حرف ولفظ کی جمالیات کا گہرا شعور رکھتے ہوں، وہ جو مشرقی ومغربی علوم وفنون کا کماحقہٗ علم رکھتے ہوں۔ ایسا ادارہ جس کے فیصلوں کو مجموعی طور پر تسلیم کیا جاتا ہو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی تشکیل نو کے فوراً بعد ہی اس طرف توجہ کی اور ماہرین سے مشوروں کے بعد اصول وضوابط وضع کرکے ان کے تحت اصطلاح سازی کے انتظامات کیے۔ اس کے لئے کوئی ١٨ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن میں ملک کے ماہرین علوم اور دانشور حضرات شامل تھے ہر علم وفن کے لئے علیحدہ کمیٹی تھی اور ان کمیٹیوں نے بہت محنت اور کاوش کے بعد ہر علم کی الگ فرہنگ اصطلاحات تیار کی اور کونسل نے اس کو شائع بھی کیا۔ قومی کونسل برائے اردو زبان کو ایک بااقتدار ادارہ تسلیم کیا گیا

ہے۔ مذکورہ کمیٹیوں نے متعلقہ علوم کے لئے جو اصطلاحات تجویز کی ہیں اب صرف انہیں کا استعمال اور رواج ہونا چاہئے۔ لیکن اب بھی اصطلاحات سے متعلق الجھنوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور بھی کئی مسائل پھر ابھر کر آئے۔ ایک تو یہ کہ قومی کونسل نے جو فرہنگ شائع کی ہے ان میں دیکھا گیا ہے کہ مروّج اصطلاحات کو نظر انداز کر کے نئی اصطلاحات وضع کر دی گئی ہیں اور ایسا کرتے وقت انگریزی اصطلاحات کے لغوی معنوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ کہیں کہیں اس کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ کون سی اصطلاح کس مفہوم کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ کم از کم نفسیات سے متعلق فرہنگ میں تو یہی دیکھنے میں آیا ہے (حوالے کے لئے ملاحظہ فرمایئے، فرہنگ اصطلاحات۔ فلسفہ، نفسیات، تعلیم)اس میں تینوں شعبوں سے متعلق اصطلاحات شامل ہیں۔ یہاں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مذکورہ علمی کاموں پر تنقید کرنے کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا لیکن اصطلاحات سے متعلق اس مضمون میں ان باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو مسائل بنتے ہیں اور الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ اصطلاحات میں اختلاف نہ صرف مصنف کے لئے مسئلہ بن جاتے ہیں بلکہ قاری کے لئے بھی ایک مشکل۔ مصنف کے لئے اس طرح کہ وہ اپنے مضامین میں وہی اصطلاحات استعمال کریں جو رائج ہیں اور جو اب تک استعمال ہوتی رہی ہیں اور جن کے ذریعے علم کی تعلیم حاصل کی گئی تھی یا ان کی وہ نئی اصطلاحات ہیں جو مضمون میں متعلقہ مفہوم کی طرف اشارہ نہیں کرتیں۔ یہاں اپنی بات ایک مثال کے ذریعے واضح کرنا چاہوں گا۔ نفسیات میں تحلیل نفسی کے تعلق سے انگریزی اصطلاح Association استعمال کی جاتی ہے۔ یہ جس مفہوم کے لئے استعمال کی جاتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے "جب دو مظاہر میں ایک ایسا تعلق پیدا ہو جائے کہ ان میں سے ایک ادراک ہو تو دوسرا فوراً ذہن میں آجائے" اردو میں اس مفہوم کے لئے نفسیاتی کتابوں میں قدماء نے تلازم کی اصطلاح استعمال کی تھی اور اب بھی تلازم ہی استعمال ہوتا آرہا ہے اور اس سے متعلق جو دوسری اصطلاحات ہیں جیسے Free Association کے لئے آزاد تلازم، Associative memory کے لئے تلازمی حافظہ وغیرہ استعمال ہوتی رہی ہیں لیکن قومی کونسل کی مذکورہ فرہنگ میں Association کے لئے ائتلاف کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور متعلقہ اصطلاحات بھی اسی طرز پر آزاد ائتلاف، ائتلافی حافظہ وغیرہ تجویز کی ہیں اب کسی نئے مصنف یا مترجم کے لئے نئی وضع کردہ اصطلاحات الجھن کا باعث ہو سکتی ہیں کہ اب تک جو اصطلاح جس مفہوم کے لئے استعمال ہوتی آرہی ہے اور جس کو پڑھتے ہی قاری کا ذہن اس کے مفہوم کی طرف چلا جاتا ہے اس کی جگہ وہ کوئی نئی اصطلاح استعمال کر کے کیا اپنے مضمون میں اس مفہوم کی وضاحت کر پائے گا؟ ایک اور مثال۔ انگریزی اصطلاح Suggestion کے لئے جامعہ عثمانیہ کی کتابوں میں اثر آفرینی کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی لیکن بعد میں Auto Suggestion کے نظریہ کی ابتداء ہونے کے بعد اس کے لئے خود ترغیبی کی اصطلاح استعمال کی گئی اور اسی تعلق سے Suggestion کے لئے ترغیب کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ اس تبدیلی کی کوئی وجہ تھی اور جب پہلی مرتبہ یہ استعمال ہوئی تو اس کی وضاحت کر دی گئی (دیکھئے حزب اللہ صاحب کی کتاب "تحلیل نفسی") اب نفسیات کی تمام کتابوں میں اس عمل کے لئے ترغیب ہی استعمال ہوتا ہے جس کا مفہوم ہے "جب فرد ایک مخصوص کیفیت میں اپنے آپ کو دنیا کے دوسرے مسائل سے آزاد تصور کر کے اپنے ذہن کو کسی دوسرے فرد یا افراد کے پیغامات، مشورے، رویے اور خیالات کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار کرلے۔" لیکن قومی کونسل کی فرہنگ میں اس کے لئے اردو متبادل اصطلاح کی شکل میں "ایما" تجویز کیا ہے یہ بھی ڈکشنری کے معنی نہیں لیکن جب یہ اصطلاحاً استعمال ہوتا ہے تو وہ مفہوم واضح نہیں کرتا جس کے لئے اس کو استعمال کیا گیا ہے۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلسفہ یا تعلیم میں Association کے لئے ائتلاف اور Suggestion کے لئے ایما اصطلاحاً استعمال ہوتا رہا ہے یا نہیں البتہ یہ طے ہے کہ نفسیات میں ان اصطلاحات کا استعمال نہیں ہوتا۔ اصطلاحات میں اختلاف کی اور بھی مثالیں ہیں لیکن ان سب کا ذکر کسی مختصر مضمون میں ممکن نہیں لیکن اتنا عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ چونکہ جدید علوم انگریزی سے اردو میں منتقل ہو رہے ہیں اس لئے انگریزی اصطلاحات کی جگہ اردو اصطلاحات وضع کرتے وقت یہ بھی ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ اردو محض انگریزی اصطلاح کے لغوی معنی نہ ہو بلکہ اردو اصطلاح بھی ایسی جامع ہو کہ اپنے مفہوم کا پوری طرح اظہار کر سکے۔ نفسیات ہی سے ایک اور مثال ہے مثلاً انگریزی اصطلاح Behaviour کے لئے اردو میں متبادل اصطلاح کردار ہے حالانکہ عام زبان میں کردار کے معنی کچھ اور لئے جاتے ہیں اور یہ انگریزی لفظ کے ہم معنی بھی نہیں ہے لیکن نفسیات میں جب کردار کا لفظ اصطلاحاً استعمال ہوتا ہے تو قاری کا ذہن اس کے مفہوم کی طرف جائے گا اور عام زبان میں جب یہ لفظ استعمال ہوگا تو اس کے لغوی معنی لئے جائیں گے۔ ایک اور مثال۔ Automatism کے لئے مختلف فنون میں اردو متبادل اصطلاح "خودکاریت" استعمال کی جاتی ہے لیکن نفسیات میں اس کی متبادل اصطلاح "سرفیت" ہے۔ پاکستان سے شائع ہونے والی نفسیات کی کتابوں میں بھی یہی اصطلاح دی گئی ہے۔ نفسیات میں یہ اصطلاح جس کیفیت کے لئے استعمال کی جاتی ہے اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے: "جب انسان کا شعور دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور دونوں حصے اپنا اپنا کام آزادانہ طور پر انجام دیتے ہیں مثلاً ایک فرد کچھ لکھ رہا ہے اور کسی سے بات چیت بھی کر رہا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں کچھ ایسے الفاظ یا عبارت استعمال کر جائے جو اس کی اصل تحریر سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو بلکہ وہ اس کی گفتگو کا حصہ ہو۔" جب اس کیفیت کے لئے انگریزی میں Automatism کی اصطلاح استعمال ہو تو اس کے متبادل اردو میں سرفیت ہی استعمال ہوگا حالانکہ سرفیت کے لغوی معنی کچھ اور ہیں۔

چونکہ اصطلاحات زبان ہی سے لئے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں اس لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے عام معنوں اور اصطلاحی معنوں میں فرق ہو اور یہ صورت بڑ

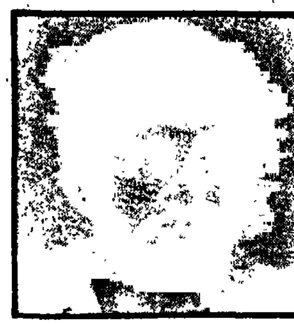
زبان میں ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں بھی یہی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمی کتابوں کے بہت سے مصنفین خاص طور پر قاری کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ مضمون میں جہاں جہاں کوئی اصطلاح آئے تو اس کے مفہوم سے واقفیت حاصل کرلیں اس کے بعد آگے بڑھیں کیوں کہ اگر کسی لفظ کے اصطلاحی مفہوم کے بجائے اس کے عام معنی ذہن میں رکھ کر مطالعہ کیا جائے گا تو عبارت کا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لفظ ایک علم یا فن میں اصطلاحاً کسی خاص مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور وہی لفظ دوسرے علم یا فن میں مختلف مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے حالانکہ اصطلاحات وضع کرتے وقت اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس قسم کے اختلافات کی نوبت نہ آئے۔

قارئین یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ اس مضمون میں نفسیات سے متعلق اصطلاحات پر گفتگو ہے اور اس مضمون سے مثالیں بھی دی گئی ہیں تو یہ مسائل صرف علم نفسیات تک ہی محدود ہوں گے لیکن احقر چونکہ نفسیات کا طالب علم ہے اور وقتاً فوقتاً ان مسائل سے گزرنا پڑتا ہے لہٰذا مثالیں نفسیات ہی سے دی ہیں تاہم یہ مسائل اور الجھنیں تو دیگر علوم و فنون کے ساتھ بھی یکساں ہیں۔

اصطلاحات سے متعلق مسائل پر بحث ہو رہی ہے تو موجودہ دور میں ایک اور مسئلہ ابھر کر آیا ہے اس کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں علمی کتابوں میں جو اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں وہ سرحد پار سے شائع ہونے والی علمی کتابوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ وہاں کئی یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے جہاں اردو کے ذریعے مختلف علوم کی تدریس کی جاتی ہے اور اسی مقصد سے وہاں مختلف علوم کی نصابی کتابیں تیار کرلی گئی ہیں۔ اب ہمارے ہاں بھی مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے قیام کے بعد اردو کے روشن مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی ہے اور امید ہو چلی ہے کہ ہمارے یہاں بھی مختلف علوم کی تعلیم اردو کے ذریعہ دیئے جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ ایسی صورت حال میں ایک زبان میں ایک ہی علم میں استعمال کی جانے والی اصطلاحات میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے ورنہ تو ایک علاقہ کی علمی کتابیں دوسرے علاقوں میں معاون کتب کی حیثیت سے بے معنی ٹھہریں گی۔ اب تک تو صرف دو ہی ممالک کا معاملہ ہے لیکن اب اردو میں اشاعتی کاموں کی ابتدا دوسرے ممالک میں بھی ہو گئی ہے۔ خلیجی ممالک میں ہی نہیں بلکہ یوروپی ممالک اور امریکہ میں بھی اشاعتی کام ہونے لگا ہے اور آنے والے دور میں اس میں اور بھی ترقی ہو گی اس لئے ابھی سے یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اصطلاحات کے سلسلے میں اردو زبان علاقائی قید و بند کا شکار نہ ہو بلکہ ایک عالمی زبان کی حیثیت سے ترقی کرے اس لئے ایک علاقے میں شائع ہوئی علمی کتابیں ہر علاقے میں مفید ثابت ہوں۔ ایسا ہی مسئلہ انگریزی زبان کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا کیوں کہ یہ بھی ایک بڑی عالمی زبان ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اس زبان میں علمی کتابیں شائع ہوتی ہیں لیکن جہاں تک علمی اصطلاحات کا تعلق ہے عالمی معیاری علمی کتابوں میں مستعمل اصطلاحات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے اب اردو کے ارباب اقتدار کو بھی سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا اور ہر علم میں معیاری اصطلاحات کی پہچان کرنا ہو گی تاکہ ایک زبان میں ایک علم میں کسی خاص مفہوم کے لئے عالمی سطح پر ایک اور صرف ایک ہی اصطلاح استعمال کی جائے۔

اردو اسکولوں کے لئے درسی کتب کی تیاری میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان درسی کتابوں میں صرف وہی اصطلاحات استعمال کی جائیں جو قومی کونسل نے تسلیم کرلی ہیں۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر میں ایسے اردو اسکولوں کے لئے جہاں میٹرک تک ذریعہ تعلیم اردو ہے، درسی کتب کی تیاری سرکاری طور پر کی جاتی ہے ان میں بعض سائنسی علوم کی کتابوں میں اصطلاحات میں رد و بدل کیا گیا ہے۔ اس خامی کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک اہم کام اور کرنا ہے کہ اردو میں ہر علم کی اصطلاحات کی فرہنگ شائع کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی کی طرز پر ہر علم کی ایسی فرہنگ بھی تیار کرنا چاہئے جس میں اصطلاحات کی تشریح اور تفہیم کی گئی ہو۔ انگریزی میں نہ صرف سائنسی علوم بلکہ تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، ادب اور معاشیات وغیرہ کی اصطلاحات کی تشریح اور تفہیم پر مشتمل لغات بھی دستیاب ہیں جن سے نہ صرف طالب علم بلکہ مصنفین بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اس وقت ہند و پاک میں جو انگریزی اردو لغات جدید طرز پر تیار ہو رہے ہیں یا شائع ہوتے ہیں ان میں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کے معنی اور متبادل دئے جا رہے ہیں۔ ایسے معیاری جدید لغات میں بھی اصطلاحات کے وہی متبادل دینا ضروری ہیں جنہیں مقتدر اداروں نے مجموعی طور پر وضع کیا ہے۔ وہ قدیم علمی و فنی کتابیں جو اردو میں ترجمہ ہوئیں اور ان میں جو انگریزی اصطلاحات کے متبادل ہیں، جو مستعمل رہے ہیں اور ہماری سائیکی کا حصہ بن چکے ہیں ان میں بنا کسی منطقی یا تحقیقی جواز کے کسی تبدیلی پر غور کرلینا بھی ضروری ہے۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اصطلاحات سے متعلق مسائل کو سمجھے بنا اور ان کا حل تلاش کئے بغیر ہم اردو میں سائنسی ادب کی تخلیق و ترقی کے راستے ہموار نہیں کر سکتے۔ ★★



عبد الاحد ساز

حدِ افق پر سارا کچھ ویران ابھر تا آتا ہے
منظر کے کھو جانے کا امکان ابھر تا آتا ہے

پیچھے پیچھے ڈوب رہی ہیں عمرِ رواں کی منفعتیں
آگے آگے اک بھاری نقصان ابھر تا آتا ہے

پس منظر میں 'فیڈ' ہوئے جاتے ہیں انسانی کردار
'فوکس' میں رفتہ رفتہ شیطان ابھر تا آتا ہے

لفظ تو آخر لفظ ہی ٹھہرے ان کی کیا اوقات مگر
لفظوں کے نیچے سے جو امکان ابھر تا آتا ہے

جیسے میں دبتا جاتا ہوں ان آنکھوں کے بوجھ تلے
دل پر دو اشکوں کا ایک احسان ابھر تا آتا ہے

ایک تشنج، اک ہچکی، پھر اک نیلی زہریلی قے
سب کچھ کہہ چکنے جیسا ہیجان ابھر تا آتا ہے

ساز مری جانب اٹھتی ہے دلت کے اک شب الست'
روح میں اک بھولا بسرا پیمان ابھر تا آتا ہے

● ZAKARIA MANOR 4TH FLOOR,
149-YSUF MEHERALI RD, MUMBAI-3

فرید پربتی

پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

سایۂ تاک میں کتنی ہوئی کم تلخیٔ غم
اور کیا اس کے سوا بنت عنب پوچھتی ہے

فہم و ادراک سے بالا ہے چلن دنیا کا
ہارنے والے سے یہ جیت کا ڈھب پوچھتی ہے

رنگ رخ، قربتِ جاں کچھ بھی نہیں پاس مگر
حاملِ صحبتِ شب صبح طرب پوچھتی ہے

عشق میں عزت سادات گئی کیا اس کا غم
دل کی نسبت نہیں شجراتِ نسب پوچھتی ہے

چاند کی پہلی کرن پوچھنے آتی ہے حال
جب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے تب پوچھتی ہے

اس طرح پہلے کبھی بام نہ در بجتا تھا
آج کیا بات ہے یہ رونق شب پوچھتی ہے

پہلے پوچھا ہی نہیں دل کے دھڑکنے کا سبب
کشتیاں ڈوب کے کیا موجِ غضب پوچھتی ہے

دل کی وسعت کیلئے مجھے چاند ستارے کم ہیں
اکتفا کس پہ کروں میری طلب پوچھتی ہے

● 66-GOVT HOUSING COLONY,
RAWALPORA, SRINAGAR-190005 (JK)



اقبال خلش

حسرت دل و نظر سے برستی رہے گی کیا
دنیا ہمیشہ یاس کی بستی رہے گی کیا

ہوگی نہ زندگی سے سحر کی مفاہمت
ناگن اندھیری رات کی ڈستی رہے گی کیا

مقروض قہقہوں کی الم ناک روشنی
زہراب بن کے ہم پہ برستی رہے گی کیا

کتنے مکان آج زمیں بوس ہو گئے
دو چار حادثوں میں یہ بستی رہے گی کیا

چھایا ہوا ہے موت کا سناٹا ہر طرف
اس سرزمیں پہ اب کوئی ہستی رہے گی کیا

تفہیم انقلاب کو ماحول چاہیے
پانی میں رہ کے شعلہ پرستی رہے گی کیا

تخریب کی بلندیاں کہتی ہیں اے خلش
ہم ہیں تو اس زمین پہ پستی رہے گی کیا

● CHAM CHAM GALI,
AGRA-282003 (U.P.)

حسن جمال
LOHARPURA, NEAR PANNA HOUSE
JODHPUR - 342 002 (RAJ.)

بے آواز صدائیں

صبح اٹھا تو مجھے اپنا سر دھڑ سے الگ محسوس ہوا۔ بظاہر میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور کان سن رہے تھے لیکن دماغ اپنے ٹھکانے پر نہیں تھا۔ وہ پھدکتے مینڈک کی طرح چوکڑیاں بھر رہا تھا اور میں حیران تھا کہ یاخدا! یہ کیا ہوگیا؟ مجھے زور سے پیشاب محسوس ہو رہا تھا اور میں بستر پر ماتھا پکڑے بیٹھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا دماغ کہیں آتش فشاں کی طرح پھٹ نہ جائے۔

میں بہت نفاست اور قرینے سے سونے کا عادی ہوں۔ لیکن چادر پر نظر گئی تو یقین نہیں آیا کہ میں اپنے بستر پر ہوں۔ تنی ہوئی چادر میرے گھٹنوں کے درمیان دبی پڑی تھی۔ ایک تکیہ پلنگ کے نیچے گرا ہوا تھا دوسرا پائینتی پڑا تھا۔ ایسی حالت تو مستی کے عالم میں نئی بیوی سے کھیلتے ہوئے بھی نہیں ہوتی۔ کم از کم میرا تجربہ ایسا نہیں تھا۔ یاالٰہی! رات ہی رات میں یہ کیا ہوگیا؟ کیا میرے سراپے میں شیطان کا نزول ہوگیا تھا؟

میں رات بھر رستوگی کے بارے میں سوچتا رہا تھا یعنی بے چین نیند آنے سے پہلے۔ رستوگی میرا کلیگ اور دوست تھا۔ بڑا زندہ دل اور خوش مذاق۔ ایک ذرا سی بات پر یوں بگڑ جائے گا، ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دفتر سے لوٹتے وقت ہم اکثر کافی ہاؤس میں مل بیٹھتے تھے اور کافی کی چسکیوں کے درمیان دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میری طرح وہ بھی پانچ بجتے ہی گھر لوٹنے کا عادی نہ تھا۔ کل شام رما کی بات نکل آئی تھی۔ رما ہمارے دفتر میں ایک جونیئر افسر تھی۔ وہ براہ راست میری ماتحتی میں تھی۔ رستوگی کا واسطہ اس سے کم ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رستوگی رما میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے اس بات کی جلن بھی تھی کہ رما مجھے کچھ زیادہ ہی بھاؤ دیتی ہے۔ میں بھی رما کو پسند کرتا تھا لیکن اس حد تک نہیں کہ پریشانی کا سبب بنے۔ آخر ہم تینوں شادی شدہ تھے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میں دودھ کا دھلا ہوا ہوں۔ رما ایک خوش مزاج، سلیقہ مند، قبول صورت عورت تھی۔ خصوصاً اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ بھی کبھی کبھار ہمارے ساتھ کافی ہاؤس میں چلی آیا کرتی تھی۔ تب ہمیں کافی کا ذائقہ بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس روز ہم دیر تک بیٹھنا چاہتے تھے لیکن رما اپنے پتی دیو، ساس اور بچوں کا بہانہ بنا کے اٹھ جایا کرتی۔ اس کی گداز پشت کو یک ٹک گھورتا ہوا رستوگی کہتا۔

"بہار چلی گئی!"

"اتنا آگے نہ بڑھو۔" میں اسے ہمیشہ ٹوکتا۔

پتہ نہیں کل شام کس بات پر وہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ رما کے ذکر پر مجھ سے الجھ پڑا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ رما کے معاملے میں وہ اس قدر حساس ہے۔ اس کے مطابق میں اس کی راہ کا پتھر تھا۔ بگڑتے بگڑتے اس نے مجھے "ہپوکریٹ" کہہ دیا۔ پھر میں بھی اپنے آپے میں نہ رہا۔ اطراف کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ کوئی تماشہ ہو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور گھر چلا آیا اور اب دھڑ سے جدا "آؤٹ آف کنٹرول" سر کا معاملہ درپیش تھا۔ میرا ہاتھ آپ ہی آپ اس گومڑ کو سہلانے لگا جو شام کو رستوگی سے جھگڑا ہونے کے بعد دروازے سے ٹکرانے پر ابھر آیا تھا اور میں دیر تک اسے ٹٹولتا رہا تھا۔ چوٹ لگنے پر پہلے بھی ایسے 'پھوڑے' نکلے تھے جو اپنے آپ کچھ دنوں بعد بیٹھ گئے تھے اس لئے فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن یہ عجیب طرح کا پھوڑا تھا۔ جس کا درد سینے میں بھی ہو رہا تھا اور ناقابل تصور پریشانی سے میرا سامنا تھا۔ مجھے لگا، سر میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی ہے اور کچھ عجیب و غریب آوازیں دستک دے رہی ہیں۔

بیوی چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ وہ نہا چکی تھی۔ قمیص بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ شاید تولیے کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کی پرانی عادت ہے۔ میں نے سر سے پاؤں تک اسے بغور دیکھا۔ "عجیب آدمی ہے بھوکے بھیڑیے کی طرح دیکھ رہا ہے۔ صبح صبح تھوبڑا سوجا ہوا ہے د آج مجھے شاپنگ کے لئے جانا تھا۔ بہن کو رسیو کرنے بھی جانا ہے۔ کس طرح اسے رام کروں گی۔؟"

"آداب آج آپ دیر سے اٹھے۔" وہ معمول کی طرح مسکرائی۔ اس کا مسکراتا چہرہ مجھے ہمیشہ بھلا لگتا رہا ہے۔ مجھے خوش مزاج عورتیں پسند ہیں۔ اس معاملے میں میں خوش نصیب ہوں۔ رستوگی کی مسز کی تیوریاں ہمیشہ چڑھی رہتی ہیں۔

"تم نے کچھ کہا؟"

"ہاں آج آپ دیر سے اٹھے؟" چوڑیاں کھن کھنائیں۔ اس کی دائیں کلائی ہمیشہ چوڑیوں سے بھری رہتی ہے۔

"نہیں اس سے پہلے کچھ کہا تھا۔؟"

"نہیں تو!" وہ کھل کھلائی۔ چوڑیوں بھرا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھا۔

"جناب! دن نکل آیا ہے۔ ابھی تک آپ محوِ خواب ہیں۔"

"ہاتھ نہ لگاؤ۔" میں پیچھے جھکا۔ "سر درد سے پھٹا جا رہا ہے کوئی گولی دولی ہو تو دے دو۔"

"ناشتہ کرنے کے بعد۔" اس کی مسکراہٹ کچھ کم ہوئی۔ "ناشتے کے بعد جو لینا ہو گا لے لیں گے۔ آپ دیر تک جاگتے رہیں گے تو یہی ہو گا۔"

وہ اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ صبح وہ بے حد مصروف رہتی ہے۔ میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹوتھ پیسٹ پچکی ہوئی تھی۔ دبانے پر بھی کچھ نہ نکلا۔ میں جھلایا چیخا۔ بیوی نمودار ہوئی۔ "کیا ہے؟"

"ٹوتھ پیسٹ۔"

"آج لاؤں گی۔"

"ایکسٹرا کیوں نہیں رکھتیں۔ کتنی بار کہا ہے۔ موڈ آف کر دیتی ہو۔ حامد کی لاؤ۔"

"وہ اپنی کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا ہے۔"

"باپ کو بھی نہیں؟"

"نہیں جناب! وہ آپ ہی کا بیٹا ہے۔ پاؤڈر لا دوں؟"

باتھ روم سے نکلنے کے بعد ہاتھ پاؤں ہلکے کرنے کے لئے ورزش کر رہا تھا۔ سر میرا گھٹنوں کے درمیان تھا کہ حامد نظر آیا۔

(میرا باپ کتنا کنجوس ہے۔ افسر ہے تو کیا؟ بچپن کا منگتا پن چپکائے بیٹھا ہے۔)

"بدتمیز! نامعقول!!" میں نے چیخنا چاہا۔ مگر گھٹنے جواب دے گئے۔

کیا یہی میرا مستقبل ہے؟ توازن بگڑنے پر میں سر تھام کر فرش پہ ڈھیر ہو گیا۔

"السلام علیکم ابو جی"

وعلیکم السلام بیٹا۔ تمہیں کچھ چاہئے۔؟ ابھی کچھ کہہ رہے تھے۔"

نہیں تو ابو جی۔" حامد بوکھلا گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

اسے پتہ ہی نہ تھا کہ میں نے اس کی سوچی ہوئی بات سن لی ہے۔ ساجد کے مقابلے میں حامد کو فرماں بردار اور سیدھا لڑکا سمجھتا تھا۔ "ابو جی ابو جی" کہتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ اس گلوبل ولیج میں اپنی اولاد کو پہچان پانا ہی مشکل ہے۔

"تم آج کل بڑے بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔"

(گنے ہزار روپے یہ کھڑوس تو مانگنے سے پہلے ہی بگڑ رہا ہے۔)

"میں نے کیا کیا ہے ابو جی۔ ؟ اچھا آیئے میں آپ کے سر کی مالش کر دوں۔"

انجان ہاتھوں سے خوفزدہ بن بیاہی دوشیزہ کی طرح میں بدکا۔ "ہاتھ نہ لگانا۔ وہ مت نچ ی۔ ہو سکے تو بام لا دو۔ تمہاری امی کو گولی لانے کے لئے کہا تھا کوئی سنتا ہی نہیں آج کل میری۔"

(کنجوس کی کون سنے گا؟)

"لا تعلوں ابو جی آپ O.K نہیں ہیں۔" حامد پاؤں پٹختا ہوا اچل رہا تھا۔ مجھ سے بام کی بو برداشت نہیں ہوتی۔ کوئی دوسرا لے آئے تب بھی نہیں۔

لگتا ہے تمام فضا افسردہ اور بیمار ہو گئی ہو۔ میں نے ذرا سا بام پیشانی پر لگایا۔ رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھوئے مگر اس کی بو بدستور چلی گئی اور اس بو کے درمیان انجان آوازیں ٹوٹے برساتی نالے کی طرح کانوں میں گھس گھس آتی تھیں۔ اے دو جہان کے مالک اس طرح تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ تو نے کیسی Frequency شروع کر دی؟ میرا ایمان ہے کہ اس کائنات میں بڑے بڑے راز پوشیدہ ہیں مگر میں سائنسداں نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی انسان ہوں۔ میرا جسم کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے۔ اگر تو رحم والا ہے تو مجھ پر رحم فرما اور مجھے اس نامطلوبہ نعمت یا لعنت سے نجات دے۔

میری دعائیں اکثر قبول نہیں ہوتیں کیوں کی میرے ذہن میں وسوسے بہت ہیں۔ میں وقت سے پہلے نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ باہر نکلوں۔ شاید باہر کی کھلی (مگر زہر آلود) فضا میں آوازوں کا یہ دیو میرا پیچھا چھوڑ دے۔ بیوی کھانے کے لئے پکارتی رہی مگر میں رکا نہیں۔ میں ذھن کا پکا ہوں۔ سوچ لیا کہ باہر نکلنا ہے تو بس نکلنا ہے۔ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھتا۔ آگے کی پلاننگ نہیں ہوتی۔ بس ایک نادیدہ طاقت خس و خاشاک کی طرح اڑاتی ہوئی کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے جس شخص کی میں صورت دیکھنا گوارہ نہیں کرتا، کسی روز باچھیں پھیلائے اس کے در پہ کھڑا ہوتا ہوں۔ میرا نظم و ضبط نہایت کمزور ہے۔ اب اسے حماقت ہی کہیئے کہ کل شام کی بدمزگی کے باوجود میں رستوگی کے ہاں پہنچ گیا۔

رستوگی کی بیوی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کا منہ غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ شاید رستوگی نے اسے شام والی بات بتا دی تھی۔

(یہ صبح ہی صبح کیوں آن مرا ہے)

چڑھی ہوئی تیوریوں کے باوجود نئے چاند کی موہوم لکیر کی مانند ایک باریک مسکراہٹ اس کے موٹے ہونٹوں پر چسپاں رہتی ہے۔ آج وہ بھی غائب!

"آیئے آیئے خان صاحب! وہ باتھ روم میں ہیں۔ بیٹھئے آج ادھر اس وقت؟"

(سالا صفائی دینے آیا ہو گا۔ صاف کہہ دوں کی ایسے دوغلے سے دور رہو ایسا آدمی دوستی کے لائق نہیں۔) کہتے کہتے اس نے پنکھا آن کر دیا۔

"میں دوغلا نہیں ہوں!" جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔

جاتے جاتے مسز رستوگی نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔

تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی صحن کی طرف چلی گئی۔ تبھی رستوگی نظر آیا۔ تولیے سے گیلے بال پونچھتے ہوئے۔ ایک لمحہ ٹھٹکا جیسے اسٹیج کا اداکار اسٹیج پر آنے سے پہلے ونگ سے جھانکتا ہے۔

(یہاں کیوں آیا ہے کم بخت کھانا بھی سکون سے نہ کھانے دے گا)

"او ہو خان صاحب! کیا شام کی کچھ کسر باقی رہ گئی؟ اس وقت۔ خیریت تو ہے؟"

"کل شام کے جھگڑے کے لئے میں شرمندہ ہوں۔"

کیا اتنا ہی؟" وہ کھڑا رہا۔ "سوری کہہ دینے سے معاملہ رفع دفع نہیں ہو جاتا۔ "You know Rama is my weakness, She is married" وہ کہیں دور ستاروں کے جہان سے بولتا ہوا محسوس ہوا۔

"وہ آپ کی پراپرٹی نہیں ہے۔" وہ کچھ تیز آواز میں بولا۔ وہ اپنی چھت کے نیچے تھا۔ مجھے اپنے کم تر حالت کا اندازہ ہوا۔ میں فی الفور تردید نہ کر پایا (کم بخت میرے ہی گھر میں نصیحت دے رہا ہے۔ شادی شدہ میر چندانی پر ڈورے ڈالتے وقت اخلاقی فرض صبر و ضبط یاد نہیں رہے۔)

مجھے غصہ آنے لگا۔ "مسٹر رستوگی حد سے نہ بڑھو۔"

"کیا آپ لڑنے آئے ہیں؟" وہ تن کر کھڑا ہو گیا جیسے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہو۔ میں پھر پست ہو گیا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ آدمی غصے میں ہو تو اس سے دور رہنا چاہئے۔ شاید میری شامت ادھر لے آئی۔ مجھے اٹھنا چاہئے۔ یہ شخص حملہ ور ہوتا جارہا ہے۔ پتہ نہیں عورت کے درمیان میں آتے ہی رشتے کیوں بگڑ جاتے ہیں۔؟ کیا یہ ملکیت کا معاملہ ہے؟ رما اگر کسی کی ملکیت ہے تو اپنے شوہر کی۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہماری دوست ہو سکتی ہے۔ دوست بھی کہاں۔؟ ایک کلینک۔ اس کی وجہ سے برسوں کی شناسائی میں دراڑ آجائے، یہ میں قطعی نہیں چاہتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شانت ہو جائے گا تب بات کروں گا کہ نہ میں غلط تھا نہ میری نیت خراب تھی۔

(سالا ہپو کریٹ کہیں کا! پرائی عورت کی خواہش بھی رکھتا ہے اور آدرش بھی بگھارتا ہے۔ مسز کو کہہ دوں گا کہ آئندہ اس شخص کے لئے دروازہ نہ کھولا جائے۔)

یہ میری ہتک تھی میں تلملا گیا۔ دیکھ لوں گا اسے دفتر میں۔ کبھی نہ کبھی میری گرفت میں آئے گا۔ چھوڑوں گا نہیں اسے۔

"جا رہے ہیں؟" چائے تو پیتے جائیے۔ کہاں جائیے گا۔؟"

"جہنم میں۔ کہنا چاہا لیکن بولا۔ سوچتا ہوں آفس ہی چلا جاؤں۔ آج کل پیون بھی حرام خور ہو گئے ہیں۔ اسی بہانے Sudden Checking ہو جائے گی'

"کچھ نہیں کر پائیں گے آپ۔ آج کل سب کے اپنے Sources ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ کسی کی کھنچائی کرو تو اپنی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ جیسا چل رہا ہے چلنے دیجئے۔ ڈسپلن، کام کی ذمہ داری، ڈیوٹی کا احساس۔ یہ سب ماضی کی باتیں ہو گئی ہیں۔"

رستوگی صحیح کہہ رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا اور ہولے ہولے قدموں سے باہر نکل آیا۔ رستوگی وہیں کھڑا رہا۔ دروازے پر۔ اس نے گیٹ تک آنے کا معمول توڑ دیا تھا۔

مجھے دفتر جانا تھا مگر میں رما کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بھی دفتر کی تیاری میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی۔ بولی کہاں، سوچا (یہ آدمی یہاں بھی چلا آیا۔ اسے تو میں شریف سمجھتی تھی۔ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب اس کی خاطر مدارات کرنی ہو گی۔)

"آئیے خان صاحب۔ آج راستہ کیسے بھول گئے؟ آنکھوں پہ یقین نہیں ہو رہا۔ وہ آئے ہمارے گھر خدا کی قدرت ہے......"

"آپ کے مسٹر نظر نہیں آرہے ہیں!" گھر کا سناٹا دیکھ کر میں بولا۔

(ضرور غلط ارادے سے آیا ہے۔ سن گن لینا چاہتا ہے کہ لائن صاف ہے یا نہیں؟ ہاتھ لگا کے تو دیکھے۔ دن میں تارے دکھادوں گی۔ ماتحت ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ رال ٹپکاتے گھر پہنچ جاؤ۔)

رما مسکرائی۔ پھیکی سی۔ "ذرا بازار گئے ہیں ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

(کل رما ہی نے بتایا تھا کہ مسٹر ٹور پر گئے ہیں)

"اور بچے؟"

"اسکول۔ ذرا ٹھہریئے۔ چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اتاؤلا پن ٹالنے جیسا۔ میں چلنے لگا۔ سر کی دھمک بڑھتی جارہی تھی۔ روکا نہیں اس نے۔ سنا میں نے (اچھا ہوا اپنے آپ ٹل گیا ورنہ دیر تک 'ہاں جی ہاں جی' کہنا پڑتا۔ Siniority کا رعب جھاڑتا رہتا) ظاہرا کہا "پہلی بار آپ آئے اور یوں......"

"نہیں میں ذرا سی دیر میں بہت 'کچھ' لے چکا ہوں۔ اس خاطر تواضع کے لئے شکریہ۔" میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا (اس شخص کو کیا ہوا؟ اچھا بھلا تو تھا! عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔)

رما کو بھی دیکھ لوں گا، اس کے گھر سے نکلتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔ کس کس کو دیکھوں گا میں؟ فی الوقت تو مجھے اپنے آپ کو دیکھنے اور سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ یہ سر کی دھمک ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ دن کی ابتدا ہی غلط ہوئی۔ کل شام کا حادثہ آسیب کی طرح مجھ سے چپک گیا ہے۔ اگر میں اسی طرح لوگوں کی ان کہی باتیں سنتا رہا تو میرا جینا مشکل ہو جائے گا۔ چند گھنٹوں میں ہی میں بوکھلا گیا ہوں۔ ہم جو سننے کے عادی ہیں اس کے برعکس دیگر باتیں سن لینا صحت کے لئے بہت مضر ہے۔ ہمارے تعلقات انہی باتوں پر ٹکے رہتے ہیں جو صرف منہ سے بولی جاتی ہیں۔ ذہن میں کہی نہیں جاتیں۔ یہ ٹیلی پیتھی ہے کہ کیا بلا ہے؟ دماغ کی کون سی رگ بیدار ہو گئی ہے؟ کل کو اگر تمام لوگ اس بیماری میں مبتلا ہو گئے تو اس دنیا کا کیا ہو گا؟ دنیا کا سارا کاروبار کچھ بتانے میں کچھ چھپانے میں مضمر ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دیر بعد میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے کلینک میں موجود پایا۔ ڈاکٹر وہ جو کسی زمانے میں میرا کلاس فیلو تھا۔ بھمبھانی اس کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ بڑے مرغ حلال کرتا تھا وہ۔ کاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کار والوں کو کون سے مسئلے در پیش رہتے ہیں۔ جو چار پہیوں پر چلیں اور دھرتی پر ان کے قدم نہ پڑیں وہ کیا جانیں کہ واقعی پرابلم کیا ہوتی ہیں!

بھمبھانی ایک نہایت خوبصورت عورت کے گدرائے سینے پر کان دھرے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسٹیتھو اسکوپ کے باوجود۔ تعلیم کے

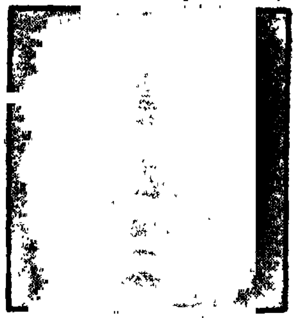
باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے



سعدیہ روشن صدیقی

دل کی حالت ہے اختلاجی بھی
اور تقریر احتجاجی بھی
جو قیادت نہیں پسند یدہ
شہ نشیں پر وہی براجی بھی
نام جمہوریت کا لیتے ہو
طور اطوار سامراجی بھی
کھائے جاتا ہے خوف آبادی
اور اپنی یہ کم اناجی بھی
ناتوانی ہماری مجبوری
شہر کی کیفیت نراجی بھی
عافیت کی خبر نہیں دیتے
حال احوال یہ سماجی بھی
آنے والی صدی کا مستقبل
کیا ضروری کہ ہو رواجی بھی
یہ طلوع سحر کا منظر ہے
نور و نکہت کا امتزاجی بھی
کچھ دلیل طرب نہیں ہوتی
ہم صفیروں کی خوش مزاجی بھی
مجھ کو تسلیم ساری تنقیدیں
ایک نعرہ مگر خراجی بھی
سعدیہ حوصلہ بلند رکھو
دور آئے گا اچھا جی بھی

● P.O. BOX NO. 26555,
ABUDHABI (U.A.E.)



بلقیس ظفیر الحسن

(نذرِ میرؔ)

کس نے کہا کسی کا کہا تم کیا کرو
لیکن کسی کسی کی کبھی سن لیا کرو

ہر آرزو فریب ہے ، ہر جستجو سراب
مچلے جو دل بہت اسے سمجھا دیا کرو

یوں چپ رہا کرے سے تو ہو جائے ہے جنوں
زخم نہاں کرید کے کچھ رو لیا کرو

ہاں ، شہر آرزو تھا کبھی یہ اجاڑ گھر
ان کھنڈروں سے ان کی کہانی سنا کرو

اس ناشنیدنی سے تو بہتر ہے چپ رہو
ہے کیا ضرور شکوۂ بے فائدہ کرو

ابھی نہ سو رہے ہوں چنبیلی کی چھاؤں میں
نو واردِ چمن ہو سنبھل کر چلا کرو

نالے ابل رہے ہوں تو رستہ بھی چاہئے
بلقیس گاہے گاہے غزل کہہ لیا کرو

● H-2-B-6, POSA APTS. ROHANI,
SECTOR-15, DELHI-110085

ملکہ نسیم

دیئے کی لو

دیئے کی لو تھر تھرا رہی ہے
یہ شام غم ہے کہ آفتوں کی سحر ہوئی ہے
فصیلِ شب پر اُداس جگنو
کسی مسافر کی راہ تک کر
لٹا چکا ہے تمام روشن بہار اپنی
پرندے اڑنے کو مضطرب ہیں
مویشی خانوں میں مچ رہی ہے عجیب ہلچل
جو بچے ماؤں کی چھاتیوں سے
لپٹ کے سوئے تھے جاگ اٹھے ہیں
وہی تڑپ بھوک کی وہ شدت
اذان صحن چمن میں دیتا ہے مرغ ایسے
کسی کو جیسے کوئی فسانہ سنا رہا ہے
اُٹھو! اندھیرا بہت ہے لیکن
چراغ لے کر تلاش کرتا ہے تم کو سورج
دیئے کی لو تھر تھرا رہی ہے

3543-BARION KI GALI, MOTIKATLALA
ZAR, JAIPUR -2 (RAJ.)

رضا نقوی واہی
5/16, GARDANI BAGH
PATNA-800 001

ارود ادب میں طنزومزاح

تقریباً چالیس پینتالیس سال قبل اسی شہر عظیم آباد سے ایک مفتیٔ ادب نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ اردو غزل "نیم وحشی صنفِ سخن" ہے۔ اس فقرے میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ فوراً سارے ملک میں بحث کا دروازہ کھل گیا۔ ناقدین دو گروہ میں بٹ گئے۔ کوئی اس فقرے کا ہمنوا بنا اور کوئی مخالف۔ ہم نوائی کرنے والوں میں ترقی پسند تحریک کے سورما آگے آگے رہے۔ مخالفت روایتی شاعری کے علم برداروں نے کی۔ اسی دوران ایک دیگر اصنافِ ادب کی جب کھتونی کی جانے لگی تو ایک گوشے سے متشرع قسم کے ایک ناقد نے یہ شوشہ چھوڑا کہ "طنز و مزاح دوسرے درجے کا ادب ہوتا ہے"۔ ان کے مقلدوں نے مکھی پر مکھی بٹھاتے ہوئے ادبی چراگاہ میں بھیڑ چال کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ اور یہ موضوع بھی عرصے تک محاذِ جنگ بنا رہا۔ لیکن ادھر دس پندرہ برسوں سے دونوں محاذوں پر جنگ بندی ہو گئی ہے، کیوں کہ بیرونی ممالک سے جنگ جاری رکھنے کے لئے مانگے کے اسلحے نہیں مل رہے ہیں۔

میرا راست تعلق طنز و مزاح سے رہا ہے۔ اس لئے دانشوروں کے اجتماع میں اس موضوع پر چند باتیں پیش کروں گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی فن ہو، اس کی درجہ بندی نہیں کی جاسکتی، البتہ اس فن کے برتنے والے فنکاروں کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً غزل گوئی بھی ایک فن ہے، جس کے برتنے والے بڑے منجھولے یا بونے قد کے لوگ ہو سکتے ہیں، جیسے غالب نے بھی غزل کہی اور مرزا مشکی پوری بھی غزل کے شاعر تھے، لیکن دونوں کے کلام میں فرق ہے کہ غالب کی غزلیں ہر دور میں زندہ و تابندہ رہیں گی جب کہ مرزا مشکی پوری کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ غزلوں کا اسٹاک اب تک بنیوں کی دکانوں میں ردّی کے بھاؤ بک چکا ہوگا۔ فن اور فنکار کی ایسی مثالیں، دوسرے میدانوں میں بھی مل سکتی ہیں۔ تو میرا موقف یہ ہے کہ ظرافت یا طنز و مزاح ادب کی ایک صنف ہے، جس کے برتنے والے پہلے دوسرے اور تیسرے درجے کے فنکار ہو سکتے ہیں۔ بذاتِ خود طنز و مزاح کو بڑی ذات اور چھوٹی ذات کے خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ادب میں سنجیدہ طنز و مزاح فنِ تنقید کا شوگر کوٹیڈ رخ یا اسلوب ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "ہمارے سماج میں ہنسنے ہنسانے کو بہ چشم نم دیکھا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی ہشاش بشاش، خوش و خرم نظر آئے تو یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شارع عام پر کوئی سنگین جرم کرتے پکڑ گیا ہے۔ رونی صورت عموماً احترام سے دیکھی جاتی ہے اور جو جتنا سنجیدہ، رنجیدہ یا غم دیدہ نظر آتا ہے اتنا ہی بڑا مفکر، فلسفی یا عارف کائنات سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے رنج و غم نے فیشن کی شکل اختیار کرلی ہے اور سارے ادب اور فلسفے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔" لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح کو اپنی اہمیت منوانے کے لئے کسی سعی، سفارش یا بیساکھی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے بل بوتے پر اصنافِ ادب میں وہی درجہ رکھتا ہے، جو دوسرے کسی بھی صنف کو حاصل ہے۔ یعنی سنجیدہ ادب کے ساتھ سنجیدہ ظرافت کا مقام ہے۔

مثل مشہور ہے کہ رونا گانا سب کو آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لیکن ہنسنا ہنسانا سب کو نہیں آتا۔ یہ وہ فن ہے جو ریاضت چاہتا ہے اور ظرف و حوصلہ مانگتا ہے۔ اردو ادب کو یہ شرف حاصل ہے کہ طنز و مزاح کی روایت پرانی ہے اور اعلیٰ سطح کی بھی ہے۔ یہ اس کے ادبی مزاج کی شائستگی اور بالیدگی کا ثبوت ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک اردو پر جو قیامت گذری ہے یا گذر رہی ہے، اس کے باوجود اردو دنیا ہنسنا ہنسانا نہیں بھولی اور اس کے قہقہے کھوکھلے اور بے جان نہیں رہے۔ اس ہنسی میں زہرناکی بھی رہی اور فکر انگیزی بھی، دل سوزی بھی، دردمندی بھی۔ اعلیٰ طنز و مزاح فنکار کی دروں کی قوت مشاہدہ اور قوت اظہار کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ طنز و مزاح نگار سر کے بل کھڑے ہو کر دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرنے کے بجائے صرف دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھاتا ہے کہ وہ اردگرد کی ناہمواریوں کو دیکھ سکیں اور ان کے مضحک پہلوؤں پر ہنس سکیں۔ طنز و مزاح نگار کا تعلق معاشرے کے مسائل سے ہے یہ بے معنی ہنسی کا نام نہیں بلکہ گہرے عرفانِ ذات کا یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہر قسم کے کوڑھ کا مذاق اڑا کر سماج میں صحت مند توازن کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہ زندگی کے المیے سے گریز نہیں، بلکہ خندہ پیشانی سے اور حوصلے کے ساتھ سہنا اور اس پر قابو پانا سکھاتا ہے۔ اسے برتنے کے لئے پہلے ایک حساس دل ہونا چاہئے، اور پھر وہ قوت متخیلہ جو بہ ظاہر اَنمل بے جوڑ چیزوں میں ایک ربط و مناسبت تلاش کر کے اسے فنکارانہ طور پر قاری کے سامنے پیش کر دے۔ طنز و مزاح زبان کی بالغ نظری اور شائستگی کا پیمانہ ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا سرمایہ نہ صرف مقدار بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی گراں

مایہ ہے۔

جس طرح ایک مہذب مجلس میں کسی بے ادبی کی گنجائش نہیں ہوتی، اسی طرح طنز و مزاح کی صنف بھی کسی ابتذالی، سطحی مزاح یا ادبی بے راہ روی کی متحمل نہیں ہوتی اور اس کے آبگینے کو پھوہڑپن یا ابتذال کی ٹھیس سے محفوظ رکھنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ آج کے معاشرے کا کینوس اپنے مسائل اور مشاغل کے اعتبار سے بہت پیچیدہ وسیع اور پہلو دار ہے۔ اس لحاظ سے معقولیت اور نامعقولیت کے تضادات کا میدان بھی بہت کشادہ ہو گیا ہے۔ ان پر سنجیدگی اور ہم دردی کی نگاہ رکھتے ہوئے اپنے کام کا مواد تلاش کرنا اہل ظرافت کا اصل منصب ہے اور اس منصب کا حصول بہت مشکل بھی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ مہذب طنزیہ اور مزاحیہ ادب اور شاعری کے میدان میں ادباء اور شعراء کی تعداد گویا نہیں کے برابر رہی ہے، کیوں کہ اس میدان میں قدم جمانا ہر کس و ناکس کے بس کے باہر ہے۔

اب میں ذرا تفصیل سے اعلیٰ اور معیاری ظریفانہ شاعری کی تعریف میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ اور معیاری ظریفانہ شاعری کے لئے صرف طنز مزاح کی حسین آمیزش ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اس میں فکری عنصر کا بھی ہونا ضروری ہے۔ ایک شاعر اسی وقت معیاری اور ظریفانہ شاعری کا خالق ہو سکتا ہے، جب طنز مزاح کی آمیزش فکری بنیادوں پر کی جائے۔ معاشرے کی برائی، بد عنوانی اور کمزوریوں کے خلاف ردِ عمل کا نام ظریفانہ شاعری نہیں، کیوں کہ اس طرح کا ردِ عمل انتہا پسندانہ ہوتا ہے اور ایک انتہا پسندی دوسری انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں ردِ عمل کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، جو اصلاح حال کے بدلے حالات کو اور پیچیدہ اور غیر صحت مند بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر فکر کی بنیادوں پر طنز و مزاح کی آمیزش ہوتی ہے تو ظریفانہ شاعری میں ہمدردی کے عناصر شامل ہوتے ہیں اور شاعر معاشرے کی کمزوریوں کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس انداز میں اس کو پیش کرتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ شاعر کی فنی چابکدستی، عمق فکر اور اسلوب بیان پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک لوگوں میں تعمیری رجحان پیدا کرتا ہے اور کس حد تک غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ظریفانہ شاعری میں پایا جانے والا ہمدردی کا یہی جذبہ اس صنفِ ادب کی افادیت اور مقصدیت کا ضامن ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک اور اہم بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ظریف شاعر بھی معاشرے میں رہتا ہے اسی معاشرے کے ماحول میں سانس لیتا ہے۔ لیکن وہ ایک عام سطحی انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ صرف خارجی کوائف پر سرسری نگاہ نہیں ڈالتا بلکہ معاشرتی زندگی کی کیفیات کو داخلی طور پر محسوس کرتا ہے اور اس کی فکر نواز نگاہیں ان کیفیات اور حالات کی تہوں تک پہنچتی ہیں۔ اس کے مشاہدے میں داخلیت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے، اس کی فکر کی گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شاعری زیادہ افادی اور مقصدی ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی کمزوریوں اور برائیوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ معاشرتی زندگی یا ان کمزوریوں کے حامل افراد یا گروہ سے نفرت نہیں محسوس کرتا بلکہ اسے ان سے اسی طرح ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے، جیسے کسی معالج کو کسی مریض کو دیکھنے کے بعد ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح ایک اچھا معالج کسی مریض کو دیکھ کر اور اس کے مراض کی تشخیص کے بعد اس کا مضحکہ نہیں اڑاتا اور نہ ہدفِ ملامت بناتا ہے بلکہ اس سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسے اس مرض سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ایک کامیاب اور معیاری ظریف شاعر معاشرے کے نقائص اور کمزوریوں کے خلاف نفرت کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن جس طرح ایک اچھا معالج، مرض دور کرنے کے لئے کڑوی دوائیں تجویز کرتا ہے، مرض کے نقصانات سے باخبر کرتا ہے اور مریض کو تاریکی میں رکھنے کے بجائے اسے مرض سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہے اور اس کی لاپروائیوں کا تذکرہ کر کے اس کی اپنی کمزوریوں سے آگاہ کرتا ہے، اسی طرح ایک ظریف شاعر بھی ہمدردی کے جذبے کے ساتھ امراض معاشرہ کا تذکرہ کرتا ہے اور امراض کے لئے جو لوگ ذمہ دار ہیں ان کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کمزوریوں کو بتاتے ہوئے ایک طرف معاشرے کو ایسے غلط اور غیر صحت مند رجحانات سے باخبر کرتا ہے تو دوسری طرف برائیوں کے ذمے دار افراد پر طنز کرتے ہوئے انہیں ان کے غلط طرز سلوک کی طرف متوجہ کر کے وہ محرکات عمل پیدا کرنا چاہتا ہے، جو مثبت، صحت مند اور تعمیری ہوں۔ ظریفانہ شاعری میں یہ خوبی اسی وقت آ سکتی ہے جب طنز و مزاح کی پیشکش فکر کی بنیاد پر کی جائے۔ مثال کے طور پر میں اپنی ایک نظم پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

<u>تحقیقی مقالے برائے فروخت</u>

پیش رفت اردو ادب کی تیز کرنے کے لئے ۔۔۔ خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لئے
جامعہ کے چند استادوں کو سوجھی دور کی ۔۔۔ مل چلوں نے کھول ڈالی ایک نئی انڈسٹری
اس نئی انڈسٹری میں تھیسیس ڈھلنے لگیں ۔۔۔ اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں
ایسے ایم۔اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی ۔۔۔ اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی
ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لئے ۔۔۔ خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لئے
فیس استادوں نے رکھی فی مقالہ دس ہزار ۔۔۔ جس سے سودا پٹ گیا، بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار

دے کے پیسے ختم ہو جاتا ہے شاگردوں کا کام — حضرت استاد کرتے ہیں بقیہ انتظام
اکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسس گئی — پیروی جا جا کے خود گائیڈ نے اس کے گھر پہ کی
وائی وا کے واسطے آیا جونہی اکزامنر — ہوٹلوں میں اس کو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر
ہو کے ممنونِ کرم اس کو وہی کرنا پڑا — حضرت استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا
جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی — کیکٹس کی شاخ میں گویا کلی سی کھل گئی
تیل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اردو فارسی — مل ہی جائے گی کسی کالج میں اس کو نوکری
اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دہرا فائدہ — ایک کو اُجرت ملی، اور ایک روزی سے لگا
نسلِ نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر — کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پہ ڈالے اک نظر

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلّی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

بقیہ صفحہ ۳۰ : بے آواز صدائیں

زمانے میں اسے سب سے زیادہ شکایت رہتی تھی کہ کوئی لڑکی اسے گھاس نہیں ڈالتی۔ جب کہ دیکھنے کرنے میں وہ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ آج اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے پہچاننے میں اسے لحظہ بھر دیر لگی (یہ پٹھا آج ادھر کدھر ؟! اچھی خاصی نوکری کر رہا ہے۔ پھر اسے ٹینش کس بات کا ہے ؟ ضرور کسی حسینہ سے لفڑا ہوا ہے۔ شروع سے جذباتی ہے۔ لفٹ نہیں ملی ہوگی۔ لیکن یوں منہ اٹھائے کیوں چلا آیا ؟ دھندے کے وقت۔ فون کر کے آنا تھا۔ سالا پھوکٹیا۔!)

"وڑی بھلے چنگے تو ہو نی ؟" خوبصورت عورت کو بھاری دل سے وداع کرنے کے بعد وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ "برسوں بعد دیکھ رہا ہوں تجھ کو ؟ کیا ہوا میرے یار کو ؟"

میں اٹھ کر اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ یہ پٹھا آج ادھر کدھر ؟ سالا پھوکٹیا۔ یہی کہا تھا نہ تو نے ؟"

بھمبھانی کرسی سے اچھلا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ "ایسا میں نے کب کہا سائیں۔ سوچا بھر تھا۔"

"یہی تو بیماری ہے بھمبھانی۔"

"کب سے ؟" بھمبھانی گھبرایا۔

"کل رات سے۔" میں بولا مجھے بچالو بھمبھانی۔ میں بے موت مارا جاؤں گا۔ یہ ان کہی آوازیں یہ سوچی ہوئی باتیں۔ اگر میں یونہی سنتا رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گا بھمبھانی کچھ کرو۔ کچھ بھی۔"

وڑی تو مذاق تو نہیں کر رہا ہے ہمیشہ کی طرح۔ نوٹنکی! وہ حیرت سے میر منہ تک رہا تھا۔

دفعتاً میں نے چیخ ماری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر مجھے پتہ نہیں، میری ایسی حالت دیکھ کے بھمبھانی کی کیا حالت بنی اور میری کیا۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، سب کچھ گڈمڈ۔ پنکھے کے ساتھ گھومتا ہوا۔ ★★



لطیف شاہد

ارے مسئلے یکساں، ہمارے غم مساوی تھے
رتقدیر کے ہاتھوں میں کچھ مہرے بھی باقی تھے

م اپنی کوششوں پر یوں نہ رو لیتے تو کیا کرتے
سائل انفرادی تھے ، مسائل اجتماعی تھے

ی سازش نہیں تھی گردش ایام کی اس میں
ہم پر حادثے گذرے سراسر اتفاقی تھے

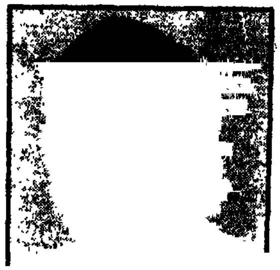
ادت میں جنوں کی دو قدم بھی چل نہیں پائے
رد کے پاس تو سارے نظریے ہی کتابی تھے

یں کس سے شکایت، کٹ گئے خود اپنے خنجر سے
با اب تقسیم فرقوں میں ، کبھی ہندوستانی تھے

ائی جارہی تھیں دھجیاں دامانِ عصمت کی
ہر امن کے مصروف غسلِ آفتابی تھے

م اپنے آپ میں محصور ہو کر رہ گئے آخر
ملنے کے تقاضے اپنی غیرت کے منافی تھے

● HARIPURA, BURHANPUR-450331
(M.P.).



اشرف شاد

وہ بچھڑ کر کیوں گیا ہے پوچھنا
کیا وفا کرنا برا ہے پوچھنا

کس کی آنکھوں میں دیئے روشن ہوئے
آج کس کا گھر جلا ہے پوچھنا

اپنے دل کے سب سے گہرے زخم سے
دوستوں سے کیا ملا ہے پوچھنا

دی ہے جس نے زندگی اس سے کبھی
زندگی نے کیا دیا ہے پوچھنا

راہ تکنا شام ہی سے ، ہر گھڑی
اب گھڑی میں کیا بجا ہے پوچھنا

بادشاہوں نے بتایا تھا جسے
کیا وہی میرا خدا ہے پوچھنا

زخم کی منڈی میں تم نے شاد جی
کیا کیا ہے کیا دیا ہے پوچھنا

● 177/102, MILLER STREET,
PYRMONT NSW 2009
AUSTRALIA

ذوالفقار احسن

یہ شام کا بڑھتا ہوا سایہ ہے کہ میں ہوں
تاحدِ نظر آنکھ میں صحرا ہے کہ میں ہوں

آخر تجھے یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا
تیرے لئے بہتر تری دنیا ہے کہ میں ہوں

تصدیق جو تو نے مرے ہونے کی ابھی کی
یہ سوچ کہ میں نے بھی یہ سوچا ہے کہ میں ہوں

اک دھوپ کا تپتا ہوا صحرا ہے کہ تم ہو
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ میں ہوں

جھلمل کبھی احساس میں بکھری تو یہ سوچا
مہتاب کسی جھیل میں اترا ہے کہ میں ہوں

ایسے ہی تذبذب میں پڑا سوچ رہا ہوں
بادل ہی بہت ٹوٹ کے برسا ہے کہ میں ہوں

منظر جو یہ دیکھا ہے تو دل کانپ اٹھا ہے
یہ شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہے کہ میں ہوں

اُن آنکھوں میں کیا جانئے، کیا بات ہے احسنؔ
دیکھا جو کسی نے بھی سمجھا ہے کہ میں ہوں

● GALI NO. 6, HOUSE NO. 85/8,
ISLAMPURA SARGODHA (PAK)

احمد صغیر
F-15/9 JOGABAI EXTN.
BATLA HOUSE, OKHLA, NEW DELHI-25



درد بھری زمین

فرقان کی باتیں سن کر اماں دنگ رہ گئیں۔ پہلی بار اس خاندان میں بٹوارے کی بات اٹھائی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی عجیب نظروں سے فرقان کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی کہ اماں کا دل دہل گیا تھا اور وہ سوچ کی دنیا میں گویا غرق ہو گئی تھیں۔۔۔۔

درد بھری زمین پر ازل سے کوئی نہ کوئی حادثہ رونما ہوتا چلا آرہا ہے جس سے لمحہ لمحہ زمین کے درد میں اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن گھاؤ لگانے والے درد سے بے خبر، خون بہانے سے پہلے اور خون بہانے کے بعد اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں کا جشن شراب کی بوتلوں سے مناتے ہیں۔ اور تب وقت کی تقدیر پر ایک المیہ کی تاریخ ثبت کر دی جاتی ہے۔!

درد بھری زمین۔۔۔۔'

زمین کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور بانٹا بھی جا رہا ہے لیکن سورج کا بٹوارہ کب ہوگا؟ چاند کا حق دار کون ہوگا؟ دھوپ کس کے قبضے میں ہوگی اور چاندنی کس کے آنگن میں بسیرا کرے گی۔؟

اماں سوچ کی دنیا میں غرق تھیں۔۔۔۔'

فرقان نے اماں کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی۔۔۔'

"اماں یہ جو عمارت ہے جس میں میں اور میرے دو بھائی رہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرے حصے میں آجائے...... تم اپنی فکر نہ کرنا۔ تاحیات تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا، لیکن یہ عمارت.........."

فرقان کی تجویز کے تیر نے اماں کے دل کو چھید ڈالا تھا۔ وہ رات بھر مضطرب رہیں۔ انہوں نے وہ رات اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے گزار دی۔ ان کے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتی تھیں اور نہ ہی کسی کی سمجھ میں آ سکتی تھی۔ پھر سمجھ کر بھی کوئی کیا کر لیتا۔ زخم لگانا تو آسان ہے مگر مرہم رکھنا بہت مشکل ہے۔۔۔ کچھ زخم تو ایسے ہوتے ہیں جس کا مداوا بھی نہیں ہوتا وہ زندگی کے ساتھ جاتے ہیں۔۔۔۔'

پھر اماں؟

فرقان کی بیوی نے اطلاع دی۔۔۔۔

"اماں کل سے بالکل خاموش ہیں۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی ہیں اور چھت کو گھورتی رہتی ہیں۔ پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے؟"

فرقان فوراً اماں کے کمرے میں پہنچ گیا اور ان کی خیریت دریافت کی اماں کافی غور سے فرقان کو دیکھتی رہیں، پھر ان کی نگاہیں چھت سے ہوتی ہوئی کھڑکی سے باہر خلاء میں منڈلانے لگیں۔۔۔ جب فرقان نے کچھ زیادہ ہی اصرار کیا تو اماں نے کہا۔۔۔ "بیٹا ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا سر جسم سے الگ کر رہا ہے۔"

فرقان گھبرا گیا اور اس نے فوراً شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد ذہنی ٹینشن کی طرف اشارہ کیا۔ دوا تجویز کی اور چلا گیا۔۔۔

اماں کی طبیعت بشاش نہ ہو سکی۔ وہ اکثر آسمان کو گھورتی رہتیں۔ بہت کم بولتیں، کپڑے سیتے سیتے آنکھ اٹھا کر فرقان کی طرف دیکھتیں۔ ٹھنڈی سانس بھرتیں اور پھر سلائی میں مصروف ہو جاتیں۔ مگر ان ٹھنڈی سانسوں کو سمجھنے والا کون تھا؟ بہو تازہ اخبار لا کر اماں کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ اماں اخبار اٹھا کر ایک نگاہ ڈالتی ہیں۔۔۔۔

"کارگل میں دراندازوں اور ہندوستانی فوجیوں کے درمیان تصادم۔۔۔ پچاس درانداز ہلاک اور دس فوجی شہید۔"

اماں اس خبر کی تفصیلات پڑھتی ہیں اور پھر بڑبڑاتی ہیں۔۔۔۔

"زمانے کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں لوگ علیحدگی اختیار کرنے پر بضد ہیں۔"

"اماں! اس میں کسی کی سازش لگتی ہے۔ مجاہدین تو وہاں پہلے ہی سے لڑ رہے تھے لیکن یہ درانداز پاکستان ہی نے بھیجے ہیں۔"

"جب اپنوں کے دل میں نفرت کا بیج پھوٹتا ہے تو اسے سینچنے کے لئے بہت سے ہاتھ آگے آجاتے ہیں۔"

اماں نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

لیکن اماں جب اپنے ہی باغی ہو جائیں تو انہیں دبانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"محض باغیوں کو کچل کر بغاوت ختم نہیں کی جا سکتی بلکہ بغاوت کے اسباب کو تلاش کرنا چاہئے، تب ہی کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔"

"تو اماں تمہاری نظر میں اس کا کیا حل ہونا چاہئے؟"

یہ تو میں بھی کئی روز سے سوچ رہی ہوں۔"

"اماں! تم یہ سوچنا چھوڑ دو۔ اس پر سوچنے کے لئے ہمارے بہت سے سیاست داں تنخواہیں اٹھا رہے ہیں۔ پہلے میرے بارے میں سوچو۔ میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔"

"ہاں وہ تجویز ہر وقت میرے پیش نظر ہے اور ہر پل ہر لمحہ میں تمہاری تجویز پر غور کر رہی ہوں۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکلے گا۔"

"اماں لیکن جلد ــــــ"

"مرنے سے قبل تو کسی فیصلے پر ضرور پہنچوں گی۔"

"اماں ایسی بات کیوں کہتی ہو؟"

"آج کل تمہارے ابو میرے خوابوں میں بہت آنے لگے ہیں۔"

"اماں بس کرو۔ تم آج کل عجیب عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔"

تبھی دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے اور فرقان باہر چلا جاتا ہے۔ جاتے ہوئے فرقان کو وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہیں، پھر ٹھنڈی سانس لیتی ہیں اور تخت سے اٹھنا چاہتی ہیں مگر لڑکھڑا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بڑی بہو جو سامنے کھڑی انہیں غور سے دیکھ رہی تھی، دوڑ کر آتی ہے اور انہیں سہارا دیتی ہے۔ــــ

"کیا بات ہے اماں! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

"کچھ نہیں رے......... بس یونہی......... آنکھ کے آگے ذرا اندھیرا چھا گیا تھا۔"

"اماں اگر دل میں کوئی بات ہے تو کہہ دیجئے۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔"

اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ــــ "خدا سے دعا کروں گی تم لوگوں کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ــــ مجھے میرے کمرے میں پہنچا دو، نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

آفتاب ڈوب چکا تھا۔ دھندلکا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ اماں کے کمرے میں ابھی تک اندھیرا تھا۔ آج وہ سر شام ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور خاموشی سے بستر میں لیٹی ہوئی تھیں۔ روشنی آن کرنے کی بھی ضرورت انہوں نے محسوس نہیں کی تھی۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں آواز دے رہا ہے۔ــــ

"اماں!"

وہ اٹھنا چاہتی ہی تھیں کہ کمرے میں روشنی جل اٹھتی ہے۔

"کون عدیل؟"ــــ اماں نے اپنی آواز صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اماں۔ میں ہی ہوں۔"

اماں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔

"اماں! تم نے کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا تھا؟"

"ارے اب اندھیرے کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور میں اس کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔"

"اماں! یہ کسی ناول کا مکالمہ ہے۔ لگتا ہے تم اب بھی ناول پابندی سے پڑھتی رہتی ہو۔"

"یہ کسی ناول کا مکالمہ نہیں۔ میرے وجود کے احساس کی زبان ہے جو لمحہ لمحہ اپنا پنجہ میری طرف بڑھاتی آ رہی ہے۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ اماں! آج تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔"

"تو بھی کچھ کہہ ڈال۔ دل میں رکھے گا تو میری طرح تیرا وجود بھی لہو لہان ہو جائے گا۔"

"اماں سنا ہے کہ بڑے بھیا اس عمارت کو اپنے نام کرانا چاہتے ہیں؟"

"ٹھیک ہی سنا ہے تو نے۔"

مجھے اس عمارت سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن مشرق کی جانب جو زمین ہے جہاں فصل اگی ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم وہ زمین میرے نام کر دو۔ میں اس کے کنارے پر ایک خوبصورت سا فلیٹ بنواؤں گا اور وہیں بال بچوں کے ساتھ زندگی گزاروں گا......... اماں تم بھی میرے ساتھ ہی رہو گی۔ تمہیں میرے بچوں سے کتنا پیار ہے اور بچے بھی تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔"

اماں نے اچانک محسوس کیا کہ اس دنیا میں ان کا وجود محض فرضی ہے۔ پھر انہوں نے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چمکتا ہوا چاند کبھی بادل میں روپوش ہو جاتا، کبھی نکل آتا۔ آج وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہیں۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی کا پہرہ تھا مگر وہ جاگ رہی تھیں۔ لمحہ لمحہ اداسی کی چادر دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ نیند پتہ نہیں وقت کے کس انجانے موڑ پر رہ گئی تھی اور پتہ نہیں اسے کس کا انتظار تھا۔ دل تھا کہ رہ رہ کے دھڑکے جا رہا تھا۔ وہ چیخ کر رونا چاہتی تھیں مگر آنکھوں میں آنسوؤں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اور پھر ان آنسوؤں کو کون دیکھے گا اور اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو ان آنسوؤں کا ردعمل اثبات میں ہو گا یا نفی میں ــــ؟

صبح ہوئی تو عدیل اماں کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہو گیا۔ــــ

"اماں! تم کو کوئی تکلیف ہے کیا؟ ایسا لگتا ہے، تم رات بھر نہیں سوئی ہو؟"

"نہیں بیٹا! اب اس بڑھاپے میں کیا تکلیف ہو گی، البتہ ایسا لگتا ہے کہ میرا وجود دھیرے دھیرے بکھر رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے، بس جتنے دن زندہ رہ لوں غنیمت ہے۔"

"اماں تم فکر نہ کرو تمہارے تین تین بیٹے ہیں۔ علاج میں کوئی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر تمہارے علاج کے لئے دوڑا آئے گا۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"ارے میری فکر مت کر، جا اپنا کام دیکھ"ــــ اماں نے محبت سے ڈانٹا۔

"اچھا اماں آفس جاتے ہوئے میں ڈاکٹر کو تمہارا حال کہتا جاؤں گا۔ اس نے ضرورت محسوس کی تو وہ آکر خود چیک اپ کر جائے گا۔ تم ذرا [illegible]

گھبراتا۔"

عدیل چلا جاتا ہے۔ بہو دودھ کا گلاس لے کر حاضر ہوتی ہے۔

"اماں دودھ پی لیجئے۔"

اماں [illegible] ہاتھ میں لے لیتی ہیں۔

"[illegible] وی آن کر نا نیوز کا وقت ہو گیا ہے۔"

بہو [illegible] کے بڑھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ خبریں آرہی تھیں۔

"آسام کے دہشت پسندوں نے یوم آزادی کا بائیکاٹ کیا۔ کئی سرکاری عمارتوں کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا........."

"بہو! ٹی وی بند کر دو۔ دہشت گردی کے علاوہ ان لوگوں کو کوئی خبر ہی نہیں ملتی۔"

اماں کی آنکھیں اداس ہو جاتی ہیں۔ ان کی نگاہ ایک طرف ٹنگی ان کے شوہر کی تصویر پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے ہیں اور ہونٹ کپکپا اٹھتے ہیں۔۔۔

"آپ کی قبر تو پاکستان میں ہے جہاں آپ کے بیٹے فاتحہ پڑھنے بھی نہیں جا سکتے لیکن میری قبر کہاں ہو گی؟ کس بیٹے کی سرزمین پر؟ کیوں کہ ہر بیٹا مجھے بانٹنا چاہتا ہے۔"۔۔۔۔

اور اماں کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگتی ہیں۔★★

- زرِ سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا تعاون دیجئے۔
- منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں مع خریداری نمبر ضرور درج کیجئے۔
- ڈرافٹ یا چیک پر صرف "THE SHAIR BOMBAY" درج کیجئے۔



عطا عابدی

ھائیکو

طرز گلشن سیکھ
کہتی ہے ہر نوکِ خار
جینے کا فن سیکھ

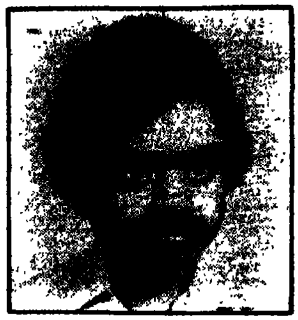
سچ کو جانے گا؟
خود وہ اپنا دشمن ہے
لیکن مانے گا؟

رہ گیروں کے ساتھ
خوش خوش چلتے رہتے ہیں
زنجیروں کے ساتھ

اپنا پن ہر سوٗ
ہر خوشبو پر غالب ہے
مٹی کی خوشبو

اونچے بندوں سے
ہم نے سیکھی نادانی
دانش مندوں سے

● URDU DEPT. BIHAR LEGISLETIVE COUNCIL PATNA-800015 (BIHAR)



ناصر راہی

خواب خواب نظمیں

①

وہ خواب
جن کی تعبیریں
تم
صبح نور کی کتابوں میں ڈھونڈتے ہو
یا پھر جن کے لئے
تم
شیخ و برہمن سے ملتے ہو
ان کی جڑیں
بدن کی مٹیوں سے ہو کر
روح تک پہنچتی ہیں

②

نیند میں آکر
کوئی با معنی خواب تمہیں گدگدائے
یا بستر پر تمہیں دیر تک ستائے
تم سمجھ لینا
کہ تمہاری زندگی کے کئی دن
مفت میں
تمہارے ہاتھوں سے نکل گئے!!

● BARINAGAR, P.O. LUABASA, TILCO, JAMSHEDPUR (BIHAR)

ابے — عبد اللہ

ھم سخن

جانے، پہچانے دیرینہ
واقف کار، شناسا جب بھی
مل بیٹھیں تو
بلا توقف بات چیت چلتی رہتی ہے
لیکن جب
چلتے چلتے یہ بات چیت کچھ تھک سی جائے
یعنی لمبے با معنی وقفے آنے لگ جائیں
تو پھر
لفظ ذرا بے معنی سے لگنے لگتے ہیں
اے میرے دیرینہ واقف، دوست، شناسا
ہم بھی
دھیان دھریں اور غور کریں
بات چیت میں اپنی
خاموشی کے با معنی
لمبے وقفوں پر

● 12421 RIVERS EDGE DR POTOMAC, MD 20854 (U.S.A.)

ملک زادہ جاوید

تم نے خود کو چلو سجایا تو — آئینہ آج مسکرایا تو
عشق کرلوں گا دشمنوں سے میں — وہ اگر ہوگیا پرایا تو
سوچ کر دل کو توڑنا میرے — یہ دیا بجھ کے جل نہ پایا تو
دھوپ کرنوں سے روٹھ جائے گی — پیڑ آنگن میں گر لگایا تو
یہ عنایت ہے بس تری جاوید — دیر سے ہی سہی تو آیا تو

● T-25, SECTOR-9, NOIDA (U.P.)

اقبال وسیم ملک

خوشیوں کی انجمن میں بھی دل بے قرار ہے — آجا، کہ زندگی کو ترا انتظار ہے
ہم اس طرف لبوں پہ ہیں صحرا لئے ہوئے — دریا ادھر ہمارے لئے بے قرار ہے
غزلیں سناؤ جس سے کہ طبیعت بحال ہو — غیبت کسی کی اپنی سماعت پہ بار ہے
دیوانگی تو دیکھ ذرا اپنے عشق کی — خود سے زیادہ مجھ پہ تجھے اعتبار ہے
میں شکل ہوں تو وہ ہے مرا آئینہ وسیم — پیاسے لبوں پہ پیاسے دلوں کی پکار ہے

● 8/189, RASOOL JAMADAR STREET, RANDER SURAT(GUJ)

نثار احمد نثار

کبھی زمین سے گردوں پہ جو نگاہ کروں — نہ کج ادا ہی کروں اور نہ کج کلاہ کروں
اسی طرح سے یقینی رہے گی فتح مری — کوئی قصیدہ لکھوں اور نذر شاہ کروں
اب اس کے شہر سے اتنا ہی ربط باقی ہے — کوئی بلائے کبھی تو ادھر کی راہ کروں
کسی کے سحر کا یہ دل کبھی اسیر نہ ہو — میں جس کو چاہوں اسے پیار بے پناہ کروں
نہ ماہ و نجم ہی افلاک پر چمکتے ہیں — تو کیوں چراغ بجھاؤں یہ شب سیاہ کروں

● BEGUMPUR, SAMASTIPUR- 848101 (BIHAR)

رئیس صدیقی

ہنسی ہنسی میں ہر اک غم چھپانے آتے ہیں — حسین شعر ہمیں بھی سنانے آتے ہیں
ہمارے دم سے ہی آباد ہیں گلی کوچے — چھتوں پہ ہم ہی کبوتر اڑانے آتے ہیں
دریچہ کھول دیا تھا ترے خیالوں کا — ہوا کے جھونکے ابھی تک سہانے آتے ہیں
وصال، ہجر، وفا، فکر، درد، مجبوری — ذرا سی عمر میں کتنے زمانے آتے ہیں
حسین خوابوں سے ملنے کو پہلے سوتے تھے — کہ اب تو خواب بھی نیندیں اڑانے آتے ہیں

● URDU MAJLIS, AKASHWANI,NEW DELHI-110001

جی ڈی احمر

کوئی فقیر ہوتا ہے اک آدھ ہی سو میں — ورنہ سبھی بہہ جاتے ہیں جذبات کی رو میں
اس درد کی لذت میں ہے جینے کا مزہ اور — ہم خود کو جلاتے ہیں ہر اک شمع کی لو میں
ہر ایک کے بس میں یہ اجالا نہیں ہوتا — فرزانے جلا کرتے ہیں احساس کی ضو میں
لازم ہے ہمہ وقت کھلی آنکھ کا رکھنا — کچھ گھن بھی تو پس جاتے ہیں پستے ہوئے جو میں
یہ اپنی طبیعت ہے لگا رہتا ہوں اکثر — کوشش میں، تجسس میں، تلاش و تگ و دو میں

● HOUSE NO. 29-RD.NO. 5, AZAD NAGAR JAMSHEDPUR

مکتوبات

"جولائی کے شمارے میں "مکتوبات" کے باب
ں شاعر کے عام شماروں پر موصولہ بے شمار خطوں میں سے
ر ایک شامل کئے گئے تھے۔ اب اس شمارے میں کچھ اور خطوط
ل کئے جارہے ہیں۔ گذشتہ شماروں پر خطوط کی خاصی بڑی
د اب بھی موجود ہے۔ مئی اور جون کے شماروں پر بھی
وط موصول ہورہے ہیں۔ جولائی کا شمارہ قارئین کے
الے میں ہے۔ اور اب اگست کا شمارہ پیش ہے۔ ہم چاہتے
ں کہ شاعر کے قارئین ہر شمارے پر اپنی گراں قدر رائے سے
ریں۔ ان کی پسند ناپسند کے تناظر میں شاعر کے ہر شمارے کو
تیب دیا جائے۔ بہت سارے تعریفی و توصیفی خطوط شامل
اعت نہیں ہوپاتے لیکن وہ ہماری روحانی مسرتوں اور
رتوں کا ایندھن ضرور بنتے ہیں۔ ہم شاعر کے ایسے تمام
رئین کے بے حد شکر گذار ہیں کہ وہ اپنی پر خلوص دعاؤں
ے ہمیں نوازتے ہیں۔ گذارش ہے کہ اپنی دعاؤں کا سلسلہ
ری رکھئے۔ فروری، مارچ ۲۰۰۰ء کا خصوصی شمارہ (پاکستان
ں اردو ادب) ہنوز موضوع گفتگو ہے۔ اس پر موصولہ خطوط
ئع کئے گئے تھے۔ مگر اس پر خطوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔
ر کسی موقع سے ان خطوں کو موضوع بنایا جائے گا۔"

[ادارہ]

جنوری ۲۰۰۰

کرامت علی کرامت

اکیسویں صدی کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ یہ ایک کرشمہ ہے کہ "شاعر" نے ستر سال کی عمر مکمل کرلی۔ میں سمجھتا ہوں دنیا بھر کی تمام زبانوں میں بہت کم ادبی رسالے ایسے ہوں گے جو اس اعتبار سے شاعر کی ہم سری کا دعویٰ کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ نئی صدی میں علامہ سیماب اکبر آبادی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے گی، لیکن اس صدی کو سیماب صدی کہنا مناسب نہ ہوگا، کیوں کہ کسی صدی کو کسی واحد شخص سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ ریاض صدیقی کے مضمون سے یہ جان کر افسوس ہوا کہ کراچی میں سیماب صاحب کا مزار کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ سنا تھا کہ وہاں سیماب اکادمی کچھ کام کررہی ہے۔ معلوم نہیں اس کے اراکین اب مزار کے تحفظ کے لئے کیا کررہے ہیں۔ ویسے کسی بڑے سیاسی لیڈر کے برعکس بڑے ادیب کا مزار محفوظ ہونا کوئی ضروری نہیں۔ آج بھی کم ہی لوگوں کو اس بات سے دلچسپی ہے کہ نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی کا مزار کہاں ہے۔ لیکن یہ لوگ اہل اردو کے دلوں میں زندہ ہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیماب کی بہت سی چیزیں اب بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ سیماب خاندان سے میری سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ اس نے دوسروں کے لئے بہت کچھ کیا، لیکن سیماب کے لئے کچھ نہیں کیا۔ کیا غالب نمبر اور کرشن چندر نمبر کی طرح سیماب نمبر شائع نہیں کیا سکتا تھا؟ آپ اگر اقبال نمبر میں کامیاب ہوئے تو سیماب نمبر کیا گھاٹے کا سودا ہوتا؟ اس میں بہت زیادہ مالی فائدہ نہ سہی، لیکن کم از کم گذشتہ صدی کے چند بڑے نقاد ضرور متوجہ ہوجاتے۔

"چھیڑ خوباں سے چلی جائے" کا مصداق آپ کا ادبی فیچر "غزل پر مکالمہ جاری ہے" بحث مسائل پر مبنی ہے اور غور و فکر کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ آپ یہ کیا لکھ دیا کہ اردو رسم الخط کی طرح اگر اردو سے غزل بھی چلی جائے تو اردو والوں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں ہندوستان کی دیگر زبانوں میں غزل ضرور زندہ رہے گی۔ "اردو سے نہ اس کا رسم الخط چھینا جاسکتا ہے نہ اس سے غزل جدا ہوسکتی ہے۔ یہ بات اتنی بار آزمائی جاچکی ہے کہ مزید آزمائش کی ضرورت نہیں رہی۔ غزل اردو تہذیب کا حصہ ہے، ہندوستان کی کسی دوسری علاقائی زبان کا نہیں۔ یہ اور بات کہ گجراتی، مراٹھی، بنگلہ، اڑیا، تلگو جیسی زبانوں میں غزلیں کہی جانے لگی ہیں، لیکن غزل ان زبانوں کی تہذیبی روایت کا حصہ نہیں بن سکتی۔ یہ صنف صرف اردو تہذیب کی روح بن کر زندہ رہے گی۔ غزل کے پہلو بہ پہلو نظم کو بھی فروغ دینا چاہئے۔ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ غیر اردو داں طبقہ ترجمے کے ذریعے بڑی حد تک اردو نظموں سے محظوظ ہوسکتا ہے، جب کہ اردو غزلوں سے کماحقہٗ محظوظ ہونے کے لئے اسے اردو جاننا ضروری ہے۔ یہی ان دونوں اصناف میں فرق ہے۔

● REHMAT ALI BLDG. DEWAN
BAZAR CUTTACK-753 001 (ORISSA)

خورشید اکرم

شاعر کے تازہ شمارے میں اردو ناولوں کی عدم موجودگی پر وارث علوی کا نوحہ نظر نواز ہوا۔ فکشن کے بارے میں ان کے بیشتر خیالات سے میں متفق ہوں یہاں تک کہ ان کی یہ بات بھی تسلیم کہ اردو میں اچھے ناول نہیں لکھے جارہے ہیں۔ مگر اس بات کا شکوہ کرتے ہوئے وہ دو باتیں بھولے جارہے ہیں پہلی بات تو یہ کہ اردو فکشن ابتدا ہی سے افسانے کے سحر میں ہے۔ واقعہ یہ ہے ہمارے دو بہترین فکشن نگاروں، منٹو اور بیدی نے ناول کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ باقی کے اہم فکشن نگاروں میں قرۃ العین حیدر، پریم چند، اور خدیجہ مستور اور ایک حد تک بلونت سنگھ کو چھوڑ کر کس نے قابل ذکر ناول لکھا؟ ان کے بعد ایک عرصے تک تو ناول سرے سے لکھے ہی نہیں گئے۔ ادھر کے آٹھ دس برسوں میں کچھ ناول لکھے گئے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی بڑا ناول نہیں ہے مگر اس باب میں "کیان سنگھ شاطر" کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ ناول میں جن پیچیدگیوں کو احاطۂ تحریر میں لاتا ہے اس کے لئے ادیب کو کتنی ریاضت اور کتنی یکسوئی کی ضرورت ہے وہ کوئی لکھنے والا ہی جان سکتا ہے۔ اردو ادب کا تازہ المیہ یہ ہے کہ اس کے خلاق ذہن متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے آرہے ہیں جنہیں بڑے شہروں کی روزمرہ کی زندگی کے تقاضے ہی کھائے جارہے ہیں۔ نہ وہ فرصت میسر ہے نہ فراغت۔ سید محمد اشرف نے پچھلے دنوں ایک ذاتی خط میں اس عدیم الفرصتی کا ذکر کس خوبصورتی سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:- ۱۹۸۲ء میں ایک ناول شروع کیا تھا۔ صرف آخری باب رہ گیا تھا۔ آج تک وہ لمحۂ نایاب ہاتھ نہیں آیا کہ اس باب کو مکمل کرپاؤں۔ "میر امن - قصہ سنو" کا مسودہ اکثر رات گئے مجھ سے سوال کرتا ہے، کیا ہمیں بھول گئے؟ میں اس کے سامنے شرمندہ ہوجاتا ہوں۔ قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو اگلے دن کی دھوپ راستہ روکے نظر آتی ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو نیچے سی روڈ پر روشنیوں کا رقص اور آوازوں کا جادو نظر آتا ہے۔ تھوڑی دیر تک غور سے دیکھوں تو سب کچھ تاریک لگتا ہے۔ اس پہلو پر میں جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی میرا خیال پختہ ہوجاتا ہے کہ بڑا ادب بڑے شہروں میں رہنے والے اب نہیں لکھ سکتے۔ ان ڈربہ نما مکانوں میں اب کوئی گوشہ نہیں بچا جہاں ادیب اپنی راتیں اُجال سکے کیوں کہ اتنی روشنی گھر کے باقی لوگوں کی آنکھ میں چبھتی ہے۔ بڑا ادب یوں بھی چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں لکھا جاتا تھا۔ کچھ استثنائی مثالوں سے قطع نظر دنیا کا بیشتر بڑا ادب فارغ البال لوگوں نے ہی لکھا ہے۔ یہ ایک بحث کا موضوع ہوسکتا ہے کہ یہ کم حال طبقہ جو اس وقت ادب پڑھنے لکھنے کے لئے اس درجہ سنجیدہ ہے، کار دو بار شوق کا متحمل ہو بھی سکتا ہے کہ نہیں۔ اردو کی کم نصیبی ہے کہ جن لوگوں کو اس میں فرصت و فراغت میسر ہے انہیں

زندگی کی پیچیدگیوں کا شعور نہیں ہے۔ انسان کے بڑھتے دکھوں کا ادراک نہیں ہے۔ ان کا ہن سہن ہی نہیں ذہن بھی قصباتی ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے بھیس میں صارفیت نے شہر کے رہنے والوں پر ایسا شبخون مارا ہے کہ: نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں! ایسی صورت حال میں بس اسی کو غنیمت جانئے کہ اس مایوس کن اندھیری رات میں درخشاں ستارے نہ سہی، جگنو کی طرح جلنے بجھنے والے ابھی موجود ہیں۔ ابھی صورت حال اتنی بھی خراب نہیں ہوئی ہے کہ وارث علوی اپنی حویلی کی چھت سے کھڑے ہو کر للکاریں اور کسی کو غصہ بھی نہ آئے۔ تازہ شمارے کی دیگر تخلیقات ابھی ٹھیک سے نہیں دیکھیں۔ غزل پر مکالمہ کا سلسلہ اب بند کیجئے۔ یہ بحث اب ہذیان گوئی کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ ستیہ پال آنند کے خیالات سے میں متفق نہیں ہوں۔ لیکن غزل کے دفاع میں جو نیازہ ترد لیلیں دی جا رہی ہیں ان سے پشتینی مکان کے کسی اونچے طاق میں رکھے ہوئے بارہ سنگھے کی سینگ کی سی مہک آتی ہے۔ غزل کے دفاع میں شکیل جمالی کی نظمیں دیکھ کر شرمندگی ہوئی کہ اردو میں اس تک بندی کو بھی یار لوگ شاعری کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ان لغویات کو آپ نے نمایاں طور پر پورے ایک صفحے میں شائع کیا ہے

● M-7/2, ST. NO. 6/6, JOGABAI EXTN.
NEW DELHI - 110 025

شہناز صبیح

ادبی فیچر "غزل پر مکالمہ جاری ہے" سنجیدگی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ خورشید حیات کے خیالات سے (اردو غزل، نصاب، اساتذہ اور طلباء) متفق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو سے ایم اے کر لینے کے باوجود طلباء جدید غزل گو، افسانہ نگار اور تنقید نگاروں سے متعارف نہیں ہو پاتے، ماسٹر کی ڈگری مل جاتی ہے۔ نصاب کی ترتیب درجات کے اعتبار سے سلسلہ وار ہونا چاہئے مثلاً پرائمری درجات میں بچوں کے ادیب و شاعر یا شعرا و ادباء کا کلام جو بچوں سے متعلق ہو، نصاب میں ہو اور درجہ ششم سے (تاریخ ادب) اردو کا نصاب سلسلہ وار ہو تاکہ ایم اے کرنے تک مطالعہ مکمل ہو جائے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلباء ہی کو نویں جماعت سے ایم اے تک اردو پڑھنے کے مواقع دیے جائیں۔ اردو طلباء کی تعداد اس سے متاثر ہو سکتی ہے لیکن اردو کا ادبی مزاج رکھنے والا حلقہ ضرور وجود میں آ سکتا ہے۔ جس سے پڑھنے اور پڑھانے والوں کا معیار بلند ہو ورنہ اس وقت اردو ادب کے درس و تدریس کی حالت تو زار نا قابل بیان ہے۔ اردو میں بی۔ اے لینے والی طالبات کی اکثریت اپنا نام درست نہیں لکھ سکتی، وہ ادب کی تاریخ پس منظر، تنقید، تحقیق پر کیسے نظر رکھے گی۔ قوم کی خدمت ناکارہ طلباء کو زیادہ نمبر دینے سے نہیں ہو سکتی ہے۔ ہر اردو والا ایک آدمی کو اردو سکھانے کا عزم نہیں کرے گا تو اردو کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، اردو دشمن عناصر رسم الخط کا مسئلہ ہماری اسی حالت کے پیش نظر اٹھاتے ہیں۔

احسان آوارہ کا نثری خط اردو غزل کے وکیل صفائی کی حیثیت رکھتا ہے، مقدمہ تو غزل کے حق میں جیتا ہوا ہے ہی، شکیل جمالی کی نظم اس سلسلہ کی کڑی ہے، "ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے" غور طلب ہے۔ دہائی ہے انگنت چینلوں کی جنہوں نے سستی تفریح میں باذوق لوگوں کو بھی بے ذوق کر دیا، اب تو ناولیں چھپ چھپ کے پڑھنے کا زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا ناولیں ادل بدل کر پورے خاندان میں گھوما کرتی تھیں ہر فرد پڑھنا اپنا فرض سمجھتا تھا، خاص خاص معاشرتی ٹکڑوں، مسائل، پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ کس کس کو سوچئے۔ کس کس کو روئیے۔ مغربی تہذیب کا سیلاب دیکھئے کیا چھوڑتا ہے؟ کاش ہمیں اپنے سرمائے کی وقعت معلوم ہو جائے کہ اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ ملکی سرمایہ، معاشرت ہندو تو اور ہندوستان جیسے گمراہ کن سیاسی نعروں کی نذر ہوا جا رہا ہے۔ یہ بھیڑ چال کب رکے گی؟ نئی دنیا کے باسی اپنے تجربوں سے اور بھی ہول پیدا کر دیتے ہیں۔

"ٹی وی۔ افتخار نسیم شکاگو"

● 623 - WASIABAD, ALLAHABD (UP)

پروین جاوید

شاعر کا ہر شمارہ اپنی جگہ نہایت دلچسپ، بامعنی، مفید اور معلوماتی مواد پر مشتمل ہوتا ہے۔ خاص طور پر نثری حصے میں اردو کے معاصر شاعروں کا سلسلہ۔ اس میں نہ صرف شاعر کا اسلوب، نظریات اور تعارف بلکہ اس دور کے ادبی ماحول سے بھی قاری کو شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ انداز تحریر موثر ہے، قاری خود کو اسی ماحول اور حالات میں محسوس کرتا ہے۔ سردار جعفری پر وارث کرمانی کی نہایت دلچسپ اور قابل قدر تحریر ہے۔ موجودہ شمارہ جنوری ۲۰۰۰ء میں ریاض صدیقی صاحب کی تحریر "انہیں تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں" پڑھا اور حضرت سیماب اکبر آبادی کا وہ کھرا اور سچا شعر جس میں تعلی نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے، پڑھا جو زبان زد خاص و عام ہے۔ اور ان کی ادبی حیثیت جس کا زمانہ معترف ہے اس کا اوراک انہیں خود ہی ہو چلا تھا۔

میں ہوں ایک مستقل عنوان ہستی کا فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

اور آج کل کے گلوبل ولیج میں حقیقتاً اس شعر اور ان اشعار کو موجودہ دور کے تناظر میں از سر نو سمجھنے کی ضرور ہے، کیوں کہ ہم اپنی ثقافت بھول کر عالمی کلچر کے دل د ہو چکے ہیں۔ ریاض صدیقی صاحب کا مضمون قابل توجہ کہ آج کے قاری کے لئے ان کے مضمون میں آج کے د میں انسانی قتل کا بے پایاں کرب بھی ہے جو تہذیب یافتہ ترقی یافتہ (نام نہاد) قوم کے ہاتھوں مسلسل ہو رہا ہے اور ک اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا کیوں کہ ا نام نہاد ترقی اور تہذیب یافتہ لوگوں نے اپنے سازشی ہتھکنڈ سے ساری دنیا کے بیشتر ممالک کو کسی نہ کسی طرح غلام بنار ہے۔ لہٰذا ظلم و جبر و استبداد محسوس کرنے اور دیکھنے کے باو زبان سے اُف نہیں کرتے۔ شاعر کے مختلف افسانے ا کہانیاں جہاں انسانی ذہن کے کینوس پر اپنا بھرپور تاثر قائم کر ہیں وہیں انسانوں کے مخصوص طبقات کے مسائل کا احا کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی خطے کے انسا ہوں۔ مثلاً افتخار نسیم کی کہانی "ٹی وی" حسین الحق کا "چھاجو برستا پانی" محمود شاہد کا "عطر" یا محمود واجد کا "اثاثہ" یا اختر یوسف کا "بدبو" جس میں اختر یوسف نے موجودہ ترقی یافتہ معاشر میں عورت کا مقام اور حیثیت کا وہ حقیقی روپ اجاگر کیا ہے مردوں کے معاشرے میں مہذب اقوام کے مردوں کے ہاتھوں میں ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ کیا پتہ آئندہ بھی ہو رہے کیوں کہ مرد اس قدر احساس کمتری کا شکار ہے (چند لوگ نہیں صرف چند لوگ) کہ وہ عورت کی صلاحیتوں کو اجا ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتا جب کہ ایسے حضرات خود کو ہر خاص عام میں زیادہ سے زیادہ مظلوم اور عورتوں کو انتہائی ظالم ا جانے کیا کیا کہہ کر لوگوں سے ہمدردی حاصل کرتے ر ہیں۔ جب کہ اندرون خانہ وہ فحش کلامی اور مار پیٹ سے آ دن اپنی بیویوں کو ظلم کا نشانہ بناتے رہتے ہیں دراصل وہ (ا یوسف کی کہانی "بدبو" کے ایک کردار جو عورت کو اپنی خوا میں تمام رات اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیتا وہی کریہہ کردار ہیں) اس کے علاوہ یہ کہانیاں اور ان کے کرد دراصل ہمارے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرے کے منہ طمانچے ہیں۔ شاعر کا منظوم حصہ جس میں بخط شاعر، منتخب غزلیں اور اس کے علاوہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل حصہ دنیائے ادب کے اردو قاری کے لئے نہایت اہم

ں کے ذریعے ہم مختلف شعراء کا کلام پڑھ لیتے ہیں اور اندازہ
ں ہو جاتا ہے کہ کس ملک میں کس کس انداز سے اردو
عری کی ترویج و ترقی ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف شعراء
ے زبانی کلامی ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

● R-341.9, DASTAGIR SOCIETY,
F.B.AREA, KRACHI (PAK)

پرویز اختر

آپ کے اور یے کچھ زیادہ ہی حساس ہوتے جا رہے ہیں۔ پ کی تڑپ رائیگاں نہیں جائے گی، انشاء اللہ۔ غزل پر مکالمہ .ی رہنا چاہئے۔

وارث علوی صاحب کی تحریریں میں بڑے شوق سے ھتا ہوں۔ معاصر اردو فکشن ایسا گیا گذرا بھی نہیں کہ صوف بیزار ہوئے بیٹھے ہیں۔ اسی شمارے میں حسین الحق کہانی "چھاجوں برستا پانی" ملاحظہ کریں۔ یہ کہانی تین سطحوں چلتی ہے۔ کہانی کے تین ہی کردار ہیں۔ راگنی شباہت اور پھی۔ راگنی ستی کر دی گئی۔ انتہائی دردناک اور انسانیت سوز نحہ ہے لیکن کم از کم راگنی مر کر آزاد تو ہوئی۔ اس پھوپھی کو ہئے کہ ایک مدت سے چتا پر ہے، اور المیہ یہ ہے کہ زندہ ہے۔ ہت جو ابھی ابھی چتا پر چڑھی ہے اللہ کرے کوئی بھلا مانس ئے اور اسے بچا لے جائے۔ اس کی زندگی پھوپھی جیسی ناک نہ ہو "وہی جنگل کی اندھیری رات! شہزادی جنگل کی .ھیری رات سے کب تک جوجھتی رہے گی۔ "آخر سماج ب تک یہ تماشہ دیکھتا رہے گا؟ اس کا حل کب تلاش کیا جائے ؟ کیا یہ صرف جنگل کی اندھیری رات ہے؟ یہ رات کہیں ت اور زندگی تو نہیں؟ یہ ایک بہترین کہانی ہے۔ وارث احب ایک کہانی سے اور کیا چاہتے ہیں۔ اگر موصوف کو نیا .ضوع چاہئے تو افتخار نسیم کی کہانی "ٹی وی" کیا بری ہے؟ اور ہدا اختر کی "برگد والی پھوپھی" کو کیا آسانی سے بھلا دیں گے۔ ال یہ بھی ہے کہ کیا موصوف آج کا فکشن پڑھ بھی رہے ں؟ حالانکہ وارث صاحب کا مضمون 'ناول' پر ہے اور میں سانہ + ناول = فکشن کی بات کر رہا ہوں۔ کیوں کہ موصوف ۔کچھ اور تحریروں بھی ذہن میں ہیں۔ بہر حال موصوف کا یہ یہ ہے کہ انہیں منٹو اور بیدی سے آگے کچھ نظر ہی نہیں تا ورنہ جس زبان کے پاس سلام بن رزاق، انور خان، ین الحق، علی امام نقوی، ساجد رشید، سید محمد اشرف، کنور لین، شفق، مشتاق مومن، انور قمر، ابن کنول اور بہت ہی تازہ .شرف عالم ذوقی، صغیر رحمانی اور خورشید اکرم (یہ تو وہ نام ہیں جو فوری طور پر ذہن میں آئے ہیں) جیسے فکشن نگار موجود

ہوں۔ اسے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیگر مشمولات کے لئے بھی آپ کو مبارکباد۔ شکیل جمالی کی نظمیں سینکڑوں دلوں کی آوازیں ہیں۔ پچھلے شمارے میں آپ کی نظموں نے مسحور کر دیا تھا۔ اپنی الجھنوں کی وجہ سے خط نہ لکھ سکا۔ بہر حال احساساتی اور جمالیاتی ہر دو سطح پر وہ نظمیں روشن ہیں۔

●QAZI SARAI, CHANDURA-246725(UP)

رام پرکاش کپور

میرے خیال میں "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت "گوشۂ ستیہ پال آنند" شائع کرنا حق اور غیر ضروری تھا۔ آپ نے ان کو خواہ مخواہ میں اتنی اہمیت دی ہے۔ اور اب وہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور اب اپنے اس منظوم خط میں غزل کے لئے ایک اور صفت 'اندھا کنواں' انہوں نے ایجاد کر دی ہے۔ مجھے احسان آوارہ کی اس تحریر سے پورا اتفاق ہے۔ "...... آپ غزل سے اتنے خائف کیوں ہیں؟ ممکن ہے یہ محض آپ کا ایک جاندار حربہ ہو شہرتوں کے حصول کا۔ کیوں کہ آپ غزل کی مخالفت نہ کرتے اور رسالہ شاعر میں آپ پر گوشہ نہ شائع ہوتا تو شاید آج آپ ہندو پاک کے چھوٹے بڑے ادبی رسائل میں اتنے نمایاں نہ ہوتے ...... آج آپ اور آپ کی شاعری جو کچھ ہے، اس کے لئے غزل ہی کو دعا دیجئے اور اس کا شکریہ ادا کیجئے . .."

احسان آوارہ نے ستیہ پال آنند کے احساس کمتری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ نہایت سخت احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ اور چونکہ وہ خود اچھی اور بلند پایہ اور قابل یادگار "غزل" جو میر، غالب، مومن یا دوسرے غزل گو شعرا کے مقابل رکھی جانے کے قابل ہو، نہیں لکھ سکتے۔ تو وہ اپنی فرسٹریشن (Frushtration) اور مایوسی کا غصہ غزل کے خلاف لکھنے میں نکالتے ہیں۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والی بات ہے۔ ویسے ان کی کوئی ایسی پابند نظم بھی نظر سے نہیں گذری جسے اقبال، جوش، یا ساحر وغیرہ کی نظموں کے ساتھ جگہ مل سکے۔ جناب احسان آوارہ نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ "...... آپ نے تو عظیم پابند نظمیہ شاعری کی روایت کو بھی کچھ نہیں سمجھا اور نظم کے زوال میں معاون ہوئے۔ غزل کے ساتھ اردو کی عظیم پابند نظمیہ شاعری میں اصناف کا تنوع اور اس کے تحت جو شاعری ہوئی ہے وہ غیر معمولی ہے جدید نظم سے موازنہ کر لیجئے......"

اس سلسلے میں مجھے ماہنامہ انشاء کے جون، جولائی ۹۷ء کے شمارے میں چھپا مشہور نقاد اور اردو فارسی کے جید عالم آنجہانی ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا ستیہ پال آنند کی کتاب "دست برگ" پر تبصرہ یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا: "ستیہ پال آنند سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ 'دھار کھیو میری بہت غریب لوڈ' ایسی نظموں کو عالمی معیار پر کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت حال تو یہ ہے کہ متعدد غیر مسلم شعراء ایسی نظموں سے مسلم جذبات میں جگہ پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ امم ایک غیر مسلم کو قابل احترام ہی رہتے ہیں اور بس۔ اس چور دروازے سے داخل ہو کر ایوان شاعری میں جس نوعیت کی نظمیں پیش کی ہیں وہ تمام تر خرافات کے تحت ہی آ سکتی ہیں۔ سلیم شہزاد کا شعری مجموعہ "تزکیہ"، ساجدہ زیدی کا "آتش سیال"، کرشن موہن کے ۸۔۹ مجموعوں وغیرہ میں جو شاعری ملتی ہے اس کو ہر اعتبار سے عالمی معیار پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر باوصف بلند آہنگی "دست برگ" کی ایک ہی نظم درخور اعتنا نہیں معلوم ہوتی۔ دست برگ تو نام ہے مگر غالباً اس کی وجہ تسمیہ آنند صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ بہر کیف اردو شاعری کے ایوان میں اسے کبھی کوئی مقام نہیں مل سکتا۔

ترتیب نالل راچوں گرد گاں بر گنبد است

ستیہ پال آنند کی نظر میں وہی شاعری عظیم ہے جو انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو سکے۔ لیکن میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ غزل کے اشعار کو دوسری زبان میں پُر اثر ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ غزل کے شعر میں جو کوزے میں سمندر موجود ہوتا ہے، اس کی وسعت کو دیگر زبانوں کے دو مصرعوں میں ڈھالنا ممکن ہی نہیں۔ ایسے میں غزل کے شعر کی پرکھ بے معنی ہے۔ اس میں غزل کا کیا قصور۔ ادب میں بنیادی چیز جذبہ اور احساس ہے اس کے اظہار میں غزل کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور صنف کو نہیں۔ غزل جن بلندیوں کو پہنچی ہے اس کا جواب دنیا کے ادب میں نہیں ہے۔ جو بات میر، غالب نے ایک شعر میں کہہ دی دنیا کے شاعر لمبی نظمیں کہتے رہے، لیکن خیال و بیان کی ان بلندی کو نہ پہنچ سکے۔ کہ وہ مصرعے زبان زد خاص و عام ہو جائیں اور قاری و سامع کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں۔

"شعرائے اردو چند بندھے ٹکے موضوعات کو دہرا رہے ہیں" یہ حقیقت ہو یا نہ ہو۔ لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور ان کے نوید اپنے بیانات کے ذریعے کلیم الدین احمد، عظمت اللہ خان اور حالی کی طرح غزل پر اپنے اعتراضات کے سہارے ان صف میں شامل ہو کر اپنی اہمیت ضرور تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن حالی کی ادبی حیثیت غزل پر اعتراضات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی علمی و ادبی تصانیف کے وسیلے سے ہے۔ عظمت اللہ خان کی عظمت ان کے ادبی شعری کارناموں کی وجہ سے تسلیم

کی گئی۔ کلیم الدین احمد بھی غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دینے کی وجہ سے ادب میں امتیازی مقام نہیں رکھتے بلکہ اپنے گراں قدر کارناموں کی وجہ سے انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔

● D-832, NEW FRIENDS COLONY,
NEW DELHI - 110052

اپریل ۲۰۰۰ء

حکیم منظور ــــــــــ

شاعر کا اپریل ۲۰۰۰ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ ہر لحاظ سے اچھا ہے جب سے شاعر کی کتابت کمپیوٹر پر ہونے لگی ہے، اس کی ظاہری صورت نکھر گئی ہے۔ سر ورق کو مزید دلکش اور دیدہ زیب بنانے کی ضرورت تاہم باقی ہے۔ مشمولات میں نثری حصہ جاندار ہے مگر شعری حصہ میں رطب ویابس دونوں طرح کی کاوشیں موجود ہیں۔ زیادہ دقت نظر کے ساتھ انتخاب کرنا ناگزیر ہے۔ مظہر امام صاحب کی نظم البتہ خیال اور اسلوب دونوں اعتبار سے مجھے بے حد خوبصورت لگی۔

شارق جمال صاحب نے پھر لفظ طمانیت کے صحیح تلفظ اور ہندی الفاظ کے حروف علت کے گرانے کی بحث چھیڑی ہے۔ محض عبارتیں نقل کرنے اور لغات شماری سے یہ بحث طے نہیں ہو سکتی۔ شارق صاحب کا یہ کہنا کہ ان کے شمار کردہ لغات کے سامنے فرہنگ عامرہ، فیروز اللغات اور اسٹینڈرڈ ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (جس کا میں نے حوالہ دیا تھا اور جس میں طمانیت کے ہجے اس طرح کئے گئے ہیں (Tamaniy-yat) کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ جرات بے جا صرف وہی کر سکتے ہیں۔ ہر چند کہ غیاث اللغات کے بغیر میرے پاس باقی سب لغات ہیں تاہم میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو جاننے والوں میں اکثر ان لغات کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے، ان سے استفادہ کرنا تو دور رہا۔ ان لغات کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ یہ الفاظ کا تلفظ نہیں بتاتے اور الفاظ پر اعراب لگا کر اس کا صحیح تلفظ سمجھنے میں معاون ثابت نہیں ہوتے۔ فیروز اللغات اور فرہنگ عامرہ کی خوبی یہ ہے کہ ان میں الفاظ کا تلفظ صاف صاف بتایا گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ فیروز اللغات کا وہ کون سا ایڈیشن ہے جس کے صفحہ نمبر ۶۲۹ پر طمانیت کا تلفظ شارق صاحب کے حسب خواہ کیا گیا ہے۔ میرے پاس جو فیروز اللغات ہے وہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا شائع کردہ ہے اور اس کے صفحہ ۸۸۰ پر طمانیت میں 'ی' پر ایک واضح تشدید موجود ہے۔ اسی طرح لفظ 'صلاحیت' جسے شارق صاحب مفاعلن کے وزن پر رکھنے پر زور دیتے ہیں فیروز اللغات میں یوں لکھا گیا ہے (ص + لا + حی + یت) یعنی بر وزن مفاعیلن۔ اسی طرح شارق صاحب نے ڈاکٹر منظر اعظمی کا حوالہ دیا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب میرے اچھے اور قریبی دوست تھے۔ ان کی میری دوستی کا عرصہ تیس برس رہا۔ مرحوم نہ لسانیات میں کوئی درک رکھتے تھے اور نہ فن شعر کی انہیں کوئی واقفیت تھی۔ وہ قابل احترام ضرور ہیں مگر کسی لحاظ سے قابل تقلید نہیں۔ یہی حال ان بزرگوں کا بھی ہے جن کا حوالہ غیر ضروری طور پر شارق صاحب نے دیا ہے۔ دیکھئے غلط مبحث میں شارق صاحب نے 'طمانیت' میں 'ط' کے بالفتح اور 'ن' کے مکسور ہونے کی بات چھیڑی ہے۔ اس پر کس کم بخت نے دوسری رائے کا اظہار کیا تھا جو انہیں اس کے لئے عبارتوں کی عبارتیں نقل کرنا پڑیں۔ ان کا آدھے سے زیادہ خط تو انہیں غیر ضروری حوالوں کی نذر ہو گیا ہے۔ میں بصد احترام گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ جن لغات کو شارق صاحب نے غیر اہم قرار دیا ہے، وہی لغات ۹۰٪ اردو جاننے والے استعمال کرتے ہیں۔ فیروز اللغات کی اہمیت یہی ہے کہ اس میں ہندی اور اردو کے الفاظ اور محاورے بھی شامل ہیں جب کہ فیروز اللغات عربی فارسی اور ترکی الفاظ کا با تلفظ مخزن ہے۔ میں یا کوئی بھی معقول آدمی کس طرح نور اللغات یا فرہنگ آصفیہ کو عامرہ پر ترجیح دے سکتا ہے، جب کہ ان لغات میں نہ الفاظ پر اعراب موجود ہیں اور نہ ان کے ہجے بتائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ سے واقفیت ہو۔ طمانیت عربی الاصل ہے اور ترجیحی طور پر اس کا تلفظ وہی ہوگا جو عربی میں اسے حاصل ہے۔ کوئی اگر اسے اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کرتا ہے تو اس پر اعتراض محض دل لگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ رہا سوال کہ یہ لفظ 'ی' پر تشدید لگانے سے یہ لفظ ثقیل بن جاتا ہے تو اس بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر منظر اعظمی صاحب زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ صلاحیت، اولیت، المیہ، قوی الجثہ جیسے الفاظ کو لغات سے خارج کیوں نہ کیا جائے کیوں کہ یہ بھی ثقیل الفاظ ہیں۔ ہندی الفاظ کے حروف علت کو بہ ضرورت شعر تقطیع سے خارج کرنا جائز ہے۔ اس سے نہ ابر احسنی گنوری مرحوم اور نہ کسی شوق نیموی صاحب نے اختلاف کیا ہے۔ شرط ذوق سلیم کی عائد کی گئی ہے اور ذوق سلیم کوئی ایسی شئے نہیں جس کے رنگ اور زاویے مختلف کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا جو مجھے پسند ہو ممکن ہے وہ شارق صاحب کو بے ڈھنگا لگے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ میری پسند غلط ہے۔ میں نے اپنے مصرعے پر دوبارہ غور کیا اور مجھے قطعاً یہ نہیں لگا کہ اس میں کوئی جھول ہے۔ کوئی بھی شخص کسی کے شعر کو اپنے انداز سے کہہ سکتا ہے اور بدل سکتا ہے لیکن وہ شاعر کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے شعر [illegible] دے یا بغیر طلب کے مشورہ ارزاں کرے کہ وہ شعر یا مصر[illegible] بدل دے۔ وہ زیادہ سے زیادہ شعر کو ناپسند کر سکتا ہے [illegible] ناپسندیدگی ان کا ذاتی معاملہ ہوگی اس پر رائے شماری میرے نزدیک معقول نہیں۔ اگر اس روش کو اعتبار ملا [illegible] بھی شاعر خود شارق جمال صاحب بھی محفوظ نہیں رہیں [illegible] استاد بننا کوئی بری بات نہیں مگر اس کا دائرہ صرف طالبان [illegible] تک محدود رہنا چاہئے خود کو ٹھونسنے کا رویہ قابل اعتراض [illegible] متذکرہ وجوہ کی بنا پر میں شارق صاحب کے اعتراضات [illegible] اساس پاتا ہوں اور دوبارہ مسترد کرتا ہوں۔

[illegible]0-PRATAP PARK, PRESS ENCLAVE,
[illegible]NAGAR-190001 (J&K)

اقبال حسن آزاد ــــــــــ

جیتندر بلو کی کہانی "اعتراف" بعض اسکالر کے کمینے [illegible] جیتی جاگتی تصویر ہے مگر ایسے کتنے اسکالرز ہوں گے جنہیں [illegible] اس قبیح حرکت پر احساس گناہ نہ ہوتا ہو۔ کہانی فنی اعتبا[illegible] بھی بہت کامیاب ہے۔ کہانی کار نے انگریزی ہندی او[illegible] زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ کے سلسلے میں بہتر (Better) (Widow) کی مثالیں دی ہیں۔ وہ اگر اس طرح کی دو چار [illegible] اور دے دیتے تو کہانی میں زیادہ رچاؤ پیدا ہو جاتا مثلاً (Brother) مادر (mother) پدر (Father) [illegible] تاریخی اور نسلی تعلقات کے لحاظ سے دنیا کی تمام زبانوں [illegible] بڑے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) سامی ([illegible] چینی (۳) ڈراویڈی (۴) مونٹرا (۵) افریقہ کی بانتو (۶) [illegible] (۷) ملایا (۸) ہند یوروپی۔ ہند یوروپی خاندان السنہ ان میں سب سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں اکثر ایسی زبانیں داخل [illegible] اپنے ادبی اور علمی ذخیروں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے [illegible] زبانیں کہلائی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کی اہم خصوصیت یہ [illegible] ان کے اجزا ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل جاتے [illegible] اس میں اس قدر تبدیلی آتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایک [illegible] کئی معنوں میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ اردو، ہندی، انگریز[illegible] فارسی وغیرہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے [illegible] زبانوں کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں [illegible] یوروپی زبانوں کو بھی آٹھ خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے [illegible] میں سے ایک ہند ایرانی یا ہند آریائی ہے۔

جیتندر بلو کی مذکورہ کہانی ایک مخصوص ہمواری [illegible] ساتھ آگے بڑھتی نظر آتی ہے مگر جہاں پر ڈائری [illegible] جانے کا واقعہ درج ہے وہاں تجسس ختم ہو جاتا ہے اور کہا[illegible]

ہی کھونے لگتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس رفتہ پر سے بالکل آخر پردہ ہٹایا جاتا کہ آخر وہ ریسرچ اسکالر اپنے گناہ کا اعتراف ناچاہتا ہے۔ اس طرح کہانی زیادہ دلچسپ اور یادگار ہو جاتی۔ شید ملک کی کہانی "کپل بر لیس سوٹ" اپنے شگفتہ انداز بیان وجہ سے یاد رکھی جائے گی یوں بھی جس کہانی میں جنس کی نی ہوتی ہے وہ نہ صرف بہت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی بلکہ قارئین کے ذہن میں اپنی ایک جگہ بھی بنا لیتی ہے۔ ایک دو جگہ کہانی کار کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش آتی ہے مثال کے طور پر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "معاشرے کسی لڑکی کا اچھوتا رہ جانا محال ہے۔ اگر پچیس سالہ غیر شادی لڑکی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کنواری ہے تو فوراً سمجھ لیجئے تو وہ سفید جھوٹ بول رہی ہے یا پھر اس کے بدن میں کوئی وئی نقص ضرور ہے۔" پتہ نہیں خورشید ملک کس شرے کی بات کر رہے ہیں۔ اگر ان کا اشارہ مسلم متوسط طبقے جانب ہے (جیسا کہ اس کہانی کے پس منظر سے ظاہر ہوتا) تو وہ سراسر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ابھی ہمارا متوسط طبقہ لعنت سے کافی حد تک محفوظ ہے۔ کچھ ایسا ہی بیان آج سے بھگ بیس پچیس سال قبل فلم اداکارہ پروین بابی نے دیا تھا پر کافی واویلا مچا تھا۔ خیر وہ تو فلم ہیروئن تھی اور اعلیٰ طبقے کی ردہ تھی اس لئے اس کی بات قابل معافی ہے کہ اس نے ویسا ماحول دیکھا اور پایا تھا مگر ایک کہانی کار کو چند ایک مثالوں کو منے رکھ کر پورے معاشرے پر کیچڑ اچھالنا زیب نہیں دیتا۔

کہانی میں ایک جگہ یہ شعر رقم کیا گیا ہے ؎

وصل تو ممکن ہوا مگر یہ مشکل ہو گئی
اس بت کافر کو شوق روز مرہ ہو گیا

اس شعر میں مصرع اولیٰ خارج از بحر ہے۔ اصل شعر یوں اچاہئے ؎

وصل تو ممکن ہوا لیکن مشکل ہو گئی
اس بت کافر کو شوق روز مرہ ہو گیا

اس کہانی کا انجام بھی بڑا غیر فطری اور پھسپھسا ہے۔ کوئی ت اپنے شوہر کی جنسی لغزشوں کو برداشت نہیں کر سکتی ئے اس صورت میں جب کہ وہ خود بھی جنسی بے راہ روی کا رہو اور پھر ایک عیاش شخص کو گوتم بدھ سے نسبت دینا ن کی دانائی ہے۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود کہانی اپنے صورت رواں دواں اسلوب کی وجہ سے پسند آئی۔ رفیع حیدر کی کہانی "بارش کے بعد" پڑھ کر بے ساختہ پریم چند کی نی "گلی ڈنڈا" کی یاد تازہ ہو گئی۔ دونوں کہانیوں کا پلاٹ تقریباً مل ہے (اور یہ کوئی قابل گرفت بات نہیں) اس فرق کے ساتھ کہ پریم چند کی کہانی میں ایک ایسی سادگی پائی جاتی ہے جو صرف پریم چند سے مخصوص ہے، جب کہ 'بارش کے بعد' اپنے خوبصورت اسلوب اور تازگی بیان کی وجہ سے منفرد ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں پر کہانی کا انداز شاعرانہ ہو گیا ہے جس سے کہانی میں ایک دلنشیں نزاکت اور لوچ پیدا ہو گیا ہے۔ بعض مقامات پر ستارہ جیسے جملے کہانی کی چمک میں اور اضافہ کرتے ہیں مثلاً

(۱) "تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اسی شہر کی سڑکوں، بازاروں اور کوچوں میں ہم نے مل کر کچھ عرصہ بے روزگاری کے کنکر بھی چنے تھے۔" (۲) وہ لوگوں کے لئے نظر کے چشمے درست کرتا ہے، فریم اور لینس لگاتا ہے لیکن اس کے وجود پر اب تک ایسی کوئی نظر التفات نہیں پڑی جو اس کی زندگی کا رخ موڑ سکے"۔ کہانی مجموعی طور پر پسند آئی۔ امین بنجارہ کی "قیامت" ہر لحاظ سے ایک کمزور کہانی ہے۔ کہانی کی ابتداء بڑے ہی لچر انداز میں ہوتی ہے۔ چند بے تکے مکالموں سے کہانی کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر ان مکالموں کی تکرار اس فرق کے ساتھ ..... صرف ایک ماہ بعد ...... صرف پندرہ دن بعد ...... صرف نو دن بعد ...... صرف ایک دن بعد۔ مزید ناگوار گذرتی ہے۔ اس کہانی کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کا کلائمکس درمیان ہی میں روشن ہو جاتا ہے۔ جہاں پر کہانی کار یہ کہتا ہے کہ "جس وقت زبیدہ کی دوسری شادی ہوئی تھی اس وقت شہلا نو برس کی تھی ... شوخ چنچل، ڈال ڈال اتراتی پھرتی ایک خوش رنگ تتلی۔" اور پھر جب کہانی آگے بڑھتی ہے تو شہلا کا یہ کہنا "سر آفتاب سوا نیزے پر ہے (کہ آفتاب اس کے سوتیلے باپ کا نام ہے) قاری کو کہانی کے انجام سے آگاہ کر دیتا ہے اور جس کہانی کا انجام کہانی کے ختم ہونے سے پہلے معلوم ہو جاتا ہے وہ اس Charactor Less لڑکی کی طرح ہے جو شادی سے قبل ہی نامناسب کچھ لٹا دیتی ہے۔

● SHAH COLONY, SHAAH ZUBAIR ROAD, MONGIR - 811 201 (BIHAR
)

امّ سلمیٰ

عطیہ خان نے (شاعر اپریل ۲۰۰۰ء) خواتین قلم کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی جو وجوہ پیش کی ہیں وہ اپنی جگہ درست ہیں یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا جو موقع ملا اس نے ان کی تربیت بھی کی اور انہیں اظہار کا سلیقہ بھی عطا کیا لیکن میں ذکاء الدین شایاں کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ خواتین قلم کار حشرات الارض کی طرح اچانک نمودار ہوئی ہیں۔ مجھے بتایئے کہ آج کل جتنی خواتین قلم کار اخبارات و رسائل کے صفحات پر نظر آتی ہیں یا مشاعروں میں جلوہ گر ہوتی ہیں ان میں سے کتنی اور جعلی ہیں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ذمہ دار ادارے بھی ان جعلی کاروں کی پوری سرپرستی کرتے ہیں۔ شاعرات کے مشاعر میں گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے والی شاعرات کی کیا ضرورت ہے؟ واقعی شاعرات ہیں؟ یا قوالائیں ہیں۔؟ اگر قوالی سننے کا اتنا شوق ہے تو قوالی کی الگ محفل جمایئے۔ افسوس اس بات کا کہ شاعرات کے مشاعرے میں اردو کی اس تہذیب کا کو احساس تک نہیں ہوتا جو اردو کی پہچان ہے۔ اور تو اور ا اکیڈمیاں بھی اس طرح کی غلاظت بکھیرنے میں بھرپور تعا کر رہی ہیں۔ شاعرات کے مشاعرے کے نام پر ان کی جیب بھری جا رہی ہیں جو سیدھے راستے آکر اکاڈمی سے خیرا وصول نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ اشعار کی پرچی جیب میں اپنی اپنی شاگرد قوالہ کے آگے پیچھے تین تال کا ٹھیکہ دینے خاطر مشاعرے میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ اپنے ساتھ دینے والوں کی ایک ٹولی بھی رکھتے ہیں جو موقع موقع سے کسی اٹھانے اور کسی کو گرانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ ادارے مشاعرے کی ٹکٹیں فروخت کر کے روپے کماتے اس لئے ان کا مشاعروں کے تئیں مصالحانہ رویہ سمجھ میں ہے لیکن سرکاری اداروں کی کیا مجبوریاں ہیں؟ وہ مخصوص ا ذوق سامعین کے لئے ایک مختصر سی محفل منعقد کریں تا اپنے پروگرام کی مقبولیت کے لئے ایسی شعبدہ بازیاں نہ کریں کیا احمقوں سے ہال کا کھچا کھچ بھرا رہنا اردو سامعین کی خوش ذو ضامن ہے؟ رسائل میں قلم کار خواتین ہر صنف سخن پر آزمائی کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک دلچسپ وجہ ہمارے ایک کرم فرما نے یہ بتائی کہ اگر دوہے یا ماہیے یا ترو کی تاریخ لکھی جائے گی تو کم از کم اس میں ذکر تو ہو گا ورنہ غز گویوں اور نظم نگاروں کی بھیڑ میں تو اچھی اچھی آوازیں ہو جاتی ہیں۔ بزرگ اساتذہ اپنی آخرت کا سامان کرنے کوشش میں مبتدیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ شاید پر چراغ جلانے والا کوئی پیدا ہو جائے۔ جعلی فن کاروں کی بڑ ہوئی تعداد کے ذمہ دار ہمارے وہ سنجیدہ نقاد بھی ہیں جنہوں نسائی ادب کو کبھی قابل توجہ نہ سمجھا۔ اگر انہوں نے مناسب موقع پر صحیح گرفت کی ہوتی تو آج نسائی ادب کے نام پر یہ کرکٹ جمع نہ ہوا ہوتا اور عورتیں حشرات الارض کی طرح نمودار نہ ہوئی ہوتیں۔ اردو کے کسی بڑے نقاد کے سامنے کہیے تو منہ بچکا کر کہے گا۔ "عورتوں کو اپنا نقاد خود پیدا کرنا چاہئے ہمیں کیا پڑی ہے۔"

KOL BANDAR ROAD, RANI GANJ
(W.B.)

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

پانی پت (طویل نظم)

رفعت سروش

"پانی پت" مشہور شاعر رفعت سروش کی ایک طویل نظم ہے۔ اردو میں طویل نظمیں لکھنے کا رجحان کم ہے کیوں کہ یہ ایک صبر آزما عمل ہے۔ اس میں کافی وقت بھی لگتا ہے اور محنت بھی درکار ہوتی ہے۔ رفعت سروش آل انڈیا ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے وقت کا صحیح استعمال کر رہے ہیں اور شاعری اور تصنیف و تحقیق میں مصروف ہیں۔ اب تک ان کی کوئی بائیس چوبیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مختلف اصناف سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں نظمیں، نغمے، منظوم ڈرامے، بیلے ڈانس ڈرامے، خود نوشت، ناول سفر نامہ، ڈرامے اور افسانے شامل ہیں۔ اس سے ان کے ہمہ جہت ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک اضافہ انہوں نے اس طویل نظم بہ عنوان "پانی پت" سے کیا ہے۔

"پانی پت میں رفعت سروش نے پانی پت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تینوں مشہور جنگوں کے احوال ضرور پیش کئے ہیں لیکن بقول ڈاکٹر خلیق انجم، جیسا کہ انہوں نے اس کے دیباچے میں اپنی ذہین رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:"...... انہوں نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے، مضمون نہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو شاعر ہی رہنے دیا ہے، مورخ بننے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر حقائق پر مبنی یہ ایک ہلکی پھلکی نظم یا منظوم تاریخ ہو کر رہ جاتی ....."

یہ طویل نظم رزمیہ ہونے کے ساتھ ساتھ چند عالمی اور زیادہ تر ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کو بڑی فنی نزاکت سے اپنے دائرے میں سمیٹ لیتی ہے۔ وقت کے ناقابل گرفت بہاؤ، تاریخ کے جبر اور انسان کی تخریب کاری کے متن کے ذریعے سے مستقل عالمی امن، ہندوستان میں قومی یکجہتی، اور دنیا بھر میں اخوت اور باہمی محبت اور عزت کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ اس وسیع کینوس کی طویل نظم کے سیاق و سباق کے علاوہ شعری محاسن کے لئے بھی رفعت سروش کی یہ کاوش اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

ضخامت: ۱۴۳ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ☆ ناشر: نورنگ کتاب گھر ۱۷-۸۰، سیکٹر ۲۷ نوئیڈا-۲۰۱۳۰۱ (یوپی) ☆

مبصر: محافظ حیدر

مثنوی باغباں و گل فروش (شاعری)

قاضی سلیم

مثنوی باغباں و گل فروش قاضی سلیم جیسے معتبر اور نمائندہ جدید شاعر کی، ایک قدیم کلاسیکی طرز پر کہی ہوئی، "جدید" مثنوی ہے۔ اس مثنوی کو موضوع اور اپروچ کی جدت اور مثنوی کی روایتی لفظیات و لوازمات کی امتزاج نے بہت ہی خوب سیرت اور منفرد بنا دیا ہے۔

اس مختصر مرقع شعر کا موضوع ہے: اردو ادب کی موجودہ صورت حال، بعض بزعم خویش ارباب اقتدار ادب اور اس قبیل کے بعض اداروں کی اجارہ داری اور ان کے ساتھ خود ادیبوں اور شاعروں کی ساز باز اور خوشامدانہ رویہ۔ شہرت و انعام کی خاطر ادباء و شعراکی سستی سمجھوتے بازیاں، منفی رویے، تعلقاتی سیاستیں، مفادات کے تبادلے اور ان تمام عوامل کے تناظر میں ادب کے ارباب اختیار اور ناقدین کرام کا شوق حکمرانی۔ ان تمام علائق کو طنز کی مکمل گرفت اور فنی برتاؤ کی چابکدستی کے ساتھ اس مثنوی میں نظم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مختلف ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

ناقدانِ ارجمند — توڑ شب خوں کی کمند
ہو گئے خود قلعہ بند — تا نہ پہنچے کچھ گزند

اھبِ شعر و ادب — چھوڑ کر راہِ طلب
آ گیا ہے راہ پر — آپ سے ہے بہرہ ور
پونچھ کا ہر زاویہ — آپ نے بتلا دیا
دھائی گھر کی چال سے — طے ہوئے سب مرحلے

جن کو لینا ہے ایوارڈ — جن کو کرنا ہے فراڈ
آئیں منت مانگنے — اپنی عرضی ٹانگنے

یہ مثنوی تخاطب کے پیرائے میں ہے۔ اس لئے یقیناً اس کا کوئی براہ راست مخاطب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن "روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" کے تحفظات بہر حال قاضی سلیم نے قائم رکھے ہیں۔ اور کتاب کے پیش لفظ میں وضاحت بھی کر دی ہے کہ۔ "بلا توضیح اسما کرم فرمایان من، بغیر انسلاک حاشیہ جات در ذکر اشغال و اعمال و افعال نقاداں"۔

مثنوی کو قدیم صنف سخن کی مناسبت سے اس کتاب کا گیٹ اپ، سرورق، زردی مائل کاغذ اور صفحات پر منقش جدول، بالکل اردو شاعری کے پرانے نسخوں کے مانند ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پیش لفظ بھی مقفیٰ اور مسجع نثر میں لکھا گیا ہے اور آخر میں اس مثنوی کے معرض تخلیق میں آنے کی ہجری و عیسوی تاریخیں بھی منظوم کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب یقیناً قارئین کی توجہ اور دلچسپی کا باعث ہو گی۔ "قیمت اس گنجینۂ معانی کی پانچ روپے سکہ رائج الوقت قرار پائی ہے۔"

ضخامت: ۳۲ صفحات ☆ قیمت: پانچ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: قاضی سلیم (سابق ایم پی) نیو عثمانیہ کالونی، اسٹیشن روڈ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

مبصر: عبد الاحد ساز

تعبیر (افسانے)

معین الدین جینا بڑے

ویسے تو نئے افسانہ نگار ابھرتے رہے ہیں لیکن ان اپنی خلاقیت کا لوہا منوانے والے چند ہی ہوتے ہیں جو اپنی اور مقبول ہونے والی افسانہ نگاری کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار معین الدین جینا بڑے ہیں جو یونیورسٹی کے اردو کے استاد ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے "تعبیر"۔

"حرف آغاز کے عنوان سے اپنے دیباچے میں فن کے تئیں اپنے رویے کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:"میرے زندگی اور فن کے خانے الگ الگ نہیں۔ میری افتادِ طبع کسی ثنویت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک زندگی کا چہرہ ہے اور زندگی کہانی کی روح۔ باطن اور ظاہر کے مابین پایا جانے والا پر اسرار رشتہ، فن کے قالب ڈھل کر مجھے اپنے وجود کے دونوں سروں کا احاطہ کرنے کے قابل بناتا ہے......" اس کے علاوہ ایک پتے کی بات انہوں نے کہی ہے:"واقعہ ہر شخص بیان کر سکتا ہے، ہر شخص کہانی نہیں سنا سکتا۔ سانس ہر شخص لیتا ہے، ہر شخص زندگی نہیں جیتا۔ سانس لینا تو خیر کوئی بات ہی نہیں، جیون جینا البتہ فن کاری ہے۔" ان دونوں قابل غور بیانات کے پیش نظر ان

افسانے پڑھے جائیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہوائی دعوے نہیں ہیں بلکہ معین الدین جینابڑے نے ان کا عملی مظاہرہ اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات تنوع لئے ہوئے ہیں۔ "رنگ ماسٹر" ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ "بکیت گھات اور گرجا گھر" علامتی رنگ لئے ہوئے ہے۔ "ناستک" ایقان اور اعتقاد میں تذبذب اور تذبذب کی مذمت کرتا ہے۔ "تعبیر" میں مذہب کی سیاست گری پیش کی گئی ہے تو "برسورام وعزاکے سے" میں سیاست سے لپٹ کر مذہب کے اپنے محور سے گریز کرنے کی تصویر کشی ہے۔ سبھی افسانوں میں پلاٹ کی ماہرانہ صنعت گری سے کام لیا گیا ہے۔ ان افسانوں سے معین الدین جینابڑے کی صلاحیت اور قابلیت کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ گٹ اپ اعلیٰ معیار کا ہے۔

ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، سامنے بلڈنگ، ۲ نانابھائی لین، فلورا فاؤنٹین، ممبئی-۱

مبصر: محافظ حیدر

آب (شاعری)

منظور ہاشمی

منظور ہاشمی کا پہلا شعری مجموعہ بارش ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا تقریباً تیرہ برس بعد ان کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ ماندگاں کا یہ وقفہ ظاہر کرتا ہے کہ منظور ہاشمی ٹھہر ٹھہر کر شعر کہتے ہیں اور شائع کرنے میں صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ منظور ہاشمی کا یہ مجموعہ دس قطعات سے قطع نظر غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جو تخلیقی تنوعات جلوہ گر ہیں وہ احساس و جذبے کی تطہیر کی دین ہے۔ کسی بھی شاعر کی انفرادیت اصل میں زبان کے تخلیقی استعمال میں مضمر ہوتی ہے اور زبان کے تخلیقی استعمال کی سراغ رسانی الفاظ کے انتخاب و انسلاک سے ہوتی ہے۔ منظور ہاشمی نے معاصر شعری محاورے میں سے ناآسودگی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ انتخاب ان کے اس احساس کا عطیہ ہے جسے اسلوب احمد انصاری نے کتاب کے پیش لفظ میں "ندرت احساس" کا نام دیا ہے۔ منظور نے احساس کے اظہار میں ایک طرف خود ضبطی سے کام لیا ہے تو دوسری طرف غیر ضروری اہتمام و انصرام سے بھی اجتناب کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اپنے اسلوب میں کھردراپن آنے دیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کھردرے پن کو کھرے پن سے مظہر کیا ہے اس لئے انہوں نے ودیعت ہوئی زبان سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس کی ترتیب میں تبدیلی کی ہے۔ انسلاک کی تبدیلی کئی بار ان کے یہاں صوفیانہ شان پیدا کردیتی ہے لیکن عصری محاورہ ان کے ہاتھ سے نہیں نکلتا۔

کبھی کبھی تو وہ اتنی رسائی دیتا ہے
کہ سوچتا ہوں تو مجھ کو سنائی دیتا ہے

ان پر روایت شکنی کا الزام تو لگایا جا سکتا ہے، جو ہر اچھے شاعر کی شناخت ہے، لیکن ان پر ناتراشیدگی یا بے راہ روی کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ ان کا انحراف اوحائیت سے عبارت نہیں۔ ان کے یہاں غزل کی مخصوص رومانیت بھی ہے لیکن ہم عصر یا پیش رو شعراء سے بچتی ہوئی۔

سب رنگ ہیں تجھ سے ملتے جلتے
موسم بھی تری پہچان ہو گیا ہے

منظور انسان کی مطلق العنانی سے بخوبی واقف ہیں اس لئے وہ اپنی محرومی کو بھی شکر کے مقام تک لے جاتے ہیں۔

بھلا ہوا کہ مری ہر دعا قبول نہ کی
وگرنہ میں تو زمانے کو خاک کر دیتا

منظور ہاشمی کا یہ مجموعہ پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں غزل کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں ان کا نام بھی لکھا جائے گا۔

ضخامت: ۱۱۹ صفحات ☆ قیمت: ۴۰ روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۴ء ☆ ناشر: دائرے پبلی کیشنز، علی گڈھ ☆ پتہ: A-1 انذیر احمد روڈ، اے ایم یو، علی گڈھ (یو پی)

مبصر: شین کاف نظام

فصل آگہی (شاعری)

سلیم انصاری

سلیم انصاری کے شعری مجموعے "فصل آگہی" کا ادبی حلقوں میں استقبال کیا گیا ہے۔ کئی فن کاروں کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہے کہ رسائل و جرائد میں شائع شدہ ان کی تخلیقات سے ان کا جو ادبی نقشہ تیار ہوا تھا۔ وہ ان کے مجموعے کی اشاعت کے بعد دھندلا گیا۔ سلیم انصاری کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجموعہ "فصل آگہی" سے ان کا ادبی قد کچھ اور بلند ہوا ہے۔ کتاب کی تقریظ ڈاکٹر خالد محمود نے لکھی ہے۔ اپنی مختصر تحریر میں انہوں نے سلیم کے لہجے کی انفرادیت اور ان کی عصری حسیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عشرت ظفر نے "فصل آگہی - ایک تخلیقی تجربہ" کے عنوان سے سلیم کے تخلیقی تنوع کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اس تخلیقی مزاج کا تجزیہ کیا ہے جو بلاشبہ استثنائے ہیئت ان کے فن میں Wholeness پیدا کرتا ہے۔ عبدالحئی انجم نے فن کار کے درون و بیرون کے انطباق اور ڈاکٹر محمود شیخ نے سلیم کے رچاؤ اور گداز نیز انفرادیت کے کئی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ احمد ہمیش نے کہیں نہ کہیں سے سلیم انصاری کی تخلیق کی Transparency کی بات کہی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو سلیم کے فکر و فن کی تفہیم کے کئی اہم گوشے سامنے آچکے ہیں۔ سلیم انصاری ایک جینوئن فنکار ہیں۔ وہ اپنے معاصرین میں بہتوں سے بہتر کہہ رہے ہیں۔ ان کے پاس اردو شاعری کے روایتی تیور کا مطالعہ بھی ہے اور ایک ایسا تخلیقی Urge بھی جو انفرادیت اور ندرت پیدا کرتا ہے۔ ان کا فکری رویہ ایک عمودی سفر کا علامیہ ہے۔ اس سفر کی تشریح و تعبیر کئی اندازسے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کی شاعری میں ماورائے مادہ ایک خلائی سفر کا احساس ہوتا ہے جہاں ایک Thiner World کی تلاش جاری رہتی ہے۔ طبیعیاتی نظام سے اوپر اٹھنے کی یہ خفیف سی کوشش سلیم انصاری کے کلام میں کئی انفرادی رنگ پیدا کردیتی ہے۔ ان کی متعدد نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار اسی محرک کی پیداوار ہیں۔ انحراف سفر / سفر لامسمیت کا / سفر۔ خدشات کا / منظر واپسی / ایک نظم / موسم ہجر کی پہلی نظم / تیاگ / روشنی قہقہہ / وغیرہ سفر مدام سفر کا احساس دلاتی ہیں۔ اس طرح غزلوں کے اشعار بھی اسی تصور و احساس کے ضامن ہیں۔

سلیم انصاری کا تخلیقی اختصاص ان کے مخصوص فکری رویے، مشاہدے کی ندرت، درون ذات کی نیم گویا آواز، اظہار کی ایک خلیج کو جو قاری سے جست خیال کی متقاضی ہے۔ نفی سے اثبات کی تراوش، ایک بے نام افتاد، کرب اور زندگی کی یکسانیت سے عبارت ہے۔ نظم سلیم انصاری کے ہاتھوں سے پھیل جاتی ہے۔ وہ مستقبل میں اپنی غزلوں سے پہچانے جائیں گے۔

ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے مطبوعہ: ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: ۵۵۱ - موتی نالہ، مرزا غالب روڈ جبل پور (ایم، پی)

مبصر: [illegible]

سفر آمادہ (شاعری)

شاعر: مصطفیٰ شہاب ☆ ضخامت: ۹۸ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: نومبر ۹۹ء ☆ پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوان اردو، پنجہ گٹہ، حیدر آباد ۵۰۰۰۸۲ ☆
14-THE GARDENS PINNER,
MIDDLESEX 11A5 5DW (U.K.)

علی جواد زیدی۔حیات شخصیت اور فن

مصنف: ڈاکٹر شیخ عبد الرحمٰن انصاری ☆ ضخامت: ۳۰۰ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: 16-1-24/B/C/10 فرح کالونی، سعید آباد، حیدر آباد ۵۰۰۰۵۹

مولانا محمد انوار اللہ فاروقی

(شخصیت، علمی وادبی کارنامے)

مصنف: ڈاکٹر کے محمد عبد الحمید اکبر ☆ ضخامت: ۳۳۵ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ر روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ خواجہ کالونی، گلبرگہ (کرناٹک)

پیڑ (ماحولیاتی کتاب، بچوں کے لئے)

مترجم: ظل ہما ☆ ضخامت: ۲۶ صفحات (جہازی سائز) قیمت: ۳۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، اے۔۵ گرین پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

کھیل کھلوت

(۲۹ کہاوتیں، معنی، استعمال، باتصویر، بچوں کے لئے)

مصنف: خالد سعید ☆ ضخامت: ۲۸ صفحات (جہازی سائز) ☆ قیمت: ۳۵ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: پیش رفت پبلی کیشنز، مسلم چوک گلبرگہ (کرناٹک)

قلم گوید (شاعری)

شاعر: یعقوب یاور ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: شعبۂ اردو وسنت کالج برائے خواتین، راج گھاٹ فورٹ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱ (یوپی)

ورق ورق اضطراب لکھوں

(رسالہ گلبن کے اداریے)

اداریہ نگار: سیّد ظفر ہاشمی ☆ مرتب: رشید افروز ☆ ضخامت: ۲۲۳ صفحات ☆ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ رشید افروز۔ A/5-6، امین سوسائٹی، باغ فشلا، سرکھیج روڈ، احمد آباد ۳۸۰۰۵۵ (گجرات)

دلت کتھا (دلت مراٹھی کہانیاں)

مترجم: وقار قادری ☆ ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: مئی ۲۰۰۰ء ☆ ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز سامنے بلڈنگ، فلورا فاؤنٹین، ممبئی-۱ ☆ وقار قادری ۹۔۹-جوے بیلے، تیسرا منزلہ، موری روڈ ماہم ممبئی ۴۰۰۰۱۶

متاع خودی (شاعری)

شاعر: شکیل نبی نگری (مرحوم) ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۴۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ ☆ پتہ: عشرت بنی نگری ۱/۱/۵۲، قاضی پاڑہ لین بی گارڈن، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۳

شعر سخن (شاعری)

فن کار: رشید شیخ ☆ ضخامت: ۲۰۳ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ر روپے ☆ ۱۰ امریکی ڈالر ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ:
RASHEED SHAIKH 4550 -N.
CLARENDO AVE., APARTMENT 1201-5,
IL 60640 (U.S.A)

عرضانہ (مذہبی شاعری)

شاعر: قاضی فراز احمد ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ستمبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: پوسٹ مقام ساکوے، تعلقہ راجہ پور، ضلع رتناگری ۴۱۶۷۰۹ (مہاراشٹر)

غزلوں کے شہر میں

(۱۹۵ قدیم و جدید شعرا کا انتخاب، ہندی رسم الخط میں)

مرتبین: نشتر خانقاہی، ڈاکٹر گری راج شرن اگروال، جلیس نجیب آبادی، سردار آصف ☆ ضخامت: ۲۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ہندی ساہتیہ نکیتن، ۱۶ ساہتیہ وہار، بجنور (یوپی)

لہریں لیتی پیاس (شاعری)

شاعر: شہاب صفدر ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ر روپے ☆ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: غلام محمد قاصر ادبی فورم، صابر کتاب گھر، عمر بازار، ڈیرہ اسماعیل خان (پاکستان)

کڑوے موسموں کی زد پر (شاعری)

شاعرہ: نجمہ عثمان ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۷۵ر روپے ☆ سات پاؤنڈ ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ:
57-ROSEDALE ROAD, EPSON
SURREY, K717 2JH (U.K.)

لفظ بہ لفظ (شاعری)

شاعر: شاد عباسی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: زرنگار کمپیوٹر کمپوزنگ سینٹر، باگڑ بلی ساتی باغ، مدن پورہ، بنارس (یوپی)

ایش ٹرے (شاعری)

فنکار: شکیل اعظمی ☆ ضخامت: ۲۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۵/۱۸۰۸، ہند اسٹورس، مین روڈ، سید پورہ، سورت ۳۹۵۰۰۳ (گجرات)

ورق انتخاب (شاعری)

شاعر: ڈاکٹر علی احمد جلیلی ☆ ضخامت: ۱۲۲ صفحات ☆ قیمت: ۲۵ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدر آباد (اے پی)

حلقۂ ارباب ذوق اور اردو نظم (تحقیق)

تحقیق کار: زرینہ زرین ☆ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: محمد نور الہدیٰ، ۰ اے، آغا مہدی اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

علمی و ادبی رسالے

جامعہ (ابو الکلام آزاد نمبر- جلد دوم)

مدیر: شمیم حنفی ☆ نائب مدیر: سہیل احمد فاروقی ☆ ضخامت ۳۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ر روپے ☆ مطبوعہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

ہندوستانی تناظر (فنون لطیفہ)

ایڈیٹر: بھارت بھوشن، مادھوری گپتا ☆ ضخامت ۴ صفحات (جہازی سائز) ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ اپریل ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ایڈیٹر: انڈیا پرسپیکٹوز، 149-A اے ونگ شاستری بھون نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اردو دنیا (ماہنامہ ادبی خبر نامہ)

چیف ایڈیٹر: ارشاد ہاشمی ☆ ایڈیٹر: جاوید خان ☆ ضخامت ۱۶ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: مئی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ:
ROEMER STR. 65-65414,
RECHTINS HAUSAN, GERMANY

عہد نامہ (سہ ماہی۔ فیاض رفعت نمبر)

مدیر اعلیٰ: قمر معتبر ☆ ترتیب: سرو ساجد ☆ ضخامت ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۲۵ر روپے ☆ مطبوعہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۳۶، ایچ پی او، رانچی ۸۳۴۰۰۱

آواز (اردو انگریزی سہ ماہی)

مدیر منتظم: بی۔ سی۔ لوئڈ ☆ مدیرہ اعلیٰ: خانم تسنیم علی ☆ ضخامت: ۲۰ صفحات ☆ قیمت: ۵۰ ڈالر (سالانہ) ☆ مطبوعہ: سرما/ بہار ۲۰۰۰ء ☆ پتہ:
JADID URDU TEHRIK, 59-JOHN
STREET 9TH FLOOR, NEW YORK, NY
10038-8376 (U.S.A.)

بانی
علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۱واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۷۱
شمارہ — ۹

فون: 3829904

ستمبر ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	**معاونین سے**
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکرِ امروز

صاحبو! زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ مجازی جذباتِ وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہئے۔ ہم شاعر ہیں، ہمیں فطرت کے الہام کدے سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہئے۔ ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہئے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے اور جو ہمارے لئے، ہمارے ملک کے لئے اور فرزندانِ وطن کے مستقبل کے لئے ایک ابدی پیام بن سکے۔ (۲۹ر نومبر ۱۹۳۰ء کے ایک خط سے اقتباس۔ کلیم عجم۔ ص ۳۸)

سیماب اکبرآبادی

اردو زبان و ادب کی تفہیم کے لئے نا گزیر

فرہنگِ ادبیات

مؤلف : سلیم شہزاد

لسانی و ادبی اصطلاحات کے اس توضیحی و تنقیدی مطالعے میں شامل اندراجات

(۱) تکنیکی اصطلاحات: اصول سہ گانہ، تقطیع، زحافات، وزن و بحر اور صنائع بدائع وغیرہ

(۲) صنفی اصطلاحات: غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ نظم، افسانہ، انشائیہ، ڈراما اور ناول وغیرہ۔

(۳) لسانی اصطلاحات: اسم، فعل حرف، صفت، ضمیر، صوتیہ، صرفیہ، صوتیات، صرفیات اور لسانیات وغیرہ۔

(۴) فلسفیانہ اصطلاحات: اثباتیت، افلاطونیت، وجودیت، تاثریت اور مظہریت وغیرہ۔

(۵) سماجیاتی اصطلاحات: اشتراکیت، جمہوریت، جاگیردارانہ نظام، سرمایہ داری اور سماجیات وغیرہ۔

(۶) فنی اصطلاحات: اظہاریت، پیکریت، گردابیت، مکعبیت، آہنگ اور الیکٹرک آرٹ وغیرہ۔

(۷) علمی اصطلاحات: اخلاقیات، بشریات، تاریخ، سیاست، مذہب اور نشاۃ الثانیہ وغیرہ۔

(۸) تحریکی اصطلاحات: دادائیت، ماورائیت، جدیدیت، لغویت، لا تشکیل، مابعد جدیدیت اور ہیئت پسندی وغیرہ۔

(۹) اقوال اور تصورات پر مبنی اصطلاحات: اخفائے فن ہی فن ہے۔ شعر چیزے دیگر است اور ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا وغیرہ

(۱۰) متفرق اصطلاحات: بحران، بیت شاعر، ٹوٹم ازم، زین اور ہولوگراف وغیرہ۔

تمام اصطلاحات کی تعریفات ، ان کی وضاحتیں اور مثالیں اس فرہنگ کے علمی وقار کو بڑھاتی ہیں .

ادب کے طلبا، مدرسین اور باذوق قارئین کے لئے "فرہنگ ادبیات" ایک گراں قدر عطیہ اور تاریخ ادب اردو میں ایک اہم کارنامہ ہے

کمپیوٹر کمپوزنگ اور آفسیٹ طباعت میں منظر عام پر

ضخامت---۶۸۷ صفحات

قیمت: صرف پانچ سو روپے ☆ ۱۰۰ ریال ☆ ۵۰ ڈالر

(چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر مؤلف کے نام بھیجے جائیں)

کتب فروش ایجنسیوں کو خصوصی رعایت

رابطہ منظر نما ۳۲۳ منگلوار وارڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ مہاراشٹر

سرورق تصویر

سردار جعفری

مکتوبات

حمید الماس	امیر حمزہ ثاقب	ساقی فاروقی
مقصود الٰہی شیخ	بانو ارشد	صابر عظیم آبادی
سید محمد عقیل	اندر پرتاپ نیر	اختر یوسف
معین الدین عثمانی		عطیہ خان

۴۲

شمارہ ۔ ۹ [ستمبر ۲۰۰۰ء] جلد ۔ ۷۱

گفتگو بند نہ ہو

اس وقت پوری اردو دنیا ایک سانحہ عظیم کو اپنے روز و شب میں مختلف سطحوں پر جی رہی ہے۔ آہ! سانحہ سردار جعفری، یکم اگست صبح پونے ۸ بجے بمبئی کے مشہور ممبئی ہسپتال میں اپنے کو دنیا سے منقطع کر لیا۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش سانحہ جو کچھ دنوں بعد ادبی واقعہ بن جائے گا۔ بیسویں صدی کی ایک دانشور شخصیت جو نصابوں، کتابوں، رسالوں، تحریروں، تقریروں اور ہندوستان کے ثقافتی حوالوں میں ہمیشہ روشن رہے گی۔ ہمہ صفات اور ہمہ جہات۔ ایک ایسا ادبی قد جس کی فی الحال ان کے ہم عصروں میں کوئی دوسری مثال نہیں۔ اردو ادب کی ایک صدی کے معماروں میں جعفری صاحب کا شمار ہوگا۔ وہ کبھی حرف و لفظ سے روشن ہوئے تو کبھی حرف و لفظ کو روشن کیا۔ ان کا علم ان کی روح سے جھلکتا آتا تھا۔ وہ سانسوں سانس اپنی عمر کے ہر پل کو کار آمد بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ماہنامہ افکار (کراچی) کا ضخیم سردار جعفری نمبر اس کی ایک تازہ مثال ہے۔ جعفری صاحب کو برین ٹیومر تھا۔ کئی ایک عوارض میں مبتلا تھے۔ ذت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اور دنیا کی شناخت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بستر مرگ پر اپنی آخری منزل کا منتظر بچی کچی کمزور سانسوں کو گن رہا تھا۔ دنیا سے تو رابطہ ٹوٹ ہی چکا تھا، جسم اور روح کا رشتہ بھی بال برابر رہ گیا تھا۔ مگر حواس سے ان کا رابطہ کب ٹوٹا ہوگا یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ کچھ امید افزا ساعتیں وہ بھی تھیں جب ڈاکٹرس یہ کہتے تھے کہ آپ بولئے جعفری صاحب سنیں گے آپ پڑھ کر سنایئے وہ سمجھیں گے۔ وہ بولنے لگیں گے، وہ پڑھنے لگیں گے۔ فی الحال وہ اپنے چہرے سے REACT کر سکیں گے۔ حواس کی وہ آخری پرچھائیاں جب ان سے تحریری طور پر کہا گیا کہ کوئی شعر لکھ دیجئے۔ انہوں بیہ وقت تمام اپنی گم ہوتی ہوئی شکستہ تحریر میں لکھا کہ کوئی شعر یاد آئے گا تو لکھوں گا۔ ٹوٹ ٹوٹ جانے والا تکلم اس وقت محسوس کیا گیا جب بمبئی کے نہرو سینٹر میں انہوں نے اپنا آخری بڑا مشاعرہ پڑھا۔ بہت دیر تک مائک پر خاموشی اور سوچ کے درمیان اپنے حافظے سے الجھتے رہے اور پھر نظم "میرا سفر" سنائی۔ خدا معلوم کہ بستر مرگ پر طویل ہوتی ہوئی خاموشی میں ان کی سوچ کی موت کب ہو گئی تھی؟ ایک عالم مقرر، حرف و لفظ پر اپنی سانسوں کا حرارت رکھنے والا شخص غالباً موت سے آخری مکالمہ کر رہا تھا۔ اپنی موجودہ علالت سے ایک دو سال قبل بھی وہ ہسپتال میں تھے اور لگتا تھا کہ ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ اپنے اندر کمزور ہوتی ہوئی سانسوں کے بوجھ کو مزید سہار نہ سکے گا۔ ہمیشہ کیلئے اپنی سانسوں کو باہر اچھال دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، وہ ہسپتال سے گھر آ گئے۔ ان کے پیروں میں تو رستے کھو گئے تھے، وہ پھر سفر پر نکل گئے۔ شاید ابھی سانسیں ان کے نحیف و نزار جسم کے خلیوں میں ادھر ادھر پھنسی رہ گئی تھیں۔ انہیں جلدی دوبارہ ہسپتال جانا پڑا۔ اور پھر جعفری صاحب کے تحت الشعور اور لاشعور میں علم کے بے شمار خزانے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

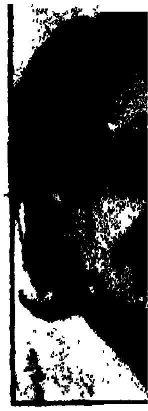
کہانی ہے تو بس اتنی فریب خواب ہستی کی ۔۔۔ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے [سیماب]

تو کیا اب علی سردار جعفری افسانہ ہو جائیں گے؟ یا انہیں اردو زبان و ادب کی ایک مستقل کہانی بن جاتا ہے؟ یہ افسانہ کہانی کیسے بنے گا؟ ہماری تعزیتی قرارداد بطور خراج عقیدت کچھ یوں ہے۔

سردار جعفری اکاڈمی قائم ہو ○ جہاں وہ رہتے تھے اس علاقے کا نام سردار جعفری روڈ یا سردار جعفری چوک رکھا جائے ○ جعفری صاحب کے پاس جو علمی و ادبی خزانہ ہے اور جس کی حفاظت شاید ان کے ورثہ نہ کر سکیں کیوں کہ اس کے لئے اردو زبان سے واقفیت اور ادبی ذہن کا ہونا ضروری ہے۔ وہ صاحب مطالعہ تھے، بے شمار کتابوں پر ان کے قلم سے حواشی درج ہیں اس خزانے کو کسی طرح محفوظ کیا جائے ○ مشاہیر کے بے شمار خطوط جمع ہوں گے اور بہت بڑی تعداد میں جعفری صاحب نے بھی خطوط لکھے ہوں گے ○ ان سب کی جمع آوری اور ترتیب و تدوین یہ بذات خود ایک اہم اور بڑا کام ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جن دنوں جعفری صاحب میر تقی میر پر کام کر رہے تھے تو ان کی مراسلت دانشور محقق قاضی عبد الودود سے رہی تھی قاضی صاحب کے خطوط کی تعداد زیادہ ہے۔ جعفری صاحب ان خطوط کو شاعر کے لئے مرتب کرنا چاہتے تھے اپنے مفید حواشی کے ساتھ لیکن اپنی عدیم الفرصتی کے سبب وہ ایسا نہ کر سکے۔ ایسے اور بھی مراسلاتی سلسلے ہوں گے ○ تصانیف کے جدید ایڈیشن شائع ہوں ○ شعری و نثری انتخاب ○ کلیات سردار جعفری ○ وہ تحریریں جو رسائل و جرائد میں بکھری پڑی ہیں ان کی ترتیب و تدوین ○ میر تقی میر پر ان کی حالیہ جدید کتاب جو ان کی علالت کے دوران طبع ہو کر آئی اس کی نکاسی کا اہتمام ○ شاعری کی ایک جدید فرہنگ ترتیب دے رہے تھے، خاصہ کام کر لیا تھا، اس کی تکمیل و راشاعت ○ جعفری صاحب پر جو تحقیقی کام ہوا ہے۔ یا ہو رہا ہے اس کی نگرانی ○ تمام اردو والوں کی طرف سے مرکزی حکومت اور حکومت مہاراشٹر پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ سردار جعفری اکاڈمی کے قیام میں سرکاری مدد دیں ○ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے قلم کاروں کو بھی اس میں شامل کیا جائے کہ وہ ہندوستانی ادب میں بھی نمایاں مقام کے حامل تھے ○ اکاڈمی کے ساتھ سردار جعفری آرکائیو بھی قائم ہو تاکہ سردار جعفری صاحب کو مکمل طور پر وہاں محفوظ کر دیا جائے۔

اردو والوں میں اپنے مشاہیر کی یادگاریں قائم کرنے کا چلن نہیں ہے۔ غالب اور اقبال [سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے] سے آگے ہم بڑھے نہیں ورنہ تو اردو زبان و ادب کی ایک سے ایک قد آور شخصیتیں تہہ خاک ہیں جن کی یادگاریں قائم ہونا چاہئے تھیں۔ دیکھنا ہے کہ اب اردو والے سردار جعفری کے لئے کیا کرتے ہیں۔

زندگی تو ہے ازل سے تا ابد ۔۔۔ مرگ خوش انجام کی خواہش کرو [اعجاز صدیقی]



Tel: 3867134

۱۵ سیتا محل۔ [illegible] روڈ۔
بمبئی - ۴۰۰۰۲۶ - ۷ / دسمبر ۱۹۹۴

عزیزم افتخار امام۔ نیا سال مبارک ہو۔
آپ کا ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء کا خط یقیناً دسمبر کے شروع میں آیا
ہوگا لیکن میں نومبر کے [illegible] دسمبر کے پورے مہینے سفر میں
[illegible]۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ شاعر ہمارا نہایت اہم رسالہ ہے جسے
آپ کی محنت نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ میں آپ کے
ہم عصر اردو ادب نمبر کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا

[illegible]
[illegible]

[illegible] میں اس نمبر
کو آٹھ سطروں کی نظم پر ترجیح
دیتا ہوں۔ [illegible]
[illegible] ۔
[illegible] انتظار
کیجیے۔ نوازش نامہ [illegible]۔
[illegible]
آپ کا
سردار جعفری

15 INDIA

MR. IFTIKHAR IMAM
~~THE "SHAIR" (MONTHLY)~~
MAKTABA QASRULADAB.
~~BOMBAY CENTRAL POST OFFICE,~~
P. O. BOX NO. 4526.
BOMBAY-400 008.

पिन PIN

سردار جعفری بنام افتخار امام صدیقی

سردار جعفری صاحب [پ:۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء-م: یکم اگست ۲۰۰۰ء] نے شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے بطور خاص اپنی تخلیقات ارسال کی تھیں۔ اس سلسلے میں ٹیلی فون اور پھر مراسلت بھی ہوئی تھی۔ انہیں خطوں میں سے ایک خط کا عکس شائع کیا جارہا ہے۔ یہ محض ایک خط نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ تحریر ہے۔ [ادارہ]

سردار جعفری

خراجِ محبت-خراجِ عقیدت

ذیل میں علی سردار جعفری صاحب کاایک مضمون خراجِ محبت قارئین شاعر کی نذر کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون قبلہ اعجاز صدیقی کی نظموں کے مجموعے —"کربِ خود کلامی" [مطبوعہ: فروری ۱۹۷۹ء] کے لئے بطور پیش لفظ، لکھا گیا تھا۔ جعفری صاحب کی یہ تحریر ۲۰ر جولائی ۱۹۷۸ء کی ہے۔ اعجاز صاحب کا انتقال ۹ر فروری ۱۹۷۸ء کو ہوا تھا۔ اس تحریر کی مکرر اشاعت کا مقصد جعفری صاحب اور ان کے دوست اعجاز صدیقی کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے۔ یوں بھی ہم سب اپنے اپنے کمزور حافظوں میں جی رہے ہیں او رہمیں اپنے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ گزرا ہوا کل صدی برابر ہوا جارہا ہے۔

یہ ایک سچی اور زندہ تحریر ہے جو مبالغے سے تقریباً پاک ہے۔ اسے جعفری صاحب نے اپنی روح کی روشنی میں لکھا ہے۔ وہ اپنے دوست اعجاز صدیقی اور خاندان سیماب سے بہت قریب تھے اور اپنے دوست کے مزاج آشنا بھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ترقی پسند ادبی تحریک کے لئے اعجاز صاحب نے رسالہ شاعر کے ذریعے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں لیکن چونکہ اعجاز صاحب خالص ترقی پسند نہیں تھے ور ترقی پسند ادبی تحریک سے اس طرح وابستہ نہیں تھے جیسا کہ بہت سارے 'کمیٹیڈ' یا نام نہاد ترقی پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اعجاز صاحب کو وہ سب کچھ نہیں ملا جو بیشتر ترقی پسندوں کو نصیب ہوا اور خوب خوب نصیب ہوا۔ خالص ترقی پسندوں نے اعجاز صاحب کو اپنے "منشور" سے باہر ہی سمجھا اور نظر انداز کرتے رہے۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں ان کا نام نہیں آتا۔ ترقی پسند ادب کے کسی انتخاب میں اعجاز صاحب نہیں ہیں۔ وہ نظم سے زیادہ غزل کے شاعر تھے اور غزل بھی وہ جس کی تعریف خود جعفری صاحب نے کی ہے۔ مگر جعفری صاحب بھی کہاں اپنے دوست کے لئے کچھ خاص کر سکے تھے۔ بہر حال یہ ایک طویل داستان ہے نظر اندازی کی۔ یہ جب کبھی لکھی جائے گی تو بہت سارے چہرے بے نقاب ہوں گے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جیسی دھاندلیاں اردو ادب میں ہوئی ہیں اس کی مثالیں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں کم کم ملیں گی۔

اعجاز صدیقی کا سرمایۂ نثر و نظم کم نہیں ہے۔ یہ بہت وقیع ہے اور پھیلاؤ لئے ہوئے ہے۔ جعفری صاحب کے مضمون میں کئی ایک باتیں ایسی ہیں جو صراحتیں، وضاحتیں چاہتی ہیں لیکن یہ موقع نہیں ہے، پھر یہ کہ مضمون بہت طویل بھی ہو جاتا۔ جعفری صاحب کے مضمون کی بازدید کا مقصد جعفری صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے شاعر کے بے شمار قارئین کو ایک اہم اور سچی تحریر سے متعارف کروانا ہے جعفری صاحب نے اپنے معاصرین پر خاصہ لکھا ہے۔ ان تحریروں کا ایک انتخاب ہونا چاہئے۔

[الف الف]

اردو ادب کی تاریخ میں اس دَور کے شاعروں کا ذکر جب بھی ہو گا اعجاز صدیقی کا نام ادب اور احترام سے لیا جائے گا۔ ان کو شاعری اپنے والد بزرگوار علامہ سیماب اکبر آبادی سے ورثے میں ملی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کو کافی نہیں سمجھا اور انہوں نے اقبال کے اس شعر پر عمل کیا ۔

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی کجا عیشے بروں آوردن لعلے کے در سنگ است

اس لئے انہوں نے عمر بھر خارا تراشی کی اور اپنی شاعری کے لعل اس بر آمد کرتے رہے۔ غزل اور نظم دونوں پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی اور بعض مقامات پر وہ اپنے بزرگ والد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی نظم سنجیدہ اور پُر وقار ہے۔ حالانکہ ان کے موضوعات زیادہ تر قومی اور سیاسی رہے ہیں اور اس اعتبار سے وہ شاعری موضوعاتی شاعری کے دائرے میں آتی ہے لیکن ان کی فکر اور بصیرت نے اس کو ہم عصر زندگی کا ترجمان بنادیا ہے۔ ان کی نظموں کا زیرِ طبع مجموعہ "کربِ خود کلامی" اس پر شاہد ہے۔

غزلوں میں ان کا انداز کلاسیکی رہا ہے لیکن اس کلاسیکیت میں انہوں نے جدید عہد کے تقاضوں کی اس طرح آمیزش کی ہے کہ زبان جدّت اور روایت کا ایک خوبصورت امتزاج بن گئی ہے۔ ان کی شاعری میں رومانیت سے زیادہ فکری صلابت ہے اور یہ چیز بہت قابلِ قدر ہے کیونکہ سستی رومانیت نے اردو شاعری کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی غزلیں جدید غزل میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں لیکن جس طرح اقبال اور یگانہ کی غزل گوئی کو نظر انداز کیا گیا ہے، اسی طرح اعجاز صدیقی کی غزل کے ساتھ بھی بد سلوکی کی گئی ہے۔ اس عہد کے غزل کے معماروں میں انکا نام مستند، معتبر اور قابلِ فخر ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی غزلوں کا دیوان جلد سے جلد منظرِ عام پر آئے اس وقت یہ احساس عام ہو گا کہ اعجاز صدیقی کی غزل کا لہجہ کتنا منفرد ہے۔ منفرد لہجہ اچھے شاعر کی دلیل ہے۔ ورنہ غزل کہنا ایک نہایت آسان کام ہے۔

اعجاز صدیقی صرف شاعر نہیں تھے بلکہ نثر میں بھی اپنا ایک انداز رکھتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر اپنے سفر نامے اور رسالہ 'شاعر' کے اداریے لکھے ہیں۔ کچھ تنقیدی مضامین اور ذاتی تاثرات ہیں۔ کچھ مرحوم ادیبوں پر مضامین ہیں۔ لیکن ان کے اندر موضوعات کا جو تنوع ہے وہ ان کی نثری تحریروں کو ایک امتیاز عطا کر

تا ہے۔ ان مضامین کو بھی یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرانا بہت ضروری ہے تاکہ یہ بے بہا موتی استبداد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں۔ ان کی نثر میں علمی وقار ہے اور فکری تہہ داریاں ہیں۔ ہماری شاعری کی طرح ہماری نثر کا بھی ایک اچھا خاصا حصہ رومانیت زدہ ہے جس میں اساتذہ کے اشعار کے ٹکڑوں سے آرائش او رزیبائش کا کام لیا جاتا ہے۔ میں اس کو نثر کی نارسائی سمجھتا ہوں۔ اعجاز صدیقی کی نثر اس عظیم روایت کا حصہ ہے جس میں شبلی اور حالی کے نام لئے جاتے ہیں۔ اس میں فارسی کی غیر ضروری آمیزش نہیں ہے اور بات کہنے کا انداز منطقی ہے جس سے معنوی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ اعجاز صدیقی اردو زبان کے جیالے سپاہی اور بیباک مجاہد بھی تھے۔ اس جہاد میں انہوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے اور کسی موقع پر کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ان کے بہت سے خیالات اس قابل ہیں کہ اردو کے ادارے اور اکیڈمی ان پر عمل کر کے سرخروئی حاصل کر سکتی ہیں۔ اور اردو کے حقوق کے لئے بہتر فضا پیدا کر سکتی ہیں۔ اردو کا مسئلہ جس بیباکی کا مطالعہ کر رہا ہے وہ اردو تنظیموں میں ناپید ہے۔ تمام تنظیمیں سرکاری امداد پر چل رہی ہیں اس لئے بیباک نہیں ہو سکتیں۔ اردو مجاہدوں کی فوج تو کوئی سیاسی جماعت ہی تیار کر سکتی ہے جو اس سوال کو سیاسی سطح پر حل کرے گی۔

اعجاز صدیقی اپنی ادبی صلاحیتوں اور خوبیوں کے علاوہ ذاتی خوبیوں کے بھی مالک تھے۔ وہ نہایت اچھے دوست اور مخلص انسان تھے۔ ہر ایک کے لئے ہمدردی ان کے کردار کی ایک اعلیٰ صفت تھی۔

بس ان میں ایک ہی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے منصب کو ہمیشہ کم کر کے دیکھا۔ انہوں نے اپنے رسالہ "شاعر" میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے گوشے قائم کئے لیکن اپنے لئے کوئی گوشہ نہیں بنایا۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کو خوب داد دی لیکن خود داد حاصل نہیں کی۔ زندگی بھی نہایت عسرت او رتنگدستی میں گذار دی۔

آگرے سے "شاعر" کو بمبئی لے کر آئے اور آخری سانس تک اس پرچے کو جاری رکھا لیکن جن حالات میں جاری رکھا وہ معمولی جگر گردے کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ جن کوٹھریوں میں انسانوں کے رہنے کے لئے جگہ نہیں انہیں میں ان کے بیوی بچوں کے ساتھ شاعر کی فائلیں اور کاغذات اور مسودات رہتے تھے مسلسل علالت کے باوجود وہ دن میں کئی بار تین چار منزل کی سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے تھے۔ ان کی جسمانی طاقت ساتھ دینے سے انکار کرتی تھی لیکن وہ بھری ہوئی بسوں میں سفر کرنے پر مجبور تھے۔ علاج کے لئے جتنی رقم کی ضرورت تھی وہ کبھی ان کی جیب میں نہیں آتی۔ لیکن نہ تو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا اور نہ شکایت کی۔ بس اندر ہی اندر گھٹتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت کو اپنی ایک خوبصورت نظم میں خود بیان کیا ہے۔

> اپنے اجداد کی خدمات کا کیا ذکر کروں / ایسی خدمات تو تاریخ ادب میں کم ہیں / بھول بیٹھی ہے مگر ان کو بھی دنیائے ادب / کل مجھے بھی یہ بھلا دے / تو تعجب کیا ہے / کارناموں پہ مرے پھیر دے پانی یکسر / اور اک یہ بھی حقیقت ہے کہ / اے میرے دماغ / نہ مرے پاس وہ نظمیں ہیں نہ غزلیں ہیں نہ گیت / داد جن کی مجھے ارباب نظر نے دی ہے / دفن یہ سب ہیں رسائل کے ان انباروں میں / گھر میں جو فرش سے چھت تک ہیں لگے / یہ مرا کلبۂ غم، یہ مرا چھوٹا سا مکان / یہ پلنگ، اس پہ یہ تکیے، یہ خطوط اور فائل / یہ مرا 'تختِ ادب' / جس پہ برسوں سے فروکش ہوں میں / ہر طرف گھر میں کتابوں کے رسائل کے ہیں ڈھیر / "مسودّے"[ا] بند لفافوں میں چنے رہتے ہیں / ایک میرا ہی نہیں / ان میں وہ قیمتی "سرمایۂ سیماب" بھی ہے / جو دل و جان سے زیادہ ہے عزیز / کون اس قیمتی سرمائے کی تدوین کرے / کون اس گھر کی اذیت سے دلاتا ہے نجات کس کو یہ فکر، اک آوارۂ خدمت کے لئے / کوئی رہنے کو ٹھکانے کا مکاں ہی مل جائے۔
>
> (کربِ خود کلامی)

آخر عمر میں انکی یہ دلی تمنا تھی کہ علامہ سیماب اکبر آبادی کی تمام تخلیقات کی ترتیب و تدوین ہو جائے اور وہ دیدہ زیب کتابوں کی شکل میں شائع ہو جائیں۔ اس قیمتی علمی اور ادبی انبار میں ایسے بیش بہا مسودے بھی ہیں جیسے قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم کے منظوم ترجمے۔ ان کو ضائع ہونے سے بچانا ایک زبردست علمی اور ادبی خدمت ہے۔ اس مقصد کیلئے اعجاز صدیقی نے کوشش کر کے سیماب اکیڈمی قائم کی۔ اکیڈمی کے چند ابتدائی جلسے ہوئے اسکی طرف سے دو تین تہذیبی اور شاعرانہ پروگرام بھی مرتب کئے گئے لیکن سرمائے کی فراہمی کا کام ابھی باقی تھا کہ اعجاز صاحب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

ان کے ہونہار صاحبزادوں نے پوری ذمے داری کے ساتھ شاعر کی ادارت اور اشاعت کا کام سنبھال لیا ہے اور اپنے خاندان کے ادبی ورثے کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو گئے ہیں۔ اعجاز صاحب کے انتقال کے بعد شاعر کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ اعجاز صاحب زندہ ہیں۔ اور زندہ رہیں گے۔ آگرہ، میر، نظیر اکبر آبادی اور غالب کا وطن ہے۔ علم و رشد کی اس سرزمین سے سیماب اور اعجاز بھی اٹھے اور اردو ادب کے صفحات پر نقشِ دوام چھوڑ گئے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام

ا۔ غیر مشدد شعری مجبوری ہے۔ اعجاز صاحب کا نوٹ

مٹھی بھر شاعری



ندا فاضلی

◆

کٹھ پتلی ہے یا جیون ہے جیتے جاؤ سوچو مت
سوچ سے ہی ساری الجھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

لکھا ہوا کردار کہانی میں ہی چلتا پھرتا ہے
کبھی ہے دوری کبھی ملن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

ناچ سکو تو ناچو جب تھک جاؤ تو آرام کرو
ٹیڑھا کیوں گھر کا آنگن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

سب دھرموں کا ایک ہی کہنا، جیسا مالک رکھے رہنا
جب تک سانسوں کا بندھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

گھوم رہے ہیں بازاروں میں سرمائے کے آتش دان
کس بھٹی میں کون ایندھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

◆

کالا امبر پیلی دھرتی یا اللہ
ہا ہا، ہو ہو، ہی ہی ہی ہی یا اللہ

پیر پیمبر کو اب اور نہ زحمت دے
چولہا چکی روٹی سبزی یا اللہ

کرگل اور کشمیر ہی تیرے نام ہوں کیوں
بھائی بہن محبوبہ بیٹی یا اللہ

گڑ مصری بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ

تو ہی بادل، آنچل، آنگن، ہریالی
اور کبھی تو ناگا ساکھی یا اللہ

تیز رفتاری

پہلے ایسا کب ہوتا تھا
اجیارا ہو یا اندھیارا
جب ہونا ہو، تب ہوتا تھا

ہر دن چلتا تھا ہفتوں تک
خواب تھے چھوٹے رات بڑی تھی
وقت نکلتا تھا کم باہر
جیب کے اندر جیب گھڑی تھی

آنکھ اٹھی اور منظر بدلے
یہ کیسا جھنجھال نیا ہے
پچھلا سال گیا ہے کل ہی
آج جو دیکھا سال نیا ہے

تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر نظم مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ قلم سے کاغذ پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر پریت مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ گگن سے دھرتی پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر جیت مکمل ہوتی ہے
سیما سے وہ لیکن آنگن میں
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

پھر نظم نئی
پھر پریت نئی
پھر جیت نئی بہلاتی ہے
ہر بار مگر لگتا ہے یونہی
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

گیت

بادل میرے گاؤں بھی آؤ
پگڑی ٹانگو پیپل نیچے
اونٹ بٹھاؤ مسجد پیچھے
سوکھ رہے ہیں تال تلاؤ پھر ان کو بھر جاؤ
بادل میرے گاؤں بھی آؤ

چوپالوں کو کتھا سناؤ
پنجرے میں توتے سے بولو
بنیا ڈنڈی مار رہا ہے
دال نمک اچھے سے تولو۔
کھول کے اپنی مہنگی گٹھری سستی ہاٹ لگاؤ
بادل میرے گاؤں بھی آؤ

نیم کی میٹھی کرونبولی
سلگاؤ ٹھنڈے چولہوں کو
میدانوں سے دھوپ اٹھا کر
پینگیں بھرنے دو جھولوں کو
چپ چپ ہیں بچوں میں آکر آلہا اودل گاؤ
بادل میرے گاؤں بھی آؤ
پگڈنڈی پر گھاس بچھاؤ
دودھ اتارو گائے کے تھن میں
پھاڑ کے مکھیا کے کھاتے کو
چین لکھو گھر کے آنگن میں
پیاسی ہے ندیا بیچاری، برکھا جل برساؤ
بادل میرے گاؤں بھی آؤ

ستمبر ۲۰۰۰ء

گیت

گلی کا پیپل لہرایا
شہر میں مجھ سے ملنے میرا
گاؤں چلا آیا۔
گرمی بیچ آنگن میں بیٹھی
پان سپاری کھائے
برکھا پھٹی پرانی چھتری میں
پیوند لگائے
بھیج نبی جی مٹھو بولا۔
مینڈک ٹرّایا
گلی کا پیپل لہرایا
شہر میں......

سات پیالوں کے رنگوں سے
دھنک ہوئے دوپٹے
کھن کھن کرتے ہاتھوں سے
سنگیت بنے بیل بٹے
پوسٹ مین کاکا اپنوں کا
سندیسہ لایا
گلی کا پیپل لہرایا
شہر میں......

پیلی ساڑی پہن کے گذری
سونی سی ایک شام
چمپا، گیندا، آنسو سپنا
سارے اس کے نام
تانگے والے نے گھوڑے پر
چابک برسایا
گلی کا پیپل لہرایا
شہر میں مجھ سے ملنے میرا
گاؤں چلا آیا۔

● 103, AMAR APTS KHAR -DANDA,
MUMBAI-400052 (MS.)

اردو ناول، مکالمہ تہذیب، برطانیہ میں اردو کا مستقبل

ادبی سحر

ہند وپاک میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا اس سے قطع نظر اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا، یہ بحث بہت اہم ہے۔ ادھر اردو کی نئی بستیوں میں عالمی اردو کانفرنس ہو رہی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ خبریں آرہی ہیں۔ عالمی مشاعروں سے آگے اب عالمی اردو کانفرنس اور ادبی نوعیت کے مذاکروں، سمیناروں کا چلن بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے تو خوش آئند بات، ایسا ہونا بھی چاہئے تاکہ اردو کی نئی نسل کو اپنی مصروف ترین زندگی میں معاصر اردو ادب ادبی مسائل، معلومات اور عالمی سطح پر اردو کے لئے کیا ہو رہا ہے اس کا علم ہو سکے۔ لیکن ایک بہت اہم سوال جو بار بار مکالمہ کرتا رہا ہے اور یہ سوال مکالمہ اب شدید ہوتا جارہا ہے اور شور آوازیں سن رہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا مستقبل نئی نسل میں مضمر ہے، اور نئی نسل؟ اردو ٹرسٹ (لندن) نے ایک اچھی سی عالمی اردو کانفرنس منعقد کی تھی تو اس میں بوڑھے اور تھکے ہوئے چہروں کی تعداد زیادہ تھی۔ تروتازہ چمکتے ہوئے چہرے کم، بہت ہی کم تھے۔ وجوہ چاہے جو بھی رہی ہوں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ اس پر کسی ضد ی او ر ٹھہرے ہوئے مکالمے کے بجائے مبنی بر حقائق مباحثہ روشن ہونا چاہئے، جو ہو نہیں رہا ہے۔ اب پھر اگست کے آخر میں ایک اور اردو کانفرنس EUROPEAN URDU WRITERS SOCIETY-(U.K) کے تحت لندن ہی میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کا موضوع ہے "۲۱ویں صدی میں اردو زبان میں نئے امکانات" اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ ہوگی کہ اس میں ان مستشرقین اردو کو مدعو کیا جارہا ہے جو یورپ اور امریکہ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں اردو درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ یہ واقعی ایک اہم موضوع ہے اور ہم اس پر خاصی تفصیل کے ساتھ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ [۱۹۹۹ء] میں لکھ چکے ہیں۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے کیوں کہ اب اردو سیکھنے والے غیر ملکیوں کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ یہ دونوں ہی موضوع بہت اہم ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اردو کی نئی بستیوں کے اردو دانشور حضرات اس پر مثبت مکالمہ قائم کریں تاکہ عالمی سطح پر یہ مکالمہ گونج اور پھر آواز بن سکے۔ کام کرنے والوں کے لئے راہیں ہموار ہو سکیں نئے سال اور نئے ہزارہ میں جرمنی میں بھی ایک عالمی اردو کانفرنس متوقع ہے۔ کوئی بھی عالمی اردو کانفرنس ہو اس کے مباحث کاغذی نہ ہوں بلکہ عملی ہوں اور دوسروں کے لئے کار آمد بھی۔ اس طرح ہند وپاک میں بھی اردو زبان و ادب کو تقویت ملے گی۔

ہم نے ۱۹۸۰ء سے 'لفظ مکالمہ' کو بطور خاص مروج کیا ہے۔ دراصل ایک مدت ہوئی لفظ مرنے لگے ہیں۔ لفظ کی جگہ جدید ترین ہتھیاروں نے لے لی ہے۔ آج یہ بہت آسان ہے کہ ناپسندیدہ شخص کو قتل کر دیا جائے یا قتل کروا دیا جائے۔ عالمی دہشت گردی اپنے عروج پر ہے۔ ہر ملک کی اپنی ایک ایجنسی ہے جو ملک سے باہر دنیا بھر میں اپنے ملک کے دفاع کے لئے جو کچھ ممکن ہوتا ہے کرتی ہے۔ آدمی، آدمی کا دشمن ہوا جارہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے جینے کا پورا حق ہے اسی طرح جس طرح صدر امریکہ کو ہے یا کسی بڑی سے بڑی پوسٹ والے آدمی کو ہے۔ دنیا کا عظیم ترین آدمی بھی، پہلے آدمی ہے اور آدمی ہی کی طرح ہے وہ سارے حقوق جینے کے، کسی عام آدمی کے لئے ہیں، وہی خاص آدمی کے لئے بھی ہیں۔ خدا کے آخری نبی کا وہ خطبہ (زندگی کا منشور) قیامت تک ایک ایسا آدمی نامہ ہے جو آدمی کے لئے نجات کا راستہ ہے، آدمی آدمی برابر ہے۔ آج ایسا نہیں ہے۔ آج آدمی کی کوئی اہمیت نہیں رہی، آدمی کی طاقت جدید ترین اور خطرناک ترین اسلحہ جات ہیں۔ آج کی عالمی سیاست اور عالمی قیادت ہتھیاروں ہی کے بل پر ہے۔

لفظ نہیں، اب بندوقوں کی بھاشا ایک عذاب
موت سے بدتر، موت کی شکلیں، جینا ایک عذاب

اور اس عذاب نے آدمی کا جینا حرام کر دیا ہے۔ لفظ سے مکالمہ ختم ہو گیا ہے۔ ہم نے ۱۹۸۰ء سے مکالمہ تہذیب (DIALOGUE CIVILZATION) کا آغاز کیا تھا۔ آج کے آدمی کو اب اس تہذیب کی سخت ضرورت ہے۔ آدمی کا سفر اب پھر معکوسی ہو رہا ہے۔ وہ لفظ سے خاموشی کی طرف جارہا ہے۔ STONE AGE کی طرف یہ معکوسی سفر، ترقی یافتہ آدمی کا سفر ہے اور آج کے آدمی کو ایک بار پھر مکالمہ تہذیب کی ضرورت ہے۔ معاصر ادبی منظر نامہ بھی ادبی مکالموں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ بیسویں صدی کا نصف آخر، کم ہوتے ہوئے مکالمے میں کم ہو گیا۔ اب نئی صدی اور نئے ہزارے کا نصف اول کیا ہوگا۔ قرائن سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاعر نے جس مکالمہ تہذیب کا آغاز کیا تھا، اسے اردو والوں نے محسوس نہیں کیا۔

اردو میں ناول ہے لیکن فکشن نقاد جس طرح کے ناول کو اپنا معیار بنائے ہوئے ہیں، وہ ناول نہیں ہے۔ ناول پر کوئی مکالمہ بھی کہاں ہوتا ہے۔ چند ایک ناولوں پر ہی گفتگو ہوتی ہے اور بار بار ہوتی ہے اور شاید ہوتی رہے گی۔ اردو میں ناول ہے، ناول نگار ہیں، ناول نقاد ہیں، ناول قاری بھی ہیں۔ وہ افسانہ نگار جنہوں نے اعتبار حاصل کیا ہے وہ بھی ناول لکھ رہے ہیں، بعض نئے قلم کار بھی ناول تخلیق کر رہے ہیں۔ عبدالصمد نے کئی ناول لکھے اور اب مشرف عالم ذوقی کے ۵ ناول شائع ہو گئے ہیں، تین ناول زیر طبع ہیں۔ لیکن اردو ناول پر جس نئے تنقیدی مکالمے کی ضرورت ہے وہ ابھی روشن نہیں ہوا۔ بیسویں صدی میں اردو ناول کا از سر نو جائزہ لیا جانا ہے تاکہ بعض جامد مفروضے اور مغالطے ختم ہو سکیں۔ شاعر میں معاصر اردو ناول کے مسائل پر کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ابھی اور بھی مقالے شائع ہوں گے، مباحث آئیں گے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر ۲ میں ایک پورا باب ناول پر دیا جارہا ہے۔ نئے ناولوں کی تلخیص اور ابواب بھی آئیں گے۔ یہ سب کچھ رسالہ شاعر میں ہوگا۔ ہم نے ناول پر مکالمے کا آغاز کر دیا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کے جو مسائل ہیں وہ بھی شاعر کا موضوع بنتے رہیں گے۔ [الف الف]

معاصر اردو ناول - حقیقت اور تاریخی ماضیت

د کا ا لد س سا ںاں



حال کے زمانہ میں رہ کر ماضی قریب یا ماضی بعید کے واقعات کردار اور ماحول کی بنیادوں پر تاریخ نویس اپنی تالیفات ایمانداری کے ساتھ مرتب کرتا ہے۔ اور مفکرین کا یہ قول بھی سچ ہے کہ ادبی اور لسانی خوبیوں کے حامل قلمکار تاریخ جیسے موضوع اور مواد کو کسی داستان یا ناول کی طرح دلچسپ بناتے رہے ہیں۔ اسی کے دوسرے سرے پر یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ تاریخ کے خام مواد کو لے کر، ناول نگار بھی تاریخی اور واقعاتی ادبیت کے پیرائے میں جمالیاتی و تصوراتی تراش خراش کے ذریعے ناول کی فنی تشکیل کر سکتا ہے۔

انگریزی ادب میں والٹر اسکاٹ اور جین آسٹین ایک ہی عہد کے دو ناول نگاروں نے تاریخی اور عصری دونوں قسم کے نہایت کامیاب ناول لکھے۔ اسکاٹ نے ماضی قریب اور ماضی بعید کی تاریخ سے کام لیا۔ جبکہ جین آسٹین نے صرف معاصر زندگی سے تعلق رکھا۔ لیکن بہ حیثیت ناول نگار دونوں کا مقام اہم ہے۔ اگر اسکاٹ نے تاریخی واقعات اور کرداروں کو ادبی طرز نگارش کے تحت کچھ تبدیل کیا، تو آسٹین نے بھی اپنے دور کی عصریت کو بالکل خبری انداز میں مرتب کرنے سے گریز کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ادب میں موضوعی سرمایہ اس وقت تک ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس میں مصنف کا ادبی اسلوب حل نہ ہو جائے۔ اور ناول واقعاتی ہو کر بھی تخلیقی رہے۔

ترقی پسند تحریک کی ناول نویسی سے قطع نظر کہ اس دور میں عصری تقاضوں کی ضرورت و طلب نے ناول نگاروں کو اپنے عہد کے واقعات، کردار اور ماحول ہی سے وابستہ رکھا، اردو میں چھوٹے بڑے، بہت سے معیاری ناول تخلیق کئے گئے۔ اگر ہم سنجیدگی سے ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ناول کا جائزہ لیں، تو یہ حقیقت بہر حال ہمارے سامنے آئے گی کہ اس زمانے میں عموماً ناول کے خالق اپنی عصریت کا شدید احساس رکھنے کے باوجود للچائی ہوئی نظروں سے تاریخ اور ماضی کے داستانی اور تمثیلی ماحول پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ موجودہ عہد میں جو بھی ناول لکھے گئے چند کو چھوڑ کر، مختصر ناول یا ناولٹ ہی کیوں رہ گئے؟ انگریزی ناول کی طرح وہ تین سو سے لے کر چار پانچ یا چھ سو صفحات کا احاطہ کرنے میں کیوں ناکام ہیں؟ جبکہ ہماری قدیم داستانیں خاصی طویل ہیں۔ انیسویں صدی سے تاحال انگریزی ادب میں ضخیم ناول نگاری کی روایت اسی طرح قائم ہے اور اس کی ضخامت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

آج کل ہمارے نقادوں کو یہ افسوس ہے کہ رزمیہ شاعری کا وسیع میدان کہاں غائب ہو گیا؟ (وارث علوی وغیرہ کا خیال) اور اردو کے فن کار ضخیم رزمیے کیوں تخلیق نہیں کر رہے ہیں؟ حالانکہ میتھو آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کی تنقید اور ناول کو نثری رزمیہ تک ثابت کر دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں صاف ذکر کیا ہے کہ اس تحریک کے وسیلے سے چند بڑے ناول ضرور لکھے گئے، لیکن بعد کو ناول نویسی کا فن نذیر احمد، رسوا اور شرر کی اس کار آمد صنف (ناول) کو آگے نہ بڑھا سکا۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ۱۹۴۵ء کے بعد ابوالکلام آزاد کی انشائیہ نما نثر اور عصری و تاریخی منشر خیالی کے زیر اثر "غبار خاطر" کے اثرات ناول ہی کی ضخامت کے دائرے میں ہمارے نئے ادیبوں کو متوجہ کرنے لگے تھے۔ اور جس کا سب سے زیادہ فائدہ قرۃ العین حیدر نے اٹھایا۔ دیگر رُخ "پرویز کا تھا کال" جیسے شاہی دربار ہی ختم ہو گئے جو رزمیوں کی تخلیق کا سبب تھے۔ جمہوریت کے عہد میں انہیں کون خاطر میں لاتا؟ خود راجندر سنگھ بیدی کے "ایک چادر میلی سی" کو کیا ہم واقعی "ناول" کہہ سکتے ہیں؟۔ اس کی حیثیت طویل افسانے یا ناولٹ سے زیادہ نہیں۔ "تو اس نسلیں" "خدا کی بستی" یا بعد کو دو چار ضخیم ناول ضرور نظر آتے ہیں۔ لیکن صنف ناول نگاری کے ارتقاء میں یہ مغربی، انگریزی اور روسی ناولوں تک کہیں نہیں پہنچتے۔ ان ناولوں میں بھی عصریت کے متوازی ماضی کا رجحان واضح ہے۔

ناول میں کرداروں کے تنوع کی کثرت، واقعات و سانحات کی پیچیدگیاں اور زندگی کے عصری اور تاریخی ماحول کو زمانوں مکاں کے تفصیلی حدود میں لپیٹ کر پانچ سو صفحات میں فنی تکمیل کے ساتھ پیش کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ کہ کوئی ناول نگار چلتے پھرتے قلم برداشتہ ناول نویسی کی صنف اختیار کر لے اور عظیم ناول نگاروں میں اپنا نام درج کر سکے۔ اس کے علاوہ آپ ایسے قارئین کہاں سے مہیا کریں گے جو اتنے صفحات پر پھیلے ہوئے ناول کو یکسوئی اور ضبط و تحمل سے پڑھ سکیں؟ چارلس ڈکنس کے بیشتر ناول خود نوشت سوانح کے انداز میں ہیں تھیکرے کے ناول بھی تاریخی اور جنگ عظیم کے پس منظر کے ساتھ عصریت پر قائم ہیں۔ تو ناول نگار کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بہر صورت صرف موجودہ زندگی کے حالات سے متعلق رکھے اور گزرے ہوئے زمانوں کو بھلا دے، بالکل بیکار بات ہے۔

موجودہ عصر اور تاریخ کے مسئلے بھی بہت الجھے ہوئے ہیں۔ عصر تو اخباری دنیا کا عکاس ہوتا ہے۔ لیکن وہ "ادب" کیوں نہیں کہلاتا؟ ہم نے اس موضوع پر ناول نویسی کے تعلق سے زیادہ غور نہیں کیا۔ کہانی، واقعات، مقامی فضا، کردار اور اعمال کی تمام دھوپ چھاؤں کو سمیٹے ہوئے کوئی کامیاب ناول نگار صرف عصری اور صحافتی انداز سے اپنے حالیہ وقت کی زندہ تصویریں پلاٹ میں پرو کر نہ ناول نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے اور نہ ناول نویس بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر کے واقعاتی مواد میں بہت کچھ خیال آرائی داخل ہو جاتی ہے۔ ناول کے کردار تاریخ سے بھی وابستہ رہتے ہیں۔ اور دونوں کا امتزاج ناول کی تخلیق میں مدد کرتا ہے۔

ورڈز ورتھ نے اپنے تنقیدی خیالات واضح کرتے ہوئے لکھا تھا "شاعری یا ادب کی تخلیق ہوتی ہی اس وقت ہے جب فنکار اپنے گزرے ہوئے واقعات، مشاہدات،

تجربات اور احساسات کو مخصوص فراغت کے لمحات میں از سر نو اپنی فکر میں شامل کرتا ہے۔ اور اس طرح جیسے وہ گزشتہ محسوساتی حقائق کا تصوراتی اعادہ کرنے کی سطح تک پہنچ جاتا ہے...... "یہی وہ منزل ہے جہاں صحافت (خبری واقعات) ادب و شعر (تصوراتی عمل) سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے آج ہم تخلیق اور تنقید کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہوئے تخلیق کاروں کو اولیت دینا چاہتے ہیں۔ اور تنقید کو نیچے درجے کی صنف قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مغرب میں ہر بڑے ادیب یا شاعر کو اپنی "تنقید" بھی خود وضع کرنا پڑتی ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کو تاریخ سے منقطع کرنے کا سبق پڑھایا تھا، جو نظریاتی حد تک ہی رہا۔ کیوں کہ اس دور میں جتنے بھی معیاری ناول لکھے گئے وہ عصری تصویر کشی کے ساتھ ماضی کی تاریخی اور تصوراتی بازگشت سے منحرف نہ ہو سکے۔ کرداروں کی نفسیات اور ان کے سوچنے کے عمل میں گزشتہ زندگی کے دھندلے نقوش کبھی براہ راست اور اکثر تخیلی پس منظر میں ہمیشہ تازہ نظر آئے۔ ایسا کیوں ہوتا رہا کہ ناول کا کردار حال کی بخشی ہوئی زندگی اور اس کی کارکردگی سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا؟ آزادی کے زمانے ہی سے رجائیت کے وہ خواب کیوں بکھرتے گئے جو عصری عہد کے مناظر و معمولات ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے، اور جن کے لئے "قدیم" کو بھلا دینا ہی ضروری تھا؟ آج پچاس سال کی تاریخ کے بعد بھی ہمارا معاشرہ فسادات، قتل و خون، سماجی ناانصافی وغیرہ جیسی لعنتوں کا شکار کیوں ہے؟ اور ہمارے نئے ناول نگار ماضی کی زندگیوں کے مفسر کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے حقیقت پسندانہ رویوں کے بعد نئے اردو ناول نے داستان، اساطیر اور ماضی کے ماحول اور کرداروں کو بار بار زندہ کرنا چاہا ہے اور ایسا کیوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناول نگار عصری معاشرے کی گھٹن سے بیزار ہو کر ماضی کے تصوراتی اور خیالی سائے میں زیادہ ذہنی اطمینان کی تلاش میں ہیں۔ نئے ناولوں کے گہرے مطالعے سے یہی ماضیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ ترقی پسند ناول اپنی صنفی حیثیت سے معیاری ناول کا جو وزن ظاہر کرتا ہے اس کے مقابل نیا اردو ناول اتنا توانا کیوں نہ ہو سکا؟ اس ضمن میں وارث علوی کو اگر نئے اردو ناول سے شکایت ہے، تو بالکل بجا ہے۔

غور کیجئے، انگریزی ناول کی تاریخ اٹھارہویں صدی سے تاحال ضخامت کے باوجود اسی طرح ہر عہد اور ہر صدی میں رواں دواں اور تازہ ہے۔ وہاں ناول نگاری اور شاعری اس وضع سے ساتھ ساتھ چلے ہیں، کہ زیادہ تر ناول شاعرانہ خوبیوں کے باوصف ناول کی معیاری نثر سے غافل نہیں رہے۔ تھامس ہارڈی سے لے کر ڈی، ایچ لارنس اور ورجینا ولف اور بعد تک یہ طریقہ کار واضح ملتا ہے۔ قصہ، واقعات، پلاٹ، کردار، ماحول، زبان۔۔ کسی پہلو میں کہیں شاعری اور نثر کا غیر ضروری اظہار نہیں ملتا۔ ہر عنصر ایک دوسرے میں پیوست ہے۔ ہمارے نئے اردو ناول نگاروں نے یا تو مغربی ناول کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا یا اس کی ضخامت سے اکتاتے ہوئے انگریزی ناول نگاری سے کوئی گہرا ذہنی تعلق نہ رکھا۔ اور افسانہ نگاری کے متوازی محض ذائقہ بدلنے کے لئے ناول نگاری کو بھی خال خال اپنا لیا۔ اور اپنا پورا زور یا تو اساطیر اور داستانی تمثیلات میں صرف کیا، یا محض شاعری کی خود کلامی میں۔ اردو ناول اور خصوصاً جدید ناول نگاری کے میدان میں یہ بات توجہ طلب ہے۔ مثال کے طور پر ہارڈی نے شاعری کے علاوہ اپنی پوری ادبی زندگی میں کم و بیش آٹھ دس ناول (چار پانچ سو صفحات کی ضخامت پر مشتمل) تخلیق کئے۔ یہ ناول تمام تر دیہی اور شہری زندگی کے کرداری تصادم اور المیوں کے ساتھ اپنے اپنے طور پر بالکل جدا نثری انداز کے حامل بھی ہیں اور مجموعی اعتبار سے انگلستان کے مقامی دیہی ماحول کے خصوصی جغرافیائی عناصر کو بھی واضح کرتے ہیں، جہاں انسان اور فطرت کے قدرتی اور حادثاتی جبر کے درمیان کشمکش کے مناظر ہیں جن سے ہارڈی نے زندگی کے المناک انسانی حوادث کا تانا بانا بنا ہے مغربی ناول کے ارتقاء میں حقیقت نگاری، تاریخیت، انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے لیکر جنس وغیرہ ہر قسم کے موضوعات پر ضخیم ناول تخلیق ہوتے رہے ہیں۔ آج ہمارے نئے ناول نگار امریکی ناولوں کی طرز پر اور حقیقت نگاری کے تعلق سے ایسے ناول لکھنے کی طرف مائل ہیں، جو زندگی کی دہشت، قتل و جرم، موت، وحشت، اور ہر شے کی عدم معنویت کی تبلیغ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس رنگ کے ناولوں کا مطالعہ موجودہ نئی نسل کو زندگی سے مزید خوفزدہ کر رہا ہے۔ ان کے اندر زندگی کی مثبت قدروں سے بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔ تشدد، نفرت، جنس اور جرائم کی ایسی مصوری ناول کا شیوہ نہیں ہونا چاہئے۔ مغربی ناول کی کلاسیکی فضا نے مطالعے کے بعد ناول کے کرداروں کے ساتھ ساتھ زندگی کے جن عزائم اور حوصلوں اور غموں کو برقرار رکھنے اور برداشت کرنے کا جو راستہ دکھایا تھا وہ کہاں غائب ہو گیا؟

● NEAR OLD CITY POST OFFICE PAKARIA, PILIBHIT262001(U.P)

اہل فکر و فن اور انسانیت کے نام کھلا خط

سرفراز نسیم



(ہفتہ عشرہ ہوا دل بے قرار سا رہنے لگا ہے، کئی ہنگامے ایک ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ ابھی دو روز قبل نصف رات کے قریب میرے دل کے قریب ہلکا سا درد اٹھا اور پھر رات آنکھوں میں کاٹنا پڑی۔۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے اس لئے بھی نہیں ملتا کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دے۔ اور پھر میرا اور میرے ڈاکٹر کا ایک نیا سلسلہ چل نکلے۔ کیونکہ آج کل جتنے مریض ہیں اتنے ہی ڈاکٹر ہیں اور پھر ہر ڈاکٹر کے لئے ایک تو ایسا مریض ہونا چاہئے جو اس کا Permanent Patient ہو در اصل میں آنکھ کھولتا ہوں تو زندگی، کائنات کی ہر چیز اشکبار نظر آتی ہے۔ اخبارات اور ٹی وی میڈیا نے انسانیت کو بہت زک پہنچایا ہے اور اب انٹرنیٹ ٹکنالوجی کا پھیلاؤ یہ سب کچھ دیکھتا ہوں تو آنکھیں بھینچ لیتا ہوں کیا کروں "انسانیت" کی تذلیل مجھ سے دیکھی نہیں جاتی (اور یہ فقرہ جتنا بھی روندہ گیا ہے، اتنا ہی اس میں درد بھر آیا ہے)

یہ ایک خبر ملاحظہ کیجئے۔ لاہور کے چڑیا گھر میں ایک نوجوان جوڑا اپنی دس ماہ کی بچی کے ساتھ سیر کرنے گیا، بچی جالی کے ساتھ کھڑی بندریا کی حرکتوں کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ بندریا بچی کو دیکھتے ہی جھپٹی اور جالی کے اندر سے بچی کو نوکیلے پنجوں کے ساتھ سختی سے پکڑ لیا۔ فوراً کچھ لڑکے لپکے اور بچی کو جالی سے الگ کرنے لگے، اسی اثناء میں ایک نوجوان نے بندریا پر گولی چلانے کی کوشش کی مگر چڑیا گھر کے ملازموں نے اس لڑکے سے بندوق چھین لی۔۔ دوسری طرف بندریا بچی کو اندر کھینچتی رہی اور چند نوجوان باہر کی سمت لاسی کشمکش میں دس ماہ کی بچی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ اللہ! بچی کا آدھا حصہ جالی کے اندر جا گرا جس پر دو تین بندریاں جھپٹیں۔۔ یہ کہانی تو لاہور کے چڑیا گھر کی ہے لیکن یہ کہانی تو پوری دنیا کی کہانی ہے۔ کہیں بھی کسی وقت پیش آ سکتی ہے۔ لیجئے ایک اور قصہ بھی سن لیجئے جس نے میرے اندر شکست و ریخت پیدا کر دی ہے۔ جبھی تو اپنا غم غلط کرنے کی ضد میں رات دوسرے پہر اٹھ کر آپ سے یہ طویل مکالمہ جاری کیا ہے۔

"لاہور راوی" کے کسی علاقے میں ایک شخص نے ۱۰۰ بچے ہلاک کر دیئے اور یہ تمام بچے ایسے تھے جو کئی مہینوں سالوں سے اپنے گھروں سے غائب تھے، قاتل نے ان تمام بچوں کے مکمل کوائف بلکہ تصویری ریکارڈ جمع کر رکھے تھے۔ قاتل راوی کے قریب کسی علاقے میں رہتا تھا۔ قاتل روز دو تین بچے رات کو دو بجے گھر لاتا اور ان کا ریکارڈ بنا کر ان کو قتل کر دیتا تھا، اور نعش تیزاب کے ڈرموں میں ڈبو دیتا، جب نعش گل سڑ جاتی تو پانی کے ذریعے گٹر میں بہا دیتا۔ قاتل نے یہ تمام روئیداد ایک بتیس صفحات کی کاپی میں رقم کر رکھی ہے، قاتل کا کہنا ہے کہ دو سال قبل کسی نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جب میں نے اس واقعہ کی رپورٹ پولس میں درج کروائی تو پولس میرے مخالف کے ساتھ مل گئی اور الٹا مجھ پر مقدمہ کر دیا۔ لہذا یہ سب میں نے بدلہ لینے کی غرض سے کیا ہے۔ صد حیف کیا صرف یہی ایک واقعہ ہے۔ بچوں کے اغواء اور قتل کے واقعات کی کوئی کمی ہے کیا؟ ترقی یافتہ ممالک میں تو یہ کہانیاں عام ہیں۔ زندگی اور موت دونوں ایک جیسی سزائیں لگتی ہیں۔ مرنا ایک سزا اور زندہ رہنا دوسری سزا اور اس کائنات میں ہے کیا؟ خدا جو اس کائنات کا مالک و خالق ہے، اوپر بیٹھا آدمی کا تماشہ دیکھ رہا ہے:

دیکھ تیرے سنسار کی حالت کیا ہو گئی بھگوان　　　کتنا بدل گیا انسان، کتنا بدل گیا انسان

اور اب ہم ایک نئی کمپیوٹرائزڈ دنیا میں داخل ہونے کو ہیں جہاں ہر کام ایک لمحے میں ایک سوئچ "ON" کرنے سے پلک جھپکنے میں ہو جائے گا۔ ہم لوگ بلا سوچے سمجھے ایک نئی صدی کی تیاریوں میں مگن ہیں مجھے یہ نہیں سجھائی دے رہا کہ ہم آنے والی صدی کا بوجھ کیسے اٹھائیں گے۔۔ ہم کیوں یہ نہیں سوچتے کہ اس وقت کائنات میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو پچھلی صدی کا ہو جس سے ہم پوچھ سکیں کہ پچھلی صدی کی آمد کیسی تھی؟ دلفریب یا ناخوشگوار۔۔ ہاں۔۔ بنگال کے امرت سین کیمبرج یونیورسٹی میں معاشیات پڑھاتے ہیں۔ گذشتہ سال انہیں معاشیات میں نوبل انعام ملا تھا۔ پروفیسر امرت سین نے یاد دلایا ہے کہ جب دوسرے ہزار سالہ دور یعنی ۱۰۰۰ء کی ابتداء ہوئی تو یورپ میں کافی اضطراب اور خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ یورپ والوں کو ڈر تھا کہ حضرت عیسیٰ (یسوع المسیح) کے بعد ہزار سال مکمل ہونے پر قیامت نازل ہونے والی ہے۔ وہ روز محشر اور حساب کتاب کے خوف سے کانپنے لگے اور پورے یورپ پر ایک سال تک دہشت کی فضاء قائم رہی۔ قاضی جاوید کا کالم [خیالات سے اقتباس] اور اب منظر نامہ بدل چکا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ آنے والی صدی کمپیوٹر کی ہو گی، غزل کی ہو گی، یا نظم کی ہو گی، افسانے والے بضد ہیں کہ آئندہ صدی افسانے کی ہو گی، کچھ کہتے ہیں اب صنعتی انقلاب آئے گا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ ہم ایک نئی صدی کی پردہ کشائی کرنے جا رہے ہیں پردہ اٹھے تو جانے اندر کیا نکلے؟ بس یہی خوف مجھے حراساں کئے ہوئے ہے۔! مگر ایک نئی صدی اور ایک نئے ہزارے کا استقبال وقت سے پہلے ہو چکا ہے۔ وقت سے پہلے وقت کی باتیں۔ ہم بھی کیسے دانشور ہیں؟ کوئی سوال نہیں اٹھاتے؟ کوئی بات نہیں کرتے کیوں اس نازک وقت کی پکار نہیں سنتے؟ دراصل ہم زندہ رہنے کے عادی ہو گئے ہیں یا یوں کہئے کہ ہم زندگی کے غلام بن چکے ہیں۔ آخر ہم کیوں نہیں چاہتے کہ جو کچھ بھی ہونا ہے ہو کیوں نہیں جاتا؟ کوئی بھی فیصلہ؟ "زندگی یا موت" آخر ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیوں کوئی ایسا دن نہیں آتا جس کی رات نہ ہو، کوئی ایسا سورج طلوع نہیں ہوتا جو غروب نہ ہو؟ ہم باطل اور سچائی سے ڈرتے ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کوئی مکالمہ روشن کیوں نہیں کرتے۔ ہم سب آدمی ہیں اور آدمی نہیں ہیں ہم سب دانشور ہیں اور دانشور نہیں ہیں۔ ہمارا ادب، ہماری سیاست، ہماری قیادت، زندگی ایک عجوبہ ہو کر رہ گئی ہے۔ زندگی کم اور موت زیادہ، موت ایک سچائی ہے۔ لیکن یہ سچائی اپنے فطری مظاہر میں کم اور آدمی کی پھیلائی ہوئی درندگی اور بربریت سے زیادہ ابھر رہی ہے، بلکہ تیز تر ہے۔ آدمی ایک مذاق اور زندگی اس کی انتہا ہے۔

مآل کار یہی کہوں گا ہم خوش نصیب ہیں کہ دو صدیوں کا مزہ لوٹ رہے ہیں دوسرے ہزار سالہ دور کے آخری چند لمحوں کا اور تیسرے ہزار سالہ دور کے چند پہلے لمحوں اور آنے والی اگلی صدی سے متعلق کیا کہوں؟ میں تو یہ جانتا ہوں میرے پچھلوں نے بھی پچھلی صدی نہیں دیکھی تھی اور میرے اگلے بھی اگلی صدی نہیں دیکھیں گے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر میں کہاں سے ہوں، کہیں سے تو میری جڑت (نسب نامہ) اور آئندہ جانے کہاں تک میری نسل جائے شاید صدیوں تک یعنی میرے بیٹے، بیٹوں کے بیٹے، پھر بیٹے اور پھر بیٹے لیکن کہنا یہ ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا نہیں اس سے متعلق میں کیا کہوں سوا اس کے میرے بعد کچھ نہیں ہو گا۔ بس یوں سمجھئے آج ہم زندہ ہیں تو سب کچھ ہے، کل نجانے کیا ہو؟ شاید کچھ نہ ہو۔

ختم ہو جائیں گے یہ روز و شب　　　میری سانسوں تلک ہی دنیا ہے

● 18- B,FRANCIS ABAD, GUJRANWALA(PAK)



برطانیہ میں ہماری نسلوں میں اردو کا مستقبل

[illegible] اماد صدیقی

برطانیہ سے اردو زبان کا رشتہ دو چار برس کی بات نہیں بلکہ یہ صدیوں کا رشتہ ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور حکومت کے بعد سے آزادیٔ ہند اور پھر قیام پاکستان سے اس پورے برصغیر میں آج تک یہ رشتہ کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے۔ ہندوپاک کے تعلیمی نظام پر انگریزوں کا سایہ آج بھی ہے اور انگریزی زبان ہندوپاک کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کے درمیان آج بھی رابطے کا کام انجام دے رہی ہے۔ انگریزی کے اس تسلط کے خلاف احتجاج بھی ہوتا رہتا ہے۔ احتجاج کی یہ شدت پاکستان میں زیادہ ہے۔ پاکستان میں اردو قومی زبان اور علاقائی زبانیں، ہندوستان میں ہندی قومی زبان کے ساتھ اردو اور علاقائی زبانیں۔ ان سب کے درمیان انگریزی کسی ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ اردو سے محبت اور اردو کا دیگر زبانوں سے رشتہ کچھ تو انگریزی اور کچھ اردو غزل سے بنا ہوا ہے۔ ان تمام مباحث سے قطع نظر برطانیہ میں اردو کے ماضی وحال اور مستقبل پر گفتگو اپنے آپ میں ایک مبسوط کتاب کا لوازمہ فراہم کر سکتی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ برطانیہ سے اردو کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے دور حکومت میں اردو کے لئے خاصہ کام کیا تھا وہ چاہے ان کی سیاسی ضرورت تھی یا پھر کوئی اور مقصد، ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعے ہوئے اردو کے کاموں پر تنقید بھی ہوئی ہے۔ مستشرقین اردو، وہ چاہے ہندوستان میں رہے ہوں یا پھر برطانیہ میں ان لوگوں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں اور بعض بنیادی کام کئے ہیں۔ [شاعر کے حالیہ خصوصی شمارے "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ۔ا" میں خاکسار کا مقالہ اس موضوع پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی مقالہ نہایت ہی اہتمام کے ساتھ مقتدرہ قومی زبان کے ترجمان ماہنامہ اخبار اردو کی جنوری ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے] افکار (کراچی) کا ضخیم خاص نمبر "برطانیہ میں اردو" کے علاوہ اس موضوع پر اختر ضیائی کا ایک طویل مقالہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی گرانقدر کتاب "بیرون ممالک میں اردو" میں شامل ہے۔ میں یہاں اردو کے ایک اہم مستشرق اور برطانیہ کے بابائے اردو رالف رسل کے ایک حالیہ انٹرویو مطبوعہ شاعر جون، جولائی ۹۹ء سے ایک جملہ درج کر رہا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں "یورپ اور خصوصاً انگلینڈ میں اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے" یہ جملہ معنی خیز بھی ہے اور رالف رسل کی اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے جہد مسلسل کا ماحصل اور اختتامیہ بھی۔ اس جملے کی روح میں اتر کر کسی مکالمے کے بجائے بعض حقائق کے تناظر میں مستقبل کا کوئی عمل نامہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ میں اردو درس و تدریس کی روایت کو بہت دور سے نہ دیکھتے ہوئے سو ڈیڑھ سو سال ہی کو موضوع کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اردو کی درس و تدریس، خاصہ اہم کام ہوا ہے اور یہ کہ اس پوری روایت میں بہت سارے ناموں کے درمیان رالف رسل ایک بڑا نام ہے اور صرف رالف رسل ہی کے کارناموں کا احوال بیان کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس ایک شخص نے کتنا وقیع کام کیا ہے بالخصوص اردو درس و تدریس کے سلسلے میں غیر ملکی طلباء کے لئے جو تدریسی مواد انہوں نے ترتیب دیا وہ غیر ملکی طلباء کو اردو سیکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ برطانوی بالغان کو اردو پڑھانے کے لئے بھی انہوں نے خاصہ کام کیا ہے۔ ان کی کتاب A,NEW COURSE IN THE URDU AND SPOKEN HINDI کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے بنیاد بناتے ہوئے آج کے مطابق مزید سائنٹفک بنایا جا سکتا ہے۔ اسے اردو کی دیگر نئی بستیوں کے لئے ماڈل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جدید لسانیات وصوتیات کے اصولوں کے مطابق اور برطانیہ میں بنیادی انگریزی زبان کے پیش نظر یہ کام کیا ہے۔

برطانیہ میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں انگریز مستشرقین نے بہت اہم کردار کیا ہے بلکہ بنیادی کام انہیں لوگوں نے کیا ہے۔ تارکین وطن اردو والے تو بہت بعد میں شامل ہوئے ہیں۔ ان میں محمود ہاشمی جیسے لوگوں کی اردو خدمات غیر معمولی ہیں۔ برطانیہ میں اردو صحافت کی ابتداء ہاشمی صاحب سے ہی ہوئی ہے۔ ہفت روزہ "مشرق" کا اجراء کیا جو ۱۲ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ برطانیہ کے اردو مستشرقین کے بارے میں ہندوستان سے ایک اچھی اور معلوماتی کتاب "برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو" کے عنوان سے مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف ڈاکٹر علی جاوید ہیں۔ مشہور شاعر اختر ضیائی نے برطانیہ میں اردو کے عنوان سے یکم جون ۱۹۹۶ء میں جو طویل تفصیلی مقالہ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں پورے یورپ بلکہ دیگر براعظموں کی اردو بستیوں سے کہیں زیادہ اردو زبان وادب کے لئے کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور اردو کا مستقبل روشن ہے ۔ مگر صد فی صد ایسا ہے نہیں۔ نہیں۔ ہفت روزہ راوی (بریڈ فورڈ) کے مدیر وصحافی اور افسانہ نگار مقصود الہی شیخ اپنے اداریوں میں برطانیہ میں اردو زبان وادب کے مسائل پر سنجیدگی سے لکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص نئی نسل میں اردو سے عدم دلچسپی کے بارے میں بہت سارے سوال قائم کئے، لوگوں سے لکھوایا بھی، برطانیہ کے مستشرقین اردو بھی برطانیہ میں اردو کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ دراصل برطانیہ میں نئی نسل کے اپنے مسائل ہیں وہ نسل جو برطانیہ ہی میں پیدا ہوئی، یہیں کے ماحول و مزاج میں پروان چڑھی انگریزی کلچر سے اپنی سانسیں کشید کر رہی ہے، اس کے لئے اردو زبان، رسم الخط وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ واجبی مذہبی تعلیم میں قرآن مجید ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی جگہ دیگر کتابیں جو اردو کے بجائے انگریزی میں شائع ہو رہی ہیں، نئی نسل کو ضرورت بھر کام آتی ہیں۔ اور اب انٹرنیٹ نے نئی نسل کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں گھر گھر انٹرنیٹ موجود ہے۔ چھوٹے بڑے بچے اپنا خاصہ وقت انٹرنیٹ کو دے رہے ہیں۔ جدید الیکٹرونک دور میں انٹرنیٹ زندگی کی بنیادی ضرورت بنتا جا رہا ہے اور اس انٹرنیٹ سے اردو کی تدریس کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ پر ایک دنیا سمٹ آئی ہے۔ اردو کا سوفٹ ویئر آگیا ہے

برطانیہ میں ہندی والے کیا کر رہے ہیں؟ بول چال کی زبان مشترکہ ہندی اردو زبان ہی ہے۔ ہندوپاک کی دیگر زبانیں کیا کر رہی ہیں؟ ہندی رسم الخط کے ساتھ گجراتی، مراٹھی، بنگالی بولنے والے بھی برطانیہ میں ہیں۔ اب اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں رہی، بہت سارے مسلمان اردو نہیں جانتے اردو کی نئی بستیوں میں ہندی والے بھی بسے ہوئے ہیں اور جس طرح ان بستیوں کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو قائم ہے، ہندی کے شعبے بھی قائم ہیں اور ہندی کی تدریس کا عمل بھی جاری ہے بلکہ کئی جگہ ہندی شعبوں میں اردو کی تدریس بھی ضم ہے۔ تو کیا وہ نئی نسل جن کے بزرگ ہندی کو اپنی مادری زبان سمجھے ہوئے ہیں اور اپنے بچوں کو ہندی سکھانا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی تو رسم الخط کے مسائل ہوں گے۔ کیا یہ لوگ بھی اپنے بچوں کو رومن انگریزی کے ذریعے ہندی کی تدریس کر رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نہیں یا شاید پھر ایسا ہو رہا ہو؟ یہ مسئلہ صرف اردو رسم الخط ہی کے ساتھ کیوں؟ اردو کی نئی بستیوں میں چونکہ پاکستانی اور ہندوستانی مشترکہ طور پر بسے ہوئے ہیں اور ان میں بھی ان مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو اپنے گھروں میں اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانیں بھی بولتے ہوں گے اور انگریزی چلن کے ساتھ اپنے بچوں کی تربیت کر رہے ہوں گے تو ایک سوال یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ ان مسلمانوں نے کیا اپنے بچوں کو دینی تعلیم نہیں دی؟ یا نہیں دے رہے ہیں۔ ؟ کیا، انہوں نے اپنے بچوں کو قرآن مجید نہیں پڑھایا یا نہیں پڑھا رہے ہیں؟ قرآن مجید کی تدریس کا مطلب یہ ہوا کہ بچے کو عربی رسم الخط کی مبادیات سے ضرورت بھر واقفیت کروائی جائے۔ بغدادی قاعدہ یا پھر کوئی جدید ترین قاعدہ ضرور پڑھایا ہو گا یا پڑھاتے ہوں گے ہندوپاک میں اردو قاعدوں کی بھی ایک روایت ہے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم کا انحصار ان ہی قاعدوں پر ہے لیکن جدید قاعدوں کے باوجود اردو کی نئی بستیوں میں بھی اردو کی درس و تدریس سے وابستہ اردو دوستوں نے اردو کے قاعدے اور اردو کے نصاب مرتب کیے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں محمود ہاشمی (برمنگھم) نے بچوں کے لئے ابتدائی سطح پر نہایت ہی دلچسپ قاعدے کہانی کے انداز میں مرتب کئے ہیں۔ اردو رسم الخط کی جگہ رومن یا کوئی اور رسم الخط اپنانے کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اردو رسم الخط اور اردو املا مشکل ترین ہیں۔ یہ سائنٹفک نہیں جب کہ دنیا میں جتنے بھی رسم الخط رائج ہیں، سب کے ساتھ یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو منحصر ہے شوق پر۔۔۔ پھر یہ کہ ہر زبان کا اپنا لسانی کردار اور ثقافتی مزاج ہوتا ہے۔ اس کردار اور مزاج کو آپ کیوں کر قائم رکھ سکیں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ اردو رسم الخط کا مسئلہ لسانی ہے ہی نہیں۔ یہ تو سیاسی اور تہذیبی مسئلہ ہے جو دن بہ دن پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ بہت سارے مسلمان ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں کوئی دوسری زبان ہے۔ وہ ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں سندھی اور پنجابی زبانوں میں ہندی در آئی ہے۔ برطانیہ میں گجراتی، تمل وغیرہ زبانیں بھی ہیں اور ان کے بولنے والے اپنی بقاء کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر زبان کی اپنی کوششیں ہیں۔ اردو کے لئے ان زبانوں کے نیٹ ورک سے کام لیا جاسکتا ہے۔

اردو کی نئی بستیوں کے مہاجرین کا ایک مسئلہ وقت بھی ہے کہ یہاں پر بسے ہوئے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ وقت دے سکیں چنانچہ گھر یا ہر جو بھی نظام تعلیم ہے، بچے کو اس کے سپرد کرنے پر یہ لوگ مجبور ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں آدمی اور مشینوں کی مسابقت میں وقت اینڈھن ہے جسے مسلسل متواتر، اس مسابقت میں جھونکے بغیر زندگی اپنی کسی بھی رفتار میں جی نہیں سکتی جینے کے اس عمل میں بچوں کو شریک کرنا بھی ضروری ہوتا ہے لہذا رائج طریقہ تعلیم ان کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اب انٹرنیٹ ایک ایسا جدید ترین وسیلہ ترسیل بن گیا ہے کہ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ انٹرنیٹ ہی سے ہو گا اور نئی نسل میں اردو کی درس و تدریس انٹرنیٹ کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں اور یورپ میں برطانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اردو والوں کی بہت بڑی تعداد یعنی دس لاکھ سے زائد تعداد موجود ہے۔ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج اس اضافے کی جو بھی صورتیں ہیں اس کا جائزہ برطانیہ کے اردو ادیب شاعر، دانشور اور اساتذہ کرام کو لینا ہے کہ دنیا کی دیگر بڑی زبانیں اپنی زبان کی ترویج و اشاعت اور اپنے رسم الخط کا پھیلاؤ کس نہج پر کر رہی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کا اپنا اپنا مزاج، اپنا کلچر، اپنے وسائل اور شب و روز کا اپنا نظام ہوتا ہے، اس میں باہر سے آنے والوں کو پوری طرح شامل ہونا پڑتا ہے اور ان کی جو بھی نسل یا نسلیں ہوں گی وہ مکمل طور پر اس ترقی یافتہ ملک کی زائیدہ و پروردہ ہوں گی چنانچہ مہاجرین کی نئی نسلوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے پیش روؤں کی زبان، ان کے کلچر اور مذہب ہی کو اپنائیں، بہت مشکل ہے۔ بظاہر برطانیہ کے مشاعروں اور نئی نسلوں میں اردو کا مستقبل روشن تو نہیں تاہم اس کے امکانات ہیں کہ نئی نسلوں میں اگر کام کیا جائے تو نتائج امید افزا ہو سکتے ہیں۔ برطانیہ کے مشاعروں اور سیمناروں میں نئی نسل نہیں آ رہی ہے۔ نئے قلم کار تو بالکل ہی نہیں ہیں۔ پرانی نسلوں سے کام چل رہا ہے۔ ہاں! ہندوستانی فلمیں، فلمی گانے، پاکستانی ڈرامے اور غزل گائیکی ابھی کسی حد تک نئی نسل میں موجود ہے، مگر یہ سلسلہ تو کچھ دور جا کر ختم ہو جانے والا ہے۔ (یہ مضمون لندن میں اردو ٹرسٹ کی جانب سے منعقدہ عالمی اردو کانفرنس کے لکھے گئے خاکسار کے کئی مضامین میں سے ایک ہے)

مصوّر سبزواری

سنگ شکم پر ڈھوتے ڈھوتے سزائیں ختم ہوئیں
خالی قبریں بھرتے بھرتے عمریں ختم ہوئیں

ترکِ مراسم کے بعد اور وہ اچھا لگنے لگا
مان لیا تجدیدِ وفا کی شرطیں ختم ہوئیں

اپنا تعلق تو بگڑا تھا اس ہر جائی سے
رستوں سے کیوں برسوں کی پہچانیں ختم ہوئیں؟

رنگت باتیں، خوشبو لہجے، ریشم لفظوں کے
قریہ قریہ عطر اڑاتی سانسیں ختم ہوئیں

کرن کرن کے طواف میں دن بھی تھک کر بیٹھ گیا
کچھ کا سفر جاری تھا کچھ آوازیں ختم ہوئیں

● CHOUDHRI SARAI
SAMBHAL, DIST-MORADABA'D(U.P)



حکیم منظور

خوشبوئیں بجھ چکی ہیں یہ اندازہ ہو گیا
انداز کیا ہواؤں کا شائستہ ہو گیا !؟

شفاف صاف پانی کسے دے گیا فریب
کون آپ اپنی آنکھ کا گرویدہ ہو گیا ؟

پتھر تھا: مجھ میں ڈھونتے رہتے تھے لوگ نقش
میں غمزدہ ہوں جب سے میں آئینہ ہو گیا

آزردگی مزاج کی کام آگئی مرے
سب دور کیا ہوئے کہ میں آسودہ ہو گیا

مجھ میں نہ جانے کون سی برفوں کی آگ ہے
جو لفظ بھی کہا وہی انگارہ ہو گیا

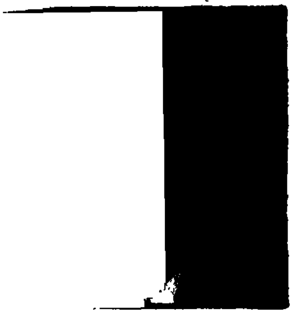
اس دن کی رات کی نہ ہوئی صبح آج تک
جس دن کہ ایک صبح کا بٹوارہ ہو گیا

مہکی ہوئی ہوائیں ہیں بہکے ہوئے گلاب
موسم نگاہ و رنگ کا آمیزہ ہو گیا

ذکر گلاب ذکر صبا جب سے بند ہے
دیکھا ہوا جو تھا وہی نادیدہ ہو گیا

معنیٔ سخن کے بدلیں گے منظور طے ہے یہ
بوجھل اگر کتاب پہ دیباچہ ہو گیا

● 10, PRATAP PARK, PRESS
ENCLAVE SRINAGAR-190001 (J&K)



مصحف اقبال توصیفی

دھوپ سر پر ہے اٹھو، ضد مت کر
چائے کی پیالی..؟ یہ لو ضد مت کر

اپنی زلفوں سے مجھے باندھا ہے کیوا
ہاتھ میرے کھول دو ضد مت کر

ٹھیک سے چلنا تو پہلے سیکھ
اتنے اونچے مت اڑو ضد مت کر

پاس بیٹھو گے تو وہ کھوجائے
دور ہی سے دیکھ لو، ضد مت کر

زخم جاگ اٹھیں گے پھر کروٹ نہ
رات ہے، لیٹے رہو، ضد مت کر

آستیں سے اپنی آنکھیں پونچھ
جاؤ اس سے بھی ملو، ضد مت کر

شہر کے بازار، سڑکیں سو گئے
اب اٹھو، اب گھر چلو، ضد مت کر

مصحفؔ اس کا دل دُکھاتا ہے ضر
ایسے پتھر مت بنو، ضد مت کر

FLAT NO.204, MOGHAL MAST
TS.12-2-82/A/2, MAHDIPATNAM
/DERABAD-500028

ش۔ صغیر ادیب
65- BLACK BURN STREET
BLACK BURN BB1 7NG LANCS (U.K.)

اس کا زادِ راہ

شہاب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بجنے والے تھے۔ دم بدم ڈوبتی شام کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ نیم کے پیڑ پر بسیرا کرنے والے پرندوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ مگر یہ شور اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ پرندے اسے ہمیشہ سے پسند تھے، اور ان کی موسیقی ریز چہکار۔ بچپن میں بلبل مینا اور کبوتر بڑے شوق سے پالا کرتا تھا۔ اب لڑکپن نہیں تھا مگر پرندوں سے اس کی دلچسپی بھی برقرار تھی۔ اس دلچسپی اور لگاؤ کا سبب کیا تھا۔ اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ پرندے آزادی اور خود مختاری کی علامت ہیں پرندے کسی کے تابع فرمان نہیں ہوتے، نہ مجبور و محکوم ہوتے ہیں۔ وہ کھلے آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ آزاد، خود مختار اور بے فکر۔ وہ اپنی زندگی خود جیتے ہیں۔ اور بالکل اسی طرح، جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ آزادی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ساری زندگی اسے ان راستوں پر چلنا پڑا تھا جو حالات نے اس کے لئے کرائے تھے۔ اور ان فیصلوں کو ماننا پڑا تھا، جو وقت نے کئے تھے۔ زندگی کے اسٹیج پر اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ اور شاید یہ اسی محرومی اور مجبوری کا ردعمل تھا کہ اسے کھلی فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پرندوں کی آزادی میں اسے اپنی محرومی کی تلافی کا عکس نظر آتا۔ شاید یہ خود فریبی ہی ہو۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ کبھی کبھی خود فریبی زندگی کی بہت سی محرومیوں کا نعم البدل محسوس ہوتی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر نیم کے پیڑ کو دیکھا، گہری سبز پتیوں سے لدی پھندی اسکی ٹہنیوں پر چڑیاں ادھر ادھر پھدک رہی تھیں۔ اور شور مچا رہی تھیں۔ وہ چند ثانیئے مسکراتی نظروں سے چڑیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر نگاہ خود بخود گھڑی پر چلی گئی۔ چھ بج کر دس منٹ، وہ قدرے بے چین ہوا۔ آخر یہ وقت گذر کیوں نہیں رہا۔ گھڑی کی سوئیاں اتنی سست کیوں ہیں؟ پھر وہ دھیرے سے ہنسا، آخر یہ اتنی بے چینی کیوں؟ وہ تو خود ہی وقت سے پہلے آگیا ہے۔ اکبری باجی نے بتایا تھا کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اب اگر وہ پونے چھ بجے ہی وہاں پہنچ گیا ہے تو یہ غلطی اسی کی ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کا کیا قصور۔

مگر وہ بھی کیا کرتا۔ چھتیس سال گذرے۔ گویا ایک عمر، ایک زندگی بیت گئی۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک سلطانہ سے پھر ایک بار چند منٹ کے لئے ہی سہی ملاقات کی انہونی ممکن ہو سکے گی۔ یہ آس تو مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے صبر کر لیا تھا۔ زندگی جیسے بھی گذری، گذر گئی۔ جو باقی ہے وہ بھی گذر ہی جائے گی۔ گئے دنوں کی یادیں اس کی پونجی ہیں۔ اس کی متاعِ حیات، انہی کے سہارے اس نے زندگی کے محروم و افسردہ زندگی کے بے کیف شب و روز گذارے ہیں اسے کوئی غم نہیں، کوئی پچھتاوا نہیں۔ تقدیر کی جھولی میں اس کے لئے جو کچھ تھا، وہ اسے ملا۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ پونجی کچھ ایسی کم بھی تو نہیں، اس کار گہہ شیشہ گری میں بے شمار لوگ تو بس کانچ کی طرح جیتے ہیں، ٹھیس لگی اور چور چور ہو گئے۔ اور انہیں اتنا بھی نہیں ملتا جتنا اسے ملا ہے۔ اس کے پاس تو سلطانہ کی یادیں ہیں۔ اور بھرم کہ وقت نے سلطانہ کے دل میں اس کی چاہت کم نہیں کی ہے۔ خود اس کے اپنے تصور میں سلطانہ کا سراپا محفوظ ہے۔ اس کی جلترنگ جیسی میٹھی آواز، اس کی شام کے کاجل سے سنوری آنکھیں اور اس کا تراشیدہ منور چہرہ۔ چھتیس برسوں میں نہ تو اس کے دل میں بسی یادیں دھندلائی ہیں اور نہ ہی سلطانہ کے نقش و نگار پر گرد جمی ہے۔ وہی آواز، وہی آنکھیں اور بال اور چہرہ آج بھی اس کے ذہن میں موجود ہے۔ اور یہ پونجی زندگی گذارنے کے لئے کچھ ایسی کم تو نہیں، بلکہ شاید ہفت اقلیم کی دولت سے بھی زیادہ ہے۔

سلطانہ کا خیال آیا تو دل میں ایک بھنور سا اٹھا۔ کیا ہوگا؟ اتنی طویل مدت کے بعد جب سلطانہ سے سامنا ہوگا تو کیا محسوس ہوگا؟ کیا وہ اپنے دل کو سنبھال سکے گا۔ اس نے اضطراری انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مشکل ہے، بڑا سخت امتحان ہے۔ ہر چند کہ وہ اب ایک سنجیدہ، عمر رسیدہ آدمی ہے۔ پھر بھی سلطانہ سے سامنا کرنا آسان نہ ہوگا۔ خدایا، کیسا عجیب لمحہ ہوگا وہ۔ سلطانہ اس کے سامنے ہوگی۔ اور وہ......ایک بار پھر اس نے زور سے سانس لی اور بے چینی سے پہلو بدلا۔۔۔ وہ اسے دیکھے گا۔ خواب یا تصور میں نہیں بلکہ جیتا جاگتا، روبرو۔ تب کیا کرے گا وہ؟ کیا کہے گا؟ اور سلطانہ کیا کہے گی؟۔ ہر چند کے اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ گذرے چھتیس برسوں کے روز و شب کی باتیں، اَن گنت باتیں۔ دکھ درد اور محرومیاں اور یادوں کے سہارے زیست کرنے کا جتن۔ اور سلطانہ کا دامن بھی تو خالی

نہیں ہوگا۔اس کے پاس بھی یقیناً بے شمار باتیں ہوں گی۔اس کی اپنی باتیں، بال بچے اور شوہر، پردیس میں پینتیس چھتیس سال اس نے کیسے گذارے۔ مگر کیا وہ ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ سکیں گے۔ شاید زبانیں ساتھ نہ دیں، شاید دل حوصلہ ہار جائیں اور ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں!۔

اپنے اضطراب پر قابو پانے کی لاشعوری کوشش کے طور پر اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا برآمد کی۔ مگر ڈبیا کھولی تو کوفت مزید بڑھ گئی۔ صرف ایک سگریٹ تھی۔اس نے سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ ایک طرف اچھال دیا۔ پھر ایک طویل کش لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ دھوپ کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔اور اجالا دھیرے دھیرے معدوم ہو رہا تھا۔ اطراف کے بعض مکانوں سے گہرا کثیف دھواں اٹھ کر کاہلی سے فضا میں پھیل رہا تھا چھت کے اوپر پھیلی نیم کی گھنی شاخوں میں دھندلکا نسبتاً زیادہ گہرا تھا۔ اور ساتھ ہی چڑیوں کا شور بھی بڑھ گیا تھا۔وہ چند لمحے چڑیوں کی چہکار سنتا رہا۔ پھر یکایک مسکرایا۔ پرندے، سلطانہ کو بھی تو پرندے بہت پسند تھے۔ مینا، بلبل اور لعل۔!

یکایک اس کے کانوں میں سلطانہ کی آواز گونجی۔ "اپنا خیال رکھنا۔۔"

اور زندگی بھر اس نے صرف یہی کیا تھا کہ اپنا خیال رکھا تھا۔کیوں کہ یہ سلطانہ کے آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے تھے۔

پھر وہ چلی گئی تھی۔

بچپن سے دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ ساتھ کھیلے تھے، شرارتیں کی تھیں۔ کچھ عرصہ مدرسے میں بھی ساتھ رہا تھا۔ بچپن گذرا، جوانی میں قدم رکھا۔ دونوں کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن جس طرح بلند پہاڑیوں کے درمیان گہری گہری گھاٹیوں میں خودرو گھاس خود بخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح ان کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کی چاہت خود بخود پیدا ہوئی تھی اور چپکے چپکے بڑھتی رہی تھی۔ لیکن دونوں بے خبر تھے۔ احساس اس وقت ہوا، جب سلطانہ کی اماں نے ذکر کیا کہ اس کی نسبت کئی سال پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ اس کا منگیتر خارجہ کے محکمے میں ملازم ہو کر سویڈن گیا ہوا ہے۔

سلطانہ نے یہ اطلاع شہاب کو دی۔ اور اس وقت پہلی بار وہ اس محبت سے آگاہ ہوئے جو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے تھی۔ زبان سے کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ آتی بھی کیسے؟ انہیں تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کے تحت الشعور میں خود بخود یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ جس طرح بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں، اسی طرح باقی زندگی بھی ساتھ رہیں گے۔ گمان تک نہیں گذرا کہ ان کے راستے کبھی الگ ہو جائیں گے۔ مگر اب منگنی کا انکشاف ہوا تو جدائی کا احساس بھی ہوا۔ اور شاید اس جاں سوز احساس ہی نے انہیں بتایا کہ وہ ایک دوسرے سے چپکے چپکے محبت کرتے رہیں ہیں۔ مگر دیر ہو چکی تھی بہت دیر ہو چکی تھی۔ دل کی بازی وہ اس طرح ہارے تھے کہ انہیں خبر تک نہ ہو سکی تھی۔

وہ ملاقات اکبری کے گھر میں ہوئی تھی۔ اکبری باجی اور سلطانہ کے گھریلو مراسم تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں کی بہت شفیق دوست بھی تھیں۔ اور وہ اکثر وہاں ملا کرتے تھے۔ اس وقت وہ دونوں چھت پر تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ بہت دور مغرب میں سورج آدھا ڈوب چکا تھا، اور باقی نصف سورج ایک سرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی گہری سرخی افق پر دور تک یوں پھیل گئی تھی جیسے ہزاروں لاکھوں محبت کے مارے دلوں کا خون ہو گیا ہو۔

دونوں دیر تک چپ رہے۔ شہاب وحشت بھری نظروں سے ڈوبتے سورج کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زور سے سانس لی۔

"یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔۔" آخر کار اس نے کہا۔ اس کی آواز میں دل کے ٹوٹنے کی بازگشت تھی۔

"ہاں۔۔"

"اب کیا کریں۔؟"

"میں اماں ابا کو دکھی نہیں کر سکتی۔۔۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" شہاب نے مدھم آواز میں کہا۔ "کیوں کہ یہ جو ماں باپ ہوتے ناں یہ بڑے پیارے انسان ہوتے ہیں۔ بے لوث، بے غرض، دنیا میں شاید ہر شے کا نعم البدل ہے، مگر ماں باپ کا نہیں۔ یہ لوگ صرف محبت کرتے ہیں۔ اپنا سب کچھ اپنے بچوں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ دن کا سکون، رات کا چین، اپنی خواہش، اپنی خواہشیں اور ضرورتیں تیاگ دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے دامن میں چھپا کر اس طرح پالتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دکھ، کوئی آفت ان کے قریب نہیں پھٹک پاتی۔ بچے کی جان پر بن آئے تو اپنی زندگی کے عوض اسکی زندگی اور سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔ اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ ماں باپ کی قوم بڑی انوکھی ہوتی ہے کہ ان کی محبت اور ایثار میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے۔۔" وہ یکایک رکا، آنکھوں میں جھلملاتا آنسو پونچھا۔ پھر افسردگی سے مسکرایا۔ "انہیں دکھ دینے کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔۔۔"

سلطانہ نے محبت سے اسے دیکھا۔

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ اور دیر تک چپ رہے۔ اور غمگین سناٹا انکے چاروں طرف پھیلتا گیا اور بڑھتا گیا۔ سورج کچھ اور جھک گیا۔ افق کی سرخی کچھ اور خون آلود ہو گئی۔ اور آسمان، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، کچھ اور زیادہ ویران ہو گیا۔ سلطانہ نے سر اٹھا کر آسمان میں اڑتے اکا دکا بے آسرا، بے گھر، بے منزل پرندوں کو دیکھا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمہاری نوکری کا کیا ہوا۔؟"

"ارے ہاں۔" شہاب زور سے چونکا۔ "میں ذکر کرنے ہی والا تھا۔"

نوکری مل گئی ہے۔ اگلے ہفتے مجھے جانا ہوگا۔" اتنا کہہ کر وہ بے معنی انداز میں ہنس پڑا۔

"ہنسے کیوں۔؟" سلطانہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس کی ہنسی میں چھپا کرب کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ "ملازمت کا پروانہ ملا تھا تو یوں ہی خود بخود ایک خیال آیا تھا کہ وہاں جاؤں گا ایک اچھا سا گھر بناؤں گا۔ اور پھر......" اس نے رک کر شکستہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔ "اور پھر ہم دونوں اس میں رہیں گے۔۔ کتنی احمقانہ بات ہے، ہے ناں۔۔۔"

سلطانہ کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ نے دم توڑا۔

چند لمحے بعد سلطانہ نے کہا۔ "وہاں رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔"

"ابھی نہیں، لیکن ہو جائے گا۔"

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ مغموم نظروں سے اسے دیکھا۔ "شہاب سورج ڈوب رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"ہاں۔" شہاب کے سینے میں کوئی شے چیخ کر ٹوٹ گئی۔ "ہاں بہت گہرا اندھیرا ہو جائے گا۔ پھر پتہ نہیں کب اجالا ہو۔ ہو بھی کہ نہ ہو۔"

سلطانہ کے ہونٹ لرزے۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر پھر چپ ہو گئی۔ وہ بھی چپ رہا۔ حالانکہ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ اور جی بھی چاہتا تھا، کہ ڈھیر ساری باتیں کر لیں۔ دل کی حسرت نکال لیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بچھڑ جائیں گے۔ اپنے اپنے راستوں پہ چلے جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہو، کون جانتا ہے۔ جانے پھر ملاقات ہو نہ ہو۔ ہو سکتا ہے، پھر بھی سامنا ہو اور عمر گذر جائے۔ تو پھر کیوں نہ ان چند لمحوں کو جو انہیں ملے ہیں، امر کر لیں۔ مگر باوجود خواہش کے کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی اپنی ردائے دکھ میں لپٹے چپ چاپ کھڑے رہے اور ڈوبتے سورج کو یوں دیکھتے رہے جیسے سورج نہیں، وہ خود ڈوب رہے ہوں۔

یکایک سلطانہ نے کہا۔ "اچھا شہاب میں چلتی ہوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔۔"

"اچھا۔" اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

سلطانہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ معاً اس نے کہا۔ "سلطانہ۔"

وہ رک کر گھومی۔ "کہو۔"

"بس چند پل یوں ہی کھڑی رہو۔" اس نے کرب میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"اچھا۔"

وہ چند قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑی تھی۔ کاسنی رنگ کے شلوار جمپر میں ملبوس۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے اس کے گرد ایک ہالہ سا بن دیا تھا۔ اور اس ہالے کے درمیان وہ آکاش سے اتری کسی اپسرا کی طرح نظر آتی تھی۔ بلور کی طرح منور، اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ترشے ہوئے نین نقش، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بال۔ شہاب اسے دیکھتا رہا۔ اپنے آپ سے، اپنے گردوپیش سے، تمام موجودات و مظاہر سے بے خبر ہو کر یوں دیکھتا رہا جیسے اس منظر کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتا ہو اپنی روح میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔ لمحے ایک ایک کر کے گذرے لیکن وہ چند لمحے بے حد انمول تھے۔ اس کی زندگی کا حاصل، اب یہی لمحے اس کا زادِ راہ ہیں۔ اور اس کی بیساکھی کہ ان ہی کے سہارے اسے اپنی زندگی گذارنی ہے۔

وہ چند لمحے بے آواز گذر گئے تو اس نے کہا۔ "اب جاؤ۔"

سلطانہ افسردگی سے مسکرائی، آگے بڑھی۔ مگر زینے کے پاس پہنچ کر پھر رک گئی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اپنا خیال رکھنا۔"

اگلے ہفتے اُس نے اس شہر کو خیر باد کہہ دیا۔ جہاں زندگی کے انگنت شب و روز گذارے تھے۔ پہلے گاؤں جا کر والدین سے ملا۔ پھر تین سو میل دور واقع اس چھوٹے سے شہر کا رخ کیا جہاں ملازمت ملی تھی۔ نیا شہر تھا، نئے لوگ اور نیا ماحول۔ ابتدا میں اسے بڑی وحشت ہوئی۔ تنہائی اور بے گھر ہونے کا احساس گھیرے رہتا تھا۔ مگر بتدریج اس نے نئے ماحول کو قبول کر لیا۔ اور رفتہ رفتہ ایک معمول بھی بن گیا۔ دفتر، گھر، چند ایک دوست بن گئے۔ اور وقت بہت سست روی سے ہی سہی۔ گذرے،

اکبری باجی سے رابطہ تھا۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ سلطانہ کی شادی ہو گئی ہے۔ پھر یہ اطلاع بھی ملی کہ اپنے شوہر کے ساتھ سوئیڈن چلی گئی ہے۔ چند ماہ بعد اس کی اپنی شادی بھی ہو گئی۔ اس کی بیوی خاصی تعلیم یافتہ تھی رنگ و روپ بھی اچھا تھا۔ اور گھر گرہستی بھی جانتی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان مفاہمت، ہم آہنگی اور قربت پیدا نہ ہو سکی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ اس کی بیوی شاکرہ کا اپنا مزاج تھا۔ جس میں خود پسندی کا پہلو نمایاں تھا۔ بنیادی طور پر اس میں خود اپنے آپ سے محبت کرنے کی خو زیادہ تھی۔ اور کچھ اس کارن کہ وہ خود اپنے آپ کو شاکرہ کی جانب ملتفت کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ سلطانہ چلی گئی تھی۔ وقت گذر گیا تھا۔ مگر وہ شام اس کے تصور میں زندہ تھی، آخری ملاقات کی شام۔ اداس، پر سکوت شام۔ ڈوبتا ہوا سورج اور نارنجی کرنوں کے ہالے میں گھری ہوئی سلطانہ، اور اس کے لبوں سے نکلے ہوئے آخری الفاظ "اپنا خیال رکھنا" گو ان گنت شب و روز گذر چکے تھے۔ مگر وہ منظر جوں کا توں اس کے تصور میں زندہ تھا۔ اس پر وقت کی گرد نہیں جمی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ منظر ماضی کے سیاہ خانوں میں گم ہو جائے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی آس، کوئی خوشی، حتیٰ کہ کوئی شکوہ بھی نہیں۔ لے دے کے بس وہ ایک منظر ہی تو تھا اس کے پاس۔ اس کی کل پونجی، اس کی متاعِ حیات، اس کا زادِ راہ کہ اسی کے

سہانے [illegible] گذارنی تھی۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس شام کو اپنے احساس، اپنے [illegible] رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور آدمی تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں، قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اپنی اخلاقی ذمہ داری کو پہچانتا تھا، چنانچہ باوجود اس کے کہ اس کے دل میں شاکرہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، اس نے اسے شکایت کا موقع کبھی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ اسے خفیف سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ اس کے دل کے نگار خانے میں کسی اور کی تصویر آویزاں ہے۔ اپنی ذمہ داریاں نبھانے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مگر کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے دونوں نے اپنے لئے اپنی اپنی ایک غیر مرئی دنیا تخلیق کرلی اور اس میں مگن ہوگئے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے۔ مگر اس طرح گویا دونوں کے درمیان محض رسمی شناسائی ہو۔ نہ وہ شاکرہ کے معاملات میں دخل دیتا اور نہ شاکرہ اس کی مصروفیات میں مخل ہوتی۔ اکثر وہ اپنے میکے چلی جاتی اور کئی کئی ماہ گذار کر واپس آتی۔ لیکن اسے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

وقت کی انگلیوں میں شب و روز کی تسبیح گردش کرتی رہی۔ دن، مہینے، سال۔ دھیرے دھیرے بہت کچھ بدل گیا۔ چہرے، مزاج، قدریں۔ زندگی جو اس کے بچپن میں ایک نرم رو ندی کی طرح بہتی تھی، اب ایک تیز سرکش اور لاپرواہ آبشار کی مانند بھاگنے لگی۔ وہ زندگی اور وقت کے ساتھ نہیں چل سکا بلکہ پیچھے رہ گیا۔ اتنا پیچھے کہ اس لمحے سے آگے بڑھ ہی نہیں سکا، جب اس نے آخری بار سلطانہ کو شام کے نارنجی دھندلکے میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی بھی اسی لمحے میں زندہ تھا۔ سلطانہ سامنے کھڑی تھی۔ اور اپنے آپ سے غافل ہو کر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور شام رفتہ رفتہ ڈوب رہی تھی۔

مگر سے کوئی ملال نہیں تھا۔ نہ پچھتاوا اور نہ کوئی شکوہ۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے۔ شکایت کیوں اور کس سے؟ ایک زندگی ہی تو گذارنی ہے۔ گذر جائے گی۔ چنانچہ وہ زیست کرتا رہا۔ سلطانہ کے بارے میں کبھی کبھی کوئی اطلاع مل جاتی تھی۔ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ کئی سال سوئیڈن میں گذارنے کے بعد اس کے شوہر کا تبادلہ پہلے ناروے اور پھر افریقہ کے کسی ملک میں ہوگیا تھا۔ وہاں سے پھر وہ انگلینڈ آئی۔ اور چند سال وہاں خدمات انجام دینے کے بعد اس کے شوہر نے کچھ وجوہ سے ملازمت چھوڑ دی اور انگلینڈ میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس کے بعد اطلاع ملنے کا سلسلہ تقریباً منقطع ہی ہوگیا۔

پینتیس چھتیس سال گذر گئے۔ ان گذرے ماہ و سال نے اپنا خراج وصول کیا۔ وہ جو کبھی بڑا وجیہہ، صحت مند اور زندگی سے بھرپور تھا۔ دھیرے دھیرے خود اپنا سایہ بن گیا۔ قویٰ مضمحل ہوئے، بالوں میں چاندی اتر آئی۔ عمر نے ساٹھ کے دروازے پر دستک دی تو انحطاط اور بھی بڑھا۔ حتیٰ کہ اسے چلنے پھرنے کے لئے کبھی کبھی کسی چھڑی کے سہارے کی ضرورت بھی پڑنے لگی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ زندگی جیسی بھی گذری، بری نہیں گذری۔ گو اسے سب کچھ نہیں ملا۔ پھر بھی جو کچھ ملا، کچھ ایسا کم بھی نہیں تھا مگر اطمینان کے باوجود پچھلے کچھ برسوں سے ایک خواہش، ایک آرزو اس کے دل میں سر ابھارنے لگی تھی۔ سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش گذشتہ کئی برسوں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ کس شہر میں رہتی ہے؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟ جب بھی سلطانہ کا خیال آتا۔ دل میں ایک حسرت سر اٹھانے لگتی۔ برسوں پہلے کا وہ منظر آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ اور اس کی آواز کانوں میں گونجتی۔

"اپنا خیال رکھنا۔"

وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ اس کے دل میں سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش نے جنم لیا تھا اور بالکل اسی طرح جنم لیا تھا، جیسے اونچے پہاڑوں کے درمیان چھپی گہری گھاٹیوں میں خودرو گھاس خود بخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ بالکل غیر محسوس طور پر اس کی یہ آرزو بھی چپکے چپکے بڑھی تھی اور شدید ہوتی گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی۔ آخر کیوں؟ لیکن سمجھ نہ پاتا۔ شاید سبب یہ ہو کہ زندگی کی شام سر پر تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اور اس احساس نے کہ اب غروب میں شاید کچھ وقت نہیں ہے اس کے من میں اس تمنا کو ابھارا تھا کہ وہ ایک بار اور سلطانہ کو دیکھ لے۔ ایک بار اور اسکی میٹھی آواز سن لے۔ پھر اسے اطمینان ہو جائے گا۔ دل کی حسرت نکل جائے گی اور اسے محرومی کا احساس نہیں رہے گا۔ مگر یہ سوچ کر کبھی کبھی اسے پچھتاوا اور ملال ہوتا کہ اس حسرت کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سلطانہ بہت دور انگلستان میں بیٹھی ہے۔ اپنے گھر بار میں مگن ہے۔ عرصے سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اس صورت میں اس سے ملاقات کا کیا امکان ہے۔ نہیں، اب یہ ممکن نہیں۔ شاید حسرت، حسرت ہی رہے گی۔ اور سورج غروب ہو جائے گا۔ تاہم جب وہ اپنے دل کو ٹٹولتا تو محسوس کرتا کہ اگر سلطانہ سے پھر کبھی سامنا نہ ہو تو اسے قسمت سے کچھ ایسی زیادہ شکایت نہیں ہوگی۔ اس کے لئے اتنا اطمینان کافی ہے کہ سلطانہ جہاں بھی ہے خوش ہے، مطمئن ہے۔

لیکن جب اکبری باجی نے یکایک کہا کہ سلطانہ سے ملوگے تو اس کے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی۔

اسے اپنے پرانے شہر میں اتفاقیہ طور پر ایک کام پڑ گیا تھا۔ چنانچہ اسے تین سو میل کا سفر کرنا پڑا۔ اس بار اس کی آمد برسوں بعد ہوئی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ شہر کافی حد تک بدل گیا تھا۔ ان گنت نئی نئی عمارتیں کھڑی ہوگئی تھیں۔ پبلک پارک جو پہلے بہت خوبصورت اور وسیع تھا، نصف سے زیادہ غائب ہو گیا تھا۔ گندگی بہت زیادہ تھی۔ سڑک پر ہجوم بہت زیادہ تھا اور شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح چند ایک دن گذارے اور مسلسل ان بیتے دنوں کو یاد کیا،

تب یہ شہر بہت خوبصورت، صاف ستھرا اور پر سکون ہوا کرتا تھا۔ لیکن گئے دنوں نے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ نہ صرف انسانوں سے بلکہ آبادیوں سے بھی۔ اب انسانوں کے پاس محبت اور مروت نہیں رہی تھی اور آبادیاں سکون اور تحفظ کی ضمانت سے محروم ہو گئی تھیں۔

شام کی گاڑی سے اس کی واپسی تھی۔ صبح وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کباب، سموسے اور اس کا پسندیدہ بیسن کا حلوہ۔ ابھی وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ معاً اکبری باجی نے کہا۔

"شہاب، سلطانہ سے ملو گے۔؟"

یکلخت اسے یوں لگا جیسے زمین پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔ ہاتھ اس بری طرح سے کانپا کہ چائے چھلک گئی۔ اس نے عجلت سے پیالی میز پر رکھی۔ اور سٹ پٹا کر اکبری باجی کو دیکھا۔

"سلطانہ سے۔؟"

"ہاں۔"

"مگر وہ......"

"آج کل وہ یہیں ہے۔ عزیزوں سے ملنے آئی ہے۔ اب شاید دو چار دن میں واپس جانے والی ہے۔"

"مگر اسے کیا علم کہ میں یہاں ہوں۔"

"میں نے بتایا تھا پرسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

شہاب چند لمحے چپ بیٹھا رہا۔ اور بے یقینی سے اکبری باجی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ دل کی شوریدہ سر دھڑکنوں اور اعصابی انتشار پر قابو پانے کے لئے اسے چند منٹ کی مہلت درکار تھی۔ چائے سپ کر کے اس نے سگریٹ جلائی۔ ایک کش لیا، پھر زور سے سانس لے کر بولا۔

"اچھی تو ہے وہ۔؟"

"ہاں۔"

چند ثانئے چپ رہ کر اس نے کہا۔ "اب تو کافی عمر ہو گئی ہو گی اس کی۔؟"

اکبری باجی زور سے ہنسیں۔ "لو، کیسی عجیب بات کرتے ہو تم بھی۔ برسوں گذر گئے۔ تم بوڑھے ہو گئے۔ میرے چہرے پر بھی لکیریں پڑ گئیں تو ابھی تک وہ جوان ہی رہے گی۔"

وہ جھینپ کر مسکرایا۔ "ہاں خیر یہ تو ہے۔ پینتیس چھتیس برس تو ہو گئے اسے باہر گئے ہوئے۔" لمحہ بھر رک کر پھر بولا۔ "مگر باجی میں تو آج شام کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔"

"تو کیا ہوا، جانے سے پہلے چند منٹ کے لئے مل لو۔"

"لیکن کیا یہ مناسب ہو گا۔؟"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ، ممکن ہے وہ پسند نہ کرے۔"

"ارے نہیں۔" اکبری باجی مسکرا کر کہنے لگیں۔ "میں نے تمہارا ذکر کیا تو دیر تک تمہارے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی۔ جب میں نے ذکر کیا کہ تم ایک دو دن میں واپس جانے والے ہو تو اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔"

"اچھا۔" اس کے دل کی دھڑکن دفعتاً بڑھ گئی۔

"ملنے کی خواہش ظاہر کی۔!"

"ہاں تبھی کہنے لگی، میں چند دن میں واپس لندن جاؤں گی۔ پھر کون جانے کبھی ایسا اتفاق ہو نہ ہو۔ لہٰذا چند منٹ کے لئے مل لوں۔ خیریت پوچھ لوں، پھر کہنے لگی کہ ایک نظر شہاب کو دیکھنے کے لئے بہت جی چاہتا ہے۔" اکبری باجی رکیں، پھر بولیں۔ "میں نے آج شام کو اسے چائے پر بلایا ہے۔ تم بھی آجانا اور چند منٹ کے لئے ملاقات کر لینا۔"

وہ حیرت اور بے یقینی کے حصار میں گھرا بیٹھا رہا۔ سلطانہ سے ایک بار پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔ ایک بار پھر وہ اس کی من موہنی صورت دیکھ سکتا ہے اور اس کی آواز کی جلترنگ سن سکتا ہے۔ خدایا یہ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ اس نے زور سے سانس لی اور اضطراری حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو معاً وہ منظر سامنے آگیا جو اس کی زندگی کی کل جمع پونجی تھا۔ جس کے سہارے اس نے عمر کا سفر طے کیا تھا۔ سورج ڈوب رہا ہے، سلطانہ سامنے کھڑی ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ پورا منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ۔ سلطانہ کا سراپا، اس کا خوبصورت چہرہ، اس کی منور آنکھیں اور...... اس نے اضطراری حالت میں ایک اور سگریٹ جلائی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" اکبری باجی نے پوچھا۔

"خیر یہ تو ٹھیک ہے کہ چند منٹ کے لئے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" آخرکار اس نے کہا۔ "میں آجاؤں گا۔"

مگر جب وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اطلاع دی کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اوپر چھت پر جا رہا ہے۔ جب سلطانہ آئے گی تو نیچے آجائے گا۔ چھت پر پہنچا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ برسوں پہلے وہ اسی چھت پر سلطانہ سے آخری بار ملا تھا۔ گو چھت وہی تھی مگر اب چند تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ اور گرد میں کئی بلند عمارتیں بن گئی تھیں۔ گلی میں ایستادہ نیم کا درخت بڑھ کر اب چھت سے اوپر نکل گیا تھا۔ اور اس کی گھنی شاخوں نے نصف چھت کو ڈھک لیا تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اکبری باجی نے چھت پر ایک کمرہ بنوا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر حیرت اور تاسف ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ تبدیلیاں اسے اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک خلش اور پچھتاوے نے دل میں چٹکی لی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی کوئی عزیز شے اس سے چھین لی گئی ہو۔ کم از کم ایک شے تو ضرور چھین لی گئی تھی۔ ڈوبتا ہوا سورج کہ نیم کی گھنی شاخوں نے اب مغربی افق کو چھپا لیا تھا۔

اس بار گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ معاً اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراری انداز میں چھت پر ٹہلنے لگا۔ اس خیال نے کہ کچھ ہی دیر میں سلطانہ آنے والی ہے۔ اس کے دل میں ہیجان اور تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ابھی سلطانہ آئے گی تو کیسا لگے گا، کیسا محسوس ہوگا۔ سلطانہ کیا کہے گی، وہ کیا کہے گا۔ اس نے چشم تصور سے اس لمحے کو دیکھنے کی کوشش کی جب وہ ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ سلطانہ اور وہ، ایک دوسرے کے روبرو۔ تقریباً چھتیس سال بعد، خدایا، کیا ہوگا، وہ لمحہ قیامت سے کم تو نہ ہوگا۔ اس نے بے قراری سے چند قدم اٹھائے پھر یکایک دھیرے سے ہنسا۔ حد ہو گئی، ارے بھئی اس میں اس قدر گھبراہٹ کی کیا بات ہے۔ وہ کوئی نوجوان لڑکا لڑکی تھوڑا ہی ہیں۔ دونوں سنجیدہ اور باشعور انسان ہیں۔ اور چند منٹ کے لئے ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو پھر پریشانی کیسی؟ نہیں، اسے اتنا مضطرب نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر کو ہولے سے جھٹکا۔ نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھے گا۔ اور اطمینان سے گفتگو کرے گا۔ سلطانہ کی خیریت پوچھے گا، اور اس کے بچوں کا حال، لندن کی باتیں، لندن میں اس کا گھر کیسا ہے؟ وہاں اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ یوں جیسے اسے اطمینان کا احساس ہوا ہو

ٹہلتے ٹہلتے وہ رک گیا۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بڑا آئینہ نصب تھا۔ وہ بے خیالی میں آگے بڑھا، کمرے میں گیا۔ ہاتھ بڑھا کر بتی جلائی۔ اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اور تب یکلخت اس کا دل ڈوب سا گیا۔

آئینے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے سر پر گنتی کے بال تھے۔ کچھ سلیٹی، کچھ سفید۔ ایک بوڑھا بے رونق چہرہ تھا، جس پر ان گنت لکیریں پڑی تھیں۔ گردن کی کھال تھوڑی سی لٹکی ہوئی تھی، آنکھوں پر دبیز چشمہ تھا اور کمر میں خفیف سا خم۔ اس آدمی کے چہرے پر گزرے ہوئے ماہ و سال کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اور حسرتوں اور محرومیوں کا مرثیہ۔ یہ آدمی وہ نہیں تھا جس نے چھتیس سال قبل ایسی ہی ایک شام میں، اسی چھت پر سلطانہ سے آخری ملاقات کی تھی۔ وہ آدمی تو بڑا وجیہہ تھا۔ دراز قد اور توانا، زندگی سے بھرپور۔ اس آدمی کے چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں اور گھنے سیاہ بال اور دمکتی ہوئی رنگت۔ وہ آدمی کہاں گیا؟ ماضی کی قبر میں کہیں دفن ہو گیا۔ اور یہ آدمی جو آئینے میں کھڑا ہے، یہ تو اس کی پرچھائیں بھی نہیں۔ خدایا، یہ کیا ہوا؟ وہ حیرت اور صدمے کے حصار میں گھرا ہوا آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ اور اس کا دل دھیرے دھیرے ڈوبتا گیا۔ آنکھوں کے سامنے وہ منظر ابھر آیا جب آخری بار سلطانہ سے ملا تھا۔ اس کا شاداب اور منور چہرہ، اس کا سیاہ بال اور مرمر سے تراشا ہوا اس کا سراپا، جیسے کوئی اساطیری دیوی ہو۔ جواں سال، پرجمال، پرشکوہ۔ کیا وہ اب بھی ویسی ہوگی۔ اس نے سہم کر اپنے چہرے کو دیکھا اور دہشت سے اس کا دل کانپ گیا۔ نہیں، شاید وہ ویسی نہیں ہوگی۔ جب وہ خود اپنا سایہ بن گیا ہے، تو وقت نے اس سے بھی اپنا خراج ضرور وصول کیا ہوگا۔ بہاریں رخصت ہو چکی ہوں گی، تنویریں ماند پڑ گئی ہوں گی، شاید اس کے چہرے پر بھی لکیریں ہوں۔ شاید اس نے بھی چشمہ لگا رکھا ہو۔ اس نے تصور میں سلطانہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور اسے مزید ڈر لگا۔

وہ اک عالم وحشت میں کمرے سے باہر آیا۔ اور شش و پنج کے عالم میں سوچنے لگا۔ کیا کرے؟ سلطانہ کو دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گذرے۔ وہ سلطانہ جو چھتیس سال سے اس کے تصور میں رہتی ہے، اس کی اپنی ہے۔ جب کہ یہ سلطانہ پرائی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس پرائی سلطانہ کو دیکھے تو اس کی اپنی سلطانہ مر جائے۔ ہاں، یقیناً وہ مر جائے گی۔ کیا وہ اس کی موت کو برداشت کر سکے گا؟ کیا اس صدمے کو جھیل سکے گا۔ نہیں، بہت مشکل ہے یہ، کڑا امتحان ہے۔ وہ اس سلطانہ کو کفن میں نہیں لپیٹ سکتا۔ وہ اسے زندہ رکھے گا کہ اس ایک جواں سال، دلکش اور حیات افروز شبیہ کے سہارے ہی تو اس نے شب و روز کا دکھ بھرا سفر طے کیا ہے۔ وہ شبیہ اس کا کل سرمایہ ہے، اس کی بیساکھی ہے۔ اس کا زادِ راہ، اگر وہ شبیہ مر گئی تو زندگی کے باقی دن کیسے گذارے گا۔ تو پھر کیا کرے؟

کیا اپنا زادِ راہ لٹ جانے دے؟

اس نے بے قراری سے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے تھے۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ عجلت سے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے آیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اکبری باجی صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ارے شہاب کہاں جا رہے ہو۔؟ سلطانہ تو بس اب آ ہی رہی ہوگی۔"

"باجی میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ لے کر ابھی آتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

تیز تیز قدموں سے گلی طے کی۔ سڑک پر پہنچ کر دائیں جانب مڑا اور عجلت سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت سات بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ کوئی سو سوا سو قدم چل کر وہ خود بخود رکا اور غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ گلی کے سامنے ایک کار آ کر رکی تھی۔ اور اس سے ایک عورت جو گہرے رنگ کی شال اوڑھے تھی، اتر رہی تھی۔ ایک جوان عورت اور ایک بچہ پہلے ہی اتر چکے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذرا غور سے دیکھا۔ فاصلہ بھی تھا اور شام کا گہرا دھندلکا بھی، اس بنا پر پہچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم اسے یقین کی حد تک شبہ ہوا کہ شال والی عورت سلطانہ ہی ہو سکتی ہے وہ چند لمحے گم صم اور حسرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ گلی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ ✣



صادق

ہم ہیں کس شمار میں

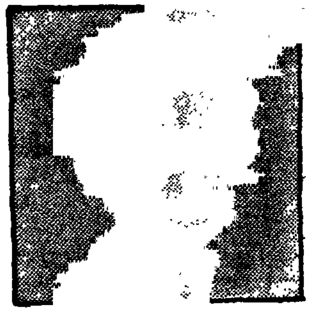
دع کی تلاش میں
، تو ہر شروع
یاں لگا

یان سے
کے ہم
ع کا شروع
نڈتے رہے

ے قبل بھی
سر پھرے
ع کی تلاش میں
بھٹک کے رہ گئے
کراں خلاء میں
ں میں
ار میں

کس قطار میں
ں کس شمار میں

● A.G.1/47C,VIKASPURI,
NEW-DELHI-110018



ساحل احمد

آئینہ

کوئی ایسی تصویر بنانے کی خواہش تھی
جو بول سکے
مگر وہ رنگ میسر نہیں آئے
جو بولنا سکھاتے ہیں
رنگ بھی تو بے رنگ ہو گئے ہیں
بہت کم رنگ اپنی اصالت
قائم رکھ سکے ہیں
تو پھر کیا کروں
سورج تو بہت دور ہے۔ جلالی ہے
چاند قدرے نزدیک ہے۔ جمالی ہے
ستاروں کی کمندوں کا سہارا لوں
یہ ممکن نہیں
ہاں قلب سے کہوں
وہ راستہ دکھلائے
آئینہ رنگوں کے تعلق سے آشنا ہے
کاش مجھے
آئینۂ قلب میسر آجائے
تصویر بنا پاؤں

●126- CHOWK,
ALLAHABAD - 211003 (U.P.)

مرحوم

سید احمد سحر

اسٹیچو

ترے تصور سے میں نے ہمدم
غم جہاں کو حیات کا مہماں بنایا
نشاط کا رازداں بنایا
ترے تعلق سے میں نے ہمدم
جہاں کو جنت نشاں بنایا
زمین کو آسماں بنایا
خزاں کی بے کیف ساعتوں کو
بہار کی داستاں بنایا
تیرا بھنور رفیق جاں تھا
تو ہر نفس جیسے کیف زا تھا
ترنم افزا تھا ناطقہ بھی
سماعتوں میں بھی رس بھرا تھا
ترا تصور رفیق جاں تھا
تو ہر طرف زندگی حسیں تھی
تو ہر نظر جلوہ آفریں تھی
مگر نہ جانے ترے تصور کی وہ حرارت
ترے تعلق کی وہ لطافت
مجھے تحیر کی وسعت بیکراں سے کیوں ہمکنار کر کے
چھڑا کے دامن
کہاں گئی ہے
کہ زیست کا رنگ اڑ گیا ہے
بس اب میں پتھر کا ایک بت ہوں۔

KHALIL GHARBI,
SHAHJAHANPUR - 242001(U.P)



بشر نواز
BHATKAL GATE
AURANGABAD- 431001(M.S)

شخصی صلاحیتیں اور اصناف ادب

(غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ)

ذیل میں بشر نواز صاحب کا ایک پرانا لیکن غیر مطبوعہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون غزل کی اس بحث کے تناظر میں ہے جو شاعر شمارہ مئی ۱۹۹۱ء میں 'غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ' کے تحت شروع کی گئی تھی اور یہ سلسلہ کئی سالوں پر محیط رہا۔ اسے ہم عصر اردو ادب نمبر کے لیے موقوف کیا گیا کیوں کہ اب بھی پچاس سے زائد قلم کاروں کی آراء (مباحث) اپنی اشاعت کے منتظر ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی کی یہ سب سے گرما گرم بحث تھی۔ اس سے قبل کسی بھی ادبی رسالے میں کوئی ادبی مکالمہ اتنے طویل سلسلوں تک روشن نہیں ہوا۔ غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ والا باب ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) میں شامل نہیں ہو سکا۔ شاعر کے عام شماروں میں یا پھر ہم عصر اردو ادب نمبر ۲ میں مذکورہ باب شامل کیا جائے گا۔ بشر نواز کا مضمون غزل کے حوالے سے بعض دیگر مسائل پر بھی مکالمہ قائم کرتا ہے۔ ان کا تخاطب نئی نسل سے ہے۔ اب ایک دہے کے بعد اور نئی صدی میں غزل پر ایک اور نیا مکالمہ ہم نے قائم کیا ہے۔ شاعر کے گذشتہ شماروں میں 'جرعات' کے تحت غزل کے اس وصف کو کردار کیا گیا ہے جس سے اردو قلم کار و نقاد حضرات واقف ہوتے ہوئے بھی ناواقف ہیں کتابی رسالی غزل سے باہر اب اردو غزل کا روپ سروپ کچھ اور بن رہا ہے۔ (ادارہ)

غزل واحد صنفِ سخن ہے جو رہ رہ کر موضوعِ بحث بنتی رہی ہے۔ حالی کے بعد سے آج تک ہر پانچ پچیس برسوں میں کوئی نہ کوئی ایسا جیالا پیدا ہو جاتا ہے جو اپنی غیر ہضم علمیت مستعار لفظیات اور ذہنی تحفظات کا سارا بوجھ اس غریب پر لاد دیتا ہے۔ اس خیال سے کہ اب یہ اس بوجھ تلے سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔

لیکن غزل ایسی سخت جان کہ نہ صرف صاف بچ نکلتی ہے بلکہ اساطیری نئی کی طرح ہر غسلِ آتش کے بعد اور زیادہ توانا و حسین ہو جاتی ہے۔ آخر اس میں کوئی تو ایسی بات ہوگی کہ ہر مخالفت کے چند ہی دنوں میں پیالی میں اٹھایا ہوا طوفان بن کر رہ جاتی ہے "شاعر" میں جاری بحث کا انجام بھی کچھ مختلف نہیں ہوگا کچھ لوگ مخالفت کریں گے اور کچھ لوگ موافقت کریں گے، اس اثنا میں جو کچھ پڑھا وڑھا ہے اس کے حوالے دیں گے، اپنے اپنے طور پر تاویلیں پیش کریں گے اور پھر کچھ بھول بھال کر غزل گوئی پر اتر آئیں گے یا نجی محفلوں میں اور خانگی خطوط میں غزل ہی کے اشعار برت کر اپنے ذوق کی داد چاہیں گے۔ یہ صرف خام خیالی یا آرزو مندانہ سوچ نہیں، واقعہ ہے۔ غزل کی ہر مخالفت کا انجام یہی ہوا مولانا حالی نے تو خیر سے بہ اعتبار حروفِ تہجی غزل کا پورا دیوان ہی مرتب کر ڈالا۔ جوش اور راشد کے مجموعہ بھی اس معتوب صنفِ سخن سے خالی نہیں رہ سکے۔ عظمت اللہ خان کے خطوں اور نظ۔ انصاری کی تقاریر میں غزلیہ اشعار کے بر محل استعمال کی گواہی دینے والے سیکڑوں مل جائیں گے۔ رہے کلیم الدین احمد سو "مردو شاعری" پر ایک نظر" کا سرسری مطالعہ ہی انکے بلند بانگ دعووں کی تکذیب کے لئے کافی ہے۔

اب جو آپ کے یہاں نئے سرے سے یہی بحث چھڑی اس کا جواب خود آپ نے کافی وشافی دے دیا ہے۔ مخمور سعیدی نے اس کے سیاسی مضمرات کی طرف اشارہ کیا، وزیر آغا نے اپنے خط میں کافی سلجھے انداز میں کچھ اشارے دیئے، مناظر عاشق نے بجا طور پر غزل کے غنائی کردار کی نشاندہی کی اور تازہ شمارے میں اوم پرکاش راحت نے ستیہ پال آنند کی شخصیت سے متعارف کروایا اس سے یہ تو ہوا کہ مسئلہ کے کچھ ڈھکے چھپے پہلو سامنے آگئے اس کے علاوہ ہمیں اپنے ادب اور اس کی مختلف اصناف پر پھر سے غور کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ بحث تو خیر اپنی جگہ ہے اور رہے گی لیکن کچھ سوالات سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں مثلاً یہ کہ فنونِ لطیفہ اور ان کے مظاہر یا ادب اور اس کی اصناف کا کسی مخصوص ملک و قوم سے کیا تعلق ہوتا ہے؟ ادب یا دیگر فنون اپنے تہذیبی خطے سے توانائی حاصل کرتے ہیں یا یوں ہی نظری بحثوں پر اپنی بنیادیں استوار کرتے ہیں؟ فنکار اپنے طور سے حسی تجربے اور مشاہدے کو فن میں برتتا ہے یا محض فنکار کہلانے کا شوق اسے تخلیقِ فن پر اکساتا ہے؟ بدلتے ہوئے تہذیبی اور سماجی و ثقافتی رشتے فن پر یا اسکے کسی خصوصی مظہر پر کس حد تک اور کن حالات میں اثر انداز ہوتے ہیں؟ اصناف یا کوئی خاص پیرایہ اظہار صرف فنکار کی افتادِ طبع کی دین ہوتا ہے یا اس کے پس پردہ ایک زبان، ایک ملک اور ایک قوم کی نفسیات عمل پیرا ہوتی ہے؟

یہ اور اس قسم کے کئی ایسے ناگزیر سوال ہیں جن کے جواب پائے بغیر ہم فنونِ لطیفہ کی ماہیت اور غرض و غایت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے یہ سوالات تو اٹھائے ہیں لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ کچھ اتنے گمبھیر اور بنیادی ہیں کہ ان کے جوابات مجھ جیسوں کے بس کا روگ نہیں تو کیوں نہ اُن بزرگوں سے رجوع کریں جن کی عمریں اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہیں اور جن کے حاصل کردہ نتائج صدیوں سے رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں میں یہاں مشرقی

مفکرین سے پہلے مغربی اہل نظر کے کچھ خیالات و نظریات پیش کروں گا کہ احباب کے لئے مغرب ہی کا حوالہ سندِ اعتبار رکھتا ہے۔

اٹھارویں صدی کا فرانسیسی نقاد اور ادیب فونتیل (Fonte ndile) ادب پارے کی پرکھ کے لیے قومی مزاج، رسم ورواج، زمانے اور زبان کے اصولوں سے واقفیت کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فرانس کا مزاج، رسم ورواج اور زبان کی ساخت چونکہ لاطینی سے الگ ہے اور چونکہ فرانس کے حالات یونان کے حالات سے مختلف ہیں اس لئے "یونان وروما کے ادب کو جب ترجمے کی شکل میں پڑھتا ہوں تو اس میں کوئی ایسی بات اور خوبی نظر نہیں آتی جن کا ذکر ماہروں کے ہاں سنائی دیتا ہے"

فونتیل کا ایک معصر بیل (Baye) تو سوفیکلز اور کورنی یا یوروپڈیس اور راسین کے تقابلی مطالعے اور موازنے کو بھی فضول قرار دیتا ہے۔ دلیل اس کی وہی ہے "یونان اور فرانس کے مزاجوں میں فرق ہے جو جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، سماجی اور نسلی تفاوت کی دین ہے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جو ادب یونان کے لیے باعثِ افتخار ہو، فرانسیسیوں کے لئے بھی اتنا ہی اہم اور قابلِ تقلید قرار پائے" انیسویں صدی میں ٹین (Tain) نے سائنسی طریق کار کو اپناتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ "انسانی صلاحیتوں کے ماخذ نسل، ماحول اور زمانہ ہیں۔ نسل سے مراد وہ صلاحتیں ہیں جو کسی کے ورثے میں ملتیں اور جن کی بناء پر انفرادی مزاج اور جسمانی ساخت وجود میں آتی ہے۔ ماحول سے مراد، آب ہوا، سرزمین، معاشری اور سیاسی حالات ہیں زمانے سے مراد وہ خاص عہد ہے

جس میں انفرادی صلاحتیں اجاگر ہوتی ہیں" انھیں انفرادی صلاحیتوں کا اظہار جب لفظوں میں ہوتا ہے تو ان کا ایک پیٹرن سا بن جاتا ہے اور مختلف ہیئتیں جنم لیتی ہیں۔ ہیئت اور موضوع ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ہر موضوع میں خود اس کی ہیئت چھپی ہوتی ہے۔ بالقصد اپنائی ہوئی ہیئت اگر موضوع کو کسی طور اپنے میں سمیٹ لے تب بھی وہ فنّی اکائی وجود میں نہیں آتی جو کامیاب ادب پارے کی اولین شرط ہے۔ ہیئت اور موضوع کی ثنویت ادب پارہ تو دور رہا عام سی کاروباری تحریر کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ ادب ہی نہیں اس کی ہیئتیں بھی اپنی زبان اور ملک کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اِس اعتبار سے کسی زبان میں رائج ہیئت یا صنف کو منسوخ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اس زبان کے فطری اظہار پر روک لگادی جائے۔ اِسی کے ساتھ ہم دانستگی یا نادانستگی میں ادب کو اس کے ملک و قوم کی جیتی جاگتی زندگی سے کاٹ کر ایسا لفظی گورکھ دھندہ بنادیں گے جو نہ کسی سچے تجربے کو سہارا سکے تصور کی اڑانوں کا ساتھ دے سکے گا۔ اِس بحث سے کچھ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(الف) ادب جس ملک و قوم اور زبان میں تخلیق ہو گا اسی کی عکاسی کر سکے گا۔

(ب) ادب کی مختلف اصناف اظہار کے فطری بہاؤ کی شکلیں ہوتی ہیں اور ان کی تشکیل میں قوم وزبان کا مزاج اور ورثے میں ملی ہوئی خصوصیات بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

(ج) کوئی صنفِ سخن یا اظہار کی کوئی صورت اس وقت تک عوامی قبولیت حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ ان کے خیالات وجذبات کے اظہار پر قادر اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو۔

عالمی ادب میں یقیناً ایسی مثالین بھی ملتی ہیں کہ کچھ اصناف دوسری زبانوں اور ملکوں سے لی گئی ہوں اور وہ مقبول بھی ہوئی ہوں لیکن بہ نظر غائر دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ اول تو ان اصناف میں کچھ خصوصیات ایسی تھیں جو قبول کرنے والوں کے مزاج اور انداز فکر واحساس سے ہم آہنگ تھیں دوسرے یہ کہ در آمد شدہ صنف سخن من وعن قبول نہیں کی گئی بلکہ کچھ ردّوبدل کے بعد اسے مقامی رنگ میں رنگ لیا گیا۔ ہندستان کی اردو ہی نہیں فارسی غزل تک مقامی اثرات قبول کر کے نہ صرف ایرانی غزل سے مختلف ہو گئی اور "سبک ہندی" کہلائی بلکہ یہاں رہنے والوں کی سائیکی کا حصہ بن گئی۔ یہ سب اِس لئے ہو سکا کہ ہندستانی مزاج پہلے ہی سے اِسے قبول کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ دوہوں، سورٹھوں اور پدوں کی روایت موجود تھی۔ سنتوں اور صوفیوں کے مقولوں کا ایک سلسلہ تھا جن میں بات اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی تھی۔ اختصار وایمائیت اِن مقولوں میں بھی وہی کیفیت پیدا کردیتی تھی جو غزل کے شعر میں ملتی ہے دوہے، بھگتی اور تصوف کے انسان دوست نظریات کی ترسیل کا موثر ذریعہ تھے اور اپنے ہیئتی ایجاز واختصار اور معنوی گہرائی میں غزل کے شعر سے ملتے جلتے تھے۔ ان کے رموز وعلایم زندگی اور فکر واحساس میں رچے بسے تھے اور سننے والے ان رموز وعلایم کی وسعتوں سے آشنا تھے اِس لئے وہ کہنے اور سننے والے میں مغائرت اور فاصلہ پیدا کرنیوالے میں مغائرت پیدا کرنے کے بجائے رابطے اور پل کا کام انجام دیتے تھے۔ اِن حالات اور اس ذہنی فضا میں جب غزل کا شعر فارسی کی پیوندکاری سے ایک نئی توانائی پاکر اور رمز وکنائے کے کچھ اور ابعاد لے کر سامنے آیا تو اس کا لوگوں کے دلوں تک پہنچنا اور ان کی زندگی میں گھل مل جانا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ ہندستان ہی کے خمیر سے تشکیل پانے والی زبان "اردو" میں یہیں کی روحانی، نفسیاتی اور جذباتی فضا کی عکاسی کرنے والی صنفِ سخن، غزل، سب سے مقبول صنف بن گئی اور یہ مقبولیت ہی اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس صنف میں اور یہاں کی ذہنی فضا میں ہم آہنگی موجود ہے۔ یوں تو بیرونی زبانوں سے اردو نے کئی اسالیب اور اصناف لی ہیں۔ خود فارسی سے غزل کے علاوہ قصیدہ مثنوی، رباعی وغیرہ لئے گئے۔ انگریزی سے سانیٹ اور آزاد نظم اردو میں آئی۔ اِسی طرح دوسری زبانوں کی

کچھ اصناف کو برتا گیا لیکن جو قبولِ عام غزل کو ملا، دوسری اصناف اس کے مقابلے میں کہیں نہیں ٹھہر تیں۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔ ادب کے اِس عام اصول سے تو معمولی طالبِ علم بھی واقف ہو گا کہ در آمد کی جانے والی وہی اصناف اعتبار کا درجہ پاتی ہیں جن میں در آمد کرنے والی قوم کے مزاج و شعور کا حصہ بن جانے کی صلاحیت ہو۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دوسری زبانون کے وہی خیالات و اصناف کسی مخصوص زبان کے ادب کا حصہ بن سکتے ہیں جنھیں قبول کرنے کے لئے ثانی الذکر زبان میں پہلے ہی سے کچھ گنجائش ہو۔ اِس نقطہ ء نظر سے دیکھیں تو غزل کی مقبولیت کا جواز خود ہندستان کی عام فضا اور ذہنی رویوں میں مل جاتا ہے اور آج ہندی مراٹھی، تلگو، گجراتی، کشمیری اور پنجابی میں غزل کا کہا جانا اِس بات کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس صنف سخن کی ہیئت، اسلوب اور مضوعات ہمارے عوامی شعور کا حصہ ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مشرقی اور مغربی اذہان میں بنیادی فرق ہے۔ اِس فرق کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ مغرب میں حقیقت پسندانہ اور تجزیاتی رویہ غالب نظر آتا ہے اور مشرق میں وجدان و روایت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جس کی سرحدیں رومانویت سے ملتی ہیں۔ ماورایت، انجان اور ان دیکھے کی تلاش و جستجو میں ہزار کنویں جھنکواتی ہے۔ تخیل و تصور کی دنیائیں تخلیق کرتی ہے اور ان میں طرح طرح کے رنگ بھرتی ہے۔ ہمارے لئے خارجی حقیقت اپنے آپ میں مکمل ہے نہ مقصود بالذات بلکہ یہ اس حقیقتِ کل کی آیت اور نشانی ہے جسے ارسطو ذہنِ فعال کہتا ہے اور محی الدین ابن عربی "حقیقت الحایق" کا نام دیتے ہیں یہ "حقیقت الحایق" رمز و اشارے میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور رمز کا انکشاف صرف ان دلوں پر ہوتا ہے جو عشق آشنا ہوں اور وجدانی لمحوں میں رمز و اشارے کے پسِ پردہ حقیقت کی جھلک دیکھ سکتے ہوں۔ وجدانی کیفیات، طوالت، تسلسل اور منطقی استدلال سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ عقل انسانی صرف معلوم حقائق کا اثبات و تجزیہ کر سکتی ہے اِن میں منطقی تسلسل تلاش کرتی ہے لیکن پوشیدہ حقائق تک نہیں پہنچ سکتی۔ وجدان امکانی حقائق تک نہ صرف پہنچاتا ہے بلکہ اپنے بہتر لمحات میں انھیں ایک معنویت بھی عطا کرتا ہے۔ یہ اندازِ فکر مشرق اور خصوصاً ایشیا میں نہ صرف عام ہے بلکہ اس کی سائیکی کا اہم ترین جز بھی ہے اسی لیے ولیم جونز کہتا ہے "جب تک ایشیائی اقوام اور ایشیا کی تاریخ فطرت کا عالمانہ علم حاصل نہ ہو کوئی شخص ایشیائی شاعری کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتا"

یہ طرزِ فکر اور قومی مزاج برا ہے یا بھلا، سائنٹفک ہے یا غیر سائنٹفک، پھر سائنسی فکر کس حد تک حقیقت کا انکشاف کر سکتی ہے اور انسان کی مخفی قوتیں، اگر بیدار ہو جائیں تو ان کی حدود انتہا کیا ہے؟ یہ ایسے سوال و مباحث ہیں جن کے بارے میں کوئی رائے دینا یا منطقی نتائج اخذ کرنا آسان ہے نہ موضوعِ زیرِ بحث سے راست تعلق رکھتا ہے۔ نظریاتی بحثوں اور تجریدی الجھاؤں کو فلسفیوں اور نظریہ سازوں کے لیے بچا رکھنا چاہئے۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ اس عمومی مزاج و فکر کی نمود ہمارے ادب اور خصوصاً اس کی ایک صنف میں جو عوام کی محبوب اور دانش جویوں کی معتوب ہے، کس حد تک اور کس انداز میں ہوتی ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) مشرقی ذہن حقیقت خارجی کو کُل نہیں، حقیقتِ کلی کا اشارہ سمجھتا ہے۔

(۲) اس کے نزدیک ساری کائنات حقیقت اولیٰ کا رمز ہے۔

(۳) حقیقت تک صرف وجدانی اور توفیق کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے۔

(۴) عشق ایسی طاقت ہے جو انسان اور "حقیقت الحایق" کے بیچ حائل حجابات کو اٹھا سکتی ہے۔

(۵) عقلِ محض یا منطقی علم حقیقت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے صرف وجدان لمحات ہی میں حقیقت کوندوں کی طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔

اب دیکھئے غزل اِس طرزِ فکر اور مزاج کے اظہاری اسلوب کی حیثیت سے کن رویّوں اور فنی ذریعوں کا استعمال کرتی ہے اور یہ مجرد جذبات و احساسات تخیلات و تصورات کس طرح ایک ہیئت اختیار کرتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ میں اب بھی اپنی بات واضح نہیں کر سکا اس لئے تکرار کی معافی چاہتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ غزل نے ان خیالات و احساسات کو نہیں اپنایا بلکہ ہند و ایران کے مزاج اور عمومی اندازِ فکر نے فنّی سطح پر غزل کی ہیئت اختیار کی وہ جو غالب نے کہا ہے تاکہ 'شعر نے خود خواہش کی کہ میرا فن کہلائے۔ مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

کچھ اِسی قسم کی بات غزل اور اس کی ہیئت کے ساتھ پیش آئی چنانچہ پورے مشرقی مزاج کا، اس کی پراسراریت و رمزیت کا، کوندوں اور جھلکیوں کی شکل میں حقیقت کو دیکھنے کا، عشق کی پوری قوتوں کو بروے کار لانے کا اظہار نہ صرف غزل کے رموز و علائم میں ہوتا ہے بلکہ اس کی ہیئت بھی اِسی اظہار کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک اکائی ہوتا ہے، ایک جھلک اور بجلی کا کوندا ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے شعر سے مربوط ہونا ضروری نہیں۔ گویا ہر شعر اپنے طور پر اس وجدانی لمحے کا نتیجہ ہے ماہرین نفسیات کا بھی کہنا ہے کہ انسانی دل و دماغ میں پیدا ہونے والے جذبات و خیالات کے محرکات دو اور دو چار کے انداز میں واضح نہیں ہوتے۔

استعارہ، رمز، کنایہ، اشارہ اور استعارہ بالکنایہ غزل کے عام عناصر اور سامانِ آرائش ہی نہیں لازمی وسیلے ہیں کہ حقیقتِ کل کا پورا بیان ممکن نہیں اس کا اندازہ یا تو مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے یا اشاروں میں اس کی جھلک دکھائی جاسکتی ہے۔ اِسی طرح عشق، اچھی غزل میں صرف دو اشخاص کا نجی اور جنسی مسئلہ نہیں بلکہ حیات و کائنات کو سمجھنے کا وسیلہ ہے کہ اِسی میں حجابات اٹھانے کی ہمت و سکت ہے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

یہ "کچھ اور" ہی غزل کی روح اور رمز ہے۔ چوں کہ اس "کچھ اور" تک ہر ذہن رسائی نہیں پا سکتا اس لئے صورت پرستی، غزل پر مختلف اعتراضات کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے چنانچہ "نقاب" "کائنات کی پر اسراریت کے استعارے کے بجائے کپڑے کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے یا چمن، عالم رنگ و بو اور انسان کی باطنی کیفیات کی بجائے محض ایک قطعہ زمین بن جاتا ہے۔

واکر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
نقابِ یار ہے غفلت نگاہی ہائے بینندہ مژہ پوشید پنہاں پردۂ عریاں ہے [غالب]
گہہ گل ہے، گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو آتا نہیں نظر وہ طرحدار اک طرح [میر]
گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی [سودا]

اب اگر ان اشعار کو میں ان کے الفاظ سے آگے نہ لے جاسکوں ان کی رمزیت و اشاریت کو نہ سمجھ سکوں تو یہ قصور ہیت یا اسلوب کا نہیں میری فہم اور اپنے مزاج و سائیکی سے بے خبری کا ہوگا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ جب تک ہم مشرقی شعریات اور ان کے وسیع پس منظر کو نظر انداز کر کے مستعار پیمانوں سے اپنے ادب کو ناپتے رہیں گے تب تک نہ کنفیوژن دور ہوگا نہ ہم اپنے ادب کی صحیح قدر شناسی کے قابل ہو سکیں گے اور نہ اپنے اسالیب و اصناف ادب کی عوامی مقبولیت کے اسباب و وجوہات سے واقف ہو سکیں گے. ان حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہمارے بار سوخ و ذی علم دانشور ترجمے کی ناکامی اور دوسرے ماحول میں تربیت پائے ہوئے ذہنوں کی نارسائی کا انتقام اپنے اسالیب و اصناف ادب کی تحقیر کر کے لینے کی بجائے دنیا کو اس روایت سے، اس تہذیب اور اس رویۂ حیات سے آشنا کروائیں جن کا اظہار ان اسالیب و اصناف میں ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے۔ تہذیب و روایت سے آشنائی کے بعد ادب پڑھنے والوں کو خود پتہ چل جائے گا کہ لفظ "گنجینۂ معانی" کا طلسم کیسے بنتا ہے۔ "ہر جا جہانِ دیگر" کا منظر کیسے پیش کرتی ہے۔ اور رمز و استعارہ خارجی حقائق اور اندرونی کیفیات کو کس طرح ایک کر دیتا ہے" دلّی" کیسے بنتی ہے اور "ابر شفق آلود" "آتش زدہ گلستاں کی یاد کیسے دلاتا ہے۔ ورنہ اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے۔

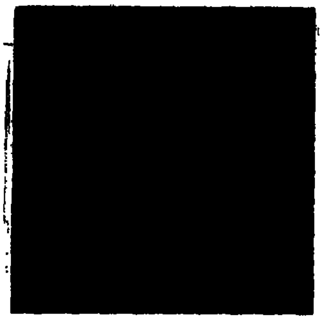
ایک صاحب سے پوچھا گیا' بھئی یہ ذیشان کے کیا معنیٰ ہیں' قریب بیٹھے ہوئے چھوٹے سے بچے نے کہا جی۔ میرے بھائی جان ہیں (بچے کے بھائی کا نام ذیشان تھا) یہ جاننے کے لئے کہ ذیشان بھائی جان کے علاوہ اور بھی کچھ ہے بچے کو محنت تو کرنی ہی پڑے گی غزل بھی اپنے قاری سے تھوڑی بہت ذہنی تیاری اور تہذیبی و ذہنی رویوں سے واقفیت کا مطالبہ کرتی ہے فارسی کو یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق شعر کو معنی پہنا لے مگر اسے یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سیاق و سباق سے واقف ہوئے بغیر رموز و علایم کے وسیع معنیٰ اور ذہنی محرکات کو سمجھے بنا تنقید و تبصرہ کرنے بیٹھ جائے۔ اب رہی یہ بات کہ غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے سو اسکا جواب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قافیہ ردیف کیا خود زبان اظہار کے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی دیتی ہے یا یہ کہ آرٹ تو نام ہی بکھرے بکھرے بے نام و بے چہرہ خیالات و احساسات کو ہیت عطا کرنے کا ہے اور فنکار کی آزمائش ہی پابندیوں پر فاتحانہ قابو پانے میں ہوتی ہے۔ پھر آرٹ کا کون سا فارم ہے جو ہر قسم کی پابندی سے قطعی آزاد ہے۔ یا یہ کہ مغربی شاعری میں تو اصناف سخن کے لئے بحریں اور ارکان تک مقرر ہیں پھر غزل ہی میں قافیہ ردیف کی پابندی قابلِ اعتراض کیوں؟ میں یہ جواب دے کر آگے بڑھ جاتا اگر مجھے احساس نہ ہوتا کہ یہ جواب بھی اتنا ہی سطحی اور کھوکھلا ہے جتنا کہ اعتراض ہے۔ اور کسی سنجیدہ بحث میں اس قسم کی باتیں کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں۔ اس لئے کہوں گا کہ جس طرح ادب ملک و قوم کی امنگوں اور آرزوؤں طرز فکر و احساس اور رویۂ حیات کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح ہیتیں بھی اجتماعی انداز فکر' مجموعی ماورائی تصورات اور عام طرز حیات کے بطن سے جنم لیتی ہیں ہمارے معاشرے میں "دائرہ" ایک گہری معنویت رکھتا ہے یہ موسموں کی گردش سے بیج کے اُٹنے اور پھر بوئے جانے تک اور سات پھیروں سے جنم جنم کے چکر تک نئے نئے روپ میں اپنی معنویت اجاگر کرتا ہے [اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا سے رجوع کیجئے] سو ہماری موسیقی ہو یا شعری ہیت اجنتا کی مورتیوں کی گولائیاں ہوں عمارتوں کے گنبد سبھی کا سلسلہ دائرہ سے جا کر ملے گا۔ پھر اگر غزل قافیہ ردیف کو بار بار دہرا کر فکر و احساس کی دائروی فضا تعمیر کرتی ہے تو کیا برا کرتی ہے۔ آخر راگ راگنیاں بھی تو اسی دائرے کی صوتی اشکال ہیں۔ گانے والا ایک مقام سے شروع ہوتا ہے، راگ کے مطالبوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تان پلٹوں کے کمالات دکھاتا ہے مرکیاں لگاتا ہے بہلا دیتا ہے اور متعینہ وقت پر پھر اپنے مقام پر آجاتا ہے۔ غزل کے شاعر کا عمل بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ قافیے ردیف کی پابندی یا مجبوری کی بات کرتے ہوئے یہ بنیادی تصور بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ انسان صرف اپنے خورد میں آزاد ہے اسکی مختاری، استعاروں اور تشبیہوں کے انتخاب میں آزاد اور بحر، قافیہ ردیف یا حرف قافیہ کے استعمال میں مجبور ہے۔ لیکن اس مجبوری کو اچھا اور بڑا شاعر صورت گری اور حسن آفرینی کا ہنر بنا لیتا ہے اور ہنر یہ ہے کہ قافیہ ردیف خیال و احساس سے یوں ہم آہنگ ہو جائیں اور شعر میں ایسے رچ بس جائیں کہ اظہار کی فطری ضرورت محسوس ہونے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا شاعر جب فکر و احساس کی دنیاؤں کی سیر کر کے قافیہ پر پہنچتا ہے تو سننے والے بے ساختہ واہ کہہ اٹھتے ہیں۔ پھر اس کی ساحرانہ اثر آفرینی میں رموز و علایم، استعارہ و کنایہ غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے رموز و علایم جو آس پاس کی زندگی میں یا فکر و احساس اور ہماری

سائیگی میں رچے بسے ہیں ترسیلی سطح پر اس پھلجھڑی کی طرح ہوتے ہیں جو فن کی حرارت پاتے ہی رنگارنگ چنگاریوں کی صورت میں سارے پھیل کر غزل کی فضا روشن ہوجاتی ہے۔

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز   بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

یہ تو طے ہے کہ عارفی تہذیبی فکر جذبہ واحساس، رسوم ورواج اور روحانی اقدار غزل کی ہیئت اور رموز وعلایم میں تانے بانے کی طرح بن گئے ہیں۔ ان سے غیر ضروری چھیڑ چھاڑ صرف غزل ہی سے نہیں اپنی تہذیب اور ورثے سے مذاق کے مترادف ہے ہاں یہ ضرور دیکھنا چاہیئے بلکہ دیکھتے رہنا چاہیئے کہ ہمارے غزل گو غزل کا حق ادا کر پا رہے ہیں کہ نہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہیں کہ غزل کی مقبولیت اور اسکی ہیئت کے عام استعمال نے ہر موزوں طبع کو شاعر ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ کہیں اسکے رموز وعلایم سطحی اور میکانیکی انداز میں استعمال ہو رہے ہیں، انہیں نئے سیاق وسباق میں استعمال کر کے ہم عصر زندگی سے جوڑنے کا کام شاذ ونادر ہی ہو رہا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بعض شعراء کے ہاں معاصر زندگی کی حقیقت بیانی کے نام پر دو مصرعوں میں بقید قافیہ ردیف کوئی عام سی اطلاع فراہم کر دی جاتی ہے۔ اور کہیں پرانے جسم میں نیا خون داخل کرنے کے نام پر لفظی بازیگری کا بازار گرم ہے۔ لیکن اس صورت حال کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔ غزل نئی لفظیات، نئے استعاروں اور ایک نئی فضا سے آشنا بھی ہو رہی ہے تجربے ناکام بھی ہوتے ہیں ممکن ہے زیادہ تر ایسا ہو لیکن ایک کامیاب تجربہ کئی ناکامیوں کی تلافی کے لئے کافی ہے کہ اس سے نئے امکانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ غزل کا شعر کبھی اکہری معنویت کا حامل نہیں ہوتا، اسکی اشاریت کئی معنوی سطحیں رکھتی ہے۔ اکہرا شعر رد کیا جاتا رہا ہے۔ اور رد کیا جاتا رہے گا۔ اس لئے اسے موضوع بحث بنانا یا اسکی بنیاد پر پوری صنف سے بدظن ہو جانا مناسب نہیں۔ یہ تسلیم کر لینے سے کہ ہر صنف ادب کی طرح غزل کی بھی کچھ تحدیدات ہیں۔ کچھ موضوعات یقیناً تفصیل کے ساتھ غزل کا موضوع بن سکتے لیکن بہت سارے ایسے موضوعات جنہیں عام طور پر غزل کے گاؤں باہر سمجھا جاتا ہے، غزل کا موضوع بن سکتے ہیں، اور بنتے رہے ہیں۔ ان کی تفصیل اشاروں کنایوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ غزل کے آرٹ کو ہم نیچر کا آرٹ کہہ سکتے ہیں ویسے انسان کو خود "عالم اصغر" یعنی کائنات کا منی ایچر کہا گیا ہے۔ خیر اس بحث کو یہیں چھوڑیئے۔ یہ تو سبھی مانتے ہیں کہ ہر صنف سخن یا آرٹ کے ہر اسلوب کے کچھ حدود ہوتے ہیں اور ہر موضوع یا اسلوب کی سمائی ہر صنف میں نہیں ہو سکتی اسی وجہ سے مختلف اسالیب کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے ایلیٹ کا کہنا ہے "ہمیں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے" کسی اسلوب کو اپنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے اسالیب سے کنارہ کر لیں تاکہ اپنے اختیار کردہ اسلوب کے ساتھ انصاف ہو سکے غزل کا اسلوب اختیار کرنے والے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ رزمیہ اور بیانیہ سے اجتناب کرے پھر اگر وہ ایسا کرتا ہے تو برا نہیں کرتا فن کے تقاضوں کے مطابق، اس کا عمل ہوگا پھر یہ بھی ہے کہ جب ہم افسانے سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کے وہ ناول بن جائے یا نظم کو اس لئے رد نہیں کر سکتے کہ وہ ڈرامہ کیوں نہیں ہے تو پھر غزل ہی سے اس قسم کا مطالبہ کیوں کہ وہ بیانیہ کی طرح تفصیلات بھی مہیا کرے۔ قصہ مختصر ہر موضوع اپنے حسب حال صنف کا مطالبہ کرتا ہے اور اچھا فنکار خوب جانتا ہے کہ اسے کس صنف کا استعمال کب کرنا چاہیئے۔

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اصناف کے بارے میں نظریاتی بحثوں میں الجھنے کے بجائے دستیاب مواد کی عملی تنقید کی طرف توجہ دیں۔ اگر غزل ہی پر بات کرنی ہے تو نمائندہ غزلوں کو لے کر اور انہیں ان کے دائرۂ عمل میں رکھ کر ان کے حسن وقبح پر غور کریں۔ اگر یوں ہو تو شاید ہم ادب وزبان کے لئے زیادہ بہتر فضا تیار کر سکیں گے اور نظری مباحث میں خیالی گھوڑے دوڑانے کے بجائے ادب اور زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ بہتر طور سے واقف ہو سکیں گے۔ ***



سلطانہ مہر

میں لہر ہوں تجھ سے بچھڑی

میرے دل، میرے سمندر
تو ساگر اور خاموش نیلا سر
لطیف — لفظ کی موجیں
جب تجھ میں کروٹ لیں
اک جھرنا پھوٹے
اور علم کے موتی یوں برسیں
جیسے لڑیاں ٹوٹیں
میں اپنے جیون کے موتی چن کر ان سے
اپنا سب یوری کا سرمہ چاہوں

میرے دل، میرے سمندر
اسی شیریں پانی
جو ان جھم بوندیں برسیں
پیاسے تن سیراب کریں
یا جیسے منہ بند کلیاں چٹکیں
اور عالم کو مہکائیں
میں جو خوشبو کے ریشم میں لپٹ کر
اپنا جیون مہکانا چاہوں
میرے دل، میرے سمندر

جب جب تو حرفوں کی مالا گوندھے
تب تب جادو سے کرنیں پھوٹیں
اور گھور اماوس راتوں کا
ہر پل اجلا اجلا ہو جائے
میں کب سے ہوں تجھ سے بچھڑی
میرے ساگر گہرے نیلے
آ! اپنی بانہیں پھیلا
اور مجھ کو اپنا جزو بنا لے



شبنم صبیح

'معمول'

پرندے ہیں
تمہارے دل کے خوش منظر جزیرے میں
نیا موسم پھر آیا ہے!

یہی ہوگا
کہ پھر سے شام
تھوڑی بارشیں ہوں گی
ہواؤں میں لطافت
بادلوں میں دلکشی
تازہ شگوفوں میں نمی ہوگی
نیا سبزہ، نئی بالیدگی ہوگی
عجب اک بے خودی ہوگی

پھر اس کے بعد
پرندے چہچہا کے
نئے موسم کے نظارے پہ رہنے
[illegible] ان دیکھے جزیرے کی
طرف پرواز کر لیں گے
ہمیشہ کی طرح تم پھر
شکستہ دل
شکستہ جاں
پلٹ آؤ گے گھبرا کر
اسی ویران، بوسیدہ حویلی میں
[illegible]
تمہارے [illegible]
اپنے [illegible] میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ماہ طلعت زاہدی

تم بن سارا عرصہ گزرا
یا اشکوں کا دریا گزرا

کاٹ گیا تھا زیست کا دھارا
کہنے کو اک لمحہ گزرا

میرا بھی گھر بھول گیا تھا
بادل قریہ قریہ گزرا

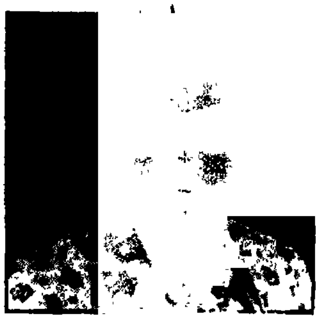
خوش رہنے کا خاک جشن ہو
دل پر بھاری صدمہ گزرا

رستے میں لوگ بچھڑ جاتے ہیں
آہ مگر، اک اپنا گزرا

خون ہے جن آنکھوں سے جاری
ان میں بھی اک سپنا گزرا

چیخ تھی دل کی لے میں ڈھل کر
جیسے کوئی نغمہ گزرا

جانِ محفل تھا وہ، پھر بھی
کتنا تنہا تنہا گزرا



یوسف عارفی
B-5,4th CROSS,ANUBHAV NAGAR
NAGARBHAVI MAIN ROAD BANGALORE- 560 072.

پڑوسی !!/؟

ابھی ابھی دفتر سے تھکا ہارا لوٹا ہوں اور آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا ہوں۔ بیوی شاپنگ کرنے گئی ہے یا اپنی ہم جولیوں کے درمیان بیٹھی کھل کھل ہنس رہی ہے۔ بچے جینس پینٹ اور ٹی شرٹ پہن کر نہ جانے کہاں کہاں پھدک رہے ہیں ـــــ اب تو چھوٹے سے دیہات کی بیس فٹ سڑک بھی یم جی روڈ کے نام سے مشہور ہو گئی ہے۔ تھکن کے باعث میرا سر گھوم رہا ہے۔ گھر کی ہر چیز میری دیکھی بھالی ہے۔ وہی، اجلی چھت سے لٹکتا خاموش پنکھا، شوکیس میں رکھے خوبصورت گڈّے گڈیاں، گلدانوں میں سجا کر رکھے مختلف رنگوں والے پلاسٹک کے پھول، سنہری حرفوں میں چھپی آیت الکرسی، سنگِ مرمر کا تاج محل اور ایک بے حد نفیس ٹرے میں سجے، آم امرود، سیب، انگور، ناشپاتی، موسمبی ـــ "بے رس ـــ بے رس" ـــ میں دانت پیس کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ٹی وی کے اس خاموش سیٹ کو گھورنے لگتا ہوں جس کے چہرے پر میری بیوی نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ میں نے کئی بار ٹوکا ہے "ـــ ٹی وی کے چہرے پر دہ ڈال کر تم نے اسے مسلمانی بنا ڈالا ہے "مگر بیوی ہنس کر کہتی ہے ـــ "پردہ الٹ کر سوئچ آن کرو پھر دیکھو" بیوی کے بھول پن پر میں جھلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک دقیانوسی طبقے کا خون اب بھی اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ مجھے اندر ہی اندر ایک بے اطمینانی سی محسوس ہوتی ہے کہ بہت کچھ میری مرضی کے مطابق نہیں ہو پا رہا ہے۔ میں ٹیبل پر رکھا اخبار اٹھاتا ہوں لیکن اخبار کو ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھے لگتا ہے، ہاکر کا لایا ہوا اخبار جوں کا توں پڑا ہے، کسی نے اسے کھولا تک نہیں ہے۔ میں ماتھے پر بل ڈال کر سوچ رہا ہوں آخر یہ لوگ پڑھائی میں کیوں نہیں دلچسپی لیتے۔ پڑھائی سے ذہن کی گرہیں کھلتی ہیں، شعور جاگتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

تم لوگوں نے کورس کی کتابوں کے علاوہ آج تک کوئی کتاب، رسالہ، یا اخبار پڑھنے کی کوشش کی ہے؟" میں نے کئی بار اپنے بچّوں سے یہ بات کبھی نرمی سے اور کبھی سختی سے پوچھی ہے لیکن بچے انجان بن کر نظروں سے یوں اوجھل ہو جاتے ہیں جیسے انہیں کچھ سنائی نہ دیتا ہو، میں دانت پیسنے لگتا ہوں تو میری بیوی ٹپک پڑتی ہے ـــ "آپ انہیں کتابوں کا بھوت بن کر مت ڈرایئے!"

"اب انہیں کون سمجھائے کہ مذہبی اصطلاح میں کتابوں کا مطالعہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ "عبادت" اور "مطالعہ" جیسے لفظ اب ان کے لئے اجنبی بنتے جا رہے ہیں اور مجھے میرا وہ کلچر ڈوبتا ہوا لگ رہا ہے جس میں ہم اذان کی آواز کے ساتھ جاگتے تھے۔ اب تو آڈیو ویڈیوں کی اتنی دھما چوکڑی مچی رہتی ہے کہ مجھے اپنی سانسیں بھی لرزتی ہوئی سی لگتی ہیں۔

دفتر سے تھکا ہارا لوٹنے کے بعد آرام کرسی پر ڈھیر ہو کر میں ہر روز کچھ ایسی ہی حقیقی اور غیر حقیقی باتیں سوچتا ہوں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ "لیکن آج ایک عجیب بات ہو گئی ـــ قارئین سوچ رہے ہوں گے ـــ بیوی بن سنور کر سراپا محبت بنی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ بالکل نہیں! ـــ یا بچے پورے انہماک کے ساتھ سر جھکائے اپنے ہوم ورک میں غرق ہوں گے۔ منظر بھی غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پورے گھر پر سناٹا مسلّط ہے اور میں یکہ و تنہا بیٹھا ٹیبل پر رکھے اس لفافے کو حیرت اور مسرّت سے دیکھ رہا ہوں جس پر ڈاک کے ٹکٹ چسپاں ہیں۔ میری حیرت اس لئے ہے کہ ایک عرصے کے بعد میرے نام کی ڈاک آئی ہے۔ اور مسرّت اس لئے ہے کہ بڑے دنوں کے بعد کسی نے مجھے یاد کیا ہے۔ آخر کس نے مجھے یاد کیا ہو گا؟ میں بڑی بے صبری کے عالم میں لفافہ چاک کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوتی ہے کہ لفافہ پہلے ہی کھولا جا چکا ہے اور اس میں میرے نام کا کوئی خط نہیں ہے۔ صرف ایک تصویر ہے بے حد کمزور اور نحیف و نزار آدمی کی تصویر ـــ! "کون ہو تم!" میں زیر لب بڑبڑاتا ہوں کیونکہ پہلی ہی نظر میں تصویر کا آدمی مجھ سے پہچانا نہیں جاتا۔ میں ذہن پر زور لگا کر چہرے کے وہ ساری نقوش جن سے آدمی کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے ابھارنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اس کا چہرہ مجھے اس خزاں رسیدہ پتے کی طرح نظر آتا ہے جو شاخ سے ٹوٹ چکا ہے اور جسے طوفانی ہوا اڑائی لے جا رہی ہے۔ میں تھک ہار کر سوچتا ہوں ـــ آدمی اپنے نام اور کام سے پہچانا جاتا ہے بھلا تصویر سے کیا پہچانا جائیگا ـ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ تصویر کسی اجنبی نے نہیں بلکہ کسی شناسا یا دوست نے بھیجی ہو گی۔ کاش! ظالم نے اپنا نام یا پتہ کچھ تو لکھ دیا ہوتا۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور سوچنے لگا شاید یہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے حیرت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یک لخت اپنی آنکھیں کھول دیں تصویر کی پشت پر لکھا تھا:

"گزرے دنوں کا ایک پڑوسی، جسے تم کتابوں کا کیڑا کہتے تھے۔"

"پڑوسی!" میں سخت متعجب ہوا۔۔۔۔ گزرے دنوں میں میں نے شاید تین گھر تبدیل کئے ہوں گے لیکن کسی پڑوسی سے رسم و راہ نہیں بڑھا سکا تھا کہ آج پڑوسیوں سے رسم و راہ بڑھانے کا رواج اٹھ چکا ہے۔۔۔۔ میں نے دوبارہ ایک نظر تصویر کی پشت پر لکھی تحریر پر ڈالی۔

"کتابوں کا کیڑا!" ۔۔۔۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔۔۔۔ اکثر میری اماں مجھ سے کہتی تھیں میں لڑکپن میں بہت منہ پھٹ واقع ہوا تھا ۔۔۔۔ رشتے کے چھوٹے بڑے لوگوں اور آس پاس کے پڑوسیوں کی حرکات و سکنات کی نقل اتارتا انہیں کسی نہ کسی بے تکے نام سے پکارتا تھا۔ میری اس نازیبا حرکت پر ابا مجھے بہت ڈانٹتے اور پھٹکارتے تھے۔ لیکن "کتابوں کا کیڑا" سن کر نہ جانے کیوں مسکرائے تھے اور بڑی حسرت سے کہا تھا۔۔۔۔ "خدا کرے کہ اس نام سے میں تمہیں پکارنے کے لئے زندہ رہ سکوں"۔۔۔۔۔

ابا کی بات سن کر میں اداس ہو گیا تھا اور اس پڑوسی سے ملنے کے مواقع تلاش کرتا رہا تھا۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ وہ پڑوسی جو نہ صرف ہم عمر تھا بلکہ اس کے خدوخال مجھ سے ملتے جلتے تھے۔۔۔۔ یوں غائب رہتا تھا جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں رہتا بستا ہو اور جسے ڈھونڈ نکالنا مشکل ہو۔۔۔۔

اس دن آسمان ابر آلود تھا باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔۔۔۔ میرے والد فصلوں کی آمدنی اور خرچ کے حساب میں حد درجہ مصروف تھے اور گاہے گاہے میری اماں سے خریف کی تخم ریزی کے بارے میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ میں دبے قدموں سے باہر نکل گیا اور اس پڑوسی کے گھر جا پہنچا۔ میں جانتا تھا ۱۹۴۷ء میں اس کے گھر کے پورے افراد کو حملہ آوروں نے بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ دیکھنے والے اس گھر کو دیکھ کر ایک دہشت سی محسوس کرتے تھے پھر کچھ دنوں بعد لوگ اس گھر کو بھوتوں والا گھر پکارنے لگے تھے۔۔۔۔ اس کے گھر کی دیواریں جگہ جگہ سے منہدم ہو گئیں تھیں ۔۔۔۔ صدر دروازے میں دراڑیں پڑ گئیں تھیں۔۔۔۔ میں نے صدر دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا، وسیع و عریض آنگن میں خود رو گھاس اور جنگلی پودے اگ آئے تھے اور بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر تک دم سادھے کھڑا رہا۔ پھر میں نے دیکھا۔۔۔۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میری ہی جانب آ رہا ہے۔۔۔۔ اس نے اپنی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی اور پورا چہرہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دئے اور دھیرے سے کہا۔۔۔۔ "کتابوں کا کیڑا!" میرے پورے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی پھر وہ میرا ہاتھ تھامے خراماں خراماں مجھے اپنے ساتھ یوں لئے جا رہا تھا جیسے کوئی نایاب ترین چیز مجھے دکھانا چاہتا ہو۔ ہم آنگن کی خود رو گھاس سے بچتے بچاتے دالان میں داخل ہوئے تو اس نے میرا ہاتھ قدرے مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔۔ دالان سے گزرتے ہوئے ہم ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچ کر رک گئے۔۔۔۔ میں نے کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، کمرہ کیا تھا پورا کباڑ خانہ تھا۔۔۔۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، تصویروں کے ٹوٹے ہوئے فریم جن میں شاید اس کے اجداد کی تصویریں رہی ہوں گی، گراموفون کے ریکارڈ، ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جھولتی لکڑی جس پر لمبے لمبے لبادے لٹک رہے تھے۔۔۔۔ بے شمار ٹین کے صندوق اور دیواروں سے لگی لکڑی کی الماریاں جن کے شیشے یا تو ٹوٹے ہوئے تھے یا اس قدر گرد آلود تھے کہ ان کے اندر رکھی ہوئی ضخیم کتابیں بمشکل نظر آتی تھیں۔۔۔۔ "یہ تمہارا میوزیم ہے؟" میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں اس سے پوچھا۔ "نہیں یہ میری وراثت ہے!" اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر اس نے ایک بڑی سی الماری کھولی اور نہایت احتیاط سے دو مجلد کتابیں اٹھا لایا اور کہا "آب حیات" کا یہ پہلا ایڈیشن ہے جسے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے دستخط کر کے میرے دادا حضرت کو بھجوایا تھا۔ یہ میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" ہے جسے جان گلکرسٹ نے اپنی نگرانی میں لندن سے چھپوایا تھا۔۔۔۔ "اور اس سے قبل کہ وہ آگے کچھ کہتا، میں تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے کے اس کونے میں پہنچ گیا جہاں ملگجا اندھیرا تھا۔ "ان ملگجے اندھیروں میں کھوئی ہوئی ہر چیز آج بے کار محض بن کر رہ گئی ہے" وہ میری پشت پر کھڑا تاسف سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔ "میں نے بہت چاہا کہ عہد حاضر کے لوگوں کے ساتھ ان کھوئی ہوئی چیزوں کا سلسلہ بنا رہے مگر "حرف سے ناآشنائی" نے پورا سلسلہ ہی منقطع کر ڈالا ہے۔

"تم بھی مجھے ان کھوئی ہوئی چیزوں کا ایک حصہ دکھائی دیتے ہو" میں نے پھر اس کا مذاق اڑانا چاہا۔ مگر قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ عہد حاضر میں جینے اور آگے بڑھنے کے لئے تمہارے پاس کیا وسائل ہیں؟

"وسائل!" وہ بڑی دیر تک چپ رہا۔ میں جانتا تھا وہ ٹوٹے پھوٹے منہدم ہوتے گھر میں اکیلا ہی جی رہا ہے۔ دور دراز کا کوئی رشتے دار اس کے پاس آتا بھی ہے تو شام ڈھلے ہی اس گھر سے لوٹ جاتا ہے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ جینے کے لئے تمہارے پاس کیا وسائل ہیں؟" میں نے پھر ایک بار پوچھا۔

"پورے وسائل رکھنے کے باوجود آج میری حالت ہندوستان میں اردو زبان جیسی ہے۔ جس کے خاندان کے افراد لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن جس کے غیر محفوظ ہونے کا خوف بڑھتا ہی جا رہا ہے۔۔۔۔ آج تک ۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔ آج کے بعد۔۔۔۔ شاید نئی صدی کے پہلے، دوسرے، یا تیسرے دہے کے بعد۔۔۔۔ "وہ جذبات کی رو میں بہتا ہوا مسلسل بولے جا رہا تھا مگر میں اچانک ہی اسے بتائے بغیر وہاں سے کھسک آیا اور گھر پہنچ کر بہت اداس اور خاموش خاموش سا رہا میں نہیں جانتا تھا کہ اپنی عمر کے کسی ساتھی کا دکھ جب دل میں سرایت کر جاتا ہے تو کتنی بے چینی اور بے قراری ابھرتی ہے۔۔۔۔

"کچھ پریشان سے لگتے ہو؟" ابا نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں!" میں نے دھیرے سے کہا۔ میرے ذہن میں بے شمار سوال اٹھ

رہے تھے مگر تایا اپنا فیصلہ سناتے رہے اور میں شہر جانے سے قبل نہ جانے اس سے کتنی بار ملتا رہا۔ جب بھی ملتا وہ پسینے میں شرابور ایک ایک الماری کھولتا ڈھول اور گرد میں خود ڈھول سے اٹا ہوتا ہوا، الماری سے ایک ایک کتاب نکالتا۔ ـــ تاریخ طبری، مشکوٰۃ الصلوٰۃ، صرا لحمید، مذاق العارفین ـــ

"شہر پہنچنے کے بعد کچھ دنوں تک وہ مجھے یاد آتا رہا۔ پھر شہر کی چکاچوند روشنیاں، بارونق سڑکیں اور دھلے دھلائے صاف ستھرے لوگ اور تعلیمی سلسلے ـــ ان سب میں، میں اس قدر کھو گیا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصہ گزر گیا۔ اجاڑ بستی خواب وخیال بن گئی۔ کبھی کبھار یہ سننے میں آتا رہا کہ بستی کے اطراف کھڑی فصلیں ڈھ گئی ہیں ـــ ہنومان جی کی جاترا میں بہت زیادہ جم غفیر ہونے لگا ہے ـــ حبیب اللہ کے عرس میں محفل سماع کی جگہ فلمی گانے دھوم مچانے لگے ہیں اور وہ بوڑھے جن کے دھندلے دھندلے چہرے مجھے یاد تھے ایک ایک کر کے مٹتے جا رہے ہیں۔

"اور میرا وہ پڑوسی اور اس کی وراثت!" بارہا نہ سہی کبھی کبھار تو میں نے اسے یاد کیا ہی ہوگا کہ گزرے دنوں کا یہ پڑوسی میرے ذہن میں کسی طلسماتی کردار کی طرح بسا ہوا تھا ـــ

اکثر میری بیوی مجھے اس کے خیال میں کھویا ہوا پا کر پوچھ بیٹھتی ـــ "اس پڑوسی کی کیا عمر رہی ہوگی؟"

"شاید میری عمر سے وہ کچھ بڑا ہی رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے اس نے بستی چھوڑ دی ہو اور میری طرح شہر چلا آیا ہو۔ اور اگر شہر چلا آیا ہے تو اسے ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی ـــ مگر اس کی کوئی تصویر ـــ!

فرصت کے اوقات میں، میں نے وہ سارے لفافے چھان مارے جن میں ہم نے کچھ ایسی تصویریں رکھ چھوڑی تھیں جو ہماری فیملی کے البم سے نکال دی جاتی رہی تھیں ـــ یہ تصویر ـــ یہ تصویر ـــ ڈھیر ساری تصویریں میرے ذہن میں گڈمڈ ہوتی رہیں ـــ اب شاید اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک لگ گئی ہوگی ـــ گال پچک گئے ہوں گے ـــ پیشانی ماہ وسال کی لکیریں ابھر آئی ہوں گی ـــ دن رات کتابوں کے اوراق الٹتے الٹتے اس کی کنپٹی کی رگیں تڑپتی ہوں گی کہ وہ کتابوں کا کیڑا ـــ

اچانک ہی مجھے اپنی پشت پر کسی کی گرم گرم سانسوں احساس ہوا ـــ میں نے چونک کر دیکھا، پشت پر میری بیوی کھڑی گہری لمبی سانسیں لیتی ہوئی اس تصویر کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھی جو میرے سامنے پڑی تھی۔

"یہ تصویر ـــ؟" وہ اچانک ہی پوچھ بیٹھی۔

"گزرے دنوں میں یہ میرا پڑوسی تھا ـــ" میں نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔ جواب سن کر میری بیوی ایک دم قہقہہ لگا بیٹھی پھر میرا مذاق اڑاتی ہوئی بولی "اب تو آپ سے اپنی تصویر بھی نہیں پہچانی جا رہی ہے!" ***



واصل عثمانی

ڈھونڈا کیا ہوں غم کا مداوا کہاں کہاں
ہوتا رہا ہوں عشق میں رسوا کہاں کہاں

یہ کاروبارِ شوق کی دنیا عجیب ہے
مجھکو لئے پھری یہی دنیا کہاں کہاں

شاید نگاہ شوق جہت آشنا نہ تھی
کرتی رہی کرم کا تقاضا کہاں کہاں

اے جذبہ شوق تو بھی مرے ساتھ چل
پھرتا رہوں میں یوں تن تنہا کہاں کہاں

دیکھا تھا اس نے ایک نظر لطف خاص سے
اس اک نظر کا اب بھی ہے چرچا کہاں کہاں

● P.O BOX 2080,DAMMAM-31451,(K.S.A.)



بسمل نقشبندی

سوائے تیرے نگاہوں کے رو برو کیا ہے
جو تو نہیں تو یہ دنیائے رنگ و بو کیا ہے

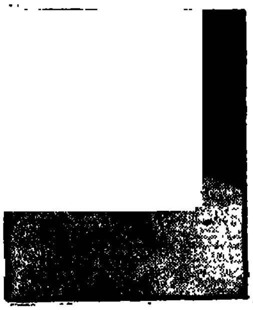
کبھی مقیم کبھی دربدر کبھی گمنام
میں خود سمجھ نہیں پایا کہ میری خو کیا ہے

لہو کا رنگ ہے معیارِ زندگی کا ثبوت
لہو کا رنگ بدل جائے تو لہو کیا ہے

ہے خشک ریت کا ٹیلہ ہواؤں کی زد پر
خوشی کا اسکے سوا نام اور نمو کیا ہے

نکل کے دیکھ کبھی خلوتوں سے اے بسملؔ
دیارِ عشق میں یہ رقص ہاؤ ہو، کیا ہے

●RAHMAT KADA RAJ TALAB. BANSWARA -327001(RAJ.)



رزاق اثر شاہ آبادی

دیدۂ دلبراں میں رہتا ہوں
شبنمی سائباں میں رہتا ہوں

فہم وادراک ہیں مری پہچان
چشم دانشوراں میں رہتا ہوں

کچھ عناصر ہیں جس کی دیواریں
ایک ایسے مکاں میں رہتا ہوں

درمیاں فاصلہ نہیں کچھ بھی
حرف کن ہوں فکاں میں رہتا ہوں

وقت ہوں لوٹ کر نہیں آتا
گردِ ہوں کارواں میں رہتا ہوں

● KHURSHID MOHALLA,SHAHABAD- 585228(KARNATAKA)

عدیل یوسف صدیقی

دوقدم ہی نکلے تھے شہر آگہی میں ہم
صید ہوگئے اک دم دام باہمی میں ہم

التفات خوباں سے زیست اپنی آساں تھی
خود ہی ہو گئے مشکل ان کی بے رخی میں ہم

لذتیں گناہوں کی کہہ رہی ہیں لوٹ آؤ
اجنبی سے لگتے ہیں راہِ راستی میں ہم

مستقل مزاجی سے کس نے کس کو چاہا ہے
کیا عجب جو رہتے ہیں لطفِ عارضی میں ہم

بے دلی سے ملتے تھے رسم سی نبھاتے تھے
اب جو دوستی چھوٹی خوش ہیں دشمنی میں ہم

● 2 FLAMSTED AVENUE,WEMBLEY, MIDDLESEX HA9 6DL(U.K)

ساحر افغانی

فقیروں تک رسائل بے پناہی کے نہیں آتے
سلیقے اب بھی ہم کو بادشاہی کے نہیں آتے

بھٹکتی ہے جوانی وسوسوں کی تیز آندھی میں
محاذ جنگ سے جب خط سپاہی کے نہیں آتے

یہ پسماندہ علاقہ ہے یہاں مزدور رہتے ہیں
قدم اس میں کسی ظلِ الٰہی کے نہیں آتے

سر فہرست سارے باغیوں میں نام ہے میرا
مجھے آداب اس دربار شاہی کے نہیں آتے

کوئی منصف تمہارے حق میں کیسے فیصلہ دے گا
طریقے جب مجھے جھوٹی گواہی کے نہیں آتے

●49-CHIPA PURA,JAORA-457226(M.P)

قمر جمالی
C-117 A.G. COLONY, YOUSUFGUDA,
HYDERABAD - 500045 (A.P.)

خواب، آنکھیں اور تعبیر

"اُف !"

اسما نے شانتی کی چولی برابر کردی۔

"جانور ہے۔ ساری پیٹھ زخموں سے پٹی پڑی ہے۔ بہت ظالم ہے۔"

"وہ مجھے چاہتا بھی بہت ہے میم صاب۔ مگر۔۔۔"

گھڑی بھر کو ٹھنڈی ہوا کی زد میں آیا چہرہ یکلخت پہلے سے زیادہ مرجھا گیا اور شانتی اس 'مگر' کا جواز ڈھونڈتی کہیں دور نکل گئی۔ اسما کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ایک شانتی ہی کیا دنیا کی ساری عورتوں کی بے بسی اس سہ حرفی لفظ 'مگر' سے جڑی ہے۔ بڑا طاقت ور لفظ ہے یہ۔ اپنے آپ میں مثبت منفی صفات لئے۔ کبھی کبھی تو یہ لفظ وہ کام کر جاتا ہے جو بڑے بڑے سورما بھی نہیں کر سکتے۔

'مگر'

ایک اندھا یقین۔

خود فریبی۔

ایک جھوٹا سچ۔

جینے کا حوصلہ۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔!!

اسما بڑی دیر تک اس چھوٹے سے لفظ کی بھول بھلیوں میں گردش کرتی رہی۔ پھر جو شانتی کی طرف اسکی نظر اٹھی، اسے اپنے بودے پن پر غصہ آیا۔ "شٹ۔۔۔ تو سٹپٹیلا۔۔۔!!"

اس نے ذہن کو جھٹکا دیا اور آہستہ سے شانتی کے شانوں کو چھوا جو سسکیوں کی وجہ سے مسلسل متحرک تھے۔ شانتی! میں تیرے اس 'مگر' کا پھیلاؤ دیکھ سکتی ہوں۔ بڑا دو حیثیت لفظ ہے یہ دراصل یہ لفظ، لفظ، نہیں، ہتھیار ہے۔ چاہو تو اپنی حفاظت کے لئے استعمال کرو۔۔۔ چاہو تو اسی سے خود کشی کرلو۔ رو نہیں شانتی! آنسو کسی کا مقدر نہیں بدلتے۔ پھر تو بات بے بات پر اس سے الجھتی کیوں ہے۔۔۔؟ مان کیوں نہیں لیتی وہ جو کہتا ہے؟"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں میم صاب۔۔۔! آپ تو اپنی آرگنائن (آرگنائزیشن) میں عورت کو طاقت ور بننے کا سبق سکھاتی ہیں۔ اپنے حق کے لئے لڑنا سکھاتی ہیں" شانتی نے آنسوؤں سے تر بتر چہرہ اوپر اٹھایا تو اسما کو لگا جیسے چوری کرتے دھرلی گئی ہو۔ اسے اپنی شخصیت مٹی مٹی ڈھیر ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شانتی سچ کہتی تھی۔ وہ خود کو آزادیٔ نسواں کی علمبردار سمجھتی تھی۔ مگر۔۔۔

"اف! پھر وہی مگر۔۔۔!!"

اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ اس صورت حال کی عادی تھی۔ شانتی! ظلم صرف سہنے کی چیز ہے اور ظلم سہنا عورت کا مقدر ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے اس ظلم کا شکار صرف تیری ہی برادری کی عورتیں ہوتی ہیں۔۔۔؟ نہیں!۔

عورت صرف عورت ہے۔ اس کے صرف نام بدل سکتے ہیں۔ کبھی شانتی۔۔۔ کبھی اسما۔ مگر ناموں کے بدلنے سے ظلم کے ساتھ عورت کا رشتہ بدل نہیں جاتا۔ صرف ظلم سہنے کے طور طریقے بدل جاتے ہیں۔ میری ایک بات یاد رکھ، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے گرہستی کی دیواریں ہلنے لگتی ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اگر تجھ میں استادم ہے تو پھر۔۔۔"

پھر آپ میم صاب۔۔۔؟"

ایک زوردار سمندری تھپیڑا اسما کے وجود سے ٹکرا گیا۔ آنسو اب دونوں کی آنکھوں سے رواں تھے۔ ان میں اب نہ کوئی مالکن تھی اور نہ کوئی ملازمہ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں اب کوئی دو وجود تھے ہی نہیں۔ صرف ایک تھی۔

عورت۔۔۔

خدا کی سب سے خوبصورت، مگر مجبور تخلیق۔

تخلیق کا سرچشمہ۔۔۔ پھر بھی حکم کی بندی۔

مرد کے احکامات کی پابند۔۔۔

کہا کھڑی ہو جاؤ۔۔۔ تو حکم بجالانے کے سوا چارہ نہیں۔ ورنہ دین دنیا دونوں سے محروم۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ اپنی آنکھوں میں اپنی نیند سونا چاہتی ہے۔

پیدائش سے لے کر بیاہنے تک صرف یہی الفاظ اس کے کانوں میں انڈیلے جاتے رہے کہ۔۔۔ شوہر مجازی خدا ہے۔۔۔ اس کی بندگی کرو۔

کہا سو جاؤ۔۔۔ تو چپ چاپ سو جاؤ۔

کہا جاگتی رہو۔۔۔ تو اس کا دل بہلاؤ۔

کہا دلہن بن کر سامنے آؤ۔۔۔ تو ویسا ہی کرو۔

شٹ۔۔۔ ایہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔۔۔

"شانتی! تو کبھی اپنے میاں کے لئے تیار ہوئی ہے؟"
"سمجھی نہیں میم صاب۔۔۔"
"یعنی کہ۔۔۔۔ کیا تو کبھی خود سے۔۔۔ خیر چھوڑ۔۔۔ تو سمجھے گی نہیں۔" "کیوں نہیں میم صاب۔۔۔!"

وہ ایک دم چہک اٹھی اس کے چہرے پر بے شمار چراغ جل اٹھے بجھی بجھی آنکھوں میں چمک در آئی

"اور آپ میم صاب۔۔۔؟"

شانتی نے شرماتے لجاتے امبا کی طرف دیکھا تو گھبرا گئی۔۔ امبا میم صاب اسے پتھر کا بت لگیں۔ نہ آنکھوں میں جوت تھی۔۔۔ نہ چہرے پر زندگی

۔"امبا میم صاب۔۔۔!"

وہ امبا کو جھنجھوڑنے لگی۔

امبا، مہذب دنیا کی پیداوار تھی جہاں تہذیب کی قدروں نے اس سے کسی کے فطری جذبوں کو سلب کر لیا تھا ،اور وہ وقت کے ایک ایسے اسپیس شیپ (SPACE SHIP) میں قید تھی جس سے باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ اب وہ اس اسپیس شیپ کے کمانڈ پر مختلف ادوار میں سفر کر رہی تھی جس کا نہ کوئی ٹھور ٹھانہ ٹھکانہ۔ جہاں روک دیا۔۔۔ بس اسی دور کو جی لئے۔

شانتی کے اس اچانک سوال کے لئے امبا تیار نہ تھی۔ اس کے سوال نے امبا کے اسپیس شیپ کو اس زور کا جھٹکا دیا کہ وہ اچھل کر کسی اور دور میں پہنچ گئی جہاں وہ ابھی تک ایک پاؤں چلتی بچی تھی۔

کھلی آنکھوں سے اس نے دیکھا۔

وہ پاؤں پاؤں چل رہی تھی اور دو نگران آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ذرا لڑکھڑا کر گری کہ دو مہربان ہاتھوں نے اسے اٹھا لیا اور اسکے نام نہاد زخموں کو آنکھوں سے لگایا۔ ان پر بوسوں کی ایسی بارش کی کہ اس کے گھٹنوں کی نرم ریشمی جلد چلنے لگی۔

"اف جلتا ہے۔۔!!"

بے خیالی میں وہ اپنا گھٹنا سہلانے لگی۔۔

"کیا ہوا میم صاب۔۔۔؟"

آؤ تاؤ دیکھے بغیر اس کے برابر نیچے قالین پر بیٹھی شانتی زور زور سے امبا کا گھٹنا سہلانے لگی "چہرے کے لگتے ہیں۔؟"

"کہاں میم صاب؟"

یہاں۔۔۔"

امبا نے ساڑی اوپر کھسکا کر شانتی کو اپنا گھٹنا دکھلایا۔

"پیار جلتا ہے تجھے پتہ ہے۔۔۔؟" "پتہ نہیں میم صاب۔۔ مگر پیار بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ ایک نشہ سا ہوتا ہے۔ اتنا کہ خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔ ہاں کبھی کبھی بالوں سے پھولوں کا گجرا پھسل کر ادھر ادھر پھیل جاتا ہے تو پیار خوشبو بن کر نس نس میں سماجاتا ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ۔۔۔۔"

شانتی جذبات کی رو میں کہے جا رہی تھی۔

مگر امبا۔۔۔؟

وقت کے اسپیس شیپ میں پھنسی کسی روبوٹ کی طرح تڑپ رہی تھی ایسے خواب تو اس نے بھی دیکھے تھے۔

مگر۔۔۔

خواب اور حقیقت کے بیچ اتنا بعد ہوگا اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ زندگی کے شائستہ رویوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ خواب بھی۔

"شانتی! تو نے کبھی ایسا خواب دیکھا۔۔۔؟"

"کیسا میم صاب؟"

"کہ تو ایک دم جوان ہے جیسے کچھ سال پہلے تھی۔۔ اور کوئی تجھ سے۔۔۔ نہیں رہنے دے۔ تو سمجھے گی نہیں۔۔۔۔"

"سمجھوں گی کیوں نہیں میم صاب۔ ایسے خواب تو میں ہر رات کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ مگر کسی ایسے ویسے کے ساتھ نہیں۔۔۔ سب میرے اپنے ہوتے ہیں۔۔ میرے سپنوں کے راج کمار۔ کتنا ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔۔! کتنا پیار کرتے ہیں۔۔! میں اس کا حساب بھی نہیں کر سکتی۔ تھک جاتی ہوں۔ مگر اس تھکان میں بھی ایک طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ دن کیسے گزر جاتا ہے۔۔ نہیں پتہ۔۔۔ آپکے گھر سے کل ملا کر دس گھروں کا چوکا باسن کرتی ہوں۔ پھر بھی۔۔۔۔"

"خواب دراصل محرومیوں کی تعبیر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سب کچھ الٹا الٹا دکھائی دیتا ہے۔ شانتی! جو چیز ہم زندگی میں حاصل نہیں کر سکتے وہ خواب میں حاصل کر لیتے ہیں۔ خواب بہت سی خاموش زندگیوں کے جینے کا سہارا ہوتے ہیں۔ اگر خواب بھی آنکھوں سے روٹھ جائیں تو پتہ نہیں کتنی زندگیاں ادھ جلی لکڑیوں کی طرح صدا دینے لگیں۔

اور

بھگوان نہ کرے۔۔۔ خواب اگر چھن جائیں۔۔

تو۔۔۔

عورت تو جیتے جی مر جائے۔۔۔"

"میم صاب۔۔۔ میم صاب! آج یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ یہ کس دنیا کی بات کر رہی ہیں۔ اور۔۔۔ یہ آپکی آواز کو کیا ہو گیا ہے؟!"

"یہی میری حقیقی آواز ہے شانتی۔ ایک عورت کی آواز جو وہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے۔ مگر زمانہ، حالات اور زندگی کے تقاضے اسے مختلف آوازوں کے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ گزرتے وقت کے ساتھ بے شمار آوازیں بیک وقت نکل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شناخت باقی نہیں رہتی۔"

"آپ کی بھی میم صاب؟"

"ہاں میری بھی۔"

مگر صاب تو آپ کے پاؤں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں۔ آپ تو آپ،

وہ کسی بھی عورت پر ظلم ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔"

بس یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر مرد دوہرا ہو جاتا ہے۔ دوہرا مرد اکہرے مرد سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ایسا مرد بظاہر تو عورتوں کی بھلائی کی باتیں کرتا ہے، مگر اندر ہی اندر اسے یہ خوف مزید خطرناک بنا دیتا ہے کہ کہیں گھر کے اندر کی عورت اس سے زیادہ طاقت ور نہ ہو جائے۔"

"تو نہیں جانتی شانتی۔! ظلم کیسے شکلیں بدل بدل کر وار کرتا ہے۔ پہلے تو زندگی کی مہذب قدریں عورت کے حلق سے اس کی آواز کھینچ لیتی ہیں۔ پھر بھی۔ کبھی جو کوئی آواز کسی طرح بلند ہو گئی ـــــ تو سمجھو مہابھارت چھڑ گئی

اپنے ہی آنگن میں کروکشیتر۔

جس میں پانڈو بھی اپنے اور کورو بھی اپنے۔ کس کس کو روئے ـــ

تو جانتی ہے شانتی! مہابھارت میں سب سے مظلوم کردار کس کا تھا۔؟

گاندھاری کا۔

کروکشیتر گواہ ہے گاندھاری مہابھارت کا وہ مظلوم کردار ہے جس نے رن بھومی پر گرے ہر خون کے قطرے کو اپنی پلکوں سے سینچا ہے۔ مگر کس نے گاندھاری کے درد کو محسوس کیا ـــ؟

کسی نے نہیں۔ شانتی! تو نے ـــــ"

یکایک امبا کو محسوس ہوا کہ بیچ بیچ میں ہاں، ہوں، کر کے اس کی باتوں کی تصدیق کرنیوالی اس کے قریب قالین پر بیٹھی شانتی موجود نہیں ہے۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائینگ روم میں شانتی کو نہ پا کر وہ باہر لیونگ ہال (LIVING HALL) میں نکل آئی۔ شانتی وہاں بھی نہیں تھی، مگر پاس کہیں سے گہری سانسوں کی مدہم لہر سنائی دے رہی تھی۔ امبا سانسوں کی اس سرگم کے تعاقب میں ڈرائینگ ہال تک چلی آئی جہاں سے پورٹیکو کا ایک حصہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ شانتی اپنے میاں کے سینے سے چپکی کھڑی تھی۔ اس کے میاں کی پیٹھ ڈائنگ ہال کی طرف تھی۔ وہ امبا کو دیکھ نہیں سکتا تھا مگر امبا کو پورٹیکو کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ شانتی کا سر اس کے میاں کے شانوں پر تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب آسودگی تھی۔ جسم کا سارا خون رخساروں میں سمٹ آیا تھا۔ ہونٹ فرط جذبات سے لرز رہے تھے اور آنکھوں میں سجے ادھورے خواب پلکوں سے چھلکنے بے تاب تھے۔ شانتی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے میاں کے گرد جکڑ رکھے تھے۔ ایک انجانے جذبے کے تحت وہ دو قدم اور آگے بڑھ گئی ـــــ پھر خود ہی لوٹ آئی۔ مگر ـــــ

ایک نظر مزید ان کی طرف دیکھنے کی چاہ نے اس کے قدم جکڑ لئے۔ وہ رک گئی ـــ

ساکت جسموں میں اب جنبش ہونے لگی تھی۔

"اُف جلتا ہے ـــــ!"

امبا دوڑتے قدموں سے ڈرائنگ روم میں لوٹ آئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پیار پلکوں کے پیچھے گلسرین کی رو کی طرح پھیل گیا تھا۔

اسے اپنا سارا بدن جلتا ہوا محسوس ہوا۔

مارے گھبراہٹ کے اُس نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ کالے پر سوار خوابوں کے ہیولے حدِ نظر تک پھیل گئے تھے۔

اور ....

سب کچھ دھواں دھواں سا تھا ۵۵

بقیہ صفحہ ۴۰۔ ابرزادی ۔

"میری ماں نارویجن ہے اور باپ پاکستانی۔ اس نے بولنا شر: دونوں کو لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہونے کا شوق ہے۔ ایک کو موجودہ ز: اور دوسرے کو آنے والی زندگی میں۔ چنانچہ میری ماں جسے اس زندگ پتی ہونا تھا، ایک ڈرگ اسمگلنگ کیس کی وجہ سے جیل میں بیٹھی ہے: باپ جسے آنے والی زندگی کیلئے سرمایہ درکار ہے۔ اس نے مسجد کو ا بنالیا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی میں کیا کروں۔ مجھے لکھ پتی یا کروڑ پتی میں اپنی زندگی جیل یا مسجد میں نہیں گزار سکتی۔ مجھے ان جگہوں کی بہ! اور منزل پر پہنچنا ہے لیکن وہ ہے کہاں اور مجھے وہاں کیسے پہنچنا ہے۔ ا: خبر نہیں ہے۔"

"منیر تو کہہ رہا تھا کہ تمہارے ماں باپ جنت میں ہیں" کافی ش بیٹھے اکرم نے کہا۔

"اسے میں نے ہی بتایا تھا۔" گینا بولی۔

"لیکن آج کا تمہارا بیان مختلف ہے۔" اکرم نے تبصرہ کیا۔

"بالکل نہیں!" وہ وثوق کے ساتھ بولی۔ "میرا دعویٰ اب بھی یہ میرے ماں باپ اپنی اپنی جنت میں ہیں۔" کہیں دور سے ایک ننھی منی آواز سنائی دے رہی تھی۔ منتظم خاتون نے ایک نئے سیشن کا آغاز کر دیا



عالم خورشید

اپنی مسافت بے مزہ کرنا نہیں
،نا ہے منزل کا پتہ کرنا نہیں

، ہم کبھی ساحل پہ پہنچیں یا نہ پہنچیں
ی ناخدا کو اب خدا کرنا نہیں ہے

سے ہی قائم ہے ہماری ضو فشانی
سے چراغوں کو جدا کرنا نہیں ہے

وقت کے تیور پرکھنا چاہتے ہیں
ں نے بزرگوں کا کہا کرنا نہیں ہے

ضامن ہو میری زندگی کے مرے خوابوں!
اک پل بھی آنکھوں سے رہا کرنا نہیں ہے

شفتہ سر مل جائیں گے اس راہ میں عالم
کے واسطے ہم کو صدا کرنا نہیں ہے

● O/O THE D.A(P) EXIBHITION ROA
PATNA-800001 (BIHAR)



رفیق عادل

کوئی منزل نہ کوئی زینہ ہے
ہر مکاں گویا اک دفینہ ہے

سر خرو ہے اگر لہو دل کا
شامل اس میں کوئی پسینہ ہے

رابطہ کیا ہے اشک سے دل کا
اک انگوٹھی ہے،اک نگینہ ہے

اس کی خاطر ہے اپنی خوش پوشی
اس کی خاطر فگار سینہ ہے

کس سمندر کی بیکرانی میں
ذہن کا ڈوبتا سفینہ ہے

● MADAR MOHLLA,
FAIZPUR 425503(M.S)



ریاض لطیف

غلیہ خلیہ وقت کے پتھر بس یوں ہی
ایک جہاں رگ رگ کے اندر بس یوں ہی

رنگوں کا دل چیر کے تکتا رہتا ہوں
منظر میں کھلتے ہیں منظر بس یوں ہی

روحوں کی گردش کا ہوں نایاب ثمر
میں کھلتا ہوں محور محور بس یوں ہی

ہاتھ کب آتا ہے مفہوم ترا پھر بھی
چھو کر دیکھا تیرا پیکر بس یوں ہی

اندر کیا کچھ ٹوٹ چکا ہے پھر بھی ریاضؔ
ہم بیٹھے ہیں دل کے باہر بس یوں ہی

● A-3 ACORED STEPS NR.KHANPUR
DARWAZA,AHMADABAD-380001(GUJ)



سعید انجم

ابر زادی

اردو کی نئی بستیوں کے مشہور افسانہ نگار سعید انجم ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ابھی فروری کے آخری ہفتے میں اردو ٹرسٹ (لندن) نے عالمی اردو کانفرنس منعقد کی تھی۔ وہیں ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی حالانکہ ایک زمانے سے ہمارے درمیان مراسلت تھی. اس پہلی ملاقات میں کئی خوابوں اور وعدوں کے ساتھ رخصت ہونے والے سعید انجم یوں اچانک ۲۱ر اپریل بروز جمعہ کو کوپن ہاگن (ڈنمارک) میں اپنی آخری سانسوں کو گن کر رکھ دیں گے. معلوم نہ تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اوسلو سے EASTER کی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دوست سائیں سچا اور نصر ملک کے ساتھ ایک اہم پروجیکٹ، مغرب میں اردو افسانہ، کے موضوع پر کام کر رہے تھے۔ اور بھی کام تھے ان کے۔ رسالہ شاعر سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ضلع گرداسپور (پنجاب) میں پیدا ہوئے سعید انجم مختلف تعلیمی مراحل اور معاشی مسائل سے گزرتے ہوئے درس و تدریس، فلم اور سیاست سے وابستہ ہوئے۔ درس و تدریس ان کا بنیادی کام تھا۔ مختصر فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ ایک فیچر فلم سات سمندر پار. اپنے ایک نارویجین دوست کے ساتھ لکھی اور اس کی ہدایت کاری بھی کی۔ اس فلم نے کئی عالمی ایوارڈ حاصل کئے۔ سعید انجم کی تصانیف میں: سب اچھا ہوگا [افسانے۔ ۱۹۹۰ء] سوتے جاگتے خواب [افسانے۔ ۱۹۹۴ء] مغرب کے اردو افسانے [مختلف افسانہ نگاروں پر مضامین۔ ۱۹۹۷] اوسلو کے مہمان [اوسلو میں آنے والے اردو قلم کاروں پر مضامین۔ ۱۹۹۹ء] زیر طبع کتابیں: آدھی رات کا سورج [قیام نامہ ناروے] نارویجین افسانے [تراجم] مغرب میں اردو افسانے [خواتین افسانہ نگاروں پر مضامین]

سعید انجم کا یہ افسانہ ابر زادی. ان کا آخری غیر مطبوعہ افسانہ ہے جو ان کے دوست افسانہ نگار سائیں سچا [سویڈن] نے شاعر کے لئے ارسال کیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے دو مضامین بھی بھجوائے ہیں۔ ایک خود ان کا تحریر کردہ ہے اور ایک نصر ملک (ڈنمارک) نے لکھا ہے۔ مگر افسوس کہ کہانی کے ساتھ مذکورہ مضامین شائع نہیں کئے جا رہے ہیں حالانکہ خود سعید انجم مرحوم کے خطوط اور دیگر چیزیں ہمارے پاس ہیں اور ایک خوب سیرت. گوشہ سعید انجم' ترتیب دیا جاسکتا تھا لیکن شاعر کے محدود صفحات کے سبب صرف اسی کہانی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ کہ ہند و پاک کے کئی مشاہیر مرحومین کا ہم پر قرض ہے اور اب محترم علی سردار جعفری بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ ہمارے دکھ مسلسل ہیں. رفتگاں کی یکجائی سے کوئی خصوصی شمارہ ترتیب دیا جاسکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو اس میں سعید انجم بھی شامل رہیں گے۔ [الف الف]

ٹن کی آواز گونجی اور دروازے کے پٹ کھل گئے۔

لفٹ کی دودھیا روشنی میں ایک حسینہ کھڑی پلکیں جھپکا رہی تھی۔

"اکرم ؟" شناسائی بھرے لہجے میں وہ بولی۔ جان پہچان کی مسکراہٹ اکرم کے چہرے پر بھی چمکی "آجاؤ!" ایک طرف سمٹتے ہوئے اس نے کہا۔ اکرم آگے بڑھا۔ خودکار دروازہ بند ہو گیا اور دور کہیں چھپے ہوئے ایک پنکھے کے ساتھ لفٹ متحرک ہو گئی۔

پہلی دفعہ وہ منیر کے یہاں نظر آئی تھی۔ گھنٹی بجائے بغیر اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلی آئی۔ اسے لائیٹر یا ماچس کی ضرورت تھی۔ سگریٹ سلگا کر وہ واپس نہیں گئی۔ وہیں ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور میز پر رکھے تھرموس کی طرف دیکھنے لگی۔ "کافی پیو گی؟ منیر نے پوچھا"

"چائے" کہتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن چہرے کا تناؤ راستے میں پہاڑ بنا جاتا تھا۔

"ہم تو کافی پی رہے ہیں" منیر نے بتایا

"اوہ !؟" ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اٹھی اور سرکس کے رسے پر چلنے کے انداز میں دروازے سے باہر چلی گئی۔

"میری ہمسائی ہے یار" منیر بولا "دودھ اور چینی والی چائے اسے پسند ہے کبھی کبھار سگریٹ سلگانے کے بہانے یہاں چلی آتی ہے۔"

"تو چائے تم پلا دیتے" اکرم نے کہا "یہاں دودھ بھی ہے اور چینی بھی" "ضرور پلا دیتا۔" منیر بولا۔ "اگر وہ ہوش میں ہوتی۔ دیکھا نہیں تم نے، اس کی آنکھیں کیسی بجھی ہوئی تھیں؟"

"لیکن بدن تو خوب تنا ہوا تھا۔" سر ہلاتے ہوئے اکرم نے کہا۔ "شام کے وقت تو یہ سجا بھی ہوتا ہے" منیر نے ہنستے ہوئے بتایا "تب یہ حسینہ نشہ خریدنے کیلئے اسے بیچتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جسم کو بیچنے کیلئے نشہ کرتی ہو؟" اکرم نے اندازہ لگایا "عین ممکن ہے" منیر نے کہا "تم ایک کام ضرور کرو۔"

"بتاؤ۔" اکرم بولا۔
"کسی روز اسے چائے پر بلالو۔ وہ خوشی خوشی تمہارے ہاں پہنچ جائیگی۔ پھر اسی سے پوچھ لینا۔ اپنے اعمال کی وجہ وہ خود ہی بیان کر دے گی۔"

گھنٹی بجتے ہی اکرم نے دروازہ کھول دیا۔ طے شدہ وقت پر وہ پہنچ گئی. مسکراتی آنکھوں کے ساتھ۔ اس کے چہرے پر کسی پہاڑ کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک نیلا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ دروازہ کھلنے پر وہ اندر داخل ہوئی۔ پہلے اس نے جیکٹ اتاری پھر جوتے۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ آرام سے بیٹھ گئی۔ "گندہ موسم۔ روائتی انداز میں اکرم نے بات شروع کی۔ "غلط کپڑے۔ جواب میں وہ بولی "میری ماں کہا کرتی تھی کہ جو بات تمہارے بس میں نہ ہو اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے"۔
"یعنی موسم برا نہیں ہوتا؟" اکرم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں!" وہ وثوق سے بولی۔ "کپڑے غلط ہوتے ہیں۔" مناسب کپڑے!" اکرم نے اس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "موسم کا مقابلہ کرنے کیلئے تم تیاری کر کے نکلی ہو۔"
"شاید؟" وہ بولی۔ "میری ماں گھر سے نکلتی تو چھتری ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ وہ کہا کرتی۔ بادل کبھی بھی آسکتے ہیں۔ بارش کہیں بھی ہو سکتی ہے۔" "یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔" اکرم نے کہا"۔ جب کہیں انسان کے بھیگنے کا ڈر ہو چھاتا اسے ڈھانپ لیتا ہے۔"
"لیکن میں کبھی چھتری لے کر نہیں نکلتی۔"
"کیوں؟"
"بھیگنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ فطرت کے خلاف ہتھیار اٹھانا مجھے پسند نہیں۔
"ویری گڈ!" اکرم اٹھتے ہوئے بولا۔ "آج تم چائے میں نہاؤ۔"

گھنٹی بجتے ہی اکرم نے فون اٹھالیا۔ "ہاں بھئی؟" دوسری طرف منیر تھا۔
"بولو!"
"کیا بولوں؟؟ اکرم نے پوچھا
"تمہاری ڈیٹ کیسی رہی؟ بدن تک پہنچے؟؟" منیر نے پوچھا "نہیں بھئی"
"تو سوئی کیا نشے پر ٹکی رہی؟" "یہی سمجھ لو۔" اکرم نے کہا "چائے کا سر در دیکھنے کا موقع مل گیا۔"
"یعنی مزہ آیا؟" چھلکتے ہوئے لہجے میں منیر بولا۔ "ہاں! چائے کا لونڈیا نے خوب مزہ لیا۔"
"معلوم ہوتا ہے اس ملاقات میں تمہیں کچھ ملا نہیں؟" منیر کا لہجہ کچھ بجھ سا گیا۔ "تمہاری توقعات تو معلوم نہیں کیا تھیں لیکن مجھے وہ اپنی ماں کی باتیں سناتی رہی۔" اکرم نے تو بتایا
"میرا خیال ہے ـــــ ایک لمحے کیلئے رک کر منیر بولا۔ "تم میں اسے اپنا باپ نظر آیا ہوگا۔"
"بھئی لعنت ہے تم پر۔" کہتے ہوئے اکرم نے فون بند کر دیا۔ گھنٹی پھر بجی۔ اکرم نے فون اٹھالیا۔ "اب کیا ہے؟" اس نے تلخی سے پوچھا
"میرا نام نگینہ ہے۔" دوسری طرف سے ایک زنانہ آواز سنائی دی۔
"نگینہ؟" اکرم نے حیرانی سے دوہرایا
"ہاں!" وہ بولی۔ "آپ کے دوست منیر کی ہمسائی کل آپ نے مجھے چائے پر بلایا تھا۔"
"اوہ؟ ـــــ اچھا اچھا!!"
"کل کی نشست کیلئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔" بامحاورہ نارویجن زبان میں اس نے اپنے مہذب ہونے کا اظہار کیا۔ "کچھ اسی طرح کے احساسات آپ میرے بھی سمجھئے۔" اکرم نے بھی نارویجن آداب سے شناسائی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔" نگینہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"ہیلو!" گھنٹی بجتے ہی اکرم نے فون اٹھالیا "تمہیں غصہ کیوں آگیا تھا؟" منیر نے پوچھا "تمہاری ہمسائی کا نام نگینہ ہے کیا؟" اکرم نے پوچھا "ہاں! ۔کیوں؟"
"مغرب کی لڑکی اور مشرق کا نام؟" اکرم زیر لب بڑبڑایا "اس کی ماں نارویجن تھی اور باپ پاکستانی" منیر نے اطلاع دی "واقعی؟" اکرم کو یقین نہیں آیا۔ "میں پوچھ رہا تھا ـــــ" منیر نے کہا "تمہیں غصہ کیوں آگیا تھا کیا ماں باپ کو خبر ہے کہ ان کی بیٹی نشہ کرتی ہے اور جسم بیچتی ہے؟"
"وہ دونوں جنت میں ہیں۔" منیر نے بتایا "اوہ!" اکرم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیوں؟ کیا ہوا؟؟"
"کچھ نہیں۔" اکرم نے جواب دیا۔ "بیچاری نگینہ"
"واہ! تم تو سچ مچ اس کے باپ بن گئے۔"
"تو کیا حرج ہے؟" اکرم نے شاید خود سے کہا۔
"بھئی لعنت ہے تم پر۔" منیر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اکرم کو استقبالیہ سے فون پر ایک ملاقاتی کے پہنچنے کی اطلاع دی گئی۔ پھر اسے منیر کی آواز سنائی دی۔ "نیچے آؤ فوراً!"
بھاگم بھاگ وہ استقبالیہ تک پہنچا۔ وہاں پر ایک چٹ چھوڑ کر منیر جا چکا تھا جس پر لکھا تھا "میرے فلیٹ پر پہنچو۔"
"اس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟" ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے اکرم نے سوچا۔ سامنے سے پولس کی ایک کار سائرن بجاتے ہوئے نکل گئی۔ بریک لگتے ہی اس نے پیسے دیئے اور گاڑی سے اتر آیا۔ منیر کے علاقے میں نرم اور بھربھری برف اب شیشہ بن چکی تھی۔ کسی بھی وقت

کوئی بھی پھسل سکتا تھا۔ احتیاط سے چلتے ہوئے اکرم کو ایک محاورہ یاد آیا:
پھسلن پر سب کا وزن مساوی ہوتا ہے۔

دروازے کی گھنٹی کے پاس اکرم کے لئے ایک نئی چٹ موجود تھی۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔

منیر کی دی ہوئی فالتو چابی سے اکرم نے دروازہ کھولا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔ اسکرین پر ایک ایکشن فلم کے کردار لڑائی مار کٹائی میں مصروف تھے۔

ایک دم دروازہ کھلا اور چند پولس والے اندر آگئے۔ گھنٹی بجائے بغیر۔

"تم حراست میں ہو۔" آگے آنے والے افسر نے کہا۔ ہکا بکا اکرم ہتھکڑیوں کو دیکھتا رہ گیا۔

عدالت میں پیشی کے وقت منیر کے علاوہ نگینہ بھی تھی۔ "میرا نام گینا ہانسن ہے۔" ایک کٹہرے میں سے وہ بولی۔ "میرے گھر کی ایک فالتو چابی میرے ہمسائے کے پاس بھی رہتی تھی۔ نشہ آور دواؤں کا جو ذخیرہ پولس کو میرے گھر سے ملا وہ اسی نے میری لاعلمی میں وہاں رکھ دیا۔

میرے ہمسائے کا نام منیر احمد ہے۔"

ہمسائے کی شناخت کے بعد اکرم کو رہا کر دیا گیا۔ "تمہارا صحیح نام کیا ہے؟ اکرم نے نگینہ سے پوچھا جب دودھ اور چینی والی چائے کے ساتھ وہ دونوں رہائی کا جشن منا رہے تھے۔

"کاغذات میں گینا لکھا ہے۔ میرے ابو مجھے نگینہ کہتے تھے۔"

"اور ہانسن ـــــ؟"

"میری ماں کا خاندانی نام۔"

"یعنی باپ کی طرف سے تمہارے پاس کچھ نہیں رہا؟" اکرم نے اندازہ لگایا "نہیں" نگینہ نے جواب دیا "کچھ ممکن ہی نہیں تھا"

"کیوں"

"ان کے پاس بس اپنا کفن تھا۔" نگینہ نے بتایا۔ "جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے موت کا کچھ پتہ نہیں کب اور کہاں آجائے۔" "یہ بات تو" بالکل صحیح ہے۔ اکرم کہتے کہتے رک گیا۔ اسے نگینہ کی ماں یاد آگئی جو کہتی تھی "بادل کبھی بھی آسکتے ہیں۔ بارش کہیں بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں کبھی چھتری لے کر نہیں نکلتی۔" نگینہ بولی۔ "اور نہ کوئی کفن اپنے پاس رکھتی ہوں۔ معلوم ہے کیوں؟"

"کیوں؟" اکرم نے پوچھا

"کیونکہ ورثہ ہمیشہ اثاثہ نہیں ہوتا۔" نگینہ نے بتایا۔

"تمہارا اثاثہ تو یہ نیلا بیگ ہے شاید۔" اکرم بولا۔ "یہ ہمیشہ تمہارے پاس ہوتا ہے" "ٹھیک کہا تم نے۔" نگینہ بولی۔ "میرا سرمایہ تو اسی میں ہے۔ جب بھی میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ اس وقت یہ بیگ ہی میرے کام آتا ہے"

ٹن کی آواز گونجی اور دروازے کے پٹ کھل گئے۔ "کافی شاپ میں بیٹھتے ہیں۔" لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ بولی۔ "تمہیں گینا کہوں یا نگینہ؟" آرڈر کے بعد اکرم نے پوچھا "جو تمہارا جی چاہے" اس نے جواب دیا۔ "کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے والد مجھے نگینہ کیوں کہتے تھے؟" "نہیں!" اکرم نے جواب دیا۔

"کیونکہ خود کو وہ انگوٹھی سمجھتے تھے۔" "ہر باپ کیلئے اس کی اولاد نگینے جیسی ہوتی ہے۔" "اکرم نے کہا۔ وہ انگوٹھی بن کر اس کی حفاظت کرنی چاہتا ہے۔" "لیکن میرے والد کی اپنی جگہ میری ماں کی انگلی میں تھی" کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اپنی بات پوری کی۔

"تمہارا نیلا بیگ کہاں ہے گینا ہانسن؟ اکرم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی "وہ بیگ نہیں ایک پٹہ تھا اکرم۔" گینا نے جواب دیا۔ "میں اس کے ساتھ بندھی ایک لفٹ کی طرح متحرک رہتی۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ لوگ آتے جاتے رہتے لیکن میں وہیں موجود رہتی۔ ایک سرنگ میں۔ پانچ سال پہلے میں نے شہر چھوڑا تو میرے سارے ٹھکانے بدل گئے۔ سارے تعلقات بدل گئے۔ نیلے بیگ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ تو تم نے کمال کر دیا۔" اکرم نے توصیفی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا "شاید؟" گینا بولی۔ "اپنی مدد تو مجھے کسی طرح کرنا ہی تھی۔"

"اب یہاں اس ہوٹل میں کیسے؟" اکرم نے پوچھا۔ جیسے تم۔ "گینا نے بتایا "سیمینار کے شرکاء کی فہرست تم نے نہیں دیکھی؟" "نہیں!" اکرم نے بتایا۔ "میں یہاں کچھ دیر سے پہنچا ہوں۔ سیمینار کے کاغذات فی الحال اچھی طرح دیکھ نہیں سکا۔"

"مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔" گھڑی دیکھتے ہوئے گینا بولی "اب چلیں۔ سیشن کا وقت ہو رہا ہے۔"

ایک ننھی منی گھنٹی بجا کر منتظم خاتون نے سیشن کا آغاز کیا۔ سب کے چپ ہو جانے پر اس نے بولنا شروع کیا تارکین وطن اور پناہ گزین افراد کی ناروے میں موجودگی معاشرے کی رنگارنگی پرتوں میں وسعت کا اظہار ہے جبکہ کچھ لوگ اس صورت حال کو خطرے کی گھنٹی بھی بیان کرتے ہیں۔ جو افراد گرجے کی گھنٹی کا احترام نہ کر سکیں ان سے مندر کی گھنٹی کے تقدس کو سمجھنے کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ دنیا بھر کی لوک کہانیوں میں ہمیں چرواہوں کے کردار ملتے ہیں۔ ان کو اپنے ریوڑ کی خیر خبر گھنٹی کی آواز ہی سے ملتی ہے۔ سوشل ورکروں کے اس سیمینار کیلئے ہم نے معاشرے کے انبوہ میں سے چند خاص افراد کو یہاں پر بولنے کی دعوت دی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی روداد سن کر ہمیں اپنی کارکردگی کیلئے کسی نئی حکمت عملی کی ضرورت پیش آئے۔

اس نے پہلا نام پکارا۔

تالیوں کی گونج میں گینا ہانسن مائیک پر آگئی۔ (باقی صفحہ ۱۶۳ پر دیکھئے)



غفران امجد

جگر کے چاک کو داغ نہال کہتے ہوئے　　گزر رہی ہے لہو کو گلال کہتے ہوئے
غبار شام میں روشن ہوئی دھنویں کی لکیر　　اذان ہجر بہ طرز وصال کہتے ہوئے
کوئی تو ہے جو سروں کو اتار لیتا ہے　　ہمارے کاندھوں پہ بار ملال کہتے ہوئے
فضا کے پاؤں میں زنجیرِ ناز پڑنے لگی　　جنوں شکست رتوں کا زوال کہتے ہوئے
ہوا پروں کو سمیٹے گزر گئی امجدؔ　　مرے خیال کی مٹی محال کہتے ہوئے

● B-18/52,P.I.B.REORI TALAB, VARANASI-221001

انور شمیم

سارے جھگڑوں کو ہی اب حل کردیا ہے　　میں نے دروازہ مقفل کردیا ہے
نیکیاں کرنے کی خواہش بھی عجب سی　　اس نے تو چہرہ ہی مہمل کر دیا ہے
حیرتیں ہیں آئینے اور میری آنکھیں　　تجھکو کس نے مجھ سے اوجھل کر دیا ہے
اک ذرا سی بات پر اتنا بہت کچھ　　ساری بستی کو ہی مقتل کر دیا ہے؟؟
میں نے اس مٹی پہ باغ و نہر چاہے　　کس نے اس دنیا کو چیٹل کر دیا ہے

● SADAR BAZAR SAMASTIPUR- 848101(BIHAR)

احمد کمال حشمیؔ

ریگ زاروں میں نہیں آب توکیا کیجے گا　　ایسے ہی ہوتے ہیں احباب تو کیا کیجئے گا
حاجتِ قطرہ ہو تو خواہش دریا نہ کریں　　"بڑھکے آجائے گا سیلاب تو کیا کیجئے گا"
دوستی تلخ حقائق سے بھی کچھ رکھئے میاں　　نہ رہے آنکھوں میں کل خواب تو کیا کیجئے گا
خونِ دل بھر کے چراغوں کو جلائے رکھئے　　کل اگر نکلا نہ مہتاب تو کیا کیجئے گا
اس قدر اشک فشانی کی ادا ٹھیک نہیں　　خشک ہوجائے گا تالاب تو کیا کیجئے گا

● H/28/1, BL ND.2 NAYABAZAR, KANKINARA- 743126(W.B)



عبد الرحمن جامی

آئینہ سخی پہ نجیلی کا بال ہو　　اب میری حیثیت کے علاوہ سوال ہو
ہم ایسے جان دینے سے منہ موڑلیں تو پھر　　اے شہر خود کشی ترا بسنا محال ہو
کیا کوچ کر گئے سبھی ہمدرد گانانِ شہر　　کوئی تو میرے حال کا پرسانِ حال ہو
اب یہ وفور عقل کے بس کا نہیں رہا　　امداد اس سے مانگ جو شوریدہ حال ہو
اوروں کے تبصرے میں مری خامیاں بھی جوڑ　　مجھ پر وہ طنز کر کہ ہنسی پائمال ہو

● 20/33, HARIR-PURA BURHANPUR-450331(M.P)

کریم خان سازؔ

کوئی سورج نہ دیا ہے مجھ میں　　شعلۂ درد چھپا ہے مجھ میں
سانس لیتا ہوں تو یوں لگتا ہے　　جیسے کچھ ٹوٹ رہا ہے مجھ میں
مٹ گئے زخم مگر ، زخموں کا　　تلخ احساس بچا ہے مجھ میں
یوں جو دیکھو تو نہیں ہے کچھ بھی　　اور سمجھو تو خدا ہے مجھ میں
جس کو دیکھو وہی منزل کیلئے　　راستہ ڈھونڈرہا ہے مجھ میں

●MACHLI PETH, RAOPURA,VADODRA-390001(GUJ)

مکتوبات

❞شاعر کے ہر شمارے پر بلا مبالغہ اتنے خطوط موصول ہوتے ہیں اور پوری اردو دنیا سے آتے ہیں کہ ان سب کی سمائی محدود صفحات میں ممکن بھی نہیں ہو پاتی اور خطوں کا ذخیرہ بڑھتا رہتا ہے۔ قارئین دیکھ رہے ہوں گے کہ بروقت شائع ہونے والے ہر شمارے میں جو خط شائع ہو رہے ہیں وہ پرانے شماروں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اب یہ ستمبر کا شمارہ ہے۔ اس میں جولائی اگست کے خطوط کے بجائے اپریل مئی جون کے شماروں پر آراء شامل کی جارہی ہیں۔ اپریل کے شمارے پر اب صرف ایک ہی خط دیا جارہا ہے جبکہ ابھی مزید اتنے خط ہیں کہ دو شماروں تک ان کی اشاعت کی جائے جو ممکن نہیں۔ ابھی مئی شمارے پر ڈھیر سارے خط جمع ہیں۔ جولائی اور اگست کے شماروں پر آراء موصول ہو رہی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ طویل مکاتیب بھی ہیں جو ادبی فیچر میں اپنی اشاعت کے منتظر ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر [جلد اول] سے متعلق سال بھر خطوط شائع کئے گئے۔ جبکہ خطوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بڑے دلچسپ اور بحث طلب اور معنی خیز خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ انتظار میں ہے کہ ان کا استعمال ہو۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جسے ہم نے نہیں لکھا شاعر کے بے شمار قارئین نے تحریر کیا ہے۔

ہم اپنے بے شمار قارئین کے شکر گزار ہیں کہ وہ نہ صرف رسالے کے حرف حرف سے گزرتے ہیں بلکہ اپنی گرانقدر رائے سے بھی نوازتے ہیں۔ ہم بے حد ممنون ہیں، بہت شکر گزار ہیں ان خطوط نگار حضرات کے بھی جو شاعر کے نام تعریف و توصیفی خطوط لکھتے ہیں اور خوب خوب لکھتے ہیں لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ محدود صفحات میں کیا کیا سجائیں۔ ہماری کوشش بھی رہتی ہے کہ اس باب کے محدود صفحات کو کار آمد اور قابل مطالعہ بنایا جائے۔ ایسے مکاتیب شامل کئے جائیں جو بحث انگیز ہوں، مکالمہ قائم کرتے ہوں ادب کے طلباء کی ذہنی تربیت کرتے ہوں۔ آپ ہمیں خط لکھئے اور لکھتے رہئے تنقیدی، مسائلی اور تعریفی و توصیفی بھی۔ ہم اپنے قارئین کے خطوط کی روشنی میں شاعر کے ہر شمارے کو مرتب کرتے ہیں بے شمار خطوط کے باوجود ہمیں خطوں کا انتظار رہتا ہے۔❝ [ادارہ]

حمید الماس

آپ نے کنڑا کے شعری ادب میں غزل نویسی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ دراصل کنڑا کے قدیم اور جدید شعری ادب میں کنڑا کا وجود نہیں کے برابر ہے جدید شاعری آر۔ لکشمن راؤ اور ایس این لکشمن نارائن بھٹ نے کنڑا میں غزل لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر وہ تخلیقات غزل کے فارم میں نہیں تھیں۔ میں نے شخصی طور پر ان دونوں کو بتایا تھا کہ غزل کیا ہے اس کے بعد ان دونوں نے غزل نہیں لکھا البتہ ایک کنڑا شاعر شانت رسف نے حقیقی معنوں میں کنڑا میں غزل کہی ہے۔ میں نے یہ غزلیں پڑھی ہیں۔ معمولی سی فنی غلطیوں کے باوجود انہیں غزلیں کہا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے شانت رس ہی غزل کہنے والے کنڑا کے پہلے شاعر ہیں۔ کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے ان کی یہ غزلیں جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہونے والی ہیں۔

● 1169 -26TH A MAIN 9TH BLOCK,
JAYANAGAR,BANGALORE-560069

امیر حمزہ ثاقب

'مابعد جدیدیت ،انضمامیت ،معنویت ، ارتجائیت ، بھئی ہمارے دانشوران علم و ادب نے تو اصطلاحات سازی کی ٹکسال لگا رکھی ہے اور مجھ ایسے تازہ واردانِ بساطِ شعر و ادب جب ان مصنوعی اور مستعار ادبی تھیوریوں کو پڑھنے کے بعد تخلیقی مراحل سے گذرتے ہیں تو یہ دیو پیکر اصطلاح ساز نمودار ہو جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کی سعی میں کبھی دستار گِر جاتی ہے تو کبھی جہاں بینی اور دروں بینی کی دھڑکنیں تھم جایا کرتی ہیں لیکن ذرا ٹھہریئے تخلیق کی ندی اپنی راہ خود بناتی ہے تنقید کی انگلی تھام کر نہیں چلتی۔ 'نیم وحشی صنف سخن، غزل پر ادھر آپ نے جو مکالمہ روشن کیا ہے اور جس قسم کے ادبی فیچر ز ترتیب دے رہے ہیں وہ نہ صرف معاصر رسائل کے مروّجہ اسلوب سے جدا ہے بلکہ نقیب نسیم سحری بھی ہے۔ خصوصاً ان قارئین کیلئے جو پیچیدہ، گنجلک اور مبہم، تنقید، فکشن، اور شاعری کے باعث "دست کشِ ادب" ہو گئے تھے۔

اردو ادب کے قاری کا مسئلہ نیا نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب یہ مسئلہ دن بہ دن گمبھیر ہوتا جارہا ہے۔ اردو کے اساتذہ بھی ادب کے قاری ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیوں؟۔ ایم۔ اے کی سطح پر نصاب میں شاعری، فیض سے آگے، فکشن، پریم چند، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور سے آگے نہیں ہے۔ کم و بیش کچھ یہی حال تنقید کا بھی ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں جدید ادب یا جدید تر ادب کوئی کیوں پڑھے؟ روزی روٹی تو بہر حال چل رہی ہے ناں !۔

اردو ادب کے فروغ کیلئے اجتماعی کوششیں ضروری نہیں یہ کام انفرادی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ اخلاص شرط اولیں ہے۔ مگر محترم خلوص ہے کہاں۔۔۔؟

322-SHAMA- NAGAR HDAMANKAR
NAKA, BHIWANDI,-421305(MS.)

ساقی فاروقی

شاعر کے ماہ اپریل شمارے میں جتیندر بلو کی کہانی پڑھی تو دل میں ان کی عزت بڑھ گئی۔ اور احساس جرم (GUILT) پر ایسی خوبصورت کہانی اردو میں کم کم لکھی گئی ہو گی [اور اگر بہتر کہانی ہو گی تو میں نے نہیں پڑھی] وہ گفتگو میں تو گاہے گاہے ابھرے نظر آتے ہیں مگر ان کی تحریروں میں تمہیں بڑھتی جاتی ہیں۔ جتیندر بلو کو اور 'شاعر' کو یہ کہانی مبارک۔

100-SUNNY GARDENS ROAD.
LONDON NWH IRY (U.K.)

مقصود الٰہی شیخ

رتن سنگھ جی اسی ہفتے ماہنامہ "شاعر" کا مئی کا پرچہ ملا۔ اس میں آپ کا افسانہ " ٹھہرا ہوا لمحہ " پڑھا۔ اس سے پہلے آپ کی کہانیاں، یاد نہیں پڑتا کہ پڑھی ہیں۔ دراصل میں بڑی مدت تک ادب سے ٹوٹ کر، بنا پڑھے لکھے کی زندگی گزار تا رہا ہوں لہذا ملتجی ہوں کہ ایسا لکھنا کہ آپ کو پہلے نہیں پڑھا گستاخی نہ سمجھئے گا۔ اب جو پڑھا تو آپ کی تحریر دستک دیئے بغیر دل میں اتر گئی۔ بڑی خوبصورت عبارت ہے۔ پھول ہیں، پیڑ ہیں پرندے اور پنچھی ہیں اور پڑوسی ہے جو شور نہیں کرتا کچھ نہیں کہتا، تنگ نہیں کرتا۔ بے ضرر سا ہے غیر موجود ہے، مگر موجودگی کا اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ ساری ACTIVITY تو خاموشی سے اسی کے یہاں ہے۔ کہانی میں یہی سوتی جگاتی یکساں فضا، کہانی کے فرش سے افق تک، اس کی بڑی فنی خوبی بھی ہے۔ لطف یہ کہ کچھ بھی بے مقصد نہیں جیسے جیسے عبارت آگے بڑھتی ہے ویسا ہی منظر آنکھوں میں آجاتا ہے۔ ادھر گل مہر ہے تو پھول ہی پھول ہیں۔ رنگ ہی رنگ ہے اور اسی تتلی ہے تو تتلی اور پکشی پنکھ پھڑ پھڑاتا پھدکتا نظر ہی نہیں آتا بلکہ اس کی آواز بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ اور یہ سارا اہتمام، محسوس کرائے بغیر اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے:

"میری نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں ایک میلا کچیلا آدمی پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے آدھا ننگا آدھا ڈھکا اپنی ہتھیلیوں سے گل مہر کے گرتے ہوئے پھولوں کو نہار رہا تھا اور۔۔۔ "زندگی تو اسی طرح میلی کچیلی ہے" اختتام، میری رائے میں، جھنجھوڑنے کے بجائے ابتدائیے کی طرح خوبصورت اور احساس کو گدگدا کر

اہوا ہے۔ یہ ایک شروع سے آخر تک دل آویز کہانی ہے۔
● 24-PARK HILL DRIVE,BRADFORD
BD8 ODF (U.K.)

بانو ارشد

اس میں شک نہیں کہ شاعر کا اپنا ایک انفرادی انداز ہے لئے ایک طویل مدت سے اپنی اسی سطح کو بنائے ہوئے ہے ں کی ابتدا علامہ سیماب اکبر آبادی نے کی تھی اور اب تیسری ں میں آپ اس کو اپنی نامعلوم انتہاؤں تک لئے جا رہے ہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کی اسی کیفیت میں پڑھنے والے لئے ایک نشہ ہے اور قاری کو کیف ملتا ہے۔

مئی کے شمارے میں ادبی فیچر کے تحت سید تقی عابدی کا ون ایک ادبی بدعت جو ادبی سنت بن گئی، غور سے پڑھا۔ وس الٰہی شیخ کا افسانہ منظر بدل گیا" جتنا مختصر ہے اتنا ہی مورت بھی ہے۔ انہیں کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس قسم جانے کتنی ہی کہانیاں مغرب اور مشرق کے توسل سے جنم ، رہی ہیں لیکن مشاہدے کے ساتھ ساتھ کسی کہانی کو عات کو قاری کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں اس کے لئے ، تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ مبارکباد کے ق ہیں شیخ صاحب کے انہوں نے مختصر الفاظ میں اس کہانی ند کر لیا جیسے سیپ موتی کو تخلیق کرتا ہے۔ دیگر کہانیاں بھی ی ہیں۔ مضامین میں علی احمد فاطمی کا مقالہ اردو افسانہ ۱۹۶۰ء ، بعد، بہت ہی معروضی جائزہ اور تجزیہ ہے ندا فاضلی کے ہم اور تعارفی نوٹ بہت عمدہ ہے۔ ادبی فیچر آپ کا ایک اچھا سلہ ہے۔ شعری تخلیقات معیاری ہیں۔ سلیم آغا قزلباش کا ائیہ "شرافت" دلچسپ ہے۔ اس کو نہ جانے کتنی بار پڑھ چکی ں اور ہر بار ایک نیا لطف لیتی ہوں۔ اچھی تخلیقی تحریروں کا ف ہی یہی ہے کہ انہیں جب پڑھیئے اور جتنی بار پڑھیے ایک نیا ۔ آتا ہے۔

● 12-CAMROSE AVE, EDGWARE,
MIDDX.HA 8 6EG(U.K.)

صابر عظیم آبادی

زیر نظر شمارے میں ادبی فیچر بہت پسند آیا۔ خاص طور سے ہم شہزاد کا فیچر "پاکستانی اردو کے خدوخال" اور سید تقی عابدی کا ; ایک ادبی بدعت جو ادبی سنت بن گئی "بڑا موثر اور جامع ہے ; تو شینکو کی شاعری پر ندا فاضلی کا مضمون معلوماتی اور تراجم مل لفظوں کی طرح ہیں علی احمد فاطمی کا مضمون "اردو افسانہ۔ ۱۹۶۰ء کے بعد" بہت مربوط اور جاندار ہے۔ انہوں نے اچھے نسانوں اور افسانے کے تنقید نگاروں کی نشاندہی کر کے قارئین کامل حالات سے آگاہ کیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں رتن سنگھ کی کہانی ٹھہرا ہوا لمحہ اور م۔ ناگ کی کہانی "بچپن" مجھے پسند آئی۔ شاعر میں نظموں اور غزلوں کا حصہ خاصہ معیاری ہوتا ہے۔ اس مرتبہ مظفر حنفی، راہی قریشی، حمید الماس، پرویز اختر اور مغل فاروق پرواز کی غزلیں نظمیں اچھی شاعری کی مثال ہیں۔

● HOVSE NO.C- 707 SECTOR-1
MAJEED COLONY,
LANDHI,KARACHI-22(PAK)

سیّد محمد عقیل

شاعر کا نیا شمارہ (جون ۲۰۰۰ء) ملا اس کے مشمولات میں "ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے" دلچسپ اور خیال انگیز موضوع ہے۔ شرکاء نے بھی دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض بحثیں تو محض خانہ پری کیلئے ہیں لیکن افسانہ نگار شوکت حیات کی بعض باتیں خیال انگیز اور قابل غور ہیں۔ ان کے جواب میں حسب ذیل باتوں کو سَر سری نہیں لیا جاسکتا۔

(۱) "افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو ایسی آگہی سے دوچار کرنا کہ ان کی نیند ٹوٹے اور وہ نئے سرے سے اپنے عہد اور اپنے وجود کا تخلیقی ادراک حاصل کر سکیں یہی آج کی سچائی ہو سکتی ہے اور تخلیق کا سبب بھی"۔

(۲) سچائی کو افسانہ نگار اپنے اپنے زاویے سے دیکھتا ہے اور اپنے پہلو سے جائزہ لیتا ہے۔"

(۳) "سچائی سے زیادہ اہم دراصل افسانہ نگار کا نقطۂ نظر VISION اور ضمیر ہے او رشاید وہی اس کی اصلی سچائی اور ایمانداری ہے جو افسانے کی تخلیق کے لئے لازم ہے "ایک اچھے افسانے یا اچھی تخلیق کے لئے اس سے زیادہ واضح اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر دور کی تخلیق کے لئے ایک طرح کی گائیڈ لائن ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر دور کی سچائی، اس دور کے انسانوں کے درمیان سے آئے ہوئے مسائل سے ہی پیدا ہوتی ہے کیونکہ سچائی کوئی ڈھلا ڈھلایا فارمولا نہیں کہ اس کا اطلاق ہر دور میں ایک جیسا ہو سکے۔ انسان میں جو شیطان چھپا ہوا ہے، وہ بھی اپنے طور پر سچائی کے زاویے بدلتا رہتا ہے اور اپنے مفاد اور مصلحت کے تحت، سچائی کی تعبیریں اس طرح کرتا رہتا ہے کہ جو اس کے مفید مطلب ہے وہی اصل سچائی ہے۔ ادب میں بھی یہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ علامتی دور کے افسانہ نگاروں نے ابہام اور لایعنیت ہی کو، اصل سچائی بتانا شروع کیا تھا۔ تاویل یہ تھی کہ چونکہ زندگی لایعنی ہے اس لئے ادب کا بامعنی ہونا، محض فریب ہے۔ مگر بہت جلد یہ ملمع اتر گیا اور اوپر سے اوڑھی ہوئی جعلی (PSEUDO) سچائی بے نقاب ہو گئی۔ افسانہ نگاری اور تمام تخلیقات نے یہ فریب نظر، اتار پھینکا اور فکشن پھر اپنے مسائل لے کر اپنے تخلیقی سفر پر گامزن ہو گیا

'شاعر کے اس نئے شمارے میں، نسیم محمد جان کی کہانی شام ڈھلے، اور آنند لہر کی کہانی سرحد کے درمیان، اچھی کہانیاں ہیں جن میں مسائل بھی ہیں اور فن کاری بھی۔ محمد حسن صاحب کا خط آپ نے شائع کر دیا اچھا کیا۔ مگر جواب کے لئے اگر دوسروں کا انتظار کر کے، تب آپ جواب لکھتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ دیکھنا چاہئے تھا کہ دوسرے اس سلسلے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہر ادیب اور شاعر کے لئے ایک "رائے عامہ بھی ہوتی ہے جو دبے پاؤں چلتی رہتی ہے۔ یہ رائے کبھی VOCAL نہیں ہوتی مگر اس کا محاسبہ نوے فی صد ضرور درست ہوتا ہے عجیب بات ہے کہ تاریخ ادب پر یہی دبے پاؤں چلنے والی رائے ہی آخر میں حاوی ہو جاتی ہے۔ آپ نے ایک خط تارا چرن رستوگی صاحب کا بھی شائع کیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟۔ تارا چرن رستوگی صاحب کا اس خط سے کیا مقصد تھا؟

● PINE VIEW, 18-B,DARYABAD
ALLAHABAD - 211 003 (U.P.)

اندر پرتاپ نیر

جون شمارہ بہ غور پڑھا جرعات میں اردو کی موجودہ حالت پر آپ نے بڑا بے باک تبصرہ کیا ہے اور اسکے رخ زیبا کا کوئی گوشہ چھپایا نہیں ہے درست ہے کہ آج کی سرکار اردو کی سرپرستی نہیں کر رہی بلکہ منصوبہ بند طریقے۔ سے اس کا استحصال کر رہی ہے۔ لیکن اگر اسے ہندی رسم الخط سہارا دے رہا ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ کیا آپ کے علم میں ہے کہ آج میر، غالب، داغ، اقبال، فیض اور ساحر کے دواوین کی مانگ اوھر نادرون انڈیا میں صرف ہندی رسم الخط میں رہ گئی ہے۔ جس سے لاکھوں ہندو آدمی اور عورتیں فیض یاب ہو رہی ہیں کہ اردو زبان سے لگاؤ اور اشتیاق بڑھا ہے اور اسکی خدمت ہو رہی ہے بلکہ اسے زندہ رکھنے کے لئے اور تخلیق کار کی حوصلہ افزائی کیلئے اب ہندی ہی ایک ذریعہ رہ گئی ہے مسلمان تو اس زبان سے اب دستکش ہو گیا ہے، بڑے بڑے گھرانوں میں میں اردو میں خط لکھتا ہوں تو مجھے ہندی میں جواب آتا ہے آج ہندی رسم الخط کے ذریعے ہی اردو کو زندہ رکھا جاسکتا ہے، ہم سب کو حالات کے مطابق ADGEST کرنا سیکھ لینا چاہیے۔

بانو قدسیہ کی کہانی بہت ہی اچھی ہے۔ اس میں کہانی پن ہے جو بہت دیر بعد نظر آیا ہے مشرف عالم ذوقی کا مکالمہ نئی صدی میں اردو شاعری بہت متاثر کرتا ہے۔ نظموں میں قمر قدیر ارم سب سے آگے ہیں عزیز اندوری اور آغا سروش کی غزلیں بڑی دلکش ہیں۔ کتاب بازار بڑا معلوماتی فیچر ہے اس میں اردو دنیا ساری کی ساری محیط ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کا خط تضادات سے بھرا ہوا ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو خط اور بھی شائع

ہوئے تھے۔ یہ غالباً پہلا خط ہے جو بہت بعد میں شائع ہوا ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں تو ایک مجموعی عالمی رائے یہ بن چکی ہے کہ یہ اردو ادب کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ ادبی رسائل میں ایسا کام پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہاں! ایک بات یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی تو ہم عصر نمبر تقریباً لوگوں کے مطالعے میں ہے اور حیرتوں میں ڈالے ہوئے ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی بعض آرا سے سخت اختلاف ہے! خاص طور پر علامہ سیماب کے بارے میں "باب آگرہ اسکول" تو ہم عصر اردو نمبر کی روح ہے۔

● 5-A, MAJOR SHIVDEV SINGH
MARG CIVIL LINES, LUDHIANA,141001

اختر یوسف

مجھے شمارہ ۶/[جون ۲۰۰۰ء] میں "ہم عصر اردو ادب نمبر-۲ کے تحت شائع ہونے والے ڈاکٹر محمد حسن کے خط پر کچھ کہنا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا خط متضاد اور بہکی بہکی باتوں کا ملغوبہ ہے۔ کہتے ہیں "پھر حسن ترتیب وہ بھی ایسا کہ ہر شعبہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے" اب صفحہ ۴۴ پر فرماتے ہیں "حصہ نظم میں مجھے ایک ہی شکایت ہے کہ تم نے سب کو ایک ہی جگہ چھاپ دیا ہے" واہ کیا کہنے ہیں۔ کہاں تو حسن ترتیب کو ایک کارنامہ بتایا گیا لیکن زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ حصہ نظم کی ترتیب سے انہیں شکایت ہو گئی۔ آپ کو بار بار مبارک باد دینے کے بعد انہیں اچانک دھیان آیا کہ ادب میں تو تخلیقی سوتے ہی سوکھتے جاتے ہیں۔ پھر انہوں نے وشال ہم عصر اردو ادب نمبر-۱ کے لئے دواوین میں "گلدستہ" کا استعمال کرکے ہوئے اسے طنز کا نشانہ بنایا اور فرمایا کہ بس اس میں گنے چنے چند افسانے، نظمیں اور غزلیں ہیں اور باقی سب کا سب فضول۔ سریندر پرکاش، جتیندر بلو اور سلام بن رزاق کے افسانوں کو چھوڑ انہیں کوئی بھی دوسرا افسانہ ان کے دامن دل کو کھینچتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اور بقول شخصے مذکورہ تین افسانہ نگاروں کے افسانوں کے باقی جو افسانوی حصے میں ہیں وہ دہرائے ہوئے لفظوں کا ایک بدرو ہے جو بہتا چلا جارہا ہے۔ اس میں موضوعات کا قحط ہے، دردمندی کا فقدان ہے اور صرف بک بک جھک جھک ہے۔ یہ سب کہہ کر انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ بیان "تمہاری ہمت مردانہ پر رشک آیا کہ اس قدر استقلال، حوصلے اور دردمندی سے یہ نمبر مرتب کیا۔ اس لگن اور ایسی دیدہ ریزی وہ بھی اردو ادب کے لئے" کو یک لخت کر دیا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ شاید زندگی بھر مارکسزم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے بعد بھی ڈاکٹر موصوف اپنے اندر کے دوہرے پن سے آزادی حاصل نہیں کر سکے۔ یا ڈاکٹر موصوف آج کے فن کاروں کی تخلیقات سے خوف زدہ ہیں۔ شاعر کے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کے بہانے ڈاکٹر موصوف نے آپ کی محنت، لگن، ایمانداری، لگا انتخاب اور مدیرانہ صلاحیت کو بڑی فن کاری سے ہدف بنایا ہے... لیکن "چشم تنگ" کثرت نظارہ سے کب وا ہوتا ہے! تنقیدی حصہ کی بابت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "تنقیدی حصہ البتہ کمزور ہے کیوں کہ بنیادی طور پر اس کا کوئی خاکہ تم نے نہیں بنایا۔ اپنے مضمون کے بارے میں کیا کہوں۔؟"

ڈاکٹر صاحب کی خود ردیت قابل افسوس ہے۔ قبل انہوں نے کیا کہا اور اب کیا کہتے ہیں۔ دراصل "نامور ترقی پسند نقاد" ادبی کم اور سیاسی زبان زیادہ، لکھنے کے ابتداء ہی سے عادی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو انہیں شاعر کے نمبر میں الفاظ کا ایک بدرو بہتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف تنقید کا حصہ "البتہ "کمزور نظر آتا ہے۔ لفظ "البتہ" سے تو صاف ظاہر ہوا کہ باقی حصے طاقت ور ہیں اور صرف تنقید کا حصہ کمزور ہے۔ دیگر آپ سے انہیں شکایت بھی ہے کہ آپ نے تنقیدی حصے کا کوئی خاکہ نہیں بنایا۔ کیوں نہیں بنایا؟ بھائی افتخار امام آپ بھی غضب کرتے ہیں! آپ اگر بہت مصروف تھے تو ڈاکٹر موصوف سے تنقیدی حصے کا خاکہ مرتب کرا لیتے۔! اپنے مضمون کے بارے ڈاکٹر صاحب کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے ہمیں محروم رکھا۔ کچھ کہتے تو ہمیں روشنی ملتی بہرحال انہیں شکایت ہے کہ ان دنوں تنقیدی گمراہیوں کا پوٹلہ ہے۔ ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر موصوف نے عرصہ سے پڑھنا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ وگرنہ وہ اس قسم کی پوچ بات نہیں کہتے۔ اب جہاں تک حواریوں کو بانس پر چڑھانے کا سوال ہے تو یہ کام ڈاکٹر موصوف ہی انجام دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں "تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی کمی کھٹکتی ہے کیوں کہ دور حاضر میں یہی ایک نقاد ہے جس نے حال میں مثنوی، مرثیہ، ناول، افسانہ اور تاریخ ادب کے ضمن میں آنے والی (مضامین نہیں) کتابیں لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں بعد حال ہی میں ہی چھپی ہیں" بھائی افتخار آج پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ کتابیں پہلے شائع ہوتی ہیں پھر بعد میں چھپتی ہیں اب رہ گیا ڈاکٹر سید محمد عقیل کا سوال تو انہیں ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا سرٹیفکیٹ ملنا ہی چاہئے تھا سو مل گیا۔

وسیم بریلوی اور کلیم عاجز کو مشاعروں کے شاعر کہہ کر ڈاکٹر موصوف نے ان کی اہمیت بڑھائی نہیں ہے بلکہ کم کر دی ہے۔ آخیر میں ان کا سر فخر سے اونچا ہو گیا اور احساس ہوا۔ ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

ڈاکٹر موصوف کے بے ربط خط کے جواب میں آپ نے بہت محدود مدلل اور COMPACT باتیں کہی ہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی آدمی ہی ہیں۔!

● SRI AUROBINDO NAGAR
DORANDA, RANCHI - 834002 (BIHAR)

معین الدین عثمانی

شاعر جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں "اس عنوان کے تحت خورشید حیات کا مرتب کردہ فیچر باصرہ نواز ہوا خورشید حیات کے علاوہ گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی، احمد یوسف، علیم اللہ حالی، شوکت حیات اور رفیع حیدر انجم نے اپنے اپنے انداز میں خامہ فرسائی کرتے ہوئے مختلف معروضات سے قارئین کو روشناس کروایا۔ گوپی چند نارنگ کے علاوہ سبھی کی تحریریں زندگی سے قریب تر اور حقیقت کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی پوری طرح سے قابل قبول نہیں کیونکہ ہم زندگی کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے ہوئے ادب میں برتنے کے خواہش مند ہوتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اگر ہم جزئیات کے الجھاوے سے پرے خالق کائنات کے مقررہ قواعد کو سامنے رکھ کر اپنا منشاء و مدعا بیان کرنے کی کوشش کریں تو سارے سوالوں کے جواب پہلے ہی سے موجود پائیں گے خالق کائنات نے ہمیں غور و فکر کی ہدایت فرمائی، اگر اس آسان سے کلیئے کو کچھ سمجھ لیا جائے تو سچائی کا متن پوری طرح سے واضح ہو جائے گا۔ مگر اس کے لئے کھلے ذہن کے ساتھ اپنے آپ کو اس سپرپاور کے زیر نگیں لانا ہو گا ورنہ انسانی زندگی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے مختلف شعبہ جات میں ہر دور نے نئے نظریات پیش کئے جس کو مابعد کسی بھی صورت قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ تو پھر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ یہ نحیف اور کمزور ذہن کا انسان خالق کائنات کے اصولوں کو من و عن کیوں نہیں اپناتا۔ جو اصل سچائی ہے۔ آزادی رائے اور اظہار خیال کی آزادی نے اسے مختلف النوع جنگلات کی سیر کرانے کے بعد اس جگہ لا کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ کچھ زیادہ ہی بے چین پایا جارہا ہے

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے زندگی کے نشیب و فراز کے تحت الگ الگ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں چونکہ یہ ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں اس لئے اس سے فرار ممکن نہیں۔ مگر اسی کو زندگی کی مکمل تصویر قرار دینا بے معنی ہی نہیں بلکہ اصل سے فرار کے مصداق ہے۔ حقیقت حال کا پیش کرنا ادیب کی ذمہ داری ضرور ہے مگر تخیل کی آمیزش کیا اس کے کرداروں پر جھوٹ کا ملمع نہیں چڑھا دیتی؟ اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ اس ضمن میں بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں پریم چند کے کفن کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ تو محض زندگی کا ایک رخ ہے۔ گھیسو نے اگر زندگی کے حقیقی فلسفے کو سمجھ لیا ہوتا تو شاید حقیقت اور سچائی کے ادراک سے وہ پریم چند کا ایک مثبت کردار بن کر بھی سامنے آسکتا تھا۔ چونکہ عام آدمی اور فن کار کی

مجھ بوجھ کے فرق کو ہم سب مانتے ہیں اس لئے عام آدمی کی بہ نسبت فن کار کی یہ عظیم ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ پہلے کائنات کی اس سچائی کا عرفان حاصل کرے جو مقصود ہے، اس کے بغیر فن کار کا فن جھوٹ اور بھول بھلیوں کے علاوہ کچھ نہیں یہاں بات کو اس طرح بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ جب سچائی کو پیش کر دیا گیا ہے تو پھر اس کے بعد ہم اور کون سی سچائی پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں تو بس اس کلیے کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس کائنات کے رموز سے انانیت کو روشناس کرواتا ہے۔ سچائی جو جھوٹ کے ساتھ موجود ہے اس فرق کو واضح کرنا ہی اصل کام ہے۔ ہم نے اپنی محدود نظر او نظریات کے آئینے سے اس کے جس جز کو بھی دیکھا، کل سمجھ کر قبول کر لیا۔ اور پھر اس کو لادنے کی کوشش میں کائنات کی اصل شبیہ کو ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔ دراصل اس بڑے فن کار نے سچائی تو پیش کر دی ہے بس ضرورت اس کو تلاشنے اور واضح کرنے کی ہے۔ اپنی طرف سے اس میں غیر ضروری آمیزش زیادہ نہیں نہیں بلکہ اس کے معاملات میں دخل دینے کے مترادف ہے بات ہے، بہت چھوٹی مگر معنویت کے اعتبار سے ضروری اور اہم ہے۔ اگر یہ واضح ہو جائے تو چاروں طرف سچ ہی سچ ہے ورنہ سب جھوٹ۔

● 264, SHAHU NAGAR,
JALGAON - 425001.(M.S.)

عطیہ خان

"جرعات میں آپ بہت صاف اور مبنی بر حقیقت باتیں لکھتے ہیں۔ جون کے شمارے میں بھی آپ نے جن کاموں کو اردو میں کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ کام کرنے میں تو خود اردو کے نام نہاد سرپرست بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو نہ پڑھانے کا عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ اردو کا روٹی روزی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ انہیں لاکھ سمجھایا جائے کہ اردو کا روٹی روزی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ ہائی اسکول، انٹر اور بی۔اے تک اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ روٹی روزی تو آخری ڈگری سے حاصل کی جاتی ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی مثال موجود ہے جن کی روٹی روزی کا تعلق اردو سے نہیں رہا۔ جو زبان بول چال میں استعمال ہوتی ہے اس میں علمی قابلیت اپنے خیالات کا موثر طریقے سے اظہار کرنے میں بہت فائدہ مند ہوتی ہے ان باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اردو کی بدحالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اردو کے مٹنے کی شکایت کرتے ہیں اور اپنے علاوہ باقی سب کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں دراصل خود ہی اردو کی طرف سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور اسے حقیر سمجھ کر اپنے بچوں کو سہ لسانی فارمولے کے تحت بھی اردو کی جگہ سنسکرت کو پڑھانا بہتر سمجھتے ہیں۔

اردو کی کتابیں، اخبار اور رسالے خریدنے کا جہاں تک تعلق ہے اسے اردو کی محبت کے دعویدار بھی پیسے کی بربادی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف موقع پرست لوگوں نے ایک وبا یہ پھیلائی ہے کہ اردو کی خدمت کے نام پر رسالہ نکال کر اعزازی شمارے زر خریداری اور زر معاونت کی طلب کیساتھ بھیجتے ہیں لیکن جیسے ہی زر خریداری انہیں مل جاتا ہے زر رسالہ آنا بند ہو جاتا ہے پھر ان مدیران کو خواہ کتنے ہی خط لکھے جائیں کوئی جواب نہیں آتا۔ اس طرح کے مدیران اردو کے سیدھے سادھے مخلص قارئین اور قلمکاروں کو اردو سے بیزار کر رہے ہیں۔

سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے جو اردو کے رسالے شائع ہوتے ہیں ان کی اشاعت اور ترویج کی طرف بالکل ہی دھیان نہیں دیا جاتا ان کا یہ عالم ہے کہ خریداروں کو سال میں دو چار شمارے ہی ملتے ہیں۔ اگر رسالہ نہ ملنے کی شکایت کی جائے تو الزام محکمہ ڈاک کو دیا جاتا ہے اور بار بار شکایت کرنے والوں کو خریداری ہی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ کی جمہوریت کے بعد بھی وہی شہنشاہی ذہنیت برقرار ہے۔

● 52 - BRENT WAY, LONDON,
N3 IAP (U.K.)

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

فسانہ عجائب ☆ باغ و بہار گلزار نسیم

مزا رجب علی بیگ سرور ☆ میر امن دہلوی
دیا شنکر نسیم لکھنوی

مرتبہ :- **رشید حسن خان**

ادب کے مطالعے میں کلاسیکی کتابوں کی اہمیت مرکزی ہوتی ہے۔ کوئی ادیب یا ادب کا طالب علم ان سے استفادہ کئے بغیر ادب کا صحیح ذوق حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ جب یہ مطالعہ اس کے رگ و ریشے میں جذب ہو جاتا ہے، خون بن کر دوڑنے لگتا ہے تب ہی وہ زبان و ادب کا مزاج آشنا ہوتا ہے۔ ورنہ اچھی سے اچھی تحریر میں بھی ایک اکھڑا پن محسوس ہوتا ہے جسے ایک تربیت یافتہ ذہن فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کی تدوین و تحقیق بڑی ذمہ داری اور بصیرت کا تقاضہ کرتے ہیں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبد الودود اور امتیاز علی عرشی ایسے چند ہی محقق ہوئے ہیں جنہیں ادبی اردو دنیا نے بڑے احترام و ادب سے دیکھا ہے۔ فسانہ عجائب، باغ و بہار اور مثنوی گلزار نسیم کی تدوین کے بعد آج ان محترم ادیبوں کے ساتھ تیسرا نام رشید حسن خاں کا ہے جن کی ہر تحریر ادب کے طالبعلم کے لئے ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

ان تینوں کتابوں کی تدوین میں انہوں نے برسوں ریاضت کی ہے۔ باغ و بہار کے اہم اڈیشنوں کی تلاش انہوں نے ۱۹۶۴ سے شروع کر دی تھی اور بیس سال کی تحقیق، جستجو کے بعد انہیں وہ خطی نسخہ ملا جس پر وہ کام شروع کر سکے اور بالآخر ۱۹۹۲ میں انجمن ترقی اردو کے تعاون سے انہوں نے باغ و بہار کو جدید تحقیقی تقاضوں کے مطابق یعنی متن، حواشی، وضاحتی نوٹس اور فرہنگ کے علاوہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا۔

اسی فسانہ عجائب کی تدوین میں رشید خاں صاحب کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ جب وہ متن کی تدوین کا کام مکمل کر چکے، کتابت بھی ہو گئی اسی زمانے میں ان کا پٹنہ جانا ہوا وہاں خدا بخش لائبریری میں فسانہ عجائب کا ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۸۰ھ ملا اسے انہوں نے نکلوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مصنف کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ہے بقول ان کے "ایک صورت تو یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رکھا جائے آخر میں ایک نوٹ شامل کر دیا جائے جس میں اس نسخے کی بازیافت کی اطلاع ہو اور اس مجبوری کی بھی کہ یہ ایسے وقت ملا ہے جب اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا یہ آسان راستہ تھا۔ لیکن اصول تدوین کے احترام اور اخلاقی ذمے داری کے احساس نے اس آسان پسندی کی اجازت نہیں دی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ متن کو از سر نو مرتب کیا جائے اور یہی کیا گیا۔ اس میں اچھا خاصہ وقت صرف ہوا"۔

اب "مثنوی گلزار نسیم" انہوں نے مرتب کی ہے۔ اس میں متن کے ساتھ ضمیمہ تشریحات، ضمیمہ تلفظ و املا، فرہنگ کے علاوہ مثنوی کا فارسی متن، معرکہ چکبست اور شرر کا پس منظر، گلزار نسیم کے نسخوں کا ذکر اور ان کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور گلزار نسیم کی ادبی نصابی اہمیت، قصے کا محل وقوع، قصے کے جزو تمثیلی انداز، نسیم کے حالات زندگی بیان کئے ہیں اس ایڈیشن کی ایک خاص چیز ضمیمہ تشریحات ہے اس ضمیمے میں مثنوی کے ہر ایسے شعر کی انہوں نے تشریح کی ہے جو قاری کی خاص توجہ چاہتا ہے۔ جس پر استادان فن نے اعتراض کئے ہیں اور اس پر مصنف کا جواب اور مشرقی تنقید کے ماہر کی حیثیت سے رشید حسن خاں کی رائے کے ساتھ درج ہے۔ ان تشریحات اور معرکہ چکبست و شرر کے مطالعے کے ساتھ ساتھ گویا وہ زمانہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جب مثنوی تحریر کی گئی ہمارے اسلاف کے نزدیک شعر میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں اور کن معائب سے پاک ہونا چاہیئے۔ وہ شعر کو کیسے سمجھتے اور پرکھتے تھے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے یہ مثنوی اردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اس کی فنی خوبیوں اور شاعر کی قادر الکلامی کا زمانہ معترف ہے۔ مبسوط مقدمے اور ضمیموں کے ساتھ ہم اپنے ادب کی اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جو ہماری دسترس سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اور شاید یہ کل خواب و خیال ہو جائے۔ اس لحاظ سے ہمارے شاعروں، ادیبوں اور طالب علموں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے جسے ہمیشہ ان کے مطالعے میں رہنا چاہئے یہی بات ان کی مرتبہ دوسری کتابوں "باغ و بہار اور فسانہ عجائب پر بھی صادق آتی ہے۔

رشید حسن خاں کی کتابیں نہ صرف کلاسیکی ادب کی تفہیم و تحسین کے لئے ناگریز بلکہ شعر و ادب کے بنیادی پہلوؤں اور تنقید و تحقیق کے آداب سمجھنے کے لئے بھی ان کے مطالعہ سے صرف نظر ممکن نہیں۔

فسانہ عجائب ☆ ضخامت: ۷۱۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۷۵ روپے ☆ اشاعت: طبع اوّل: ۱۹۹۰ء، طبع دوم۔ ۱۹۹۶ء ☆ **باغ و بہار** ضخامت: ۸۴۷ صفحات ☆ قیمت: ۲۳۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۲ء ☆ طبع دوم: ۱۹۹۹ء **مثنوی گلزار نسیم** ☆ ضخامت: ۷۲۴ صفحات ☆ قیمت: ایک سو دس روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۵ء ☆ ناشر: انجمن ترقی اردو، اردو گھر، ایوینیو نئی دہلی

مبصر: انور خان

دیوار و در کے درمیان (شاعری)

مخمور سعیدی

جدیدیت کے رجحان کو روایت بننے میں جتنا وقت لگا اتنا ہی وقت مخمور سعیدی کو "گفتنی" سے "دیوار و در کے درمیاں" تک پہنچنے میں لگا ہے۔ مخمور سعیدی نے اپنے شعری مجموعے "واحد متکلم" کے دیباچے میں لکھا تھا کہ: (شاعری کے لئے ا... شعری روایت سے مکمل انقطاع ممکن نہیں۔ شعری اور ... روایت صدیوں کے تہذیبی تسلسل کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ سفر کے کسی موڑ پر یہ تسلسل ٹوٹ سکتا ہے لیکن اس کے آثار باقی رہتے ہیں۔ اور پھر ایک نئے فکری عمل کا سر چشمہ بنتے ہیں۔ روایت سے اس نوع کی وابستگی اور آگہی کے ساتھ ساتھ ا... تحریر میں انہوں نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ "جدیدیت میرے لئے تخلیقی سچائی کا دوسرا نام ہے"۔

"دیوار و در کے درمیاں" ان کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری جدیدیت و روایت کے نقطۂ اتصال سے پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے وہ کسی طرح کے DILEMMA کا شکار نہیں ہیں۔ مخمور کی شعری تربیت جس ماحول میں ہوئی اس کے پیش نظر اگر وہ رسمی شعر گوئی میں ... ہو جاتے تو تعجب نہ ہوتا لیکن مقام شکر ہے کہ ان کی شخصیت میں احترام کی حد تک پہنچے اعتراف میں، بغیر کسی استہزا اور ... تخلیقی انحراف بھی موجود ہے۔ انحراف کا یہی عنصر ایک طرف انہیں رسمی شعر گوئی سے باز رکھتا ہے تو دوسری طرف تجر... کے نام پر الم غلم شعر کہنے سے بھی روکتا ہے۔ یہی عنصر انہیں درس دیتا ہے کہ تخلیقی سچائی کا دوسرا نام جدیدیت ہے اور یہی عنصر ہے جو جدیدیت کے ازلی "دشمن ترقی پسند تحریک" سے متعلق ان سے یہ کہلاتا ہے کہ: "ادب کے سکہ بند ترقی پسند نظر... سے مجھے اختلاف ہے لیکن ترقی پسند شاعروں نے جو اچھی شاعری کی ہے، میں اسے اپنے حافظے سے نہیں جھٹک سکتا"

انحراف کے سبب ان کی شعری شخصیت میں
تا ہے۔ ان کی شاعری کسی ایسے شخص کی
ہے جو مدنی معاشرت میں رہتے ہوئے ان
کا متمنی ہے جن سے اس کی ذات تعمیر ہوئی
نے ان سے جلا حاصل کی۔ مہانگر کے
قدیم قدریں اس کی کمزوری ہیں کہ انہیں
اس کا گزارا نہیں ہو سکتا اور وہ انہیں ترک
ہی قدریں اس کی قوت ہیں کہ انہیں کے بل
ے کی طوائف الملوکی کے سامنے سینہ سپرد
ہر کی بھاگ دوڑ اسے کچل نہیں سکتی۔
شخص کا ثقافتی سفر نامہ ہے جس کے لئے
م RITUAL محض نہیں ہے لیکن وہ ترقی
بے زاری یا الحاد پرستی کا بھی قائل نہیں ہے۔
کی سرگزشت ہے جس کے لئے مذہب و
زیر تبصرہ مجموعے کی پہلی نظم "اندھا سفر" او
ن غزلوں سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے
پر بخطِ شاعر جو تحریر شائع ہوئی ہے وہ بھی اس
کے تخلیقی عمل کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے
یری شاعری، میری جذباتی او روہنی سوانح
کے مختلف ادوار میں جن حالات و واقعات
ان حالا و واقعات نے میرے دل و دماغ پر جو
ہیں، میری شاعری انہی کا اظہار ہے "دیوار و
مشمول غزلیں، نظمیں قطعات، رباعیات،
طالعہ شاہد ہے کہ شاعر نے زندگی کی بو قلمونی
مظہر کیا ہے۔ ہر صنف کا انتخاب، اس میں
ن اور اس کے آہنگ کی مناسبت سے کیا گیا
ں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ فارسی شعریات کا
ری علاقائی زبانوں سے کماحقہ واقفیت اور ان
سے انہوں نے جو شعری زبان خلق کی ہے وہ
نرد بھی بناتی ہے اور اپنے دیگر معاصرین سے
موعے کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اب مخمور
جہاں شاعری اور زندگی میں فرق کم سے کم
اس کے آگے کی منزل، جس کے نقوش اس
ملتے ہیں، جہاں فن اور فن کار میں کوئی بعد یا
ان سے دور نہیں ہے۔

۲۸۸ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ
جستھان اردو اکادمی، ۳۔ل سبھاش مارگ، ایکم
ن) مبصر: **شین کاف نظام**

ایک شام کا قصہ (افسانے)

سلطان جمیل نسیم

"کھویا ہوا آدمی" اور "سایہ سایہ دھوپ" کے بعد سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شائع شدہ سبھی افسانے دہشت گردی کے موضوع پر ہیں۔ شاذ و نادر ہی قاری کو ایک ہی موضوع پر لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر لکھنا جتنا مشکل ہے اتنا ہی پڑھنا بھی۔ لیکن سلطان جمیل نسیم نے بڑی فنکاری سے یہ سبھی افسانے لکھے ہیں۔ ہر افسانے کے پلاٹ تنوع لئے ہوئے ہے او رہر افسانے کا تکنک میں بھی ندرت ہے۔ کسی افسانے سے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ سبھی افسانے اچھے اور دلچسپ ہیں۔ زبان بامحاورہ، مکالمے چست اور فطری، جذبات نگاری پُر اثر اور بیان، رواں دواں ہے۔ اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے "خاک کے سوا" جس میں نیاز بھائی اپنے اکلوتے بیٹے کو کراچی سے اعلا تعلیم کے لئے امریکہ بھیجنے کے سخت خلاف ہیں لیکن جب کراچی اور حیدر آباد وسندھ میں دہشت گردی بہت پھیل جاتی ہے تو ان کا ارادہ بدل جاتا ہے۔ المیہ تب واقع ہوتا ہے جب شکاگو میں ان کا بیٹا تشدد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی لاش کراچی لائی جاتی ہے اور بقول نیاز بھائی "جس سرزمین سے خوف زدہ ہو کر اور جس مٹی سے دامن چھڑا کے بیٹے کو بھیجا تھا اپنے ہاتھوں اسی زمین میں اتار اور وہی مٹی ڈالی" بین السطور میں افسانہ نگار کا اظہار خیال یہ ہے کہ دہشت گردی کراچی اور حیدر آباد سندھ ہی میں نہیں بلکہ در حقیقت یہ ایک عالمی مظہر ہے جس سے مفر کافی الحال کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے (پاکستان میں) ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ تقسیم کار: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی (پاکستان) مبصر: **محافظ حیدر**

سلسلۂ سود و زیاں (شاعری)

اطہر عزیز

اطہر عزیز صحافی ہیں، پبلسٹی کرتے ہیں، ناشر ہیں، یہ تو معلوم تھا لیکن شاعر ہیں اور ایک اچھے شاعر ہیں یہ نہیں معلوم تھا۔ یہ پتہ چلا ان کے اس پہلے مجموعہ کلام کی اشاعت او رمطالعے سے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہیں، کچھ نظمیں ہیں اور چند نظموں کے تراجم۔

ان کی غزلوں کے معیار کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے:

تخریب ارتقا کی سیاہی میں ان دنوں
ڈرتا ہوں ڈوب جائے نہ حُسن سحر کہیں
اس سے سنور سکے گی بھلا زلف زیست کیا
جس کے شعور غم میں ابھی پختگی نہیں
جو خار گراں سایہ ملے راہِ وفا میں
بڑھ کر انہیں اخلاص کی پلکوں سے چنا ہے
اک داغ تمنا ہے تو اک زخم وفا ہے
تنہا سایہ دل کتنے شراروں میں گھرا ہے
ہر لب پہ مچلنے لگا اب لمحہ فردا
اس دور میں دم توڑ نہ دیں کہنہ روایات

اپنے ہی اشاعتی ادارے ایڈ شاٹ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام دلکش گٹ اپ ساتھ اسے انہوں نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت ۱۰۰ روپے ☆ سنہ شاعت دسمبر ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز سانے بلڈنگ، ناتا بھائی لین، فلورا فاؤنٹین، ممبئی ۴۰۰۰۰۱ مبصر: **محافظ حیدر**

بیاضِ فطرت (شاعری)

شبیر احمد راہی (مرحوم)

شاعر اپنی فکری تخلیقی کاوشوں کا انتخاب تیار کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کی تنقیدی نظر زندگی بھر کی معنوی کمائی اور فکر و قلم کی سچائی کا بیشتر حصہ یا تو کھا جائے گی یا پھر جو کچھ اسے نصیب ہے وہ اسی کے حق میں وصیت کر جائے گا۔

شبیر احمد راہی نے، جو انتہائی معروف اور متنوع زندگی گذارنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔ دوسری صورت کو اولیت دی وہ اپنی آخری عمر میں اپنی شعری کائنات کو نا صرف سمیٹنے بلکہ اپنے ہی خط میں لکھنے میں بھی معروف تھے تاکہ آنے والی نسلیں حسن کلام سے استفادہ کے علاوہ حسن تحریر کا اندازہ بھی کر سکیں۔

موصوف کی اصل شہرت مذہبی، سیاسی مقرر کی حیثیت سے تھی اور ان کے شعروں میں بھی یہی وصف اور خطابت کا رنگ غالب ہے ۳۶۸ صفحات پر مشتمل شعری مجموعے میں بیشتر غزلیں ہیں اور ان غزلوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نے غزل کی کلاسکی روایات کو سلیقے سے آگے بڑھایا ہے مگر مشرف بہ اسلام کر کے۔

کلام شبیر احمد راہی اگر کمل نہ شائع ہو کر انتخاب کی صورت میں شائع ہوتا تب بھی اس کے کئی شعر ارباب ذوق کے لئے سکون قلب کا باعث بنتے۔

ضخامت: ۳۶۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۸ / نومبر ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: بزم راہی، ۵۳ - ورگاہ روڈ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ ضلع تھانے (مہاراشٹر) مبصر: **شمیم طارق**

کتاب بازار

قمر نعمانی-شخصیت اور فن (تحقیق)
مصنف: ڈاکٹر مظفر حسن عالی ☆ ضخامت: ۳۵۲ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ ناشر: کوکن اردو رائٹرز گلڈ، نیروبی (کینیا) ☆ پتہ: جدید اسلوب، بارہ دری، سہسرام ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

جگن ناتھ آزاد-بطور اقبال شناس (تنقید)
مصنفہ: یاسمین کوثر ☆ ضخامت: ۲۸۶ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (توصیفی خطبہ)
تحریر: خلیق انجم ☆ ضخامت: ۱۰۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یادگار نامہ قاضی عبد الودود
مرتبین: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر شریف حسن قاسمی ☆ ضخامت: ۴۶۲ صفحات (کلاں) ☆ قیمت: ۳۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

سحرالبیان (مثنوی)
شاعر: میر غلام حسین دہلوی ☆ مرتب: رشید حسن خاں ☆ ضخامت: ۶۷۲ صفحات ☆ قیمت: ۳۲۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باب سخن (شاعری)
تخلیق کار: محسن زیدی ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۵۳ / ۱۸، اندرا نگر، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶ (یوپی)

وزیر اعظم (ناول)
مصنف: اشرف شاد ☆ ضخامت: ۵۷۶ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد (پاکستان) ☆ پتہ: 177/102, MILLER STREET, PYRAMONT, NSW 2009, AUSTRALIA

موسم (شاعری)
فن کار: ولی آسی ☆ ضخامت: ۱۶۸ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: مکتبہ دین وادب، امین الدولہ پارک، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)

لفظ در لفظ (تنقیدی مضامین)
ناقد: شین کاف نظام ☆ ضخامت: ۲۳۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ ناشر: راجستھان اردو اکادمی، 3-J، سبھاش مارگ، C-اسکیم جے پور، (راجستھان) ☆ پتہ: کلوں والی گلی، جودھپور، (راجستھان)

روشنی تو اپنے اندر ہے (شاعری)
شاعر: محسن بھوپالی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۹۰ روپے ☆ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۷ء (طبع دوم) ☆ پتہ: فرید پبلشرز، پہلی منزل، نوشین سینٹر، اردو بازار کراچی (پاکستان)

اردو غزل میں پیکر تراشی (آزادی کے بعد)
مصنف: ڈاکٹر شہپر رسول ☆ ضخامت: ۵۲۴ صفحات ☆ قیمت: ۳۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

بستیاں (افسانے)
مصنف: جوگندر پال ☆ ضخامت: ۲۱۳ صفحات ☆ قیمت ۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: اردو اکادمی دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۲

ایڈز (افسانے)
افسانہ نگار: خورشید حیات ☆ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ☆ قیمت: ۶۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: بنگلہ نمبر-217/T/2 بنگلہ یارڈ، بلاسپور-۴۹۵۰۰۴ (ایم۔پی)

ایک ٹکڑا دھوپ کا (افسانے)
تخلیق کار: غزال ضیغم ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۵ روپے ☆ مطبوعہ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۶۸-آفیسرز ہاسٹل میرابائی مارگ، لکھنو ۲۲۶۰۰۱ (یوپی)

میں سوچتی ہوں (شاعری)
شاعرہ: شبنم عشائی ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ مطبوعہ: فروری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: عشائی منزل تاپرپلن ۱۹۳۱۲۱ (کشمیر)

رسائل وجرائد

فنون (سہ ماہی)
مدیر: احمد ندیم قاسمی ☆ مدیر منتظم: منصورہ احمد ☆ ضخامت: ۳۵۲ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۱۳۰ روپے ☆ مطبوعہ شمارہ ۱۱۲، جنوری تا جون ۲۰۰۰ء ☆ رابطہ: میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور (پاکستان)

ہماری زبان (مجروح سلطانپوری نمبر)
مدیر: خلیق انجم ☆ ضخامت: ۲۴ صفحات (اخباری سائز) قیمت: موجودہ شمارہ ۳ روپے ☆ مطبوعہ ۱۵ تا ۲۱ اگست ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اردو، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۲

نعت رنگ (نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ)
مدیر: سید صبیح الدین رحمانی ☆ (شمارہ ۹) مارچ ۲۰۰۰ء ضخامت: ۲۵۶ صفحات قیمت: ۱۰۰ روپے (پاکستان میں) (شمارہ ۱۰) اپریل ۲۰۰۰ء ☆ ضخامت: ۲۵۶ صفحات ☆ قیمت ۱۰۰ روپے ☆ پتہ: 25-E، فیس V- ڈی این ٹی فلیٹس، شادمان ٹاؤن-۱۱، نارتھ کراچی ۷۵۸۵۰ (پاکستان)

ادب (سہ ماہی)
مدیر اعلیٰ: جلال عظیم آبادی ☆ ضخامت: ۲۷ صفحات قیمت ۲۵ ٹاکا ☆ مطبوعہ: مئی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۱۲/ا، سلیم احمد روڈ محمد پور، ڈھاکہ ۱۲۰۷ (بنگلہ دیش)

لوح ادب انٹرنیشنل (سہ ماہی)
سرپرست: ڈاکٹر الیاس عشقی ☆ مدیر: شکیل احمد خان ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۲۵ روپے پاکستان میں ☆ مطبوعہ: اپریل تا جون ۲۰۰۰ء ☆ رابطہ 1/A لطیف آباد نمبر ۱۱، حیدر آباد (پاکستان)

عبارت (سہ ماہی)
مدیر: تنویر اختر رومانی ☆ ضخامت: ۳۲ صفحات ☆ قیمت روپے (فی شمارہ) ☆ ۲۰ روپے (سالانہ) ☆ رابطہ ۵۹ چونا شاہ کالونی، پی او آزاد نگر، جمشید پور-۸۳۲۰۰۱ (بہار)

ششی (ہندی میں اردو ادب)
مدیر: حسن جمال ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت ۲۰ روپے مطبوعہ: جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: نزد پنہ نواس، لوہار پورہ، جودھپور-۳۴۲۰۰۲ (راجستھان)

کمپیوٹر کمپوزنگ
شوکت علی القاسمی

مکتبہ قصر الادب

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۱واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ـــــ ۷۱

شمارہ ـــــ ۱۰

فون: 3829904

اکتوبر ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	معاونین سے
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai -

فکر امروز

کسی مشاعرے کی کامیابی کا انحصار کم سواد اور بد مذاق شعرا کی کثرت اور نا اہل سامعین کی ہنگامہ آرائی پر کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس میں دو چار ادیب و مشاہیر شریک ہو کر ہمیں اپنے کلام سے مستفیض کریں وہ مشاعرہ یقیناً کامیاب ہے۔ جب ارباب علم و کمال کی کمی نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ بدنام کنندگان ادب کو ایوان ادب میں اذن باریابی دے کر اشاعت فن کے مقصد عظیم کو پراگندہ کیا جائے اور ایک سکون آفریں فضا کو شورش پسند افراد کا اکھاڑا بنا دیا جائے (۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کے ایک خطبے سے اقتباس)

سیماب اکبرآبادی

سرورق

حامد اقبال صدیقی

❖

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(قارئین و قلمکار)

۴۱

❖

مکتوبات

جہاں	رئیس الدین رئیس	الف۔ ناظم
ن عظیم آبادی	شہناز صبیح	صادقہ نواب
ر خان	ش۔ صغیر ادیب	نسیم بن آسی
ب عرفان	حمیدہ معین رضوی	خلیل تنویر
	اسلم جمشید پوری	

۴۳

❖

شمارہ۔۱۰ [اکتوبر ۲۰۰۰ء] جلد۔ ۷۱

ادبی فیچر

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

منھی بھر نظمیں

بخط شاعر

آثار لفظ لفظ

جرعات

نقد و نظر

کتاب بازار

دوردرشن کا اردو چینل کیوں نہیں ؟

۶/اگست کی شب میں ہندوستان کی ایک اور علاقائی زبان پنجابی کے سرکاری چینل کا اختتامی پروگرام ہوا اور اب ۱۵/اگست سے دوردرشن کے اس نئے سرکاری چینل نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ ہم ہندوستان کی ایک اور خوبصورت زبان کے اس نئے سرکاری چینل کے آغاز پر تمام پنجابی بھائیوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ پنجاب میں دوردرشن دیگر علاقائی زبانوں کی طرح اپنا کام کررہا ہے۔ پنجابی زبان کا ایک پرائیویٹ چینل بھی اپنا کام کررہا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے سرکاری اور ذاتی چینل اپنا کام کررہے ہیں۔ گویا ہندوستان کی تقریباً ہر بڑی زبان کے کم از کم تین سٹیلائٹ چینل ضرور ہیں اور ہندی تو غیر سرکاری زبان ہے ہی چنانچہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری، ہر چینل پر کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔ اب چاہے درپردہ اردو بھی اس میں کیوں نہ شامل ہو۔ مگر کسے معلوم۔

اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ سرکاری سطح پر اردو کہاں ہے؟ ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح اردو کا سرکاری چینل کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ ہندوستان کی زبان نہیں؟ کیا یہ زبان اپنے کسی سرکاری چینل کا کوئی جواز نہیں رکھتی؟ اردو، کسی بھی علاقائی زبان سے بڑی زبان ہے تو پھر اس کا کوئی سرکاری چینل کیوں نہیں ہے؟ اگر ہندی سرکاری زبان نہیں ہوتی تو کیا یہ پورے ہندوستان کی زبان ہوتی؟ اب اگر یہ سرکاری زبان ہے تو پھر اردو کے بغیر کیوں کر؟ تو کیا اب ایک مشترکہ تہذیب کا خاتمہ نہیں ہورہا ہے۔ عوامی زبان کا قتلِ عام ہورہا ہے اور یہ سب کچھ ہندی کے نام پر ہورہا ہے لہٰذا ہر اعتبار سے ایک سرکاری اردو چینل اب ناگزیر ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سرکاری سطح پر ہندی کے ساتھ اردو کو بھی ہر محاذ پر رکھا جاتا اور اردو کا اپنا ایک سرکاری چینل ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے دونوں ہی کام نہیں ہوئے۔ اردو نے ہندی کے لئے اور ہندوستان کے لئے جو بنیادی کردار ادا کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ اردو غزل نے ہندی، ہندوستان اور علاقائی زبانوں کے لئے ہندوستان میں اور عالمی سطح پر جو ثقافتی کردار ادا کیا ہے اس کی بھی کوئی دوسری مثال نہیں۔ آج اردو کے نام پر سب کچھ ہندی کے کھاتے میں جارہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہندی فلم ہے۔ یہ فلمیں خالص ہندی میں نہیں ہیں۔ وہ ہندی جو سرکاری ریڈیو، دوردرشن اور سرکاری ایوانوں میں سوچ سوچ کر بولی اور شعوری طور پر رائج کی جارہی ہے۔ رامائن اور مہابھارت سیریلس اور ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد بطور خاص۔ اور یہ سب کچھ نہایت ہی سوچی سمجھی سازش کے تحت ہورہا ہے۔ ہر سطح پر اردو کو ہندی کے نام کردیا گیا ہے۔ دوردرشن سے مشاعرے ختم ہوگئے، قوالی کے پروگرام ختم ہوگئے۔ جہاں جہاں ریڈیو اور ٹی وی پر مقامی پروگراموں میں اردو برائے نام رہ گئی ہے۔ بہت مجہول سی اردو اور اس کا بھی کوئی پُرسانِ حال نہیں۔

اب اس بحث سے قطع نظر کہ اردو پر کیا گزر رہی ہے سرکاری سطح پر مختلف صوبوں میں علاقائی زبانوں کے ساتھ اور ہندی کے نام پر ہم سرکار سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ دوردرشن کا اردو سٹیلائٹ چینل کیوں نہیں ہے؟ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ دوردرشن کا ایک سرکاری اردو چینل جلد از جلد شروع کیا جائے جو آج کے ہندوستان کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اگر سرکار نے اس طرف جلد توجہ نہ کی تو ہم اردو والے سخت احتجاج کریں گے اور اس کے لئے کاغذ قلم سے اٹھ کر جو کچھ بھی کرنا پڑے گا ہم کریں گے اور احتجاج کی وہ فرسودہ زبان نہیں جو آزادی کے بعد سے اردو والوں کا مقدر بنی ہوئی ہے۔ آج احتجاج کے اسالیب، دھرنا، ریلی، بھوک ہڑتال، پریس کانفرنس، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر غلبہ، سیاسی پارٹیوں اور سیاسی لیڈروں سے احتجاجی مکالمہ، عوامی جلسے اور اس سے بھی آگے۔۔۔

ہم ممبئی میں اردو کے لئے احتجاج کی جدید ترین عالمی زبان میں مکالمہ کا آغاز کررہے ہیں۔

اکتوبر ۲۰۰۰ء



خلیل الرحمٰن اعظمی بنام اعجاز صدیقی

خلیل الرحمٰن [پ: ۹راگست ۱۹۲۷ء - م: یکم جون ۱۹۷۸ء] کا یہ ایک بہت اہم خط ہے۔ ادبی رسائل کے مدیران کا یہ ایک ایسا ناگزیر مسئلہ ہے جس سے مفر نہیں۔ شاعر کی ۷۱ سالہ زندگی میں اس کے مدیران کو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کے مسائل میں نئے پرانے قلم کاروں کے عجیب و غریب نفسیاتی رویّوں کا ہمیشہ ہی سامنا رہا ہے اور اب ہند و پاک کے درمیان سیاسی فاصلوں اور سرحدوں کے الجھاوؤں نے ان مسائل کو زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے۔ حالانکہ پاکستان میں شاعر کے قارئین کی تعداد وہاں کے ادبی رسائل کے قارئین کی کسی بھی تعداد میں رکھی جا سکتی ہے۔ خلیل صاحب کے خط کا آخری پیراگراف آج کی آواز ہے۔ یہ ہر دور کی آواز ہو سکتی ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ قارئین کو شاعر کا خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر یاد ہوگا۔ [ادارہ]

حرف ولفظ کے کھیل تماشے

ادبی فیچر

کیا اردو میں اب مابعد جدیدیت پر مکالمہ کمزور پڑ گیا ہے؟ کم از کم نئی نسل تو مابعد جدیدیت کی لسانی اور اصطلاحی بحثوں سے اوب چکی ہے۔ پھر یہ کہ جدیدیت سے بے زاری کے جواز میں کسی نئی بحث کے طور پر مابعد جدیدیت کے تمام مسائل و مباحث کو محض مکالمہ ہی بنایا گیا۔ اسی بحث کے بطن سے بہت ساری اصطلاحیں بھی ابھر آئیں، مابعد جدیدیت کو کوئی نام عنوان دینے کے لئے جس سے مشرقی ادبی روایت ابھر سکے۔ یوں بہت سارے مباحث خلط ملط ہو گئے۔ جدیدیت کا رجحان تو ۱۹۷۰ء کے آس پاس اور پھر اس کے بعد کمزور پڑا ہی تھا، ترقی پسندی کو ۱۹۹۰ء کے بعد قدرے سنبھالا ملا۔ معاصر شعر و ادب پر اثرات تو دونوں ہی کے ہیں مابعد جدیدیت نے تو قطعی کوئی اثرات مرتب نہیں کئے۔ آج کے ادب کے مسائل تو کچھ اور ہیں۔ نئے تنقیدی دبستان آپس میں چاہے کتنے ہی متصادم ہوں، تخلیقی ادب تو وہی آ رہا ہے جو قطعی آزادانہ فضا میں تخلیق ہو رہا ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کی بحث کمزور ہوئی کہ یہ بھی تمام تر مغربی اور ادبی کم لسانی زیادہ تھی۔ جدیدیت کے بعد ایک اور نئی جدیدیت اور ترقی پسندی کے آس پاس جو بھی نظریے ابھرے وہ کبھی جدیدیت کی حمایت کرتے ہوئے معلوم ہوئے تو کبھی ترقی پسندی کی بازیافت معلوم۔ کبھی ان کے امتزاج سے کسی نئی ادبی تھیوری کا تصور دیتے رہے مگر ادب تو وہی تخلیق ہوتا رہا جو ان کے بغیر بھی ہوتا۔ نئے ڈسکورس (مکالمہ) تو کچھ اور بھی ہو سکتے تھے۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے اپنے کلاسک سے ایک طرح سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ اب جدیدیے وہی کام کر رہے ہیں جو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں انہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہمارا جاندار زندہ کلاسیکی ورثہ ہر دور اور عہد میں اپنی نئی معنویت کو تخلیق کر رہا ہے۔ غزل کے کسی زندہ اور تہہ دار شعر کی طرح۔ ہمیں اپنی روایت ہی سے نئے مکالمے روشن کرنے ہیں لیکن اب انٹرنیٹ کی ایک نئی دنیا میں جو ادب انٹرنیٹ پر آ رہا ہے اور اس کی جو تنقید لکھی جا رہی ہے یا جو نظریے (سیاسی اور مذہبی نوعیت کے) ابھر رہے ہیں ان سے استفادہ بھی ضروری ہے۔

ترقی پسندی، جدیدیت یا نئی ماڈرن ازم ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت یا کوئی اور نظریہ، آدمی سے آدی کی تفہیم کے لئے نئے ڈسکورس بہر حال ضروری بلکہ ناگزیر ہیں اور اب نئے ہزارے اور نئی صدی کے لئے اس ناگزیریت کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ شاعر کا ادبی فیچر ہر طرح کے ادبی مکالمے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

شعر، غیر شعر یا نثر، غیر نثر کے فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے اگر قاری کا ذہن تربیت یافتہ ہو۔ خود فن کار میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔ فنکار اور غیر فن کار میں بھی یہی فرق ہے لیکن ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارے بہت سارے فن کار ادب سے جڑے ہونے کے باوجود شعر اور غیر شعر یا نثر اور غیر نثر میں فرق نہیں کر پاتے۔ بُری شاعری اور بُری نثر کے ڈھیر لگاتے رہتے ہیں۔ جو لکھ دیا اسی کو منفرد، اعلیٰ، معیاری اور اپنے طور پر اضافہ سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں جبکہ تخلیقی اور غیر تخلیقی زبان میں فرق کا شعور بڑی ریاضتوں اور بے پناہ مطالعے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ اچھا سچا اور اپنا شعر کہنا تو بہت مشکل امر ہے۔ اچھی نثر لکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک صحیح جملہ لکھنا اور اس میں تخلیقی چمک پیدا کرنا ایک عمر کھپانے کے بعد بھی ممکن ہوگا، نہیں کہا جا سکتا۔ ادبی رسائل دیکھ لیجئے، شعری مجموعے اور نثر کی کتابیں پڑھ لیجئے۔ تخلیقی زبان شاعری اور نثر دونوں ہی اصناف میں سمٹتی جا رہی ہے۔ اسلوب تو اسی وقت جنم لے گا جب زبان تخلیقی ہو گی یعنی جملوں کی ساخت پرداخت میں تخلیقیت ابھر کر آئے۔ وہ قاری ہو یا فن کار، جب تک تخلیق اور غیر تخلیق کے فرق کا شعور پیدا نہیں ہو گا، نہ تو اچھا اور سچا ادب تخلیق ہو گا اور نہ ہی اس ادب کا قاری۔ جیسی روح ویسے فرشتے والا معاملہ ہے۔ اس موضوع پر خاصہ لکھا گیا ہے لیکن اس شعور کو روشن کرنے والے ادبی ادارے، ادبی اسکول اور اساتذہ اب اردو سماج میں رہے نہیں۔

ادبی تخلیق سچائی کے بغیر بھی ممکن ہے۔ معاصر اردو ادب کے جائزے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتنے ہی قلم کار بہت اچھی مگر مصنوعی شاعری کر رہے ہیں۔ مصنوعی کہانی تخلیق کر رہے ہیں۔ حرف ولفظ کا سارا کھیل ہی مصنوعی ہو کر رہ گیا ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ آج بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہو گا۔ فن پارے میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ، اس کا اندازہ کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سچا فن پارہ از خود مکالمہ کرتا ہے۔ اپنے جوہر کی پوری نشاندہی کرتا ہے۔ ایک مصنوعی ادبی فن پارہ بھی اپنے تخلیقی اوصاف سے متعارف کروانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر وہ کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ اس کا انحصار قاری کے ذوق سلیم پر منحصر ہے۔ آپ مہمل سے مہمل شعر کو بامعنی کر سکتے ہیں۔ اپنی قوتِ اظہار سے شعر کو کچھ سے کچھ بنا سکتے ہیں۔ آپ کا علم، آپ کا مطالعہ، آپ کا ذخیرۂ الفاظ آپ کے اندر کی اپج، بابت۔ شارحین غالب و اقبال اور میر کے یہاں اس کی جلوہ گری موجود ہے۔ جدید لایعنی افسانوں کے شارحین کے یہاں بھی ایسے ہی کمالات موجود ہیں۔ کوئی ایسا کلیہ، قاعدہ نہیں ہے جو سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکے۔

بہر حال! یہ بحث بہت دلچسپ اور ایک مستقل موضوع لئے ہوئے ہے۔ مکالمہ جاری ہے۔

اردو زبان و ادب کا عالمی منظر نامہ ہمارے ادبی فیچر کا خاص موضوع بن رہا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے اردو قلم کار نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ عالمی اردو کانفرنسوں اور سیمیناروں نے بحث کے راستے روشن کئے ہیں۔ انہیں سے عمل کی صورتیں بھی ابھر رہی ہیں۔ ابھی اور زیادہ سنجیدہ اور باعمل ہو جانا ہے ان لوگوں کو جو عالمی مشاعروں کا انعقاد کرتے ہیں، عالمی ادبی محفلیں سجاتے ہیں، جشن کرتے ہیں۔ اردو ادب کے لئے متحرک ہیں۔ وہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی بقاء اور ترویج و اشاعت کے لئے بھی عمل پیرا ہوں۔ (الف۔الف)

مابعد جدیدیت : فکر اور انتشارِ فکر

احمد سہیل



جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت دونوں کی فکری رومانوئیت ایک ہی سی ہے۔ جہاں تک فکر کی ترگیت کا تعلق ہے تو یہ ایک دوسرے سے کئی ہاتھ آگے تصور کئے بیٹھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ معاشرتی کلیت کی مابعد جدیدیت کے نظریئے سے معاشرتی نظم (ORDER) عقلیت کا شعور حاصل کرتا ہے اور اپنے رویوں میں جدیدیت کی خود مختاری کے اس نظریئے کو تسلیم نہیں کرتا جو انسان شکنی کے نظریئے سے آگے نہیں بڑھا جس میں فرد کی خود مختاری کے کئی اجزائے ترکیبی ترتیب پاتے ہیں۔ جبکہ مابعد جدیدیت میں یہ خود مختاری اس وقت ہی حاصل ہوتی ہے جب فرد انفرادی سطح پر اپنی ''آزادی'' کو مکمل طور پر آگہی میں لاسکے اور بعد ازاں اس کے اختتام کو مخصوص مکاجیاتی فطانت کے ساتھ تشکیل دیتے ہوئے اپنے موضوع اور معروض کی تشکیل کا بھی اہل ہو۔

مابعد جدیدیت ادب اور اس کے تنقیدی نظریئے میں چند ایسی باتیں ضرور سامنے آتی ہیں جو ہمیں چونکاتی بھی ہیں اور حیران و پریشان بھی کر دیتی ہیں، لسان، ثقافت، عقلیت اور معاشرتی سیاق میں یہ نظریہ کئی نئی باتوں کو منظرِ عام پر ضرور لاتا ہے۔ اسے معاشرتی تبدیلی کا فکری وظیفہ بھی کہا گیا، حالانکہ یہ جدیدیت سے منہدب انداز کی فکری معذرت ہے کیونکہ مابعد جدیدیت نے اپنے فکری نظام میں اس بات کا شدت سے احساس دلوادیا ہے کہ ''ثقافتِ عالیہ'' اور عام زندگی میں انتہا درجے کا فرق ہوتا ہے۔

آج کی دنیا جوہری خطرات میں گھری ہوئی ہے اور جغرافیائی تبدیلیاں، ابلاغ اور ترسیل کے حقائق اور ثقافت کے وسیع سے وسیع تر ہوتے تناظر نے وحدت کے نئے تصورات کو جنم دیا۔ حس کی جذباتی اور عقلی کشمکش کو حساس سے حساس تر بنانے کی ذمہ داری بھی محیطِ ارض ٹیکنالوجی اور نئے طرز کی نظام سرمایہ داری بھی ہے کیونکہ یہ جدید دور میں معروض کی خواہشات کو جنم دیتے ہیں جو کہ بیج اور کرشموں کے متبادل کے طور پر بھی ابھرے اور اس سے فکر کے انتشار کے تموج میں فرد، فکری تسلسل سے کٹ گیا لیکن اس نے ہمت سے کام لے کر معاشرے، تاریخ، ذات اور ثقافت کو پھر سے ٹٹولا اور گہرائی سے کھنگالا۔ یوں نئی لسانی بدیعیات سے نئی مابعد جدیدیت ثقافت ابھر کے سامنے آئی جو اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ اعلیٰ بیانیہ اور اعلیٰ رموز سے فرد کی فکر کو آگاہ کیا جائے اور نئے تجربات کا فرد سے مبادلہ کیا جائے۔ فکری تسلسل سے کٹ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پالینے کی کوشش نے ''اتھارٹی'' سے اپنا حساب چکانے کا بھی عندیہ دیا۔ اس عمل میں مابعد تغیر اور اعلیٰ رموز کے عناصر، اصناف اور کئی نئی ادبی ہیئتوں کو بھی متعارف کرواتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کا نظریہ اپنی فکری تجدیدیات اور محدودیت کو بھی چیلنج کرتا ہے اور زندگی کے حاشیائی پہلوؤں پر سے پردہ کشائی کے لئے بھی بے چین رہتا ہے، جس نے فرد کی زندگی اور اس کے علم و فن کو چیستانی بنادیا اور عظیم بیانیہ نے تمام تجربات کو ایک مخصوص تبدیل کر کے مخصوص مناجیات کے تحت پیش کیا کیونکہ کلیت اور کچل جانے کا احساس انسان کو ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ اس کی ماہیت کو پالینے کے لئے نئے فکری فریم ورک کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی بلکہ متن اور معاشرتی بین العمل کے آفاق میں پوشیدہ عظیم رموز پر سے بھی پردے اٹھانے پڑتے ہیں جو کہ انبساط اور اذیت کے ثنوتی تضادات کی صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں اور فاسد قسم کی جمالیات پر بھی نظر ڈالتے ہوئے نئی قسم کی جمالیات کی رونمائی بھی کرتے ہیں۔ جسے ہر شخص باآسانی قبول نہیں کرپاتا۔ کیونکہ اس عمل میں سابقہ جمالیات کریہہ صورت میں ابھر کر اپنے کریہہ ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتی ہیں یہ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب عظیم بیانیہ کا عمل آزادی کے ساتھ ہو۔ آزادئ فکر ہی عظیم بیانیہ کی وساطت سے آفاق کے قطبین کو ہمارے فکری تجربے میں لاتی ہیں اور ان کی مبادیات کی درجہ بندی بھی کرتی ہیں۔ لیکن فردیاتی سطح پر ایک مخصوص حسیاتی نظام دنیا کا ماورائی اجازت نامہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ وہ کوئی اخلاقی آفاق کو تشکیل دے رہے ہیں۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے اور فرد اکیسویں صدی میں نمونوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا اور ایک سے لیکر صفر کے ہندسوں میں معنیات تلاش کرتا ہے وہ ایک تاریخی جبر میں دبی ہوئی گھٹن زدہ ماحولیات میں سانس لیتے ہوئے کبھی نہ ختم ہونے والی غیر تخلیقی کائنات میں اپنی زندگی تمام کر دیتا ہے۔ فرد اختصاصیت کو گلے لگانا چاہتا ہے مگر مابعد جدیدیت اسے دوسری راہوں پر ڈال دیتی ہے مثال کے طور پر مابعد فکشن جو پہلے اپنے ''فکش'' ہونے پر زور دیتی ہے اور اسے اپنے فکشن ہونے کی مکمل آگاہی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس عمل میں ایک ڈرامائی صورت حال بھی سامنے آتی ہے یا فکشن کی فطرت میں باطل قسم کی تشکیلات بھی شامل ہو جاتی ہیں اور معاشرتی تجربات آخر کار فکشن کے تجربات قرار پاتے ہیں۔ فکشن کی یہ فکری اور خلقی حرکت پذیری فکشن کی جمالیات بن جاتی ہے اور دوسرے بھی معاشرتی حقائق سے حقائق اخذ کرتے ہیں اور واہمے اور فینٹسی کی دنیا بھی بسالی جاتی ہے۔ یہی وہ ردِ عمل ہے جو کہ جدیدیت کی کلی ہیئت پسندی کو مسترد کرتے ہوئے وہیت کے جمالیاتی پہلوؤں سے دست برداری کا اعلان کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں ایک مخصوص قسم کی لفظیات کی میکانیت تشکیل پاتی ہے اور اسی قسم کی لفظیات جدیدیت کے رجحان کی پہنچان بھی قرار پاتی ہے۔ اس قسم کی مخصوص لفظیات مخصوص رجحان کے حامل لکھنے والوں کے درمیان رموزی اور علامتی بین العمل کا اشتراک بھی بن جاتا ہے۔ رموزی پیغام رسانی لکھنے والوں کو ایک مرکوز رجحان عطا کرتی ہے۔ جبکہ اس مخصوص رموزی ماحولیات میں خصوصی لفظیات تو جنم لیتی رہتی ہیں جو تخلیقی اور فنکارانہ عمل میں اپنے نفوذ سے نت نئے رنگ بکھیر دیتی ہیں اور بعض دفعہ یہ عام زندگی سے کٹ بھی جاتی ہیں۔ مابعد جدید نظریہ اس ''منفی فیصلے'' کو مسترد بھی کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی جمالیات سے ہر فکری اور تخلیقی معروض اور موضوع کو پرکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ

اس کی تمام کوشش فن اور زندگی سے باہم تصور کی جائے جو کہ ہیت کی عام صورِ تحال ہوتی ہے اور اسی صورِ تحال سے مروّج ثقافت اور زندگی کے روزمرّہ حقائق جان لئے جاتے ہیں۔ یہ نظریہ باختن کے کارنیوال (CARNIVAL) کے تصور سے قریب تر ہے۔ جو کہ اقتدار اور قوت سے اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے مابعد جدید فکر میں "آزادی" کے چراغ کو جلاتا ہے۔ کارنیوال کے تصور رواج شکنی (TRANSGRESSION) کے تصور میں محدود ہے اور یہ تصور فکریات کا نظام سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی اور کلیت کے تصورات کی ساخت بجائی بوجھ کر توڑ پھوڑ دیتا ہے اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کو سب سے زیادہ صدمہ پہنچاتا ہے۔ (اگر سچائی جان لی جائے تو!) بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ معاشرتی پیکر یت کنٹرول کرنے کے لئے جب بھی مناجیات کا سہارا لیا جاتا ہے تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور رواج شکنی (TRANSGRESSION) کا یہ تصور بیچ منطق (PARALOGICAL) کے تصور سے قریب تر ہوتا ہے جو کہ وجدانی سطح پر غیر عقلی معاشرتی تصورات کو ابھارتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے فکریات کا یہ نظام دنیا کی توانائی بنا کر معاشرتی حقائق فرد کے تجربات میں نہیں ہوتے ہیں اور وہ ساخت کے باہر ایک عظیم بیانیہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ جس میں قول محال لی تخفیف سازی ریڈیکل تبدیلی سے جائز قسم کے حقائق میں نفوذ کر جاتی ہے اور اس مقام پر موضوع وجودیاتی بنیادوں پر استوار کر لئے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ فکر کے سنجیدہ مسائل کو "کارنیوال" کے نظریئے سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسئلہ یوں بھی مزید الجھ جاتا ہے کہ بات الٹ پلٹ ہو جاتی ہے اور فکری معنیات کا نظام بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اثرات پیروڈی سے لے کر لوک طنز و مزاح تک محسوس کئے جاسکتے ہیں اور عمرانیاتی فکر کو علمی اور ادبی سیاق میں خوش آمدید کہنے کے بعد بنے بنائے سابقہ فکریاتی جہات کی صحتِ نو کی خواہش میں کئی فکری نکات کو مسترد کرنے سے بھی اجتناب نہیں برتا جاتا اور مناجیات کی سنجیدہ تخفیف کاری انتشار فکر کو ذہن کی بساط پر بچھا دیتی ہے اور بعض دفعہ فکر کے سکہ بند مہرے ایک مخصوص آئیڈیالوجیکل نظام سے متعلق ہو کر فرد کو "ربوٹ" میں تبدیل کر دیتے ہیں اور بیانیہ کا روایتی نظریہ فکری متن میں پائے جانے والے شگافوں اور جھول جھال کو بہت حد تک سہارا دیتا ہے اور غیر ضروری طور پر فکری متن میں دخل در معقولات سے بھی گریز کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بعض دفعہ یہ بھی تجربے میں آتا ہے کہ مہابیانیہ کا حاوی محرک متن کی فکری فضا پر اپنے استبداد اور دباؤ کو بھی قاری سے متعارف کرواتے ہوئے بڑی صفائی اور مہارت سے یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ مہابیانہ میں چھپی ہوئی آئیڈیالوجی کو قاری ویسا ہی قبول کر لے جیسا کہ مہابیانہ چاہتا ہے اور فکری متن کی بلوغت اور سنجیدگی دم توڑ دیتی ہے۔ اس سیاق میں متروک فکری رواجوں کو مثبت شعور کے ساتھ متن میں سمو دیا جاتا ہے یا کوشش کی جاتی ہے کہ اس طور پر متن کی معنیات کو اجاگر کیا جائے جو قاری کے لئے جاذبِ نظر ہو اور ساتھ ہی اس سے افتراقات جنم لیں۔ اس عمل میں فکشن اور غیر فکشن شاعری اور ناشاعری کے اختراقات واضح طور پر متعین نہیں کئے جاتے بلکہ ان کے اپنے اپنے حدود کو بھی دریافت کیا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ ادبی اصناف کی درجہ بندی بھی کر دی جاتی ہے جو کہ تمدن عالیہ اور ایک کم تر ثقافت میں پروان چڑھتی ہے۔ آفاقی حسیت ہی بدیعیات کو وجود میں لاتی ہے اور زبان و ثقافت میں تمثالوں، علامتوں اور رموز کو تشکیل دیتی ہے حالانکہ کوئی بھی اس کی راستی (VALIDITY) کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ موضوع اقتدار اور قوت کے میدان کو ایک خود مختار موضوع کے طور پر تجربے میں لاتا ہے اور ادراک کے کئی طریقۂ کار ابھرتے ہیں۔

موضوعی آفاق میں ذات کا بھی انتشار پیدا ہوتا ہے اور اس سے ذات اوجھل ہو جاتی ہے اور ذات مزید محض نفسیاتی حقیقت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ ثقافتی تشکیلیت کو جنم دیتی ہے جبکہ بلاغت کی فضا میں زبان اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔ یوں نفسِ مضمون اور صورتِ حال نظروں سے معدوم ہو جاتے ہیں کیونکہ صورتِ حال کے اختراقات سے موضوع کی آگہی تشبیعت کاشکار ہو جاتی ہے یہ ایک طرح کی ڈرامائی صورتِ حال ہوتی ہے کیونکہ بدیعیات اور لفظیات کی سحر گری سے لفظ پھیکے اور اس حوالے سے جو بھی فکر تشکیل پاتی ہے وہ عمیق نہیں ہوتی لہٰذا وہ اپنے نمو سے قاصر رہتی ہے۔

بہر حال فرد طبیعی دنیا میں طبعی فرد ہوتا ہے اور اسکا وجود طبعی تصور کیا جاتا ہے۔ یہی مابعد جدیدیت کی عقلیت ہے اور اسی کو اس کی فکریات کی روشن خیالی سے معمور کیا جاتا ہے اور اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ طبعی طور پر فرد کا وجود مختلف سمتوں میں منقسم ہوتا ہے۔ جس میں جدولیاتی تبدیلی پر زور دیا جاتا ہے جو کہ وجود کی بنیادی صورتِ حال سمجھی جاتی ہے۔ سچائی جمالیات سے زیادہ عقلیت پسندی کے روپ میں ابھرتی ہے اور یہی فکر کی رونمائی بھی کرتی ہے اور آخر کار اس کی ٹانگ اخلاقیات پر آکر ہی ٹوٹی ہے۔

جب جدیدیت اپنی فکر نو کا احاطہ کرتی ہے تو وہ تاریخ کو توڑ پھوڑ کر مسخ کر دیتی ہے کیونکہ اس کو بیانیہ کی تکنیک سے کم ہی آگاہی کا انسلاک ہوتا ہے جبکہ تاریخی آگہی کے لئے بیانیہ کا شعور ہونا شرط تصور کیا گیا ہے اور تاریخ ہی انسانی آگہی کو تشکیل دیتی ہے جو دبے قدموں سے ہمارے شعور میں داخل ہوتی ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے قرطاس پر پھیلا ہوا متن ہی نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی اور تہذیبی احساس و شعور کا بیکراں وسیع و عریض سمندر بھی ہوتا ہے جس کو "معاشرتی متن" کا نام دیا گیا ہے اور زبان تاریخی شعور ابھارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ زبان کی بدیعیات ہی بیانیہ کی قوتوں کی تشکیل بندی کرتی ہیں۔ نئی لسانیات اور اظہار کے نئے پیرائے تجربے میں شامل ہوتے ہیں کبھی کبھار قنوطی صورتِ حال بھی سامنے آتی ہے کہ فرد کو عام زندگی کا ڈھانچہ جو کہ غیر واضح ہوتا ہے وہ اس کی نظروں سے مستقل اوجھل رہتا ہے اور فرد ہر بات کو "حالات" پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ وہ مصلحت کشی کو کوئی دلفریب سا نام دے کر ہر صورتِ حال سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی فکریات میں انسانی انانیت معاشرتی اور تاریخی تشکیلات سے متعلق ہوتی ہے اور کبھی کبھار مایوس کن بھی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس بات کو رد بھی کرتی ہے کہ "ذات" معاشرت سے تشکیل پاتی ہے جو وحدتِ ذات کی حسیت کو صدمہ پہنچاتی ہے۔

یہاں یہ بات خاطر نشان رہے کہ انسانی تاریخ کی شہادتیں تاریخ کی مبادیاتی وحدتوں کو دریافت نہیں کر پاتیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ فرد کے تجربات تاریخی فکری

عروج وزوال کو مکمل طور پر تشریح کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ جو اس کے فکری شعور اور تجربے میں "مغائرت" کا عنصر مھوتی نوعیت کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ اس کے فکری شعور میں ابھر کر کئی نئی مضائرتی جہتوں کو اپنے تجربے میں شامل کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ یہ فکری عمل آبلہ فریبی کو ابھارتے ہوئے بیانیہ میں منطقی متعلقات کا انکشاف بھی کرتا ہے اور تاریخ کے نادر لمحات گھمباتی طریقۂ کار کی زد میں آکر مغائرت سے دوچار ہوتے ہیں اور فرد التباسی فضا میں یہ جان کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی تاریخیت اور اس کا فکری شعور "مطلق" نوعیت کا ہے اور وہ آگہی کے عمل میں سرخرو ہو چکا ہے۔ یہی التباس تاریخی بیانیہ کے متن میں مزید پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ دوسری جانب منطقی متعلقات فرد کے ذاتی وجود اور شناخت کے رموز سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی کشادگی اور محدودیت کو بھی اس کے شعور میں شامل کردیتے ہیں اور یہ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب فرد کا موضوع اس معروض میں شامل ہو کر مختلف معروضات کو قبول ہی نہیں کرلیتا بلکہ اس کے ساتھ ہی معروض کے اختراقات اختصاصی نوعیت میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔

● 131, MEMORY LANE, HOUSE No. 201, PALESTING, TX 75801 (U.S.A.)

ادبی اور غیر ادبی تحریر

اظہار خضر



ادب، فنکار کے جذباتی حسیاتی اور اضطراری ردِّ عمل کا نام ہے۔ یہ ایک نادر، عمیق اور لطیف تجربہ ہے جو کسی فنکار پر اضطراب و ہیجان کے عالم میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ یہ ایک تحلیلی اور تعمیری سرگرمی کی انتہا ہے جس میں تخلیقی عمل کے دوران فنکار کا ہیجان صرف ہوتا ہے اور اضطرار تحلیل ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں فنکار کو آسودگی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا فنی نمونہ دوسروں کے لئے بھی آسودگی اور سکون و طمانیت کا سبب بنتا ہے۔ چونکہ ادیب ہمارے اور آپ کے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اس لئے اس کی تخلیقی فکر ہماری خارجی دنیا سے ہی ماخوذ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اس دنیائے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اپنے احساسات و جذبات کی تہذیب و ترتیب کرتا ہے۔ یعنی فنکار کا باطن جب ظاہری احوال و کوائف کی تپش سے گرماتا ہے تو فکر و فن کا ایک نادر آمیزہ تیار ہوتا ہے۔

گویا ادب کی دنیا محسوسات کی دنیا ہے۔ اس کے دائرے میں حواس و حسیات کے عناصر بکھرے رہتے ہیں۔ فنکار اپنی لطیف حسّیات اور تخیلات کے سہارے تخلیقی عمل کے دوران ان عناصر کو اپنی تخلیقی فکر کا حصہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس غیر ادبی تحریروں میں محرّر کے لطیف حسّیات و جذبات کار فرما نہیں ہوتے۔ اس کی تحریروں سے قاری کے حواس و حسّیات کی تسکین نہیں ہوتی، البتہ قاری کی معلومات میں اضافہ ضرر ہوتا ہے کیونکہ اس نوع کی تحریروں میں معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ، فلسفہ اور سائنس کی کتابوں سے معلومات تو حاصل کرلیتے ہیں، لیکن ان کے مطالعے سے ہم پر کسی قسم کے کتھارسس (KATHARSIS) کا عمل نہیں ہو پاتا یعنی ان سے ہمارا جی ہلکا نہیں ہوتا ہے۔ ایسی کتابیں قدروں کی سطح پر شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ یعنی ان کتابوں کی تصنیف و تالیف میں عقل و فکر اور دلائل سے کام لیا جاتا ہے اور ایک طئے شدہ اصول و ضوابط کے پیش نظر مواد کی ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے۔ جبکہ ادب میں اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کی بنیاد تو فنکار کے لطیف احساسات، جذبات اور تخیلات ہیں۔ فنکار جتنا ذکی الحس ہوگا اس کا فن اتنا ہی وقیع اور جامع ہوگا۔ یہ فنکار کی ذکاوت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنے اطراف سے اثر قبول کر کے اپنے فن کے کینوس پر اپنی نازک خیالی کی رنگ آمیزی کرتا ہے اور فنکار کی یہ رنگ آمیزی قاری اور سامع کے احساسات و جذبات میں ابال کا باعث بنتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فنکار اور قاری دونوں ہی کی فطرت میں جمالیاتی جبلتیں (AESTHETHIC INSTINCTS) موجزن رہتی ہیں۔ لیکن ایک عام قاری میں احساس کی یہ سطح ظاہر نہیں ہو پاتی ہے۔ وہ حسن و جمال کو محسوس تو کرتا ہے لیکن اسے لفظوں کے پیکر میں ڈھالنے سے مجبور ہے۔ اس کی جمالیاتی حِس غیر شعوری طور پر اس کے ذہن و دماغ کو متاثر کرتی رہتی ہے فنکار کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دبی ہوئی چنگاری کو دعوتِ شعلگی دے دیتا ہے۔ اس عمل میں فنکار کا سارا وجود جلتا رہتا ہے۔ یعنی فنکار کی فکر و شعور کی سوزش قاری کی تمام تر محسوس کیفیتوں میں حرکت و توانائی پیدا کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں سے دلچسپی رکھنے والے قاری یا سامع اور فنکار کے درمیان ایک فکری اور حسّیاتی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جبکہ ایسے قلم کار جن کا تعلق فنون لطیفہ سے نہیں ہے اور جو دیگر علوم و فنون کے موضوعات پر اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لاتے تو ہیں، لیکن ان کی تحریریں چونکہ حسِ لطیف (FINER SENSE) کے دائرے سے باہر ہوتی ہیں اس لئے ان سے قاری کا سازِ دل مرتعش نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ جب ہم تاج محل اور لال قلعہ کے تعمیری حسن نیز اجنتا اور ایلورا کے صعیلاتی پیکر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارا احساس جمال جاگ اٹھتا ہے۔ میر و غالب کی غزلوں کو پڑھتے ہیں تو آبگینۂ دل میں نازک ترین خیالات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں سے ہمارے حواس بھڑک اٹھتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مطالعے سے ایک مخصوص قسم کی فکری شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ تاج محل، لال قلعہ، اجنتا اور ایلورا کے مجسمے، غالب و میر کے اشعار اور ابوالکلام آزاد کے خطوط جیسے فنی نمونے، فن لطیف کے خوبصورت اور حسین شہکار ہیں۔ ان کا فنکار دوران تخلیق جمالیات کی سرزمین سے آشنا تھا۔ لہٰذا اس قسم کے تخلیقی عمل کے نتیجے میں جو فن معرض وجود میں آتا ہے اس میں فنکار کے احساس جمال کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل کا خالق دنیائے حسن جمال کی نیرنگیوں سے واقف تھا۔ اجنتا اور ایلورا کا بت تراش رنگ اور سنگ آمیزش اور تراش و خراش کا ہی ماہر نہیں تھا بلکہ وہ ان رنگ و سنگ میں اپنے احساس جمال کو بھر دینے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ گویا فنون لطیفہ کا فنکار اپنے فن کے اظہار کا ایک خاص سلیقہ اور ہنر جانتا ہے۔ وہ ذریعہ اظہار کا ہی ماہر ہوتا ہے۔

چونکہ ادب بھی فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے اس لئے ادیب اپنے وسیلۂ اظہار یعنی الفاظ کا ہی ماہر ہوتا ہے۔ ادیب الفاظ کا استعمال کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ ان سے ایک جہان معنی کی تشکیل ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ لفظوں کا استعمال صرف مطلب کی ادائیگی کے لئے نہیں کرتا ہے بلکہ وہ طرز ادا میں ایک ایمائیت، ایک آن اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لئے الفاظ اپنی وضعیٔ دلالت یعنی اپنے لغوی معنی سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان کی ترتیب و تنظیم ایک موزونی ہم آہنگی اور نغمگی کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ادیب الفاظ کے توسط سے قاری کے دل ودماغ پر جادو جگاتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بلندیٔ فکر اور شوکتِ الفاظ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھا ہو جاتی ہیں اور وہ لمحہ فنکار کی تخلیقی سرگرمیوں کا نصف النہار ہوتا ہے۔ ایسے تخلیقی لمحے میں جب فنکار اپنے تجربات ومحسوسات کو لفظوں کی صورت میں ڈھالتا ہے تو پڑھنے والے کے محسوسات کے تاروں میں سُر پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ ہیجان واضطراب کے عالم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ادب کا فنکار جمالیات کا ادا شناس ہوتا ہے۔ اس کا مقصد ہی "نغمہ ہائے غم" اور "ساز ہستی" میں ارتعاش پیدا کرنا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے اظہار میں کار فرما رہتا ہے۔ غرضیکہ ایک ادبی تحریر میں ایمائیت، رمزیت، حسن وجمال، لطافت، نزاکت اور حسیات وجذبات کی تمام تر باطنی کیفیتیں جلوہ فگن رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی فنکار سیاسی، سماجی اور تاریخی مسائل وواقعات سے متاثر ہو کر فن کی تخلیق کرتا ہے تو اس کا فن سیاسی، سماجی اور تاریخی نوعیت کے ہوتے ہوئے بھی فن لطیف ہی ہوگا اور اس قسم کی ادبی تحریروں میں فنکار کی دروں بینی اور موضوع سے متعلق گہری بصیرت کا اشاریہ ملے گا۔ مثلاً قاضی عبدالستار کا ناول "دارا شکوہ" ناول نگار کی گہری سیاسی اور تاریخی بصیرت کا غماز ہے۔ اس ناول میں اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش کی جو داستان بیان کی گئی ہے اس سے قاری کے ذہن ودماغ میں ایک مخصوص قسم کا سیاسی اور تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو مورخ نے بھی اپنے طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن مورخ کا انداز بیان کچھ اور ہی طرح کا ہے۔ وہ حقائق کی سطح پر واقعات کو منٖ وعن بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ واقعات کی داخلیت اور خارجیت اور اس کے کیف وکم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لفظوں کے حقیقی اور مجازی معنی سے بھی اس کو کوئی سروکار نہیں۔ جبکہ قاضی عبدالستار نے ناول "دارا شکوہ" میں لفظوں کا ہی کھیل کھیلا ہے۔ یہ ناول فکر وخیال اور لفظوں کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ناول نگار کا کمالِ فن اس کی طرز ادا ہی ہے۔ انداز بیان میں ایک زبردست شان وشوکت اور طمطراق رہنے کی وجہ سے سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ اس ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے!

"دریائے شفق میں غسل کرتے آفتاب نے جب ستاروں کی زبانی ساموگڈھ کے میدان میں برپا ہونے والی قیامت کی خبر سنی تو ننگے بدن آسمان پر نکل پڑا۔ ساری دنیا اس کے جاں سوز حسن سے بلبلا اٹھی۔ فلک بارگاہ سے دو میل آگے دارا شکوہ کا لشکر کھڑا تھا۔ سب سے آگے توپوں کا ذخیرہ تھا جو پچاس پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اور موٹی موٹی آہنی زنجیروں میں ایک دوسرے سے اس طرح بندھا تھا کہ درمیان سے سواروں کا گزرنا ممکن نہ تھا۔ پیتل کی موٹی موٹی نالیں دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان کے پیچھے بارود اور گولوں کے انبار تھے۔ دو دو میل پر خچر یا گھوڑے اور ہاتھی اپنی اپنی توپوں کے پیچھے کھڑے تھے اور توپچی مستعد تھے۔۔۔ راؤ چھتر سال اور اس کے ساتھی اس بے جگری سے تلواروں پر گر رہے تھے جیسے دولہا، سالیوں کے ہاتھ چوتھی کی مار کھاتا ہے۔ پھر راؤ نے کڑک کر پڑھا

"ہمار نیام بجلی کا آشیانہ ہے رگردش ایام ہمارے گھوڑے کی چال ہے ریم راج ہمارا دوت ہے۔ راور پر لئے ہمارے دھاوے کا خطاب ہے"

دیکھا آپ نے ناول نگار نے میدان جنگ کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ آس پاس جنگی قطاریں کھڑی ہیں اور آمادۂ جنگ ہیں۔ زیر نظر اقتباس کو ذرا غور سے پڑھئے تو آپ کو تشبیہات واستعارات اور رمز وکنایہ کی فراوانی کا احساس ہوگا۔ بالخصوص یہ جملہ تو زبان کے تخلیقی استعمال اور اس کے تخلیقی ڈکشن کا ایک عمدہ نمونہ ہے :-

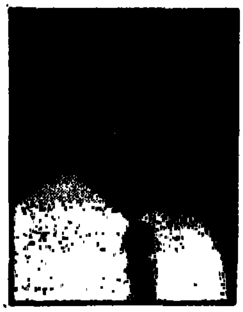
"راؤ چھتر سال اور اس کے ساتھی اس بے جگری سے تلواروں پر گر رہے تھے جیسے دولہا، سالیوں کے ہاتھ چوتھی کی مار کھاتا ہے"

یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک ادبی تحریر کو غیر ادبی تحریر سے ممیز وممتاز کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ادبی تحریروں کی صحیح شناخت اس کی تخلیقی زبان ہی سے ہوتی ہے۔ بڑا فنکار وہی ہوتا ہے جس کے یہاں ترسیل کی بے پناہ صلاحیت ہو اور اس صلاحیت کے لئے فنکار کو زبان وبیان کی کڑی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ فن اور فنکار کی انفرادیت کی شناخت اس کے فنی نمونوں کے وسیلے ہی سے ہوتی ہے۔ اس لئے شعر وادب میں ایک منفرد تخلیقی زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر کسی بھی فنکار کا فن ادبی دائرے میں داخل نہیں ہوتا۔

● CITY COURT NEAR UMAPETROL PUMP, PATNA - 800007 (BIHAR)

کیا ادب میں پوری سچائی ہوتی ہے ؟

نظر بریلوی



کچھ ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے (مطبوعہ جون ۲۰۰۰ء) کے حوالے سے۔

سچائی، لفظی سچائی، تخلیقی سچائی، خیالی سچائی، ساعتوں کی سچائی، مرئی غیر مرئی سچائی، واقعاتی غیر واقعاتی سچائی، ادبی غیر ادبی سچائی، ہماری آپکی سچائی، سچائیاں بے شمار خانوں میں بٹ جانے کے باوجود اپنی اکائی برقرار رکھتی ہیں اور وقت آنے پر پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ اس وقت ہم نئی سچائی اور پرانی سچائی کو الگ الگ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح لاٹھی مارنے سے پانی الگ نہیں ہوتا، سچائیاں بھی مختلف خانوں میں بٹنے سے علیحدہ نہیں ہوتیں۔ مگر ہم اپنی سہولت کے لئے ایسا ضرور کرلیتے ہیں کہ ہم اشرف المخلوق ہیں اور ہمیں اس کا حق بھی ہے۔ لیکن کیا ادب میں پوری پوری سچائی ہوتی ہے ؟ کیا لفظوں میں پوری سچائیاں پیش کی جاسکتی ہیں ؟ کیا الفاظ سچائیوں کا بار اٹھاسکتے ہیں ؟ ادب میں کتنے فی صد سچائی ہوتی ہے ؟ اور کیا یہ ایک سطح پر برقرار بھی رہتی ہے ؟۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ادبی سچائیاں ہمیشہ اپنی سطح تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ آج کا خیال کل سچ بن سکتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔ ہمارا معاشرہ ہماری تہذیب ہمارا ماحول اور ہماری مجبوریوں سے ہمیں کتنے فی صد سچائی پیش کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم (ادیب) اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی سچائیوں کو سمیٹنے میں خود کو کتنا اہل پاتے ہیں۔ خود کو کتنے فی صد بغاوت پر آمادہ کرسکتے ہیں۔ کتنے فی صد خود کو منٹو یا عصمت چغتائی ثابت کرتے ہیں۔ کتنے فی صد سچائی کے پارکھی ہیں۔ کتنے فی صد سچائی پیش کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ یہ بھی سچائی ہے کہ ہر خیال دوسرے خیال کو جنم دیتا ہے۔ ہر پل اپنے اندر کی سچائیاں اگلنے میں معروف ہے، ہر سچائی آنے والی سچائیوں کے لئے راستوں سے خس وخاشاک صاف کرتی رہتی ہے۔ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ ہر سچائی جاذبِ نظر بھی ہو۔ کبھی سچائی ایسی حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہوتی ہے کہ شاہد دنیا و مافیہا سے بے خبر مشاہدے میں غرق ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی سچائی اتنے بھیانک روپ میں آتی ہے کہ سچائیوں کے نقیب یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں۔

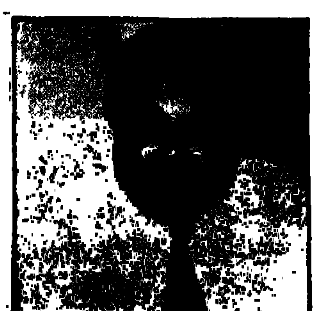
اگر ہم سچائی کو جسم تصور کریں تو اسے پیش کرنے کے لئے لباس بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی ہر زمانے میں لوگ لباس کو جسم پر فوقیت دیتے آئے ہیں اور لباس میں سے کتنے فی صد سچائی جھلکتی ہے یہ اہلِ نظر خوب سمجھتے ہیں۔ بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ بادشاہِ وقت نے ایک نجومی سے اپنے خوبصورت دانتوں کی عمر دریافت کی، نجومی نے کہا بادشاہ سلامت آپ کے دانت آپ کی موت سے پہلے گر جائیں گے۔ بادشاہ سلامت کو یہ سچائی گوارا نہ ہوئی لہٰذا نجومی مجرم قرار پایا اور قتل کردیا گیا۔ بادشاہ ایک دوسرے نجومی کو بلا کر وہی سوال دہراتا ہے۔ دوسرا نجومی، جو سچائی پیش کرنے کے فن سے واقف تھا کہا کہ بادشاہ سلامت کی عمر دراز ہو، خدا آپکا سایہ سروں پہ تادیر قائم رکھے۔ آپ کی عمر گراں ان خوبصورت دانتوں کی عمر سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ نجومی ایک کڑوی سچائی کو شہد میں گھول کر پیش کرتا ہے اور انعام واکرام کا حقدار ٹھہرتا ہے، وہ بھی سچائی تھی جو پہلے نجومی نے پیش کی تھی یہ بھی سچائی ہے جو دوسرے نے کہی۔ لیکن ان دو سچائیوں کی پیش کش میں زمین و آسمان کا فرق ہے، تسلیم وانکار کا فرق ہے۔ انعام وسزا کا فرق ہے۔ زندگی اور موت کا فرق ہے۔

مشاہدہ یہی ہے کہ ہم برہنہ سچائیوں سے کترا کر گزر جاتے ہیں یا خوبصورت جامہ تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں اور سچائی پیش کرنے کا وقت ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، دیر سے پیش کی جانے والی سچائی پوری طرح متاثر کرنے سے قاصر رہتی ہے، چاہے وہ واقعاتی سچائی ہو، ادبی سچائی ہو، یا تخلیقی سچائی۔

● P.O. BOX No. 9046, M.A.B. AHMADI, 61004, KUWAIT - (A.G.)

عالمی سطح پر اردوزبان کے لئے کیا ہو ؟

جاوید زیدی



"جرعات" (شمارہ جون ۲۰۰۰ء) قابل ستائش ہے۔ جس نسل کی فرمائش آپ فرمارہے ہیں، اس کے لئے خطۂ زمین کا انتخاب مشکل ہوگا ؟ پاکستان جس کی قومی زبان اردو ہے، پچھلے ۵۳ برس میں ایسا نہ کرپایا۔ ہندوستان، جہاں اردو کا بیمانہ قتل قابل دید ہے۔ یا لندن و امریکہ ؟ دعا دیجئے غریب شاعر و ادیب و فنکار کو اور ہندوستان کی فلم انڈسٹری کو کہ غزل اور اردو زندہ و پائندہ تھے، ان کے ذاتی مفادات نے اس مظلوم زبان کو سنبھال رکھا ہے، کشمیر سے کنیا کماری تک اردو خواب ہے۔ جو دفتری زبان کی حیثیت سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوپائے گا۔ آیئے، احمقوں کی جنت سے نکل کر شدادی کی سرزمین پر کہ جہاں آپ اور ہم دونوں رہتے ہیں۔ جہاں انگریزی پڑھنے لکھنے والے یہ کالے انگریز، حکومت کی باگ ڈور اور سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جہاں سول سروس اکیڈمی اور ملٹری اکیڈمی میں چھری اور کانٹے سے بسکٹ کی تقسیم اور "عوام الناس سے نمٹنے کے گُر" سکھائے جاتے ہیں۔ جہاں سرحدوں

کے دونوں جانب، نفرتوں کو یوں بڑھاوا دیا جاتا ہے، تاکہ سیاسی دکانیں چمکیں اور ملٹری بجٹ کا جواز پیش کیا جاسکے۔ جہاں روٹی کپڑا مکان کو غریب کیلئے مہیا کرنا وقت طلب ہے، البتہ جوہری توانائی اسرائیل وچین کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ جہاں فراق وجوش کی غزلوں رباعیوں میں پرچون کی پڑیاں بنتی ہیں اور انہیں " گیان پیٹ" اور " تمغۂ امتیاز " سے یوں نوازا جاتا ہے کہ حکومت اپنا اصل چہرہ چھپا سکے، اس لئے نہیں کہ فراق غزل یا جوش نظم کے عظیم سپوت تھے ؟ افتخار بھائی، آپ کے جذبے کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ لیکن برصغیر کے ناسور کی تلخ حقیقتوں کو کیا فراموش کیا جاسکتا ہے ؟ تہذیبیں اور زبانیں، ارتقائی تبدیلیوں کی محتاج ہیں۔ انہیں ڈنڈا مار کر یا تحریک کے ذریعے سب کے سر پر سوار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غزل، شاعری، ادب، ڈرامہ، مجالس، میلاد، مظاہرے، انقلابات جب تک اس دنیا کی ضرورت ہیں، دنیا اسے اپنے ساتھ لئے چلے گی۔ لیکن ارتقائی میلہ میں اگر کہیں اس کا ہاتھ چھوٹ گیا تو ہماری زبان وتہذیب ہی کیا ہے۔ دنیا کی عظیم تہذیبیں وزبانیں، خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ ارتقائی تبدیلی دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔ اسے جھٹلانا ممکن نہیں ؟؟؟

آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں نے اردو ادب کی اور غزل کی مٹھی بھر کاوش جو کی ہے اس میں ہمارے تمام مفادات کے ساتھ ارتقا کا پہیہ بھی حرکت میں برکت اور زندگی کے مترادف ہے۔ یوں بھی اقوام عالم ایک ایسے عالمی گاؤں کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں مختلف تہذیبیں اور زبانیں پنپ رہی ہیں۔ سب کا اپنی اپنی جگہ ایک ارتقائی رول ہے۔ جو زبانیں دھرتی کے سینے سے چمٹی رہیں اور جنہوں نے اپنے وقت کی سچی عکاسی پوری صداقت وایمان کے ساتھ کی۔ وہ تہذیبیں وزبانیں، دنیائے ادب میں آج بھی زندہ ہیں۔ گو کہ حقیقتاً ان کا وہ رول ختم ہو چکا ہے، جو اور پچھلے سات سو برس سے آج تک بھی بخوبی انجام دے رہی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنی پیاری زبان اردو کو کس طرح اس عالمی گاؤں کے منظر پر قاری کے دلوں میں اتار سکتے ہیں ؟ شیکسپیئر گلی گلی یوں پہنچا کہ حکومت کے ساتھ اس کی زبان اور ترجے بھی عوام وخاص کے دلوں تک پہنچے۔ حکومت نہ سہی، تحریک نہ سہی، لیکن آج بھی ہم زبان کے سہارے لوگوں کے دلوں کو چھو سکتے ہیں۔ اپنے قلم کے ذریعے اپنی تخیل کی بلندی کے ذریعے، اپنی اشاعت وتشریح وابلاغ کے ذریعے۔ وسعت قلبی وصداقت نظر کے ساتھ خیالات قلم بند کیجئے۔ آپ کو بھی اس عالمی گاؤں میں مٹھی بھر جگہ ملے گی جس طرح عمر خیام، خلیل جبران وحافظ دنیا کے کونے کونے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے وہ ہمیں بھی کرنا ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے بھائی کہ ہم بھی، تندہی سے نظیر وانیس، میر وغالب، فراق وجوش، فیض وفراز کے ترجے اس درجہ عمدگی وتزئین کے ساتھ کریں اور عالمی گاؤں میں جوق در جوق پھیلائیں کہ "اردو" سے دنیا فیضیاب ہو، جس طرح ہم ہو رہے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ اردو ترجے کا کام اعلیٰ پیمانے پر مسلسل اساتذہ سے نئے قلمکاروں تک کیا جائے اور اسے پھیلایا جائے۔

افتخار بھائی، آپ سے بہتر یہ بات کون جان سکے گا کہ آپ خود اپنی جگہ ایک مجسم تحریک ہیں۔ غزل ہو کہ اردو، وہ اپنی MERIT پر پنپ سکتی ہے اور اسے پنپنا چاہیئے اور ماشاءاللہ پنپ رہی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں نروس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس پر بقول آپ کے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت دو بڑے TRGETS ہیں۔

۱- ہماری نسل کے بعد اردو زبان کی نئی نسل تک منتقلی۔ " AS IT IS " یا تراجم کے ذریعے۔ ۲- اردو زبان کو اس قابل بنانا کہ وہ ارتقائی تبدیلی کا جھٹکا کھا کر زمانے کی روش کے ساتھ چل سکے۔ رسم الخط اور مواد (CONTENTS) اہم ہیں۔ لیکن مواد (CONTENTS) بہر حال زیادہ اہم ہے۔ لیبل نہیں پروڈکٹ کو اہمیت دینی ہوگی۔ ۳- ترجے: انگریزی خصوصاً، ہندی اور دیگر زبانوں میں یا ان زبانوں میں جو ہماری نئی نسل ذوق وشوق یا مجبوری کے تحت پڑھ رہی ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ابھی تک بھی ایسے لوگ زندہ ہیں جو اردو اور انگریزی مزاج سے واقف ہیں اور CONTENTS کو منتقل کر سکتے ہیں۔

● 15719, RED SPRINGS, HOUSTON, TX. 77082 (USA)

بقیہ : صفہ ۱۷ فیمنسٹ تحریک ، ایسی بلندی ایسی پستی

انگریزی زبان پر مہارت کا دعویٰ کرنے والے غیر انگریزی داں اس حقیقت سے آگاہی نہیں فراہم کرتے ہیں کہ سترہویں صدی کے معروف انگریزی لکھاریوں نے بھی اس رجحان کو محسوس کیا تھا۔ شیکسپیئر کا ڈرامہ ٹیمپسٹ پڑھیئے تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج کے گلوبل کلچر میں سانس لے رہا ہے۔ اس میں اوائل سترہویں صدی کی ابھرتی ہوئی نو آبادیت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں پراس پرو (PROSPERO) اپنے علم کے ذریعہ جزیرے کو نو آبادیائے جانے اور اسے تہذیب سے آشنا کرانے کے عمل کا جواز پیش کرتا ہے گویا وہ یوروپی انا اور طاقت کی علامت ہے جبکہ کردار کالیبن (CALIBAN) نو آبادیت کا غلام ہے۔ اسے نئی ترقی یافتہ زبان سکھائی جاتی ہے اور اس طرح وہ یعنی اس کا طبقہ مقامی زبان سے محروم ہو جاتا ہے۔ سترہویں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انگریزی متون کی فہرست میں ایسے بھی تخلیقی متون کم نہیں ہیں جنہوں نے نو آبادیانے والوں اور نو آبادیائے جانے والوں کے مابین تضادات کو پیش کیا ہے۔ (دیکھئے پیٹر وڈوسن PETER WIDDOWSON کی کتاب "لٹریچر" راؤٹلیج لندن ۱۹۹۹ء)۔ اس مجموعی تناظر میں دیکھئے تو فیمنزم اور مارکسزم کے درمیان ناخوشگوار تعلقات سے (UNAPPT MARRIAGE) کا اہتمام جس طرح ایک زمانے میں امر لازم تھا اسی طرح ۱۹۹۱ء کے بعد اس بندھن کا ٹوٹنا بھی برحق تھا سو وہ ٹوٹ گیا اور اصول پسند مارکسی دانشوروں کے اختلاف اور ان منفی نتائج کی جس کی وہ نشاندہی کر چکے تھے سند بھی ثابت ہوا۔ (نکولس ڈرکس، NICHOLAS DIRKS "کالونیلزم اینڈ کلچر۔ اَن آربر ۱۹۹۲ء)۔ ☆☆

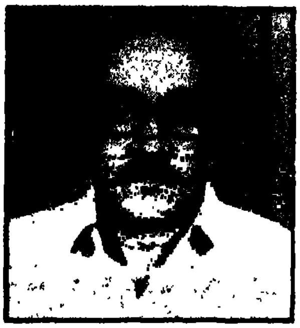
بہ خطِ شاعر



رسوکن بائی کی نذر

لی علمت دربدر، راگ خنجر در گلو
سُر تھے تال کا دامن پکڑ کر سو گئے
ن اس عالم میں سنتا، نغمۂ خونِ رواں
م کے قدموں پہ کٹ کر صبح کا مازوگرا
دیرا کا جسم مجہول
انت محفل وہاں پر نشہ کا پیرا
اج و بازار کے بوسہ رفاقت لوٹ کرائی شب
وہ بلمپت کہ درت ہو شب کے مقتل کی فغاں
بانوا کی سوح آ کر وہ ہوا کے پوچھنے کو چل پڑی
لس سمے کا راگ تھا کون ہو
لن دھنوں میں غم کی کھوٹ ہو
کس کوں کا پاؤں گھلاؤں ہو
کس کتھا میں جا چھپوں
کون آہوں کی تپک سے، بجلیوں کے سوز سے
دکھتا ہے اب، اجلا ہا دیجے
تعاملوں کا پیچ تھم کیلئے ساز بیچے ہوا بھی،

حسن نعیم



باقر مہدی

یادِ رفتگاں
(مشہور شاعر اور دوست حسن نعیم کو یاد کیا!)

اور بھی مہرباں رہے تھے مگر
یاد تیری ستا رہی ہے مجھے
جس نے تیرا "عروج" دیکھا تھا
نامور شاعروں کی محفل تھی
فیض، سردار — تیرے گھر آئے
میں بھی گوشے میں چپ سا بیٹھا تھا
شاعری اور شراب کی گردش
جیسے تاروں کی جگمگاہٹ تھی
اور تو (کرشن نور کی مانند)
اپنی غزلیں انہیں سناتا تھا
آج تک یاد ہے مجھے وہ رات!

④

اور پھر پھر — تو کہاں کہاں نہ گیا
کتنا خوش حال وہ زمانہ تھا
جب بھی بمبئی سے دلی آیا
سارے "احباب" جمع ہوتے تھے
تیرے "اشعار" سننے بیٹھے

③

میں ہی تنہا وہ شخص تھا لیکن
جس نے تیرا زوال دیکھا تھا
کتنا خاموش اور بے کس تھا
بس انا (EGO) کا ہی اک سہارا تھا
وہ بھی کیا کام آ سکی تیرے؟
کاش اتنا سمجھ گیا ہوتا
سارے ہنگامے اک ڈرامہ ہیں
انتہا جس کی اک تباہی ہے
زندگی تیری آدھوری تھی
المیہ جو بنا نہ سکا!
میں ترا شعر پڑھتا رہتا ہوں
"میں چلا جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزمِ یاراں میں تیا سا تنہا کا بیٹھا"

● E-1, RAVI DARSHAN OFF CATER ROAD
BANDARA (W) MUMBAI - 400050.

خطِ شاعر میں اردو کے معتبر غزل گو حسن نعیم [پ: ۶؍ جنوری ۱۹۲۷ء – م: ۲۲؍ فروری ۱۹۹۱ء] کی یہ نظم باقر مہدی صاحب نے شاعر کے لئے دی ہے۔ بقول باقر صاحب یہ نظم غیر مطبوعہ ہے اور ان کے کاغذات میں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے حسن نعیم مرحوم کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ [ادارہ]

ریاض صدیقی
261/C/11, C.AREA, TARIQ ROAD,
P.E.CH. KARACHI (PAK)

فیمنسٹ تحریک، ایسی بلندی ایسی پستی!



فیمنسٹ رجحان کی ابتداء ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ امریکہ و برطانیہ میں ہوئی تھی۔ مختلف مرحلوں سے گذرتی ہوئی وہ بیسویں صدی میں ایک ہمہ گیر تحریک بن گئی۔ ساٹھ کی دہائی میں اسی تحریک کے بطن خواتین کی آزادی کی تحریک نے جنم لیا۔ ۱۹۹۶ء تک اس تحریک نے اپنی ایک سو چھیالیس برس کی عمر پوری کرلی تھی۔ ادبی و فکری تحریکات کی تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ کام کرنے والی یہ واحد تحریک تھی۔ دوسری طرف یہ واحد ادبی و فکری تحریک بھی ثابت ہوئی جس نے ۱۹۹۶ء میں اپنے خاتمے اور اپنی ناکامی کا بھی اعلان کیا اور یہ اعتراف بھی کہ وہ اپنے بنیادی مقاصد کو پورا کرنے میں سپھل نہیں ہوئی۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو برسوں کی جدوجہد کے بعد فیمنسٹ مکتبہ فکر کے کرتا دھرتاؤں کو یہ احساس ہوا کہ خود کو مردوں سے الگ کرکے خود مختار بنیاد پر تحریک چلانے کے نتائج مایوس کن ثابت ہوئے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مردوں کو فیمنسٹ تحریک سے الگ رکھنے کے باوجود ایسے مردوں کا فقدان نہیں تھا جو فیمنسٹوں کی معقول مانگوں کو حق بہ جانب سمجھتے تھے بلکہ عملاً ان کے لئے اپنا کردار بھی ادا کیا تھا۔ اردو فکر و نظر کی قلم رو میں گو کہ فیمنسٹ تحریک ان معنوں میں کبھی نہیں رہی جن معنوں میں وہ امریکہ اور یورپی ملکوں میں مقبول ہوئی پھر بھی اردو کی فکری تاریخ میں عورتوں کے جائز حقوق، ان کے مسائل اور ان کی جینوین مجبوریوں کو سب سے پہلے موضوع بنانے والے مرد لکھاری ہی تھے۔ سر سید نے یقیناً عورتوں کی تعلیم سے اختلاف کیا تھا مگر حالؔی اور استاد سیماب اکبر آبادی ان کی تعلیم کے حامی تھے۔ نذیر احمد نے خاندانوں میں رائج جاہلانہ اور ظالمانہ رویوں پر تنقید کی۔ اردو کی پہلی اعلیٰ ترین فیمنسٹ ناول امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا رسوا تھے جنہوں نے گناہ آلودہ ماحول میں زندگی کرنے والی عورت کی بے بسی اور مجبوری کو محسوس کیا اور اس عورت کے اندر جو نیک شریف اور پاک عورت چھپی ہوئی تھی اس کو بے نقاب کیا۔ امراؤ جان ادا خود طوائف نہیں بنی تھی اسے مرد مسلط سماج کے ظلم نے طوائف بن جانے پر مجبور کردیا تھا۔ اسے شدت کے ساتھ یہ احساس بھی ہوا کہ طوائف بن جانے کے بعد اگر وہ عورت اپنے ماضی کی شریفانہ زندگی کی طرف لوٹنا بھی چاہے تو سماج اسے قبول نہیں کرتا ہے۔ مرزا رسوا کی امراؤ جان ایک آفاقی کردار بھی ہے کیونکہ ترقی یافتہ و مہذب دور کے جدید تناظر میں بھی عورت کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے جس کی تازہ مثال امریکی صدر کلنٹن نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ خواتین کے مسائل پر اردو میں پہلی جامع کتاب نیاز فتح پوری نے لکھی تھی۔ فیمنسٹ مکتبہ فکر ناکام کیوں ہوئی اور اسے اپنے خاتمہ کا اعلان کیوں کرنا پڑا؟ اس پر اظہار رائے سے پہلے اس مکتبہ فکر کے بعض مراحل اور اس کے انداز نظر کا احاطہ کرنا مفید ہوگا۔ پچاس کی دہائی میں عالمی فیمنسٹ تحریک کی اکائی ٹوٹ گئی تھی اور اس ٹوٹ پھوٹ کے بطن سے بہت سے متضاد اور مختلف نقطہ ہائے نظر نے جنم لیا تھا۔ اس کثرتیت (PLURALISM) کے رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ محنت کش اور متوسط طبقے کی خواتین پس منظر میں چلی گئیں اور تحریک پر شہری اشرافیہ (ایلٹ) کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے طریقۂ کار میں ریاکاری اور مکاری دراصل وہ کیل ہوتی ہے جس پر لٹو ناچتا ہے اسی لئے وہ کنفیوژن کو بڑھاوا دینے اور اختلافات کو ہوا دے کر کثرتیت پیدا کرنے پر ماہرانہ عبور رکھتی ہے۔ فکر و نظر کی اکائیت کو توڑنا اس میں شاخیں اور شاخچے پیدا کرنا اور ان کے تانے بانے میں عوام و متوسط طبقے کی اکثریت کے کردار کو غیر موثر بنانا ہی اسکے مفادات کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے۔ ان دو صدیوں کے دوران جو گذر چکی ہیں ایسے نظریات پیدا ہوئے جو اپنی اکائی میں مکمل تھے مگر وقت گذرنے کے بعد ان کی اکائی ٹوٹ گئی اور وہ شاخوں اور شاخچوں میں تقسیم ہوگئے۔ فیمنسٹ تحریک اس ٹوٹ پھوٹ سے کس طرح بچ سکتی تھی۔ اس نے رائج سرمایہ دارانہ نظام کے نبرد آزمائی کے نتیجے میں کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں لیکن کامیابیوں کے مقابلے کہیں زیادہ فائدہ سرمایہ دارانہ نظام کے کھاتے میں منتقل کردیا۔ اس نظام نے کل آبادی میں آدھی سے زیادہ عورتوں کو جنہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنالی تھی تمام انقلابی اور مزاحمتی قوتوں سے کاٹ کر الگ کردیا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں اپنے خاتمے سے پہلے فیمنسٹ تحریک ایک درجن دھڑوں میں بٹ چکی تھی اور ان کے مابین فکری اختلافات کی ریکھائیں بن گئی تھیں۔ ان دھڑوں میں زیادہ متحرک اور فعال امریکہ کے افریقی شہریوں کا تھا جو نسلی امتیاز کے فاتح اور انسانی حقوق کے حصول کے لئے جنگ کر رہا تھا۔ سفید فام اور سیاہ فام فیمنسٹوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کا ہمیشہ ہی فقدان رہا۔ انسان دوستی کی بنیاد پر جن سفید فام فیمنسٹ دانشوروں اور کارکنوں نے سیاہ فام فیمنسٹوں کی حمایت کی تھی وہ بھی خود کو نسلی امتیاز کے شعور سے پوری طرح الگ نہیں کرسکیں۔ امتیاز کا یہ شعور سفید فام نسل کے مزاج کا حصہ ہے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں امریکہ اور برطانیہ کی فکری قلم رو پر کلچر کی لڑائی کا رجحان وارد ہوا (اینٹونی ایس تھاپ ANTONY EASTHOPE "لٹریری ان کلچرل اسٹڈیز" مطبوعہ راوٹلیج لندن ۱۹۹۱ء) شعری و ادبی مطالعے اب کلچر کے تناظر میں کئے جانے لگے جس کے نتیجے میں رائج سکہ بند تنقیدی نظریات اور ان سے اطلاقی طریقۂ کار کی نفی کا رجحان بڑھ گیا۔ اسی رجحان نے حکمراں امریکی و برطانوی قوتوں کو ایک اور موثر ہتھیار کلچرل سامراجیت فراہم کردیا جو نوآبادیاتی نظام کی شکست وریخت کے بعد کند پڑ گیا تھا۔ امریکی حکمرانوں اور ان کے حامی نظریہ سازوں نے اس کند ہتھیار پر دھار رکھی اور اسے پہلے سے بھی زیادہ تیر بہدف بنادیا۔ اپنی شہرہ آفاق کتاب "کلچر اینڈ امپیریلزم" (مطبوعہ ۱۹۹۳ء) میں ایڈورڈ سعید نے اس موضوع کا تجزیاتی مطالعہ قوم پرستانہ نقطہ نظر سے تیسری دنیا کے تناظر میں کیا تھا۔ (اس کتاب کا اردو ترجمہ گو کہ پہلی فرصت میں کیا جانا چاہئے تھا مگر کیا نہیں گیا)۔ اسی زمانے میں فیمنسٹوں نے ایک پانچ حرفی (ACRONYM) اصطلاح DWEMS یعنی مرے ہوئے سفید فام مرد (DEAD WHITE EUROPEAN MALES) وضع کی تھی اور نعرہ لگایا تھا کہ شعر و ادب اور تاریخ و ثقافت گھیراؤ میں ہے یعنی شعر و ادب اور تاریخ و ثقافت پر ہمیشہ ہی مرد طبقے کا تسلط رہا ہے۔ تاریخ نویسی، تحقیق اور تعلیم پر ان ہی کی حکمرانی ہے۔ انہوں نے ہر عہد میں پیدا ہونے والی خواتین لکھاریوں اور دانشوروں کو نظرانداز کیا ہے اور جن دو چار کو انہوں نے موضوع بنایا بھی ہے ان کا تجزیہ بھی مردانہ نقطہ سے کیا ہے اور ان کو کم تر درجہ دیا ہے۔ DEWM کے مطابق مردوں نے جو کہ (HETROSEXUAL) تھے عورتوں کا مطالعہ ایک ایسے وجود یا معروض کی صورت میں کیا ہے جو صرف مردوں کو آسودگی اور لطف فراہم کرنے کا وسیلہ ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم جنسیت کا رجحان رکھنے والے مرد لکھاری عورتوں کے لئے زیادہ محترم ہیں کہ وہ عورتوں کو موضوع نہیں بناتے تھے۔ خواتین اہل الرائے کی یہ شکایت غلط بھی نہیں ہے مثلاً اردو شعر و اب ہی کی تاریخ کو لیجئے۔ اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے پہلے آدھ تک سینکڑوں خواتین اہل نظر موجود تھیں مگر تذکرہ نویسوں، ادبی مورخوں اور نقادوں نے ان کا ذکر تک نہیں کیا کوئی ایسی مستند تاریخ مرتب نہیں کی گئی جو گمنام خواتین کو یکجا کرتی ہو۔ تحقیق کرنے والوں نے بھی اس موضوع کو منہ نہیں لگایا۔ خواتین اردو لکھاریوں نے بھی مغربی خواتین کی طرح ایسی اینتھالوجی مرتب نہیں کی۔ معلوم نہیں ہماری یونیورسٹیوں میں قائم خواتین مطالعات کے شعبے کرتے کیا ہیں۔ ان کی کارکردگی سے اگر کچھ اندازہ ہوتا ہے تو یہ کہ وہ مغرب ہی کے افکار و نظریات اور ان کے پروگراموں کو ایک ایسے خواتین سماج میں پرچار کر رہی ہیں جہاں اسی فی صد خواتین ناخواندہ اور پسماندہ ہیں یہ شعبے اپنے کام کو انگریزی زبان میں ہی پیش کرتے ہیں ان کے مخاطب اور پڑھنے والے یا تو حکمراں اور امرا و شرفا کے حلقے ہیں یا پھر وہ دانشور جن کو انگریزی پر مہارت ہے۔

مغرب کے دانشور تجزیہ نگاروں کا یہ موقف یقیناً وزنی ہے کہ فیمنسٹ تحریک ساٹھ کی دہائی کے بعد ساخت شکن (DECONSTRUCTION) کے رجحان سے جڑ گئی اور اس پر سیاست کاری (POLITICIZATION) حاوی ہوگئی شہرہ آفاق ساخت شکن جیکوئیس لاکان کا موقف ہے کہ جنس کی پہچان کے تعین میں زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ علامتی نظام (ORDER) پر مرد کا ہی سکہ چلتا ہے۔ اسی زمانے میں فیمنزم پر نو فرائیڈی مکتبۂ فکر بھی اثر انداز ہوا جس کے نتیجے میں جنسی سیاست کو بڑھاوا ملا (بیٹی فریڈن، دی فیمنسٹ مس ٹک، نیویارک ۱۹۶۳ء) اور اس قبیل کی لکھاریوں نے جنسی معاملات میں مردوں کا اختیار اور عورتوں کے پراسرار خاموشی کو توڑا اور اپنی صنف کے جنسی تجربوں اور ان کی فطری خواہشات کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ ان تبدیلیوں کی باڑھ اور کاٹ کا اثر یہ ہوا کہ پسماندہ اور ترقی پذیر ساجوں سے تعلق رکھنے والی خواتین دانشوروں میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔ گلوریا انیزلدوا (GULDRIA ANZALDUA) نے لکھا کہ پسماندہ اور ترقی پذیر دنیا کی عورتیں دوہری نوآبادیت کا عذاب جھیل رہی ہیں اور پل صراط پر کھڑی ہوئی ہیں۔ شہرہ آفاق ہندستانی دانشورہ گیاتری چکرورتی نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا "غلام عورتیں اظہار رائے کے جسارت کرسکتی ہیں؟ (CAN SUBALTERN) اس موضوع پر ٹن منہہ ہا (TINH-MINH-HA) اور چند تالپیڈے موہانٹی نے بھی بہت گراں قدر کام کیا ہے۔ (گلوریا" باڈر لینڈز " آنٹ لیوٹے بکس، سان فرانسسکو ۱۹۸۷ء گیاتری "تھری ومینز ٹیکسٹس اینڈ اے کرٹیکے آف امپیریلزم" گیٹس ایڈیشن، ۱۹۸۵ء اور "کین سبالٹرن اسپیک ۱۹۹۸ء ٹرنہہ منہہ ہا" وین نیٹو، متھیون لندن ۱۹۸۹ء اور موہانٹی "تھرڈ ورلڈ ومن اینڈ پالٹکس آف فیمنزم" انڈیانا یونیورسٹی پریس، بلومنگٹن ۱۹۹۱ء)

زیر نظر تناظر کے رد عمل میں مغرب کی فیمنسٹوں نے اپنی علیحدہ آزاد اور خود مختار دنیا بنالی جس میں مردوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی اس خود مختار دنیا میں انہوں نے تاریخ، شعر و ادب اور تنقید اور مباحثوں کا اتنا زیادہ گراں قدر سرمایہ مہیا کیا جو تاریخ کے پاس پہلے سے موجود سرمائے کے اگر برابر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے کتابوں رسالوں اور دستاویزات کی اشاعت سے لے کر تنظیم سازی، اداروں اور شعبوں کے قیام اور طباعت و اشاعت کے لئے خواتین پریس لگانے تک انہوں نے مردوں کو مات ضرور دی۔ ماضی کی غائب خواتین لکھاریوں کی تخلیقات اور خواتین کی ادبی روایت کو کھوج کر ان کو شعر و ادب اور فکر و نظر کی تاریخ سے جوڑ دیا۔ گمنام اعلیٰ تخلیقات کو مرتب کرنا اور ان تجزیاتی مطالعات کو قلم بند کرنا بھی ان ہی کا کارنامہ ہے۔ شیلا ربوتھم (SHEILA ROBOTAHM) نے "ہڈن فرام ہسٹری" جیسی کتاب لکھی (مطبوعہ پلوٹو پریس لندن ۱۹۷۳ء)۔ اس کتاب میں مصنفہ نے اس ظلم و ستم کی تاریخ کا بھی احاطہ کیا ہے جو تین سو برسوں تک عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا اور کسی نہ کسی صورت میں اب تک موجود

ہے۔ ۱۸۵۰ء میں اسی صورت حال کے خلاف ان دنوں کی خواتین نے مزاحمتی رجحان کو بڑھاوا دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت نے خواتین دانشوروں کو متحرک کر دیا اور انہوں نے اس موضوع پر تحقیق و تفتیش کے ذریعہ جتنا مواد اکھٹا کیا وہ کتابوں اور مقالات کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ایلن موئیرس (ELEN MOERS) کی کتاب "لٹریری ومن" (مطبوعہ گارڈن اسٹی اینکر پریس ۱۹۷۶ء)، ایلین شوالٹر (ELAINE SHOWALTER) کی "اے لٹریچر آف دیر اون" (مطبوعہ پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۷۷ء)، میری جیکوبس (MARY JACOBUS) کی "ومن رائٹنگ اینڈ رائٹنگ اباؤٹ ومن" (مطبوعہ کروم ہیلم لندن ۱۹۷۹ء) اور جیولیا کرسٹیوا (JULIA KRISTEVA) کی تنقیدی نظریہ خواتین (GYNOCRITICISM) جیسی کتابیں شائع ہوئیں۔ گائی نوکرٹسزم نے تنقیدی اصولوں اور طریقہ کار کا ایک پروگرام وضع کیا تاکہ اسی تناظر میں خواتین لکھاریوں کی تخلیقات اور تحریروں کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے تمام حسّی، جنسی، سماجی، اقتصادی اور خاندانی مسائل کا احاطہ کیا جاسکے۔ جنس کے حوالے سے عورتوں کے مابین جنسی تعلقات (LESBIANISM)، استقاط حمل اور مانع حمل ادویات اور طریقے بھی موضوع بنے اور لکھاریوں نے کھل کر ان موضوعات پر اظہار رائے کیا۔ جس ہمہ گیر تبدیلی کو مغرب کی ادبی تاریخ نے ۱۹۶۰ء کے جنسی انقلاب کا دھماکہ کہا ہے اس کے لئے فضا فیمنسٹ تحریک نے پیدا کی تھی۔ خواتین اہل الرائے نے مردوں میں ہم جنسیت کے رجحان کو بنیاد بنا کر عورتوں کے سماج میں پائے جانے والے اس رجحان کو حق بہ جانب قرار دیا اور ہر طرف لزبین تنظیمیں بنائی گئیں جنہوں نے حکمرانوں سے مانگ کی ان حقوق کو بھی آئینی تحفظ دیا جائے۔ استقاط حمل کے بارے میں خواتین کا موقف تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی خواتین مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں اور مرد اپنی ہوس کو پورا کرنے کے بعد عورتوں کو گابھن کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ مشرقی ملکوں کے مقابلے میں یہ مسائل مغربی ملکوں میں عام زندگی کا معمول بن گئے تھے اور اب بھی ہیں، مگر یہ خوش فہمی کہ مشرقی سماج میں یہ رجحانات نہیں تھے صحیح نہیں ہے۔ مشرقی خاندانوں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے تھے ابتداءً ان کو چھپا دیا جاتا تھا۔ طوائف بازی اور مجروں کا اہتمام امراؤشرفا کے طبقے میں رائج تھا اور اسے برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مغرب کی فیمنسٹ خواتین نے سوائے بائیں بازو کے مارکسی حلقوں کی خواتین استقاط حمل کے حق کو بھی آئینی تحفظ دینے کی مانگ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں سو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے یہ مانگیں بہت زیادہ منافع بخش بھی تھیں یہی وجہ ہے ان کی منظوری میں دیر نہیں لگی اور جنس منڈی کا بکاؤ مال بنالی گئی۔ کوئی بھی سماج جو سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے میں سانس لے رہا ہو اور اس کے خلاف مزاحمتی قوتیں بہت کمزور اور غیر موثر ہوں وہاں کے اہل الرائے کو اول الذکر رجحانات کو مان لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اس حوالے سے بھی غیر مارکسی خواتین دانشوروں نے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ درحقیقت رائج سرمایہ نظام ہی کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔

مارکسسٹ خواتین دانشوروں میں بھی جزوی اختلافات تھے اور ان کا ایک حلقہ جو اقلیت میں تھا انسانی حقوق کی فراہمی اور رائج نظام کی تبدیلی کا پرچارک تھا اور جنڈر اور نسل کے حوالوں سے مردوں اور عورتوں کی "الگ الگ" تحریکات کو اس دلیل کی بنا پر رد کرتا تھا کہ ان سے سرمایہ دارانہ نظام کی بین الاقوامی سامراجیت کو تقویت پہنچے گی اور وہ بنیادی مسائل مثلاً روٹی کپڑا مکان اور روزمرہ زندگی کے ہر شعبے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان حقیقی مساوات اپنی جگہ جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ بائیں بازو کے اصول پسند مارکسیوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ سماج میں طبقاتی تقسیم اعلیٰ مراعات یافتہ طبقے کی خواتین کو موقع فراہم کرے گی اور وہ نچلے اور متوسط طبقے کی خواتین کی صفوں میں گھس کر پوری تحریک کا رخ موڑ دیں گی۔ وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی آزادی اور آئینی حقوق کی ضمانتوں سے فائدہ اٹھا کر آزادئ حقوق جمہوریت ترقی اور تہذیبی آداب کو جواز بنا کر جنسی کرپشن بے راہ روی اور فحاشی کو بھی جدید تہذیب اور ترقی کا لباس پہنا دیں گی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد یہ سب کچھ ہوا اور دھڑلے سے ہوا حتیٰ کہ موجودہ اقتصادی بین الاقوامیت اور آزاد منڈی معیشت نے اسے دنیا کے ہر حصے میں عام کر دیا ہے جو فلموں، شوبزنس، حسن کے مقابلوں، مبتذل قسم کی تفریحات، فیشن کاری، ماڈلنگ، اشتہار سازی اور الکٹرانی میڈیا کے بین الاقوامی چینلز کے ذریعہ تیز رفتار طوفان کی طرح وارد ہوا ہے۔ اس چکاچوندھ میں عورتوں کے حقوق و مسائل کا معاملہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا ہے۔ خواتین عموماً دنیا کے ہر حصے میں اس جگہ آکھڑی ہوئی ہیں جس کے لئے فیضؔ نے کہا تھا۔

حرلفیاں شمع محفل کو سر بازار لے آئے　　　　کہ لیلائے وطن کے بیسوا ہونے کا وقت آیا

خود کو مارکسی کہنے والی خواتین کا دوسرا حلقہ جو فعال بھی تھا اور زیادہ پھیلاؤ رکھتا تھا اپنے ہی نظریئے کا نقاد بن گیا اور یہ دعویٰ کیا کہ مارکس نے اپنے جامع نظریاتی نظام میں عورتوں کی بڑی اکثریت کو موضوع نہیں بنایا۔

۱۹۶۰ء میں ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری اور اس کی معاونت کرنے والے سائنس و ٹیکنالوجی کے بطن سے مغرب کی جس نئی دنیا نے جنم لیا تھا اس کا کلائمیکس نوّے کی دہائی تھی جب اچانک ساری دنیا کا نقشہ بدلنا شروع ہوا اور نئی نو آبادیاتی سامراجیت نے بلاشرکت غیرے اپنی عالمی امپائر کو مسلط کر دیا اور دنیا بھر کے انسان دوست اور باشعور اہل الرائے کو اندازہ ہوا کہ زمین پیروں تلے سے کھسک چکی ہے اور اب مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا والی حالت ہے۔ دنیا کی سات یا آٹھ ارب آبادی پر صرف پانچ یا چھ سو کھرب پتی خاندانوں کی آمریت قائم ہو گئی۔ سرد جنگ نے چولا بدل کر نیا روپ دھار لیا اور ہر سو

ثقافتی، نسلی، فرقہ وارانہ اور علاقائی جنگیں عام ہو گئیں۔ اس اکھاڑے میں کیا عورتیں اور کیا مرد سب ہی پٹ گئے ان کی مقامی زبانیں ثقافتیں عقائد روایات اور ان کی پہچان سب ہی دیوار سے لگ گئیں۔ موجودہ دنیا مٹھی بھر دولت مند طبقے کی دنیا ہو گئی ہے جہاں نہ عورتوں اور نہ مردوں کے مسائل ہیں۔ اس وقت جب کہ صنعتی سرمایہ داری اور اس کی ٹیکنالوجی ترقی کی انتہا کو چھو رہی ہے امریکہ، برطانیہ اور یوروپی ملکوں کی پارلیمانوں، ان کے انتظامی اداروں، اقتصادی ومالیاتی اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں اعلیٰ وبااختیار خواتین کارکنوں اور حکام کی تعداد مردوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے خاندانی ڈھانچے پر بھی مردوں کا تسلط برقرار ہے مردوں اور عورتوں کے درمیان حقیقی مساوات کہیں نہیں ہے۔ سیاسی میدان میں بااختیار عہدوں پر جو تھوڑی بہت عورتیں دکھائی دیتی ہیں وہ مرد مسلط (MALE DOMINATED) نظام کے مفادات اور تقاضوں ہی کو پورا کرتی ہیں۔ کام کرنے کی جگہوں پر بھی مرد طبقہ ان کا پیچھا کرتا ہے اور انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ نچلی اور درمیانی سطح پر جو عورتیں خدمات انجام دینے کے لئے رکھی جاتی ہیں ان پر بھی بااختیار مرد حکام ہی کی گرفت ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام یقیناً نچلی اور درمیانی سطح پر زیادہ سے زیادہ عورتوں کو خدمات کا موقع فراہم کرتا مگر ان کی جسمانی اور جنسی کشش کو سیاسی اور کاروباری مفادات پورے کرنے کے لئے ہی استعمال کرتا ہے۔ وہ اشتہارات، میڈیا، ماڈلنگ اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے لئے خام مال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے کہ ملازمت اور کام حاصل کرنے کے لئے عورتوں کو کیسے کیسے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت اور آزادی نے ان ہی رجحانات کو جدید ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کا اعزاز بخشا ہے اور اس رجحان کو جواز فراہم کرنے کی ذمہ داری دولتمند طبقے کی ان فعال فیمنسٹوں نے پوری کی جو ساٹھ کی دہائی کے بعد فیمنسٹ دھارے میں آئی تھیں۔ کیرول ایہرش (CAROL EHRHICH) نے اپنے معروف مضمون "دی ان ہیپی میرج آف مارکسزم اینڈ فیمنزم" میں لکھا تھا کہ فیمنسٹ تحریک تیزی کے ساتھ ان دیکھی مگر غیر انقلابی رخ کی طرف مڑتی جارہی ہے اور وہ بورژوائی طبقے میں پہنچ گئی ہے۔ مغربی علاقوں میں کی یہ صورت حال صرف ان ہی ملکوں تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اب وہ افریقی اور ایشیائی ملکوں میں بھی اسی طرح کھیل کھیل رہی ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے حکمراں بیوروکریٹس، اور دولت مند طبقے اسی رجحان کو جدید ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کا معیار سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو ان رجحانات کی مزاحمت کرتے ہیں اور نہ مزاحمت کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں خواتین کی بہت بڑی ناخواندہ اور پسماندہ اکثریت اور نئے منظر نامے سے الگ اپنی اذیتوں اور مسائل کی آگ میں جل رہی ہے۔ عوام کی بڑی اکثریت کو اتنا موزوں اور غیر موثر بنادیا گیا ہے کہ ان میں جدوجہد کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے اور ان سے ان کی قیادت بھی چھین لی گئی ہے۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے انگریزی زبان سے کام لیا جارہا ہے کیونکہ پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں ۸۰ فی صد آبادی انگریزی نہیں جانتی ہے اس لئے ملک کے سیاسی انتظامی اقتصادی اور مالیاتی امور کی قلم رو میں اس کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اصول پسند مارکسی دانشوروں نے آزاد وخود مختار فیمنسٹ تحریک پر جو اعتراضات کئے تھے اور جن حتمی نتائج کو نشان زد کیا تھا تاریخ اسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئی اور ۱۹۹۳ء تک یہ تحریک اس طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی کہ بااختیار اور مقبول اہل الرائے نے اس کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ اس موضوع پر نوامی ولف (NAOMI WOLF) نے اپنی کتاب "فایئر ودھ فایئر" میں تفصیل سے بحث کی ہے (مطبوعہ شیتو اینڈ ونڈس، لندن ۱۹۹۳ء) مگر چونکہ وہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام ہی سے اتفاق رکھتی ہیں اس لئے انہوں نے خواتین کو اقتصادی طاقت حاصل کرنے کا درس دیا ہے اور تین بنیادی اصولوں کو جدوجہد کے لئے رہنما قرار دیا ہے اول سیاسی صورت حال کا بروقت استعمال دوم دولت کا حصول اور اس کی طاقت کا استعمال اور سوئم سیاسی فتح کی منزل تک پہنچ۔ جدوجہد کے لئے ان رہنما اصولوں میں ایک قباحت یہ ہے کہ اس میں صرف وہی خواتین حصہ دار بن سکیں گی جو بااثر پڑھی لکھی اور مراعات یافتہ طبقے کی تنظیمیں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ دراصل مقابلے کی دوڑ کے سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار عورتوں کا طبقہ پیدا کرنے کے حق میں ہیں۔ (یہ مطالعہ اس تفصیلی نظام کا تتمہ ہے جو ماہنامہ شاعر میں پہلے چھپ چکا ہے۔ زیر نظر مطالعے میں پچھلے مضمون کی تفصیلات کو دہرایا نہیں گیا ہے۔)

اس مجموعی تناظر میں دیکھئے تو ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ دارانہ نظام نے فیمنسٹ تحریک سے دو بنیادی کام لئے اول اس نے بائیں بازو کی فکری وحدت کو توڑ پھوڑ کر منتشر کردیا اور دوم وہ بین الاقوامی امپائر سازی کے جس ہدف کو پالینا چاہتا تھا اس کو پالیا تو اب اپنی مہان کامیابی اور بین الاقوامی آمریت کا ہدف حاصل کرلینے کے بعد فیمنسٹ تحریک کا مزید جاری رہنا اس کے حق میں نہیں رہا تھا۔ اس کا موجودہ بین الاقوامی نظام اور اس کا کلچر تاریخی، فکری، نظریاتی اور علمی وادبی شعور کو اپنی حاکمیت اور سالمیت کے لئے زہر قاتل سمجھتا ہے اسی لئے نئے عالمی نظام نے شعر وادب، تنقید و تاریخ اور ہیومنیٹیز (HUMANITIES) کی تعلیم پر بھی عرصۂ حیات تنگ کردیا ہے۔ اس نے نئی بین الاقوامی ترقی اور جدیدیت کے معیار کو متعین کرنے سے پہلے ہی پروپگنڈے کے ذریعہ علم وادب، انسان، نظریئے اور تاریخ کی موت کا اعلان کردیا تھا اور انگریزی زبان کو نئی نوآبادیت کی عالمی امپائر کا عضو لازم قرار دے کر پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کی زبانوں اور ثقافتوں کے کردار کو غیر موثر بنادیا۔ اس رجحان کو کوئی نیا رجحان بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ سترہویں صدی میں یوروپی ملکوں کی نوآبادیانے والی قوتوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے سامراجی کردار کو خوب بڑھاوا دیا تھا۔ [بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھئے]



شہریار

٭

تجھے کچھ یاد آتا ہے

میں تیرے جسم تک کن راستوں سے
ہو کے پہنچا تھا
زمیں آواز اور گندم کے خوشوں کی مہک میں
ساتھ لایا تھا
تجھے کچھ یاد آتا ہے

میں صبح سے اداس ہوں

ہوا کے درمیان آج رات کا پڑاؤ ہے
میں اپنے خواب کے چراغ کو جلا نہ پاؤں گا
یہ سوچ کے
بہت ہی بد حواس ہوں
میں صبح سے اداس ہوں

ایک نظم

کچھ لوگ تو ہوں جو سچ بولیں
یہ خواہش دل میں پھر آئی
ہے تیرا کرم اے تنہائی!

فرقہ پرستی

نیم پاگل لوگ
اس تعداد میں
کچھ اثر آئے مری فریاد میں

اس لئے خوفزدہ ہوں

شام کا ڈھلنا نئی بات نہیں
اس لئے خوفزدہ ہوں اتنا
آنے والی جو سحر ہے اس میں
رات شامل نہیں

● 4/81-A, KABIR COLONY, JAMALPUR, ALIGARH - 202002 (U.P.)

صفیق عالم
15-A TARAK DATTA ROAD,
CALCUTTA- 700019

دریاپار

میں اور بختاور ہوٹل کے اندر داخل ہوئے۔

"چھ تندوری روٹی، دو مٹن چانپ، سلاد اور جلدی۔" بختاور نے ہوٹل کے مالک سے کہا۔

ہم دونوں شوربہ سے مہکتی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں ایک کمزور بلب جل رہا تھا جس سے مکڑی کے جالے جیسی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ لڑکا پانی کے ڈرم سے پیٹھ لگائے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اسکا اکڑوں سایہ گیلے فرش کو بیچ سے کاٹتا ہوا دروازہ تک چلا گیا تھا۔

"اب ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔" بختاور نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"میں بہت دنوں سے اسکے پیچھے ہوں۔"

میں خاموش رہا۔

"وہ تمہیں پسند کرتی ہے اس لئے تم میرا یہ کام کر سکتے ہو" بختاور نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ ایک شریف لڑکی ہے۔"

"مگر تمہیں چاہتی ہے۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔ "مجھے ہر حال میں وہ چاہیئے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مگر میں یہ کام نہیں کر سکتا"۔

"ٹھیک ہے۔" بختاور نے کہا۔ "تو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا؟"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی شادی ہو چکی ہے۔ صرف اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔"

"تب تو اور بھی آسان ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "تم بھی کتنے معصوم ہو۔"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اس کے شوہر کو جانتا ہوں اس سے وہ مجھ سے ملتی ہے۔ لڑکیوں کو اپنے شوہروں کے بارے میں جاننے کی بہت چاہ ہوتی ہے۔"

"جو بھی ہو۔ تم اس کے لئے اہم آدمی ہو۔" اس نے کھانے کی چیزوں کو آتے دیکھ کر ایک دوسرا اینڈ کرہ چھیڑ دیا۔ "یاد رکھو، میں اچھے میکنک کی قدر کرتا ہوں۔" اس نے ہوٹل کے آدمی کو سنا کر کہا۔

مگر شاید اس نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ میز کی گندہ حالت دیکھ کر لڑکے پر برس پڑا۔

"حمدو، سور کے بچے!"

لڑکا اچھل کر اسٹول سے نیچے اتر آیا اور جب وہ گندے تولیہ سے میز کو صاف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا اسے اپنی متورم آنکھوں کو کھلی رکھنے کے لئے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ جب تک آدمی ہمارے سامنے رکابیاں سجا تا رہا لڑکا پانی کے ڈرم کے پاس کانچ کے گلاس اور المونیم کا جگ اٹھائے کھڑا رہا۔ اس نے ایک عمر دراز آدمی کا بوسیدہ کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا اور جب وہ میز پر گلاس رکھ کر پانی انڈیلنے لگا تو اس کی ناک مشکل سے گلاس کے اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک اچھی طرح سے جاگا نہ تھا۔ غنودگی کے عالم میں اسنے بہت سارا پانی میز پر گرا دیا۔

"جاؤ سو جاؤ۔" بختاور نے اسکے ہاتھ سے جگ لے لیا۔ لڑکا اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا اور ہماری طرف تاکنے لگا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوف سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ابھی سے جان گیا تھا دنیا کیسی جگہ ہے۔ ہوٹل ایک کمرہ جس کے اندر ہم تینوں بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے باہری برامدے پر مشتمل تھا جس کے کنارے ایک تندور جل رہا تھا۔ برآمدے کے باہر چاند اور اسٹریٹ لیمپ کی ملی جلی روشنی کے سبب سڑک کسی خواب کی نگری سے گذرتی نظر آرہی تھی۔ اوائل سرما کی رات کافی بیت گئی تھی۔ آس پاس کی گلیوں کی رنڈیاں اور کتے تک سو چکے تھے اور میں اپنے اندر میلوں تک سناٹا محسوس کر رہا تھا جسے حلق سے اترتے ہوئے گوشت کے گرم ٹکڑے بھی دور نہیں کر پا رہے تھے۔

"میں نے اس وقت تم پر رحم کھا کر اپنے ساتھ رکھا جب تم کوئی کام نہیں جانتے تھے۔" بختاور سنگھ نے پہلا لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

"جب تم بھوک سے ادھ مرے ہو رہے تھے تو میں نے تمہیں نئی زندگی دی"۔

"ہاں!"

"شاید اس وقت تم وہی کپڑے پہنے ہوئے ہو جو میرے ہدیئے ہوئے ہیں۔"

وہ روٹیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے شوربے میں ملا رہا تھا۔ اس کا حلقوم غیر فطری طور پر چل رہا تھا۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ اسکی بھوک کبھی نہیں مٹی تھی۔ عورت کے معاملے میں تو اور بھی نہیں۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ "دنیا میں احسان فراموشی کی مثال آسانی سے مل جاتی ہے۔ میر جعفر ہر دور میں پیدا ہوتا ہے۔" وہ جانتا تھا اس کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ وہ جانتا تھا مجھے ٹھیک کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل آئے جنہیں چھپانے کے لئے مجھے پانی کا گلاس اٹھانا پڑا۔ پانی بد مزہ اور بھاری تھا۔ اس میں دھات کی مقدار زیادہ تھی۔

"ٹھہرو!" بختاور سنگھ نے مجھ سے کہا اور اس نے میری طرف رم کی بوتل بڑھا دی جسے میں نے جیبی چھری سے کھول لیا۔ میں نے گلاس کے اندر جو نصف پانی سے بھرا ہوا تھا تھوڑی سی رم انڈیلی اور اس کی طرف ممنونیت سے تاکتے ہوئے اسے چڑھا گیا۔ میں رم کا عادی نہ تھا۔ رم میری بساط کے باہر کی چیز تھی۔ میں دیسی تک ہی محدود تھا۔ میں نے اسے اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی جھانجھ سے میرے مغز میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں اور میری آنکھوں سے پانی ابل آیا۔

"بوتل مجھے دو"۔ بختاور سنگھ نے رم اپنے گلاس میں انڈیلی اور بوتل کو دوبارہ میری طرف بڑھا دیا۔ روٹی کے ریزوں کو دانتوں سے کچلتے ہوئے میں نے بختاور سنگھ کی طرف دیکھا اور اس کے لئے میرے اندر رحم کا سوتا ابل پڑا۔ بیچارہ بختاور، اسے ہمیشہ میرے جیسے احسان فراموشوں سے پالا پڑتا رہا ہے۔ میں نے دوسرا گلاس خالی کر کے اس تلخی کو کم کیا اور کھانے لگا۔

"آخری بار جب میں نے اسے دیکھا۔۔۔" بختاور سنگھ نے کہا۔ "وہ چاند کی روشنی میں تمہارے ساتھ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔"

"پدما پار کی لڑکیاں چاند کی روشنی میں ہمیشہ خوبصورت نظر آتی ہیں۔"

"اور وہ رات کے وقت کسی بھی آدمی کے ساتھ باہر نکل آتی ہیں"

"سب نہیں۔ سب کے ساتھ نہیں"۔ میں نے رم کی بوتل کے اندر دیکھا جو نصف خالی ہو چکی تھی اور اسے مزید اپنے گلاس میں خالی کرنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس موضوع کے سبب مجھے اس کی رم پینے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔

"ذرا آہستہ۔ ولائتی کے لئے ابھی تم چھوٹے ہو۔" بختاور سنگھ نے میرا کندھا تھام کر کہا۔ آہ! اس کی گرفت میں کتنی اپنائیت تھی! میرا جی چاہا کہ اس کا چہرا چوم لوں۔ مگر اس میں کثرت سے بال اگے ہوئے تھے۔ اس لئے میں اس جذبے کو دباتے ہوئے اس کی رم پینے تک محدود رہا۔ اور اس کی رم اس کی طرح مہربان مگر کہیں پر کھٹکتی تھی۔

"اور اس پار کی لڑکیاں آزاد خیال کی ہوتی ہیں"۔ اس نے تشریح کی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "اپرنا کے بارے میں بتا سکتا ہوں"

"تم کبھی سچ بات نہیں کہو گے، بختاور سنگھ مسکرایا۔ اس کی پلیٹ خالی ہو چکی تھی اور وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔

"مگر یہ ہر کسی کے ساتھ آزاد خیال کی نہیں ہوتیں۔" تھوڑی دیر بعد میں نے اصرار کیا۔

"پیو!" بختاور سنگھ نے میرے گلاس میں بچی کھچی رم انڈیل دی جسے خالی کرنے میں مجھے کافی وقت لگ گیا لیکن گلاس خالی کرتے ہی مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیدا ہونے لگی کہ گلاس میرے کس ہاتھ میں ہے؟ اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ گلاس میرے کس ہاتھ میں ہے تو مجھے میز کا کنارہ بہت دور دکھائی دینے لگا۔ میں نے سمجھا مجھے چڑھ رہی ہے اس لئے میں نے بختاور سنگھ کی طرف دیکھا۔ مگر اس کے چہرے میں مجھے جھاڑیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ تو میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو بختاور سنگھ کی گرفت میں پایا۔

"میں نہ کہتا تھا۔" بختاور سنگھ کہہ رہا تھا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو"۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بختاور سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔ "مجھے صرف تھوڑی دور تک سہارا دو۔ صرف دریا پار تک۔ میرا مطلب ہے صرف گراج تک۔"

"میں نے ہمیشہ تمہیں سہارا دیا ہے"۔ اس نے مجھے یاد دلایا اور ہوٹل کے مالک کو پیسہ چکایا جسے لیتے وقت اس نے مجھے گھور کر دیکھا وہ ایک گنجا مسلمان تھا جس کی داڑھی کوٹ کے اندر تک پہنچتی تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا مگر موقع محل دیکھ کر ممنوعہ شراب کا دھندا کرنے سے نہیں چوکتا۔ باہر قدرے سردی تھی اور ہم دونوں کے سائے نالے پر پھسلتے جا رہے تھے۔ تقریباً تمام کھڑکیاں بند تھیں جیسے شہر پر دشمن فوج کا غلبہ ہو چکا ہو۔ بختاور سنگھ مجھے گراج کی طرف نہیں لے جا رہا تھا۔ وہ تو دریا کی طرف بھی نہیں جا رہا تھا بلکہ ہم دونوں دریا کے ڈھلواں کناروں پر بسے ہوئے نو آباد محلوں کے درمیان چل رہے تھے جہاں گلیاں اتنی ناہموار اور تنگ تھیں کہ نہ صرف ہم ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے بلکہ میں بختاور کی سانس کی گرمی تک کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ مجھے اسی راستے سے لئے جا رہا تھا جو میرا جانا پہچانا تھا۔

"تم سور کی طرح بھاری ہو۔" اس نے مجھ سے کہا اور تھم گیا۔ "دیکھو، تمہیں میں ٹھیک جگہ پر لایا ہوں نا؟"

میں نے دیکھا۔ میرے سامنے لکڑی کا ایک اونچا زینہ تھا۔ جس کے خاتمے پر ایک مستطیل نما کھڑکی تھی۔ گلی، چاند کی حقیر روشنی کے باوجود تاریک تھی۔ میں نے بختاور سنگھ کو اپنے جسم سے الگ ہوتے ہوئے

محسوس کیا۔

"خود کو سنبھالو۔" اس نے کان میں کہا اور پیچھے گلڑ کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک ریلوے پارک کی ٹوٹی ہوئی چہار دیواری نظر آرہی تھی۔ میں اس جگہ کے استعمال کو اس سے بہتر جانتا تھا۔ اکثر یہاں پولس چھاپہ مارا کرتی تھی ۔"پارک کے اندر جو دیول ہے میں اس کے پوکھر کے کنارے انتظار کروں گا۔ تم یہیں اس سے ملا کرتے ہوتا۔ کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟"

"میں کوشش کروں گا" میں نے کہا۔ "تم دیکھ رہے ہو یہ آدھی رات ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم دن کے اجالے میں اس کے ساتھ ۔ ۔۔ ہو، ہو ،ہو،" اس کی شرابی ہنسی سے گلی کی دو ایک کھڑکیاں جل اٹھیں۔

"شی ۔۔۔" میں نے کہا اور وہ جھینپ گیا۔ تھوڑی دیر تک کھڑکیاں جلی رہیں، پھر بجھ گئیں۔ اس نے رم کی بوتل نکال کر میرے چہرے کے سامنے لٹکا دی۔ "ادھر دیکھو! میں لال پری کے ساتھ تمہارا انتظار کروں گا۔ لیکن تم تنہا نہیں آؤ گے۔ کہ بالکل نہیں آؤ گے؟"

"میں کوشش کرونگا۔" میں نے بوتل کے اندر تاکتے ہوئے کہا جس میں اب شراب برائے نام بچی تھی۔ مگر مجھے اس کی ضرورت تھی۔ "میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کوشش کرونگا"۔

میں نے اسے گلڑ کی طرف جاتے اور پتھر کی دیوار پر چڑھتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا اور لکڑی کا زینہ چڑھ کر کھڑکی کے شیشے کو کھٹکھٹایا۔ مجھے یاد نہیں کتنی دستک پر اس نے کھڑکی کھولی۔ لیکن میں نے دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین کرتے نہیں بن رہا تھا۔ وہ نیند سے جاگی ہوئی تھی اور اس کے عریاں کندھوں پر ہاتھ رکھتے وقت میری انگلیاں شہوانی خواہش سے کانپ رہی تھیں میرے ہونٹ سلاخوں کو تھامی ہوئی اس کی انگلیوں کو باری باری سے چومنے لگے۔

"تم نے پی رکھی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس وقت میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"میں نے بالکل نہیں پی ہے۔" میں نے کہا۔ " یقین کرو میں نے بالکل نہیں پی ہے۔ مجھے پلائی گئی ہے۔"

"کس نے تمہیں پلائی ہے؟" اس نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔

"یقین کرو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔"

"مگر کس نے؟"

"میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں احسان فراموش بننا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

"لیکن اس وقت میں کبھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ تم نے پی رکھی ہے اور مجھے تم پر اعتبار نہیں۔"

"میں اسی جگہ بیٹھ کر رات گذار دونگا۔" میں نے دھمکی دی۔ "تم جانتی ہو میں کس قسم کا لڑکا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرائی۔ عورت اس وقت کے مقابلے میں جب وہ اپنی قوت سے واقف ہوتی ہے اور کبھی اتنی خوش نہیں ہوتی۔ عورت اندر سے کتنی ہی بند ہو اسے کھولنے کے لئے یہی ایک کنجی کافی ہے۔

"جاؤ، جاؤ۔" اس نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ "میں آرہی ہوں۔ لیکن اتنی رات گئے پھر کبھی نہ آنا۔ تم جانتے ہو میرا باپ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ تم ہمیشہ خالی ہاتھ آتے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ لیکن جب میں پیسے بچانے کے قابل ہو جاؤنگا تو تمہارے پتا کے لئے چوڑے کور کی دھوتی لاؤنگا اور ریشمی کرتا اور خادم کی بنی ہوئی خوبصورت چپل اور ایک گانٹھ دار چھڑی جس کی مٹھیا سونے کی ہوگی جو اتنی قیمتی ہوگی اتنی قیمتی ہوگی کہ اس کے سامنے کوہ نور بھی ماند پڑ جائے گا۔

"بس، بس۔ ورنہ تم کچھ بھی نہ لا سکو گے میرے شاہجہاں"۔ اس نے ہنس کر کہا اور کھڑکی بند کرلی۔

گلڑ کی طرف جاتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ دنیا میں احسان لینے سے زیادہ برا اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے بختاور سنگھ کو پوکھر کے کنارے سمنٹ کے بینچ پر بیٹھا پایا۔ اس کی ٹھوری اس کی ہوس کی طرح نوکیلی نظر آرہی تھی۔ بینچ کے پیچھے لوہے کے ریلنگ کے اس پار دریا چمک رہا تھا اور دریا کے اس پار سے پولس اسٹیشن کی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ خاکی چوہے گھنٹی بجاتے وقت کبھی احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ جب رات کے گیارہ بجے ہوں تو دو بار گھنٹی بجا کر چپ ہو جاتے ہیں۔ جب تین بجے ہوں تو آٹھ بار بجانے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دو بج رہے تھے۔ یا ممکن ہے مجھے نشہ چڑھ جانے کے سبب ایسا محسوس ہوا ہو اور اس وقت رات کا صرف ایک بجا ہو۔ یا ممکن ہے گھنٹی نے کس درمیانی وقفے کا اعلان کیا ہو۔

"کیا ہوا؟" بختاور سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک کتے کی طرح بے چین تھا۔ اس وقت وہ ایک کتا ہی تھا۔ میں چپ رہا۔ میں نے سوچا میرا چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ میں نے اسے ہنستے دیکھا اور اس کی مکروہ ہنسی سے بچنے کے لئے ریلنگ پھاند کر ڈھلان اترتا چلا گیا اور دریا کے کنارے واقع ایک مشتبہ جھونپڑے کے سائے میں بیٹھ کر میں نے رم کی بوتل کھولی۔ آسمان میں تارے اپنے مقام بدل چکے تھے۔ مکان کے اندر ایک عورت رو رہی تھی۔ شاید اسکا شوہر بہت دیر سے میری طرح شراب پی کر گھر لوٹا تھا اور اپنی "شوہریت" وصول کرنا چاہتا تھا۔ نہیں، میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ شاید اس کے پیٹ میں بچہ ہو، شاید اسکا بچہ مر گیا ہو، شاید اس کے بچہ نہ ہو رہا ہو یا شاید وہ بچہ نہ چاہتی ہو اور اسکے بچہ ہو رہا ہو یا۔ شاید۔۔۔

"خاموش!" میں نے اپنے آپ سے کہا اور ڈرتے ڈرتے، کیونکہ میرے پاس شراب کو نرم کرنے کے لئے سوڈا نہ تھا، رم کا پہلا گھونٹ لیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بہت ہی پرانے مکان کی پیش دھلیز پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے کی زمین دریا تک ناہموار ہے اور کوڑا کرکٹ سے بھری پڑی ہے۔ دن کے وقت یہ جگہ کوؤں اور گدھوں کی خوبصورت آماجگاں بن جاتی تھی اور لوگ گندگی کے ان ڈھیروں کو پھلانگتے ہوئے دریا کی طرف نہانے اور رفع حاجت کے لئے جاتے تھے اور ان کے درمیان سے واپس لوٹتے۔ اور ننگ دھڑنگ بچے ان کے درمیان اس طرح کھیلتے جیسے وہ ان سے ہی پیدا ہوئے ہوں۔ میں نے سوچا، کبھی کبھی انسان کے اندر اس کے اندر بہتی ہوئی موریوں کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اسکے اندر بے شمار موریاں بہتی ہیں اور کبھی وہ خود ایک موری ہوتا ہے، میری طرح۔ دراصل میں جس رفتار سے پی رہا تھا میں مر بھی سکتا تھا۔ لیکن شاید جہنم میں میرے لئے ابھی جگہ بنی نہ تھی اس لئے آخری قطرے تک ڈکار جانے کے بعد بھی میں سانس لے رہا تھا۔ میں نے اپنے سامنے کے تمام بٹن کھول دیے اور دیوار کے پلستر کو ناخنوں سے کھرچتے ہوئے مسکرانے لگا۔ میں نے سوچا زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

"اور بختاور ایک بھلا آدمی ہے۔ ورنہ اسے کیا غرض تھی کہ ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی کے لئے مجھ پر اتنی مہربانی کرتا۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لئے جو دوسروں کے ناجائز بچے گراتی پھرتی ہے"۔ لیکن اگر اس وقت میں چاہتا تو رو بھی سکتا تھا لیکن ہر انسان اپنے اندر کہیں نہ کہیں ایک شریف آدمی کو چھپائے رکھتا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے آپ کو کمزور سمجھوں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میں جوان ہو چکا تھا۔ جانے کیوں مجھے اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے ندامت کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عورت چپ ہو گئی جس کے ساتھ ہی دھلیز کے نیچے لیٹا ہوا ایک کتا مجھ پر بھونکنے لگا۔ شاید وہ مجھ سے ڈر رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کا پنجر کوڑا کرکٹ کے ان ڈھیروں کے درمیان کہیں نظر آئیگا اور تب میں ادھر سے گذرتے وقت اس پر ہنسوں گا۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے لئے پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ کچھ ملکوں میں جانور اور انسان کی تقدیر ایک ہی قلم سے لکھی جاتی ہے وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھ پر بھونک رہا تھا اور جب اس نے بھونکنا بند کیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور دریا پار گھنٹی بج رہی تھی اس بار گھنٹی اتنی بار بجی، اتنی بار بجی، اتنی بار بجی کہ مجھے لگا میں پاگل ہو جاؤں گا۔

"جہنم میں جاؤ۔" میں نے کھڑے ہو کر کہا اور پیروں کو گھسیٹتے ہوئے اوپر کی طرف جانے لگا۔ مگر میری ٹانگیں باغی ہو چکی تھیں۔ لوہے کے ریلنگ کا سہارا لیتے وقت مجھے اپنے آپ سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔ کتنی کمینی ہے یہ انسان کی ذات کہ اپنے احسان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ایک کمزور لڑکی کو ایک حیوان کے سامنے ڈالنے سے بھی ذرا نہیں چوکتا۔ میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اپنی پوری طاقت لگا کر اسے خیالی بختاور سنگھ کی طرف پھینکا۔ پتھر ریلنگ سے ٹکرایا، ٹن کی آواز گونجی اور وہ نیچے گر پڑا۔ شاید میں زیادہ پی گیا تھا اور حواس قبضے سے باہر چلے گئے تھے۔ بمشکل میں دس قدم بغیر سہارے کے چل پایا اور ایک بار پھر ریلنگ سے لگ کر آگے بڑھنے لگا۔ جب میں بختاور سنگھ کے پاس پہنچا تو وہ زمین پر لیٹا ہوا آسمان کی طرف تاک رہا تھا۔ چاند کی ناکافی روشنی میں اس کی آنکھیں دھندلی ہو رہی تھیں۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس کے جسم میں ہلکی سی بھی جنبش نہ ہوئی۔

"اٹھو اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ اس پارک میں سردی کافی ہے"۔ میں نے کہا۔

"مجھے ایک گھونٹ دو۔" اس نے کہا اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"اٹھو، میرے پاس ایک قطرہ بھی نہیں۔" میں نے اسکا جسم ہلایا۔ "اٹھو بھی۔ یہاں پولس کبھی بھی آسکتی ہے۔"

"مجھے مت چھوڑ" اس نے غصے سے کہا۔ اور تب میں نے کھوٹے سے لٹکتے دقیانوسی بلب کی روشنی میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے سارے چہرے پر ناخونوں کے کھروچنے کے نشانات تھے جن سے خون نکل کر جم گیا تھا۔

"آہ!" میں نے کہا۔ "تم تو زخمی ہو"۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" بختاور نے کراہ کر کہا۔ "کہ وہ ایک چڑیل ہے"۔

"وہ چڑیل نہیں ہے"۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے پیر پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔"

"تم نے غلط دیکھا ہے۔"

"اور اس کے اندر دو بیلوں کی طاقت ہے"۔

"سو تو ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ واقعی ایک چڑیل ہے۔ مگر اس کے اندر دو بیلوں کی طاقت نہیں ہے"۔

"تو کتنی طاقت ہے؟"

"جانے بھی دو۔" میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ہم پارک سے باہر چل پڑے۔ مگر ہمیں دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے چل رہا تھا۔

دریا پار سے پولس کے تھانے کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

"میں تھانے میں رپٹ لکھوانا چاہتا ہوں"۔ بختاور کی آواز میں سسکی تھی۔

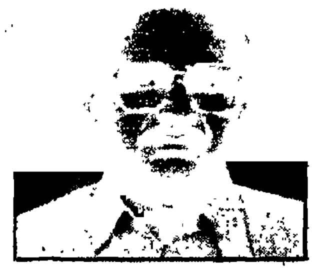
"پولس والے تمہیں لاک اپ میں ڈال دیں گے۔"

"وہ مجھے لاک اپ میں کیوں ڈالیں گے؟ زخمی تو میں ہوں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ مگر ایسے حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے"۔

بختاور تھوڑی دیر تک آسمان کو تاکتا رہا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر دیکھئے)



ساغر جیدی

دوہے

کیا دیمک کیا گورخر، سب کی روٹی سخت
محنت کش یہ دہر ہے، کوئی نہیں بدبخت

●

اِکتالے پر پیٹ لے، چاہے پہاڑی راگ
بات نہ مانے گا تری، دل ہے پرانا گھاگ

●

چولہا میرا پیر ہے، چرخا میرا مرید
ہر بھوکے عرفان کا، نکتہ نکتہ جدید

●

ہم تو آنکھیں موند کر، کہہ دیں گے آمین
تجھی دعائیں شیخ جی! تقوے کی توہین

●

عالم عالم کو یہاں، کہتا ہے اوباش
اک اندھا اک اندھے سے، کھیل رہا ہے تاش

●

کیوں ہیں دل میں وسوسے، اچھی طرح سے بھانپ
ورنہ ستائے گا تجھے، ہر لکڑی کا سانپ

●

وقت میں ہونا تھا ہمیں، ہوگئے ہم تحلیل
دوکوڑی کے حادثے، کیا دیں گے تمثیل

● 20/369, M.V. STREET.
CUDDAPAH-516001 (A.P.)

میری آواز

[illegible]

میری آواز کو محفوظ سراپا کرلو
میں چلا جاؤں گا آواز تو رہ جائے گی
دل کی تصویر، مرے ذہن کی تفسیر ہے یہ
میری آواز مری روح کا آئینہ ہے
گردشِ شام وسحر، لرزشِ رفتارِ حیات
میری آواز میں لرزاں ہے مرا ماضی وحال
میرے دکھ سکھ، مرے ارمان بھری امیدیں
میرے احساس کی لہریں، مرے جذبات کے رنگ
خواہش دل کے سمن زار، تمنا کے طلسم
خوش امیدی کی شفق، مست نگاہی کی دھنک
سبز باغ آرزوؤں کے، مرے خوابوں کے سراب
نامرادی کے نشانات، مرادوں کے نقوش
انقلاباتِ زمانہ کے نشیب اور فراز
مرحلے عمر کے سب، زیست کے سارے منظر
میری آواز کے پردے میں نظر آئیں گے
میری آواز کو محفوظ سراپا کرلو
میری یادوں کی یہ آواز محرک ہوگی
کبھی بے چین کرے گی کبھی تسکین دے گی
کبھی تڑپائے گی تم کو کبھی بہلائے گی
میرے ہونے کا جواز اور نہ ہونے کا ثبوت
میری آواز میں ہے مرا عدم مرا وجود
یہ دلائے گی کبھی میری کمی کا احساس
کبھی اس ساز کے پردے میں مجھے پاؤ گے پاس
میری آواز میں ہر رنگ میں پاؤ گے مجھے
اپنی آواز میں زندہ میں نظر آؤں گا
میری آواز مری زیست کا سرمایہ ہے
میری آواز کو سینے سے لگائے رکھنا
میری آواز کو محفوظ سراپا کرلو

● A-47 ZAKIR BAGKH,
OKHLA ROAD, NEW DELHI-26

عبدالقوی ضیاء

قطعات

سہہ رہا ہے ہر ایک ضربِ نفس
دیکھیے ظرف آئینے کا
اپنی ناکامیٔ طلب سے ضیاء
ہم نے سیکھا ہے ڈھنگ جینے کا

●

کتنی یادوں کے زخم تھے دل میں
سانس لینے کا حق ادا نہ ہوا
شہر میں خود غرض سبھی نکلے
کوئی بھی درد آشنا نہ ہوا

●

اک خلش سی محیط ہے دل پر
زندگی ہوگئی گراں کتنی
ہر نفس آرزو اسی کی ہے
آگہی ہے عذابِ جاں کتنی

●

ناخدا ڈوب گیا جب سرِ ساحل تو کھلا
اب سے پہلے تھی سمندر میں روانی کتنی
جاں ہتھیلی پہ لئے ہم نکل آئے ہیں ضیاء
دیکھیں بازار میں اب کے ہے گرانی کتنی

●

سرمئی رات پہ خوابوں کے دھندلکے تھے محیط
اور ماحول پہ چھایا تھا اداسی کا خمار
رفتہ رفتہ مرے پہلو سے اٹھا اک مہتاب
آگئی دشت تمنا میں دبے پاؤں بہار

● 961-AUGER AVE SUDBURY,
ONT. P3A 4A7 CANADA.

خورشید اکرم
M-7/2, JOGABAI EXTN.
OKHLA,NEW DELHI- 110025.

پالتو

بیلن کے برتنوں سے ٹکرانے کی آواز آئی۔ کچھ اسٹیل اور المونیم کے برتن ادھر ادھر ڈھن ڈھنا کر گر گئے۔ آج شاید پہلی بار اماں کو اتنے زوروں پر غصہ آیا تھا کہ انہوں نے بلّی کو بیلن پھینک کر مارا تھا۔ اماں جیسے ہی کچن میں داخل ہوئیں، دیکھا کہ بلّی دودھ پی رہی ہے۔ مگر جب تک وہ بیلن اٹھاتیں اور چلاتیں بلّی بھاگ نکلی تھی اور اماں گرے بڑے برتنوں کو اٹھاتے ہوئے کوسنے لگیں۔

"یہ نگوڑی بلّی تو عاجز کئے ہوئے ہے۔ ارے کسی روز اسے زہر کھلادوں تب ہی جان چھوٹے گی"۔

اماں ایسا کبھی نہیں کریں گی۔ بلّی تو بڑی چیز ہے وہ چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتیں۔ لیکن جب کبھی بلّی کچھ جھوٹا کر دیتی ہے یا ریشماں کے لئے رکھا ہوا دودھ پی جاتی ہے تو وہ اس طرح کوسنے لگتی ہیں۔

"او اماں! جب آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ بلّی پرکی ہوئی ہے، جھوٹا کر دیتی ہے تو پھر چیزوں کو کھلا کیوں چھوڑ دیتی ہیں"۔

"یہ بھی کوئی بات ہے، گھر ہے تو اس میں کوئی چیز کھلی رہے یا بند۔۔۔"

اماں غصے سے جواب دیتی ہیں۔

"لیکن اماں! بلی کو جب بھوک لگتی ہے تبھی تو وہ۔۔۔" میں اس منطق سے اماں کا غصہ کم کرنا چاہتا ہوں مگر وہ کچھ اور بھڑک اٹھتی ہیں۔

"ارے تو نا س پیٹی کو ہمارا ہی گھر نظر آتا ہے؟"

"اماں جی! بلی کس کے گھر کھائے۔ کھائے گی تو اسی طرح اس کے لئے تو سب گھر ایک جیسے ہیں۔ جہاں بھوک مٹانے کو کچھ مل جائے وہیں منہ مار لیتی ہے۔

مگر میری اس منطق کا اماں پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

"ارے جھاڑو پھیرو اس کو اور اس کی بھوک کو، اور تمہاری گھڑنتی کو۔ تم لوگوں کو پیٹ اور بھوک کے سوا کچھ نظر آتا ہے؟"

اماں جب غصے میں ہوتی ہیں تو ان کے پاس میری ہر بات کا ایسا ہی جواب ہوتا ہے۔ جانے کیسے اماں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بھوک اور پیٹ کی بات کرنے والے چاہے لاکھوں سے اچھے ہوں لیکن پھر بھی اچھے نہیں ہوتے کہ ان کی دنیا بھی اچھی نہیں اور عاقبت بھی خراب۔

لیکن اس میں اماں کا کیا قصور۔ نجمہ بھی تو مجھے دین ایمان کا دشمن ہی سمجھتی ہے۔ میں جب کبھی اپنی یونین کے مزدوروں کی پریشانیوں کا ذکر کرتا ہوں تو وہ مجھے خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ میں ساؤتھ افریقہ کے سیاہ فاموں پر ہونے والی ہول ناکیوں کا ذکر کرتا ہوں یا اپنی چار سالہ بیٹی ریشماں کو صفدر ہاشمی کا کوئی گیت سناتا ہوں تو وہ زیر لب استغفار پڑھنے لگتی ہے۔ زیر لب استغفار پڑھنا اس کے اس خوف کا پتہ دیتا ہے جو انسان کے اندر ناہموار اور نا آسودہ معاشی نظام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ میں نے اسے بار بار سمجھایا ہے کہ آدمی کو فطری انداز میں جینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اطمینان اور آسودگی کی زندگی گزارنے کے لئے خود پر جبر کر کے جینا فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن وہ اوسط سے کم درجے کی ذہنیت والے مردوں کی بیویوں کی طرح کی ایک عورت ہے اور اسی میں مطمئن رہنا چاہتی ہے کہ اس کی دنیا بھی گھر سے شروع ہو کر زیور پر ختم ہو جاتی ہے۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو ایک منظر دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی اور خوشی ہوئی۔ میری بیٹی ریشماں بلّی سے بہت ڈرتی تھی۔ ڈرتی کیا تھی۔ اماں اور نجمہ نے سے الٹے سیدھے قصے گھڑ کر اور بلّی کے پنجوں اور ناخنوں یا آنکھوں کے ڈراؤنے پن سے اس کے دل میں بلّی کا ایسا بیٹھا دیا تھا کہ وہ کسی بلّی کو دیکھتے ہی ماں یا دادی سے لپٹ جاتی تھی۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ریشماں بلّی کو گود میں اٹھائے ناچ نچیا کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی اور شرارت کا ملا جلا تاثر ہے۔ یونین کے مقدمے کے سلسلے میں کورٹ اور وکیلوں کے چکر میں ایک ہفتہ پیروں پر گزرا تھا۔ تھکان سے میں ٹوٹ رہا تھا۔ بلّی کو بیٹی کی گود میں دیکھ کر اور اسے اس قدر خوش دیکھ کر پل بھر میں جیسے میری ساری تھکان دور ہو گئی۔ حالانکہ سوچنے پر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے اچانک اتنی خوشی کیوں ہوئی۔ اس معمولی سے ایک منظر میں ایسا کیا تھا جس نے میرے حواس کو اس قدر متاثر کیا تھا۔

بلّی سے ریشماں کی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں دیکھتا کہ بلّی میری بیٹی کے ساتھ کھیل رہی ہے وہ ایک طرف پڑی ہوئی ہے اور ریشماں کبھی اس کی دم پکڑ کر کھینچتی ہے، کبھی اس کے کان مروڑتی ہے۔ بلّی کبھی کبھی اپنی

آنکھیں جھپکا کر اسے ڈرانے کی کوشش کرتی یا کبھی ہولے سے غراتی ہے، جیسے پرائیوٹ فرم میں کام کرنے والا منشی کبھی احتجاج کا حوصلہ کرتا ہے مگر اتنے احتیاط سے کہ دل کو سکون بھی مل جائے اور کوئی آفت بھی نہ آئے۔ اس کے باوجود مجھے ڈر لگتا ہے کہ بلی اسے کہیں نوچ نہ لے۔ لیکن ایسا جب کبھی ہوتا ہے۔ جب بلی اس پر غراتی ہے وہ زور زور سے ہنستی ہے، خوشی سے تالیاں بجانے لگتی ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ بلی کو صرف ستاتی ہے۔ اکثر وہ بسکٹ یا کھانے پینے کی کوئی اور چیز بلی کو دیتی ہے۔ یا شاید یوں ہے کہ جیسے ہی ریشماں کچھ کھانے کو ہوتی ہے جانے کہاں سے بلی کو اس کی بھنک مل جاتی ہے وہ ریشماں کے پاس منڈلانے لگتی ہے اب اماں نے بھی بلی کے کھانے دانے کا انتظام کر دیا تھا۔ گھر کے لوگ جب کھانا کھا لیتے ہیں تو اماں بچا ہوا کھانا بلی کے سامنے ڈال دیتی ہیں۔ وہ دم ہلا کر جو کچھ ملتا ہے کھا لیتی ہے۔ رات میں جب ہم لوگ کھانے پر بیٹھتے ہیں تب کہیں سے بلی نمودار ہوتی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں آکر ایک ہلکی سی میاؤں کے بعد بیٹھ جاتی ہے۔ یہ میاؤں کی آواز شاید اس کے آنے کا دھیما سا اعلان ہے۔ کبھی کبھی اس کی میاؤں میں مجھے اس بھکاری کے لہجے کا احساس ہوتا ہے جس کو صدا لگاتے وقت جھڑک کے جانے کا خوف بھی گھونٹا رہتا ہے۔ بلی کی آنکھیں انتظار اور التجا کی کیفیت میں ڈوبی ہوتی ہیں اور زبان بار بار جبڑوں اور نتھنوں پر پھر رہی ہوتی ہے۔ جب ہم کھانا ختم کر چکے ہوتے ہیں، تو اماں بچا کھچا بلی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ چپڑ چپڑ کھاتے ہوئے بلی تشکر آمیز نگاہوں سے اماں کی طرف دیکھتی ہے۔ اماں اس کی طرف دھیان نہ دے کر دوسرے کاموں میں لگ جاتی ہیں۔ نجمہ کو کبھی بھی یہ بات پسند نہیں رہی۔ اس کو بلی کا اس طرح ہمارے کھانے میں شریک ہونا اچھا نہیں لگتا۔ اس کا بس چلے تو وہ بلی کو مار بھگائے۔

"اوہ! تم خواہ مخواہ اس سے نفرت کرتی ہو دیکھو تو کیسی خوبصورت بلی ہے"۔ ایک روز میں نے اس کی جھنجھلاہٹ پر ٹوکا۔

"ہاں ہاں مفت میں کھانے کو مل رہا ہے تو بدن پر چربی تو چڑھے گی ہی"

"اُفوہ نجمہ، ٹھیک ہے۔ کون سا ہم اسے اپنے حصے کا کھلاتے ہیں کچھ بچا کھچا ہی تو دیا جاتا ہے"۔

"بات وہ نہیں ہے، دراصل یوں ہے کہ ـــ کہتے ہیں بلی بہت بے وفا جانور ہے وہ جس کے گھر کھاتی ہے اس کے لئے بد دعا کرتی ہے کہ اس کا مالک اگر اندھا ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر جی بھر کے کھائے"۔

ایسا نہیں ہے کہ نجمہ قدامت پسند ہے۔ تھوڑی پڑھی لکھی بھی ہے۔ ماں کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ بی اے پاس ہے۔ پاس پڑوس کی عورتوں میں اس بات کی دھاک ہے کہ وہ انگریزی کا اخبار پڑھتی ہے۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ پڑھ لیتی ہے۔ وہ توہم پرست نہیں ہے۔ لیکن شاید جب اسے اپنی نفرت کے لئے کوئی اور عذر نہ ملا تو اس نے اس توہم کو ڈھال بنایا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے بتاؤں کہ بلی کسی کے لئے کوئی دعا بد دعا نہیں کر سکتی۔ اس کی دعاؤں سے اگر کچھ ہونا ہوتا تو وہ اپنے پیٹ کے جنجال سے نکل گئی ہوتی۔ لیکن اگر میں دعا اور بد دعا اور دعاؤں کے بے اثر ہونے کی بات کرتا تو وہ زیر لب استغفار پڑھنے لگتی۔

بلی اب ہمارے ہی گھر کے کسی کونے کھدرے میں رہتی ہے، وہ اب کافی موٹی ہو گئی ہے۔ بلکہ موٹاپے سے لوتھ ہو گئی ہے۔ اب وہ چوہے کے پیچھے نہیں بھاگتی یا شاید بھاگ نہیں پاتی۔ ریشماں اسے دو چار قدم دوڑا کر پکڑ لیتی ہے۔ کبھی جب ریشماں کا مزاج اکھڑا ہو تو اس کا غصہ بلی پر اترتا ہے وہ اسے پٹختی ہے اسے اٹھا کر پلنگ سے نیچے پھینک دیتی ہے۔ ایسے میں بلی دم دبا کر اس کے سامنے سے بھاگ جاتی ہے۔

کسی گھر میں رہنا، بچے کھچے کھانے کا انتظار کرنا، شکریہ کے لئے دم ہلانا، مار کھا کر سہن کر جانا، دم دبا کر کھسک جانا۔ یہ سب کچھ بلی کی فطرت کے خلاف ہے اس کے گدیلے پیروں کے اندر لمبے لمبے ناخن ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ جب چاہے کھول سکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ بلی ہمارے گھر سے مانوس ہو گئی ہے لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہمارے گھر کی پالتو ہو گئی ہے۔ اب گھر کے کچن میں کھانے پینے کی چیزیں یوں کھلی پڑی رہتیں تب بھی بلی انہیں منہ نہیں لگاتی۔ اماں کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ اب دوسری کوئی بھی بلی ہمارے کچن کی طرف نہیں دیکھتی۔ شاید دوسری بلیوں نے میرے گھر کی موٹی تازی بلی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بلی جو بچے کھچے کے عوض پالتو ہو گئی تھی۔

میری یونین کا معاملہ ادھر بہت گڑبڑ چل رہا تھا۔ کچھ لوگ یونین سے نکل کر مالک سے جا ملے تھے۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ مجھے پہلے بھی ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ لوگوں کے وفاداری بدلنے کا معاملہ یونین کے لئے خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم اپنی جدوجہد کے ایسے موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں ہماری یونین کی بڑی مانگوں کا پورا ہو جانا تقریباً یقینی تھا۔ چند ایک نے اپنے سوارتھ کے لئے اپنے ڈھیر سارے ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ دیا تھا۔ معاملہ بہت نازک، بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ہم اس لڑائی کو کسی صورت ہارنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اب اگر ہم یہ لڑائی ہار گئے تو پھر یہ مزدور دنوں تک اپنی کمر سیدھی نہیں کر پائیں گے۔ آج ان میں جو جوش ہے وہ کل ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ جوش اور اکائی بہت بڑی قوت ہے لیکن ٹریڈ یونین میں صرف جوش اور اکائی سے بھی کام نہیں چلتا۔ یہاں بیوروکریسی کے مقابلے میں وہ سیاسی چالیں بھی چلنی پڑتی ہیں، جو کسی شریف آدمی کے بس کی نہیں۔ شرافت کا جو تصور رائج ہے وہ ٹریڈ یونین اور احتجاج اور تحریک کی دنیا میں جوں کا توں نہیں چل سکتا ورنہ شاید کوئی ٹریڈ یونین کبھی اپنی مانگیں منوانے میں کامیاب نہ ہو پاتی۔

مہینوں سے یہ لڑائی چل رہی تھی۔ احتجاج، نعرے، میٹنگیں، جلوس، سیاسی داؤ پیچ، کورٹ مقدمہ ان سب نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ ان سے تھوڑی

دیر کو سہی چھٹکارہ چاہتا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھلانا چاہتا تھا۔ تو نجمہ کی ایک سہیلی کی شادی میں شرکت کے لئے میں بھی ساتھ ہولیا۔

واپس لوٹتے ہوئے بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ گھر پہنچا تو یونین کے دو ساتھی میرا انتظار کررہے تھے۔

"پتہ چلا ہے کہ موتی بھی مینجمنٹ سے مل گیا ہے" اور اس خبر سے مجھے سخت دھچکا پہنچا۔ موتی ہماری یونین کی جان تھا۔ موتی وہ آدمی تھا جس نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر یہ یونین کھڑی کی تھی اور مجھے یونین کا سکریٹری بنایا تھا وہ موتی آج اپنے ساتھیوں سے غداری کررہا ہے۔ کیا مل جائے گا اسے۔ ہو سکتا ہے بہت کچھ۔ لیکن کیا حیثیت رہ جائے گی اسکی۔ جب وہ اپنے لوگوں میں تھا تو مینجمنٹ سے آنکھ ملا کر بات کرتا تھا۔ کیا اب وہ مینجمنٹ سے آنکھ ملا کر بات کرپائیگا۔ مینجمنٹ تو دور اب تو وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کبھی آنکھ نہیں ملا پائے گا۔ ذہن پھر تناؤ میں آگیا تھا۔ اچانک میں نے اپنے قدموں میں سرسراہٹ محسوس کی۔ بلی میرے قدمون سے لپٹی تھی۔ میں نے سے گھور کر دیکھا۔ وہ دم دبا کر کہیں سٹک گئی۔

جنرل منیجر کے چیمبرس میں موتی اور دوسرے غدار مزدور بیٹھے ہیں۔ جان کیا کیا باتیں کررہے ہیں زور زور سے۔ باہر یونین کے مزدوروں کی چیخ و پکار ہے۔ نعرے ہیں، جھنڈے ہیں، بھیڑ ہے، پسینہ ہے، دھوپ ہے۔ بھیڑ میں پھنسا ہوا میں ہوں۔ ادھر ادھر کھڑے پولس والے ہیں۔ مرنے مارنے پر اتارو مزدور ہیں۔ نعروں کی آواز اینٹ پتھروں میں بدل جاتی ہے۔ پولس کے جوان لاٹھیوں سے مجمع پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ میرے سر پر ایک ضرب پڑی ہے۔ اعصاب کی رگیں چٹخنے لگی ہیں، ہر طرف نعرے ہیں، شور ہے، زخمیوں کی آہ و بکا ہے، سائرن بجاتی پولس کی گاڑی ہے اور میرا سر درد کے مارے پھٹا جارہا ہے۔۔۔ اچانک میری نیند ٹوٹتی ہے۔ نیند سے جلتی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اپنے بستر پہ ہوں۔ گھڑی میں دو بج رہے ہیں۔ دروازے پر بلی رو رہی ہے۔ رینگ رہی ہے۔ بری طرح جھنجھلا جاتا ہوں۔ جی میں آتا ہے کہ۔۔۔

اماں بغل والے کمرے سے اٹھ کر آجاتی ہیں۔

"اماں مارو اس بلی کو، پھینکو اس کو باہر۔۔۔"

اماں، بلی کی طرف دیکھ کر کہتی ہیں "اے۔۔۔؟۔۔۔ہے۔۔۔ہے لگتا ہے بھوک سے رو رہی ہے۔ آج اس کو کھانا نہیں دیا گیا تا!"

نجمہ نندا سی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے۔ بلی کے رونے کی آواز سن کر جیسے اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔

"بھاگ کتنی ار رو رہی ہے۔ نحوست پھیلا رہی ہے۔ اللہ رحم کرنا، جانے کیا بلا لائے گی یہ بلی۔ اللہ رحم کرنا"

"چ۔۔۔ کیا دقیانوسی باتیں کررہی ہو۔ کیا پتہ وہ کس تکلیف سے رو رہی ہے۔ یا شاید بھوک ہی سے رو رہی ہو" میں بیوی پر برس پڑتا ہوں۔

اماں ہماری باتوں سے بے نیاز کچن کی طرف بڑھتی ہیں، کچن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دودھ کھلا رہ گیا تھا۔ دو تین بسکٹ ایک طشتری میں پڑے تھے۔ ایک پیالے میں ریشماں کی جھوٹی سوئیاں رکھی ہوئی تھی۔ اماں نے بسکٹ اور سوئیاں اس کے سامنے ڈال دیں۔ تھوڑا سا دودھ بھی ڈال دیا۔ بلی نے جلدی جلدی وہ سب کھایا۔ چپڑ چپڑ دودھ پیا۔ اسے واقعی بہت زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔

اماں کچن کا دروازہ اس طرح کھلا چھوڑ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔

میں نے دیکھا کہ اماں سو گئی تھیں۔

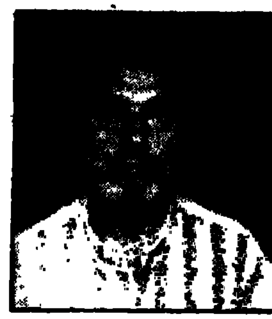
بلی اپنی بھوک مٹا کر کسی کونے کھدرے میں جا دبکی تھی۔

مین نے سوچا کہ بلی بھوک سے بے تاب تھی اور کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔۔۔ اور یہ سوچتے ہی میری نیند اڑ گئی۔ ☆☆

بقیہ صفحہ : ۳۵ چھوٹی سی بات

رات بھر سمندر میرے سینے میں بپھرتا رہا۔ مجھے اپنی جوانی کا غم ستاتا رہا جو اس ہجرت نے مجھے دیا تھا۔ چوبیس پچیس برس کی عمر میں آئی تھی میں اور اس کے بعد کا بیس پچیس برسوں کا طویل عرصہ خود سے بیگانگی اور لاتعلقی میں گذرا تھا۔ صرف بچے ہماری زندگی کا محور تھے، ان کی صحت، ان کی تعلیم، ان کی تربیت، کہیں وہ مذہب سے بیگانہ نہ ہو جائیں، اپنی زبان نہ بھول جائیں، اپنی تہذیب سے متنفر نہ ہو جائیں، دن رات اسی فکر میں گذرتے، ان کی دیکھ بھال کرتے، ان کو سمجھاتے، مدد کرتے، ان کے سوالوں کا جواب دیتے، نسلی تعصب کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتے۔ ہماری زندگی کا یہی نصب العین رہ گیا تھا اور جب آج ہماری کوششیں کامیاب ہو چکی ہیں، ہمارے بچے ایک اچھے انسان بن گئے ہیں تو مجھے کتنا فخر محسوس ہوتا ہے انہیں دیکھ کر بے حد مطمئن تھی میں۔ لیکن آج اس کے بیٹے نے ایک جملہ کہہ کر اس کا سکون غارت کردیا تھا۔ تو کیا تم بچوں سے توقع رکھتی تھیں کہ وہ تمہارے ممنون ہوں گے، بچے کبھی شکر گذار ہوتے ہیں۔ اپنے الدین کے؟ تم نے اپنے جذبے، ایک ماں کے جذبے کے تحت جو قربانی دی، جو کچھ کیا کیا اس کے لئے تشکر کے جذبات کی متمنی ہو؟ یہ تو تمہارا فرض تھا اور تم نے اپنا فرض بخیر و خوبی ادا کیا۔ اب اس کے لئے تمہیں کوئی انعام تو دینے سے رہا۔ کوئی اندر سے کہہ رہا تھا۔ لیکن بچے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں نے ان کے لئے اپنی ساری خوشیاں تج دی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی، بچے کب سمجھتے ہیں، انہیں اپنے والدین کی مشکلات کا کب احساس ہوتا ہے۔ شائد جب وہ خود والدین بنیں تو انہیں اپنے والدین کا خیال آئے۔

ایک چھوٹی سی بات، جذبات کا کیسا طوفان اٹھا سکتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ دل کا سکون کیسا برباد کر سکتی ہے۔ اب یہ جوار بھاٹا جو میرے اندر ہے وہ کیسے ختم ہوگا؟؟؟ ☆☆



مختار شمیم

جر کی صبح ، ہجر کی شام

نگل جنگل گونج اٹھاسناٹا کیسا!؟
زک شاخیں، ہاتھ پسارے چیخ رہی ہیں
گ وبار ـــ ٹوٹے، بکھرے، خاک ہوئے ہیں
مٹی دھول اور راکھ ہوئے ہیں

رک نازک موتی جیسے شبنم قطرے
ئک جگمگ کرتے جیسے جھلمل جھلمل تارے

لی ڈالی، پتی پتی چوم رہے ہیں
ئ خوبی، اپنی چاہت پر وہ کیسے جھوم رہے ہیں
اے جہاں میں چم چم چم دھوپ جو اتری کیسی خوشی تھی
ں کو خبر کہ سورج کی کرنوں میں انی تھی (موت چھپی تھی)
ک نازک موتی جیسے شبنم قطرے لرز گئے ہیں
ں پتی، پھول پھول سے جدا ہوئے ہیں
اشاخ پہ تنہا پرندہ تنہا چاند کے سناٹے میں دیکھ رہا ہے
انے کیا کیا سوچ رہا ہے)

ر کی صبح، ہجر کی شام
ں کی قدرت، اس کا نظام

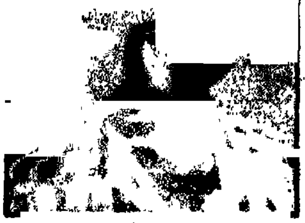
● GOVT. DEGREE COLLEGE
BHARWAHA, (M.P.)



شاھد میر

اک سچا اظہار غزل
ایک کھرا کردار غزل
بامِ ادب کے زینے میں
حرف لفظ اشعار غزل
دل کو لگے عزیز ترین
رنجیدہ ، بیمار غزل
لمبی لمبی تانوں سے
ہوئی گھرانے دار غزل
دکھ کے سرد اندھیروں میں
ایک سنہرا تار غزل
دامن چھڑا نہیں پائے
لکھی تھی اک بار غزل
پاکر موتی اشکوں کے
ہے سرمایہ دار غزل
جس گھر قید ہیں سناٹے
اس کی پہرے دار غزل
اس دریا کا اور نہ چھور
جس دریا کے پار غزل
شاہد بڑا اندھیرا ہے
لکھو سحر آثار غزل

● DIRECTOR,
KRISHIVIGYAN KENDRA,
SIRONJ - 464228 (M.P.)



ماھیئے

تنہائی کا میلہ تھا
درد کے صحرا میں
مہتاب اکیلا تھا

●

اس دھوپ کی بارش سے
بچ کے نکلنا ہے
احباب کی سازش سے

●

چھوٹا سا مکاں ہوگا
چاند اگائیں گے
کیا خوب سماں ہوگا

●

بہتوں نے تھا سمجھایا
زیست کریں کیسے
پر کام نہ کچھ آیا

●

جب زخم کوئی مہکا
سبز ہوا موسم
آنکھوں سے لہو ٹپکا

●

وہ لوٹ کے آئیں گے
خواب ستاروں سے
ہم گھر کو سجائیں گے

●

اس خواب کی تعبیریں
کون بتائے گا
مفلوج تھیں تحریریں

● 123/2, 4th CROSS,
SHESHADRIPURAM
SHIMOGA-577201.KARNATAK



اطہر فاروقی
123-SABAR MATI H[illegible]EL
J.N.U. NEW DELHI -[illegible]0067

ہندوستان میں اردو کا مخدوش مستقبل اور مسلمان

زبان کے طور پر اردو کے فروغ اور ہندوستان میں اس کے مستقبل کے امکانات سے متعلق طویل بحث اب بھی جاری ہے۔ایک طرف اگر کچھ اسکالرز(جن میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی طرح سرکاری مراعات سے فیض یاب ہورہے ہیں)اردو کی موجودہ صورت حال سے مطمئن دکھائی دیتے ہیں اور اس رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ زبان کے طور پر ہندستان میں اردو کا مستقبل روشن اور درخشاں و تابندہ ہے تو دوسری طرف کچھ اسکالرز کے مطابق ہندوستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی موجودہ صورت حال کے متعلق سنجیدہ سطح پر بحث و تمحیص کے باب وا کیے جائیں تاکہ اس امر کا تعین ہو سکے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے ہندستانی خصوصاً مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی تناظر میں اردو کے فروغ کے کیا امکانات ہیں۔

زندگی اور زبان کے باہمی رشتے اور ساتھ ہی اس کے فروغ اور مستقبل کے امکانات ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں اور ارتباط زبان کے ارتقاء اور فروغ میں فیصلہ کن طور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔اگر کوئی زبان کسی مخصوص سیاسی، تہذیبی یا مذہبی فرقے کے حوالے سے شناخت پذیر ہوتی ہے تو پھر اس زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بھی اس فرقے کی جانب سے شدید ردِ عمل کا اظہار فطری امر ہے اور ایسے حالات میں اس زبان کے مستقبل میں فروغ پانے کے امکانات کو اس مخصوص فرقے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا مشاہدہ کیے بغیر سمجھنا اور صحیح اور معروضی تجزیہ کرنا ممکن نہیں جس سے وہ منسلک ہوتی ہے۔اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل سے آزادی تک بلاشبہ اردو کو کبھی مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھا گیا، جب اردو لنگوا فرینکا(LINGUA. FRANCA) کی شکل اختیار کر گئی اور مختلف تہذیبی، سماجی اور مذہبی طبقوں کے ذریعے اس کا استعمال کیا جانے لگا تو زبان کی حیثیت سے اردو نے تمام طبقاتی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی بندشوں کو توڑ ڈالا۔انیس ویں صدی کے اردو، ہندی تنازعے کے نتیجے میں اردو پہلی مرتبہ مسلمانوں سے وابستہ ہونا شروع ہوئی، مگر تقسیم ہند کے بعد اردو عملاً مسلمانوں کی زبان بن کے رہ گئی ۔ تقسیم کے بعد اردو کی حالت بھی کم و بیش مسلمانوں کی حالت جیسی ہی ہو گئی اور اردو کا مسئلہ مسلمانوں کے مسائل کا ہی حصہ تصور کیا گیا۔اس لئے موجودہ تناظر میں اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے اور ہندستان میں اس کے مستقبل کے امکانات کا تعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہندستانی مسلمانوں کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے بالخصوص ان لسانی مسائل کا جن کا مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی حالات اور مسائل سے براہِ راست تعلق ہے۔یہاں ہمیں یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندستان کے موجودہ اردو داں طبقے میں اکثریت تو مسلمانوں کی ہے اور اس طبقے میں غیر مسلم اردو والوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو روز بہ روز مختصر ہوتی جا رہی ہے اور آئندہ پچیس برسوں میں اس کا خاتمہ یقینی ہے۔دراصل ان غیر مسلموں نے آزادی سے قبل اردو کا ایک زبان کے طور پر اس وقت مطالعہ کیا تھا جب یہ اشرافیہ تہذیبی اقدار کی علم بردار اور اسٹیٹس سمبل(status symbol) تھی۔

ہندستان میں اردو کے موجودہ حالات نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ مایوس کن ہیں بلکہ دن بدن بدتر ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کے معاشی حالات نسبتاً بہتر ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد جب ہم ہر سطح پر مسلمانوں کے تئیں روا رکھے گئے تعصب کا جائزہ لیتے ہیں تو پھر اردو کے تئیں روا رکھی گئی ناانصافیاں اور تعصبات ہمارے لیے کوئی معمّا نہیں رہ جاتے۔اسی لیے مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر بھی تکلف یا تامل نہیں کہ اردو اور اردو کی تعلیم کا تجزیاتی اور معروضی مطالعہ آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے حالات اور ان کے تئیں حکومت اور اکثریتی فرقے کے تعصبات اور تحفظات کے جائزے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔جہاں تک اردو تعلیم کا معاملہ ہے تو آج ہندوستان میں جو بیش تر طالبِ علم پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا پھر اسے ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھتے ہیں وہ سب تقریباً مسلمان ہیں۔ مسلمان چوں کہ دوسرے اہلِ وطن کے مقابلے معاشی طور پر زیادہ پس ماندہ ہے اور نوکریوں میں اس کا تناسب تقریباً نہیں کے برابر ہے اس لئے غریب مسلمان کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ اردو روزگار سے وابستہ نہیں ہے۔ آج ہندستان میں غریب مسلمان کا اردو کے تئیں تقریباً وہی رویہ ہے جو اسلام کے تئیں ہے کہ اردو کی حفاظت بغیر کسی سرکاری سرپرستی اور حدود و حائل رکاوٹوں کے بعد بھی کرنا ہے۔ہندستان میں اسلام کے لیے بھی حالات بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان

مذہب سے دست بردار ہو جائے۔ بالکل اسی طرح اگر اردو پڑھ کر روزگار نہیں مل سکتا تو بھی اردو کے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر یہ غور مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا اردو کے تئیں عام ہندوستانی مسلمان کی نفسیات اسی مثبت فکر کے تابع ہے۔ تعلیم ہی کیا، مسلمانوں کے تمام خصوصاً تہذیبی اور مذہبی مسائل سے ماضی کے رشتے ہر روز ایک نئی پیچیدگی سے روشناس ہو رہے ہیں۔ جہاں تک اعلیٰ اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کے اردو تعلیم کے تئیں رویّے کا سوال ہے تو وہ بلاشبہ مایوس کن ہے۔ آج اردو چونکہ اسٹیٹس سمبل نہیں اس لیے مسلم متوسط طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلاتے۔ اردو میڈیم میں آنے والے بچوں کی تو اکثریت ہی نچلے متوسط یا پس ماندہ گھرانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ طبقات غربت کے کے سبب اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتے ،یہی وجہ ہے کہ دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں ڈراپ آؤٹ (Drop out) کا مجموعی تناسب ۹۸ فی صد کے آس پاس ہے۔

آزادی کے بعد اردو کے مسائل سے متعلق اب تک کوئی مطالعہ ہندستان کی کسی یونی ورسٹی میں نہیں کیا گیا ہے۔ سماجیات کے متعدد اسکالرز نے مسلمانوں کے مسائل پر کام تو کیا مگر انھوں نے اردو کے حوالے سے اور معاشرتی تناظر میں مسلمانوں سے اس کے رشتے کو موضوع بحث بنانے سے اعماض کیا ہے۔ لہٰذا اردو کے اس انتہائی اہم مسئلے کا کوئی معروض مطالعہ اس وقت ممکن ہے جب تک مسلمانوں کے سیاسی و سماجی مسائل کے تناظر میں ان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے موجودہ سیاسی اور سماجی تناظر کے حوالے سے اردو کے مسائل کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے اتر پردیش میں ایک تفصیلی سروے کیا تھا ویسے تو یہ سروے صرف اتر پردیش تک ہی محدود تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ اس کے ذریعے صرف اتر پردیش ہی نہیں بلکہ تمام ہندستان میں اردو کے مجموعی مسائل کا مطالعہ کرسکوں میں اس سلسلے میں اردو کے تقریباً دو سو معروف اہل قلم حضرات سے ملا ان میں سے اکثر یا تو یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں سے تعلق رکھتے تھے یا پھر کسی درسرے (سرکاری) اداروں سے وابستہ تھے۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان سے گفتگو کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ انھیں اردو زبان کے حقیقی مسائل کا علم ہی نہیں تھا۔ ان میں سے اکثر نے اردو زبان کے موجودہ مسائل کا جو تجزیہ کیا اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے جن مراعات کا مطالبہ کیا ان کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے اپوزیشن کے چھُٹ بھیّے لیڈر راجدھانی سے دور واقع ہونے والے ہر حادثے کے لیے بغیر سوچے سمجھے وزیر اعظم سے استعفے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

میرے سروے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ کیا بدلے ہوئے حالات اور سماجی تناظر میں اردو مسلمانوں کی زبان بن کر نہیں رہ گئی ہے، اور اب اردو کی حفاظت بھی مسلمانوں کو ایسے ہی کرنا پڑے گی جس طرح وہ اب تک ہندستان میں اسلام کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ بیشتر مخاطب یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھے کہ اردو اب عملاً صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان میں سے اکثر کا بے حد بودا اور طفلانہ استدلال یہی تھا کہ اردو کا چوں کہ ایک سیکولر کردار اور تاریخ ہے اس لیے ماضی کی طرح وہ آج بھی ہندو، مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔ ایسے ٹیپ کے بند تو سبھوں نے لگائے کہ اردو ہندی تو سگی بہنیں ہیں اور دونوں ہندستان کی زبانیں ہیں وغیرہ، وغیرہ۔ ان حضرات سے گفتگو کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ انھوں نے زندگی میں پہلے کبھی سنجیدگی سے اردو کے کسی مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ جن لوگوں کے بارے میں میرا خیال ہے کہ انھیں کسی حد تک مسئلے کی فہم تھی، انھیں نے بھی اتر پردیش میں اردو کی تباہی کی بیشتر ذمّے داری خود اردو والوں پر ڈالی۔ البتہ یہ بات تقریباً ہر شخص نے کہی کہ اتر پردیش کے اردو دانوں نے آزادی کے بعد (اردو سے متعلق) صرف سرکار کے وعدوں پر تکیہ کیا اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ اردو والوں کے خود کچھ نہ کرنے کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض حضرات نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ جب اردو داں حضرات ہی اپنے بچّوں کو اردو نہیں پڑھاتے اور اردو کے اخبار و رسائل خرید کر پڑھنا اپنی کے شان کے خلاف سمجھتے ہیں تو پھر دوسروں سے کیا شکوہ؟ اردو والوں کے ذریعے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے یا نہ پڑھانے کا مسئلہ صرف یوپی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اپنے بچوں کو اردو نہ پڑھانے والے 'اردو والے' پورے ملک میں اعلیٰ طبقے کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل اردو صرف اس لیے پڑھی تھی کہ اس وقت اردو پڑھنا منفعت بخش تھا۔ یہاں میں ضمناً بعض ایسے امور کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جن کا فی الوقت اردو کے مسئلے سے گہرا تعلق ہے مثلاً آج کل یہ بات بہت عام ہے کہ جنوبی ہند اور بہار میں اردو والوں نے اردو کو زندہ رکھا ہے۔ ایسا کہتے ہوئے ذہنی طور پر اردو والوں پر اردو والوں سے ہماری مراد مسلمانوں سے ہوتی ہے کیوں کہ جنوبی ہند میں (بلکہ پورے ہندستان میں) کوئی ایک اردو اسکول بھی ایسا نہیں جس نے مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسرے مذہبی فرقے نے قائم کیا ہو۔ بہار میں تو اردو کو زندہ رکھنے کا کام خصوصاً دینی مدارس و مکاتب نے کیا ہے۔ بہار میں دینی مدارس و مکاتب کی مجموعی تعداد ہزاروں میں ہے جب کہ اتر پردیش میں حالات مختلف ہیں۔ جب ان مدرسوں سے اردو پڑھ کر اور فیضل امتحان پاس کر کے بڑی تعداد مین مسلم نوجوان بے روزگار مارے مارے پھرنے لگے تب بہار میں اردو کا مسئلہ اس موڑ پر پہنچا کہ اسے بہار میں دوسری زبان کا درجہ دینا پڑا۔ اتر پردیش میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملے ہوئے کئی سال ہوے کو ہیں مگر اس پر عمل در آمد کی منزل ابھی کوسوں دور ہے مقدمہ چونکہ عدالت میں زیر سماعت ہے یوں کسی عوامی دباؤ کا بھی سوال نہیں اٹھتا اور یوپی کا مسلمان اب اردو کے مسئلے پر مزید توانائی برباد کرنے کے موڈ میں بھی نظر نہیں آتا۔

بہار کے تجربات سے ہی یہ پتہ چلا کہ اردو کے دوسری سرکاری زبان ہونے کا مطلب اور اہمیت موجودہ سماجی تناظر میں چند لوگوں کو روزگار ملنے سے

زیادہ کچھ نہیں ہے، کیوں کہ اوّل تو مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ ہے، دوئم جب ہندی (جو ہندستان کی راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہے) تک بھی روزگار ملنے کی ضمانت نہیں بن سکی پھر اردو کس کھیت کی مولی ہے؟ اردو زبان کے مسائل کا تجزیہ کرنے کی طویل مشق کے بعد میرا تجزیہ یہی ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں سے بڑی غلطی یہی ہوئی کہ انھوں نے واضح اور دو ٹوک انداز میں اردو کو اپنی زبان تسلیم نہ کرکے اس کے لیے جدو جہد کا غلط لائحہ عمل مرتب کیا۔ اس سیاق و سباق میں اس اہم واقعے کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق اردو کو آئین کے آٹھویں جدول میں شامل کیے جانے سے ہے۔ آئین ساز کمیٹی کے اجلاس میں اردو کو شامل کیے جانے کے سوال پر راجستھان کے بزرگ کانگریسی سیٹھ گوونداس نے کڑک کر پوچھا تھا کہ اردو کو ہندستان کے آئین میں جگہ دینے اور تسلیم کرنے کا جواز کیا ہے؟ یہ ہندستان کے کس شہری کی زبان ہے؟ سیٹھ گووند داس کے سوال پر پنڈت نہرو نے بے حد جذباتی ہو کر جواب دیا تھا کہ یہ میری نانی اور ماں کی زبان ہے۔ اگر پنڈت نہرو کی ماں اور نانی کی مادری زبان اردو تھی تو پنڈت نہرو کی مادری زبان کیا ہوئی؟ اس سیدھے سوال کا سیدھا جواب دینے کی ہمت اس وقت کے حالات اور ان کے سیاسی مفادات نے پنڈت نہرو میں نہیں چھوڑی تھی۔ پاکستان کے قیام نے قوم پرست ہندستانی مسلمانوں کو تقسیم وطن کے ناکردہ گناہ کی مجرم ضمیری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس وقت جب ہندستانی مسلمانوں کا مذہبی تشخص ہی متعدد خطرات میں گھرا ہوا تھا اور ان کی حب الوطنی مشکوک تھی (جو آج بھی ہے) ایسے میں وہ اردو کو جس پر ہندستان کی تقسیم کا الزام عائد کیا جا چکا تھا، اردو کو اپنی زبان کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے، پھر بھلا ہندستان کے وزیر اعظم میں اتنی ہمت کہاں سے آتی جنھیں اپنی آئندہ نسلوں کے لیے اقتدار کی راہیں بھی ہموار کرنا تھیں، یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد لاہور یا جنوبی پنجاب کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے ہوئے ہندو پنجابیوں نے اردو کا بہت ساتھ دیا لیکن ان میں سے کسی ایک پنجابی کی بھی مادری زبان اردو نہیں تھی اور انھوں نے اردو کی مارکیٹ ویلیو (market value) ختم ہو جانے کے بعد اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھائی۔ آج بھی اردو کے نام پر زیادہ سے زیادہ مراعات یہی طبقہ حاصل کر رہا ہے۔ اتر پردیش میں اردو کے تقریباً ختم ہونے کا اہم سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کے متوسط اور تعلیم یافتہ طبقات نے سب سے زیادہ یہیں سے پاکستان ہجرت کی اور یہاں رہ جانے والے لوگوں میں تعلیم کا تناسب تقریباً صفر تھا، آزادی سے قبل جو غریب مسلمان مدرسے میں اردو پڑھ رہا تھا وہی آج بھی اور اسی طرح اسے پڑھ رہا ہے۔

سروے میں مخاطب حضرات سے میرا سب سے اہم اگلا سوال یہ تھا کہ کیا آئندہ بھی ہندستانی مسلمانوں کو اردو کی حفاظت ایسے ہی کرنا ہوگی جیسے وہ اب تک ہندستان میں اسلام کی حفاظت کرتے رہے ہیں؟ بیشتر حضرات نے چونکہ براہِ راست یہ تسلیم ہی نہیں کیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس لیے وہ اس سوال کا جواب بھی دو ٹوک الفاظ میں دینا نہیں چاہتے تھے۔ 'کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟' اس سوال سے جڑے ہوئے کچھ اور سوال بھی ہیں جن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا اتر پردیش میں اردو دس پانچ سال سے زیادہ زندہ رہ سکے گی؟ اتر پردیش میں کل تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مشکل سے دس فی صد ایسے ملیں گے جنھوں نے ایک مضمون کے طور پر اردو کا مطالعہ کیا ہو، پورے اتر پردیش میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دو جونیر اور ایک ہائی اسکول کے علاوہ اردو میڈیم کا ایک بھی پرائمری، جونیر یا ہائی اسکول نہیں ہے۔ پورے اتر پردیش کے کسی کالج یا یونی ورسٹی کے اردو شعبے میں کبھی کلاسیں پابندی سے نہیں لگتیں اور بی، اے، کی سطح تک ادب کے بیش تر طالبِ علم کلاس نوٹس ہندی میں تیار کرتے ہیں۔ اس وقت اردو میں پی، ایچ، ڈی، کی حالت دنیا میں سب سے زیادہ خراب ہندستان میں ہی ہے۔ (بھارت مہان) کی ہر یونی ورسٹی اردو میں پی، ایچ، ڈی، کرنے کے خواہش مند ہر گدھے، گھوڑے کو داخلہ دے دیتی ہے۔ اردو کے فروغ کے نام پر قایم ہونے والے تمام سرکاری ادارے ہر طرح کی بد عنوانیوں اور جعل سازیوں کے اڈے بنے ہوئے ہیں اور اردو کے اہلِ قلم کہلانے والوں میں ان کی رکنیت کے لیے ہوڑ سی لگی رہتی ہے۔ اردو کے لیے جدو جہد کرنے والی انجمنوں کا حال بھی ویسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کے مفادات کے نام پر سیاسی ٹھیکے داری کرنے والی جماعتوں اور اداروں کا ہے کہ جدو جہد کا تمام تر مقصد ہی سرکار سے سودے بازی کرنا ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اب عام اردو والا اردو کے نام پر جدو جہد کی دعوے دار کسی پارٹی یا شخص کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے لے کر حیات اللہ انصاری تک اس نے تمام نام نہاد عمائدین اردو کو اپنی قیمت خود لگا کر سرکار سے وصول بھی کرتے دیکھا ہے۔ اردو کی موجودہ صورتِ حال میں کیا یہ سوال اہم نہیں کہ جو زبان صرف نعروں، وعدوں اور لائبریریوں کے بل پر چل رہی ہو وہ کتنے دن تک اور زندہ رہ سکتی ہے۔ جواب بالکل سیدھا ہے کہ اب اتر پردیش میں تو اردو کا اللہ حافظ ہے۔ البتہ جنوب میں اردو کی حالت فی الحال ٹھیک ٹھاک ہے مگر سرکاری اردو والے یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ حقیقتاً میں اردو کی حالت 'لب دم مریضِ عشق' کی سی ہے، امید کا دامن اس وقت تک ہاتھ سے چھوڑنے کو تیار نہیں جب تک اس کا چہلم نہ ہو جائے۔ ایک لمبے عرصے تک اردو سے جذباتی اور اس کی ترویج و ترقی کی عملی جدو جہد سے قریب کا تعلق رکھنے والے مسلم نوجوان کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے کہ کچھ نہ کر سکنے کی حالت میں بھی مسلمان اردو کے بارے میں سچ سننے کو تیار نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنی لیڈر شپ پر وہ اب ذرہ بھر بھی یقین نہیں رکھتا مگر ہر بار خون دے کر اس کی آبرو بچا لیتا ہے۔ "یادش بخیر" ۱۹۸۹ء میں اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا نام نہاد قانونی درجہ دینے کا اندازہ مجھے بابری مسجد مسئلے کے طول پکڑتے اور بڑھتے دیکھ کر ہو گیا تھا اور جب میں نے مہینوں پہلے دلی کے ہندی

روزنامے "نوبھارت ٹائمز" میں اس موضوع پر مضمون لکھا کہ اب جلد ہی اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا رہا ہے تو کئی دوستوں نے اسے 'مجذوب کی بڑ' قرار دیا تھا۔ شاید ان کے دلوں میں ایک طرح کا خوف بھی تھا جو بدایوں کے اردو فساد کے بعد حقیقت میں بدل گیا۔ اس مضمون میں میں نے جو مشورے دیے تھے ان کی افادیت آج بھی برقرار ہے کہ اردو کے تحفظ کا صرف ایک طریقہ ہے کہ پہلے ہم سخت اور پتھریلی زمین پر کھڑے ہو کر خوش فہمی کے حصار سے نکلیں اور اپنے مسائل کا تجزیہ کریں۔ میں نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا وہ چند ہفتوں بعد ہی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ میں نے اس وقت یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ اردو کے دوسری سرکاری زبان بن جانے کے بعد دفتروں میں کلرکوں، ٹائپسٹوں وغیرہ اور اسکولوں میں پرائمری سطح سے اعلیٰ سطح تک اساتذہ کی بڑی تعداد میں ضرورت ہوگی وہ کہاں سے آئیں گے؟ دینی مدارس کے تعلیم یافتہ طالب علم عربی، فارسی، میں تو مہارت رکھتے ہیں مگر ہندی اور انگریزی دونوں میں سے کوئی بھی زبان نہیں جانتے۔ ان میں سے بیش تر کبھی اسکول کالج یا یونی ورسٹی تک نہیں پہنچ سکے۔ یونی ورسٹیاں دینی مدرسوں سے فارغ التحصیل طلبہ کو اپنے یہاں داخلے کا اہل قرار نہیں دیتیں، اور دے بھی نہیں سکتیں۔ سید حامد نے پہلی بار (محدود سطح پر ہی سہی) دینی مدارس کی ڈگریوں کے ذریعے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلے کی راہ ہموار کی تھی۔ کچھ دینی مدارس کی ڈگریوں کو جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی تسلیم کرتی ہے مگر عملاً دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان یونی ورسٹیوں سے فیض کم ملتا ہے۔ سرکاری طور پر اردو کو یوپی، اور بہار میں دوسری زبان کا درجہ ملنے کے بعد استعمال میں آنے کے لیے کم از کم ایک اور نسل کا انتظار کرنا ہوگا یا پھر دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ان لوگوں کی بھرتی کھولنا ہوگی جو ہندستان میں عملاً استعمال کی دو زبانوں (ہندی، انگریزی) میں سے کوئی ایک زبان بھی نہیں جانتے۔ اس سے دفتروں میں اور زیادہ تکنیکی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔

یوں بہ حیثیت مجموعی ہندستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ مکمل طور پر مسلمانوں سے وابستہ ہو جانے کے بعد اسے زندہ رکھنے اور اس کے لیے جدّوجہد کرنے کی ذمّے داری صرف مسلمانوں پر آجاتی ہے، مسلم لیڈر شپ کے عاقبت نااندیش رویّوں کی وجہ سے تو ہندستان میں مسلمانوں کا مستقبل ہی بے حد مخدوش ہے۔ مسلمانوں میں اس طرح کی رضاکار انجمنوں کا بھی فقدان ہے جو اردو کی طرح خطروں میں گھری ہوئی کسی زبان کی حفاظت کر سکتی ہیں ایسے میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا تو ممکن ہو نہیں ہے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا مستقبل مسلمانوں کی مذہبی انجمنوں اور جنوبی ہندستان اور بہار کے مسلمانوں کے روّیے پر بھی کافی کچھ منحصر ہے۔ میں جنوبی ہند کی ریاستوں اور بہار کے علاوہ ان تمام علاقوں جو اردو کے نئے مراکز ہیں، میں اردو کے بہت درخشاں اور تابناک مستقبل کا خواب نہیں دیکھتا۔ جنوبی ہند کے کچھ شہروں (جو اردو کے روایتی مراکز بھی ہیں) کے علاوہ زیادہ تر نئے مراکز اور بہار کے ہاتھوں اردو کے مستقبل کو گروی رکھ دینا عقل مندی نہیں، اردو کے مستقبل پر بات کرتے ہوئے ہمارے اردو دانش ور over simplification کی روایت کی بنیاد پر کہہ دیتے ہیں کی شمالی ہند کے مسلمانوں نے تو اردو کی قبر کھود دی ہے اور اب یہ یا تو بہار میں زندہ رہے گی یا پھر جنوبی ہند میں۔ کچھ لوگ اگلی ہی سانس میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اردو کا مرکز ایک بار پھر شمال سے جنوبی ہند کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ بات اتنی سیدھی نہیں ہے۔ جنوبی ہند میں اردو کے جس قدیم مرکز کی بات کی جاتی ہے وہ صرف اس حد تک ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ جنوبی ہند کے کچھ بڑے شہروں میں اردو کا رواج رہا ضرور ہے مگر بہت محدود۔ تقسیم ہند کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں دوسرے فرقوں خصوصاً دوسری اقلیتوں کی بہ نسبت مسلمان کہیں زیادہ پس ماندہ ہو گیا اور اردو لگ بھگ مردہ زبان بن کر رہ گئی۔ اردو کے ساتھ ایک اور بدقسمتی یہ تھی کہ تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمان اپنے اندر اردو کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکے اور خوف کے ماحول میں سانس لے رہے مسلمانوں کے مسئلوں میں اسلام، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی' پرسنل لا وغیرہ کی طویل فہرست میں اردو کوئی مقام نہ پا سکی۔ تقسیم کے بعد کافی عرصے تک تو ہندستانی مسلمان اس خود فریبی کے سہارے خود کو دلاسا دیتا رہا کہ اردو کی حفاظت سیکولر، اور آزادی سے پہلے پیدا ہونے والے اور جنوبی پنجاب سے آنے والے، ہندو کریں گے۔ مگر ۱۹۸۰ء کے آس پاس جب یہ سہارا بھی ٹوٹنے لگا تو جنوبی ہند اور بہار وغیرہ میں اردو کی لہلاتی کھیتی کے پُر فریب نعروں کی آغوش میں مسلمانوں نے پناہ لی۔ زمین کی پتھریلی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے جماعت اسلامی نے شمالی ہند کے موجودہ یعنی اردو سے تقریباً بے بہرہ نئی نسل کے لیے نماز وغیرہ کی کتابیں ہندی میں شائع کرنا شروع کر دی ہیں۔ جنوبی ہند کی ریاستوں میں اسلامی ادب خصوصاً قرآن وغیرہ کے تراجم علاقائی زبانوں میں بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔ کچھ ایسے علاقوں (جن میں بہار بھی شامل ہے) جہاں علاقائی بولیاں زبان کی شکل اختیار کر کے مذہبی ادب کی اشاعت کی اہل نہیں بن سکی ہیں ان میں اسلامی ادب اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مگر ایسا صرف ان لسانی خطوں میں ممکن ہے جہاں اردو کے ساتھ (مسلمانوں کی) کسی علاقائی زبان کے تصادم کا خطرہ نہیں ہے۔ جن ریاستوں میں شدید علاقائی عصبیت ہے اور علاقائیت کے رجحانات بے حد طاقت ور ہیں، وہاں اردو کی جگہ علاقائی زبانوں کو ہی اسلامی ادب کی اشاعت کا ذریعہ بنایا گیا ہے تاکہ اردو کے ساتھ کسی علاقائی زبان کا تصادم نہ ہو۔ ہندستان میں آج حیدر آباد جیسی چھوٹی بڑی ریاستیں بھی اردو کی سرپرستی کرنے کے لیے موجود نہیں ہیں۔ پھر جنوب ہند میں کل کون سے نئے علاقائی رجحانات اور تنازعات سر اٹھائیں گے کہنا مشکل ہے۔ برصغیر میں مذہب اور زبان گذشتہ نصف صدی میں

کئی نئے گل کھلا چکے ہیں۔ مذہب کے نام پر مشرقی بنگال کا ہندوستان سے الگ ہو جانا، ساتھ ہی زبان کے نام پر پاکستان کے دو لخت ہونے کے حادثات کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گذری اور ہند و پاک دونوں ہی ممالک میں متعدد نئے لسانی تنازعات سر ابھار رہے ہیں۔ بہار جیسی پس ماندہ ریاست سے اشرافیہ طبقے (elite ethos) کی زبان اردو کے تحفظ کی توقع احمق پن کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح کی توقعات ایک مرتبہ پھر شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن دبا کر مسئلے کے ٹل جانے کی خود فریبی میں مبتلا ہونا ہے۔

دینی مدارس جو ہندوستانی ہند میں بھی بڑی تعداد میں ہیں، اردو کی حفاظت کے لیے ان کو متحد کر کے نہ صرف اردو کو بچایا جا سکتا ہے بلکہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کی رفتار میں بھی کئی گنا تیزی لائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی مسجد میں ایک مکتب ضرور ہوتا ہے۔ بالعموم بڑے بڑے شہروں کی مساجد میں شبینہ مکاتب ہوتے ہیں۔ ہندو فرقہ واریت اور احیاء پرستی کے فروغ کے ساتھ ہی ان مکاتب کے طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس مکتبی نظام کی تنظیم نو کے ذریعے اسے تبلیغی جماعت جیسے ملک گیر اثرات رکھنے والی تحریک سے وابستہ کر کے اردو تعلیم کے میدان میں انقلابی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں مگر اس کے لیے بڑی جرأت اور تبلیغی جماعت کے مقاصد میں تبدیلی کی سخت ضرورت ہے۔ تبلیغی جماعت کا مسلم عوام سے چونکہ براہ راست تعلق ہے اس لیے مسلمانوں میں تعلیمی توسیع اور اردو کے تحفظ میں اس جماعت اور مکاتیب کا رول بہت اہم ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ وسائل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی اور مسلم آبادی کی تعلیمی طور پر پس ماندگی اکثریت کو مذہب کے نام پر تعلیم کی طرف راغب کرنا بھی آسان ہوگا ہندوستان میں اردو کا تحفظ اب صرف اسلام اور مذہبی جماعتوں کے ذریعے ممکن ہے۔ ☆☆

(۲)

اطہر فاروقی کا یہ عملی سروے کئی سال پیشتر کا ہے لیکن انہوں نے اس میں جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں سے بعض بہت بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جن پر مکالمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان مسائل پر گفتگو تو ہوتی ہے اور کتب و رسائل میں مضامین و مباحث بھی آتے رہتے ہیں۔ سیمینار اور کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے اور وہ تیزی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ مہاراشٹر میں زبردست تعلیمی بیداری آئی ہے۔ اردو کی صورت حال اس صوبے میں اب بھی دوسرے صوبوں سے بہتر ہے۔ ممبئی خصوصیت سے اردو کا ایک اہم مرکز بنا ہوا ہے۔ یوپی میں اردو کا معاصر منظر نامہ گذشتہ سے قدرے بہتر ہوا ہے حالانکہ وہاں کے مدرسوں اور عبادت گاہوں کو مسلسل قانونی ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ سانحۂ بابری مسجد کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے فکر و عمل میں بھی خاصی تبدیلی آئی ہے۔ تبلیغی جماعت ہو یا جماعتِ اسلامی یا ایسے ہی بڑے مذہبی ادارے ہندوستانی سطح پر اردو کے لئے کام کر سکتے ہیں جبکہ ان کا بنیادی مقصد تو کچھ ہے۔ اس کے لئے علاقائی زبانیں اب ان کی معاون ہو رہی ہیں اور یہ ضروری بھی ہے تاہم مذہبی اداروں اور جماعتوں نے اردو رسم الخط کے تحفظ کے لئے بطور خاص کام نہیں کیا ہے۔ یوپی میں اگر اردو باقی ہے تو وہ مدرسوں ہی کی بدولت ہے لیکن یہ رشتہ بھی کمزور پڑ رہا ہے۔ ہمارا موقف یہی ہے کہ اردو، ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ بہر حال! اردو کے لئے، اردو کے چند ایک مجموعی بنیادی مسائل پر مل کر کام کریں تو یہ ہندوستان کے لئے، اقلیتوں کے لئے، اردو اور ہندی کے لئے مفید ٹھہرے گا۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل اب بھی تاریک میں ہے۔ (الف۔الف)

ہندوستان میں اردو کے معیاری رسائل بقدرِ کافی موجود ہیں لیکن ابھی تک ان کی ایک مرکزی انجمن قائم نہیں ہو سکی ہے۔ صوبوں میں بھی انجمن قائم ہیں وہ بھی محدود ہے چند ضرورت ہے کہ اخبارات اور رسائل کی علیحدہ علیحدہ دو انجمنیں قائم ہوں اور سال میں دو مرتبہ ان کے مدیر ایک جگہ جمع ہوں انجمن کا اجلاس مختلف مقامات پر ہو۔ رسائل اور اخبارات چونکہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اس لئے ان کو باہم ملا دینا ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ اخبارات کے دل اور نظام کار ان کی پالیسی کے تحت کبھی ایک نہیں ہو سکتے لیکن رسائل چونکہ ادبی خدمت کرتے ہیں اس لئے ان میں اشتراک عمل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے ادب میں یکگونہ منظم ترقی ہو سکتی ہے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ رسائل اپنا ایک فنڈ بھی قائم کریں اور ہر رسالہ کچھ ماہانہ رقم اس فنڈ میں بھیج دیا کرے وہ روپیہ دوسروں کو تجارت کے لئے دیا جائے اور منافع بڑھانے کی کوشش کی جائے اس طرح وقت ضرورت ہر رسالہ کا ایڈیٹر فنڈ سے روپیہ قرض لے سکتا ہے، اور اس طرح وہ رسالے جو دو چار سال نکل کر بند ہو جاتے ہیں یا جن کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے تقویت پا سکتے ہیں۔ اگر میرا تجویز کردہ خیال کچھ منفعت بخش ہے تو میں تمام مدیران رسائل کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ دیگر معاصرین بھی اس باب میں تبادلہ خیال فرمائیں گے۔

مدیرانِ ادبی رسائل کو دعوتِ عمل

یہ تحریر ماہنامہ شاعر کے تاریخ ساز کالم 'جرعات' (مطبوعہ: جون ۱۹۳۷ء آگرہ صفحہ ۹) کا ایک اقتباس ہے۔ ماضی میں کیا ہوا اس سے قطع نظر محترم اعجاز صدیقی (مرحوم) کی یہ تجویز آج کی اہم ضرورت ہے بلکہ ناگزیر ضرورت ہے۔ ہم نے آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس (دہلی) کو ادبی رسائل کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی گزارش کی تھی جسے اردو ایڈیٹرس کانفرنس نے منظور کر لیا ہے۔ ہمیں مدیران رسائل کا تعاون درکار ہے۔ (ادارہ)



حبیب کیفی

عمر کو باندھے ہوئے بیٹھے رہے تیرے لیے
ہیں ابھی قصّے بہت سے ان کہے تیرے لیے

بول اے سریو کنارے کی زمین تو کچھ تو بول
کیا ضروری ہے کہ پھر کچھ خوں بہے تیرے لیے

ہوگئے تبدیل اشکوں میں نہ جانے کس طرح
جو بچا رکھے تھے میں نے قہقہے تیرے لیے

ہم کو ہے معلوم اوّل تا ابد ایک ایک بات
کہہ تو سکتے تھے مگر، ہم چپ رہے تیرے لیے

کسی دن پوچھنے کے واسطے ہی یہ سوال
تم ایسے بول کتنوں کے سہے تیرے لیے

● 159- ZAKIR HUSAIN COLONY,
5th CHOPASIA ROAD JODHPUR (RAJ)



راشد جمال فاروقی

تمہارا دم نہیں گھٹتا سدا کی عجلت سے
کبھی تو آؤ کہ بیٹھیں ذرا سی فرصت سے

یہ کس عذاب کی دستک نے پھر سے چونکایا
ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے اس قیامت سے

وہ دن بھی آئے ہمیں اجنبی لگیں خود کو
کہ خوش ہیں یوں تو بہت بھولنے کی عادت سے

اسے سراب مسرت نے خوب دوڑایا
وہ آشنا ہی کہاں تھا غموں کی لذت سے

یہی کہ چاہتے ہیں اور پا نہیں سکتے
ہمیں بھی ایک تعلق ہے جاہ و حشمت سے

نہ جانے کون سے دن دیکھنا پڑیں راشد
بعید کچھ بھی نہیں ہے ہماری قسمت سے

● A-1496 - IDPL - RISHIKESH
(DEHRADUN) 249202

انور حسین انور

کبھی زندگی ہے گلاب سی کبھی زندگی ہی کپاس ہے
اسے دیکھ شکر کی آنکھ سے تیرے جسم پہ جو لباس ہے

ابھی گم شدہ ہیں کہانیاں ترے آدمی کے مقام کی
کہیں صورتیں ہیں کھلی ہوئی کہیں آئینہ بھی اداس ہے

مری مٹھیوں میں جو بند ہے وہی آدمی کو پسند ہے
یہ بھرم کی بات ہے زندگی یہاں کون چہرہ شناس ہے

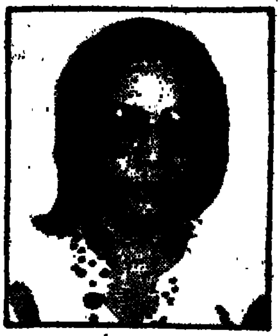
ابھی انقلاب وہ آئے گا جو نئے چراغ جلائے گا
مری بات ہیں صداقتیں تیرا وہم ہے کہ قیاس ہے

تجھے لفظ لفظ پڑھا کروں تجھے حرف حرف لکھا کروں
یہی خواہشیں مرے ساتھ ہیں مرے دل میں بس یہی آس ہے

میں دھنک دھنک ہوں کھلا ہوا ترا نغم ہے مجھ سے ملا ہوا
تری خوشبوئیں مرے ساتھ ہیں تری روشنی میرے پاس ہے

جسے ریت ریت گذرنا ہے! وہی دریا ہے مری ذات میں
جو سمندروں پہ کھلی نہیں مرے ساتھ ساتھ وہ پیاس ہے

● 100 - CHATTA
ALI RAZA, MEERUT (U.P.)



فیہ صدیقی
8-TWYFORD ABBE... AD
LONDON-NW10 M... .)

چھوٹی سی بات

ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں برائٹن پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی اور جب میں ڈھائی گھنٹہ کار میں مقید رہنے کے بعد اتری تھی تو سمندری ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تھا اور میری تمام کلفت لمحہ بھر کو دور ہو گئی تھی۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اپنے سب سے بڑے بیٹے سے ملنے ویکنڈ پر آئی تھی۔ جس نے حال ہی میں ایک فلیٹ خریدا تھا جو سمندر کے کنارے واقع ایک بلڈنگ میں تھا۔ میرے چھوٹے بیٹے کو سمندر کے کنارے والے اس فلیٹ کو دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا کہ وہ پہلی فرصت میں اسے دیکھنے آ پہنچا تھا اور ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹ لایا تھا۔ فلیٹ کشادہ اور ہوادار تھا، جدید سہولتوں سے آراستہ میرے بڑے بیٹے کو گھر صاف ستھرا رکھنے کا جنون تھا۔ اب تو خیر اس کی شادی ہو چکی تھی۔ لہٰذا اکا دکا چیزیں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں ورنہ جب وہ اکیلے کرائے کے فلیٹ میں رہتا تھا تب وہ اسے اتنا صاف ستھرا اور سجا سجایا رکھتا تھا کہ میں ہمیشہ اس کے یہاں جا کر شرمندہ شرمندہ سی ہوتی تھی۔ میرے چھوٹے بیٹے نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کدھر ہے سمندر، مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔" وہاں تو حد نظر تک اونچی اونچی عمارتیں تھیں اور دور پرے رہائشی مکانوں کی چھتیں۔

"تم تو پشت کا حصہ دیکھ رہے ہو، ادھر تو ہوٹل ہیں اور دور گھروں کی چھتیں" میں نے اسے بتایا۔ "سمندر تو برابر میں ہے، وہ کھڑکی سے نظر نہیں آ سکتا، صرف ساحل نظر آتا ہے تھوڑا سا"۔

"رات میں سن لینا کہ کتنا نزدیک ہے" میرے بڑے بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم تو اب عادی ہو گئے ہیں مگر کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ سوئچ ہوتا تو اسے تھوڑی دیر کو آف کر دیتے"۔

کھانے کی میز پر وہ بتا رہا تھا کہ دو سال میں وہ گھر خریدنے کی کوشش کرے گا۔ فی الحال اسی فلیٹ میں گزر ہو جائے گی۔ وہ ہنس ہنس کر بتا رہا تھا۔ "اس بلڈنگ میں رہائش پذیر لوگوں کی "ایوریج ایج" ستر ہے۔ یہاں پر سب ریٹائرڈ لوگ رہتے ہیں۔"

"پیسے والے ریٹائرڈ لوگ" میں نے کہا۔

"اں۔ برائٹن میں ریٹائر منٹ کے بعد اور کون رہائش اختیار کر سکتا ہے"۔ پھر دونوں بھائی باتیں کرنے لگے، ملازمت کی، تعلیم کی، اسکول کی، دوستوں کی، ٹیچروں کی، اسکول کی کرکٹ ٹیم کی، فٹ بال ٹیم کی۔ اب وہ بچپن کی باتیں کر رہے تھے کہ گفتگو کے دوران میرا بڑا بیٹا بولا۔

"یہاں آ کر تو ممی ڈیڈی بھی انگریزوں کی طرح ہو گئے تھے، جیسے انگریز بس کام کرنا چاہتے ہیں پیسہ جمع کرنے کے لئے تاکہ وہ ہالی ڈے پر جا سکیں، اسی طرح یہ بھی پیسہ جمع کرنے کی دھن میں لگ گئے تھے۔ ممی نے بھی نوکری کر لی تھی اور جب ہم اسکول سے آتے تھے تو گھر خالی ہوتا تھا۔ میں سب سے بڑا تھا اس لئے کنجی میرے پاس ہوتی تھی گھر کھولنے کے لئے۔ ہم تینوں کو گھر خالی اور ٹھنڈا ملتا تھا، میں ہیٹر آن کرتا تو کہیں جا کر آدھے گھنٹے میں کمرہ گرم ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سینٹرل ہیٹنگ عام نہ تھی اور ہم پرانی سی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ممی آتی تھیں کہیں۔" میرے دل میں ایک دم سے سوئیاں سے چبھ گئیں اور آنکھیں بھر آئیں۔ "مگر بیٹا۔ یہ بھی تو ہماری مجبوری تھی۔ کوئی میں شوق کی وجہ سے تھوڑی نوکری کرنے لگی تھی"۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ میری بہو نے مجھے پانی کا گلاس بڑھایا۔ میں نے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ پھر بولی ۔ "تمہیں معلوم ہے میری کس طرح پرورش ہوئی تھی؟ پاکستان میں تو میں کبھی گھر سے اکیلے نہیں نکلی، کہیں جاتی تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا۔ کبھی بس سے سفر نہیں کیا۔ کبھی شاپنگ کے لئے بازار نہیں گئی۔"

"اپنے لئے بھی شاپنگ نہیں کرتی تھیں؟" میرے چھوٹے بیٹے نے پوچھا۔

"میں گروسری کی بات کر رہی ہوں اور کپڑے جوتے خریدنے بھی اکیلے نہیں گئی۔ ہمارے یہاں شریف عورتیں تو گروسری کی شاپنگ کے لئے جاتی ہی نہ تھیں۔ یہ کام صرف گھر کے لڑکے یا مرد یا پھر نوکر کرتے تھے اور جب میں چھ سات برس کی تھی اس وقت ہم ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے، وہاں تو کپڑے جوتے خریدنے کے لئے بھی شریف خواتین کا باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔"

"تو پھر آپ لوگ کیا کرتی تھیں۔" بہو نے سوال کیا۔

"تم یقین نہیں کرو گی مگر سب سامان گھر پر آ جاتا تھا۔ جیسے لڑکیوں

کے لئے جوتے چاہیئے تو دکان پر کھلوا دیا گیا، وہاں سے پندرہ بیس جوتوں کے ڈبے آگئے، لانے والے نے جوتے پہنائے، جو پسند آئے، فٹ ہوئے وہ خرید لئے گئے، بقیہ واپس چلے گئے۔ بس ہر چیز کی ایک دکان تھی اس شہر میں۔"

"وہ لاتا کیسے تھا یہ سامان؟"

"اب مجھے یہ تو یاد نہیں۔ غالباً سائیکل پر بالکل یاد نہیں۔ کپڑے کے تھان کے تھان آجاتے تھے ہر طرح کے، اسی طرح زیور وغیرہ بھی، عورتوں کی کنگھی چوٹی کا سامان اور چوڑیاں وغیرہ بھی۔ ابو کے انتقال کے بعد ہم لوگ نانا کے پاس رہتے تھے اور شہر کے سب لوگ انہیں جانتے تھے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے مگر" بڑے بیٹے نے بڑے سکون سے میری بات سن کر سر ہلایا۔

The Fact remains that we came to an empty house, you were not there for us.

"مگر بیٹا۔ ذرا میری بیک گراؤنڈ دیکھو، اور میرا لندن شہر کی سڑکوں پر مارے مارے پھرنا، بسوں میں دھکے کھانا، شاپنگ کے لئے، نوکری کے لئے۔ مجھے نوکری بھی نہیں ملتی تھی اور جو ملی وہ کرنی پڑی۔"

"نوکری کیوں نہیں ملتی تھی آپ کو؟" میری بہو کا سوال تھا۔ "آپ تعلیم یافتہ تھیں۔"

"بھئی اس وقت کا جو حال تھا یہاں وہ تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں صاف صاف کہہ دیتے تھے۔ وی ڈونٹ ایمپلائے کلر لیڈیز۔ پھر میں نے تو کبھی کوئی کام کیا بھی نہیں تھا، کوئی تجربہ نہیں تھا اور میں نے کوئی خوشی سے ہالی ڈے پر جانے کے لئے تھوڑی نوکری کی تھی۔ میں نے تو گھر والوں کو بتایا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو صرف اس لئے پیسہ کمانے کی کوشش کی کہ پہلے تو ہم لوگ واپس جانا چاہتے تھے، پھر جب یہ احساس ہوا کہ تم لوگوں کا وہاں جانے میں پڑھائی کا نقصان ہوگا تو ہم نے سوچا کہ فلیٹ میں کب تک رہیں گے کیوں نہ گھر خریدنے کی کوشش کی جائے تاکہ تم لوگ آرام سے رہ سکو۔ تم کو کم سے کم یہ تو احساس ہونا چاہیئے کہ میں مزدوری کرنے نکلی تو کیوں نکلی۔ تم لوگوں کے لئے"۔ میرے دل پر ایک سیل سی آن گری تھی۔ ان کمبختوں کے لئے کیا کیا تکلیفیں سہیں اور کتنے کتنے ذہنی عذابوں سے گذری ہوں، اور یہ کچھ نہیں سمجھتے، ہمارے احساسات کا، ہماری کٹھن زندگی کا انہیں کوئی اندازہ نہیں۔ میرا بڑا بیٹا کہہ رہا تھا۔

"ممی آپ تو جذباتی ہو جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ نے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں بٹ دی فیکٹ ریمینز (But the fact remains) کہ آپ گھر پر نہیں ہوتی تھیں اور ہمیں سرد اور خالی گھر ملتا تھا۔ اسکول سے آکر ہمیں آپ کی بہت ضرورت محسوس ہوتی تھی اور ہم آپ کو بتا نہ پاتے تھے"۔ میرے دل میں درد کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آرہا تھا، وہ اندھیری شامیں اور بچوں کی اسکول سے واپسی، سرد کمروں کی آغوش میں۔ انہیں اپنی ماں کی ضرورت تھی، ماں کی توجہ کی، دیکھ بھال کی۔ شاید میں نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اپنے بچوں کو محبت اور ذہنی آسودگی پہنچانے کی زیادہ ضرورت تھی، پیسے کی کمی سے گذر ہو ہی جاتی۔ مگر اس وقت تو ہمیں بچوں کو بہتر معیار زندگی مہیا نہ کر سکنے کا غم رہتا تھا۔ بہتر معیار زندگی کی خاطر تو یہ تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو وقت نکل چکا ہے۔ وقت کی ریت تو کب کی مٹھیوں سے نکل چکی ہے، وہ کب ٹھہرتی ہے۔ ہم نے اپنے لحاظ سے تو بچوں کے لئے اتنی قربانیاں دیں، کبھی اپنے متعلق سوچا تک نہیں۔ کپڑے لتے، گھومنا پھرنا، سینما تھیٹر، ساری آرزوئیں دل میں دفن ہو گئیں۔ ساری رنگینیاں اسی لندن شہر میں موجود تھیں۔ مگر ہم ا سے بے نیاز محنت اور مشقت کے اندھیروں میں زندگی گذارتے رہے اور آج وہی بچے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ان کو جذباتی محرومیاں دیں۔ کمینے کہیں کے۔ آج ان کے پاس ساری آسائشیں ہیں تو انہیں ہماری تکالیف کا کیا اندازہ۔ انہیں کیا پتہ کہ ہم نے نسلی تعصب کے نام پر کتنی ذلتیں سہیں، کتنی توہین برداشت کی، دل ہی دل میں کڑھتے رہے جلتے رہے اور بچوں کی خاطر سب کچھ سہہ گئے۔ اپنی انا، اپنی عزت نفس، خودداری سب کو دفنا کر زندگی کا ایک ہی مقصد بنالیا تھا کہ بچوں کو بہتر سے بہتر تعلیم اور معیار زندگی مہیا کرنا ہے۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد سب لوگ ٹیلیویژن دیکھنے لگے تھے تو چہل قدمی کے لئے میں بلڈنگ سے باہر نکلی، عمارت کے برابر کی سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی سمندر کے کنارے بنے ہوئے جنگلے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ سڑک پہ اکا دکا گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ دور گرینڈ ہوٹل کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی راہگیر یا ایک دوسرے میں گم جوڑا فٹ پاتھ پر سے گذر جاتا۔ دور بڑی بینچ پر ایک بڑے میاں اپنے کتے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے جنگلے پر ہاتھ ٹکا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ سمندر کے بپھرنے کی آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لہریں غصے میں ساحل سے ٹکراتیں اور لوٹ کر چلی جاتیں، لمحہ بھر کو وقت تھم گیا تھا اور میں اس منظر کا حصہ بن گئی تھی، میرا وجود کائنات میں مدغم ہو گیا تھا۔ میں بھی سمندر تھی اور غصے میں تلملا رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی ساعتیں گذریں جب میں سمندر کے فسوں سے آزاد ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ سمندر تو میرے سینے میں موجیں مار رہا ہے۔ باہر والے سمندر کی پھوار سے میرا چہرہ نم ہو گیا تھا مگر اندر والے سمندر نے مجھے میرے قلب کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ آمدورفت ختم ہو گئی تھی اور میں اس بپھرتے چنگھاڑتے سمندر کو چھپائے ہوئے واپس آگئی۔

(بقیہ صفحہ ۲۰۶ پر دیکھئے)



سخاوت شمیم

گریزپا

امید یہ تھی کہ
دل کا چراغ
جاں کے لئے
فصیلِ ذات و
انا کے سمندروں سے پرے
نیا جہاں کوئی آباد کر کے دم لے گا
مگر یہ جسم کی دیوار پھاندنے والا
خلوص و مہر و رفاقت کی جستجو میں گم
پرائی آگ کی بھٹی میں
تپ کے خاک ہوا

سکوت یخ بستہ موسموں کا

ابھی تو عہدِ طرب نہیں ہے
جمود طاری ہے خواہشوں پر
بدن سے دل کی
وہ بات پہلی
زباں سے اظہارِ جذبِ الفت
عمل میں بے لوث ذمہ داری
ہوئی ہے۔ معدوم کہ ابھی ہے
رفاقتوں پر
عداوتوں پر
ہماری اپنی ہی چاہتوں پر
سکوت یخ بستہ موسموں کا

● SURGEON, D.B. HOSPITAL
CHURU - 331001 (RAJ.)



منصور اعجاز

نظمیں

میری ماں نے یہ نہیں چاہا
اس کا بیٹا
لکھ پڑھ کے افسر بن جائے
خوب کمائے
کتنی اچھی سچی تھی ماں
جب خوش ہوتی
سینے سے لگاتی
دعائیں دیتی ـــ
"میرے بیٹے نیک بنو
نیک بنو تم
نیک بنو"

۲

سانپ نے اپنے پر اور
پیروں کا استعمال نہیں کیا
رینگتا رہا ـــ
اب بھی رینگ رہا ہے
ژراف بھی منہ اوپر کر کے
پیروں سے اونچا اٹھ کے
گردن لمبی کر بیٹھا ہے
"تم بھی عقل سے کام نہیں لیتے
جاؤ ہمالی کرو"

● RASHEED STUDIO,
YAVATMAL - 445001, (M.S.)



شفق سوپوری

کیا منور اگر شہر کو سویروں نے
ذرا سی روشنی دی راکھ کے بھی ڈھیروں نے

خیام کھول دیئے سرزمینِ درد میں پھر
ضرور ڈیرے کہیں ڈال کے اندھیروں نے

میں سوچتا ہوں، کہاں خون ہے، کہاں پانی؟
کہاں پہ جال بچھائے مرے مچھیروں نے

یہ بات سچ ہے خوشی سے گذار دی ہم نے
حیات ناپ لی آوارگی کے پھیروں نے

کہاں کہاں پہ ترے وحشی ہو گئے آباد
کہاں کہاں پہ گرایا ہے خون شیروں نے

● GOVT. WOMEN COLLEGE
UDHAMPUR -182101 (J.K.)

علی حیدر ملک
A-2 BLOCK -N- NORTH NAZIMABAD,
KARACHI - 74700 (PAK).

دل دریا

تقریب جہاں بھی ہو، آرٹس کونسل میں، کسی پنج ستارہ ہوٹل میں یا کہیں اور وہ ہر جگہ پہلی صف میں بیٹھی دکھائی دیتی۔ تقریریں اور مضامین غور سے سنتی۔ کبھی کبھی بیگ سے ڈائری نکال کر کچھ نوٹ کرتی اور پھر قلم اور ڈائری بیگ میں رکھ دیتی۔ تقریب کے بعد چائے کی میز پر وہ لوگوں کو آداب و تسلیمات پیش کرتی۔ کسی کی خیریت دریافت کرتی۔ کسی کو اس کے مضمون یا تقریر پر مبارکباد دیتی۔ اخبارات میں جب تقریب کی روداد اور تصویریں شائع ہوتیں تو سامعین کی صف میں کبھی کبھی اس کی تصویر بھی نظر آتی۔ ایسے اخبارات کے تراشے وہ ایک فائل میں محفوظ کر لیتی اور اپنے رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کو دکھاتی۔

"دیکھو اخبار میں میری تصویر شائع ہوئی ہے۔ میری بائیں جانب مشہور شاعر فلاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دائیں جانب ملک کے نامور ادیب فلاں صاحب ہیں اور میرے پیچھے جو صاحب نظر آرہے ہیں وہ۔۔۔"

یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔ شہر کے ادبی و ثقافتی حلقوں کے لوگ اسے شکلاً پہچاننے لگے تھے مگر نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔

ایک دن کسی کتاب کی تقریب رونمائی کے بعد تقریب کے صدر اور بزرگ شاعر، استاد فردوس مرادپوری ڈائس سے نیچے اتر رہے تھے کہ ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ وہ قریب ہی کھڑی تھی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے استاد کا ہاتھ پکڑ لیا وہ سنبھل گئے۔

"بہت بہت شکریہ بی بی۔" استاد فردوسؔ مرادپوری نے کہا۔

"نہیں۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے"۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

کچھ توقف کے بعد استاد نے سوال کیا۔ "آپ کرتی کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے شاعری وغیرہ کرتی ہیں یا۔۔۔"

"نہیں۔ شاعری وغیرہ تو نہیں کرتی۔ بس ادب سے دلچسپی ہے۔ صرف پڑھنے اور سننے کی حد تک" اس نے جواب دیا۔

"کیوں شعر کیوں نہیں کہتیں؟"

"نہیں۔ شعر نہیں کہتی۔ شاید مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"صلاحیت تو پیدا کی جاتی ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"آپ کل شام میرے پاس آجائیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ شاعری کیسے کی جاتی ہے۔" استاد نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔ حاضر ہو جاؤں گی"۔ اس نے کارڈ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

دوسری شام وہ استاد کے یہاں پہنچ گئی۔ استاد کے کمرے میں تین چار افراد پہلے سے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے استاد نے کہا۔

"یہ میری نئی شاگردہ ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد یہ شاعری کی دنیا میں نام پیدا کریں گی"۔

پھر ان افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "یہ لوگ بھی میرے شاگرد ہیں۔ ہر جگہ مشاعرے میں بلائے جاتے ہیں"۔

ان لوگوں نے بہت گھور کر استاد کی نئی شاگردہ کی طرف دیکھا۔ نئی شاگردہ نے بھی ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد استاد نے اپنے پرانے شاگردوں کو کسی مشاعرے کا دعوت نامہ پکڑا کر رخصت کر دیا۔

اب کمرے میں صرف وہ اور استاد رہ گئے۔

"ہاں بی بی! کیسی ہیں آپ؟" استاد نے رسمی سوال سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی آپ کی دعا ہے"۔ اس نے بھی رسمی سا جواب دیا۔

"اب یہ بتائیں کہ آپ شعر کیوں نہیں کہتیں؟"

"اس لئے کہ میں شاعری کے فن مثلاً ردیف، قافیہ، بحر، وزن وغیرہ سے واقف نہیں ہوں"۔

"کبھی کوشش کی آپ نے؟"

"جی! کئی بار کوشش کی اور کچھ چیزیں لکھیں بھی لیکن جب اپنے بعض جاننے والوں کو یہ چیزیں سنائیں تو انہوں نے کہا کہ یہ شاعری ہرگز نہیں ہے۔ میری ایک سہیلی نے کہا کہ یہ نثری نظمیں ہیں اور آج کل نثری نظم کا چلن عام ہو رہا ہے۔ تم نثری نظم کے طور پر اپنی چیزیں مشاعروں میں پڑھ سکتی

ہو۔ چاہو تو رسالوں میں بھی چھپوا سکتی ہو۔ کچھ رسالے بہت شوق سے نثری نظمیں چھاپتے ہیں"۔

"لاحول ولا۔ نثری نظم بھی کوئی شاعری ہے؟ یہ تو بغیر شاعروں نے اپنے کو شاعر کہلوانے کے شوق میں ایک ڈھونگ شروع کر رکھا ہے۔"

"جی! عام طور پر لوگوں کا یہی خیال ہے"۔

"آپ خود سوچیں ادب میں یا تو نثر ہوتی ہے یا نظم۔ یہ بھلا نثری نظم کیا چیز ہوئی؟ چوں چوں کا مربہ"۔

"ہاں! شاعری تو وہی ہوتی ہے جسے گایا جاسکے"۔

"بالکل بالکل۔ شاعری میں ایک غنائیت ہوتی ہے۔ اسکے بغیر شاعری کا کیا لطف؟۔ آپ غزلیں کہیں گی اور مشاعروں میں پڑھیں گی"۔

"مگر کیسے؟"۔ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ میں ابھی بتاتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں"۔ استاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور پشت پر رکھی ریک سے ایک رجسٹر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اس میں صفحہ نمبر ایک سو پچاس پر جو غزل ہے اسے اپنی ڈائری میں نقل کر لیں"۔ سات اشعار کی غزل تھی۔ اس نے کوئی چار منٹ میں اسے نقل کر لیا اور بولی۔

"جی! میں نے غزل لکھ لی ہے"۔

"اب اسے پڑھ کر سنائیں۔"

اس نے ٹھہر ٹھہر کر یکے بعد دیگرے سارے شعر پڑھ دیئے۔ استاد غور سے سنتے رہے اور کہیں کہیں الفاظ کے تلفظ اور تراکیب کی اضافتوں کی اصلاح کرتے رہے "یہ لیجئے"۔ استاد نے ایک کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہفتے کی شام آرٹس کونسل میں مشاعرہ ہے۔ وہاں اس غزل کے ساتھ آجایئے گا۔ میں منتظمین سے کہہ کر آپ کا نام شعراء کی فہرست میں شامل کرادوں گا"۔ وہ ذرا دیر رک کر پھر بولے۔

"مگر میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں"۔

"جی! میرا نام رحمت النساء بیگم ہے"۔

بی بی! یہ نام تو شاعری میں نہیں چلے گا"۔

"تو کیا کیا جائے؟ میرا نام تو یہی ہے"۔

"ذرا ٹھہریں۔ میں ابھی آپ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ ویسے آپ کے والد کا کیا نام ہے؟"

"عبداللہ خان"۔

"اور آپ کے میاں کا؟"

"لطف اللہ خان"

"نہیں نہیں۔ آپ کے نام کے ساتھ یہ نام بھی استعمال نہیں ہو سکتے۔ آپ کا کوئی خوبصورت اور سبک سا نام ہونا چاہیئے۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ استاد نام سوچنے میں محو رہے۔ پھر اچانک بولے۔ "شازیہ عندلیب۔ آج سے آپ کا نام شازیہ عندلیب ہوگا۔ دنیا آپ کو اسی نام سے جانے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔ اب اجازت دیں۔ خاصی دیر ہو گئی ہے"۔

"ہاں! اب آپ جاسکتی ہیں"۔ استاد نے صوفے سے اٹھ کر نئی شاگردہ کے سر پر مسکراتے ہوئے ہاتھ پھیرا۔ شاگردہ بھی سلام کر کے مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

ہفتے کی شام آرٹس کونسل میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شازیہ عندلیب کا تعارف ایک نئی اور ہونہار شاعرہ کی حیثیت سے کرایا گیا۔ اس نے غزل سنائی اور سامعین کے ایک حلقے خصوصاً استاد کے شاگردوں کی طرف سے خوب خوب داد پائی۔

اس کے بعد شہر کے اکثر مشاعروں میں اسے بلایا جانے لگا۔ اخباروں میں اس کا نام اور تصویریں چھپنے لگیں۔ کبھی کبھی ریڈیو اور ٹی وی کی طرف سے بھی اسے بلایا جانے لگا۔ اب وہ ایک جانی پہچانی شاعرہ بن چکی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ استاد کی سب سے مقرب شاگردہ شمار ہونے لگی۔ مگر ڈھائی تین سال ہی گزرے تھے کہ اس کے اور استاد کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے لگی۔ کشیدگی کی وجہ استاد کی ایک اور نئی شاگردہ تھی۔ اس نے استاد سے کئی بار شکایت کی کہ آپ کی توجہ اب اس لڑکی کی طرف زیادہ ہونے لگی ہے اور اپنا اچھا کلام بھی آپ اسے دینے لگے ہیں۔ استاد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ ابھی نئی ہے۔ اسے متعارف کرانے کے لئے خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ تم تو۔۔۔"

لیکن وہ نہیں مانی۔ استاد کے رویے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ فاصلے بڑھتے گئے وہ مشاعروں میں کم دیکھی جانے لگی۔ یہاں تک کہ بالکل غائب ہو گئی۔ ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اسے بھولنے لگے۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ وہ ادبی منظر نامے پر دوبارہ طلوع ہوئی۔ اب کے افسانہ نگار کی حیثیت سے۔ افسانہ نگاری میں معروف افسانہ نگار اور صحافی جہاں زیب آفاقی اس کے استاد تھے۔ ہر جگہ ہر محفل میں وہ اور جہاں زیب آفاقی ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے وہ افسانوی اور تنقیدی نشستوں میں افسانے پڑھنے لگی۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ آپ نے شاعری کیوں ترک کر دی اور افسانہ نگاری کی طرف کیسے آگئیں تو وہ بڑے اعتماد سے جواب دیتی۔

"شاعری میں کچھ نہیں رکھا۔ یہ زمانہ نثر کا ہے اس لئے میں نے افسانہ نگاری شروع کر دی۔ افسانے میں آپ اپنے عہد اور گرد و پیش کے مسائل کو بھرپور طریقے سے پیش کر سکتے ہیں"۔

ادبی و نیم جریدوں میں اس کے افسانے اور انٹرویو شائع ہونے لگے۔ کسی کسی رسالے سے کچھ معاوضہ بھی ملنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پورے ملک

میں افسانہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کی جانے لگی۔ جہاں زیب آفاقی کے علاوہ دوسرے افسانہ نگار اور نقاد بھی اپنے مضامین اور انٹرویو میں نئی ابھرتی ہوئی افسانہ نگار کے طور پر اس کا ذکر کرنے لگے۔ اس سے اپنا افسانوی مجموعہ شائع کرنے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ اس نے کئی بار استاد جہاں زیب آفاقی سے اپنے افسانوں کے مجموعے کا ذکر چھیڑا۔

"سر! مجموعے کی بہت فرمائش ہونے لگی ہے۔ کسی ناشر سے اس سلسلے میں بات کریں نا!"

"ابھی ذرا ٹھہرو۔ جلد بازی سے کام نہ لو"۔ آفاقی اسے سمجھاتے۔ "تمہاری ادبی حیثیت کچھ اور مستحکم ہو جائے پھر مجموعے کی اشاعت مناسب رہے گی تاکہ یہ فروخت بھی ہو سکے اور بڑے نقادوں کی توجہ بھی حاصل کر سکے۔"

مجموعے کی اشاعت کی شدید خواہش کے باوجود وہ چپ ہو جاتی۔

شہر کے پنج ستارہ ہوٹل میں ملک کے ایک ممتاز نقاد کی نئی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد ہونے والی تھی۔ جہاں زیب آفاقی نے شازیہ عندلیب کو تاکید کی کہ اس تقریب میں شرکت ضروری ہے تاکہ نقاد موصوف سے تعلقات کو مزید بہتر اور خوشگوار بنایا جا سکے۔

تقریب کے دن وہ وقت پر ہوٹل پہنچ گئی مگر جہاں زیب آفاقی نہیں پہنچے۔ اس نے سوچا کہ وہ حسب عادت دیر سے آئیں گے لیکن وہ دیر سے بھی نہیں آئے۔ تقریب کی کارروائی شروع ہوئی اور ختم بھی ہو گئی۔ اب چائے کا دور شروع ہونے والا تھا لیکن اس نے چائے نہیں پی اور ایک جھلاہٹ کے عالم میں ہوٹل سے نکل کر گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جہاں زیب آفاقی صوفے پر بیٹھے ہیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور بال الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ کی بیٹی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا ہے اور بال بے ترتیب ہو رہے ہیں۔ قمیض کے بٹن بھی کھلے ہوئے ہیں۔ "بے بی اندر جاؤ"۔ اس نے اپنی بیٹی کو گھورتے ہوئے کھردری آواز میں حکم دیا۔ بیٹی تیزی سے اندر چلی گئی۔ جہاں زیب آفاقی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جہاں زیب آفاقی کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی اور آفاقی نظریں نیچی کئے قالین کو دیکھتے رہے۔

وقت سنگین تانے دونوں کے درمیان کھڑا رہا۔

"سر! اب افسانے سے کام نہیں چلے گا۔ ناول لکھنا پڑے گا ناول"۔

کمرے میں اچانک شازیہ عندلیب کی آواز ابھری۔

وقت نے درمیان سے سنگین ہٹا لیں۔

جہاں زیب آفاقی کے اعصاب تناؤ سے ایک دم آزاد ہو گئے۔ ☆☆

بقیہ صفحہ ۲۲ دریا پار

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو" پھر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شاید اس کے زخموں سے ٹیس ابھر رہی تھی۔ "کہیں مجھے زہرباد تو نہیں ہو جائے گا۔؟"

"نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے ناخنوں کو پہچانتا ہوں"

"اس چڑیل کے؟"

"ہاں وہ چڑیل ہے۔"

"اور پھر بھی تم اس سے ملتے ہو۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مجھے چڑیلیں اچھی لگتی ہیں" "اور ان کے مڑے ہوئے پیر؟"

"وہ بھی اچھے لگتے ہیں۔"

"اور انکا کیا کیا اچھا لگتا ہے؟" بختاور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"شٹ اپ!" میں نے کہا اور ہم ڈھلان اترنے لگے کیونکہ ہمارا گراج دریا پار واقع تھا۔ "ذرا سنبھل کے۔ یہ ڈھلان بہت ہی خطرناک ہے۔ ہم پھسل گئے تو نیچے چٹانوں پر گر کر چور چور ہو جائیں گے"۔

"کیوں نہ میں تمہیں ڈھکیل دوں؟"

"تم خود بھی گر پڑو گے۔ پھر لوگوں کے لئے یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ ہمارے جسم کا کونسا حصہ کس کا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے کہا۔ "کیا نام بتایا تھا اسکا؟"

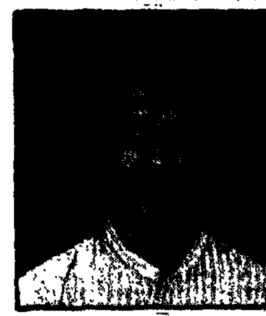
"شٹ اپ!"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ ایک چڑیل ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

چاند تھوڑی دیر تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر وہ اوپر پارک کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھوٹ گیا۔ ☆☆



عبدالسلام عاصم

اور یہاں اب کیا روزانہ ہوتا ہے
روز نیا اخبار پرانا ہوتا ہے

اک سچائی ہے خوابوں کی حد تک بھی
دل کو بھی کیا کیا سمجھانا ہوتا ہے

ایسے میں پھر نیند بھی تب آتی ہے جب
بند آنکھوں میں خواب جگانا ہوتا ہے

آپ اپنی تمثیل ہے یہ خوش سمتی کی
تیر نظر کا دل ہی نشانہ ہوتا ہے

تشنہ لبی مقسوم ہے عاصم لظم نہیں
ساقی کا اپنا پیمانہ ہوتا ہے

● S-302. TAJ ENCLAVE, GEETA COLONY, (E) DELHI-31

افضال فردوس

میں خاک میں ملے ہوئے گلاب دیکھتا رہا
اور آنے والے موسموں کے خواب دیکھتا رہا

کسی نے مجھ سے کہہ دیا تھا زندگی پہ غور کر
میں شاخ پر کھلا ہوا گلاب دیکھتا رہا

کھڑا تھا میں سمندروں کو اوک میں لئے ہوئے
مگر وہ شخص عجیب تھا سراب دیکھتا رہا

وہ اس کا مجھ کو دیکھنا بھی اک طلسم تھا مگر
میں اور اک جہاں پس نقاب دیکھتا رہا

وہ گہری نیند سوئی تھی میں نیند سے لڑا ہوا
سورات بھر سحاب وماہتاب دیکھتا رہا

● 6711-HORNWOOD H.228 HOUSTON TX. 77074 (U.S.A.)



حسن ماب خان واقف

سامری تیرا تماشہ یہ بہت خوب رہا
حد کے اندر جو تری آیا وہ معتوب رہا

میں نے بدلے ہیں کئی بھیس اسے پانے کو
میں قلندر کبھی مجنوں مجذوب رہا

آج پہچان مری اپنی بدولت ہے یہاں
میں فلاں ابنِ فلاں سے کبھی منسوب رہا

بہر ہستی کا مرے بجز خلاصہ ہے یہی
صبح جو اچھلا یہاں شام گئے ڈوب رہا

روز اوّل سے یہ گتھی نہیں سلجھی واقف
کون کاتب ہے ترا کس کا تو مکتوب رہا

● TOWN : MAUDAHA, DIST. HAMIRPUR-210507 (U.P.)



اوشا بھدوریہ

ندیا ساگر سے مل کر ساگر کہلائی
خوشبو پتھر پر بیٹھی پتھر کہلائی

جلتی دھوپ سلگتا پربت میرے اندر
مٹی کی چھایا دیوار و در کہلائی

جس نے سر پر ہاتھ رکھا اکثر راہوں میں
وہ چاہت کب اس تن کی چادر کہلائی

تو آتا تو میں بھی اپنا روپ سجاتی
تیرے بن کب من کی کٹیا گھر کہلائی

تن پر اوڑھی ارمانوں نے نرم چاندنی
تیری چاہت خوابوں کا زیور کہلائی

● 29/30 N-3, HOSTAGE-2, PIPLANI, BHEL, BHOPAL (M.P.)



فاطمہ تاج

کس سے پوچھوں، کیسے پوچھوں، کیوں ہے اتنی بے کل شام
جانے کیا کیا زخم ملے ہیں، کیسے ہوئی ہے، گھائل شام

میرے اس کے بیچ میں ایسے شام و سحر تقسیم ہوئے
اُس کے لب پر صبح بہاراں، آنکھ کا میری کاجل شام

سیرِ گل کی خواہش نے بھی ساتھ مرااب چھوڑدیا
میری قسمت میں ہے صحرا، کانٹے، بھورے بادل، شام

اپنے گھر کی چوکھٹ پر میں تنہا بیٹھی رہتی ہوں
دیواروں سے باتیں کرتی رہ جاتی ہے پاگل شام

میری دنیا سب سے الگ ہے ذات الگ ہر بات الگ
آنکھوں میں ہیں چاند ستارے پلکوں پر ہے بوجھل شام

● HOUSE No.22-3-339, MAGAR - MIRCHOWK, HYDERABAD - 2 (A.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۱۳)

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کے بارے میں تاثراتی و تنقیدی خطوں اور مراسلوں کا سلسلہ ابھی تھما نہیں ہے۔ جو بھی رفتار ہے اس میں اب بھی شدت باقی ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کا اعتراف بھی تاریخ ہی کرے گی اور پھر اس تعریف کا دفاع بھی۔ بلا مبالغہ اب بھی بے شمار خط اپنی اشاعت کے منتظر ہیں۔ ۱۲ر شماروں میں خطوں کی سمائی کے باوجود۔ درمیان میں تین شماروں کو ان خطوں سے خالی رکھا گیا لیکن موصول ہوتے والے خطوں کا سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ مجبوراً کچھ شماروں کے لئے اسے پھر جاری کیا جارہا ہے۔ قارئین کے اصرار کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کا مطالعہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور اردو کی نئی بستیاں، مجموعی طور پر یہی خبریں مل رہی ہیں کہ مطالعہ ابھی جاری ہے۔ یہ سچ ہے کہ خاص نمبر کی تخلیقی ترتیب میں ادب کائنات کی اتنی کہکشائیں سجی ہوئی ہیں۔ ان سب کی سیاحت کو ایک وقت درکار ہے، اور آج کے آدمی کا وقت خدا معلوم کہاں گم ہوگیا ہے۔ کہ ایک سال ایک لمحے میں سمٹ گیا ہے۔ بہر حال! یہ کیا کم ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر لوگوں کے مطالعے میں ہے۔ (ادارہ)

حنیف نقوی

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ نے اس کو متنوع، جامع اور پُر معلومات بنانے میں جس قدر محنت صرف کی ہے اور جس سلیقہ مندی سے اسے ترتیب دیا ہے، بھلا کون ہوگا جو اس کا اعتراف نہ کرے اعلان سے اشاعت تک کم و بیش دس مہینوں کی مدت تو گزر ہی گئی ہوگی لیکن اس انتظار کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ بہر حال اطمینان بخش اور قابل تعریف ہے۔

● URDU DEPARTMENT, B.H.U.
VARANASI (U.P.)

واصل عثمانی

آپ کا دستاویزی ضخیم نمبر "ہم عصر اردو ادب نمبر" ایک معرکے کی چیز ہے مطالعے کے علاوہ حوالے کی ایسی دستاویز ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہاں دمام اور الخوبر کے معاصر شعراء اور ادباء خصوصاً۔ اقبال فرید میسوری اور صادق کرمانی نے ایک مذاکرہ اور اس نمبر کے حوالے سے ایک شام منائی جس میں اصحاب الرائے نے کھل کر تبصرہ فرمایا اور آپ کی اس عالمانہ کوشش کو سراہا۔ اس کے ان پہلوؤں پر بھی گفتگو ہوئی جو قدرے تشنہ معلوم ہوئے اور چند بڑے ناموں کا اندراج نہ ہونے سے محسوس کیا گیا۔ مگر کوئی بھی شمارہ سو فی صد مکمل تو نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری جلد کا انتظار ہے۔ اس ضخیم نمبر کو بڑھنے کے لئے تو ایک سال کی رخصت دفتر سے ضروری ہے خدا معلوم دوسرا نمبر کہیں عمر نوح کا تقاضانہ کر بیٹھے۔ اللہ آپ کو ہمت و حوصلہ عنایت کرے (آمین)

● P.O. BOX 2080,
DAMMAM -31451 (K.S.A.)

مقبول احمد مقبول

ہم عصر اردو ادب نمبر ابھی زیر مطالعہ ہے۔ مختلف دانشورانِ ادب اور قارئین کی آراء پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ نمبر کس قدر مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ ۲۱ر مئی کو انجمن ترقی اردو [شاخ گلبرگہ] کی جانب سے گلبرگہ میں منعقدہ ہم عصر اردو ادب مذاکرہ بہت کامیاب رہا۔ مذاکرے میں تقریباً ہر مقالہ نگار نے بے لاگ اور معروضی نقطہ نظر سے ہم عصر اردو ادب نمبر کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر اکرام باگ اور حامد اکمل کے مقالے مجھے بطور خاص پسند آئے۔ وہاب عندلیب کا مقالہ آگرہ اسکول اور سیماب اکبر آبادی کی خدمات سے متعلق تھا۔ موصوف نے اردو ادب میں سیماب کے مقام و مرتبے کے یقین پر جو سوال قائم کئے وہ نہ صرف بہت اہم ہیں بلکہ وقت کا تقاضہ بھی ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے بعض نقاد سیماب جیسی عبقری شخصیت سے کیوں چشم پوشی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سیماب کو ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ تمام پرانی درسی کتابوں میں سیماب موجود تھے اب بھی بعض صوبوں کی ابتدائی درسی کتابوں میں سیماب کی نظمیں شامل ہیں لیکن مجموعی طور پر اعلیٰ درجے کے نصابوں میں سیماب نہیں کے برابر ہیں۔ کیا یہ کوئی ادبی سازش ہے؟

● MIAN ROAD, CHITGUPPA,
DIST. BIDAR - 585412 (KARNATAKA)

خاور نقیب

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر پیش نظر ہے۔ بے شک آپ کی ادارتی بصیرت اور ترتیب و تہذیب کی ارفع شائستگی عدیم الشال ہے۔ میں آپ کی صحافتی جرأت مندی کو سلام کرتا ہوں۔ امر واقعی ہے کہ آپ نے ادبی صحافت کے میدان میں تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔ دعا ہے کہ اس ادبی دستاویز کی دھنک رنگ کرنیں تا قیامت جوت جگاتی رہیں۔

● P.O. KOOD-754221 SANGRA,
DIST. CUTTACK (ORISSA)

محمود شیخ

آج کل ہم عصر اردو ادب نمبر مطالعے میں ہے۔ بہت عمدہ اور لاجواب۔ کافی تحریریں پڑھ چکا ہوں اب افسانوں کی باری ہے۔ ہر باب کی ابتداء اور درمیان میں آپ کے مختصر اداریے آپ کے دھڑکتے دل کی آواز ہیں۔ من جملہ اسے لائبریری کی زینت بنایا جانا ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلوں کو ایک لائحہ عمل مل سکے۔ اس قدر گرانی کے زمانے میں جبکہ اردو داں حضرات کا حلقہ کافی سمٹ چکا ہے۔ اتنا عمدہ اور ضخیم رسالہ شائع کرنا الوالعزم اور دھن کے پکے افتخار امام صدیقی ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ دیگر زبانوں کے متمول افراد بھی جو کارنامہ انجام نہ دے سکے اسے آپ نے کر دکھایا۔ باقی مکمل مطالعے کے بعد۔

● 592 - NAYA MOHALLA MIRZA
GHALIB MARG, JABALPUR-482002

مسرور سبز واری

ہم عصر اردو ادب نمبر اتنا ضخیم اور معنی آفریں کیا بلکہ عہد ساز نمبر آپ نے کس طرح نکال لیا۔ مجھے حیرت ہے آپ کے اس جنونِ بے پایاں کی سعئی کامرانی پر۔ اس نمبر پر آپ کو جتنی مبارکباد دوں وہ کم ہے۔ ابھی پورا کہاں پڑھا، جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں۔ فکشن کا حصہ شعری حصے سے زیادہ

وقیع۔ شعری حصے میں قبلہ علامہ سیماب اکبر آبادی اور حضرت [illegible] صدیقی مرحوم کے نوادرات اس حصے کو بے حد افادیت بخشتے ہیں۔

● CHOWDHRY SARAI, SANBHAL,
DIST. MORADABAD - (U.P.)

محمد اسلم

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر موصول ہوا۔ اتنا جاذب نظر اور بے پناہ مطالعاتی مواد لئے ہوئے، ایسے ضخیم نمبر کون نکال سکتا ہے؟ واقعی یہ روایت ہی ہے۔ اب صرف ایک ہی مشکل ہے کہ اسے کس طرح پڑھا جائے۔ مجھے لیٹ کر پڑھنے کی عادت ہے لیکن ظاہر ہے کہ اتنے ضخیم رسالے کو اس طریق پر نہیں پڑھا جاسکتا۔ اس کے لئے تو خصوصی نشست درکار ہوگی۔ بہرحال! مبارکباد قبول کیجئے۔ یقین ہے کہ پوری اردو دنیا سے آپ کو خوب خوب داد ملے گی۔

● P.O. BOX. No. 7367, ANDHERI (W)
MUMBAI - 400 058.

تاج پیامی

ہم عصر اردو ادب نمبر موصول ہوا۔ واقعی آپ کی لگن قابلِ ذکر ہے۔ اس کے لئے خود کو وقف کردینا پڑتا ہے۔ اور آپ نے وہی کیا ورنہ اتنا ضخیم اور خوبصورت نمبر شائع نہیں ہوسکتا تھا۔ سید عنایت علی بیگ کا مضمون اقبال اور سیماب ہندوستان کے "دو بے مثل نظم نگار" خاص طور پر پسند آیا۔ نہایت وقیع اور معلوماتی ہے۔

● MAHADEVA MOHALLA
ARARAH - 802301 (BIHAR)

شہاب اختر

شاعر کے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کی دو کاپیاں خریدیں۔ ضخامت نے خوف زدہ کردیا۔ سرورق بے حد خوبصورت ہے۔ اس خاص نمبر میں پڑھنے اور محفوظ کرنے لائق کافی کچھ ہے۔ میں سوچتا ہوں وہ لوگ اب کیا کہتے ہوں گے جنہوں نے اس نمبر کے بارے میں کیسی کیسی افواہیں اڑا رکھی تھیں اور جنہوں نے شک کیا تھا آپ کی مدیرانہ صلاحیت پر مجھے تو اطمینان تھا لیکن سچ کہتا ہوں کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ اتنا جاندار ہوگا۔ آپ بار بار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ فکشن پر خاص کام ہے۔ افسانوں کا حصہ بہت ہی اچھا ہے۔ آگرہ اسکول میرے لئے پوری پہچان ہے کیونکہ میں نے اس طرح نہ کبھی جانا اور نہ ہی پڑھا ہے۔ رام لعل اور اشک پر گوشہ ٹھیک مرتب ہوا ہے۔ محمد صلاح الدین پرویز کی بارہ ماسہ بھی نمبر کو تاریخی بناتا ہے۔ ان دنوں ان کی شاعری عبادت کر رہی ہے۔ اس تاثر کو مکمل جانیں۔ شعری حصہ پڑھنے میں شاید مہینوں لگ جائیں۔ آخر میں پھر سے کہوں گا کہ ان بددعاؤں کی خیر جن سے ایسے بڑے کام ہوتے ہیں۔

● CALCUTTA CLOTH STORES
KAPRA PATTI P.O. JHARIA - 828111

مرزا حامد بیگ

مجھے تازہ "شاعر" نہیں ملا لیکن میرے ایک شاعر دوست ابرار احمد نے بتایا کہ آپ نے تازہ پرچے میں ارشد محمود ناشاد نامی کسی شخص کا خط شائع کیا ہے، جس میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ میں نے "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر جلد: اوّل میں اعظم کریوی مرحوم کا تحریر کردہ مکتوب اپنے نام ظاہر کیا۔ ذرا پڑتال تو کیجئے کہ ایسا کیوں کر ہوا؟ "شاعر" ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اوّل، صفحہ 534 ملاحظہ ہو۔ میں نے "اردو افسانے کی روایت" میں افسانہ نگاروں کی تصاویر کے ساتھ ان کا عکس تحریر بھی دیا ہے۔ بلاشبہ اگست 1951ء کا تحریر کردہ یہ وہی خط ہے جو میں نے اعظم کریوی کی نادر و نایاب تصویر کے ہمراہ عکس تحریر کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ اصل مکتوب اعظم کریوی مرحوم کے فرزند (مقیم کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے "اردو افسانے کی روایت" میں اعظم کریوی سے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ 22، جون 1954ء کو کراچی میں قتل کردیئے گئے۔ یہ اندھا قتل تھا۔ قاتل کا تاحال سراغ نہیں ملا۔ میری تاریخ پیدائش 29 اگست 1949ء ہے۔ اعظم کریوی صاحب 25 اگست 1951ء میں مجھے کیوں کر خط لکھنے لگے۔ نہ میں نے "اردو افسانے کی روایت" میں عکس تحریر کے طور پر یہ خط متعارف کرواتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ مکتوب میرے نام ہے۔ درحقیقت میری کتاب "اردو افسانے کی روایت" سے اعظم کریوی کے اس خط کا عکس لے کر "شاعر" ہم عصر اردو ادب نمبر: جلد اوّل میں شائع کرتے ہوئے غلط عنوان جمانے کی غلطی "شاعر" کے ایڈیٹوریل بورڈ سے ہوئی۔ کیا اس کا خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا؟

ارشد محمود ناشاد نامی شخص کا یہ بچگانہ استفسار خط کی صورت میں شائع کرنے سے قبل اگر آپ "اردو افسانے کی روایت" دوبارہ دیکھ لیتے تو شکوک و شبہات کو جنم دینے والا یہ خط آپ شائع ہی نہ کرتے یا معترض کے خط کے ساتھ آپ کی جانب سے یہ وضاحت بھی چھپ جاتی کہ اعظم کریوی کے عکس تحریر کو "اردو افسانے کی روایت" سے چنا گیا، لیکن "شاعر" میں عنوان غلط چھپ گیا۔ تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا اور اپنا قد بڑھانے کے شوقین ارشد محمود ناشاد کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ نیز مجھے یہ خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اب ذرا تفصیل میں جائیں :

"شاعر" ہم عصر اردو ادب نمبر جلد: اوّل میں شا[...] ابوالفضل صدیقی کا خط (صفحہ 355)، شمشیر سنگھ نرولا کا [...] (صفحہ 380)، اختر حسین رائے پوری کا آخری خط (صفحہ 533)، احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب کے خطوط (صفحہ 587) میرے نام ہی لکھے گئے تھے۔ جن کا عکس یا متن آپ نے میری کتاب "اردو افسانے کی روایت" سے اخذ کر[تے] ہوئے "مکتوب بنام مرزا حامد بیگ" کا حوالہ دے دیا۔ ان حوالہ جات کا شکریہ۔ لیکن میری اسی کتاب سے اخذ کردہ بہت مواد "شاعر" کے کئی ایک دیگر مقامات پر بغیر حوالے کے موجود ہے۔ مثلاً نیاز فتح پوری (صفحہ 459)، خواجہ حسن نظا[می] (صفحہ 478)، محمد حسن عسکری، بلونت سنگھ (صفحہ 489)، عزیز احمد (صفحہ 496)، مجنوں گورکھ پوری، علی عباس حسی[نی] (صفحہ 502)، راشد الخیری، پریم چند (صفحہ 538)، [...] عبدالقادر، جلیل قدوائی (صفحہ 590) کے نظریہ ہائے ف[ن] سے متعلق مواد۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہیں نہ آپ سے کو[ئی] شکوہ۔ اس لئے کہ یہ مواد میں نے بھی مختلف انتھالوجیز، مقا[لہ] جات اور رسائل سے چنا، جن کا حوالہ میں نے "اردو افسا[نے] کی روایت" میں دے دیا ہے۔ آپ نے حوالہ در حوالہ [...] اجتناب کیا، اور غالباً میرے قیام اٹک کے دوران آپ [...] اس کی پیشگی اجازت بھی لے لی تھی۔ میں خوش، میرا [...] خوش۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے افسانہ نگارو[ں] کی نادر و نایاب تصاویر، عکس تحریرات اور ان کے نظریہ ہا[ئے] فن سے اردو دنیا کو متعارف کروایا۔ لیکن ملال اس بات کا [ہے] کہ "شاعر" کے خاص نمبر میں ایڈیٹوریل بورڈ کی جانب [سے] ایک غلط سرخی جمانے پر "شاعر" ہی میں میرے خلاف ہر[زہ] سرائی شروع ہوگئی۔ اس کا تدارک بھی آپ ہی نے کرنا [ہے]۔ محققین چاہیں تو "اردو افسانے کی روایت" کو دیکھ [کر] تصدیق کرلیں۔

[...]197- MEHRAN BLOCK
[AL]LAMA IQBALTOWN,LAHORE (PAK).

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) میں سہواً جو اغلاط رہ[گئی] ہیں ان میں سے ایک اعظم کریوی مرحوم کے خط کی سرخی بھی [ہے]۔ ارشد محمود ناشاد کا خط اسی غلط سرخی کا نتیجہ ہے۔ اس خط کے پیچھے [...] کیا نیت تھی یہ تو ہمیں نہیں معلوم تاہم یہ ضرور ہے کہ خط کی اشا[عت] سے قبل ہمیں اپنے طور پر تحقیق کرلینی چاہیئے تھی۔ خاص نمبر [کی] ترتیب کے دوران جو انتشار تھا اور جو ذہنی دباؤ تھا اس کے تحت [...] ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال سہو کے لئے ہم معذرت خوا[ہ ہیں] اور خاص نمبر میں جو اغلاط رہ پا گئیں ہیں، جو سہو اور تسامحات [ہوئے] ہیں ان کے اندراج میں اس غلطی کو بھی نوٹ کرلیا ہے (ادارہ)

مکتوبات

"یہ اکتوبر کا شمارہ ہے اور اس میں جون، جولائی اور اگست
شماروں پر موصولہ بہت سارے خطوں میں سے چند
شائع کئے جارہے ہیں۔ جنوری تا اپریل کے شماروں پر
،اہم خطوط اب بھی اشاعت کے منتظر ہیں کہ ان میں
،جولائی اور اگست کے شمارے بھی شامل ہوگئے۔ ستمبر کا
اور اس کے بعد یہ تازہ شمارہ اکتوبر کا اور وہی محدود
ت۔ عموماً ادبی رسائل میں خطوط کے لئے زیادہ صفحات
، کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کا مشہور تاریخی ادبی رسالہ "
ں" ۱۶۰ صفحات کی ضخامت کا ہوتا ہے اور اس میں خطوط
ب انجمن خیال ۵۶ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعر کے
شمارے سے بھی زائد صفحات۔ ادبی رسائل کی تاریخ
یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جس کی دوسری مثال نہیں۔
، کے ہر شمارے پر اتنے خطوط تو آتے ہی ہیں کہ ۴۸
ت میں ان کی سمائی ہوسکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں اور ہماری
ش بھی یہی رہتی ہے کہ منتخب اور بحث طلب آرا ہی
ت میں دی جائیں تاکہ شاعر کے بے شمار قارئین ان
استفادہ کرسکیں۔ اللہ نے اپنے بے پناہ علم کے خزانے
ے اپنے بندوں کو بہت تھوڑا سا علم عطا کیا ہے۔ اسی
ے سے علم کو آدمی سے آدمی میں منتقل کرنا ہی ہمارا
ب العین ہے اور رسالہ شاعر اس کا نمائندہ ہے۔ خدا،
ت اور آدمی یہی ہمارا موضوع ہے۔ ہم سب افہام
یم کے محتاج ہیں۔ شاعر کے نئے پرانے شماروں پر اہم
ری مکاتیب کی اشاعت کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

قارئین کرام! آپ شاعر کے مندرجات پر شاعر کے
لے سے فکر انگیز اور بحث طلب خط لکھتے رہیئے۔ اپنے اس
ب اور مفید کالم کی خوب سیرتی میں اضافہ کرتے رہیئے۔"
(۰

۲۰۰۰

قمر جہاں

بہت دنوں کے بعد شاعر جون ۲۰۰۰ء میں دو بے حد
بصورت افسانے نگاہوں سے گذرے ہیں۔ ایک آنند لہر
سرحد کے درمیان" اور دوسرا بانو قدسیہ کا نفس نارسا"۔
نہ تو تخلیقی آرٹ کے سوتے خشک ہوتے نظر آرہے ہیں۔
یہ میں کبھی کبھار کوئی اچھی تخلیق پڑھ کر پیاسی زمین پر
ابار پڑنے کا لطف آنے لگتا ہے۔ شاعر کے حوالے سے ان
دونوں تخلیق کاروں کو میری جانب سے اتنی خوبصورت
تخلیق کے لئے مبارکباد پیش کردینے کی عنایت کریں،
شکریہ۔

"ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے"۔ اس قسم کا
ادبی فیچر بھی ادبی ذہن کو متحرک رکھنے کی ایک کامیاب
کوشش ہے۔ شرکاء کے ساتھ مرتب خورشید حیات
مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاعر کے معیار کو معیاری اور
پسندیدہ بنانے کی آپ کی کوشش کے لئے کیا کہوں۔

● DEPARTMENT OF URDU S.M.
COLLEGE, BHAGALPUR - (BIHAR)

رئیس الدین رئیس

شاعر کا تازہ شمارہ جون ۲۰۰۰ء موصول ہوا شکریہ ہمیشہ
کی طرح صوری و معنوی ہر اعتبار سے معیاری ہے۔ ادبی فیچر کا
سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ شاہین نظر کا مقالہ خلیجی ممالک میں
اردو کی صورت حال خوب ہے یہ مسئلہ خلیجی ممالک ہی کا نہیں
برصغیر میں ہر اردو کے لئے ہے خدا معلوم یہ بے حسی کہاں
لے جائے گی۔ کہانیاں چاروں ہی قابل مطالعہ ہیں غزلیں
سب ہی اچھی ہیں مگر غلام مرتضٰی راہی صاحب کے پاس لگتا
ہے نیا کچھ نہیں وہ مسلسل خود کو دوہرانے میں لگے ہیں۔
عشرت آفریں کے ہائیکو بہت پسند آئے۔ کچھ نئے نمبروں کا
اعلان آپ نے کیا تھا وہ کب تک شائع ہورہے ہیں۔

10/1725, DELHI GATE, ALIGARH (U.P.)

الف ناظم

"شاعر" شمارہ جون فردوسِ نظر بنا۔ یہ شمارہ بھی پچھلے
شماروں کی طرح خوبصورت اور معیاری ہے۔ مضامین
و تخلیقات سبھی معیاری اور وقیع ہیں۔ ادبی فیچر میں "ادبی
تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے" کے عنوان سے افسانہ
نگار خورشید حیات کا مرتب کردہ مکالمہ لائق توجہ و قابل
اعتناء ہے۔ بانو قدسیہ کا افسانہ نفس نارسا خاصا دلچسپ ہے۔
موصوفہ نے کافی تفصیلات بیان کرکے اپنے افسانے کو دیدہ
زیب بنایا ہے۔ کئی باتوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے انہوں نے دل
کی بات کہہ دی۔ آنند لہر کا افسانہ "سرحد کے درمیان" بھی
پسند آیا۔

دیگر مشمولات زیرِ مطالعہ ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی
نہایت پرگو اور منفرد ہے۔ تاج سعید، دلنواز صدیقی، اسرار
اکبر آبادی، غلام مرتضٰی راہی، شجاع خاور اور خوشبیر سنگھ شاد
اور دیگر شعراء کی منظوم تخلیقات داد طلب ہیں۔ تاہم مجھے
تاج سعید، دلنواز صدیقی اور پروین جاوید کی غزلوں کے
مطلعوں پر اعتراض ہے۔

صفحہ ۶ پر "بہ خطِ شاعر" کے عنوان سے تاج سعید، دلنواز
صدیقی اور اسرار اکبر آبادی کی غزلیں درج ہیں۔ اوّل الذکر
دونوں شاعروں کی غزل کی جمالیات میں الفاظ ان کی دروبست
، وزن و بحر یعنی شعری آہنگ اور فنّی چابک دستی کو خاص
اہمیت حاصل ہے اور ان کی غزل میں کسی حد تک یہ
خصوصیات ہیں۔ مگر انہوں نے ایطاء (جوکہ قافیہ کا بدترین
عیب ہے) سے دانستہ طور پر چشم پوشی کی ہے جوکہ کم از کم ان
کے معیاری کلام کو زیب نہیں دیتی۔ یہی غلطی پروین جاوید
(صفحہ ۳۹) نے بھی دہرائی ہے۔ اگر وہ ذرا سی احتیاط سے کام
لیں تو فنّی چابک دستی کا حق آسانی سے ادا کرسکتی ہیں۔

تینوں مطلعے ذیل میں پیش کئے جاتے ھیں :

سوکھے ننگے پیڑ کو دیکھ کے دل میرا کیوں روتا ہے
جنگل کی خاموشی میں کوئی کنکر پتھر ڈھوتا ہے (تاج سعید)

رو + تا (روتا)، ڈھو + تا (ڈھوتا) رو اور ڈھو بامعنی ہیں
اور یہی ایطاء کہلاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں خوشی کی 'ی'
ساقط ہے جس سے شعری ہیت کا حسن مجروح ہوتا ہے اور
مصرع خارج از بحر ہوجاتا ہے۔ اساتذۂ فن نے عربی فارسی
الفاظ کے حروفِ علت (الف۔ و۔ ے) کے سقوط کو ناجائز
قرار دیا ہے۔

لے لیں جو چاہیں وہ شرطیں مجھ سے
بچے بے وعدہ نہ بچھڑیں مجھ سے (دلنواز صدیقی)

شرط + یں (شرطیں) بچھڑ + یں (بچھڑیں)، شرط اور
بچھڑ بامعنی ہیں اور باہم مقفّی نہیں۔ لہٰذا ایطاء ہوا۔ درج ذیل
مطلع میں بھی یہی عیب ہے۔

اسی احساس پر ہم لوگ تقصیریں بناتے ہیں
کہ وہ اب بھی بچے آزار تعزیریں بناتے ہیں (پروین جاوید)

●19,BISALPUR,PILIBHIT,U.P.262201

ضمیر الحسن عظیم آبادی

باب "جرعات" میں اردو، اردو، اردو۔۔۔ لیکن عمل
میں آپنے جو بھی اظہار خیال کیا ہے۔ راقم الحروف لفظ بلفظ
اس سے متفق ہے۔

آپ نے میرے دل کی بات لکھ دی ہے۔ "اردو
اداروں سے وابستہ افراد تو اردو کے سب سے زیادہ خدمت

گذار معلوم ہوں گے۔ کیا ایسا ہے؟" میں کہوں گا ہر گز نہیں ۔ یہاں تو برا حال ہے۔ اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو اساتذہ حضرات طالب علموں کو درس تک نہیں دیتے ہیں۔ ہمیشہ غائب ہیں۔ چند حضرات ہیں تو وہ حکومت کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔ اردو داں طبقے کو اس کی ذرا فکر نہیں ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کی بات تو دور رہی۔ والدین اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے سے گریز کرتے ہیں صوبہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے مگر پھر بھی اس پر ہم لوگ قطعی عمل نہیں ہو رہا ہے اور ہم لوگ پوری طرح اس کے ذمہ دار ہیں۔

بہار قانون ساز کاؤنسل کے چیئرمین پروفیسر جابر حسین کی اردو خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ عمل کاؤنسل کے ہال سے نکل کر عوامی سطح تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ آپ کے خیالات کے مطابق اردو کے فروغ اور عمل کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔

● MOHALLAH KHAN MIRZA
PATNA - 800006

شہناز صبیح

"جرعات" کا مشورہ سر آنکھوں پر خورشید حیات کا قائم کردہ مکالمہ "ادبی تخلیق سچائی کے بغیر ممکن نہیں ہے"۔ دلچسپ ہے۔ شرکائے کرام نے اپنے خیالات کے دھنک رنگ بکھیرے ہیں اور سچائی، کو مختلف انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بات صرف اتنی کا ہے کہ ادیب جس سچائی کو پیش کرتا ہے وہ دل سے نکلتی ہے اسی لئے دل میں گھر کرلیتی ہے۔ اخلاص کے آمیزے میں سچائی کا عرفان ادب کی معراج ہے یہی وجہ ہے کہ سائنسی سچائی، سماجی، سیاسی تاریخی سب معلوماتی ہوتی ہیں لیکن ادیب جس سچائی کو پیش کرتا ہے دل اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے مصر ہوتا ہے۔ یہی مقناطیسی رابطہ ادیب اور قاری کو ایک دوسرے کی جانب کھینچے لئے جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سچائی کو دیکھتے اور سمجھتے رہتے ہیں متاثر کس سے ہوتے ہیں؟ کسی شعر، افسانہ، ناول یا ڈرامے سے! "نفس نارسا" سرحد کے درمیان"، "شام ڈھلے" یا ایک دکان کی کہانی (اس شمارہ کے افسانے) کیا اخبارات کی رپورٹس اور پولس ریکارڈس کے حصے نہیں ہیں؟ جب کوئی ادیب انہی سچائیوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرکے خلوص میں ملا کر پیش کرتا ہے تو اس کی آب و تاب ہی الگ ہوتی ہے۔ (یہاں خلوص اور اخلاص سے مراد خالص، بے لوث محبت ہے جو ایک انسان دوسرے انسان کی بہتری کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، جو ادب پارے کا محرک بنتا ہے) ہائیکو اور سیز یو پسند آئے۔ غزلوں کے چند اشعار نے دل کو چھوا۔

● 623- VASIA ABAD, ALLAHABAD - 211008 (U.P.)

صادقہ نواب سحر

ماہ جون کی پیشانی پر بانو قدسیہ کا افسانہ 'نفس نارسا' جگمگاتے تاج سا ہے جس میں انسانی نفسیات کے بعض پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پارک کی بینچ پر اکیلا بیٹھا ہوا تحسین زندگی کی کن کن منزلوں سے گزر جاتا ہے۔ ماں، ستا بیگم! زعفرانی، سیٹھ ہوزری والا، گاؤں کی کنواریاں، شہر کی بھیڑ، سبھی کے بیچ سب سے جڑا مگر بے تعلق تحسین، اپنی ذات سے محبت کے گھیرے میں الجھا ہوا۔ زندگی کے سفر میں آگے بڑھتا ہوا، وہ اپنی ماں کے آخری وقتوں کا ساجھے دار نہ بن سکا۔

افسانے میں کچھ مکالمے بہت ہی برمحل، چست اور مرکزی کردار کی شخصیت کو مکمل طور سے نمایاں کرنے میں کامیاب۔ نفس نارسا حاصل شمارہ افسانہ ہے۔ جی خوش ہو گیا پڑھ کر۔ واقعتاً ہر انسان میں کہیں نہ کہیں ایک تحسین ضرور بیٹھا ہوا ہے۔

آپ کے اداریے "اردو، اردو، اردو۔ لیکن عمل" پڑھ کر آپ کو یہ خبر پہنچانے کو جی چاہا کہ امسال طعطیلات میں انجمن ترقی اردو (شاخ کھپولی) کی جانب سے [جس کی میں کنوینر ہوں] میں نے ذاتی طور پر ۲۱ بچوں کو اردو کی پہلی کتاب پڑھائی تھی۔ انہیں اردو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ شاعر کا سر ورق ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور جاندار ہے۔

● MOHSIN MANZIL, SHASTRI NAGAR
KHAPOOLI - DIST. RAIGAD - 410203

انور خان

آثار لفظ لفظ میں یگانہ چنگیزی کا خود کو گدائے تکبر کہنا لطف دے گیا۔ مرزا حامد بیگ کا شاعرانہ خیال کی منطق بھی اچھا ہے۔ تبصروں میں محافظ حیدر کا کتاب نصف ملاقات پر تبصرہ دلچسپ ہے۔ کاوش بدری کے خط پر ابن اسمٰعیل کا خط بھی کمال کا ہے لیکن یہ وحدت الوجود کا فلسفہ نہیں، قبر پرستوں کا عقیدہ ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔

● 17/311, TEJASNAGAR. BPT COLONY
REYNAULD RD. WADALA, MUMBAI-37

ش۔ صغیر ادیب

"شاعر" شمارہ جولائی موصول ہوا۔ شکریہ!

آج کل ذرا مصروفیت ہے۔ پھر بھی وقت نکال کر مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ گذشتہ چند شماروں میں جو کہانیاں آپ نے شائع کی ہیں وہ معیاری اور پراثر ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان شماروں میں مقالات اور ادبی فیچر کے تحت لکھے گئے مضامین کا پلڑا بھاری رہا۔ مرزا حامد بیگ نے شاعرانہ خیال کی منطق میں اہم نکتے اٹھائے ہیں جو فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔ "ادبی مقصد اور تحریک" اور "فلسفہ فن اور جمالیات" عمدہ مضامین ہیں۔ ایسے مضامین دوسرے ادبی رسائل میں اکثر نظر نہیں آتے۔ صرف "شاعر" کو یہ امتیاز حاصل ہے اور شاید "شاعر" کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ امید ہے کہ ادبی فیچر کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

65 - BLACK BURN ST. BLACK
BURN LACS. B61 7NG (U.K.)

نسیم بن آسی

اے۔ خیام کا افسانہ "وائلڈ لائف" پسند آیا۔ جو لوگ وطن سے باہر بیرون ممالک میں تلاش معاش کے لئے جاتے ہیں، انہیں ذلت کی جو زندگی گزارنی پڑتی ہے، یہ افسانہ اس کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ آغا گل کا افسانہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہے۔ ادبی فیچر فکر انگیز ہی نہیں، دھماکہ خیز بھی ہے۔ کاوش بدری کے مضمون میں خود نمائی، قابلیت اور اپنے علم کے زعم کی بو آتی ہے۔ ان کے بارے میں ابن اسمٰعیل کی رائے سے ہر ذی شعور متفق ہوگا۔ شعری حصہ بھی کافی جاندار ہے ۔ افتخار امام صدیقی کی غزل حاصل شمارہ ہے۔ آثار لفظ لفظ میں یاس یگانہ چنگیزی کی نادر تصویر اور تحریر دیکھنے کو ملی۔ معروف شخصیتوں سے متعارف کرانے کا جو سلسلہ آپ نے جاری کر رکھا ہے۔ اس کے لئے ہم آپ کے بہت ممنون ہیں ۔ مکتوبات کے تحت کافی طویل خطوط شائع ہو گئے ہیں۔ شاعر کے صفحات میں جب جگہ کی قلت ہے تو اتنے طویل خطوط شائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خطوط کے خاص اور اہم حصہ کو ہی شریک اشاعت کیا کریں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ خطوں کو جگہ مل جائے گی۔ اس بار مضامین بہت اکیڈمک ہیں

KOH-E-NOOR GENERAL STORE
ARMAR KATRA MUGHALSARAI-232101

غالب عرفان

اس مرتبہ مکتوبات بہت گرما گرم تھے پڑھ کر بہت لطف آیا چند باتیں لائق فکر بھی تھیں لیکن کاوش بدری صاحب نے جو سوالات "ذہن جدید" کے ادب پیا کے حوالے سے اٹھائے ہیں وہ تمام سنجیدہ ادبی حلقوں سے مناسب مکالمے ضرورت بن گئے ہیں۔ لہٰذا آپ کا اداراتی نوٹ بھی اسی حوالے سے بروقت اور برمحل ہے۔ میر کی زمین پر

غزلیں بہت خوب ہیں لیکن آپ کی غزل زیادہ پسند آئی بالخصوص یہ شعر "آدمی گم ہو رہا ہے آدمی۔ اڑ رہی ہے دھول بازاروں کے بیچ لطف دے گیا۔

● R-263, SECTOR-B, NORTH KARACHI, 75850 (PAK)

حمیدہ معین رضوی

تازہ شمارہ اپنے معیار کے لحاظ سے حسبِ معمول اچھا لگا۔ ادبی فیچر میں اچھی باتیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ ان میں اختلاف کے پہلو بھی ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے مضمون "شاعرانہ خیال کی منطق میں"۔ ملارمے کا ایک قول نقل کیا گیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "شاعری خیال سے نہیں، الفاظ سے تشکیل پاتی ہے"۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کاوش بدری کے خط کے مطابق زبیر رضوی نے جو درجہ بندی کی ہے وہ نامناسب ہی نہیں غلط بھی ہے۔ تاہم آپ کا کہنا صحیح ہے کہ یہ بحث ذہنِ جدید اور کتاب نما ہی تک محدود رہنی چاہیئے۔ اے۔ خیام کا افسانہ ورلڈ لائف پڑھ کر اپنی قوم کے بچوں پر بہت رونا آیا۔ آخر اپنے ملک میں کیا کمی ہے کہ اپنی تذلیل کی جائے۔ دیر تک میں سکتے میں رہی۔ تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ سادہ حقیقت نگاری اور تاثر کی گہرائی۔ ابنِ اسماعیل کے خط سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ نگار کا غلو منطقی لحاظ سے بھی غلط ہے۔ محمود شیخ کا مقالہ "ادبی مقصد اور تحریک" میں ایسے حقائق کا بے باکانہ اظہار ہے جسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجھے ان کے اس خیال سے بھی اتفاق ہے کہ "مغربی فکر سے لوگوں کی آنکھیں ایسی اندھی ہو چکی ہیں کہ مشرق کی ان خوبصورت چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جن سے روح کی تابناکی عیاں ہوتی ہے۔ مغرب کا تصور حقوقِ انسانی بھی انتہائی خود غرضانہ اور غیر معروضی ہے۔ یہ سراسر نسل پرستی پر مبنی ہے۔ یہی حال ان انسانیت کا بھی ہے جہاں جنس کا بے لگام جذبہ اور اس کی تسکین انسان کا بنیادی حق بنا دیا گیا۔ خواہ اس راستے وہ تمام روحانی قدریں خاک میں جل جائیں جو انسانیت کو حیوانیت سے جدا کرتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے مغرب اور مشرق کے ادب کو ساتھ ساتھ پڑھا ہے خود ایک تحریک پیدا کریں اور مشرقی فکر کو بغیر کسی احساس کمتری کے آگے بڑھائیں۔ افسانوں میں اے۔ خیام کے بعد نعیم کوثر کا افسانہ 'نئی گوشالہ' اچھا ہے اگرچہ موضوع بہت گھسا پٹا ہے۔ افسانہ نسل کشی پڑھ کر بوزنیا یاد آگیا۔ میری کلاس میں انگریزی سیکھنے جو بوزنیا کی خواتین آتی رہی ہیں وہ اس طرح کی کہانیاں سناتی تھیں۔ ارشد مسعود ہاشمی کا افسانہ 'ماضی' کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

● 38- GAINS BORDUGH ROAD, NEW MALDEN, SURREY - KT3 5NU (U.K.)

خلیل تنویر

آپ نے اگست کے شمارے میں مجروح سلطان پوری صاحب پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے اس میں تحریر کیا ہے کہ ان کے چند شعر زبان زدِ خاص و عام ہوئے اور روزمرہ بنے لیکن فیض احمد فیض کی شہرتوں کے حوالے سے یہ شعر زیادہ جانے گئے۔ آپ نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ مجروح کے اشعار فیض کے نام سے کیوں جانے گئے۔ اس میں فیض کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ دراصل مجروح صاحب ۱۹۴۵ء میں ممبئی آئے اور ممبئی آنے کے بعد ہی وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ ان کی غزل گوئی کے ارتقا کا زمانہ بھی بہت مختصر یعنی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک رہا۔ جب کہ فیض احمد فیض برابر غزل کہتے رہے۔

مجروح صاحب کا ایک بیان بیسویں صدی شمارہ فروری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے فیض احمد فیض کو ترقی پسندوں میں سب بڑا شاعر کہتے ہوئے انہیں ترقی پسندوں کا میر تقی میر کہا تھا۔ لیکن مجروح صاحب اپنی عمر کے آخری پڑاؤ میں اس بات پر زور دینے لگے تھے کہ وہ ترقی پسند غزل کے باضابطہ اوّلین شاعر ہیں۔ مجروح صاحب اگر یہ سمجھتے تھے کہ غزل میں ارض ماسکو کا ذکر سب سے پہلے انہوں نے شروع کیا تھا تو واقعی وہ ترقی پسند غزل کے باضابطہ اوّلین شاعر تھے لیکن

گہری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمین کہ ستارے جسے سلام کریں

ایسے شعر مجروح صاحب نے اپنے شعری مجموعہ "غزل" سے بعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیئے تھے۔ مجروح صاحب سے بہت پہلے جذبی، مجاز اور فیض ایسی غزلیں کہہ رہے تھے جن غزلوں کو ترقی پسند غزل کی نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ مجاز کا یہ شعر

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

فیض کا پہلا شعری مجموعہ نقشِ فریادی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں فیض کا یہ شعر بھی تھا جو بہت مقبول ہوا۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دل فریب تھے غم روزگار کے

یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں کہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح مجروح بھی فیض سے کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور تھے۔ چودھری محمد نعیم نے ۲۱؍ جنوری ۱۹۸۴ء میں شکاگو کی ایک ادبی محفل میں مجروح صاحب کی غزل پر مضمون پڑھا تھا اس محفل میں مجروح صاحب بھی موجود تھے۔ یہ مضمون کتاب نما شمارہ اپریل ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا وہ لکھتے ہیں "مجروح کی ۱۹۴۲ء کی ایک غزل کا شعر ہے۔

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غم جاناں ناں برسوں سے

کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر میں وہی بات دوہرائی گئی ہے جس کو فیض نے چند سال بیشتر اپنی بیحد مشہور اور عہد آفرین نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب مانگ" میں پیش کیا تھا اور جس کا یہ مصرع ضرور مجروح کے ذہن میں گونجا ہوگا

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

مجروح کی غزل کا ارتقاء ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک رہا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تخلیقی قوتوں کو فلمی گیتوں میں صرف کر دیا۔ فلمی گیتوں میں ان کا یوگ دان ساحر اور شکیل بدایونی سے کسی طرح کم نہیں۔ مجروح صاحب کے فلمی گیتوں کا مجموعہ شائع ہونا چاہیئے اور یہ کام مجروح اکاڈمی اپنے طور پر کر سکتی ہے۔

● 25-GANDHI NAGAR, MALLAPA TALAI. UDAIPUR - 313001 (RAJ.)

اسلم جمشید پوری

شاعر کے اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں 'جرعات' کے تحت آپ نے اردو چینل سے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے وہ حقیقی صورتِ حال ہے۔ آج اردو کی Professionalism کو کوئی غیر اردو ادارے بھی محسوس کر رہے ہیں اور اردو چینل شروع کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ آپ نے فلک، ETV اور خلیج کی ایک کمپنی کے علاوہ زی ٹی وی کا ذکر کیا ہے۔ میں اس میں ایک نام سہارا ٹی وی کا اضافہ کر رہا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کمپنی کا چینل کس معیار کا ہوگا۔ آپ کا خیال درست ہے کہ یہ اردو چینل کیسے ہوں گے کیا ان کی زبان صرف اردو ہوگی۔ کیا پردے پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ صرف اردو میں Casting کو ہی اردو کا نام دے دیا جائے گا۔ یا اردو کی روح کا خیال کرتے ہوئے اس کے ہر پروگرام میں خصوصی توجہ دی جائے گی؟ یہ باتیں قابلِ غور ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اردو Cable culture میں داخل ہو رہی ہے (غیر اردو والوں کے مطابق جبکہ اردو پہلے سے ہی موجود ہے) ایسے وقت صرف پروگراموں پر اردو لیبل چسپاں کر دیا جائے گا یا واقعی اردو کی خدمت ہوگی۔ اگر صحیح سمتوں میں اردو کو مختلف چینل کا واسطہ (Medium) مل جاتا ہے تو اردو حقیقی معنوں میں Professionalism سے جڑ جائے گی اور ملازمتوں کے مواقع میسر آئیں گے۔ لیکن اس موقع پر حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کا اداریہ بروقت اور برمحل ہے۔

● MAJEEDIA MODEL SCHOOL B-BLOCK, NORTH GHONDA DELHI-53

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

شرف محنت و کفالت (اسلامیات)

شمیم طارق

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں محنت اور کفالت کی اہمیت پر اسلامی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اس میں چھوٹے چھوٹے گیارہ ابواب ہیں اور ابواب میں " عمل کی اہمیت، معذور لوگوں کی کفالت، زکوٰۃ کی تقسیم، محنت کشی کی عظمت، توکل کے نام پر بے عملی کار، تجا، بیواؤں اور یتیموں کی ذمہ داری، پیداوار میں مزدور کا حصہ، ظلم واستحصال کی برائی، پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے حقوق، اسلام اور اشتراکیت کا موازنہ، قرض لینے اور اس کے ادا کرنے کی ضمانت، یہ اور اس قسم کے متعدد اور مسائل ہیں جن سے فاضل منصف نے آیات واحادیث اور صحابہ وصوفیہ کے اعمال وافعال کی روشنی میں بحث کی ہے۔

ابتداء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تقریظ اور مولانا محمد رابع حسن ندوی کا مقدمہ ہے تقریظ میں مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ: جناب شمیم طارق صاحب نے شرف محنت واجرت پر بہت ہی وسیع مطالعہ کے بعد جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ بالکل نئے ہیں۔ جس کے لئے موصوف داد وستائش کے مستحق ہیں"۔

مقدمے میں مولانا رابع ندوی نے فرمایا کہ: "محترم شمیم طارق صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت عرق ریزی اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے اور شرف محنت وکفالت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے اہل تحقیق وعلم کو دعوت تحقیق دی ہے۔"

تقریظ اور مقدمہ کے بعد خود فاضل مصنف کا حرف آغاز ہے جس میں انہوں نے محنت وکفالت کے اسلامی تصور کو مختصراً بیان کرنے اور مسلمانوں کی معاشرتی ابتری کے اسباب وعلل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کے بعد بتایا ہے کہ "یہ المیہ نہیں تو کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے گھر آنگن میں سورج ہوتے ہوئے دور دراز کے ٹمٹماتے دیوں سے روشنی لینے کی کوششوں میں اندھیروں سے ناطہ جوڑ کر ٹھوکریں کھائیں ہیں۔ محنت ومحنت کش کے حقوق وفرائض اور فلاحی منصوبوں کے بارے میں انہیں تمام نظریوں کا علم ہے اگر وہ نہیں جانتے تو صرف محنت وکفالت کے شرف اور اس کے اسلامی تصور کو"۔

آخری صفحے کی پشت پر عربی جریدہ "العالم الاسلامی میں شائع شدہ ""فضیلۃ العمل والکفالۃ باللغۃ الاردیۃ" کے عنوان سے عبدالرزاق ندوی کے عربی میں لکھے ہوئے ایک تبصرے کا عکس بھی ہے جس میں فاضل تبصرہ نگار نے کتاب کے موضوع، زبان اور اسلوب نگارش کی کھل کر تعریف کی ہے۔

شمیم طارق ایک منجھے ہوئے ادیب صحافی اور معتبر شاعر ہیں۔ برسوں وہ اردو بلٹز سے منسلک رہے اور اپنے مضامین اور تبصروں کے ذریعے قارئین کے ذوق مطالعہ کو گرماتے رہے، اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک اچھے ادیب اور صحافی ہی نہیں بلکہ ایک اچھے محقق اور عالم بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی اس کتاب کے لئے جو موضوع چنا ہے وہ عملی نقطہ نظر سے مسلمانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

زبان بھی آسان ہے اور طرز بیان بھی عام فہیم، انہوں نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔" ہر خاص وعام مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس کتاب کا ایک بار ضرور مطالعہ کرے، علم کے لئے بھی اور عمل کے لئے بھی۔

ضخامت: ۱۹۵ صفحات ☆ قیمت: ۷۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: فلیٹ نمبر ۷، ۲ مرزبان مینشن، بائیکلہ فروٹ مارکیٹ ممبئی-۲۷ مبصر: **حامد اللہ ندوی (مرحوم)**

☆ مندرجہ بالا تبصرہ کتاب کی اشاعت کے بعد موصول ہو گیا تھا اور ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل کے باب نقد ونظر میں شائع ہونا تھا جس میں تقریباً پانچ سو کتب ورسائل پر تبصرے دئے جانے تھے۔ مذکورہ باب خاص نمبر کی غیر معمولی ضخامت کی نذر ہو گیا۔ ہمارے بزرگ اور شاعر کے قلم کار و مبصر ڈاکٹر حامد اللہ ندوی (مرحوم) نے بھی بہت ساری کتابوں پر تبصرے کئے تھے۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کتاب کے تبصرے پر ادارتی نوٹ اس لئے لگایا جارہا ہے کہ کتاب پرانی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ چوتھا ایڈیشن بھی جلد متوقع ہے۔ ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی کچھ اور زبانوں میں بھی اس کتاب کے تراجم آرہے ہیں۔ کتاب پر سیمینار منعقد ہو رہے ہیں۔ کتاب کا موضوع آج کا موضوع ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اسلامیات کے باب میں گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو سب کے لئے ہے اور سب کے لئے یکساں مفید کتابیں وقت کے ساتھ سفر کرتی رہتی ہیں۔ اور زندہ کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ (الف۔ الف)

نقوش عالی (شخصیت)

(ڈاکٹر عالی جعفری کی یاد میں)

ترتیب وتدوین: **یعقوب راہی**

اس کتاب میں اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری، ممبئی میں اردو کے سابق استاد اور ایک ہر دل عزیز شخصیت عالی جعفری مرحوم پر ان کے شاگردوں، احباب اور افراد خاندان کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر بخوبی یہ علم ہو جاتا ہے کہ عالی جعفری ایک قابل استاد، ایک شریف دوست اور ایک شفیق فرد خاندان تھے۔ اُن کی زندگی کے کوائف، ان کی شخصیت، ان کے کردار، ان کی ذہنی استعداد اور ادبی ذوق پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے مضامین اور اشعار بھی شامل ہیں۔

باقر مہدی کی ایک پر درد نظم سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ نثری خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں باقر مہدی کے علاوہ پروفیسر عبدالستار دلوی، یوسف ناظم، ڈاکٹر خورشید نعمانی، علی امام نقوی، ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی، ڈاکٹر میمونہ دلوی، اطہر عزیز اور کئی خواتین وحضرات شامل ہیں۔

طباعت، کمپوزنگ اور سرورق ایڈ شاٹ پبلی کیشنز کے مثالی معیار کے مطابق ہے۔

ضخامت: ۲۴۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ سنہ اشاعت جولائی ۱۹۹۹ء ☆ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسیس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ ممبئی ۳ ☆ مبصر: **محافظ حیدر**

شہر غزل (شاعری)

رفعت سروش

غزل گوئی میں رفعت سروش نے اپنی قابل رشک صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس طرح آج کل غزل میں موضوعات کی حدبندی نہیں اور بلند پرواز تخلیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو ان کے یہاں بھی اس کی وافر مثالیں مل جاتی ہیں۔ جیسے یہ اشعار

زانہ اجاڑے ہے بھرے شہروں کو لیکن
لنہ تو صحرا کو بھی آباد کرے ہے
یاند ایک نقش پا کہکشاں رہگزر
ہے ادھورا مگر آگہی کا سفر
ے سوال کو سن کر میں اس لئے چپ ہوں
اب دوں گا تو پیدا کروں گا لاکھ سوال
ام عمر جو پلکوں پہ بوجھ بن کے رہا
ں ایک اشک ندامت سے تھک گیا ہوں میں

روح رواں عشق کے موضوع پر بھی اس مجموعے
ار موجود ہیں:

ہ لکھ کے مٹا دیوے ہے تو نام یہ کس کا
کبھو سروش آج کسے یاد کرے ہے
یب شخص مری زندگی میں آیا تھا
یاد رکھوں اسے اور نہ بھول سکتا ہوں
تیں گزریں یہاں سویا تھا کوئی ایک رات
ج تک مہکا ہوا ہے میرا بستر دیکھنا
دا کرے کہ نہ آئے وہ اور تھوڑی دیر
ت لطیف ہے یہ انتظار کا لمحہ

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے ئی ہے۔ کتابت، طباعت نفیس ہے۔

۱۹۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ناشر: رفعت سروش، اے ۸۰، سیکٹر ۲۷، نوئیڈا ۲☆ مبصر: **محافظ حیدر**

منفرد (افسانے)

نعیمہ ضیاء الدین

فرد کے نام سے جرمنی میں مقیم پاکستانی افسانہ نگار نعیمہ ضیاء الدین کے خوبصورت افسانوں کا مجموعہ حال شائع ہوا ہے۔ نعیمہ ضیاء الدین کا شمار ان لکھاری میں ہوتا ہے جو گذشتہ عشرے کے دوران بطور شاعرہ اور سفر نامہ نگار سامنے آئیں اور اپنا لوہا منوالیا وہ اپنے چھوڑ کر ہجرت کے کرب سے گزریں۔ انہیں اس جو واقعات پیش آئے ان ہی پر مبنی نہ صرف سفر نامے انہوں نے انہیں افسانوں کا موضوع بھی بنایا۔
انیوں میں مختلف معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا اور تی کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا۔ ان کا انداز بیان بہت ۔ اسلوب بیان اور الفاظ کا چناؤ بھی خوب ہے۔ وہ تانا بانا اس طرح بناتی ہیں کہ آپ کوئی کہانی پوری بغیر نہیں چھوڑ سکتے وہ بات کہنے اور افسانہ لکھنے کا ڈھنگ جانتی ہیں۔ وہ اپنی تحریر پر پوری گرفت رکھتی ہیں اور پڑھنے والے کو سحر میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ منفرد میں شامل افسانے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ کتاب میں ۱۵ افسانے شامل ہیں۔ جو تمام کے تمام افسانے زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کو موضوع کرتے ہیں۔ خاص طور سے بیسوا، خطرے کی گھنٹی، پس آئینہ، آکسیجن، صرف ایک مارک، مجبور، واقعی منفرد انداز میں لکھے ہوئے افسانے ہیں۔ صفیہ صدیقی (لندن) رام لعل (لکھنؤ) ڈاکٹر خالد سہیل (کینیڈا) سعید انجم (ناروے) بانو قدسیہ (لاہور) ف۔ س۔ اعجاز، کرشن ادیب (بھارت) ڈاکٹر پرویز پروازی (سویڈن) نے اظہار خیال کرتے ہوئے نعیمہ ضیاء الدین کے فکر کو سراہا ہے۔

ضخامت: ۱۵۶ صفحات ☆ قیمت: ۶۰ روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۸ء، ناشر: انشا پبلی کیشنز 6-A، کنال سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳- مبصر: **انوار فیروز (پاکستان)**

کیول دھیر کی کہانیاں (افسانے)

ڈاکٹر کیول دھیر

ڈاکٹر کیول دھیر اردو فکشن کا ایک معروف نام ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جن قلمکاروں نے اردو فکشن کو "زرخیز کیا" ڈاکٹر کیول دھیر ان میں سے ایک ہیں۔ خاک وطن کا خمیر، مزاج کی شگفتگی اور پختہ شعور نے ایسی توانائی بخشی کہ انہوں نے فکشن کے باذوق قاری کو کئی اچھے افسانے دیئے اور اردو کی بیانیہ کہانی کو مرنے نہیں دیا۔ کیول دھیر کا یہ انتخاب بیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک بات تو بہت نمایاں طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ کیول دھیر بنیادی طور پر ایک رومانی افسانہ نگار ہیں اور موجودہ دور میں یہ بڑی بات ہے جبکہ موجودہ دور صرف مسائل کا دور ہے اور اردو کہانی میں بیانیہ کی واپسی کے باوجود کہانی محض رومانی نہیں رہی کہانی بہت مختلف ہو گئی ہے اور ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیاں مختلف رومانی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کی عورت بہت خوبصورت ہے وانتی ہو یا مس نیلم، سنگیتا ہو یا رجنی، مرمریں سانچے میں ڈھلی حسن کی یہ دیویاں بہت معصوم، معطر، مترنم، سلیقہ شعار اور پڑھی لکھی ہیں اور ہندوستانی تہذیب کی علامت ہیں۔ ہندوستانی معاشرے کی اعلیٰ قدریں مصنف کو ہر حال میں عزیز ہیں۔ یہی کیول دھیر کی کہانیوں کی انفرادیت ہے۔ ان کی کہانیوں کے مرد بھی بہت آدرش وادی اور مثالی ہیں۔ یقیناً اس میں مصنف کا اپنا عکس بھی نظر آتا ہے۔ بدلتے اقدار، سماجی مسائل، جنسی بے راہ روی، رشتوں کی پامالی، محبت کے بندھن، ان کی کہانیوں کے خاص موضوع ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر چونکہ پیشے سے ڈاکٹر ہیں لہٰذا اپنی کہانیوں اور کرداروں کی تخلیق میں ان کا پیشہ معاون ہوا ہے۔ کہانیوں میں ندرت آئی ہے۔ میں شرمسار نہیں، رشتوں کی پہچان، لہو کا رنگ، دہشت، اس مجموعے کے خاص اور قابل مطالعہ افسانے ہیں۔ احساس اور تم وہی ہو نفسیاتی کہانیاں ہیں۔ اپنی بنت اور موضوع کے اعتبار سے بھی یہ اہم کہانیاں ہیں۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے کتاب کی تمام کہانیاں سلیس، شائستہ شگفتگی کا مظہر ہیں۔ سماج کی تچی کھری تلخ سچائیاں ان کہانیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہلکے پھلکے رومان کی چاشنی نے ان کو مزید دلچسپ بنادیا ہے۔ امیری غریبی کے فرق کو مٹانے، محبت کے رشتے استوار کرنے اور قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینے والی یہ کہانیاں ادب برائے زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ روشن طباعت، معیاری کاغذ اور عمدہ گٹ اپ کی یہ کتاب اچھی کہانی کے قارئین کے لئے تحفہ ہے۔ یقین ہے کہ فکشن کے ناقدین بھی اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

ضخامت: ۲۰۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ادیب انٹرنیشنل (ساحر کلچرل اکاڈمی) لدھیانہ (پنجاب)۔ مبصر: **نگار عظیم**

دعا کا شجر (شاعری)

منیر سیفی

جودت فکر اور ندرت احساس کا شاعر، منیر سیفی کا دوسرا شعری مجموعہ "دعا کا شجر" کی ہر غزل میں نئی بات، نئے انداز سے، نئے موقع و محل میں کہی ہوئی مل جاتی ہے اور مطالعے میں تھکان نہیں معلوم ہوتی۔ "منیر نے" "؟" "عید کارڈ" "دور اندیش" جیسی کامیاب نظمیں بھی لکھی ہیں۔ "دعا کا شجر" سے چند اشعار۔

ضرورت بھر ضرورت چاہتا ہوں
پرندوں جیسی عادت چاہتا ہوں
سمندر، دشت، پربت کاٹتی ہے
مصیبت کو مصیبت کاٹتی ہے
اٹھائے ہوئے لوگ ان دیکھا بوجھ
سروں سے اتارے چلے جائیں گے
لوگ خائف ہیں ہلال عید سے
آسماں کے ہاتھ میں خنجر نہ ہو

ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۷۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: سید احسان اللہ، ۶۰- سرکلر روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ (بہار) مبصر: **حکیم سید قسیم سہسرامی**

کتب بازار

فریب زار (ناول)
مصنف: غلام جیلانی ☆ ضخامت: ۱۴۸ صفحات ☆ قیمت: اسّی روپے ☆ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدر آباد ۵۰۰۰۸۲۔

پہچان (شاعری)
شاعر: شاہد کبیر ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ایک سو پچاس روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: شاہد کبیر، B/12 فراز اپارٹمنٹ، جعفر نگر، ناگپور-۴۴۰۰۱۳

درد کو لفظ کیا ہے (شاعری)
شاعر: ڈاکٹر سجاد سید ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ایک سو روپے ☆ پتہ: ۱۴-ابوالفضل اپارٹمنٹ، ۲۲-وسندھرا انکلیو۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۹۶

قرآن حکیم: جمالیات کا سرچشمہ (مقدمہ)
تحریر: شکیل الرحمٰن ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مدھوبن، A-267، ساؤتھ سٹی، گوڑگاؤں، ہریانہ-۱۲۲۰۰۱

اذان (شاعری)
شاعر: راجیش ریڈی ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۹ء ☆ ناشر: گل بوٹے پبلی کیشنز ☆ پتہ: ۷-اے، ۴۰۲، کلپک اسٹیٹ، انٹاپ ہل، ممبئی-۴۰۰۰۳۷

ادب کا اسلامی تناظر (مضامین)
مصنف: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی ☆ ضخامت: ۱۵۲ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ: اگست ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: اپلائڈ پبلی کیشنز، پرائیویٹ لمیٹیڈ، 1739/3 (بیس مین) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

لپروسی کیمپ (ایک طویل نثری نظم)
فن کار: مشرف عالم ذوقی ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۶۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ T-101، تاج انکلیو، گیتا کالونی، لنک روڈ، دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱

شب تاب (شاعری)
شاعر: شاہ حسین نہری ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۵ روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: نوائے دکن پبلی کیشنز ۶۷-۱-۱-۱، نارائن نگر، جونا بازار، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱

شام کی ٹہنی کا پھول (افسانے)
افسانہ نگار: سلطان سبحانی ☆ ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ہم زبان پبلی کیشنز، ۱۹۳-ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں (مہاراشٹر)

آخری گھڑے کا پانی (تنقید)
ناقد: خلیق الزماں نصرت ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ: جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مصنف: بلڈنگ نمبر ۴- فلیٹ نمبر ۱۵، سائی نگر کالونی، بھیونڈی

سنگ بستہ (افسانے)
افسانہ نگار: طاہرہ اقبال ☆ ضخامت: ۲۱۶ صفحات ☆ قیمت: ایک سو پچاس روپے ☆ مطبوعہ: ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: قرطاس پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۲۵، فیصل آباد (پاکستان)

رستہ رستہ ریت (شاعری)
شاعر: سرفراز شاکر ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ستر روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: سرفراز شاکر، سیواچی گیٹ مانگلیان کی گلی، جودھپور (راجستھان)

آدھی رات کی شبنم (شاعری)
شاعر: مرغوب علی ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: اسّی روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ رابطہ: تخلیق کار پبلیشرز ۱۰۷-بی، آئی بلاک، لکشمی نگر، نئی دہلی-۹۲

دعوتِ فکر (خیال پارے)
تخلیق کار: عبدالرحمٰن مخلص ☆ ضخامت: ۳۲۸ صفحات ☆ قیمت: تین سو روپے ☆ سال اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: عبدالرحمٰن مخلص، سیر جاگیر، سوپور، کشمیر۔

ہوا کچھ اور کہتی ہے (شاعری)
شاعر: زمان کنجاہی ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے ☆ سال اشاعت ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: شفیع اسٹریٹ، شیر از پارک، اتحاد کالونی، ملتان روڈ، لاہور (پاکستان)

موم کی گڑیا (افسانچے)
کہانی کار: ساحر کلیم ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: پچاس روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انڈیا گیس ورکس سلوڑ، ضلع اورنگ آباد۔ ۴۳۱۱۱۲ (مہاراشٹر)

ندی کا تیسرا کنارہ (منتخب عالمی کہانیاں)
مترجم: شرجیل احمد خاں ☆ ضخامت: ۹۰ صفحات ☆ قیمت: ۴۵ روپے ☆ سال اشاعت: یکم جنوری ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: عکاس پبلی کیشن، حق مارکیٹ، آریہ کمار روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

☆☆☆☆☆☆☆

رسائل و جرائد

شعرو حکمت (ادبی کتابی سلسلہ)
مدیران: شہریار، مغنی تبسم ☆ ضخامت: ۵۳۴ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے ☆ مطبوعہ: کتاب ۱، دور سوم، جولائی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مکتبہ شعروحکمت 6-3-659/2 سوماجی گوڑہ۔ حیدر آباد ۵۰۰۰۸۲

شاہین (سالانہ ادبی کتاب)
مرتبین: معین الدین عثمانی، صغیر احمد ☆ ضخامت ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ سنہ اشاعت: جلد ۱۳، ۲۰۰۰ء ☆ رابطہ: ادارہ شاہین لائبریری، نورانی شاپنگ سینٹر، شاہو نگر، جلگاؤں-۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

الحسنات (رسالت نمبر)
مدیر اعزازی: مرتضیٰ ساحل تسلیمی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۶ روپے (خاص نمبر) ☆ مطبوعہ: اگست ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ادارہ الحسنات، رامپور (یوپی)

شمس وقمر (سہ ماہی)
مدیر: انجد ناظری نظر ☆ ضخامت ۵۶ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۸ روپے ☆ مطبوعہ: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: چمپانگر، بھاگل پور (بہار)

عالمی رشتہ (ماہنامہ)
مدیر اعلیٰ: ایم۔ اے ربانی ☆ مدیر: نصرت فاطمہ ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ دس روپے ☆ مطبوعہ اگست ۲۰۰۰ء ☆ رابطہ: عالمی رشتہ، ۳۱۲۰، بہادر گڑھ روڈ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مریخ (ماہنامہ)
مدیر: عبدالمغنی ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات ☆ قیمت … روپے ☆ مطبوعہ: جولائی تا اگست ۲۰۰۰ء ☆ پتہ اردو بھون، سیکنڈ فلور، چوہٹا، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فاصلہ (سہ ماہی)
شعیب شمس کی ادارت میں متوازن ادب کی صحت مند قدروں کا ترجمان، تخلیق کار، قارئین اور ایجنٹ حضرات رابطہ قائم کریں ☆ شعیب شمس، شاہ کمپاؤنڈ، شاستری نگر، موتی ہاری ۸۴۵۴۰۱ (بہار)

کمپیوٹر کمپوزنگ
محمد ایاز راجپوت

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۱واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد ——— ۷۱
شمارہ ——— ۱۱

فون: 3829904

نومبر ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ ۱۰۰ روپے — لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے — معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے — امریکہ ۲۵ ڈالر — برطانیہ ۱۵ پونڈ — خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

خودداری

سجدے کروں، سوال کروں، التجا کروں
یوں دیں تو کائنات مرے کام کی نہیں
وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت!
مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں

(ماہنامہ شاعر [illegible])

سیماب اکبرآبادی

روایت، ترقی پسند اور جدیدیت سے مختلف لب ولہجہ

پُر اثر اندازِ بیان اور انوکھے اسلوب کے شاعر

سردار آصف

کے تین شعری مجموعے

[illegible]

(ہندی رسم الخط میں)

قیمت: ۱۰۰ روپئے

چاند [illegible] میں

ضخامت: ۱۳۴ صفحات

قیمت: ۱۰۰ روپئے

ڈوبتے جزیرے

ضخامت: ۱۲۹ صفحات

قیمت: ۷۰ روپئے

پہلی بار ہندی رسم الخط میں امیر خسرو سے عہدِ حاضر تک کے شعراء
کی معیاری غزلوں کا انتخاب

غزلوں کے شہر میں

مرتبہ: نشتر خانقاہی
—— سردار آصف
—— جلیس نجیب آبادی

قیمت: ۱۰۰ روپئے (مجلّد) • ۷۵ روپئے (پیپر بیک)

رابطہ: ایم این پبلی کیشنز، حکمائی لین، چاہ شیریں، بجنور (یوپی)
اقبال ساجد خان ایڈوکیٹ، سکھوتی ٹولہ، شاہجہاں پور (یوپی)
جلیس نجیب آبادی، پٹھانپورہ، نجیب آباد (یوپی)

نومبر ۲۰۰۰ء

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں
(قارئین و قلمکار)
۴۰

❖

سلطان نسیم جمیل	[illegible] پروین	احسان سہگل
غلام نبی مومن	اندر موہن کیف	نسرین بانو
شکیل انجم	محمد قمبر علی خان	رضوان علی رضوان
محمد حامد انیس	ضمیر الدین ضمیر	تقی عابدی
	اسلم جمشید پوری	

۴۲

❖

شمارہ ۱۱ [illegible] نومبر ۲۰۰۰ء جلد ۱۷

ادارۂ شاعر کا ایک بڑا عملی قدم

ہم نے شاعر کے گذشتہ شمارے میں دوردرشن کا اردو سٹیلائٹ چینل کیوں نہیں؟ کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا۔ اسی اداریے کو کچھ پھیلا کر ایک مضمون ہندوستان کے تقریباً تمام اردو رسائل وجرائد میں بھجوادیا تھا۔ اسی مضمون کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ (اردو پریس کے بارے میں کسی موقع سے لکھا جائے گا)۔ فی الحال تو شاعر کے بے شمار قارئین کو یہ خوشخبری دینی ہے کہ ہم نے اپنی ڈیمانڈ کے لئے ۱۲ راکتوبر کی شام ساڑھے تین بجے ممبئی مراٹھی پترکار سنگھ میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی تھی جس میں ممبئی کے تقریباً ہر زبان کے بڑے چھوٹے اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ ایک گھنٹے کی بھرپور اور کامیاب پریس کانفرنس میں ہم نے دوردرشن کے اردو سٹیلائٹ چینل کی مانگ کی اور بتایا کہ آج ہماری یہ مانگ ضروری کیوں ہے۔ بڑے آڑے ترچھے سوال جو عام طور پر اردو کے نام پر ابھر سکتے ہیں اور ابھرتے ہیں، ان کی بوچھار بھی سیاسی باتیں، سیاست، مذہبی باتیں اور مذہب، اردو اور مسلمان اور اس سے جڑتے ہوئے گرما گرم سوال۔ ہمارا مدعا تو صرف دوردرشن کا اردو سٹیلائٹ چینل تھا اور اسی کو مرکز بنا کر ہم نے پریس والوں کو بتایا بھی اور ان کے سوالوں کا جواب بھی دیا۔ یہ ہمارا اوّلین عملی قدم ہے اور اب ہم اس سے آگے جائیں گے اور آج کے جو بھی عملی روپ اور احتجاجی اقدامات ہو سکتے ہیں، وہ ہم کریں گے۔ ممبئی میں جو کچھ نہیں ہمیں کرنا ہے وہ کرتے ہوئے دہلی کا رخ کریں گے۔ ہم لوگ اب قلم اور کاغذ سے اٹھ کر اپنی اس ڈیمانڈ کو ہر طرح سے منوانے کی کوشش کریں گے۔ نصف صدی گزر گئی، اب تک ہم قلم اور کاغذ ہی میں شور مچاتے رہے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے نام لاکھوں دستخط ہوں یا گجرال کمیٹی رپورٹ جو کمیٹی در کمیٹی پہلوؤں کے راستے سرد خانے میں پہنچ گئی۔ یہ اور ایسی بے شمار باتیں ہیں جن کا کبھی کوئی حل نہیں نکلا۔ اور ہم اردو والے تو اب ان باتوں کے عادی ہوگئے ہیں اور بے سروپا بے معنی کاموں میں مصروف ہو کر بہت آہستہ آوازوں میں اردو کے بارے میں کچھ لکھتے یا بولتے ہیں۔ بہرحال! ہم نے شکایت کرنا ترک کر دیا ہے اور اپنے طور پر عمل کے راستوں پر گامزن ہونے کی ٹھان لی ہے۔ اب جو ہماری طرف آئے گا، ہمارا ساتھ دے گا، وہ ہمارا اپنا ہوگا۔ یہ کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک نہیں ہے یہ اردو کی تحریک ہے لہٰذا تمام سیاسی پارٹیوں، سیاست دانوں اور سماجی لوگوں کو ہم اپنی اس تحریک میں شامل ہونے کی درخواست کریں گے۔ ہمارے احتجاج کی زبان آج کی زبان ہوگی۔ ۲۱ رویں صدی کی زبان ہوگی، وہ زبان جسے اردو والوں نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ یہی آج کی ضرورت ہے اور یہی کل کی ضرورت بھی ہوگی۔

دوردرشن کا اردو سٹیلائٹ چینل کیوں نہیں ہے؟ کبھی کسی اردو والے نے اس بارے میں نہ سوچا اور نہ ہی کوئی احتجاج کیا ورنہ دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا اپنا سرکاری چینل بھی ہوتا۔ ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر کروڑوں اردو والوں کی یہ ایک ایسی ضرورت ہے جسے سرکار تو کیا سوچتی، خود اردو والوں نے نہیں سوچا۔

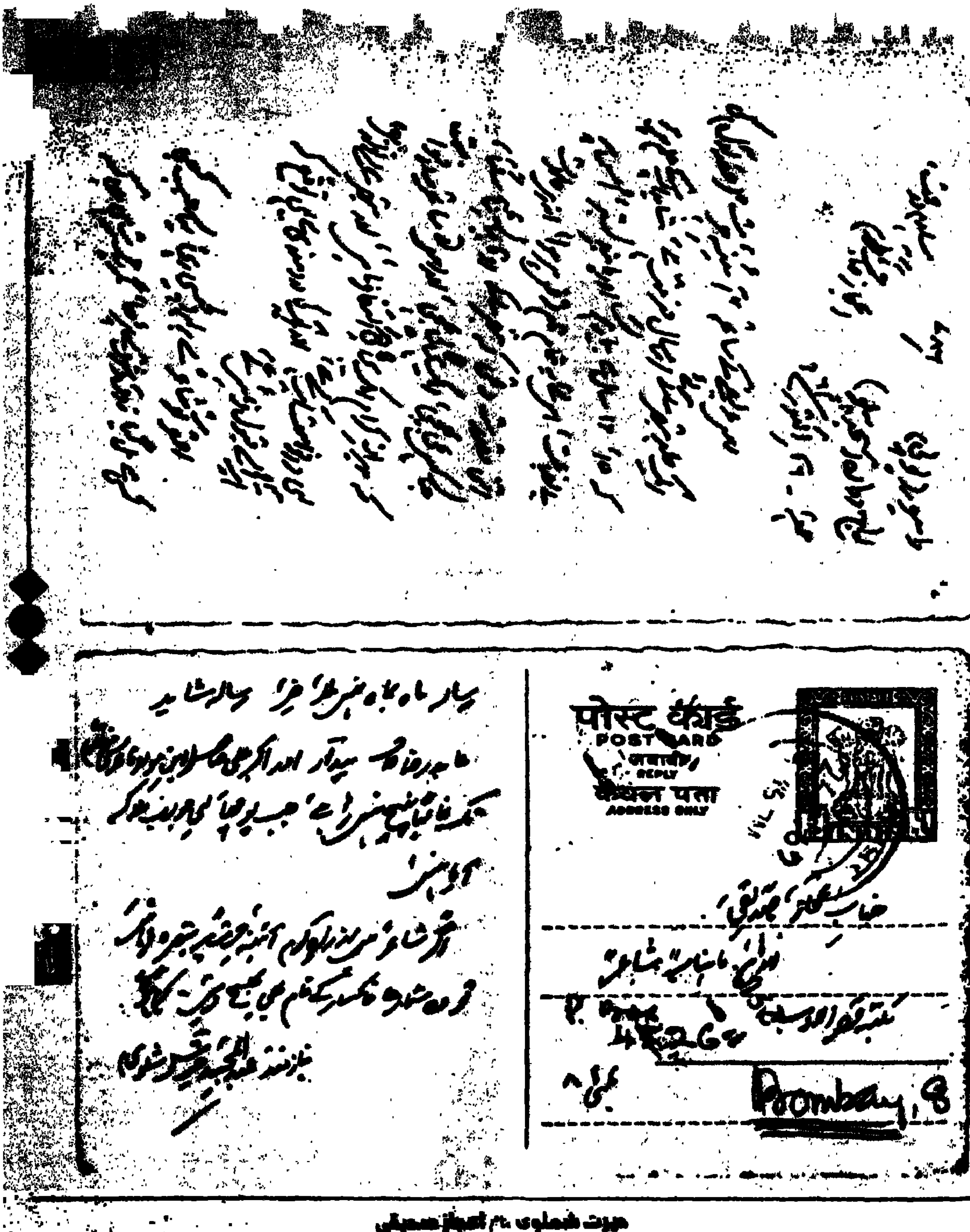
دوردرشن کا اردو سٹیلائٹ چینل اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ عوامی زبان مر رہی ہے۔ سیکولرازم اور قومی یکجہتی کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ ایک بار پھر وہ باتیں دہرائی جارہی ہیں جو کبھی اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے۔ ہندوستان کی ایک بڑی زبان کو اور زیادہ ہندوستانی کرنے کی کوشش میں کی جارہی تھیں۔

قارئین شاعر! ہم چاہتے ہیں کہ اگر آپ کو اپنی زبان اردو سے عشق ہے تو ہماری آواز میں اپنی آواز ملایئے، ہمارے قدم سے قدم ملایئے اور جو بھی عملی کام ہم کر رہے ہیں، آپ بھی کیجئے۔ ہمیں ایک آواز ایک طاقت بن کر اردو کے لئے کام کرنا ہے۔

اس سلسلے میں مختلف شعر ریاں بہت ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کے خیالات بھی ہمارے لئے عملی تجاویز ہو سکتی ہیں۔

مجھے آپ کے گرانقدر مشوروں کا انتظار رہے گا۔

نومبر ۲۰۰۰ء



حیرت شملوی بنام اعجاز صدیقی

عبدالمجید خان حیرت شملوی (پ: ۱۹۰۱ء شملہ۔ م: ۱۸ ستمبر ۱۹۶۳ء کراچی (پاکستان)) اردو کے معروف شاعر تھے۔ آج کل ان کو کم لوگ جانتے ہیں۔ آپ ایک قابل شاعر اور ادیب تھے۔ انتقال سے دو سال قبل تک ہندوستان ہی میں تھے۔ صاحب طرز ادیب اور نقاد اخیں شاہ جیلانی، حیرت شملوی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ دعا کیجئے کہ یہ کام جلد مکمل ہو۔ (ادارہ)

وارث کرمانی

دشت بے صدا

مرا جی چاہتا ہے ایک دشت بے صدا ہوتا
جہاں دور آسماں جھک کر زمیں کو چومتا ہوتا
زمانے کی کوئی آواز کانوں میں نہ آسکتی
نہ کوئی ہمنشیں ہوتا نہ کوئی ہمنوا ہوتا
سمجھ کر وحشی صحرا نشیں اپنی طرح مجھکو
مرے پاس آہوے نازکبدن آکر کھڑا ہوتا
مجھے یہ جانور اچھے ہیں انسانوں سے باز آیا
مجھے حسرت رہی ان میں کوئی درد آشنا ہوتا
کوئی یہ پوچھتا یہ انگلیاں مجروح کیسی ہیں
کہ یہ وہ عمر تھی زور قلم ان میں سوا ہوتا
تمہاری زندگی دانشوروں کے درمیاں گزری
کوئی چشم کرم اٹھتی کوئی حاجت روا ہوتا
کہیں نغمے کی جو رشید بے خون جگر نکلی
کوئی خارا تراشی پر تمہاری لب کشا ہوتا
تمیز حق و باطل اس قدر آساں نہیں ہوتی
جو تم ناحق کو حق کہتے تو کوئی کیوں خفا ہوتا
جہالت کو جب عین معرفت لوگوں نے ٹھہرایا
تمہاری بھی زباں پر مرحبا صد مرحبا ہوتا
درندے جب تقاضا کر رہے تھے مدح خوانی کا
تو ان کو یوسف و منصور تم نے بھی کہا ہوتا
جنوں بے مصلحت غارتگر تعمیر ہوتا ہے
زمانے سے اگر اتنا نہ لڑتے تم تو کیا ہوتا

● ALLAH WALI KOTHI DOODHPUR
CIVIL LINES, ALIGARH-2 (U.P.)

سلطان اختر

جہاں پہنچ نہ ہو اپنی کمند ڈالتے ہیں
کہ آب زر بھی چٹانوں سے ہم نکالتے ہیں
دلوں میں عہدِ گذشتہ کی یاد پالتے ہیں
ہم اپنے گھر میں ہی تیروسناں اچھالتے ہیں
کسی طرح کوئی ارماں کہاں نکالتے ہیں
ہم اپنی خواہشِ ارزاں کو روز ٹالتے ہیں
برے دنوں میں بھی خود کو کہاں سنبھالتے ہیں
کب اپنے آپ کو ہم لوگ گھاس ڈالتے ہیں
اسی لئے تو یہاں معتدل ہے ان کا وقار
وہ تھوڑا جھوٹ بھی سچائیوں میں ڈالتے ہیں
ہمارا شہر ہے شہر طلسم ہوش رُبا
شکستہ پر بھی یہاں اپنے پر نکالتے ہیں
جلا کے اپنا لہو روز وشب چراغوں میں
وہ ہم ہی ہیں جو تیرے بام و در اجالتے ہیں
روایتوں نے کہیں کا نہیں رکھا اختر
ہم ایسی عظمتِ رفتہ پہ خاک ڈالتے ہیں

● HAROON COLONY, SECTOR-1
P.O.PHULWARI SHARIF
PATNA - 801505 (BIHAR)



مصطفیٰ شہاب

میں سب میں اپنے جوہر بانٹتا ہوں
یہ عادت ہے، سو اکثر بانٹتا ہوں

کسی اڑتے ہوئے بادل کو پاکر
خیالوں میں سمندر بانٹتا ہوں

انا اپنی سجا رکھتا ہوں باہر
خودی کو اپنے اندر بانٹتا ہوں

میں مٹی بیچتا ہوں اور دنیا
سمجھتی ہے کہ مرمر بانٹتا ہوں

گھڑی بھر بھی مجھے فرصت نہیں ہے
میں اپنا وقت دن بھر بانٹتا ہوں

لہو کو معتبر کرنے کو، اپنے
پسینے میں ملا کر بانٹتا ہوں

● 14-GARDENS PINNER
MIDDLESEX -HAS 5DW (U.K.)

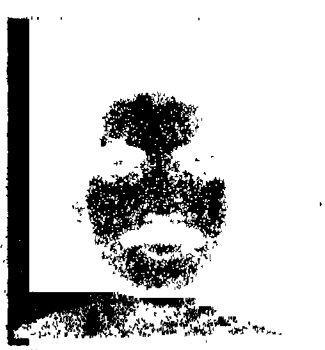
ایک نئے آدمی کو تخلیق کرنا ہے

ادبی فیچر میں معاصر شعر و ادب پر جو مکالمے قائم کئے جاتے ہیں ان سے ادارہ شاعر بھی متفق ہو، یہ ضروری نہیں۔ ادبی فیچر قارئین شاعر اور نئے پرانے قلم کاروں کے لئے آزادانہ اظہار رائے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہمارے درمیان سے "مکالمہ تہذیب" ختم ہو رہی ہے۔ ہم اپنے اختلافات کے اظہار نہیں لب شائستہ میں رہے اور غیر ادبی اسالیب کو اپنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس سے ہماری زبان اور معاصر ادب خاصہ متاثر ہو رہا ہے۔ تخلیق کار کے باطن سے روشنی کے بجائے کچھ اور ابھر رہا ہے۔ حرف مدلفظ میں سموئے جانے والے خیال اپنی تخلیقی چمک، اپنی ندرت اور تازگی کھوتے جا رہے ہیں۔ بہت مصنوعی، روایتی، کتابی رسالی شعر و ادب، خام مواد کی صورت میں چلا آ رہا ہے۔ نئے نئے ادبی رسائل اپنے پیش رووں کے ساتھ تیزی سے پھیلتے ہوئے خام مواد کو اپنے یہاں ذخیرہ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں بالکل آخری لمحوں کی بیسویں صدی میں اردو ادب کی آخری دہائی کا کوئی معروضی تجزیہ ہی بتا سکے گا کہ کتنا معیاری ادب تخلیق ہوا ہے اور کتنا غیر معیاری۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اور پیرنٹ میڈیا کی مسابقت میں کم از کم ادب کو تو بہت نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ بڑھتے ہوئے سٹیلائٹ چینلس کی ہوڑ میں خالص ادب کم ہو رہا ہے، خالص شاعری کم ہو رہی ہے۔ علاقائی زبانوں کے ادب کو اتنا خطرہ نہیں ہے لیکن اردو ادب؟۔ ہاں! غزل اب بھی ہر جگہ موجود ہے۔ کتب و رسائل کے شکم کو بھرنے والا خام ادب بھی اب کتنا پڑھا جا رہا ہے؟ ادب کے قاری اب کون لوگ رہ گئے ہیں؟ قاری تو ہے کیونکہ رسالہ شاعر ابھی زندہ ہے۔ ہم نے نئے نئے قلم کاروں کی دریافت کے ساتھ نئے قاری بھی پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ رسالہ شاعر کے لئے قاری بہت اہم ہے۔ ہم نے گذشتہ دو دہائیوں میں ادب کے قاری پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ادب کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ادبی رسائل کے لئے قاری ایک بنیادی کردار ہے۔ آج اس کردار سے مکالمہ ضروری ہو گیا ہے۔ ادبی فیچر میں اس کردار کے بارے میں کوئی مکالمہ قائم ہو تو ایک ایسی بازگشت آواز بنے گی جو معیاری ادب کی تخلیق میں معاون ہو سکتی ہے ورنہ تو جس کی ڈفلی اسی کا راگ والا معاملہ ہی بنا رہے گا۔ اس وقت اردو ادب میں کئی ایک ڈفلیاں اپنا اپنا راگ الاپ رہی ہیں۔ راگوں کا ایک شور ہے جس سے نئی نسل کے قلم کار زیادہ خوش نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ سریلے ہونے کے بجائے کن سرے ہونے کے خوف سے زیادہ پریشان ہیں۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور پھر اس کے بعد کے نئے ادب کے مسائل۔ ادبی فیچر ہر نوع کے مسائل و مباحث کے لئے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ ہر نوع کے علمی و ادبی اور تہذیبی مکالمے کے لئے کوئی سرحد نہیں ہے۔ اردو زبان جہاں جہاں ہے اور اردو ادب کے قلم کار و قاری جہاں جہاں بھی ہیں ادبی فیچر ان سب کے لئے ہے۔ ہم اس کالم کو مزید LIVE بنانے کے خواہش مند ہیں۔ ہندوستان ہو کہ پاکستان یا اردو کی نئی بستیاں۔ ادارہ شاعر ادبی فیچر کے لئے سب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ مکالمہ تہذیب میں شریک ہو کر آدمی سے آدمی کی افہام و تفہیم کو روشن کیجئے۔

مابعد جدیدیت کی بحث کا مطلب مغربی لسانی مباحث یا کسی مغربی ادبی عبوری یا آئیڈیالوجی کو فروغ دینا نہیں ہے۔ تازہ روشنی اور ہوا کی ناگزیریت کا وہ عمل ہے جس کی ہر نئے قلم کار کو احتیاج رہتی ہے۔ ہم اس بحث کو اصطلاحی، مکتبی اور میکانیکی دائروں سے باہر لانا چاہتے ہیں۔ زندگی کو زندگی کرنے کے عمل میں شعر و ادب کی ضرورت اور اہمیت کی بھرپور بازیافت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے کلاسیکی ورثے کی بازدید بھی کرنا چاہتے ہیں۔ بازیافت و بازدید کے عمل سے ایک نئے آدمی کو تخلیق کرنا ہے۔

اردو کی نئی بستیاں شاعر کا موضوع خاص ہے۔ ادبی فیچر کے تحت اس مکالمہ جاری رہے گا۔ [الف۔ الف]

خود افکاریت (دیباچہ)



خاکسار نے اپنے پچھلے مضمون رد مابعد جدیدیت (مطبوعہ ماہنامہ شاعر ممبئی شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء) کے تحت اپنا مدعا اگرچہ صراحت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ تاہم قارئین کرام میں سے بعض خوش ہوئے بعض خفا اور بعضوں کا خیال ہوا کہ اگر خاکسار نے اپنا خیال پیش نہ کیا ہوتا تو مابعد جدیدیت کے شور سے کچھ نہ کچھ منوایا جا سکتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں نے جو حق سمجھا وہ لکھا۔ یہ میری اپنی سوچ ہے کہ غلط خیال کی تقلید سے بچا اور بچایا جا سکے۔ اگر کسی کے پاس واقعی کچھ نیا ہے تو اسے متعارف کرانے بلکہ منوانے کے لئے "پرانے" کو رد کرنا ضروری نہیں کہ وہ تو نئے کی پیشکش محض سے ہی از خود رد ہو سکتے ہیں کہ "ان الباطل کان زہوقا" چنانچہ اپنی لائن کو بنانے اور بڑھانے کی ہمہ جہت کاوشیں کی جائیں اور اسے سابقین سے زیادہ بلند کرنے کی کوششیں انتہائی تحمل، احتیاط اور عرق ریزی کے ساتھ کی جائیں۔ یہ کام البتہ مزاج خاص کا حصہ ہے اور اس کے لئے غیر معمولی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کوئی اس ہدایت کو ہوتا ہے وہی کچھ بلند یا بہتر تجدید سر انجام دے پاتا ہے ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ بنیاد و تعمیر تو کجا گمراہوں اور نااہلوں نے سوائے بہتان طرازی اور انگشت

تنہائی نے کبھی کچھ نہیں کیا۔

اپنے پچھلے مضمون میں خود افکاریت سے متعلق یہ عرض کیا تھا کہ جدیدیت کے بعد جس ارتقائی فطرت کا ظہور ہوا ہے اسے خود افکاریت کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے میں نے اپنے موضوع کو مزید پھیلا دیا ہے اور دلائل و شواہد کے ساتھ لکھا ہے جس کی اس مختصر سے مضمون میں قطعی گنجائش نہیں۔ میں نے بطور دیباچہ جو [illegible] اختصار کے ساتھ لکھا ہے اسے شاعر کے ذریعے اپنے ہم عصروں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

مجھے اس امر کا یقین تھا اور ہے کہ تخلیقی و عملی شعبوں میں اب جو کچھ ترقی و تبدل ممکن ہے وہ خالص ذاتی خود افکاریت کے طفیل ہی ممکن ہے کیونکہ ادب یا زندگی یا ہماری شخصیتوں میں تازگی و ترقی کے امکانات کیونکر روشن ہوں یہ سوال اب بھی اپنی جگہ قائم ہے حالانکہ آج جب ہم تازگی و ترقی پر از سر نو غور کرتے ہیں تو یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر ایک نئی روحانیت موجزن ہے اور ہمارے ارد گرد اس کے اثرات بہت تیزی سے قائم ہو رہے ہیں۔ یاد رہے کہ ہم سے قبل جو دو بزرگ جماعتیں ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام نامی سے مشہور ہو چکی ہیں انہوں نے ادب کی تکنیکی (روحانی نہیں) سطحوں پر بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یعنی ہمارے پیش روؤں نے (امیر خسرو، نانک، نامدیو، ایسے مشاہیر کو چھوڑ کر) ادب کے ارتقا کو جن منزلوں تک پہنچایا وہ زیادہ تر تکنیکی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی بھی تکنیک کی ایک حد ہوتی ہے اس کا ایک متعین وقت ہوتا ہے کہ جس کے بعد اسے انتقال کر جانا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ دوسری تکنیک آتی ہے پھر تیسری۔ اس طرح تکنیکوں کی تجدید کے سلسلے جاری و ساری رہتے ہیں۔ جدیدیوں کی تکنیک کے بعد تجدید کی جو لہریں ہمارے اندرون و بیرون میں موجزن ہیں انہیں تکنیکی حدود میں نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ تازہ لہروں کی بنیاد ایک صریح روحانیت پر ہے۔ یہ اپنے ساتھ اپنی فطری تکنیک تو لائی ہے مگر اس کا نصب العین تکنیکی نہیں ہے۔ اس کے ظاہر میں بعض تعلیمی و درسی علامتیں تو ہیں لیکن اس کے بطن میں ایک لامحدود فلسفہ حیات ہے جو ترقی پسندوں کی طرح یہ نہیں کہتی کہ محض عکاسی اور احتجاج کرو۔ یہ جدیدیوں کی طرح یہ بھی نہیں کہتی کہ محض عکاسی اور احتجاج کرو۔ یہ جدیدیوں کی طرح یہ بھی نہیں کہتی کہ ابہام، تشکیک، کفر اور قنوطیت کے غوطے لگاؤ۔ بلکہ یہ شخصیت کی برگزیدہ اور مقدس تعمیر کے ذریعے خود دریافتگی کے لامتناہی عمل سے مستفیض کیا چاہتی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ جن لوگوں کی روحوں پر ان کے دماغ زیادہ قابض و غالب رہے انہوں نے تکنیک سے کام لیتے ہوئے وقتی فلسفوں کو شعار کیا مگر ان کی تکنیک میں وہ روح شامل نہیں ہوئی جو ازل کے ادب سے موجود ہے اور ابد کے ادب تک موجود رہے گی جب کہ ہم اس یقین کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں کہ ہم نے جس روحانیت کو تازہ دم کیا ہے اس کے اجزاء ابد تک کام آتے رہیں گے۔ "ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام"۔ خود افکاریت جو کہ روز اول سے چلی آتی ہے مختلف ادوار و اوقات میں مختلف ناموں اور معنوں میں مستعمل رہی ہے۔ آج بھی اسے خود شعاریت، خود فنکاریت، خود ساختیت، خود اظہاریت، خود جوازیت، خود مختاریت وغیرہ کے مختلف ناموں سے یاد کیا جا رہا ہے۔ دراصل لغوی اعتبار سے ہر وہ شخص جس نے اپنے طور پر نئی اختراع و ایجاد کی یا ادب و زندگی کو نئے حقائق سے ہمکنار کیا یا نئے انکشاف و الہام کا اظہار کیا یا نئی دریافت و بازیافت سے کام لیتے ہوئے نئی تعریفیں وضع کیں یا نئے اطوار رائج کئے یا رائج کرنے کی اولین نمائندگی کی خواہ اس کا تعلق کسی شعبہ و موضوع سے ہو وہ خود افکار کہلایا۔ چنانچہ لقمان، اسکائلز، ہومر، سقراط، افلاطون، ارسطو، لانجائنس، بو علی سینا، البیرونی، ابن بطوطا، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، مولانا روم، عمر خیام، حسن بن صباح، شیکسپیئر، کالی داس، نطشے، کارل مارکس، نیوٹن، ایڈیسن، آئن سٹائن، فرائڈ، بریخت، بیکٹ، آئنسکو، آنتون آخطو، جیمس جوائس، ورجینا ولف، کامیو، کافکا، سارتر، ژینے، امیر خسرو، کبیر، غالب، نظیر اکبر آبادی، میر امن امانت لکھنوی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، ٹیگور، سجاد ظہیر، بھیم راؤ امبیڈکر، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، ستیہ جیت رے، دلیپ کمار، شمس الرحمٰن فاروقی اور اے پی جے ابوالکلام وغیرہ درجہ بہ درجہ اپنے خود افکار کارناموں کے ذریعے اپنے میدانوں میں انقلاب برپا کرتے رہے ہیں۔ یعنی خود افکاریت کے ہزار شعبے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ میں نے جس خود افکاریت کا ذکر کیا ہے اس کی مکمل یک رنگی میں از خود ہزاروں رنگ مضمر ہیں کہ یہ ایک ابدی فلسفہ حیات ہے۔

خود افکاریت کے ابدی فلسفہ حیات کو اور یجنل سوچ کے بغیر نہیں پایا جا سکتا۔ اور یجنل سوچ کی قلت عام ہے اور اس کا عالم یہ کہ عہد کے بڑے دانشور فنکار بھی ایک حد تک خود افکار و خود شعار ہونے کے سوا مکمل طور پر خود اختیار نہیں ہیں۔ ایک سائنس کو لیجئے۔ قدرت نے انسانوں کو جس قدر دماغ عطا کیا ہے اس کے صرف ۳۳ر فی صد استعمال تک پہنچنے میں ہی اب تک کے تمام بڑے (موجد سائنسداں، معمار دانشور اور ندرت پسند شاعر و فلسفی و فنکار) عاجز ہیں کہ ۳۳ر فی صد سے قبل ہی لوگ مولانا ابوالکلام بھی ہو جاتے ہیں اور اے پی جے ابوالکلام بھی۔ یعنی دماغ کے ۳۳ر ویں فی صد کو اگر حد تسلیم کر لیں تو خود افکاروں کا درجہ بہ درجہ مقام ۱۵ر سے ۳۳ر فی صد تک یعنی دماغ کی ۱۵ر ویں منزل سے شروع ہوگا اور سائنسدانوں (موجدوں) کو چھوڑ کر دوسرے خود افکاروں کی رسائی ۲۵ر ویں فی صد تک۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ خود افکاروں کو موجودات کا تعاون ناگزیر ہے۔ خود افکاروں کے جو کچھ کارنامے ہو سکتے ہیں موجودات کے اندر اور ان کے تعاون سے ہی ممکن ہیں یہاں تک کے کسی بھی ایجاد، اختراع یا دریافت شدہ علم و فن کے بارے میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ کسی شخص کی ذاتی کد و کاوش کا نتیجہ ہے یا بعینہٖ تخلیق۔ دراصل تمام چیزیں خالق کائنات کی جانب سے انسانوں کے لئے عطیہ ہیں۔ جس سے انسان اپنے مزاج و شعور کے مطابق فائدہ و نقصان اٹھاتا ہے کہ خود اعلیٰ حیثیت موجودات میں ادنیٰ جز کی سی ہے۔ یعنی ترکیب، تحقیق اور تدبیر کی حد تک دماغ سے کام لیا جاتا ہے مگر مرتب محقق یا مدبر خالق نہیں ہو سکتا رہی تعلّی و خوش فہمی سو وہ دانشوروں میں ہی غلط العام والخاص العوام کے مصداق رائج ہے۔ شعراء و ادباء پر بھی اسی مطلع کا اطلاق ہوگا کہ دراصل وہ بھی مرتب محقق یا مدبر سے زیادہ نہیں ہیں۔ یعنی انہیں بھی تخلیق کار کہنا یا سمجھنا عین تعلّی ہے۔ نظام ساختیات و طریقۂ اظہار کی مختلف ہیئت و صورت ماقبل نہ ہوں تو نئے الفاظ نئی تراکیب نیا ساختیاتی نظام یا نئی اظہار کیونکر ممکن ہو۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کی شاعری نئی ہے تو کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ماقبل شاعرانہ جزئیات سے نئی شاعری کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ نہیں بلکہ اس قدر مراد لیتے ہیں کہ ماقبل

شاعرانہ خصائص میں بہ لحاظ ترتیب و تنظیم نیا اضافہ ہوا ہے (تخلیق نہیں)۔ انسان تخلیق کر ہی نہیں سکتا اسے صرف ترتیب و تنظیم کی اہلیت عطا کی گئی ہے اور بس معلوم ہوا کہ خود انکار کارناموں میں تقریباً ۸ ار فی صد انسان کی ذاتی کاوشیں تقریباً ۱۵ ار فی صد اجتماعی شعور (ماحول و معاشرے کے اثرات) سے ماخوذ اور تقریباً ۶۷ ار فی صد تعاون قدرتی یعنی موجودات ارض و سماوات کے طفیل ہے۔ نتیجتاً صد فی صد خود انکار کارنامے کسی کے لئے بھی ناممکن ہیں۔

جس حد تک کہ ہمارے خود انکار کارنامے تازہ دم ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ضرورت اگر ان حوالوں کی ہو اور اگر صرف ایک مثال سے کام چل سکے تو اس تازہ خود انکار عہد میں غزل کو خالد عبادی کا نام خصوصیت کا حامل ہوگا۔ ان کی شاعری اس کا ثبوت ہے اور نثر نمونہ اور اگرچہ کہ ۲۶ ر دسمبر ۱۹۹۶ء کی ایک یادگار نشست میں یاران خود شعار نامی انجمن کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے (تفصیل کیلئے انقلاب جدید، پٹنہ شمارہ ۸ جنوری ۹۷ء اور ہماری زبان دہلی شمارہ یکم مارچ ۹۷ء کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے) تاہم مجھے اس ضمن میں ایک بات اور کہنی ہے کہ خود انکار اپنی ذات میں خود ایک اسکول ایک عہد ایک تحریک ہوتا ہے۔ جہاں کئی شخصیتیں مل کر کسی ایک اسکول کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً دہلی اسکول، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ اسکول وغیرہ وہیں خود انکاریت تنہائی میں اور تنہا یہ قائم ہوتی ہے اور اپنا سفر طے کرتی ہوئی اپنی منزل کو جا پہنچتی ہے۔ اسی لئے خود انکاریت رائج معنوں میں کبھی اسکول یا تحریک نہیں بن پاتی۔ یعنی تحریکیت اور خود انکاریت اپنی فطرت میں دونوں متضاد ہیں۔ خود انکاریت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں، ہوتے رہیں گے لیکن اسے تحریک کی شکل دینا اس کی فطرت کے منافی اور بغاوت کے مترادف ہے۔ اگرچہ کہ ہمارا عہد خود انکاروں کا عہد ہے لیکن کتنے فنکار خود انکاریت و خود شعاریت کے پل صراط سے گذر پاتے ہیں یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ خود انکاریت و خود شعاریت کی توثیق، تحقیق اور تصدیق اپنے ساتھ رہنما برگزیدگی، الہامی شوریدگی اور مقدس سنجیدگی کی بشارت لائی ہے۔ اس کا چشم کمال عظمت کے سینے سے پھوٹا ہے۔ ستاروں کی چال بدل رہی ہے۔ کائنات کے نقشے پر اثبات و نفی کی انتہا جنگ و جدال اور حرص و ہوس کے کریہہ و پرفریب و ہیبت ناک منفی نتائج اپنے فیصلہ کن روحانی انقلاب کو بہم ہو رہے ہیں۔ سمندر کے گرداب اور صحرا کے آداب سر بہ سر تجدید آمادہ ہیں اور ارض و سماوات کو خود انکاروں کے لئے سجایا اور سنوارا جا رہا ہے وماعلینا الا البلاغ

● QUILA GHAT COLONY, DARBHANGA (BIHAR)

تخلیق کی لامحدودیت نئی نسل کی پہچان ھے

انور اسرح

نئی ادبی نسل کو مابعد جدیدیت سے، خود انکاریت سے یا تخلیقیت سے جوڑیں یا کسی اور معنویت کے اعتبار سے اسکی کوئی اور اصطلاح تجویز کرلیں۔ اس سے قطع نظر نئی نسل بار بار یہ اعلان کر رہی ہے کہ وہ کسی نظریئے اور تھیوری کی پابند نہیں ہے، لہٰذا ان کی تخلیقات یا افکار کو مغربی افکار سے جوڑ دینا، جن سے مشرقی شعریات کی خلاف ورزی ہوتی ہو، غلط ہے۔

نئی نسل کے سچے فنکاروں نے دو بڑے کام کئے ایک تو یہ کہ وہ تمام پابندیوں اور حد بندیوں کو توڑتے ہوئے، اپنے مسائل اور عصری تقاضوں کے ساتھ آزادانہ تخلیقی رویہ رکھا، اور تخلیق کو اپنا اصل مرکز مان کر اپنے ادب کو نظریاتی حصار کے اندر گھٹنے سے بچا لیا۔ دوسرا نقادوں کی بالادستی کی مخالفت کی اور ان کی امامت قبول کرنے سے انکار کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہم کسی تنقیدی یا نظریاتی اصول پر فن کی تخلیق کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی ان اصولوں کے لئے تخلیقی معذوری پسند کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے نئی نسل کو نقاد کی عدم موجودگی کا احساس پریشان نہیں کرتا۔ وہ اپنی تخلیق کو تخلیقیت کے دم پر زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کو محسوس کرنے لگی ہے کہ اگر تخلیقات میں متوجہ کرنے کی صلاحیت ہے تو از خود نقاد حضرات فن پارے کی طرف رجوع کریں گے، باوجود اس کے اگر وہ تخلیقی فن پارے سے روگردانی یا چشم پوشی کرتے ہیں تو یقیناً ادب کے ساتھ اس غیر منصفانہ رویے کے لئے اپنا ہی نقصان کریں گے، اور یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ ایسے فنکار جن کی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیئے تھا، یا ان کی جو پذیرائی ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہو سکی، ایسا کیوں ہوا؟ آج قاری شدت سے اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ آخر ان سچے فنکاروں کے ساتھ ہمارے ناقدوں نے یہ رویہ کیوں روا رکھا؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ ان قلم کاروں کے پاس اعلیٰ عہدے نہ تھے، وہ کسی لابی یا گروپ میں شامل نہ تھے یا ان سے نقادوں کی چاپلوسی نہ ہو سکی۔ لیکن جو ان خصوصیات سے لیس تھے (سب نہیں) انہیں تبصرے، گوشے مضامین اور رسالے کے نمبروں کے ذریعے ادب پر تھوپا ضرور گیا اور ایک حد تک اس کے ذمے دار ہمارے مدیران رسائل بھی ہیں۔ میں سب کو مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھتا اور نہ ہی ان سب کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارا اختلاف تو ادب کے اس غیر ایماندارانہ رویے سے ہے جو بعض نقاد اور مدیران رسائل نے اپنا رکھا ہے۔ آپ اگر دو چار سال کے ادب کا جائزہ لیں تو آپکو اندازہ ہو جائے گا کہ کتنے جونئیر قلم کار سامنے آئے (کچھ کو چھوڑ کر) اور وہ تخلیقی سطح پر کتنے صحت مند تھے اور کس طرح زبردستی انہیں ادب کا شہسوار ثابت کیا گیا۔ لیکن ان سچے فنکاروں کے ساتھ کیا ہوا۔ جنہوں نے ادب کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کرنا چاہا تھا، ان میں سے بیشتر کی تخلیقات ناقدین ادب کی بے توجہی کی دبیز گرد جمتی رہی اور کچھ وقت کے لئے وہ ضرور گمنام ہو کر رہ گئے (یا رہ جائیں گے) لیکن اب جیسے جیسے قاری کی واپسی ہو رہی ہے۔ اخوا کردہ وہ رتوں اور قدروں کی بازیافت کے ساتھ ہی تخلیقات کی چھان پھٹک کا عمل بھی سامنے آ رہا ہے اور بے التفاتی اور عدم توجہی کی شکار تخلیقات دھیرے دھیرے رہی سہی، پوری توانائی کے ساتھ سامنے آ رہی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مصلحت اندیش نقادوں کی "تنقیدی بصیرت" کے ساتھ ان کی شخصیت کے آگے سوالیہ نشان لگنے لگے ہیں۔

نئی نسل اور مابعد جدیدیت کے سلسلے میں بہت کنفیوژن ہے۔ نئی نسل کے کچھ قلم کار اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ جدیدیت کے بعد جن فنکاروں نے اندھی

تقلید سے [stain] ئے ہوئے غیر مانوسیت سے مانوسیت کی طرف راجعت کی اور اپنا ایک الگ راستہ اختیار کر لیا تھا جسکے ڈانڈے جدیدیت سے نہیں ملتے ہیں۔ دراصل یہی مابعد جدیدیت فنکار ہیں۔ لیکن اس سے موجودہ ادبی نسل کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی نئی نسل خود کو اس میں شامل کرنا چاہتی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ مابعد جدیدیت اتنی ہی بوڑھی ہے جتنی کہ جدیدیت، کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس وقت اس کی موجودگی کے اظہار کو ضروری نہ سمجھا گیا ہو، یا اس کی جرأت نہ کی جا سکی ہو، اس مفروضے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں کہ آخر اس وقت اس کے اظہار کو ضروری کیوں نہ سمجھا گیا؟ یا اس کے اظہار کے لئے کون سی مجبوری حائل تھی؟ جبکہ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ وہ جدیدیت سے بالکل الگ ہٹ کر فن کی تخلیق کر رہے ہیں اور ان کے ڈانڈے بھی جدیدیت سے نہیں بلکہ غیر جدیدیت سے مل رہے تھے۔ میرے خیال سے مابعد جدیدیت کے اوّلین فنکار اور موجودہ ادبی نسل کو اس طرح سمجھنے اور سمجھانے سے بھی اس کے فکری وقائع دب کر رہ جائیں گے۔

مجھے اس سے قطعی انکار نہیں کہ جدیدیت سے گریز کرنے والے فنکار ہی بانیان مابعد جدیدیت کہلانے کے مستحق ہیں اور انہوں نے ہی بلاشبہ اپنے بعد کے تخلیق کاروں کے لئے راستہ ہموار کیا ہے، اب بعد کے تخلیق کار اگر دس سال کے اندر اپنے پیش روؤں کا گلا گھونٹ دیں تو یہ ان کا جارحانہ عمل ہوگا، یوں بھی دس دس سالوں میں نسلوں کا خاتمہ ادب کے لئے کوئی مستحسن قدم نہیں ہے بلکہ نسلوں کا اسقاط ہے اور یہ الزام موجودہ ادبی نسل اپنے سر کیوں لے؟

موجودہ ادبی نسل کے بیشتر قلم کاروں کا اس بات پر بجا اصرار ہے کہ وہ جدیدیت سے انحراف کے بعد کی پوری نسل کو ایک اکائی مانتی ہے، اور مابعد جدیدیت کی اس اصطلاح کو مغرب سے مستعار نہیں جانتی، جو بھی مسائل اور تقاضے ہیں، ان کے اپنے ہیں نئے ادب کا منظر نامہ ماقبل ادب کے منظر نامے سے مختلف ہے۔ چنانچہ نئی نسل اوڑھے ہوئے تقاضے اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بجائے بھوگے ہوئے مسائل سے جوجھ رہی ہے، لہٰذا یہ مابعد جدیدیت اردو کی اپنی اصطلاح ہے اور مشرقی شعریات سے وابستہ ہے، جو کسی نظریئے کی غلامی پر یقین نہیں رکھتی بلکہ تخلیق کی لامحدودیت پر ایمان رکھتی ہے جو اس کا امتیازی وصف ہے۔

● URDU SECTION BIHAR LEGISLETIVE COUNCIL, PATNA - (BIHAR)

حوالہ جاتی خلیجی ادب کا جائزہ

محمد ممتاز راشد



شاعر میں خلیجی ریاستی میں اردو کی صورت حال کے بارے میں جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شاہین نظر کا جو ڈیڑھ صفحے کا مضمون شائع ہوا ہے وہ بہت سرسری سا ہے۔ اسی پس منظر میں اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے "حوالہ جاتی خلیجی ادب کا جائزہ" پیش کیا ہے۔ اس میں گذشتہ ربع صدی کے خلیجی ادب کے حوالے سے بنیادی معلومات جمع کی ہیں تاکہ اس پر بحث ہو اور کوئی اس کام کو آگے بڑھائے۔ شاعر میں آپ خلیجی ادب کو کافی جگہ دیتے ہیں۔ یہ ایک مستقل تحقیق کا موضوع ہے۔

خلیجی ریاستوں میں اردو سرگرمیوں کا سلسلہ تقسیم ہند کے زمانے ہی سے جاری ہے۔ لیکن ان میں تیزی ۱۹۷۰ء کے عشرے میں آئی جب پاک وہند سے خلیج میں آنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھی اور یوں اردو سرگرمیوں میں کئی پہلوؤں سے وسعت آئی۔ ان سرگرمیوں کے بارے میں کئی زاویوں سے بات ہو سکتی ہے مثلاً عالمی مشاعرے، مقامی مشاعرے اور گھریلو نشستیں، مذاکرے اور مباحثے، ادبی سیمینار اور ادبی جشن، شعری ونثری کتابوں کی اشاعت، اردو کے تعلیمی ادارے، اردو رسالے اور اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کی اردو نشریات وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہو سکتی ہے تاہم اس مضمون میں صرف حوالہ جاتی خلیجی ادب کے موضوع پر بات ہو گی۔ یہ ۲۰۰۰ء کا نصف آخر ہے اور اب تک اس ضمن میں جو کاوشیں میرے سامنے آئی ہیں ان کا احوال یوں ہے کہ سب سے پہلا انتخاب ۱۹۸۰ء میں "صدائے صحرا" کے نام سے سجاد بابر نے شائع کیا جس میں دوبئی اور شارجہ کے شعراء کا منتخب کلام تھا۔ سجاد بابر بعد میں دوبئی سے جدہ چلے گئے۔ ۱۹۸۱ء میں اسلام عظمی نے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ اشتراک سے "ریت اور شبنم" کے عنوان سے ایک انتخاب شائع کیا جس میں ابوظہبی کے شعراء کا کلام تھا۔ ۱۹۸۰ء میں "بزم اردو قطر" نے مجلّہ "تعارف" شائع کیا جس میں قطر کے شعراء کا کلام تھا۔ ۱۹۸۲ء میں بزم اردو قطر نے "صحرا کی ٹھنڈی شامیں" (مرتبہ محمد ممتاز راشد) شائع کی جس میں قطر کے شعراء کے منتخب کلام کے علاوہ قطر کی ادبی تاریخ پر دو ایک مضامین بھی تھے۔ ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے "قطر میں اردو" کے عنوان سے گوہر نوشاہی کا مرتب کردہ ایک پمفلٹ شائع کیا جو کہ دس بارہ صفحات کا تھا۔ اس میں بیشتر مواد بزم اردو قطر کے مجلّہ "تعارف" کے حوالے سے تھا۔ بزم اردو قطر نے ۱۹۸۴ء میں قطر میں مشاعروں کے پچیس سال پورے ہونے پر "سلور جوبلی مشاعرہ" منعقد کیا اور پھر اس کی روداد پر مشتمل "سلور جوبلی مشاعرہ" نامی مجلّہ شائع کیا۔ ۱۹۹۵ء میں اس بزم نے "امیر خسرو سیمینار" منعقد کیا تو "مجلّہ امیر خسرو" بھی شائع کیا۔ بزم کے مذکورہ تینوں مجلّوں کی تیاری میں مجھے نمایاں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۹۸۵ء میں سلیم جعفری مرحوم نے یو اے ای میں عالمی مشاعرے کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۶ء میں انڈو قطر اردو مرکز کے محمد سلیمان دہلوی نے قطر میں بھی عالمی مشاعروں کا آغاز کیا اور ۱۹۹۴ء میں مصیب الرحمٰن ملک نے مجلس فروغ اردو ادب کے تحت قطر میں زیادہ بڑے پیمانے پر عالمی مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ مجلس کا یہ سلسلہ قطر اور یو اے ای میں تاحال جاری ہے۔ ان عالمی مشاعروں، جشنوں اور ایوارڈز کی تقریبات کے ساتھ ضخیم مجلّے بھی شائع ہوتے ہیں جن میں خلیجی ادب کے بارے میں بھی خاصا مواد ہوتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں مسقط سے عبدالودود مخلص نے ماہنامہ "مفہوم" شروع کیا۔ اس میں بھی خلیجی اہل قلم کی نگارشات خاصی تعداد میں

ہوتی تھیں۔ اس دور میں کویت سے طاہر پرویز اور ان کے ساتھی، ماہنامہ "ادبی ڈائجسٹ" نکالتے رہے جو کویت پر عراقی حملے (۱۹۹۰ء) کے بعد ختم ہو گیا۔ اس دور میں "الخُبر سعودیہ" سے نصیر الدین ناصر نے کچھ ماہ کے لئے ماہنامہ "قافلہ" بھی نکالا۔ ان رسالوں میں خلیجی اہلِ ادب کی کاوشیں متواتر شائع ہوتی تھیں۔ قطر کے بزرگ شاعر وحید بخش غیاث نے ۱۹۸۹ء میں ایک کتاب "مقیاس" اور ۱۹۹۲ء میں ایک ضخیم مجلّہ "سلور جوبلی" شائع کیا جن میں قطر کی بیسیوں شخصیات کا تعارف تھا اور ان میں خاصی تعداد میں اہل قلم کا تعارف بھی تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں "مقتدرہ قومی زبان" کے ماہنامہ "اخبار اردو" اسلام آباد کا "بیرونِ ملک اردو نمبر" آیا۔ اس میں درجنوں ممالک کی اردو سرگرمیوں کے بارے میں مضامین تھے۔ خلیج کی سبھی ریاستیں بھی ان میں شامل تھیں۔ ۱۹۹۶ء میں اس مجلّے کے مرتب ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے "بیرونی ممالک میں اردو" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب بھی مرتب کی جس میں نئے مضامین بھی تھے اور "اخبار اردو" کے مضامین کو بھی تازہ معلومات سے آراستہ کر کے شامل کیا گیا تھا۔ ان دونوں کتابوں میں قطر کے بارے میں تحریر کردہ مضامین خاکسار ہی کے تحریر کردہ تھے۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں ایک ضخیم ادبی انتخاب "مشرقِ وسطیٰ میں اردو" شائع ہوا۔ ۴۷۲ صفحات کی اس کتاب کے مرتبین میں سید قمر حیدر قمر، ڈاکٹر راشد فضلی، شمس الحق نوشاد اور بشیر مرزا شامل تھے۔ اس میں سعودیہ سے ۴۸، یو اے ای سے ۱۴، عمان سے سات، قطر سے آٹھ، کویت سے چھ اور بحرین سے چار اہلِ قلم کی تخلیقات شامل تھیں۔ یہ کل ۱۱۰ قلمکار تھے جن میں ۱۹ وہ تھے جو سعودیہ سے واپس جا چکے تھے نیز چاروں مرتبین کے نام بھی شامل تھے۔ ۱۹۹۵ء میں خاکسار نے ادبی سہ ماہی رسالہ "خیال و فن" جاری کیا جو دو سال تک باقاعدگی سے شائع ہوا اور اب سال میں ایک بار لاہور اور دوحہ سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے ہر شمارے میں نہ صرف خلیجی اہلِ قلم کی شعری اور نثری نگارشات بڑے تناسب کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ بلکہ ہر شمارے میں کسی ایک نمایاں خلیجی شاعر کے بارے میں خصوصی گوشہ بھی ہوتا ہے۔ "خیال و فن" کے بعض خصوصی نمبر بھی آ چکے ہیں مثلاً خلیجی شاعرات نمبر، آزادی کا گولڈن جوبلی نمبر اور حمد باری تعالیٰ نمبر، جبکہ "خلیجی نعت نمبر" ستمبر ۲۰۰۰ء میں آ رہا ہے۔ اس رسالے کے ذریعے بیسیوں خلیجی اہل قلم کی کاوشیں سامنے آ چکی ہیں جبکہ ایک شمارے میں قطر سے شائع ہونے والی تمام اردو کتب کی تفصیل بھی دی جا چکی ہے۔ ۱۹۹۵ء سے خلیج کا پہلا اردو نامہ بھی شائع ہو رہا ہے اور یہ جدہ سے شائع ہونے والا "اردو نیوز" ہے۔ اس کے ہفتہ وار ویکلی ادبی صفحے کے ذریعے خلیجی ادبی سرگرمیوں اور خلیجی اہلِ قلم کا بھرپور تعارف ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۹۸ء سے اس ادارے کا ویکلی "اردو میگزین" بھی شائع ہو رہا ہے جس کے کئی صفحات خلیجی ادب کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ پاک و ہند کے کئی رسائل اور جرائد بھی خلیجی ادبی سرگرمیوں کو جگہ دیتے ہیں اور ان اخباروں اور رسالوں کی بھی خلیج میں کافی کھپت ہے۔ ۱۹۹۷ء سے ادبی ماہنامہ "دنیائے ادب" کراچی بھی خلیجی اہلِ قلم کے بارے میں خاصا مواد شائع کر رہا ہے۔ اس کے مدیر حمایت علی شاعر کے صاحبزادے اوج کمال ہیں۔ معروف افسانہ نگار سلطانہ مہر اپنے شوہر کے ساتھ بحرین میں مقیم تھیں پھر لاس اینجلس (امریکہ) میں جا بسیں جہاں سے انہوں نے ایک ادبی تذکرہ "سخنور" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کی اب تک تین جلدیں آ چکی ہیں۔ دوسری اور تیسری جلد میں خلیج کے درجنوں اہلِ قلم کا تعارف اور کلام شامل ہے۔ اس کا حصہ اوّل ۱۹۹۷ء میں اور حصہ دوم ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ محمد ہارون پاشا ابو ظہبی ریڈیو کی اردو سروس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے یو اے ای کے کئی نمایاں افراد کے خاکے لکھے جو دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں ان میں کئی اہلِ قلم بھی ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں بزم اردو قطر کے صدر اور افسانہ نگار شمیم حیدر نے "ریگ رنگ" مرتب کی جس میں بزم سے وابستہ ۲۶ قلمکاروں کی منتخب شعری و نثری کاوشیں شامل تھیں۔ ۱۹۹۸ء میں کویت میں مقیم شاعر باقی احمد پوری نے "بین الاقوامی اردو شاعری" کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا جس میں ۵۴ شعراء کی تخلیقات شامل تھیں۔ ان میں سے تقریباً نصف کا تعلق خلیج سے ہے۔ ممبئی سے ماہنامہ "شاعر" سات عشروں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر افتخار امام صدیقی نے ۱۹۹۸ء میں اس کا ایک خصوصی نمبر "اردو کی نئی بستیاں" شائع کیا جس کی دوسری جلد ۲۰۰۰ء کے اواخر میں متوقع [اردو کی نئی بستیاں نہیں بلکہ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کی دوسری جلد ۲۰۰۱ء میں متوقع ہے۔ (ادارہ)] ہے اس میں بھی خلیج کے بیسیوں اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں "الحمد پبلی کیشنز" لاہور کے صفدر حسین کی تحریک پر خاکسار نے ایک کتاب "خلیج کی منتخب غزلیں" مرتب کی جس میں چودہ صاحبِ کتاب خلیجی شعراء اور شاعرات کی دس دس غزلیں ہیں۔ اس کی اشاعت دسمبر ۲۰۰۰ء تک متوقع ہے۔ ۱۹۹۸ء سے ابو ظہبی میں مقیم پروفیسر ظہیر بدر خلیج میں اردو کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ یہ مکمل ہو گا تو خلیج کے حوالے سے یہ پہلی باقاعدہ مبسوط تحریر ہو گی اور اس کی اشاعت سے خلیجی ادبی سرگرمیوں کی ایک مستند اور دستاویزی تحریر سامنے آئے گی۔ جنوری ۲۰۰۰ء میں قطر کی ادبی صورتحال کے بارے میں عطاء الرحمٰن ندوی کا تحریر کردہ چھبیس صفحات کا ایک مفصل تجزیاتی مضمون انجمن ترقی اردو کی دہلی میں منعقدہ کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ اس میں قطر کی چار پانچ نمایاں ادبی تنظیموں کی کارگزاری کا تجزیہ بھی شامل ہے۔ ۱۹۹۹ء کے اواخر میں ماہنامہ "تخلیق" (لاہور) کا "خلیجی ریاستوں میں اردو" کے عنوان سے ایک ضخیم نمبر شائع ہوا۔ اس ضمن میں ہونے والی کوششوں میں اس نمبر کو سب سے وقیع کوشش کہا جا سکتا ہے۔ ۴۸۰ صفحات کے اس خصوصی شمارے کا ٹائٹل فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے بنایا جبکہ تزئین کا عمل نامور مصور اسلم کمال کا کارنامہ ہے۔ "تخلیق" کے مدیر اظہر جاوید نے اس شمارے کے منظرِ عام پر آنے کے سلسلے میں مصیب الرحمٰن ملک اور لبنیٰ جاوید کے تعاون کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ دیگر نمایاں معاونین میں سعودی عرب کے نسیم سحر، قمر حیدر اور عاصم صدیقی، دوحہ کے سعید کوکب، ابو ظہبی کے ظہور الاسلام جاوید، کویت کی مسرت جبیں زیبا، قطر سے راقم اسطور اور بحرین کے بزرگ شاعر سعید قیس کے نام شامل ہیں۔ اس خاص نمبر میں خلیجی ریاستوں کے تعارف میں لکھا ہوا۔ نجم الحسن رضوی کا اہم مضمون اور ظہور الاسلام جاوید یو اے ای کی ادبی تاریخ کے بارے میں لکھا ہوا خصوصی مضمون بھی ہے۔ "تخلیق" کا یہ شمارہ ۱۹۹۳ء میں شائع ہونا تھا، اسی لئے اس میں شامل کئی قلمکاروں کا تعارف اسی دور تک کا ہے۔ اس نمبر میں کل ۱۲۵ اہلِ قلم شامل کئے گئے ہیں ان میں سعودیہ سے ۵۳، یو اے ای سے پانچ، کویت سے اٹھارہ، بحرین سے آٹھ، عمان سے چھ اور قطر سے اڑتیس اہلِ قلم کا منتخب کلام شامل ہے۔ شاعری میں غزلوں کا تناسب بہت زیادہ ہے بھی خاصی

بچاس نظموں کے مقابل ۳۸۴ غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ ۳۴ قطعات، ۱۶ رباعیاں، ۱۴ ماہیے، ۸ دوہے، ۴ حمدیں، دو خماسیاں اور چار مزاحیہ قطعات بھی شامل ہیں۔ دو نمکین غزلیں، ایک دکھنی غزل، ایک پنجابی غزل، اور دو پنجابی نظمیں بھی ہیں۔ نثری حصے میں چار افسانے اور تعارفی تحریریں شامل ہیں۔ کل شخصیات میں ۱۲۵ شا اور بارہ شاعرات کے علاوہ چار مرد اور دو خواتین افسانہ نگار ہیں۔ ان اعداد و شمار سے بھی خلیج کی ادبی صورتِ حال کا ایک منظر نامہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ اس شمارے کے! خاکسار نے "خلیجی ریاستوں میں اردو - ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ "دنیائے ادب" کراچی کے شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا اور ادبی ماہنامہ "پیش رفت" دہلی کے شمارہ جون ۲۰۰۰ء میں بھی شائع ہوا۔

اس اجمالی جائزے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ خلیج کے حوالے سے جتنا کام ہو چکا ہے اسے خلیج کی تمام اہم لائبریریوں میں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جائے اور ا لائبریریوں میں اردو سیکشن کھلوائے جائیں۔ خلیجی ریاستوں میں ایسے جتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے وہاں خصوصی توجہ دی جائے اور ان اسکولو کی لائبریریوں میں "خلیجی اردو ادب" کے خصوصی سیکشن قائم کیے جائیں جہاں خلیج کے اردو شعراء اور نثر نگاروں کی کتابیں بھی دستیاب ہوں اور وہ تمام کتب اور بھی جن میں خلیج کے حوالے سے مواد موجود ہو۔ اسی طرح پاک و ہند میں اردو کے جو مرکزی ادارے ہیں وہاں بھی خلیجی ادب کے لئے خصوصی سیکشن قائم ہو۔ ضروری ہیں کیونکہ پاک و ہند کے سینکڑوں شاعروں اور نثر نگاروں کو خلیج کے اہلِ ادب ان کی بھرپور پذیرائی کرتے ہیں۔ چنانچہ پاک و ہند میں بھی کوئی ٹھوس ادبی کام، چاہیئے تاکہ خلیجی ادب کو فروغ حاصل ہو سکے۔

P.O. BOX. No.41, DRAWING SECTION, DOHA, QATAR.

☆ ادبی فیچر نئے پرانے تمام قلمکاروں کے لئے ہے۔
☆ اپنی بات کہیئے، اظہار خیال کیجئے۔
☆ نیا ادبی مکالمہ، نئے سوال قائم کیجئے۔
☆ آپ جو سوچ رہے ہیں معاصر اردو ادب اور اردو زبان کے بارے میں، اس پر اپنی آزادانہ رائے دیجئے۔
☆ آپ کی رائے سے ادارۂ شاعر یا کسی اور کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
☆ قارئین شاعر کے لئے ادبی فیچر اظہار خیال کا موثر ذریعہ ہے۔



تاج پیامی

نذر مصحفی

(۱۷۴۷ء-۱۸۲۵ء)

ہپا کے رکھا تھا دل کا غبار ہم نے تو
ی نہ ان پہ کیا آشکار ہم نے تو

باز گشت ہوئی ہے نہ در کھلا ہے کبھی
مدائیں دی ہیں انہیں بار بار ہم نے تو

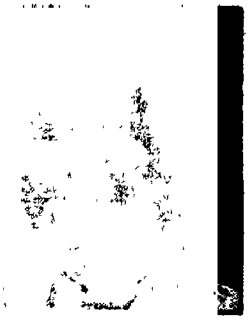
راہزن ہوں کہ رہبر انہیں خبر ہی نہیں
ے سے چن لئے راہوں کے خار ہم نے تو

جام جس میں نہ شامل ہو بے رخی، ساقی!
ام عمر کیا انتظار ہم نے تو

م کو چوم کے آسانیاں چلیں ہمراہ
ن جو راہ تھی کی اختیار ہم نے تو

زاں کی دوست بنی پھر رہی ہے اتراتی
با پہ تاج کیا اعتبار ہم نے تو

● DARUL ADAB MAHADEVA
MOHALLA, ARA 802301



غنی اعجاز

آدمی کی حیات مٹھی بھر
یعنی کل کائنات مٹھی بھر

ہاتھ بھر کا ہے دن بچھڑنے کا
اور ملنے کی رات مٹھی بھر

کیا کروگے سمیٹ کر دنیا
ہے جو دنیا کا ساتھ مٹھی بھر

کرگیا کشتِ آرزو شاداب
آپ کا التفات مٹھی بھر

اور ملنا بھی کیا سرابوں سے
ریت آئے گی ہاتھ مٹھی بھر

حوصلہ یوں نہ ہارتے اعجاز
ہوگئی تھی جو مات مٹھی بھر

● MOMIN PURA,
AKOLA 444001, (M.S.)



جمال قریشی

حماقت درحماقت کررہے ہیں
وہ اب مرنے کی حسرت کررہے ہیں

ہمیں رہنا ہے اس بستی میں یارو
جہاں ظالم حکومت کررہے ہیں

جو کل کا خواب ، کل کی زندگی تھے
وہی بچے بغاوت کررہے ہیں

انہیں اک روز پچھتانا پڑے گا
لہو کی جو تجارت کررہے ہیں

جنہیں پالا ہے ہم نے خوں پلا کر
وہ ہی اب ہم سے نفرت کررہے ہیں

تمہارے شہر میں آنے کی حسرت
بس ایک گھر کی بدولت کررہے ہیں

● JAMAL MANZIL,TANTGARWAD
JAMALPUR, AHMEDABAD-380001 (GUJ.)



شوکت حیات
DR. MAHABIR BHAWAN,
MAHENDRU, PATNA - 800006 (BIHAR)

کوبڑ

اس نے اسٹیشن پہنچنے میں کچھ اور دیر کر دی ہوتی تو ٹرین چھوٹ جاتی۔

اچانک اس کی اماں نے حکم صادر کر دیا تھا کہ اسے اپنے چھوٹے بھائی کو دہلی جاکر سی آف کرنا ہوگا۔ وہاں سے آگے اللہ مالک ہے۔ کم سے کم وہاں تک کی خیر و خبر تو اماں کو اس کے ذریعہ مل جائے گی۔

اس طرح اچانک ہزار میل کا سفر اختیار کرنا پڑے گا؟ یہ بات اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ شادی بیاہ کے ہنگاموں کی وجہ سے وہ دو روز سے مستقل جاگا ہوا تھا۔ آج شاید کچھ سکون سے سونے کا موقع ملتا۔ حالانکہ صبح سویرے اٹھ کر بھائی کو ہوائی اڈے تک الوداع کہنے کے لئے جانا تھا اور یہی نہیں، گھر کے سارے افراد کو وہاں تک پہنچانے کا اہتمام کرنا تھا۔ طرہ یہ کہ گاڑیوں کی ہڑتال تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس طرح یہ سب بحسن خوبی انجام دے گا کہ اماں نے حکم صادر کر دیا کہ اسے ابھی شام والی گاڑی پکڑ لینی ہے تاکہ صبح گیارہ بجے تک دہلی پہنچ جائے۔ اس کا بھائی صبح کی فلائٹ سے دہلی کے لئے روانہ ہوگا اور ساڑھے دس گیارہ تک پہنچ جائے گا۔ وہاں وہ بھائی سے ہوائی اڈے پر ملے گا۔ اسے رات کے ڈھائی بجے نیویارک والی فلائٹ میں سوار کرا دے گا۔

بادل ناخواستہ دہلی جانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اتنی جلدی بھی کہیں پروگرام بنتا ہے۔ اب برتھ کی ریزرویشن ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ساری رات جاگتے گزرے گی۔ گھر کے سارے لوگ اصرار کرنے لگے کہ بھائی ہونے کے ناطے اسے دہلی سی آف کرنے کا فریضہ ادا کرنا چاہیئے تو اسے تیار ہونا ہی پڑا۔

دوسرے دن سے ہولی کی چھٹی شروع ہو رہی تھی۔ ٹرین میں بے تحاشہ بھیڑ تھی۔ اس کے تو اوسان خطا ہو رہے تھے۔ بغیر ریزرویشن کے اس بھیڑ بھاڑ میں اپنے لئے گنجائش نکالنے کا تصور اس کے لئے سوہان روح تھا۔

سلیپر میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ریزرویشن چارٹ لے کر گھومتے ہوئے ایک ٹی ٹی ای سے اس نے بات کرنی چاہی تو اس نے سنی ان سنی کر دی۔ یوں بھی اس جم غفیر میں کسی سے اپنی بات کہہ پانا آسان نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم کی جانب لپک رہی تھی۔ انبوہ میں دور سے ٹرین کے انجن کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ یہ گاڑی اس کے سینے کو روندتی ہوئی آ رہی ہے۔

۔۔۔ کیا مجھ جیسا ناتواں آدمی کمپارٹمنٹ میں داخل ہو سکے گا۔۔۔!؟

ٹرین رکتے ہی اس نے خود سے سوال کیا۔

کوئی جواب دئے بغیر امنڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان اس نے خود کو گٹھر میں تبدیل کر لیا۔ یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کر دینا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے جیسے آدمی کے لئے جینا آسان نہ تھا۔ اس کے کمزور جسم میں مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

کمپارٹمنٹ میں جیسے تیسے داخل ہونے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ہتھیلی سے خون بہنے لگا ہے۔ خون کا بہنا اس کے نزدیک کوئی اہمیت کی بات نہ تھی۔ اہم تو یہ تھا کہ گٹھر میں تبدیل ہونے کے بعد دھکے کھاتا ہوا وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے میں آخرکار کامیاب ہو گیا تھا۔ اب صرف یہ اندیشہ تھا کہ ریزرویشن نہیں ہونے کی وجہ سے اسے کنڈکٹر سلیپر سے نکال سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی کھل گئی۔ جن لوگوں کے ریزرویشن تھے انہوں نے اپنی اپنی برتھ پر اپنے بستر بچھا دئے۔ اس کی طرح کچھ اور لوگ بھی تھے جو اس ٹرین میں بے گھر بار تھے۔ ان میں سے بیش تر نے کنڈکٹر کو پچیس پچیس روپے دئے اور اپنی ٹکٹوں پر ایک ایک برتھ ریزرو کرا لی۔

کنڈاکٹر اس کی طرف بھی بڑھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ پچاس روپے ٹکٹ کے لگ چکے ہیں۔ سونے کے مزید پچیس دینے کا مطلب تھا کہ اس کے سفر کے خرچ کا پورا بجٹ گڑبڑ ہو جائے گا۔ بھائی امریکہ میں ڈھیر سارا روپیہ کماتا ہے اس سے کیا۔ اسے بہرحال اپنی آمدنی اور اپنی حیثیت دیکھنی ہے۔ آخر اس نے اپنی اوقات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہی تو بھائی کو سی آف کرنے کے لئے طیارے کے بجائے ٹرین کی سواری اختیار کی تھی۔

"ریزرویشن کے سات روپے لگتے ہیں پھر یہ پچیس کیوں؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے کنڈکٹر سے سوال کر دیا۔ کنڈکٹر کے تیوریوں پر بل آئے۔ اس نے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے سارے لوگ بے وقوف ہیں کیا۔۔۔ نہیں دے سکتے تو اگلے اسٹیشن پر اتر جانا۔۔۔ یہ تھری ٹائر ہے۔۔۔ آپ کو جنرل بوگی میں جانا ہوگا۔۔۔!"

"جب یہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے تو وہاں کیسے گھس سکوں گا!"

"پھر لائیے پچیس روپے۔۔۔ آخر اس بھیڑ بھاڑ میں آپ کے لئے سونے کی جگہ مہیا کروں گا۔۔۔ کوئی مذاق ہے کیا۔۔۔!"

"بھائی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں!"

"دہلی بغیر پیسے کے جاتے ہو۔۔۔ یہ سالی بغیر پیسے کے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیتی ہے!"

"پہلی بار جارہاں ہوں۔۔۔!"

"تو لاؤ بیس ہی دے دو۔۔۔ تمہارے لئے مروت کر رہا ہوں۔۔۔!"

ہنسوڑ قسم کا کنڈکٹر اس کی خستہ حیثیت بھانپتے ہوئے "آپ" سے "تم" پر اتر آیا۔

"بھیا! سب میری جیب میں نہیں جائے گا۔۔۔!"

اس نے کہا کہ وہ اسے دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ کنڈکٹر نے دس روپے لیتے ہوئے اسے بتایا کہ تب اسے بیٹھ کر جانا ہوگا۔ یہ بھی کم نہیں کہ اسے بیٹھنے کی جگہ مل رہی ہے۔

گاڑی مغل سرائے سے آگے بڑھ گئی تو اس نے ٹوائیلٹ کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر اس کی کوفت میں اضافہ ہوگیا کہ کئی برتھ خالی پڑے تھے۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے وہ برتھ کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھنے پر مجبور تھا۔

وہ دہلی پہلی بار جارہا تھا اور متعدد الجھنوں سے دوچار تھا۔ اسٹیشن سے اسے پالم ایئرپورٹ جانا ہوگا۔ نہ معلوم اسے نئی دہلی اسٹیشن اترنا چاہیئے یا پرانی دہلی۔ پہلے کون سا اسٹیشن آئے گا۔ جس اسٹیشن پر بھی اترے گا وہاں سے کون سی سواری کرے گا۔ ہم سفروں سے اگر پوچھتا ہے تو سب اسے نراگاؤدی سمجھیں گے کہ اتنا سن رسیدہ ہونے پر بھی اب تک وہ اپنے ملک کی راجدھانی نہیں گیا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ کتنے لوگ اس ملک میں ایسے ہیں جو دہلی تو بہت دور کی بات ہے اپنے صوبے کی راجدھانی تک نہیں جاسکتے ہیں۔

کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ریلوے لائن نہیں دیکھی۔۔۔ اور کتنے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ایک ساتھ چار روٹیاں نہیں دیکھیں۔۔۔!

وہ غمزدہ ہوگیا۔ اسے لگا کہ وہ رات کے سناٹے میں کسی مرگھٹ میں بیٹھا ہے۔۔۔ دور کہیں سے کتوں کے رونے کی آواز آرہی ہے۔۔۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ بجز اس روشنی کے جو ایک جلتی ہوئی لاش سے برآمد ہورہی ہے۔

ٹرین کے پہیوں کی چھک چھک اور سناٹوں کی ہولناک آوازوں کو سنتے سنتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ہوئی تو اس کی نیند ٹوٹی۔ ایک طیارے کو اس نے ٹرین کے اوپر اڑتے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہے کہ اس ہوائی جہاز میں اس کا چھوٹا بھائی سفر کر رہا ہے۔ ہوائی جہاز میں اڑنے والے کا وہ بڑا بھائی ہے۔۔۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ لیکن خود اسے اپنی ہنسی بہت کھوکھلی لگی۔

اس کا ذہن ماضی بعید میں بھٹکنے لگا۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ بے سروسامانی کے عالم میں اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کا کوئی فرزند اس قدر ترقی کرے گا کہ امریکہ جا پہنچے گا۔ وہ تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔ ٹھٹھر سا گیا۔ لیکن کیا کیا جاسکتا تھا۔ حالات کے لازمی نتائج کے طور پر یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ اطمینان کی بات تھی کہ کم سے کم یہ چھوٹا پودا تو اگ کر تن آور درخت بن گیا۔

ڈرتے ڈرتے ایک سردار جی سے اس نے دہلی کے بارے میں آئیڈیا لینا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ وکرم شیلا تو نئی اور پرانی دونوں دہلی جائے گی لیکن اسے پالم جانا ہے تو نئی دہلی اتر جانا چاہیئے۔ اس نے نصیحت کے طور پر گر کی بات بتائی کہ اسٹیشن کے کیمپس سے لگی ہوئی کوئی سواری نہ کرے۔ اسٹیشن سے باہر آجائے۔ بائیں جانب پیدل بڑھے اور پھر کناٹ پلیس کے پاس سے تین سو سات نمبر کی بس پکڑ لے یا تھری ویلر کرے۔

سردار جی نے یہ بھی کہا۔

"لیکن سرداروں کی ٹیکسی کے میٹر کے چکر میں نہ پڑنا۔۔۔ بھاڑا طے کرلینا۔۔۔ دس سے پندرہ روپے کے بیچ میں تیار ہوجائے تو ٹھیک ہے۔۔۔ میٹر کا حساب کروگے تو ایسا بھی ہوگا کہ وہ ادھر ادھر گھما کر تم سے پچیس تیس اینٹھ لیں گے اور تم پالم سے اتنی ہی دور ہوگے جتنا کناٹ پلیس کے پاس تھے۔۔۔!"

سردار جی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"یار دہلی میں اچکے زیادہ بستے ہیں۔۔۔ ہندوستان میں کہاں کہاں نہیں گھوما۔۔۔ لیکن اتنی لوٹ سالے تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔۔۔!"

سردار جی زندہ دل اور بے باک شخص تھا۔ دنیاداری کی باتوں کے علاوہ سردار ہوتے ہوئے اس نے سرداروں کے اتنے سارے دلچسپ لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑگئے۔

کام کی باتیں اس نے بڑی احتیاط سے گرہ میں باندھ لیں۔

ہدایت کے مطابق نئی دہلی اتر کر سڑک پر بائیں جانب بڑھتا گیا۔ اس درمیان کئی ٹیکسی والے اس کے پاس آئے لیکن وہ سب کو اس شان بے نیازی سے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا جیسے کئی پشت سے وہ کناٹ پلیس کا باشندہ رہا ہو اور چہل قدمی کرتا ہوا اپنے باپ کے مکان کو جارہا ہو۔ اس درمیان وہ ترچھی نظروں سے گزرتے ہوئے تھری ویلر کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔

وہ ایسے تھری ویلر کا متلاشی تھا جس کا ڈرائیور غیر سردار ہو اور جو دیکھنے میں کچھ شریف قسم کا آدمی نظر آرہا ہو۔ ظاہر ہے اس کے لئے وہ کسی

نحیف اور لاغر بیٹھے والے ڈرائیور کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس طرح کا ایک ڈرائیور اسے مل ہی گیا۔ دبلا پتلا بیمار سا۔ یہ آدمی خطرناک نہیں ہو سکتا ۔ اس نے اشارہ کیا۔

"کہاں چلو گے صاحب۔۔۔!"

"پالم۔۔۔ کتنے لگیں گے۔۔۔؟"

"بیٹھ جاؤ صاحب۔۔۔ میٹر گرا دیتا ہوں۔۔۔!"

"نہیں طے کر لو۔۔۔!"

"پندرہ روپے دینا۔۔۔!"

"بارہ دوں گا۔۔۔!"

"آجاؤ۔۔۔!"

تقریباً پینتالیس منٹ کے بعد وہ پالم پہنچ گیا۔ پیسے دینے کے لئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالے تو پتا چلا کہ بھیڑ بھاڑ میں اس کے روپے کسی نے گول کر دئے تھے۔ اب کیا ہو۔۔۔ ہوائی اڈے کے اندر بھائی کو ڈھونڈ کر اپنی مصیبت بتائے۔ اس سے مدد لے۔ لیکن یہ اسے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اب چلتے چلاتے وقت اس معمولی سی ضرورت کے لئے بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

یوں بھی اس بار اس نے چھوٹی بہن کی شادی میں تقریباً پچاس ہزار روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ لیکن اس ڈرائیور کا کیا ہو۔ اس نے فوراً قلم نکالا ۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو محض ڈھائی روپے کا تھا۔ اس سے کرائے کا بھگتان کیسے ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی۔ کلائی کی گھڑی۔

اس نے سوچا ڈرائیور شریف آدمی ہے۔ ڈھائی سو کی گھڑی کا چھ نہیں تو سو روپے دے ہی سکتا ہے۔ اس میں اس کی واپسی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے تھری ویلر اسٹارٹ کر دیا تھا۔ اس نے گھڑی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی ایسا ہے کہ میری جیب کٹ گئی۔۔۔ تم یہ گھڑی رکھ لو اور جتنے پیسے مناسب سمجھو مجھے دے دو۔۔۔!"

شریف اور غیر سردار ڈرائیور نے گھڑی اپنے نحیف ہاتھوں میں لے لی۔ ایک نظر اسے گھور کر دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ جا وہ جا۔

وہ دھیمی آواز میں چیختا رہ گیا۔ اس جگہ زیادہ شور اور ہنگامہ کر کے وہ اپنے آپ کو مذاق کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ڈرائیور نے اس کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ تھری ویلر کے اڑتے ہوئے دھوئیں میں اس کے زرد چہرے کی شکست قابل دید تھی۔

انٹر نیشنل ڈیپارچر کے پاس شیشے کی دیوار کے اندر اس کا بھائی ٹہل رہا تھا۔ اس نے بہت لپک کر کہا۔

"بھائی!"

اس کا بھائی اس کے قریب آگیا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ رات کی فلائٹ او کے ہے۔ ٹھیک دو بج کر چالیس منٹ پر۔ فلائٹ نمبر زیرو ون۔ جب تک ہم لوگ چلیں۔ امریکہ کے دوستوں کے لئے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ ادھر ہی ہم لوگ کھانا بھی کھائیں گے۔ میں نے سارا سامان لفٹ لگیج میں رکھ دیا ہے ۔ اب کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ہم لوگ رات بھر جاگ کر ایئرپورٹ پر گپیں کریں گے۔ آپ صبح کی کسی گاڑی سے واپس چلے جایئے گا۔۔۔ کل یوں بھی ہولی کی وجہ سے دہلی بند رہے گا۔۔۔ گھومنے پھرنے کا کوئی موقع نہیں۔۔۔!"

دونوں تمام دن کناٹ پلیس، قرول باغ، پالیکا بازار اور مینا بازار میں گھومتے رہے۔ لگ بھگ تین ہزار روپے کی خریداری کی گئی۔ کسی دوست کے لئے کولہاپوری چپل، کسی کے لئے پینٹ، کچھ ایمی ٹیشن، کچھ اماوٹ وغیرہ وغیرہ۔ ہینڈلوم کے سوتی کپڑوں کا وہاں ایک خاص کریز تھا۔ جامع مسجد کے پاس فلورا ہوٹل میں کھانا کھایا گیا۔ پھر شاپنگ۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔

اس کا چھوٹا بھائی بہت ہوشیار تھا۔ شاپنگ میں مول تول کے طریقے جانتا تھا۔ جس چیز کی قیمت دکاندار سو روپے بتاتا، اسے وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ میں خرید لیتا۔ دنیاداری کے ان طریقوں سے وہ ناواقف تھا۔ اگر وہ تنہا خریداری کر رہا ہوتا تو سو کی جگہ سو ہی دے کر آتا۔ اتنی بڑی عمر میں محض لٹتے چلے جانے کے علاوہ ہوا ہی کیا تھا۔

دہلی آتے ہی وہ دو بار چوٹ کھا چکا تھا۔ جیب کٹ گئی اور گھڑی بھی لٹ گئی۔ اگر بھائی سے اس کا وہ تذکرہ کرتا تو اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ واپسی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اس ٹھنڈک میں بھی پسینے آگئے۔ بھائی نے کہا۔

"دیکھا کتنا مقوی کھانا تھا یہاں کا۔ آپ کو پسینہ آنے لگا۔ بھیا آپ اگر پٹنہ چھوڑ دیں تو بالکل چکنے ہو جائیں۔۔۔!"

وہ بس یک ٹک بھائی کو دیکھتا رہ گیا۔ کچھ نہیں بولا۔

بھلا ہندوستان میں رہ کر بھی صحت بن سکتی ہے۔۔۔

خاموشی کی زبان میں وہ یہی کہہ سکا۔

بھائی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں تو ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ ہاہا کرتے ہوئے اس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔

"بھیا کیا برا ہے۔۔۔ اگر دہلی میں شادی کی جائے۔۔۔!"

وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ اسے تو یہاں کی لڑکیوں میں نام کو بھی حسن نظر نہیں آیا۔ یہاں کی حسین ترین لڑکی بھی اس کے یہاں کی قبول صورت لڑکی کے مقابلے میں کمتر تھی۔ لیکن بھائی کو شاید یہی سب پسند ہے۔ بڑی بڑی گول ہپ۔۔۔ موٹی موٹی گٹھیلی پنڈلیاں۔۔۔ کیلے کے تنے جیسی گدرائی ہوئی جانگھیں۔۔۔ بڑے بڑے آہنی گولوں جیسے سخت اور تنے

ہوئے۔۔۔

اسے تو ان سب کے پیچھے نکل جانے کا خوف ہوتا۔ روندے چلے جانے کا احساس جاگنے لگتا۔

اچانک بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے لئے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر رکھیئے گا۔۔۔ امریکہ میں سب کچھ کیجئے۔۔۔ خوب موج مستی لیجئے۔ لیکن شادی کے لئے ہندوستانی لڑکی ہی بہتر ہوتی ہے۔۔۔ وہ کی لڑکیاں شوہروں کا شوہر پن آسانی سے تسلیم نہیں کرتیں۔۔۔ اور اس طرح ان میں بیوی پن کبھی نہیں آپاتا۔۔۔!"

ایئرپورٹ پر بھائی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"بھیا آپ تو اب نہ معلوم شادی کریں گے یا نہیں۔۔۔ لیکن آپ کے انتظار میں اب میں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ صرف شادی ہی تو نہیں۔۔۔ اولاد بھی زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، یہ بھی تو دیکھنا ہے!"

سچ بات ہے۔۔۔!

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ خوف سے اس کی آنکھیں اندر دھنس گئیں۔

مان لو بھائی میری شہوت کی عمر اگر بچی بھی ہے تو کیا ہوا۔۔۔ اولاد کو اپنے پیروں پر کھڑا کر پانے کا زمانہ تو ختم ہو گیا۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن ہم لوگ تو بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے۔۔۔!

یہ باتیں اس نے اتنی آہستہ سے کہیں کہ اس کے بھائی نے نہیں سنیں۔

"اور ہاں سنئے۔۔۔ اماں کا پاسپورٹ بنوا دیجئے۔۔۔ انہوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔۔۔ اب انہیں آرام اور سیر و سیاحت کا موقع ملنا چاہیئے۔۔۔ اگلی بار آؤں گا تو انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔۔۔ سوچتا ہوں اگلی بار بیگم اور اماں دونوں کو۔۔۔!"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں پاسپورٹ کے لئے اپلائی کر دوں گا۔۔۔!"

"صرف اپلائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔۔۔ دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔۔۔ ہاتھ پاؤں چلانے ہوں گے۔۔۔ ادھر ادھر کرنا ہوگا۔۔۔ انڈیا میں سرکاری کام بغیر لئے دئے نہیں ہوتا۔۔۔!'

"ٹھیک ہے۔۔۔!"

اس نے کہا۔

اب اور کتنی دوڑ دھوپ کروں گا۔۔۔!

یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔

"اور بھیا اماں کا خیال رکھیئے گا۔۔۔ میں تو برابر پیسے بھیجا ہی کروں گا۔۔۔ آپ کم سے کم اتنا کریں گے کہ مقوی چیزیں خرید کر ان کے لئے لے آیا کریں گے۔۔۔!"

"ٹھیک ہے۔۔۔!"

اچھی چیزیں وہ کھانا ہی نہیں چاہتیں۔۔۔ نہ معلوم انہیں کون سا دکھ کھائے جا رہا ہے۔۔۔!

یہ بات اس نے خود سے کہی۔

گپ شپ کرتے کرتے رات کے دس بج گئے۔ بھائی نے کہا۔

"اب ٹرالی لے آتا ہوں۔۔۔ سامان نکال کر ان ساری خریدی ہوئی چیزوں کو سیٹ کر دیتا ہوں۔۔۔!"

اس کام میں تقریباً گیارہ بج گئے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر لینے کے بعد انہوں نے پھر گپ شروع کر دی۔ بے شمار باتیں۔ بچپن کی۔۔۔ باپ کے زمانے کی۔۔۔ باپ کی انتقال کے بعد کی۔۔۔ اور اس کے بعد بھائی نے امریکہ میں اپنے کچھ معاشقوں کی روداد بھی سنائی۔

"آپ نے بھیا یہاں کچھ موقع نکالا کہ نہیں؟"

چھوٹے بھائی نے تھوڑے توقف کے بعد کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھائی۔۔۔ ان کاموں کے لئے فرصت ہی نہیں ملی۔۔۔ اور پھر مجھ میں ہے بھی کیا کہ کوئی لڑکی میری طرف نظر ڈالے۔۔۔ ڈھنگ کا کپڑا ۔۔۔ قاعدے کی صورت۔۔۔ نہ انداز گفتار میں کشش۔۔۔ سب کچھ تو کھڑکھڑاتا ہوا۔۔۔ ہاہا۔۔۔!"

اس نے ہنسنے کی ناخواستہ کوشش کی۔

"آپ رہ گئے بھیا۔۔۔!'

ہاں۔۔۔ میں رہ گیا۔۔۔ کہیں چھوٹ گیا ہوں۔۔۔ جانے کہاں۔۔۔ اندھیرے میں ایک ٹرین گم ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ میں کنارے کھڑا ہوا اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ میرے چاروں طرف کتنے بھیانک آواز میں رو رہے ہیں۔۔۔ روتے ہوئے کتے رونے کا فعل چھوڑ کر میری طرف دیکھ کر بھونکنے لگے ہیں۔۔۔

وہ خاموشی کی زبان میں خود سے کہتا رہا۔

"آپ کہاں کھو گئے بھیا۔۔۔؟"

وہ چونک پڑا۔

"ہاں۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ سچ مچ عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔۔۔!"

اپنی ذہنی کیفیت پر اس نے پردہ رکھا۔

اناؤنسمنٹ ہوئی۔۔۔ بڑی خوبصورت اور خوابیدہ آوازیں۔

"امریکہ جانے والے یاتری گن اپنے سامان اور فارین ٹیکس کی پے منٹ کے لئے کاؤنٹر کی اور پرستھان کریں۔۔۔!"

ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ لگا کہ ساری دہلی، امریکہ جانے کے لئے مقابلہ آرائی کر رہی ہے۔ آن کی آن میں امریکہ پہنچ جانا چاہتی ہے۔

جیسے تیسے اس کا بھائی ٹرالی پر سامان لئے ہوئے ائر انڈیا کے کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ وہ دور ہی سے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر کے قریب ویزیٹرس کے جانے کی ممانعت تھی۔ سامان جمع کر کے اور رسیدیں لے کر بھائی واپس

آگیا۔

"اب گھر کے لئے کسٹم کے سامنے ڈیکلریشن دینا ہوگا۔۔۔ اور پھر سیکوریٹی چیکنگ۔۔۔ پھر تو بھیا آپ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔۔۔ اوپر ویورس گیلری سے شاید ایک بس نظر آئے جس میں میں بیٹھ کر رن وے تک جاؤں گا۔۔۔ میں نظر نہیں آؤں گا۔۔۔ پھر ممکن ہے کسی اڑتے ہوئے جہاز پر ائر انڈیا لکھا ہوا نظر آجائے۔۔۔ آپ سمجھ لیجئے گا کہ بھائی رخصت ہو گیا۔۔۔!"

بھائی سے جدائی کی گھڑی کی قربت کا خیال آتے ہی وہ اندر سے ٹوٹتا سا لگا۔ اسے غصہ آرہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔

کیوں چلے آتے ہو ہمیں دکھی کرنے کے لئے۔۔۔ کیا رکھا ہے وطن میں۔۔۔ کیسا وطن ہے، ہماری ساری زندگی کرائے کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں بسر ہو رہی ہے۔۔۔ جب ہم تمہارے بغیر رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں، تم آکر اپنے ہونے کے احساس کا چرکا دے دیتے ہو۔ ہمیں رونے کے لئے چھوڑ جاتے ہو۔۔۔ ہم لوگوں سے اگر نہ بھی ملو تو تمہارا کیا بگڑے گا۔ ۔۔۔ ملنے سے کون سا روحانی سکون ملتا ہے۔۔۔!

خاموشی کی زبان میں کہتے کہتے اس کے جذبات بے قابو ہونے لگے۔ آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ سمندر اچھل اچھل کر اس کے وجود کے کناروں کو ریزہ ریزہ کرنے کے درپے تھا۔

خوابیدہ آواز دوبارہ گونجی۔

"امریکہ کے یاتری گن اب سیکوریٹی چیکنگ کے لئے پرستھان کریں۔ رن وے تک لے جانے والی بس ان کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔"

اس کا بھائی بھی آبدیدہ ہو گیا۔

"بھیا تم اپنا خیال نہیں رکھتے۔۔۔ کیسی صحت ہو گئی ہے تمہاری۔۔۔ چند سال بڑے ہو۔۔۔ لیکن دیکھنے میں باپ لگتے ہو۔۔۔!"

سب چلتا ہے بھائی۔۔۔ اگلی بار جب تم آؤ گے تو میں تمہارا دادا لگوں گا ۔۔۔ اور اس سے اگلی بار شاید میں۔۔۔!

وہ خود کلامی کرتا رہا۔

"بھیا اب رخصت کی گھڑی ہے۔۔۔ آؤ۔۔۔ ہم لوگ گلے مل لیں۔ ۔۔۔ اب نہ معلوم کب ملنا نصیب ہو۔۔۔!"

اس کے بھائی نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

دونوں کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں تھے۔

اچانک چھوٹا بھائی چیخ مار کر الگ ہو گیا۔

"بھیا۔۔۔ تمہاری پیٹھ پر یہ کیسا ابھار ہے۔۔۔ مکروہ خبیث کے سر جیسا۔۔۔!"

بڑے بھائی کو کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی کی اس بات کا کیا جواب دے۔ چھوٹا بھائی پھر بولا۔

"بھیا۔۔۔ یہ کیسا آسیب سوار ہے تو پر۔۔۔ تم نے آج تک نہیں بتایا۔۔۔!"

امریکہ جانے والے ایک ہم سفر نے سیکوریٹی چیکنگ کے لئے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ زور سے پکڑا۔

"جلدی کرو۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔۔۔ گیسٹ کو گڈبائی کہو۔۔۔!"

"خدا حافظ بھائی۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔ بھائی۔۔۔!"

اس کا بھائی خوف و دہشت کا تاثر لئے ہوئے جا رہا تھا۔ لگاتار وہ اس کی پیٹھ کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

"بھیا! اس خبیث سے چھٹکارا حاصل کرو۔۔۔ جیسے بھی ہو۔۔۔!"

جاتے جاتے اس نے پکار پکار کر کہا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دھیرے دھیرے بالکل سناٹا چھا گیا۔ مسافروں کی ریل پیل ختم ہو گئی۔

۔۔۔ دیوانہ وار وہ ویورس گیلری کی طرف لپکا جو اوپری منزل پر واقع تھی۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ کچھ بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ونڈ اسکرین کا شیشہ صاف کیا۔ نیم روشن دھندلے منظر میں ایک بس رن وے کے طرف بڑھ رہی تھی۔ دودھ جیسی سفید بس۔

اس کا بھائی اسی میں ہوگا۔۔۔ اس نے اندازہ لگایا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک طیارہ اڑا۔۔۔ ہو نہ ہو اس کا بھائی اسی میں ہوگا۔

الوداع۔۔۔ الوداع۔۔۔ اے پردیسی ہم وطن۔۔۔ اب ہم جانے کب ملیں۔۔۔ ملیں بھی کہ نہیں۔۔۔ بے رحم زندگی کے راستے پر سفر کا پہاڑ ڈھونے والے۔ خدا حافظ۔۔۔!

طیارہ آسمان میں غائب ہو چکا تھا۔

اب چاروں طرف سناٹا تھا۔ قبرستان کا سا گہرا سناٹا۔

اس کا دماغ کچھ دیر کے لئے خالی ہو گیا۔ تکان کے عالم میں اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تو خیال آیا کہ اس کا بھائی الوداعی کیفیت کی شدت جسے خبیث سمجھ رہا تھا وہ اس کی پیٹھ کا کوبڑ تھا اور یہ بھی کہ دہلی سے واپسی کے لئے اس کے پاس ٹرین کا کرایہ نہیں تھا۔ ●●



سوہن راہی

لتنے سورج، چاند، تارے، جگنوؤں کے قافلے
م نے یہ سب اک سیاہی کے حوالے کر دیئے

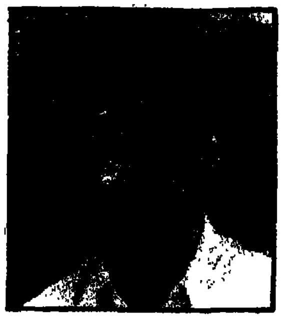
نیرے اندر بھی کوئی مجنوں پکار اٹھا ہے، یہ
بج کی مٹی، جدائی کے سمندر میں گھلے

قص میں آئی جو کل شبنم ہماری آنکھ کو
آنسوؤں سے ہم نے پھولوں کے پیالے بھر دیئے

روشنی ہی روشنی پیشِ نظر بٹتی رہی
ہم مگر شب کو ہی چادر اوڑھ کر سوتے رہے

ن رہے تھے ہم وطن کی خاک کی دھڑکن کہیں
لٹ گئے آہستہ آہستہ وطن سے رابطے

● 63 HAMILTON AV. SURBITON,
SURREY KT6 7PW (U.K.)



سیفی سرونجی

نفرت ہے اس کو مجھ سے نوازش بھی خوب ہے
ہے دوستی عروج پہ رنجش بھی خوب ہے

گرتے ہیں بار بار زمیں پر ہی ہم مگر
چھونے کی آسمان کو خواہش بھی خوب ہے

سوکھی ہوئی زمین ہے پیاسے ہیں سب درخت
طوفان بھی عجیب ہے بارش بھی خوب ہے

سب جانتے ہیں تجھکو کہ ہرجائی ہے بہت
دنیا کو دل سے پانے کی خواہش بھی خوب ہے

باتوں میں اس کی آئے تو سب کچھ لٹا دیا
چہرے پہ یہ خلوص کی پالش؎ بھی خوب ہے

میں اس کو بھول جاؤں لکھا اس نے خط یہی
یہ شرط ہے عجیب گذارش بھی خوب ہے

؎ شعوری استعمال ہے

● INTESAB (QUARTERLY)
SIRONJ (M.P.)



جمیل احسن

ہمارے شہر کا نقشہ بدلتا جاتا ہے
کہ جیسے خوف سے چہرہ بدلتا جاتا ہے

غریبِ شہر کا آنگن لہو سے سرخ ہوا
امیرِ شہر کا رتبہ بدلتا جاتا ہے

سمندروں پہ بھی آفات آنے والی ہیں
لہو کے رنگ سے دریا بدلتا جاتا ہے

بدلتے جاتے ہیں احباب راستے اپنے
محبتوں کا طریقہ بدلتا جاتا ہے

لہو بہا کے بھی انصاف مل نہیں سکتا
ہمارے عدل کا آقا بدلتا جاتا ہے

جو دیکھئے تو بظاہر ہم ایک قوم سہی
مگر یہ سوچ کا دھارا بدلتا جاتا ہے

جمیلؔ اپنے مقدر کبھی تو بدلیں گے
سنا یہ ہے کہ زمانہ بدلتا جاتا ہے

● HYGALUNDSG 42 7TR, 171 50
SOLNA, SWEDEN

حامدی کاشمیری
MASOOD MANZIL, SHALIMAR
SRINAGAR - (J.K.)

متن میں معنی کا عمل

متن میں معنی کی نوعیت اور عمل آوری پر توجہ کرنے سے قبل اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ علوم انسانیہ ہوں یا سائنسی علوم، یہ بنیادی طور پر انسان کے ان ذہنی، فکری، جذباتی اور روحانی عوامل و محرکات سے تعلق رکھتے ہیں، جو زندگی اور اس کی معنویت کا شعور پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اس لئے سماجی اور ثقافتی زندگی میں ان کی معنویت افروزی مسلّم ہے، جہاں تک ادب کا تعلق ہے، جو علوم انسانیہ کا ہی ایک مخصوص شعبہ ہے، وہ اپنی تمامتر فرضیت اور داخلیت، جو اس کا وصف ذاتی ہے، کے باوجود اپنے ضابطوں کے تحت حقیقت کی آگاہی کو ممکن بناتا ہے اور معنی یابی کی جانب سفر کرتا ہے، جوناتھن کلر نے صحیح کہا ہے کہ "معنی اور ساخت ادبی تصانیف کی خاصیتیں ہیں"۔

ادب میں معنی کی تعیین کا مسئلہ ہر زمانے میں خاص کر گذشتہ چالیس برسوں میں ادبی تنقید کا ایک اہم موضوع رہا ہے، اور اس کی مختلف تاویلیں کی جاتی رہی ہیں، یہ مسئلہ بہر حال اتنا سادہ اور یک رخا نہیں ہے، جتنا کہ تاریخی تنقید نے اور اس کے بعد ہیئتی تنقید اور پھر ساختیاتی تنقید نے اسے ظاہر کیا ہے، تاریخی تنقید جس میں مارکسی تنقید کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، مصنف کے زاویۂ نظر کے مطابق زندگی اور عصر کے حالات کی توضیحی پیش کش کو اپنا مقصد بناتی ہے، ہیئتی تنقید نے روسی فارملزم کی مانند متن سے موضوعیت (Content) کو کالعدم کرکے اس کے ہیئتی نظام کا تجزیہ کرنے سے مصنف کے اخراج کا موقف اختیار کیا اور ہیئتی و لسانی عناصر کے تجزیے کو اخذ معنی کے حربے کے طور پر استعمال کیا، ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید نے سائسیر کے نظریۂ لسان سے استفادہ کرکے ادب کو لسانی نشانات کا سسٹم قرار دیا، اس سے ادب کی تاثراتی تاویلات کے برعکس اس کی معروضی توجیہ کے لئے راستہ ہموار ہو گیا، چنانچہ بارتھ اور دریدا نے مصنف کے معنی یا وحداتی معنی کو رد کرکے متن کے کثیر المعنی ہونے پر زور دیا، قاری اساس تنقید کے موئیدین یعنی ایزر، سٹینلے فش اور رفاتیز اور دوسروں نے متن کا رشتہ مصنف کے بجائے قاری سے جوڑ دیا، یہ قاری کی قرأت ہی ہے، جو متن کے لسانی نظام کو بامعنی بناتی ہے، قاری اساس تنقید نے قرأت کے حوالے سے قاری کے ثقافتی پس منظر، لسانی اہلیت اور ادبی شعور کے متن میں در آنے، یا اس سے متاثر ہونے یا اس پر حاوی ہونے کے نتیجے میں معنی یابی کے توسیع پذیر عمل کو واضح کیا۔

یہ سارے تنقیدی نظریے من حیث المجموع طریق کار کے اختلاف کو روا رکھنے کے باوجود متن سے بلاواسطہ استخراج معنی کی وکالت کرنے پر مصر رہے، یہ ضرور ہے کہ ساختیاتی تنقید، ہیئتی تنقید (جو متن کے الفاظ کے لغوی معانی یا ان کے ابہام سے پیدا ہونے والے معانی سے سروکار رکھتی ہے) کے علی الرغم زبان کے موافق اور مخالف عناصر کے تعمل سے معنی آفرینی پر زور دیتی رہی، یہاں تک کہ بعض نقادوں مثلاً سٹینلے فش یا کلر نے لسانی نظام کو ہی براہ راست معنی بکنار قرار دینے کے بجائے اس کے روایتی آداب کے تحت موثر اور بالواسطہ کارکردگی کی اہمیت کو تسلیم اور اسے معنی کا وسیلہ قرار دیا۔ سٹینلے فش کا کہنا ہے کہ "یہ پوچھنے کے بجائے" کہ "یہ جملہ کیا معنی رکھتا ہے؟" "یہ پوچھنا چاہیئے" کہ "یہ جملہ کیا کرتا ہے؟" اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ متن میں لسانی عمل کو معنی پر فوقیت دیتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے معنی خیزی ہی کو پیش نظر رکھ کر قاری کے Responses کے تجزیاتی عمل کو پیش کرتا ہے:

" ANALYSIS OF THE DEVELOPING RESPONSES OF THE READER IN RELATION TO THE WORDS A THEY SUCCEED ONE ANOTHER IN TIME " (AFFECTIVE STYLISTICSP.126)

کلر نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے، اس نے ساختیاتی تجزیے کو راست معنی خیزی کا باعث قرار نہیں دیا، اس نے معنی کی نشاندہی سے قبل لسانی عمل سے پیدا ہونے والے اثرات (Effects) پر زور دیا، چنانچہ اپنی تصنیف Structural Poetics میں اس نے " Effect " کا بار بار ذکر کیا ہے، کتاب کے صفحہ نمبر 117 کے ایک ہی پیراگراف میں اس نے لفظ " Effect " کا سات بار ذکر کیا ہے، وہ Effect کے Effect کی وضاحت کرنے کے بجائے تنقید کے لئے معنی کے حوالے سے ہی ہیئتی عناصر کے تجزیے پر زور دیتا رہا، وہ لکھتا ہے کہ:

" CRITICISM IN THIS COUNTRY MAY BE SEEN AS AN ATTEMPT TO INCREASE THE FORMAL FEATURES THAT CAN BE MADE RELEVANT AND TO FIND WASY OF ANALYSING THEIR EFFECTS IN TERMS OF MEANING" STRUCTURAL POETICS P.179

ظاہر ہے کہ کلر متن میں ہیئتی عناصر کے توسط سے پیدا ہونے والے Effect پر زور دینے کے باوجود Effect کو معنی سے الگ نہیں کرتا، بلکہ ان کو معنی سے ہمرشتہ کرتا ہے، اور بات بالآخر معنی خیزی تک ہی پہنچتی ہے۔

بہر کیف، میرے خیال میں پس ساختیاتی تنقید ہو یا مظہریت ہو یا ریڈر رسپانس کریٹی سزم، ان سے معنی کے نظریے کے حوالے سے اختلاف کا ایک نمایاں پہلو

موجود ہے، جس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی، یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ متذکرہ نظریات سے اختلاف کے جس پہلو کی وضاحت کرنا مقصود ہے، اسے ان کے معنی کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے نظریے کا قطعی استرداد قرار دینا درست نہیں، میرا اختلاف ان کے نظریۂ معنی سے نہیں، بلکہ متن کو اپنی اصلی خاصیت سے بیگانہ کر کے اسے معنی کا بدل قرار دینے کے طریقِ کار سے ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مروّجہ نظریات کے طریق ہائے کار کی تان بالآخر معنی کی نشاندہی پر ہی ٹوٹتی ہے، چنانچہ فن پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسکے لسانی عمل سے فوری طور پر جزوی یا کلیتاً معنی کی تعیین پر زور دیا جاتا ہے، الفاظ کے رشتوں کی بات ہو یا ان کی علامتی اور استعاراتی برتاؤ کی، ان کی انسلاکیت کا ذکر ہو یا قول محال، طنز، تناؤ یا قاف کی موجودگی کا، اس سے بہر صورت معنی خیزی کا کام لیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ساختیاتی تنقید نے مصنف کے معنی یا وحدانی معنی یا عائد کردہ معنی کو رد کیا، اور تکثیر معنی کے لئے راستہ ہموار کیا۔ یہ متن کے معنی کے حوالے سے ایک اہم پیش رفت ضرور ہے، تاہم بغور دیکھا جائے تو یہ بھی گھوم پھر کے اور مختلف طریقے آزما کے متن کو معنی کے مترادف قرار دینے کے عمل سے مختلف نہیں ہے۔

مغربی تنقید میں فن پارے میں ایک سے زائد معنی کی نشاندہی کا عمل نیا نہیں ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی تشریح و تعبیر اس کی مثال ہے، موجودہ صدی میں ایمپسن نے اس ضمن میں خاصا اہم کام کیا ہے، اردو میں "ذو معنی" اور "پہلوداری" کی اصطلاحیں یا کلام غالب کی تشریحات اس کا واضح ثبوت ہیں، میر نے شعر کو "زلف سا پیچ دار" کہہ کر اس کی پہلوداری کی جانب اشارہ کیا ہے، غالب نے خود شعر کو "معنی آفرینی" کے مماثل قرار دیا ہے، "معنی آفرینی" کی اصطلاح کسی ارادی معنی یا وحدانی معنی یا متعینہ معنی کے بجائے تکثیر معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور قاری کی موجودیت کو لازمی ٹھہراتی ہے، کیونکہ معنی کی آفرینش کے لئے کسی فاعل یا قاری کی موجودگی لازمے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم پس ساختیاتی تنقید کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ اس نے اپنے نظریات کو تاثریت اور داخلیت کے بجائے معروضیت اور استدلالیت پر استوار کرنے کی کوشش کی، تنقیدی عمل کی یہ تبدیلی اپنی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ یہ ادب کے ادراک و تفہیم کے لئے ایک معروضی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

اگر متن کا تجزیہ اس غرض سے نہ کیا جائے کہ اس کے معنی کو نشان زد نہ کیا جائے، تو اس کی غایت (End) کیا ہوگی؟ اس سوال پر توجہ کرنے سے ہمارا دھیان فوری طور پر فن کی نوعیت اور کارگزاری کی جانب مڑ جاتا ہے۔

فن ایک مخصوص اور منفرد ذہنی عمل ہے۔ اس میں دیگر شعبہ ہائے علم کے خلاف فنکار کی شخصیت اپنی کلیت اور جامعیت کے ساتھ عمل آرا ہوتی ہے، دیگر شعبۂ ہائے علم جن میں سائنس کے علاوہ بشریات، فلسفہ، مذہب، تاریخ اور ثقافت شامل ہیں، اپنے مطالعاتی طریقِ کار اور نتائج فکر کے لئے معروضیت اور عقلیت پر انحصار رکھتے ہیں، جبکہ فن اصلاً داخلیت اور وجدان سے منسوب ہے، دیگر علوم کے مقابلے میں فن کی ماہیت تمام و کمال تخلیقی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیب، الہام یا باطن کے تصورات سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اپنی توجہ کیلئے عقلی ادراک کو مہیا نہیں کرتا کیونکہ یہ ایک غیر معمولی فرد کے حوالے سے لاشعوری طور پر اس تخلیقی سرجوش سے ہمرشتہ ہو جاتا ہے، جو کائناتی مظاہر و موجودات، یہاں تک کہ زمان و مکاں کے بطن میں بھی، ازلی انرجی کے تخلیق کردہ نظام کے طور پر کارفرما ہے، اور نت نئی شکلی صورتوں میں نمود کرتا ہے، یہی کائناتی انرجی اپنے اصول و قواعد کے سسٹم کے تحت فن کی تخلیق کا محرک بنتی ہے، اور اپنا جواز حاصل کرتی ہے۔

فنکار لسانی توسط سے اپنے دائرہ کار میں بنیادی طور پر "نمودِ مور" کا اہتمام کرتا ہے، اس سے اس کی اس ازلی تخلیقی اُپج کی تشفی اور تکمیل ہوتی ہے جو اسے فطرت سے ودیعت ہوتی ہے اور جو اسے نابود کو بود کرنے کی تحریک دیتی ہے، اسی طرح سے وہ کائناتی نظام میں اپنی تخلیقی انرجی کو کام میں لاتے دیکھ کر اپنے ہونے کے اثبات کرتا ہے، اور یوں اپنی ناگزیر نفسیاتی ضرورت کی تکمیل بھی کرتا ہے، چونکہ اس کا عمل محض ذاتی یا موضوعی ہو کر نہیں رہ جاتا، کیونکہ وہ فطرت یا کائنات کے دائرۂ کار میں آ جاتا ہے، اس لئے اس کا عمل اجتماعی منظوری کا حقدار ہو جاتا ہے، اس کا تخلیقی شعور اس کی شعوری اور لاشعوری قوتوں کو متحرک و مرتب کر کے اس کے ذہن کو ذہن رسا یا ارفع ذہن میں بدل دیتا ہے، جو کائنات گیر ہو جاتا ہے، اور "دل وجود" کی گہرائی میں اترتا ہے۔ اپنی تخلیقی Urge کی تکمیل کرتے ہوئے وہ اپنے حواس کو بیدار رکھتا ہے خاص کر وہ اپنی "چشم بصیرت" کو وا رکھتا ہے، اور زندگی کے ثقافتی مظاہر سماجی روابط، انسان اور فطرت کے باہمی ربط و کشاکش اور حیات و لمحات کی آگہی پر قادر ہو جاتا ہے، اور یوں اس کی یہ آگہی اور تخلیقی جذبہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں، یہ آگہی اس کے تخلیقی عمل کو مہمیز کرتی ہے، اور تخلیقی عمل آگہی کو نام و نمود عطا کرتا ہے، نتیجتاً اس کا تخلیقی عمل ذاتی ہو کر بھی غیر ذاتی ہو جاتا ہے اور وہ پوری انسانیت کے مقدر سے متعارض ہو جاتا ہے، اور تخلیق سے قارئین کے ربط و بستگی کا جواز فراہم کرتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پڑھا لکھا شخص ادب سے رابطہ قائم کر سکتا ہے، ادب سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک "خاص قاری" کا ہونا ضروری ہے، خاص قاری کے لئے ذوق، نظر اور علم سے متصف ہونا لازم ہے، وہ فن کی انفرادی نوعیت اور انفرادی عمل کی واقفیت رکھتا ہے، کلر نے قاری کے لئے شعر کے لوازم، آداب، روایت اور ہیئتی عناصر سے واقف ہونے کی شرط پیش کی اور زور دے کر وضاحت کی ہے، ایسا قاری یا نقاد بالخصوص یہ جان کر فن کی جانب رجوع کرتا ہے کہ یہ ایک الگ شعبۂ حیات ہے، اس کے محرکات الگ ہیں، اس کے لسانی اور ہیئتی ضوابط الگ ہیں، اور اس سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کا طریقہ الگ ہے اور پھر وہ خود فن کی انفرادی حیثیت کا ادراک کرتا ہے۔

فن کی تخصیصیت کا اثبات کرنے سے خود بخود علم انسانیہ سے اس کے مختلف ہونے کی توثیق ہوتی ہے، فن اساسی طور پر ایک جمالیاتی مظہر ہے، اور ہر جمالیاتی مظہر کی طرح یہ مسرت زائی پر منتج ہوتا ہے، فن کی جمالیاتی اصل کے بارے میں ارسطو سے لے کر دور حاضر کے جمالیین کے ساتھ ساتھ فن کو سماجیات کا بدل قرار دینے والے نقاد بھی اس کی جمالیاتی تاثیر کے داعی رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فن اپنا جمالیاتی کردار کس طرح حاصل کرتا ہے؟ شاعر لفظوں کی تخلیقی ترتیب سے اور اصناف کی لوح بندی کے آداب کو ملحوظ رکھ کر اپنے بے نام تجربات کی صورت گری کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے، کیونکہ اس صورت میں فن میں اس کی ذات کی مداخلت واقع ہو سکتی ہے۔ جو قارئین کے لئے قابل قبول نہیں اور نہ ہی یہ خود نوشتانہ اور ترسیلی انداز شعر کے لسانی نظام سے مطابقت رکھتا ہے، شعری لسانیات اپنے ضابطہ بند اور مخصوص عمل کی پابند ہے۔ یہ تجربے کو اپنے طور پر مجسم کرتی ہے، اور اسے لا شخصی بناتی ہے، ساختیات نے لا شخصیت کی وکالت کی، ساختیات سے قبل ایلیٹ نے لا شخصیت کے عنصر پر زور دیا تھا۔ ساختیاتی نقادوں نے اسے معروضی اور سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی سعی کی، ان کے نزدیک جس زبان کو شاعر برتتا ہے، وہ خارجی حقیقت کے لئے آئینے کا کام نہیں کرتی، یعنی وہ خارجی حقیقت کو ہو بہو پیش نہیں کرتی، بلکہ اس کے تصور کی بار آفرینی کرتی ہے، گویا زبان ترسلیت، جو نثر کا وسیلہ ہے، سے انحراف کر کے داخلی رشتوں کے نظام کے تحت عمل کرتی ہے، اس کے نتیجے میں مصنف کے INTENTION کی نفی ہوتی ہے، اور زبان اپنے تفاعل کے مطابق رشتوں کے نظام کے تحت تجربے کی انگیخت کر کے معنی کو ممکن بناتی ہے۔

ہمارا سوال یعنی فن اپنا جمالیاتی کردار کس طرح حاصل کرتا ہے؟ اب بھی تشنہ جواب ہے۔

فن دراصل لسانیاتی عمل سے ایک کمپلکس اور تہہ دار شعری تجربے کو خلق کرتا ہے، جو مادی وجود میں ڈھل کر قابل شناخت ہو جاتا ہے، تجربے کے مختلف اور متضاد عناصر ایک ترکیب پذیر وحدت میں ضم ہونے کے طبعئی میلان کو ظاہر کرتے ہیں، یہ تجربہ خارجی حقیقت کی حوالگیوں سے انقطاع کر کے اپنے فرضی وجود کی نمود پر اصرار کرتا ہے، اس کی فرضیت اجنبیت کا احساس تو دلاتی ہے، لیکن یہ اجنبیت مانوسیت اور جذب و کشش سے متصف ہوتی ہے مزید یہ اپنی شبیعت کی بنا پر حواس کو مرتعش کرتی ہے، خاص کر یہ چشم شوق کو نظارگی کی دعوت دیتی ہے، اور اپنی شناخت کروانے اور منکشف ہونے کے میلان کا مظاہرہ کرنے کے باوجود انجانی اور گریزاں رہتی ہے، اور جذبۂ تجسس اور جذبۂ تلاش کو انگیز کرتی ہے یہ اپنی اصل جو دراصل کا ئناتی عمل ہے، کے حوالے سے بھی نہفتگی اور گمشدگی کے ساتھ ساتھ نمود اور بار آفرینی کے متضاد عمل کو پیش کرتی ہے، اور قاری کو بھی اس پیچیدہ عمل سے گزرنے کی تحریک دیتی ہے، اور قاری کے لئے الگ الگ چیلنج بن جاتی ہے۔

فن کا جمالیاتی عمل دراصل اس بنیادی سوال کو سامنے لاتا ہے کہ شعر میں لفظ کے عمل کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا فہم عامہ کے مطابق یہ جواب ہو سکتا ہے کہ زبان کے نحوی یا استعاراتی عمل کی پابندی کرتے ہوئے شعر کے لسانی عناصر معنی کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں، لیکن یہ جواب اصلیت سے بعید ہے کیونکہ شاعر اپنے لسانی عمل کو اس لئے روا نہیں رکھتا کہ وہ کسی معنی یا موضوع یا عقیدے یا Content کو قاری تک پہنچادے، اگر ایسا ہوتا تو زبان کو توڑنے مروڑنے، مختصر کرنے یا استعاراتی اور Oblique پیرایۂ بیاں کو برتنے کی کیا ضرورت تھی؟ مزید برآں، شعر میں کفایتِ لفظ، اختصار، ردیف و قافیہ، بحر اور آہنگ کے ساتھ ساتھ کردار، واقعہ، مکالمہ، توقف اور منظر کا تانا بانا بننے کی کیا مجبوری تھی؟ اسی طرح فکشن میں کردار، واقعات، منظر، کہانی، پلاٹ اور مکالمے سے کام لینے کا کیا جواز ہے؟

ظاہر ہے شاعران لسانی اور ہیئتی عناصر کی ترکیب سے اپنے خیالات، نظریات یا محسوسات کو قاری تک پہنچانے کا ارادی اہتمام نہیں کرتا اس کے برعکس وہ کرتا یہ ہے کہ وہ ایک ایسی صورتحال کو پنپنے دیتا ہے جو لفظوں کی زائدہ ہوتی ہے، اور تمام تر فرضی ہوتی ہے، یہ خارجی حقیقت سے کسی راست حوالگی کو رد کرتی ہے، اس فرضی صورتحال کو متشکل اور متحرک کرنے اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع دینے میں فرضی کردار، واقعات، مکالمے، خاموشیاں اور فضا آفرینی مدد دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ ایک فرضی دنیا کی نمود کو ممکن بناتی ہے، یہ دنیا بقول Blanchot "ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور خارجی دنیا کو نظر انداز کرتی ہے، یہ ایک ایسی جگہ لے جاتی ہے، جہاں دنیا نہیں ہوتی اور یہ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے، خود کو ہم پر بالکل منکشف نہیں کرتی، پھر بھی ایک ایسی موجودگی کی صورت میں اپنے ہونے کا اثبات کرتی ہے جو دنیوی حال (Temporal Present) اور مکانی موجودگی (Spatial Presence) سے لاتعلق ہوتی ہے"۔

اس دنیا کے زمین و آسماں، شمس و قمر، شب و روز، مظاہر و موجودات اور انسانی اعمال تقلیب پذیر ہوتے ہیں، یا بقول شلاوسکی "اجنبیانے" کے عمل سے گذرتے ہیں، اور مختلف صورتیں اختیار کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، اس فرضی دنیا میں کرداروں کے عمل، رد عمل اور مقدرات اپنے مضمرات کی بنا پر اجنبیت کے باوجود مانوسیت کا احساس دلاتے ہیں، اور جذب و کشش کا ساماں کر کے جمالیاتی حس کو متحرک کرتے ہیں، یہ جمالیاتی حس قاری کے کلی وجود سے الگ متصور نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ اس سے منسلک و مربوط ہے، ظاہر ہے یہ اس کی فکری حس کو بھی متحرک کرتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ جمالیاتی حس ہی "Beauty is Truth" کے مصداق حس کو بھی انگیخت کرتی ہے اور آگہی کی طرف لے جاتی ہے، یہاں تک کہ تخلیق کے حوالے سے زندگی، معاشرے کائنات اور حیات و موت کے مسائل کے ادراک کی جانب راغب ہوتا ہے۔

شعر میں نمود کرنے والی اس فرضی صورتحال کو شعری تجربے سے موسوم کیا جا سکتا ہے، روزمرہ زندگی میں ہم مختلف تجربات سے گذرتے ہیں کوئی واقعہ یا چیز جس سے ہمارا سامنا ہوتا ہے اور جو ہمیں متاثر کرے، ہمارے لئے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے، کسی کے متبسم ہونٹوں کو یا کھلے ہوئے گلاب کو یا راستے میں حادثے کو دیکھنا تجربہ ہے، اسی طرح شعری دنیا میں فرضی طور پر کولرج کے معمر جہازی سے متصادم ہونا، یا ورڈز ورتھ کی لوسی کو دیکھنا یا غالب کے شعر میں سراب میں سفینوں کو رواں دیکھنا یا اقبال کے لالہ صحرائی کو دیکھنا تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

پس شعر میں جو تجربہ لفظوں میں مستور یا خوابیدہ ہوتا ہے، قاری اسے منکشف یا بیدار کرتا ہے، اور ذاتی سطح پر سے گذرتا ہے اور یوں وہ تجربے کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ فوری طور پر معنی ہے اور نہ بقول کلر "Effect" ہے، یہ خالصتاً تجربہ ہے، اور معنی یا Effect سے ماورا ہے، معنی یا Effect ایک اجزائی یا انتزاعی چیز ہے، جو

شعری تجربے سے فقط ایک زیرز میں نسبت رکھتا ہے، اور اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بھی شعری تجربے کی سالمیت اور جامعیت برقرار رہتی ہے، شعری تجربہ اپنے لسانی نظام کی پابندی کرتے ہوئے وجودی طور پر اپنے خود گرد وجود کو پالیتا ہے اور معنی یا Effect جو تشریحی عمل ہے پر انحصار نہیں رکھتا۔

شعری تجربہ فی الاصل متن میں خلق ہونے والا وقوعہ ہے، جو معنی نہیں ہے۔ گو معنوی امکانات سے عاری بھی نہیں ہے، تجربے کی خاصیت کو ملحوظ رکھ کر اسے معنی کے مرادف قرار دینا درست نہیں، اگر اسے معنی کے مرادف قرار دیا جائے، تو تجربہ اپنی اصل اور خاصیت سے محروم ہو کر محض معنی یا زیادہ سے زیادہ نہفتہ معنی ہو کر رہ جائے گا اور اس کا تخلیقی استناد فنا ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ قاری مکمل انجذابی Response کے تحت متن کے نادیدہ شعری تجربے میں شریک ہو جاتا ہے، اس کا جذبہ تجسس اور جذبہ تلاش متحرک ہو جاتا ہے اور وہ تعجب انگیز رد عمل کے تحت متن کی کہانی کے پیچ و خم سے گزرتے ہوئے اس کے خاتمے کی طرف سفر کرتا ہے، جو ایک نئے سفر کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے۔

بہ! قاری کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ متن کا سامنا کرتے ہوئے لسانی عمل کے تحت ابھرنے والی صورت حال کی دید و دریافت کو اپنا مطمع نظر بنائے اور ایک پُر اشتیاق ناظم کا روپ دھارلے، Merlean Ponty نے لکھا ہے کہ "ناول کا یہ تفاعل نہیں کہ وہ روایتی فلسفے کی طرح ایک خیال کو موضوع بنائے، بلکہ اسے ہمارے روبرو ایک شے کی طرح حیات آشنا کرے"۔

جوں جوں قاری لفظ کی عمل آوری سے نظر میں آنے والی "شے" کا مشاہدہ کرے گا وہ ہل من مزید کے طور پر اس کی انجانی جہتوں کو کھوجنے کی فطری کشش محسوس کرے گا اور یوں وہ کہانی کے پیچ و خم میں الجھتا چلا جائے گا، گویا یہ متن کے یکے بعد دیگرے نمود کرنے والے واقعات ہوں گے جو اس کے حسیاتی وجود کو متاثر کریں گے اور خارجی دنیا اس کے لئے کالعدم ہو جائے گی۔ ظاہر ہے متن شناسی کے لئے خارجی زندگی سے رابطہ قائم کرنا یا متن کو زندگی کے معانی کا راست حامل قرار دینا اس کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ تاہم شعری تجربے کی معنویت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ اپنی جمالیاتی اصل کی بنا پر تمام تر حسیاتی نوعیت رکھتا ہے اور قاری کی حسیاتی زندگی کو متاثر کرتا ہے، قاری کی حسیات میں خصوصاً بصری حس کی تشفی شعری تجربے کا وظیفہ جاریہ ہے، شعر میں ابھرنے والا وقوعہ قاری کی نگاہوں میں آجاتا ہے، بالکل ایسی ہی صورت پریوں کی کہانیوں، داستانوں، اساطیر اور فکشن میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ قاری چشم کو وا رکھتا ہے۔ وہ انکشاف پذیر متنی وقوعے کا بچشم خود نظارہ کرتا ہے۔ اس کی نظارگی اس کی نظر، ذوق، جمالیاتی حس، ثقافتی شعور، اور ماورائی آگہی سے منسوب ہوتی ہے۔ لازماً وہ اپنی بصیرت کے مطابق شعری تجربے کے خدوخال اور اس کی امکان پذیریوں کو پہچان لیتا ہے۔ جیسا کہ قاری اساس تنقید نے بھی واضح کیا ہے۔ سٹینلے فش کا یہ کہنا کہ متن میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ "الفاظ کیا کرتے ہیں نہ کہ الفاظ کن معنی کو پیدا کرتے ہیں" ایک صحیح سمت کی جانب اشارہ کرنے والی بات تو ہے کیونکہ اس سے متن میں لفظ کی کارکردگی کی جانب دھیان جاتا ہے، لیکن یہ کہنے کے بعد اس بات کو فوکس کرنے کے بجائے کہ لفظ کی اصل کارکردگی کیا ہے، یعنی لفظ اپنے سیاق میں کیا کرتا ہے۔ تاکہ اس کے انفرادی اور انسلاکاتی عمل کا تعین ہو سکے، وہ فوراً اپنے پہلے سے سوچے سمجھے گئے خیال یعنی لفظ کی معنی خیزی کی جانب رجوع کرتا ہے، اور یوں لفظ کے متنی تفاعل سے دور ہو جاتا ہے، الفاظ فوری طور پر Effect کو بھی پیدا نہیں کرتے، جیسا کہ جونا تھن کلر کا دعویٰ ہے اصل میں الفاظ اپنی ساختگی اور انسلاکیت کے نظام کے تحت ایک بے نام تجریدی کیفیت سے ایک Tangilce اور مشاہدہ کی جانے والی "چیز" کو جنم دیتے ہیں۔ جسکا حسیاتی ادراک ممکن ہو جاتا، یونگ اسے "صاف طور پر جانی پہچانی نہ ہونے" کے باوجود "Profoundly Alive" قرار دیتا ہے۔

شعری تجربے سے گذرتے ہوئے قاری کے ذہن میں عمل اور رد عمل کا ایک طویل سلسلہ حرکت میں آتا ہے۔ فن اس لئے وجود میں نہیں آتا کہ لوگوں کو حقیقت کی حقیقت سے براہ راست اور قطعیت کے ساتھ آشنا کیا جائے یہ کام دوسرے علوم مثلاً فلسفہ اخلاقیات، سماجیات اور ثقافت کے لئے مخصوص ہے۔ فن کی ایک الگ نوعیت اور طریق کار ہے، یہ فرضیت کو خلق کرتا ہے اور فرضیت کی عدم قطعیت میں دلچسپی لینے کے عمل سے اپنا جواز حاصل کرتا ہے، معنی رہا وہ شعری تجربے سے الگ کوئی معنی نہیں رکھتا، جب اصل زندگی کا ہر وقوعہ تجربہ ہے اور ہر تجربہ معنی کا امکان رکھتا ہے، تو متن کے فرضی وقوعے کو تجربہ قرار دینا، اور اسی نسبت سے معنی آفرینی کا عمل قابل فہم ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ شعری تجربے سے گذرنے والا قاری نفسیاتی اور ذہنی طور پر اس میں پیوست معنی کا غیر شعوری طور پر ادراک کرتا ہے۔ پریوں کی کہانی ہو۔ متھ، داستان یا افسانہ ہو، سب کی فرضیت میں کھو جانے کے بعد لاشوری طور پر (شعوری طور پر بھی) اس کے معنی کا احساس کرنا پس اندیشی کا حصہ ہو سکتا ہے، جو متخالف کرداروں کے تصادم میں خیر اور شر کی قوتوں کی رزم آرائی کے شعور کو پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح شعر اپنی فرضیت کے باوجود زندگی کی حقیقت کا ادراک جسے معنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کا راستہ ہموار کر سکتی ہے۔ متن میں تجربے اور معنی کی عمل آوری کو واضح کرنے کیلئے ذیل میں ولیم بلیک کی نظم Ah Sunflower کے دو تجزیے پیش کئے جاتے ہیں، پہلا تجزیہ کلر اور ہیر الڈبلوم کا ہے، جو استخراجی معنی کے حاوی ارادی عمل کا مظہر ہے، اور شعری تجربے کی کلیت کی شناخت سے لا تعلق ہے، اور دوسرا تجزیہ، جو میں نے کیا ہے۔ شعری تجربے کی کلیت کی بازیافت و دید سے سروکار رکھتا ہے اور معنی کو ذیلی چیز قرار دے کر اس کی اپنی حیثیت کو متعین کرتا ہے، نظم یہ ہے:

AH SUN FLOWER

Ah, Sun flower, ! weary of time,
who countest the steps of the sun,
seeking after that sweet golden clime,

where the traveller's journey is done.
where the youth pined away with desire,
and the pale virgin shrouded in snow,
arise from their graaues, and aspire,
where my. Sun - flower wishes to go !

تجزیہ نمبر ۱ ہیر الڈ بلوم نے لکھا ہے کہ

"BLAKE'S DIALECTICAL THRUST AT ASCETICISM IS MORE THAN ADROIT. YOU DO NOT SURMOUNT NATURE BY DENYING ITS PRIME CLAIM OF SEXTUALITY. INSTEAD YOU FALL UTTERLY INTO THE DULL SOUND OF ITS CYCLIC ASPIRATIONS" THE VISIONARY COMPANY P.42

ہیر الڈ بلوم نے نظم کے شعری تجربے کی تحسین کرنے کے بجائے بلیک کی شخصی زندگی کے ایک پہلو یعنی اس کی تپسیا (asceticism) کی نشان دہی کی ہے اور یوں نظم کے معنی کو نشان زد کیا ہے، اور اسے شاعر کے شخصی عقیدے سے منسوب کیا ہے، مزید وہ فطرت کی جنسیت کو رد کرنے کے رویے کو فطرت کے دائروی خواہشات میں گرفتار ہونے کے عقیدے کے مترادف قرار دیتا ہے اور یوں نظم کو Contect میں تبدیل کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نظم سے معنی نچوڑنے کا غیر تنقیدی عمل ہے، جو نظم کے اصلی تجربے کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔

کلر نے ہیر الڈ بلوم کی نظم کے معنی کے اس ادراک سے اتفاق کرتے ہوئے Rule of Significance کے Convention کا سہارا لیتے ہوئے اس کی موضوعیت ہی کی نشاندہی کی ہے، لکھتا ہے:

" READ THE POEM AS EXPRESSING A SIGNIFICANT ATTITUDE TO SOME PROBLEM CONCERNING MAN AND/OR HIS RELATION TO THE UNIVERSE."

اس کے بعد سورج مکھی کے Counting اور Seeking کو اس کے سورج کی جانب رجوع کرنے اور اسے " An Instance of the human assperatons " قرار دیا ہے، اس کے بعد غروب آفتاب کو دنیوی وقت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ Tilernity of Death سے تعبیر کیا ہے، نظم میں Convention of thematic Unity کا ذکر کرتے ہوئے وہ نظم کے حوالے سے نوجواں اور دوشیزہ کو Aspiration کی مثال، اور بلوم کی تائید کرتے ہوئے نظم کے سیاق میں Repression of Sexuality کی علامت قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کلر کا تجزیاتی طریق کار جو شاعری کے Conventions کے حوالے سے معنی کے تعین پر زور دیتا ہے، بلوم کے طریق کار سے مختلف نہیں ہے دونوں نقاد نظم کے استعاروں اور کنایوں سے اور زبان کے الگ الگ عناصر سے یا ان کو نظم کی کلیت سے مربوط کر کے اس کے معنی / معانی کو نشان زد کرنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں، ایسا کرتے ہوئے ان کے تجزیے جزوی، لادے ہوئے اور مقصدی ہو کر رہ جاتے ہیں، یوں وہ نظم سے جزوی یا کلی طور پر معنی کی کسی کڑی کی نشاندہی پر اپنے تجزیاتی عمل کو شروع کرنے سے قبل ہی تمام کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نظم ناگزیر الفاظ کا مجموعہ ہے، اور ہر لفظ اپنے تلازمات کی بنا پر اپنا ناگزیر حصہ ادا کرتا ہے، کلر نے الفاظ کی اس مخصوص کارکردگی سے بے اعتنائی برتی ہے، چنانچہ اس نے نظم میں "آہ!" "سورج مکھی"، اسکی تجسیم، مسافر اور اس کے سفر، برف کے کفن نوجواں اور دوشیزہ کی تجسیم، اور ان کے "قبروں سے اٹھنے" اور آخری مصرعے میں سورج مکھی ساتھ "میرا" کی ترکیبوں، استعاروں اور ہیئتی عناصر پر توجہ کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی اور نظم کے تجزیے کی تشکیل میں ان کے کردار کی تعین کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہے، اور صرف معنی یابی سے واسطہ رکھا ہے۔

نظم کا کردار ایک فرضی ماحول میں سورج مکھی کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے وقوعات کا مشاہدہ کرتا ہے، اس کا لہجہ متاسفانہ اور Inti Mate ہے، لیکن جذبات آلودہ نہیں، وہ سورج کو My Sun-flower کہہ کر اس سے انسیت اور قرب کے باوجود اسے ایک معروضی متلازمہ میں بدل دیتا ہے، اور خود راوی کے رول پر اکتفا کرتا ہے وہ زیرک، صاحب نظر اور فطرت کا اداشناس ہے، فطرت سے اس کی قربت اتنی Intimate ہے کہ وہ فطرت کا ناگزیر حصہ بن جاتا ہے۔ پہلے بند میں متکلم، سورج مکھی اور سورج کے کردار سامنے آتے ہیں، متکلم سورج مکھی کے بارے میں تاسف آمیز لہجے میں اطلاع دیتا ہے کہ وہ وقت کے گذران سے عاجز آگیا ہے۔ Weary of time کے الفاظ سے اس کے وقت سے تنگ آنے یا تکان کو محسوس کرنے کا پتہ دیتے ہیں، یہ اس کی آرزو، انتظار اور کرب کا بھی اشاریہ ہیں، پھول وقت کے گذرنے یا نہ گذرنے سے تھک چکا ہے، دوسرے مصرعے میں متکلم خبر دیتا ہے کہ پھول سورج کے قدموں کو گن رہا ہے، یہ سورج کی آہستہ روی اور پھول اس کے لئے انتظار اور اشتیاق کا مظہر ہے، اس مصرعے میں سورج کی تجسیم کی گئی ہے اور اس کے محو سفر ہونے کی مصوری کی گئی ہے، تیسرے مصرعے میں سورج مکھی اس "دلاویز سنہری سرزمین" کی آرزو کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جہاں مسافر کا سفر اختتام پذیر ہوتا ہے، مسافر کون ہے؟ نظم کے نمود پذیر تجربے سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ یا تو یہ کوئی مسافر ہے، جس کی الگ entity ہے اور نظم کی ایک اور کڑی کا مظہر ہے، یا خود سورج ہے۔ جو مسافر ہے، گویا یہ سورج کی تمثیلی تجسیم ہے، اس کا سورج ہی ہونا قرین قیاس ہے، کیونکہ پھول اسے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کی منزل افق کی سنہری دنیا ہی ہے، سورج کو مسافر کے روپ میں پیش کرتے ہوئے سفر کے متلازمات کے لئے فضا تیار ہو جاتی ہے اور سورج کے سفری ہونے کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ اب دوسرا بند دیکھئے:

جس سرزمین کو سورج کی منزل قرار دیا گیا ہے، وہ سورج کے لئے "دلاویز سنہری سرزمین" ہے، یعنی حسین خوابوں کی سرزمین، حالانکہ وہ وقتاً سورج کے زوال کی نشانی ہے، اس سے بھی زیادہ وہ غیر متوقع طور پر ایک آفت زدہ اور ستم دیدہ دنیا بن جاتی ہے، اس دنیا میں نوجواں عاشق (The Youth) اور اس کی معشوقہ جو زرد دوشیزہ

The pale virgin) ہے، اپنی اپنی قبروں میں مدفون ہیں، عاشق اور معشوقہ کے الفاظ Capital Latters میں ہیں تاکہ ان کی تخصیص بھی قائم ہو اور وہ عاشقوں اور معشوقوں کی نمائندگی بھی کر سکیں، نوجواں عاشق کی کہانی یہ ہے کہ اس نے خواہش سے کڑھتے ہوئے موت کو گلے لگالیا ہے، لفظ "خواہش "(Desire) اس کے عشق کے جذباتی اور جنسی تقاضوں کا محرم ہے، اور Pined away کے الفاظ اس کے انتظار، آرزو اور محرومی کا اشاریہ ہے، Virgin کے ساتھ Pale کے سابقے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی جذباتی، ذہنی اور جسمانی کیفیت سے گزری ہے، جو عاشق کا مقسوم تھا، وہ برف کے کفن میں لپٹی ہوئی ہے، یعنی برف میں مدفون ہے، لفظ برف" موسموں کے تغیر وتبدل کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، اور انجماد بے حسی اور یخ بستگی کا اشاریہ بھی ہے، اور دوشیزہ کے عبرتناک انجام کے المیے کا غماز بھی ہے۔ ان دو مصرعوں سے جہاں سورج مکھی کے خلد بداماں خواب کی شکست ظاہر ہوتی ہے (کیونکہ موسم کی رنگینی، جس کی توثیق گل آفتاب کی موجودگی سے ہوتی ہے، زمستاں کی برف میں بدل جاتی ہے، اور برف کفن بن جاتی ہے) وہاں ان سے سورج مکھی کی اس آرزو کا بھی انہدام ہو جاتا ہے کہ وہ سورج مکھی کے ختم سفر پر اس سے واصل ہوگا۔

ان دو مصرعوں اور تیسرے مصرعے کے ان الفاظ Arise from their graves سے ایک محیر العقول ماورائی صورتحال ابھرتی ہے، یعنی مدفون عاشق اور معشوقہ اپنی اپنی قبروں سے بے روک اٹھتے ہیں، اور تعجب انگیزانہ طریقے سے اسی سرزمین میں جانے کی آرزو کرتے ہیں، جہاں سورج مکھی جانے کا آرزومند ہے حالانکہ وہ اسی سرزمین میں دفن بھی ہیں اور وہیں زندہ بھی ہوتے ہیں۔

الغرض سورج مکھی بظاہر نظر آنے والی جس شفقی اور حسی دنیا کی آرزو کرتا ہے یہ سوچ کر کہ وہاں اس کے دل کی مراد بر آئے گی یعنی اسے سورج کی قربت نصیب ہوگی، وہ دراصل عاشق اور معشوق کا قبرستان ہے یعنی وہ معصوم آرزوؤں کا مدفن ہے، اور مدفن بھی ایسا جو آرزو کرنے والوں کو ایک مستقل اذیت میں مبتلا رکھتا ہے، لفظ arise کسی خاص وقت یا لمحے کا یقین نہ کرتے ہوئے آواگون کے فلسفے کے مطابق مرنے اور زندہ ہونے کے ایک ختم نہ ہونے والے چکر کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح سے آرزومندی اور محرومی کی ایک متناقض پچویشن سامنے آتی ہے۔ نظم میں جو تہہ نشیں طنز ہے، اس سے متکلم کی شخصیت میں دردمندی اور لاتعلقی کے متناقض رویے اور پھول سے اس رویے کے منطبق ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور تجربے کی ایک اور گرہ کھلتی ہے۔ وہ ایک تنہا پھول سے اپنی قلبی وابستگی کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے ظاہر وباطن پر نظر رکھتا ہے، لیکن پھول کے سنہری دلاویز سرزمین کے خواب دیکھنے کے عمل کو اس کی سادگی اور معصومیت سے محمول کرتا ہے وہ اپنے اس رویے کو My Sun Flower کہہ کر ظاہر کرتا ہے، اس سے سورج مکھی سے اپنے دلی رشتے کی نزاکت اور اس کے انجام نا آشنا ہونے کے المیے کی آگہی کو متشکل کرتا ہے۔

یہ ہے نظم کی کہانی، جو قاری حسیاتی طور پر Involve کرتی ہے، جہاں تک اس کے معنی کا تعلق ہے، اس کا ادراک کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں لیکن فوری طور پر اس سے زیادہ متن کے تجربے کا تجربہ کرنا زیادہ اہم اور برمحل ہے۔ معنی کا ادراک قاری کی نظر، ذوق اور علم پر منحصر ہے، اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نظم صرف ایک یا دو معنی پر حاوی نہیں جیساکہ ہیرالڈ بلوم اور کلر کا خیال ہے۔ یہ کثرت معنی سے معمور ہے، یہ انسان کی اس ازلی تلاش کا اشاریہ ہے، جو اسے نادیدہ جہانوں تک رسائی حاصل کرنے خوب سے خوب تر کی جستجو کرنے، خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے اور جذباتی، نفسیاتی اور حسی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے گرم سفر رکھتی ہے، لیکن اس کی ساری تگ ودو، اضطراب، خواب بینی اور Passoion اسے انجام کار لاحاصلی کے دکھ میں مبتلا کرتی ہے، اتنا ہی نہیں یہ نظم انسان اور وقت، انسان اور فطرت اور انسان اور کائنات کے رشتوں، ان کی آویزشوں، ان کی معنویت اور عدم معنویت کے متضاد معانی پر بھی حاوی ہے، سورج مکھی کے پھول کی علامتی حیثیت خود اس کے کثیر المعنی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

آخر میں ذیل کے اقتباس پر توجہ کیجئے۔ جو میری کتاب "اکتشافی تنقید کی شعریات" سے مستخرج ہے، اور جو متن میں معنی کے عمل کے بارے میں میرے نظریے پر دلالت کرتا ہے:

"تخلیق کسی معنی یا خیال کی ترسیلیت سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، یہ امکان خیز تخیلی فضا، جو لسانی عمل کا نتیجہ ہے، کی تشکیل کرتی ہے، اس میں کردار و واقعہ کے تعمل سے جو تجربہ ابھرتا ہے، وہ مختلف جہات کی جانب سفر کرتا ہے، اور تجسس وتحیر کو انگیخت کرتے ہوئے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔" ص ۶۸-۶۹

اقتباس ہذا کے پہلے ہی جملے یعنی "تخلیق کسی معنی یا خیال کی ترسیلیت سے کوئی سروکار نہیں رکھتی" سے میرے اس خیال کہ تخلیق کسی ایسے معنی جو مصنف سے منسوب ہو، یا وجدانی ہو یا Content کے مماثل ہو، سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، کی توضیح ہوتی ہے، کیونکہ جملہ ہذا میں لفظ "معنی" کو "خیال" کے مرادف (معنی یا خیال) کے طور پر برتا گیا ہے، اور پھر "ترسیلیت" کے لفظ سے معنی کو مدعا یا موضوعیت کے مماثل گردانے کے ساتھ ساتھ معنی کے اس معنی جو فن کے وجودی الاصل ہونے کی نفی کرتا ہے، سے ہم آہنگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقتباس ہذا میں درج یہ جملے کہ "یہ امکان خیز تخیلی فضا، جو لسانی عمل کا نتیجہ ہے، کی تشکیل کرتی ہے، اس میں کردار و واقعہ کے تعمل سے جو تجربہ ابھرتا ہے، وہ مختلف جہات میں سفر کرتا ہے، اور تجسس و تحیر کو انگیخت کرتے ہوئے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے" میرے سطور بالا میں درج میرے معروضات کی تائید کرتے ہیں، یعنی:

(۱) لسانی عمل کی اہمیت (۲) لسانی عمل سے ایک امکان خیز تخیلی فضا کی تشکیل، (۳) تخیلی فضا میں کردار و واقعہ کا تعمل، (۴) کردار و واقعہ کے تعمل سے تجربے کا ابھرنا، (۵) تجربے کا مختلف جہات کی جانب سفر کرنا (۶) تجربے کا تجسس و تحیر کو انگیخت کرنا، (۷) تجربے کا جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کرنا۔

یہ وہ نکات ہیں، جو میرے اس موقف کے عین مطابق ہیں کہ شعری تجربہ جو لسانی عمل کا زائیدہ ہے، متن کی ناگزیر خاصیت اور استناد ہے، اور شعری تجربے کی خاصیت یہ ہے کہ قاری کی جمالیاتی حس کی تشفی کرتا ہے، اور فکری طور پر معنی کے ادراک کو ممکن بناتا ہے۔ ☆☆

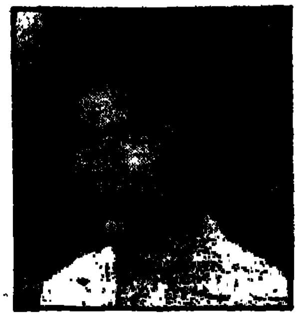


افتخار نسیم

غلیل

آؤ مجھے زور سے کھینچو
اتنی زور سے کہ
میرے اندر کا کنکر
درخت کے سب سے اونچے پھل
کو لگے
اور وہ گرنے سے پہلے سارا رس
چھلکا دے
ہم دونوں کے جسموں پر
گرا دے
پھر ہم اس رس کی لذت کو
اپنی زبانوں سے چکھیں
اس رس کو
جو کتنے ہی سمندروں کے منتھن کے بعد نکلا ہے
یہ ضروری نہیں کہ خالق
کوئی تخلیق ہی کرے
آؤ یہی زندگی کو زندگی کے لئے جیئیں
آؤ مجھے زور سے کھینچو

● 6033-NORTH SHERIDAN ROAD
SUITE-40-J. CHICAGO-60660 (U.S.A.)



شفیق گوہر کیموری

ٹوٹے نہ کبھی گئے جو دس کے
ساجن تو سکھی کب اپنے بس کے

کیا عشق ہوا کہ ہو گئے ہیں
ہم سولہ برس میں سو برس کے

خود شرم سے روک نہ انکو
پھر دور تک دیکھنا ترس کے

آئیں گے تو پھیر لیں گے آنکھ سے
ترسے ہوئے نین یہ درس کے

تن کیا ہے سجن کے من کے آگے
ناتے ہیں ہوس کے

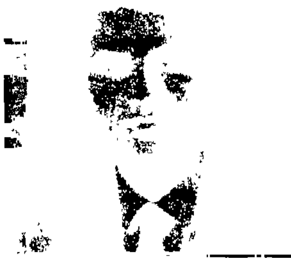
سلجھاؤ سجن تو تمکو جانیں
جو تار الجھ گئے نفس کے

زلفوں سے ٹپک رہے ہیں موتی
بادل تو گذر گئے برس کے

ساجن مرے کنگن بجے ہیں
پینالے میں تار لاڈی کس کے

جادو تو بھی غزل تمنا کی
کانوں میں پڑے ہیں بول رس کے

● J-17, BEEUTAL AVE
5-K, NORTH KARACHI, KARACHI-75050 (PAK)



عزیز نبوی طارق

چرچا کیا بحر و بر کا
قصہ سب اس سے پر کا

سرخ لکیروں میں گھر کر
پھر چھوٹا رشتہ گھر کا

قیدی کو تنہائی کیا
جھگڑا ہے دیوار و در کا

بس میں اپنے کیا کیا کچھ
سب ہے کھیل مقدر کا

تاروں کا خزانہ خالی
ذکر ہے پھر کس کے زر کا

قطرہ گل بھی جائے اگر
کیا ہوگا قطرے کے ڈر کا

HJ-176, HOUSING BOARD COLONY
EROZPUR ROAD, LUDHIANA-141001



عبدالصمد
212-A, RAJWI GANDHA,
SADAQAT ASHRAM, PATNA - 10 (BIHAR)

بھوتوں کی بستی

ان میں ایک مرد تھا دوسری عورت۔

بظاہر دیکھنے میں ایسا لگتا کہ دو دیوانے آپس میں مل کر کسی رومانی مہم کو سر کرنے نکلے ہیں۔ دوپہر کی اٹھان، گرمی کی وہ تپش، سڑک پر بچھی کولتار کو بھی پسینہ آرہا تھا۔ گلیاں دھول اڑا رہی تھیں اور زندگی بے حال ہو ہو کر بھی جئے جارہی تھی۔

"صبح سے دوپہر ہو گئی، اب شام بھی ہو جائے گی، کچھ حاصل ہوا۔۔۔؟"

عورت نے ایک رومال سے اپنی گردن، ہونٹ اور پیشانی کا پسینہ پونچھا اور دوسرے رومال سے اپنا گاگلس صاف کیا۔ اس کے ہینڈ بیگ میں کئی رومالوں کے خانے تھے۔

"جو تمہیں حاصل ہوا وہی مجھے۔۔۔ اور حاصل کیا کرنا ہے، ہم کسی خزانے کی تلاش میں نکلے ہیں کیا۔۔۔؟"

مرد کے انداز میں خاصی بے پروائی تھی۔

"پھر بھی، ابھی تک تو ہم نے صرف دھول ہی پھانکی ہے۔۔۔"

عورت سخت بور ہو چکی تھی۔

"سوشل سائنٹسٹ کے لئے یہ دھول پھانکنا بھی بہت مفید ہوتا ہے۔۔۔"

مرد نے ماحول کے تناؤ کو دور کرنے کے لئے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو لگے ہاتھ یہ سب بتا دو کہ ابھی کتنی دھول اور پھانکنی ہے۔۔۔؟"

عورت ابھی تک یہ جڑی ہوئی تھی۔

"کمال ہے میڈم، آپ اتنی جلد بور ہو گئیں۔ اس کا مطلب ہے پہلے آپ نے اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا۔۔۔؟"

مرد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"کیا کیوں نہیں۔۔۔ لیکن اس قدر Lack of Co- operation میں نہیں۔"

عورت نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

مرد ہنس پڑا۔

"Lack of Co-operation۔۔۔ یعنی وہ سب، یعنی آپ کے Respondents آپ کے استقبال کے لئے اپنے دروازوں پر کھڑے ہوں، ہاتھوں میں پھولوں کے ہار، ہونٹوں پر مسکان۔۔۔"

مرد کے انداز پر عورت روہانسی ہو گئی۔

"طنز کے تیروں سے یوں چھلنی کرنا تھا تو مجھے یہاں لائے ہی کیوں۔۔۔؟"

"ارے برا مان گئیں۔۔۔ اگر ایسی بات ہے تو میں اپنے سارے تیر واپس لیتا ہوں، چلئے اپنے تیروں سے اپنا ہی بدن چھلنی ہو۔۔۔"

"میری مانو تو وہی کرو جو سب کرتے ہیں۔۔۔"

عورت نے لوہا کسی قدر گرم دیکھ کر ایک ہلکی ضرب لگائی، مرد نے سنجیدگی سے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

"جانتی ہو تم کیا کر رہی ہو۔۔۔؟"

"کوئی مجرمانہ ترغیب نہیں دے رہی۔۔۔"

عورت نے دوٹوک جواب دیا۔

"سراسر بے ایمانی ہوگی اپنے Commitment سے اپنے پیشے سے۔۔۔" مرد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"غلط سمجھ رہے ہو تم، دیکھو میں تمہیں بتاتی ہوں۔ صبح سے دوپہر تک ہم نے مشاہدے و جائزے میں وقت گزارا، اب کچھ دیر میں شام ہو جائے گی اور ہم یونہی خالی ہاتھ لوٹ جائیں گے۔۔۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو تم۔۔۔؟"

مرد نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آرہی ہوں بھائی۔۔۔ میں یہ کہنے جارہی ہوں کہ دن بھر کے مشاہدے اور جائزے کی بنیاد پر ہم اپنے سوال نامے بہت آسانی سے ترتیب دے سکتے ہیں ورنہ یہ جاہل بچے ہمارے سوال اور ہماری منشا کو کیا سمجھیں گے۔۔۔"

عورت نے مرد کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن مرد لاتعلق بنا رہا۔ عورت اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، پھر کچھ جواب نہ پا کر بولی۔

"اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو بتاؤ۔۔۔"

"بالکل غلط کہہ رہی ہیں آپ میڈم۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماجی مطالعے اعتبار کی سند کو نہیں پہنچتے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے ہیں، حکومت اور سماجی ادارے کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں، حاصل کچھ نہیں ہوتا، سوائے خانہ پری کے۔ ایرکنڈیشن کمروں میں آرام دہ میز کرسیوں پر بیٹھ کے ہم تپتے ہوئے ریگ زاروں اور دھول اڑاتے ہوئے

میدانوں کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں بھلا۔۔۔؟"

مرد باقاعدہ تقریر پر اتر آیا۔ عورت بے بسی سے اس کے چہرے کو تکنے لگی، پھر اپنے پرس سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے چہرے کی نوک پلک کو درست کیا اور قدرے نرم لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو، لیکن اب تو وقت بھی کم ہے، پھر کیا ارادے ہیں۔۔۔؟"

"اگر ایک بھی۔ Respondent مل گیا تو سمجھوں اپنی محنت اکارت نہیں گئی۔۔۔"

مرد پرجوش لہجے میں بولا۔

"تو اب بھی تمہیں یقین ہے۔۔۔؟"

عورت نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں طنز کی چمک تھی۔

"ایک سوشل سائنٹسٹ کبھی ناامید نہیں ہوتا۔۔۔"

مرد کا لہجہ بہت مستحکم تھا۔

کچھ لوگ انہیں سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتے رہے، کچھ لوگ ایسے اخباری نمائندے جو ان کی غربت اور بدحالی سے اپنی جھولی بھرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی نگاہوں میں ان کے لئے شک وشبہ ہی تھا۔ وہ جو اپنا مقصد بتاتے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا۔

بھلا بچوں سے انہیں کیا بات کرنی ہے، کرنا ہے تو ان کے ماں باپ سے کرو جو انتہائی غربت کے عالم میں بہ حالت مجبوری انہیں ایسے کام پر بھیجتے ہیں جو ہرگز ان کے لائق نہیں، بھلا اپنی خوشی سے کون بھیجتا ہے۔۔۔؟ یہ بچے کیا بتائیں گے، ہم سب سے پوچھو، ہمارے پاس بتانے کو بہت کچھ ہے، بہت ساری باتیں، اتنی باتیں کہ تم سب سمجھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن جہاں ہم نے بچوں کی طرف سے بولنا شروع کیا، تم نے روک دیا، پتہ نہیں کیا کرنا چاہتے ہیں ان بچوں سے باتیں کر کے۔۔۔"

وہ بستی کا کونہ کونہ چھان چکے تھے، ایک بار نہیں، کئی بار، لیکن لمبے دو لمبے کے لئے کسی بچے پر اپنا سوالنامہ Administer نہیں کر سکے۔ جس کے سبب ان کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مزدور بچوں کے منہ سے ان کی اپنی زبان میں ان کے محسوسات جاننا چاہتے تھے۔ اس بستی کا تقریباً ہر بچہ مزدور تھا لیکن اسکے سارے احساسات اور ان کی زبانیں اپنی تھیں۔

کبھی کبھی مرد کو لگتا عورت ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ مشاہدے اور جائزے کی بنیاد پر انہیں اپنا کام مکمل کر لینا چاہیئے۔ لیکن اس کے اندر کی ازلی ایمانداری اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ اپنے مطالعے کو اعتبار کا درجہ دلانا چاہتا تھا جو فیلڈ ورک کرنے سے ہی حاصل نہیں ہو سکتا۔

سورج کا رنگ کملانے لگا تھا اور دن کسی طرح سے شام کا سہارا لے کر رات کی چادر میں منہ چھپانا چاہتا تھا۔ اچانک مرد کو ایک خیال آیا۔

"ایک بات ذہن میں آرہی ہے۔ اب تک ہم ان بچوں کو ڈھونڈتے رہے ہیں جن کے ماں باپ نے انہیں مزدوری پر لگایا ہے، کچھ بچے ایسے بھی تو ہوں گے جو بالکل خود مختار ہوں گے، یعنی ان کے ماں باپ۔۔۔"

عورت کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی آگئی، یقیناً ایسے بچے بھی ہوں گے ان سے بات چیت کرنے میں کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہو گی اور وہ بہت آسانی سے ان کے Respondents بن سکیں گے۔

نشان دہی کوئی ایسی مشکل نہیں تھی، کوئی بھی خوانچہ والا، بیڑی والا، چائے والا ان کے کام آسکتا تھا۔ سو آیا۔

تاڑ اور کھجور کے لیے پتوں سے ٹھہرا ہوا، بانس کی کھپچیوں، کوڑے پر پھینکے ہوئے ان گنت پولیتھین کے ٹکڑوں اور اینٹ کے ٹکڑوں سے مزین چھت پر مشتمل وجود کو اگر جھونپڑا نہیں کہا جاتا تو اور کیا کہا جا سکتا تھا۔۔۔؟

ان کے پکارنے پر ایک دس گیارہ سال کا بچہ اندر سے نکل کر آیا اور انہیں دیکھ کر ٹھٹھک گیا، ایک صاحب ایک میم صاحب۔۔۔!

"کیا بات ہے صاحب۔۔۔؟ آپ کو کسی کی تلاش ہے۔۔۔؟"

اس نے انتہائی سنجیدگی سے بالکل بڑوں بلکہ ادھیڑ عمروں کی طرح پوچھا، انہیں ایک جھٹکا تو لگا لیکن ان کے سامنے اپنے مقصد کے سوا کوئی دوسری بات سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

"آپ۔۔۔ تم ہی سے کام ہے بھئی۔۔۔ تم۔۔۔"

انہوں نے کھڑے کھڑے اپنے سوالنامے کا ایک ایک سوال اس پر داغنا شروع کر دیا، وہ بہت سنجیدگی سے اپنے انداز میں ہماری باتوں کا جواب دیتا رہا۔

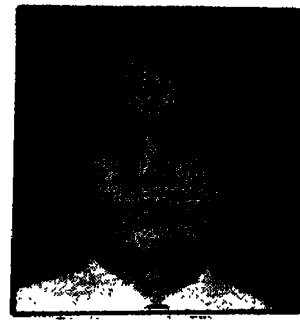
اس کا باپ اینٹ ڈھوتے ہوئے ایک زیر تعمیر عمارت کی نویں منزل سے گر پڑا تھا اور اس کی لاش کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ تب سے وہ بچہ اپنے خاندان کا کفیل تھا، بیوہ ماں جو جوانی میں اپنی دونوں آنکھیں کسی پراسرار بیماری کے سبب کھو چکی تھی۔ چار چھوٹی چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی۔ ۔۔۔وہ بچہ صبح سے رات تک مزدوری میں جٹا رہتا اور اپنی صلاحیت سے بہت زیادہ محنت کر کے بس اتنا کما لیتا کہ کسی طرح گھر والوں کا پیٹ بھر جاتا۔"

اس لڑکے سے گفتگو کرتے ہوئے انہیں ایک ذرا شائبہ بھی نہیں گزرا کہ وہ کسی بچے سے مخاطب ہیں۔ اس کی باتیں اکثر بڑوں کے شعور پر بھی بھاری پڑ رہی تھیں۔ اندر سے ایک عجیب احساس انہیں پل پل کاٹ رہا۔

وہ بچہ انہیں اپنے جیسے کئی بچوں کے پاس لے گیا جو اسی کی طرح اپنے خاندان کے کفیل تھے۔ ان میں کچھ تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے باپ سے محروم ہو چکے تھے۔ کچھ ماں باپ دونوں ہی سے محروم تھے۔ سب کے حالات ایک جیسے نہیں تھے لیکن سب تقریباً ایک ہی جیسی زندگی جی رہے تھے۔

ان کے سوالنامے اتنے بھر گئے کہ ان کے مطالعے کا خاصا مواد جمع ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر دیکھئے)



پرکاش تیواری

وہ پھول سا کھل کے جب ملا ہے
اداسیوں کا سبب ملا ہے

عجب ہے قصہ فقیر دل کا
بغیر مانگے ہی سب ملا ہے

نظارے سے اس کے خوش ہیں کیسے
ہمیں کوئی جیسے رب ملا ہے

بہار کا رنگ دیکھتے کیا
سراغ اپنا ہی کب ملا ہے

نہ کوئی رستہ نہ کوئی منزل
عجب سفر روز و شب ملا ہے

تمام ہو عمر چولا دھوتے
بشر کو جیون عجب ملا ہے

سرور پرکاش زندگی کا
بنا محبت کے کب ملا ہے

● B-4, ROSE APTS. SECTOR14
(EXTN.) ROHINI, NEW DELHI -11



خورشید افسر بسوانی

کب کہا میں نے زمیں پر کوئی تارا اترے
کم سے کم شمع کے نیچے تو اجالا اترے

روز بھوکا ہی سلادیں یہ زمانے والے
آسماں سے نہ اگر رزق ہمارا اترے

اپنے دشمن کا کروں ذکر، پریشاں تو ہو
حال میں اپنا سناؤں، ترا چہرا اترے

ایک ہی رات میں طے کرلیا صدیوں کا سفر
کئی صحراؤں سے گزرے، کئی دریا اترے

کیسا موسم ہے وہی جھیل ہے لیکن افسرؔ
نہ شکاری کوئی آئے نہ پرندا اترے

● BISWAN, SITAPUR-26102(UP)

شاہد اسحاقی

بڑھ گئی دھوپ ہوا تنگ سحر کا دامن
اور ادھر پھیل گیا بوڑھے شجر کا دامن

سبز شاخوں پہ ہی اٹکی رہی اک ایک کرن
میرے آنگن کو چھپائے تھا شجر کا دامن

کیا غضب ہے وہی گلشن کا محافظ ہے جو خود
رکھ کے کانٹوں پہ گھسیٹے گل تر کا دامن

ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کی لویں تیز ہوئیں
تنگ سے تنگ ہوا تنگ نظر کا دامن

تونے نغمات وفاؤں کے الاپے شاہدؔ
وسعتیں پائے نہ کیوں تیرے ہنر کا دامن

● 2101-W.HOODAVE APT.NO.2E
CHICAGO.IL 60659. (U.S.A.)

قیصر تمکین
160-OAKSFORD, CUMBRAW
SOUTH WALSE, NP44, 6UN (U.K.)

شادیٔ مرگ

دنیائے ادب میں کامیابی کی تمام کوششوں میں ناکامی کے بعد حضرت لوقان نے فیصلہ کیا کہ مرجائیں۔

ان کے اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد احباب کو مقامی وغیر مقامی اخباروں سے ان کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی۔ مگر اس سے پہلے ان کا ایک ذاتی خط شری ہاکامشرا کے نام پہنچا۔

شری ہاکامشرا اردو دنیا میں ہندی کے ایک دگامبر پورنتر لیکھک اور آلوچک اور ہندی ساہتیہ میں اردو کے جلیل القدر ناتھ مانے جاتے تھے۔ حضرت لوقان کو طوفان بنانے میں شری ہاکامشرا کا اتنا ہی بڑا ہاتھ تھا جتنا پاپا ڈاک کی عظمت میں سی آئی کا۔ ہاکامشرا نے پڑھنا شروع کیا حضرت لوقان کا ذاتی اور نہایت ہی خفیہ خط تھا۔

" میرا انتقال ہو رہا ہے، جلسۂ تعزیت کا انتظام شری رماشنکر تمنا اور پنڈت یادو ناتھ انگر کر رہے ہیں۔ آپ کا آنا ضروری ہے کیونکہ آپ ہی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں گے۔ یہ تقریب بالکل کلاسیکی یونانی انداز میں منانا چاہتا ہوں۔ سیڈنبرگ ہال میں چبوترے پر جو لمبی میز ہے اس پر میرا جسد خاکی رکھا جائے گا۔ اس کے اوپر سیاہ کامدار چادر ڈالی جائے گی اور آنے والے سوگواران ادب آنکھیں ملنے کے بعد ہار پھول ڈالیں گے۔ سرہانے ہومر داستانوں کی نوعیت کا عوددان ہوگا جس میں میرے چھوٹے بھائی حضرت ارمان اور حضرت لوقان برابر تازہ عود ڈالتے رہیں گے۔"

مزید لائحہ عمل یہ تھا کہ وہ تمام بدخو، بدطینت، بدکردار اور بدگفتار ادیب وناقد جو کسی زندہ ادیب کی شان میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں اس موقع پر بڑھ چڑھ کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ حضرت لوقان کی ادبی خوبیوں، انسانی عظمتوں، فنی گہرائیوں اور اس میں کچھ فلسفیانہ وستوں وغیرہ کے بارے میں دھواں دھار تقریر کریں گے۔ ان سب تقریروں کی صدابندی کی جائے گی اور طرح طرح سے تصویریں اتاری جائیں گی۔ جلسے کے خاتمے پر ومبلڈن آرکیسٹرا کی سدابہار کنواریاں اپنے سنہری بالوں کو مواج سینوں پر بکھرا کر وردی کا سوز پیش کریں گی اور پھر حضرت لوقان چادر ہٹائیں گے اور الا اللہ کہکر اٹھ بیٹھیں گے۔ اس کے بعد دھوم دھام سے بغلی کمرے میں "کھاؤ پیو" آراستہ ہوگی جس میں حضرت لوقان ایک ایک ادیب اور ناقد کو چڑھائیں گے کہ یارو یا تو تم سب اب تک جھوٹ بولتے رہے تھے یا پھر آج جھوٹ فرمارہے تھے۔ تمہاری ادبی دیانت کا تو ابھی پتہ چل گیا ہر بات ریکارڈ کرلی گئی ہے اور اب میں ان سب باتوں کو کتابی شکل میں چھاپ کر تقسیم کروں گا اور اپنے نئے مجموعے میں تمہاری یہ بے لاگ اور فیاضانہ باتیں اور رائیں خوب استعمال کروں گا۔ تب مزہ آئے گا۔"

اصل قصہ یہ تھا کہ حضرت لوقان گذشتہ چوتھائی صدی سے برابر علم وادب کے کاشانوں میں شمعیں جلارہے تھے۔ اگر یہ سب شمعیں جمع کی جاتیں تو اب تک ان کی ادبی عظمت کا ایک چھوٹا موٹا سورج طلوع ہو چکا ہوتا۔ اب اسی طلوع کے فقدان کی باپردہ غروب ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔

حضرت لوقان کو گمان ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ ناقدوں اور ادیبوں نے ان کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے۔ جب بھی ان کی کوئی چیز چھپتی تو مختلف گروہوں اور جماعتوں کے ادیب اور ناقدان کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے اور بعض تو اوبدا کر انہی دنوں "شہر سے باہر" چلے جاتے۔ عام ناقدوں نے جب خاص طور پر حضرت لوقان کو نظر انداز کیا تو حضرت لوقان نے بھی خاص ناقدوں کو عام طور پر نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اسی رسہ کشی میں ان کی ادبی عظمت کا سفینہ اور بھی بھول چوک کے منجدھار میں پھنس کر رہ گیا۔

حضرت لوقان کے انتقال پُر ملال اور پھر جلسۂ تعزیت کا سارا کھیل ان کے چھوٹے بھائی حضرت لقمان یعنی مسٹر لک میں Look man کے ذہن رسا کی پیداوار تھا۔ مسٹر لک مین اشتہار سازوں کی ایک ایشیائی کمپنی میں جھوٹ کو سچ، رنگے چاولوں کو بریانی اور رات کے چھیچھڑوں کو "شیش کباب" ثابت کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ انہوں نے برادر مکرم کو سمجھایا کہ اردو میں ایک بڑا ادیب بننے کے لئے یوروپ کا سفر اور ایک عدد انگریز بیوی تو لازمی ہے مگر آزادیٔ فکر بغاوت یا احتجاج وغیرہ کی جدید یوروپی ترکیبیں استعمال کرنے کے لئے ملک وقوم سے غداری بھی بہت ضروری ہے وہ مدتوں سے انگلستان میں مقیم تھے اس لئے اپنے پناہ گزین ادیب کا فیشن ایبل دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے پھر ملکۂ معظمہ سے غداری کا خیال ہی حضرت لوقان کو سہادینے کے لئے کافی تھا۔ اپنے بیوی بچوں کو

ڈ کر وہ آئرلینڈ کی ایک چلتی رقم قسم کی فاحشہ سے سول میرج کر چکے اور گھر بار چھوڑ کر مقامی کونسل کی پناہ گاہ قسم کی عمارت میں مدتوں سے تھے۔ ان باتوں کا کوئی بڑا اثر ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ مسٹر لک نے کہا کہ بڑے ادیبوں کی وفات کی جھوٹی خبریں بھی اکثر بیشتر چھپتی ہیں۔ وہ بھی اسی طرح کی خبریں مشتہر کر کے اور پھر ان کی تردید کے نے تھوڑی بہت مفت کی شہرت کما سکتے ہیں۔ بات حضرت لوقان کی میں آگئی۔

تو اس طرح حضرت لوقان کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ستان و پاکستان کے علاوہ احتیاطاً کینیڈا، امریکہ، سعودی عرب اور ایک خلیجی ریاست کو بھی بھیج دی گئی۔

اصلی جلسے کی دیکھ بھال کے لئے حضرت لوقان شری ہاکا مشرا سے سیوا ابھلاشی ہوئے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شری ہاکا مشرا حال ہی میں ف بہ اردو شاعری ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں وہ پنڈت نہال چند نہالی شاگرد بھی ہو گئے تھے اور استاد کے ایماء پر تخلص اپنا رکھا تھا نونہال ری۔ انہوں نے حضرت لوقان کے حادثہ وفات پر جھٹ پٹ ایک یہ بھی تصنیف کر ڈالا تھا۔

جب حضرت لوقان کے انتقال کی خبر مشتہر ہوئی تو بہت سے سرین نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو ایک بلا تو ٹلی۔ لیکن جب فرداً فرداً ، چھوٹے بڑے سنبھلے سنبھلے ادیب و شاعر کے نام جلسہ تعزیت کے ت نامے پہنچے تو سبھی نے ذرا سوچ سمجھ سے کام لیا۔

حضرت جناب ڈاکٹر حکیم بیمار صحت گنجوی جو ساؤتھ ہال میں نقلی ن بیچ بیچ کر ایک عظیم الشان اور عہد آفریں دانشور اور ناقدین کا روپ چکے تھے سوچنے لگے: "اپنا کیا جاتا ہے۔ جلسے میں جا کر دو چار ریاکاری جملے کہہ دیں گے۔ خبر بھی چھپے گی اور مفت میں فوٹو بھی الگ۔"

فوٹو کے بارے میں سبھی ادیب مطمئن تھے کیونکہ روزنامہ "بم" کے رافر کو ہدایت تھی کہ ایشیائیوں کی تصویروں کے نگیٹوز بہت کالے اکرے تاکہ چھپتے وقت سب کی صورتیں گوری نظر آئیں۔ اس رافر کے بارے میں حضرت مژدہ خیر آبادی کی کا کہنا تھا کہ خدا غلام ئے مگر غلام صورت نہ بنائے۔

ادب کی قدیمی "آپائیں" اور "بجیائیں" بھی بالوں کو خضاب سے رکر، نقلی دانت چمکاتی، ڈھیروں لپ اسٹک تھوپے، سیتوں کو ایزنگ اسٹک کٹوریوں سے سجائے، منہ سے لہسن کے بھبھکے اڑاتی پہنچیں۔ نامہ "بم" کا غلام صورت فوٹو گرافر ایک خصوصی رسم کے طور پر ہمیشہ ب کو اکٹھا کر کے خواتین کا علاحدہ فوٹو اتارتا تھا جس پر یہ سب آپائیں بجیائیں۔ جو تقریباً سبھی نانیاں اور دادیاں بن چکی تھیں بہت نازاں ں کیونکہ "بم" کے فوٹو میں سب کی صورت گوری لگتی۔

ممتاز اور جغادری ادیب حضرت لطیفن کلیمن جاروی نے سوچا کہ کیا پتہ جلسہ تعزیت میں حضرت لوقان کی "گوری" بیوہ سے اظہار تعزیت کرتے وقت وہ عملی جذبات کا بھی اظہار کر سکیں۔ مولوی ساقی کو حضرت لوقان کی سینیر بیوہ کا خیال آیا۔ گو وہ بھی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھیں لیکن پھن اوڑھ کر اب بھی اچھی صورت نکالتی تھیں۔ مولوی ساقی نے سوچا کہ کیا خبر اس غضبناک موقع پر انہیں بیگم لوقان سینیر سے کچھ شرعی ربط و ضبط بڑھانے کا موقع مل سکے۔ نئے مارکسی، تجریدی، تاریخی، جدلیاتی، ساختیاتی، نباتاتی ارجاواتی نقاد ادب موسیو بے خوف ہو نسلوی کو حضرت لوقان کی صاحبزادیوں کا خیال آیا۔ وہ اگر باپ کے جلسہ تعزیت میں ہوں گی تو ظاہر ہے موسیو بے خوف ہو نسلوی بہت شفقت سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیر سکیں گے۔ سب سے نادر خیال تو ڈاکٹر پروفیسر اولٰی اعلیٰ پوری کو آیا۔ انہوں نے ایک معرکے کا مضمون گھسیٹ ڈالا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ یہ مضمون حضرت لوقان مرحوم کے اکلوتے سائنسداں بیٹے فوقان کو خطاب کر کے سنائیں گے۔ فوقان اب رائل سوسائٹی کا ممبر ہو چکا تھا مگر اس کا رجحان طبع مشرقی تھا اور وہ کبھی کبھی اردو میں ایک آدھ غزل بھی جھاڑ دیتا تھا۔ ڈاکٹر پروفیسر اولٰی اعلیٰ پوری نے سوچا کہ کیا پتہ ان کے خراج عقیدت سے متاثر ہو کر فوقان کسی ادبی گھرانے میں شادی کر بیٹھے اور ادبی گھرانوں کا جہاں تک سوال تھا یہ ظاہر ہی تھا کہ پروفیسر ڈاکٹر اولٰی اعلیٰ پوری سے بڑھ کر ادبی گھرانا پورے یوروپ میں اب اور کہاں تھا؟

باقی ادیبوں اور شاعروں نے بھی سوچا کہ اگر اس موقع پر دو چار انگریز کونسلروں یا ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ کھڑے ہوئے فوٹو کھنچوانے کا موقع مل ہی گیا تو اپنی گرہ سے کیا جائے گا۔ پاس پڑوس کے ایشیائی پنساریوں اور پلاؤ خور تبلیغیوں پر رعب ہی پڑے گا۔

جس کسی کو بھی تعزیتی جلسے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اس نے احتیاطاً ایک آدھ انشائیہ، نظم، غزل یا مضمون جیب میں ڈال لیا کہ کیا معلوم اس کو کچھ چھپنکنے کا موقع مل جائے۔ سننے سنانے کا موقع کوئی وقت اور ساعت دیکھ کر تھوڑا ہی آتا ہے یہ وقت تو موت اور گاہک کی طرح کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

اس دن شہر میں کوئی دوسری سرگرمی نہیں تھی۔ اس لئے اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، چینی، جاپانی اور روسی زبانوں اور ادب پر مکمل عبور اور مہارت تامہ رکھنے والے بابائے ادب حضرت پروفیسر ڈاکٹر علامہ ابوالقاموسی بھی "ادب میں قابل قدر اضافہ" قسم کے ادیبوں کی بیواؤں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آن پہنچے۔ لوگ انہیں دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ سب لوگ کھڑے ہو گئے، جلسہ کی صدارت کے لئے کرسی انہیں فوراً پیش کی گئی۔ علامہ ابوالقاموسی کبھی کسی جلسہ تعزیت میں نہیں جاتے تھے یہ تو حضرت لوقان کی گوری بیوہ سے اظہار

افسوس کرنے کا فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لئے وہ یہاں آگئے تھے۔

ہال دو گھنٹوں کے لئے کرائے پر لیا گیا تھا۔ مگر ناقدان ادب نے حضرت لوقان کے انتقال کو کچھ اس طرح ادب و تہذیب ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے حادثۂ عظیم ثابت کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔

حضرت لوقان شروع ہی سے خون کے دباؤ کے مریض تھے۔ اپنی تعریفیں سن سن کر پھولے نہیں سمارہے تھے۔ اپنے ازلی مخالفین کے منہ سے قصیدے سن سن کر وہ خوش ہو رہے تھے۔ مگر یہ سوچ کر محظوظ بھی ہو رہے تھے کہ بعد میں یہ سب کمبخت کس طرح تلملا کر اور پانی پی پی کر انہیں کوسیں گے۔ اکثر جملوں پر تو وہ خوشی سے اتنا بے قابو ہو جاتے کہ جی چاہتا ابھی اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور "لندن میں مردہ زندہ ہو گیا" کی تفسیر بن جائیں۔ پھر بھی مشکل سے ضبط کئے پڑے رہے۔

حضرت لوقان چادر اور پھولوں میں ڈھکے چھپے لیٹے تھے۔ تو انہیں پروفیسر ڈاکٹر علامہ ابوالقاموسٰی کی آمد کا یقین ہی نہ آیا کیونکہ پروفیسر ڈاکٹر علامہ ابوالقاموسٰی جو تمام تیسرے اور چوتھے درجے کے انگریزی، امریکی اخبار والوں یا نام نہاد ادیبوں کی کفش برادری کو اعزاز فاخرہ تصور فرماتے تھے اردو کے بڑے سے بڑے ادیب و شاعر کو گھاس پھوس سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ ان کی آمد اپنی جگہ پر خود ہی ناقابل اعتبار کرشمہ تھی۔ اس پر ان کا فیاضانہ اظہار خیال۔!!

حضرت ڈاکٹر پروفیسر علامہ ابوالقاموسٰی نے جب اظہار خیال کرنا شروع کیا تو حضرت لوقان کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔

"مجھے لوقان کے سانحۂ ارتحال کی خبر سے سخت رنج ہوا۔ میں تھرڈ ورلڈ۔ فورتھ ورلڈ اور نارتھ ساؤتھ ادیبوں و دانشوروں کو بصیرت و معرفت سے معمور کر رہا تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر یہاں آگیا۔ محض اپنے دلی جذبات غم کا اظہار کرنے کے لئے۔ آپ حضرات خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ احساس کر سکتے ہیں کہ لوقان کتنا بڑا اور ہر دلعزیز قلمکار تھا کہ اس کے انتقال پر میں۔ یعنی میں۔ غور فرمایا آپ نے کہ میں تک افسردہ ہوں۔ اس کی وفات سے دنیائے ادب میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کسی طرح۔۔۔"

حضرت لوقان اس کے آگے اور کچھ نہ سن سکے۔ چادر اور پھولوں سے ڈھکا ہوا ان کا جسم واقعی مسرت سے ساکت ہو گیا تھا۔ ●●

بقیہ صفحہ ۳۸ شیرنی

"دیکھو ایسے۔۔۔ رو دو نہیں۔۔۔ مجھے بتاؤ تو صحیح۔۔۔ آخر ہوا کیا" میں نے پیار سے پوچھا۔ "میں جب اپنے۔۔۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے غسل خانے کی طرف جانے لگی۔۔۔ تو ایک عجیب سی۔۔۔ آواز آئی۔۔۔ "اس نے دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف کی اور آہستہ آہستہ بولی" جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو جی۔۔۔ سنو کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ ساری چھت خالی تھی میں سمجھی مجھے ایسے ہی وہم ہو گیا ہے۔" "پھر۔۔۔؟ نہیں تھا نہ کوئی۔۔۔ ڈر کیوں گئیں"۔ میں اس کی طرف دیکھ کر ابرو سیکڑ کر سر کے اشارے سے کیوں کہتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں جی۔۔۔ تھا نا، میں تو وہم ہی سمجھی اور غسل خانے کی طرف جانے لگی ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں کوئی غسل خانے میں ہی نہ ہو۔ روشنی بھی تو پوری طرح نہیں ہوئی تھی۔" وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ "ارے۔۔۔ رونے کے بغیر بتاؤ نا۔۔۔ بس۔۔۔ اب نہ رونا۔۔۔ ٹھیک ہے؟" اس نے آنسو پونچھے "ابھی میں نے غسل خانے کی طرف دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ پھر آواز آئی "اے سنو نا۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں۔ اس ساتھ والے گھر میں کام کرتا ہوں۔ ادھر دیکھو نا۔۔۔ مجھ سے کیا شرمانا دیکھو۔ ادھر اوپر۔ میں نے اوپر دیکھا۔۔۔ پھر دائیں طرف کی دیوار کی طرف نظر ڈالی تو۔۔۔ تو۔۔۔ تو بی بی جی۔۔۔ " وہ پھر سسکنے لگی۔ "ادھر۔۔۔ دیوار پر ایک پاؤں ادھر کو لٹکائے ایک مونچھ والا لڑکا بیٹھا تھا جی۔۔۔ میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب۔۔۔ دیوار پر چڑھا ہوا۔۔۔ میں ڈر گئی۔۔۔" ●●

بقیہ صفحہ ۲۸ بھوتوں کی بستی

اچھی خاصی شام بھی ہو گئی تھی۔ واپسی کے ان کے قدم تیز تھے، مرد کے عورت سے بھی زیادہ۔ "اب تو خوش ہو۔۔۔ تمہارے صحیح Respondents مل گئے۔۔۔!" عورت نے ماحول پر طاری سنجیدگی کو اپنے شوخ لہجے سے ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ مرد خاموش رہا، البتہ اس کے قدم تیز سے تیز تر ہو گئے۔ عورت نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں۔۔۔؟ تمہارا کام ہو گیا پھر بھی موڈ خراب ہونے کی وجہ۔۔۔؟" "میں سوچ رہا ہوں کہ جتنا جلد ہم یہاں سے نکل بھاگیں، اتنا ہی اچھا ہے۔۔۔" مرد نے دیر کے بعد زبان کھولی۔ "کیوں۔۔۔ ایسا کیوں کچھ ہو گیا جو۔۔۔؟" "تم نے دیکھا نہیں، اس بستی میں سیدھے جوان پیدا ہو رہے ہیں، بچے سرے سے غائب ہیں اور جوان بھی ایسے جو بڑھاپے کی طرف دوڑے جا رہے ہیں، یقیناً یہ بھوتوں کی بستی ہے۔ یہاں زیادہ دیر تک رہنا خطرے سے خالی نہیں۔۔۔" مرد نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا کہ عورت خوف زدہ ہو گئی، چوکنی نگاہوں سے اس نے چاروں طرف دیکھا اور مرد کے قدم سے قدم ملاتی ہوئی بولی۔

"میں تو تم سے پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ فیلڈ ورک۔۔۔ لیکن تم مانے نہیں، اب غلطی کی ہے تو۔۔۔" "تم ٹھیک کہتی تھیں۔۔۔" مرد دھیرے سے بولا اور عورت کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً دوڑنے لگا۔ ●●



وسیم بٹ وسیم

یہی کمال ہے اُس کا

زندگی میں لوگوں کی
کب کمی رہی
لیکن
میری شاعری میں
وہ
آج بھی سنائی دے

نظم سے باہر اک سوال

اسی سوال پر
آنکھوں سے خواب روٹھیں گے
کس اعتبار پہ
دیکھوں میں خواب سورج کے
سحر کو بھی تو
کسی رات ہی میں ڈھلنا ہے

دھوپ میں پہلا قدم

کسی کے حق میں بھی ہو
فیصلہ تو کرنا ہے
نہیں تو پھر سے وہی ہوگا
جو ہوا ہے ابھی
وہ ایک لمحہ
جو محور بدلتا رہتا ہے
اسے کشش کے
کسی دائرے میں لانا ہے
جو ہو چکا ہے
اسے جائزے میں لانا ہے

حکمت

زمیں پہ خاک کی چادر بچھانے والے نے
بلندی آنکھ میں رکھی تو ساتھ ڈر بھی دیا
سمندروں کے بدن میں تہوں کی منزل تک
مٹا کے راستے اک سوچ کا سفر بھی دیا
فضائے دہر کو یکساں بنا کے آخر میں
ہوا کو بھیس بدلنے کا اک ہنر بھی دیا
اُدھر جلا کے الاؤ خلا کے آنگن میں
اِدھر بنا کے مجھے ایک برف گھر بھی دیا

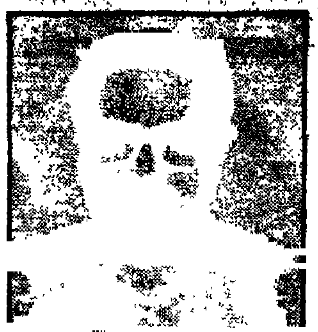
جواب ڈھونڈھتا سوال

تو کیا یہ سچ ہے
کہ اونچی اڑان والوں کو
بلندیوں کا سفر
راس آگیا
ورنہ
وہ آسمان کو
زیرِ زمین لے آتے
یا
اس زمین کے
دم توڑتے مکانوں میں
نئے جہان سے
زندہ
مکین لے آتے

منظر بدل جائے گا

مجھے دیکھ لو
کہ میں خامشی کی
سبھی حدوں سے گزر گیا
کہیں ٹوٹنے کی صدا کوئی
کبھی آئے
تو مجھے سوچنا

P.O. BOX NO. 58171,
NAIROBI - KENYA



محمود احمد قاضی
MILLAT COLONY No.2
RAHWALI, GUJRANWALA (...)

پیاسا

گاڑی اچانک جب شدید جھٹکے کے ساتھ رکی تو اس کے ساتھ ساتھ سبھی حیران ہوئے کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ اس خرابے میں گاڑی کو یوں ٹھہرنے کی کیا تک تھی؟ تاش کھیلنے والی چوکڑی بھی حیران و پریشان تھی پتے ان کے ہاتھوں میں اٹک گئے تھے کسی نے باہر جھانکا۔

"کوئی بہت ہی چھوٹا سا غیر آباد اسٹیشن ہے۔ شاید آگے سے کوئی گاڑی آنے والی ہے۔"

گاڑی کے اس طرح رک جانے سے گرمی کی شدت کا احساس اور بھی بڑھ رہا تھا ہر کوئی گاڑی کے چلنے کا منتظر تھا اور ان میں سے ہر ایک کھڑکیوں میں آدھا دھڑ باہر کی طرف لٹکا کر آگے کی سمت دیکھتا اور پھر مایوسی سے سر ہلاتا اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتا سب بے چین تھے اور اپنے آپ سے الجھ رہے تھے سمجھ میں نہ آنے والی چیز کو سمجھنے کے لئے سوچے جا رہے تھے مگر معمہ تھا کہ حل نہیں ہو پا رہا تھا اور وہ نیک بی بی جو ابھی شادی والے سرخ جوڑے میں ملبوس تھی اور جسے وہ ابھی کل ہی بیاہ کر اپنے ساتھ اپنی پوسٹنگ کے اسٹیشن پر لئے جا رہا تھا کسمسائی اور پھر ذرا جھجک کے ساتھ پکار اٹھی۔ "پانی"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا مگر تھوڑی دیر بعد اسے پھر اس کی پکار سنائی دی اب اس سے رہا نہ گیا شرمندہ سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پانی لانے کے لئے برتن ہاتھ میں لئے اسٹیشن پر کود پڑا۔ نیم پختہ اینٹوں سے بنے پلیٹ فارم پر سرکتے ہوئے وہ آگے بڑھا ریلوے اسٹیشن اپنی تنہائی اور اداسی میں یکتا محسوس ہوتا تھا وہ ٹہلتا ہوا اسٹیشن کے واحد کمرے یا دفتر کی طرف بڑھا ایک ادھیڑ عمر شخص کل پرزوں سے الجھتا ہوا اسے ملا۔ اس نے پانی والا برتن اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے فریاد کی۔ "پانی"

"ادھر۔ باہر۔ فقیر کی جھونپڑی ہے پانی تمہیں وہاں سے ملے گا"۔ بابو نے اپنی کل پرزوں سے کھیلتے ہوئے کہا گاڑی یہاں کتنی دیر رکے گی۔ پانی لانے تک چل تو نہیں پڑے گی۔

"نہیں۔ اگلا اسٹیشن دور ہے۔ طوفان میل کو یہاں پہنچنے میں ابھی کچھ دیر تو لگے گی ہی۔ آپ اطمینان سے جائیں۔"

اور وہ واقعی اطمینان سے چلتا ہوا اسٹیشن کی حدود سے باہر اس طرف چل پڑا جدھر بابو نے فقیر کی جھونپڑی کی نشاندہی کی تھی۔ ذرا فاصلے پر ایک جھونپڑی تو ضرور تھی مگر خالی پڑی۔ وہاں فقیر کی گدڑی تو تھی مگر فقیر نہیں تھا۔ آس پاس پانی بھی کہیں نظر نہ آیا۔ سامنے اسے ایک بازار کے آثار نظر آئے تو وہ ادھر ہو لیا اور شور کے دریا میں اترنے لگا۔ خاموشی کی دیوار توڑ کر اچانک لوگوں کا ہجوم اسے بازار میں سیر کرتا نظر آیا وہ راستہ بناتا لوگوں کے درمیان میں سے ہوتا ایک چیختے والے ہوٹل پر آگیا وہاں ائرفون ریکارڈ بج رہا تھا اور لوگ میزوں پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے ہوٹل والا مصروف بہت تھا مگر اس نے سوال داغ ہی دیا۔

"بھلے آدمی۔ پانی۔ مجھے تھوڑا سا پانی چاہیئے"۔

"پانی۔ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ارے تم پانی نہیں سمجھتے۔ ایک بے رنگ۔ بے بو مائع شے ہوتی ہے اسے پانی کہتے ہیں اور یہ پینے کے لئے ہوتا ہے اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا پیاس! یہ لو!"

اس نے ایک سفید رنگ کا آمیزہ سا اس کے سامنے کر دیا۔

"ارے یار کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ یہ پانی تھوڑا ہی ہے یہ تو کوئی دودھ جیسی چیز ہے"۔

"تو پھر کیا چاہیئے۔ یہ لے لو اور اپنی پیاس بجھاؤ۔"

"لیکن مجھے تو پانی چاہیئے!"

ہوٹل والا اب اس سے بے زار ہوا جاتا تھا اس لئے اپنے کام میں مگن ہو جاتا ہوا اسے بھولنے لگا وہ اس کی بے رخی کو جان کر آگے کھسک لیا۔ بازار میں چہک دمک بہت تھی کپڑوں کی دکانیں۔ لوہا۔ سریا۔ کیل قبضے، ہتھوڑے، آنکڑے، پیتل کے برتن، بچوں کے کھلونے وغیرہ سب کچھ تھا مگر پانی نہیں تھا وہ آگے بڑھتا رہا اور پانی کے بھٹکتا رہا۔ وہ جس کسی سے بات کرتا پہلے تو اسے پانی کے متعلق سمجھانا پڑتا کہ وہ کیا ہوتا ہے جب کافی مغز ماری کے بعد وہ سمجھ جاتا تو کسی اور طرف اشارہ کر دیتا اور وہ ادھر کو چل پڑتا اور پھر اسے وہاں بھی مایوسی ہوتی۔ پانی کے نام پر اس کے سامنے عجیب و غریب قسم کی چیزیں۔ گاڑھے محلول اور دوسری فضول سی چیزیں لائی جاتیں جنہیں وہ رد کر کے آگے بڑھ جاتا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور یوں بازار

بھی ختم ہو گیا پھر ویرانہ آیا۔ یہاں پھر خاموشی کا راج تھا لیکن لوگ اسے اور آگے اور آگے جانے کے اشارے کرتے رہے۔ وہ اور آگے بڑھتا گیا یوں پھر ایک اور بازار آ گیا یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی یہاں صرف سیمنٹ ریت بجری اور اینٹیں تھیں۔ پانی نہ ملا بلکہ پانی کے نام پر طرح طرح کے خرافات سے ہی اس کا واسطہ پڑتا رہا۔ اب وہ تھک چلا تھا اور ناامید ہو کر واپسی کا ارادہ کرنے کو تھا کہ ایک لاٹھی ٹیکتی مائی نے اسے دلاسا دیا اور پانی دلانے کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا مائی کے چلنے کی رفتار تو کم تھی مگر اس کی زبان بڑی تیز تھی وہ دنیا جہان کی باتیں کئے جاتی تھی اور وہ بے زاری سے سنے جاتا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لئے مختلف بازاروں میں گھماتی کئی جگہوں کے چکر گھورتی ایک تنگ گلی کے دو کمروں والے مکان میں لے آئی وہاں پہنچ کر وہ سانسیں بحال کرتے ہوئی بولی۔

"پانی میں تمہیں تب دوں گی جب تم شام کی روٹی بنانے کے لئے مجھے گیہوں پیس کر دو گے"۔

وہ غصے سے دانت کچکچانے لگا بڑھیا بڑی لالچی اور کھکھی تھی بہر حال اس نے صبر کے گھونٹ پئے اور چکی پر جت گیا۔ گیہوں پیسنے کے بعد اس نے مائی کی واحد کھٹولی کی ادوائین بھی کسی۔ اس کے گھر کی صفائی کی اس دوران مائی اطمینان سے ایک طرف بیٹھی اپنے آپ کو پنکھا جھلتی رہی وہ فارغ ہوا تو بولی۔

"سامنے والے گھڑے سے پانی لے لو"

وہ خوش خوش گھڑے کی طرف بڑھا اس کا ڈھکن اٹھا کر اس نے اپنے برتن میں جب پانی انڈیلنا چاہا تو ایک بدبودار گاڑھا سیال اس کے کپڑوں کو تربتر کرتا برآمد ہونے لگا اسے قے آنے لگی۔

"یہ۔ یہ۔ پانی ہے!" وہ روہانسا سا ہو رہا تھا۔

"ہاں یہی پانی ہے"

"مگر یہ تو۔۔۔"

"اسے ہی پانی کہتے ہیں بیٹا"

"مگر یہ تو پانی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے"

"اگر نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ جاؤ دفعہ ہو جاؤ اور کہیں اور سے مانگ لو"

"مگر کہاں سے؟"

"کہیں سے بھی۔ ویسے تمہیں ملے گا نہیں شاید"

"کیوں۔۔۔؟"

"اب کیوں کا میں کیا جواب دوں۔ تم چیز ہی ایسی طلب کرتے ہو کہ۔۔۔"

وہ اس کی لمبی تقریر سنے بغیر وہاں سے نکل پڑا۔ گلیوں کے چکر ختم کر کے وہ دوبارہ ویرانہ پار کر رہا تھا اب اس کا جسم اور روح دونوں زخمی تھے اور وہ کسی قدر غصے میں بھی تھا مگر اب وہ واپسی کے سفر پر تھا اور اسے جلدی بھی تھی پانی تو نہیں ملا تھا مگر اب اسے گاڑی تک پہنچنا تھا گاڑی۔ اس کا خیال آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ کیا اسے گاڑی اب تک وہیں کھڑی ہوئی ملے گی۔؟

اگر گاڑی نکل گئی ہو گی تو۔ وہ تیز تیز قدموں سے چھوٹے اور پھر بڑے بازار کو پار کرنے لگا اور آخر کار فقیر کی کٹیا تک آ پہنچا۔ اب کے فقیر اپنی کٹیا میں موجود تھا ایک ہٹا کٹا شخص جس کی آنکھوں میں اور دانتوں پر پیلاہٹ تھی۔

"بابا۔ سنا ہے تمہارے پاس پانی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے تھوڑا سا پانی دے دو۔"

"پانی۔ یہ تم کس چیز کا نام لے رہے ہو۔ شاید تم نے پلہ آئی کہا ہے۔"

"ہاں۔ پانی۔ جو بے رنگ ہوتا ہے اور بے بو ہوتا ہے مگر میٹھا ہوتا ہے۔ جس کے پینے سے پیاس بجھتی ہے۔"

"پانی۔ پیاس۔ پتہ نہیں تم کیا بک رہے ہو۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

اس نے سٹپٹا کر اسٹیشن کی طرف دیکھا اور گاڑی کا خیال کرتے ہوئے ادھر اسٹیشن کی طرف بھاگا۔

"ارے کیا ہوا کدھر جاتے ہو"

"بابا۔ وہ گاڑی۔ ادھر گاڑی کھڑی تھی اسٹیشن پر وہاں میری بیوی بیٹھی میرے انتظار میں پیاس سے بلک رہی ہو گی۔"

"ہاں۔ ہاں"

"ارے احمق جلدی کرو۔ وہاں سب تمہارے انتظار میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ یہ گاڑی تو ادھر ایک عرصے سے کھڑی ہے تم پہنچو گے تو گاڑی چلے گی۔"

وہ بھاگتا ہوا اسٹیشن پر پہنچا۔ سب مسافر اس کی طرف باہیں پھیلائے سے کوس رہے تھے۔

"ارے تم کدھر جا رہے تھے۔ ہمارا سفر بھی کھوٹا کیا اور اپنا بھی۔"

وہ ڈبے میں سوار ہوا تو اس کی بیوی کی جان میں جان آئی۔

"آپ آ گئے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ آپ پانی لے آئے۔ لائیے مجھے پانی دیجئے۔"

"پپ۔ پانی۔ وہ تو نہیں ملا"

"کیا۔؟" اس کی بیوی کے گلے سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس کا گھونگھٹ ذرا سا کھل گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس کی بیوی کے سر کے آدھے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور وہ تاش والی جوان بھلن کی چوکڑی بھی اپنی ادھیڑ عمروں والے فق چہرے لئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اب گاڑی آخری وسل دیتے ہوئے اس ویران اسٹیشن کی حدود سے نکل رہی تھی اور اس کے رعشہ زدہ ہاتھوں میں پکڑا پانی سے خالی برتن نیچے گرا جا رہا تھا۔ ●●

محی الدین

شجر ممنوعہ

شجر ممنوعہ کا ثمر سا
نامحرم بوسہ
میری رگ و پے میں شہد سا بھر گیا تھا
محرم اور جائز رشتوں نے

زہر
تلخی
مایوسی، کے سوا کیا دیا

کس مفتی سے دریافت کروں
کہ تمہیں

مایوسی،
تلخی
زہر،
اور شہد سے واقفیت ہے؟

زیست

وقت سے شب و روز گالیاں کھاتا رہا
بھوک،
بیسوا کی طرح ساتھ چپک کر رہ گئی تھی
اس سے سٹے یوں لگا جیسے
زیست،
اماوس کے نطفے سے جنمی ہو
ایسی ناگفتہ بہ حالت میں
امید کی روشنی تھی
اور کیا تھا۔

● MAHTO PARA ROAD, HILL VIEW
AREA P.O. JUGSALAI, JAMSHEDPUR -8

نورالدین نور

پانیوں کا سراغ

جب رگ و پے کی سرخ سرحد پر
زرد شعلوں کا ہراول دستہ
نیلگوں مورچے بناتا ہے
خواہشیں پیرہن بدلتی ہیں
لوحِ احساس کسمساتا ہے
اور!
انفاس کے اندھے پنچھی پھڑ پھڑا کر اڑان بھرتے ہیں
خونچکاں شب کے آہنی حلقے
روشنی کی گداز گردن پر
پل بہ پل تنگ ہوتے جاتے ہیں
داخلی تتلیوں کے جھرمٹ کو
گھیر لیتے ہیں خارجی عفریت
ہنہناتے ہیں خون کے دیپک
لو کی پرچھائیاں سسکتی ہیں
سوچ بیساکھیوں پہ چلتی ہے
ذہن آلائشیں اگلتا ہے
پھر تلذذ کے آتشی بادل
درد کے نامعبور صحرا پر
تشنگی سی اچھال دیتے ہیں
تب کہیں نکتہ دانِ وحشت کو
ارتقاء کی عمیق گاگر سے
پانیوں کا سراغ ملتا ہے

● 198, VIDYA NAGAR COLONY
M.S.K. MILLS ROAD, GULBARGA - 3

آر. ایم. شاہین

مشورہ

ضابطہ حیات سے ہٹ کر
موت کی وادیوں میں کھونے سے پہلے
آؤ ہم ـــــ یا تو
صندل کے پیڑ بن کر
کہیں صف آراء ہو جائیں
اجنبی ہواؤں سے دوستی کر لیں،
اپنی خوشبو سے فضاؤں کو معطر کر دیں
یا پھر ـــــ
کوئی حسین خیال بن کر
ورق ورق بکھر جائیں
کتاب بن کر
کہیں کسی گوشہ میں سج جائیں
یا ـــ
اک تصویر بن کر
خاموشی کے عالم میں کھو جائیں ـــ!
دیوارِ جہاں کو رنگین کر دیں ـــ

D-NO. 21-45-10, ASSIPAPA, STREET CHUNGAL
PETA, VISHAKAPATANAM - 1

ترنم ریاض
C11,JUNGPURA EXTN.
NEW DELHI - 110014.

شیرنی

"میں ڈر گئی۔۔۔بی بی۔۔۔جی"۔۔۔ نجمہ نے تھرتھراتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور خوف زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں تلے ناک کچھ اس طرح سکڑی ہوئی تھی کہ ناک سے ملی ہوئی ایک لکیر سیدھی پیشانی کے درمیان تک جارہی تھی۔

میں اس کی بات سن کر ششدر رہ گئی۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی۔ مگر نہیں۔ شاید وہ سچ کہہ رہی تھی اور میرا دل ہی اس کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب نجمہ چلی جائے گی کہ وہ اس سے پہلے کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ کھیتوں اور جنگلوں میں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے والی۔ ذرا سی آہٹ پر آدھی آدھی شب کواڑ کھول کر باہر چکر لگا آنے والی۔ مویشی کی پکار سن کر اندھیرے میں لال ٹین لئے درندے کی تلاش میں نکل پڑنے والی ڈر کیسے سکتی ہے۔ کس سے ڈر سکتی ہے۔

میں کسی تقریب میں شرکت کیلئے اس کے گاؤں گئی تھی۔ شہر سے آئے مہمانوں کی سکونت کا انتظام وہاں کے ڈاک بنگلے میں کیا گیا تھا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے دامن میں واقع تھا بلکہ جنگل کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ رندے سے ہموار کئے گئے اور وارنش سے چمکائے گئے تختوں اور شیشوں سے بنا بڑے بڑے کمروں اور طویل طویل غلام گردشوں والا دو منزلہ مکان جس کی ٹین کی چھت پر سبز رنگ کا روغن کیا گیا تھا۔ سامنے خوبصورت باغیچہ، جس کی پتھر سے بنی چار دیواری پر سرخ اور زرد پھولوں کی بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ پچھواڑے مختصر سی راہداری سے لگا ہوا باورچی خانہ اور دوسری طرف چوکیدار کی کوٹھری۔ چوکیدار ہی مہمانوں کے لئے سارا انتظام کرتا تھا۔ اس رات چوکیدار مہمانوں کو رات کا کھانا کھلانے کے بعد سامنے کی چراگاہ سے لگی ڈھلوان اتر کر گاؤں کے اندر چلا گیا تھا۔ اسے کوئی کام تھا اور اس کی جگہ رات بھر ڈاک بنگلے میں رہنے کیلئے کوئی اور آنے والا تھا۔ رات رہنے کے لئے کوئی آیا کہ نہیں یہ معلوم کرنے کی کسی کو ضرورت نہ پڑی۔ سب اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔

میرا کمرہ دوسری منزل میں تھا جس کی کھڑکیاں باغیچے میں کھلتی تھیں۔ رات کو اچانک میں جانے کس آواز سے بیدار ہو گئی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ پردہ سرکایا تو سارا ماحول چھٹکی ہوئی چاندنی میں نہایا ہوا ملا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ عجیب روح پرور سی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ہوا میں جنگل کی خوشبو کے ساتھ باغ کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ مختلف نوع کے پھولوں کا منظر میں آنکھوں کے راستے دل میں اتارنے لگی۔ چاندنی میں باغیچہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مصور نے شوخ رنگوں سے بنائی کسی تصویر پر سرمئی گھول گرا دیا ہو۔ سارا ماحول سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اچانک برآمدے سے ملحقہ چوبی زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر نیچے کو جھانکا تو ایک چمکتی ہوئی پنڈلی نظر آئی اور پھر دوسری اس کے ساتھ ہی پوری شبیہہ میرے سامنے تھی۔ کوئی طویل قامت لڑکی تھی جو ہاتھ میں لال ٹین لئے پھاٹک کی طرف جارہی تھی۔ مہمانوں میں اس حلئے کی کوئی لڑکی شامل نہ تھی۔ پھر۔۔۔

مجھے سارا منظر کسی HORROR فلم کا سین معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بغیر دائیں بائیں دیکھے سیدھے پھاٹک کے قریب چلی گئی اور بغیر کسی آہٹ کے زنجیر اتار دی۔ کواڑ کے قبضے دھیرے سے کچھ بولے اور خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے سلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اور پائنچے گھٹنوں تک چڑھا لئے تھے۔ گلے میں دوپٹہ تھا نہ پاؤں میں چپلیں۔ لمبی سی کمر پر موٹی سی چوٹی جھول رہی تھی۔

لڑکی کون تھی۔ اور کہاں جارہی تھی۔ اس سناٹے میں۔ آدھی رات کو۔ مجھے بھوتوں چڑیلوں پر یقین نہیں تھا مگر۔

جب اس نے ایک ہاتھ سے کواڑ بند کئے تو میں نے اس کے دوسرے ہاتھ میں لمبے دستے والی کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ دیوار کے اس طرف ہوتے ہی وہ غائب ہو گئی۔ سامنے ہرے بھرے میدان میں کوئی شے متحرک نہ تھی۔ کھوکھلے تنے والا ایک بڑا سا اکیلا درخت خاموش کھڑا تھا۔ اچانک کسی جانور کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سمجھ گئی کہ ایسی ہی ایک آواز سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ اس کے بعد کسی تڑپتے پیکر کے گرنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ بھی۔ اس کے بعد کچھ دیر سناٹا رہا پھر لڑکی جیسے دیوار کی دوسری طرف سے پھولی

اور درخت کے تنے کے قریب چلی گئی۔ لال ٹین کی روشنی میں مجھے دور سے تنے کے پاس تقریباً کتے کی جسامت کا کوئی جانور لیٹا نظر آیا۔ لڑکی نے اسے بغور دیکھا اور پھر پھاٹک کی جانب چل پڑی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یا شاید آرہا تھا۔ میں نے کمرے کی بتی روشن کی۔ کہتے ہیں بھوت پریت رہتے ہیں۔۔۔

لڑکی نے اندر داخل ہو کر زنجیر چڑھادی اور میری روشن کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی "سلام بی بی جی۔ کچھ چائے کافی لاؤں۔ نیند نہیں آئی"۔ وہ اوپر چہرہ کر کے بولی۔ وہ شاید مسکرا بھی رہی تھی۔ چاندنی میں اس کا چمکتا ہوا چہرہ تو نظر آرہا تھا مگر نہ تو نقوش واضح تھے نہ تاثرات معلوم پڑ رہے تھے۔ میں اسے کئی لمحوں تک دیکھتی رہی۔

"تم کون ہو؟" میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد پوچھا اور مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میری آواز سن کر اس کا بازو بہت لمبا ہو جائے گا اور کھڑکی تک آکر مجھے دبوچ لے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

"میں نجمہ ہوں جی۔۔۔ میرا بابا یہاں چوکیدار ہے" وہ لال ٹین چہرے کے قریب لے جا کر بولی۔ وہ کوئی سولہ، سترہ برس کی خوبصورت سی لڑکی تھی۔

"تم ادھر کہاں گئی تھیں۔ اس وقت۔ نجمہ"

"وہ جنگلی بلا تھا جی۔ کئی دنوں سے مرغیوں کو کھائے جا رہا تھا۔ مار دیا میں نے اسے۔ آپ دیکھیں گی۔؟" وہ اپنے اونچی آواز میں باتیں کر رہی تھی جیسے اس وقت آدھی رات نہ ہو بلکہ دوپہر کا وقت ہو۔

"نہیں۔ شکریہ۔ اب میں سو رہی ہوں"۔

صبح میری آنکھ کھلی تو باغیچے سے باقی لوگوں کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بلے کی لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ لمبے سے بلے کی گردن پر کلہاڑی کا گہرا نشان تھا۔

بے چارہ بلا۔ مگر وہ لڑکی۔ مجھے خیال آیا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چائے کی کشتی لئے داخل ہوئی۔

"صبح بخیر۔ بی بی جی۔۔۔ چائے پی کر نیچے آئیے گا میں آپ کو وہ جنگلی بلا دکھاؤں گی۔۔۔ شکریہ؟" وہ چائے بنانے لگی۔

"ایک۔۔۔ تم کیسے جانتی تھیں کہ بلا ہی ہے۔ کوئی چیتا دیتا ہوتا تو؟" میں نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی "ویسے تو مجھے پتہ تھا جی کہ بلا ہی ہے۔ مگر یہ بھی سوچتی تھی کہ کوئی لومڑی یا بھیڑیا یا کوئی چیتا نہ ہو" وہ ہنس دی۔

"تو۔۔۔ تم ڈری نہیں"۔

"ارے نہیں جی میں تو اس کا بھی یہی حال کرتی" وہ آنکھیں گول گول گھما کر ایک ترچھی نظر فرش پر ڈال کر مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ڈر کا ہے کا جی۔۔۔ ڈرنا تو صرف اوپر والے سے چاہیئے"۔

نجمہ کی شادی دو تین برس میں ہونے والی تھی۔ مجھے اس کی سادگی ا بہادری کچھ ایسی بھائی کی میں نے اس کے والدین سے اسے ان دو تی سالوں کیلئے مانگ لیا میں بھی شہر میں اکیلی رہتی تھی۔ ان لوگوں نے ا بخوشی میرے ساتھ کر دیا۔

میرا فلیٹ تین منزلہ بلڈنگ کی تیسری منزل پر واقع تھا اور چھت بھی ایک کونے میں ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور اس سے آٹھ دس گز کے فاصلے غسل خانہ وغیرہ۔ باقی اطراف میں گملے ہی گملے تھے۔ کچھ پھولوں کے خالی، جن کے پودے خراب ہو چکے تھے۔

ہفتے بھر کے اندر اندر نجمہ نئے ماحول میں ایسے رچ بس گئی جیسے سا عمر سے یہیں رہ رہی ہو۔ علی الصبح نہا دھو کر پودوں میں پانی دے کر بھیگ مٹی کی سوندھی سوندھی مہک لئے نیچے آجاتی۔ میں آدھی سوئی آد جاگی دروازہ کھول دیتی۔ وہ ایک شاداب سی مسکان سجائے سلام کرتی ہو باورچی خانے کی طرف چلی جاتی۔ چائے کی کشتی مسہری سے ملحقہ تپائی رکھ کر وہ مجھے میرا پرس پکڑا دیتی اور پیسے لے کر بازار چلی جاتی۔ ڈیری۔ دودھ اور سبزی وغیرہ لاتے ہوئے اس کی سیر بھی ہو جاتی۔ پھر ان معمول شروع ہو جاتا۔ کبھی صفائی کبھی دھلائی کبھی باتیں کبھی آرام کبھی وی وغیرہ کسی دن اگر مجھے اسے اکیلا چھوڑ کر سارا دن بھی باہر رکنا پڑتا واپسی پر اسے خوش و خرم پاتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ شام کو بازار چلی جا تی۔ وہ پہلی بار شہر آئی تھی، مگر اس بات کی اسے کوئی خوشی تھی نہ غ حیرت تھی نہ تجسس، اسے اپنے کام سے کام تھا۔ نہ تو وہ صبح کے وقت سنسان سڑک پر چلنے سے گھبراتی تھی نہ ہی اترتی رات کے اندھیرے سے

پھر۔۔۔ پھر اسے ڈر کس شے سے لگا۔ اوپر تو ایسا کچھ نہ تھا جس سے ڈر جاتی۔۔۔ وہ لیکن ڈر ہی کیسے سکتی تھی۔

"تم کس سے ڈر سکتی ہو؟" میں نے لفظ تم پر زور دیا "مذاق تو نہیں کر رہیں۔" میں نے یقین اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے درمیا کہا اور باہری دروازہ بند کر کے اس کے قریب آگئی۔

"اوپر۔۔۔ کوئی۔۔۔ کوئی ہے جی" وہ رک رک کر بولی "کیا کو بھوت ووت ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا اور مسکرانے لگی "میں بھوت سے نہیں ڈرتی جی" اس کی آواز کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تو اس چہرے پر آرہے بال انگلیوں سے کانوں کے پیچھے ٹانکے اور حلق کے پا سے دوپٹہ ذرا سا کھینچ کر بالائی لب پر آرہا پسینہ پونچھا۔ "تو پھر کیا تھا جس سے تم جیسی بہادر لڑکی ڈر سکتی ہے۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ کچھ پل مجھے دیکھتی رہی اور پھر نظریں جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی جانے کب اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر ٹک گئے تھے۔

"کیا ہوا۔۔۔ مجھے بتاؤ نا" میں نے پیار سے پوچھا تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ سمیٹ کر سسک پڑی۔ (باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھئے)

فاروق انجینئر

ہو میسر شادمانی کتنی دیر رت رہے گی یہ سہانی کتنی دیر
پھر جھلستا ہے شجر کو دھوپ میں اس گھٹا کی مہربانی کتنی دیر
کتنی دیر اس میں مرا کردار ہے ؟ زندگی تیری کہانی کتنی دیر
پھر دھڑکتا ہے پرانی طرز پر ذہن کی اس دل نے مانی کتنی دیر
صبح کے سورج نے پھولوں سے کہا اوس کی ہے زندگانی کتنی دیر

● 19-QIDWAI NAGAR, IMLI PHATAK, JAIPUR -15 (RAJ.)

چراغ الدین چراغ

اگر کچھ جسم کے باہر رکھا ہے تو بس ایک خوف کا منظر رکھا ہے
رکھی جائیگی دستارِ فضیلت مگر سر تو ہتھیلی پر رکھا ہے
نہیں ڈرتا وہ دنیا میں کسی سے خدا کا جس نے دل میں ڈر رکھا ہے
کسے میں روندکر بڑھنے لگا ہوں مرا ہرگام سائے پر رکھا ہے
چراغ اک درد ہی ہے جس کے در پر قلم کیساتھ میرا سر رکھا ہے

● HIMALIYA BACKERY, MANDI BAZAR, BURHANPUR - 450331, (M.P.)

قائم علی غوری

منزل کی دھن میں تیری طرف آگیا ہوں میں دھوکا ہے دل فریب مگر کھا گیا ہوں میں
اک تلخ امتحاں سے گزارا گیا ہوں میں دھرتی پہ آسماں سے اتارا گیا ہوں میں
اس بارگاہِ حسن میں تخلیق سے بھی قبل صدیوں بڑے تپاک سے سوچا گیا ہوں میں
میری حدوں کا کیسے تعین کروگے تم ہفت آسماں سے آگے بھی دیکھا گیا ہوں میں
قائم خدا کے واسطے لہجے کو تو بدل یک رنگی کلام سے اکتا گیا ہوں میں

● P.O.BOX NO. 5000, DOHA (STATE OF QATAR) (A.G.)

اظہار وارثی

دل میں محفوظ کروں روح کے اندر رکھوں سات پردوں میں ترے غم کو چھپاکر رکھوں
کربِ جاں خندۂ لب تک نہیں آنے پاتا اصلِ منظر کو ہمیشہ پسِ منظر رکھوں
تو سرابوں سا رہا گرچہ مری پیاس کے ساتھ پھر بھی میں ہوں کہ ترا نام سمندر رکھوں
اپنی تقدیر ہی شیشے کی زمیں جب ٹھہری کس جگہ آس کی بنیاد کا پتھر رکھوں
یہ بلندی ہے کہ احساس بلندی کا فریب عرش لگتی ہے زمیں پاؤں جہاں پر رکھوں

● 220, BRAHMANI PURA, BAHRAICH-271801 (U.P.)

ناہید سلطانہ ناہید

خاک سے اٹھایا تھا خاک میں ملایا ہے اب ہماری ہستی کا عکس ہے نہ مایا ہے
دل میں شورشیں ہیں اب ذہن شرپسندوں میں یہ بغاوتیں کیوں ہیں کون یاد آیا ہے
اس کی خستہ حالی پر دیکھ لو نظر کرکے میری ہی طرح اسکو درد نے ستایا ہے
کیا ہواؤں کا شکوہ کیوں گلہ ہو لہروں سے ریت کا گھروندا ہی میں نے جب بنایا ہے
جسم ایک دریا ہے دل ہے ایک قطرہ سا میں نے ایک قطرے میں اک چناب پایا ہے

● AT: RANIPUR P.O. BARHARIA, DIST. SIWAN - 841232 (BIHAR)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

طویل و مختصر تاثرات کا سلسلہ

(۱۴)

صابر آفاقی

"شاعر" ہم عصر اردو ادب نمبر اپنی پوری توانائی اور تابانی ے ساتھ آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ محو حیرت ہو کہ ایک یلے آدمی نے سینکڑوں کا کام کیو نکر کر ڈالا۔ افتخار امام صدیقی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے کہ وہ تعریف و تحسین کا قاق رکھتے ہیں۔ آگرہ نے چار بڑے شاعر پیدا کئے ہیں میر ظیر، غالب اور سیماب شاعر نے آگرہ اسکول کا تعارف ،واکر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے ۔ آگرہ اسکول کے بانی ضرت سیماب تھے۔ درجنوں باکمال شاعر آپ ہی کے حلقہ ن کے تربیت یافتہ تھے جن میں بسمل سعیدی، نازش پرتاب ،ہ، عثار صدیقی، مخمور جالندھر، سراج الدین ظفر، الطاف نہدی، ساغر نظامی، سوز بجنوری وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اسکول کسی خاص خطے تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے برصغیر ۔و ہند اور تک پھیلا ہوا ہے۔ شاعر نے آگرہ اسکول کا پس ۔ر اور پیش منظر پیش کر کے ایک اہم کام کیا ہے اور اس لئے ہماری تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔ ۱۹۰۱ سے ۱۹۵۰ء ۔ دو چار برس کی بات نہیں۔ نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس نف صدی میں حضرت سیماب کا طوطی بولتا رہا اور وہ اردو مر و ادب پر چھائے رہے۔ ان کے قصر الادب نے جو قصر ب تعمیر کیا۔ اس کی بنیادیں اس قدر محکم و مستحکم ہیں کہ انے کے تغیرات انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ سید یت علی خاں نے اقبال اور سیماب کا موازنہ خوب کیا ہے۔ ضرت سیماب کی مطبوعات و مخطوطات کا تعارف افتخار امام ،دیقی نے پوری ذمہ داری سے کر دیا ہے اور چند منظومات ہاب دے دی گئی ہیں۔ "شاعر" کے اس خاص اور تاریخی ر کا ایک امتیاز یہ ہے کہ مشاہیر کے خطوط کے عکس پورے ر میں چھاپ دیے گئے ہیں۔ جو خاصے کی چیز ہیں۔

"شاعر" میں اردو شعر و ادب کے مباحث کو ابواب کے ت مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً باب تنقید، باب افسانہ، باب اعری، باب تحقیق، باب مذاکرہ وغیرہ۔ خاص نمبر کا بہت م، کار آمد اور ضخیم باب افسانے پر ہے۔ اس باب سے کئی کتابیں ترتیب دی جا سکتی ہیں۔ باب افسانہ میں حامدی کاشمیری کا تحقیقی مقالہ نیا اردو افسانہ پڑھنے کی چیز ہے۔ سلیم شہزاد کا مضمون "بازگوئی کا افسانہ" اور طارق سعید کا "بیانیہ" وقیع مضامین ہیں۔ اس باب میں صرف مضامین یا صرف افسانے نہیں ہیں۔ اس باب کا تعارف آسان نہیں ہے۔ معاصر اردو افسانے پر مذاکرہ ایک کتاب کا لوازمہ ہے۔ "باب شاعری" میں پہلے تو افتخار امام صدیقی کا مضمون معاصر اردو شاعری علی حماد عباسی کا شعری پرکھ محمد حسن کا مضمون اردو نظم کا زوال بھرپور اور قابل استفادہ مضامین ہیں اور پھر جو شعری انتخاب ہے اپنے آپ میں ایک الگ تنقیدی مطالعے کا متقاضی ہے۔ معاصر شاعری کی تقریباً تمام اصناف کا احاطہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے شاعر کے اس نمبر میں باب تحقیق بھرپور نہیں ہے بس قابل استفادہ ایک ہی مضمون ہے جو رشید حسن خاں نے لکھا ہے۔ مالک رام پر اور مضامین آنے چاہیئے تھے۔

نئی صدی کے دستخط۔ "شاعر" کا ایک اہم کارنامہ ہے جہاں مشاہیر شعر و ادب کے دستخط محفوظ کر دیے گئے ہیں اس کوشش میں ہمیں کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ نمبر کے آخر میں اردو کے اہل قلم کے پتے مع فون نمبر ایک کام کی ڈائرکٹری ہے۔ نمبر کے شروع میں مدیر "شاعر" افتخار امام صدیقی نے چار صفحات پر مشتمل جو اداریہ۔ ایک ناممکن تخلیقی خواب کی داستاں۔ کے تحت قلم بند کیا ہے۔ اس میں مسلسل کوششوں اور لگاتار ناکامیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس پر صعوبت راہ میں حائل ہوئیں اور بالآخر وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ یہ فقید المثال خاص نمبر اپنی تمام تر انفرادیت اور غیر معمولی انداز پیش کش میں علمی و ادبی اور تخلیقی مباحث کو انگیز کرتا ہے، سوال قائم کرتا ہے، اختلافی مسائل پیدا کرتا ہے، ساتھ ہی ردّ و قبول کی کشاکش بھی بنتا ہے اور داد و تحسین کے ساتھ سب کچھ قبول نہ کرنے کا بھی حوصلہ دیتا ہے۔ پھر بھی آزاد کشمیر کے ہم اہل قلم افتخار امام صدیقی کو اردو شعر و ادب کا عالمی گاؤں آباد کرنے پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

☆ذیل میں پرکاش چندر صاحب کے دو خط من و عن شائع کیے جا رہے ہیں۔ پہلا خط ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۸ء کا ہے یعنی ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کے فوراً بعد کا اور دوسرا شاعر کے حالیہ شمارے میں ڈاکٹر محمد حسن کے طویل خط سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ پہلا خط اس لئے شائع نہیں ہو سکا کہ مکتوب نگار نے خاص نمبر کے سرسری مطالعے کے بعد تحریر کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ اس پر ادارتی شذرات ضرور تھے۔ پھر یہ بھی انتظار رہا کہ مکتوب نگار خاص نمبر کے مطالعے کے بعد جو خط لکھیں گے وہ زیادہ اہم ہو گا اور دونوں خط ایک ساتھ شائع کرا دیے جائیں گے۔ پرکاش چندر صاحب سے مراسلت بھی ہوئی اور ذاتی گفتگو بھی رہی لیکن موصوف اپنی سرسری اور ابتدائی رائے پر قائم رہے جیسا کہ ان کے خط نمبر ۲ سے واضح ہے۔

اب ان دونوں خطوں پر ادارتی شذرات کی ضرورت نہیں رہی ہم عصر اردو ادب نمبر کے بے شمار قارئین خود اندازہ کر لیں گے کہ موصوف کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بہر حال ان کی اپنی ذاتی رائے ہے اور پسند ناپسند کا اختیار سب کو ہے ضروری نہیں کہ ہم اس سے اتفاق بھی کریں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر پر شائع ہوئے خطوں میں ہر طرح کی تنقید و تعریفی رائے آ چکی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔[ادارہ]

پرکاش چندر

بہت لمبی انتظار کے بعد آپ کا تازہ معرکہ وصول ہوا۔ تو یہ ہے کہ آپ ضخامت میں یقین رکھتے ہیں نہ کہ معیار پر۔

(۱) ۱۲۰۰ سے زیادہ صفحوں میں حضرت سیماب اکبر آبادی (جو واقعی بڑے شاعر تھے) اور ان کی اولاد (آپ کو چھوڑ کر) پر ۱۶۰ صفحے لگ گئے۔ سیماب اور اقبال کو ایک برابر کا درجہ دینا کہاں تک مناسب ہے) (۲) ہر حصے سے پہلے حضرت افتخار امام صدیقی کا لکھا ہوا مضمون ہے گویا وہ ادب کی سب اصناف پہ ماہر ہیں (۳) صلاح الدین پرویز صاحب۔ بارہ ملے نے بارہ سے زائد صفحے لے لئے (۴) افسانہ حصے میں تقریباً سبھی بڑے نام ہیں سوائے علی امام نقوی

حالانکہ آدھی درجن ہلکے تخلیق کار شامل رہیں۔ نام لینے سے کیا فائدہ (۵) مکاتیب مشاہیر افسانہ نگار میں سوائے دو کے سب خط اعجاز صدیقی صاحب کے لئے ہیں (٦) دبستان سیماب اور نامور آگرہ گھرانے (شاعری) کے مقابلے میں ۲۳ صفحے۔ یہاں بھی اشک کو کم از کم رام لعل سے دگنے صفحے ملنے چاہیئے تھے! (۷) معاصر اردو شاعری پر مقالات میں کوئی خند نقاد نہیں ہے صفحہ ۷۷۷ سے ۸۱٦ تک (۸) منظومات میں شاید شاعر میں شائع ہوا کلام ہی لیا گیا ہے معیار کا خیال تو ۷۰ فیصدی کلام میں غائب ہے۔ درجنوں اہم نام غائب ہیں اور اتنے ہی گمنام نام شامل ہیں۔ (۹) تحقیق۔ گوشہ مالک رام مذاکرے۔ نئی نسل اور مابعد جدیدیت کے مسائل۔ قاری اساس شعر وادب۔ سوانحی لغت (سوائے اس کے کئی غیر اہم نام شامل ہیں) نئی صدی کے دستخط اور شاعر ڈائرکٹری نہایت بڑھیا ہیں مرحبا! (۱۰) کیری کیچر ز سردار جعفری۔ فاروقی۔ قاسمی۔ بشیر بدر اور زبیر رضوی کے کافی مضحکہ خیز ہیں ان سب کو ہم جانتے ہیں اس لئے صرف ان پر لکھ رہے ہیں دوسروں پر نہیں۔ افتخار امام صدیقی کا کیری کیچر نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

افتخار بھائی ان معروضات سے یہ نہ سمجھنا کہ میں اس خاص نمبر کو قارئین کی نظر سے گرانا چاہ رہا ہوں۔ میں صرف جامع اور مختصر کے امتزاج کا حامی ہوں اگر کاوش کو صرف ۸۰۰ یا ۹۰۰ صفحوں تک محدود رکھا جاتا۔ سختی کے ساتھ انتخاب کرتے تو نہایت مفید ہوتا۔ آگرہ اسکول کو اور طوالت کے ساتھ آگرہ اسکول خاص نمبر کی شکل میں ترتیب دیا جا سکتا تھا۔

جب تمام مشمولات کو پڑھ لوں گا تو شاید ایک اور صفحہ بہ صفحہ تجزیہ پیش کروں گا میں عام نقادوں کی طرح محض توصیفی کلمات لکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ گہرے مطالعے کے بعد لکھوں گا اگر آپ جواب میں اجازت دیں نہیں تو چپ سادھ لوں گا۔ (۹) کے پوائنٹ میں میں نے جو لکھا ہے اسے غور سے پڑھیں تو میرا مدعا صاف ہو جائے گا اور میری نیک نیتی کا ثبوت بھی فراہم ہو جائے گا۔

اگر یہ نمبر محدود کیا جاتا تو اسی قیمت میں بڑھیا کاغذ پر شائع ہو سکتا تھا اب تو لگتا ہے Newsprint پر چھپا ہے۔ ایسی تخلیق تو مدتوں سنبھال کر رکھنے کی ہونی چاہیئے اور جلد بھی اور دبیز ہونی چاہیئے۔ [۲۴ ؍ دسمبر ۱۹۹۸ء]

(۲)

آداب۔ جب میں نے حماقت کی تھی اپنے معروضات لکھنے کی ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اول پر تو آپ بہت ناراض ہوئے تھے اگرچہ میرا خط ذاتی تھا نہ کہ اشاعت کے لئے اور مدعا یہ تھا کہ جلد دوم میں بہتر نظام ہو۔ چلیئے میں تو ایک بے ڈھب نیم جاہل شخص ہوں۔ جون کے شاعر میں ڈاکٹر محمد حسن نے جب آگرہ اسکول کے بارے میں ہی کہا ہے جو خاکسار نے جرأت (یا حماقت) کی تھی تو آپ نے نہ صرف شائع کیا ہے بلکہ اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے کوئی حرف آخر تو نہیں تھی مگر آپ سیخ پا ہو گئے۔ دوستی کے ناطے آپ کا غصہ ناچیز نے سر آنکھوں پر رکھ لیا۔

اس سے پہلے مظہر امام صاحب نے بھی کچھ اغلاط کی طرف اشارہ کیا تھا اور بھی کئی لوگوں نے لکھا ہے میں مانتا ہوں اتنے ضخیم نمبر اور اردو کے بارے میں آپ کا عزم تھا اور کسی کا نہیں ہے مگر میرا کہنا ہے کہ آپ دوسروں کی بات پر غور کریں نہ کہ غصہ، میرا تو خیال ہے کہ اگر آپ انتخاب کا معیار کڑا رکھتے اور ہرا یرہ غیرہ نتھو خیرہ کی تخلیقات شامل نہ کرتے تو اس نمبر کا حجم ۱۵ یا ۲۰ فیصدی کم ہوتا اور قاری کو ہر نوعیت کی تخلیقات نہ پڑھنا پڑتی۔ اشاعت کی قیمت بھی مناسب ہوتی اگرچہ میں کہوں گا قیمت یہی رکھتے تو بھی موزوں ہوتا۔ میں قیمت کی کمی کی بات نہیں کر رہا۔ جو آپ نے علامہ سیماب صاحب کے بارے میں دفاع دیا ہے اس کا صحیح طریقہ تھا شاعر کا ایک خصوصی شمارہ علامہ اور اعجاز صدیقی صاحب پر۔ لیکن جب عالمی اردو ادب کی بات ہے تب میرے خیال سے ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ پھر بھی جلد دوم کا انتظار ہے کیا میں امید کروں کہ آپ اس خط کو اشاعت کے قابل قرار دیں گے۔ مشکور و ممنون رہوں گا۔

● 5 & 6 / 4253, VASNT
NEW DELHI -110070 - KUNJ

ناظم جعفری

شاعر کا ہم عصر اردو نمبر موصول ہوا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس دور میں ضخیم اور خوبصورت نمبر نکالنا بس آپ ہی کا کام ہے۔ آپ کی ہمت کی داد دینی ہی پڑے گی۔ بارہ سو پچاس صفحات میں آپ نے جو موتی ٹانکے ہیں اور جس سلیقے سے ان کی ترتیب دی ہے وہ خود اپنی جگہ آپ کی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ادب کے تقریباً تمام گوشوں پر نظر رکھ کر قدیم و جدید رنگ کی آمیزش نے اس نمبر کو ایک یادگار بنا دیا ہے۔

آج کے ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی یہ ایک انتہائی قیمتی تحفہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو عمر طویل عطا کرے اور اردو ادب کی خدمت کے مواقع فراہم کرے۔ اس نمبر کو پڑھنے میں کافی وقت لگے گا۔

● HAKIM M. JAFAR ROAD
DALMANDI VARANASI - 221001

او دے سرن ارمان

ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اول بحسب نظر ہوا۔ بہت بہت شکریہ میں نے آج تک اتنا ضخیم اور ہر اعتبار سے خوبصورت اور لاجواب نمبر نہیں دیکھا۔ اس دور انحطاط میں یہ ایک معجزہ ہی ہے۔ جگ جگ جیو آپ لوگ اتنا حسین و جمیل نمبر نکالنے کے لئے تہنیت کے مستحق ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائے۔

● U.S.A. HOSPITAL, GANDHI ROAD
BILARI, 202411 (U.P.)

کیول دھیر

"شاعر" کا ضخیم خاص نمبر حصہ اول موصول ہوا۔ اس عظیم الشان، خوبصورت اور قابل مطالعہ اشاعت کے لئے دلی مبارکباد۔ سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے جس لگن، محنت اور تحقیق سے یہ ادبی معرکہ سر کیا ہے یقیناً یہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ بن گیا ہے۔ اس بات کا بھی یقین ہو گیا ہے کہ دوسری اور تیسری جلد تاریخ کو مکمل کریں گے۔ بہت بہت مبارکباد!

● 2- NEHRU COMPLEX FEROZE GANDHI
MARKET, LUDHIANA-141001 (P.B.)

دلشاد لاری

ہم عصر اردو ادب نمبر جیسا ضخیم نمبر نکالنا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ آپ نے اتنے اہم اور مشکل کام کو جو عموماً ادارے انجام دیتے ہیں۔ تن تنہا سر انجام دیا ہے۔ اہل تحقیق کے لئے اس نمبر کی ایک اہمیت ہے۔ شاعر کے نمبروں کی افادیت مسلم ہے۔ اعلیٰ سطح پر زبان و ادب کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے لئے بھی "ہم عصر اردو ادب نمبر" سے استفادہ ناگزیر ضرورت ہو گی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی ان سے رہنمائی حاصل کریں گی۔

شاعر کا اپنے معیار پر اس شان سے نمبروں کا شائع کرتے رہنا بڑی تقویت کا باعث ہے۔ شاعر کا یہ نمبر موضوعات کا تنوع ہر موضوع پر بھرپور انداز کی تحریریں اور نمبر کی ترتیب ہر پہلو تعریف کے قابل ہے۔ اس عالیشان نمبر کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

● 102, AVAS VIKAS COLONY
GORAKHPUR (U.P.)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مکتوبات

شاعر کے ہر نئے شمارے پر قارئین شاعر کے خطوط میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ابھی جون اور جولائی کے شماروں پر کئی اہم خط اپنی اشاعت کے منتظر ہیں۔ اگست کے شمارے پر موصولہ خطوط میں سے چند ایک گزشتہ شمارے میں شامل تھے۔ اب نومبر کی اس تازہ اشاعت میں اگست شمارے کے بارے میں کچھ اور خط دئے جا رہے ہیں۔ ابھی ستمبر کے شمارے پر آراء موصول ہو رہی ہیں۔ ایک اہم اور بہت اہم بات یہ ہے کہ محترم علی سردار جعفری کے انتقال کے بعد ادارہ شاعر کو تعزیتی خطوط موصول ہوئے اور خاصی بڑی تعداد میں آئے، ساتھ ہی تعزیتی مضامین اور تعزیتی منظومات بھی موصول ہوئیں۔ اب ستمبر کے شمارے میں جعفری صاحب کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے تو اس کے حوالے سے بھی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ہم فی الحال اس موقف میں نہیں ہیں کہ جعفری صاحب پر کوئی خصوصی شمارہ ترتیب دے سکیں۔ ہم سے تعزیت کرنے والوں کا بہت شکریہ کہ یہ سانحہ ہم سب کا سانحہ ہے، اردو کا، ہندی کا، ہندوستان کا بلکہ ایک عالم کا سانحہ ہے کہ جعفری صاحب اس دنیا کی ایک اہم شخصیت تھے۔

گذارش۔ ایک التماس

قارئین شاعر سے درخواست ہے کہ وہ 'مکتوبات' کے لئے علاحدہ سے خط لکھیں اور سرنامے پر 'مکتوبات' لکھ دیں۔ اپنا خط صاف، واضح اور روشن لکھیں۔ عام طور پر قلم کار و قارئین ایک ہی سانس میں سارا کچھ کہہ جانے کی کوشش میں ہمارے کاموں کو الجھا دیتے ہیں۔ اس طرح بعض اہم خط اِدھر اُدھر فائلوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ڈاک کا زبردست انبار رہتا ہے۔

لہٰذا ایک ہی خط میں رسالے کے بارے میں اپنی تخلیقات کے بارے میں، خریداری کے بارے میں یا دیگر ضروری غیر ضروری امور پر لکھنے سے سوائے الجھاوؤں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جواب میں تاخیر ہوتی ہے، کام بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا نہ کیجئے۔ کفایت شعاری اچھی عادت ہے لیکن ایسی بھی کفایت کس کام کی جس سے کسی کا بھی بھلا نہ ہو۔ لہٰذا شاعر کے مندرجات پر اپنی گرانقدر رائے، تاثرات وغیرہ ایک علاحدہ کاغذ پر برائے 'مکتوبات' لکھ کر ارسال کیجئے تاکہ آپ کے شذرات بروقت شامل اشاعت ہو سکیں۔

سلطان جمیل نسیم

اگست کے شمارے میں آپ کا اداریہ "اردو چینل" وقت کی ضرورت کی جانب ایک اہم تجویز ہے۔ اردو چینل کے عنوان سے غالباً دبئی سے ایک نئے چینل کا آغاز تو ہوا ہے جو پاکستانی ڈرامے، فلمیں اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی فلمیں بھی دکھا رہا ہے۔ محض اردو چینل نام رکھ لینے سے کام نہیں چلتا۔ اردو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے سوال تو رسم الخط کا ہے۔ یعنی اردو لکھنے اور پڑھنے کی بھی ایسی زبان ہو جائے جو پوری بولتی اردو دنیا میں پڑھی اور لکھی جائے۔ بہر حال ایسا جب بھی ہوگا۔ اردو لکھنے پڑھنے والوں کا خواب اور اس خواب کی طرف شاعر کی رہنمائی۔ حقیقت کا روپ بن کر سامنے آئے گی۔

● A1-49, BLOCK-3 GULSHAN-E-IQBAL
KARACHI-5300 (PAK)

عذرا پروین

اداریے سے آخری صفحے تک ابھی سرسری دیکھا ہے۔ اردو چینل پر آپ کی فکر مندی نیچرل ہے۔ احمد سہیل کی نظم اور ادبی فیچر اچھا ہے۔ عبدالرحمٰن عبد کی غزل بھی اچھی ہے۔ آخر میں سبھی مکتوبات بے حد فکر انگیز ہیں۔ خاص طور پر خورشید اکرم، پرکاش کپور اور بھرام سکلی مضامین سے زیادہ بے باک اور بے نہایت۔ بعض خطوط کا کاٹ دار لہجہ وہی ہے جو آپ کے یہاں ہے۔ سبھی کو اور ان خطوط کو جوں کا توں چھاپ دینے کی مبارکباد آپ کو بھی ضرور ملنی چاہئے۔ ان خطوط میں بہت سارے سچ ایک ساتھ اکٹھا ہو گئے ہیں۔ کئی نام تو ابھی ادب میں بہت قد آور نہیں مگر ان کی تحریر کا قد، قد آوری سے بڑا ہے۔

● P.O. BOX 32, H.P.O.
CHOWK-LUKHNOW-226003 (U.P.)

احسان سہگل

"شاعر" ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ورنہ دیگر رسائل کی صورت حال یہ ہے کہ کبھی تاخیر سے ملتے ہیں اور کبھی ملتے ہی نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں آپ واقعی داد کے مستحق ہیں۔ کیونکہ کئی دشواریوں کے باوجود آپ کا رسالہ وقت پر شائع ہو جاتا ہے۔ اگست ۲۰۰۰ء کا "شاعر" ملا۔ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ آپ کی محنت کا ہر کوئی معترف ہے۔ آپ واقعی بہترین انتخاب پیش کرتے ہیں۔

اس دفعہ "شاعر" میں محترم محمد سعید اظفر چغتائی کی چھ عدد رباعیات شائع ہوئی ہیں۔ جو اپنے مفہوم کے ساتھ بہترین رباعیاں ہیں۔ لیکن مجھے پہلی دو رباعیات کے اوزان سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ان دو رباعیات کے اوزان رباعی کے مخصوص ۲۴ اوزان میں سے نہیں ہیں۔ پہلی رباعی۔

"پانی وہ رواں کہ جس سے امرت شرمائے"

کا وزن یہ بنتا ہے۔ "مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعلین۔ فعلن۔" جو رباعی کے وزن میں نہیں ہے۔ کیونکہ اس رباعی کے عروض و ضرب میں ایک جز اضافی ہے۔ جسے غزل یا نظم میں ادبی کراہت کے ساتھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رباعی میں ایسا نہیں ہے۔ چغتائی صاحب نے یقیناً عروض و ضرب میں شرمائے کے مائے کو اور سائے اور جائے کو فاع کے وزن پر باندھا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری رباعی میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یعنی "گر تاج محل نیا نہ کوئی بن پائے" کے عروض و ضرب میں بھی ایک جز اضافی ہے۔ جس کی وجہ سے رباعی کا وزن بدل گیا ہے۔ البتہ اسی رباعی کے تیسرے مصرع کا وزن درست ہے۔ ان دو رباعیات کو قطعات کہیں تو بہتر اور مناسب لگتا ہے۔ یہ ایک نیا وزن بن گیا ہے۔ جسے عروضی اجتہاد سے تعبیر کرنا بے جا نہیں۔

VONPELSTRAAT-5, 2513 EN,
HE HAGUE, HOLAND.

غلام نبی مومن

"شاعر" کا اگست ۲۰۰۰ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ اس شمارے میں سید اقبال امروہوی صاحب کا ایک گراں قدر مضمون اردو میں سائنسی ادب اور اصطلاحات شامل ہے۔ سائنس و دیگر علوم و فنون کی اصطلاحات کے معیار کے تعین کے بارے میں ان کی رائے یقیناً وقیع ہے۔ موصوف نے قومی کونسل کی تیار کردہ فرہنگِ اصطلاحات کی غلطیوں، خامیوں کو مثالیں دے کر واضح کیا ہے۔ اس کے آخری پیراگراف میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ درسی کتب میں قومی کونسل کی تسلیم شدہ اصطلاحات ہی کا استعمال کیا جائے۔ مہاراشٹر ٹیکسٹ بک بیورو، پونہ سے شائع ہونے والی درسی کتابوں میں جو اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں ان کے بارے میں متعلقہ مضمون اور زبان کے ماہرین سے صلاح و مشورہ کیا جاتا ہے۔ قومی کونسل کی فرہنگ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ فرہنگ اصطلاحات

ثانیہ، کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد ہی کسی اصطلاح کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی اصطلاح کے غلط ہونے کو واضح کر دیا جائے تو ادارہ اس اصطلاح کو تبدیل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اگر موصوف مہاراشٹر میں شائع شدہ سائنس کی درسی کتب (سوم تا ہشتم) میں استعمال کردہ غلط اصطلاحات کی نشاندہی کر دیں تو ادارہ ان کا شکر گزار ہوگا۔ حسنِ اتفاق ہے کہ ہم نے اسی مہینے آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جو سائنس کی مروّجہ درسی کتب کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ کمیٹی میں تجربہ کار اساتذہ، سائنس مضمون کے ماہرین اور مترجمین شامل ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں کتابوں میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اسی طرح چھ افراد پر مشتمل ایک دوسری کمیٹی ریاضی کی درسی کتب کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اگلے برس تاریخ و جغرافیہ کی درسی کتب کا جائزہ لینے کا پروگرام ہے۔

اصطلاحات کی تشریح و تفہیم پر مشتمل فرہنگ سازی کی تجویز انتہائی اہم، بروقت، ضروری اور معقول ہے۔ ادارہ بال بھارتی (پونہ) سردست مراٹھی میں شہریت کی اصطلاحوں کی مجوزہ فرہنگ تیار کر رہا ہے۔ جو چند مہینوں میں شائع ہو جائے گی۔ اب یہ اردو والوں کا کام ہے کہ اس فرہنگ کو اردو میں شائع کروانے کی کوشش کریں۔

● URDU OFFICER, M.S. BUREAU OF TEXT BOOK BALBHARTI, S.B. ROAD, PUNE - 411004 (M.S.)

اندر موہن کیف

شاعر بہتر سے بہتر ہو رہا ہے۔ اس شمارہ میں عشرت قادری۔ محمود سعیدی۔ لطیف شاہد۔ اشرف شاد اور عبدالاحد ساز کی غزلیں بہت خوب ہیں۔ نظمیات میں ڈاکٹر منیرپال آنند اور ایک دو نظمیں تنہا تماپوری کی فکر انگیز ہیں۔ آپ نے مابعد الجدید کی بحث چھیڑ کر قارئین کو پھر الجھا دیا۔ کیا مابعد الجدید، جدید شاعری کا ہی ایک قدرے ترقی یافتہ روپ نہیں ہے؟ بال کی کھال اتارنے والی بات ہے۔ بہر صورت خالد عبادی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ نصیرالدین احمد کا افسانہ کچا علم بھی اچھا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن کی غزل پسند آئی۔ عین رشید کی نظم تو خاصی ہے مگر ایک جگہ "ختم" کا تلفظ غلط باندھ گئے ہیں۔ بہر صورت مجموعی اعتبار سے آپ کی کوششیں بار آور ہوتی ہیں اور مبارک کی مستحق ہیں۔

● 96/8 CIVIL LINES, JHANSI (U.P.)

نصرین بانو

شاعر کا اگست ۲۰۰۰ء شمارہ آپ کے خط کے ساتھ دیکھنے کو ملا۔ اس رسالے کے منفرد مزاج اور ادب سے متعلق سنجیدہ گفتگو سے غالباً پہلی بار متعارف ہوئی۔ اب تک اس کے مطالعے سے محروم رہنے کا پچھتاوا ہوا۔ شمارے کے مطالعے سے علم ہوا کہ اردو چینل کے حوالے سے آپ نے پہلے بھی قاری کو متوجہ کیا ہے اور اردو کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اردو سٹیلائٹ چینل سے متعلق جو سوال اٹھائے ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ اس پر بھی سنجیدہ گفتگو ہونی چاہیئے اور اس سے متعلق ایک واضح خاکہ مرتب ہونا چاہیئے۔ تاکہ کوئی مثبت اور نتیجہ خیز پہلو سامنے آسکے۔

اردو میں سائنسی ادب اور اصطلاحات اور ادبی فیچر کے تینوں مضامین اچھے اور معلوماتی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے خالد عبادی نے جو اشعار پیش کئے ہیں اس کی نہ تو ترتیب سمجھ میں آئی اور نہ ہی اس کی ضرورت، اس کی وضاحت کر دیتے تو شاید کچھ بات پلے پڑ جاتی۔ واہی صاحب کا مضمون اردو ادب میں طنز و مزاح کا فن اچھا ہے۔ یہ فن ریاضت اور حوصلہ چاہتا ہے۔ اس فن میں زیرناکی، فکر انگیزی، دل سوزی اور دردمندی چاہیئے۔ آج کے فنکار میں یہ کمیاں کھٹکتی ہیں۔

افسانے میں کچا علم، بے آواز صدائیں پسند آیا۔ بے آواز کا یہ جملہ اچھا لگا۔ آداب آج آپ دیر سے اٹھے۔ وہ معمول کی طرح مسکرائی۔ اس کا مسکراتا چہرہ مجھے ہمیشہ بھلا لگتا رہا ہے مجھے خوش مزاج عورتیں پسند ہیں۔ اس معاملے میں میں خوش نصیب ہوں۔ رستوگی کی مسز کی تیوریاں ہمیشہ چڑھی رہتی ہیں۔ درد بھری زمین کی گرفت مضبوط ہے۔ عطا عابدی کا ہائیکو بہت پسند آیا۔ خصوصاً۔ اونچے بندوں سے ہم نے سیکھی ناموانی، دانشمندوں سے، دیگر غزلیں نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ پروف پر دھیان دینا بہت ضروری ہے۔ عنوان میں غلطیاں ہوں تو اسے کیا کہا جائے۔ اردو چینل کے بجائے اردو چینل اور واہی صاحب کے مضمون میں بھی اردو اردو ہو گئی ہے۔

● FLAT NO. 182, ROAD NO.6 R. BLOCK, PATNA-800001

شکیل انجم

اگست کا "شاعر" تخلیقات کے اعتبار سے اچھا تھا۔ خصوصی طور پر مابعد جدیدیت پر مباحثی مضامین جو اردو ادب کو صحیح اور مثبت سمت دینے میں بہت معاون ثابت ہوں گے بہتر لگے۔ اس کے علاوہ احمد صغیر کی کہانی "درد بھری زمین" بہت پُر اثر اور معنی خیز ہے۔ سید اقبال امروہوی کا مقالہ "اردو میں سائنسی ادب اور اصطلاحات" منفرد نوعیت کا ہے۔ اگر ہم اردو زبان کو جدید خطوط پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور اسے بین الاقوامی درجہ دلوانا چاہتے ہیں تو اس طرح کے مضامین کی اشد ضرورت ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی مناسب ہیں مگر بیچ بیچ میں آنے سے ترتیب کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔

● IDARA BAZM-E-SADIQ, HYDERABAD 21/A, LATIFABAD-N, HYERABAD (PAK)

محمد قمبر علی خان

اگست کا شمارہ پڑھ کر دیکھ کر اٹھا تو آپ یاد آگئے۔ یہ آپ کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ جدیدیے تو بہت ہیں مگر شاعر کی بات جدا ہے۔ مابعد جدیدیت پر بھاری بھرکم مضامین شائع کریں اب اس خلجان سے قاری کو نکالیں۔ سید اقبال امروہوی کا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ ابھی ایسے مضامین کی ضرورت ہے۔ ہم بدلتی ہوئی دنیا کا عکس دیکھتے ہیں، چہرہ بھی دیکھنا ضروری ہے۔ کہانی۔ درد بھری زمین پسند آئی۔ شعری حصہ ٹھیک ہی ہے۔ البتہ ایک شعر بے حد پسند آیا۔

تصدیق جو تو نے مرے ہونے کی ابھی کی
یہ سوچ کہ میں نے بھی یہ سوچا ہے کہ میں ہوں

ہمیشہ کی طرح جرعات پڑھ کر آپ کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے اور آپ کی روشن خیالی پر افتخار کرنا چاہتا ہوں۔

● 3, BHIKANPUR, BHAGALPUR 812001 - BIHAR

رضوان علی رضوان

"جرعات" کے تحت آپ کے خیالات سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ ادبی فیچر کے تحت مقالے بے حد دلچسپ اور حقائق پر پڑے پردے اٹھائے ہوئے محسوس ہوئے۔ افسانوں میں "بے آواز صدائیں" (حسن جمال) اور درد بھری زمین احمد صغیر نے بے حد متاثر کیا۔ گھر کو بانٹنے والے افراد ایک ماں کو کس طرح تقسیم کریں گے؟ احمد صغیر کا یہ سوال موجودہ علیحدگی پسند عناصر سے جواب طلب ہے۔ اردو میں سائنسی ادب اور اصطلاحات از حد معلوماتی مضمون ہے۔ سید اقبال امروہوی کے ذریعے اٹھائے گئے سوال پر اصطلاح ساز اداروں کو یقیناً غور و خوض کرنا چاہئے۔ نظموں میں خصوصیت چونکاتی ہیں۔ غزلیات کے کالم میں جہاں اچھی غزلوں سے محظوظ ہوا، وہیں فرید پرتی کی غزل نے بہت مایوس کیا۔ ان کی غزل کے پانچ میں اور آخری شعر کے مصرعہ

ہوئی خارج از بحر ہیں اور آ[illegible]ر کے مصرع ثانی میں
لفظ کی کی خامی کھٹکتی ہے۔ اگر [illegible] ردیف کی رعایت کی
جائے تو "کوب" کی جگہ "کوبو[illegible]ہیے تھا۔ بہر حال خامی
اگر شاعری ہے تو اسے "شاعر" جیسے مستند معیاری رسالہ
میں نہیں شامل کرنا چاہیئے تھا اور اگر یہ سب پروف ریڈنگ کی
کرشمہ سازی ہے تو بھی "شاعر" اپنی صحت مند روایات کی بنا
پر اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ اقبال خلش کی غزل اچھی
تھی مگر مقطع نے مایوس کر دیا۔

تخریب کی بلندیاں کہتی ہیں اے خلش
ہم ہیں تو اس زمین پہ پستی رہے گی کیا؟

میرے خیال میں اس شعر کو یوں ہونا چاہیئے۔

تخریب کی بلندیاں کہتی ہیں اے خلش
گر ہم نہ ہوں، زمین پہ پستی رہے گی کیا؟

کیونکہ ساری پستیاں تخریب کی بلندیوں کی ہی مرہون منت ہیں۔ "اردو ادب میں طنز و مزاح" (رضا نقوی واہی) کا مضمون بھی پسند آیا۔ میں ان کے اس خیال سے سو فی صد متفق ہوں کہ اعلیٰ طنز و مزاح کی پیشکش کے لئے فکری بنیاد ضروری ہے۔ معاشرے کی برائیوں کا پردہ فاش کرنا اور اسکی اصلاح کی ذمہ داری ہر فنکار پر عائد ہوتی ہے اور طنز و مزاح کا شاعر بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔ حالانکہ یہ کام کسی اور سے مختلف ہے۔ مگر ناچیز کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اصلاح قوم ہو نہ سکی مولوی سے جب
ہم کر رہے ہیں طنز کے پتھر اچھال کے

مکتوبات کا کالم بھی مضامین کا مزہ دے گیا۔ مبارکباد۔

● C/o. R.B. SCREEN PRINTERS
PAKKI SARAI ROAD, MUZAFARPUR (BIHAR)

محمد حامد انیس

شاعر (اگست ۲۰۰۰ء) نظر نواز ہوا۔ تمام خوبیوں سے بھرے اس رسالے کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اب تک میں ایسے عمدہ رسالے سے دور کیوں رہا۔ قارئین کے لئے یہ ایک دلچسپ، بامعنی، مفید اور معلوماتی رسالہ ہے۔

اگست کے شمارے میں ادب سے جوڑنے کے لئے جو اردو کلینک کی بات کی گئی ہے وہ ایک اچھا اقدم ہے۔ "شاعر" کا نثری اور منظوم دونوں حصے نہایت دلچسپ اور جاذب نظر ہیں۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے اور جو ہمارے نوجوان طلباء ہیں ان کے لئے یہ رسالہ کافی مفید ہے۔ انہیں اس رسالے میں ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ پائے کے ادیب اور شعراء کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ اس شمارے کے تینوں افسانے اچھے ہیں اور معنی خیز ہیں۔ لیکن مجھے احمد صغیر کا افسانہ "درد بھری زندگی" کافی پسند آیا۔ انہوں نے بڑے ہی موثر ڈھنگ سے زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے۔ ماں جسے قدرت نے اولاد کے لئے ایک بیش قیمتی تحفہ قرار دیا ہے۔ جو اپنی اولاد کی خاطر ان کی پرورش کی خاطر زندگی کی مشکل راہوں سے گذرتی ہے۔ زندگی کی مشکلوں اور تکلیفوں کے بارے میں اولاد کے لئے ماں تقویت دینے والی دوا کام کرتی ہے۔ جو اپنے بچے کے نازک جسم کو سردی گرمی سے بچاتی ہے۔ ان کے کمزور جسم میں طاقت پہنچانے کے لئے جسم میں بچا ہوا دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پلانے سے گریز نہیں کرتی۔ جو خود بھوکی رہ کر اولاد کو بھوکا نہیں رکھنا چاہتی۔ وہی اولاد زمین کے چند ٹکڑوں کے لئے کہ ماں کا قدیم زمین کا ٹکڑا ان کے نام کر دے۔ اس کے بعد وہ اپنی ماں کو تمام آرام پہنچانے کا لالچ دے کر پھسلانے کی ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں۔ ماں ان سب باتوں کو سمجھتی ہے اور ان کی ان حرکتوں پر رنجیدہ رہتی ہے اور اپنی بدقسمتی پر خون کے آنسوں بہاتی رہ جاتی ہے۔ عطا عابدی کے "ہائیکو" بھی اچھے لگے۔ اس کا ایک مصرعہ کہ "دانش مندوں سے سیکھی ہم نے نادانی" کافی معنی خیز ہے۔

● DEPARTMENT HINDI PARKASHAN,
BIHAR LEGILATIVE COUNCIL PATNA - (BIHAR)

ضمیر الدین ضمیر

شاعر اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں "ادبی فیچر" کے تحت عبدالمتین جامی نے شاعری کے حوالے سے جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک " روشن خیالی تاریخی حقائق کے تناظر میں حالات کا جائزہ مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ ویسے مابعد جدیدیت کی بحث کا دائرہ لامحدود ہے۔ شعری رنگ و آہنگ کے اعتبار سے نئی روش کو جدیدیت کی شاخ تصور کرنا لازمی ہے۔ اسی شمارے میں صفحہ ۱۴ پر آہ! مجروح سلطانپوری پر بڑے موصوف نے لکھا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر معروضی کام جو ادھورے پڑے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ایک کارنامہ ہوگا۔ ممبئی میں مجروح اکاڈمی کے تحت کچھ کام ہوا ہے۔ مجروح صاحب نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا مگر اپنے گھر میں اردو نہیں رکھی۔ میرے علم کے مطابق ان کی تخلیقات سے ان کی اولادیں محظوظ نہیں ہو سکیں گی کیونکہ وہ اردو کی حرف شناس نہیں ہیں۔ اردو کے شعرا و ادباء کی ایک جماعت ایسی بھی ہے۔ جنہوں نے اردو کو اپنے گھروں سے صرف اس لئے نکال باہر کیا ہے کہ کہیں اردو تعلیم انہیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ کر دے۔ پتہ نہیں کس خوف سے وہ اپنے بچوں کو اردو نہیں سکھاتے، پڑھاتے؟

● CHHATABAD KATRASQUARB
DHANBAD - 828113 (BIHAR)

تقی عابدی

گذشتہ ایک سال میں فلک پیر نے اردو ادب کے گراں قدر اور روشن چراغوں کو زمین سے اٹھا کر اپنے دامن میں ستاروں کے مانند ٹانک لیا۔ ضمیر جعفری، شوق، ثقلین نقوی سعید شہیدی، مجروح سلطانپوری اور سردار جعفری اس فہرست میں شامل ہیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

جبر حیات کا مختصر سا خاکہ جو آپ نے جرعات "تشنگی نہ ہو" کے ذیل میں لکھا اس کی تقریباً ہو بہو تصویر میں گذشتہ سال مرحوم ضمیر جعفری کی علالت کے دوران نیویارک میں دیکھ چکا ہوں ان کو بھی برین ٹیومر تھا۔ بقول مہاراجہ کشن پرشاد

کل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

جس طرح سیماب اکبر آبادی نے ہمارے دماغوں جھنجوڑا ہے۔ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے اسی طرح اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

مرنے والا مر چکا اور رونے والا رو چکا
وائے برہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

اسی لئے جن تجاویز کو بیان کیا گیا ہے اسے واجب کفا سمجھ کر صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ واجب عموی سمجھ کر سب انجام دینا چاہیئے۔ اردو کی نئی بستیوں کے بارے میں برطانیہ میں اردو کا مستقبل اتنا تاریک نہیں کیوں کہ اس دیار غربت میں بھی اتنا روشن بھی نہیں تھا جاں آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ج لوگوں نے برصغیر اور دولت کبیر میں اپنے مفادات کی خاطر ا راستے پر چراغ جلائے وہ ان کے اور ہمارے لئے بھی مفید ثابت ہوئے۔ انشاء اللہ شمالی امریکہ کی جدید اردو بستیوں پر معلومات روانہ کروں گا تاکہ آپ سب کے مشوروں سے تر میں تیز رفتاری پیدا ہو جائے۔ غزل پر تنقیدی مکالمہ جناب ش نواز کا بہت ہی خوبصورت اور تحقیقی ہے۔ وسعت بیان میں گہرائی و گیرائی ہمکنار ہیں۔ آج کل ہمارے تنقید نگاروں میلان زیادہ تر مغربی تحقیقات کی طرف جھکا ہوا ہے اگر چہ ماخو، تاریخی اور ادبی لحاظ سے اردو جتنی فارسی ادب کے قریب کسی اور ادب کے قریب نہیں۔ سبک ہندی کی بابت جو فہمیاں برصغیر اور یورو چین ادبی علماء کے پاس نظر آتی ہیں ا عالمانہ اور محققانہ بحث ڈاکٹر سیروس شمیسا نے اپنی شاہکار تصنیف "کلیات سبک شناسی" مطبوعہ تہران میں کی ہے جو سبک ہند سمجھنے کے لئے ضروری اور موثر ہے۔

HEALTH SCIENCES CENTER, 300
INCE PHILIP DRIVE, St. JOHNS,
WFOUNDLAND, CANADA, A1B 3V6

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

بھوپال: ادب کے آئینے میں (تنقید و تحقیق)

محمد نعمان خان

بھوپال ہندوستان کی ان چند مسلم ریاستوں میں سے ایک ہے جس کے سبھی فرمانروا نہ صرف خود عالم و فاضل تھے بلکہ انہوں نے علم و ادب کی خدمت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی ڈالی ہوئی مضبوط بنیادوں کا ہی نتیجہ تھا کہ بھوپال کی سرزمین نے سینکڑوں نامور عالم، ادیب اور شاعر پیدا کئے اور آج بھی وہاں علم و ادب کا چرچا ہے۔

خاص طور پر بھوپال نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں جو کارنامے انجام دیے ان پر ایک عرصۂ دراز تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی پہلے ادیب اور محقق ہیں جنہوں نے سیفیہ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد بھوپال کے علمی و ادبی کارناموں کو اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا اور تیس سال کی مسلسل کوشش کے بعد بھوپال کو نہ صرف از سر نو زندہ کیا بلکہ ایسے شاگر بھی پیدا کئے جو ان کے بعد ان کے اس ادبی کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس کتاب کے فاضل مصنف ڈاکٹر محمد نعمان انہیں کے شاگرد ہیں اور انہوں نے اس کام کو وہاں سے شروع کیا ہے جہاں ان کی شفیق استاد نے اس کو چھوڑا۔ ان کی کتاب "بھوپال ادب کے آئینے میں" ان کے اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

یہ گراں قدر کتاب فاضل مصنف کے دس ادبی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کے عنوان ہیں: (۱) بھوپال ایک تصویر دو رخ (۲) ریاست بھوپال کا پہلا صاحب دیوان فرمانروا۔ نواب جہانگیر محمد خان ادلہ (۳) بھوپال کا پہلا اردو تذکرہ۔ "تذکرۂ فرح بخش" (۴) بھوپال کا پہلا اردو اخبار۔ عمدۃ الاخبار (۵) بھوپال میں اردو افسانہ۔ ایک مختصر جائزہ (۶) بھوپال میں اردو نظم۔ آزادی کے بعد (۷) مدھیہ پردیش میں اردو صحافت۔ ایک جائزہ (۸) بھوپال کا ایک اہم اور منفرد تذکرہ۔ شبستانِ عالمگیری (۹) دیوان غالب کی ایک نادر شرح۔ مطالب الغالب اور سہا مجددی (۱۰) مکاتیب رشید احمد صدیقی بنام مخلص بھوپالی، ہر مضمون بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ان مضامین کی ترتیب میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد بھوپال کی پوری ادبی تاریخ ہمارے سامنے آجائے۔ ابتداء میں اپنی بات کے نام سے خود مصنف کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور سرزمین بھوپال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ بلاشبہ مصنف کی یہ کتاب بھوپال کی ایک مختصر مگر بہترین ادبی تاریخ ہے اور اس کو ہر لائبریری میں ہونا چاہیئے۔

ضخامت: ۱۵۱ صفحات ☆ قیمت: ۵۵ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۱۹۹۴ء ☆ ناشر محمد نعمان خان، ۵۶- ندیم روڈ بھوپال (مدھیہ پردیش) ☆ مبصر: حامد اللہ ندوی (مرحوم)

مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے (تحقیق)

راہی فدائی

زیر تبصرہ کتاب ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات ویلور (تمل ناڈو) کے تعارف و تاریخ اور بانی بانی ام المدارس شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری (۱۸۳۱ء-۱۹۱۹ء) کے حالات واقعات کی تحقیق کے علاوہ اس کے تقریباً دو سو سالہ زریں تاریخ کے تابناک نقوش اور اس کے وابستگاں کے علمی ادبی فضائل و کمالات کے تحقیقی تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے ان تمام شاعروں اور ادیبوں کے شخصی حالات اور علمی و فنی کمالات پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ جو بظاہر مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے ذہن کی آبیاری، فکری بالیدگی اور تعمق نظری کا منبع و مرکز بانی مدرسہ کی برگزیدہ شخصیت اور مدرسہ باقیات کا نورانی علمی ادبی ماحول تھا۔

جنوبی ہند کے ان علاقوں میں جہاں تمل، ملیالم، تیلگو اور کنڑ زبانیں رائج تھیں وہاں اردو جیسی غیر دراوڑی زبان کس طرح نہ صرف پھلی پھولی، بلکہ یہاں کی اردو داں آبادی میں ایسے ایسے شعراء ادباء اور باکمال حضرات پیدا ہوئے جن کی زبان دانی، مشق و مزاولت، اور فنی مہارت پر امیر و داغ جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ سخن نے بھی رشک کیا؟ یہ جاننے کے لئے ام المدارس اور اس کے دائرۂ اثر میں پروان چڑھنے والے دیگر مدارس خصوصاً دار العلوم لطیفیہ کے فیضان کا مطالعہ بہت ضروری تھا اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے دیدہ ریزی کے علاوہ اپنے مطالعے کے حاصل کو قارئین تک پہنچانے میں بڑے سلیقے کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ بانی ام المدارس بزرگان لطیفیہ سے نسبت رکھتے تھے اس لئے مدرسہ باقیات صالحات اور دار العلوم لطیفیہ میں مختصر سی مدت کی رقابت کے علاوہ ہمیشہ تعاون اور خیر خواہی کا جذبہ غالب رہا، جس سے اس پورے خطے کی نہ صرف روحانی علمی پیاس بجھی بلکہ اردو زبان و ادب کو نئی فضا، نئے ذہن اور نئی قلمرو بھی نصیب ہوئی۔

ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۶ء ☆ رابطہ: ابوالحسان اکاڈمی، ۶/۱۸۴، برہان الدین اسٹریٹ، کڑپہ-۵۱۶۰۰۱ (آندھرا پردیش) ☆ مبصر: شمیم طارق

حمد نامہ (حمدیہ شاعری)

ضیا حیدری

پاکستانی شاعرہ ضیا حیدری کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے لیکن ایک خاتون کا پہلا حمدیہ مجموعہ ہے اس لحاظ سے یہ حمد نامہ ایک کارنامہ ہے۔ اس میں نظمیں، مسدس اور اللہ تعالیٰ کے ہر ایک نام اور اس کی تعریف و تشریح کے ساتھ ایک قطع درج ہے جو شاعرہ کے ایمان و اعتقاد کا عکاس ہے۔ اور اسی کو انہوں نے اپنی شاعری بنایا ہے۔ اپنے جذبوں اور اپنی سوچ کی تخلیقی صورتوں میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔

ضخامت: ۱۹۲ صفحات ☆ قیمت: سو روپے (پاکستانی) ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ ناشر: نفیس الرحمٰن حیدری ☆ زیر اہتمام القلم۔ این پبلی کیشنز کراچی (پاکستان) ☆ مبصر: محمد حفیظ جوہر

تصویریں اجالوں کی (قلمی مرقعے)

نور الحسن نقوی

اقبال، سرسید، نذیر احمد، مصحفی، غالب اور جرأت کے فکر و فن پر اپنے قلم کے جوہر دکھانے کے بعد نور الحسن نقوی نے چند اہم ہستیوں کے قلمی مرقعے پیش کئے ہیں جن میں مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، آل احمد سرور، علی محمد خسرو، سید حامد اور کرنل بشیر حسین زیدی وغیرہ شامل ہیں۔ سبھی مرقعے دلچسپ ہیں اور فنکارانہ چابک دستی سے لکھے گئے ہیں۔ دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"منٹو کی طرح اپنے کردار کا 'موڈرن' کرنے کے لئے ان کے (مصنف کے) پاس کوئی استرا نہیں ہے۔ منٹو کے خاکوں "گنجے فرشتے" پہ یہ چوٹ کی گئی ہے جس سے

مجموعہ میں یہ بحر ہے اور بری طرح کھٹکتی ہے۔ کتابت اور طباعت گوارہ ہے۔

ضخامت: ۲۰۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۹ء ☆ تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ-۲۰۰۰۲ (یوپی) ☆مبصر: مظفر حیدر

چاند چراغ (شاعری)

کمار پاشی

"چاند چراغ" کمار پاشی کا تازہ شعری مجموعہ ہے، جو ان کی وفات کے دو سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے سے بھی اس بات کی تائید و توثیق ہوتی ہے کہ پاشی ٹوٹی ہوئی قدروں کے نہیں ٹوٹتی ہوئی قدروں کے شاعر ہیں۔ شاعری ان کے نزدیک ماضی کے آئینے میں، حال کی آنکھ سے، مستقبل کا عکس دیکھنے کا عمل ہے۔ ثقافت کے ساتھ سیاست کی بدسلوکی اور فرد کی بیچارگی ان میں ایک تخلیقی احساسِ شکست پیدا کرتی تھی۔ ان کی تخلیق کا سوتا تہذیب اور تاریخ کے تصادم اور ناخوشگوار نتائج سے پھوٹتا تھا۔ تاریخ کی چیرہ دستیوں کے سبب تہذیب میں آنے والی تبدیلیاں انہیں حال سے نبرد آزما ہونے کی تحریک دیتی تھیں۔ ان کے اس طرح متحرک ہونے کو رجعت پسندی یا رجعت القہقری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کا سروکار زندگی اور تہذیب سے تھا۔ تہذیب، جو زندگی کرنے کا ہنر سکھانے کے ساتھ ساتھ دوسرے سیاقوں سے فرد کے رشتوں کو تعین اور انہیں بنانے کی تادیب کرنے کا نام ہے، پر جب ضرب لگتی تو وہ بلبلا اٹھتے تھے۔ شاید اسی لئے ان کے یہاں فرد کی تنہائی کا سبب مشینی معاشرے کی بے تکان تگ ودو اور بڑھتی ہوئی قربت میں سمٹتی ہوئی انسانیت نہیں بلکہ تہذیب کی وہ ٹوٹتی ہوئی اقدار ہیں جن سے شخصیت کی تشکیل و تعمیر اور شخص کی شناخت پیدا ہوتی ہے جو اسے اجتماع میں انفرادیت کا اعزاز عطا کرتی ہے۔ سیاست کے ہاتھوں منتشر و منقسم ہوتے معاشرے کا فرد بار بار عہدِ عتیق کے حوالوں سے خود کو بازیافت و دریافت کرتا ہے لیکن قدیم قدریں موجودہ معاشرے میں اس کی معاون نہیں ہوتیں اور وہ سراسیمگی کے عالم میں مبہوت ہو جاتا ہے۔ عہد عتیق کے حوالے سے اپنے وجود کا جوڑ ڈھونڈنے کے سبب ہی شاید پاشی کو میرا جی کی توسیع قرار دیا گیا لیکن ان دونوں میں بنیادی بصیرت کا فرق ہے۔ میرا جی آریوں کی ہجرت پسندی یا ہجرت زدگی کو اپنی شعری اور شخصی آوارہ گردیت کی اساس گردانتے تھے جب کہ پاشی کی دلچسپی ہجرت کے سبب مجبور اور کسی مقام پر پہلے سے مقیم منضبط معاشرے کے ٹوٹنے، بکھرتے اور بھٹکتے فرد کی بیچارگی میں ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک ہندوستانی کلچر کا انسانی و امتیازی وصف "انجذاب" وصف حمیدہ کی بجائے مجبوری محض ہے اور ان کی شاعری کا بنیادی عنصر فاتح کے ہاتھوں مفتوح کی مغلوبیت اور محرومیت کا انکشاف ہے۔ ایسے میں میرا جی کا عہدِ عتیق یا آریوں سے انس ایک رومانی لگاؤ ہے جو بعض اوقات تخلیقیت کے لئے مفید بھی ثابت ہوتا ہے لیکن وہ ہوتا سطحی نوعیت ہی کا ہے، جب کہ پاشی کے یہاں وہ ایک کرب سے عبارت ہے۔ مجموعے کا اولین فلیپ، جو "پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میں مخمور سعیدی نے لکھا ہے:

"گندھے دنوں کا قصہ" اور "ولاس یاترا" دونوں نظمیں پاشی کے اس احساس کی ترجمان ہیں کہ جب ایک تہذیب دوسری تہذیب پر غالب آتی ہے تو وہ اس کی پاکیزگی کو مجروح کرتی ہے۔ ہم ان دونوں نظموں کو دو حوالوں سے سمجھ سکتے ہیں: دراوڑ تہذیب پر آریاؤں کی یلغار یا پھر آریہ اقدار پر ان مسلمانوں کا حملہ جن میں سامی اور آریائی اثرات گڈمڈ ہو گئے تھے۔"

ہم چاہیں تو کرستانی تہذیب کی یلغار کو بھی اس میں شامل کر سکتے ہیں جس کے سبب ایک مضبوط و مخلوط کلچر نہ صرف یہ کہ منقسم ہو گیا بلکہ جس کی تعلیم و تادیب کے سبب تہذیبی اقدار اور تاریخی حقائق بھی مسخ ہو گئے۔ خیر، تو اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاشی اسطور سازی کا نہیں بلکہ تہذیب کی تاریخ کے ہاتھوں ہوتی بے حرمتی و شکست کے سبب منضبط معاشرے کے منتشر ہوتے افراد کے احساس کا شاعر ہے۔

"چاند چراغ" دو حصص میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں نظمیں ہیں دوسرے میں غزلیں۔ مذکورہ بالا باتوں کے تناظر میں اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مجموعے کی غزلیں جہاں سیاست اور ثقافت کے تصادم اور ثقافت کی ہوتی شکست کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں وہاں نظمیں تہذیب اور تاریخ کے تصادم اور اس کے ناخوشگوار نتائج کا فنی اظہار ہیں۔ پاشی ہی کی نہیں سچی اور اچھی شاعری کو پسند کرنے والوں کے لئے بھی اس مجموعے کا مطالعہ ناگزیر ثابت ہوگا۔

ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ساٹھ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۴ء ☆ ناشر: سطور پرکاشن، ۱۷/۳۳، دہلی گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ☆مبصر: شین کاف نظام

تخلیق (خلیجی ریاستوں میں اردو)

مدیر: اظہر جاوید

۱۹۷۵ء سے رسالہ شاعر میں اردو کی نئی بستیوں کو موضوع کیا جا رہا ہے۔ ان بیس بائیس برسوں میں شاعر کے صفحات پر یہ موضوع اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ان سب کی یکجائی ایک مبسوط کتاب بن سکتی ہے۔ تنہا 'ہم عصر اردو ادب نمبر' (جلد اوّل) میں سے بھی اگر انتخاب کیا جائے تو وہ بھی ایک اچھی خاصی کتاب کا لوازمہ ہوگا۔ اس موضوع کو ہند و پاک کے بیشتر ادبی رسائل نے اپنا موضوع بنایا ہے اور اپنی اپنی بساط بھر کام بھی کیا ہے اور اب تو یہ ایک کاروبار بن گیا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر بعض ادبی رسائل کے مدیران سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر کام بھی کر رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں ماہنامہ تخلیق (لاہور) کا خلیجی ریاستوں میں اردو نمبر شائع ہوا ہے۔ ادبی رسائل کے مدیران میں اظہر جاوید بہت حساس، کھرے اور سچے مدیر ہیں۔ بے حد جذباتی اور انا آبار انسان ہیں۔ مذکورہ نمبر کا جو خاکہ انہوں نے بنایا تھا وہ ایک مثالی خاکہ تھا۔ کئی برسوں سے اس خاص نمبر کا انتظار ہو رہا تھا۔ امید کی جا رہی تھی کہ تخلیق کا یہ خاص نمبر ایک گرانقدر تخلیقی، تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہوگا لیکن ایسا ہوا نہیں اظہر جاوید پہلے مدیر ہیں جنہوں نے نہایت ہی ایمانداری اور سچائی کے ساتھ اپنا شکست نامہ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی روح کی روشنی میں اپنی بات کو لکھا ہے۔ پوری تحریر خاص نمبر کی جان ہے بلکہ یہ تحریر ان تمام بے لوث خادم ادب کی آواز ہے جو اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں مگر جنون سے بھی آگے کسی ثمر کے بغیر۔ تخلیق کا یہ خاص نمبر اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود اپنی سی ایک کوشش بھی ہے کہ فی زمانہ اس نوع کے گھاٹے کا سودا کرنے والے جیالے خال خال رہ گئے ہیں ورنہ آج اپنے معمولی سے معمولی "کام" کو عظیم کام کہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ تخلیق کے اس موضوعاتی خاص نمبر میں نیا کچھ نہیں ہے اور جو کچھ ہے بھی تو اس میں کوئی تخلیقی "ترتیب" نہیں ہے۔ اس کا عنوان خلیجی ریاستوں میں اردو کے بجائے خلیجی ریاستوں میں اردو ادب ہونا چاہئے تھا۔ اس نمبر کے مطالعے سے خلیجی ممالک میں اردو بہ حیثیت زبان کے کوئی معلومات فراہم نہیں ہوتیں اس خاص نمبر میں مطبوعہ مضامین بھی شامل کئے جاسکتے تھے۔ ایسے ہی مضامین میں وہ پانچ مقالے بھی ہیں جو ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی مرتب کردہ کتاب 'بیرون ممالک میں اردو' (۱۹۹۶ء) میں شامل ہیں جبکہ تخلیق کا خاص نمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں دوسروں پر انحصار کرنا ہی پڑتا ہے لیکن مدیر کو بھی اپنا آپ پوری طرح کھپانا پڑتا ہے۔ 'ہم عصر اردو ادب نمبر' اس کی ایک مثال ہے۔ بہر حال تخلیق کا یہ خاص نمبر آج کے ایک مثالی مدیر اظہر جاوید کی ایک ایسی کوشش ہے جو اپنے موضوع پر ہمیشہ ہی حوالے کا کام دے گی۔ اس خاص نمبر کی مہمان مدیرہ لبنیٰ جاوید منظور ہیں۔ ضخامت: ۴۸۰ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے (پاکستان میں) ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: بھگوان اسٹریٹ، پرانی انار کلی، لاہور ۵۴۰۰۰ (پاکستان)

☆مبصر: افتخار امام صدیقی

رفتار

ادبی ، علمی ، تہذیبی و ثقافتی عالمی منظر نامہ

"۱۹۳۰ء میں رسالہ شاعر آگرہ سے جاری ہوا تو اس میں دیگر مستقل عنوانات میں سے ایک کالم مختلف النوع خبروں کا بھی تھا ۔ پھر یہی کالم اپنے روپ بدلتا ہوا بعد میں رفتار کے عنوان میں منتقل ہوکر شاعر کی تیسری نسل تک چلا آیا ۔ لیکن حالیہ برسوں میں اس کالم کو محض اس وجہ سے عارضی طور پر بند کرنا پڑا کہ ہر ادبی رسالے اور اخبار نے اپنے اپنے طور پر خبریں دینا شروع کردیں اور تقریباً ایک جیسی خبریں یہاں وہاں شائع ہونے لگیں ۔ اس سے رسالہ شاعر اور اس کے تاریخی کالم ' رفتار ' کی اپنی انفرادیت متاثر ہونے لگی ۔ اس دوران ہم اپنے اس کالم کے بارے میں غور کرتے رہے کہ اب اسے دوبارہ کس روپ میں شروع کیا جائے اور اس میں شاعر کی اپنی انفرادیت کیا ہو ۔ اس تجدید میں قارئین شاعر کے لئے نئی دلچسپی اور تجسس کو کس طرح روشن کیا جائے ؟ بہت عام میکانکی سلسلے کو کس طرح توڑا جائے ۔ یہ سب کچھ ابھی زیر غور ہے ۔ فی الحال کالم ' رفتار ' کی تجدید اشاعت کا یہ غیر واضح اولین روپ ہے ۔ اس میں مزید تبدیلیاں کی جائیں گی جو قارئین شاعر کے مشوروں کی روشنی میں ممکن ہوں گی ۔ اردو کا عالمی منظر نامہ بہت تازہ کار ، زندہ اور متحرک ہو، یہی ہماری کوشش رہے گی ۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ہندو پاک اور اردو کی نئی بستیوں کے قلم کار حضرات اپنے زیر تکمیل غیر معمول علمی وادبی کاموں کے بارے میں اطلاعات فراہم کریں ۔ بڑے ادارے تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کی اطلاع دیں ۔ ایسی سرگرمیاں جن کی کوئی اہمیت ہو ۔ ایسی اہم خبریں جو اردو زبان وادب کے لئے ،ادب کے طلباء کے لئے اور قارئین شاعر کے لئے ہر زاویے سے مفید ہوں ۔ اس ضمن میں یہ کرر واضح کردینا ضروری ہے کہ معمولی سطحی ، میکانکی ، مقامی اور محض خانہ پری کرنے والی خبریں اور اطلاعات ازخود نظر انداز کی جائیں ۔ اس کالم میں جو بھی لازمہ دیا جائے گا اس کے لئے ادارۂ شاعر قطعی آزاد ہوگا ۔ ہم جیسے شاعر اور اس کے بے شمار قارئین کے لئے مناسب سمجھیں گے اسی خبر ، اطلاع یا معلومات کو شائع کریں گے ۔

عموماً ہم اپنے ان مشاہیر قلم کاروں کی علمی وادبی سرگرمیوں سے لاعلم رہتے ہیں جو پرنٹ میڈیا اور خبروں سے الگ نہایت ہی خاموشی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں ۔ خبروں سے باہر دراصل یہی لوگ زبان وادب کے سچے خادم ہوتے ہیں ورنہ تو شور مچانے والے فن کاروں کی کمی نہیں جو تصویروں ، خبروں ، جلسوں ، سیمیناروں ، محفلوں ، اداروں ، میٹنگوں وغیرہ میں ہر جگہ موجود اپنے آپ کو نمایاں رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں ۔ اپنے لئے خبریں بناتے رہتے ہیں ۔

ادھر انٹرنیٹ پر اتنے ویب سائٹ جمع ہوگئے ہیں کہ پوری دنیا لمحہ بہ لمحہ اس طرح سمٹ گئی ہے کہ رواں دواں حقیقی دنیا اس کے آگے محدود ہونے لگی ہے ۔ خبر سے گھر تک سب کچھ دستیاب ہے ۔ اردو غزل اور اردو زبان وادب کے بارے میں بھی انٹرنیٹ پر بہت کچھ موجود ہے ۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی مثلاً ایک ویب سائٹ ۔WWW.URDUSTAN.COM آپ کو ہر طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو زبان وادب کے متعلق انٹرنیٹ پر جتنے بھی ویب سائٹ ہیں ان کا تعارف شاعر میں پیش کیا جائے تاکہ پوری اردو دنیا اس سے استفادہ کرسکے ۔ انہیں تازہ ترین معلومات فراہم کرسکے ۔ ہندو پاک کے کئی بڑے اردو اخبارات انٹرنیٹ پر آگئے ہیں ۔ لیکن بڑے ادبی رسائل ابھی انٹرنیٹ پر نہیں آئے ہیں ۔ معاصر اردو شعراء یا معاصر اردو شاعری بھی انٹرنیٹ پر کم کم دستیاب ہے ۔

بہرحال ! رفتار کے حوالے سے مکالمہ جاری رہے گا ۔ رفتار کے لئے آپ کا بھرپور تعاون اور گرانقدر مشوروں کا بھی انتظار رہے گا ۔(الف الف)"

مظہر امام : ان دنوں اپنی شاعری کا کلیات مرتب کر رہے ہیں۔

ابو محمد سحر : ہاتھوں میں رعشہ آجانے کے باوجود اپنے تحقیقی ولسانی مضامین کی یکجائی اور ایک نئی کتاب (علمی کتاب ہندی رہندوی پر ایک نظر) کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

فضیل جعفری : شاعر، نقاد، صحافی ایک بار پھر اردو کے ایک بڑے روزنامے انقلاب (ممبئی) کے مدیر بنادیے گئے ہیں۔

رشید حسن خاں : اپنا نیا تحقیقی معرکہ ٹھگوں کی زبان کا مکمل لغت کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ اس سے قبل املائے غالب کی آمد آمد ہے۔

انصار اللہ نظر : تاریخ ادب اردو (۱۷۰۰ء تا ۱۸۰۰ء) کی جلد اوّل (۱۷۰۰ء تا ۱۷۵۰ء) میں مصروف ہیں۔ وہ ہر اہم مرکز کا حال الگ الگ لکھنا چاہتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی : اپنی علالت کے ساتھ رسالہ "شب خون" کو صحت مند رکھنے اور اپنے علمی وادبی کاموں میں مصروف ہیں ۔ حالیہ تصنیف ' اردو کا ابتدائی زمانہ' سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

یعقوب راہی : مراٹھی نظموں کے تراجم ' دلت آواز' کی مقبولیت کے بعد مراٹھی کی استری وادی شاعری کے تراجم میں مصروف ہیں۔ شعری مجموعہ 'خواب تحریر' شائع ہوگیا ہے۔

ندا فاضلی : مقبول ترین منفرد سوانحی ناول کا دوسرا حصہ جلد شائع ہو رہا ہے۔ فلمی اور تخلیقی کاموں کے ساتھ عالمی شاعری کے تراجم بھی کر رہے ہیں۔ کتاب متوقع ہے۔

حامد اقبال صدیقی : نوجوان شاعر اور مفکر، اردو زبان میں طلباء کے لئے "عام معلومات" کی ایک ضخیم کتاب کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ جو آخری مراحل میں ہے۔ مشہور زمانہ کتاب اسلامی کوئز کا دوسرا ایڈیشن متوقع ہے۔

URDU WITH PHONICS : ایک نئے ڈھنگ میں اردو سکھانے والا ایک نیا ویڈیو کیسٹ عالمی مارکیٹ میں آیا ہے۔ اسے جاوید خان نے تخلیق کیا ہے۔ ایک سو دس منٹ کے اس ویڈیو کیسٹ کو مندرجہ ذیل پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

FATIMA PRODUCTION INC.
P.O.BOX 56909, RIVERSIDE, CA-92517 (U.S.A.)
EMAIL : KHANZADE @WORLDNET NET.att

مثنویات شوق (فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق)
شاعر: نواب مرزا شوق لکھنوی ☆ مرتب: رشید حسن خاں ☆ ضخامت: ۴۰۶ صفحات ☆ قیمت: ۲۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی۔۱۵۹-بلاک-۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۴۰۰ (پاکستان)

نسبت (نعتیہ شاعری)
شاعر: ابوالخیر کشفی ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: اقلیم نعت ۲۵-ای فیز ۵، ٹی این ٹی فلیٹس، شادمان ٹاؤن نمبر ۲ شمالی کراچی ۷۵۸۵۰ (پاکستان)

اللہ ھو (شاعری)
شاعر: شجاع خاور ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت دو سو روپے (مجلد) ☆ مطبوعہ: جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۱-پارک لین پارک اسٹریٹ، نزد تالکٹورا انڈور اسٹیڈیم، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

آئین سخنوری (تنقیدی مضامین)
ناقد: حیدر طباطبائی ☆ ضخامت: ۲۶۲ صفحات ☆ قیمت: دو سو روپے (۵ برٹش پونڈ) ☆ مطبوعہ: اپریل ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انوار انجم D-278/5، اوکھلا ولیج، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سید محمد صادق علی صادق مطوی (شخصیت و فن)
محقق: شکیل احمد خاں ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: ۲۱-اے، یونٹ نمبر ۱۱، لطیف آباد، حیدر آباد (پاکستان)

حرف وصدا (مجموعہ مضامین)
مصنف: راج کھیتی (مرحوم) ضخامت: ۱۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: مکتبہ جدید-۹/۱۰ گولہ مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تذکرۂ معدانواں (عظیم آباد کا ایک علمی و ادبی مرکز)
تذکرہ نگار: ڈاکٹر سید شاہد اقبال ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۶۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: آستانۂ حق، روڈ نمبر ۱۰ (ویسٹ بلاک) نیو کریم گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

نوائے ساز (شاعری)
شاعر: عبدالرحمٰن واکھلے ساز ☆ ضخامت: ۲۴۰ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: جنوری ۱۹۹۹ء
☆ پتہ: 7120 VAWBUREN WAY BUENA PARK, CALEFORNIA - 90620 (U.S.A.)

کشتن (افسانے)
افسانہ نگار: مقصود الٰہی ☆ ضخامت: ۱۹۰ صفحات ☆ قیمت: ۷۰ روپے ☆ مطبوعہ ۱۹۹۷ء ☆ پتہ: روم نمبر ۸۷، پلاٹ نمبر ۳۴ لولانڈ کلکٹر کمپاؤنڈ مالونی ملاڈ (مغرب) ممبئی ۴۰۰۰۹۵ (مہاراشٹر)

زبان اردو (حصہ اوّل۔دوّم)
مرتب: رئیس صدیقی ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات (حصہ اوّل) ۴۸ صفحات (حصہ دوّم) ☆ قیمت: ۱۲ روپے فی حصہ ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: مکتبہ الحسنات ۲۲۴۱-کوچہ چیلان، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اوراق زندگی (شاعری)
شاعر: خلش نیازی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: شمس بک ہاؤس، واجد نگر، مراد آباد (یوپی)

لفظ بہ لفظ (شاعری)
شاعر: شاد عباسی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: بی ۱۳۰/۱۶، باگڑ بلی، مدنپورہ، وارانسی (یوپی)

کانٹوں بھری ھتھیلیاں (شاعری)
شاعرہ: شہلا نگار شمسی ☆ ضخامت: ۱۰۴ صفحات ☆ قیمت: ۷۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء
☆ پتہ: 51, BREWERS COURT, 20, BISHOPS BRIDGE ROAD, LONDON W26AD (U.K.)

رات ابھی باقی ھے (شاعری بخط شاعر)
شاعر: پرشوتم یقین ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۷۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۴-۱-اے-۷-۳ مہاویر نگر ایکسٹینشن، کوٹہ (راجستھان)

رسائل و جرائد

غالب نامہ (میر تقی میر نمبر)
مدیر اعلیٰ: پروفیسر نذیر احمد ☆ ضخامت: ۴۳۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

صریر (سالنامہ)
مدیر: فہیم اعظمی ☆ ضخامت: ۵۲۰ صفحات ☆ قیمت: سالنامہ ۲۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: جون جولائی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: C-14/20، ایف، بی، ایریا کراچی ۷۵۹۵۰ (پاکستان)

ذہن جدید (سہ ماہی)
ترتیب: زبیر رضوی ☆ ضخامت: دو سو صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۳۰ روپے ☆ مطبوعہ: مارچ تا اگست ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۹۷۸۹، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نیا ورق (سہ ماہی)
مدیر: ساجد رشید ☆ ضخامت: ۲۴۰ صفحات ☆ قیمت فی شمارہ ۳۵ روپے ☆ مطبوعہ: جولائی تا اکتوبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: 36-38 آلو پار وبلڈنگ، چوتھا منزلہ، عمر کھاڑی کراس لین ممبئی ۴۰۰۰۰۹ (مہاراشٹر)

ترسیل (سہ ماہی)
مدیر: ڈاکٹر یونس اگاسکر ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت فی شمارہ ۳۵ روپے ☆ زر سالانہ: ۸۰ روپے ☆ پتہ: سن ملن اپارٹمنٹ-۳۰۱، تیسرا منزلہ، پلاٹ نمبر ۱۹۳، سیکٹر ۲۱- نیرول، نئی ممبئی (مہاراشٹر)

المحمود (ماہنامہ)
مدیر: محمد فاروق غفرلہ ☆ ضخامت: ۴۸ صفحات ☆ قیمت فی شمارہ ۱۰ روپے ☆ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: جامعہ محمودیہ علی پور، ہاپوڑ روڈ، میرٹھ (یوپی)

اسباق (کوثر صدیقی۔ فن اور شخصیت)
مدیر: نذیر فتح پوری ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت خصوصی شمارہ ۴۰ روپے ☆ مطبوعہ: اپریل تا جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: اسباق پبلی کیشنز سائرہ منزل، سروے نمبر ۲۳۰-بی، پلاٹ نمبر ۱۰۲، وِمان درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ ۴۱۱۰۳۲ (مہاراشٹر)

تسطیر (سہ ماہی)
مدیر: نصیر احمد ناصر ☆ ضخامت: ۴۱۶ صفحات ☆ قیمت: موجودہ شمارہ ۱۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: اپریل تا ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۲۵-اے، شادمان کالونی نمبر ۱، جیل روڈ، لاہور (پاکستان)

آثار (ماہنامہ)
مدیران: فیصل عجمی، ثمینہ راجہ ☆ ضخامت: ۳۱۰ صفحات ☆ قیمت: فی پرچہ سو روپے ☆ مطبوعہ: جنوری تا اپریل ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۲۱ ڈی، ایس این سی سینٹر، تھرڈ فلور، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد (پاکستان)

کمپیوٹر کمپوزنگ
محمد ایاز راجپوت

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

اشاعت کا ۷۱واں سال

جلد ـــ ۷۱
شمارہ ـــ ۱۲

فون: 3829904

دسمبر ۲۰۰۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ✿ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ✿ خلیجی ممالک ۲۰۰ روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکرِ امروز

✿

ـــــ ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ فطری۔ ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، الکیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل شعر ہونا چاہیئے۔ ہماری ہر نظم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اہلِ ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیئے اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذباتِ عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیئے جس میں ہمارے نوجوان ماضی، حال اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں جو ہمیں تعمیرِ منزل اور شاہراہِ ترقی بتا سکے اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے۔

(خطبۂ صدارت سے اقتباس۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۲ء)

ـــ سیماب اکبرآبادی

سرورق
کبیر اجمل [بنارس]

❖

مکتوبات

شین صفیر ادیب | عذرا پروین | اصغر رضوی
نسیم بن آسی | لائق رونق جمال | شبیر اصغر
کاوش بدری | انور خان | خورشید اکرم
مغنی تبسم

۴۲

❖

شمارہ ۔ ۱۲ [دسمبر ۲۰۰۰ء] جلد ۔ ۷۱

محفل اپنی

بیسویں صدی کا یہ آخری شمارہ

۲۰ویں صدی کے آخری سال، آخری مہینے دسمبر ۲۰۰۰ء کا یہ آخری شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ سنہ دو ہزار میں شاعر کا ہر شمارہ اپنے آپ میں خصوصی شمارہ رہا ہے اور یہ بات باعث فخر ہے کہ امسال ہم اپنے قارئین کو مکمل ۱۲ شمارے دے سکے اور بروقت دے سکے۔ اس شمارے کے ساتھ ایک ہزارہ، ایک صدی مکمل ہو رہی ہے اور رسالہ شاعر بھی اپنی عمر کے ۷۱ سال مکمل کر رہا ہے۔ ایک ہزارہ، ایک صدی اور رسالہ شاعر، اپنی اپنی ایک تاریخ۔ اور شاعر کی تاریخی حیثیت اور اہمیت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔

نیا ہزارہ، نئی صدی، نیا سال

جنوری ۲۰۰۱ء سے نئے ہزارے، نئی صدی اور اس صدی کے نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے ہو رہا ہے۔ یکم جنوری ۲۰۰۱ء سے شاعر اپنی عمر کے ۷۲ ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ شاعر کے لیے ہمارے خواب بہت ہیں اور ہمارے عزائم بھی بلند ہیں۔ کئی ایک پروجیکٹ ہیں جن پر ہم کام کر رہے ہیں۔ کئی خصوصی شمارے زیر ترتیب ہیں حالانکہ ہمیشہ ہی سے یہ مسئلہ بنا رہا ہے کہ اس تاریخ ساز ادبی رسالے کو کس طرح زندہ رکھا جائے۔ اور اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل کبھی نہیں ملا۔ یہ کس کی بدقسمتی ہے؟ شاعر کی، اردو کی یا ہندوستان کی۔ ہمیں بہرحال شاعر کو زندہ رکھنا ہے اور اس کے لیے ہم نے اپنی سانسیں وقف کر دی ہیں۔

ہم عصر اردو ادب نمبر-۲

ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) کی گونج ابھی بنی ہوئی ہے۔ ابھی یہ خاص نمبر بے شمار لوگوں کے مطالعے میں ہے۔ ابھی مکالمہ جاری ہے۔ اسے ابھی کوئی آواز بننا ہے تاہم جلد دوم کے تقاضے بھی بڑھ رہے ہیں ہمیں بھی اس کا احساس ہے۔ انشاءاللہ جلد دوم بھی شائع ہوگی اور ضرور شائع ہوگی۔ انتظار تو کرنا ہی پڑے گا کہ جلد دوم بھی جلد اول ہی کی طرح مختلف بلکہ اس سے آگے کی چیز ہوگی۔ بس دعا کیجئے کہ یہ کام بھی ہم سے مکمل ہو جائے۔

شاعر کے صفحات میں اضافہ

شاعر کے صفحات میں اضافے کے لیے قارئین شاعر کا اصرار شدید ہو رہا تھا۔ دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ہم خود بھی اس بارے میں غور کر رہے تھے لیکن صفحات میں اضافہ کرنا آسان نہیں تھا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے باوجود حوصلہ نہیں ہو رہا تھا حالانکہ ۴۸ صفحات میں جو کچھ ہم سوتے ہیں وہ کسی بھی طرح ۶۴ صفحات کے مواد سے کم نہیں ہوتا اور یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف ہند و پاک اور اردو کی نئی بستیوں کے قلم کار و قارئین بھی کرتے ہیں۔ ہم تو سوچتے ہیں کہ شاعر کا ہر نیا شمارہ سو صفحات سے زائد کا ہو، مکمل طور پر باتصویر اور کلرڈ ہو۔ ہماری سوچ کے مطابق کوئی بھی ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے۔ ہم سوچتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا اور جو ہم سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ فی الحال تو شاعر کے صفحات میں ۸ صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب جنوری ۲۰۰۱ء سے شاعر ۵۶ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ پہلے سے زیادہ مواد، [illegible] ترتیب و تہذیب کے ساتھ۔ قارئین شاعر کے مشوروں اور تجاویز کی روشنی میں اب رسالہ شاعر پہلے سے زیادہ تازگی و توانائی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوگا۔ شاعر کے قارئین کا بھرپور تعاون حاصل ہوتا رہا ہے تو صفحات میں مزید اضافہ ممکن ہے۔

قیمت میں معمولی اضافہ

۴۸ صفحات کے شاعر پر ہر ماہ جو لاگت آتی ہے اس نے بارہا یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ عام شمارے کی قیمت میں اضافہ کیا جائے، زر سالانہ کی رقم میں اضافہ کیا جائے کیونکہ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ کاغذ بہت مہنگا ہی نہیں ہوا بلکہ بازار سے نیوز پرنٹ ہی غائب ہو رہا ہے۔ بڑی تگ و دو کے بعد اچھے کاغذ کی فراہمی ممکن ہوتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں بڑھتی ہوئی قیمتوں سے لوگ پریشان ہیں۔ مسائل بڑھ رہے ہیں اور الجھ رہے ہیں۔ قیمتوں پر کسی کا کوئی قابو نہیں ہے۔ ہم تو سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ شاعر کے لیے کیا کریں۔ اب ضخامت میں ۸ صفحات کا اضافہ کیا ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ قیمت میں اضافہ بھی ناگزیر ٹھہرے گا۔ صفحات میں اضافہ کئے بغیر بھی ہم اس پر غور کر رہے تھے۔ اب بھی شاعر فی شمارہ ۹؍روپئے اپنے غیر معمولی مواد کے ساتھ دیگر ادبی ماہناموں اور سہ ماہی ادبی کتابی سلسلوں کی قیمتوں سے کہیں کم ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد ۸ صفحات میں اضافہ اور ہر شمارے کی قیمت میں معمولی تبدیلی کے ساتھ زر سالانہ کی رقم میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ قارئین شاعر اس تبدیلی کو نوٹ کرلیں اور جب بھی ان کی خریداری ختم ہو نئی شرح کے مطابق شاعر کو اپنا تعاون دیں۔ نئی شرح ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

عام شمارہ	۱۲؍ روپئے
زر سالانہ	۱۲۵؍روپئے
لائبریریوں سے	۱۵۰؍روپئے

جنوری ۲۰۰۱ء کا شمارہ ۵۶ صفحات کا ہوگا اور قیمت فی شمارہ ۱۲؍روپئے ہوگی۔ یقین ہے کہ شاعر کے بے شمار خریدار و قارئین اس تبدیلی کو ہماری مجبوری پر محمول کرتے ہوئے اسے قبول کریں گے اور اپنے محبوب شاعر کو زندہ و پائندہ رکھنے میں ہماری مدد فرمائیں گے۔ اپنا عملی تعاون دیں گے۔ (ادارہ)

Ghayas Ahmad Gaddi
FATEHPUR LANE. P.O. JHARIA-828111 (India)

[illegible]

مکرمی مرزا صاحب [illegible]

آپ کے افسانوں کا مجموعہ "گمشدہ کلمات" بہت دن پہلے ملا تھا۔ [illegible]

[illegible] یہ سارے افسانے مجھے پسند ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک بات اور۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

غیاث احمد گدی [illegible]

غیاث احمد گدی بنام مرزا حامد بیگ

اردو کے مشہور و معتبر افسانہ نگار غیاث احمد گدی (پ: ۲۸ر فروری ۱۹۲۸ء - م: ۲۵ر جنوری ۱۹۸۷ء) کا یہ خط ایک طرح سے نئی نسل کے نام ہے۔ غیاث صاحب خطوں میں بہت صاف اور واضح بات کہا کرتے تھے۔ ایک اہم افسانہ نگار کے خطوط کی جمع آوری ضروری ہے۔ خدا معلوم کون یہ کام کرے گا۔ (ادارہ)



نصیر احمد ناصر

قرمزی دھوپ کا فسوں بھی ہے
منظر شام خوابگوں بھی ہے

ایک محراب ہی گری ہے فقط
چھت بھی قائم ہے اور ستوں بھی ہے

صبح آئی ہے روشنی کے بغیر
رات گزری ہے جوں کی توں بھی ہے

کیوں نہ اس کو گزار کر دیکھیں
زندگی بے ثبات یوں بھی ہے

اپنے سائے کے روبرو ناصر
سروقامت ہے، سرنگوں بھی ہے

● 17-D SECTOR-B2,
MIRPUR - 10250 (PAKISTAN)

امجد اسلام امجد

مختصر نظمیں

تمہارا غم سلامت ہے
تو پھر بازارِ ہستی میں
کسی کی کیا ضرورت ہے!

●

اے چشمِ یار تیرے ارادے کو دیکھ کر
ہاتھوں میں لے کے سر
ہم آگئے ہیں آپ ہی مقتل کی راہ پر!

●

بہت مشکل نہ ہو جائے!
تمنّا اب جو رہتی ہے مری بے خواب آنکھوں میں
کہیں یہ دل نہ ہو جائے!

●

میں صبح و شام لکھتا ہوں
زمیں پر جسقدر اچھی زبانیں بولی جاتی ہیں
میں ان سے حرف چنتا
اور تمہارا نام لکھتا ہوں

● 22- MUMTAZ STREET,
GARHI SHAHU, LAHORE (PAK)

علیم اللہ حالی

سہانا خواب آنکھوں میں بسا ہے
کہ تو مجھ سے قریب اب آچکا ہے
لرز اٹھا ہے سناٹے کا پیکر
کوئی خاموشیوں میں بولتا ہے
عذاب اللہ کا اترے گا شاید
کوئی بچہ کہیں پر رو رہا ہے
ابھی تک ہے وہی تشنہ لبی کیا؟
سمندر ساحلوں سے پوچھتا ہے
کٹے گی خوب اب کے فصلِ آدم
وہ ہتھیاروں کی کھیتی بو رہا ہے
نہ اب لیتی ہے وہ آ آ کے بوسے
کہ تتلی پھول سے شاید خفا ہے
خدا اس خوف سے محفوظ رکھے
کہ اب دل میں کوئی تیرے سوا ہے
رگوں میں تیرتا ہے نام تیرا
مری ہر سانس میں تو گونجتا ہے
نظر سے لمس کی لذت ہے حاصل
خموشی گفتگو کا سلسلہ ہے
کہاں محفل میں اب مجروح و سردار
دیا اک ایک بجھتا جارہا ہے
کسی کے درد کا قصہ ہو حالی
مجھے لگتا ہے میرا واقعہ ہے

● WHITE HOUSE COMPOUND
GAYA - 823001 (BIHAR)

اردو زبان و ادب ، ۲۱ / ویں صدی ، رسم الخط اور ...

اردو کے جو بھی مسائل ہو سکتے ہیں، وہ اردو والوں نے اپنی بے تحاشہ تقریروں اور تحریروں میں گم کر دیئے اور اس کا تمام تر فائدہ مخالفین اردو کو پہنچ رہا ہے۔ سماجی اور سیاسی سطح پر اردو کا رسم الخط کمزور پڑ رہا ہے لیکن بول چال کی زبان یا عوامی زبان کی حد تک اردو تھوڑی بہت باقی ہے۔ مجموعی طور پر تو جو کچھ ہے وہ ہندی ہے۔ اب یہ مفروضہ کہ اردو، مسلمانوں کی زبان ہے، بذات خود ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ جو اردو اور مسلمان دونوں ہی کو نقصان بلکہ شدید نقصان پہنچا رہا ہے۔ کسی وقت اردو مسلمانوں کی زبان رہی ہوگی اپنے مذہبی ورثے کے حوالے سے لیکن اب تو بیشتر اسلامی لٹریچر علاقائی زبانوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کے تراجم، تفاسیر، احادیث کے علاوہ مسئلے مسائل اور دیگر اسلامی موضوعات پر علاقائی زبانوں میں کتابیں آ رہی ہیں، رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ اخبارات آ رہے ہیں۔ مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اپنے صوبوں کی سرکاری زبانوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے مذہب کی تمام تر معلومات بلکہ جدید معلومات علاقائی زبان میں مل رہی ہے۔ جنوبی ہند کی زبانیں اس کی مثال ہیں۔ اب آیئے ان صوبوں کی طرف جو ہندی علاقے کہلاتے ہیں اور جہاں اردو بھی ہے۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی نئی نسل ہندی اور انگریزی سے اپنی تعلیم مکمل کر رہی ہے۔ اردو سے ان کی واقفیت صرف قرآن مجید اور اس کے بعد فلمیں یا فلمی گانے ہیں۔ ہاں! اردو اگر کہیں باقی ہے تو وہ دینی مدارس میں اور اب دینی مدارس پر بھی حکومتِ وقت اور ان کے حواریوں کی نگاہ ہے۔ اردو کا نقصان تو ہر طرح سے ہے۔ اب بہت اہم سوال یہ ہے کہ مسلم ادیبوں کا کردار کیا ہونا چاہیئے؟ مگر ایک سوال یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ مسلم ادیب اب کتنے ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں؟ اب تک انہوں نے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے لئے کیا کیا؟ جو ادیب شاعر کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنی جگہ اس قدر SET ہیں کہ اب ان کا اردو کے لئے ہلنا جلنا محال ہے۔ ان کا سارا STATUS ہی ڈسٹرب ہو جائے گا، تو سوال کہاں رکھے جائیں؟ مکالمہ کس سے کیا جائے؟ سوال اور مکالمہ سے قطع نظر یہاں دو اہم کتابوں کا۔ ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ قارئین شاعر اردو زبان کی تاریخ اور زبان کے تہذیبی مسائل کا تازہ ترین مطالعہ کر سکیں۔ اوال الذکر کتاب کا نام ہے۔ "ہندی رہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین" اس کے مصنف ڈاکٹر ابو محمد سحر ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پانچ مضامین ہیں لیکن سب سے طویل اور اہم مضمون ہندی رہندوی پر ایک نظر ہے۔ یہ مضمون ہندی کے مشہور مصنف اور پریم چند کے صاحب زادے امرت رائے کی کتاب۔ "A HOUSE DIVIDED - THE ORIGIN & DEVELOPMENT OF HINDI / HINDVI" (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں اردو سے متعلق جو بھی تضادات اور تعصبات ہیں ان کا پورے استدلال و استدراک کے ساتھ جواب دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے ۶۵ صفحات پر پھیلا ہوا یہ مضمون ۱۹۸۶ء میں تحریر کیا گیا تھا اور اب کتاب میں شامل ہے۔ اردو کے لسانی و تہذیبی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو مذکورہ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ امرت لال کی کتاب پر ایک طویل مقالہ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی (آنجہانی) نے بھی تحریر کیا تھا۔ مرزا خلیل بیگ نے بھی ایک مضمون "امرت رائے اور ہندی اردو کا مسئلہ" کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو ان کی کتاب لسانی تناظر (مطبوعہ: ۱۹۹۷ء) میں شامل ہے۔ امرت رائے کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں ORIGIN AND DEVELOPMENT OF HINDI URDU کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کم و بیش وہی لوازمہ ہے جو پہلے ایڈیشن میں تھا۔ اور کے بارے میں دوسری بہت اہم اور گرانقدر تحقیقی و تنقیدی کتاب اردو کا ابتدائی زمانہ۔ ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو" ہے۔ اسے جناب شمس الرحمن فاروقی نے تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب امرت رائے کی کتاب کا براہ راست جواب نہیں ہے لیکن اردو کی ابتداء اور پھر اس کی ادبی تہذیب کے بارے میں اپنی نوعیت کی بالکل مختلف کتاب ہے۔ اردو رہندی رہندوستانی یا اردو، ہندی، ہندوی کے تعلق سے بہت سارے تاریخی مبالغے اور مغالطے آپس میں اتنے الجھ گئے ہیں کہ صحیح تاریخ اور کوئی قطعی تاریخ بن ہی نہیں سکی ہے۔ فاروقی صاحب کی کتاب بہت سارے سوالوں کا الجھاووں کا شافی جواب ہے۔ یہ آج کی کتاب ہے اور اردو کی ابتداء، ادبی تہذیب و تاریخ کے بارے میں مستند و معتبر کتاب ہے۔ بہت سارے استادان اردو، ماہرین لسانیات اور اردو کی نئی نسل کو مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ اگر اردو کی جنگ لڑنی ہے تو ۲۱ ویں صدی میں اردو مخالفین، ہندی اور الیکٹرانک میڈیا، تینوں ہی سطحوں پر خود کو پوری طرح تیار کرنا ہوگا۔ ۲۱ ویں صدی کے نصف اوّل کا ہندوستان ایک نئے انقلاب سے دو چار ہوگا۔ گلوبلائزیشن، مذہبی انتہا پسندی، سیاسی بحران اور اقتصادی ناہمواریوں سے عوام نت نئی پریشانیوں سے گزرے گی۔ اردو زبان کے لئے سوال او گہرے ہوں گے۔ خدا کرے ایسا سب کچھ نہ ہو اور جو بھی انقلاب آئے، کامیاب آئے۔

کیا واقعی ایسا ہی ہے کہ ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے؟ نئے قلم کار نہیں آ رہے ہیں؟ علمی و ادبی اختلافات رہے نہیں؟ سارے نقادان ادب بجھ گئے ہیں؟ عمریں ٹھہر گئی ہیں، کوئی ہلچل نہیں ہے۔ نہیں بالکل نہیں! آج جو ہو رہا ہے وہ کل بھی تھا، کل بھی رہے گا۔ مکالمہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں اردو زبان و ادب ۲۱ ویں صدی میں کیا ہوگا؟ ہماری شاعری، ہمارا افسانہ، ہماری تنقید کیا ہونی چاہیئے۔ ادب تو تخلیق ہو رہا ہے، نئے قلم کار آ رہے ہیں۔ نئے نئے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ وہی سرگرمیاں ہیں، وہی ہنگامے ہیں، وہی سارا کچھ ہے جو اردو والوں کا مزاج بن چکا ہے۔ مسئلہ تو سارا رسم الخط کا ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں اردو رسم الخط رہے گا بھی کہ نہیں؟ ہم سب تو اپنے رسم الخط سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہماری ساری کوششیں تو رسم الخط کے دفاع اور اس کے فروغ کے لئے ہونی چاہیئے کیا ہم ایسا کر رہے ہیں؟

ادبی فیچر، میں علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی سوال قائم کیجئے، مکالمہ روشن کیجئے۔ [الف۔الف]

اردو کے تہذیبی مسائل

[illegible]

زبان چونکہ ایک عمرانی مظہر یعنی کسی تہذیب کے حامل گروہ، افراد کے مابین ترسیلِ خیال کا ذریعہ ہے اس لئے اس گروہ کے تعلق سے بھی بعض معروضی مسائل رونما ہوتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ زبان معاشرے کی طاقت ہے یا معاشرہ زبان سے طاقت کو حاصل کرتا ہے۔ توریت کے باب پیدائش میں مذکورہ ایک واقعے کے مطابق افراد زبان کے طاقتور میڈیم کے استعمال سے اپنا ہر ارادہ پورا کر سکتے ہیں۔ لکھا ہے کہ: "تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی۔ تب لوگوں نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں۔ اور خداوند جب اس برج کو دیکھنے اترا تو اس نے کہا کہ یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے تو اب یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں سو آؤ، ہم ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات کو سمجھ نہ سکیں۔ بس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔

معاشرے کے افراد کی یہ پراگندگی ایک زبان کو کہیں سے کہیں لے جاتی اور اس میں بے شمار صوتی و معنوی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے جو لسانی مظہریت کے مطابق دیگر زبانوں، بولیوں، نجی اظہاروں اور معاشرے کی لسانی روایتوں سے آمیز ہو کر امتدادِ زمانہ سے خود بھی ایک نئی بولی اور زبان کی ساخت حاصل کر لیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو کا معاملہ اس سے قطعی مختلف نہیں جیسا کہ سید احتشام حسین کے دکن میں اردو کے حوالے سے کہتے ہیں:

مسلمان فوجی عمال، اہلِ حرفہ، صوفی فقراء اور شمالی ہند کے لوگ اپنے ساتھ وہ ملی جلی زبان بھی دکن لے گئے جو ابھی اچھی طرح بن بھی نہ پائی تھی۔ دکن میں دراوڑی زبانیں رائج تھیں۔ آریائی زبانوں سے اتنی مختلف کہ ان کے اختلاط سے کوئی نئی زبان جنم نہیں لے سکتی تھی اس لئے شمالی ہند کے جو فوجی ملازمین، ان کے اہلِ خاندان، تاجر، صوفی فقیر وہاں بس گئے تھے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کسی دراوڑی زبان کا استعمال کر سکتے تھے یا اس ملی جلی نئی زبان کا جسے وہ دلی سے اپنے ساتھ لائے تھے، اس زبان میں پنجابی ہریانی اور کھڑی بولی کا میل تھا، یہ برج بھاشا کے اثرات سے بھی محفوظ نہیں تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں عربی فارسی کے بہت سے الفاظ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے اسی زبان سے کام چلایا یہاں تک کہ وہ ترقی کر کے ادب کی زبان بن گئی۔ ادبی مورخوں نے اس کو کبھی زبان ہندی، کبھی زبان ہندوستانی اور کبھی دکنی کہہ کر پکارا ہے"۔

تیرہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی معاشرے میں لسانی اظہاروں، ساختوں بولیوں اور روایتوں کا یہ اوغام ہندو مسلم معاشرتی لین دین کا واضح ثبوت ہے اور اردو کی تشکیل، نشوونما اور ترقی میں اس دو مذہبی قوم کی یک عملی سے انکار لسانی کفر کے مترادف۔ آئندہ صدیوں میں یہ لسانی قومی اشتراک و تعاون مزید طاقت حاصل کر کے اردو کو ہندوستان کی ایک ایسی جدید ہند آریائی زبان کی صورت میں سامنے لاتا ہے کہ ہندوستان میں اپنی حکومت کے استحکام کے لئے برطانوی سامراج کے حکمران اس نئی نویلی زبان کو سیکھنا اپنے لئے ضروری قرار دے لیتے اور اردو کے عمرانی اور تہذیبی خاکے میں کچھ خالص یورپی رنگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جنہیں اس زبان کے لسانی اصول و قواعد کی تدوین میں دیکھا جاسکتا ہے اور جو ابتدا یوروپی ماہرین زبان کی کاوشوں میں برگ و بار لاتی ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی نے انگریزی دور حکومت میں اردو کی سماجی سیاسی اور تہذیبی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

"رومی رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو برطانوی ہندوستانی فوج میں انگریزی کے بعد دوسری زبان کے طور پر قبول کر لی گئی تھی۔ بلکہ وکٹوریہ نے کوئی ہندوستانی زبان سیکھنا چاہی تو ان کو فارسی خط میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ اردو کو مسلم ہندوستان کا ورثہ تصور کیا جاتا تھا اس لئے برطانوی دور میں فارسی آمیز اردو کی کافی سرپرستی کی گئی"۔

چٹرجی موصوف اردو کے تعلق سے اس قدر لسانی تعصب کا شکار نظر آتے ہیں کہ ہندی، ہندوی، ہندوستانی، ہندوستھانی، اعلیٰ ہندی، ناگری ہندی، دکنی، دکھنی کے حوالوں سے ہر طرح اردو کو صرف مسلمانوں سے ہمرشتہ کرنے کے لئے تاریخی، جغرافیائی لسانی، تہذیبی اور عام انسانی حقائق کو خوب گڈمڈ کرتے اور ان کی تان اس مفروضے پر ٹوٹتی ہے کہ:

"فارسی مغل دربار کی زبان رہی تھی اور خیال یہ کیا جاتا تھا کہ انگریز انہیں کے جانشین ہیں۔ اس صورتحال کی بڑی وجہ ہندوؤں کے نزدیک یہ تھی کہ ہندوستان میں برطانیہ کا سیاسی میلان مسلمانوں کی طرف ہے"۔

ہندی اردو، ہندو مسلم، فارسی ناگری خط اور لسانی تہذیب و سیاست وغیرہ کے تعلق سے ناچیز کا یہ تصور ہے کہ ہندوستان جیسے ایک کثیر لسانی خطے میں آکر فارسی ترکی بولنے والے مسلم حکمرانوں اور حکومت چلانے والے عمال (معمولی فوجی سے لے کر امیر و نواب تک) کے لئے ناگزیر تھا کہ جہاں ہر شاخ پر الگ بولی بولنے والا پنچھی بیٹھا ہو اس درخت پر اپنا گھونسلا بنانے کے لئے ہر بولی کی آواز اپنے کنٹھ سے نکالی جائے۔ نتیجہ ہندی، ہندوستانی یا دکنی وغیرہ کسی بھی نئی زبان کی صورت میں سامنے آنا تھا سو آیا۔

اب زبان صرف بولنے اور ہاتھ پیر سر کے اشاروں میں کام کرنے تک محدود بھی نہیں اسے کسی نہ کسی ترسیمی یا تحریری نظام کے تحت لانا ہی پڑتا ہے کیوں کہ زبان کا لکھنا بھی ایک سماجی اور تہذیبی ضرورت ہے بلکہ بعض حالات میں زبان کی تحریری سطح پر تقریری سطح سے بھی کہیں بڑھ کر اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً وقائع نگاری،

دستاویز نگاری ضبط فضیات اور تاجرانہ لین دین کی لکھت پڑھت وغیرہ کے موقعوں پر طور اس مقصد کے لئے اردو کے ابتدائی تشکیل زمانے میں دیوناگری خط جاننے والوں نے دیوناگری اور فارسی خط جاننے والوں نے فارسی خط اختیار کر لیا اگرچہ دونوں خطوں میں لکھی گئی ایک ہی زبان یعنی اردو لیکن بولنے اور لکھنے والوں کے فنی تہذیبی اثرات سے زبان کب محفوظ رہ سکتی ہے۔ ان باتوں کا سب سے گہرا اثر تو زبان ہی پر ہوتا ہے چنانچہ ہندوؤں نے اگر ابتداء میں اردو کو ناگری خط میں لکھا تو یہ فطری تھا کہ ان کی تحریر میں ہندوستانی اصل کے یعنی سنسکرت الفاظ راہ پاگئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تحریر میں قدرتاً عربی فارسی کے الفاظ شامل ہوگئے۔ آگے چل کر اردو سنسکرت الفاظ بڑھا کر ہندی یا اعلیٰ ہندی اور عربی فارسی کے الفاظ بڑھا کر اردوئے معلی اور اردوئے معلی کا نام بنا دے دیا گیا۔ رسم الخط کا یہ فرق دو قومی زبان کی تشکیل کا باعث بنا اور نتیجے میں ہم ایک اصل کی زبان کو دو زبانیں کہنے لگے۔ اور ہمارے ایسا سمجھنے اور کہنے میں ہم سے یعنی زبان استعمال کرنے والوں سے کہیں بڑھ کر سیاست اور مذہب یا مذہبی سیاست کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ چٹرجی کے مطابق اگر ہندو رہنماؤں نے ہندوستانی کو دیوناگری میں لکھ کر ہندو خیالات اس میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اردو میں دلچسپی اس لئے ہے کہ ان کا مذہبی ادب اس زبان میں لکھا گیا ہے۔ زبان اور مذہب کا یہ تال میل راقم تحریر کے نزدیک مذہبی سیاست کا کرشمہ ہے اور اردو بیچاری اس میں برطانوی دور حکومت ہی میں مبتلا ہو چکی تھی پھر تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ زبان کی یہ سیاست بھی چلتی رہی، بقول چٹرجی:

"۱۹۲۰ء کے بعد ہماری قومی تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس وقت سے انگریزی پر عدم اعتماد کے باعث زبان کے مخالف بھی عداوت پیدا ہوگئی اور لوگ چاہنے لگے کہ ہر شعبے میں ان کی اپنی زبانیں ہوں۔ چنانچہ ملک کے وسیع تر علاقے میں بولی اور سمجھی جانے کے باعث مہاتما گاندھی کی حمایت سے انڈین نیشنل کانگریس نے ہندی کو راشٹر بھاشا کے نام سے ملک کے طول و عرض میں ترسیل خیال کے واحد ذریعے کے طور پر قبول کر لیا اگرچہ انگریزی، یہاں تک کہ سنسکرت کو بھی اس سیاست میں اہمیت دینے کے جتن کئے گئے۔ اسی بیچ ہندی اردو کے رسوم الخط کے نزاع نے بھی سر اٹھایا اور آج بھی ہم اس کا سر کاٹنے میں ناکام ہیں۔"

رسم الخط کا مسئلہ اگرچہ زبان کی طبعی ساخت کا مسئلہ ہے لیکن اس نے چار دانگ ہند میں مختلف مذہبی، نسلی اور گروہی تعصبات کو بھی خوب ہوا دی اور لسانی سیاست کے زیر اثر اس میں بے گناہ عوام کا خون تک بہا دیا گیا ہے۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں جب لسانی بنیاد پر ملک میں ریاستوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ تو کسی ریاست میں محدود نہ ہونے کے سبب (سوائے جموں کشمیر کے ایک حصے کے) اردو کو سب سے بڑا نقصان اٹھانا پڑا اگرچہ ملکی دستور کے آٹھویں شیڈیول کے مطابق اسے ایک ہندوستانی زبان تسلیم کرتے ہوئے دستوری حیثیت عنایت کی گئی اور مادری زبان ہونے کی صورت میں اردو بولنے والے افراد کو اس میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اردو کشی کی مہم بھی تیز کر دی گئی۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی بنیاد کے ساتھ ہی اردو کشی کی مہم کا آغاز ہو چکا تھا جب ہندوستانی کے لئے دو رسوم الخط ناگری اور فارسی اخذ کئے گئے تھے۔

چٹرجی فرماتے ہیں:

"ہندی یا ہندوی (ہندوستھانی) کی دونوں شکلوں کی قواعد ایک ہی ہے اور مشترکہ لفظ اور مادّے بھی ایک ہیں لیکن مختلف رسم الخط (دیسی ناگری) اور بدیسی فارسی عربی کے استعمال نے اور ایک طرف فارسی پر اور دوسری طرف سنسکرت پر بیجا انحصار نے صرف ادبی اسلوب کو زبان کا قضیہ بنا ڈالا"۔

اور پھر اسی منہ سے اردو کے خلاف موصوف کا یہ اعلان کہ:

"اردو یا فارسی عربی ہندی" صاف بات یہ ہے کہ یہ مسلمان زبان ہے اور اپنے رجحان کے اعتبار سے بڑی حد تک غیر ہندوستانی ہے"۔

اردو کو مسلمان زبان کہنے کی روایت نے آزادی کے بعد مزید زور پکڑا اور متعصب تنگ نظر سیاست اور سیاسی ماہرین کی سازشوں کے زیر اثر اردو کے خواص یعنی اس کے اساتذہ، ادباء و شعراء چٹرجی کے اعلان کے جواب میں اردو کو ہندو مسلم اتحاد کا تاریخی مظہر ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنے لگے۔

اس کا سیاسی اور سماجی فائدہ اردو کے ان غیر مسلم ادیبوں کو ملنے لگا جن کے لئے سیاست کے ایک بیچ نے ہندو مسلم اور اردو ہندی نزاع کو اپنے رنگ میں پیش کر کے سیاسی مفادات حاصل کرنے چاہے تھے۔ اردو کے غیر مسلم ادیبوں کے سر اردو زبان و ادب کے سارے کارناموں کا سہرا باندھنے کے بعد کیا یہ تصور ملک کی فضا سے ختم ہوا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ؟ اس صورت میں اردو کے مسلم ادیبوں کا کیا کردار ہونا چاہئے، اس کا تصفیہ ضروری ہے۔

● 323-MANGALWAR WARD, MALEGAON-423203 (M.S.)

فکر جزیرہ

مشرف عالم ذوقی



میری جان اردو ! اختلاف کا موسم بھی چلا گیا شاید

ادب میں زندہ رہنے کے لئے صحت مند اختلاف بھی ضروری ہے۔ لیکن عام طور پر اردو زبان میں جب بھی ادب کی بیمار کو پنپنے کا موقع دیا گیا ہے اسے نجی یا ذاتی دشمنی سے جوڑا گیا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جہاں اختلاف کی ٹھنڈی، صحت مند اور خوشگوار ہواؤں کا چلن نہ ہو۔ اختلاف کے بغیر کسی بھی متنازعہ رائے یا تنقید کو ہم بہ آسانی قبول کرنے کو تیار ہو چکے ہیں لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ بات سے بات پیدا نہیں ہوتی۔ فکر ایک مقام

تک آکر ٹھہر جاتی ہے۔ نتیجہ قبول ورد کی روش کو بغیر ادبی بحث کے ہم ماننے یا اپنانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

مگر اب اختلاف بھی کس سے ہو؟

اس زبان کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ آئندہ برسوں میں آپ ادب کی کسی بھی اہم تھیوری پر محض اپنی رائے پیش کرنے کے لئے خود کو پابہ جولاں پائیں گے اور خواہش کے باوجود تجزیہ، مکالمہ، تبصرہ یا تنقید کے لئے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیں گے کہ آیا اب یہ لوگ بھی رخصت ہو گئے تو کل لکھنے والوں کا قافلہ ہی کتنا سا رہ جائے گا۔؟

میں افسانے اور ناول کا آدمی ہوں۔ ادب میرے جسم کے قطرے قطرے میں رواں ہے۔ میں وہ ہوں، کہ جس نے شاید اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ انکار یا انحراف یا اختلاف کا راستہ اپنایا ہے۔ انکار یا انحراف کے راستے چلتے ہوئے بھی، مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ میں ادب کے بحرِ ذخار سے دو چار کار آمد موتی حاصل کرنے کی جستجو کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عمر سے کافی بڑے افسانہ نگاروں سے بھی اختلاف وانحراف کا راستہ اپنایا۔ کالج کے دنوں میں بھی، فن افسانہ کی سنگلاخ سر زمین پر چلتے ہوئے میں نے انتہا پسندی کے اپنے خونخوار ردیے کی اتنی کیلیں ٹھونکیں کہ افسانہ نگار دوست احباب تک برسوں مجھ سے بد ظن رہے۔ پیٹھ پیچھے یقیناً مجھے برا بھلا بھی کہتے رہے۔ لیکن میں تو جیسے SADIST بن چکا تھا۔ اذیت رسانی میرا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن کیا سچ مچ ایسا تھا؟

نہیں! شاید یہ پورا پورا سچ نہیں ہے۔ میں نظریاتی تبدیلیوں کے عجیب پر اسرار مقامات سے گذر رہا تھا۔ قدم قدم پر مجھے IDEALOGY کے نئے حسین گلیارے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمر کے یہ وہ ادوار تھے جب میں تھیوری، آئیڈیالوجی اور کسی خاص نظریاتی سطح تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ یہ وہ عہد تھا جب میں نے افسانے میں نئے سُر کی تلاش میں بغاوت کا پرچم اٹھا لیا۔ انور خاں کیا بیچتے ہیں؟ حسین الحق جو لکھتے ہیں، کیا وہ کہانی ہے؟

اقبال مجید CONFUSED ہیں۔ جنگل کٹ رہے ہیں۔ یا ان کی زیادہ تر کہانیاں۔ آرٹ کے چکر میں وہ اپنے آپ میں زیادہ الجھ جاتے ہیں۔

نیر مسعود جان بوجھ کر کہانی میں ایک ایسا اختتام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قاری الجھ کر رہ جائے اور "ناقدان شہر ایسی تخلیق پر بڑے ادب کا فتویٰ صادر کر سکیں۔"

مثالوں کی کمی نہیں۔ میں جو کچھ بھی سوچتا تھا، اسے لکھنے اور کہنے میں کبھی مجھے شرم محسوس نہیں ہوئی۔ میں کبھی اس خیال کے دہشت بھری رہ گزار سے نہیں گزرا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

لیکن اچانک، نئی صدی کی ایک صبح مجھ پر ایک نیا انکشاف ہوا اور اب دکھ کے اس موسم میں آپ کے ساتھ بھی شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے ایک صبح مجھے خبر ملی ☆ انور خاں ریٹائر ہو گئے۔ (ریٹائرمنٹ کی جو عمر حکومت نے مقرر کی ہے۔ اس کے مطابق کم از کم ۶۰ سال) ☆ نیر مسعود پر فالج کا حملہ ☆ علی امام نقوی سخت بیمار ہیں ☆ غضنفر کی بیٹی ام بی بی ایس میں ہے ☆ انیس رفیع کے لڑکے نے دلی کے ایک انگریزی اخبار کو جوائن کیا ہے اور فلاں نے لکھنا بند کر دیا۔ فلاں نے اپنے اور اپنے عمر کے بیچ سمجھوتہ کر لیا۔

میں کیا کہنا چاہتا ہوں

نیر مسعود کو چھوڑیں، تو ان میں زیادہ تر ایسے افسانہ نگار شامل ہیں جنہیں ناقدان افسانہ پچھلے دو یا تین برسوں سے نوجوان قلمکار کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔ عام قاری کے ذہن میں ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے بہت زیادہ پچیس تیس سال کے ایک نوجوان کی جھلک موجود ہو گی۔ مگر اب عمر سو رہی ہے اور آکاش محدود ہو رہا ہے۔ خیالات کے سوتے سوکھ رکھے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں۔ ایک درخت پرانا اور کمزور ہو چکا ہے۔ نئی شاخیں اور نئی کونپلیں سر اٹھا رہی ہیں۔ اور نقاد بیچارے کا المیہ ہے کہ وہی نوجوان قلم کار، ہمارا نوجوان افسانہ نگار۔

بھیانک بات

دراصل غلطی نقادوں کی نہیں ہے۔ نقاد پچیس تیس برسوں سے انہیں ناموں کو نوجوان قلمکار کہنے کے لئے مجبور اس لئے بھی ہیں کہ ان برسوں میں، فکشن میں کوئی نیا نام آیا ہی نہیں۔ ہندی میں ہر سال لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو میں لکھنے والا ہی گم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ نئی نسل کے ذہین بچوں نے اردو سے دامن چھڑا کر اپنے لئے دوسری دنیائیں آباد کرنے کا فیصلہ پوری ذمہ داری سے کر لیا ہے۔ شاید نئی نسل اس خوش فہمی سے آزاد ہو چکی ہے کہ اردو کا کہیں کوئی مستقبل بھی ہے؟ المیہ ہے کہ نوجوان قلمکاروں، کے اس قافلے کے بعد کون آئے گا۔؟ آہستہ آہستہ یہ جلتے چراغ بجھنے لگیں گے۔

خدا نہ کرے۔ میں ان کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کرتا ہوں۔ مگر ان کے بعد کا سوال مسلسل مجھے پریشان کئے جا رہا ہے۔ اور اب جب کہ دنیا ایک چھوٹے سے گلوبل ولیج یا عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے، نیا لکھنے والا مجھے اس چھوٹے سے گاؤں میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔

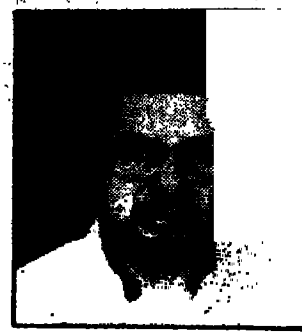
● T-101, TAJ ENCALV, GEETA COLONY, DELHI-110031.

☆ ادبی فیچر نئے پرانے تمام قلمکاروں کے لئے ہے۔

☆ اپنی بات کہئے، اظہار خیال کیجئے۔

☆ نیا ادبی مکالمہ، نئے سوال قائم کیجئے۔

☆ آپ جو سوچ رہے ہیں معاصر اردو ادب اور اردو زبان کے بارے میں، اس پر اپنی آزادانہ رائے دیجئے۔



راہی فدائی

رت کی سرزنش ہے سیلاب کی تباہی
ہے نخوت بشر کے اسباب کی تباہی

ل درا سے آنکھیں پتھرا گئیں اچانک
نیر کو ترستی ہے خواب کی تباہی

ھانہ جائے ہم سے، اقدارِ نو کے ہاتھوں
لاص سی متاعِ نایاب کی تباہی

لت پہ نازاں کو، تھا بس انہیں پروں پر
ردہ کرگئی ہے سرخاب کی تباہی

کیوں نہ منہ چڑھاؤ، تم لاکھ خاک اڑاؤ
ن نہ ہوسکے گی ، مہتاب کی تباہی

سودہ شکم ہیں، قلب و نظر کے جلوے
ہے نئے کہف کے اصحاب کی تباہی ؟

وں پہ مشتمل ہے راہیؔ کتابِ ہستی
و کر نہ جائے ، ابواب کی تباہی

● 6\184-BURHANUDDIN STREE
CUDAPAH-516001 (A.P.)

شاہد کلیم

جرعہ جرعہ خون میرا پی رہی ہے خود غرض
زندگی سے کیا توقع ، زندگی ہے خود غرض

ہر جگہ تو دیکھتا رہتا ہے بس اپنا مفاد
تیرے حصے میں کہاں سب روشنی ہے خود غرض

کیا کسی سے بھی بھلائی کی توقع میں رکھوں
آج کی دنیا میں ہر اک آدمی ہے خود غرض

بے سبب آتی نہیں ہے موجِ دریا اس طرف
روز ساحل کے لبوں کو چومتی ہے خود غرض

آج تک اس کی عنایت سے ہے تو محروم کیوں
سوچ تیری بندگی ، کیا بندگی ہے خود غرض

گھر کے اندر ہی نہیں باہر بھی روشن کر چراغ
دیکھ چاروں سمت کیسی تیرگی ہے خود غرض

آج ہی ہو جائے گا یہ فیصلہ بھی اے کلیمؔ
مجھ کو یا تجھ کو یہ دنیا بولتی ہے خود غرض

● DOODH KATORA
ARA-802301 (BIHAR)

منیر سیفی

بس کام ہی تھا ان دنوں پنچھی بکھارنا
تاکے سے روز سوئی کے ہاتھی گزارنا

مجھ کو بنا کے آئینہ زلفیں سنوارنا
پہلے بناؤ چائے پھر آنگن بہارنا

تلچھٹ کوئی جو ہو تو نتھاری بھی جاسکے
ممکن نہیں ہے دل کی کدورت نتھارنا

پہلے غزل کی نوک پلک دیکھ ، بعد میں
وحشی لبوں سے جسم طلائی نکھارنا

لوٹے کبھی ہیں ڈار سے بچھڑے ہوئے پرند
جو پل گزر چکا ہے اسے کیا پکارنا

آتا نہیں ہے اس کے سوا کام کچھ مجھے
دفتر میں دن ، کتاب میں راتیں گزارنا

مجھ کو منیرؔ یاد ہے وہ ساعتِ وصال
اک ایک کرکے رات کا کپڑے اتارنا

● H.NO.546, SAMANPURA,
P.O.B.V.COLLEGE PATNA-800014

حسین الحق
SIR SYAD COLONY
NEW KARIM GANJ, GAYA - 823001

بچاؤ بچاؤ

میں عام زبان میں ایک مذہبی آدمی ہوں، داڑھی رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، ماتھے پر نماز پڑھنے کا نشان بھی اب نمایاں ہو گیا ہے، کبھی کبھی لوگ تقاضہ کرتے ہیں تو مذہب کے حوالے سے تقریر بھی کر دیتا ہوں۔ کچھ مذہبی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ روز کی محفلوں میں لوگ مذہب پر میری باتیں شوق سے سنتے ہیں۔

دراصل میں نے مدرسے میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج کی راہ لی اور اس راستے سے ہی معاش کی سبیل ڈھونڈھی اس لئے اب گویا میرے دو چہرے ہیں۔ ایک چہرہ سرکاری ملازم کا اور دوسرا اوسط مذہبی علم رکھنے والے بظاہر ہر متشرع مسلمان کا۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میں نے معاش کی خاطر کالج کی راہ لی تو کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی سے ہندوؤں سے میری ملاقاتیں بھی رہیں اور دوستیاں بھی۔ کالج کے دنوں میں رمیش، راہل اور شنکر پرشاد میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ راہل سے تو کالج کے بعد پھر میری ملاقات نہ ہو سکی۔ رمیش یوپی میں سرکاری نوکر ہے اور دو چار برس پر کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ شنکر میرے ہی شہر کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے اور اب آر ایس ایس کا بہت سرگرم ممبر بن گیا ہے۔ جب بھی اپنے آبائی وطن جاتا ہوں تو اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں جب ملتے ہیں تو کالج کے دنوں کو یاد کرتے ہیں اور کچھ ایک دوسرے کے بال بچوں کا حال پوچھتے ہیں۔

پھر نوکری کے سلسلے میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ایک تو بنسی دھر ہیں جن سے ملنے کو جی چاہتا ہے حالانکہ کئی لوگوں نے کہا کہ وہ لالہ ہیں اور بڑے چتر ہیں لیکن میں جب بھی ان سے ملا تو لگا کہ یہ آدمی کہیں میرے اندر ہی ٹک گیا ہے۔ دوسرے ستیش جی ہیں جن سے میں قریب ہونا چاہتا ہوں مگر وہ خود ہی ذرا ریزرو سے رہتے ہیں اس لئے ہر بار میں چاہ کر بھی ان کے اندر دور تک نہیں جا پاتا۔ اور تیسرے دوست ہیں ڈاکٹر سہتانند پریمی صاحب۔ یہ مہاشئے نہ تو میرے کالج کے دنوں کے ساتھی ہیں نہ ہی نوکری میں میرے کلیگ۔ ایک بالکل الگ سی صورت حال میں میرا ان کا سامنا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ تعارف جان پہچان میں بدلا اور جان پہچان نے تعلق کا روپ دھارا، پھر پتہ نہیں کیسے اس تعلق میں یاد یا چاہت بھی شامل ہو گئی۔ حالانکہ ان کے بارے میں بھی بھانت بھانت کی باتیں سننے کو ملیں۔ مگر میں جب ان سے ملا تو لگا کہ ایس آدمی میں تو وہ سب کچھ نظر ہی نہیں آتا جو ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہت دنوں بعد کسی کے آگے ان کا چرچہ چلا تو وہ آدمی خود بولا کہ "پریمی جی برہمن ہیں" تو اور حیرت ہوئی کہ یہ آدمی برہمن ہوتے ہوئے بھی چھوا چھوت کیوں نہیں کرتا؟

قصہ مختصر یہ کہ پریمی جی بہت آہستہ آہستہ مگر ستیش جی کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی کے ساتھ میرے اندر جگہ بناتے گئے۔ سچ کہتا ہوں، ان سے بات کر کے ہر بار لگا "یہ آدمی جیسا بھی ہو جھوٹا نہیں ہے"۔

تو جب پریمی جی کا فون آیا کہ "حق صاحب۔ ہولی اب جا رہی ہے۔ بھینٹ ملاقات نہیں ہو گی؟" تو میں تھوڑی دیر کے لئے گڑبڑا گیا۔ ہولی میں رنگ ونگ کا ایسا چکر رہتا ہے کہ میں دو تین دن گھر ہی میں دبکا رہتا ہوں۔

"ہولی کی بدھائی ہو۔ ملاقات کیوں نہیں ہو گی؟ آپ ہولی منا لیں تو پھر ہم آپ ملیں گے"۔ میں نے بات ٹالنی چاہی۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ ہماری آپ کی ملاقات ہولی میں ہونی چاہیئے"۔

"بھائی۔ کیوں اس سفید داڑھی کو رنگوانا چاہتے ہیں؟ آپ کا گھر جس علاقے میں ہے ادھر جا کر میں بچ پاؤں گا؟"

"ارے۔ آج کچھ نہیں ہو گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔"

"ایسا؟"

"ہاں۔ بالکل ایسا!"

"تب جیسا آپ کا حکم، کس وقت آؤں؟"

"چھ بجے آیئے!"

"چھ بجے؟"

"ہاں ہاں۔ چھ کے آس پاس آیئے۔ میں نے اپنے گھر پر ایک ہاسیہ کوی گوشٹی کا پربندھ بھی کیا ہے۔ کرشن چودھری، سہیل، ستندر، سوم ناتھ سبھی رہیں گے۔ ڈی ایم صاحب نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ بھی آ جایئے"۔

پریمی جی کا لہجہ میرے تئیں ایسا یقین بھرا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا اور پونے چھ کے قریب ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا حالانکہ میں سوا پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان نکلنا چاہتا تھا مگر عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہوتے کچھ لوگ آگئے اور ان کو نپٹاتے نپٹاتے دیر ہو گئی۔ بیچ میں بار بار خیال آتا رہا کیوں کہ میرے گھر سے پریمی جی کا گھر کم از کم تین چار میل کی دوری پر ضرور واقع ہے اور چوں کہ پورا علاقہ آبادی سے بھرا ہوا ہے اور موڑ پر موڑ کاٹنا ہے اس لئے ان کے گھر تک پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگ ہی جاتا ہے۔

میں سویرے اس لئے بھی نکلنا چاہتا تھا کہ پریمی جی کے گھر جانے کے لئے میل ڈیڑھ میل صرف ہندو علاقے سے گزرنا پڑتا ہے اور باوجود کہ پریمی جی نے اطمینان دلایا تھا پھر بھی یہ اندیشہ تو بنا ہی ہوا تھا کہ آج ہی رات میں ہولی جلنے والی ہے تو اب اس وقت شام میں ہولی منانے والے ہولی کے پورے موڈ میں ہوں گے۔ مگر اب اتفاقات پر کس کا بس، دیر ہونی تھی ہو گئیں۔

پریمی جی کے یہاں میں سوا چھ کے بعد ہی پہنچ سکا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھے، سب دوستوں سے ملایا اور پھر کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ میٹھا، نمکین، پوری کچوری، پھل، پھر کوی گوشٹی شروع ہوئی اور ختم ہوتے ہوتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ میں چلنے لگا تو سوم ناتھ بولے "حق صاحب۔ آپ تو وادھر ہی چل رہے ہیں۔ چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

سوم ناتھ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بات چیت کے دوران وہ باجپائی کی حمایت میں بھی بول رہے تھے اور پی بھی رکھی تھی۔ جب انہوں نے ساتھ چلنے کا پروپوزل رکھا تھا تو میں انکار نہ کر سکا مگر یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ میں پہلی ملاقات میں اتنی بے تکلفی کا عادی نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے منہ کھول دیا اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔

"کدھر چلنا ہے؟" میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"آپ چلئے نا۔ میں بتاؤں گا" انہوں نے اسکوٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں چل پڑا۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں جس راستے سے آیا ہوں اسی راستے میں کہیں یہ رک جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ کچھ دور چل کر سومناتھ بولے "دائیں مڑ جایئے" میں تجھے میں پڑ گیا۔ مجھے سیدھے جانا تھا اور وہ دوائیں مڑنے کو کہہ رہے تھے۔ سوچا یہیں کہیں آس پاس ان کا گھر ہوگا۔ جی میں ایک بات آئی۔ ان کو اتر جانا چاہیئے تھا۔ یہاں سے ٹہلتے ہوئے چلے جاتے"۔ مگر میں چپ رہا۔ اسکوٹر تو دائیں مڑ ہی چکا تھا۔ اس کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ سوم ناتھ جی بولتے رہے میں سنتا رہا، اور اسکوٹر مڑتا رہا۔ کچھ وہ مانو دھرم کی بات کر رہے تھے، کچھ باجپائی کی حمایت کا راگ الاپ رہے تھے، کچھ لالو پرشاد کے خلاف بول رہے تھے۔ ان کی بات سنتے رہنے کے درمیان میں کئی ایک کیفیتوں سے گزرا کبھی لگتا یہ آدمی بی جے پی کا حمایتی ہے، پھر لگتا کہ N.D.A. میں شامل پارٹیوں میں سے کسی کا حصہ ہے پھر وہ موضوع بدل دیتے اور بالکل صوفی سنت جیسی باتیں کرنے لگتے۔ بیچ بیچ میں طبیعت الجھ جاتی۔ میں اور میری گاڑی دونوں اتنا موڑ کاٹ چکے تھے کہ میرا جانا پہچانا راستہ میرے لئے دھند میں کھویا منظر بن چکا تھا۔ سوم ناتھ لگاتار بول رہے تھے۔ بولتے بولتے انہوں نے پوچھا: لگتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟" میں چپ رہا تو وہ بولے "آپ کبھی پارٹی میں بھی رہے ہیں؟" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "ہاں کیمونسٹ پارٹی میں تھا۔" سوم ناتھ چہک کر بولے "میری میموری مجھے دھوکا نہیں دیتی۔ میں نے آپ کو پارٹی والوں کے ساتھ ہی دیکھا ہے"۔

"آپ بھی کیمونسٹ پارٹی میں ہیں؟" میں اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔

"میں تو اب سی پی آئی مارکسسٹ لینسٹ (مالے) میں ہوں"۔

اچانک اسکوٹر کا پہیہ سڑک پر پانی سے چھپے ایک گڈھے میں گیا اور اسکوٹر تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسکوٹر کنٹرول کیا۔ اسکوٹر پھر آگے دوڑ رہا تھا اور میں سوم ناتھ کے جملوں کا قیدی تھا۔ باجپائی اچھا کر رہے ہیں۔ ۔۔ کانگریس کو لالو کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے تھا۔۔۔ این ڈی اے والوں کو تو دھوکا ہو گیا۔۔۔ میں سی پی آئی مارکسسٹ لینسٹ میں ہوں۔۔۔"

سوم ناتھ نشے کی ترنگ میں تھے۔ مجھے لگا یہ آدمی وقت بے وقت پئے رہتا ہے۔ کسی وقت ہوش میں نہیں رہتا۔

تقریباً ۲۰ منٹ تک کئی طرح کے موڑ مڑنے اور موڑنے کے بعد ایک جگہ سوم ناتھ نے رکنے کا اشارہ کیا۔

"تو اب میں جاؤں؟" سوم ناتھ جی اسکوٹر سے اتر گئے تو میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ذرا رکئے گا۔" کہتے ہوئے سوم ناتھ سڑک پار کر کے سامنے ایک کچے مکان کے دروازے پر گئے اور دستکیں دینے لگے۔

"یا اللہ۔ اب کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے پہنچانے کو کہا میں نے پہنچا دیا۔ اب یہ کیوں روک رہے ہیں؟"

میں نے سوچا اور خود کو بے بس سا محسوس کر کے اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔ خالص ہندوؤں کا محلہ تھا، مسلمان کیا کوئی سکھ بھی کہیں پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، سوا نو بج چکے تھے۔ ہولی کا دس کے بعد جلنے والی تھی، پوری فضا ہولی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ لڑکوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی گزر رہی تھیں اور سب مجھے اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا اجنبی نگاہوں سے دیکھنا غلط بھی نہیں تھا۔ سوا نو ساڑھے نو کے درمیان ایک داڑھی والا مسلمان نما آدمی جب اسکوٹر کھڑا کر کے چاروں طرف دیکھتا دکھے گا تو شک ہونا واجب ہے، کیا پتہ کوئی فسادی۔۔۔ کوئی آتنک وادی۔۔۔ آئی ایس آئی کا کوئی ایجنٹ۔۔۔"

مجھے ہنسی آگئی مگر پھر فوراً ہی ہنسی پر بریک لگ گئی۔

نشے میں دھت دو لڑکے میرے اسکوٹر کے پاس آکر رک گئے تھے اور نشے کے جھونک میں زمین آسمان کا قلابہ ملا رہے تھے۔ ایک بولا: ارے [illegible]

ہے یار۔ پرسوں مالتی [illegible]۔ میں نے کہا: میری جان کہاں ہو آج کل۔۔۔ سر کس آیا ہوا ہے۔۔۔ چلو۔۔۔ تم کو گھما لاؤں۔ تو سالی پوز مارنے لگی۔ ہم کو تو پہلے ہی سے خبر تھی کہ آج کل۔۔۔ رنجیت پر لٹو ہو رہی ہے۔ سالا ہم کو بھی غصہ آگیا۔ کہا" سالی ہم کو پہچانتی نہیں ہے؟" پورا شہر میرے ٹھینگے پر رہتا ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے اپنے کو؟ دوسرے کو یہ ڈینگ شاید بری لگی۔ برا سا منہ بنا کر بولا بھتنی کے کتا بھونکنے پر تو پاد دیتا ہے اور یہاں ڈینگ ہانک رہا ہے؟ اس پر پہلے کو غصہ آگیا۔ اس نے دوسرے کا کالر پکڑ کر جو دھکا دیا تو وہ مجھ پر آگرا اور میں اسکوٹر سے لڑھک کر منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

"سوری۔۔۔ سوری بھائی صاحب۔ پہلے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ جلدی جلدی میرے پیر چھونے لگا۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔" میں نے جلدی سے خفت بھری ہنسی کے ساتھ زمین پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے مولبی صاحب۔۔۔ آداب۔۔۔ آداب" دوسرے نے شاید سمجھ لیا کہ میں مسلمان ہوں۔

"ہیں؟ مولبی صاحب؟ ارے ہاں مولبی صاحب۔۔۔ سلام۔۔۔ سلام۔۔۔ سلام وعلیکم"۔ پہلا بھی دوسرے کی آواز سن کر چونکا، میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بالکل جوکر کی طرح جھک جھک کر آداب کرنے لگا۔

"آداب۔۔۔ آداب!" مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور خوف بھی آرہا تھا۔ "یہ سوم ناتھ نے کس چکر میں پھنسا دیا؟ خود تو گھر کے اندر چلا گیا اور میں یہاں؟"

اسی سمے سوم ناتھ کا چہرہ مکان کی ایک کھڑکی پر آکر ٹکا" آپ جائیے حق صاحب۔۔۔ مجھے کچھ دیر ہوگی"

میں نے بے سوچے سمجھے کک ماری اور ایکسیلیٹر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ مگر اسکوٹر آگے بڑھا کے میں چکر میں پڑ گیا۔ میں اس علاقے میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ میرا اسکوٹر بھاگا جا رہا تھا۔ مگر راستہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آتے وقت سوم ناتھ لگاتار بولتے رہے اور ان کی بات سننے اور جواب دینے میں راستے کا ذرا بھی دھیان نہیں رہا۔ میں رک کر کسی سے راستے کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ اس سے ادھر والوں کو اندازہ ہو جاتا کہ میں اس علاقے کا نہیں ہوں، اس لئے صرف اندازاً موڑ پر موڑ مڑتا رہا۔ میں سوم ناتھ جی کے گھر سے ساڑھے نو بجے روانہ ہوا تھا۔ اب دس بج چکے تھے۔ ہولی کے ہلائے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہولی کے گیت زور زور سے گائے جا رہے تھے۔ جے جے کار کی گونج فضا میں گونج رہی تھی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی وہاں تک ہندو شردھالوؤں کے جتھے کے جتھے اچھلتے کودتے خوشی مناتے نظر آرہے تھے اور میرا اسکوٹر دوڑ رہا تھا اور میرے چاروں طرف رات تھی اور میرے من میں ایک عجیب قسم کی بے اطمینانی تھی۔۔۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال۔۔۔ میں بالکل ہندوؤں کے علاقے میں ہوں۔۔۔ یہ اکھنڈ ہندو علاقہ ہے۔۔۔ آج ہولی کی رات ہے۔۔۔ یہ ہندو علاقہ ہے۔۔۔"

خدا خدا کر کے بغیر سوچے سمجھے موڑ پر موڑ مڑتے میں ایک ایسی سڑک پر پہنچ گیا جو میری جانی پہچانی سڑک تھی، میں اس سڑک پر کئی بار آیا گیا تھا۔

"مسلم ایریا تک پہنچنے میں یہاں سے پانچ سات منٹ لگیں گے"۔ دل میں ایک ڈھارس سی بندھی۔

اب میں پوری رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا۔

میں جب مسلم علاقے میں داخل ہوا تو گھڑی دیکھی۔۔۔ ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ ساری دوکانیں بند ہو چکی تھیں، ہو کا عالم۔ سن سناٹا!

یاد آیا کہ اس علاقے میں ان دنوں مسلم کرمنلس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے۔ چھوٹے بڑے تقریباً درجن بھر جرائم پیشہ لڑکوں کے نام مجھے یاد آگئے۔۔۔ پھر یاد آیا کہ ان سب میں بھی بنے میاں اور گلن خان تو بہت خطرناک قسم کے کرمنل بن گئے ہیں۔ اس علاقے میں کئی قتل ہو چکے تھے کئی اسکوٹر چھینے جا چکے تھے، کئی لوگ سرِ شام لوٹے جا چکے تھے۔ کئی گھروں میں بنے میاں اور گلن خان کے گرگے گھس کر زبردستی ڈاکہ ڈال چکے تھے۔ ایک ڈی ایس پی میری جان پہچان کا تھا اس نے ایک مرتبہ برسبیلِ تذکرہ بتایا تھا کہ پولس والے اس علاقے میں وردی پہن کر کبھی بھی تنہا آنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اب میری گاڑی اور بھی زیادہ تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔

اور میری زبان پر ایک ہی دعا تھی "یا اللہ! مجھے بنے میاں اور گلن خان سے بچانا!" ☆☆

کرامت بخاری

دل سوچتا ہے ۔

ب دور کہیں
پربت سے پرے
تم فضا میں دیپ جلے
دل سوچتا ہے ،

جب یادوں کو بیتی یادوں کی
اور رات کا دامن بھیگ چلے
دل سوچتا ہے ،

جب مجبوری مجبوری ہو
اور چتونا تنکہ دوری ہو
رفتہ رفتہ شام ڈھلے
دل سوچتا ہے ،

جب کچھ بھی اپنے بس میں نہیں
یہ پاگل من کیوں سوچتا ہے ،
کیا کچھ سوچتا ہے ۔
اس بات کو بھی دل سوچتا ہے
دل سوچتا ہے ۔

287-A GOR 5, FAISL TOWN
LAHORE (PAKISTAN)



عاصی کاشمیری

ماہیے

دلدار چلے آنا
جب بھی پکاروں میں
ہر بار چلے آنا

ٹیلے پہ چڑھایا ہے
عشق نے رانجھے کو
جوگی بھی بنایا ہے

پھلی پھولی ہے سرسوں
دیکھے ہوئے تم کو
تو بیت گئے برسوں

کتنے ہی جتن کر کے
ہوئے نہیں تم کو
ہم ترک وطن کر کے

اک سچی کتاب ایسا
پڑھ نہیں پایا میں
چہرہ وہ کتاب ایسا

788-WOODBORUGH ROAD
NOTTINGHAM NG3 5QJ (U.K.)



نصرت گوالیاری

ہائیکو

کیسا ہے یہ میل
نیم سے مانگے شیرینی
انگوروں کی بیل

کاسہ الٹا ہے
نیند آئے کیا اندھے کو
کتا بھوکا ہے

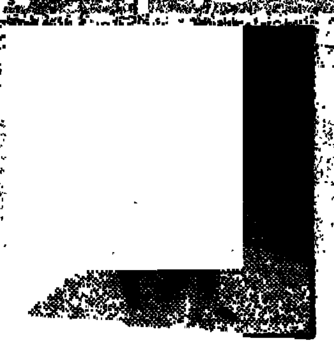
دل پر آنس کا وار
جیسے کوئی بجلی کا
چھولے ننگا تار

سر کو اونچا رکھ
غیرت، عزت، خودداری
کچھ تو زندہ رکھ

بیٹے کیوں ہو تنگ
تم بھی لڑ کر میری طرح
جیتو اپنی جنگ

چپ ہو جاؤ جی
اک حد تک ہی ممکن ہے
کوئی پابندی

5071- CHHATTA BHIJAN
KUCHA REHMAN CHANDNI
CHOWK, DELHI -110006



محمد حسن
D-7, MODEL TOWN, DELHI - 110009

سرگزشتوں کا زمانہ

قیاس کو دخل نہیں دیتا مگر سچ یہ ہے کہ پچھلے چند سال میں اردو میں ایک دو نہیں آٹھ خود نوشت سوانحعمریاں چھپیں ہیں۔ یوں تو تعداد ان سے بھی کہیں زیادہ ہوگی مگر صرف اس دور کے سوانحعمریوں کو شمار کیا ہے جو میرے اپنے زمانے سے قریب تر ہیں اور ان مصنفین کے قلم سے لکھی گئی ہیں جن کے بارے میں فیض کے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے۔ یہ شب ہم پر گزری ہے یہ فرد اہم بھی دیکھیں گے۔ (بادائی تحریف) ان میں ال احمد سرور، مسعود حسین خاں اور سید محمد عقیل، خواجہ احمد فاروقی تعلیم و تدریس سے متعلق ہیں۔ اختر الایمان اور وامق جونپوری اپنے دور کے نامی گرامی شاعر ہیں۔ رفعت سروش ریڈیو سے متعلق رہے ہیں اور ڈرامانگار ہیں حمیدہ سالم مجاز کی بہن اور پروفیسر ابو سالم ماہر اقتصادیات کی بیوی اور خود ماہر اقتصادیات ہیں۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان سب کے زمانے کے نشیب و فراز کے پس منظر میں ان کی آپ بیتی کو جانچا اور پرکھا جائے۔ ان سب کا پس منظر ہے بھی تقریباً یکساں یہ سبھی سوانح عمریاں اس وقت سے شروع ہوتی ہیں جب ہندوستان پر برطانوی حکومت تھی۔ آزادی کی تحریکیں زور و شور سے اور کبھی کبھی خاموشی سے جاری تھیں۔ اور ہندوستان کے مزاج کے مطابق کچھ سماجی اصلاح کی آوازیں اٹھتی تھیں کبھی انتہاپسندانہ انقلابی گھن گرج اٹھتی تھی کبھی کبھی مختلف نوعیت کی سماجی بیداری کا ذکر بھی سننے میں آتا تھا اور ان سب کے درمیان باغیانہ روش کے نشانات بھی ملتے تھے اور ان سب الٹ پھیر اور شور شرابے کے دوران انفرادی زندگیاں نت نئی راہیں تلاش کرتی تھیں۔

ذرا غور سے دیکھیں تو ان سب سوانح عمریوں میں رنگارنگی بھی ملے گی۔ سرور صاحب، مسعود حسین خاں اور خواجہ احمد فاروقی کا تعلق نیم جاگیردارانہ طبقے سے ہے جو اترپردیش کے مختلف شہروں یا شہروں کے نزدیک کے قصبوں میں آباد تھے ان سے آگے بڑھیے تو سید محمد عقیل کا تعلق قصبے سے زیادہ دیہات سے ہے جہاں پرانے شرفا اودھ کی حکومت کی الٹ پھیر کے بعد جاکر آباد ہوگئے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ چاروں نے بعد کو مختلف یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو (یا لسانیات) کے صدر ہوئے۔

ان سے ذرا الگ ہٹ کر دیکھیے تو وامق جونپوری اور حمیدہ سالم نظر آئیں گے۔ وامق جونپور سے اور بیگم حمیدہ سالم ردولی سے تعلق رکھتی ہیں وامق نے اس قصباتی رشتے کو آخر تک نباہا اور کشمیر سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوکر جونپور ہی کے قصبے میں اپنے آبائی مکان کو آباد کیا۔ اپنی جڑوں کی طرف واپسی کی یہ وہ مثال ہے جو کم یاب ہے اور شاید کیفی اعظمی کے علاوہ کوئی بھی دور حاضر کا فن کار اس طرح اپنے وطن میں پھر واپس آکر آباد نہیں ہوا۔

رفعت سروش کا تعلق بھی چھوٹے سے قصبے نگینہ سے ہے مگر انہوں نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس قصباتی رنگ و آہنگ میں براڈکاسٹنگ کے نسبتاً جدید فن میں کامیابی حاصل کی اور تکیہ غلاف پر کاڑھے جانے والے نقش و نگار کے مشغلے سے آگے بڑھ کر آواز کے پھول کھلائے اور نشریات میں نام پیدا کیے، ڈرامے لکھے اور انہیں اسٹیج کیے اور بالآخر شہر ہی کے ہو کر رہ گئے۔

وامق بھی نیم جاگیردارانہ سماج ہی سے ابھرے، خاصے مذہبی خاندان سے متعلق تھے گو اپنی فکر اور تجربے کی روشنی میں مذہبیت کی گرفت سے باہر نکلے اور سماجی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے انقلابی تحریکوں سے وابستہ رہے اور بھوکا ہے بنگال کا گیت انہیں کے قلم سے نکلا۔ خیالات کی تبدیلی کی یہ لہریں ان کی سوانح عمری میں نمایاں ہیں۔ ترقی پسند تحریک پر ان کی تنقید ان کی سوانح کا حصہ نہیں بن سکی ہے۔ مگر بین السطور میں بہت کچھ اشاروں اشاروں میں کہہ دیا گیا ہے۔ پھر اختر الایمان کی اس آباد و خرابہ میں ہے جو ان کی ادھوری سوانح عمری ہے اختر الایمان نے گو اپنی زندگی کے پیچ و خم کو تفصیل اور تجزیے کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے مگر مجموعی طور پر یہ پوری داستان ان کی اپنے منفرد انداز میں بیان ہوگئی ہے۔ شاید یہی ایسی سوانح عمری ہے جس کا ابتدائی حصہ کسی خانہ بدوش لڑکے کی مہم جوئی سے عبارت ہے بعد کے حصوں میں اختر الایمان نے بہت کچھ رد و بدل کر دیا ہے اور اپنی ذاتی زندگی کو بہت کچھ چھپایا بھی ہے اور حلقہ ارباب ذوق اور میراجی سے اپنے تعلق کے جوش میں کم سے کم حیدر آباد کے ترقی پسندوں کے احتجاج کی بات خاصے جانبدارانہ ڈھنگ سے کہی ہے اور بعد کے صفحات میں ترقی پسندوں کی سخت تنقید کرکے خود کو جدیدیت کی حمایت کرنے کی بھی ناکام کوشش کی ہے جو اس سے قبل انہوں نے کبھی نہیں کی تھی اور اسی محویت میں وہ فلمی دنیا میں اپنی نجی زندگی اور خاص طور پر گھریلو زندگی کے پیچ و خم کو بھی نظر انداز کر گئے ہیں۔

یہ سب سوانح عمریاں کئی اعتبار سے اہم ہیں اور ان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے یہاں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی سوانح عمری کے اس ٹکڑے سے بحث ہے جو گئو دھول کے نام سے شائع ہوا ہے جو حیثیتوں سے منفرد بھی ہے اردو اساتذہ کی فہرست میں ٹھیٹھ دیہات سے تعلق رکھنے والے شاید وہ تنہا استاد ہیں یہاں تک کہ سرور صاحب

کا تعلق بدایوں سے ہے مسعود حسین کا قائم گنج سے اور خواجہ صاحب کا مچھرٹوں سے مگر ان میں سب سے کھرا دیہات عقیل صاحب ہی کا ہے۔

سوانح عمری کے شروع میں ایک الجھن پریشان کرتی ہے اور وہ ہے عقیل صاحب کی والدہ کے عقد ثانی کا مسئلہ اور اس پر ان کے خاندان کے لوگوں کی خاموشی یہ نزاع خود عقیل صاحب نے اپنی سوانح کے ابتدائی صفحات میں اٹھایا ہے اور اس طرح اٹھایا ہے کہ ان کے والد کا ان کی کم عمری ہی میں انتقال ہونے کے بعد عقیل صاحب کی تعلیم کا سوال خاصہ بحث طلب بن جاتا ہے یہ بھی اپنے گاؤں کے مشغلوں میں مست تھے۔ کہیں گلی ڈنڈا تو کہیں باغوں کی سیر تو کہیں تیراکی اور شکار۔ کہ اچانک ایک چیلنج یا للکار ملی، اسی کے ساتھ اعجاز صاحب کی سرپرستی بھی اور ان کا علمی سفر شروع ہو گیا اور اسی راہ چلتے چلتے سوبالآخر پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب تک پہنچے۔

الہٰ آباد یونیورسٹی کی فضا اور یہاں کی زندگی کی تصویریں کہیں کہیں ملتی ہیں مگر یہ سب کی سب سوانحی تفصیلات کے ضمن میں ہیں عقیل صاحب اس دور کے شدید تنازعاتی کشمکش کے دوران تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعجب کہ اس زمانے میں یا اس سے کچھ بعد کے دور میں الہٰ آباد یونیورسٹی کا شعبۂ اردو خاصی دیرپا کشمکش کا شکار ہوتا ہے ۔جس کی نوعیت نہ سیاسی ہے نہ نظریاتی۔ایک چھوڑ تین تین تقررات ایسے ہوتے ہیں جن سے تنازعات کا آغاز ہوتا ہے پھر ان کا سلسلہ اتنا طول کھینچتا ہے کہ پورے شعبے کی ہی نہیں بلکہ پورے صوبے کی اردو آبادی کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اس کا ایک سرا تو خود کپتان ضامن علی صاحب اور ان سے ڈاکٹر سید اعجاز حسین سے اختلافات کا سلسلہ ہے پھر شعبے کے تقررات میں رسہ کشی اور اس کے بعد کی بدلتی وفاداریوں نے شعبے ہی کی نہیں یونیورسٹی کی زندگی پر بھی اثر ڈالا۔ عقیل صاحب نے اس ضمن میں بھی روایتی توازن کو قائم رکھا ہے اور پلڑا کسی ایک طرف جھکنے نہیں دیا ہے۔

اس دور کا بیان خاصہ دلچسپ ہے اور صناعانہ بھی کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ عقیل صاحب انگریزی میں بھی ایم اے کر چکے تھے۔ لہٰذا اس کے ڈسپلن کو ہر قدم پر ملحوظ رکھتے ہیں مگر اس کا کیا کریں کہ ادھر ضامن علی صاحب اور اعجاز صاحب کا دور ختم ہوا ادھر شعبے میں ترقی درجات کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی کچھ دن مسیح الزماں صاحب سربراہ رہے پھر احتشام صاحب کا دور آیا اور ان کے انتقال کے فوراً بعد گیان چند شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ مسیح الزماں صاحب سے تو عقیل صاحب کی زیادہ بنی نہیں مگر احتشام صاحب سے لے کر گیان چند تک وہ ہمیشہ صلح کل اور اپنے کام سے کام رکھنے کے قائل رہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کا ذکر عقیل صاحب نے اپنی نجی سرگزشت میں بھی زیادہ تفصیل سے نہیں کیا ہے وہ احتشام صاحب کا دور صدارت تھا کہ جدیدیت کا شوشہ اٹھا اور اس معاملے میں الہٰ آباد کے لوگ خاصے نمایاں رہے بلکہ شب خون کے ابتدائی شماروں میں اعجاز صاحب کا نام بھی بطور سرپرست شامل رہا مگر دھیرے دھیرے شب خون نے ہاتھ پاؤں نکالے اور جدیدیت کے پردے میں ترقی پسندوں پر سوقیانہ لہجے میں اعتراضات کی بھرمار کر دی سب سے پہلا وار احتشام صاحب پر ہوا جو خاصے معتدل اور نرم مزاج ترقی پسند نقاد تھے۔ عمیق حنفی نے احتشام صاحب پر وار کیا پھر تو ہر ایرے غیرے کی زبان کھل گئی۔ احتشام صاحب کی ذات تو الگ رہی ترقی پسند تصورات پر حملے ہونے لگے اس یورش کا آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے والوں میں عقیل صاحب تھے جنہوں نے اسی زمانے میں شب رنگ کے نام سے ایک ادبی رسالہ شائع کیا اور اس میں ایک دو مضامین ہی اس موضوع پر نہیں لکھے بلکہ اسے مستقل موضوع ہی بنا لیا لطف یہ ہے کہ اس جواب الجواب میں وہ جدیدیت کے پسندیدہ شاعروں کی فرگزاشتوں اور حماقتوں کو بھی بے نقاب کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عقیل صاحب نے اپنا تنقیدی مرتبہ حاصل کیا۔ ان کی اردو مثنوی والی کتاب بھی اسی زمانے میں چھپی اور وہ ایک سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے ابھرے۔

گئو دھول میں احتشام صاحب کا ذکر خاصے ادب اور احترام کے ساتھ ہے دراصل عقیل صاحب کے ادبی ذوق کی آبیاری میں احتشام صاحب کی کسی قدر مختصر الہٰ صحبتوں کا بڑا حصہ رہا ہے یہ اور بات ہے کہ احتشام صاحب کی وراثت کا بڑا حصہ صرف عقیل صاحب ہی کے ہاتھ آیا۔

اس دور کے بعد کی کہانی خاصی الجھنوں سے بھری ہوئی تھی۔ جین صاحب کا آنا اور جلد ہی حیدر آباد کے لئے رخصت ہو جانا عقیل صاحب کے لئے مختصر سا دور نشاط تھا اس کے بعد خود انہیں صدر شعبہ کی جگہ کے لئے دوڑ دھوپ کرنی پڑی جن کی تفصیلات گو بڑی احتیاط سے دی گئی ہیں مگر ان میں عقیل صاحب کا ضبط و نظم نمایاں ہے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں صدر شعبہ کی جگہ اتنی عزیز نہ تھی جتنا اس کے ذریعے ادبی اور علمی خدمت کا جذبہ عزیز تھا۔ یہاں بھی وہی کیفیت ہے کہ بقول اکبر: "گفتنی درج گزشت باقی جو ہے ناگفتنی" اس دوران ان کی شادی بھی ہوئی اور وہ بھی کشمیر جنت نظیر میں بچے بھی ہوئے۔ بچے بڑے ہوئے ان کی پرورش اور پرداخت کے مناسب انتظام میں بھی لگے رہے۔ گھریلو زندگی بغیر کسی زبردست ہلچل کے سنبھالتے رہے۔ اسی دوران پروفیسر شپ اور صدر شعبہ ہونے کے مسئلے بھی آئے جن کی جھلکیاں سوانح میں ملتی ہیں۔ بیچ بیچ میں سیر و سیاحت کا بھی ذکر ہے جس کی نوعیت غالب کے اس مصرعے کی سی ہے۔ "سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی"۔ اسی سلسلے میں دہلی یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں مختصر مدت کے لئے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کا بھی ذکر ہے۔ یہاں بھی عقیل صاحب دہلی کے مختلف شعبوں اور ارباب شعبہ کے تذکروں سے بیاں کو سجاتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ کہیں کہیں لطیفوں سے، کبھی کبھار واقعات سے اور کم تر افراد کے شخصیاتی تجزیے سے بیان کو دلچسپ بناتے ہیں۔ مگر اپنی روایتی احتیاط کے ساتھ ان میں شخصی مطالعے بھی ہیں "گو کم ہیں، اس دور کی پرچھائیاں بھی ہیں اور یونیورسٹیوں میں اردو طلباء کے لئے کلاس پڑھانے کے مسائل کی بھی جھلک ملتی ہے۔

پھر کسی پرانے لطیفہ گو کے لفظوں میں داستان سمیٹی ہو تو دنیا سنے تو قصہ غم ہے بہت طویل، گر تم سنو تو قصہ غم مختصر بھی ہے۔ اس سوانح عمری میں مختصر طور ہی سہی مگر وہ حدود ضرور واضح ہوتے ہیں جو اردو اور اس کے مشترکہ قومی ورثے کو عزیز رکھنے والوں کے لئے کیا امکانات اور حدود ہیں اور آزاد ملک میں آزادی کن بندشوں رسے آشنا بلکہ مانوس ہو چکی ہے یہ درست ہے کہ اس دشت امکان کی سیاحی کی تصویر یہاں بالکل واضح الفاظ میں بیان نہیں ہوئی ہے مگر ذاتی اور نجی یادداشتوں کی

شکل میں ضرور نمایاں ہوئی ہے۔

آخری ایام میں گو گودھوں کی رعایت سے سوانح عمری نے عمر گزشتہ کی کتاب کی شکل اختیار کرلی ہے مگر مصنف کو شخصیت کی "زندہ دلی کے مرجھانے اور بے کیف ہونے کا کوئی اندیشہ سامنے نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ زندگی کے "پیشہ وارانہ "سفر کا اختتام آپہنچا اور یہ بھی صحیح ہے کہ بقول فیض "اس دشت میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری مگر خیالات اور اقدار کو یہ ابدی کشمکش آخری صفحے کی آخری سطر تک نمایاں ہے جو گویا اختر الایمان کے لفظوں میں پکار پکار کر کہتی ہے۔ دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں۔"

سچائی بایں ہمہ یہ ہے کہ یہ بین السطور میں پڑھی جاتے والی کتاب ہے لفظوں کے پیچھے اوٹ میں کھڑی ہوئی سچائیاں ہنوز اظہار کی منتظر ہیں یا یوں کہئے زیادہ برملا اظہار کی طلب گار ہیں۔ اس سرگزشت کو ایک فرد کی بپتا کی طرح نہ پڑھا جائے بلکہ اسے وسیع تر تہذیبی رزمیے کے حصے کے طور پر دیکھا پرکھا اور برتا جائے تو اس سے بڑی صداقتیں برآمد ہوں گی کہ یہ دور ہی ان کی صداقتوں پر نہایت سخت گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس صداقت آشوب سے گزرے اور سرفروشانہ گزرے اور اپنے نشاط و کرب کے لمحات کو محفوظ کرسکے۔

(۲)

خیال یہ تھا کہ اس دور میں جتنی خود نوشت سوانح عمری چھپ کر آئی ہیں ان کے دور کے مشترکہ عناصر اور تہذیبی فضا کو یکجا کرکے اس کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے جو اثرات اس دور کی نسلوں پر پڑے ان کا جائزہ لیا جائے کہ یہ کام ہوا ابھی نہیں ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے پس منظر کو یکجا کرنے کی کوشش تو اس درجہ ہوئی کہ تنقید میں دور کا رنگ تو غالب رہا اور فن کار کی تخلیقی اپج کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مگر سوانح عمریوں میں کہ ان میں واقعات اور کردار دونوں افسانے اور ناولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقی ہوتے ہیں اس قسم کی جسارت نہیں کی گئی۔ مثلاً مندرجہ ذیل خود نوشت سوانح عمریوں ہی کو لیجئے تو اس دور میں چھپی ہیں ان میں تین خود نوشت سوانح عمریاں تو مختلف ہوئی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ کی ہیں۔ آل احمد سرور، مسعود حسین خاں اور سید محمد عقیل رضوی جن میں سے دو علی گڑھ کے اور آخر الذکر الہ آباد یونیورسٹی کے ہیں گو ان تینوں کے زمانے میں تقدیم و تاخیر ہے سرور صاحب بہت پہلے سے اردو پڑھا رہے ہیں مسعود حسین خاں ان کے شاگرد رہے ہیں مگر یہ بھی تقسیم ہندوستان ہی سے اس فریضے کی ادائیگی میں لگے ہوئے ہیں۔ عقیل رضوی بہت بعد میں آئے مگر ان کی شخصیت اور ماحول کے جائزے میں ان کی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ آزاد ہندوستان میں اردو کی بدلتی ہوئی صورت حال بھی کسی نہ کسی طرح ضرور جھلکے گی (گو علی گڑھ اور الہ آباد میں فاصلہ بھی ہے اور فرق بھی)۔ یہی صورت دوسری شخصیتوں کے ساتھ ہے۔ مثلاً عوامی ذرائع تمثیل میں رفعت سروش کی آپ بیتی کا تجزیہ بھی دلچسپ ہے کہ نگینہ کے ایک نوجوان کو ریڈیو میں آکر کیسے کیسے بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ذوالفقار بخاری سے لے کر ماتھر تک کی ماتحتی کا زمانہ اکس طرح گزرا اور اس دور میں ان کے اپنی متاع فکر و فن ہی پر نہیں خود ان کی ذات پر کیا بیتی۔

پھر وامق کا معاملہ ان سب سے الگ ہے شاعری اور زندگی دونوں میں ان کی حیثیت الگ ہے۔ راشننگ کے دفتر سے لے کر بھوکا ہے بنگال اور پھر شاہراہ کی ادارت اور سردار جعفری سے اختلافات تک۔ وامق کا رنگ و آہنگ کیا رہا اور کیوں رہا۔ یہ بھی ذرا مختلف معاملہ تو ہے مگر اسی دور سے متعلق اور ملحق ہے اور کیا اور کیوں، کے سلسلے اس دور کے دوسرے خود نوشت نگاروں سے ملتے جلتے ہیں۔

حمیدہ سالم اس دور کے مقبول ترین نوجوان شاعر مجاز کی بہن ہیں اور جاں نثار اختر کی چھوٹی سالی ہیں جن کے سایۂ عاطفت میں جاں نثار اختر کے دونوں بیٹے جاوید اور اویس پلے بڑھے۔ زمانہ ان کا بھی وہی ہے ان کا دائرہ ذرا وسیع ہوا اور یہ غیر ممالک میں جا بسیں اور ردولی کی پردہ نشیں سماج سے نیویارک کی جدید ترین فضاؤں تک رسائی حاصل کی۔ زمانہ ان کا بھی یہی تھا۔ یہ سب لکھ ہی رہا تھا کہ جنت سے نکالی ہوئی حوا نام کی ایک خود نوشت کسی نے بھیجی، آدھی کتاب تو خود نوشت سوانح عمری سے ملتی جلتی ہے باقی آدھی دوسروں کے قصوں سے عبارت ہے جس میں مصنفہ نفیس بانو شمع نے اپنی زندگی کی جھلکیاں دیکھی اور دکھائی ہیں۔ زمانہ اس سوانح کا بھی کم و بیش یہی ہے۔ اب ان سب کو ملا کر اس دور کی تصویر تیار کی جائے تو وہ تصویر کس انداز کی ہوگی؟ یعنی جب ملک آزاد ہوا تو کس قسم کی زندگی ہمیں ملی اور ہم نے جس میں سوانح نگار بھی شامل ہیں، کس طرح اس کی تعمیر اور تعبیر کی۔

اتفاق سے یہ تمام سوانح عمریاں ان خواتین و حضرات کی ہیں جو اتر پردیش کے مختلف قصبوں یا اس زمانے میں قصبے سے بھی چھوٹی آبادیوں میں پلے بڑھے سرور صاحب بدایوں میں مسعود حسین خاں قائم گنج میں سید محمد عقیل رضوی کراری میں رفعت سروش نگینہ میں وامق جونپور میں حمیدہ سالم ردولی میں پلے بڑھے تھے قائم گنج تو خیر ان افغانوں کی محفوظ آبادی کا قصبہ تھا ہی جو براہ راست افغانستان سے آکر آباد ہو گئے تھے مگر ردولی اور جونپور تو ایسی آبادیاں تھیں جو برطانوی تسلط کے دور میں شہروں سے مہاجر خاص طور پر لکھنؤ کے مہاجر شرفا سے آباد تھیں جو انتقامی کارروائیوں سے خائف ہو کر قصبوں میں آباد ہو گئے تھے۔ کراری کی آبادی خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے کی ہے۔ سید محمد عقیل رضوی نے کراری کے آباد ہونے کی تاریخ اور اس کی وجہ تسمیہ پر خاصی توجہ صرف کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"قیاس ہے کہ یہ حیدر کرار (حضرت علی) کے نام پر بسائی گئی ہے میرے بچپن میں کراری کو کراری مشدد کرکے لکھتے تھے کراری کا ذکر مجھے سوائے آئین اکبری کے اور کسی کرانیکل میں نہیں ملا ابوالفضل نے آئین اکبری میں صفحہ ۷۹ پر لکھا ہے کہ کراری کڑا سرکار کا محال ہے" (گئو دھول صفحہ ۸۹)

یہ قصہ ہے کراری کا مگر اس چھوٹے سے قصبے کے نام اور شہرت یا عدم شہرت کی جو تحقیق مصنف نے کی ہے وہ قابل داد ہے گو خود ان کے والد کا زیادہ تر قیام ابدل

پوریا عیدل پور میں رہا۔ جو کراری کے قصبے سے خاصہ قریب تھا ان دونوں میں عقیل سے کونسا قصبہ جذباتی طور پر قریب تھا اور کیوں۔ اس کا راز نہ کھلا مگر کراری سے ان کی جانبداری نمایاں ہے۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے جن حضرات کی سوانح کا ذکر ہے۔ خواہ سرور صاحب ہوں یا مسعود حسین خاں مذکورہ بالا بزرگوں اور دوستوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح مختلف قصبات ہی سے رہا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ بدایوں جو بعد میں محض قصبہ ہو کر رہ گیا کبھی بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا) مگر لطف یہ ہے کہ یہ سبھی خواتین وحضرات اپنے وطن یعنی قصبوں کی فضیلت اور وہاں کی تہذیبی فضا کا ذکر تو مزے لے لے کر کرتے ہیں (اور ان میں اختر الایمان بھی شامل ہیں جن کی سوانح اس آباد خرابے میں چھپ چکی ہے، مگر سوائے وامق جونپوری کے کوئی بھی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آبائی قصبے میں جاکر پھر سے آباد ہونے کو تیار نہیں ہوا۔ خواہ ان کا اپنا آبائی مکان ہی وہاں ان کا منتظر کیوں نہ ہو۔ عقیل کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے کہ کراری کی تحقیق پر اتنی جاں کاہی کرنے کے باوجود ریٹائر ہونے کے بعد آباد ہوئے تو الہٰ آباد کی محمود منزل میں۔ یہ قرب اور یہ دوری بھی توجہ طالب ہے۔

بقول شاعر:

فراق و وصل جداگانہ لاتے دارد ہزاربار بروصد ہزار بار بیا

اس سے نفسیات اور سماجیات کے پیمانوں کا وہ فرق بھی واضح ہوتا ہے جو زیادہ ترقی یافتہ شہروں کو زندگی کا عادی ہو جانے کے بعد چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں پھر سے بس جانے میں مزاحم ہوتا ہے اور کوئی اس مہم کو وامق کی طرح سر انجام دے تو اس کے لئے بڑی قربانی اور ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بحث کو یہی چھوڑیے۔ گنودھول کی ورق گردانی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی سوانح عمری تو ہے لیکن اس کے کم سے کم صفحہ ۲۰۸ تک یہ آپ بیتی سے کہیں آگے بڑھ کر جگ بیتی ہو گئی ہے اور اس دور کی بڑی ہی دلچسپ جذباتی روداد بھی۔ (ان صفحات سے ذاتی شجرے کے صفحات نکال دیئے جائیں تو یقیناً یہ حصہ کسی صورت سے بھی تہذیبی سرگزشت سے کم نہیں جو اس پائے کی ضرور ہے جس پر ستیہ جیت رے جیسے کسی فلم ساز کو فلم بنانا چاہیئے۔

اس کے آگے کی منزلیں بھی بڑی دلچسپ ہیں مگر ذرا ٹھہر کر لڑکپن کے اس دور کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

"چنانچہ (ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد) پٹائی کی خوف سے میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ گھر سے کتابیں لے کر صبح اسکول کے وقت نکلتا مگر اسکول جانے کے بجائے کھیتوں اور باغوں میں گھومتا پھرتا اور ہر فصل کا مزہ لوٹتا۔ برسات ہے تو تالاب میں پیراکی کی مشقیں کرتا، جاڑوں میں امرود کے باغوں میں کنجڑوں کے لڑکوں کے ساتھ بلبلیں پھنساتا اور اس کام کے لئے برگد کے پیڑ پر چڑھ کر اس کے پتوں سے دودھ جمع کر کے لاسہ بناتا جو بلبل پھنسانے کے کام آتا کبھی کسی جاتی ہوئی بیل گاڑی پر بیٹھ کر جوائے رائڈ کرتا اور شام کو گھر لوٹ آتا۔ اسی زمانے میں اپنے گاؤں کے ایک پاسی لڑکے سے جو میرا ہم سن تھا دوستی ہو گئی۔ پاسی کا لڑکا اپنے گھر سے سور چرانے گاؤں کے باہر جنگل کی طرف جاتا اور میں اپنی کتابوں کا بستہ لئے گاؤں سے باہر نکل کر اس سے جا ملتا"۔

"کھلونا کے پاس اور بہت سے فن تھے وہ پیڑ پر بندر کی طرح چڑھ جاتا اور آم جامن توڑ کر لے آتا۔ روز کسی کے آم پر چڑھ کر کچے پکے آم توڑ لاتا۔ تالاب میں تیراکی کی مشقیں کرتا اور اپنے ہم سنوں میں کھیلتا اور پھر ہار جانے پر ان کی پٹائی کرتا اور ذرا ذرا سی بات پر ان سے جھگڑتا۔"

"اسی زمانے میں میاں جی نام کے ایک شخص کہیں سے آئے اور بھائی علی اصغر صاحب کے یہاں قیام پذیر ہو گئے انہیں لاٹھی چلانے کا بڑا اچھا فن آتا تھا۔ ان کے پاس ایک آبنوسی رنگ کی تیل پلائی ہوئی لاٹھی تھی جو پانی میں ڈوب جاتی تھی۔ میں نے اپنی دلچسپی سے یہ فن بہت اچھی طرح میاں جی سے سیکھ لیا۔ اپنے بہنوئی اختر حسین صاحب کی مدد سے مانڈہ سے ایک لاٹھی منگائی اگرچہ میری عمر ابھی دس سال سے زیادہ نہ تھی مگر دیہات کے لاٹھی چلانے والوں نے میرے فن کا احترام کرنا شروع کر دیا تھا (صفحہ نمبر ۲۲) اور اس کے بعد کا یہ قصہ کہ گاؤں کے ایک نوجوان رگھوبیر سنگھ لاٹھی کے فن میں ان کے تنہا شاگرد تھے جو حال ہی میں انتقال کر گئے۔ یہ واقعہ محض تفریح طبع کے لئے نہیں ہے بلکہ اس طرز کے متعدد واقعات اس تہذیبی مزاج کو ظاہر کرتے ہیں جس میں مصنف کی پرورش ہوئی اور جو آج بھی نہ تو محض سینہ کوبی کے لئے ہیں نہ محض تاریخ کا حصہ ہیں بلکہ زندہ حقیقت ہیں گو رائج حقیقت نہیں ہیں۔ ان میں زمینداروں کے ظلم و ستم (صفحہ ۲۶ و ۳۸) اور لطف و کرم (۳۰ و ۳۳) کے قصے بھی ہیں شوکت کے ساتھ نیم رومانی سرگشتی کی (تقریباً) بے کم وکاست روداد بھی ہے۔ ایک نوجوان حنفی لڑکی عشرتی کی قصیدہ خوانی بھی ہے اور سب سے زیادہ حسن کلام کے ساتھ کوشک سلطان کی رونقیں اور عبرتیں۔ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا" میں ملگجے اجالے میں حسن بانو کا ناچ اور بے تکلفی کی صحبتوں میں دور کے جلوے کے مناظر۔ یہ سب صرف چند جھلکیاں ہیں اس دور کے مزاج کی جو آج بھی دلوں کو مسلنے اور جذبات و تصورات کے چراغ روشن کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان میں محاکات کی بے مثل فن کاری ہے جو سوانح کو ناول کی سی کیفیت اور گداختگی بخشتی ہے۔ پھر قبل تقسیم کی فضا تقسیم ہندوستان کی مار کاٹ، اس سے پیدا شدہ انتشار اور اس سب کا بیان ایک ایسے نوجوان کی زبانی جوان کو زد پر تو ہے مگر اس پر آشوب دور کا محض تماشائی ہے اور جب یہ سب کچھ خون کے سمندر کی لہر اپنے پیچھے آنے والی ہزاروں لہروں کو چھوڑ کر گزر گئی تو اس مد و جزر کے کنارے بیٹھا ہوا ایک بے بس نوجوان اپنی ٹوٹی پھوٹی زندگی کے ٹکڑے یکجا کرتا نظر آتا ہے۔

"ہم آگے بڑھے تو کھڑتال بجا بجا کر ایک نابینا انگریز پادری حضرت عیسٰی کی تعلیمات سنا رہا تھا اور پمفلٹ بھی انگریزی اور ہندی میں بانٹ رہا تھا پھر ہارمونیم پر ایک بھجن بھی گانے لگا جس کے بول تھے میرا یسوع مسیح گڈریا I AM SHEPLERD AND YOU ARE MY SHEEP مگر نابینا کون تھا گڈریا یا اس کی بھیڑیں!

(صفحہ ۱۷۴)

علاوہ بریں اس دل آویزی کے باوجود اسے سوانح کے ضمن میں الماری کے اس خود نوشت والے خانے میں رکھ کر بھول جانے پر مصر ہوں تو آپ جانیں مجھے تو یہ تخلیقی ادب کا ایک معجزہ کتنا ہو یارہ خون ہی نظر آتا ہے کم سے کم صفحہ ۲۰۸ تک اور اسی ضمن میں مختلف ادیبوں اور دوستوں کے مرقع بھی ہیں اور ان کے بارے میں وثوق اور صداقت سے بیان کئے ہوئے قصے بھی۔ فراق صاحب، اعجاز صاحب، احتشام صاحب جیسے اساتذہ کی تصویروں سے تو یہ نگار خانہ آباد ہے ہی ساحر، اطہر پرویز، مجاز، احمد عباس، گیان چند وغیرہ وغیرہ غرض ایک پورا عالم خیال ہے جو یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے مگر ان میں بھی سب سے جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے تو تیغ الٰہ آبادی کی (اور جو بعد کو مصطفےٰ زیدی ہوئے)

"تیغ اور مس سرنی کے قصے ادھر ادھر سننے کو ملتے رہے مگر یونیورسٹی کی دنیا ایک وسیع دنیا ہوتی ہے وہاں کسے پروا۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب مصطفےٰ زیدی کی کہانی میں لکھا ہے کہ سروج بالا سرن جسٹس شنکر سرن کی بیٹی تھی یہ بات درست نہیں ہے سروج دہرہ دون کے ایک پنجابی خاندان کی بیٹی تھی جس کا ایک بھائی الٰہ آباد میں اس وقت ڈپٹی کلکٹر بھی تھا۔

"تیغ صاحب کا عشق زوروں پر تھا۔ دوسرا سال آیا تو ستمبر ۱۹۵۱ء میں یہ خبر سننے میں آئی کہ تیغ نے سروج کے عشق میں افیون کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اسپتال کے ڈاکٹروں نے انہیں بچالیا۔۔۔ کیسی عجیب بات ہے کہ تیغ نے جن لڑکیوں سے ہندوستان میں عشق کئے ان سبھوں کے نام 'ش' حرف سے شروع ہوتے تھے اور وہ عورت جو پاکستان میں ان کی قاتل بنی اس کا نام 'ش' (شہناز) سے شروع ہوتا تھا۔ (صفحہ ۱۵۵)

الٰہ آباد کو پروفیسر اعجاز حسین کی لغت میں وہی درجہ حاصل تھا جو رشید احمد صدیقی صاحب کی لغت میں علی گڑھ کو حاصل رہا یعنی جس نے الٰہ آباد کی زیارت نہیں کی وہ ادھورا رہ گیا یا لاہور والوں کی اصطلاح میں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ گویا پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس میں دخل اس بات کا بھی تھا کہ کلکتے کے بعد انگریزوں نے شمالی ہند میں لاہور اور الٰہ آباد ہی کو پایہ تخت کی حیثیت دی تھی دہلی کا شمار تو بہت بعد میں راجدھانیوں میں ہونے لگا اور وہاں بھی دلی والے کہاں تھے بقول غالب دلی میں اہل حرفہ تھا یا باہر کے آنے والے۔ اس پر مستزاد الٰہ آباد میں ہائی کورٹ اور بعض دوسرے اداروں کا قیام اور گنگا جمنا اور تروینی کا سنگم آزادی کی جدوجہد میں نہرو خاندان کا نام کچھ اس طرح اچھلا کہ وہ اس تحریک کے روح رواں ہوگیا۔ غرض اس الٰہ آباد کی تصویریں۔ بغیر اعجاز صاحب کی شگفتگی کے جابجا گوندھول میں در آئی ہیں۔

ایک پہلو ہندی کے ادبی مرکز ہونے کا بھی اس میں شامل ہے۔ خاصے پرانے زمانے سے الٰہ آباد ہندی ادیبوں کا گڑھ رہا ہے اور ان ہندی ادیبوں کا اثر الٰہ آباد کی ادبی فضا سے لے کر ہندوستانی اکیڈمی تک رہا ہے ان ادیبوں کے اثرات کا ذکر بھی جابجا اس سوانح میں موجود ہے گو مرعوبیت نہیں ہے۔

مصنف نے اپنی غیر ادبی دلچسپیوں کا تذکرہ بھی خاصی دیانت داری سے کیا ہے۔ شروع شروع میں جب یونیورسٹی میں درخور حاصل ہوا اور عارضی طور پر لیکچرار کی جگہ ملی اس وقت بھی صاحب تصنیف کو شوق شکار سے زیادہ تھا۔ شکار کا بیان جس قدر دلچسپ اور جاذب نظر ہے اس قدر سوانح حیات کے کم واقعات کا بیان ہے یوں بھی شکار کے واقعات میں دلچسپی کا سامان زیادہ ہوتا ہے اور وہ آسانی سے سننے اور پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھتے ہیں اس پر مستزاد عقیل رضوی کا انداز بیان:

"جناب علی نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں نے تار کو را تفل کے لوہے سے چھلا دیا روشنی کی ایک چوڑی اور تیز لکیر کنار آب تک تیر گئی۔ پانی پینے والے جانور نے آنے والی روشنی کی طرف غضیلی آنکھوں سے گردن پھرا کر جو دیکھا تو میرے بدن میں تھرتھری پھوٹ گئی۔۔۔ مگر میں نے اپنے حواس اور بدن کی تمام طاقت کو سمیٹ کر نشانہ باندھا اور اسپرنگ فیلڈ کی لبلبی دبا ہی تو دی معلوم ہوا کہ جیسے تمام جنگل میں بھونچال آگیا۔

ایک تیز آواز 'ہاؤں' کی آئی اور پھر سطح آب پر سناٹا۔۔۔ جناب علی مجھ سے لاکھ لاکھ کہتا رہا کہ چلئے جانور کو تلاش کریں مگر میں۔۔۔ کسی طرح تیار نہ ہوا۔ ہم مانڈہ سے واپس چلے آئے مگر جناب علی اور چندکول وغیرہ اس زخمی تیندوے کی تلاش میں گئے تیندوا تھوڑی دور پر ایک کتھے کی جھاڑی میں مرا پڑا تھا" (صفحہ ۲۰۰)

شکار کا یہ باب خاصہ دلچسپ ہے مگر یونیورسٹی کے باہر کی زندگی کے جس قدر ہوش ربا جلوے ان صفحات میں جھلک دکھلاتے ہیں ان کی نظیر اس تصنیف میں اور کہیں نہیں ہے اور دراصل یہی کتاب کی جان ہیں۔ یہ تبصرہ بے شک تشنہ ہے شاید غیر متناسب بھی کہ شروع کے دو سو صفحات سے کچھ زائد پر کسی قدر تفصیلی تذکرہ بھی ہے اور اس پر رائے زنی بھی اور اظہار پسندیدگی بھی مگر بعد کے صفحات پر کم و بیش نصف کتاب کے برابر ہیں کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے جواب اس کا وہی ہے۔ کہ بات نظر نظر کی اور اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔

ادھر عقیل صاحب کو الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں جگہ ملی اور ادھر سوانح عمری میں میری دلچسپی ختم ہوئی آگے کی داستان جانی بوجھی ہے بقول فیض۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری　　تنہا پس زنداں کبھی رسوا سربازار

کچھ شعبۂ اردو کے کاٹ پیچ کچھ رفاقتیں اور بیشتر رقابتیں، آگے بڑھنے کی تڑپ اور اس راہ کی دشواریاں کچھ غیبتیں، کچھ لگائی بجھائی۔ مگر عقیل صاحب کے ظرف کی داد دیتا ہوں کہ اکثر جن حادثات کا ذکر کرتے بھی ہیں تو ماتھے پر شکن نہیں لاتے اور خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

"ہر بیان کے ساتھ مصنف چند لمحوں کے لئے اپنی عمر کی اس منزل پر بھی تو پہنچ جاتا ہے جس سے وہ گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو عالم خیال میں اپنی ناآسودہ خواہشات کو بھی تحریر میں پیش کر کے اپنی محرومیوں کی خلش کا بھی مداوا کر لیتے ہیں" (صفحہ ۲۸۰)

مگر اس خود نوشت میں صرف سید محمد عقیل ہی نہیں ہے کسی نہ کسی نہج سے ان کے پورے عہد کی جھلکیاں بھی ہیں یہاں ترقی پسند ادب اور ادیبوں کی کہانی بھی ملے گی۔ جدیدیت کے مبلغوں اور کارپردازوں کی اونچی پرواز بھی نظر آئے گی، شعبۂ اردو کی سازشوں کا عکس بھی دکھائی دے گا سوشلزم اور سوشلسٹ روس کے عروج

وزوال کی بازگشت بھی سنائی دے گی اور اردو زبان وادب کا مدو جزر بھی نظر کے سامنے آئے گا کہ ہم خود کیا سے کیا ہو گئے اور کیا ہوتے جا رہے ہیں۔ ملکی سیاست اور معاشرت بھی اور ہندی ادب کے موڑ پھیر بھی دیکھنے میں آئیں گے۔ اور پھر ان پردوں کے پیچھے انسانی سرشت کی کمزوریاں اور کاٹ پیچ، چھوٹی موٹی خفیف الحرکاتیاں بھی نظر آئیں گی جن کے بارے میں حفیظ جالندھری کا یہ شعر دہرا کر ہی چپ ہو جانا مناسب ہے۔

خبث دروں دکھا دیا ہر دھن غلیظ نے　　　کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

مگر اس کتاب کا مصنف بھی آخر ہماری آپ کی دنیا کا باسی ہے خود اسے بھی اعتراف ہے کہ وہ کوئی فرشتہ نہیں کہ خفیف الحرکاتی خاموشی سے برداشت کرتا ہے لہٰذا اس کا رد عمل دیر سے ہوتا ہے مگر ہوتا ہے شدید۔ چنانچہ اس عمل اور رد عمل کی جدلیت بھی جہاں تہاں نظر آتی ہے مگر اسے تعمیری راہوں تک لے جانے کی کوشش البتہ ظاہر ہے اس دوران کچھ فرد گذاشتیں مصنف سے بھی ہوئی ہوں گی مگر ان کے احساس، ادراک اور بیان تلاش کرنا یہاں ممکن نہیں۔ آخر وہ بھی آدمی اور بقول مجاز

زندگی کیا ہے گناہ آدم　　　آدمی ہیں تو گنہہ گار ہیں ہم

اس سوانح عمری میں اعجاز صاحب بھی ہیں فراق صاحب بھی احتشام صاحب اور گیان چند جین بھی اور ان سب کے مرقعے خاصے دلکش ہیں ان میں کسی قسم کی غیر معمولی عقیدت مزاحم نہیں ہوئی ہے اور یہ سب مل کر ایک ایسے دور کی یاد تازہ کرتے ہیں جب تازگی اپنی زندگی اور رنگارنگی کے اعتبار سے گویا ایک جیتا جاگتا نگار خانہ تھی۔

رہی عقیل صاحب کی تصانیف کی بات۔ ان میں مجھے اردو مثنوی پر ان کی کتاب اور اردو مرثیے کی ادبی سماجیات پر ان کی تصنیف عزیز ہے گو آخر الذکر میں سماجیات کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوا ہے مگر اس پر جو مخالفت کا طوفان اٹھا اس نے مجھے اس تصنیف سے قریب تر کر دیا کہ جہاں تعصب بے مہار ہو جائے وہاں حمایت کا جذبہ بھی اسی شدت سے ابھرتا ہے۔

پھر ان کے سفرنامے ہیں جو اس کتاب کے علاوہ لندن او لندن کے نام سے بھی چھپے ہیں اور اس کتاب میں بھی دہلی، حیدر آباد، ممبئی اور کلکتے سے لے کر برطانیہ اور پاکستان تک آغوش میں سنبھالے ہوئے ہیں ان میں میرے نزدیک حیرت کی بات یہ ہے کہ عقیل صاحب نے کتاب علم اور اپنی تاریخ دانی کے ذوق سے لندن کیا پیرس تک کے نوادر کو زیر کر دیا مگر انہوں نے اپنی تہذیبی اور ثقافتی حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش بلکہ ہمت نہیں کی۔ بات تو مختلف قسم کی ہے مگر کیا کروں جوش صاحب ہی کا شعر یاد آتا ہے وہی نقل کرتا ہوں جس کو تفہیم کے لئے بلاغت کے عرفان کی ضرورت ہوگی۔

افسوس جوش کتنے سخن ہائے گفتنی　　　خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

غرض یہ سوانح کو مختلف تاثرات کا ایک سلسلے میں سلیقے سے گوندھا ہوا مجموعہ ہے مگر اپنے دور کی ایسی بے لاگ گواہی خود نوشت کے انداز میں کم تر ملے گی۔ اپنے کو غیر کی نظر سے دیکھنے کی جرأت پیدا کرنا آسان نہیں اور اس دشواری کو عقیل صاحب نے اپنے اوپر بڑی مشکلیں جھیلنے کے بعد آسان کیا ہوگا بقول شاعر:

ایں قدر دانم کہ دشوار ست آساں زیستین

بقیہ صفحہ ۳۹ : گواہی

تمہاری بیٹی بھی شادی کے لائق ہو چکی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مزدوروں کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا، انہیں بھرپور معاوضہ دیا جائے گا۔ بس اس وقت تم وکیل کی بات مان لو پھر جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ مالکان کے ہاتھ کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ویسے بھی پرائے دیس سے ہیں۔ کیا فائدہ ان سے جھگڑا مول لینے کا۔

منیجر نے محبوب الحق کو رات اپنے گھر پر ہی روک لیا تھا اور دوسری صبح اپنے ساتھ عدالت لے کر گیا تھا۔

میٹنگ سے لے کر رات عدالت کے کٹہرے میں آنے تک محبوب الحق مسلسل اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا تھا۔ کبھی گوری چمڑی والے کی بات اسے قائل کرتی ہوئی لگتی اور کبھی اس کا ضمیر اس پر حاوی ہو جاتا۔ کبھی ماضی کی محرومیاں اور نامرادیاں اسے یاد آتیں۔ کبھی آسائشوں سے بھرے حال کی آزمائشیں اسے ڈنک مارتیں اور کبھی ڈوبتا ابھرتا مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔

مسلسل ذہن پر زور دیتے رہنے سے محبوب الحق کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں لال بھبھوکا ہو گئیں۔ اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی اور اپنا وجود ہوا میں معلق لگا۔ اس نے گھبرا کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کر کچھ لوگ اسے سہارا دینے کے لئے بڑھے جن میں گوری چمڑی والا منیجر بھی شامل تھا۔ اسے سینے سے لگا کر پوچھا "کیا ہوا محبوب الحق؟ تم ٹھیک تو ہو؟" جواب میں محبوب الحق نے پانی مانگنا چاہا مگر کوشش کے باوجود اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ اس کی قوت گویائی واقعی ختم ہو چکی تھی۔ محمد محبوب الحق ہمیشہ کے لئے گونگا ہو چکا تھا۔ ☆☆

ساحر شیوی

نے پانی پہ کیا لکھا ہے
ں میں جینا بھی اک سزا ہے
جانے کب تک کھڑا رہے گا
ریت پر اس کا گھر بنا ہے
سب میں تقسیم کررہا ہوں
تجربوں نے مجھے دیا ہے
رے کہنے پہ کیوں چلوں میں
الگ سب سے راستا ہے
بھر نہیں سکتا زندگی میں
زخم تو نے مجھے دیا ہے
جنگ کے بدلے صلح کرلیں
میں دونوں کا فائدہ ہے
نہیں خوف زندگی سے
زندہ ہوں میرا حوصلہ ہے
وہ خود کو بدل نہ پایا
زمانے سے کیوں گلہ ہے
زندگی کے سفر میں ساحر
گرا ہے کبھی اٹھا ہے

● 47-SUTTON GARDEN, SUDON PARK, LUTON BED LU3 3AF (U.K.)



بھٹناگر شاداب

امیدوار ہوں شاید یہ کام ہوجائے
ادھر سے گزریں تو میرا سلام ہوجائے

اگر لبوں پہ لگادی ہے مہر خاموشی
تو پھر نظر کا نظر سے کلام ہوجائے

کہیں ٹھہرتا نہیں ہے مرا یہ دل دو پل
ہے اس کی ضد، اسی در پر، قیام ہوجائے

سریلے گیت پرندوں کے چھین مت صیاد
انہیں کے ساتھ نہ دنیا تمام ہوجائے

یہ کیسا کرب ہے نغمات ساز الفت میں
جو درد دل مرا ان میں دوام ہوجائے

تمام عمر رہی ہے حقیقتوں کی تلاش
اگر تلاش ہی خد نذر جام ہوجائے

لہو کا دورہ ہماری رگوں میں ہو کہ نہ ہو
نفس ہو پاک تو شاداب نام ہوجائے

● 48-B.M. COMPOUND, G.T. ROAD GHAZIABAD-201009 (U.P.)

یوسف اعظمی
تنہا موسم

موسم کا جسم دھندلا ہی دھندلا ہے کیا کریں
ایسی فضاء میں آنکھ پہ کہرا ہے کیا کریں
صحرائے دشتِ غم میں ہے شب خون ہر طرف
اب رہزنی کی زد میں اجالا ہے کیا کریں
روشن صدی میں سبز اجالوں کا خون ہے
دستِ حنا میں خون تمنا ہے کیا کریں
سولی پہ موسموں کی چمن کی حیات ہے
سائے میں خنجروں کے پرندہ ہے کیا کریں
دل کی ہر ایک چیخ ہے لفظوں کی دھار پر
ہر سمت آج زخم کا میلہ ہے کیا کریں
نقشِ قدم تو چاند کے سینے پہ ثبت ہیں
دنیائے قلب وجاں میں اندھیرا ہے کیا کریں
جس بانسری کی تان میں وحدت تھی اعظمی
وہ نغمگی بھی گونج سراپا ہے کیا کریں

● 5-9-1110/4/A, KING KOTHI HYDERABAD-500029 (A.P.)

محمد مظہر الزماں خان
H. No. SPL. C.C.I.B.
KACHIGUDA-HYDERABAD - 500027

دستاویز



تصدیق نامہ----
تمسک ناطہ دعویٰ----
تاریخ----؟
دن-انام
موسم----(کوئی بھی نہیں)
باوشاہت رصدارت؟
پہلا مقدمہ----آخری مقدمہ-
انصاف---(باقی ہے)
---شور ہی شور---

آرڈر، آرڈر۔ اسقدر شور عدالت کے اصول کے خلاف ہے کہ یہ انصاف گاہ ہے۔ یہاں سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہوتا ہے اور آداب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

"یور آنر۔ اس شور سے عدالت عالیہ میں موجود کسی بھی فرد کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ یہ شور تو عدالت کے اطراف پھیلے ہوئے بے شمار پیپل، برگد، ببول، جامن، شیشم اور نیم کے درختوں پر الٹی لٹکتی ہوئی ان ہزار ہا چمگادڑوں کا ہے جو اپنے سیاہ لباس میں دن رات ان درختوں پر جھولتی رہتی ہیں جیسے صدیوں سے انصاف جھول رہا ہے۔ لہٰذا عدالت سے میری گذارش ہے کہ وہ ان درختوں کو کٹوادیں جن کی ہر شاخ پر چمگادڑوں کے گوشے کے گوشے صدیوں سے جھول رہے ہیں۔ شاید جناب عالی نے کبھی ان کی آوازوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ ورنہ یہ آوازیں صبح سے رات تک سنائی دیتی ہیں۔ اکثر جب بغیر کسی فیصلے کے عدالت کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ چمگادڑیں اپنی مکروہ آوازوں سے زمین اور آسمان سر پر اٹھالیتی ہیں جیسے انصاف کا ماتم کررہی ہیں کہ یہ بوڑھی حرافہ زمین کی کہانی ہے جس پر ہم جیسے یا مجھ جیسے عیار کچ مچ لیتے ہیں۔ اگر ان چھتنار درختوں کو کٹوادیا جائے تو شاید یہ کہانی بے اثر اور بے آواز ہو جائے کہ آواز ہی بہت اہم ہے اگر وہ چھن جائے تو زمین ہی گونگی ہو جائے گی اور پھر ان درختوں کو کٹوانے کے لئے کسی کاغذی لباس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ صرف زبانی حکم ہی کافی ہوگا اور پھر آج کل تو بیکار کاغذی حکم ناموں سے زیادہ زبانی حکم ہی چل رہے ہیں۔ لہٰذا زبانی حکم ہی دیا جائے کیوں کہ زبانی حکم کی کوئی سند نہیں ہوتی ویسے کسی بھی سند کی ان دنوں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

"ٹھیک ہے، مجسٹریٹ نے کہا۔" ہم ایسا ہی کریں گے کہ ہم ایسا ہی کرنے کے عادی ہیں۔ اس شور سے عدالت عالیہ کا بے حد قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ لیکن ہم نے سنا ہے کہ عدالت کے اندر بھی چمگادڑوں نے اپنے گھر بنا لیئے ہیں مگر ان چمگادڑوں کو کہیں کسی نے دیکھا نہیں۔

یس یور آنر: لیکن ایسا یقین سے کہا نہیں جاسکتا کہ ایسا ہے مگر اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ چمگادڑیں موجود نہیں ہیں۔" اس تعلق سے ہم اگلی صدی میں غور کریں گے کہ اس صدی میں ہمارے پاس غور کرنے کے لئے وقت نہیں۔ اب کارروائی شروع کی جائے کہ یہ بہت اہم مقدمہ ہے کہ یہ مسلسل چل رہا ہے اور آج تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ یہ دھاگے کے کچے کچے پھندے کی طرح ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کا کوئی سرا ملتا ہی نہیں اور اب بیسویں صدی ختم ہو چکی ہے اور اکیسویں صدی کا چہرہ بھی صاف نہیں ہے۔ خیر مقدمہ شروع کیا جائے کہ وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔

"یور آنر: میں کہہ رہا تھا کہ یہ مجرم جو عدالت کے کٹہرے میں چپ چاپ کھڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا سفاک اور بے رحم قاتل ہے کہ اس کی مثال اس پوری زمین پر کہیں نہیں ملتی۔ کیونکہ اس نے ایک بے قصور، معصوم اور نہایت خوبصورت اور بے داغ انسان کے جسم کو اس بے دردی سے چھلنی کردیا کہ مقتول کے جسم کا کوئی عضو سلامت نہیں رہا۔ لہٰذا عدالت سے میری التجا ہے کہ اپنے سابقہ انصاف کو برقرار رکھتے ہوئے قاتل کو ایسی عبرتناک سزا دے کہ ساری انسانیت، بشرطیکہ انسانیت موجود ہو۔ کانپ اٹھے۔

"تمہیں اپنی صفائی میں اگر کچھ کہنا ہے تو کہہ سکتے ہو کہ عدالت تمہیں اس کی اجازت دیتی ہے"۔ مجسٹریٹ نے مجرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی صفائی میں بھلا میں اب مزید کیا کہہ سکتا ہوں یور آنر۔ میرا تو بس ایک ہی کہنا ہے جو میں مسلسل کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہ قتل نہیں کیا اور میں بے قصور ہوں۔ لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں جبکہ میرے وکیل صفائی نے بھی صاف طور پر اور بار بار عدالت سے یہی درخواست کی ہے

کہ میں قاتل نہیں ہوں۔

"پھر تمہاری انگلیوں کے نشانات ان ہتھیاروں پر کیسے پائے گئے جن سے تم نے قتل کیا ہے۔ وکیل سرکاری نے کہا۔ "یور آنر ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جن ہتھیاروں سے مجرم نے قتل کیا ہے ان ہتھیاروں پر بڑی عجیب و غریب زبان لکھی ہوئی ہے جسے کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا کہ دنیا کے تمام ماہر لسانیات دیکھ چکے ہیں ان ہتھیاروں پر لکھی زبان کسی کو سمجھ ہی میں نہیں آتی پتہ نہیں یہ کون سی زبان ہے۔ کس ملک اور قوم کی ہے کہ جسے دنیا کا کوئی بھی فرد پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اور انہیں ہتھیاروں سے مجرم نے ایک نہایت خوبصورت اور معصوم جسم کو چھلنی کیا ہے۔ لہٰذا عدالت سے میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ قاتل کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

"یور آنر۔ میں عدالت سے ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ عدالت مجھے سزا دے کر اپنا دامن خون آلودہ نہ کرلے کہ یہ دھل ہی نہ سکے گا اور پھر پھیلتا ہی جائے گا اور اتنا پھیلے گا۔ اتنا پھیلے گا کہ انصاف کا چہرہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ بیشک ان ہتھیاروں پر میری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں لیکن میری ہی انگلیوں کے نشانات کی طرح سبھوں کی انگلیوں کے نشانات بھی ان ہتھیاروں پر موجود ہیں کہ آج ہم سبھوں کے ہاتھ ایک جیسے ہی ہو چکے ہیں۔ اور اگر میری بات پر یقین نہ آئے تو سب سے پہلے وکیل سرکاری کی انگلیوں کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھے جائیں اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس قتل میں وکیل سرکاری بھی شامل ہیں۔ میری عدالت سے یہ گذارش ہے کہ وہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھ لیں۔

"یہ ناممکن ہے۔ اور ایک مہذب وکیل پر جھوٹا الزام ہے۔ کیونکہ دنیا میں کسی بھی شخص کی انگلیوں کی لکیریں کسی اور شخص کی لکیروں سے مل ہی نہیں سکتیں۔ عدالت تمہاری اس دلیل کو تسلیم نہیں کر سکتی۔"

"مجھے مکمل یقین ہے یور آنر کہ ان ہتھیاروں پر میرے ساتھ وکیل سرکاری کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ اگر عدالت کو میرے اس دعوے پر شک وشبہ ہے تو وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی دیکھ لیں۔ اور اگر میری بات غلط ثابت ہو جائے تو عدالت مجھے جو چاہے سزا دے۔"

ایک بار پھر عدالت میں ایک شور سا اٹھا۔ ان درختوں کو فوراً کٹوا دیا جائے کہ چمگادڑوں کی آوازیں عدالت کا قیمتی وقت خراب کر رہی ہیں۔ اور عدالت کا وقت خراب کرنا۔ عدالت کو خراب کرنے کے برابر ہے۔

"تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجسٹریٹ نے گرجدار آواز میں کہا"۔

"یس یور آنر میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک سنگین جرم ہے لیکن عدالت سے میری التجا ہے کہ وہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ بھی ملاحظہ فرمائیں۔"

"یہ سراسر ایک الزام ہے ہز ہائی نس (HIS HIGHNESS) مجرم خواہ مخواہ عدالت کا وقت برباد کر رہا ہے اور جو الزام مجرم نے مجھ پر لگایا ہے وہ قانون کے ایک محافظ کا مذاق اور توہینِ عدالت وانصاف ہے۔ کیونکہ یہ جس کو جہاں چاہیں اور جب چاہیں پیدا کرنے اور مجرم قرار دینے کے برابر ہے اور یہی کچھ مسلسل ہو رہا ہے کہ مجرمین جب جی چاہا اپنے چہرے پر کسی کا بھی چہرہ لگا رہے ہیں۔ حتیٰ کے نصاب اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ شہروں اور ملکوں بلکہ لطفوں کی شکلیں تک بدلی جا رہی ہیں۔ تاہم اگر مجرم کی یہی خواہش ہے تو میں اپنی انگلیوں کے نشانات اسی وقت پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ نکالے گئے اور پھر عدالت عالیہ کے سامنے پیش کئے گئے تو سبھوں نے اپنی اپنی انگلیوں کو اپنے اپنے دانتوں میں دبالیا کہ ان ہتھیاروں پر پائے جانے والے سرکاری وکیل کی انگلیوں کے نشانات بھی ہو بہو قاتل کی انگلیوں کے نشانات جیسے ہی تھے۔ رائی برابر بھی فرق نہ تھا۔ چنانچہ وکیل سرکاری کو بھی عالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تو کٹہرا کچھ اور پھیل گیا کہ جب بھی کسی مجرم کو کٹہرے میں لایا جاتا کٹہرا آپ ہی آپ پھیل جاتا تھا۔

یور آنر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھوں کے نشانات دوسرے آدمی کے ہاتھوں کے نشانات ایک جیسے ہی ہوں آج تک ہم نے کہیں دیکھا اور نہ سنا۔ مگر ایسا ہوا ہے اور ایسا ہو جانا ہم سبھوں کے لئے بڑے تعجب اور فکر کی بات ہے۔ نئے سرکاری وکیل نے کہا تو کٹہرے میں کھڑے ہوئے پہلے وکیلِ سرکاری نے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔ یور آنر اگر میرے فنگر پرنٹ قاتل کے فنگر پرنٹ سے میل کھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صرف میرے بلکہ مہذب وکیلِ سرکاری اور وکیلِ صفائی کے ساتھ ساتھ تمام گواہوں کے فنگر پرنٹ بھی نکال کر دیکھے جائیں کہ ہم میں سے کون کون اس قتل میں شامل ہے کیونکہ مجھے بھی سارے وکلاء اور تمام گواہوں پر شک ہے لہٰذا میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ جس طرح میرے فنگر پرنٹ نکالے گئے ہیں اسی طرح عدالت میں موجود سبھوں کے فنگر پرنٹ بھی نکالے جائیں کہ یہ بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ مقدمہ اب نیا موڑ اختیار کر چکا ہے اور اس موڑ اور راستے پر ہم سب چل رہے ہیں جو مذبح کی طرف جاتا ہے۔

عدالت میں پھر ایک زبردست شور اٹھا جو چمگادڑوں کے شور کے ساتھ مل کر پوری عدالت میں پھیل گیا تھا۔

"آرڈر۔۔۔ آرڈر! مجسٹریٹ نے بلند لیکن لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ عدالت یہ حکم دیتی ہے کہ نہ صرف عدالت میں موجود افراد بلکہ تمام شہریوں، وزیروں وغیرہ وغیرہ کے فنگر پرنٹ نکالے جائیں کیونکہ مقتول کا خون اب تمام ہاتھوں پر دکھائی دے رہا ہے کہ اب ہر ہاتھ مشکوک ہو گیا ہے۔"

اور پھر ایک کے بعد ایک سبھوں کے فنگر پرنٹ لئے گئے۔

[باقی صفحہ ۳۲ پر دیکھئے]





صبا اکرم

چھوت کی بیماری

ہمارے شہر کے
خارش زدہ کتے تو سارے
ایک جیسے ہیں
وہ دیسی ہوں
بدیسی نسل کے ہوں،
بھونکتے ہوں
آنے جانے والے ہر اک
اجنبی کو دیکھ کر،
یا دم ہلاتے ہوں
وہ آقاؤں
کے قدموں سے لپٹ کر
یا گلے میں اپنے
سونے سے بھی زیادہ قیمتی پٹہ
غلامی کا وہ پہنے ہوں،
انہیں تو جتنی جلدی ہو سکے
تم بلدیہ والوں سے کہہ کر
زہر دلوادو
کہ خارش بھی
وفاداری کی صورت
پھیلنے والا مرض ہے چھوت کا
تم کو بھی لگ سکتا ہے، ہم کو بھی!!

● C-102, RUFI SWEET HOMES, GULSAN-E-OMAIR, MAIN UNIVERSITY ROAD, KARACHI-75290.

حسن فرخ

ہلکا ہلکا سا نشہ جسم میں بھرتی خوشبو
سرمئی شام کے زینوں سے اترتی خوشبو

دائرہ دائرہ جذبات کے طوفانوں میں
دھیمی دھیمی سی تپش بن کے ٹھہرتی خوشبو

کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی لرزتی سانسیں
سرخ رخساروں کی مانند ٹھٹھرتی خوشبو

رسمساتے ہوئے عارض کے بلاوے کی طرح
کسمساتی ہوئی باہوں میں اترتی خوشبو

لمس کے نور میں بہتا ہوا سرشار گلاب
جسم کے مست جزیروں سے نکھرتی خوشبو

ان کہی باتوں کی مانند مہکتی زلفیں
کنوارے خوابوں کی طرح خود میں سنورتی خوشبو

آ کہ سینے میں چھپالوں کہ کوئی دیکھ نہ لے
اے بلا خیز ہواؤں میں بکھرتی خوشبو

● HOUSE NO.10-1-160, HUMAYUN NAGAR, HYDERABAD-500028 (A.P.)

خاور نقیب

ایک اجلی نظم

دن سیاہی پوت کر رخصت ہوا
رات کے کالے سمندر میں شناور
سینکڑوں بے رنگ و رامش کشتیاں
جن کے ادھڑے بادباں سے اٹھ رہی ہے
فاحشہ جذبوں کی بو،
دن سیاہی پوت کر رخصت ہوا
رات گہری ہو چکی
نیگرس کے کالے آنچل
کب کے اجلے ہو چکے

شکم پاتال

پیٹ، روٹی مانگتا ہے
اس کے اندر
بھوک کے صحرائی گلکس چہل قدمی کر رہے ہیں
اور شکم پاتال کی بھٹی ہے روشن
میری پژمردہ رگوں کو
ہر گزرتے پل کی اینٹھن چوستی ہے
چاہتا ہوں
کوئی میرے پیٹ پر کوہ ہمالہ باندھ دے
بھوک کے صحرائی گلکس کو کچل دے

● EDITOR "TARWEEJ" P.O. KOOD SUNGRA DISTT. CUTTACK (ORISSA)

عتیق انظر
P.O. BOX. NO.40089
DOHA (STATE OF QATAR)



ادب مہجر

جو کہانی میں آپ کی سماعتوں کی نذر کر رہا ہوں اس کا عنوان ہے 'ادب مہجر' اس کہانی کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود بھی اس کہانی کا ایک چھوٹا سا کردار ہوں۔ یوں تو یہ کہانی اسی لمحہ عالم وجود میں آچکی تھی جس لمحہ خالق کائنات نے حضرت آدم علیہ السلام کو شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے کی پاداش میں جنت سے دنیا کی جانب ہجرت کا حکم دیا تھا، جنت کی یاد میں آدم کا آنسو بہانا اور ان آنسوؤں سے لفظوں کو سیراب کرنا 'ادب مہجر' ہے۔ مہجر مشتق ہے ہجر اور ہجرت سے، گویا 'ادب مہجری' کا اطلاق عموماً اس ادب پر ہوگا جو وطنِ مالوف سے دور اجنبی سرزمین پر تخلیق پذیر ہوا اور بطورِ خاص جس میں وطن سے محبت کا نغمہ ہو، وہاں کے پھول، پیڑ پودے، پرندے، آبشار، وادی، پہاڑیاں، موسم، کھیت، کھلیان احباب واعزا وغیرہ سے بچھڑنے کے دکھ کا اظہار اور انہیں پانے اور ان سے ملنے کی حسرت ہو، اسی طرح ہجرت اور مہجر یعنی مکانِ ہجرت کے مسائل، احساسِ غربت، نئے حالات، اور نئے تقاضوں سے سمجھوتے کی دشواریاں، نئی کائنات کی راحتیں اور کلفتیں، وہاں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل اور مختلف سرگرمیاں، اجنبی جگہ، ناآشنا لوگ اور غیر مانوس تہذیب سے معاملوں کا اظہار بھی 'ادب مہجر' میں شامل ہے۔ ہجرت انسانی زندگی کا انتہائی المناک سانحہ ہے۔ ان مقامات سے جدا ہونا جہاں لڑکپن کے سہانے دن گذرے ہیں، ان مناظر سے بچھڑنا جن سے آنکھیں مانوس ہیں، ان ہواؤں اور فضاؤں سے محروم ہونا جن میں سانسوں کی گرمی اور دل کی دھڑکنیں ہیں، اپنی زمین اپنے لوگ اور اپنی مٹی سے دور ہونا، اپنا گھربار اور اپنا شہر چھوڑنا انتہائی دشوار عمل ہے، ہجرت کا لمحہ اتنا دلدوز ہوتا ہے کہ پتھر کا سینہ بھی شق ہو جائے، انتہائی سخت دل انسان بھی اپنے آنسوؤں کے طوفان پر قابو نہیں پاتا، پورے ماحول پر اداسی اور افسردگی کا مہیب سایہ ہوتا ہے وقتِ ہجرت کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا غالب نے کہا۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

آیئے اسی حوالے سے انسانی تاریخ کی چند اہم ہجرتوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ اور نو مولود اسمٰعیلؑ کے ساتھ سرزمین عرب کی جانب ہجرت کر رہے ہیں، تین نفوس کا یہ مختصر قافلہ کٹھن دشوار گذار راستوں پر گامزن ہے، اس کی ایک جھلک حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کے ان تین شعروں میں ملاحظہ فرمائیں:

چلا جاتا تھا اس تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر　　جہاں دیتا ہے انساں موت کو ترجیح جینے پر
وہ صحرا جس کا سینہ آتشیں کرنوں کی بستی ہے　　وہ مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترستی ہے
وہ صحرا جس کی وسعت دیکھنے سے ہول آتا ہے　　وہ نقشہ جس کی صورت سے فلک بھی کانپ جاتا ہے

ان اہم ہجرتوں میں رام جی کے بن باس کی داستان بھی شامل ہے۔ اردو کے معروف شاعر چکبست نے رام جی کے واقعے اور وقتِ ہجرت کے جذبات واحساسات کو اپنی نظم میں انتہائی دردانگیز اور متاثر کن انداز میں نظمایا ہے۔ میں یہاں اس نظم کے صرف دو بند پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا، پہلے بند کا پس منظر یہ ہے کہ رام جی اپنے پتا جی سے وداعی ملاقات کے بعد اپنی مغموم والدہ کی خدمت میں اجازت کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور والدہ یوں گویا ہوتی ہیں:

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں　　میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں　　لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

پھر رام جی اپنی ماتا جی کو اطمینان و تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام　　بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام　　قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج وبلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اور اخیر میں ایک بیت کہ: اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

اس باب میں تقسیم ہندو پاک کے بعد اپنے خوابوں کے دیس پاکستان کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کی ہجرت کے واقعے بھی ہیں جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہجرت کے اس دل دہلا دینے والے حادثے میں نہ جانے کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو گئے، کتنے خاندان بے گھر ہو گئے، ریل گاڑیوں میں مہاجرین کے بجائے ان کی لاشیں گئیں، ہر طرف آگ اور خون کی ہولی تھی، ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ اس ہجرت پر مہاجرین یا غیر مہاجرین نے جو شعر و ادب تخلیق کیا ہے وہ اردو ادب کا بہت جاندار حصہ ہے اس لئے کہ اس میں تجربے اور مشاہدے کی سچائی اور اسلوب کی بے ساختگی ہے۔ اس حوالے سے ناصر کاظمی کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ دلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
ذرا گھر سے نکل کر دیکھ ناصر چمن میں کس قدر پتے جھڑے ہیں
انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے

یوں تو تاریخ کے سینے میں اور بہت سی ہجرتوں کے المناک سانحے محفوظ ہیں۔ لیکن اخیر میں میں یہاں صرف ایک اور ہجرت کا ذکر کرنا چاہوں گا جہاں ہجرت کو مقدس فریضہ اور عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ہے مکے سے مدینے کی جانب۔

حفیظ جالندھری کے چار مصرعوں میں صحابہ کرام کی مظلومیت کی تصویر ملاحظہ فرمائیں:

وہ جن پر ظلم کے بیداد کے بادل برستے ہیں وہ جو اپنے وطن میں سانس لینے کو ترستے ہیں
جو ناحق کے ستم سہتے ہیں اور مغموم رہتے ہیں وطن کو چھوڑ کر بھی بے کس و مظلوم رہتے ہیں

اور شبِ ہجرت کا ہولناک منظر ان تین ابیات میں دیکھیں:

جگا کر اپنے فتنے رات نے پھیلا دیے دامن فضا پر لشکرِ ظلمات نے پھیلا دیے دامن
مسلط ہو گئیں خاموشیاں دنیائے ہستی پر ستاروں کی نگاہیں جم گئیں مکے کی بستی پر
نہیں تھا دامنِ کعبہ پر زمزم اشک جاری تھا چٹانیں دم بخود تھیں وادیوں پر ہول طاری تھا

مدینہ آکر حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت بلالؓ کو اپنے وطن مکے کی یاد ستاتی ہے، جب ان کے دلی جذبات کا علم اللہ کے رسول ﷺ کو ہوتا ہے تو آپ دعا فرماتے ہیں:

"اے اللہ جس طرح ہمیں مکہ پیارا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا"

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر ہجرت ناگزیر نہ ہوتی تو میں مکہ ہی میں مقیم رہتی، میں نے کبھی بھی آسمان کو زمین سے اتنا قریب نہیں دیکھا جتنا سرزمینِ مکہ سے، کسی شہر میں میرے دل کو وہ طمانیت حاصل نہ ہوئی جو طمانیت مکہ میں نصیب ہوئی اور چاند مجھے اتنا خوبصورت کہیں اور نظر نہیں آیا جتنا خوبصورت مکہ میں نظر آیا۔

ہجرت کے یہ چند واقعے اس ہجرت اور اس کے ادب کو پیش کرنے کے لئے بطور تمہید مذکور ہوئے ہیں جو میری گفتگو کا موضوع ہے۔ دو عالمی جنگوں کی بھیانک تباہی کے بعد مغرب کی ازسرِ نو تعمیر و آبادکاری کے لئے ایشیائی باشندوں کو ابتداء مغرب لایا گیا۔ پھر خود ایشیائی باشندے اپنے خوابوں کو تعبیر دینے اور اپنے مستقبل کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لئے مغرب کی جانب ہجرت کرنے لگے۔ ہجرت کے مختلف اسباب میں دو سبب اہم اور بنیادی ہیں، ایک سیاسی جبر و استبداد اور دوسرا معاشی و اقتصادی زبوں حالی۔ سیاسی جبر و استبداد کے نتیجے میں عام طور پر عربوں نے یوروپ اور امریکہ کی جانب ہجرت کی خصوصاً لبنانیوں اور فلسطینیوں نے۔ لیکن ایشیائی تارکین وطن نے امریکہ اور یوروپ کی جانب عام طور پر بہتر ذرائع معاش کی خاطر ہجرت کی۔ ہندو میتھالوجی میں وہ انسان خوش نصیب تصور کیا جاتا ہے جس کی جنم بھومی، کرم بھومی اور مرن بھومی ایک ہو۔ یعنی انسان جس زمین پر پیدا ہو اسی سے رزق حاصل کرے اور پھر اسی میں دفن ہو۔ لیکن ہجرت انسان کی ضرورت بھی ہے اور اس کی مجبوری بھی اس لئے ہر عہد میں ہجرت کا سلسلہ جاری رہا اور انسان ہی کیا کہ چرند و پرند بھی اٹھاتے ہیں وہ بھی دربدری کے اندوہناک اور مشکل مرحلے سے گزرتے ہیں، نقل مکانی کرتے ہیں، پرندے تو خیر آزاد ہوتے ہیں، تلاشِ رزق میں ہجرت کرتے ہیں اور اکثر اپنے گھونسلوں کو واپس آجاتے ہیں لیکن ذرا تصور کریں ان جانوروں پر کیا گزرتی ہوگی جو فروخت ہو کر اپنے نئے مالک کے ساتھ کہیں دور چلے جاتے ہیں، وہ بھی شاید انہی احساسات سے گذرتے ہیں لیکن بے زبان جانور اور معصوم پرندے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے، اپنا دکھ کسی کو نہیں بتا سکتے جبکہ انسان اپنے احساسات و جذبات کا حسین اظہار کرتا ہے، اپنے دکھ درد کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتا ہے، جو دل پر گذرتی ہے اسے دلکش انداز میں رقم کرتا ہے، یوں اپنا بوجھ بھی ہلکا کرتا ہے اور "پرورشِ لوح و قلم بھی"۔

اردو میں ہجری ادب کے نشانات اس کے ابتدائی دنوں سے موجود ہیں۔ لیکن کم کم، ذرا دھندلے دھندلے، میں یہاں کلاسیکی اردو شاعری سے صرف میر کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ جو کم عمری ہی میں ہجرت کے تجربے سے گزرے اور اس کے دکھ بھی اٹھائے۔ میر نے کہا کہ:

زمانے نے رکھا مجھے متصل پراگندہ روزی پراگندہ دل

میر نے آخری ہجرت سیاسی اور اقتصادی حالات کے جبر کے تحت دلّی سے لکھنو کی جانب کی۔ جب وہ مہجر پہنچے تو ان کی غربت اور اجنبیت کا مذاق اڑایا گیا اور ان سے ان کا وطن پوچھا گیا تو میر نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا:

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو   ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب   رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کردیا   ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

کلاسکی اردو شاعری ہجرتوں کے کرب سے خالی نہیں مثالوں سے گریز کرتا ہوں۔

آیئے اب ہم اس پس منظر میں اپنے عہد کے تارکینِ وطن شعراء کی شاعری کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ انہوں نے ہجرت کے مختلف گوشوں کو اپنے فکر و خیال کی روشنی سے کس طرح منور کیا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کو کیسے کیسے شعری پیکر عطا کئے ہیں۔ یہاں میں ایک اور وضاحت کرتا چلوں کہ ہجرت کے مسائل کا اظہار نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ہوا ہے۔ بلکہ افسانے میں ہجرت اور مہجر کے مسائل کا بیان تفصیل کے ساتھ ہوا ہے اور یوروپ و امریکہ نیز خلیجی ممالک میں تنقید، تحقیق، افسانہ، ناول اور سفر نامہ وغیرہ ہر طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے اور مہجر میں اچھے لکھنے والوں کی کمی نہیں اسی طرح مہجر سے رسالے جرائد، روزنامے شائع ہو رہے ہیں، ادبی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، تارکینِ وطن اپنے بچوں کی اردو تعلیم کے لئے متفکر اور کوشاں ہیں لیکن ہماری گفتگو کا موضوع صرف شاعری ہے۔ اور اس مقالے میں شاعری کا بھی پوری طرح احاطہ کرنا مشکل ہے۔ سب سے پہلے ہم نفسِ ہجرت کے موضوع کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے متعلق ہمارے غریب الدیار شعراء کے احساسات و تصورات کیا ہیں، مہجر میں رہ کر کس کس انداز سے انہوں نے ہجرت کو اپنی شاعری میں برتا ہے ملاحظہ فرمائیں یہ چند شعر:

شکم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر   سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا   (افتخار عارف)
نڈھال کر گئی ہے ہجرتوں کی جانکاہی   مسافتیں ہوئیں آزارِ جاں ہمارے لئے   (حفیظ الکبیر قریشی۔ کینڈا)
یہ جال پھیل رہا ہے مری ہتھیلی پر   کہ ہجرتوں کا حوالہ ہے میری قسمت سے   (حمیر الرحمان۔ نیویارک)
سفر میں ہیں تو لگتا ہے سفر میں کچھ نہیں رکھا   کبھی یہ کہہ کے نکلے تھے کہ گھر میں کچھ نہیں رکھا   (قمر شہزاد۔ بحرین)
خاک ہوں رہ گزر میں رہتا ہوں   میں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں   (عبدالرحمان عبد۔ نیویارک)
تھے دربدر سو لیے سر پہ سب عذاب پھرے   ہمارے ساتھ کئی ہجرتوں کے باب پھرے   (جاوید زیدی۔ ہیوسٹن)
میں نے تیرے لئے ہجرت کی اٹھائی ذلت   میری محبوب زمیں اب تو کوئی گھر دے دے
ترے شہر میں آج ہجرت ہے رسوا   رویئے پہ تیرے وفا چیختی ہے   (عتیق النظر۔ دوحہ)

یہ ہے ہجرت اور ہمارے عہد میں اس کے ساتھ سلوک۔ مغرب میں اور یہاں لندن میں شاید وہ صورتِ حال نہ ہو۔ لیکن بیشتر خلیجی ممالک میں تارک وطن انسان کو سگِ زمانہ ہی تصور کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ برتاؤ بھی وہی روا رکھا جاتا ہے جو ایک سگِ زمانہ کے ساتھ۔ لیکن شکم کی آگ ایسی ہے کہ اسے بجھانے کے لئے یہ مہاجر آدمی ہر طرح کی ذلت اٹھا لیتا ہے، اہانت برداشت کر لیتا ہے اپنی خودداری اور غیرت کو اپنے ہاتھوں قتل کر کے اپنے سینے میں دفن کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوروپ میں ایک مخصوص مدت گزار دینے کے بعد مہاجر وہاں کا باشندہ بن سکتا ہے لیکن خلیجی ممالک میں ۳۰-۴۰ سال کی طویل مدت تک صحراؤں کی خاک چھان کر بھی وہاں کی شہریت حاصل کرنے کا حقدار نہیں ہو سکتا اور اپنے جینے کا حوالہ ڈھونڈتا رہ جاتا ہے:

ہم ہیں وہ لوگ جو بے قوم و وطن کہلائے   ہم کو جینے کے لئے کوئی حوالہ دے دو   (عقیل دانش۔ لندن)

ہجرت در ہجرت کا سلسلہ۔ اور غریب الدیار کی یہ خواہش کہ کوئی مہجر اسے اپنے دامن میں پناہ دے۔ لیکن نہیں!

ہر شہر کو اک ضد سی رہی گھر نہ بنا پائیں   کس شہر کے دامن سے لپٹ کر نہیں دیکھا   (نسیم سید۔ کینڈا)

مہاجر اپنے خوابوں کے شہر کے لئے خیالوں میں نہ جانے کیسے کیسے سپنے سجاتا ہے۔ لیکن جب وہ مہجر پہنچتا ہے اور اس کی سوچ اور توقعات و تصورات کے برعکس صورتِ حال ہوتی ہے تو کہتا ہے:

تھکن کہتی ہے آگھر لوٹ جائیں   مسافر یہ سفر کچھ بھی نہیں ہے   (افتخار نسیم۔ امریکہ)
اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر   مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے   (حمیر الرحمان۔ نیویارک)

پردیس میں جو لوگ برسرِ روزگار ہیں ان کے متعلق عزیز و اقارب ان اور ان کے دوستوں کو نہ جانے کیسی کیسی خوش فہمیاں ہوتی ہیں لیکن ٹورنٹو کے عابد جعفری کیا کہہ رہے ہیں وہ سماعت فرمائیں:

یہ ان دنوں جو سر پہ مرے سائبان ہے   اک دھوپ ہے کہ چھاؤں کا جس پر گمان ہے

دوحہ کے شوکت علی ناز کا یہ احساس:

ڈار سے جدا ہو کر کس قدر پریشاں ہیں   دیکھتے ہیں ہم اکثر رتجگے پرندوں کے

اور نیویارک کے ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ کا یہ اعتراف کہ:

عبدؔ جس شہر کی تہذیب سے خوف آتا ہے — پھنس گیا آ کے اسی شہر بتاں میں میں بھی

یا جیزان سے ارمانؔ نجمی کا یہ سوال:

پڑاؤ ڈالو گے صحرا میں کس ٹھکانے پر — کہیں تو ہو شجر سایہ دار کی منزل

اور کویت سے سعیدؔ روشن کا حوصلہ بخش خیال کہ:

سفر میں دور تک سائے نہیں ہیں — مگر ہم پھر بھی گھبرائے نہیں ہیں

ہجر میں بطور خاص خلیج میں تارکِ وطن اپنے آپ کو ہمیشہ غیر محفوظ تصور کرتا ہے اور یہ خوف ہمیشہ اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے کہ نہ جانے کب اسے نوکری سے سبکدوش کر کے وطن واپس بھیج دیا جائے گا اس لئے وہ اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو محدود رکھتا ہے

کون جانے کوچ کا کب حکم صادر ہو جلیلؔ — ہم اسی باعث نہیں رکھتے کبھی بستر کھلا (جلیل نظامی۔ دوحہ)

ہجر کے مسائل پر چند متفرق اشعار اور ملاحظہ فرمائیں:

مسلکِ افرنگ میں موسم کا نہ پوچھو احوال — دھند کا، برف کا، برسات کا ڈیرا نہ گیا (سکندر سالم۔ بریڈفورڈ)

اک انقلاب وقت نے مفلس کیا ہمیں — تہذیب زندگی کے سب آداب لے گیا (مظفر احمد ضیاء۔ امریکہ)

جنون صحر نوردی کا یہ صلہ نکلا — زمین چھوٹ گئی آسماں خفا نکلا (عزیز نبیل۔ دوحہ)

میں اکیلا بھٹک رہا ہوں نسیمؔ — اپنی کونجوں کی ڈار سے باہر (افتخار نسیم۔ امریکہ)

اک آہِ سرد اک لرزیدہ آنسو — ہمارے شہر کی آب و ہوا کیا (عبدالقوی ضیاء۔ کینیڈا)

لٹایا زندگی بھر ہم نے سونا — مگر پائی صلے میں خاک ہم نے (نسیم سحر۔ جدہ)

نہ وہ کارواں نہ گزر نہ آستاں نہ وہ سنگِ در — یہ پتا نہیں کہاں آگئے، کہاں جا رہے ہیں خبر نہیں (نیاز گلبرگوی۔ شکاگو)

پاس جب تھا تو کہاں اس کا خیال آتا تھا — جب ہوا دور تو ہے فکر کہ کیسا ہوگا (رشید منظر۔ لندن)

کوئی تو ہو کہ جس سے تبسم ادھار لیں — اس شہر میں تو جو بھی ملا نوحہ گر ملا (عابد جعفری۔ ٹورنٹو)

تارکِ وطن کا ایک بڑا المیہ ہے ہجر میں احساسِ غربت اور دردِ تنہائی، لندن کے گلشن کھنہ کہتے ہیں:

میں زندگی کی کڑی دھوپ میں اکیلا ہوں — فریب ابر مرے آس پاس رہنے دے

زندگی کی تمامتر سہولیات کے باوجود زندگی میں خلا محسوس ہوتا ہے:

عیش کے سارے ساماں بہم ہیں مگر — تیرے بن زندگی میں خلا ہے بہت (عتیق الظفر۔ دوحہ)

پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی مصروف سڑک — کیسے سمجھے گی کہ تنہائی کسے کہتے ہیں (فیصل ہاشمی۔ ناروے)

کرن پہنچی نہ رمز در کھلا ہے — یہ گھر صدیوں سے بے آب و ہوا ہے (خواجہ ریاض الدین عطش۔ امریکہ)

کنج صحرا میں کس آرام سے بیٹھے ہو منیرؔ — خود کو دنیا کی ہر اک بھیڑ سے تنہا رکھے (منیر حیدر۔ کویت)

رقصِ آہو بھی نہیں سایۂ گیسو بھی نہیں — دشتِ فرقت میں تری یاد کے جگنو بھی نہیں (جلیل نظامی۔ دوحہ)

شدید لطفِ رفاقت شدید تنہائی — مرے نصیب میں اتنا عذاب کیوں رکھا (افضال فردوس۔ ہیوسٹن)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہاجر اپنے مسائل میں گھر کر اپنی ذات سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے:

نشاطؔ کیسی ہے کچھ لوگ پوچھ لیتے ہیں — میں کیا بتاؤں کہ اس سے تو رابطہ بھی نہیں (آصفہ نشاط۔ امریکہ)

اجنبی لوگوں میں مہاجر جیسے چاہے رہے۔ اگر کوئی ناشائستہ حرکت بھی اس سے سرزد ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی شناسا اسے دیکھنے والا نہیں اور آدمی باعزت یا ذلیل تو آشناؤں میں ہوتا ہے۔ اس لئے غم تنہائی سے بچنے کا مشورہ لندن کے اطہر راز یہ دے رہے ہیں:

غم تنہائی سے بچنا ہے تو گاتے رہنا — کون دیکھے گا یہاں شور مچاتے رہنا

اکیلے پن کے دکھ سے بچنے کے لئے انسان محفل سجاتا ہے — یوں تنہائی کا غم کچھ کم ہو جاتا ہے — لیکن پھر:

محفل بکھری اک اک کر کے سارے مہماں لوٹ گئے — آخر شب کا تنہا ساتھی اک خاموش ستارہ ہے (اکبر حیدر آبادی۔ آکسفورڈ)

اور کبھی بھیڑ بھاڑ میں بھی آدمی اکیلا پن محسوس کرتا ہے:

اب اس انبوہ میں بتلائیں کیسے کہ ہم کتنے اکیلے ہوگئے ہیں (ہمایوں ظفر زیدی۔ مسقط)

وطن سے دوری کے احساس کے پس منظر میں دوحہ کے محمد ممتاز راشد کی نظم "صحرا گزیدہ" ملاحظہ فرمائیں:

ہمارے بھاگ میں ہو تا/ہم نے اپنے دیس میں رہ کر/وہاں کے موسموں/رنگوں، نظاروں کے مزے لیتے/گلستانوں، پہاڑوں، وادیوں کے منظروں سے/روح ودل کو شادماں کرتے/نہ یوں آہ وفغاں کرتے/مگر قسمت کی باتیں ہیں/ہمیں تو اپنے ناکردہ گناہوں کی سزاؤں میں/وطن کو چھوڑ جانا تھا/کوئی صحرا بسانا تھا/سو اب شام وسحر اپنے/اسی میں ریت ہوتے ہیں/بس اب تو زندگی کا ایک ہی مفہوم باقی ہے/ہمیں صحرا سجانا ہے/یہیں خود کو گنوانا ہے۔

وطن سے محبت ایک فطری عمل ہے۔ انسان جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے جہاں پلتا بڑھتا ہے وہاں کی ہر شے سے اسے دلی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی جائے پیدائش سے دور کہیں اور چلا جاتا ہے تو وطن سے متعلق اس کی یادیں خیالوں میں چلنے پھرنے لگتی ہیں۔ اس کے خانۂ دل میں محفلیں سجنے لگتی ہیں اور اس طرح کے شعر وجود میں آتے ہیں:

دھوپ میں تتلیاں پکڑتے تھے اپنے بچپن کے دن سنہرے تھے
ایسے موسم میں باغ چھوٹا تھا جب چنبیلی کے پھول مہکے تھے
ان درختوں کو دل میں بوئیں گے جن کی چھاؤں کے خواب دیکھے تھے (عتیق انظر۔دوحہ)
اپنے ماضی کے اجالوں سے عقیدت ہے مجھے اپنے بچپن کے کھلونوں سے محبت ہے مجھے (ارشد عثمانی۔کینیڈا)
گو عمر مری دشت نوردی میں کٹے گی لیکن تری گلیوں کا پتا یاد رہے گا (ساحل صدیقی۔ڈربن)
وہ سبزہ زار وہ کہسار و دریا چل کے دیکھیں تو ہیں جس مٹی کا ہم زندہ حوالہ چل کے دیکھیں تو (محمد سالم۔امریکہ)
کنارے جھیل کے اب بھی لڑکپن کھیلتا ہوگا ذرا ماضی کے آئینے میں چہرہ چل کے دیکھیں تو
تازہ ہوا تھی مہکی فضا تھی کیا تھے اچھے دن پل پل اب تو پچھلا زمانہ اچھا لگتا ہے
تجھ سے بچھڑ کر پیارے وطن تیری ہی چاہت میں غم سے لپٹ کر آنسو بہانا اچھا لگتا ہے
بدیس میں مری کشتی ستا رہی ہے مجھے وطن کی جھیل بہت یاد آرہی ہے مجھے (عتیق انظر۔دوحہ)
دشتِ غربت میں دل پہ کیا گزری دل فگاروں سے پوچھ کر دیکھو (محمد ممتاز راشد۔دوحہ)
کس قدر قیمتی ہے خاکِ وطن بے دیاروں سے پوچھ کر دیکھو
پاؤں میں پردیس کی زنجیر ہے تو کیا ہوا دل تو رہتا ہے مرا ہر وقت ہندستان میں (حیدر اعظمی۔دوحہ)
دور چمن سے مالی ہے ویراں ڈالی ڈالی ہے
وہ پردیس گیا جب سے بستی خالی خالی ہے (شوکت علی ناز۔دوحہ)

اور جب وطن میں قتل وغارتگری کی خبریں سنتا ہے تو یوں گویا ہوتا ہے مہاجر شاعر:

سنتے ہیں اب ان گلیوں میں پھول شرارے کھلتے ہیں خون کی ہولی کھیل رہی ہیں رنگ نہاتی دوپہریں (عشرت آفریں۔ہیوسٹن)
یہ تو میرا شہر نہیں ہے یہ تو میرے خواب نہیں کس جانب سے آنکلی ہیں یہ گہناتی دوپہریں

وطن اور ہجرت کے تمامتر مسائل کے باوجود۔

یہ حوصلہ بھی بڑا دلنواز ہے نورؔی مرا وطن ہے میں اپنی زمین رکھتی ہیں (نور جہاں نوریؔ۔لندن)

دیارِ غیر میں ہم وطنوں کی تلاش ہوتی ہے اور ان سے مل کر ایک عجیب طرح کی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

اجنبی لوگوں کی کالی بھیڑ میں اک سخن آثار چہرا چاہیئے (زریں یٰسین۔امریکہ)
دنیا کے بے انت سمندر سے میرے جیون کی ناؤ کاش کہ تجھ تک آپہنچے، میرا ساحل ہو جائے تو (رشیدہ عیاں۔امریکہ)

پردیس میں تارکِ وطن کی تسلی خاطر اور اس کی تنہائی کی غمخواری کے لئے وطن سے کوئی پیغام کوئی تحریر بھی بڑی اہم ہوتی ہے لطف کی بات یہ کہ سلام کی جگہ دشنام بھی پیغام کی شکل میں ملے تو کوئی حرج نہیں۔

میرے لئے سلام کہ دشنام کچھ بھی ہو دستِ صبا سے بھیجے پیغام کچھ بھی ہو (نور جہاں نوریؔ۔لندن)
خط لکھ ہم کو یاد کی ایک نشانی دے پودا سوکھ رہا ہے اس کو پانی دے (رخسانہ فہیم۔جرمنی)

جن مشکل مراحل سے گزر کر انسان دیارِ غیر تک پہنچتا ہے ان کا اندازہ ہر کوئی نہیں کر سکتا:

کس قیامت سے گزرتے ہوئے پہنچے ہیں یہاں صبح تک جلتے چراغوں سے ذرا پوچھنا ہے (ریحانہ روحی۔دمام)

اور تارکِ وطن کا یہ المیہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ:

عمر ہماری صحراؤں میں ریت ہوئی گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیا (یعقوب تصور۔ابوظہبی)

ایک طرف تارکِ وطن کی اتنی بڑی قربانی کہ وہ اہلِ خاندان کے لئے، اپنے لوگوں کے لئے اپنی زندگی صحراؤں میں ریت کر دیتا ہے اور دوسری طرف اس کے گھر والے اس کی گاڑھی کمائی بے جا خرچ کرنے میں معروف رہتے ہیں۔ منور رانا نے کہا:

یا مجھے پردیس نے گھر ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

ن کا المیہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ جب وہ وطن واپس جاتا ہے تو لوگ کس کس بہانے اس سے مالی منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا اظہار ائیں:

اڑی ہے جب سے پرندوں کی واپسی کی خبر　　ہر ایک شخص نے پنجرا خرید رکھا ہے　　(یعقوب تصور۔ابوظہبی)

اور ایک طویل مدت کے بعد جب پردیس سے وہ وطن واپس آتا ہے تو ہر منظر اسے انجان سا لگتا ہے اس کے اور پوری ایک نسل کے درمیان سے شناخت غائب ہوتی ہے:

پردیس کیا گئے تھے ذرا دیر کے لئے　　یہ کیا ہوا کہ شہر ہی سارا بدل گیا　　(سعید قیس۔بحرین)
پہچان کا ہر منظر انجان ہوا آخر　　لگتا ہے کئی صدیاں ہم غار میں سو آئے　　(شفیق سلیمی۔ابوظہبی)

اور اس المناک ہجرت کا صلہ اسے یہ ملتا ہے کہ:

وطن میں لوٹ کر آئے تو دیکھا　　سفر کی دھول آنکھوں میں پڑی تھی　　(سعید قیس۔بحرین)
بے نام دیاروں سے ہم لوگ بھی ہو آئے　　کچھ درد تھے چن لائے کچھ اشک تھے رو آئے　　(شفیق سلیمی۔ابوظہبی)

حقیقت کا اعتراف اور اسکا اظہار بھی مہجری شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے، ایک شعر کہ:

افسوس تمام دوسروں سے ہم لوگ بھی مختلف نہیں ہیں　　تجھ پر بھی خزاں برس رہی ہے مجھ پر بھی زوال آگیا ہے　　(ساقی فاروقی۔لندن)

نئے موضوعات کو بھی ہمارے تارکینِ وطن شعراء نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے آج کے مشینی دور اور اس کے مسائل کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

جب سے دنیا نے مشینوں سے شناسائی کی　　سب کی آنکھوں میں تھکن دیکھی ہے تنہائی کی　　(کرامت غوری۔کویت)
اعضا کو شل کردینے کی روز نئی ایجاد　　میری نسل کے سارے سکھ ہیں تن آسانی میں　　(حمیرہ رحمان۔نیویارک)

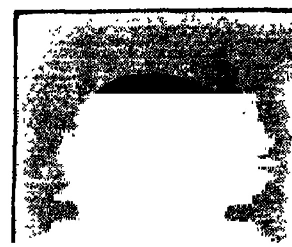
نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ جدتِ اسلوب اور نئی لفظیات بھی ہمارے مہاجر شعراء کے کلام میں جابجا نظر آتی ہیں ملاحظہ فرمائیں یہ چند اشعار:

خوف کہ رستہ بھول گئی امید کی اجلی دھوپ　　اس لڑکی نے بالکنی پر آنا چھوڑدیا　　(ساقی فاروقی۔لندن)
کاغذی پھولوں سے جب مانوس ہوں گی تتلیاں　　عاشقی کی رسم دنیا سے اٹھالی جائے گی　　(رئیس وارثی۔نیویارک)
شہر میں صورتِ دیوار تماشا ہوں جلیل　　اشتہاروں کی طرح لوگ ہیں چسپاں مجھ سے　　(جلیل نظامی۔دوحہ)
موسم نئے پھولوں کی جب شال بدلتے ہیں　　دھڑکن میں چھپے نغمے سُر تال بدلتے ہیں　　(صبیحہ صبا۔ابوظہبی)
بوندوں کے موتیوں کو منقار میں سجاکر　　اک اک شجر پہ اترا برسات کا پرندہ　　(رخسانہ شمیم۔جرمنی)
مسافر بولتے ہیں راستہ خاموش رہتا ہے　　دعائیں مانگتے ہیں سب خدا خاموش رہتا ہے　　(خالد سہیل۔کینڈا)
مار ڈالے اپنے سارے ہمسفر　　قافلہ سالار ہونا تھا ہمیں　　(نور علی۔دوحہ)
کھیتے کھیتے ہاتھ بھرے ہیں زخموں سے　　کون مری کشتی میں لنگر ڈال گیا　　(عابد جعفری۔کینڈا)
اپنے اس خستہ بدن سے اس لئے بھی پیار ہے　　ٹوٹ کر جب بھی گرا اپنے ہی قدموں پر گرا　　(غلام علی وفا۔کویت)
دن بھر پیٹھ پہ ڈھویا سورج چہرے پر تھی گرد جمی　　ساتھ میں دفتر سے گھر لوٹی شام بھی کچھ اکتائی سی　　(عذرا نقوی۔ریاض)
وہ نغمہ جو آفاق میں پھیلا ہے اسے سن　　شائد تجھے اک ہاتھ پسِ ساز نظر آئے　　(سعید اختر درانی۔برمنگھم)
وہ چیز لیں گے جسے دل قبول کرلے گا　　کہ بے کسی میں بھی اپنی پسند رکھتے ہیں　　(جمشید مسرور۔ناروے)
ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے　　سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے　　(حنیف ترین۔عرعر)
یقیں کی آگ میں تپ کر ڈھلے تھے ہم مختار　　ہماری سانس سے وہم وگمان جلتا تھا　　(مختار الدین احمد مختار۔لندن)

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو مراکز سے ہٹ کر اردو کی جو نئی بستیاں ہیں وہاں کے تارکین وطن شعراء معیاری تخلیقات پیش کررہے ہیں۔ ان کی شاعری میں کچھ ایسے تجربات بھی ہیں جن سے تخلیق کار صرف پردیس میں گزرتا ہے۔ کم تر درجے کی اور لچر قسم کی شاعری بھی پردیس میں ہورہی ہے لیکن اس طرح کی شاعری کی ہر جگہ بہتات ہے اس کے لئے دیس بدیس کی کوئی قید نہیں ایسی شاعری اپنی موت آپ مرجائے گی اور سچی اور کھری شاعری کا سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ　　جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

●



محبوب دہلوی

سامنے آؤ کہ میں چہرۂ زیبا دیکھوں
اور اس آئینے میں عکس پھر اپنا دیکھوں

تم ہی منزل ہو تمہیں گوہر مقصود مرا
دیکھ کر تم کو میں کیا اور تماشا دیکھوں

تم ہی بتلاؤ کہ اس کارگہ ہستی میں
کیا نہ دیکھوں میں اگر دیکھوں تو کیا کیا دیکھوں

تجھ کو یہ ناز کوئی پا نہ سکے گا ہرگز
مجھ کو یہ ضد کہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھوں

تونے چاہا تو بہت گردش ایام کہ میں
خود تماشا بنوں اپنا ہی تماشا دیکھوں

● 4046-W 134th STREET,APT.C.
HAWTHORNE. CA 90250 (U.S.A.)



قمر نقوی

جو ہوگا کسی نے وہ سوچا ہی کب ہے
کسی نے جو سوچا وہ ہوتا ہی کب ہے

ابھی فیصلہ میری بابت نہ کرنا
ابھی تک مجھے تم نے دیکھا ہی کب ہے

خزاں غور سے دیکھتی ہے شجر کو
ابھی آخری پتّہ ٹوٹا ہی کب ہے

ہے دست طلب تو بڑھو اور اٹھا دو
حجاب آپ سے آپ اٹھتا ہی کب ہے

جو ٹھوکر سے زخمی ہو پاؤں تو کیا
زمانہ بغیر اسکے ہٹتا ہی کب ہے

مری بات سمجھے نہیں تو عجب کیا
ابھی تک یہ درویش بولا ہی کب ہے

نتیجہ کہاں صبر کے امتحاں کا
یہ دامن ابھی مجھ سے چھوٹا ہی کب ہے

● 6207- S. INDIANA POLIS,
TULSA, OK 74136 (U.S.A.)

اسلم راہی

خدا جانے مری کشتی چلی کس پار خوابوں کی
کھلا جب بادباں تو گر پڑی پتوار خوابوں کی

یہ کیسے منظروں سے متصل نکلا حصار شب
سویرا اوڑھ کر چلنے لگی دیوار خوابوں کی

تجھے دیکھا تو پھر کیا کیا حسیں منظر نظر آئے
کہیں گل تھے کہیں تھیں تتلیاں ضوبار خوابوں کی

ہمارے واہموں نے ہم کو محوِ خواب ہی رکھا
جہاں جاگے حویلی ہوگئی مسمار خوابوں کی

تو کیا وہ چاند چرخہ کاتنے والی کا مسکن تھا
کہانی میں تھی "جس کی چاندی کو ہسار" خوابوں کی

زمیں پر کھل کے اترے گی صحیفوں کی طرح اک دن
فلک نے باندھ رکھی ہے ابھی دستار خوابوں کی

یہ تعبیروں کی پریاں نصف شب جو رقص کرتی ہیں
ہوا کرتی ہیں تابعدار پُر انوار خوابوں کی

ستارے جھلملائے جھلملا کر بجھ گئے راتی
سلگتی رہ گئیں بس تیلیاں دو چار خوابوں کی

● HOUSE No.- 426 ST. No. 158,
G-11/1, ISLAMABAD (PAK)

نعیمہ ضیاء الدین
SCHOPEWHAUER ST.32
63263 NEU, ISENBURG, GERMANY,

پرائے راستے اور اپنے ہم سفر

حنیفاں بی بی زوجہ علیم الدین مہینے میں ایک بار اپنے یہاں مجلس کروالیا کرتی تھیں۔ بڑے کمرے کی تین دیواریوں پر مقدس طغرے سجائے گئے تھے۔ اپنے آبائی قصبے حویلیاں سے برطانیہ آتے ہوئے، یہ خاندان بڑے سنہرے فریموں میں جڑی آیاتِ مبارکہ، روضۂ مقدس کی تصاویر ہی از حد احتیاط و حفاظت کے ساتھ ہمراہ نہیں لایا تھا، بلکہ وہ اس طرح سے دریائے جہلم کی قریب واقع مذکورہ قصبے کی اپنی ہی مخصوص روایات، ثقافت اور رسم و رواج کی فضا بھی اپنے دماغوں میں ٹرانسپلانٹ کروا کر لے آیا تھا۔ یہ کنبہ اپنے خون کے سرخ ذرات میں اس مذہبی دیوانگی و جنون کا وحشی جوش کسی وائرس کی مانند داخل کر چکا تھا کہ جس عقیدے کی روح سے ان کی قطعاً شناسائی نہ تھی۔ حنیفاں بی بی اپنے پختہ اعتقاد کے باعث عورت کے ننگے سر کو، جدید سائنسی تعلیم کو روشن خیال فضاء میں پنپ رہے پرسکون ماحول کو اور تمام ترنئی ایجادات کو قربِ قیامت کی نشانیاں قرار دیتی تھیں اور شیطانی محرکات کا شاخسانہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ دافع بلا کی خاطر مہینے میں ایک بار مجلس کروالیا کرتی تھیں۔ رخسانہ، نفیسہ، جمیلہ، تینوں بیٹیوں کے سر پر کس کر حجاب باندھے رکھتیں۔ دونوں لڑکے نذیر اور طفیل فارغ اوقات میں مسجد کے امور سنبھالتے۔ محلے کی اس مسجد کی تعمیر میں بڑا حصہ علیم الدین خاندان ہی کا رہا تھا۔ بعد میں یہی کنبہ اپنے آبائی قصبے سے مولوی محمد حسین کو بطور پیش امام یہاں لے کر آیا۔ محمد حسین کا دینی علم واجبی سے بھی کہیں کم تھا۔ لیکن وہ اپنی چرب زبانی نیز پاٹ دار آواز کی بدولت بے یقینی و بھیانک خوف کی ایسی پھنکار پیدا کرنے میں بلا کا طاق تھا جو فہم و شعور کے تمام روشن چراغوں کو کامل طور سے فوراً گل کر ڈالے۔

خصوصاً جنت و دوزخ کے بیانیہ میں وہ نارِ جہنم کی ہولناکی کو اس شعلہ بیانی کے تسلسل سے دہراتا کہ سامعین براہِ راست آتش کی وہ لپٹیں، کانوں کے سوراخوں سے اندر گھس کر بدن کے ریشے ریشے کو جھلساتی ہوئی محسوس کرنے لگتے۔ بلاشبہ محمد حسین اپنی پیشہ وارانہ حیثیت میں کامران رہا تھا۔ حنیفاں بی بی کے یہاں حسبِ دستور ابھی ابھی ماہانہ مجلس کا اختتام ہوا تھا۔

آج پہلی مرتبہ ان کی لڑکی نفیسہ نے اپنے اسکول کی چار سہیلیوں کو بھی مجلس میں مدعو کیا تھا۔

چاروں لڑکیاں اکتاہٹ بھری بے صبری سے مجلس کے خاتمے کا انتظار کر رہی تھیں۔ پھر وہ فوراً ہی چوکڑیاں بھرتی ہوئی وہاں سے نفیسہ کے کمرے کو بھاگ اٹھیں۔

"اے۔۔۔ سنو۔۔۔ میرے پاس سگریٹ ہیں۔۔۔" دروازہ بند ہوتے ہی نینا نے سب سے پہلے خوشخبری کا انکشاف کیا۔

"رئیلی؟" للچائی ہوئی شہدی آوازیں بھن بھن کرتی مکھیوں کی مانند حملہ آور ہو گئیں۔ وہ معنی خیز چمکیلی آنکھیں اپنی روشنی میں ایک نمایاں تحریر لکھے ہوئے تھیں۔ جس سے واضح ہوتا تھا کہ "سگریٹ" کیسے ہیں۔

نظر فریب راہوں پر اندھا دھند بھاگنے کو بے قرار خواب کا قافلہ بس کوچ کے اعلان کا ہی منتظر تھا کہ ادھر پرس سے سگریٹ برآمد ہوگی اور ادھر وہ بے جہت مگر غضب کے کیف و نشاط سے آئے جنگلوں کا رخ کرلے۔

"نو نو پلیز۔۔۔ مما کو بو آجائے گی۔" اتنے میں نفیسہ گھبرا کر بول اٹھی۔

"واٹ ۔۔۔؟" کچی عمر کی کمسن آنکھیں خوابوں کے بگٹٹ بھاگ اٹھنے والے ریلے کو اچانک وہیں کا وہیں روک لئے جانے پر جھلا اٹھیں۔

"اور وہ جو تم کبھی کبھی اسکول میں سموکنگ کر لیتی ہو۔ تب نہیں آتی بو تمہاری مما کو۔۔۔؟" سب سے زیادہ رنج غالباً ریما کو ہوا تھا جو فوراً ہی تڑخ کر کہہ اٹھی تھی۔ اس کی ترستی، مچلتی کشمکش کی آنکھ گلی میں "سکون ہی سکون" کا بورڈ صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ جو ادھر نینا کے کالے بیگ سے نمودار ہوتا اور ریما کے بڑھے ہاتھ پر آن چمکتا۔ پر وہ وہاں اس وقت ہاتھ میں ہو کر بھی ہاتھ نہ آرہا تھا۔

لڑکیاں پھر سے اکتاہٹ کا شکار ہونے لگیں۔

"بتاؤ نا نفیسہ۔۔۔ آخر اسموکنگ تو تم کرتی ہی ہو۔۔۔" ناہید نے ریما کی تائید کی۔

"وہ۔۔۔!" نفیسہ نے اس سوال پر برا سا منہ بنایا اور دلدوز قسم کی اداکاری دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"ماما۔۔۔؟ میرے اسکول میں لڑکیاں اسموکنگ کرتی ہیں۔ بریک میں تو سارا دھواں ادھر جم جاتا ہے۔ میرے لباس پر بھی۔۔۔"

قلقل کرتا قہقہہ ابھرا۔ بے فکر نوجوان وہرجائی بھنوروں کی طرح اشیاء

پر، فرنیچر پر، فانوس و پردوں پر منہ مارتا پھرا اور پھر جاکر دیواروں سے چپک گیا۔ وہاں سے بڑبڑا انہیں تکنے لگا۔ ان نوشگفتہ ادھ کِلی کلیوں ایسے چہروں کو جو شادمانِ بہارِ زندگی کے اس کیف زدہ موسم سے چور چور تھے کہ جو زندگی میں فقط ایک ہی بار آیا کرتا ہے۔ تب بے خودی میں گم، اوّلین شباب کی حیرت انگیز دریافتوں کے طلسم میں کھوئے بدن کچھ یاد نہیں کرپاتے۔ اپنا آپ بھی جنہیں بھول جاتا ہے۔ وہ بکھری بکھری سی دوشیزائیں بھی یونہی بے بات ہنس رہی تھیں۔

"لے۔۔۔لے۔۔۔لے۔۔۔" یکایک نفیسہ نے ادائے دلبرانہ سے لجاکر ایک الماری کا پٹ کھولا اور اٹھلاتے ہوئے کسی جادوئی منتر کی طرح سے دو ہاتھوں کی بند مٹھی ان تمام منتظر نگاہوں کے روبرو پیش کی۔

"کیا ہے۔ کیا ہے۔؟" آوازیں جو ابھی چند ثانیئے قبل اسموکنگ کی نشیلی دھند میں بھید بھرے مرغولوں سے آئے طلسماتی راستوں پر بے ساختہ و بے اختیار بھاگ اٹھنے کو بے قرار و مضطرب تھیں۔ اور اچانک انکار کے موڑ پر جھنجھلاہٹ بھری، ضدی، تند، تلخی کے کڑوے غبار میں مجبور ہوکر تھمی کھڑی تھیں، سرعت سے لپک کر پلٹیں اور اس نئی واردات کے انکشافی دروازے پر بے تابی اوڑھے جا بیٹھیں۔ اب وہ ندیدی رال بہاتی نوجوان اشتہاء آوازوں کے ہونٹوں پر گوشوں سے بہہ اٹھنے کو صاف صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ جب نفیسہ نے پر شباب جسم کو لہراتے ہوئے آنکھوں میں چھلک اٹھے خمارِ الفت کا راز ان اشتیاق سے لبریز چہروں کے سامنے فاش کردیا۔

سفید ریشم کا ایک ڈھیر اس کے دونوں ہاتھوں پر اس طور پھیلا تھا کہ مختصر بلاؤز کے سبک تار و پود میں غایت درجہ ناز کی ہمراہ ابھاری گئی نسوانی سینے کی گولائیاں مسحر کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو مسحور کیے جاتی تھیں۔

"وا۔۔۔ؤ۔۔۔ؤ۔۔۔" سب کی سب ریشہ خطمی سی ہوگئیں۔ انہوں نے چلاکر مٹھیاں بھینچیں اور آگے کی جانب جھک کر دوہری ہوتی چلی گئیں۔

"سچ بتاؤ۔۔۔ اسی نے دیا ہے نا۔۔۔ پیٹر نے۔۔۔؟" بیک وقت ساری مکھیاں بھنبھنائیں۔

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ں۔۔۔" نفیسہ کی آواز میں گویا سرور و افتخار، سرشاری و تسکین کا مواج سمندر ہلکورے لیتا تھا۔

"گھنّی کمینی۔۔۔ معاملہ یہاں تک چلا گیا ہے۔ اب اسے پہنو گی کہاں۔۔۔؟" کسی نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو پرابلم ہے۔۔۔" نفیسہ کے لہجے میں، لپکتی خواہش، اصرار، خوف اور جوش کی حدت، سب کے سب اس طرح سے کاٹ ٹیل بن چکے تھے کہ اب ہر جذبے کو علیحدہ علیحدہ کرکے شناخت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

"ہم اچھی طرح سے سمجھتی ہیں تیری پرابلم۔۔۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ پیٹر کو پہن کر کیسے دکھاؤں۔۔۔"

"ایگزیکلی۔۔۔" نفیسہ ہنس دی۔۔۔ "جب وہ ہولے سے پکارتا ہے "۔ "فیری" تو میں تو مری جاتی ہوں۔

بھلا یہ بھی کوئی نام ہے۔ نفیسہ۔

تبھی دروازے سے باہر اوپر آرہے زینے پر قدموں کی ناگوار آہٹ سنائی دی۔ سب کی سب جوشیلی دوشیزائیں بیزار اور پسپا ہوتے ہوئے سپاہیوں کی مانند مڑیں اور جھٹکے سے قالین پر چوکڑی مار کر سنجیدہ صورتیں بنائے جا بیٹھیں۔ ان کے اوّلین بہار میں کھلنے والے گلاب چہرے اب ادھ کٹے، نچڑے لیمو کے چھلکے جیسے ہورہے تھے۔ علیم الدین کی بیوی حنیفاں بی بی سر کو پیشانی تک چوڑے دوپٹے سے ڈھانپے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ "کھانا لگ گیا ہے بچیو۔۔۔" لڑکیوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوجے سے استفسار کیا تھا۔ اور جواب میں نگاہوں نے ایک دوسرے کی تسلی کردی تھی۔ کہ ہاں وہ دل نشیں بلاؤز پراسرار طور سے مخفی ہوچکا ہے۔ حنیفاں بی بی اور علیم الدین جسمانی طور پر لندن میں اور ذہنی لحاظ سے حویلیاں میں مقیم تھے۔ چنانچہ رسم و رواج حویلیاں کے مگر کرنسی برطانیہ کے چاہتے تھے۔ کرنسی کی لالچ میں یہ گھرانا جنون کی حد تک مبتلا تھا۔ اور اسے حاصل کرنے کی خاطر جائز ناجائز کی ہر حد سے تجاوز کرجانا قطعاً غیر اخلاقی فعل نہ گردانتا تھا۔ ان جیسے تمام افراد کو مذہب و قانون بھی اپنا لاگو کروانے کا بے پناہ جوش تھا مگر قومیت برطانیہ کی درکار تھی۔ وہ اس قانونِ فطرت سے کامل ناآشنا تھے کہ جو کچی عمر کے بدن پر ہر ماحول و خطے میں اپنا مکمل تصرف جمالیا کرتا ہے۔

"ڈیوڈ کو آج موسک جانا ہے۔۔۔" حسبِ معمول اسکول کی بریک میں پانچوں لڑکیاں اکٹھی تھیں۔ جب ناہید نے یہ اطلاع بہم پہنچائی۔ "مجھے جلد جانا ہوگا۔"

"موسک۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔؟" نینا، ریما، سویٹی اور نفیسہ، سبھی کے چہروں پر تجسس نے ایک ہی سوال لکھ ڈالا۔

"وہ دراصل وہاں اسلام قبول کرے گا۔" ناہید نے سرگوشی میں انکشاف کیا۔ اس کے لہجے میں رازداری کے علاوہ تھی قسم کے بھید کی تہہ دار معنویت بھی پوشیدہ تھی۔

"تو تمہارے پیرنٹس مان جائیں گے۔۔۔؟" نفیسہ نے بے اختیار دریافت کیا تھا۔ اس کے اس سوال میں حیرت سے کہیں بڑھ کر امید کی کرن شامل تھی کہ یہ راستہ اس کے لئے بھی خواب کے تعبیر گھر تک پہنچانے والا ثابت ہوجائے تو کیا ہی بات ہے امید و حیرت دونوں کے بیچ بہت ہی ٹرانسپیرنٹ لکیر جیسی بغاوت کی چنگاری بھی تھی جو کبھی کبھی دکھائی نہیں دیتی مگر بغیر محسوس کرائے جنگل کے جنگل خاکستر کرڈالتی ہے پھر جسے بجھانے کو ایک لشکرِ عظیم کی کوشش بھی ناکام رہتی ہے۔

"میرے پیرنٹس۔۔۔!" ناہید ہنس دی۔ ایک تمسخرانہ قسم کی

معصومی تھی۔ "میں خوب جانتی ہوں انھیں۔ ان پیئر نٹس کو۔۔۔" لفظ پیئر نٹس اس نے چبا کر اگلا تھا۔

"آر تھوڈوکس پیپلز۔۔۔ مارے خوشی کے کھل اٹھیں گے کہ ایک انگریز ان کے ہاتھوں مسلم ہو گیا ہے ایک نو مسلم داماد"۔ ارے وہ تو چاہیں گے کہ یہ بڑا بڑا لکھ کے فریم کروالیں اور ہر آتے جاتے کو فخر سے دکھایا کریں۔ سپیریئرٹی کمپلیکس کے مارے ہوئے لوگ۔ "بریک ٹائم آف ہو رہا ہے۔" ایمانے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ لڑکیوں نے جلدی جلدی سگریٹ بجھائے اور اسکول کی عمارت کو بھاگ اٹھیں۔ "نفیسہ کا مرڈر کر دیا۔ خود اس کی ممانے اور برادرنے مل کر۔" اطلاع بم کے دھماکے کی طرح سے پھٹ کر فاش ہوئی اوہ۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔!" تینوں لڑکیوں کے چہرے زرد ہو گئے اور بدن وحشت کا طیش اور صدمے کی شدت سے لرزنے لگے۔ بریک ٹائم کی ساری مسرت اور سگریٹ کا کیف آور جگنو اس روز پلک جھپکتے میں بجھ گئے۔ جب نیتانے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر یہ لرزہ خیز انکشاف کیا۔ چاروں لڑکیاں غم سے چور ہو کر آنسو بہانے لگیں۔

"تم نے اسے یہ راستہ دکھایا تھا"۔ بھیانک صدمے کا فوری ریلا گزر گیا تو سوہنی نے ایک ہاتھ سے چہرے پر دھار کی مانند بہتے اشک صاف کئے اور طیش اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں ناہید پر برسنے لگی۔

"تم لے گئیں تھیں نا اپنے ڈیوڈ کو موسک میں اسلام قبول کروانے تا کہ اسے اپنے پیئر نٹس سے ملوا سکو"۔

"ہاں۔۔۔ اور میرے پیئر نٹس نے اسے ایکسیپٹ کر لیا تھا۔ کیونکہ انہیں تو ریلیجن کی خدمت کا چانس ملا تھا، اور میں جانتی تھی اپنے پیئر نٹس کو۔۔۔"

"لیکن نفیسہ کے پیئر نٹس تو ایسے نہیں تھے نا۔ اس کی ممّا۔۔۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔ وہ تو ہر وقت اپنے گھر 'پرفیوم اسٹکو' جلا کر بک پڑھوائی رہتی تھیں، ویمنز سے۔"

"اس بک میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ دوسرے بک والوں سے میرج بنائی جا سکتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔" ناہید نے تاسف سے سر ہلایا۔ "اس کی ممّا اور آف کورس دونوں برادرز ابھی بھی میٹلی ادھر ہی رہتے ہیں۔۔۔ اپنے کینٹری کے کسی ولیج میں۔ یہاں تو ان کی ڈمیز تھیں۔۔۔"

"حنیفاں بیگم۔۔۔!" جج نے عینک کے اوپر سے زوجہ علیم الدین کو دیکھا۔

"تم پر اور تمہارے دونوں بیٹوں پر جرم ثابت ہو گیا ہے۔ تم نے اپنی بیٹی نفیسہ کے گلے میں تار کا پھندہ کس کر دونوں بیٹوں کی مدد سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عدالت میں تمہیں عمر قید کی اور تمہارے بیٹوں کو اعانتِ جرم کے سبب سات سات برس قید کی سزا سناتی ہے۔ تمہاری بارہ سالہ بچی حسینہ بالغ ہونے تک کونسل ہوسٹل میں رہے گی۔"

جہاں پر حجاب بھی نہیں کسا جا سکتا اور ڈیوڈ، پیٹر، آرنالڈ بھی اس عمارت کے کسی نہ کسی فلور پر تمام تر قربتوں کے ہمراہ موجود ہوں گے۔

آخری جملہ جج نے ادا نہیں کیا تھا۔ پر ان سب نے واضح طور سے سن لیا۔ جو وہاں اس وقت حاضر تھے۔ ☆☆

بقیہ صفحہ ۲۵ : دستاویز

تو سبھوں کی انگلیوں کے نشانات ہو بہو قاتل کی انگلیوں کے نشانات ہی کی طرح تھے۔ چنانچہ سبھوں کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تو کٹہرا پھیلتے پھیلتے تقریباً زمین کو گھیر چکا تھا اور اب صرف مجسٹریٹ کے فنگر پرنٹ باقی تھے۔ لہٰذا تمام مجرمین کی خواہش کے مطابق مجسٹریٹ کے فنگر پرنٹ بھی نکالے گئے تو وہ بھی ہو بہو قاتل کے فنگر پرنٹ جیسے ہی تھے۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے اپنا گاؤن (GOWN) اتار کر آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی عورت کے سفید جسم پر ڈال دیا اور بڑی رقت انگیز آواز میں کہا۔ ہم سبھوں کے ہاتھوں کی لکیریں قاتل کے ہاتھوں کی لکیروں ہی کی طرح ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ ایسی کیوں ہو گئی ہیں ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ان ہتھیاروں پر لکھی زبان ہی ہم میں سے کوئی جانتا ہے لہٰذا اب میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ حکم اور فیصلہ مجھ سے چھن گیا ہے چنانچہ وہ آئے گا جس نے کہا تھا کہ وہی پہلا پتھر اٹھائے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو تاہم میں صرف اتنا کہوں گا کہ ان ہتھیاروں کو پھانسی دی جائے جن کی کوئی زبان نہیں جانتا اور جو حقیقی معنوں میں مجرم ہیں۔ اور اگر انہیں پھانسی نہ دی گئی تو یہ ہتھیار ایک دن پوری زمین کو قتل کر دیں گے۔ اور پھر چمگادڑوں نے اپنی آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تو بادلوں کے دل کے دل پگھلنے لگے تھے۔ ☆☆



مٹھی بھر نظمیں

گردھر راٹھی (ہندی)

جنم: ۱۳راگست ۱۹۴۲ء راگست ۱۹۴۲ء پوریا (ایم پی) اٹارسی، اکولہ، الہ آباد میں تعلیم اور بداپیسٹ (ہنگری) میں جرنلزم کی تعلیم۔ امرجنسی (۷۷-۱۹۷۵ء) میں تہاڑ اور جے پور میں "جیسا" بندی۔ اب تک چالیس کتابیں میں تین شعری مجموعے: باہر بھیتر (۱۹۷۹ء) اندیسے کی لوری (۱۹۸۵ء) اور بھیت (۱۹۹۵ء) ۔ تراجم: اوھنک ہنگری کویتائیں، بڑا چڑیا گھر اور انیہ کویتائیں (نکولاس گیلن)، ہر شئے بدلتی ہے (بریخت)، وہ جسے سب یاد تھا (کے۔ تچی دانندن)، سمکالین بھارتیہ ساہتیہ کے مدیر۔ ۱۹۸۰ء میں شعری مجموعہ باہر بھیتر پر لوم پرکاش ساہتیہ سمان، دنیا بھر کا سفر

● SAHITIA ACADMEY, RAVINDAR BHAWAN, NEWDELHI-110001

دہلی - ۱۹۸۴ء

کیا تم نے دیکھے
سائیں سائیں کرتے مکان؟
ہاں میں نے دیکھے
اور شہر پر منڈراتا دھواں؟
ہاں
کیا تم نے سنا شور؟
ہاں میں نے سنا
بھاگتے ہوئے ہجوم؟
ہاں
اور وہ جو بھاگ نہیں سکے؟
نہیں کچھ دنوں بعد
دیکھے میں نے ڈھیر راکھ کے
جن میں شاید دبی تھیں کچھ ہڈیاں
کچھ نر۔ کنکال
پھر کچھ آنکڑے دیکھے
کچھ بیورے سنے
چشم دید
ان دنوں میں پتا کی شرن میں تھا
اس پتا کو، جو سب کا تھا
اور ان کی وصیت میں
کھوج رہا تھا اپنا حصہ

چکر - ۲

وقت آچکا ہے
لہ جانو
وقت جاچکا
دشت کے اس کے پھر آنے تک
وقت کہاں؟

مورتی

پہلے اٹھائی گئی مٹی
پھر دیا گیا جل
پھر دی گئی آگ
پھر دی گئی ہوا
بھر گیا آکاش
آکاش تک
اب اس اچل کے اردگرد
دیکھی جائے گو تی
مڑھی جائیں گی وسمرتیاں
سال در سال۔۔۔

دور

دور ہے درشن
سمواد دور بھاش
خط میرا دور لیکھ
دور ہے جو بھی
میرے نزدیک

مبارک ہو!

خوش نصیب ہیں وہ
جو پیدا ہوتے ہیں سال کے آخری دن
اس طرح بچ جاتا ہے
پورا ایک سال
خوش نصیب ہیں وہ بھی
جو نصیب ہوتے ہیں موت کو
سال کے پہلے دن
اس طرح بچ جاتا ہے
پورا ایک سال

نظم

سوکھ نہیں پائے ابھی
دھبے لہو کے
دھلے نہیں ہیں ابھی ہاتھ
سسکیاں چپ نہیں ہوئی ہیں ابھی
ملانے لگے ہیں ہم ہاتھ
ہاتھوں سے،
لینے لگے ہیں یکے بعد دیگر
ہتھیاروں کو
کندھے ہمارے
چھلے جارہے ہیں
انہی کے کندھوں سے
سوکھے نہیں ہیں ابھی
خون کے فوارے

نظم - ۱

دور کہیں دور بہت ہے گاؤ۔ وہاں
صرف یہ پتہ ہے
گاؤ ہے دور
دوری یہ
طے کرتی
میری گتی

صبح - شام

اڑے چلے آتے ہیں ہوائی جہاز
پنچھی
اڑی چلی جاتیں خواہشیں
اڑتی ہیں چتیاں نیم کی پتھو میں
اڑے چلے آتے ہیں قصے گناہوں کے

اردو: ● جینت پرمار

اصلاح

کچھ رگیں ہیں
جو خون دل تک لے جاتی ہیں
دوسری وہ
جو خون لیکر چلی جاتی ہیں
اب مجھے نہیں پتہ کہ کون سی رگ
ہوئی ہے بند
کے کھول دینے سے
بھکنے لگے گی پھر ہوا
بھکنے لگے گا پھر جل
چہکنے لگے گی پھر چڑیا۔۔۔

چکر

جتنی دیر پی میں نے شراب
کئی جگہ اُگے سوریہ کئی جگہ ڈوب گئے
اڑے ہوائی جہاز، ملے دل، تارے ٹوٹے
پتیاں لہرائیں، چٹانیں پھسلیں
لاشیں ہوئیں دفن
جتنی دیر میں نے پی شراب۔۔۔

نظم - ۲

کہیں دور کہیں دور کہیں بہت بہت دور
مجھ سے دور
کھسکتا چلا جارہا ہے
میرا گھر
جو میرا گاؤ بھی تھا
پردیش بھی
دیش بھی

3 - MADHUBAN APTS. NR GAYATRI GAYAAN PEETH, VADAJ, AHMADABAD - 380013 (GUJRAT)



شاہین نظر
SUB-EDITOR SAUDI GAZETTE
P.O. BOX No. 5576. JEDDAH-21432 (K.S.A.)

گواہی

اس نے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی:
"جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا"

اس کے بعد محمد محبوب الحق نے اپنا بیان شروع کرنا چاہا تو اسی کی زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ جیسے اس کی زبان کٹ گئی ہو، جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہوں، جیسے اس کے اندر کچھ کہنے سننے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہی ہو---

یاشاید ---

یاشاید ---وہ ڈر گیا ہو؟ آخر بزدل جو ٹھہرا۔

نہیں۔ ایسا نہیں ہے--- میں بزدل ہرگز نہیں ہوں۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ پر چیخا۔ میں بولوں گا اور ضرور بولوں گا۔ بلکہ وہ سب کچھ بولوں گا جو اب تک نہیں بولا تھا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔

ہاں کون روکتا ہے؟

اوپر والے؟

نہیں۔ نیچے والے۔

نہیں اوپر والے--- نہیں نیچے--- نہیں---

وہ گڑبڑا گیا۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہوں؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ بھری محفل میں لوگوں کی نظریں بچا کر اپنے آپ کو چٹکی کاٹی۔ سر کو سہلاتے ہوئے بالوں کو مٹھی میں لے کر بھینچا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھیں میچیں اور ناک کو انگلیوں کی گرفت میں لے کر سختی سے جنبش دی۔ پھر دونوں کانوں کو مٹھیوں میں بھر کر مروڑا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے تکلیف بھی ہوئی راحت بھی ملی۔ اس نے ذہن پر زور دیا۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ منظر اور پس منظر بلکہ پیش منظر بھی پردے پر چل رہی کسی فلم کی طرح اس کے سامنے تھے۔ اس نے محسوس کیا وہ پوری طرح سے ہوش میں ہے۔

تو پھر یہ بے ہوشی کی کیفیت کیوں؟ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اطراف کا جائزہ لیا۔

لوگ محبوب الحق کے بیان کے منتظر تھے۔

محبوب الحق کا بیان خود اسی کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ آج اسے طئے کرنا تھا کہ وہ انسانوں کے کس زمرے میں آتا ہے یا برسہا برس کی غلامی کے بعد وہ انسان رہا بھی ہے یا نہیں۔

اس نے اپنی تمام تر قوت یکجا کی اور بولنے کے لئے لب کھولے مگر ---

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے لب سل گئے ہیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ سامنے رکھے گلاس کو اٹھا کر گلا تر کیا۔ جو پانی بچ گیا اسے چلو لے کر چہرے پر چھپکا مارا۔ اپنے آپ کو مقدس کتاب کا واسطہ دیا اور پھر سے اپنی قوت یکجا کی۔

مگر اب کی بار مقدس کتاب اس کے آڑے آ گئی۔ محبوب الحق نے سچ بولنے کی قسم کھائی تھی مگر سچ بولنے کی ہمت وہ اب بھی جٹا نہیں پایا تھا۔

اس نے عدالت میں بیٹھے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ کئی لوگوں سے اس کی نگاہیں ٹکرائیں۔ اسے لگا کچھ مخصوص نگاہیں اسے مخصوص قسم کا پیغام دے رہی ہیں۔

نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے بیوی بچے کسی ہندی فلم کے ویلن کی قید میں تھے جس نے عدالت کے دروازے پر اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اپنے گھر والوں کی خیر چاہتے ہو تو زبان بند رکھو۔ اس کے بیوی بچے تو اپنے وطن میں عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو سب کچھ محفوظ تھی۔ یہی نہیں ان کا سماجی رتبہ بھی کافی بڑھا ہوا تھا کیونکہ محبوب الحق "باہر" سے بہت روپیہ کما کر بھیج رہا تھا اور گھر میں "باہر" کا بہت سامان جمع ہو گیا تھا جس سے دوستوں اور رشتہ داروں پہ بہت رعب جم رہا تھا۔ لوگ حسرت اور کبھی کبھی حسد سے اس کے گھر والوں کو دیکھتے تھے اور جب حسرت اور حسد سے کسی کو دیکھا جائے تو دیکھے جانے والے کی گردن ذرا اکڑ سی جاتی ہے اور یہی اکڑ دراصل سماجی رتبہ بڑھنے کا احساس دلاتی ہے۔ صرف احساس۔ اصل میں آدمی وہیں رہتا ہے جہاں تھا بس وقتی طور پر دماغی کیفیت بدل جاتی ہے۔

تو محبوب الحق کے گھر والے اس کی کمائی کی بدولت "رتبے" والے ہو گئے تھے۔ مگر کسی قیمت پر اس کا احساس اس نے انہیں ہونے دیا نہ انہیں اس کی پرواہ تھی۔ انہیں تو بس محبوب الحق کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ سے مطلب تھا جس کا تسلسل اس نے کبھی ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ مگر اس عمل میں

وہ خود کتنا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اس کا احساس برسوں بعد آج کٹہرے میں کھڑے ہو کر اسے ہو رہا تھا۔

برسوں پہلے محبوب الحق جب گھر سے نکلا تھا تو تنگ دست تھا۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ حسرتوں سے گذر چکا تھا۔ بڑی مشکلوں سے "باہر" کی نوکری کا ویزا اس کے ہاتھ لگا جس نے دیکھتے دیکھتے اس کی کایا پلٹ دی۔ بہت جلد اسے وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جسے پانے کی تمنا میں لوگ زندگی گذار دیتے ہیں۔ مگر انسان کی تمناؤں کی حد یہ ہے کہ بہت کچھ پانے کے بعد اس کے اندر مزید کچھ اور پانے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ محبوب الحق اسی چکرویوں میں پھنس گیا تھا۔

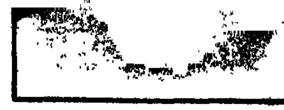
ابتداً محبوب الحق ایک سیدھا سادہ انسان تھا جو اپنے ہر عمل کو صحیح اور غلط کے خانوں بانٹنے کی کوشش کرتا۔ مگر جلد ہی نئی ہاتھ آئی۔ رئیسی نے اسے یہ احساس دلایا کہ اس کے خیالات زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت اپنے طریقۂ کار میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی۔ وہ اپنی سطح سے ذرا نیچے اترا اور اسے ایک خوش نما دنیا نظر آئی وہ ذرا اور نیچے اترا دنیا بھی زیادہ خوش نما لگی۔ اس کے بعد وہ نیچے اترتا ہی چلا گیا۔ اس نے محسوس کیا اب وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ لہٰذا اس کے مراسم اپنے یہاں کے کمتر لوگوں سے کم ہو گئے اور مغرب زدہ مقامی باشندوں اور گوری چمڑی والوں سے بڑھ گئے۔

کمپنی کے مالکان اوپر سے تسبیح دار تھے مگر اندر سے کچھ اور وہ دیس بدیس گھوم گھوم کر عیاشی میں مست رہتے۔ کاروبار عملاً گوری چمڑی والوں کے سپرد تھا جو بظاہر بڑے مہذب اور اصول پسند تھے مگر طبیعتاً بے حس اور بے مروت محبوب الحق ان کے استحصالی نظام کا آلۂ کار بن گیا۔ کمپنی میں کام کرنے والے زیادہ تر اس کے ہم وطن تھے یا اسی کی طرح غریب ایشیائی ممالک کے باشندے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی غریبی اور بے روزگاری کا علاج ڈھونڈنے گھر سے باہر نکلے تھے اور اس طرح نکلے تھے کہ ان کے پاس جو بھی پونجی تھی اسے گروی رکھ کر "باہر" کا ویزا حاصل کیا تھا۔ یہاں ان کا مقصد کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنا تھا تاکہ ان کا اور ان کے خاندان والوں کا مستقبل سنور سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ سخت سے سخت کام کرنے کو تیار رہتے اور مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرتے۔ مگر یہاں ان کی اس خوبی کو ان کی کمزوری اور مجبوری گردانا جاتا۔ تسبیح دار مالکان کے نزدیک ان مزدوروں کی حیثیت گوشت پوست کے انسانوں کی بجائے مشینی کل پرزے کی تھی جو پرانے ہو جائیں تو بدل دئے جاتے ہیں یا ٹوٹ جائیں تو پھینک دئے جاتے ہیں۔

کٹہرے میں کھڑے کھڑے محبوب الحق نے لاچاری سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ بھاگ کھڑا ہو مگر اس کے پیچھے سنتری کھڑا تھا اور سامنے جج۔ آج اسے بولنا ہی پڑے گا۔ کاش اسے بولنے سے بری کر دیا جاتا اس نے حسرت سے سوچا۔ برسہا برس جھوٹ اور فریب کی راہ پر چلتے چلتے آج وہ اچانک سچ کی گرفت میں آ گیا تھا۔ مالکان اور منیجروں کی لاپرواہی سے دس مزدوروں کی جانیں جاتی رہی تھیں اور درجنوں مزدور اسپتال میں زخمی پڑے تھے۔ معاملہ فیکٹری سے نکل کر حکومت تک پہنچ گیا تھا۔ چونکہ مزدور مختلف قوموں کے تھے اس لئے غیر ملکی سفارت خانے بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ محبوب الحق فیکٹری کا سپروائزر تھا۔ اس کا بیان کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ تسبیح دار مالکان کو انسانی جانیں تلف ہونے کی پرواہ نہیں تھی نہ ہی فیکٹری بند ہونے سے ان کی نیندیں حرام ہوئی تھیں۔ انہیں فکر تھی تو بس اپنی بدنامی کی۔ کمپنی میں حادثے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ مزدور زخمی بھی ہوتے تھے اور اکثر ان کی جانیں بھی جاتی تھیں۔ ہر بار محبوب الحق مزدوروں کو معمولی معاوضہ دلا کر معاملے کو رفع دفع کر دیتا تھا۔ اس کی اسی خوبی نے اسے ترقی کی نئی راہیں دکھائی تھیں۔ مالکان اور منیجروں کی نظروں میں اسے سرخرو بنایا تھا۔ مگر اس بار معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ کمپنی کے وکیل نے جو بیان تیار کر کے اسے دیا تھا اس کے مطابق حادثے کے ذمہ دار مزدور تھے۔ بیان کو پڑھ کر پہلی بار اس کے اندر کا انسان جاگا تھا۔ جسے بہت پہلے وہ اپنی دانست میں دفن کر چکا تھا۔ اسے حادثے کی وجہ معلوم تھی۔ فیکٹری کی بیشتر مشینیں پرانی ہو چکی تھیں۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ ان پر کام کرنے والے ہر وقت خطرے میں رہتے ہے۔ محبوب الحق انہیں بدلنے کی درخواست کئی بار دے چکا تھا۔ مگر مالکان کے نزدیک نئی مشینوں کی قیمت کے مقابلے میں مزدوروں کو دئے گئے معاوضے سستے معلوم ہوتے تھے اس لئے محبوب الحق کی درخواست پر کبھی عمل نہیں ہوا۔

مالکان اور منیجروں کے ساتھ میٹنگ میں پہلی بار محبوب الحق نے اختلاف کی جرأت کرتے ہوئے اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کیا تھا اور مزدوروں کے حق کی بات کی تھی۔ اس کا بدلا ہوا تیور کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ جواب میں مالکان اس پر دہاڑے تھے اور اسے ذلیل کر کے کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ مگر گوری چمڑی والے منیجروں کا رویہ حیرت انگیز طور پر نرم تھا۔ ایک سینئر منیجر اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا اور اس کے کندھے پر انتہائی شفقت سے ہاتھ رکھ کر "کول ڈاؤن، کول ڈاؤن" کہنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اصرار کر کے محبوب الحق کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی بیوی کو ساتھ بٹھایا اور دیر تک محبوب الحق کو شراب پلاتا رہا اور ایک بزرگ کی طرح سمجھاتا رہا۔

"دیکھو محبوب الحق تم بہت سمجھ دار انسان ہو۔ تم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے اسے اس طرح مت گنواؤ۔ تم نے ابھی ابھی اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لئے امریکہ بھیجا ہے۔ گھر بنانے کے لئے بینک سے جو قرض لیا تھا ابھی اس کی قسطیں ادا ہونا باقی ہیں۔ (باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھئے)



مسعود احمد اسنوی

قاتل مرا مزار پہ خود نوحہ خواں ہے اب
یا ہی جگر خراش مری داستاں ہے اب

ہ دن گئے کہ شعلۂ آتش تھا دل مرا
بخت وہ تو سینہ میں برق تپاں ہے اب

ٹھوکر سے ہوتی ہے میری رفتار اور تیز
تلووں کا آبلہ جرس کارواں ہے اب

سر کردگی پسند تھی ہر امر میں کبھی
سر بھی ہمارے دوش پہ بارِ گراں ہے اب

خونخواریاں شباب پھر موقوف ہیں کہاں
طرزِ ستم میں پیر فلک نوجواں ہے اب

آنسو ہوئے ہیں خشک تو آہوں سے کام ہے
دِ خزاں کے جھونکے میں ساون کہاں ہے اب

ن رات بے خودی ہے نہیں مجھ کو تابِ ہوش
ر کیوں یہ چرخ مضطربِ امتحاں ہے اب

● 15-A, AMANI MANZIL NEW
MOHALLA, POLIKODA, VELLORE
DT.635809

منیر حیدر

عبث وجود میں اک رم ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ شہر سوختہ بے دم ہے اور کچھ بھی نہیں

یہ میری سوچ، مری شاعری، ترے دم سے
زمیں کا پانچواں موسم ہے اور کچھ بھی نہیں

ملا ہمیں غم جاناں سے گر غم دوراں
ہزار شکر یہی غم ہے اور کچھ بھی نہیں

وہ آگ جس نے برابر جلائے رکھا تھا
اب اس کی راکھ کا ماتم ہے اور کچھ بھی نہیں

پڑاؤ جس نے بھی کوئے بتاں میں ڈال دیا
وہ سیر چشم کوئی دم ہے اور کچھ بھی نہیں

خوشا نصیب کہ قاتل کے روبرو تو ہوئے
چلو کہ آنکھ ذرا نم ہے اور کچھ بھی نہیں

منیرؔ حسن ادھر، فن ادھر سلامت ہے
یہ دکھ کہ وقت مگر کم ہے اور کچھ بھی نہیں

● P.O.BOX NO. 26135,
SAFAT-13122, KUWAIT (A.G.)



شہرام سرمدی

بنام عشق اک احسان سا ابھی تک ہے
وہ بد دماغ ہمیں چاہتا ابھی تک ہے

فقط زمان و مکاں میں ذرا سا فرق آیا
جو ایک مسئلۂ درد تھا ابھی تک ہے

شروع عشق میں حاصل ہوا جو دیر کے بعد
وہی صفر سا تہہ حاشیہ ابھی تک ہے

حلول کر چکی خود میں ہزار نقش و رنگ
یہ کائنات جو خاکہ نما ابھی تک ہے

طویل سلسلۂ مصلحت ہے چار طرف
یقین کر لے مری جاں خدا ابھی تک ہے

● 34-NBH, KALINA CAMPUS,
MUMABI - 98

جاوید ہمایوں

ہوا ظالم سہی دل میں اترنا چاہتی ہے اب / بدن کے چپے چپے سے گزرنا چاہتی ہے اب
بہت اچھا کہ سارے آئنے ہی ہو گئے ریزے / مرے اندر کی مکاری سنورنا چاہتی ہے اب
گناہوں سے مجھے ملتی رہی ہے شانِ شاہانہ / گنہ گاری مجھے معتوب کرنا چاہتی ہے اب
درختوں کی غلامی پر بہت مغرور تھی بارش / مگر وہ خواب گاہوں میں اترنا چاہتی ہے اب
مجھے دہشت زدہ کرتی تھی میرے خواب میں اکثر / یہ کیسی مصلحت ہے وہ بکھرنا چاہتی ہے اب

● CONTINENTAL TYRES, 12. DARGAH RD. PARK CIRCUS CALCUTTA-700017



کیفی سنبھلی

اب بھلا راکھ اڑائیں بھی ہوائیں کتنی ؟ / دل کے شمشان میں جلتی ہیں چتائیں کتنی ؟
مردہ ہو جائیں نہ سارے یہ شرافت کے اصول / وقت اک سر سے اتارے گا ردائیں کتنی ؟
بس یہی سوچ کے کچھ دیر کو ہنس لیتا ہوں / آنسوؤں سے لکھی جائیں گی کتھائیں کتنی ؟
خوش ہوا جاتا ہے کیوں میرے اکیلے پن پر / ایک برگد سے نکلتی ہیں جٹائیں کتنی ؟
کج کلاہی کے یہ دعوے نہیں بہتر کیفی / ٹوٹتی دیکھی ہیں ناتوں میں انائیں کتنی ؟

● NAMBARDARAN, NOORIYUN SARAI SAMBHAL-244302 (U.P.)



برجیش عنبر

شمس دیکھوں کہ اب قمر دیکھوں / ایک ہی عکس ہے جدھر دیکھوں
جانے کیا بات ہے کہ خوابوں میں / میں کڑی دھوپ کا سفر دیکھوں
آرزو جی میں تجھ کو پانے کی / تجھ کو دیکھوں کہ اپنا گھر دیکھوں
گر ہو ممکن تو اتنی مہلت دے / ایک منظر ہی آنکھ بھر دیکھوں
خوشبوؤں کا خزانہ ہے عنبر / اس کے سائے میں بیٹھ کر دیکھوں

● KALLON WALI GALI JODHPUR (RAJ.)



ارشد اقبال آرش

تم کبھی پاس میرے آؤ بھی / کچھ سنو اور کچھ سناؤ بھی
اب تو دینے لگے ہیں مجھ کو مزہ / تیری الفت کے دل میں گھاؤ بھی
بیقراری قرار میں ڈھل جائے / لمحہ بھر کو نظر ملاؤ بھی
میری قسمت کی تیرگی چھٹ جائے / رخ سے گیسو ذرا ہٹاؤ بھی
موجِ طوفاں سے کم نہیں آرش / میرے اشکوں کا یہ بہاؤ بھی

● VIA BOCCHERINI 109, 09045, QUARTUS. ELENA (CA) ITALY



فرحان حنیف

آئینے میں چہرا رکھ کر سوچوں گا / میں اب خود کو تنہا رکھ کر سوچوں گا
دور فلک سے اک دن میں بھی ابھروں گا / پھر قدموں پر دنیا رکھ کر سوچوں گا
کس منزل سے میرا رشتہ گہرا ہے / پاؤں تلے ہر رستہ رکھ کر سوچوں گا
میرا جزو بھی جیسے کل میں شامل ہو / دریا میں اک قطرہ رکھ کر سوچوں گا
یکساں قدریں خسرو سے فرحان تلک / سارے لہجے یک جا رکھ کر سوچوں گا

● C/o. DAILY "URDU TIMES" 243, GUJARIA MANZIL M.A. ROAD, MUMBAI-8

مکتوبات

شمارہ ستمبر ۲۰۰۰ء

"اس بار دسمبر کے اس تازہ شمارے میں جون، جولائی اگست کے شماروں پر موصولہ خطوط سے انتخاب کے ئے ستمبر اور اکتوبر کے شماروں پر موصول ہو رہی آراء سے کچھ خطوط شامل کئے جا رہے ہیں۔ ابھی ستمبر، اکتوبر مبر کے شمارے قارئین ادبی رسائل کے زیر مطالعہ ہیں رے پیارے خط آ رہے ہیں۔ دراصل اوہر شاعر نہایت پابندی کے ساتھ ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں پوری اردو تک پہنچ رہا ہے۔ ابھی ایک شمارہ مکمل پڑھا نہیں جاتا کہ را پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اب ماہناموں سے زیادہ سہ ماہی کتابی سلسلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کا وقت یوں بھی ان کا اپنا نہیں رہا۔ روز مرہ کی ضروریات اور فرائض کے ٹی وی (تقریباً سو چینل) نے بے طرح باندھ دیا ہے۔ لہ شاعر چونکہ ادب ذوق حضرات کی عادت اور رت بن گیا ہے۔ لہٰذا ہر جگہ موجود ہے اور پڑھنے والے کے لئے وقت نکال ہی لیتے ہیں۔

قارئین شاعر سے گزارش ہے کہ وہ شاعر کے رجات پر یا اس کے حوالے سے اپنے گرانقدر تاثرات ال کریں۔ تعریفی و توصیفی خطوط کی بھیڑ ذاتی طور پر پسند ہے لیکن شاعر کے قیمتی صفحات کا ہر لفظ اور ہر سطر مد ہو، یہی ہماری خواہش اور یہی کوشش رہتی ہے۔ وس ہم ان قارئین کا خیر مقدم کرتے ہیں جو صرف اور مطالعے پر یقین رکھتے ہیں۔ اچھا اور سچا ادب پڑھنا ہتے ہیں اور رسالہ شاعر کو ترجیح دیتے ہیں۔

موسیقی، مطالعہ اور عبادت، خاموشی اور ٹھہراؤ چاہتے ۔ شاعر نے صاف ستھرے مطالعے کو خاموشی اور ٹھہراؤ متعارف کروایا ہے اور ان تینوں نے مل کر ادب کی ہت کی تفہیم کا شعور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو ہر یرائی حاصل ہے۔ قاری کے بغیر شاعر اور شاعر کے قاری نہیں۔ کیا خیال ہے؟" (الف۔الف)

ین۔ صغیر ادیب

"شاعر" شمارہ ستمبر کے سرورق پر جناب سردار جعفری موی ہے جو اب ہم میں نہیں رہے۔ جعفری صاحب یکم اگست کو آخری سانس لی۔ گویا ایک نظریے نے ایک لب نے ایک عہد نے آخری سانس لی۔ جعفری صاحب ترقی پسند تھے۔ ان کے پاس ایک خواب تھا۔ ایک ایسے خوبصورت معاشرے کا خواب جو جبر، استحصال، تفریق اور ناانصافی سے پاک ہو جس میں ایک عام آدمی بھی محرومی اور ذلت سے دوچار ہوئے بغیر ایک پرسکون اور باعزت زندگی گذار سکے۔ جعفری صاحب اب نہیں رہے۔ مگر ان کا خواب زندہ رہے گا۔ آپ نے تعزیتی قرار داد میں جو تجاویز یا دوسرے الفاظ میں خواہشات پیش کی ہیں۔ میں ان سے پوری طرح متفق ہوں۔ دیکھنا چاہئے کہ اردو والے حکومت ہند اور مہاراشٹر گورنمنٹ اس ضمن میں کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔

اس شمارے میں آپ کے مضمون "برطانیہ میں ہماری نسلوں میں اردو کا مستقبل" اور اندر پرتاپ نیر کے مکتوب نے فوری طور پر توجہ کھینچی۔ آپ کے مضمون کے تعلق سے آئندہ کبھی موقع ملا تو کچھ عرض کروں گا۔ اس وقت تو صرف نیر صاحب کے مراسلے کے حوالے سے چند ایک باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نیر صاحب نے اطلاع دی ہے کہ مشاہیر شعراء کے دواوین کی مانگ صرف ہندی رسم الخط میں رہ گئی ہے۔ نیز یہ کہ مسلمان تو اب اس زبان سے دستکش ہو گیا ہے۔ انہوں نے تاویل تراشی ہے کہ اگر ہندی رسم الخط سے (اردو کو) سہارا دے رہا ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ آج ہندی رسم الخط کے ذریعے ہی اردو کو زندہ رکھا جا سکتا ہے ہم سب کو حالات کے مطابق ADGEST کرنا سیکھ لینا چاہئے۔

مجھے یقین ہے کہ اندر پرتاپ نیر کا جذبہ صادق اور نیت نیک ہے۔ ہندوستان میں آئے دن رسم الخط کی تبدیلی کا شوشہ چھوڑا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو کے بعض بڑے ادیب و شاعر اور دانشور بھی اس خیال کے ہمنوا ہو گئے لیکن کسی نے ایک اہم ترین پہلو پر کبھی توجہ نہیں دی اور نیر صاحب نے بھی اس پر غور نہیں کیا۔ وہ اہم ترین پہلو یہ ہے کہ آپ اردو زبان کا رسم الخط بدلنا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں اردو کا رسم الخط بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں اور اس پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ آپ کسی ایسی زبان کا رسم الخط تو بہ آسانی بدل سکتے ہیں۔ جو کسی ایک علاقے تک محدود ہو اور اس زبان کے بولنے والے بہ رضا و رغبت یا بحالت مجبوری رسم الخط کی تبدیلی کو قبول کر لیں۔ لیکن آپ کسی ایسی زبان کا رسم الخط کیوں کر بدل سکتے ہیں جو علاقائیت کے دائرے سے باہر نکل چکی ہو اور دو ایک ہی زبان ہے۔ یہ صرف ہندوستان کی سرحدوں تک محد نہیں۔ ہندوستان سے باہر ان گنت ممالک میں لکھی، پڑ اور بولی جاتی ہے۔ یوروپ کے کئی ممالک، امریکہ و کینیڈا شمالی آسٹریلیا تک میں اردو کے رسائل و اخبارات چھ رہے ہیں اور یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ یہ تمام او جو ہندوستان سے باہر اردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ آپ کے تابع فرمان نہیں ہیں۔ تبدیلی رسم الخط کے آ کے فیصلے کو وہ ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ غور کیج اگر آپ نے ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کیا یا اردو اکثر و بیشتر ادیبوں کی تخلیقات ہندی رسم الخط میں چھپنے لگ تو کیا ہوتا ہے۔

اگر نیر صاحب کا مقصد اردو کا رسم الخط بدلنا نہیں ہے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردو ادیبوں کی کتابیں ہند میں بھی شائع ہوں۔ تو بھی یہ کوئی ایسی بات نہیں جس۔ اردو کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔ اگر کتابیں ہندی میں چھپ گئیں اور ادیبوں کو مالی فائدہ حاصل ہو گا تو بتدریج ہندی کتابوں کی اشاعت کا رجحان بڑھے گا۔ یوں رفتہ رفتہ اردو کتابوں کی اشاعت کم سے کم ہوتی جائے گی۔ اور جلد ہی دن آئیگا کہ رسم الخط کی تبدیلی خود بخود عمل میں آ جائے اور جب رسم الخط تبدیل ہو گا یا یوں کہیئے کہ اردو کی کتابیں ہندی میں چھپنے لگیں تو ہندوستان کا اردو ادیب و شا خاص طور پر نثر نگار باقی اردو دنیا سے کٹ جائیگا۔ باہر وا اس کی تخلیقات پڑھنے کے لئے ہندی رسم الخط تو سیکھیں نہیں۔ یوں ایک ہی زبان لکھنے اور پڑھنے والے دو حصوں میں بٹ جائیں گے اور دونوں گروپ ا دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوں گے۔ کیا یہ صورت قا قبول ہوگی؟

اگر اردو کتابیں ہندی رسم الخط میں چھپ رہی ہیں تو ا میں کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس رجحان کو عام نہ رہنا چاہئے۔ اور اردو کتابیں ترجیحی طور پر اردو ہی میں شائع چاہیئے۔ اگر ہندوستان میں اردو کو بچانا مقصود ہے تو یہ ضرو ہے کہ اس کا رسم الخط بھی باقی رکھا جائے ورنہ ہندوستان اردو والے باقی ساری دنیا سے کٹ جائیں گے۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ایک روزمرہ، ایک محاورہ، ایک لہجہ اور تلفظ۔ اگر کوئی زبان اپنی فطری خصوصیات سے محروم ہو جائے تو وہ باقی نہیں رہتی۔ اردو کا اپنا ایک مزاج ہے جو اسے اپنی ایک پہچان عطا کرتا ہے اور اردو سے محبت کرنے والا کوئی بھی شخص بلا تخصیص ہندو مسلمان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اردو کا "قتل" ہندی رسم الخط اختیار کرنے کے بعد "کتل" بن جائے گا۔ اس لفظ کی مثال میں نے قصداً اس لئے دی کیونکہ رسم الخط کی تبدیلی بہر حال اردو کے قتل کے مترادف ہوگی۔

- 65-BLACK STREET,
BLACKBURN LANCS. BB1 7NG (U.K.)

عذرا پروین

سردار جعفری کو خراج عقیدت پیش کر کے ان کے نام سے یادگاریں قائم کرنے کی تجویز رکھ کر اچھا کیا آپ نے ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی حسبِ معمول ہے۔ سبھی تخلیقات ٹھیک ہیں تاہم ندا فاضلی اور ادبی فیچر، دونوں زیادہ توجہ کھینچتے ہیں۔ ادبی فیچر میں سرفراز تبسم کے خط کی شمولیت نے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ اتنی نیچرل اور INTENSE تحریر؟ کون ہے یہ سرفراز تبسم، بشر نواز کا مضمون بہت اچھا ہوتا مگر گنجلک ہو گیا ہے۔ خراج محبت، خراج عقیدت سردار جعفری کے لئے کسی اور سے لکھوا لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ان کی دیگر تحریریں بھی ہوں گی، ان میں سے انتخاب کر لیتے۔ مگر آپ بھی ہول سیل ڈیلر ہیں۔ ایک مضمون اور دو دو خراجِ عقیدت ایک جعفری صاحب کو، دوسرا اعجاز صدیقی صاحب کو۔ اعجاز صاحب آپ کی اس کفایت شعاری پر قطعی خوش نہ ہوں گے۔ اللہ آپ کو ہدایت دے۔

- P.O.BOX NO. 32 H.P.O,CHOWK
LUCKNOW -226003 (U.P.)

اصغر رضوی

ترتیب و تہذیب کا سلیقہ بلا مبالغہ غماز ہے بدلتے حالات اور معروضات پر آپ کی حساس نگاہ خراجِ باہنر کے مصداق ہے کہ ہر وقت کچھ نیا کہنے اور کر گزرنے کی کوششوں اور غبارتوں سے آپ کماحقہ آشنا ہیں۔ شاعر کے ہر شمارے میں مابعد جدیدیت کے تذکرے نے ایک بار پھر ادب کے قاری و قلم کار کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مابعد جدیدیت ادب کی ادبی طبیعت کا عملی ردِّ عمل ہے۔ جو اپنے اسلوب و لہجے کے ذریعے آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔ بالخصوص شاعری میں اس کا اظہار واضح طور پر ۱۹۸۰ء کے بعد ہوا جبکہ اثرات تو ۱۹۷۰ء کے بعد ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ آپ اس موضوع پر پرمغز تنقیدی مضامین لکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے شذرات آہی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے خود کو معروفیات کے جنگل میں گم کر دیا ہے۔ اور یہ نئے ادب کا ایک عظیم نقصان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج شاعر ہی وہ واحد ادبی رسالہ ہے جس کی تحسینی و تعریف کے بعد بھی اہلِ قلم مطمئن نہیں ہو پائے کہ حق ادا نہیں ہوتا۔

نسیم بن آسی

ستمبر ۲۰۰۰ء کا شاعر اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور ضوافشانیوں کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ رسالے نے ایک اپنا خاص معیار قائم رکھا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ ۴۸ صفحات پر مشتمل زیر نظر شمارہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ جرعات، کے تحت علی سردار جعفری پر گفتگو بند نہ ہو، افتخار امام صدیقی کا بڑی سوچی اور سمجھی ہوئی تحریر ہے۔ نئی لفظیات کے ساتھ ایسی تازہ اور زندہ تحریر بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ فاضل مدیر نے موصوف کے فن اور شخصیت کے چند ایسے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جو زیادہ واضح اور وقیع ہیں یہ روشن پہلو ہی سردار جعفری کی عظمت کی نشان دہی کریں گے اور انہیں کے باعث ان کی شاعری ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔

- KOH-E-NOOR GENRAL STORE
PARMAR KATRA, MUGHAL SARAI 232101

لائق رونق جمال

شاعر ستمبر کا شمارہ موصول ہوا سرورق پر نظر پڑتے ہی دل کی گہرائیوں سے واہ نکل گئی۔ شاعر کے روایتی سرورق سے ہٹ کر علی سردار جعفری صاحب کی بولتی ہوئی تصویر سرورق پر دیکھ کر مایہ ناز شخصیت کی جدائی کا احساس ہوتے ہی نظریں تعظیم کے لئے بے اختیار جھک گئیں اور پھر عقیدت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ جبکہ میں جعفری صاحب سے کبھی ملا نہیں تھا لیکن انہیں پڑھا، دیکھا، سنا بہت تھا۔ وہ اپنی تخلیقات، سادہ لوحی، خلوص اور بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے مجھے بے حد پسند تھے اردو کے لئے انکے کام اور خدمات کو تاقیات یاد رکھا جائے گا۔ جب جب علی سردار جعفری کا ذکر ہوگا شاعر ستمبر ۲۰۰۰ء کے شمارے کو بھی یاد کیا جائے گا تصویر دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اردو کے ساتھ بے انصافی کے لئے آنکھوں میں بے انتہا غصہ ہے فکر ہے گہری سوچ ہے رنج و غم ہے۔ اتنی اچھی تصویر شائع کرنے کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

- P/5, ADARASHNAGAR,
DURG-491001 (CHATTISGARH)

شبیر اصغر

ستمبر شمارہ سامنے ہے۔ سرورق پر دیگر رسائل نے بھی سردار جعفری کی تصویر شائع کی ہے۔ مگر شاعر کا منفرد انداز سحر انگریز ہے۔ یادوں کی نہ جانے کتنی قندیلیں روشن ہو گئیں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ دن آگیا جس کے تعلق سے "میرا ہم سنو" یہ باتیں کہی گئیں۔

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے

مگر یقین کرنا پڑتا ہے اللہ مغفرت فرمائے جرعات کے تحت آپ کی باتیں بہت اچھی صحیح مگر شاید آپ بھول رہے ہیں کہ سردار جعفری اردو کے شاعر تھے جہاں غالب کو بھی اپنی یادگار قائم کروانے کے لئے دو صدیاں درکار ہوئی ہیں۔ شمارے کے تخلیق کاروں میں ذکاء الدین شایاں سے گذارش کروں گا کہ بچوں کے کھیل پر صرف نگاہ نہ رکھ کر ان کے مسائل و عوامل پر بھی نگاہ رکھیں تو معاصر ناول نگاری کو اور بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کہانیوں کے لئے یوسف عارفی اور قمر جمالی کو میری مبارکباد۔

- C/O. N.A.R.62, COWIES GHAT
ROAD, SHIBPUR-HOWRAH-711102

اکتوبر ۲۰۰۰ء

کلوش بدری

ہر بار ادبی فیچر اور مکتوبات کے حصص ہندو پاک کے جملہ رسائل پر سبقت لیجاتے ہیں۔ آپ یقین مانئے آج آپ کی طرح مسلسل، موثر اور مستند اداریے اردو دنیا میں کوئی اور مدیر نہیں لکھتا۔ ہندوستان کے اہم ترین ماہناموں اور سہ ماہی کا میں خریدار ہوں مگر آپ کا شاعر ادب کے بازار مصر میں یوسف کا درجہ رکھتا ہے جسے زلیخا صفت شاعرہ یا ادیب یا پراگندہ طبع لوگ بھی خرید نہ پائینگے۔ آپ کے اداریے ہم عصر اردو ادب نمبر سے لیکر آج تک جتنے بھی شماروں میں شامل ہیں وہ سب کے سب ایک عظیم نقاد کی توانا تنقید اور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے جملہ اداریوں پر مشتمل جلد ایک کتاب شائع ہو۔ یہ بقول جناب اطہر فاروقی اردو زبان و ادب کا تحفظ اور اس کے شاندار مستقبل کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جبکہ ہم جملہ عربی مدارس، عربی، شریعت و طریقت کی اور تبلیغی جماعتوں کے امیروں، مہتمم حضرات کی پشت پناہی حاصل کر لیں۔ شاعر اکتوبر ۲۰۰۰ء میں اطہر فاروقی کا پر مغز مقالہ پڑھنے سے کہیں زیادہ ہمیں ٹھوس عمل کرنے کی

ترغیب دے رہا ہے۔ حضرت سید حامد، حضرت انیس چشتی، اطہر فاروقی، جناب [illegible]الرحمٰن فاروقی، جناب نثار احمد فاروقی اور ایک فعال شخصیت جناب اثر فاروقی مدیر قومی محاذ اورنگ آباد کا تعاون آپ حاصل کر کے جنوب و شمال کے عربی مدارس کے بانیوں اور مہتمموں سے ملاقات کر کے "قائدین زبان اردو" کے نام سے ایک پارلیمنٹ کی تشکیل صرف اور صرف آپ ہی دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اطہر فاروقی کو کنوینر بنا کر تمل ناڈو کے دانشور ادیب و شاعر یعنی امیر شریعت مولانا مولوی مفتی اشرف سعودی، ناظم سبیل الرشاد، ناٹوار بنگلور 560045 جو ایک عظیم عربی درس گاہ ہے خدارا مراسلت کیجئے گا۔

اس بار جناب اظہار خضر نے ایک اہم ترین موضوع "ادبی اور غیر ادبی تحریر" (یعنی اوریجنل نثری اور شعری ادب) پر بہت ہی موثر ادبی فیچر لکھا ہے۔ باقر مہدی قریش لاکھ سہی ان کے اندر کا فنکار بیمار اور قریش نہیں۔ حسن نعیم پر اچھی نظم ہے مگر انہوں نے لفظ المیہ کا تلفظ غلط کیا ہے۔ حضرت فضا ابن فیضی نے یہی غلطی ان کی ایک غزل میں کی تھی۔ المیہ کا صحیح تلفظ الم یہ ہے۔ الم یہ ہرگز نہیں ان دنوں بعض شعراء مصرعوں کو مصروں اور پھر معاف کو ماف، استعمال کو استمال اور گردن زدنی کو قابل گردن زدنی، فیصد کو فیصدی، منع کو منا، نفی جو ہم وزن فکر ہے اسے ہم وزن علی و کلی باندھنے لگے ہیں۔ ہر غزل میں اس بار متعدد شعر بیت الغزلی لگے ایک اہم ترین کام غزل کے سلسلے میں کرنا باقی ہے اور وہ کام صرف آپ کے ہاتھوں ہی ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد غزلوں میں زندۂ جاوید اشعار کی نشاندہی، اس سلسلے میں برادرم کرامت علی کرامت نے ناچیز کو لکھا بھی تھا کہ زندۂ جاوید اشعار مختلف غزل گو شعراء کے ارسال کروں۔ یہ ہم آپ کی سرپرستی میں برادران عالی قدر نعمان صدیقی اور حامد اقبال صدیقی بہ حسن و خوبی سرانجام دے سکتے ہیں ۔ نثر میں شاعری کرشن چندر اور کشمیری لال ذاکر نے بھی اپنے افسانوں میں کی تھی مگر ہم ان افسانوں کو نثری نظم نہیں کہہ سکتے۔ آزاد نظم کہنے کا حق بھی بس اسی نمائندہ شاعر کو پہنچتا ہے جو پابند نظم کہنے پر قدرت رکھتا ہو۔ شاعری کی بسم اللہ تو مقدس کلمۂ غزل سے ہوتی ہے۔ نثری شاعری سے نہیں۔ شعری مشق کے لئے نثری شاعری نئی نسل کے لئے ایک حد تک روا ہے۔ مگر مشاق شعراء جب نثری نظمیں لکھتے ہیں تو انہیں پڑھکر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اس بار مٹھی بھر نظموں میں منفرد غزل گو شاعر شہریار کے پانچوں منظومات پر مشتمل ہیں جبکہ بھی ایک حساس نثر نگار کے لئے جو میری دانست میں یہ وہ میں مصرعے نہیں ہیں ۔ نسیم بن آسی مغل سرائے کے خط میں جیسا مجھ ناچیز کو پیش کیا گیا ہے ویسا میں نہیں ہوں۔ میں تو خود کو خاکپائے دانشوران بلند فکر گردانتا ہوں تو پھر تو خود نمائی کیسی اور زعم کیسا؟ جسے علم کا نصیب لدنی نہیں وہ عالم کدھر!

● 49, VALTHI NAJM 2ND STREET
NOORULLAHPETH, AMBUR-635802

انور خان

شاعر کا اکتوبر کا شمارہ ملا۔ رسالے میں ریاض صدیقی کا مضمون فیمنسٹ تحریک ایسی بلندی ایسی پستی پسند آیا۔ حسن نعیم کی نظم اور باقر مہدی کی نظم حسن نعیم کے بارے میں، دونوں ہی خوب ہیں۔ دیگر مندرجات بھی معیاری ہیں۔

● 17/311, TEJES NAGAR RENOLD
ROAD, WADALA, MUMBAI - 37

خورشید اکرم

شاعر کے تازہ شمارے میں پالتو کہانی شائع کرنے کا شکریہ۔ آپ کے پاس قارئین کے کیسے خطوط آرہے ہیں؟ میرے پاس اب تک کئی (امید سے زیادہ) تعریفی خطوط آچکے ۔ خدا کا شکر ہے کہ کہانی آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جارہی ہے۔ صدیق عالم کی کہانی بہت پسند آئی۔ انہیں الگ سے خط لکھ رہا ہوں۔ تازہ شمارہ میں ریاض صدیقی کا مضمون میرے نزدیک حاصل شمارہ ہے۔ فیمنسٹ تحریک کی تاریخ اس کے عروج اور ناکامیوں سے میں واقف تھا لیکن جن نکات کی طرف انہوں نے اشارے کئے ہیں وہ میرے لئے نئے ہیں اور اہم ہیں۔ اس مضمون کے لئے ان سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے ان کا مضمون کس شمارہ میں چھپا تھا؟ جو پرچے میرے پاس محفوظ ہیں ان میں مل گیا تو پہلی فرصت میں پڑھوں گا۔ اطہر فاروقی کا مضمون رجائزہ چھاپ کر آپ نے بہت اچھا کیا۔

● M-7/2 JOGABAI EXTN. OKHLA
NEW DELHI-110025

کچھ اور مسائل...

مغنی تبسم

ادھر غزل میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں اور غزل کی نئی زبان تخلیق ہو رہی ہے لیکن اسے مستحکم ہونے میں وقت لگے گا۔ کلاسیکی غزل کا وصف خاص ایجاز اور ایمائیت ہے یہ بات زبان پر قدرت وسیع مطالعے اور زندگی کے گہرے مشاہدے اور تجربے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ سب سے زیادہ تخلیقی جہتیں درکار ہیں یہی سبب ہے کہ اچھے اور بڑے غزل گو ہر دور میں کم رہے ہیں۔

● 6-3-659/2 SOMAJI GUDA,
HYDERABAD-500082

بقیہ صفحہ ۴۶: نقد و نظر

کے بعد اس نے جو محسوس کیا اسے اپنے طور پر لکھ دیا بہر حال مصنف کی یہ قابلِ داد کوشش ہے کہ اس نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ مرزا ہادی رسوا پر مصنف کا تحقیقی مضمون بہت ہی عمدہ بہت ہی اہم اور مطالعے کے قابل ہے۔ اس میں رسوا کی حیات اور ان کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں کہ جس سے اردو والے شاید ناواقف یا کم واقف تھے۔ اس مضمون سے وہ کمی پوری ہوگی۔ ماضی کی عظیم ادبی شخصیتوں پر اس طرح کے مضامین کم کم ہی لکھے جاتے ہیں۔

"آزادی کے بعد اردو نظم" "یہ نظم نگاری پر ایک سرسری جائزہ ہے لیکن جو بھی ہے اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر یہ موضوع وسعت چاہتا ہے۔ احسن یوسف زئی کی شاعری پر مصنف کا مضمون بہت ہی خلوص سے لکھا ہوا ایک بھرپور مضمون ہے۔ اس میں احسن کی شاعری کی ہمہ رنگیت کی جھلک اور اہمیت کی چمک ملتی ہے۔

"بین السطور" کے آخری مضمون کا ذکر کرنے سے پہلے میں چند کتابوں کے نام لینا چاہوں گا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ "دوسرا کنارہ" جوگیندر پال کا ناول "نادید" ڈاکٹر عتیق اللہ کی کتاب "نیا محاورہ" سلیم شہزاد کی کتاب "قصہ جدید افسانے کا" شموئل احمد کا ناول "ندی" ۔۔۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر مصنف نے مختصر طور پر تبصرے کئے ہیں۔ جو فکر انگیز ضرور ہیں لیکن ایک معلوماتی اور تحقیقی مضامین کی کتاب میں اس کی شمولیت زیب نہیں دیتی۔

"بین السطور" کا آخری مضمون اہم ترین ترقی پسند افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے فن اور ان کی شخصیت پر ہے جو مختصر مگر پر اثر ہے۔ یہ مضمون بڑی ژرف بینی سے بیدی کے خوب مطالعے کے بعد لکھا گیا ہے۔

بہر حال حمید سہروردی کے مضامین جو "بین السطور" کی شکل میں ادب کے قاری تک پہنچے ہیں۔ قابلِ مطالعہ ہیں۔

ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۹۰ روپے ☆ سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: ۲۲۳۔۳ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

☆مبصر: رفیق جعفر

زرِ سالانہ ارسال کرتے وقت
اپنا خریداری نمبر ضرور درج کیجئے

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

مثنوی سحر البیان (مثنوی)

میر غلام حسن دہلوی ☆ مرتب: رشید حسن خاں

رشید حسن خاں نے کلاسیکی ادب کے جو متون بعد تلاش و تحقیق شائع کروائے ہیں ان میں سحر البیان پانچویں کتاب ہے۔ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، گلزار نسیم اور مثنویات شوق کی طرح سحر البیان کا متن بھی رشید حسن خاں کی تدوین کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ایسی مستند کتابیں تیار کی ہیں کہ ان کلاسیکی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں سوالات پیدا انہیں ہوتے جو عام طور سے ذہن کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔

مرتب کی ہر کتاب کی طرح اس کتاب کے ساتھ بھی ایک طویل مقدمہ شامل ہے جس میں حالات زندگی، وجہ تصنیف، قصہ کے ماخذ، زبان و بیان، مثنوی کے خطی نسخوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ فرہنگ کا حصہ بھی خاصا اہم ہے۔ مصنف نے اب تک پانچ کلاسیکی متون کو ایڈٹ کیا ہے اور ہر کتاب کے ساتھ فرہنگ شامل ہے۔ پانچوں کتابوں کی فرہنگ کو کوئی طالب علم یکجا کردے تو کلاسیکی کتب کی ایک عمدہ فرہنگ کی داغ بیل پڑ سکتی ہے۔ اسی طرح تشریحات کا حصہ بھی مثنوی کی تفہیم کو طالب علموں اور ادب کے عام قاری کے لئے آسان کرتا ہے۔ بقیہ چار کتابوں کی طرح اس کتاب کو اعراب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جو آج کے طالب علموں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔

کتاب کی تمہید میں رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ صبح و شام کا سماں ہو، باغ ہو، سراپا ہو، یا کسی منظر کی تصویر کشی ہو اس مثنوی کے ایسے ہر بیان میں نور اور روشنی کی لہریں موج زن نظر آئیں گی۔ چاندنی، شعلے کی چمک، جواہر کی چھوٹ، سونے کے کڑوں کی جھلک غرض ایسی ہر چیز روشنی کا مرکز معلوم ہوتی ہے۔ جیسے شاعر کے شعور اور نظر کا محور، احساس نور ہو اور چاند اور اس کی نظر اور خیال کا مرکزی نقطہ۔ اردو میں ایسی کوئی مثنوی نہیں۔ جس میں نور کی جلوہ گری اس شدت اور وسعت کے ساتھ ہو۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی بے مثال ہے۔ زبان و بیان پر رشید حسن خاں نے قدرے اختصار سے گفتگو کی ہے لیکن اس عنوان کے تحت جو باتیں انہوں نے کہی ہیں انہیں ہر طالب علم کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

بقیہ کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی انجمن ترقی اردو نے بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے ان کتابوں کی اشاعت آج اردو کی بنیادی ضرورتوں میں ہے اس لئے یہ ادارہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔

ضخامت: ۶۴۲ صفحات ☆ قیمت: ۳۲۵ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ☆ مبصر: **انور خان**

ذروں سے ستاروں تک (شاعری)

اکبر حیدر آبادی

نہیں منظور کہ ہو میری غزل میں اکبر
ذکر اس کے قد و گیسو کا کلیشے کی طرح
شعبدہ بازی سے اکبر حرف و صوت و فکر کی
میں بھی چونکا دوں جہاں کو یہ مرا مسلک نہیں

ان دو شعروں میں اکبر حیدر آبادی نے اپنی شاعری کے بارے میں ایمان داری سے صاف صاف بات کہی ہے۔ وہ ایک عرصے سے شاعری کر رہے ہیں اور یہ ان کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے۔ وہ غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیات بھی لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں بھی شامل ہیں لیکن زیادہ غزلیں ہی کہتے ہیں جن میں بقول خود ان کے نہ حسن و عشق کی معاملہ داری ہے نہ کوئی چونکا دینے والی شعبدہ بازی ویسے بھی غزل بیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنا لبادہ بدل چکی ہے۔ جو لبادہ اس نے اتار دیا ہے اس میں حسن و عشق، ہجر و وصال، گل و بلبل، خار و گل، بہار و خزاں، شمع پروانہ، ساقی و ساغر، مئے و میخانہ اور زاہد و واعظ کے نقش و نگار تھے۔ اس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کے رنگ بھی تھے۔ لیکن اب جو غزل ابھری ہے وہ عصری تقاضوں کی عکاس اور عصری حسیت کی نمائندہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں شعریت، تشبیہ و استعارے کی ندرت اور پیکر تراشی کے جلوے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ نئی زمانہ غزل گو شعراء کے بے چہرہ ہجوم میں گنے چنے شعراء ہی نے اپنے قد و خال واضح کئے ہیں اور باقی شعراء بھیڑوں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ اکبر حیدر آبادی ان شعراء میں ہیں جو اس بھیڑ چال سے بچ کر اپنی ایک الگ راہ بنانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ درج ذیل منتخب اشعار اس بات کا ثبوت ہیں:

میں تو یہ سوچ کے چپ ہوں کہ مری بات اکبر
عصر حاضر کی سماعت پہ کہیں بار نہ ہو
اقدار کے زوال سے دل گیر ہیں سبھی
ہر چیز یوں تو پہلے سے بہتر ہے ان دنوں
ہے فکر یہ سانحہ اولاد آدم کا تمام
تین دنیاؤں میں بٹ کر رہ گئی دنیا تمام
یہ قید عمر تو اک سلسلہ ہے بندشوں کا
کہ اس زنداں کے اندر اور بھی زنداں بہت ہیں
جان کر بھول گئے جاننے والے میرے
کتنا گمنام کیا ہے مری شہرت نے مجھے

اس مجموعے کی کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق، پورا گٹ اپ اعلیٰ درجے کا ہے۔ ضخامت: ۲۱۶ صفحات ☆ قیمت: ۶ پاؤنڈ ☆ سنہ اشاعت: ۱۹۹۸ء ☆ پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی۔۶ ☆ مبصر: **محافظ حیدر**

بالمشافہ (انٹرویو)

معصوم مراد آبادی

بالمشافہ، عہد حاضر کے بعض ایسے ادیبوں اور شاعروں سے معصوم مراد آبادی کی بالمشافہ گفتگو کا صحافتی ریکارڈ ہے جن میں سے بیشتر اس قابل ہیں کہ خبر میں رہیں اور بعض محض اس لئے مسلسل برسوں خبر میں رہے ہیں کہ وہ خبر میں رہنے کا فن جانتے ہیں۔

معصوم مراد آبادی جنہوں نے صحتمند صحافت کی راہیں ہموار کرنے میں ایک باخبر صحافی ہونے سے "خبردار" کے مدیر ہونے تک بڑی طویل جد و جہد کی ہے، شعر و ادب کی سمت و رفتار اور ادبی لوگوں کے مزاج و احوال کی بھی اس حد تک خبر رکھتے ہیں کہ اس قلمرو میں سکۂ رائج الوقت کی طرح چلنے والوں میں کھرے کھوٹے کی پہچان کر سکیں۔ مگر کچھ تو نام کا اثر اور کچھ صحافتی اخلاقیات کا لحاظ کہ انہوں نے اپنے تعارفی کلموں اور سوالوں سے قارئین پر اپنی پسند و ناپسند کا عکس بھی نہیں پڑنے دیا ہے۔ سوائے چند لوگوں کے جنگی مشاعرے کی شہرت نے انہیں بھی ایک سامع کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انتہائی سادہ اور معصوم اور بے ضرر قسم کے سوالوں کے جواب میں بھی اکثر اشخاص نے ایسی لن ترانیاں کی ہیں جن کی روشنی میں پروفیسر قسیم

حنفی کی اس نشاندہی کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ :

" اچھے شائستہ اور تیز لکھنے والوں کے علاوہ معصوم صاحب نے کچھ ایسے اصحاب سے بھی مکالمہ کیا ہے جو مقبولیت اور "عظمت" میں فرق نہیں کرتے اور اپنے بارے میں خود اپنے ہی فیصلوں کو تاریخ کا فیصلہ مان لیتے ہیں۔ وہ جو ایک بات کہی جاتی ہے کہ کسی بھی شخص کی رسوائی میں سب سے زیادہ ہاتھ خود اس کا اپنا ہوتا ہے تو یہ بات اس کتاب میں شامل ایک دو انٹرویوز پر بھی صادق آتی ہے"

کتاب میں شامل ایک شاعر کی ہرزہ سرائی پر خامہ بگوش کا ردِ عمل اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے لیکن کیا وہ مکمل ہے؟ مگر تبصرہ نگار کی یادداشت دھوکا نہیں دے رہی ہے تو خامہ بگوش نے اسی مضمون میں پاکستان پر کسی ہندوستانی غزل گو کے بجائے، اسمگلرز کے چھائے ہوئے کی بات بھی لکھی تھی ، بہتر ہو تا کہ خانہ بگوش کے مضمون کی ہر سطر شائع کی جاتی۔

معصوم کی تجدیدوں میں شائستگی اور برجستگی ہے۔ پیش لفظ میں انہوں نے موجودہ ادب کے بارے میں یہ سچی اور اچھی بات بھی کہی ہے کہ " ہمارے ادیب بالعموم ایسے موضاعات پر لکھ رہے ہیں جن کا عام قاری سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ "لیکن کسی بھی انٹرویو سے یہ حقیقت اجاگر نہیں ہوتی کہ ایسا کیوں ہے ؟پوری کتاب پڑھ جایئے، اس میں آپ کو مختلف رنگ نظر آئیں گے لیکن ہر رنگ میں یہ رنگ ضرور شامل ہے کہ انٹرویو نگار کو اپنی بات کہنے کا جتنا سلیقہ ہے اتنا ہی سلیقہ مخاطب سے بات کہلوانے اور دہرانے کا بھی ہے۔

ضخامت : ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت : ۲۰ روپئے ☆ سنہ اشاعت: ۱۹۹۶ء ☆ پتہ: خبردار پبلی کیشنز، ۲۶۱-۴-۱۷ نیا محل، دہلی ۱۱۰۰۰۶ ☆ مبصر: **شمیم طارق**

اردو رسائل

خدا بخش لائبریری پٹنہ ، ہندوستان کی ایک اہم اور تاریخی لائبریری ہے جو اپنی نایاب عربی فارسی اور اردو کتابوں اور قدیم رسالوں کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ نایاب کتابوں کے اس ذخیرے سے تو ہندو بیرون ہند کے اکثر اسکالر وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں، مگر رسائل کے ذخیرے سے فائدہ اٹھانے کا کام مطبوعہ فہرست کے نہ ہونے کی وجہ سے عام نہ ہو سکا، اس کمی کو دور کرنے کی غرض سے ادارے نے ان تمام قدیم رسائل کی ایک باقاعدہ فہرست شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو صرف ۱۹۹۲ء کے رسائل کی فہرست پر مشتمل ہے اور خدا بخش صدی تقریب کی یادگار کے طور پر شائع کی گئی ہے۔

اس فہرست میں ۱۹۹۲ء کے جن رسائل کی تفصیلات دی گئی ہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان رسائل کو لیا گیا ہے جو پابندی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں دوسرے حصے میں ان رسائل کو لیا ہے جو تاخیر سے شائع ہوتے ہیں ، دونوں حصوں میں ان رسائل کا ذکر حروف ہجا کی ترتیب پر مبنی ہے اور تفصیلی تعارف کے طور پر ان رسائل کے سرورق ، ترتیب مضامین اور دیگر ضروری معلومات کا عکس اس طرح دیا گیا ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھ کر قاری اس رسالہ کی ساری بنیادی خصوصیات اور مضامین سے آگاہ ہو جاتا ہے ۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں جن میں ان رسائل کے بعض اہم مضامین کا عکس پورے کا پورا دیا گیا ہے۔ ابتداء میں لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا پیش گفتار ہے جس میں انہوں نے مختصراً رسائل کے اس ذخیرے کی تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ ان رسائل کے افادے کو عام کرنے کے لئے اب تک کیا کیا کام ہوا ہے اور آئندہ چند سالوں میں کیا ہونے والا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ فہرست بے حد معلوماتی ہے اور روایتی انداز سے ہٹ کر تیار کی گئی ہے ، کتابت وطباعت بھی دیدہ زیب ہے، اردو رسائل پر کام کرنے والوں کے لئے ایک بے حد مفید فہرست ہے۔ ضخامت: ۴۰۴ صفحات ☆ قیمت: سو روپئے ☆ سنہ اشاعت: ۱۹۹۳ء ☆ پتہ: خدا بخش لائبریری، پٹنہ (بہار) ☆ مبصر: **حامد الله ندوی** (مرحوم)

بین السطور (مضامین)

حمید سہروردی

حمید سہروردی جدید افسانے کا ایک جانا پہچانا نام ہے جس کی اپنی ایک شناخت بھی ہے۔ عرصۂ دراز سے وہ خالص ادبی رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ حوالوں اور مثالوں میں بھی ان کا نام کبھی کبھی کہیں کہیں نظر بھی آتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ تدریس انکا پیشہ ہے ۔ اس مناسبت سے ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اپنی اندرونی صلاحیتوں کی تحریک پر گاہے بہ گاہے وہ ادبی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ ان ہی مضامین کا مجموعہ اب "بین السطور" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کل پندرہ مضامین ہیں۔

پہلا مضمون " مختصر "افسانہ ایک فعال صنف نثر ہے۔ اس میں مصنف نے مختصر افسانہ کی اہمیت اور افادیت پر اپنے طور پر روشنی ڈالی ہے۔ پریم چند سے لے کر جدید افسانہ کے اہم ناموں تک انہوں نے مختصراً افسانہ نگاروں کی فنی صفات کو اجاگر کیا ہے اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے اہم کارنام کو بھی سراہا ہے۔ اس مضمون کو کوئی طالب علم غور سے پ پڑھلے تو اس کے ذہن میں اردو افسانے کا بتدریج ارتقاء ا رجحانات کے حقائق نقش ہو جائیں گے۔

آزادی کے بعد کرناٹک میں اردو افسانہ اس موضو شاید یہ پہلا مفصل مضمون ہے کہ جس کے پڑھنے سے چلتا ہے کہ کرناٹک کے قلمکاروں نے افسانے کی دنیا میں اہم کام کیا ہے۔ مختصر ہی سہی مصنف نے تقریباً سبھی افس نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرناٹ کے افسانہ نگاروں نے ہر تحریک اور ہر رجحان کا ساتھ دیا۔ لیکن جدید افسانے کو پائندہ رکھنے کی کوششیں بھی اسی علا کے افسانہ نگاروں میں نظر آتی ہیں۔

" آزادی کے بعد اردو افسانہ سمت اور رفتار " : تفصیلی جائزہ ملتا ہے اس میں مصنف نے کچھ ناموں سہارے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میر جدید افسانے کے وکیل بنے ہیں۔ دلائل ان کے اپنے ہیں ملزم جدید افسانہ سے پہلے کا افسانہ ہے مقابل کوئی وکیل نہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مضمون نہایت ہی ع ریزی سے لکھا گیا ہے وکالت کے انداز میں دانشورانہ بغاو ہے۔ تحریر میں اعتماد کی قوت ہے۔ کچھ ایک جذباتی فیصلہ باتوں کو چھوڑ کر مجھے تو یہ اپنی وکالت میں کامیاب نظر آ ہیں ۔ فیصلہ ادب کا قاری کرے لیکن مشکل یہ ہے "اقلیتوں کی طرح ادب کا قاری بھی بٹا ہوا ہے"۔

"مراٹھواڑہ میں عصری ادب" یہ اپنی نوعیت کا بہت مضمون ہے کہ اس میں مراٹھواڑہ کے قلمکاروں کے نام اور کاموں کا ایماندارانہ ذکر ملتا ہے اور یہ احساس جاگتا ہے مراٹھواڑہ کی زمین اردو ادب کے لئے بہت ہی زرخیز ہے۔

"اردو ناول پیش رفت" میں مصنف نے اپنے مطا اور اپنی پسند کے اعتبار سے قاری کو ناول کی دنیا کی سیر کرا ہے اور خود گائیڈ بنے ہیں۔ سیر کے دوران قاری کو معلوما حاصل کرنے کا چسکا ہوتا ہے۔ اسے وہی معلومات مل ر ہیں جو کہ وہ جانتا ہے اس لئے وہ تشنگی محسوس کرنے لگتا۔ ویسے یہ مضمون ۱۹۸۰ء میں لکھا گیا تھا۔ اب پڑھا جا رہا شاید ایسا محسوس ہو رہا ہو پھر بھی یہ مضمون ادیبوں کے نہ سہی طالب علموں کے لئے اہم ہے۔"

" قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری " میں مصنف ایک ذ قاری نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ناولوں کا مطالعہ کرنے

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

رفتار

ادبی، علمی، تہذیبی و ثقافتی عالمی منظر نامہ

"ادبی رسائل میں خبر نامہ ایک چلن بن گیا ہے۔ کوئی بھی رسالہ ادبی خبروں سے خالی نہیں لیکن ان خبروں کی پیش کش میں کوئی تخلیقی شعور کہیں نظر نہیں آتا۔ علمی و ادبی اور تہذیبی خبروں پر مشتمل کوئی ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامہ اخبار نہیں ہے۔ پاکستان میں اس نوعیت کے اخباروں کی اشاعت بڑھ رہی ہے۔ کچھ ماہنامے بھی اسی نہج کے شائع ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں ایک ایسے اخبار یا ماہنامے کی سخت ضرورت ہے جو ادب کے علاوہ ادیبوں، شاعروں کے شب و روز کو تازہ بہ تازہ پیش کرے، کتب و رسائل کی باتیں علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں۔ گوشہ نشینوں کا ذکر، نئے چہروں کی تلاش، ادبی انکشافات، راز و نیاز کی باتیں۔

شاعر (آگرہ) میں ایک نہایت ہی دلچسپ اور مفید کالم شروع کیا گیا تھا ۔ مسافر سفر میں ہے اسے ہر ماہ مدیر شاعر قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم تحریر کیا کرتے تھے جون ۱۹۵۰ء کے بعد یعنی شاعر جب ممبئی سے جاری ہوا، تب بھی یہ کالم شاعر کا بے حد مقبول کالم تھا۔ اسی طرح مسافر کی ڈائری بھی ایک کالم تھا۔ یہ دونوں کالم ادبی حلقوں میں موضوع بنے رہتے تھے۔ لوگ استفادہ کرتے تھے ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرتے تھے اور جب شہر در شہر سفر کو نکلتے تھے تو ان کالموں میں اپنے ذکر کو تعارف نامہ بناتے تھے۔ یہ سفر نامے بھی تھے اور خبر نامے بھی۔ مذکورہ تاریخی عنوان، مسافر سفر میں ہے، کو دوبارہ شروع کرنے کا خیال ہے۔ ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ سیمینار وغیرہ ہو رہے ہیں پھر بھی ہم لوگ ایک دوسرے کی خیر خیریت نہیں جان پاتے ہیں۔ بہت ساری باتوں سے لاعلم رہتے ہیں اور اپنی بے خبری ہی کو بناعلم جانتے ہیں۔

ضی میں شاعر کا کالم 'رفتار' کبھی ایک تو کبھی دو صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کی ترتیب و تہذیب کی اپنی مثال تھی۔ بہرحال! رفتار کے حوالے سے مکالمہ جاری رہے گا"۔ (الف۔ الف)

بشیر بدر ۔ خلیجی ممالک میں اپنے کامیاب جشن سے سرشار واپس ہوئے ہیں۔ ان دنوں بہت مختلف غزلیں کہہ رہے ہیں۔ اس عہد کے مقبول ترین غزل گو سے ۲۱ویں صدی کی نئی غزل متوقع ہے۔

عتیق اللہ ۔ دہلی [redacted] مستحق تھے۔ آنکھوں میں گلوکوما اتر آنے کے سبب بینائی ختم ہو گئی تھی۔

حیثیت سے ۲۰، ۲۱ر اور ۲۲ر اکتوبر کو بعنوان ۲۰ویں صدی میں اردو خواتین کے ادب پر ایک شاندار سیمینار منعقد کیا۔ پورے ہندوستان سے منتخب خواتین قلم کار کا اجتماع پہلی بار ہوا تھا۔

معظم علی ۔ سکریٹری راجستھان اردو اکاڈمی نے اپنے قلیل بجٹ کے باوجود فروغ اردو کونسل کے تعاون سے ۱۴، ۱۵، اور ۱۶ر اکتوبر کو ہندوستان کی تمام اردو اکاڈمیوں کے سربراہوں کی ایک شاندار کانفرنس کو مثالی اور ماڈل کانفرنس بنادیا

کالی داس گپتا رضا ۔ لندن کے کامیاب سفر سے لوٹ آئے ہیں۔ جہاں ۷۔۲ر اگست کو ۲۱ویں صدی اور اردو زبان میں نئے امکانات کے عنوان سے ایک شاندار عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔

محمد حمید اللہ بھٹ ۔ فروغ اردو کونسل کے ڈائرکٹر ہیں۔ انہوں نے ایک نیٹ ورک بنایا ہے کہ اردو کو پوری طرح الیکٹرانک میڈیا سے جوڑ دیا جائے۔ اس زبان کو ایک بار پھر چلن کی زبان بنادیا جائے۔

انور خان ۔ کئی ماہ سے سخت علیل تھے اب روبہ صحت ہیں۔ شاعر کے لئے ایک تبصرہ دیا ہے اور اب کہانی متوقع ہے۔ ان کی مکمل صحت یابی کے لئے دعا کی درخواست ہے۔

امجد اسلام امجد ۔ مشہور شاعر، ادیب، ٹی وی ڈرامہ اور سفر نامہ نگار، قہقہوں اور لطیفوں کے رسیا کا جشن نئے ہزارے، نئی صدی کے نئے سال میں خلیجی ممالک میں منعقد کیا جائے گا۔

مسعود حسین خاں ۔ مشہور محقق، نقاد اور شاعر ایک مدت سے سخت علیل ہیں۔ لکھنا پڑھنا موقوف ہے ۔ صحت یابی کے لئے دعا کی درخواست ہے۔

سلام سندیلوی ۔ معروف محقق، نقاد اور شاعر کا ۱۶ر ستمبر کی شب میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۲۵ر فروری ۱۹۱۹ء کو سندیلہ میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنو میں تعلیم حاصل کی، اردو، فارسی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں سے واقف تھے۔ ۱۹۵۹ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے درجنوں اہم تصانیف کے مصنف کو وہ قدر و منزلت نہ ملی جس کے وہ

منظر کاظمی ۔ مشہور افسانہ نگار منظر کاظمی کا ۱۲ر اگست ۲۰۰۰ء کی شام ۵ بج کر ۲۰ منٹ پر جمشید پور میں انتقال ہو گیا۔ ان کی پیدائش ۲۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں سندرپور (متصل دربھنگہ) میں ہوئی تھی۔ درس و تدریس سے وابستہ منظر کاظمی کے افسانوں کا مجموعہ لکشمن ریکھا (۱۹۹۱ء) خاصہ مقبول ہوا تھا۔ وہ اپنی خود نوشت 'سرسری اس جہان سے گزرے' تحریر کر رہے تھے۔ یہ اب نامکمل ہی رہ گئی۔ منظر کاظمی کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب منظر نامہ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

عشرت کرتپوری ۔ کہنہ مشق معروف شاعر عشرت کرتپوری ۲۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء کی صبح غازی آباد (یوپی) کے ایک نرسنگ ہوم میں انتقال کر گئے۔ یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو کرت پور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ عشرت صاحب نے عمر بھر اپنی سانسوں کو سنبھالنے کے لیے جہد مسلسل کیا۔ مختلف ملازمتیں، اخبارات سے وابستگی اور پھر اپنا رسالہ 'پائل' شائع کیا۔ ہمدرد دواخانے میں ملازمت کی اور ۱۹۹۴ء تک اسی سے جڑے رہے۔ شاعری میں احسان دانش کے شاگرد ہونے اور ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ ان کے تصانیف میں کاکل صبح (۱۹۶۰ء) پاک زمین ناپاک قدم (۱۹۶۲ء) شاخ برہنہ (۱۹۷۵ء) غزلانجلی (ہندی۔ ۱۹۹۱ء)۔ عشرت صاحب کے خاص شاگردوں میں نصرت گوالیاری ایک بڑا معتبر نام ہے۔

سید حامد حسین ۔ معروف ناقد، ادیب اور استاد ڈاکٹر سیّد حامد حسین کا ۲۵ اور ۲۶ر اکتوبر کی درمیانی شب میں اندور میں انتقال ہو گیا جہاں وہ عارضی طور پر اپنی علیل بیگم کے علاج کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ اندور ہی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کا مستقل قیام تو بھوپال ہی میں تھا۔ درس و تدریس سے جڑے ہوئے تھے لیکن بہت خاموشی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت بھی کی۔ ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں ان کی تصانیف میں سے ہیں۔ تنقید، تحقیق، تخلیق، بچوں کا ادب وغیرہ پر خوب لکھا اور اعتبار حاصل کیا۔ ان دنوں وہ عام اور جدید الفاظ اور اصطلاحات پر کام کر رہے تھے اور اس موضوع پر ایک کتاب مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی ہے۔ مرحوم صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کے سچے خادم تھے۔ ادارہ شاعر سے ان کا رشتہ بہت قدیمی رہا ہے۔

کتاب [redacted] زار

آسمان اے آسمان (انتخاب)

شاعر: خلیل الرحمٰن اعظمی (مرحوم) ☆ ضخامت: ۲۴۴ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: اعظمی میموریل سوسائٹی، اردو باغ، سر سید نگر، علی گڑھ (یوپی)

وفیات مشاہیر اردو (تذکرہ)

مرتب: بشارت علی خان فروغ ☆ ضخامت: ۶۷۲ صفحات ☆ قیمت: چار سو روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: بشارت علی خاں ایڈوکیٹ، محلہ شاہ آباد گیٹ، رامپور - ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

خوابِ تحریر (شاعری)

شاعر: یعقوب راہی ☆ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۱۰۱- ارپن اپارٹمنٹ لکشمی پارک، نیا نگر، میرا روڈ، ممبئی۔ ۴۰۱۱۰۷ (مہاراشٹر)

بند راستے (افسانے)

فن کار: ابنِ کنول ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۵۰ روپے ☆ سنہ اشاعت: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۹۷۱۴، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

صلوعلیہ وآلہ (نعتیہ شاعری)

شاعر: ساغر جیدی ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: اپریل ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۲۰-۳۶۰- مستان والی اسٹریٹ، کڑپہ۔ ۵۱۶۰۰۱ (آندھرا پردیش)

شعور کا شعار (مضامین)

مصنف: احسان سہگل ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: فروری ۱۹۹۹ء ☆ پتہ:
VONDEL STRAAT 5,2513 EN,
THE HAGUE, HOLAND

مہرِ کارواں (جلد اوّل۔ احادیث کا منظوم ترجمہ)

شاعر: سیّد شمیم رجز ☆ ضخامت: ۴۴۰ صفحات ☆ ہدیہ: ۲۰ امریکی ڈالر ☆ سنہ اشاعت: ۲۴ر نومبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ:
CROWN COURT NO.5,3629 - EMERALD
STREET, TORRANE CA-90503 (U.S.A.)

صبح آنے کو ہے (شاعری)

شاعر: عشرت رومانی ☆ ضخامت: ۲۷۲ صفحات ☆ قیمت: ۲۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: جولائی ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۱۴-۸، رابعہ ڈیلکس، بلاک سی -۱، اسکیم - ۳۳، مین یونیورسٹی روڈ، کراچی ۷۵۲۷۰ (پاکستان)

بچے پھول ہوتے ہیں (بچوں کے لئے شاعری)

شاعر: محسن باعشن حسرت ☆ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ☆ قیمت: ۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۴- پرنپ اسٹریٹ (پہلی منزل) کلکتہ - ۷۰۰۰۷۲ (مغربی بنگال)

برف سے صحرا تک (اسکینڈے نیویا کا سفر نامہ)

مسافر: فیصل نواز چوہدری ☆ ضخامت: ۱۸۰ صفحات ☆ قیمت: درج نہیں ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ:
ETTERSTAD SLETTA-90
0659-OSLO-6, (NORWAY)

کشت راسخ در زمین غالب (شاعری)

شاعر: راسخ بیکانیری ☆ مرتب: خورشید احمد ☆ ضخامت: ۸۸ صفحات ☆ قیمت: سو روپے ☆ پتہ: راسخ منزل ۷۴۳ر اے، ہاسپٹل روڈ، بیکانیر (راجستھان)

سبز و سرخ (شاعری)

شاعر: راشد بنارسی ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت: ۱۲۵ روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ڈی ۳۹ر ۴۳ر ۹ بازار سدانند، وارانسی (یوپی)

۳۔ سدا بہار راتیں (مجروح شہر جلگاؤں میں)

تحریر: شفیق ناظم ☆ ضخامت: ۴۶ صفحات ☆ قیمت: دس روپے ☆ مطبوعہ: بار اوّل ۱۹۹۹ء ☆ پتہ۔ ۲۶۴- بالاجی پنتھ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

محبت روگ ہے جاناں (شاعری)

شاعر: مسعود احمد ☆ ضخامت: ۱۶۸ صفحات ☆ قیمت: ۸۰ روپے ☆ مطبوعہ: جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ۱۳۸- ظفر کالونی، اوکاڑہ (پاکستان)

الف (افسانے)

فن کار: شبیر اصغر ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: اسّی روپے ☆ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۹ء ☆ پتہ: NAR- ۶۲- کاویز گھاٹ روڈ، شب پور، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۳ (مغربی بنگال)

رسائل و جرائد

اقدار (دل شاہجہاں پوری نمبر)

مدیر: شبنم رومانی ☆ ضخامت: ۲۰۴ صفحات ☆ قیمت: شمارہ دل، ۱۰۰ روپے ☆ مطبوعہ: جلد ۵، شمارہ ۱۱-۱۲، ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: اقدار، ۲۰۷- گھڑیالی بلڈنگ، صدر، کراچی (پاکستان)

معیار (اختر الایمان نمبر)

مرتب: شاہد ماہلی ☆ ضخامت: ۵۹۶ صفحات ☆ قیمت: تین سو روپے ☆ مطبوعہ: ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: معیار پبلی کیشنز، کے- ۳۰۲، تاج انکلیو گیتا کالونی، دہلی- ۱۱۰۰۳۱

سفیر اردو (سہ ماہی/ افسانہ نمبر)

مدیران: ساحر شیوی، سیّد معراج جامی ☆ ضخامت: ۱۷۶ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ ۵۰ روپے، ۵ پونڈ، ۸ ڈالر ☆ مطبوعہ: جولائی ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ:
URDU GHAR 47-SUTTON GARDEN SUNDON
PARK, LUTON DEDS- LU3 3AF (U.K.)

نخلستان (خواتین نمبر)

مدیرہ: ملکہ نسیم ☆ ضخامت: ۹۶ صفحات ☆ قیمت: ۱۰ روپے ☆ مطبوعہ: جنوری مارچ ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: راجستھان اردو اکاڈمی 3-J، سبھاش مارگ، سی۔ اسکیم، جے پور (راجستھان)

اردو ادب (سہ ماہی)

مدیر: اسلم پرویز ☆ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ☆ قیمت: فی شمارہ تیس روپے ☆ مطبوعہ: اپریل، مئی، جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: انجمن ترقی اردو، ۲۱۲، راؤز ایوینو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سیپ (سہ ماہی/ اشاعتِ خاص)

مدیر: نسیم درّانی ☆ ضخامت: ۳۱۴ صفحات ☆ قیمت ۱۰ روپے ☆ مطبوعہ: اگست ستمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: سیپ پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴، کراچی- ۷۵۷۳ (پاکستان)

جامعہ (خواجہ حسن نظامی نمبر)

مدیر: شمیم حنفی ☆ ضخامت: ۲۰۰ صفحات ☆ قیمت: ۵۰ روپے ☆ مطبوعہ: اپریل تا جون ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شیش (ہندی میں اردو ادب)

مدیر: حسن جمال ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت ۲۰ روپے ☆ مطبوعہ: کتابی سلسلہ ۱۹- ۲۰۰۰ء ☆ پتہ حسن جمال، پٹانواس کے سامنے، لوہر پورہ، جودھپور (راجستھان)

خیال (سہ ماہی)

مدیر: حبیب احسن ☆ ضخامت: ۱۶۰ صفحات ☆ قیمت فی شمارہ ۴۰ روپے ☆ مطبوعہ: اکتوبر دسمبر ۲۰۰۰ء ☆ پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۷۵۵۱، صدر ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۴۰۰ (پاکستان)

☆☆☆☆

کمپیوٹر کمپوزنگ
محمد ایاز راجپوت

● ترنم ریاض نے اچھے موضوعات کا انتخاب اور لکھنے کے لئے مناسب اسلوب اختیار کیا ہے۔ افسوس کہ یہ بنیادی اور بہت ضروری صفت ہمارے یہاں سے ناپید ہوتی جا رہی ہے۔۔ ———— نیّر مسعود

● ترنم ریاض کے افسانوں کے موضوعات، اسلوب اور اظہار کی غیر رسمی تازگی اور سادگی، تشکیلی قدرت ان کے فن کے قابلِ ذکر خصائص میں سے چند ایک خصائص ہیں۔ ———— بلراج کومل

● بھئی کیا کہانی لکھ دی 'شہر' واہ واہ! شاید اردو میں یہ پہلی کہانی ہے جو مہانگری نما شہروں سے متعلق ہے۔ مبارک ہو۔ ———— سیّد محمد عقیل رضوی

● ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب وثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ صورتِ حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں۔ ———— ابوالکلام قاسمی

REGD.NO.TECH/47-1037/MBI/2000

Price Rs. 9 /=

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY- 400 004.

71 Years of Publications ❖ December — 2000 ❖ Tel. No. 3829904

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/ 57.

PRINTED BY PUBLISHER AND OWNER NAZIR NOMAN SIDDIQUI AT AL-AMIN PRINTERS, 370/372 MAULANA AZAD ROAD MUMBAI-400 004.